جلد ۱۵

فاران کراچی

شمارہ ۱

ایڈیٹر:- ماہر القادری | ماہ اپریل سنہ ۱۹۶۳ء

ترتیب

مقام اشاعت:- دفتر ماہنامہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

مطبوعہ مطبع سعیدی کراچی

پبلشر:- مسرور حسین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نقشِ اوّل

توحید اور کتاب و سُنّت کی تبلیغ اور شرک و بدعت کی تردید آغازِ اشاعت ہی سے "فاران" کا مسلک اور موضوع رہا ہے، ہم نے عٙ
کران موضوعات پر مضامین لکھے ہیں اور دوسروں سے لکھوائے ہیں! ان مضامین میں جو بات بھی کہی گئی ہے دلیل کے ساتھ کہی گئی
صاف اور سُلجھی ہوئی باتیں! اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان مضامین کے بڑے اچھے نتائج ظہور میں آئے ہیں، خاص طور سے "تو
ہی مفید خدمت انجام دی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے خاصی مقبولیت عطا فرمائی ہے! ہمارے پاس تعریف و توصیف کے خطوط کے
خاص حضرات کے خطوط بھی آئے ہیں جنہیں فاران کے مضامین اور "توحید نمبر" پڑھنے کے بعد اپنے غلط عقائد کی اصلاح کی توفیق
لی ہے اور ان پر جب حق واضح ہو گیا ہے، تو اُس کے قبول کرنے میں انھوں نے کسی قسم کی جھجک اور ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔

جن عقائد کی "توحید نمبر" میں تردید کی گئی ہے، ہم نے اسی فضا اور ماحول میں پرورش اور تربیت پائی ہے، ان عقائد کے علماء کی
کتابیں پڑھی ہیں، ان کے مواعظ سُنے ہیں، اُن کی صحبت میں بیٹھے ہیں، عُرسوں میں کیا ہوتا ہے! سجادہ نشینوں، مجاوروں اور درگ
خادموں کے کیا حالات اور مشاغل ہیں؟ ان تمام باتوں کا ہم نے خود مشاہدہ کیا ہے ——— اس لئے "توحید نمبر" میں ایک ایک کر
عق۔ ا۔ رسوم پر گرفت کی گئی ہے، جو اہلِ بدعت کا شعار ہیں، اور بدعقیدوں کے "علمِ کلام" کو سامنے رکھ کر ایک ایک اعتراض کو دلا
ساتھ رد کیا گیا ہے!

مگر

جن لوگوں کے ذہن و فکر پر فاسد عقائد گھٹا ٹوپ اندھیرے کی طرح چھا چکے ہیں، اور جو اس چکر سے نکلنے کا داعیہ ہی نہیں رکھتے، و
علمی دلیل لانے کے بجائے، انہی اعتراضات کو دہرائے جاتے ہیں، جن کے جوابات پوری شرح و بسط کے ساتھ "توحید نمبر" میں دیے
ہیں۔

؎ کوئی سمجھا ذکہ ہم سمجھائیں کیا ———

چنانچہ ایک بدعت پسند عالم نے "توحید نمبر" کے جواب میں ایک کتاب بھی لکھ کر چھپوائی ہے اور اس خیال و مزاج اور فکر و عق
بعض دوسرے حضرات بھی جرح و تنقید فرماتے رہتے ہیں اور کبھی کبھو، کوئی "گالی نامہ" بھی آجاتا ہے! ہم نے بعض خطوط کے جوا
بھی دیئے ہیں، اور نشان دہی کی ہے کہ آپ نے جو اعتراضات کئے ہیں، اُن کے جوابات "توحید نمبر" میں پوری تفصیل کے ساتھ موجو
مثلاً قبروں پر پھول چڑھانے کی رسم کی "توحید نمبر" میں تردید کی گئی ہے کہ دورِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں یہ عمل نہیں رہا، خود ر
صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرِ مبارک پر صحابہ کرام نے پھول نہیں چڑھائے! حالانکہ مدینہ میں پھول بھی موجود تھے، اور صحابہ کرام کو حض
ذاتِ گرامی سے جو محبت و عقیدت تھی، وہ کسی بحث و اختلاف اور ادنیٰ شائبہ کے بغیر سب کے نزدیک ثابت و مسلّم ہے!
حدیث ملتی ہے کہ حضور نے دو قبروں پر عذاب کی تخفیف کے لئے درخت کی ہری شاخیں گاڑ دی تھیں، اُس حدیث کو پیش کر
توحید نمبر میں لکھا گیا ہے کہ اس حدیث سے پھول چڑھانے کی بدعت کے لئے دلیل لانا "قیاس مع الفارق" کی بدترین مثال

مورمولنے احترام و محبت یا عقیدت و تعظیم کے خیال سے ان قبروں پر پھول نہیں چڑھاتے تھے بلکہ تخفیف عذاب کے لئے ہری شاخیں رکھی تھیں! اور آج کل مسلمان بزرگانِ دین کی قبروں پر احترام و عقیدت کے جذبہ کے ساتھ پھول چڑھاتے ہیں جو کھلی ہوئی بدعت ہے جس کے لئے کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ میں کوئی دلیل، سند اور مثال نہیں ملتی!

لیکن

اہلِ بدعت قبروں پر گلپوشی کی دلیل میں یہی حدیث کو پیش کئے جاتے ہیں! اہلِ بدعت کا یہی مزاج ہے کہ وہ قرآن کریم کی ان آیتوں کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو اپنے خود تراشیدہ عقائد و اعمال کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں، جن آیات و احادیث کا ان کی نکالی ہوئی باتوں سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا!

طلبِ حق کی راہ میں جب کوئی دعا...ی اور کٹ حجتی پر اتر آئے، تو اس سے بڑی الجھن ہوتی ہے۔ حق کے معاملہ... واضح دلیلوں کو چھوڑ کر رمز و اشاریت اور غموض و پیچیدگی کی راہ اختیار کرنا، اور سیدھی سچی بات کو الجھن میں ڈالنا نہیں ہے، ہم کیا اور ہماری بساط کیا —— جن لوگوں نے حق کو سمجھنا اور حق کو ماننا نہیں چاہا، ... بھی کارگر نہیں ہو سکی!

یہ تو رہا اہلِ بدعت کا معاملہ —— مگر ہمیں ایسے حضرات سے بھی سابقہ پڑا ہے، جو خود ... میں مبتلا نہیں ہیں اور توحید کے تقاضوں کو جانتے اور پہچانتے ہیں مگر "شرک و بدعت" کی کھلم کھلا تردید ... لیتے ہیں —— یہ حضرات اپنی رائے اور خیال میں بے شک نیک نیت ہیں اور خیر پسندی کا جذبہ رکھتے ہیں مگر ہمیں ان کی خدمت میں یہ عرض کرنا ہے کہ کفر و شرک اور طغیان و فساد پر شدت کے ساتھ احتساب اگر محلِ غور اور قابلِ اصلاح ہے، تو یہ اعتراض (معاذ اللہ) خود قرآنِ کریم پر وارد ہوتا ہے! قرآن کریم کا تنذیر اور وعید کا اندازِ بیان کس قدر شدید اور خوف دلانے والا ہے کہ اگر قلب میں قبولِ حق کی صلاحیت ہو تو محاسبۂ آخرت کے احساس سے جسم میں رعشہ پیدا ہو جائے۔

سامنے کی بات یہ ہے کہ "قرآن" جسے "ظلمِ عظیم" کہتا ہے، اور جس (شرک) میں مبتلا ہونے والوں پر رحمت و مغفرت اور نجات کا دروازہ بند کرنے کا اعلان کرتا ہے، اس کی جہاں جتنی بھی جھلک اور آمیزش پائی جائے گی، اس پر اسی شدت کے ساتھ نکیر کی جائے گی اور کرنی چاہیئے! پھر حدیثِ رسول "بدعت" کو ضلالت کہتی ہے، اس لئے یہ ضلالت جہاں نظر آئے گی اسے دیکھ کر کوئی مسلمان خاموش کس طرح رہ سکتا ہے! امت اور مسلمانوں کی خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ شرک و بدعت کے عقائد و رسوم پر احتساب کیا جائے!

"شرک و بدعت" کا معاملہ فقہی جزئیات اور شرع کے فروعی مسائل جیسا نہیں ہے کہ ان کے درمیان اعتدال کی راہ نکالی جا سکتی ہے، یا ایک ہی "حکم" کے سلسلہ میں مختلف تعبیرات کو گوارا اور قبول کیا جا سکتا ہے، مثلاً کسی نے نماز میں زور سے آمین کہی، کسی نے آہستہ، کسی نے رفع یدین کیا اور کسی نے نہیں کیا، نماز دونوں کی ہو گئی —— مگر توحید اور شرک اور سنت و بدعت کے مابین نہ کوئی سمجھوتا ہو سکتا ہے، نہ کوئی بیچ کا راستہ نکالا جا سکتا ہے اور نہ اس کے بارے میں چند رائیں ہو سکتی ہیں جو راجح و مرجوح یا قوی اور ضعیف ہوں! مثلاً صحیح حدیث میں قبروں پر چراغ جلانے والوں کے لئے "لعنت" کی وعید آئی ہے، تو اس صریح نکیر کے بعد کوئی مسلمان یہ نہیں کہہ سکتا کہ بعد میں جا کر ضرورت کے تحت بعض علماء نے قبروں پر چراغ جلانے کو "مباح" قرار دیدیا۔ اس کی حیثیت "بدعتِ حسنہ" کی ہے، اس کو ترک کرنا اولیٰ ہے مگر کرنا کوئی گناہ کی بات نہیں ہے! نیت عبادت کی نہ ہو، تعظیم و محبت کی ہو

تو قبروں پر چراغاں کیا جاسکتا ہے ——— یہ تاویل اور نکتہ سنجی سو فی صدی غلط ہے، لغو ہے اور باطل و گمراہ کن ہے!
جب فاران کا "توحید نمبر" پہلی بار شائع ہوا ہے ——— تو دلّی کے ایک مشہور علمی و دینی رسالہ نے اس انداز میں تنقید کی جیسے ہم معاذاللہ شفاعت کے منکر ہیں، اور بعض "مباح امور" کو ہم نے بدعت ٹھیرا دیا ہے ——— ہم نے رسالہ مذکور کے فاضل مدیر کو خط لکھا اور "فاران" میں جو ہمارا مضمون چھپا تھا، اُس کا اقتباس پیش کیا، جس میں قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا واضح طور پر اقرار تھا! اس کے بعد ہم نے عرض کیا کہ "توحید نمبر" نے کسی ایک فقرے اور اقتباس کی نشان دہی فرمائی جائے، جس میں کسی مباح فعل کو "بدعت" قرار دیا گیا ہو ہمارے اس خط کا وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا!
زندگی کے عام اُمور میں بھی زیادتی بُری چیز ہے بلکہ گناہ ہے، چہ جائیکہ دینی اُمور میں کسی پر زیادتی کی جائے اور کوئی غلط الزام لگایا جائے! شرک و بدعت کے معاملہ میں تو اور زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے "شرک و بدعت" اسی عقیدہ اور فعل کو کہا جائے گا، جس میں یہ مفاسد واضح طور پر پائے جائیں گے، بالکل اس طرح جیسے دو اور دو (۲ + ۲ = ۴) چار ہوتے ہیں!
کوئی صاحب ہمیں بتادیں کہ ہم نے فلاں "امرِ مباح" سے شرک و بدعت کو منسوب اور موسوم کیا ہے اور اس کی اس طرح تاویل ہو سکتی ہے ——— تو اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کے بعد ہم پورے انشراحِ قلب کے ساتھ "فاران" میں اس کا اعلان کریں گے، حق واضح ہو جانے پر رجوع الی الحق میں ایک لمحہ کے لئے بھی ہم تامل پس و پیش نہیں کر سکتے، ہمارا یقین ہے کہ اپنی غلطی کے اعتراف سے آدمی پست نہیں بلند ہو جاتا ہے۔

یہ تنقید!؟ گزشتہ سال بارہ ربیع الاول کو لاہور میں جو جلوس نکلا تھا، اُن دنوں ہم وہاں موجود تھے، اس جلوس میں جو غیر شرعی حرکتیں ہوئیں اور غیر اخلاقی اور بازاری حرکتوں کے جو مظاہر دیکھنے میں آئے، اُن کا ہم نے "فاران" میں ذکر کیا تاکہ لوگوں کو عبرت ہو، اور وہ اس چیز پر متنبہ ہوں کہ ایسی باتوں سے اللہ کا دین اور "عشقِ رسول" بدنام ہوتا ہے، یہ ایک متوازن مضمون تھا، کسی قسم کا مبالغہ نہیں، کسی پر کوئی تہمت نہیں جوڑی، کوئی ایسی بات نہیں کہی جو واقعہ کے خلاف ہو۔

مگر

لاہور کے ایک رسالہ (معارفِ اسلام) نے ہمارے مضمون کے جواب میں ایک مقالہ لکھا، جلوس نکالنے والوں کی ہمت افزائی کے لئے اُس جلوس کے متعدد فوٹو گروپ اپنے یہاں چھاپے، اور اس جلوس کو "شعارِ اسلام" قرار دیا۔

ع ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے!

اس رسالہ نے یہ زحمت اس لئے گوارا کی ——— کہ بارہ ربیع الاول کا جلوس اگر "بدعت" ثابت ہو گیا، تو محرم میں "عزا" کے نام پر جو مظاہرے ہوتے ہیں، اُن کے جواز کے لئے تو پھر کوئی ضعیف دلیل بھی ہاتھ نہ آسکے گی! اُن لوگوں کو کیا کہیے جو اپنی غلطیوں کو جائز ٹھیرانے کے لئے دوسروں کی غلطیوں کی تائید تصویب بلکہ تائید اور حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔
اللہ تعالیٰ کا دین قیم ہے، مُبین و متین ہے، اُس کو لطیفوں، چٹکلوں اور نکتہ آفرینیوں میں نہیں اُلجھانا چاہیئے، جو کوئی ایسی باتیں کرتا ہے وہ دین کے ساتھ مذاق اور مسخرہ پن کرتا ہے، ہر رسم، طریقہ اور عقیدہ کے لئے کتاب و سُنّت کی دلیل ہونی چاہیئے۔ دین میں "احترام و محبت" اور سوگ اور عزا کے نام پر رسمیں نکالنے کا کوئی بھی مجاز نہیں ہے، اور صدیوں کے عمل کے بعد یہ غیر شرعی مظاہر اگر مسلمانوں میں مقبول ہو جائیں اور لوگ انسے دین سمجھنے لگیں، تو وہ حقیقت میں دین نہیں بن سکتے!

کُفارِ قریش نے یہ رسم اپنے دل سے گھڑ کر نکال لی تھی کہ وہ کعبہ کا برہنہ طواف کرتے تھے اور سیٹیاں اور تالیاں بجانے کو "ذکر اللہ" اور ان بیہودہ مراسم و مظاہر اور غیر اسلامی شعائر کو "دین" سمجھتے تھے۔ قرآن کریم اس پر نکیر کرتا ہے ——

"وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً"

آج اہلِ بدعت کا بھی یہی دستور اور چلن ہے کہ وہ ڈھول، تاشے اور باجے گاجے اور اسی قسم کے کھیل تماشوں کو اللہ، رسول، ائمہ اور بزرگوں کے احترام و عزت کے اظہار کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اپنی اس غلط روی اور جاہلیت پر فخر کرتے ہیں، انہیں ایسی باتوں پر ٹوکا جاتا ہے تو ٹوکنے والے کو اُلٹا مطعون کیا جاتا ہے کہ تم احترام و عقیدت کے تقاضوں سے ناواقف ہو۔

دل و نگاہ کی اس غفلت سے اللہ تعالیٰ ہر کسی کو محفوظ رکھے، جب بُرائیاں، خوبیاں بن جائیں اور شرک و بدعت میں حسن بلکہ نور نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے گھر میں "صلوٰۃ غوثیہ" پڑھ کر قبلہ کی سمت سے ہٹ کر بغداد کی طرف تعظیم و استمداد کی نیت سے گیارہ قدم چلنے کی رسم ادا کی جاتی ہے ——— کہیں "صلوٰۃ غوثیہ" ہے اور کہیں ایک گھوڑے کو رسول "امام" کی سواری کا گھوڑا فرض کر کے اُس کی تعظیم کی جاتی ہے، اور یہ معاملہ فسادِ قلب کی اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ عقیدت اور محبت ہوتی ہے، اُس کا جنازہ خود اپنے ہاتھ سے بنا کر اُس پر خون چھڑکتے ہیں، اور تیر چھوتے کو گلی گلی لئے پھرتے ہیں! ان تمام رسموں اور مظاہروں کا دین سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے، اسلام نے عقیدت کے اظہار کے لئے ایسی باتوں کی اجازت نہیں دی، اس قسم کے مظاہروں کے لئے کتاب و سنّت میں کوئی سند بھی نہیں ملتی! جو کوئی ایسی بے سند رسموں اور باتوں کو "شعائر اللہ" سمجھتا ہے، وہ اللہ اور رسول اور دین کے ساتھ مذاق اور تمسخر کرتا ہے۔ دین کے معاملات کا تعلق لوگوں کے ذوق، پسند، انتخاب اور وجدان سے نہیں ہے کہ کچھ لوگ اپنے ذوق کی تسکین کے لئے کسی رسم اور طریقہ کو ایجاد کر لیں، اور پھر اُس کو جائز ٹھیرانے کے لئے "لطائف و ظرائف" کا ایک علم کلام تصنیف کر ڈالیں۔

اس ذوق و مزاج کے لوگوں کو کیا کہیئے جو ہندوؤں، مجوسیوں اور عجمیوں کی دیکھا دیکھی "مسرت و غم" کے اظہار کے لئے رسمیں اور طریقے ایجاد کرتے ہیں اور ان بدعات و خرافات کے بارے میں ان کا اصرار ہوتا ہے کہ ان کو "دینی شعائر" سمجھا جائے۔

جب بھی مُشرکانہ رسوم اور بدعات پر احتساب کیا جاتا ہے، سیدھی سچی بات کو اُلجھانے کے لئے اہل بدعت "محبت و عقیدت" کی دہائی دینے لگتے ہیں، جیسے بزرگوں کی عقیدت و محبت کے تقاضوں کو بس وہی جانتے اور پہچانتے ہیں، اور نقد و احتساب کرنے والے بزرگانِ دین کے معاملہ میں "بے ادب" واقع ہوئے ہیں! مثلاً بزرگانِ دین کی قبروں کے ساتھ اہل بدعت تعظیم و عقیدت کا جو معاملہ کرتے ہیں، اُس کے لئے کتاب و سنّت سے وہ کوئی دلیل نہیں لا سکتے، اور ان بدعات پر نکیر اسی لئے کی جاتی ہے کہ یہ باتیں خلافِ شریعت ہیں، اس جائز نقد و احتساب پر جو کوئی بزرگوں کے عدم احترام کی طنز کرتا ہے، وہ حق ناشناس ہے! انبیاءِ کرام ہوں، اہلِ بیت ہوں، صحابہ ہوں، ائمہ فقہ و حدیث اور صوفیاء و اولیاء ہوں، ان کی تعظیم و تکریم حدودِ شریعت کے اندر رہ کر کی جائے گی، شریعت کی حدوں کو توڑ کر تعظیم و محبت اللہ اور رسول کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے، مثلاً عیسائی حضرت سیدنا عیسیٰ مسیح علیہ السلام کو "ابن اللہ" کہتے ہیں، اُن کا یہ عقیدہ مُشرکانہ ہے، جسے قبول نہیں کیا جا سکتا اور حضرت عیسیٰ علیہ السّلام سے اُن کی یہ محبت و عقیدت دینی نقطہ نگاہ سے لعنت و ملامت کی مُستحق ہے! اور وہ نادان اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کو "ابن اللہ" مان کر وہ اپنے نبیؑ کی محبت کا حق ادا کر رہے ہیں! اور جو کوئی حضرت مسیح کو ابن اللہ نہیں مانتا، وہ حضرت مسیح کے جناب میں گستاخی اور بے ادبی کا ارتکاب کرتا ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ کا ذکر و بیان ایمان کی جان، اُس کی افادیت اور ضرورت کا انکار بے دینی اور الحاد! اس اعتراف کے بعد "مروجہ میلاد" کی محفلوں پر احتساب اس لئے کیا جاتا ہے کہ اُن میں بعض ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کی کتاب و سُنّت اور آثار صحابہ سے تطبیق اور تائید نہیں ہوتی! اہل بیت کرام اور صحابہ عظام نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ حضور کی ولادت کا ذکر کرکے صلوٰۃ و سلام پڑھنے کے لئے کھڑے ہو گئے ہوں! یہ نقد و احتساب معاذ اللہ ذکرِ رسول پر نہیں ہے بلکہ ان رسموں پر ہے جو لوگوں کی ایجاد کی ہوئی ہیں اور اُن کو "تعظیم و محبت" کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک سب سے نزدیک مبارک و محترم ہے، مگر مسلمانوں کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی صحابی نے قبرِ رسول کے نمونہ پر کوئی تابوت یا ضریح بنائی ہو، اور پھر اُسے گلی کوچوں میں گشت کیا ہو! اس قسم کا معاملہ کسی نبی، صحابی، امام اور ولی اللہ کی قبر کے ساتھ نہیں کرنا چاہیئے، اور جو کوئی ایسا کرتا ہے وہ غلط اندیش اور غلط کار ہے خلافِ شریعت باتوں سے کسی بزرگ کے احترام کے تقاضے پورے نہیں ہوا کرتے۔

یہ نکتہ سنجیاں؟!

ماہنامہ "معارفِ اسلام" (لاہور) میں ہماری اُن تحریروں پر بھی تنقید کی گئی ہے، جن میں ہم نے "توحید" کے تقاضوں کو واضح کیا ہے! معارفِ اسلام کی اس تنقید کو ہم نے پڑھا اور بڑی حیرت ہوئی، حیرت اس بات کی کہ کسی مسلمان کو "توحید" کی تبلیغ ناگوار نہیں گزر سکتی اور اُس کے زبان و قلم سے کوئی ایسی بات نہیں نکل سکتی جس سے "توحید" غبار آلود ہوتی ہو اور اس میں کسی قسم کا اشتباہ اور وہم پیدا ہوتا ہو۔

ہم نے توحید نمبر کے "نقشِ اول" اور اپنے دوسرے مضامین میں جو باتیں بیان کی ہیں، وہ کتاب و سُنّت کی واضح دلیلوں کے ساتھ بیان کی ہیں، کوئی بات "لطیفہ" کے طور پر نہیں کہی، اگر ہم سے کوئی بھول چوک ہو گئی ہے، یا ہمارے قلم سے کوئی غلط بات نکل گئی ہے، تو اُس کی تردید "کتاب و سُنّت" کی دلیلوں کے ساتھ کرنی چاہیئے! دین کا معاملہ قیاس و تخمین، تیر تکوں، لطیفوں اور چٹکلوں پر نہیں چلتا! "سمع و اطاعت" یہ ہے اسلام اور ایمان کا تقاضا اور مردِ مومن کی وہ صفت جس پر اُس کے مُسلم ہونے کا دار و مدار ہے!

کوئی مسلمان کسی پتھر یا دیوار پر کنکریاں پھینک کر مارتا ہوا دیکھا جائے تو لوگ اُسے مجنون اور مخبوط الحواس سمجھیں گے، مگر منیٰ میں "رمی جمار" حج کے فرائض میں داخل ہے، اسے ترک کرنے سے حج میں شدید فساد و خلل واقع ہوگا۔ اس فرض کو ترک نہیں کیا جا سکتا، ایسا کرنے میں کیا حکمت ہے اس کا حال اللہ اور رسول کو معلوم ہے، ہم تو حکم کے بندے ہیں، اور حکم کی اطاعت ہمارا مسلک اور شیوہ ہے!

کعبۃ اللہ کا طواف کیا جاتا ہے اور کعبۃ اللہ کو غلاف پہنایا جاتا ہے ——— یہ معاملہ اور کسی عمارت، مدرسہ، قبر اور آستانے کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا، یہاں تک کہ قبرِ رسول کا طواف بھی جائز نہیں ہے ——— کوئی اس انداز پر سوچے کہ کعبہ جو پتھر کی بنی ہوئی عمارت ہے، جب اس کا طواف جائز ہے، تو قبرِ رسول جس میں سرکارِ دو عالم آرام فرما ہیں، اُس کے طواف میں کیا قباحت ہے؟ اس قسم کے قیاسات اور نکتہ سنجیاں ضلالت و گمراہی کی دلیل ہیں۔ اسلام "گردن بہ طاعت نہادن" کا نام ہے۔ وہاں چون و چرا کی گنجائش نہیں، عزازیل اسی لئے راندۂ درگاہ قرار دیا گیا کہ اُس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کے مقابلہ میں قیاس سے کام لیا اور اپنی عقل سے نکتہ پیدا کیا۔

اس [illegible] نکتہ سنجیاں کہ ——— "فلاں بزرگ پر فلاں اسم کی تجلی ہوتی ہے، اور وہ اس تجلی کے بعد یہ ہو جاتا

ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " دینی مسائل میں کوئی وزن نہیں رکھتیں، اس قسم کی ۔۔۔ ن آرائیوں، لطیفہ سازیوں اور نکتہ آفرینیوں نے دین کو نقصان پہونچایا ہے، اور اسی "علم لطائف وظرائف" کی آڑ میں گمراہیاں پھیلی ہیں! مثلاً ایران میں ——— محمود پسیخوانی ——— نام کا ایک شخص گزرا ہے، اُس نکتہ سنج و نکتہ طراز نے یہ "نکتۂ بدیع" پیدا کیا تھا ——— کہ نقطۂ خاک واجب اور مبدء اول ہے ——— ہے! اس لئے اس کی یہ تحریک "نقطویت" کے نام سے مشہور ہوئی! اس دعویٰ خلالت والحاد نے پہلے تو "روح نبوت" کے بروز کا دعویٰ کیا۔ پھر گمراہی کی اس منزل میں اور آگے بڑھا اور اپنے آپ کو "مظہر الوہیت" سمجھنے لگا، ایسے بھی دوسرے گمراہوں کی طرح کچھ پیرو ہاتھ لگ گئے۔ اُس کے متبعین کہتے تھے:—

"چوں جسد کامل تر شد از آں محمود سر بر زد و نبعثک مقاما محمودا خبر آن است"۔

شرک و بدعت کی تمام گمراہیاں اسی انداز کی نکتہ سنجیوں، لطیفہ گوئیوں اور رمز و اشاریت کی باتیں اللہ تعالیٰ کے دین کے مزاج اور کتاب و سُنّت کی زبان و بیان کے خلاف ہیں!

یہودی فطرت اور مجوسی سرشت عبداللہ ابن سبا نے حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں ذات سے الوہی صفات منسوب کیں، جب یا دل فضا میں تیرتے تھے، تو یہ شخص چادر اوڑھ کر مراقب حضرت علیؓ کی سواری جا رہی ہے، حضرت علیؓ نے اس قسم کے غالی معتقدین اور گمراہ مداحین کو سزائیں دیں! حضرت ... کی ذات بارے میں جس جماعت (خوارج) نے "بغض و عداوت" کو روا رکھا، وہ بھی تباہ ہوئی۔ اور جس گروہ (اہل رفض) نے "عقیدت و محبت" کی بنا پر آپ سے الوہی صفات منسوب کیں وہ بھی غارت ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افضل المرسلین اور خاتم الانبیاء ہیں، انسان کامل ہیں، رحمۃ للعلمین اور سراج منیر ہیں حضورؐ کی اطاعت منصوص ہے، حضورؐ کا نقش قدم دلیلِ راہ ہے، حضورؐ کی یہ تمام صفات کتاب و سُنّت سے ثابت ہیں مگر آپ عبد ہیں معبود نہیں ہیں، مخلوق ہیں، خالق نہیں ہیں، سرکار کی ساری زندگی اللہ تعالیٰ کے حضور کمال درجہ کی عبدیت خضوع و خشوع اور اظہار عجز و تذلل کی زندگی ہے، اسی صفت عبدیت نے حضورؐ کو اللہ تعالیٰ کا محبوب بنایا، مگر اس "محبوبیت" پر اہلِ دُنیا کی محبت کا قیاس ہرگز ہرگز نہیں کرنا چاہیئے کہ یہاں محب، محبوب کا دیا ہوا شاہ ہے اور دونوں ایک دوسرے کے ہم نشین اور ہم مرتبہ ہوتے ہیں۔ عبد اور معبود کے درمیان جاہے وہ نبی ہی کیوں نہ ہو، برابری کا یا اُنیس بیس کی چھوٹائی اور بڑائی کا تصور کرنا بھی شرک و ضلالت ہے!

"ولم یکن لہ کفواً احد"

یہ ہے اللہ تعالیٰ کی شان، کائنات میں ——— اُس کا ہمسر اور جوڑ کا کوئی بھی نہیں ہے، ہر شے اور ہر نفس اللہ کا محتاج اور اُس کے در کا فقیر ہے یہاں تک کہ انبیاء کرام بھی اپنی حاجتیں اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرتے تھے، اور ہر وقت اُس کے فضل و کرم کے اُمیدوار رہتے تھے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کتنے ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ ان میں بندگی اور بشریت کا احتیاج اور قضاء و قدر کے آگے مجبور ہونا، واضح طور پر نظر آتا ہے! صحابہ کرام میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زندگی دنیوی اعتبار سے بڑے اضطراب کی زندگی گذری ہے ایسی باتیں ظہور میں آئی ہیں جو آپ کی طبیعت اور خواہش کے خلاف تھیں، حضرت علیؓ کی خلافت کے مقابلہ میں امیر معاویہؓ کی حکومت کا قیام اور اس کا برقرار رہنا۔ حضرت علیؓ کی مجبوری اور قضا و قدر کے معاملات میں آپ کی بے اختیاری

کی روشن دلیل ہے، دھوپ سے زیادہ روشن اور کھلی ہوئی دلیل! اس کے بعد بھی کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر مصیبت کے وقت حضرت علیؓ کو پکارتا ہے اور اُن سے مشکل کشائی کی اُمید رکھتا ہے، تو وہ پرلے درجہ کا نادان اور جاہل ہے اور توحید کے تقاضے اُس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔

قرآن کریم بتاتا ہے کہ ہر نبی نے مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ کو پکارا ہے کسی وفات پائے ہوئے نبی کو نہیں پکارا، یہ ایسی دو ٹوک بات ہے جس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں، پس ہمیں بھی اللہ تعالیٰ ہی کے نام کی دُہائی دینی چاہیئے اور اسی کو فریاد رس اور مشکل کشا سمجھنا چاہیئے! یہ صفت طاقت اور اختیار کسی بندے کو چاہے وہ نبی اور امام ہی کیوں نہ ہو حاصل نہیں ہے کہ کائنات کی کوئی چیز اُس کی نگاہ سے چھپی ہوئی نہ ہو، اور زمین و آسمان کے ماضی، حال و مستقبل کے اور دلوں کے حالات کی رتی رتی بھر اُسے خبر ہو۔ کسی نبیؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ میری زندگی میں تم مجھے جہاں سے بھی پکارو گے میں تمہاری پکار کو سُن لوں گا، اور تمہاری مصیبت کو دُور کر دوں گا اور نہ اس کا حکم دیا گیا ہے کہ بزرگوں کی ارواح سے ہم مشکل کشائی اور حاجت روائی کی اُمیدیں وابستہ رکھیں!

غیر اللہ کو مستقل بالذات مختار اور الٰہ نہ مان کر بھی اُس سے تعظیم و عبادت اور دعاء و استغاثہ کا ایسا معاملہ کرنا، جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے مخصوص ہے، شرک ہے ——— یہ نہیں ہے کہ پرستش بس پتھر اور لکڑی کے بنے ہوئے بُتوں کی شرک ہے انسانوں کی پرستش شرک نہیں ہے!

یہ تو مجوسیوں اور ہندوؤں کا شیوہ ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کے ڈولے، سنگھاسن، رتھ اور چھڑیاں نکالتے اور بازاروں میں ان کا گشت کراتے ہیں، مسلمانوں کا یہ مسلک کسی دور میں بھی نہیں رہا کہ انھوں نے روضۂ رسولؐ کی شبیہ یا تابوت بنا کر اُس کا جلوس نکالا ہو، ہر روضہ ظاہر ہے کہ روضۂ رسولؐ سے درجے میں کمتر ہی ہے، اُس کی نقل و تمثیل کا مظاہرہ، نمود و نمائش اور پھر اُس کے ساتھ ایسی تعظیم کا سلوک کس طرح جائز ہو سکتا ہے جو آدابِ عبادت سے ملتا جلتا ہے۔

مسلمانوں کے کسی فرد گروہ یا فرقہ کو اس کا اختیار حاصل نہیں ہے اور نہ وہ اس کا مجاز ہے کہ وہ اپنے ذوق و طبیعت سے کچھ رسمیں ایجاد کر لے اور اُن کو "دینی شعار" سمجھنے لگے! کتاب و سنت موجود ہے، اہل بیت اور صحابہ کے آثار موجود ہیں، اُمتِ مسلمہ کے تمام فرقے اس آئینہ میں ہر وقت اپنے عقائد و اعمال کے چہرے دیکھ سکتے ہیں! اللہ تعالیٰ کی عبادت کے کیا آداب ہیں، بزرگوں کی عقیدت و احترام کے کیا حدود ہیں! خوشی کا اظہار کس طرح کیا جاتا ہے، غم کس انداز پر منایا جاتا ہے، یہ تمام باتیں پوری تفصیل کے ساتھ تاریخ و سیر میں ملتی ہیں، اس وقت بھی لوگ پیدا ہوتے اور مرتے تھے۔ اُن کی شادی بیاہ بھی ہوتے تھے، اُس زمانے میں مسلمانوں کی قبریں اور قبرستان بھی تھے، کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ سے ہر وقت معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ان امور و مسائل اور تقریبات میں کیا کرنا چاہیئے؟ اور کیا نہ کرنا چاہیئے، کس کی ممانعت آئی ہے، کس بات کی اجازت اور رُخصت ملتی ہے! دین کی ہر چیز کو جانچنے کی کسوٹی "کتاب و سنت" ہے، اور اسی کی ہم دعوت دیتے ہیں، دین کی سادگی کو جن لوگوں نے عجمی تکلفات میں اُلجھا دیا ہے قیامت کے دن اُن سے بڑی شدید باز پرس ہوگی۔

یہ دیکھ کر بڑی تکلیف ہوتی ہے کہ آپ کسی کے سامنے قرآن کریم کی محکم آیت پیش کرتے ہیں۔ وہ اس کے جواب میں کہتا ہے کہ "مدارج النبوت" میں یہ لکھا ہے! آپ اسے حدیثِ رسولؐ سناتے ہیں، وہ اس کے توڑ پر کسی صوفی شاعر کا شعر سنا دیتا ہے! آپ کہتے ہیں صحابہ کرامؓ کا اس معاملہ میں یہ عمل تھا، وہاں سے جواب ملتا ہے کہ فلاں "شیخ وقت" یہ کیا کرتے تھے؟

اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ جب کسی معاملہ میں تمہارے درمیان نزاع واقع ہو تو اللہ اور رسولؐ (یعنی کتاب و سنت) کی طرف

[illegible] مگر مسلمانوں کا آج یہ حال ہے کہ وہ کتاب و سنّت کی بجائے صدیوں بعد کے عالموں اور صوفیوں کے اقوال و ملفوظات کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس طرح بات اور زیادہ اُلجھ کر رہ جاتی ہے اور حق واضح نہیں ہو پاتا۔ اصل سے دور ہو جانے اور اُس سے بے توجہی اور بے رُخی برتنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔

معیارِ حق "کتاب و سُنّت" ہیں بعد کے لوگوں کی کتابیں اور اُن کے ملفوظات نہیں ہیں، جن لوگوں نے اس ترتیب کو اُلٹ دیا ہے، وہ جس گمراہی میں بھی مبتلا ہو جائیں تھوڑا ہے! ہر کسی کے قول و عمل کو کتاب و سنّت کی کسوٹی پر جانچا اور پرکھا جائے گا، جس کی بات کھری نکلے گی اُسے قبول کر لیا جائے گا جس کی بات اس کسوٹی پر پوری نہیں اترے گی اُسے چھوڑ دیا جائے گا۔

دین کی راہ سیدھی، صاف اور ہموار ہے، اس میں کوئی پیچیدگی اور کسی قسم کی ناہمواری نہیں۔ قدم قدم پر کتاب و سُنّت کی روشنی "مشعلِ راہ" ہے، اس مشعل پر نگاہ ہے تو پھر لغزش کا کوئی خطرہ نہیں، یہاں تک پر چل کر نجات و مغفرت کے جنّتی دروازوں میں داخل ہو جاتے، پھر اُس کے واسطے ہمیشہ ہمیشہ لطف و اطمینان ہے! اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراطِ مستقیم پر چلنے اور دین و دُنیا میں کامیابی میں شامل ہونے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

ماہر القادری — [illegible]

محمد سلیمان فرخ آبادی

نماز

آیاتِ قرآنی کی روشنی میں!

قرآن کتاب الٰہی ہے اس کے اللہ کی جانب سے ہونے میں کچھ شک و شبہ نہیں اور نہ اس کے اندر کوئی شک و شبہ کی بات ہے۔ یہ کتاب ہدایت ہے مگر اس سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنا چند شرطوں پر منحصر ہے یعنی طالب ہدایت میں چند صفتیں ہونا چاہئیں ورنہ کوئی شخص قرآن سے پورا فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔

(۱) آدمی پرہیزگار ہو، بھلائی، برائی میں تمیز کرتا ہو اور برائی سے بچنا چاہتا ہو۔

(۲) اُن تمام ان دیکھی حقیقتوں پر ایمان لائے جن پر ایمان لانے کی قرآن دعوت دیتا ہے۔

(۳) نماز قائم کرے اور عملی اطاعت کے لئے ہر وقت آمادہ اور مستعد رہے۔

(۴) آدمی تنگ دل اور زر پرست نہ ہو اور اللہ نے جو کچھ دیا ہو اسے اللہ کے راستہ میں خرچ کرتا ہو۔

(۵) اللہ کی طرف سے اتری ہوئی تمام کتابوں کو تسلیم کرے اور کسی قسم کے نسلی و گروہی بیجا تعصب میں مبتلا نہ ہو۔

(۶) اور اسی طرح تمام نبیوں اور رسولوں پر ایمان رکھنے کے ساتھ ساتھ جناب محمد رسول اللہ صلعم کو اللہ کا آخری نبی اور قرآن کو آخری کتاب تسلیم کرے۔

۷ اور آخرت پر اللہ کے آخری نبیؐ اور آخری کتاب کی تعلیم کے مطابق ایمان رکھے۔

الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۛ ج
هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ
وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ
(البقرہ ع ۱)

الٓمٓ ۝ یہ خدا کی کتاب ہے اس کے من جانب اللہ ہونے میں کچھ شبہ نہیں، یہ ہدایت ہے پرہیزگاروں کے واسطے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

• — اصلاح حال کے لئے نماز قائم کرنا ضروری ہے۔

یہودی اللہ کی نعمتوں کو بھلا بیٹھے تھے، اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو توڑ بیٹھے تھے، اللہ کے علاوہ اوروں سے ڈرنے لگے تھے حق کی طرف لپکنے کے بجائے اس کا انکار کر رہے تھے اللہ کی آیات کو دنیا کے عوض بیچنے لگے تھے حق و باطل میں گڈمڈ کرنے لگے تھے اور جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے تھے۔

ان تمام بیماریوں کا علاج اللہ تعالیٰ نے یہ تجویز فرمایا کہ :-

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ
(البقرہ ع ۵)

نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور جو لوگ میرے آگے جھک رہے ہیں ان کے ساتھ تم بھی جھک جاؤ!

یہودی اللہ کی کتاب توریت پڑھتے تھے لیکن اس پر غور نہیں کرتے تھے، دوسروں کو نیکیوں کا سبق پڑھاتے لیکن اپنے کو بھول جاتے تھے اس مرض کا علاج بھی اللہ میاں نے یہ تجویز فرمایا کہ

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ط (البقرہ ع۵) صبر اور نماز کے ذریعہ مدد چاہو۔

سورۂ بقرہ کے اسی پانچویں رکوع میں یہودیوں کی دینی بیماریوں اور ان کا علاج بیان کرتے ہوئے اللہ میاں نے فرمایا ہے کہ :۔

(۱) خدا کے نافرمان بندے جو اس کے آگے عاجزی سے سر نہیں جھکاتے۔

(۲) جو مرنے کے بعد اپنے رب کے سامنے پیشی کا دھیان نہیں رکھتے۔

(۳) اور جو مرنے کے بعد اپنے سامنے لوٹ پلٹ کر پہونچنے کو بھول بیٹھے ہیں۔

ایسوں کے لئے نماز سخت مشکل کام ہے

اور جو

(۱) اللہ کے فرمانبردار ہیں۔

(۲) اور آخرت میں حساب کتاب کا دھیان، خیال انہیں ہر وقت ستاتا رہتا ہے۔

نماز ان کے لئے بوجھ نہیں بنتی

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (البقرہ ع۵)

اور بے شک نماز ایک سخت مشکل کام ہے مگر ان فرمانبردار بندوں کے لئے مشکل نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ آخر کار انہیں اپنے رب سے ملنا اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

•۔ اللہ تعالیٰ نے نماز قائم کرنے کا عہد لیا تھا۔

دین کی بنیادی باتوں پر کاربند رہنے کا عہد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل اور تمام پچھلی امتوں سے لیا تھا اور ہم سے بھی لیا ہے۔

(۱) اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو!

(۲) ماں باپ کے ساتھ ـــــــ رشتہ داروں کے ساتھ ـــــــ یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرو ـــــــ

(۳) لوگوں سے بھلی بات کہو ـــــــ اور

(۴) اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۔ (البقرہ ع۱۰) نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو!

•۔ نماز، اخلاق کی پاکیزگی اور استقامت علی الحق کا ذریعہ ہے!

باطل پرست اور گمراہ اہل کتاب، حق اختیار کرنے اور سچائی کی طرف ہاتھ بڑھانے کے بجائے، بغض و حسد کی وجہ سے چاہتے تھے کہ حق پرست بھی حق چھوڑ دیں، وہ صحابہ کرام پر طرح طرح سے ڈورے ڈالتے تھے کہ پھر باپ دادا کا باطل دین اختیار کر لیں اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم عفو و درگزر سے کام لو یہاں تک کہ اللہ خود ہی اپنا فیصلہ نافذ کر دے مطمئن رہو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ـــــــ اور ـــــــ

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ط (البقرہ ع۱۳) نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو!

•۔ نماز سے وہ طاقت حاصل ہوتی ہے جس کے ذریعہ منصب امامت کا حق ادا کیا جاسکتا ہے۔

ہم سے پہلے دنیا کی رہنمائی کا فریضہ بنی اسرائیل پر عائد تھا اور منصبِ امامت پر وہ فائز تھے لیکن چونکہ وہ غفلتوں کا شکار ہوگئے بلکہ گمراہیوں میں پھنس کر راہِ حق بھی کھو بیٹھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ منصب چھین کر اُمتِ محمد رسول اللہ ؐ کو دیدیا۔ منصبِ امامت پر مامور کرنے کے بعد اس امت کو ہدایات دی جا رہی ہیں کہ اس بھاری ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے لئے جس طاقت کی ضرورت ہے وہ تمہیں دو چیزوں سے حاصل ہوگی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ (البقرہ ع ۱۹)

اے اہلِ ایمان صبر اور نماز کے ذریعہ مدد چاہو!

• ۔ نماز، اللہ کے نیک اور راستباز بندوں کا شیوہ ہے۔

مذہب کی چند ظاہری رسموں کو ادا کر دینا اور صرف چند مقررہ مذہبی اعمال انجام دیدینا نیکی نہیں ہے بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی، اللہ کو، آخرت کے دن کو، فرشتوں کو، اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے، اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال، رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں پر اور مسافروں پر، سوال کرنے والوں پر، اور گردنیں چھڑانے میں خرچ کرے ـــــ اور

وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ

نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے، اور

نیک وہ لوگ ہیں جو عہد کریں تو اسے پورا کریں اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں یہ ہیں راستباز اور یہی متقی ہیں۔ (البقرہ ع ۲۲)

• ۔ نماز کی حفاظت اور پابندی کے بغیر آدمی احکام الٰہی کی پابندی نہیں کر سکتا۔

تمدن اور معاشرت کے احکام اور قانون بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نماز کی حفاظت کا حکم دے رہا ہے کیونکہ نماز انسان کے اندر خدا کا خوف، نیکی اور پاکیزگی کے جذبات اور احکامِ الٰہی کی اطاعت کا جوہر پیدا کرتی ہے اور اسے راستی پر قائم رکھتی ہے نماز کے بغیر آدمی کبھی بھی اللہ کے قانون کی پابندی پر ثابت قدم نہیں رہ سکتا۔

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ٥ (البقرہ ع ۳۱)

اپنی نمازوں کی نگہداشت رکھو خصوصاً ایسی نماز کی جو محاسنِ صلوٰۃ کی جامع ہو اور اللہ کے آگے اس طرح کھڑے ہو جس طرح فرمانبردار غلام کھڑے ہوتے ہیں۔

• ۔ نماز قائم کرنے والے اللہ کے ہاں اجر کے مستحق ہونگے اور رنج و خوف سے محفوظ رہیں گے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ٥ (البقرہ ع ۳۸)

یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کئے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کو کسی قسم کا رنج و خوف لاحق نہ ہوگا۔

• ۔ نماز شعوری اور با مقصد ہونی چاہیئے۔

نماز میں انسان اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑا ہوتا ہے، اپنے مالک کے سامنے بندگی و غلامی کا عملی مظاہرہ کرتا ہوتا ہے، نماز میں آدمی اپنے دل و دماغ، جذبات و خیالات اور اپنے جسم کے تمام اعضاء سمیت سراپا بندگی ہوتا ہے اور اگر کہیں خدانخواستہ نماز میں آدمی غفلت کا شکار ہو جائے، مقصدِ نماز (ذکر و تذکیر) سے غافل ہو جائے تو ایسی نماز، نماز نہیں بلکہ محض اٹھک بیٹھک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے نشہ

الت میں نماز کے قریب پھٹکنے سے بھی روکا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ جب کسی شخص پر نیند کا غلبہ ہو رہا ر وہ نماز میں اونگھ جاتا ہو تو اسے نماز چھوڑ کر سو جانا چاہیئے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ (الآیہ) (النساء ۶-۷)

اے ایمان والو جب تم نشہ کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب جاؤ، یہاں تک کہ تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو۔

• ۔ جہاد بالسیف سے پہلے نماز کے ذریعہ جہاد بالنفس ہونا چاہیئے!

کچھ لوگ تھے جو باطل پرستوں اور حق کے دشمنوں سے مقابلہ کا بے صبری سے مطالبہ کر رہے تھے ان سے کہا گیا ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو! کچھ لوگ تھے جو انسانوں سے خوف کھاتے تھے ان سے کہا گیا کہ نماز قائم کرو تاکہ اللہ کے سوا ہر ایک کے خوف سے نجات پاکر شجاع ادر بن سکو اور پھر راہ حق میں جانیں لڑا سکو! کچھ لوگ تھے جو ایمان سے پہلے تو بڑے شیر دل تھے لیکن ایمان و اسلام کی خاطر لڑنے سے جاتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں نے نماز کا حق ادا نہیں کیا تھا ورنہ غیر اللہ کا ڈر، موت کا خوف اور دنیا کی کشش فی سبیل اللہ سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ (الآیہ) (النساء ۱۱۶)

تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا؟ جن سے کہا گیا روکے رکھو! اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ د

• ۔ حالتِ سفر اور میدان جنگ میں بھی نماز

نماز ایک ایسا فرض ہے کہ حضر و سفر اور امن و جنگ ہر حالت میں اس کی ادائیگی لازمی اور ضروری ہے البتہ اگر کوئی کھڑے ہو کر پڑھ سکتا بیٹھ کر پڑھ لے۔ رکوع و سجدہ کرنے کے قابل نہیں ہے تو اشارے سے پڑھ لے، بیٹھنے کی بھی سکت نہیں تو لیٹ کر ہ لے، وضوء کرنے پر قادر نہیں تو تیمم کر لے۔ غرضکہ دین فطرت نے ہر جگہ آسانی اور سہولت عطا فرمائی ہے۔ نماز قصر اور نماز خوف حکام ایک طرف ہمیں بتاتے ہیں کہ نماز ہر حالت میں ضروری ہے دوسری طرف وہ اسلام کے دین فطرت ہونے کا بین ثبوت ہیں۔ ن ان احکام میں ایسی لچک ہے جس کا فطرت انسانی مطالبہ کرتی ہے۔

زمانہ امن کے سفر میں قصر یہ ہے کہ جن اوقات کی نماز میں چار رکعتیں فرض ہیں ان میں دو رکعتیں پڑھی جائیں اور حالتِ جنگ قصر کے لئے کوئی حد مقرر نہیں ہے جنگی حالات جس طرح بھی اجازت دیں نماز پڑھی جائے جماعت کا موقعہ ہو تو جماعت سے پڑھو ورنہ انفرادا ہی سہی، قبلہ رخ نہ ہو سکتے ہو تو جدھر بھی رخ ہو، سواری پر بیٹھے ہوئے بھی پڑھ سکتے ہو۔ رکوع و سجدہ ممکن نہ ہو تو اشارہ سے سہی، ضرورت پڑے تو نماز ہی کی حالت میں چل سکتے ہو، کپڑوں میں خون لگا ہوا ہو تب بھی مضائقہ نہیں ان سب آسانیوں باوجود اگر ایسی پُر خطر حالت ہو کہ کسی طرح نماز نہ پڑھی جا سکے تو مجبوراً موخر کی جائے، جیسے جنگ خندق کے موقعہ پر ہوا (تفہیم القرآن)

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ الآیہ (النساء ۱۰۶)

جب تم لوگ سفر کے لئے نکلا کرو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر نماز میں قصر کر دو۔

وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا أَسْلِحَتَهُمْ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِنْ وَرَائِكُمْ وَلْتَأْتِ طَائِفَةٌ أُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ

اور اے نبی جب تم مسلمانوں کے درمیان ہو اور (حالتِ جنگ) میں انہیں نماز پڑھانے کھڑے ہو تو چاہیے کہ ان سے ایک گروہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو اور اسلحہ لئے رہے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے آکر تمہارے

وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ج

(النساء ع ۱۵)

ساتھ پڑھے۔ اور وہ بھی چوکنا رہے اور اپنے اسلحہ لئے رہے۔

(تفہیم القرآن)

• نماز پابندی وقت کے ساتھ فرض ہے مگر اللہ کو ہر وقت یاد کرنا چاہیئے!

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلٰى جُنُوبِكُمْ ج فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ إِنَّ الصَّلٰوةَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَوْقُوتًا ۝

(النساء ع ۱۵)

پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے رہو اور جب اطمینان نصیب ہو جائے تو نماز قائم کرو نماز یقیناً اہلِ ایمان پر پابندی وقت کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔

• نماز میں دکھلاوا (ریا کاری) اور سستی منافقانہ روش ہے۔

وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوا كُسَالٰى يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيلًا ۝

(النساء ع ۲۱)

اور جب (یہ منافق) نماز کے لئے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔

• نماز قائم کرنے والوں کو اللہ اجرِ عظیم سے نوازے گا۔

لٰكِنِ الرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُونَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيمِينَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أُولٰئِكَ سَنُؤْتِيهِمْ أَجْرًا عَظِيمًا ۝ (النساء ع ۲۲)

مگر ان میں جو لوگ پختہ علم رکھنے والے ہیں اور ایمان دار ہیں وہ سب اس تعلیم پر ایمان لاتے ہیں جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھی۔ اس طرح کے ایمان لانے والے اور نماز و زکوٰۃ کی پابندی کرنے والے اور اللہ اور روزِ آخر پر سچا عقیدہ رکھنے والے لوگوں کو ہم ضرور اجرِ عظیم عطا کریں گے۔ (تفہیم القرآن)

• غسل و وضو یا تیمم کے بغیر نماز نہیں ہوتی کیونکہ نماز پاکیزگیٔ نفس کا ذریعہ ہے اور غسل و وضو پاکیزگیٔ نماز کی کنجی

حدیث میں آتا ہے الطُّهُورُ مِفْتَاحُ الصَّلٰوةِ پاکیزگی نماز کی کنجی ہے اور قرآن کہتا ہے کہ اے ایمان لانے والو جب تم نماز کے لئے اٹھو تو چاہیئے کہ اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھو لو، سروں پر ہاتھ پھیر لو اور پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو! اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ اگر بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم سے کوئی شخص رفعِ حاجت کر کے آئے یا تم نے عورتوں کو ہاتھ لگایا ہو اور پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو بس اس پر ہاتھ مار کر اپنے منہ اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو اللہ تم پر زندگی کو تنگ نہیں کرنا چاہتا مگر وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دے شاید کہ تم شکر گزار بنو (المائدہ ع ۲ ترجمانی مولانا مودودی)

• اگر نماز قائم کرتے رہو گے تو اللہ تمہارے ساتھ ہوگا اور تمہاری برائیاں مٹا دے گا۔

وَقَالَ اللّٰهُ إِنِّي مَعَكُمْ ط لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَآمَنْتُمْ بِرُسُلِي وَعَزَّرْتُمُوهُمْ وَأَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَلَأُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا یقیناً میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ اور ان کی مدد کرتے رہو (ان کے مشن کو تقویت پہونچاتے رہو) اور اللہ کو قرضِ حسن دیتے رہو، تو میں تم سے تمہاری

الْاَنْھٰرُ ج (المائدہ ۳۶) برائیاں ضرور مٹادوں گا اور تم کو ان جنتوں میں ضرور داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

• اللہ کے آگے سجدہ ریز ہونے والے بندے ہی مسلمانوں کے رفیق ہو سکتے ہیں۔

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ (المائدہ ۷)

تمہارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور اللہ کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔

دنیا میں ہر جگہ مختلف پارٹیاں اور مختلف لیڈر ہیں جو مختلف قسم کے نظام اور لائحہ عمل رکھتے ہیں اور ان میں سے ہر پارٹی اور لیڈر مسلمانوں کو ان کا خیر خواہ ثابت کر کے اپنے نیور میں لینا چاہتا ہے لیکن قرآن کہتا ہے کہ مسلمانوں کے رفیق درحقیقت وہی سچے مسلمان ہیں جو احکام اسلامی کے پابند ہوں ایمان کے تقاضے پورے کرتے ہوں نماز قائم کرتے ہوں زکوٰۃ ادا کرتے ہوں اور ہر معاملہ میں اللہ کے آگے جھک جاتے ہوں۔

• جو لوگ خدا کے دین اور نماز کو اپنانے کے بجائے ان کا مذاق اڑائیں وہ مسلمانوں کے رفیق نہیں ہو سکتے۔

کچھ لوگ ہیں جو بزعم خود دانشور اور عقلمند بنتے ہیں وہ دین اور دینی احکام نماز وغیرہ کو سنجیدہ فعل اور عمل کرنے اور اسے اپنانے کے بجائے اس پر ہنستے ہیں اور دین کے سچے پیروؤں اور اس کے علمبرداروں کا مذاق اڑاتے ہیں حالانکہ یہ خود ایک غیر معقول رویہ ہے جو لوگ ایسا غیر سنجیدہ اور غیر معقول فکر و عمل رکھتے ہوں ان کو اگر مسلمان اپنا لیڈر، سربرہ اور کرتا دھرتا بنائیں گے، تو یہ غیر ایمانی اور غیر اسلامی حرکت ہوگی جو یقیناً دنیوی تباہی اور اخروی عذاب کا پیش خیمہ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ (المائدہ ۹۶)

اے ایمان والو تمہارے پیش رواہل کتاب میں سے جن لوگوں نے تمہارے دین کو مذاق اور تفریح کا سامان بنا لیا ہے انہیں اور دوسرے کافروں کو اپنا دوست اور رفیق نہ بناؤ۔ اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو جب تم نماز کے لئے منادی کرتے ہو تو وہ اس کا مذاق اڑاتے اور اس سے کھیلتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے۔ (تفہیم القرآن)

• ایسے تمام کاموں، باتوں، معاملوں اور مشغلوں سے گریز کرنا چاہیئے جو ذکر الٰہی سے غافل کرنے والے اور نماز سے باز رکھنے والے ہوں۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ج فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (المائدہ ۱۲۶)

شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔ تو کیا تم باز رہو گے؟

• حشر بہرحال قائم ہوگا اور تم اٹھائے جاؤ گے، مالک کائنات کے آگے حاضر کئے جاؤ گے لہٰذا نماز قائم کرو!

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ وَ اَنْ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّقُوْهُ ؕ وَ هُوَ الَّذِیْۤ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ (الانعام رکوع ۹)

کہو حقیقت میں صحیح رہنمائی تو صرف اللہ ہی کی رہنمائی ہے اور اس کی طرف سے ہمیں یہ حکم ملا ہے کہ مالکِ کائنات کے آگے سرِ اطاعت خم کر دو، نماز قائم کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو، اس کی طرف تم اکٹھے کئے جاؤ گے

• آخرت پر یقین رکھنے والے، کتاب اللہ پر لازماً ایمان لاتے ہیں اور اہلِ ایمان لازماً نماز کے پابند اور محافظ ہوتے ہیں۔

وَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝ (الانعام ع ۱۱)

جو لوگ آخرت کو مانتے ہیں وہ اس کتاب (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

مومن کی زندگی کا نصب العین خوشنودیٔ رب ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کی نماز اور عبادت اور پوری زندگی کی تمام جدوجہد اللہ کے لئے وقف ہوتی ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (الانعام ع ۲۰)

کہو، نماز میری نماز، میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا جینا اور مرنا "سب کچھ" اللہ رب العلمین کے لئے ہے۔

• ۔ ہر نماز بلکہ ہر عبادت میں اپنا رُخ ٹھیک رکھو (تعلیمِ دین کا بنیادی اصول)

تعلیمِ دین کے بنیادی اصول چار ہیں۔

(۱) انسان اپنی زندگی کو عدل و راستی کی بنیاد پر قائم کرے۔

(۲) عبادت میں اپنا رخ ٹھیک رکھے معبودِ حقیقی کے سوا کسی دوسرے کی طرف اطاعت و غلامی اور عجز و نیاز کا رُخ نہ ہونے دے

(۳) رہنمائی، تائید و نصرت اور نگہبانی و حفاظت کے لئے دعا صرف اللہ سے مانگنا چاہیئے مگر اس سے پہلے دین کو اللہ کے لئے خالص کر لینا ضروری ہے۔ یہ نہ ہو کہ زندگی کا سارا نظام تو کفر و شرک اور معصیت اور بندگیٔ اغیار پر چلایا جا رہا ہو اور مدد خدا سے مانگی جائے۔

(۴) اور اس بات پر یقین رکھے کہ جس طرح اس دنیا میں وہ پیدا ہوا ہے اسی طرح ایک دوسرے عالم میں بھی اس کو پیدا کیا جائے گا اور اسے اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ (تفہیم القرآن)

قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ ۫ وَ اَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۬ؕ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ؕ ۝ (الاعراف ۳۶)

کہو میرے رب نے راستی اور انصاف کا حکم دیا ہے اور یہ کہ ہر عبادت میں اپنا رُخ ٹھیک رکھو اور اسی کو پکارو، اپنے دین کو اسی کے لئے خالص رکھ کر، جس طرح اس نے تمہیں اب پیدا کیا ہے اسی طرح تم پھر پیدا کئے جاؤ گے

• ۔ نماز قائم کرنے والے نیک کردار ہوتے ہیں ان کا کیا دھرا برباد نہ جائے گا۔

وَ الَّذِیْنَ یُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِیْنَ (الاعراف ۳۱۶)

جو لوگ کتاب اللہ کی پابندی کرتے ہیں اور جنھوں نے نماز قائم رکھی ہے یقیناً ایسے نیک کردار لوگوں کا اجر ہم ضائع نہ کریں گے۔

• ۔ جو شخص راہِ راست پر چلنا اور دنیا کو اس پر چلانا چاہتا ہو اس کے لئے نماز اور ذکرِ الٰہی بلکہ توجہ الی اللہ درکار ہے۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيفَةً وَّدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ ۝ (الاعراف ع ۲۴)

اپنے رب کو صبح و شام یاد کرو دل ہی دل میں زاری اور خوف کے ساتھ اور آواز سے بغیر چیخے اور ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت میں سرشار ہیں۔

• ۔ سچے اہلِ ایمان تو وہی ہیں جن کے دل اللہ کا دھیان آتے ہی لرز جاتے ہیں اور جو نماز قائم کرتے ہیں۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ ... الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۝ (الانفال ع ۱)

سچے اہلِ ایمان تو وہی لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے وہ ... رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔

• ۔ اقامتِ صلوٰۃ ، کفر و شرک اور اللہ کے مقابلہ میں بغاوت سے "سچی توبہ" کا ...

فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ (التوبہ ع ۲)

پس اگر یہ (کفار و مشرکین) توبہ کر لیں ... کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔

• ۔ خانۂ خدا کی آبادی اور تعمیرِ مساجد انہیں لوگوں کا کام ہے جو شرک سے بیزار اور توحید کے علمبردار ہوں اور نماز قائم کرتے ہوں۔

إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللَّهَ ۔ (التوبہ ع ۳)

اللہ کی مسجدوں کو تو وہی آباد کرتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھیں اور اللہ کے سوا کسی سے خوف نہ کھائیں۔

• ۔ جو لوگ ناگواری اور بے دلی سے اللہ کے راستہ میں مال دیں اور نماز میں سستی کرتے ہیں ان کا صدقہ و خیرات قبول نہیں۔

وَمَا مَنَعَهُمْ أَن تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَاتُهُمْ إِلَّا أَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَبِرَسُولِهِ وَلَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالَىٰ وَلَا يُنفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَارِهُونَ (التوبہ ع ۷)

ان کے دیئے ہوئے مال قبول نہ ہونے کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انھوں نے اللہ اور رسول کے ساتھ کفر کیا ہے نماز کے لئے آتے ہیں تو کسمساتے ہوئے آتے ہیں اور راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں تو بادلِ ناخواستہ خرچ کرتے ہیں۔

• ۔ وہ تمام مومن مرد اور عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں جو اللہ و رسول کے اطاعت گذار اور پابندِ نماز ہوں۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ

مومن مرد اور مومن عورتیں یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں نماز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے

اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ ط (التوبہ ع ۹) رسول ؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔

•۔ ایمان والوں کی لازمی صفات، نماز اور حدود اللہ کی نگہداشت

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاھُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰہِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (التوبہ ع ۱۴)

اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے اس کی بندگی بجالانے والے اس کی تعریف کے گن گانے والے اس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے اس کے آگے رکوع اور سجدے کرنے والے نیکی کا حکم کرنے والے اور بدی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے (اے نبی اس شان کے) مومنین کو خوشخبری دیدو!

•۔ اگر کسی دور میں امت مسلمہ کا شیرازہ بکھر چکا ہو اور اس کی دینی روح پر موت طاری ہو چکی ہو تو اس کا علاج بھی اقامت صلوٰۃ ہے۔

غالباً مصر میں حکومت کے تشدد اور خود بنی اسرائیل کے اپنے ضعف ایمانی کی وجہ سے اسرائیلی اور مصری مسلمانوں کے ہاں نماز با جماعت کا نظم ختم ہو چکا تھا۔ اور یہ ان کے شیرازہ کے بکھرنے اور ان کی دینی روح پر موت طاری ہو جانے کا ایک بہت بڑا سبب تھا اس لئے حضرت موسیٰ کو حکم دیا گیا کہ اس نظام کو از سر نو قائم کریں اور مصر میں چند مکان اس غرض کے لئے تعمیر یا تجویز کر لیں کہ وہاں اجتماعی نماز ادا کی جائے کیوں کہ ایک بگڑی ہوئی اور بکھری ہوئی مسلمان قوم میں دینی روح کو پھر سے زندہ کرنے اور اس کی طاقت کو از سر نو مجتمع کرنے کے لئے اسلامی طرز پر جو کوشش بھی کی جائے گی اس کا پہلا قدم لازماً یہی ہوگا کہ اس میں نماز با جماعت کا نظام قائم کیا جائے (تفہیم القرآن)

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی وَاَخِیْہِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِکُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُیُوْتَکُمْ قِبْلَۃً وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ یونس ع ۹)

اور ہم نے موسیٰ ؑ اور اس کے بھائی کو وحی کی کہ مصر میں چند مکان اپنی قوم کے لئے مہیا کرو اور اپنے ان مکانوں کو قبلہ ٹھیرالو! اور نماز قائم کرو اور اہل ایمان کو بشارت دیدو!

بشارت دیدو، یعنی اہل ایمان پر مایوسی، مرعوبیت اور پژمردگی کی جو کیفیت اس وقت چھائی ہوئی ہے اسے دور کردو انہیں پُر امید بناؤ، ان کی ہمت بندھاؤ اور ان کا حوصلہ بڑھاؤ!

•۔ نماز، دینداری کا پہلا اور نمایاں مظہر ہے اور اس کے تقاضے فکر و عمل کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہیں

حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم سے کہا! اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں۔ ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو! مجھے ڈر ہے کہ کل تم پر ایسا دن آئے گا جس کا عذاب سب کو گھیرلے گا اے برادران قوم! ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ پورا ناپو اور پورا تولو!۔

اور لوگوں کو گھاٹا نہ دیا کرو! ——— اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو!

قوم نے جواب دیا۔

یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (ھود ع ۸)

اے شعیب کیا تجھے تیری نماز یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے یا یہ کہ ہم اپنے مال میں تصرف بھی اپنی منشا سے نہ کر سکیں۔

• نیک بننے اور بنانے کا بہترین ذریعہ نماز ہے یہ تمہارے اندر وہ اوصاف پیدا کرے گی جن کے ذریعہ تم سوسائٹی کی تعمیر برائیوں کے بجائے بھلائیوں پر کر سکو گے۔

وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ ۚ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ۚ (هود ۱۰۶)

اور نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گذرنے پر۔ درحقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔

• عقلمند اور دانشور وہی ہیں جو قرآن کی نصیحت قبول کریں اور نماز قائم کرنے اور برائیوں کو بھلائیوں کے ذریعہ دفع کرنے کا طریقہ اختیار کریں۔

قرآن کہتا ہے کہ نصیحت تو دانشمند لوگ ہی قبول کیا کرتے ہیں اور ان کا طرز عمل یہ ہوتا ہے۔ کہ

(۱) اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو توڑتے نہیں وفاء عہد ان کا شیوہ ہوتا ہے وہ نقض عہد کرتے ہی نہیں۔

(۲) اللہ نے جن روابط کو قائم کرنے کا حکم دیا ہے انہیں برقرار رکھتے ہیں۔

(۳) وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور انہیں آخرت میں حساب کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔

(۴) رضا رب کی خاطر ہر طرح کی آزمائشوں میں صبر و استقامت اختیار کرتے ہیں۔

(۵) نماز قائم کرتے ہیں۔

(۶) اللہ کے دیئے ہوئے رزق میں سے اس کی راہ میں علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں۔

(۷) برائیوں کو بھلائیوں سے دفع کرتے ہیں۔

وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (الرعد ع ۳)

نماز قائم کرتے ہیں ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ آخرت کا گھر انہیں لوگوں کے واسطے ہے

• آخرت میں نجات نہ تو خریدی جاسکے گی اور نہ کسی کی سفارش اور دوستی نجات دلا سکے گی لہٰذا نماز اور انفاق کے ذریعہ نجات کا استحقاق پیدا کرو!

قُل لِّعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا يُقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خِلَالٌ ۝ (ابراھیم ع ۵)

میرے جو بندے ایمان لائے ہیں ان سے کہدو! کہ نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کھلے اور چھپے (راہ خدا میں) خرچ کریں۔ اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ کسی کی دوستی کام آسکے گی۔

• اہل ایمان اگر کوئی بستی بسائیں یا کوئی ملک آباد کریں تو اس سے ان کی غرض اقامت دین ہونی چاہئیے جس کی پہلی سیڑھی اقامت صلوٰۃ ہے۔

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ (ابراھیم ع ۶)

اے ہمارے رب! میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصہ کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار! یہ اس لئے کہ لوگ یہاں نماز قائم کریں۔

• ۔ مؤمن کی قلبی آرزو اور دلی تمنا ہوتی ہے جس کے لئے وہ اپنے رب سے منہ بھر بھر کر اور دامن پھیلا پھیلا کر دعائیں بھی کرتا ہے کہ وہ خود اور اس کی اولاد نماز قائم کرنے والے ہیں۔

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ط رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ۝
(ابراہیم ع ۶)

اے میرے رب! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد سے بھی (ایسے لوگ اٹھا جو یہ کام کریں) پروردگار میری دعا قبول فرما!

• ۔ پنجوقتہ نماز کی طرف اشارہ اور نماز فجر میں تلاوت قرآن کی اہمیت۔

پنجوقتہ نماز جو معراج کے موقع پر فرض کی گئی تھی اس کی تنظیم کی طرف قرآن نے جا بجا اشارے کئے ہیں اور ابوداؤد و ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو بار حضرت جبرئیل ؑ نے نماز کے اوقات کی تعلیم دی اور اسی پر ہمیشہ سے پوری امت کا عمل ہے۔

سورۂ ھود رکوع ۱۰ میں فجر، مغرب اور عشاء کی طرف اشارہ ہے سورۂ طٰہٰ کے رکوع ۸ میں پانچوں نمازوں کی طرف صاف اشارے ہیں۔ اور سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیت مجموعی طور پر پانچوں نمازوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور قرآن مجید کی طرف خصوصیت سے متوجہ کر رہی ہے۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ط اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْھُوْدًا
(بنی اسرائیل ع ۹)

نماز قائم کرو زوال آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو، کیونکہ قرآن فجر (خصوصیت سے) مشہود ہوتا ہے۔ (یعنی فرشتے اس کے گواہ بنتے ہیں)

• ۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام جیسے بندۂ خدا کو کتاب الٰہی سے نوازا گیا نبوت عطا فرمائی گئی مبارک قرار دیا گیا اور ان نعمتوں کے تقاضے کے طور پر تا حیات دنیوی نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا گیا۔

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ ط اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۝ وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا ۝
(سورۂ مریم)

(حضرت عیسٰیؑ نے) کہا میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھ کو کتاب دی ہے اور مجھ کو نبی بنایا ہے اور مجھ کو مبارک قرار دیا ہے جہاں کہیں میں ہوں اور مجھ کو تا زندگی نماز اور زکوٰۃ کا تاکیدی حکم فرمایا ہے۔

• ۔ اللہ کے پسندیدہ اور مقبول رسول اور نبی حضرت اسمٰعیلؑ نماز اور زکوٰۃ کا حکم فرماتے تھے۔

وَکَانَ یَاْمُرُ اَھْلَہٗ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ ص وَکَانَ عِنْدَ رَبِّہٖ مَرْضِیًّا ۔ (سورۂ مریم ع ۴)

اور (حضرت اسمٰعیلؑ) اپنے اہل کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے اور اپنے رب کے ہاں مقبول اور پسندیدہ تھے۔

• ۔ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی امتوں کی گمراہی اور تنزل کے دو موٹے موٹے اسباب، ضیاع صلوٰۃ اور اتباع شہوات ہیں۔

حضرت آدمؑ کی اولاد میں اللہ تعالیٰ نے نبیوں اور ان کے سچے پیروؤں اور دین حق کے علمبرداروں کو نعمتوں سے نوازا تھا انہیں عروج و اقتدار بخشا تھا۔ کشتی نوحؑ میں سوار ہو کر حمد کے ترانے گانے والے خوب پھلے پھولے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد و بنی اسرائیل میں سے حق پرست ہمیشہ اس دنیا میں پھلتے پھولتے رہے کیونکہ وہ اللہ رحمٰن و رحیم کے ہر حکم کے آگے جھک جاتے

کے اور سجدہ ریز ہو کر اس کے سامنے گڑگڑاتے تھے ۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

فَخَلَفَ مِنۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝
(سورۂ مریم ع ۴)

پھر ان کی جگہ ناخلف آئے (جنھوں نے) نماز کو ضائع کر دیا اور من مانیاں کرنے لگے پس آگے دیکھ لیں گے گمراہی کو (گمراہی کا مزہ پالیں گے یعنی دنیا میں تباہی و بربادی اور آخرت میں جہنم سے دوچار ہونا پڑے گا)

۰۔ تنہا اللّٰہ ربّ العزت معبودِ برحق ہے پوری زندگی کے تمام معاملات میں اس کی بندگی اور اطاعت ہونا چاہیئے ۔ اور یہ " اس کی یاد کے لئے نماز قائم کرکے " ہی ممکن ہو سکتا ہے ۔

اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ لا وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ۝ (طٰہٰ) ع ۱

یقیناً میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی سچا معبود نہیں لہٰذا میری ہی بندگی کرو اور میری یاد کو

۰۔ نماز اللہ تعالیٰ کا ایسا تاکیدی حکم ہے جس کا نہ صرف خود ہی پابند ہونا ضروری بلکہ ماتحتوں کو بھی جس کا حکم کرنا لازمی ہے ۔

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۝
(طٰہٰ ع ۸)

اپنے اہل کو نماز کا حکم دو اور خود بھی ...

۰۔ فکر و نظر، علم و عمل اور تہذیب و تمدن کے ہر دور اور ہر موڑ کے واسطے انسانوں کے رہنما انبیاء علیہم السلام جن کی خصوصیات یہ ہیں :۔

(۱) ان کی رہنمائی انسانی کمزوریوں سے پاک ہے کیونکہ وہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرکے خلق خدا کی رہنمائی کرتے ہیں ۔

(۲) وہ ہمیشہ بھلائیوں کی اور صرف بھلائیوں ہی کی تعلیم دیتے ہیں ۔ اُن کی تعلیم پاکبازی کا سرچشمہ ہوتی ہے ۔ اور کسی قسم کے شر و فساد اور باطل کا ان کی تعلیم سے کوئی سروکار نہیں ۔

(۳) وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے میں یعنی حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرنے کے واسطے مامور

(۴) وہ صرف دوسروں ہی کو بندگی رب کی طرف دعوت نہیں دیتے بلکہ عملاً بنفس نفیس خود اللہ تعالیٰ کی عبادت، بندگ طاعت اور اس کی پوجا، پرستش میں سب سے آگے ہوتے ہیں ۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝
(الانبیاء ع ۵)

اور ہم نے ان کو رہنما بنایا جو ہمارے حکم کے تحت رہنمائی کرتے تھے اور ہم نے ان کی طرف بھلائیوں پر عمل کرنے نماز قائم کرنے، اور زکوٰۃ ادا کرنے کے واسطے وحی کی اور وہ ہمارے عبادت گزار بندے تھے ۔

۰۔ جن خوش بختوں نے اپنے کو معبودِ حقیقی کے سپرد کر دیا اُن مخبتین کو خوشنودیٔ رب اور رضا الٰہی کا مژدہ سُنا دو !

مخبتین کون ہیں ؟

(۱) وہ جن کے دل ذکر الٰہی سے لرز اُٹھتے ہیں۔
(۲) وہ جو راہ حق پر سیدھے رہتے ہیں خواہ کیسی ہی سختیوں، اور مصیبتوں سے انہیں دوچار ہونا پڑے اور کیسے ہی ظلم و ستم کے پہاڑ ان پر توڑے جائیں۔
(۳) وہ جو نماز قائم کرتے ہیں۔
(۴) اور وہ جو اللہ کے دیئے ہوئے رزق اور اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی میں سے راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں،

فَإِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ أَسْلِمُوْا ط وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ۞ الَّذِيْنَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ أَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۔
(الحج ع ۵)

پس تمہارا معبود تو ایک ہی معبود ہے پس تم اسی کے تابع فرمان ہو جاؤ (اور اپنے کو اس کے احکام کے حوالہ کردو) اور عاجزی کرنے والوں کو خوشخبری سنادو! ایسے لوگ کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل خوف خدا سے لبریز ہو جائیں اور جو راہ حق کی ہر مصیبت کو جھیلنے والے ہیں نماز قائم کرنے والے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اسے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں

اقامتِ دین کے واسطے تن من دھن کھپانے والوں اور اعلاء کلمۃ اللہ کے واسطے سر سے کفن باندھنے والوں کی ——— اللہ تعالیٰ مدد فرماتا ہے۔

جب اللہ ان کی جدوجہد اور جانی و مالی قربانیوں اور اپنی نصرت و یاوری کے نتیجہ میں ان کو اقتدار عطا فرماتا ہے تو یہ سرفروش :-

(۱) نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کرتے ہیں۔
(۲) تمام بھلائیوں اور معروفات کو رواج دیتے ہیں اور قانوناً انہیں نافذ کرتے ہیں۔
(۳) وہ اقتدار کی طاقت اور حکومت کے ذرائع و وسائل سے کام لے کر تمام منکرات کا استیصال کرتے ہیں۔

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ط إِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۞ اَلَّذِيْنَ إِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَأَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ط
(الحج ع ۶)

اور اللہ تعالیٰ اس کی ضرور مدد فرمائے گا جو اس کی مدد کرے گا (اقامتِ دین کی جدوجہد کرے گا) اللہ تعالیٰ یقیناً قوت و غلبے والا ہے (اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی مدد فرمائے گا) جن کو اگر ہم زمین میں اقتدار عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور معروف کا حکم کریں اور منکرات سے باز رکھیں۔

• - مومنین سے ان کے ایمان و اسلام کا ہمیشہ سے یہ تقاضہ ہے کہ وہ شہادت کا فریضہ انجام دیں۔

لیکن

اس فریضہ کی ادائیگی کے واسطے چند شرائط کا پورا کرنا ضروری ہے۔

(۱) اقامتِ صلوٰۃ ———
(۲) ایتاءِ زکوٰۃ ———

(۳) اعتصام باللہ یعنی اس کے دین کو مضبوطی سے تھام لیں۔

(۴) اور اسی کو اپنا مالک و مولیٰ۔ حاکم و آقا تسلیم کرکے اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کی تعمیر کریں۔

اگر ان شرطوں کو پورا کروگے تو شہادت حق کا فریضہ انجام دے سکوگے اور اللہ تعالیٰ کی نصرت تمہارے شامل حال ہوگی۔ هُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۵ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا (اس نے (حضرت ابراہیمؑ نے) تمہارا نام مسلمان رکھا) لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا (اس سے پہلے اور اس (قرآن) میں (بھی تمہارا نام یہی ہے) شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ ج فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ تاکہ رسول تمہارے اوپر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو) وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ ط هُوَ مَوْلٰکُمْ ج (پس نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ) فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ۵ (الحج ع ۱۰) (اس کے دین) کو مضبوط تھام لو کہ وہی تمہارا مولیٰ ہے پس کیا ہی خوب آقا اور کیا ہی خوب مددگار)

• جن صفات کے حامل مومنین فلاح یاب اور جنت الفردوس کے وارث ہونگے ان

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۵ یقیناً فلاح یاب ہوئے ایمان والے

کون ایمان والے ؟

۱۔ وہ جو اپنی نمازوں میں خشوع و خضوع اختیار کرنے والے ہیں۔

۲۔ وہ جو لغو اور بے کار کاموں اور باتوں سے اعراض کرنے والے ہیں۔

۳۔ وہ جو زکوٰۃ کا عمل جاری رکھنے والے ہیں۔

۴۔ وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ یعنی پاکدامن مومنین اور مومنات۔

۵۔ وہ جو امانت دار ہیں۔

۶۔ وہ جو عہدوں کو پورا کرنے والے ہیں۔

۷۔ وہ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اُولٰٓئِکَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۵ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (المومنون ع ۱)

یہی ہیں وہ جو میراث پانے والے ہیں، جو جنت الفردوس کے وارث ہونگے اور اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

جن اللہ کے بندوں کو دنیا کا کوئی کاروبار اور مشغلہ یاد الٰہی اور اقامت صلوٰۃ سے غافل نہیں کرتا وہ اس دن سے لرزتے اور کپکپاتے رہتے ہیں جس دن نہ دل قابو میں ہونگے اور نہ آنکھیں۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوۃِ ص یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۵ (النور ع ۵)

وہ مرد جن کو تجارۃ اور بیع یاد الٰہی اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی، وہ ڈرتے رہتے ہیں اس دن سے جس میں دل اور نگاہیں الٹ پلٹ ہو رہی ہونگی۔

• اگر مالک کی رحمتوں سے مالا مال ہونا چاہتے ہو، اس کی نوازشوں سے گودیں بھرنا چاہتے ہو اور باران رحمت کے اگر طلب گار ہو، تو نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو!

مگر خبردار ۔۔۔ خبردار ۔۔۔ من مانے طریقوں سے نہیں

بلکہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے سے۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو!

وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝ (النور ۶۷)

اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو تاکہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

• اللہ رحمٰن و رحیم کے چہیتے بندے اس کے حضور کھڑے ہو کر اور سجدہ ریز ہو کر راتیں آنکھوں میں کاٹ دیتے ہیں

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِينَ ---------- اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں۔

۱۔ جو زمین میں بندگی کی روش اختیار کرتے ہیں۔

۲۔ جو جاہلوں کی جہالت سے۔ شریفانہ پہلو تہی اختیار کرتے ہیں اور سلام کہہ کر گذر جاتے ہیں۔

۳۔ جو اپنے رب کے لئے سجود و قیام میں راتیں گذار دیتے ہیں۔

۴۔ جو عذاب جہنم سے خدا کی پناہ مانگتے رہتے ہیں۔

۵۔ جو بخل و اسراف کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

۶۔ جو اللہ کے علاوہ کسی باطل معبود کو نہیں پکارتے۔

۷۔ جو کسی کو ناحق قتل نہیں کرتے۔

۸۔ اور جو زنا نہیں کرتے۔ بدکاری اور فحش سے جنہیں کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔ (الفرقان ۶۴)

• قرآن ہدایت اور بشارت ہے۔ وہ دنیا میں فکر و عمل اور زندگی کے تمام گوشوں میں رہنمائی کرتا ہے اور آخرت میں کامیابی و کامرانی کا مژدہ سناتا ہے۔ لیکن یہ ہدایت و رہنمائی ان اہل ایمان کے واسطے ہے۔ جو نماز قائم کرتے ہیں ______ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں ______ اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

هُدًى وَبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۝

ہدایت اور خوش خبری ان ایمان والوں کے واسطے ہے، جو نماز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

• ذکر الٰہی عبادت کی روح اور بندگیٔ رب کی جان ہے اور اس کا بہترین ذریعہ نماز ہے جس کا قائم کرنا کتاب اللہ پر ایمان اور اس کی تلاوت کا اولین تقاضہ ہے۔

اور جو لوگ یہ تقاضا پورا کریں گے وہ ہر قسم کے فواحش اور منکرات سے محفوظ رہیں گے کیوں کہ نماز فواحش اور منکرات سے باز رکھتی ہے بشرطیکہ نماز، نماز ہو۔

اُتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ۗ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ ۗ (العنکبوت ۵۶)

تلاوت کرو کتاب کی جو تمہاری طرف وحی کی گئی ہے اور نماز قائم کرو یقیناً نماز بے حیائیوں اور برائی سے باز رکھتی ہے اور اللہ کا ذکر عظیم تر ہے۔

• مشرکین کے زمرہ میں ہرگز شامل نہ ہو اور اللہ کے دین کو پوری یکسوئی کے ساتھ مضبوط تھام لو اور نماز قائم کرو۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۗ (الروم ۴۶) مُنِيبِينَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُونُوا

اور قائم رکھو اپنے چہرہ کو دین کے واسطے یکسو ہو کر سب رجوع ہو کر اس کی طرف اس کا تقویٰ اختیار کرو

مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (الروم ع ۴) اور نماز قائم کرو! اور مشرکین میں سے مت ہو جاؤ!

•۔ کتاب الٰہی ہدایت و رحمت ہے محسنین کیواسطے اور محسنین وہ ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں۔

هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ (لقمان ع ۱)

ہدایت و رحمت ہے محسنین کے واسطے جو نماز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

•۔ اللہ کا ایک سچا مومن بندہ اپنی عزیز اولاد کو پیار بھرے لہجے میں اور شفقت بھرے انداز میں اقامتِ صلوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور صبر کی تلقین کرتا ہے۔

وہ خود دین حق کے علمبردار ہونے کے ساتھ ساتھ چاہتا ہے کہ میری اولاد بھی میرے بعد یہ کام جاری رکھے عملی تربیت کی فکر کرتا ہے اور زندگی کے نصب العین اور طریق کار ہر ایک کی جانب اولاد کو متوجہ کرتا ہے۔

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ۝ (لقمان ع ۲)

اے میرے پیارے بیٹے نماز قائم کر معروف کا حکم دے اور برائی سے باز رکھ (اور اس سلسلہ میں جو مصیبت پہنچے) اس پر صبر کر!

•۔ مرد ہی نہیں خواتین بھی اللہ اور رسول کی اطاعت گذار بن کر رہیں اور نماز قائم کریں۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ ۔۔۔۔۔۔ اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم تقویٰ شعار بن کر رہو۔

لہٰذا!

۱) آواز میں لوچ نہ پیدا کرو کہ بیمار دل آدمی کوئی بری توقع قائم کرنے لگے۔
۲) اور بھلی بات کہو۔
۳) اور اپنے گھروں میں سکونت پذیر رہو (کہ تم چراغ خانہ ہو نہ کہ شمع انجمن)
۴) اور زمانہ جاہلیت کی طرح اپنا حسن و جمال اور بناؤ سنگار اور اپنی نسائیت دکھلاتی نہ پھرو۔
۵) وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور نماز قائم کرو۔
۶) وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور زکوٰۃ ادا کرو۔
۷) وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (الاحزاب ع ۴) اور اللہ و رسول کی اطاعت گذار رہو۔

•۔ کتابُ اللہ کی شعوری تلاوت کے نتیجہ میں جو لوگ نماز قائم کرتے ہیں اور کھلے اور چھپے پوشیدہ و علانیہ ہر طرح انفاق فی سبیل اللہ کرتے ہیں وہ درحقیقت ایک بیوپار کرتے ہیں جس میں کبھی گھاٹا اور نہ ہو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ۝ (الفاطر ع ۴)

بیشک وہ لوگ جو کتابُ اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں (یہ) امید رکھتے ہیں ایسے بیوپار کی جس میں گھاٹا نہ ہو۔

اور فرمایا

وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ (شوریٰ ۴۶)

اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے بہتر ہے اور قائم رہنے والا ہے ایمان والوں کے واسطے اور ان کے لئے :-

۱۔ جو اپنے رب پر توکل کرنے والے ہیں۔
۲۔ جو نظر و فکر اور عمل کے کم از کم بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہتے ہیں ۔
۳۔ جو شہوت کی بے راہ روئیوں اور بے حیائیوں سے محفوظ رہتے ہیں ۔
۴۔ جو غیظ و غضب کے باوجود اپنے پر قابو پاکر عفو و درگذر سے کام لیتے ہیں ۔
۵۔ جو اپنے رب کی علمبرداری کے واسطے ہر وقت تیار رہتے ہیں ۔
۶۔ اور جو نماز قائم کرتے ہیں ۔
۷۔ اور جو اپنے تمام اہم معاملات مشورے سے طے کرتے ہیں ۔
۸۔ جو انفاق فی سبیل اللہ کرتے ہیں۔
۹۔ اور جو خدا کے باغیوں اور سرکشوں سے مل جل کر مقابلہ کرتے ہیں ۔

اللہ کے پاس نعمتیں اور نوازشوں کا سامان سب انہیں کے واسطے ہے ۔

۰۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم "شاہد حق" بناکر مبعوث فرمائے گئے تاکہ لوگ صبح و شام خدا کو یاد کریں

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ ؕ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ (الفتح)

بیشک ہم نے تم کو شہادت دینے والا خوشخبری اور ڈرانے سنانے والا بناکر بھیجا تاکہ تم لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ ! اس کی مدد کرو ! اس کی عظمت ملحوظ رکھو اور صبح و شام اس کی پاکی بیان کرو !

۰۔ دشمنان دین کی ایذا رسانیوں کو سہنے کی طاقت داعیان حق ذکر الٰہی اور نماز کے ذریعہ پیدا کریں

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ۝ (ق ۳۶)

جو کچھ وہ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور طلوع سے آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب کے بعد اپنے رب کی پاکی اور تعریف بیان کرو اور رات کو اور سجدوں کے بعد بھی اس کی پاکی بیان کرو !

۰۔ راتوں میں خدا کے حضور کھڑے ہونے والے استغفار کرنے والے متقین اور محسنین کے واسطے چشموں والی جنتیں ہیں ۔

متقی کون ہیں

(۱) جو احکام و ہدایات ربانی کو مضبوطی سے تھامنے والے ہیں ۔
(۲) جو دنیا میں دین کی پیروی اور اس کی علمبرداری کے لئے ہیں احسان کی روش اختیار کرنے والے ہیں ۔
(۳) جو راتوں کو اللہ کے حضور کھڑے رہنے کی وجہ سے کم سونے والے ہیں۔

۱) جو سحر کے اوقات میں اٹھ اٹھ کر اپنے مولیٰ کے سامنے گڑگڑانے اور استغفار کرنے والے ہیں۔
۲) جن کے مال و دولت اور کمائی میں سے سوال کرنے والوں ضرورت مندوں کا حصہ ہوتا ہے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۙ اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ۭ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۔ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۔ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ
(الذاریٰت)

متقی یقیناً جنتوں اور چشموں میں ہونگے۔ ان کے رب کی جانب سے جو کچھ آیا ہے اسے لینے والے ہیں وہ اس سے پہلے دنیا میں محسنین تھے رات کو کم سوتے تھے اور سحروں کو استغفار کرتے تھے اور ان کے مالوں میں سوال کرنے والوں اور محروم کا حق ہے۔

۔ احکام ربانی کی پیروی اور اقامت دین کی جدوجہد میں استقامت کا ذریعہ تسبیح و تحمید آہ سحر گاہی ہے اور داعیان حق کی حفاظت خدا خود کرتا ہے۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۙ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ۔
(مانند پڑنے پر)

پس صبر کرو اپنے رب کے حکم کے واسطے پر ... کے سامنے ہو اور اپنے رب کی حمد کے سا... کے کھڑے ہو اور رات میں بھی اس کی تسبیح ...

۔ تزکیہ نفس کے مستقل اور ٹھوس ذرائع نماز اور زکوٰۃ جیسے فرائض ہیں۔ ان احکام کی اطاعت میں ہمہ تن غرق رہو۔

لیکن دھیان رہے کہ اللہ ہر جگہ حاضر اور ہر آن ناظر ہے آپ سے کوئی اچھا عمل اور برا کرتوت پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔

فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۔ (المجادلہ ۲۶)

پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو! اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے

۔ معاملات دنیا اور کاروبار حیات انسان کو خدا سے غافل کرنے والے ہیں۔ نماز انسان کو کاروباری ہماہمی کی غفلت سے چونکانے اور ذکر الٰہی کا بار بار موقعہ فراہم کرتی ہے۔
تاکہ انسان خدا کی بندگی سے غافل ہو کر بندوں کو اپنا بندہ بنانے یا بندوں کا بندہ بننے سے محفوظ رہے۔ یا دنیا کا بندہ بن کر اپنی آخرت خراب اور آخرت خراب نہ کرلے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔
(الجمعہ ۲۶)

اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز کے لئے پکار دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف لپکو! اور خرید و فروخت چھوڑ دو! تمہارے لئے یہی بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو (یعنی تمہیں سوجھ بوجھ سے کام لے کر اس کو بہتر سمجھنا چاہیئے!

۔ انسان اگر اپنی کمزوریوں پر فتح پانا چاہتا ہے تو اسے نمازی بننا چاہیئے۔
انسان کمزور اور تھڑدلا ہے، لیکن اگر وہ نمازی بن جائے تو عزم و ہمت کا بلند پہاڑ بن سکتا ہے۔ مگر نمازی کون ہیں اور کیسے؟ ہوتے ہیں؟

نمازی وہ ہیں:۔

(۱) جو نماز کے پابند ہیں اور نماز میں خدا ہی کی طرف ہمہ وقت متوجہ رہتے ہیں۔
(۲) جن کے مال و دولت اور کمائی میں سوال کرنے والوں اور محروم رہنے والوں کے واسطے متعین حصہ ہوتا ہے۔
(۳) جو اپنے دل، زبان اور اپنی زندگی سے آخرت کی تصدیق کرتے ہیں۔
(۴) جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں جن کی زندگی خدا سے ترساں اور لرزاں انسان کی زندگی ہوتی ہے۔
(۵) جو پاکدامن اور باعصمت ہوتے ہیں اور اپنی قضاء شہوت کے لئے اللہ کی حدود سے باہر راہیں تلاش نہیں کرتے۔
(۶) جو امانت دار ہوتے ہیں بات کے سچے اور دھن کے پکے ہوتے ہیں وہ عہد شکن نہیں ہوتے اور ایفاء عہد ان کا شیوہ ہوتا ہے۔
(۷) جو شہادت اور سچی گواہی پر قائم رہتے ہیں کسی لالچ یا خوف کی بنا پر وہ شہادت دینے سے بچل نہیں جاتے۔
(۸) جو اپنی نمازوں کے محافظ ہوتے ہیں، ان کے آداب و شرائط اور جماعت کے اہتمام سے لے کر اس کی اور مقصد تک سب کی حفاظت کرتے ہیں۔

أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُّكْرَمُونَ ۝ (المعارج ع ۱) یہی لوگ ہیں جو جنتوں میں باعزت ہونگے۔

• اقامت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کی بھاری ذمہ داری جنھوں نے اٹھا رکھی ہے انہیں تہجد گزار بلکہ قائم اللیل بننا چاہیئے۔

کیونکہ نفس کو کچلنے اور نفسانی کمزوریوں پر فتح پانے کا اکسیر صفت نسخہ رات میں خدا کے حضور حاضر ہو کر اس کے سامنے سجدہ ریزی سے بڑھ کر دوسری کوئی چیز نہیں۔

قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ نِّصْفَهُ أَوِ انقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۝ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۝ إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ۝ إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا وَأَقْوَمُ قِيلًا ۝ (المزمل ع ۱)

رات کو کھڑے رہو مگر تھوڑا، آدھی رات یا اس سے کچھ کم، یا اس سے کچھ زیادہ کر دو، اور قرآن ٹھیر ٹھیر کر پڑھو، ہم تمہارے اوپر بھاری بات (ذمہ داری) ڈالیں گے، یقیناً رات کا اٹھنا (نفس کو) اچھی طرح روندتا ہے (یعنی تزکیہ نفس کرتا ہے) اور بات کو ٹھیک بٹھاتا ہے۔

• بے نمازی بنا رہنا اور نمازیوں میں شامل نہ ہونا آدمی کو دوزخ میں لیجائے گا۔

چنانچہ اہل جنت اہل دوزخ سے سوال کریں گے۔

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ؟ — تمہیں دوزخ میں کیا چیز لے گئی ؟

وہ جواب میں کہیں گے!

لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ — ہم نمازیوں میں شامل نہ تھے۔
وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝ (المدثر ع ۲) — اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔

• قرآن کی پیروی اور اقامت دین کے واسطے اقامت صلوٰۃ اور تہجد گذاری ضروری ہے۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنزِيلًا ۝ فَاصْبِرْ — یقیناً ہم نے تم پر قرآن رفتہ رفتہ اتارا۔ پس تم جانفشانی

لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا ۝ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا ۝ (الدھر ۲۶)

رب کے حکم پر اور ان میں سے کسی گنہگار یا ناشکرے کا کہنا مت مانو، اور صبح و شام اپنے رب کا نام لو (نماز پڑھو) اور رات میں اس کے لئے سجدہ ریز ہو جاؤ اور طویل رات میں اس کی تسبیح کرو!

•- جس نے ذکر الٰہی اور نماز کے ذریعہ اپنا تزکیہ کر لیا وہ کامیاب بامراد اور فلاح یاب ہوا۔

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ

یقیناً فلاح پائی اس نے جس نے تزکیہ نفس کر لیا اور اپنے رب کو یاد کیا، پس نماز پڑھی۔

•- اطاعت میں خلوص عبادت میں یکسوئی اور اقامت صلوٰۃ و ایتاء زکوٰۃ دین قیمہ کے بنیادی پتھر ہیں۔

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ ۝ (البینۃ ۹)

اور ان کو صرف اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کریں۔ اطاعت کو اس کے لئے خالص کر کے یکسو ہو کر اور نماز قائم کریں۔ اور زکوٰۃ ادا کریں یہ ہے ثابت قدم رہنے والوں کا دین،

•- نماز پڑھنا اور قرآن پر عمل نہ کرنا دکھاوا ہے اور دکھاوے کی نماز پڑھنا غفلت ہے اور نماز سے غفلت تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہے۔

فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۝ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ۝ (الماعون)

پس تباہی و بربادی ہے ان نمازیوں کے واسطے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں جو دکھلاوا کرتے ہیں جو استعمال کی چیزیں دینے سے انکار کرتے ہیں۔

•- اللہ تعالیٰ نے دین اور قرآن کی شکل میں انسان کو خیر کثیر اور ایک بیش بہا خزانہ سے نوازا ہے لیکن اس عظیم ترین احسان کا شکر نماز اور قربانی کے بغیر ادا نہیں ہو سکتا۔

إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ

ہم نے تم کو خیر کثیر سے نوازا ہے پس اپنے رب کے واسطے نماز اور قربانی کرو!

دین اور قرآن کی نعمت کا شکر نماز اور قربانی کے بغیر ادا نہیں ہو سکتا اور اللہ کی اس نعمت کے تقاضے پیروی دین اور علمبرداری دین بھی نماز کے ذریعہ تزکیہ کئے بغیر اور جان و مال کی قربانیاں دیئے بغیر پورے کرنا ناممکن ہے۔

[ا]بو علی (اعظم گڑھ)

ذاتی ڈائری کا ایک ورق

قدیم نصاب تعلیم درس نظامیہ کے خلاف ندوہ کے اساتذہ نے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں جو فضا پیدا کردی تھی اس سے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے جب مولانا عبدالرحمن نگرامیؒ فاضل ندوہ بلکہ چشم و چراغ ندوہ کا فیض صحبت حاصل ہوا، اور موجودہ عہد میں اس کے غیر مفید ہونے کے دلائل ان کی زبان فیض ترجمان سے سنے تو آخر میں، میں بھی اس کا شدت سے مخالف ہوگیا، یہاں تک کہ اس کے بعد سے قدیم علمائے سے اگر کبھی میرا سابقہ پڑتا تھا تو ان کے سامنے قدیم نصاب کا مضحکہ اڑانے میں مجھے ذرا بھی باک نہ ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ درس نظامیہ کے ایک فارغ التحصیل اور اس کے پرجوش حامی مولوی عبدالاحد صاحب دیکھنے از بانیان مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، مدرسہ میں آئے اور پھرتے پھراتے مولانا نگرامی کے حجرے تک پہنچ گئے۔ مولانا نے دیکھا تو ان کا پرجوش خیر مقدم کیا اور حجرے میں عزت و اجلال کے ساتھ بٹھایا۔ اثنائے گفتگو میں جدید نصاب کا مسئلہ بھی آگیا جس کے مولانا نگرامی پرجوش نقیب تھے، مولوی عبدالاحد صاحب بھی دوسرے فضلائے درس نظامیہ کی طرح اس سے باہر کی کتابوں سے کچھ زیادہ واقفیت نہیں رکھتے تھے، مولانا نگرامی نے علامہ ابن تیمیہ علامہ ابن قیم، علامہ ابن حزم، حکیم ابن رشد اور اسی ذیل کے اور بہت سے اکابر ائمہ علوم کی کتابوں کا نام لے کے بعد دیگرے لینا شروع کیا تو ان پر حیرت طاری ہوگئی اور کہا کہ میں نے ان کو ابتک نہیں پڑھا ہے یہ کہنا تھا کہ پورا کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔ اور وہ بے چارے خفیف ہوکر اٹھ گئے اس کے بعد سے میرا یہ حال ہوا، کہ میرے سامنے جو کوئی قدیم نصاب اور قدیم طرز کے مدرسوں کی حمایت و وکالت کرتا تو میں قابو میں نہ رہتا۔

ایک مرتبہ سرائے میر میں دستر خوان پر بطور ٹیبل ٹاک کے مدرسے کے نصاب تعلیم پر گفتگو شروع ہوگئی۔ شرکائے بزم طعام میں اساتذہ جدید و قدیم کے ساتھ میں بھی شریک تھا۔ مولانا نگرامی نے فرمایا کہ فارسی کے نصاب میں اگر سعدی کی گلستاںؔ[1] و بوستاں کے بجائے مولانا شبلی اور مولانا فراہی کے کلام کے مجموعے جو مختلف ناموں سے چھپے ہیں اور جنکو ہندوستان کے فارسی ادب میں اچھا خاصا مقام حاصل ہے، رکھدیا جائے، تو کیا حرج ہے، اس وقت مجھ پر شدید جدت پسندی غالب تھی، میں اساتذہ اور دوسرے بزرگوں کی موجودگی میں اس کی تائید میں کچھ عرض تو نہیں کرسکا لیکن فاضل محرک کی تجویز کا اس وقت میں سو فیصدی حامی تھا، اور چاہتا تھا کہ فارسی کے نصاب میں جلد سے جلد ترمیم ہو اور صدیوں کی پرانی کتابوں کے بجائے جدید عہد کے فارسی ادبا و شعرا کی کتابیں اور دواوین رکھے جائیں جن میں ہمارے نزدیک مختلف حیثیتوں سے یہ دونوں بزرگ بہت ممتاز تھے خصوصاً مولانا شبلی کی فارسی شاعری کا پایہ تو بہت اونچا تھا، اور ان کے فارسی کلام کے مجموعے [illegible] بوئے گل اور دستہ گل کو بڑی شہرت حاصل تھی، مولانا حمیدالدین فراہی کا مذاق شاعری فارسی میں بہت بلند تھا، یہاں تک کہ ان کے ایک ایک شعر پر مولانا شبلی اپنی شاہکار کتاب شعر العجم قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے ——— لیکن یہ بات اسی مجلس میں ختم ہوگئی اور آگے نہ بڑھ سکی، پھر اس کے بعد کسی کو مدرسہ کے فارسی نصاب میں ترمیم و تبدیلی کا خیال نہیں پیدا ہوا اور پھر یہاں فارسی

---

[1] گلستاں اور بوستاں فارسی شعر و ادب کی بے مثال کتابیں ہیں جن کی تازگی اور شگفتگی کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔ جب بھی انہیں پڑھئیے ایک نئے قسم کی لذت [illegible] ملتی ہے۔ فارسی کی کوئی کتاب گلستاں اور بوستاں کا بدل نہیں ہوسکتی (ماہر القادری)

ان کی تعلیم برائے بیت تھی بھی، انجمن حمایت اسلام لاہور کے فارسی سلسلہ کی دو ایک کتابوں کے بعد گلستاں بوستاں کے ایک آدھ باب خلاقیات سے تعلق رکھتے ہیں پڑھا کر فارسی کی تعلیم ختم کردی جاتی تھی لیکن یہ اثر بہت عارضی ثابت ہوا، اور رفتہ رفتہ پورے قدیم نصاب کا تو نہیں صرف ونحو کی کتابوں کی حد تک تو میں اس کا ضرور حامی ہوگیا۔ اور مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ قدیم نصاب کا ابتدائی حصہ بالکل مکمل ہے اور اس میں کسی صلاح و ترمیم کی ضرورت نہیں ہے، بغیر صرف ونحو کی مروجہ و متداول کتابوں کے پڑھے عبارت کما حقہ سمجھ میں نہیں آسکتی، ان اوراق کی تسوید تک اپنے اسی خیال پر قائم ہوں، ہاں شرح جامی کے بجائے جس کے شور سے قدیم مدرسوں کی فضا ہر وقت گونجتی رہتی ہے، علامہ ابوالقاسم محمود بن لزمخشری صاحب تفسیر کشاف کی الدر المفصل فی حاشیۃ المفصل پڑھی ہے، اس لئے میں فیصلہ نہیں کرسکتا کہ ان دونوں میں کون طلبہ کے زیادہ مفید اور کارآمد ہے، لیکن میں نے جتنی کچھ مفصل پڑھی ہے۔ اس کی بنا پر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ہدایۃ النحو کے بعد اگر اسکو پڑھایا جائے طلبہ میں نحو کی اچھی خاصی استعداد پیدا ہوسکتی ہے، پھر اسکے بعد کسی اور کتاب کے پڑھنے کی قطعی ضرورت باقی نہیں رہے گی لیکن مشکل یہ ہے درس نظامیہ کی باہر کی اور کتابوں کی طرح ہمارے قدیم علماء اس سے بھی واقف نہ ہونگے خیر یہ تو نحو کی کتاب ہے، اور متداول نہ ہونے کی وجہ سے عام بھی ہے، زمخشری کی تفسیر کشاف تک جسکو ایک حد تک شہرت حاصل ہے، لوگ عام طور سے پڑھنا پسند نہیں کرتے۔ اور تفسیر میں بیضاوی کے ے جانا نہیں چاہتے۔

ہمارا مولانا فراہی کی صرف ونحو کی تجدیدات کے ساتھ سرائے میر کے فقہ کے نصاب کو بھی اپنی تمام اہلیتوں اور عدم صلاحیتوں کے باوجود رس ہرگز پسند نہیں کرتا۔ اس میں درس نظامیہ کی فقہ کی تمام امہات کتب کو نکال کر صرف بدایۃ المجتہد رکھدی گئی، اور یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ تنہا اسی ایک کتاب فقہ آجائے گی، اس حسن ظن کو کیا کہا جا سکتا ہے، اس سے نظر میں وسعت، اور اس دور کے تمام فقہی مذاہب، ان کے دلائل و براہین، ہر ایک وجوہ ترجیح، اور ان کی موید حدیثوں سے واقفیت تو بلاشبہ ہوجاتی ہے لیکن طالب علم میں تفقہ مسائل کی تحقیق اور استنباط احکام کا ذوق نہیں ہوتا اور وہ جہاں کا تہاں رہ جاتا ہے یعنی وہ حنفی کا حنفی رہ جاتا ہے، مالکی، حنبلی، شافعی، ظاہری اور اہلحدیث وغیرہ ہونے کسی طالب علم سے آج تک نہیں سنا، خود مولانا حمیدالدین بھی جو اس کتاب کے بیحد قدردان تھے اور جن کے ایماء سے یہ کتاب نصاب میں رکھی اور پڑھائی جاتی ہے، غالی حنفی تھے، (امام بخاری بلکہ ان کی الجامع الصحیح پر بسا اوقات تنقید بھی کرتے تھے) اور یہ اثر وہاں کے بعض طلبہ میں بھی آگیا تھا

بدایۃ المجتہد کے فقہ کی اچھی کتاب ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، لیکن فقہ کی کوئی درسی کتاب نہیں ہے، اور نہ اس نقطۂ نظر سے غالباً لکھی گئی ہے۔ زیادہ سے زیادہ فقہ کی دوسری امدادی کتابوں کے ساتھ اس کو اونچے درجہ کے طلبہ کے مطالعہ میں البتہ رکھا جاسکتا ہے، اور اس کا جو مصنف ہے وہ فقیہ سے زیادہ فلسفی تھا اور اس حیثیت سے وہ اسپین میں جہاں کے ایک شہر قرطبہ کا وہ رہنے والا تھا بادشاہ کے یہاں مشہور رہا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اپنی جامعیت کی وجہ سے موحدین کے دور حکومت میں اندلس کا قاضی القضاۃ ہوگیا تھا لیکن وہ حقیقت فلسفی ہی تھا، اور یہی حیثیت شروع ہی سے آخر تک اس پر غالب تھی، مسلمانوں میں فلسفہ ارسطو کے شیوع کا وہی بانی ہے، اگرچہ آج اسکی فلسفیانہ تصنیفات ناپید ہیں۔

لیکن یورپ میں ایک مدت تک اس کی تصنیفات تمام بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں داخل درس رہیں اور اسی کے نظریات اور فلسفیانہ افکار مقبول تھے، اب بھی اس کا شمار فقہا و مجتہدین میں نہیں، حکماء و فلاسفہ کے زمرہ میں ہوتا ہے، اس کا تعارف سب سے پہلے اردو میں علیم نواب عماد الملک بلگرامی نے کرایا، پھر مولانا شبلی نے اس پر الندوہ میں بہت مفصل مضمون لکھا جو ان کے تاریخی مقالات کی تراجم والی جلد میں شامل ہے ——— پھر فرنگی محل لکھنؤ کے ایک ہونہار نوجوان فاضل مولوی محمد یونس فرنگی محلی نے ابن رشد کے نام سے پوری ایک ضخیم کتاب لکھ ڈالی دارالمصنفین کے سلسلۂ تصنیفات میں شامل ہے، اور وہاں کی بہترین اور مایۂ ناز کتابوں میں اس کا شمار ہے ——— ابھی حال میں مولانا

عبدالسلام ندوی کے قلم سے حکمائے اسلام کے حالات میں ایک کتاب اسی نام سے دو جلدوں میں دارالمصنفین سے شائع ہوئی ہے، اس کی دوسری جلد میں اس کے بھی حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں، اور ان سب میں اس کی فلسفیانہ حیثیت کو مقدم رکھا گیا ہے۔ بلکہ اسی حیثیت سے اس کا تعارف اور ذکر بھی کیا گیا ہے

میں اس کا اظہار بالکل پہلی ہی بار نہیں کر رہا ہوں بلکہ مدرسہ سرائے میر کے ارباب اہتمام سے عرض بھی کرتا رہتا ہوں لیکن وہ اپنی ہی بات پر مصر ہیں، اور بدایۃ المجتہد کی جگہ پر یا اس کے ساتھ اسی مرتبہ کی فقہ کی اور کوئی متداول کتاب نصاب میں رکھنے پر تیار نہیں، ایک مرتبہ مستشرقین عالم کی کانفرنس آٹھ نو سال ہوئے استانبول (قسطنطنیہ) میں منعقد ہوئی تھی جس کی شرکت کے لئے حیدرآباد کے مشہور شافعی المذہب فاضل ڈاکٹر حمید اللہ صاحب بھی جو آج کل پیرس میں سکونت گزیں ہیں، قسطنطنیہ تشریف لے گئے تھے۔ اسی سلسلہ میں وہاں کے کتب خانوں کی بھی انھوں نے سیر کی تھی، وہاں سے واپسی کے بعد انہوں نے اپنے سفر استانبول اور کانفرنس کی بہت مفصل روداد لکھی، جو مارچ سنہ ۱۹۵۲ء کے معارف میں شائع ہوئی۔ اس میں استانبول کے کتب خانوں کے دوسرے نوادر اور کتب کے ساتھ فقہ کی ایک قلمی کتاب نہایۃ المجتہد وکفایۃ المقتصد کا بھی ذکر تھا، جو دو جلدوں میں تھی جس کے متعلق انہوں نے لکھا تھا کہ گویا وہ بدایۃ المجتہد کا تکملہ ہے، وہ روداد ہمارے فاضل اور لائق دوست مولانا بدر الدین ناظم مدرسۃ الاصلاح کی نظر سے گذری تو ان کو اس تکملہ کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا، اور مجھ کو اس کے بارے میں لکھا، میں نے مضمون دوبارہ ڈھونڈ کر بالاستیعاب پڑھا، تو اس میں بجز کتاب کے نام اور اس خصوصیت کے کہ وہ حضرت محی الدین ابن عربی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے اور کوئی تفصیل نہیں تھی اور نہ مل سکتی تھی۔ میں نے ان کو لکھا کہ میں تو شروع ہی سے نفس بدایۃ المجتہد ہی کے نصاب میں رکھنے کا مخالف ہوں، اور آپ ہیں کہ اس کے تکملہ کی جستجو کی خواہش آپ کے دل میں پیدا ہو گئی، آخر آپ لوگ ابن رشد کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں، اس کا اصل فن تو فلسفہ ہے، اور اسی میں اس کی سب سے زیادہ تصنیفات ہیں، اور انہی تصنیفات کی وجہ سے اس کو شہرت بھی حاصل ہے، اس نے فقہ میں کچھ کتابیں ضرور لکھی تھیں، لیکن ان کو اس کی فلسفیانہ تصنیفات وتالیفات کے مقابلہ میں شہرت حاصل نہ ہو سکی، ابتک اس فن میں اس کی تین کتابوں کا پتہ چل سکا ہے "انہی میں آپ کی محبوب ترین کتاب بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد بھی ہے، جس کے متعلق نفح الطیب میں ابن سعید کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کتاب جلیل معظم معتمد عند المالکیۃ" اس فقرہ کا آخری ٹکڑا عند المالکیۃ قابل توجہ ہے یعنی وہ مالکیہ کے نزدیک جتنی اہم، باعظمت، اور قابل اعتماد ہے، اتنی حنفیہ، شوافع حنابلہ اور ظاہریین کے نزدیک نہیں ہے اور یقیناً یہ بات صحیح بھی ہوگی کہ مصنف مالکی تھا اور ہر مسئلہ میں مالکی ہی نقطۂ نظر اور مسلک کو مرجح سمجھتا تھا۔

دوسری کتاب تحصیل ہے جس میں صحابہ وتابعین کے فقہی اختلافات اور انکے دلائل لکھے ہیں اور خود محاکمہ اور فیصلہ کیا ہے۔

تیسری مقدمات ہے یہ کتاب مولانا شبلی نے سرسید مرحوم کے خلف اکبر جسٹس سید محمود مرحوم کے لئے کتب خانہ خدیویہ سے نقل کرا کر منگوائی تھی، انھوں نے لکھا ہے کہ:۔

"میرا خیال تھا کہ ایک فلسفی فقہ کے فن کو لکھے گا تو کیونکر لکھے گا، لیکن کتاب کو پڑھ کر ہم کو کچھ تعجب نہیں ہوا۔ بلاشبہ متقدمین کی کتابوں کی نسبت وہ زیادہ صاف، مرتب اور قریب الفہم ہے، لیکن فلسفیانہ تدقیقات کا پتہ نہیں، ابوزید دبوسی کی کتاب الاسرار ہم نے دیکھی ہے، دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے"

جس کا مطلب یہ ہے کہ ابن رشد کا دماغ جس طرح معقولات کی تحقیق، شاخوں کی کتابوں کی تصنیف وتالیف کا کام کرتا تھا منقولات میں اور وہ بھی فقہ میں نہیں کرتا تھا، مولانا شبلی جیسے وسیع النظر اور جید العلم مصنف کی اس رائے سے کس کو اختلاف ہو سکتا ہے۔

گلہائے رنگ رنگ

نعیم صدیقی

خموشی کی شیریں نوا سن رہا ہوں
خیالوں کی آوازِ پا سن رہا ہوں
جیسے موجِ نکہت لئے آرہی ہے
وہ پیغام حسن آشنا سن رہا ہوں
بہاروں نے جیسے غزل چھیڑ دی ہو
کلی کی چٹک کی صدا سن رہا ہوں

نہ جانے غنچۂ نازک پہ کیا گزر جائے
چمن میں صبح بہاراں کے مسکرانے تک
بہت سے مرحلے آئے، ہزار حشر اٹھے
سوادِ شہر بتاں سے، شراب خانے تک

یہ پابندی قفس میں ہے اور پھر نغمہ خواں رہیے
یہ مجبوری ہجومِ خار و خس کے درمیاں رہیے
یہ کانٹے ایک مدت کی چمن بندی کا حاصل ہیں
انہی کانٹوں میں گھل مل جائیے اور گلفشاں رہیے
یہ ٹوٹے دل، یہ سادہ لوگ، یہ ناشاد ماں رہیں
خدا بھی مل ہی جائے گا، انہی کے درمیاں رہیے

آہ! وہ لطفِ مسرت جو ہو غم آلودہ
ہائے! وہ پھول جو سینوں میں چمن کھلتے ہیں

ایک ہی رنگ ہے اپنا وہ خزاں ہو کہ بہار
ہم کہ آغوشِ تصور میں چمن رکھتے ہیں

ساقی: ترے کرم کے سزاوار آگئے
آخر حرم سے پھر کے گنہگار آگئے

احساس کے چمن میں کھلے جب بھی تازہ پھول
لب پر وہی بصورتِ اشعار آگئے

عبدالمجید حیرت

پریشاں تابکے یوں دل رہے گا
مقدر ہے جو ملتا مل رہے گا
ابھی کب تک خدا جانے مرا دل
ہلاکِ جلوۂ باطل رہے گا
ذرا ہم بھی تو دیکھیں کوئی کب تک
وفا کی راہ میں حائل رہے گا
وفا اندیش رہنے سے کم از کم
سکونِ دل تو کچھ حاصل رہے گا
یہی عالم رہا گر بے دلی کا
یہ دل پھر کس کام کے قابل رہیگا
ہمیں تو قربِ منزل پر بھی حیرت
خیالِ وادیٔ منزل رہے گا

منظر کلیمی

کوئی ہے ساتھ کسی کے کوئی کسی کے ساتھ
رواں دواں ہوں فقط میں ہی بیکسی کیساتھ
کہیں یہ کس سے کہ کس طرح آئے ہیں واپس
گئے تھے آپ کی محفل میں کس خوشی کے ساتھ
ادھر بھی بیٹھے ہیں مدت سے تیرے شیدائی
ادھر بھی ایک نظر، چاہے بے رخی کیساتھ

تیرے ہی فیضِ کرم سے کٹ رہی ہے زندگی
اے غمِ جاناں! سلامت، ورنہ ہم کس کام کے

ساقی گری ہے کہ ایک ہی خم سے
کسی کو زہر، کسی کو شراب دی ساقی[1]

اک نظر چاہیے بے نیازانہ
کچھ تو میری بھی بات رہ جائے
جانے کیا بات آگئی جی میں
جانے! کیوں راستے سے لوٹ آئے

برق چاہل پوری

بیٹھے ہیں کہیں ساتھ نہ کچھ بات ہوئی ہے
یوں اُن سے کئی بار ملاقات ہوئی ہے
صد شکر کہ آیا نہ زباں پر ترا شکوہ
تکمیل وفا حسبِ ہدایات ہوئی ہے
تسکین کی منزل تو کہاں دہر میں پاتے
غم سے بھی سرِ راہ ملاقات ہوئی ہے
احباب کے دل ہو گئے کچھ اور مکدر
جب ٹھیک ذرا صورتِ حالات ہوئی ہے
کچھ ہوش نہیں ہو تو کریں ذکر کہیں کا
دن کس جگہ گزرا ہے کہاں رات ہوئی ہے

رشید آتش

میں کہ بے قراری سے مجھ کو پیار ہو جیسے
تم کہ میرا یہ رخ بھی تم پہ بار ہو جیسے
جب بھی تم نہیں ہوتے، رات یوں گزرتی ہے
ایک مہیب سناٹا غمگسار ہو جیسے
اس طرح ہے دامن کے ساتھ ساتھ رسوائی
ہر روش گلستاں کی خار زار ہو جیسے

---

[1] فارسی کے کسی شاعر کا شعر ہے:-
بہ یک خم نہد ساقی روزگار ... تراصاف مستاد مرا دُرد دُرد

ٹوٹنے نہیں پاتا سلسلہ تصور کا
میرے حق میں تنہائی سازگار ہو جیسے

راہی بلند شہری

سلیقہ ہو ستم کا تو ستم ایجاد ہی اچھے
قرینے سے نہ ہوں آباد تو برباد ہی اچھے
ہمارے شادماں ہونے سے تم ناشاد ہو جاؤ
تو ایسے شادماں ہونے سے ہم ناشاد ہی اچھے
خرد کے اس تذبذب سے جو ہمت توڑ دیتا ہو
جنوں کے نعرہ ہائے ہر چہ بادا باد ہی اچھے
بعنوانِ ستم کرتے ہیں، لیکن یاد کرتے ہیں
کرم فرماؤں سے تو مائلِ بیداد ہی اچھے
جنھیں حسرت تھی نظمِ گلستاں تبدیل ہو جائے
وہی نادم ہیں اب کہتے ہیں کہ صیاد ہی اچھے
ہوئے آباد تو دنیا کو پھر تکلیف پہنچے گی
ہمیں برباد رہنے دو کہ ہم برباد ہی اچھے
نشیمن بھی تو اک زنجیرِ پا ثابت ہوا راہی
اسیرِ دام اچھے تھے، نہ ہم آزاد ہی اچھے

تابش شجاع آبادی

کسی سے قصۂ غم سن کے میرا
وہ اپنے دل میں شرماتے تو ہوں گے
نکھرتی ہو گی اب بھی چاندنی رات
وہ لمحے ان کو یاد آتے تو ہوں گے
کسی کی سرمگیں آنکھوں میں تابش
کبھی آنسو بھی آجاتے تو ہوں گے

میرے تصورات کی رنگینیاں نہ پوچھ
گلشن سے کھل رہے ہیں سرِ جادۂ خیال
رنگیں لبوں پہ حسنِ تبسم کا یہ فسروغ
فردوس بن گیا ورقِ سادۂ خیال

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی

روحِ انتخاب

اسلامی حکومت دنیا کے کسی معاملے میں بھی اسلامی اصولوں سے ہٹ کر کوئی کام کرنے کی نہ تو مجاز ہے اور نہ وہ اس کا ارادہ ہی کر سکتی ہے۔ اگر فی الواقع اس کو چلانے والے ایسے لوگ ہوں جو کہ اسلام کے اصولوں کو سچے دل سے مانتے ہوں اور اس پر عمل کرتے ہوں۔ عورتوں کے معاملے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ عورت اور مرد عزت و احترام کے لحاظ سے برابر ہیں۔ اخلاقی معیار کے لحاظ سے بھی برابر ہیں لیکن دونوں کا دائرہ عمل ایک نہیں ہے۔ سیاست اور ملکی انتظام اور فوجی خدمات اور اسی طرح کے دوسرے کام مرد کے دائرہ عمل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس دائرے میں عورت کو گھسیٹ لانے کے دو برے نتیجے ہو سکتے ہیں۔ یا تو یہ کہ ہماری خانگی زندگی بالکل تباہ ہو گی۔ جس کی بیشتر ذمہ داریاں عورتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ یا پھر عورتوں پر دُہرا بار ڈالا جائیگا۔ کہ وہ اپنے فطری فرائض بھی انجام دیں جن میں مرد قطعاً شریک نہیں ہو سکتا اور پھر مرد کے فرائض کا بھی نصف حصہ اپنے اوپر اٹھائیں۔ عملاً یہ دوسری صورت ممکن نہیں ہے لازماً پہلی صورت ہی رونما ہوگی اور مغربی ممالک کا تجربہ بتاتا ہے کہ وہ رونما ہو چکی ہے آنکھیں بند کرکے دوسروں کی حماقتوں کی نقل اُتارنا عقلمندی نہیں ہے۔

اسلام میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وراثت میں عورت کا حصہ مرد کے برابر ہو اس باب میں قرآن کا صریح حکم مانع ہے نیز یہ انصاف کے بھی خلاف ہے۔ کہ عورت کا حصہ مرد کے برابر ہو کیونکہ اسلامی احکام کی رو سے خاندان کی پرورش کا سارا مالی بار مرد پر ڈالا گیا ہے۔ بیوی کا مہر و نفقہ بھی اس پر واجب ہے۔ اس کے مقابلہ میں عورت پر کوئی بار نہیں ڈالا گیا ہے۔ اس صورت میں آخر عورت کو مرد کے برابر حصہ کیسے دلایا جا سکتا ہے؟

اسلام اصولاً مخلوط سوسائٹی کا مخالف ہے اور کوئی ایسا نظام جو خاندان کو اہمیت دیتا ہو اس کو پسند نہیں کرتا کہ عورتوں اور مردوں کی مخلوط سوسائٹی ہو۔ مغربی ممالک میں اس کے بدترین نتائج ظاہر ہو چکے ہیں۔ اگر ہمارے ملک کے لوگ ان نتائج کو بھگتنے کے لئے تیار ہوں تو شوق سے بھگتتے رہیں لیکن آخر یہ کیا ضروری ہے کہ اسلام میں ان افعال کی گنجائش زبردستی نکالی جائے جن سے وہ شدت کے ساتھ روکتا ہے۔

اسلام میں اگر جنگ کے موقع پر عورتوں سے مرہم پٹی وغیرہ کا کام لیا گیا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ امن کی حالت میں عورتوں کو دفتروں اور کارخانوں اور کلبوں اور پارلیمنٹوں میں لا کھڑا کیا جائے۔ مرد کے دائرہ عمل میں اگر عورتیں کبھی مردوں کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے کہ وہ ان کاموں کے لئے بنائی ہی نہیں گئی ہیں۔ ان کاموں کے لئے جن اخلاقی اور ذہنی اوصاف کی ضرورت ہے وہ دراصل مردوں میں پیدا کئے گئے ہیں۔ عورت مصنوعی طور پر مرد بن کر کچھ تھوڑا بہت ان اوصاف کو اپنے اندر ابھارنے کی کوشش کرے بھی تو اس کا دُہرا نقصان خود اس کو بھی ہوتا ہے اور معاشرہ کو بھی۔ اس کا اپنا نقصان یہ ہے کہ وہ نہ پوری عورت رہتی ہے، نہ پوری مرد بن سکتی ہے اور اپنے اصل دائرہ عمل میں جس کے لئے وہ فطرتاً پیدا کی گئی ہے ناکام رہ جاتی ہے۔ معاشرہ اور ریاست کا نقصان یہ ہے کہ وہ اہل کارکنوں کے بجائے نااہل کارکنوں سے کام لیتا ہے اور عورت کی آدھی زنانہ اور آدھی مردانہ خصوصیات سیاست اور معیشت کو خراب کرکے رکھ دیتی ہے اس سلسلہ میں گنتی کی چند سابقہ معروف خواتین کے نام گنانے سے کیا فائدہ۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

صابر دہلوی مرحوم

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

محمد اسحٰق نام تھا، صابر تخلص، ضلع بلند شہر میں ایک گاؤں آمرپور ہے جو سان گری اور چاقو سازی کے لئے اُس نواح میں خاصی شہرت رکھتا ہے۔ وہاں کے رہنے والے تھے، پھر دلّی کو اپنا وطن ثانی بنالیا، یہاں تک کہ "دہلوی" کہلانے لگے۔ دلّی میں برسوں اپنی قوتِ بازو سے روزی کمائی۔ پھر دکان اور کاروبار اپنے لڑکوں کو سونپ کر مشاعروں، شعر و شاعری اور دوستوں کی صحبتوں ہی کے ہو کر رہ گئے۔ کوئی کام اور ذمہ داری نہیں، ہنسی مذاق، قہقہے، چہچہے، خوش فعلیاں اور رنگینیاں!

سنہ ۱۹۴۰ء میں مالیر کوٹلہ کے مشاعرے میں صابر مرحوم سے پہلی بار ملاقات ہوئی اور اس کے بعد سے جو یارانہ شروع ہوا ہے، تو اُن کے مرتے دم تک قائم رہا۔ اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ خالص دوستی کسی غرض اور مطلب کی ذرہ برابر ملاوٹ نہیں، بے تکلفی بے حد و بے نہایت! سفر میں حضر میں خلوت و جلوت میں مہینوں ساتھ رہا۔ کیسی کیسی رنگین اور دلچسپ صحبتوں میں ہم دونوں زانو سے زانو ملا کر بیٹھے ہیں، اور کس کس محفل میں ہم نفسی اور ہم نگاہی رہی ہے۔

شائستہ اور سنجیدہ محفلوں میں، مشاعروں اور پارٹیوں میں صابر اور میں جس طرح لطف لیتے تھے، مسکراتے اور ہنستے تھے اُسے کوئی دوسرا سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ کس بات پر یہ دونوں ہنسی کے مارے دُہرے ہوئے جارہے ہیں! خندہ و قہقہہ کے "رموز" ہم دونوں نے ایجاد کئے تھے، جو ہر کسی کی سمجھ میں کہاں آتے تھے، ایک لفظ، ایک اشارے اور ایک حرکت و ادا پہ دونوں دیوارِ قہقہہ اور کشتِ زعفران بنے ہوئے!

صابر مرحوم کا بدن کسرتی تھا، جوانی کے زمانے میں پہلوانی کی تھی اور دنگلوں میں کشتیاں لڑی تھیں، اس لئے وہ یار دوستوں کے "باڈی گارڈ" کے فرائض بھی انجام دیتے، کوئی لاتوں کا بھوت، باتوں سے نہ مانتا، تو اُس کی مرمت کرنے کے لئے بھی وہ تیار ہو جاتے، آدمی جیوٹ، حوصلہ مند، جری بلکہ ہٹ جھٹ تھے، اس مزاج کا آدمی کسی کی ذرا سی بھی بات کہاں سہار سکتا ہے! منافقت، مصلحت اندیشی اور زمانہ سازی اُن کو آتی ہی نہ تھی، جس سے ملتے ڈٹ کر ملتے اور جس سے کھنچتے اُس سے کھنچے ہی رہتے۔

صابر مرحوم کا چہرہ وجیہہ اور خوش منظر تھا، خوش پوشاک بھی تھے ہر لباس اُن کے بدن پر پھبتا، اُن کی آواز میں بھی سوز اور دلکشی تھی، شعر و شاعری کی بدولت ہر طرح کی صحبت میسر آئی، اس لئے حقیقت و افسانہ، خوش فہمی اور غلط فہمی کے بڑے معرکے اور مقابلے رہتے۔

صابر مرحوم کی سرشت اور فطرت میں دو چیزیں شامل تھیں عاشقی اور شاعری! انہی چٹخاروں کی بدولت وہ کم و بیش ستر سال کی عمر میں پچاس سال کے لگتے تھے! یار دوست چھیڑنے کی خاطر اُن کی عمر پوچھتے؟ اس پر وہ بگڑ جاتے! اُن کی زندگی سے

بہت سے افسانے، لطیفے اور رنگین و دلچسپ واقعات منسوب ہیں! پہلی بار ہوائی جہاز میں سفر کیا، تو راستہ بھر سہمے ہوئے بیٹھے رہے ہوائی جہاز سے جب وہ اُترے، تو چند قدم چل کر ہوائی جہاز کو مڑ کر دیکھا، اور خاص انداز میں بولے:-

"اب میں کہتا ہوں سواری خطرناک ہے۔"

صابر مرحوم کا سب سے زیادہ دلچسپ موضوع میری ذات تھی! اپنے ہوں، پرائے ہوں، دوست ہوں، اجنبی ہوں ذکر چھڑ جاتا، تو گھنٹوں باتیں کئے جاتے، میں نے انہیں کئی بار ٹوکا کہ بھائی! دوست کی ہر بات ہر کسی کے سامنے نہیں کہی جاتی! مجھے آخر کس کس کے سامنے رُسوا کروگے، کئی بار وعدہ کیا کہ اب ایسا نہیں کروں گا مگر پھر دوسروں کی زبانی سننے میں آیا کہ انھوں نے اپنے عہد و پیمان کو توڑ دیا ——— اور وہی ذکر ماہر بہ زبانِ صابر!

صابر مرحوم کے گھر میں پردے کی سخت پابندی تھی، دلی میں سب سے پہلی بار جب میں اُن کے یہاں گیا، تو بولے ماہر! میں نے قصداً اس وضع قطع کا مکان کرایہ پر لیا ہے تاکہ کسی کو مکان میں ٹھیرانا نہ پڑے، دوستوں میں جگر مُراد آبادی کے بعد تم دوسرے شخص ہو جس کو میں نے اپنے گھر کھانے پر بلایا ہے! میری بیوی کو برسوں دلی میں رہتے ہو گئے مگر اس مدت میں ایک یا دو بار جامع مسجد اور قلعہ دیکھا ہے۔ میری بیوی اور بیٹی نے آج تک سینما نہیں دیکھا ——— اس باب میں صابر مرحوم بڑے خود دار محتاط اور غیرت مند واقع ہوئے تھے، عورتوں کے معاملہ میں جس کسی نے بھی ڈھیل دی، اُس نے سخت نادانی کی، عفت و عصمت کے ان نازک و مقدس آبگینوں کی جتنی بھی حفاظت کی جائے کم ہے۔

پوتوں اور پوتیوں پر مرحوم جان چھڑکتے تھے، ان کو اپنی اولاد کی طرح پرورش کیا اور بڑی فراخدلی اور حوصلہ کے ساتھ خود تکلیف اٹھا کر اُن کی راحت و آرام کے اسباب مہیا کئے! اُن کے بڑے پوتے انوار انجم ایم۔ اے کے آخری سال میں ہیں، اور اپنی ذہانت، قابلیت اور شعر و ادب کے ذوق کے سبب کالج میں خاصے مقبول ہیں!

چند سال ہوئے انھوں نے دوسری شادی کر لی تھی، پہلی اور دوسری بیوی دونوں ساتھ ساتھ رہتی تھیں۔ ملتان کی نئی آبادی ——— گل گشت ——— میں انھوں نے مکان نہیں کوٹھی بنوائی۔ جس کے سبب ہزاروں کے مقروض ہو گئے پوری زندگی بے فکری میں بسر کی، فکر و غم کو تو وہ اپنے پاس بھی نہ پھٹکنے دیتے تھے، مگر تین چار سال سے ایسے حالات ہو گئے تھے کہ فکر و غم کو بہت کچھ ٹالنے کے باوجود وہ فکر مند رہنے لگے تھے۔ آٹے کی چکی کی آمدنی بھی برائے نام رہ گئی تھی ——— اتنا بڑا ٹبّر پورے کنبہ کے آذوقہ کی ذمہ داری، اس پر طرہ یہ کہ اخراجات کے معاملہ میں کشادہ دست اور سیر چشم!

۲ر مارچ کو لاہور میں مشاعرہ تھا۔ میں نے کراچی سے لاہور روانہ ہوتے وقت ارادہ کر لیا تھا کہ واپسی میں ملتان اُتر کر صابر صاحب سے ملوں گا، ۷ر مارچ کو ملتان اُن کے نو تعمیر مکان پر پہونچا، وہاں جا کر پتہ چلا کہ وہ تو آج ہی اسپتال میں داخل ہوئے ہیں، اُن کے پوتے کو تانگے میں بٹھا ہسپتال کا رُخ کیا، شام کے ۵ بجے ہوں گے سول ہسپتال میں چاروں طرف سناٹا سا نظر آیا۔ دروازوں میں تالے پڑے ہوئے، کئی منٹ کی تلاش کے بعد صابر مرحوم کے کمرے کا پتہ چلا، مجھے دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ میں نے کہا کہ بھائی! اس اسپتال کے اسپیشل کمروں کے دروازوں کو دیکھ کر میں سمجھا کہ ہسپتال میں بھی جیل خانہ ہوتا ہے اور تم نے ہسپتال میں آتے ہی کوئی ایسی حرکت کی ہے کہ تمہیں حوالات میں بند کر دیا گیا، اس پر وہ خوب ہنسے! میں اُن کے پاس ڈیڑھ گھنٹہ کے قریب بیٹھا رہا، میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ تمہارے چہرے پر بڑی شگفتگی اور تمہاری باتوں میں خاصی زندگی پائی جاتی ہے، انشاءاللہ جلد اچھے ہو جاؤگے۔ بولے ماہر! میں اندر سے کھوکھلا ہو گیا ہوں، جسم تو کچھ نہیں رہا، ڈھانچہ

نے بتایا ہے کہ تمہارے پیشاب میں شکر آتی ہے، اسی کے علاج کے لئے یہاں داخل ہوا ہوں، دو ہفتے کے قریب یہاں رہنا ہوگا ہاں! مظفر گڑھ کے مشاعرے سے تم بالا ہی بالا چلے گئے، اس کا مجھے بڑا شکوہ اور صدمہ تھا۔ جوش ملیح آبادی مجھ سے ملنے کے لئے آئے تھے۔ تمہارا ذکر بھی ان سے رہا۔

اور

ماہر! میں نے پکا ارادہ کرلیا ہے کہ کراچی میں آن کر رہوں، گلگشت کا مکان، کارخانہ اور اس کی زمین، یہ سب چیزیں مل ملاکر دو لاکھ پونے دو لاکھ میں بک جائیں گی۔ قرضہ ۳۰ — ۳۵ ہزار سے زائد نہیں ہے! بس پھر کراچی میں عیش اور مزے رہیں گے، تم وہاں موازنہ کرنا کہ کھانا تخشب جارچوی کے یہاں اچھا ہوتا ہے یا میرے یہاں!

میں نے اپنی تازہ غزل سُنائی اور صابر مرحوم نے اپنے یہ دو شعر ؎

عشق کا حسن نہ موجود رہا میرے بعد — کر سکا کوئی نہ تجدید وفا میرے بعد

ہائے! صابر سا وفادار کہاں سے لاؤں — اُس نے لوگوں سے یہ رو رو کے کہا میرے بعد

میں نے کہا "عشق کا حسن" کی بجائے "عشق میں حسن" ہو جائے تو کیسا ہے! اس پر وہ سوچنے لگے! میرے اس شعر پر: ؎

کوئی خوش جمال ہوگا، کوئی بے مثال ہوگا — ہمیں کس سے ہے محبت تمہیں نام کیا بتائیں

بہت داد دی، یہ اُن کے رنگ اور مزاج کا شعر تھا ——— یہ ڈیڑھ پونے دو گھنٹے کا وقت باتوں باتوں میں اس طرح گزرا جیسے مجھے آئے ہوئے چند منٹ ہوتے ہیں، اکس محبت کے ساتھ مجھے رُخصت کیا، چلتے چلتے ہم دونوں نے ایک دوسرے پر ہنسی مذاق کی پُھلجھڑیاں اور پچکاریاں چھوڑیں!

میں اسی شب میں ملتان سے روانہ ہو کر رحیم یار خاں پہونچا، ۹ / مارچ کو وہاں مشاعرہ پڑھا، ۱۰ / کو کراچی واپس آیا کراچی آنے کے تیسرے دن بعد دفتر میں بیٹھا ہوا، خطوط کے جواب لکھ رہا تھا کہ مینیجر نے تار لا کر دیا، میں سمجھا کسی مشاعرے کی اطلاع یا دعوت آئی ہے مگر اُس میں لکھا تھا:—

"ابا کا انتقال ہوگیا، جمیل الدین عالی اور دوسرے حضرات کو اطلاع دیدیجئے"۔ جمیل

کس قدر الم انگیز برقیہ! مگر مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ نہ آنکھوں سے آنسو نکلے اور نہ میں نے دل کو تھاما۔ گھبرا گھبرا کر در و دیوار کو دیکھتا تھا! ہائے! میں تو صابر سے کہا کرتا تھا کہ صابر! تم مجھ سے عمر میں بہت بڑے ہو، مگر دیکھ لینا میں تم سے پہلے مروں گا، اور تم یاد کیا کروگے کہ کیسا دلچسپ اور باغ و بہار دوست جاتا رہا ——— لیکن یہ کیا ہوا؟ میں تو انہیں ہنستا بولتا اور چہکتا چھوڑ آیا تھا۔

دو دن بعد جناب عاصی کرنالی کا خط آیا، اُس کے چند جملے:—

"ماہر صاحب! آپ کا سب سے سچا دوست، سب سے مخلص بھائی، سب سے بڑا خیر خواہ مرا ہے، جب وہ آپ کا نام لیا کرتے تھے، اُن کی آنکھوں کی چمک کہتی تھی ——— ماہر میرا ہے، صرف میرا ہے ——— آپ کا ذکر کرتے وہ کبھی نہ تھکتے، گھنٹوں حدیث دوست اور ذکر حبیب کی سرمستی ان پر طاری رہتی۔

"آپ جمعرات کو اُن سے ملنے ہسپتال گئے، جمعہ کو میں پہونچا تین گھنٹے بیٹھا رہا،

پہلے آپ کا ذکر کیا کہ وہ آئے تھے مولانا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور باہر سے کہلوایا، کوئی ماہر آیا کہ پھر فرمانے لگے انھوں نے ایک غزل کہی ہے، سُبحان اللہ کیا غزل ہے، انہیں کراچی لکھنا وہ غزل ان سے منگوانا، تین گھنٹے ان تھک بولتے رہے، داغؔ دہلوی کا ذکر، اُردو زبان کے الفاظ کی اصلاح، ملتان کی کس مپرسی کا حال، زیادہ ذکر کراچی کا رہا کہنے لگے میں آپ کو ایک خوش خبری سناتا ہوں، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں صحت یاب ہوتے ہی ملتان چھوڑ دوں گا، ملتان مدفنِ ادب ہے' اور پھر چکی میں میرے لئے کشش نہیں، میں کراچی چلا جاؤں گا۔ وہاں میرا ماہر جو ہے، تمہیں بھی لے چلوں گا عاصی! یا جلد بلالوں گا، اپنا بیٹا عاکی وہاں ہے، وہ تمہارے لئے بہت کچھ کر دے گا پھر مولانا تم پر شفقت کرتے ہیں ۔ ۔ ۔"

صابر دہلوی مرحوم کی فطرت اور مزاج میں "غزلیت" سموئی ہوئی تھی، ان کے اِس ایک مصرعہ ہی سے اُن کے رنگِ تغزل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ع دل سلامت ہے تو مشکل مری آساں کیوں ہو۔

اور

پھر محبوب کو مخاطب کر کے کہتے ہیں :-

ع میری جمعیتِ خاطر سے پریشاں کیوں ہو۔

وہ زود گو ہی نہیں خوش گو بھی تھے! تقسیم ہند سے چار پانچ سال قبل آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ان کی تعتیہ غزلوں کے پروگرام ہوتے تھے! رسالوں اور اخباروں میں اپنا کلام چھپوانے کا انہیں شاید کبھی خیال ہی نہیں آیا، نہ جانے اُن کی غزلیں اُنکے ساتھ ہی چلی گئیں یا کسی بیاض میں محفوظ ہیں! اب سے ڈیڑھ سال پہلے ایک غزل انھوں نے سنائی تھی، جس کے دو شعر یاد رہ گئے ہیں :-

ہجر کی شب بہت مختصر ہو گئی — اُن کی یاد آ گئی اور سحر ہو گئی
کیا مری آہ ـــــ[1] کارگر ہو گئی — جو اِدھر کی تھی حالت اُدھر ہو گئی

یہ مشہور مصرعہ صابر دہلوی مرحوم کی موت پر کس قدر صادق آتا ہے، جیسے خاص اُنہی کے لئے اور اسی دن کے لئے لکھا گیا تھا ـــــ

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

×

[1] اس مصرعہ کے درمیانی لفظ اس وقت یاد نہیں آ رہے ہیں ـــ

ہماری نظر میں

البلاغ المُبین (فارسی)

از:- حضرت شاہ ولی اللہؒ، ضخامت ۱۲۸ صفحات، قیمت دو روپے
ملنے کا پتہ:- المکتبۃ السلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی اس کتاب پر "حرفِ آغاز" اور ضروری حواشی مولانا محمد عطاء اللہ حنیف نے لکھے ہیں! یہ کتاب ۱۸۹۱ء میں سب سے پہلی "مطبع محمدی" (لاہور) میں شائع ہوئی تھی۔ اور اس کے بعد سے کمیاب بلکہ نایاب تھی، اب مکتبہ سلفیہ (لاہور) کو اس کی طباعت واشاعت کی سعادت میسر آئی۔

"حرفِ آغاز" کے بعد حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کے مختصر حالاتِ زندگی ملتے ہیں، جو زیادہ تر نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی کتابوں سے لئے گئے ہیں!

"البلاغ المبین" ـــــ قبر پرستی کے فتنہ کی تردید میں بے مثال کتاب ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ قبر پرستی کا آغاز کس طرح ہوا؟ قبر پرستوں اور یہودیوں کے درمیان کس قدر تشابہ پایا جاتا ہے ـــــ زیارتِ قبور کا مسنون و مشروع طریقہ کیا ہے؟ ـــــ صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کی قبر سے مدد نہیں چاہی ـــــ مشائخ اور پیروں کے اقوال کو سنت کی کسوٹی پر جانچنا چاہیئے ـــــ عرس کی دین میں کوئی سند نہیں ملتی ـــــ طریق اہل سنت اور وظائف شرکیہ ـ تفسیر آیۂ وسیلہ ـــــ جو چیز شریعت کے خلاف ہے، وہ زندقہ ہے ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ!!

کتاب کے ضمیمہ میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری کتابوں (حجۃ اللہ البالغہ ـ مصفّٰی شرح موطا ـــــ البدور البازغہ ـ الخیر الکثیر ـــــ تفسیر فتح الرحمٰن ـــــ الفوز الکبیر ـــــ) کے اقتباسات بھی دیئے گئے ہیں، جن سے شرک و بدعت کی نفی اور تردید ہوتی ہے۔

کتاب کی زبان فارسی ہے مگر آسان اور عام فہم فارسی! قبر پرستی کے اس دور میں "البلاغ المبین" کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی ضرورت ہے!

افکارِ عبدالحق

مُرتبہ:- آمنہ صدیقی (ایم، اے، بی ایڈ) ضخامت ۲۵۰ صفحات، خوشنما ٹائپ، چکنا کاغذ پائدار جلد، قیمت:- دس روپے۔ ملنے کا پتہ:- اُردو اکیڈیمی سندھ، کراچی

محترمہ آمنہ صدیقی بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی ذات سے غیر معمولی عقیدت رکھتی ہیں اور مولوی صاحب کے علمی و ادبی کارناموں کی صحیح قدر شناس ہیں، انھوں نے مولوی صاحب کی شخصیت، زندگی اور افکار و خیالات کا بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ یہ کتاب اُن کے اس مطالعہ کا نچوڑ ہے، جس پر وہ علمی دُنیا کی طرف سے مبارکباد کی مستحق ہیں۔

اس کتاب میں مولوی عبدالحق کی تحریروں کے اقتباسات دے کر اُن کے "افکار" کا جائزہ لیا گیا ہے، محترمہ آمنہ صدیقی اُن دو قواعد سے متفق ناقد... در صاحب طرز ادیب وانشا پرداز کے علاوہ مولوی صاحب کو "مفکر" بھی مانتی ہیں، وہ اس کا شاکی ہیں، اُردو دنیا نے مولوی عبدالحق کو بہ حیثیت "مفکر" کی حیثیت سے پہچاننے کی کوشش ہی نہیں کی" (ص) وہ لکھتی ہیں کہ ـــــ

"مولوی صاحب ادب کی طرف توجہ نہ کرتے، تو وہ یقیناً بہت بڑے فلسفی ہوتے (صفحہ ۹)

مگر

مولوی عبدالحق کو مفکر مانتے ہوئے وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ "اُن کے ہاں کوئی مربوط نظامِ فکر نہیں ہے" (صفحہ ۹) ــــ اور

"اس سلسلہ میں وہ غالب کے ہم قدم ہیں"

غالب اور مولوی عبدالحق کے مابین "پراگندگیٔ افکار" کا تشابہ عجیب سا لگتا ہے۔

عام طور پر یہ مشہور ہے کہ مولوی عبدالحق نثر نگاری میں سرسید اور حالی سے متاثر ہیں، خاص طور سے حالی کی سادگی کو مولوی صاحب نے اپنی تحریروں میں سمو لیا ہے، مگر آمنہ صدیقی نے اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا ہے کہ وہ شبلی نعمانی سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔

"۔۔ اُن کے ہاں ایک تیسری خصوصیت بھی پائی جاتی ہے، جسے "رنگینی" کہا جاسکتا ہے، اور یہ خصوصیت انہیں شبلی سے ملی ہے! مولوی صاحب نے اپنی تحریروں میں کبھی کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا کہ جہاں شبلی کو مطعون کیا جاسکے، لیکن اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ وہ اسلوب کے معاملے میں شبلی سے اُتنے ہی متاثر ہیں جتنا کہ حالی اور سرسید سے۔۔۔"

صفحہ ۴۰، پر مولوی عبدالحق صاحب کے "خطبات" کا ایک اقتباس دیا گیا ہے ــــــ

"اس لئے ترقی پسند نوجوانوں کی خدمت میں میری عرض ہے کہ وہ اپنے ادب اور زبان کا گہرا مطالعہ کریں، ورنہ ان کی ساری کوشش رائگاں جائے گی اور اُن کے خیالات خواہ کیسے ہی بلند اور انقلاب انگیز کیوں نہ ہوں، پت جھڑ کی طرح ہوا میں بکھر جائیں گے۔"

مگر ان نام نہاد "ترقی پسندوں" نے زبان و ادب کی وہ مٹی پلید کی ہے کہ الامان والحفیظ!!

؎ بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

جوش ملیح آبادی کی شاعری کے بارے میں مولوی عبدالحق کی رائے یہ تھی:-

"جوش کے کلام کو پڑھ کر، لطف و سُرور حاصل ہوتا ہے لیکن اس میں بلندیٔ فکر اور تاثیر نہیں۔" (صفحہ ۵۴)

مولوی عبدالحق نے کتنی سچی اور اچھی باتیں کہی ہیں، فرماتے ہیں:-

"ـــــــ یہی وجہ ہے کہ ایک سچے مذہبی آدمی کی خوشی زیادہ پائیدار اور مستقل اور بے غل و غش ہوتی ہے اور اسے اپنے کام پر زیادہ اطمینان ہوتا ہے، وہ گزشتہ کا شکر اور حال پر قناعت کرتا اور آئندہ کی توقع رکھتا ہے، برخلاف اس بوالہوس دولت کے بندے کے جو گزشتہ پر پچھتاتا اور حال میں مذبذب اور بے اطمینان رہتا ہے، اور آئندہ زمانہ اسے تاریک نظر آتا ہے"۔

• ــــ "انسان کے دل سے اس قانون (الہٰی) کے خیال کو مٹا دو اور خدا، حیاتِ جاوید، انصاف، عصمت اور عذاب و ثواب کے خیالات نکال دو تو انسان میں کیا رہ جاتا ہے؟"

• ــــ سائنس دان بیک ایک گدھا [illegible] دودھ [illegible] لگا رہا تھا [illegible] ادھر کی [illegible]

پہونچنی شروع ہوئی ہے، وہ آنکھیں مل مل کے دیکھ رہا ہے کہ یہ نئی شے کیا ہے؟ وہ زمانہ قریب ہے کہ اس کی بصارت روشن اور اُس کی بصیرت منور ہو جائے اور مذہب سے آکر بیعت کرے۔"

• ——— اسلام نے اپنا دائرہ اس قدر وسیع کر دیا ہے کہ اس سے زیادہ وسیع ہونا ممکن نہیں اور یہی وجہ ہے اس کا ہمیشہ بول بالا رہے گا، اور دُنیا پر اُس کی حکومت ہوگی، اسلام نے مذہب کی تکمیل کر دی اور خدا کی نعمت کو سارے عالم پر پھیلا دیا۔ اس کا مشرب اس قدر ہمہ گیر، اس کے اخلاق اس قدر پاکیزہ اور اُس کی تعلیم اس قدر اعتدال پر مبنی اور انسانی ترقی کی ضامن ہے کہ دُنیا کی مادی اور روحانی ترقی کا اس سے بہتر ذریعہ نہیں ہو سکتا۔"

• ——— "اب تک قدیم مذاہب میں سے کسی نے صداقت کے ایک پہلو پر زور دیا تھا اور کسی نے دوسرے پہلو پر ——— مگر اسلام نے صداقت اور حقیقت کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا، اور ان سب کو اس اعتدال اور خوبی سے ترتیب دیا کہ اس کی نسبت یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ وہ (یعنی اسلام) خاتم المذاہب اور اکمل الادیان ہے اور انسان کی ترقی اور نجات کا سچا اور صحیح راستہ ہے۔"

اُردو زبان کے بارے میں محترمہ آمنہ صدیقی کا یہ کہنا:—

"اسے ہم انگریزی، فرانسیسی یا چند ایک دوسری زبانوں کی طرح بہت ترقی یافتہ تو نہیں کہہ سکتے ——"

احساسِ کمتری اور شدید انفعالیت کی دلیل ہے، اُردو زبان اپنی کمسنی کے باوجود دُنیا کی کسی ترقی یافتہ زبان سے کمتر اور ہیٹی نہیں ہے۔

"کبھی انھوں نے خطابت کے سہارے دلوں کو گرمایا۔" (صفحہ ۴)

مولوی عبد الحق سیدھے سادے انداز میں اپنے خیالات کے اظہار پر بے شک قدرت رکھتے تھے مگر اُن کی تقریر پر خطابت کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

"اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ہے کہ کسی ادارے نے کامل پچاس سال تک زبان و ادب کی ترویج کے لئے کام کیا ہو۔" (صفحہ ۵)

انجمن ترقی اُردو کے علاوہ دار المصنفین اعظم گڑھ بھی پچاس سال سے علم و ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے اور اُس کی علمی خدمات انجمن ترقی اُردو کی ادبی و علمی خدمات سے بہت زیادہ وقیع ہیں۔

"مذہب و سائنس کا موازنہ ایک بہت ہی مبتذل موضوع ہے۔" (صفحہ ۱۱)

"مبتذل" کے لغوی معنی "عام اور روزمرہ کی چیز" کے بھی ہیں۔ مگر اُردو میں یہ لفظ عام طور پر "ذلیل اور حقیر و کمینہ" کے معنی میں بولا اور لکھا جاتا ہے! اس لئے مذہب و سائنس کے موازنہ کو "مبتذل" کہنا، اس کی دلیل ہے کہ لکھنے والے کو اس لفظ کے مروجہ معنی ہی معلوم نہیں ہیں۔

"انھوں نے اپنے مقدموں کو قصیدہ گوئی یا مناقب خوانی کی کھتونی نہیں بنایا۔" (صفحہ ۱۲)

"کھتونی" کا یہاں استعمال بے محل ہوا ہے! "واقعات کی کھتونی" تو بولتے اور لکھتے ہیں "قصیدہ گوئی اور مناقب خوانی کی کھتونی" نہ بولا جاتا ہے اور لکھا جاتا ہے۔

مولوی عبدالحق بابائے اردو کی تحریروں کے جو اقتباسات اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں، ان میں بھی بعض مقامات پر لفظ و بیان کی کھٹک محسوس ہوتی :۔

"لفظ میں ایک جادو ہوتا ہے، جو بے محل استعمال سے پھیکا پڑ جاتا ہے"۔

"جادو" کے لئے "پھیکا پڑنا" نہیں بولا جاتا۔

"تو وہ چیخ و پکار اور شور و غل سے کام لیتا ہے"۔ (ص ۹۳)

"چیخ و پکار" کے درمیان واو عطف لانا درست نہیں! اس کے علاوہ "لوٹ مار" "چیخ پکار" "چھیڑ چھاڑ" "مار دھاڑ" یہ الفاظ "واو" کے بغیر بولے جاتے ہیں۔

"دلوں میں گھر کر لینے کے جو گر ادب میں ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے"۔ (ص ۱۶۷)

"گر" اور اس کے ساتھ "ادب میں ہیں" یہ انداز بیان کتنا گنجلک اور نامانوس ہے!

"۔۔۔ تحریک اگر حق پر ہے، اور کام کرنے والوں میں خلوص اور استقلال ہے، تو مخالفت دب جائے گی۔ اور تحریک سو بسوے کامیاب ہوگی" (ص ۲۲۷)

بیس بسوے کا ایک بیگھہ اور بیس بسوے کا ایک گاؤں ہوتا ہے۔ تو ایسے موقعوں پر "بیس بسوے" بولنا چاہیئے۔ "سو بسوے" غلط ہے "سو" تو فی صد کے ساتھ بولا جاتا ہے ——— ایک مثال:۔ "اسکی بات سولہ آنے صحیح ہے" ——— اب کوئی یوں کہے کہ "اس کی بات سو آنہ صحیح ہے" تو یہ روز مرہ کی غلطی ہے اس لئے کہ سولہ آنے کا ایک روپیہ ہوتا ہے اور "سولہ آنہ" کہہ کر یہ بات ظاہر کی گئی ہے کہ فلاں شخص کی بات پوری طرح صحیح ہے اس میں کسی قسم کی کوکسر نہیں پائی جاتی۔ (یہ مضمون کتابت ہو رہا تھا کہ دوسرے اہل زبان سے دریافت کرنے اور لغت دیکھنے پر پتہ چلا کہ مولوی صاحب نے "سو بسوے" صحیح لکھا ہے اور ہمارا اعتراض درست نہیں ہے) ——— "جس نے اپنی بساط سے زیادہ قدم مارا ہے" (ص ۲۴۸)

دوڑ دھوپ کرنے کے معنی میں "قدم مارنا" آ کل نہیں بولا جاتا۔

عرضِ نغمہ

از :۔ نیاز فتحپوری، ضخامت ۹۶ صفحات، قیمت :۔ ایک روپیہ پچیس پیسے۔

ملنے کا پتہ :۔ نگار پاکستان، کراچی ۳

رابندر ناتھ ٹیگور کی نظموں کا مجموعہ ——— گیت انجلی ——— عالمگیر شہرت رکھتا ہے، اس مجموعہ کو جناب نیاز فتحپوری نے اردو میں منتقل کیا ہے، اور اس پر بسیط مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔ اردو ترجمہ شستہ اور رواں ہے، جس میں سادگی و پرکاری کے ساتھ نغمگی بھی پائی جاتی ہے، ایک نمونہ :۔

"اقطاع عالم کے ساحل پر بے شمار لڑکے شور کرتے ہوئے، ناچتے ہوئے جمع ہوتے ہیں، وہ ریت کے مکانات بناتے ہیں۔ خالی کوڑیوں سے کھیلتے ہیں، مرجھائی ہوئی پتیوں سے وہ اپنی کشتیاں بناتے ہیں، اور مسکراتے ہوئے اس وسیع و عمیق سمندر میں تیرا دیتے ہیں، بچے

* دیہی آراضی کی پیمائش کی اصطلاح ہے! بیس کچوانسی کی ایک "بسوانسی" اور بیس بسوانسی کا ایک "بسوہ" ہوتا ہے اور بیس بسوے کا بیگھہ! ——— اور ایک سالم گاؤں میں بیس بسوے ہوتے ہیں، یہ بسوہ بسوانسی والے بیگھہ سے مختلف ہے!

دُنیا کے ساحل بحر پر یوُں ہی مشغلہ لہو ولعب جاری رکھتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے تیرنا کیا چیز ہے؟ اُنہیں نہیں معلوم کہ جال کیوں کر ڈالا جاتا ہے۔ سیپیاں جمع کرنے والے موتیوں کے لئے غوطے لگایا کرتے ہیں، تاجر اپنے جہازوں میں سفر کیا کرتے ہیں، لیکن بچے تو ہمیشہ سنگریزے ہی جمع کرتے ہیں اور پھر انہیں منتشر کر دیا کرتے ہیں۔۔"

ترجمہ میں بعض مقامات محلِ نظر بھی ہیں:۔

"دائم الجدت نغمے پھونک رہا ہے" (ص۳۳) "دائم الجدت" نامانوس ترکیب ہے! ایسے موقعوں پر متن کے کسی ایک لفظ یا ایک ترکیب کا مفہوم ظاہر کرنے کے لئے، مترجم کو ایک جملہ بنانا چاہیئے۔

"موسم بہار کا پُر آرزو نفس اپنی تکمیل کا متجسس ہے" (ص۴۲) اس خیال کو ان لفظوں میں ظاہر کرنا تھا ـــــــ "موسم بہار کے سینہ میں آرزو اپنی تکمیل کے لئے بے تاب ہے"!

"اک عجز مسرور کے عمق میں اک دُھندلی مسرت کے سایہ میں!" (صفحہ ۶۱) یہ اسلوب بیان فنِ ترجمہ کے ساتھ مذاق ہے!!

"یہ وہی نہاں ترین وجود ہے، جو اپنے عمیق پوشیدہ مَس سے میری ہستی کو بیدار کر دیتا ہے" (ص۸۰) "نہاں ترین وجود" یہ کیا بات ہوئی؟ اُس پر "عمیق" "پوشیدہ مَس" مُستزاد! پڑھنے والے کے لئے کوفت بالائے کوفت! کاش! نیازؔ صاحب ایسے مقامات پر مولوی عنایت اللہ دہلوی اور ڈاکٹر عابد حسین کے "تراجم" کا نمونہ پیش کر سکتے! ـــــــ واہ رہی! "مسرت غیر ناقص" (ص۸۲) "غیر ناقص" کی جگہ "ادھوری" لکھنا تھا ـــــ!

"میرا لباس کسی مُسافر کی طرح گیروا تو ہے ہی نہیں" (ص۹۱) نہ جانے متن کے کس لفظ کا ترجمہ "گیروا" کیا گیا ہے! مسافروں کا کوئی خاص لباس نہیں ہوتا، ہاں! فقیر "گیروا" کپڑے پہنتے ہیں! پیدل مُسافر کے کپڑے گرد و غبار کے سبب "مٹیالے" البتہ ہو جاتے ہیں

"میرا قرض کثیر ہے، میری ناکامیاں عظیم، اور میری شرم پوشیدہ و گراں" (ص۴۸) اگر یہ لفظی ترجمہ ہے اور ٹیگور نے "شرم کو پوشیدہ و گراں" ہی کہا ہے، تو ایک بے تکی بات کہی ہے!

"میں ہمیشہ چاروں طرف سے اس دیوار کے بنانے میں مصروف رہتا ہوں، اور جس قدر یہ دیوار آسمان کی طرف بلند ہوتی جاتی ہے، اسی قدر میں اس کے تاریک سایہ میں اپنے حقیقی وجود کو نگاہوں سے غائب دیکھتا ہوں" (ص۴۹) ترجمہ خاصہ رواں ہے ـــ ہم نے یہ عبارت اس لئے درج کی ہے کہ ہمیں ایک ہندوستانی فلم کے مکالمہ کا ایک جُملہ "دیوار" کے ذکر کے ساتھ یاد آ گیا ـــ ایک بوڑھا شخص کہتا ہے۔

"میری لڑکی جتنی سیانی ہوتی گئی، میں اپنے گھر کی دیوار کو اتنا ہی اُونچی کرتا چلا گیا۔۔۔"

رابندر ناتھ ٹیگور کے ایک شعر کا ترجمہ ہے:۔

"ایک مسافر کو اپنے ہی دروازہ پر پہونچنے کے لئے ہر اجنبی در کھٹکھٹانا پڑتا ہے"۔

اس عبارت کو ہم نے بار بار پڑھا اور وجدان نے ہر بار نیا لُطف محسوس کیا، "گیت انجلی" میں اس طرح کے بہت سے اشعار ہونے چاہیئے تھے! مگر یہ رنگ کہیں کہیں جھلکتا ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری میں کہیں "ہندو تصوف" (ویدانت) ملتا ہے، اور کسی جگہ نیٹشے کے انداز پر "مجذوبیت" سی پائی جاتی ہے، وہ سامنے کی بات کو قصداً پُر تکلف، پیچیدہ اور پُر اسرار بنا کر کہتے ہیں، ان کی شاعری "علمی کم اور خیالی"

یادہ ہے! ذاتِ باری سے کہیں کہیں اس طرح خطاب کیا ہے جیسے وہ کوئی محسوس و مشہود و مجسم وجود ہے!

ہم اسی وقت بداہتہً بلکہ ارتجالاً چند "بول" لکھتے ہیں:۔

- ——— "فقیر کی کٹیا میں کچھ بھی نہیں اور سب کچھ ہے!" "کچھ بھی نہیں" اُس کے لئے جو نگاہ حقیقت شناس نہیں رکھتا، اور "سب کچھ" اُس کے واسطے، جو حقیقت نگر ہے۔"
- ——— "بط جب تالاب کی سطح پر تیرتی ہے تو کائی پھٹ جاتی ہے! ہائے! تالاب کے سینہ کا زخم! مگر بیچاری بط کچھ نہیں جانتی، تیرنا تو اُس کی فطرت ہے!

بط ——— اُس کی فطرت ——— تالاب کے سینہ کا زخم ——— یہ پوری کہانی اور مکمل افسانہ ہے!

- ——— اُس طرف آسمان کے دریچے وا ہوئے، اِدھر دل کے جھروکے کھلے ——— نُور کی ایک لکیر فضا میں کھنچی اور پھیلتی چلی گئی! کون کہہ سکتا ہے کہ یہ مشاہدہ تھا، رویت تھی، یا خواب تھا اگر خواب تھا، تو لے میرے خوابوں کے شہنشاہ! میں سدا خواب ہی دیکھتا رہوں اور بیداری میرے پلکوں کے پاس بھی نہ پھٹکنے پائے!
- ——— رنگ بھی اُڑتا ہے اور پرندہ بھی اُڑتا ہے! مگر رنگ کے اُڑنے کو "شکست" اور پرندے کے اُڑنے کو "پرواز" کہتے ہیں۔ ۔ ۔"

یت "انجلی" میں یہی رنگ ہر جگہ جھلکتا ہے۔

فضائل علم و ادب

از:۔ افادات:۔ حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ، ترجمہ:۔ مولانا عبدالحلیم (فاضل عربی)
ضخامت ۱۴۴ صفحات، قیمت:۔ ایک روپیہ بارہ آنہ۔
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور ۲

اس کتاب میں قرآن و احادیث کے حوالوں کے ساتھ "علم اور علماء" کے فضائل و مناقب بیان کئے گئے ہیں ——— کہ "علم" یا خصوصیات ہیں اور "علماء دین" عابدوں اور زاہدوں پر کس قدر فضیلت رکھتے ہیں، ترجمہ عام فہم اور سلیس ہے۔

"اسی طرح آدمی ہے کہ جب اس کا جوہر اکمل اور خدائے عز و جل کے معیارِ رسالت پر پورا ہو تو اُسے نبی اور رسول بنا دیا جاتا ہے۔" (ص ۹)

ہ کی یہ عبارت گنجلک ہے، اور اس کے پڑھنے سے اس قسم کا وہم پیدا ہو سکتا ہے کہ نبوت و رسالت میں بندہ کے "کسب و ت" کو بھی دخل ہے۔

جگہ جگہ "مرض" اور "امراض" کو مونث لکھا ہے، حالانکہ مرض بصورت واحد و جمع بالاتفاق "مذکر" ہے ——— کتاب کی یت اپنی جگہ مسلّم ہے۔

یسِ حیات

از:۔ عبدالرحیم جاوید الٰہ آبادی، ضخامت ۹۶ صفحات۔ قیمت:۔ ایک روپیہ ۲۵ پیسے۔
ملنے کا پتہ:۔ رحمان برادرز اردو بازار، گوجرانوالہ۔

کوئی صاحب جاوید الٰہ آبادی ہیں، یہ اُن کے کلام کا مجموعہ ہے، جس پر دیباچہ جناب محمد حفیظ حسرت قریشی نے لکھا ——— دیباچہ کا یہ رنگ ہے۔

"حضرت جاوید الٰہ آبادی بھی ایک ایسی ہی ہمہ گیر شیریں و خوشنوا بلبل کی طرح ہیں، جن کے
کلام کی رنگین بیانیوں اور وجد آفرینیوں نے شعری تخلیقات کے دریا بہائے ہیں" ـــ

"بلبلِ شیریں و خوشنوا" کا ہمہ گیر" ہونا ـ اور "کلام کی رنگین بیانیاں" اس پر مستزاد ـــ "کلام کی رنگین بیانیوں اور وجد آفرینیوں نے شعری تخلیقات کے دریا بہا دیئے" ـــــــ شاعر کے ذوقِ انتخاب کی داد دیجئے کہ اپنے مجموعہ کلام پر دیباچہ ایسے "بلند پایہ" (؟) ناقد سے لکھوایا ہے!

سلام اے وہ حسین مصر اوادنیٰ تجھے کہیے — سلام اے وہ فرازِ لامکاں ہے تیرے جولانی (صفحہ ۲۱)

"حسین مصر اوادنیٰ" یہ کیا ترکیب ہے! "صاحب قاب قوسین" شعر میں نہ آسکا تو "حسین اوادنیٰ" نظم کر دیا ـــــ "مصر" کی تک بالکل سمجھ میں نہیں آئی!

تیرا وجود پاک ہے باعثِ خلقِ کائنات — شمعِ صراطِ مستقیم، تیری حیاتِ طیبات (صفحہ ۲۲)

"حیاتِ طیبہ" کی جمع "حیاتِ طیبات" پہلی بار نظر سے گزری!

تو نے بدل کے رکھ دیا نقشہ محفلِ حیات — اہلِ جہاں کو کر دیا غرقِ یمِ تحیرات

"غرقِ یمِ تحیرات" کا بھلا کوئی جواب ہے! یہ کیا کہ جو لفظ اور ترکیب ذہن میں آئی اسے شعر میں جوڑ دیا۔

ہیں جن و بشر اور ملک کیا کہ یزداں — ہے کرتا ترا احترام اللہ اللہ (صفحہ ۲۷)

وجدان کے لئے ناگوار بلکہ تکلیف دہ تعقید!

سطوتِ کسریٰ، شکوہِ قیصری سب مٹ گیا — چھا گئی عالم پہ تیرے خُلق کی تیغ دودم

"خلق" کی تیغ اور وہ بھی "دودم" ـــــ پھر اُس کا یہ اثر کہ کسریٰ کی سطوت اور قیصر کا شکوہ مٹ گیا ـــــ فنِ تاریخ اور شاعری دونوں کے ساتھ مذاق!

چشمِ دل کھول تو اے کشتۂ تہذیبِ جدید — تو نے غفلت سے کیا گم وہ کہاں بختِ سعید
روز و شب جامِ مئے وحدت سے تو مخمور تھا — لذتِ جور و ستم میں تو بہت مسرور تھا
بجھا دیں شعلہ ہائے منکرات و فاحشات اب ہم — عدوئے دینِ یزداں کو جہاں سے بے نشاں کر دیں

حیرت ہے کہ اس قسم کی "تک" جوڑنے والے اپنے کو شاعر سمجھتے ہیں اور اُن کے "کلام" (؟) پر مقدمہ اور دیباچہ لکھنے والے اور اسے چھاپنے والے بھی ہاتھ لگ جاتے ہیں!

اہمیتِ طریقت

از:- مولانا سید نوری حسنی القادری، ضخامت ۲۰ صفحات ـ قیمت ۵۰ پیسے،
ملنے کا پتہ:- نیشنل بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدر آباد دکن (انڈیا)

تصوف اور طریقت پر یہ ایک مختصر رسالہ ہے، اس کتابچہ کی قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ شریعت کے اتباع پر بہت زور دیا گیا ہے ـــــ کتاب کے آخر میں "طریقت کانفرنس" کے سالانہ اجلاس کا خطبۂ صدارت شامل ہے!

"اس کتاب کو میرے جدِ امجد سرکار غوث الثقلین سے منتسب کر رہا ہوں"۔

یہ دکنی زبان ہے کہ "اپنے" کی جگہ "میرے" لکھا گیا ہے!

"حضور کی ذات بہ مصداق اس کے کہ:-

؎ اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

آپ کی حقیقت نور، آپ کا مقام نور، آپ کا نام نور، آپ کے افعال نورانی، اگر کوئی خاکی آپ کو سمجھے تو کیا خاک سمجھے"۔ (صفحہ ۱)

حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی "معمہ" نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی آیات کی روشن کتاب ہے، اگر حضورؐ کی ذات "معمہ" ہوتی، تو وہ دُنیا کے لئے "نمونہ" کس طرح بن سکتی تھی ــــــ پھر حضور کی "بشریت" کتاب و سُنت سے ثابت ہے، اس میں ذرہ برابر ابہام نہیں، حضور نسلِ آدم کے ایک فرد ہیں مگر سب سے افضل و اعلیٰ! جو کوئی حضور کی "بشریت کے بارے میں وہم پیدا کرتا ہے۔ وہ "کتاب و سُنت" کی ثابت شدہ حقیقت کو مشتبہ بناتا ہے۔

"یہ عجیب مخلوق ہے کہ خالق خود جس پر شیدا ہے" ــــــــــــ

اللہ تعالیٰ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا "شیدائی" کہنا، مولود خوانوں اور بازاری قسم کے واعظوں کا اندازِ بیان اور اسلوبِ فکر ہے!

"سلف الصالحین نے طریقت کو بہت کچھ اپنایا ہے۔ اور اس کے اعلیٰ مقامات حاصل کرنے کی سعی بلیغ بھی کی ہے۔ تمام اولیائے کبار کا مسلک طریقت ہی تھا۔ خود حضور سرکار عالم کی ساری زندگی طریقت ہی کی نمائش تھی"۔ (صفحہ ۱۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے "طریقت" کی نسبت عجیب سی لگتی ہے! پھر اس عبارت میں لفظ "نمائش" بہت کچھ کھٹکتا ہے!

تفسیر سُورۃ الفاتحہ

از:۔ مولانا سید نوری شاہ چشتی القادری، ضخامت ۴۸ صفحات قیمت:۔ ۵۰ پیسے،
ملنے کا پتہ:۔ سید نوری شاہ صاحب حیدر آباد دکن ہند

اس کتابچہ کا آغاز جناب سید عبدالوہاب بخاری (پرنسپل نیو کالج، مدراس) کے دیباچہ سے ہوتا ہے، مولانا سید نوری شاہ صاحب نے سورۃ الفاتحہ کی تفسیر "بطرزِ معارف" بیان کی ہے، اور دین و شریعت کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے!

مشکلاتِ غالب

از:۔ نیاز فتحپوری، ضخامت ۱۶۰ صفحات، قیمت دو روپے، ملنے کا پتہ:۔
نگار پاکستان ۲۳۷ گاندھی گارڈن مارکیٹ، کراچی ۲

غالب کے جن شعروں میں ابہام، ژولیدگی اور اشکال پایا جاتا ہے، جناب نیاز فتحپوری نے اُسے دور کرنے، سمجھانے اور اس قسم کی پیچیدگیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے! اُن کی یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب ہے ــــ چند نمونے:۔

نفس موجِ محیطِ بے خودی ہے　　تغافلہائے ساقی کا گلہ کیا

"ہماری ہر سانس خود اپنے دریائے بیخودی کی موج ہے، اس لئے ساقی کے تغافل کی شکایت بیکار ہے، کیونکہ اس کے تغافل سے ہماری بے خودی میں تو کوئی کمی ہو نہیں سکتی"۔

دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے　　غمِ آوارگیہائے صبا کیا

غالب کا یہ شعر باوجود سادہ ہونے کے کافی اُلجھا ہوا ہے۔

"عطر محض خوشبو کو کہتے ہیں اس لئے "عطرِ پیراہن" کے معنی خوشبو کے لباس کے ہوئے ــــ "دماغ نہ ہونا" برداشت نہ ہو سکنا ــــــ سوال یہ ہے کہ یہاں کس کا پیراہن مُراد

ہے! اپنا یا محبوب کا؟ بعض حضرات نے خود غالبؔ کا لباس قرار دیا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہاں لباس یار مراد ہے اور غالبؔ یہ کہنا چاہتا ہے کہ اگر صبا کی آوارگی پیراہن محبوب کی خوشبو کو اِدھر اُدھر لئے پھرتی ہے اور ہم تک نہیں پہونچاتی، تو ہم کو اس کا غم کیوں ہو جبکہ خود ہم میں اس خوشبو سے لطف اُٹھانے کی تاب نہیں ہے"۔

جو تھا سو موج رنگ کے دھوکے میں مر گیا   اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

"موج رنگ کے دھوکے میں مر گیا" یعنی موج رنگ پر فریفتہ ہو گیا، گُل کو "لبِ خونیں نوا" فرض کر کے افسوس ظاہر کیا ہے کہ دُنیا بھی کتنی حقیقت ناشناس ہے کہ وہ پھول کو موج رنگ سمجھ کر خوش ہوتی ہے، حالانکہ در اصل "لبِ خونیں نوا" ہے، جس پر اظہار غم کرنا چاہئیے"

سُراغ تفِ نالہ ہے داغِ دل سے   کہ شب رو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

"شب رو ــــــ چور یا قزاق جو عموماً رات کے وقت نکلتے ہیں ــــــ مطلب یہ ہے کہ جس طرح شب رو کے نقشِ قدم سے اُس کا سُراغ لگایا جاتا ہے، اسی طرح میرے نالہ کی گرمی کا پتہ میرے داغِ دل سے چل سکتا ہے، یعنی اگر میرے نالہ میں اتنی گرمی ہے تو حیرت کی کیا بات ہے؟ داغِ دل بھی تو اُتنا ہی گرم ہے"۔

صفحہ ۵۸ پر :-

ہے   درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا ــــــ

کی شرح کرتے ہوئے نیاز صاحب لکھتے ہیں :-

"عرض ــــــ وہ چیز جس کے ذریعہ جوہر ظاہر ہوتا ہے"

حالانکہ یہ "عرض" بروزن "فرض" نہیں بلکہ "عرض" بروزن "مرض" ہے۔ جس کی جمع "اعراض" آتی ہے۔

"یعنی جس طرح جال میں عنقا نہیں پھنس سکتی" (صفحہ ۶)

حیرت ہے کہ نیاز صاحب عنقا (مذکر) کو مونث بولتے ہیں۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے   دُشوار تو یہی ہے کہ دُشوار بھی نہیں (صفحہ ۸۱)

"مفہوم یہ ہے کہ اگر تجھ تک رسائی آسان نہ ہوتی، یعنی دُشوار ہوتی، تو یہ بات ہمارے لئے سہل تھی، کیونکہ اس طرح ہم مایوس ہو کر خاموش بیٹھ جاتے، لیکن چونکہ تیرا ملنا ناممکن نہیں ہے بلکہ ہر غیر سے مل سکتا ہے، اس لئے نہ ہمارا شوقِ آرزو کم ہوتا ہے اور نہ یہ جذبۂ رقابت کہ تجھ سے ہر شخص مل سکتا ہے"۔ (نیاز فتحپوری)

کیا جو چیز دُشوار ہوتی ہے؟ اُس کی طلب دُشواری اور دقت کی وجہ سے چھوڑ دی جاتی ہے۔ "دُشوار" ناممکن کو نہیں "امرِ مشکل" کو کہتے ہیں ــــــ غالبؔ کے اس شعر کو شارحین نے طرح طرح سے بیان کیا ہے، ہمارے خیال میں، اس شعر کا مفہوم یہ ہے ــــــ کہ "تیرا ملنا اگر آسان نہ ہوتا، یعنی مشکل ہوتا تو یہ بات بہت سہل تھی کہ کوشش و جستجو کے ذریعہ مشکل کو آسان بنایا جا سکتا ہے، مگر مشکل تو یہ آن پڑی ہے کہ تیرا ملنا دُشوار بھی نہیں ہے، یعنی ناممکن ہے اگر عشق کی فطرت یہ ہے کہ محبوب کے ملنے کی پھر بھی تمنا کی جائے اور سعی و طلب کو جاری رکھا جائے! تو بے چارہ عشق اُس شے کی طلب میں

سرگرداں رہتا ہے، جس کا ملنا ناممکن نہیں!

اہل تدبیر کی واماندگیاں　　آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں　(صفحہ ۸۱)

"جب پاؤں میں چھالے پڑجاتے ہیں، تو عموماً اُن پر مہندی باندھ دیتے ہیں، تاکہ چھالے اچھے ہوجائیں، لیکن غالب کہتے ہیں کہ یہ چارہ سازوں کی واماندگی اور سعیِ بیجا ہے کیونکہ جب آبلہ پائی مجھے صحرا نوردی سے باز نہ رکھ سکی، تو اس کی حنا بندی کیا باز رکھ سکتی ہے۔"　(نیاز فتحپوری)

نیاز صاحب نے جو مفہوم بیان کیا ہے، اُس کے لحاظ سے "بھی" حشو وزائد قرار پاتا ہے۔ ہمارے خیال میں غالب نے اس شعر میں ایک کلیہ بیان کیا ہے ——— اور اس کی بنیاد حافظ کے اس مصرعہ پر ہے :-

؎ کہ کس نہ کشود و نہ کشاید بہ حکمت ایں معمارا

غالب کا مفہوم یہ ہے کہ اہلِ تدبیر و دانش اور اربابِ حکمت جو حقائق معلوم کرنے کے لئے سعی و تدبیر کرتے اور اپنی عقل لڑاتے ہیں ——— تو اُن کی کوششوں سے حقیقت کی ایک گرہ بھی نہیں کھل پاتی۔ اس منزل میں وہ حیران و واماندہ ہی نظر آتے ہیں! اور اُن کی تدبیر کا یہ حال ہے، جیسے کسی کے پیروں میں چھالے ہوں، جن کے سبب راہ چلنا یوں ہی دشوار ہوتا ہے، اُن آبلوں پر مہندی بھی باندھ لی جائے، تو چلنے میں اور زیادہ تکلف ہوتا ہے۔ ! خلاصہ کلام یہ کہ اہل تدبیر و دانش حقیقت رسی کی منزل میں واماندہ اور عاجز ولاچار ہیں!

سر پہ ہجوم دردِ غریبی سے ڈالیئے　　وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے　(صفحہ ۱۵۴)

"دردِ غریبی و کس مپرسی کا ہجوم دیکھ کر، یہ جی چاہتا ہے کہ خاک بسر ہوجایئے اور صحرا نوردی اختیار کرلیجئے۔"　(نیاز فتحپوری)

مگر

"وہ ایک مُشتِ خاک" کی نیاز صاحب نے شرح نہیں فرمائی، یہ "ترکیب" غالب نے بلا وجہ استعمال نہیں کی! غالب یہ کہتے ہیں کہ ہمارے درد و غم کے مقابلہ میں صحرا تو بس "ایک مُشتِ خاک" ہے! لاؤ، اِس مشتِ خاک کو بھی سر پر ڈال لیں! مگر اس "ایک مشتِ خاک" سے ہمارا غم دور نہیں ہوسکتا (فارسی میں "خاک بر سر کردن" دُور کرنے اور بھلا دینے کے معنی میں بولتے ہیں، حافظ کا مشہور شعر ہے ؎)

ساقیا! برخیز و دردہ جام را　　خاک بر سر کُن غمِ ایام را

آلا۔۔۳ : ۱ ۔ ۱۱۔ [illegible]

اسلام اور آلات موسیقی ـــــ اس قسم کے جدید مسائل پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے دینی نقطۂ نگاہ سے جن افکار کا اظہار کیا ہے، وہ اس کتابچہ میں جمع کر دیئے گئے ہیں! اللہ تعالیٰ نے مولانا مودودی کو تفقہ فی الدین کی قابل قدر صلاحیت اور اس صلاحیت کو استعمال کرنے کا جو سلیقہ عطا فرمایا ہے، وہ اُن کی ہر تحریر اور ہر کتاب میں جھلکتا ہے۔ اپنی انہی علمی اور دینی صلاحیتوں کے سبب وہ "محسود" ہیں! اور بعض علماء تک، جن کو نہ خدا کا خوف ہے اور نہ بندوں کی شرم ہے، مولانا مودودی کی بیجا مخالفت پر اُتر آئے ہیں!

> "اس موجودہ ترقی یافتہ دور میں سعودی عرب میں زنا اور چوری کی سزائیں جاری ہیں، اور تجربے نے تمام دنیا کے سامنے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انہی سزاؤں کی وجہ سے سعودی عرب میں جرائم کی اتنی کمی ہو گئی ہے، جتنی دُنیا کے کسی ملک میں نہیں ہے۔
>
> دراصل اس زمانے میں لادینی تہذیب کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ساری ہمدردیاں مجرموں کے ساتھ ہیں، اسی لئے یہ نقطۂ نظر پیش کیا جاتا ہے کہ یہ سزائیں وحشیانہ ہیں، اس کا دوسرا مطلب یہ ہوا کہ چوری کرنا، کوئی وحشیانہ کام نہیں ہے، البتہ اس پر ہاتھ کا کاٹنا وحشیانہ کام ہے، اور زنا کا ارتکاب تو مغربی تہذیب میں ایک تفریح ہے ہی"۔ ـ ـ ـ ـ ـ (صنا)

مولانا مودودی کی اس تصریح و وضاحت کے بعد بھی جو کوئی اُن پر یہ الزام لگاتا ہے کہ مودودی صاحب "اسلام کی مقرر کی ہوئی سزاؤں کو وحشیانہ سمجھتے ہیں" ـــــ وہ جھوٹ بول کر اپنی عاقبت خراب کرتا ہے۔

یہ کتابچہ "بہ قامت کہتر اور بہ قیمت بہتر" کا صحیح مصداق ہے، کتابچہ کے آغاز میں جناب اسعد گیلانی نے "حرفِ اول" لکھا ہے، جس کا اختتام ان جملوں پر ہوتا ہے۔

> "توقع ہے یہ پمفلٹ اصلاح افکار و تعمیر کردار کی مفید خدمت انجام دے گا، اور جدید طبقہ کی اسلام کے متعلق بہت سی اُلجھنوں کے ازالہ کے لئے، اسلام پسند عناصر اسے زیادہ سے زیادہ پھیلائیں گے"۔

اختلافات روایت شعبہؒ

از:- ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی، ضخامت ۴۰ صفحات، ملنے کا پتہ:- قاری عبدالرحیم صاحب (دارالقرأت) قریب گیٹ بلدیہ، بازار نورالامراء حیدرآباد دکن ـــــ

جناب قاری سید کلیم اللہ حسینی کی کتاب "سراج الترتیل" کا یہ ضمیمہ ہے، جس میں حضرت شعبہ اور حضرت حفص رحمہا اللہ تعالیٰ کی "قرآت" کے اختلافات کی فہرست دی گئی ہے ـــــ چند نمونے:-

حضرت شعبہؒ	حضرت حفصؒ
رُضوان	رِضوان
تذکرون	تذّکّرون
هَشِيْرَاتُكُمْ	هَشِيْرَتُكُمْ

حضرت شعبہؒ ———— حضرت حفصؒ

اِنَّ ھٰذٰ ا بن — اِنْ ھٰذٰ ان

حضرت حفص رحمۃ اللہ علیہ کی روایت قرأت تمام قراتوں میں آسان، سہل اور راجح و مقبول ہے، اس لئے انہی کی روایت سے قرآن کریم کی کتابت ہوتی ہے! حضرت شعبہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت قرأت کو جمہور اُمت نے ترک کر دیا۔

یورپ کا نظریۂ یک زوجگی از:- غلام جیلانی صاحب ضخامت ۶۰ صفحات، قیمت ۱۔ ایکرو پیہ ملنے کا پتہ:- کتب خانہ حُسینیہ اندر قلعہ، چاٹگام۔

اس کتاب میں اکابر مغرب ہی کے افکار و آراء کے حوالوں سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ اسلام نے جو "تعدد ازواج" کی جازت دی ہے، وہ عدل و انصاف اور معاشرے کی پاکیزگی اور فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے فطرت کے عین مُطابق ہے!

کتابچے کے آخر میں مسز اینی بسنٹ کی تحریر کا ایک اقتباس دیا گیا ہے:-

"تم نے لوگوں کو اسلام پر تنقید کرتے ہوئے دیکھا ہوگا کہ اسلام تعدد ازدواج کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن شاید آپ نے میری اس تنقید کو نہیں سُنا جو میں نے ایک دن لندن ہال میں اس سلسلہ میں کی تھی میں نے اپنی تقریر میں اس بات کی وضاحت کی تھی کہ ہمارے یہاں ایک طرف تو یک زوجگی اور دوسری طرف قحبہ گری کھلی ہوئی مکّاری ہے، نظریہ تعدد ازدواج اس ذلّت سے ہزار درجہ بہتر ہے، مجھے اس بات کا کامل اعتراف ہے کہ میرے اس طرح کے بیانات سامعین کے لئے سخت تکلیف دہ ہیں، لیکن میں کیا کروں میں اپنے خیالات کو ظاہر کرنے پر مجبور ہوں، کیونکہ عورتوں کے متعلق جو قانون اسلام نے رائج کیا ہے، وہ میرے نزدیک تمام قوانین عالم کی بہ نسبت عورتوں کے لئے انتہائی موزوں اور صحیح ہے۔"

یہ کتاب پاکستان کے ان صاحبانِ اقتدار کو پڑھنی چاہیئے، جو "عائلی قوانین" کے واضعین ہیں اور پاکستان کے مسلمانوں کے متفقہ احتجاج کے باوجود، ان خلاف شریعت قوانین کی تنسیخ و ترمیم کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہوتے ——— افسوس!!

قضا و قدر اور آدابِ زندگی خُطبات خواجہ عبدالمجید قادری (پیر دیول شریف) مُرتبہ:- سید محمد سعید۔ ضخامت ۴۴ صفحات ملنے کا پتہ:- اسلامی رُوحانی خضری مشن ۴/۷۵ شاستری روڈ، کراچی ۵ ؎!

جناب پیر دیول شریف صاحب کے یہ دو خطبے جو اس کتابچے میں جمع کئے گئے ہیں اپنے اپنے موضوع پر مختصر ہیں مگر مُفید ہیں، ان کے پڑھنے سے دینی احساس اُبھرتا ہے اور رجوع الی اللہ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے!

پہلے خطبہ میں بتایا گیا ہے کہ دُنیا کی وہ ترقی جس میں رضائے الٰہی شامل نہیں ہوتی، کائنات کی پریشانی اور ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے ——— دوسرے خطبہ میں اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کی تلقین کی گئی ہے ——— پیر صاحب موصوف نے کتنی سچی بات کہی ہے:———

"اگر تم کسی ولی اللہ کا دامن اس واسطے پکڑو کہ احکامِ خداوندی نہیں بجالاؤ گے، پھر بھی وہ تمہیں بخشوا دے گا تو یہ امر ...

اگر اہلِ تصوف اپنے ملفوظات و ارشادات میں یہی لب و لہجہ اور اسلوب اختیار فرمائیں تو اس کے دینی فوائد اپنی جگہ مُسلّم ہیں!

جماعت اسلامی پاکستان کا جمہوری اور شورائی نظام

مُرتبہ :- اسعد گیلانی ، ضخامت ۲۴ صفحات

ملنے کا پتہ :- شعبہ نشر و اشاعت جماعت اسلامی ، سرگودھا۔

اس کتابچہ میں بتایا گیا ہے کہ جماعتِ اسلامی پاکستان کا نظام جمہوری اور شورائی ہے اس میں افراد کی نہیں بلکہ "صفات" کی اہمیت تسلیم کی جاتی ہے ، امیر جماعت کا انتخاب آزادی کی فضا میں ہوتا ہے۔ جماعت کی داخلی اصلاح محاسبہ اور تنقید کے ذریعہ ہوتی رہتی ہے ! "حُرّیتِ فکر و نظر" جماعت اسلامی کا طُغرائے امتیاز ہے۔

مقامِ افسوس ہے کہ جماعت اسلامی جس کا مقصد اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند اور غالب کرنا ہے اور جو اسی جد و جہد میں برسوں سے لگی ہوئی ہے ، اُسے بدنام اور مطعون کرنے کی طرح طرح سے کوششیں جاری ہیں اور جماعت کے مخلص و درد مند کارکن صبر کے ساتھ ان چرکوں کو برداشت کر رہے ہیں !

شاد

ضخامت ۳۲ صفحات ، قیمت پچاس پیسے ، ملنے کا پتہ :- نیا خواب ، پرانی تحصیل ، رام پور۔

رام پور کے شاعروں کے انتخابی سلسلہ کی یہ دوسری پیش کش ہے ، جو "بہ تقریب جشن شاد عارفی" (اکتوبر ۱۹۶۲ء) منظرِ عام پر آئی ہے ، اس کتابچہ میں جناب شاد عارفی کی غزلوں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے' اُن کے یہ اشعار کتنے شگفتہ ، دل نشین اور اثر انگیز ہیں :-

سوچنے آئے گی تب سعیٔ رفو گر کیا کام
جب نہ دامن ہی رہیں گے نہ گریباں ہونگے

ناصح جو غلط بین و غلط کار رہا ہے
آنکھوں سے تڑپ ذہن سے نادار رہا کر

اندھیرے کو اندھیرا ہی کہیں گے دیکھنے والے
سوادِ شام کو صبح وطن کہہ دوں تو کیا ہوگا

ہم خدا کے ہیں وطن سرکار کا
حکم چلتا ہے مگر زردار کا

خشک لب کھیتوں کو پانی چاہیئے
کیا کریں گے ابر گوہر بار کا

عہدِ حاضر کی روشنی پہ نہ جاؤ
جب ستارے بجھیں چراغ جلاؤ

تجربے جن کو جنوں کے نہ گریبانوں کے
طنز کرتے ہیں وہ حالات پہ دیوانوں کے

وقت کیا شے ہے پتہ آپ کو چل جائیگا
ہاتھ پھولوں پہ بھی رکھو گے تو جل جائیگا

یہ بُستانِ مرمریںِ بُت کدہ !
جیسے اب انگڑائی لی ، اب بات کی

اپنے سر الزام کیوں لیتے ہیں پھونکیں مار کر
آپ بجھ جائیں گے بے نور مٹی کے دیئے

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

اب ہاتھ بڑھ گیا ہے تو میرا قصور کیا
میں کہہ چکا تھا جام مرے رُو برو نہ آئے

یا تو ساقی جانتا ہے ، یا مجھے معلوم ہے
جس طرح محفل میں مجھ تک جام پہونچایا گیا

انتخاب میں اس طرح کے اشعار بھی آگئے ہیں۔

جتنی چادر کی پونجی ہو اتنے پاؤں پھیلاؤ
جُڑ جائے زخموں کو نمک ہی مشکل ہوا سستا تو کیا

"یوں بھی" اس شعر میں حشو و زائد ہے۔ دوسرا مصرعہ گنجلک ہے اور "تغزل" کا تو دور دور پتا نہیں۔

اکھڑنے لگی ظالموں کی ہوا　　　　ٹھہرنے لگے لوگ بسمل کے پاس

مصرعہ ثانی میں خاصا ابہام پایا جاتا ہے!

تری نگاہ میں احساس کا لہو پاکر　　　　کہیں شراب نہ پینے لگوں میں گھبراکر

"احساس کا لہو" بے معنی ترکیب ہے!

گرم حلوا

از:- سید ابو تمیم فرید آبادی، ضخامت ۴۸ صفحات (کتابت جلی، سرورق دیدہ زیب)
قیمت:- چھ آنہ، چھ پائی۔ ملنے کا پتہ:- اردو اکیڈمی سندھ، کراچی۔

یہ کتاب اردو اکیڈمی نے "اردو ترقی بورڈ" کے اشتراک سے شائع کی ہے، جناب سید ابو تمیم فرید آبادی نے بچوں کے لئے ہلکی پھلکی کہانی لکھی ہے، جو دلچسپ بھی ہے اور نصیحت آمیز بھی!

"خواب میں کبھی وہ بستر بند سے اور کہیں باہر جاتے ہوئے دیکھنے لگے" (صفحہ ۵)

عبارت کی ترکیب اور لفظوں کی نشست نے مفہوم کو گنجلک بنا دیا۔ جو کتاب بچوں کے لئے لکھی جاتے، اُس میں لفظ و بیان کا ذرا سا بھی الجھاؤ نہیں ہونا چاہیے ———— "احسان نے لڑکیوں کے والد سے پوچھا کہ آپ دُبلے کیوں ہو رہے ہیں، جب آپ میرے والد کے پاس آتے تھے، تو بہت بہتر بھی تھے۔" (صفحہ ۲۴) "بہت بہتر" اس جملہ میں اکھڑا اکھڑا سا لگتا ہے ———— "پانی کا گلاس صحن میں پھینکا اور خالی رکابیاں چھنا چھن کرکے توڑنی شروع کیں (ص۲۵)" "چھنا چھن" کے بعد "کرکے" کی ضرورت نہ تھی۔

"نہ گانے ہوتے نہ ناچ ——— ناچ گانا ہوتا بھی کیسے، سلطان بیگم نے ہی کافی شور مچا رکھا تھا" (صفحہ ۳۰) "نہ گانا ہوتا" کی جمع بنانے کی کیا ضرورت تھی ———— "آپ گھر کی سب نوکروں اور عورتوں سے کہہ دیجئے" (ص۳۱) "نوکر" کا "مونث" "نوکرانی" ہے اُس کی جمع "نوکرانیوں" آتی ہے۔

"دالان میں شیشے اور فوٹو لٹک رہے تھے، احسان نے اپنے ڈنڈے سے ان سب کو زخمی کرنا شروع کیا۔" (ص۳۳) اُردو میں بے جان چیزوں کے توڑنے پھوڑنے اور انہیں نقصان پہونچانے کو "زخمی کرنا" نہیں بولتے، یہ انگریزی انداز بیان ہے ——— "اگر کبھی غصہ آنے لگتا تو روک لیتی، ڈر جاتی، سوچتی کہ اگر میں نے ایک کام کو غصے کا کیا تو میرا میاں پچاس کام کرے گا۔ (ص۴۱)۔ اس مفہوم کو زیادہ اچھے لفظوں میں بیان کرنا تھا۔

زردہ

از:- سید ابو تمیم آبادی، ضخامت ۴۰ صفحات، قیمت:- ساٹھ پیسے۔
ملنے کا پتہ:- اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی۔

یہ کہانی بھی مزیدار اور دلچسپ ہے مگر زبان و بیان کی غلطیاں بھی کہیں کہیں ملتی ہیں، حیرت ہے کہ "ترقی اُردو بورڈ" نے کتاب کے اصل مسودے پر توجہ نہیں کی۔ اور مصنف پر اعتماد کرکے، جو کچھ انھوں نے لکھ دیا، اُسے آنکھ بند کرکے چھاپ دیا۔

"خرم برتنوں سے پہلے کے وہاں بیٹھے ہوئے تھے" (صفحہ ۵) یہ کیا انداز بیان ہے! "چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر کھچڑی مل مل کر کھا رہی تھیں" (صفحہ ۱۰) "کھچڑی کو مل مل کر کھانا" عجیب مشاہدہ ہے ———— "یہ ایک دفعہ ہی سارے قصبے میں بخار پھیلا" (ص۲۷) اس جملہ میں کس قدر ناپختگی پائی جاتی ہے "ایک دفعہ ہی" نے عبارت کا حلیہ بگاڑ دیا ———— "جی چاہتا ہے تمہارا منہ کچل دوں" (ص۳۱) ایسے موقعوں پر "منہ مسل دوں" بولتے ہیں۔

"خرم کی خدمت سے آخر نفیسہ کا دل پسیجا" (صفحہ ۳۶) "خدمت سے" یہ کہاں کی زبان ہے ——— "احسن قووال کی ہتھیلی پر سے دیں، اگر ان کو آدھی رکابی زردہ مل جائے" اس بے جان جملے پر اس کتابچہ کا اختتام ہوتا ہے۔

ماہنامہ بینات

مرتبہ:- محمد عبدالرشید نعمانی، ضخامت ۶۴ صفحات، چندہ سالانہ چھ روپے۔
فی پرچہ:- ۶۰ نئے پیسے۔ ملنے کا پتہ:- مدرسہ عربیہ اسلامیہ، نیو ٹاؤن کراچی۔

جناب مولانا عبدالرشید نعمانی کی ادارت میں ماہنامہ "بینات" منظرِ عام پر آیا ہے، جس کے پانچ شمارے اب تک شائع ہو چکے ہیں! "بینات" کے مضامین دینی اور علمی اعتبار سے مفید ہوتے ہیں! اس رسالہ کی خصوصیت جو اب تک شائع شدہ شماروں میں آئی ہے، وہ یہ ہے کہ "افراط و تفریط" سے دامن بچا کر اعتدال کی راہ اختیار کی ہے! محمود احمد عباسی کی بدنام کتاب (خلافتِ معاویہ و یزید) کی تردید میں مولانا نعمانی کا جو مضمون بالاقساط آ رہا ہے، اُس نے اس مجلّہ کی اہمیت و افادیت میں اور اضافہ کر دیا ہے! اللہ تعالیٰ ماہنامہ "بینات" کو ترقی دوام اور قبولِ عام عطا فرمائے (آمین)

روئداد سالانہ انجمن خیر خواہ عام وانمباڑی

صدر:- جناب حاجی محمد زکریا ——— جنرل سکریٹری آمنہ حاجی محمد ابراہیم۔
ملنے کا پتہ:- دفتر انجمن خیر خواہ عام مسلم پور، وانمباڑی (مدراس)

اس انجمن کے دو کتابچے ہمارے پاس ریویو کے لئے آئے ہیں! جن میں انجمن کے بجٹ کی تفصیل اور مدرسہ نسواں کی مختصر روداد درج ہے! وانمباڑی میں انجمن خیر خواہِ عام کی زیر سرپرستی "مدرسہ نسواں" جس انداز پر کام کر رہا ہے۔ اُس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں اس مدرسہ میں حاضر ہونے کی سعادت اور مسرت ہمیں حاصل ہو چکی ہے، شریعت کی تمام اخلاقی پابندیوں کے ساتھ طالبات کو جس نہج پر دینی تعلیم دی جا رہی ہے اور بخاص طور سے عربی زبان و ادب کا ذوق اُن میں پیدا کیا جا رہا ہے اُسے دیکھ دیکھ کر مدرسے کے منتظمین کے لئے دل سے دعائیں نکلیں! اللہ تعالیٰ علم و اخلاق اور تربیت و اصلاح کی اس شمع کو ہمیشہ فروزاں رکھے (آمین)

جماعت اسلامی حلقہ سرگودھا کے سالانہ اجتماع کے موقع پر

۵ اپریل

روزنامہ وفاق سرگودھا

جماعت اسلامی نمبر

شائع کر رہا ہے جس میں جماعت اسلامی کے ممتاز اہل قلم اور دوسرے معروف اہل علم و دانش کے رشحاتِ فکر شامل کیے جائیں گے :-

۲۷ صفحات پر مشتمل یہ اشاعتِ خاص ایک اہم تاریخی دستاویز ہوگی ــــ جس میں :-

- مضامین نظم و نثر کے علاوہ ارض القرآن اور بعض دوسرے اہم مقامات کی تصاویر آفسٹ میں طبع کرائی جائیں گی۔
- جماعتِ اسلامی کی تاریخ ۔ دعوت اور تنظیم کے بارے میں تعارفی اور معلوماتی مضامین کے علاوہ جماعت کے سرکردہ رہنماؤں اور ارکانِ اسمبلی کا تعارف بھی شامل کیا جائے گا۔
- جماعتِ اسلامی کی تبلیغی ۔ دعوتی ۔ اصلاحی اور سیاسی سرگرمیوں کی تفصیلات پیش کی جائیں گی۔
- "یادِ رفتگاں" کے عنوان سے جماعت کے ان رہنماؤں کی خوبیوں اور صلاحیتوں پر مشتمل مضامین ہونگے جو گذشتہ چند سالوں میں انتقال فرما چکے ہیں۔
- جناب محمد باقر خان مرحوم کی اس غیر مطبوعہ ڈائری کے چند اوراق بھی شائع کیے جائیں گے جو مرحوم نے مشرقی پاکستان میں جماعت اسلامی کے پہلے وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے قلمبند کی تھی۔
- "جماعتِ اسلامی ۔ میری نظر میں" کے عنوان سے ایک مذاکرہ بھی شامل کیا جائے گا۔
- جماعتِ اسلامی کے ممتاز رہنماؤں اور بعض دوسرے اکابرینِ ملت کے خصوصی پیغامات بھی شائع کیے جائیں گے۔
- ترتیب میں حصہ لینے والوں میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ۔ مولانا امین احسن اصلاحی ۔ میاں طفیل محمد ۔ ملک نصر اللہ خاں عزیز ۔ جناب نعیم صدیقی ۔ جناب ماہر القادری ۔ پروفیسر عبدالحمید صدیقی ۔ سید اسعد گیلانی ۔ جناب کوثر نیازی ۔ پروفیسر آسی ضیائی ۔ پروفیسر خورشید احمد ۔ جناب آباد شاہ پوری اور دوسرے متعدد حضرات کی شرکت متوقع ہے۔

★ ــــ اس رنگین و حسین مرقع کی کاپی محفوظ کرانے کے لیے آج ہی آرڈر بھیج دیجیے۔

★ ــــ ایک کاپی کی قیمت ایک روپیہ ہوگی پانچ یا اس سے زائد کاپیوں کی خریداری پر ۲۵٪ کمیشن دیا جائے گا اور وی پی منگوانے کی صورت میں ڈاک خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔

★ یکم اپریل سے روزنامہ وفاق کے مستقل خریدار بننے والے حضرات یہ خاص اشاعت اور سال بھر میں دوسرے تمام خاص نمبر چندہ خریداری ہی میں حاصل کر سکیں گے۔

سالانہ چندہ ۳۰ ششماہی ۱۵ ... ۱۰

بھارت میں روزنامہ وفاق طلب کرنے کا پتہ :-
مینجر ہفت روزہ "ندائے ملت" باغ گونگے نواب لکھنؤ

جمیل اطہر منیجنگ ایڈیٹر روزنامہ "وفاق" سرگودھا

فاران

کراچی

جلد:- ۱۵
شمارہ:- ۲

ایڈیٹر:- ماہر القادری
ماہ مئی [illegible]

ترتیب

قیمت فی پرچہ ۱-۶۲ پیسے
سالانہ چندہ:- سات روپے

مقام اشاعت:- دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی

پرنٹر پبلشر:- مسرور حسین
مطبوعہ مطبع سعیدی کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

انسانی آبادی کے نظم ونسق کو عدل وانصاف کے ساتھ سنبھالنے اور چلانے کے لئے "حکومت کا ادارہ" وجود میں آتا ہے، "نظم ونسق" ایک جامع اصطلاح ہے جس میں معاملات کا تصفیہ، ایک دوسرے کے حقوق کی نگہداشت، ملک میں امن وامان کا قیام، معاشرے کی اخلاقی خطوط پر تشکیل، سرمایہ اور محنت کا توازن ۔ ۔ ۔ ۔ غرض زندگی کے تمام شعبوں کے انتظامات کی ذمہ داری اور سربراہی شامل کر حکومت کا کام لوگوں کو محکوم اور غلام بنانا نہیں ہے، وہ تو عوام کی خدمت کا فریضہ انجام دیتی ہے، اسی لئے تو کہا گیا ہے —— سید القوم خادمہم —— قوم کا سردار، قوم کا خدمت گزار ہوتا ہے! اچھی حکومت وہی ہو سکتی ہے، جو ملک وملت اور عوام کی خیرخواہ اور خدمت گزار ہوتی ہے، اور اس کے کارکن اور چلانے والے عوام کے مقابلہ میں کسی قسم کی برتری، بالادستی اور برتری کا داعیہ اور جذبہ نہیں رکھتے۔

بالکل سامنے کی بات ہے کہ انسانوں میں سبھی لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے، ہر انسان کا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ اس دنیا میں جہاں دیانت دار اور پاکباز لوگ پائے جاتے ہیں، وہاں چور، ڈاکو اور اچکے بھی ملتے ہیں، اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ شریف اور اچھے کردار کے لوگوں سے بھی اخلاقی لغزشیں سرزد ہو جاتی ہیں، اس لئے حکومت معاشرے کی خیرخواہی کے لئے غلط کاروں کی تادیب وسرزنش کے فرائض انجام دیتی ہے اور وہ حکومت جو کاروان سرائے، مدرسے اور شفاخانے تعمیر کرتی ہے، اُسے قیدخانے اور پھانسی گھر بھی بنانے پڑتے ہیں! برائیوں کی روک تھام کے لئے محض وعظ و پند کافی نہیں ہیں، اُن پر قانونی پابندیاں بھی لگانی ضروری ہیں۔

حکومت، برق وباد اور بادلوں کی طرح کوئی غیبی طاقت اور پوشیدہ عنصر نہیں ہے، جو آپ ہی آپ طبیعی طور پر رواں دواں ہے، حکومت کو انسان چلاتے ہیں، انسانوں کے وجود کے بغیر، حکومت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا —— جس طرح حکومت انسانوں کے فلاح وبہبود کے لئے وجود میں آتی ہے، اسی طرح حکومت کے چلانے والوں کو بھی عوام کا خیرخواہ ہونا چاہیئے۔

جب عوام کو اس کا اطمینان ہو جاتا ہے کہ حکومت چلانے والے اُن کے ہمدرد اور خیرخواہ ہیں، تو وہ ایسے حاکموں کے لئے دعائیں کرتے اور اُن کی راہ میں اپنی آنکھیں بچھاتے ہیں! عوام اور اہلِ حکومت کے مابین اس ہم آہنگی اور باہمی اعتماد کے سبب ملک کے طول وعرض میں امن وامان کی فضا اور اطمینان وخوشحالی کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے، لوگ ایسا محسوس کرتے ہیں کہ آسمان سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی شبنم لگاتار برس رہی ہے اور زمین سے فضل الٰہی کی ہریالی اگ رہی ہے! اہلِ حکومت کو عوام کا اعتماد وتعاون اور عوام کو اہلِ حکومت کی ہمدردی حاصل ہو جانے ہی کو "طاقتور حکومت" کہا جاتا ہے! عوام اور اربابِ اقتدار کے تعلقات کی خوشگواری کے سبب ملک میں ایسی عظیم الشان طاقت اُبھر آتی ہے کہ دوسری حکومتیں اس طاقت کا خاطر خواہ وزن محسوس کرتی ہیں، اور جب کبھی بین الاقوامی مسائل سے سابقہ پڑتا ہے، تو یہ اخلاقی طاقت ان مسائل پر اثرانداز ہوتی ہے۔

عوام اور اربابِ حکومت کے تعلقات وروابط اُسی وقت خوشگوار اور استوار رہ سکتے ہیں، جب ان میں فکر ونظر کی ہم آہنگی پائی

جائے، اُن کے مقاصد، عزائم اور منزل ایک ہو، اُن کے افکار کے درمیان تنازع و تصادم نہ ہو، عوام مشرق کی طرف جانا چاہیں، اور ارباب حکومت انھیں مغرب کی سمت لے چلنے کی کوشش کریں، ظاہر ہے اِس اختلاف کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ بات زبانی احتجاج سے شروع ہوکر، اور معاملہ شکوہ و فریاد سے بڑھتے بڑھتے کش مکش و تصادم تک پہونچ جائے!

بیدار مغز ارباب حکومت بادشاہوں کی طرح ضدی اور جبر پسند نہیں ہوتے، وہ عوام کے احتجاج کا بروقت ازالہ کر دیتے ہیں، اور اُن کی فراست اور دور بینی کے سبب شکوہ و شکایت اور فریاد و احتجاج کی فضا ذرا سی دیر میں محبت و اعتماد کے ماحول میں تبدیل ہو جاتی ہے! جس کسی حکومت نے طاقت کے نشہ میں عوام کی پروا نہیں کی۔ اُس نے اپنے زوال کو دعوت دی!

تختِ حکومت سے دل چسپی، اپنی ذات کی بڑائی اور حفظِ نفس کے لئے دل چسپی ہی بگاڑ کی اصل جڑ ہے، اس مزاج کے لوگ چاہتے ہیں کہ وہ مرتے دم تک حکومت کرتے اور اپنا حکم چلاتے رہیں ——— یہ جذبہ کہ فرمانروائی کی عمر زیادہ سے زیادہ دراز ہو، اپنی جگہ بہت بڑی خرابی بلکہ "اُم المفاسد" ہے! اس جذبہ کے ہاتھوں طرح طرح کی اندرونی اور بیرونی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ گلے اُس کو لگایا جاتا ہے، جو کرسی کا دعاگو اور خیر خواہ ہو، چاہے اُس کی زندگی و کردار میں کتنی ہی پستی پائی جاتی ہو، ہر وقت اپنی کرسی کی حفاظت و سلامتی کی فکر! اس تگ و دو میں خواہ کوئی اصول اور اخلاقی قدر ہی کیوں نہ پامال ہو جائے، اور یہ پامالی کسی نہ کسی عنوان سے واقع ہو کر رہتی ہے۔

غلط سمجھتا ہے، جو یہ سمجھتا ہے کہ قصر و ایوان کی باتیں وہاں کی چار دیواری سے آگے نہیں جانے پاتیں، عوام کو ہر راز کی سُن گن مل جاتی ہے، غلام محمد اور سکندر مرزا کے دورِ حکومت کا ہمیں تجربہ ہے کہ عوام کو یہ تک معلوم ہو جاتا تھا کہ اُن کے کس عزیز اور رشتہ دار نے کس عنوان سے فائدہ اُٹھایا؟ اقربا پروری، حفظِ نفس اور رشتہ داروں کے استحصالِ ناروا سے چشم پوشی اور درگزر کا چکر جب چل پڑتا ہے، تو حکومت کی ساری مشینری اُس کی لپیٹ میں آ جاتی ہے، ان معاملات میں ایک عنوان ہزار ہا بے عنوانیوں کے لئے زمین ہموار کرتی ہے اور ذرا سا رخنہ بے شمار شگافوں کا پیش خیمہ بن جاتا ہے! اس فضا میں جب کہ بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کا سلسلہ "عالم بالا سے" چلا آتا ہو، نیچے کے غلط کار لوگوں کو خوب شہ ملتی ہے، اور وہ بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے پر قناعت نہیں کرتے، بلکہ اُس میں غوطے مارتے اور چھلانگیں لگاتے ہیں۔

جن بڑے آدمیوں کو حفظِ نفس کے لئے اپنے عہدے، منصب اور کرسی سے دلچسپی ہوتی ہے، انہیں زوالِ نعمت کا ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے، اُنہیں خود اپنی کمزوریاں معلوم ہوتی ہیں، اسی لئے وہ ڈرتے رہتے ہیں کہ کس وقت زندگی کا کون سا رُخ بے نقاب ہو جائے، اور اس بے نقابی کے نتیجہ میں نہ جانے کون سی مصیبت گلے آن پڑے ——— لہٰذا اپنی کرسیوں کے ارد گرد محافظوں اور رکھوالوں کو اکٹھا کیا جاتا ہے کہ وہ ایک طرف تو کرسیوں کو تھامے رہیں اور دوسری طرف جو لوگ کرسیوں کی طرف بڑھنے کی کوشش کریں، اُن کی راہ میں حائل ہو جائیں، کرسیوں کے یہ محافظ اور ہوا خواہ عام طور پر "خود غرض" لالچی اور بے ضمیر ہوتے ہیں، پرلے درجے کے خوشامدی، چڑھتے سورج کے پجاری اور جس کے بھی ہاتھ میں طاقت و اختیار ہو اُس کے دعاگو اور نیاز مند! ان حاشیہ نشینوں کے پاس کوئی اُصول نہیں ہوتا۔ کافروں کی ریاست ہو، مسلمانوں کی حکومت ہو، مہاجنوں اور بنیوں کا راج یا کمیونسٹوں کی گورنمنٹ ہو، جمہوریت کا دور دورہ ہو یا اہلِ سیف کی حکمرانی ہو، ان مرغانِ باد نما کو تو ہر دور میں ارباب حکومت کی رکابیں تھام کر چلنا ہے!

یہ لوگ اپنے ضمیروں کو یُوں ہی نہیں بیچ دیتے۔ یہ اُن کی قیمت وصول کرتے ہیں، وقت کی سازگاری سے کس کس طرح فائدہ اُٹھا

جاتا ہے، انہیں یہ گُر خوب آتے ہیں، ان حاشیہ نشینوں، حاشیہ برداروں، خوشہ چینیوں اور جی حضوریوں کی خود غرضیاں اور نفع اندوزیاں عجیب عجیب گل کھلاتی اور طرح طرح کے شگوفے چھوڑتی ہیں! اس قسم کے ماحول میں گھٹیا درجہ کے لوگوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے [illegible] ذہنی سطح اور پست کردار کے آدمی اُبھر کر اوپر آجاتے ہیں، جن کو خود ان کے محلہ کے لوگ ذلت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ان کو عروج اور عزت کا مقام میسّر آتا ہے۔

وہ جو کسی من چلے شاعر نے کہا ہے: ـــــ

ہاتھ بھر کا ہو کلیجہ دل لگانے کے لئے

تو حکومت کرنے کے لئے ہاتھ بھر کا نہیں کئی ہاتھ کا کلیجہ چاہیئے، حکومت کے لئے بڑے ظرف، سنجیدگی، متانت اور شائستگی کی ضرورت ہے، یہ دُنیا کی سب سے بڑی اور اُلجھی ہوئی ذمہ داری کا معاملہ ہے، یہاں عمر فاروق رضؓ جیسے مخلص، بے غرض، معاملہ کے صاف اور پاکباز و دانشور فرمانرواؤں کو بھی نقد و احتساب کے چرکے سہنے پڑتے ہیں! جو حضرات عوام کے اعتراضات اور تنقیدوں کو گوارا کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے، انہیں حکومت کے جھمیلے میں پڑنا ہی نہیں چاہیئے!

حکومت کے کاروبار میں ضد اور جھنجلاہٹ سے بڑے رخنے اور طرح طرح کی اُلجھنیں پیدا ہوجاتی ہیں، ہٹلر کی مثال ساری دُنیا کے سامنے ہے کہ اس کے مزاج میں بلا کی ضد اور جھلاہٹ پیدا ہوگئی تھی، اُس کے باورچی اور پیش خدمت سے لے کر وزیروں تک کوئی شخص بھی اس کی جھنجلاہٹ اور بدمزاجی سے محفوظ نہ تھا، ہٹلر کے دماغ میں یہ خناس سما گیا تھا کہ قوم و مُلک کا مجھ سے زیادہ خیر خواہ، ہمدرد اور نبض شناس اور کوئی نہیں ہے، اور دنیا بھر کی ساری عقل سمٹ سمٹا کر میرے حصہ میں آگئی ہے اسی ضد، بدمزاجی، چڑچڑے پن اور خود غلط اندیشی نے جرمنی کا تیا پانچہ کر دیا، روس میں جرمنی کی شکست کے بعد بھی بڑی حد تک باعزت طور پر صلح ہوسکتی تھی، مگر ہٹلر کی ضد اور خود رائی نے ایسا نہ ہونے دیا، اور آخر میں تو اُس کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ جیسے اُسے پاگل کتے نے کاٹ لیا ہو! یہاں تک کہ برلن کی اینٹ سے اینٹ بج گئی!

بادشاہت اور آمریت میں سب سے زیادہ کھوٹ جو پائی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ "مشورت" کی بجائے، ایک شخص کی ذاتی رائے ہی سب کچھ ہوتی ہے، قانون بھی، دستور بھی، اور فرمان بھی! طاقت کا نشہ اپنے سوا کسی اور کی جانب دیکھنے ہی نہیں دیتا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتی تھی، آپ سے زیادہ صائب الرائے اور کون ہوسکتا تھا، اس پر بھی متعدد معاملات میں حضورؐ نے صحابہ سے مشورہ فرمایا ہے، اور مشورے کے بعد جو بات طے ہوئی اُس پر عمل کیا گیا ہے۔

کونسلیں اور پارلیمنٹیں اسی لئے قائم ہوتی ہیں اور اسمبلیاں اسی غرض سے وجود میں آتی ہیں کہ باہمی مشورت کے ساتھ ملک کے معاملات طے ہوں، قوم کے دانشور اور ملک کے نمائندے سر جوڑ کر بیٹھیں، ملکی مسائل پر غور و فکر فرمائیں اور ان کے حل تلاش کریں! مشورت و رائے کے یہ ادارے آزاد اور ہر حیثیت سے طاقتور ہونے چاہئیں! لیکن اس کے برخلاف ان کونسلوں اور اسمبلیوں کی یہ پوزیشن کر دی جائے کہ اُن کی متفقہ تجویز اور متحدہ رائے بھی کسی کے حکم اور فرمان سے بلا دریغ رد کی جاسکتی ہے، تو یہ صورتِ حال "مشورت و رائے" کی افادیت و اہمیت کو کس قدر کمزور اور غیر مؤثر بنا دیتی ہے! اور اسی قسم کی باتوں سے عوام اور اسمبلی، حکومت کے درمیان کش مکش شروع ہوجاتی ہے۔

غلطی ایک آدمی بھی کرسکتا ہے، اور چند آدمی بھی کرسکتے ہیں، مگر چند آدمیوں کے مقابلہ میں ایک آدمی کے غلطی میں مبتلا ہونے کے زیادہ امکانات ہیں، اس لئے ایک فرد کو نامحدود اختیارات نہیں دینے چاہئیں، حکومت کے تمام تر اختیارات کا کسی

ایک فردِ واحد کی ذات میں سمٹ آنا خطرے سے خالی نہیں ـــــــــ پھر قانون کسی ایک شخصیت کو ذہن میں رکھ کر نہیں بنایا جا سکتا ایک آدمی یقیناً بہت اچھا ہو سکتا ہے کہ وہ اختیارات کو پوری دیانت داری اور انصاف کے ساتھ برت کر دکھائے مگر بعد کے آنے والوں کے بارے میں اس بات کی کون ضمانت دے سکتا ہے کہ وہ بھی ایسے ہی دیانت دار، مخلص اور فرض شناس ثابت ہوں گے! ہر طرح کے لوگ کرسیوں پر آتے رہتے ہیں۔

کبھی درویشوں کی باری کبھی سلطانوں کی

اس خطرے کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ کسی بد خود غلط قسم کے آدمی کو نامحدود اختیارات حاصل ہوں اور حکومت کا ہر کاروبار تمام تر اُسی کی منظوری، منشاء، ایماء اور فرمان کا محتاج ہو۔

جمہوریت اور فردِ واحد کی مطلق العنانی یہ دو متضاد چیزیں ہیں۔ آگ اور پانی ایک جگہ جمع ہو ہی نہیں سکتے! مطلق العنانی اور جمہوریت ان دونوں کے مزاج اور فطرت میں تضاد و اختلاف پایا جاتا ہے، ایک دوسرے کی ضد! اور اجتماعِ ضدین بداہتہً محال ہے جو ملک حرب و پیکار کے ذریعہ فتح اور آزاد نہیں ہوتے بلکہ جمہوری جدوجہد کے ذریعہ جن کو آزادی ملتی ہے، وہاں آمریت کا تصور ایسا ہی ہے جیسے کوئی آم کے درخت میں ببول کا پیوند لگانے کا منصوبہ تیار کرے۔ یہ تو بادشاہوں اور ڈکٹیٹروں کا مزاج ہوتا ہے کہ وہ جمہور کو مفلوج اور محکوم بنا کر رکھنا چاہتے ہیں، اُن کی کوئی آواز نہ ہو، حکومت کے کاروبار میں وہ دخل نہ دے سکیں۔ سخت سے سخت قوانین کے ذریعہ اُن میں خوف، انفعالیت اور احساسِ پستی پیدا کیا جاتا ہے ـــــــــ اس صورتِ حال کو "جمہوریت" سے تعبیر کرنا، جمہوریت کے ساتھ ہی نہیں انسانی اخلاق و دانش کے ساتھ مذاق ہے۔

حکومت اور اس کے اختیارات نہ کسی کی ملکیت ہیں اور نہ جاگیر ہیں کہ اُن کو "بہ حق مالک محفوظ" اور "وقف علی الاولاد" کرنے کی کوشش کی جائے، اور نہ یہ کوئی کاروباری چیز ہے، جس کے لینے دینے میں ڈنڈی ماری جائے اور سودے بازی کی جائے، صاف اور واضح معاملہ اور کھلی ہوئی سامنے کی بات ہے کہ جمہوریت میں جمہور یعنی عوام اختیارات کا اصل سرچشمہ ہوتے ہیں، وہ جس کو چاہیں اپنی مرضی اور پسند سے حکومت چلانے کے لئے منتخب کریں، اور جب کبھی اُن کو اس کا اندازہ اور احساس ہو جائے کہ اُن کا چُنا ہوا شخص اپنی کارکردگی سے توقعات کو پورا نہیں کر رہا ہے، تو پھر عوام اُس شخص کو منصب سے ہٹا بھی دیں، اربابِ حکومت کے نصب و عزل کا تعلق عوام کی پسند اور ناپسند سے ہے، اور ہونا چاہیئے۔

عوام اپنا بُرا چاہنے والے اور خود اپنی ذات اور مفاد کے دُشمن نہیں ہوا کرتے، وہ اپنے نفع و نقصان کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، وہ یہ بھی نہیں کرتے کہ بیٹھے بٹھائے امن و آشتی کی فضا کو انتشار و ابتری سے بدل دیں، دُنیا میں ہر کوئی سکون، آرام اور چین چاہتا ہے! بادشاہت، آمریت اور جمہوریت کے تقاضوں کو بھی عوام اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں! اربابِ اقتدار اور اہلِ حکومت سے عوام کو دُشمنی اور قلبی بغض نہیں ہوتا، اچھے حاکموں کی راہ میں تو وہ اپنی آنکھیں بچھاتے اور اُن کے لئے غائبانہ دُعائیں کرتے ہیں عوام کے مزاج کی راستی و سلامتی اور شرافت۔ وامن پسندی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نیک بادشاہوں تک کو انھوں نے نہ صرف یہ کہ گوارا کیا ہے بلکہ پسند کیا ہے اور اُن کے لئے دیدہ و دل کو فرشِ راہ بنایا ہے! دو سال ہوئے سلطان مراکش کی وفات پر وہاں کے عوام نے سوگ منایا اور پورے ملک میں صفِ ماتم بچھ گئی!

عوام کے دل دھمکی اور طاقت سے نہیں پیار، محبت اور خیر خواہی سے ہاتھ میں لئے جاتے ہیں، ڈنڈے کے زور سے رعب داب تو بے شک قائم ہو جاتا ہے اور اس کی ضرورت بھی پیش آتی ہے مگر۔۔۔۔۔۔

ـــ جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ

اختلاف و نزاع کے اسباب!

اسٹیج پر جب کوئی مقرر، شاعر اور فنکار آتا ہے، تو تماشائی اُس کی ایک ایک ادا اور حرکت کا جائزہ لیتے ہیں، عوام اس سے بھی زیادہ دیدہ ریزی کے ساتھ اربابِ حکومت کی نقل و حرکت زندگی و کردار، یہاں تک کہ اُن کے عزائم و جذبات کا مشاہدہ اور اندازہ کرتے رہتے ہیں، ایسا کرنے کا انہیں حق حاصل ہے، جن کے ہاتھوں میں اُنھوں نے زمامِ حکومت سونپی ہے، اُن سے عوام بے تعلق کیسے رہ سکتے ہیں! یہ تو اُن کی موت و حیات اور بننے بگڑنے کا سوال ہے!

ہم نے اوپر جو کچھ عرض کیا ہے، عوام اور حکومت کے بارے میں ..... عام باتیں کہی ہیں، ایسی باتیں جن کو "کلّیہ" بھی کہا جا سکتا ہے اور جو عامۃ الورود بھی ہیں! ہر کسی کے مشاہدے اور تجربے سے جن کا تعلق ہے! سیدھی سچی بات کو اُلجھاوے میں ڈالنے اور سہل حقائق کو مشکل و دقیق بنانے کے ہم قائل نہیں ہیں!

ساری دُنیا جانتی ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر اور اسلام کے لئے بنا ہے، یہاں کے عوام بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے اسلام پسند ہیں، پاکستان کے بننے سے لے کر اب تک ان کی یہی تمنا رہی ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ کا دین قائم ہو، برائیاں مٹیں اور نیکیوں کو فروغ حاصل ہو! پاکستان کے عوام جن میں "نقشِ اول" کا لکھنے والا بھی شامل ہے، انسان ہیں فرشتے نہیں ہیں، وہ بھی بعض اخلاقی کمزوریوں میں مبتلا ہیں، مگر اس کے باوجود اُن کی آرزو اور تمنا یہی ہے کہ پاکستان اخلاقی قدروں اور دینی بنیادوں پر استوار ہو ——
اس لئے پاکستان کے عوام جب "بڑے لوگوں" کے بارے میں نماز روزے اور دوسری نیکیوں کی خبریں سنتے ہیں، تو وہ خوش ہوتے ہیں، لیکن اس کے برخلاف دوسری طرح کی خبریں سُننے میں آتی ہیں تو اُنہیں دکھ ہوتا ہے۔

انسان اپنے افکار و اعمال سے پہچانے جاتے ہیں، اربابِ حکومت کے کیا افکار، معتقدات اور نظریئے ہیں، اور خود اُنکی زندگیوں کا عملی طور پر کیا انداز اور رویّہ ہے، عوام اس کی اچھی طرح خبر اور اطلاع رکھتے ہیں —— اُن کے سامنے پہلے "ضبطِ ولادت" کا منصوبہ آتا ہے، آبادی کے اضافے کو روکنے کی اس تدبیر اور اسکیم میں جو اخلاقی خطرات پنہاں ہیں، اُن پر نگاہ رکھتے ہوئے نرم سے نرم بات بر سبیل تنزل جو کہی جا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ "ضبطِ ولادت" کے منصوبہ نظریہ اور اسکیم میں دینی نقطہ نگاہ سے "کراہت" ضرور پائی جاتی ہے تنزیہی نہیں تحریمی کراہت! —— اس کے بعد "عائلی قوانین" سے عوام کا سابقہ پڑتا ہے، ان قوانین کو پاکستان کے علماء کی سو فیصدی اکثریت مسترد کر دیتی ہے، دینی نقطہ نگاہ سے ان قوانین میں کیا کیا خرابیاں ہیں، اُس پر مضامین ہی نہیں کتابیں لکھی گئی ہیں اور کتاب و سنت کی واضح دلیلوں کے ساتھ لکھی گئی ہیں ——
پھر پاکستان کے دستور میں دوسری کوتاہیوں کے علاوہ "کتاب و سُنّت" کی جگہ "اسلام" لکھا ہوا ملتا ہے، جس سے اس شبہ کے پیدا ہونے کے لئے خاصی گنجائش ہے کہ یہ نکتہ "منکرینِ سُنّت" کا سجھایا ہوا ہے، یا ان سے متاثر دماغوں کا وضع کیا ہوا ہے، اس قسم کے افکار اور نظریئے سامنے آنے سے پاکستان کے عوام کے دلوں میں تکدر پیدا ہونا، خلافِ توقع نہیں ہے!

عوام "بڑے لوگوں" کی وہ تقریریں بھی پڑھتے رہتے ہیں، جن میں شد و مد کے ساتھ اس پر زور دیا جاتا ہے کہ اسلام کو زمانے کے جدید تقاضوں کا ساتھ دینا چاہیئے —— اس قسم کی تقریروں سے عوام کو اور زیادہ وحشت ہوتی ہے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ تقریر کرنے والے "اکابر" —— "زمانے کے جدید تقاضوں" کا جو تصور رکھتے ہیں، وہ مغرب کے تقاضوں سے بہت کچھ متاثر ہے۔

ان ناخوشگواریوں اور بدگمانیوں کے ہجوم میں "سائنٹفک قرآن" پر انعام دیئے جانے کی خبر اخبارات میں چھپی ہے، جسے

پڑھ کر خواص و عوام ششدر و حیران رہ جاتے ہیں کہ یہ کتاب جو قدر شناسی کی مستحق سمجھی گئی، "بحق سرکار" ضبط کرنے کے قابل تھی، اس کتاب میں قرآن کریم کے معانی کو مسخ کیا گیا ہے، اور ایسی باتیں کہی گئی ہیں، جو کوئی مسلمان بہ صحت ہوش و حواس کہہ ہی نہیں سکتا ــــــ

ایک طرف فکر و نظر کا یہ عالم اور دوسری طرف اعمال کا یہ رنگ کہ اسکولوں اور کالجوں میں رقص و سرود کے مظاہرے ہیں، بت گری اور تصویر سازی کے ایوانوں کا قیام ہے، گرلز گائڈ کی پریڈ اور سلامیاں ہیں، مخلوط تعلیم ہے، مرد و زن کے بیباکانہ اختلاط اور فتنہ بے حجابی کی حوصلہ افزائی ہے، غیر ممالک میں مسلمان لڑکیوں کی ٹولیوں کا آنا جانا ہے، شراب نوشی کی کثرت، زناکاری پر کوئی بندش نہیں!

قرآن کریم مسلمان حاکموں کی یہ صفت بتاتا ہے کہ جب انہیں اللہ تعالیٰ کی زمین میں تمکن و اقتدار ملتا ہے تو وہ صلوٰۃ و زکوٰۃ کے نظام کو قائم کرتے ہیں، مگر پاکستان کے ارباب حل و عقد جب اس فریضہ کی ادائگی سے غافل نظر آئیں، تو عوام ان کے بارے میں خوش گمان کس طرح ہو سکتے ہیں! پاکستان کے عوام اور یہاں کے ارباب حکومت کے درمیان نظریاتی اختلافات کی بھلا کوئی حد و نہایت ہے کہ

ع آں کہ فخر تست آں ننگِ من است ــــــ

وہاں "رقص و سرود" تہذیب و تمدن، شائستگی اور روشن خیالی کی دلیل، یہاں یہ بداخلاقی کے داعیات اور محرکات! وہاں یہ داعیہ اور جذبہ کہ اسلام کو "ماڈرن" بنایا جائے، یہاں اس پر یقین کہ اسلام اسی کا نام ہے جو کتاب و سنت میں پایا جاتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو جس طرح سمجھا اور برتا ہے، اسی میں ہمارے لئے ہدایت اور نمونہ ہے! دورِ رسالت اور عہد صحابہ کا معاشرہ بہترین معاشرہ تھا، اسی معاشرے کی تجدید پاکستان میں ہونی چاہیئے!

پاکستان کے عوام کے سامنے ترکی کی مثال ہے، مصطفےٰ کمال پاشا اسلام کو ماڈرن بنانے کا تجربہ کر کے دیکھ چکے ہیں، اس تجربے نے اسلام کو مسخ کر کے اور دینی قدروں کا حلیہ بگاڑ کر رکھدیا، اس لئے مصطفےٰ کمال کے "اسلام" کو جب بھی اور جس عنوان سے بھی پاکستان میں لانے کی کوشش کی جائے گی، عوام اس کی مخالفت کریں گے، اور اس طرح حکومت اور عوام کے درمیان تلخی پیدا ہو گی اور اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جائے گی ــ

اسلام ہے، جمہوریت ہے، اُردو زبان ہے، یہی عناصر درصل پاکستان کے شیرازہ بند ہیں ــــــ اور یہی کس مپرسی کے عالم میں ہیں!

عہد رسالت اور دور صحابہ میں باہر کے وفود جب مدینہ میں آتے تھے، تو مسلمانوں کے دینی ماحول اور پاکیزہ معاشرے کو دیکھ کر متاثر ہوتے تھے اور اپنے ملکوں میں جا کر یہاں کی خوبیاں اور بھلائیاں بیان کرتے تھے کہ کیسے سیدھے سچے اور فرض شناس لوگ ہیں، ان میں کس قدر بھائی چارہ، دوستی اور پیار محبت پایا جاتا ہے، ایک طرف وہ خدا کے حقوق ادا کرتے ہیں، دوسری طرف بندوں کے حقوق کا خیال رکھتے ہیں، حکومت اور عوام کے درمیان کسی قسم کا کوئی نزاع نہیں، سب کا ایک ہی مزاج اور ایک ہی رنگ، نہ وہاں سرمایہ و محنت کی جنگ ہے، نہ حقوق کا جھگڑا ہے، نہ نسل و رنگ کی برتری اور کمتری کا احساس پایا جاتا ہے! امن و امان کا ماحول، اور اعتماد و اطمینان کی فضا سب ایک دوسرے کے خیر خواہ، غمخوار اور دست و بازو بنے ہوئے خدا کے ان نیک بندوں نے مل جل کر اللہ کی رسّی کو مضبوط تھام لیا ہے، اُن کے ہاتھ کٹ سکتے ہیں مگر وہ حبل اللہ کو نہیں چھوڑ سکتے۔

ان کی عورتیں عفت و پاکیزگی کے مجسم ربانی مجسمے ہیں! پوری قوم سیسہ پگھلائی ہوئی دیوار کی طرح مضبوط بنی ہوئی ہے، اُن کے عدل و انصاف اور مساوات کا یہ عالم ہے کہ خلیفہ کسی تعزیری جرم کا مرتکب ہو، تو اس پر بھی حد جاری کی جاتی ہے! کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بھی قانون سے بالاتر اور مستثنیٰ نہیں ہے۔

پاکستان میں بھی باہر کے لوگ آتے رہتے ہیں، بادشاہ، وزراء، عمالِ حکومت، سیاح، تاجر، صحافی، انشاء پرداز۔۔۔ وہ یہاں اگر کوئی ایسی بات نہیں دیکھتے، جو انہیں اپنے یہاں کے معاشرے اور کلچر کے مقابلہ میں ممتاز و منفرد نظر آئے، جو چیز یورپ کی دعوتوں، جلسوں، پارٹیوں اور تقریبوں میں نظر آتی ہیں، وہی یہاں دیکھی جاتی ہیں! ۔۔۔۔۔ کیا پاکستان اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے اسی "بہرے تعارف" کے لئے وجود میں آیا تھا؟ پاکستان میں دینی قدریں اُجاگر نہ ہوں اور دینی و اخلاقی نظام برپا نہ ہو، تو پاکستان کا وجود بے معنیٰ ہو کر رہ جاتا ہے، جاہلی تہذیب اور کافرانہ تمدن تو متحدہ ہندوستان میں بھی پایا جاتا تھا، انہی خرافات کو پروان چڑھانا تھا، تو پاکستان بنوا کر عصمت و عفت کی غارت گری اور جان و مال کی بربادی کا تماشا دیکھنا کیا ضرور تھا؟ یہ تباہیاں تو اسی توقع پر برداشت کی گئیں کہ پاکستان میں قرنِ اولیٰ کی اخلاقی بہاریں لوٹ آئیں گی اللہ تعالیٰ کے دین کو یہاں فروغ نصیب ہوگا اور جاہلیت کی ایک ایک رسم کو مٹا کر، دینی اقدار کو برپا قائم اور نافذ کیا جائے گا۔

مگر

پاکستان میں آج تک جو ہوتا رہا ہے، اُس نے ان توقعات کا خون کر دیا ہے! یہاں کوئی "معروف" قائم نہیں ہوا اور کسی "منکر" کو مٹایا نہیں گیا! ان حالات میں پاکستان کے اربابِ حکومت اور عوام کے درمیان اگر کشمکش رہی ہے، تو اس میں عوام کا کوئی قصور نہیں ہے! یہاں کے حالات کے بگاڑ کی ذمہ داری اُن پر عائد ہوتی ہے، جو طاقت اختیار اور اقتدار رکھتے ہیں، اور حکومت کے تمام ذرائع ملک کے سدھار کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔

اربابِ حکومت اور عوام کے درمیان یہ کشمکش آخر تابکے! یہ رسہ کشی کب تک ہوتی رہے گی!

کیا قصرِ ایوان تک عوام کے جذبات و احساسات کی صحیح خبریں نہیں پہونچتیں، اگر پہونچتی ہیں تو یہ بڑے لوگ اس کا اندازہ کیوں نہیں کرتے کہ جن جلسوں میں اربابِ حکومت پر کھل کر تنقید کی جاتی ہے، اور اُن کی کمزوریوں کو سامنے لایا جاتا ہے، اُن جلسوں میں عوام بڑی سے بڑی تعداد میں شرکت کرتے ہیں، جیسے مقررین وہ باتیں اپنی زبان سے کہہ رہے ہیں، جو عوام کے دلوں میں ہیں، اور اس طرح دلوں کے کانٹے زبان سے نکالے جا رہے ہیں، ہوا کا رُخ یہ ہے کہ جو لیڈر جلسوں میں یہ اعلان کرتے ہیں "انقلابی قیادت ناگزیر ہو گیا ہے"۔ اُن کے لئے "زندہ باد" کے نعرے لگتے ہیں، اور لوگ انہیں فرطِ عقیدت سے سچ مچ اپنے سروں پر بٹھاتے ہیں! حکومت کی جو کوئی جتنی شدت کے ساتھ مخالفت کرتا ہے، اتنی ہی زیادہ اُسے ہر دلعزیزی اور مقبولیت حاصل ہے، اور یہ خرابی اس حد تک پہونچ چکی ہے کہ بعض غلط قسم کے لوگ بھی، حکومت کی مخالفت کے سبب نمایاں ہوتے جا رہے ہیں، اور وہ قوم کی رہنمائی اور قیادت کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

یہ صورتِ حال بہت زیادہ تشویشناک اور تکلیف دہ ہے، اس سے ایک طرف ملک کے طول و عرض میں ابتری اور انتشار پھیل رہا ہے اور دوسری طرف بین الاقوامی دُنیا میں پاکستان کا موقف کمزور سے کمزور تر ہوتا جا رہا ہے! باہر کی حکومتیں ہمارے داخلی اور خارجی حالات سے رتی رتی بھر واقف ہیں، وہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ حکومت اور عوام کے درمیان تعلقات

کی کیا نوعیت ہے ؟ اور کون کس کو کیا سمجھتا ہے ؟

وہ بیرونی طاقتیں جن کو "بڑی طاقتیں" کہا جاتا ہے، نہیں چاہتیں کہ ہمارے حالات میں کوئی اچھی تبدیلی پیدا ہو، اُن کی توجیت اسی میں ہے کہ پاکستان انتشار و برہمی اور باہمی نزاع و کش مکش میں اُلجھا رہے ! اُن کا جہاں تک بس چلے گا، وہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں زمامِ اختیار نہیں آنے دیں گے جو اسلام پسند، ایثار پیشہ اور مخلص ہوں، جن کو پوری قوم کی تائید حاصل ہو، جو مُلک کی شیرازہ بندی کر سکیں، جن کے سامنے اپنا نہیں دین و ملت اور مُلک کا مفاد ہو ـــــ یہ بیرونی طاقتیں تو ایسے لوگوں کو برسرِ اقتدار دیکھنا پسند کریں گی، جن کے اندر حکومت کی بڑی بے پناہ ہوس اور بھوک پائی ہو، جو اپنے مفاد کو مُلک و مِلّت کے مفاد پر ترجیح دیتے ہوں، جن کے افکار و اعمال پر تجدد، آزاد خیالی اور مغربیت سایہ فگن ہو، رقص و سرود، سود خواری، شراب نوشی، قمار بازی، عورتوں کی بے حجابی، بُت گری، تصویر سازی اور اسی قسم کی تمام بیہودگیاں ان کے نزدیک تہذیب و تمدن کی علامتیں ہوں کہ وہ خود انہی نجاستوں میں سر سے لے کر پیر تک اور دل سے لے کر نگاہ تک ملوث ہیں بلکہ لتھڑے ہوتے ہیں، اس لیے یہ بیرونی عظیم طاقتیں انہی "بڑے لوگوں" کو پسند کر سکتی ہیں جو ان خرافات کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی .... کرتے ہوں، اس میں ان کے تمدن کو فتح اور غلبہ حاصل ہوتا ہے اور اُن کی بالا دستی قائم ہوتی ہے اور اس مزاج و فکر کے لوگ اُن کی آرزوؤں اور اسکیموں کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتے۔

"فاران" کے گزشتہ فائل اس کے گواہ ہیں کہ ہم نے ہر دورِ حکومت میں اربابِ حکومت کو مُفید مشورے دیے ہیں، اور اُن کی خدمت میں پورے اخلاص و ہمدردی کے ساتھ گزارشیں کی ہیں کہ کرسیوں کا کوئی اعتبار نہیں یہ تو ادلتی بدلتی رہتی ہیں، ـــ حکومتیں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں، رہے یہ جی حضوری قسم کے لوگ ان کی وفاداری پر جس کسی نے بھی اعتماد کیا، اس نے سخت غلطی کی اور شدید نادانی کا ثبوت دیا، یہ سچ مچ تھالی کے بینگن اور ہوا کے ساتھی ہیں، جس کے ہاتھ میں بھی اختیار رہا، یہ تو اسی کی قصیدہ خوانی کرتے ہیں ـــــ !

ـــ ہم اب بھی عرض ـــ

کرتے ہیں کہ پارلیمنٹری سکریٹریوں کی فوج بھرتی کرنے سے بھی کوئی حکومت مضبوط نہیں ہو سکتی، اور نہ سخت قوانین کے سہارے اقتدار قائم رہ سکتا ہے، عوام اور حکومت کے درمیان اختلاف و کش مکش کی فضا میں نہ تو کشمیر کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے، اور نہ بیرونی طاقتوں سے خاطر خواہ امداد مل سکتی ہے، یہ امداد ملی بھی تو "بھیک" کی طرح ملے گی، کبھی دی، کبھی نہ دی، کسی وقت تھوڑی سی بھیک دے کر ٹال دیا۔ ہندوستان بھی دوسرے ملکوں سے امداد لیتا ہے مگر کس وقار کے ساتھ، جیسے وہ امداد لے کر امداد دینے والوں پر اُلٹا احسان کر رہا ہے !

پاکستان میں "اسلام" کے قائم نہ ہونے سے ہزار ہا اختلافات اور فتنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اُردو اور بنگلہ کا اختلاف کا مسئلہ ہی کچھ کم تکلیف دہ نہ تھا کہ مغربی پاکستان میں جہاں اُردو، بالاتفاق عوام کی مشترک زبان ہے اُس کے مقابلہ میں مقامی بولیوں کو لایا جا رہا ہے ـــــ علاقائی رقابتوں اور صوبائی عصبیتوں نے الگ زور باندھ رکھا ہے ـــــ اسلام کی وحدت کے مقابلہ میں "پاکستانی قومیت" کا جاہلانہ فتنہ سر ابھار رہا ہے۔

ہم اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ ایسے موقعوں پر جب کہ عوام اور حکومت کے درمیان کش مکش برپا ہوتی ہے بعض غلط قسم کے لوگ بھی لیڈری کی کرسیوں پر براجمان ہو جاتے ہیں، اور اُن کا مقصد اصلاحِ حال نہیں بلکہ حالات کو بگاڑنا

اور اختلافات کو ہوا دینا ہوتا ہے! مزدوروں اور طالب علموں کے مسائل اپنی جگہ مُسلّم اور اُن کی شکایات درست و بجا، لیکن یہ طالب علموں کا یہ مزاج کہ امتحان کا پرچہ سخت قسم کا آگیا، تو اُسے چاک کرکے امتحان کا بائیکاٹ کر دیا، مزدوروں نے ہڑتال کی تو اُن میں کے بعض شرپسندوں نے کارخانوں میں توڑ پھوڑ شروع کر دی ـــــ اس قسم کی غیر آئینی اور تشدد آمیز حرکتوں کے پیچھے یقیناً کمیونسٹوں کا ہاتھ ہوتا ہے! کمیونسٹ منظم طور پہ فساد و ابتری پھیلانے کے گُر اور کرتب خوب جانتے ہیں، اُن کی ہوشیاری اور چالاکی کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ عبدالحمید صاحب بھاشانی، جن کے نام کے ساتھ "مولانا" لکھا جاتا ہے، اُن تک کو ان "سرخوں" نے متاثر کر دیا ہے ـــ مولانا بھاشانی جب تقریر کرتے ہیں تو زبان بے شک انہی کی ہوتی ہے مگر افکار و خیالات، کمیونسٹوں کے ہوتے ہیں ؎ انہی کی مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات اُن کی

پاکستان کے بعض صوبوں ـــ کے بعض اُن لیڈروں کو بھی ہم جانتے ہیں جنھوں نے پاکستان کو قبول ہی نہیں کیا، اور جو پاکستان سے کَد رکھتے ہیں، اس عالم میں حکومت کو جن مشکلات اور نزاکتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، وہ بھی اپنی جگہ مسلّم ہیں! حکومت کو اس صورت میں اپنی پالیسی پر غور و فکر اور نظرِ ثانی کرنی چاہیئے کہ وہ کیا چاہتی ہے کمیونزم یا اسلام! یہ پالیسی انتہائی خطرناک ہے کہ پاکستان میں نہ اسلام کو قائم ہونے دیا جائے اور نہ کمیونزم کو! ان میں سے کوئی ایک ضرور قوتِ نافذہ بن کر رہے گا!

تحریک کا مقابلہ تحریک کے ذریعہ ہی کیا جاسکتا ہے، اس لئے کمیونزم کا مقابلہ صرف "اسلام" کر سکتا ہے کہ یہ دینِ فطرت ہے! اس میں معیشت و معاش کے مسائل کا حل اور ان کے درمیان توازن ملتا ہے، اسلام سرمایہ و محنت میں جنگ نہیں صلح کراتا ہے!

کمیونزم اور اسلام کے درمیان سب سے بڑا فرق مزاج و طبع (NATURE) کا فرق پایا جاتا ہے، اسلام کا مزاج تعمیری اور کمیونزم کا مزاج سراسر تخریبی ہے، مار دھاڑ اور توڑ پھوڑ اشتراکیت کے مزاج میں شامل ہے، کمیونسٹ کسی بھی خطۂ ملک میں برہمی پھیلانے کے لئے ریلوے لائینوں کو اُکھاڑ سکتے ہیں، چاہے ایسا کرنے میں سینکڑوں بیگناہوں کو جانوں سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونے پڑیں!

حکومت کے پاس اطلاعات حاصل کرنے کے ذرائع اور وسائل موجود ہیں، خفیہ پولس کا محکمہ ہمہ وقت مستعد فعال اور برسرِ کار رہتا ہے! کیا حکومت کو اس کے اپنے مستند اور باوثوق ذرائع سے پاکستان کی جماعتوں اور اُن کے رہنماؤں کے حالات نہیں پہونچتے، اگر پہونچتے ہیں، تو اُسے معلوم ہونا چاہیئے کہ ملک کی کون سی جماعت کے کیا مقاصد ہیں، اور ان کے اکابر اور رہنماؤں کی زندگی کے کیا حالات ہیں؟ ان کی امانت، دیانت اور اپنے مقاصد کے ساتھ اخلاص کا کیا رنگ ہے! دوسرے لوگوں کے ساتھ ان کے معاملات کیسے ہیں؟ یہ تمام باتیں حکومت کے علم میں ہونی چاہئیں! اربابِ حکومت کو بعض مسائل میں کسی جماعت سے اختلاف ہے، تو اُسے چاہیئے کہ گفت و شنید اور افہام و تفہیم کے ذریعہ ان مسائل کے بارے میں اپنے ذہن کو صاف کرے! تعمیری امور میں ایسے مخلص لوگوں کے تعاون سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

ملک میں متعدد جماعتیں، پارٹیاں اور ادارے پائے جاتے ہیں، جن کی غالب تعداد حکومت کے مقابلہ میں "حزبِ مخالف" کی حیثیت رکھتی ہے، حکومت کو ان سب کو ایک جیسا سمجھ کر مخالفوں اور معاندوں جیسا سلوک نہیں کرنا چاہیئے! مثلاً کمیونسٹ نہ صدارتی نظام کو چاہتے ہیں اور نہ جمہوریت کو پسند کرتے ہیں، رہا اسلام تو اسلام سے انہیں شدید عداوت ہے، ان کا مقصود تو ہر حکومت کو درہم برہم کرکے اشتراکی نظام کو قائم کرنا ہے، ان کے مقابلہ میں جماعتِ اسلامی ہے، جس کا مقصد اسلامی نظام کا قیام ہے! حکومت کو اس کا فیصلہ کرنا ہے کہ اسلام اور ملک و ملت کے لئے کس جماعت کے مقاصد

عزائم مفید ہیں! اسی طرح مولانا مودودی اور خان عبدالغفار خاں دونوں حکومت کے مخالفوں میں شمار کئے جاتے ہیں مگر ان کے اختلافات کی نوعیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اور یہ فرق حکومت کو ملحوظ رکھنا چاہیئے! اپنے ہر ناقد و معترض کے ساتھ حکومت کا ایک جیسا سلوک کرنا، دانشمندی اور اصول حکمرانی و آئین جہاں بانی کے خلاف ہے!

اسلام پسند عناصر کو ارباب حکومت سے خدا واسطے کا بیر نہیں ہے، اگر یہ حضرات اپنی خود اصلاح فرمالیں اور حکومت کو اسلامی خطوط پر چلانے کا عزم کرلیں — تو دیندار طبقہ ان کی رکابیں تھام کر چلنے میں فخر محسوس کرے گا۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی مثال اسلامی تاریخ میں ملتی ہے، انھوں نے زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اپنی زندگی کو بدل دیا، اور ان کی زندگی کی یہ تبدیلی حکومت کے کاروبار پر اس طرح اثر انداز ہوئی کہ لوگ محسوس کرنے لگے کہ فاروق اعظم کا مبارک دور واپس آگیا ہے!

پاکستان جس نازک دور سے گزر رہا ہے اور حالات خرابی کی جس سطح تک پہونچ چکے ہیں، ان کی درستی و اصلاح کی صرف دو صورتیں ہیں ———— یا تو ارباب حکومت اپنے اندر تبدیلی پیدا کریں، اور اپنے زندگیوں کو، نظریات کو اور حکومت کے کاروبار کو پاکستان کے مقصد وجود (اسلام) کے مطابق بنادیں، اور اگر وہ ایسا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے تو پھر عوام کو اس کا موقعہ دیا جائے کہ وہ کسی خلفشار، تصادم اور غیر آئینی تدبیر کے بغیر، قانون و آئین کے حدود میں رہ کر، حکومت کے چلانے والوں کو خود منتخب کرلیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اصلاح حال کی توفیق نصیب کرے ———— اور خدا جانتا ہے کہ ان سطور کا راقم خود اپنی ذات اور اعمال کو سب سے زیادہ اصلاح و انقلاب کا محتاج سمجھتا ہے!

ماہر القادری

یوم الجمعہ — ۲۶ ر ۴ ر سنہ ۶۳ء

مذہبی کمیں گاہوں سے!

ابُوظفر حسین صاحب نے ملتان سے ایک خط مُدیر "فاران" کے نام بھیجا ہے، جو بلفظہٖ درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ــــــــــ مزاجِ گرامی!

مودبانہ التماس ہے کہ مندرجہ ذیل معروضات پر خالص علمی رنگ میں تحقیق فرما کر جوابِ باصواب کے ذریعہ سائل اور جمیع اہلِ اسلام کے لئے صحیح طرزِ فکر اور صحیح راہِ عمل متعین فرما کر ممنون و مشکور ہونے کا موقعہ عطا فرمائیں۔

۱ــــ روزنامہ حالات لاہور نے مولانا احمد علی صاحب لاہوری مرحوم کی پہلی برسی پر ایک خاص نمبر شائع کیا ہے۔ جس میں ایڈیٹر غلام الدین جناب مناظر حسین نظر نے مضمون بعنوان "حضرت شیخ التفسیر قدس سرہ العزیز بارگاہِ نبوی میں" درج کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے ساتھ مولانا احمد علی صاحب لاہوری مرحوم کے درسِ قرآن میں تشریف لایا کرتے تھے۔ واقعہ اس طرح درج ہے کہ ـــــ ایک شخص جاذبیت کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ تھا۔ اُس نے مولانا سے آ کر عرض کیا کہ جب آپ درسِ قرآن میں مشغول ہوتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ ایک بلند و بالا مقام پر مسند بچھی ہے۔ رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس پر جلوہ فرما ہیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جمعیت ساتھ ہے آپ حضرت (شیخ التفسیر) درس کا جملہ ختم کر کے سکوت فرماتے ہیں تو زبانِ نبوت حرکت میں آجاتی ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ صَدَقْتَ صَدَقْتَ صَدَقْتَ گویا آپ کے ہر جملہ درسِ قرآن پر تین مرتبہ نبوت کی مہرِ تصدیق ثبت ہوئی۔ حضرت شیخ التفسیر سے جب اس واقعہ کی تفصیل کسی صاحب نے طلب کی اور عرض کیا کہ وہ شخص یہ سب کچھ دیکھتا کیسے تھا تو حضرت شیخ التفسیر نے مشفقانہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ نوجوان مقامِ ابدالیت پر فائز ہونے والا تھا اور ابدالیوں کو یہ کیفیت حاصل ہوتی ہے اور اسی قسم کے مشاہدات سے وہ دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مع صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنے اُمتی علما کے ذکر اذکار میں تشریف لاتے رہیں۔ بریلوی علما حضرات جو یہ رائے رکھتے ہیں کہ سلام کے لئے جو

قیام کیا جاتا ہے وہ حضورؐ کی تشریف آوری کا تصور رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ اس واقعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بمعہ صحابہ کرام بنفس نفیس تشریف لاتے ہیں تو علماء بریلوی حضرات کو کیوں مطعون کیا جاتا ہے جب کہ دیوبندی علماء حضرات کا بھی اس بارہ میں یہی عقیدہ ظاہر ہو رہا ہے —— اس کے علاوہ مقالہ مذکورہ سے اور کئی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں جو خود علماء کرام ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

میں آپ سے نہایت مودبانہ التماس کرتا ہوں کہ چونکہ آپ نے قرآن وحدیث کا بنظرِ عمیق مطالعہ فرمایا ہے براہِ کرم تحریر فرما دیں کہ کیا اسلام کے ان مقدس علوم نقلیہ وعقلیہ میں شخصیت پرستی کی گنجائش ملتی ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا میں اس طرح تشریف لانے اور اس قسم کی مجالس میں شرکت کا پتہ چلتا ہے اور ان مشاہدات کے متعلق کیا عقیدہ رکھنا چاہیئے۔ کیا شخصیت پرستی میں اتنا غلو کرنا اسلام صحیح قرار دیتا ہے۔ مفصل قرآن اور حدیث کی روشنی میں اظہارِ رائے تحریر فرما کر ممنون فرما دیں۔

۲—— خدام الدین ہفتہ وار لاہور شیخ التفسیر نمبر میں مقالہ بعنوان مبشرات از حافظ اقبال احمد بھنبھالوی کرشن نگر لاہور تحریر فرماتے ہیں۔ جس میں صوفی جمیل احمد صاحب میوانی کا ایک خواب تحریر فرمایا ہے کہ —— اس سے پہلے کئی دفعہ وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خواب میں زیارت کر چکے ہیں —— میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک بلند اور عالیشان مقام ہے اور مجھے آواز آتی ہے کہ یہ نبی جی کا مقام ہے جہاں سے سمندر پار کی روشنی نظر آتی ہے۔ اس عالیشان عمارت کے احاطہ میں شیخ التفسیر درس قرآن پاک دے رہے ہیں۔ ملاحظہ فرما دیں اشارہ مذکورہ —— اسی مقالہ میں دوسرا خواب عبدالقادر صاحب کا یوں درج ہے کہ میں مسجد میں سویا ہوا تھا خدام الدین دفتر کے پاس اوپر والے حجرہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زانوئے مبارک سے ملے ہوئے ہیں آپ اس بارہ میں صحیح رائے تحریر فرما دیں کہ کیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بلند اور ارفع ترین مقام سے اس دنیا میں تشریف لاتے ہیں کیا قرآن وحدیث اس بارہ میں تائید کرتے ہیں اور عام وخاص مسلمانوں کو اس بارہ میں یہ عقیدہ رکھنا چاہیئے ——

اسی شمارہ میں ایک مضمون بعنوان "صدیقِ دوراں سے آخری ملاقات" میں ایک خواب اس طرح مندرج کیا گیا ہے کہ ایک جگہ سے اور لوگ بتلاتے ہیں کہ یہ حضرت صدیق اکبرؓ اور بقیہ صحابہؓ کے مکانات ہیں حضرت صدیق اکبرؓ کے مکانات کے دروازے سبز تھے میں نے دستک دی اندر سے ایک بچہ نکلا میں نے اس سے پوچھا کہ حضرت صدیق اکبر کہاں ہیں تو اس نے چوبارہ کی طرف اشارہ کیا کہ وہ سامنے درس قرآن دے رہے ہیں میں نے جب دیکھا تو وہ حضرت لاہوری تھے —— دوسرا خواب یوں عرض کیا گیا ہے کہ حضرت کا جنازہ جا رہا ہے (یعنی حضرت لاہوری صاحب کا) اتنے میں حضرت لاہوری چارپائی سے نیچے

اٹھے اور کھڑے ہو گئے ہاتھ میں معمول کے مطابق لمبا عصا لیا اور فرمایا کہ میں اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک حضرت صدیق اکبرؓ تشریف نہ لے آویں کیا غلو اور شخصیت پرستی کی تعریف سے یہ باتیں باہر ہیں اور کیا اسلام کی تعلیم اس بارہ میں یہی ہے۔ آپ اس بارہ میں بھی قرآن و سنت کی روشنی میں جواب با صواب تحریر فرما دیں ممنون و مشکور ہوں گا جمیع اہلِ اسلام ان غلط فہمیوں کا شکار ہو سکتے ہیں یا کہ ایسی باتیں راہِ صواب پر ڈال سکتی ہیں سائل کو تو غلو کی انتہا معلوم ہوتی ہے اور اگر یہ باتیں صحیح اور حقیقتِ حال کی حامل ہیں تو آپ مطمئن فرما کر مشکور فرمائیں ——— شخصیت پرستی میں اتنا غلو اور حد سے بڑھنے کی کیفیت کا ادھر یہ عالم ہے تو دوسری طرف اخلاقی کمزوری اور اخلاقی گراوٹ کا یہ رُخ بھی ملاحظہ فرما دیں۔

۳——— اخبار امروز لاہور ۲۷ رمضان المبارک مورخہ ۲۳ فروری میں ایک مضمون "قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید" میں حضرت قطب زمان مولانا احمد علی صاحب اور مودودی صاحب کے عنوان سے جمعیت العلماء اسلام کے ناظم صاحب نے تحریر فرمایا ہے ——— بلکہ مضمون نگار نے عامیانہ انداز میں مودودی صاحب پر کیچڑ اچھالا ہے اور اُن کی تحریک اقامتِ دین کو فتنۂ مودودیت بتلایا گیا ہے عوام الناس کو کہا گیا ہے کہ اس فتنہ سے بچیں کیوں کہ مودودی گمراہ ہے اور حضرت لاہوری مرحوم کی طرف سے تحریر فرمایا ہے کہ انھوں نے کشف کے ذریعہ معلوم کیا تھا کہ مودودی کی صورت مسخ نظر آتی ہے یہ گمراہ ہے اور اس کی تحریک سے بچنا چاہیئے سائل کا خیال ہے کہ ایک عالم دین کا دوسرے عالم دین کے نظریات اور فکر سے اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن علماء کا اس طرح عامیانہ انداز میں عام لوگوں کے سامنے کیچڑ اچھالنا علما کے وقار اور اسلام کے تحفظ کے لئے یہ رویہ مناسب اور اچھا نہیں ہو سکتا فروعی اور نظریاتی اختلاف علمی انداز میں دینی و علمی رسائل کے ذریعہ افہام تفہیم ہو سکتے ہیں اس طرح سے مسلمانوں میں ذہنی انتشار اور دین سے بیزاری پیدا ہو سکتی ہے ——— سائل آپ سے عرض کرتا ہے کہ کیا مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی اور مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ العالی نے اسی مقصد کے لئے جمعیت العلماء اسلام کو قائم کیا تھا جمعیت کے اغراض و مقاصد یہی تھے کہ علما ایک دوسرے پر اس طرح کیچڑ اچھالا کریں۔ کیا فتنۂ مرزائیت۔ فتنۂ پرویزیت۔ فتنۂ عیسائیت اور فتنۂ دہریت وغیرہ اس ملک سے ختم ہو چکے ہیں جو بعض علما اپنی طاقت کو ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے اور پگڑیاں اتارنے پر خرچ کر رہے ہیں آپ کے خیال میں جو علماء اس طرح عوام الناس کے سامنے کیچڑ اچھال رہے ہیں۔ تبلیغ دین اور مقصد دین کا جو اہم فریضہ اُن کو سونپا گیا ہے اُس کا حق ادا کر رہے ہیں کیا اس طرح علما کا کیچڑ اچھالنا اور آپس میں

علما کی تکفیر بازی عوام الناس کو دین سے بیزار بنا کر تبلیغ دین کے لئے سدِ راہ بنتا نہیں ہے تو اس کو کیا کہیں گے ۔ بعض علما کے اس اندوہناک رویّے سے اسلام اور اسلام کے مقدس مقصد کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اُس کی ذمہ داری آپ کن لوگوں پر ڈالتے ہیں اور اس دردناک عذاب سے امتِ مسلمہ کو اور اسلام کو کس طرح بچایا جاسکتا ہے اگر آپ کی نظر میں مودودی صاحب گمراہ اور بے دین ہیں اور قرآن و سُنت کی حدود کو توڑ رہے ہیں تو تحریر فرما کر مشکور فرما دیں اور اگر ایسا ہے تو غلام احمد پرویز کی طرح علماء دین کو متفقہ طور پر مودودی صاحب کو کافر قرار دیکر قوم کو ان کے باطل ارادوں سے آگاہ کر دینا چاہیئے اور اگر مودودی صاحب مسلمان ہیں اور ان کی تحریک اقامتِ دین واقعی اسلامی تحریک ہے تو بعض علما کے اس مخالفانہ رویہ پر اُن کو روکنا اور ٹوکنا چاہیئے اس موقعہ پر عوام کو صحیح یا غلط راستہ پر ڈالنے کی ذمہ داری علما حضرات پر عائد ہوگی۔ یوم الحساب کو علما ہی اس بارہ میں جواب دہ ہونگے ۔ تحریکِ اقامتِ دین کے سلسلہ میں مودودی صاحب کی کوششوں کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں اور انکی تحریک سے عامۃ المسلمین کو تعاون کرنا چاہیئے یا نہیں بالفاظ دیگر اُن کی تحریک میں شمولیت جائز ہے یا غیر اسلامی فعل ہوگا ۔ جواب با صواب کے ذریعہ ممنون و مشکور فرماویں

فاران :- مکتوب نگار نے اخباروں اور رسالوں کے حوالوں کے ساتھ یہ واقعات لکھے ہیں ، اس لئے اس بدگمانی کی کوئی وجہ ہم نہیں پاتے کہ ان واقعات میں انھوں نے تحریف، تلبیس، اضافہ یا مُبالغہ سے کام لیا ہے! اس خط کو پڑھ کر ہر اس شخص کو اذیت ہوگی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی محبت و تکریم کا جذ بہ اپنے اندر رکھتا ہے، اور جو عقیدت کے اُس "غلو" سے بھی باخبر ہے ، جس سے بچنے اور مُجتنب رہنے کی تاکید فرمائی گئی ہے ——

چاہے وہ اس قسم کے " بزرگانِ دین اور پیرانِ عظام " ہوں یا اُن کے مُرید اور عقیدت مند ہوں، جو لوگ یہ مزاج ، ذہن اور فکر رکھتے ہیں، وہ دینی اعتبار سے ہی نہیں عام اخلاقی لحاظ سے بھی پسندیدہ نہیں ہے ! یہ وہ صاحبانِ ارشاد و کرامت ہیں جن کے تقدس کے ڈنکے بج رہے ہیں، جو اپنی روحانیت کے زور سے قبروں کا حال معلوم کر لیا کرتے تھے ، اور جنھوں نے برسوں، قرآن و حدیث کا درس دیا ہے، جن کے علم و تقویٰ کی دھوم مچی ہوئی ہے، اور جن کا " صالحین امت " بلکہ اولیا امت میں شمار کیا جاتا ہے! اگر صالحیت، علم و فضل ، ذکر و شغل، پاکیزگی و تقویٰ ، مکاشفہ و مراقبہ اور روحانیت و مجاہدہ سے اسی قسم کا مزاج بنتا ہے اور اسی انداز کی ذہنیت اور فکر تشکیل پاتی ہے ——— تو

ع پھر کسے رہنما کرے کوئی ——

پہلے سوال کے بارے میں عرض یہ ہے کہ صحابہ کرام اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی کرتے تھے اور مسلمانوں کو دین کی تعلیم بھی دیتے تھے ، لیکن کسی ضعیف سے ضعیف روایت سے بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ کسی صحابی کی محفل وعظ و تبلیغ میں حضور وفات کے بعد تشریف لائے ہیں! —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے سب سے زیادہ ضروری موقعے جمل و صفین کے خونریز معرکے ہیں! حضورؐ

تشریف لاکر مسلمانوں کو بتا سکتے تھے کہ تم میں کون حق پر ہے؟ اور اس طرح مسلمان بہت بڑے فتنہ سے محفوظ رہ سکتے تھے! وفات پانے کے بعد انبیاء کرام کا محفلوں اور جلسوں میں شریک ہونا نہ تو کتاب و سنت سے ثابت ہے، نہ آثارِ صحابہ اس کی تائید کرتے ہیں اور نہ ائمہ حدیث و فقہ کے یہاں اس کی کوئی دلیل ملتی ہے! احادیث میں یہ ضرور ملتا ہے کہ شبِ معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض انبیاء کرام سے ملاقات ہوئی، اور حضورؐ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں نماز پڑھتے دیکھا، مگر ان واقعات کا تعلق عالمِ ارواح اور عالمِ برزخ سے ہے اور وہاں کے معاملات، واردات اور مشاہدات کی حیثیت "متشابہات" کی سی ہے! اُس کی کنہہ اور لم معلوم کرنے کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیئے۔

احادیث سے یہ تو بے شک ثابت ہے کہ وفات پانے کے بعد انبیاء کرام کے پاک اجساد قبور میں زمین کی گزند سے محفوظ رہتے ہیں، مگر یہ ثابت نہیں ہے کہ انبیاء کرام اور خاص طور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کے ساتھ وعظ و درس کی محفلوں میں شریک ہوا کرتے ہیں، اور حضور اور صحابہ کو بعض لوگ دیکھتے ہیں اور ان کی گفتگو سُنتے ہیں! اُس شخص نے ایسی کوئی بات بیان کی تھی تو مولانا احمد علی لاہوری مرحوم کو اُسے تنبیہ کرنی تھی کہ تو وہ بات کہہ رہا ہے، جس کا ثبوت کتاب و سنت سے نہیں ملتا، صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ فقہ و حدیث کی کسی محفل میں بھی وفات پانے کے بعد حضورؐ کا آنا ثابت نہیں ہے، تو اے میرے بھولے بھالے عقیدت کیش! ــــــ تجھے ہرگز ہرگز ایسی بات منہ سے نہیں نکالنی چاہیئے تھی! مگر حضرت مولانا احمد علی اُس شخص کی بات کو سراہتے ہیں، اور اُس سے "ابدالیت" منسوب کرتے ہیں! یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم نے اُس شخص کا "ابدال" ہوجانا کس طرح پہچانا۔

اس قسم کا عقیدہ رکھنا ہی غلط ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اس طرح زندہ ہیں کہ وہ محفلوں اور جلسوں میں شرکت فرماتے ہیں۔ اور گفتگو کرتے ہیں! ہائے یہ مُرید و عقیدت مند اور ان کے پیر!

"حیاتِ انبیاء" کس قسم کی ہے، یہ مسئلہ اپنی جگہ محلِ غور و فکر بنا ہوا ہے، اس میں بڑی بحثیں ہیں، مگر اس واقعہ سے تو "حیاتِ صحابہؓ" بھی ثابت ہوگئی اور حیاتِ انبیاء کی خصوصیت باقی نہیں رہی، یہ وہ غلوِ عقیدت اور جذبِ مکاشفہ کے لطائف ہیں، جو دین میں الجھنیں ڈالتے چلے جاتے ہیں!

عام طور پر مشہور ہے کہ مولانا احمد علی لاہوری مرحوم نے قرآن کی تفسیر میں جو نکات اور لطائف پیدا کئے ہیں، انہیں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی پسند نہیں فرماتے تھے، لیکن اس واقعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت مولانا احمد علی لاہوری کے درسِ قرآن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار "صَدَقْتَ" ارشاد فرمایا، غور تو کیجیے کہ اُن "ابدال" صاحب کی اس روایت اور مولانا احمد علی مرحوم کی تحسین نے کتنی الجھنیں پیدا کردیں، یہ الجھن اسی وقت دور ہوسکتی ہے جب اس روایت کو مجذوب کی بڑ سمجھ کر نظر انداز کردیا جائے، اور اس کو ذرہ برابر اہمیت نہ دی جائے، ورنہ اس کو درست سمجھنے کی صورت میں عقیدہ کے فساد اور غلوِ عقیدت سے لے کر مقدس و محترم شخصیتوں پر بحث و نزاع تک کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

سوال نمبر ۲ میں جو واقعات درج کئے گئے ہیں وہ بھی اسی انداز کے ہیں۔ ان لوگوں کے غلوِ عقیدت کو کیا کہیئے، جو اپنے پیروں کی بزرگی، کرامت، ولایت، اور تقدس ثابت کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے وقار تک کی پروا نہیں کرتے۔

سوال نمبر ۳ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بارے میں جو کہا گیا ہے کہ مولانا احمد علی لاہوری مرحوم نے "کشف" کے ذریعہ معلوم کیا تھا کہ مودودی کی صورت مسخ نظر آتی ہے، یہ گمراہ ہے اور اس کی تحریک سے بچنا چاہیئے" ــــــ یہ ایک

مسلمان اور عالم دین کی اہانت وتحقیر اور اس کے خلاف دل میں بغض وعداوت رکھنے کی بہت بڑی مثال ہے۔

قرآن کریم بتاتا ہے کہ بعض منافقین کے نفاق کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کو علم نہ تھا۔ (حضور ان کے ظاہری حالات کے سبب انہیں مسلمان ہی سمجھتے تھے) اس کے مقابلہ میں حضرت مولانا احمد علی لاہوری کے کشف کی قوت اور معجزنمائی دیکھئے کہ انھوں نے مولانا مودودی کی گمراہی کو کشف کے ذریعہ معلوم کرلیا! جہاں تک دینی نقطۂ نگاہ کا تعلق ہے، اس قسم کے "مکاشفات" پرِ کاہ کی برابر بھی وقعت اور اہمیت نہیں رکھتے! مولانا مودودی کی گمراہی کی جب کوئی محسوس دلیل نہ مل سکی تو اس غریب کو مطعون کرنے اور گمراہ ٹھیرانے کے لئے "کشف" کو استعمال فرمایا گیا، جو دوسرے لوگوں کے لئے تو ایک طرح کا مضحکہ ہو مگر سادہ لوح مریدوں کے لئے "سند" ہے!

مولانا مودودی کی زندگی کا کوئی گوشہ نہ تو ڈھکا چھپا ہے اور نہ پُراسرار ہے، وہ دینی فرائض کو ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے بجالاتے ہیں، نماز روزے کے پابند ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، حج ادا کرچکے ہیں، اُن کے چہرے پر ڈاڑھی ہے اور شرعی انداز کے سر پر بال بھی ہیں، وہ کسی ایسی بُرائی میں مبتلا نہیں ہیں، جس پر فحش ومنکر کا اطلاق ہوتا ہو۔ اُن کی زندگی ایک سیدھے سادے پابندِ شریعت مسلمان کی زندگی ہے! جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے، اس بارے میں بھی وہ اپنی امکانی حد تک انہیں پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض ثقہ اور معتبر حضرات کی زبانی یہ باتیں بھی ہم تک پہونچی ہیں کہ مولانا مودودی ضرورت مندوں کی مالی امداد بھی کرتے رہتے ہیں اور اُن کے کسب معاش کا ذریعہ بھی حلال ہے!

مولانا مودودی کم وبیش چالیس سال سے دین واخلاق ہی کی خدمت اپنے قلم وزبان سے ادا کررہے ہیں، اُن کی درجنوں کتابیں موجود ہیں، جو دینی افکار سے لبریز ہیں، مولانا مودودی کی کتابوں نے ہزاروں نہیں لاکھوں نوجوانوں کو متاثر کیا ہے اور اُن کے طرزِ نظر اور علم وعمل میں دینی انقلاب پیدا کیا ہے، اُن کی کتابیں پڑھ کر بہت سے دہریوں، ملحدوں، اشتراکیوں، بدعقیدوں، فضیوں اور متشککین کو ایمان ویقین کی روشنی ملی ہے!

مولانا مودودی کی کتابوں کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ان میں بعض کتابوں کے دوچار نہیں درجنوں ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں اور دُنیا کی متعدد زبانوں میں اُن کے تراجم ہوئے ہیں، خاص طور سے عربی ممالک میں اُن کی کتابیں بہت زیادہ مقبول ہیں، عرب ممالک کے چوٹی کے علماء نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں مولانا مودودی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، شام کے سابق وزیر تعلیم اور صاحب فکر عالم وادیب مصطفےٰ زرقاء نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مولانا مودودی دینی علم کے لحاظ سے امام غزالی اور امام ابن تیمیہ کی سطح کے مفکر ہیں، مولانا مودودی کے علم وفضل ہی کے سبب مدینہ یونیورسٹی کے ممبروں اور ڈائرکٹروں میں انہیں شامل کیا گیا ہے! عربی اخباروں اور رسالوں میں مولانا مودودی کی شخصیت اور اُن کے علمی تبحر اور دینی افکار پر مضامین لکھے گئے ہیں!

مولانا مودودی پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا فضل یہ ہے کہ انہیں زمانہ حاضر کی نفسیات اور اُن کے تقاضوں کے مطابق دین کا جدید اسلوب عنایت فرمایا گیا ہے، مگر ساتھ ہی اُن کے افکار "آزاد خیالی" اور "تجدد" سے غبار آلود نہیں ہوئے، سود، ضبط ولادت، یتیم پوتے کی وراثت، تصویر سازی، بُت گری اس قسم کے تمام مسائل میں مودودی صاحب کا نقطۂ نگاہ خالص دینی ہے! حالانکہ یہ وہ مسائل ہیں جن میں مصر کے بعض مقتدر علماء تک ڈگمگا گئے تھے!

جہاد ہو، تعدد ازدواج ہو، پردہ ہو، اس قسم کے مباحث میں مولانا مودودی کا اندازِ تحریر نہ معذرت (... 06 APP)

کا انداز ہے نہ اُس میں انفعالیت اور احساسِ کمتری پایا جاتا ہے ، وہ پورے یقین اور جُرآت کے ساتھ ان مسائل کو عہدِ حاضر سے آنکھ ملا کر پیش کرتے ہیں اور عقلی و نقلی دلائل سے ثابت کرتے ہیں کہ ان مسائل میں اسلام ہی کا موقف دُرست اور مطابقِ فطرت ہے !

مغرب زدگی ، لادینیت ، قوم و وطن پرستی ، اشتراکیت ، انکارِ حدیث ، قادیانیت غرض دورِ حاضر کے جتنے بھی فتنے ہیں اُن کے خلاف مولانا مودودی کے قلم نے جہاد کیا ہے ، اور وہ ہر محاذ پر اللہ کے دین کی مُدافعت کے لئے سینہ سپر نظر آتے ہیں ! "اقامتِ دین" مولانا مودودی کی تمام جدوجہد کا مرکزی نقطہ ہے ، اور اس جرم میں وہ کئی بار قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کر چکے ہیں یہاں تک کہ قادیانیت کی تردید کے جرم میں مودودی صاحب کو سزائے موت بھی سُنائی جا چکی ہے جسے سُن کر اُن کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی اور اس طرح اِس مصلحت شناس دور میں انھوں نے عزیمت و استقامت کی تاریخ دُہرا کر ، امام مالک اور امام احمد بن حنبل کی یاد تازہ کر دی ہے اور اس سلسلۃ الذہب کو مربوط بنا دیا ہے ۔

مولانا مودودی کے لکھے ہوئے ہزاروں صفحے موجود ہیں ، اُن میں کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی جسے جمہورِ اُمت کے کسی بنیادی عقیدہ سے "تجاوز" کہا جا سکے ! اُن کی کتابیں پڑھ کر لوگ دین کی طرف آئے ہیں ، دین سے بھاگے نہیں ہیں ، اُن کی کتابوں میں دین کو جس دل کش ، حسین اور مفکرانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے ، اور مودودی صاحب کی تحریروں میں جو ادبیت اور زبان کا رچاؤ پایا جاتا ہے اُس کی مثالیں اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں کم ہی ملیں گی ۔

مولانا مودودی انسان ہیں ، فرشتہ نہیں ہیں ، اس لئے انسان ہونے کی حیثیت سے اُن کا قلم بھی جزئیات میں سہو و لغزش سے محفوظ نہیں رہ سکتا ہے ، مگر ہمارے اکابر علماء میں چاہے وہ امام غزالی ، امام رازی ، امام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ ہوں یا مولانا رشید احمد گنگوہی اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی ہوں ، ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کے قلم سے لغزش نہ ہوئی ہو ، سو فیصدی بات تو اللہ اور رسول ہی کی درست ہو سکتی ہے ، جہاں تنزیہہ خالص اور عصمت کامل پائی جاتی ہے ! پھر تفسیر ، حدیث ، فقہ اور اخلاق کوئی کتاب بھی ایسی نہیں ہے ، جس میں کہیں نہ کہیں کوئی کمزوری نہ ملتی ہو ، مگر ان تمام اکابر کی اُمت عزت کرتی ہے اور ان کتابوں کو لوگ آنکھوں سے لگاتے ہیں کہ اُن کے یہاں اور اُن میں خیر و ہدایت کا غلبہ ہے ! مولانا مودودی کی کتابوں کی بھی یہی نوعیت ہے کہ فکر و نظر کی بعض کمزوریوں اور قلم کی بعض جزئی لغزشوں کے باوجود محاسن کا پلّہ بھاری ہے ، اور اُن کے مطالعے سے فکر و نظر کو دین کی روشنی ملتی ہے ! اُن کی تحریریں اللہ اور رسول کی محبت اور دین کی عظمت دلوں میں اُتارتی ہیں ۔

کیسی کیسی ثقہ مذہبی کمیں گاہیں ہیں ، جہاں سے مولانا مودودی پر ناوک اندازی اور چاند ماری ہو رہی ہے ! ان تہمت طرازوں کو جب کوئی دلیل نہ مل سکی تو مودودی صاحب پر یہ خیالی الزام لگایا گیا کہ وہ "مجدد" ہونے کا دعویٰ کرنے والے ہیں ! مگر دُنیا نے دیکھ لیا کہ مولانا مودودی کسی دعوے کے بغیر اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت کئے جا رہے ہیں ! مگر اس کے برخلاف اُن کے بدنام کیا والوں ، انہیں گمراہ سمجھنے والوں اور انہیں "منشی مودودی" کہنے والوں کے یہاں ۔ کشف و کرامت کے دعوے ملتے ہیں ، کہیں مُریدین کا یہ مبالغہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ اُن کی محفلوں میں تشریف لاتے ہیں ، کہیں یہ مشاہدہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "شیخ التفسیر" صاحب کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھے ہوتے ہیں ! اور "حضرت والا" کے کشف و کرامت کے یہ دعوے کہ وہ لوگوں کے ایمان کی کیفیت اور اُن کی نیتوں کا حال جان لیتے ہیں !

اس ظلم کی فریاد اللہ تعالیٰ کے سوا اور کس سے کیجئے کہ جس شخص (مودودی) کی علمی فراست اور دینی فکر و نظر کی تحسین ہونی چاہئے تھی ، اُس کی تنقیص و توہین کی جا رہی ہے ، مذہبی حلقوں سے جو شخص زیادہ سے زیادہ مساعدت اور تعاون کی توقع رکھتا تھا ،

وہاں اُس کے خلاف باقاعدہ محاذ قائم ہیں، اُس کی شخصیت کو گرانے کے لئے منظم طور پر مہم جاری ہے، اور اب چند دن سے تو بعض مذہبی حلقے مولانا مودودی کی مخالفت میں قادیانیوں کی لے میں لے ملا رہے ہیں!

اس دیدہ دلیری اور بے باکی سے مودودی صاحب پر تہمتیں لگانا، اُن کے خلاف جھوٹ گھڑنے اور اُن کو ذلیل و رسوا کرنے کا کام وہی "بزرگانِ دین (؟)" اور صاحبانِ کشف و کرامت اور وارثانِ علمِ نبوی (؟) انجام دے سکتے ہیں جن کو اس کا سو فیصدی یقین ہو کہ قیامت کے دن اُن کے اعمال کی سرے سے باز پرس ہی نہیں ہوگی، اور ہوئی بھی تو کسی شرعی حیلہ سے یا کشف و تصرفات کی قوت سے اس مسئولیت کو ٹالا جا سکے گا!

مولانا مودودی کو اِس دور کا تعلیم یافتہ طبقہ دینی اقدار کا قابلِ اعتماد ترجمان و مبلّغ سمجھتا ہے ——— اس صورت میں مولانا مودودی کو "گمراہ" ٹھیرا دینے کا یہ نتیجہ نکلے گا، کہ تعلیم یافتہ نوجوان دین کے بارے میں متشکّک ہو جائیں گے! اور خیر و فلاح کا جو کام جاری ہے اُس میں کھنڈت پیدا ہو جائے گی۔

ہم اِس غلوِ عقیدت اور غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہیں کہ اس دور میں جس نے مودودی صاحب کی کتابوں کو نہیں پڑھا، اُس نے دین ہی کو نہیں سمجھا، اور نہ ہمارا یہ خیال ہے کہ اللہ کے دین کی عظمت مولانا مودودی کی کتابوں سے وابستہ ہے (معاذ اللہ) ہم مودودی صاحب کو دین کا محسن نہیں، خدمت گزار سمجھتے ہیں! اُن کے قلم نے دین کی جو عظیم خدمت انجام دی ہے، اُس پر گمراہی کا جھوٹا ٹھپہ لگا دینا، صریحی بے انصافی اور کھُلا ہوا ظلم ہے! اور اس ظلم سے مودودی صاحب کی شخصیت کا نقصان تو گوارا کیا جا سکتا ہے مگر دینی محاذ کو جو صدمہ اور نقصان پہونچے گا، اُسے گوارا نہیں کیا جا سکتا!

—×—

ترجمہ:- رشیدہ اعظم فاروقی
(ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

جوہری دور میں اسلام کی بُرّاقی اور تابناکی

نو مسلم خاتون مریم جمیلہ (سابقہ مارگریٹ مارکیوس) کے واردات، و خیالات کا یہ آزاد ترجمہ ہے!
مریم جمیلہ کی زندگی اور خیالات و معتقدات کا انقلاب مادہ پرستی کے اندھیرے کے لئے شمع نور اور چراغ ہدایت ہے! انسان کے اندر ہدایت کی طلب اور حق رسی اور حق شناسی کا جذبہ ہو، تو اللہ تعالیٰ بھی تلاش حق کی راہ میں حالات کو سازگار بنا تا ہے، یہاں تک کہ حق واضح ہو جاتا ہے اور کفر و الحاد کی حالت اور تشکیک و تذبذب کی کیفیت ایمان و یقین سے بدل جاتی ہے۔

میں اٹھائیس سال قبل ایک خوشحال متوسط گھرانے میں جدید نیویارک کے نواحی شہر میں پیدا ہوئی تھی۔ میرے والد اور اجداد خالص جرمن نژاد تھے۔ تقریباً ایک صدی پہلے میرے پردادا وغیرہ جرمنی سے ترک وطن کرکے امریکہ میں داخل ہوئے۔ کیونکہ انہیں بہتر معاشی وسائل اور عمدہ روزگار کی تلاش تھی۔ جن کا انہیں یہاں موقع مل گیا تھا۔ میرے والدین کے کنبے نے پورے طور پر امریکن طرز زندگی اختیار کرلی تھی۔ مذہب کے اعتبار سے گو کہ ہم یہودی النسل ہیں۔ لیکن میرے والدین اس مذہب کے زیادہ پابند نہیں۔ یوں سمجھئے کہ ان کی یہودیت برائے نام ہے۔ اس طرح میری نشوونما، میری بڑی بہن کی مانند، پورے طور پر امریکن ماحول میں ہوئی۔ میں نے ایک مقامی پبلک اسکول میں معمولی طور پر متداول قسم کی تعلیم پائی۔ میرا بچپن کسی غیر معمولی واقعہ کے بغیر پُرسکون گزرا۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ یہ جمود و سکون صرف سطحی طور پر تھا۔ ورنہ میرا دل و دماغ تو اپنے ماحول اور سوسائٹی سے باضابطہ برسرِ پیکار رہتا تھا۔ ہر وہ چیز جو ہماری سوسائٹی میں وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ مجھے اس سے نفرت بلکہ ابکائی آتی تھی۔ کیونکہ میرے ذہن میں اس جگمگاتی ہوئی تہذیب و معاشرت کی یہ بات جم گئی تھی کہ ہر وہ چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں ہوتی۔

مجھے اپنی سوسائٹی کی تمام باتیں سطحی، مصنوعی اور کھوکھلی معلوم دیتی تھیں۔ اس کے برخلاف میرے دل میں ردِ عمل کا جذبہ موجزن رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سینما وغیرہ کو تعیشات سمجھ کر نفرت کرتی۔ مجھے ہمیشہ مغربی فائن آرٹ، ادب، موسیقی اور رقص و سرود سے قلبی بغض رہا۔ اگر کوئی چیز شان و شوکت کا اظہار کرتی یا عیش و عشرت کا مظاہرہ کرتا تو وہ کسی طرح میری آنکھوں میں نہیں جچتا تھا۔ موجودہ زمانہ کی سائنس اور ٹیکنولوجی کی ہمہ گیر فوقیت اور وجاہت کے خلاف مجھ میں ایک زبردست قوت مدافعت نشوونما پانے لگی۔ اور میں انہیں بنیادی طور پر غیر فطری بلکہ بہیمانہ سمجھنے لگی۔ اسکول میں میرے پسندیدہ مضامین تاریخ و لسانیات تھے۔ جن میں مجھے چودہ سال کی عمر سے شغف ہو گیا تھا۔ نو عمری کی منزل میں اکثر جوان اور نوجوان لڑکے اپنے بچپن اور بھپن پر اٹھلاتے اور اتراتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو تیتریوں کی طرح پھرتے ہیں۔ میری ہم جماعت سہیلیوں کا بھی یہی عالم تھا۔ وہ جدید ترین وضع قطع کے فیشن ایبل لباس زیب تن کرکے اور اپنے جسم و لباس کی خوشبو کے ذریعہ اپنے اطراف کی پوری فضا کو معطر کرتی ہوئی چلی جاتی تھیں۔ وہ نازک خرام تتلیاں، مخلوط جلسوں

اور رقص و سرود کی محفلوں میں مستانہ وار بلکہ دیوانہ وار حصہ لیتی تھیں ——— نہ صرف یہی بلکہ اپنے گہرے دوست لڑکوں کے ساتھ انفرادی طور پر "تخلیہ کی تاریخیں" مقرر کرنے میں فخر و ناز محسوس کرتی تھیں۔ لیکن مجھے ان آبرو دشمن سنہری جالوں کے پھانسنے میں ذلت نظر آتی تھی۔ میں اس مسموم فضا کو دیکھ کر پناہ مانگتی تھی۔ اس لئے میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر اس عریاں تہذیب کے خلاف اپنے جوہر نسوانیت کا ایک مضبوط مورچہ باندھ لیا۔ تاکہ نہ کوئی شکاری تاک لگائے بیٹھے رہے اور نہ کسی مردانہ حسن و جاہت پر گھائل ہونے کی مصیبتیں اٹھانی پڑیں۔ ہماری سوسائٹی ایسی تھی کہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، غرض ہر قسم کے روزمرہ کے معاملات میں سگریٹ نوشی اور پھر اس کے ساتھ ہی شراب عام طور پر بکثرت اور باشتیاق استعمال ہوا کرتی ہے ——— لیکن میں نے سگریٹ اور شراب سے ہمیشہ اجتناب کیا۔ شراب جو اُم الخبائث یعنی برائیوں کی ماں کہی جاتی ہے، مجھ جیسے بیزار دل رکھنے والوں کو کس طرح اپنے ساتھ لے ڈوب سکتی تھی؟ مجھ کو اپنے آپ پر کامل اعتماد تھا کہ میرے ساتھ "تجھ کو بھی صنم لے ڈوبیں گے!" کا سانحہ وقوع پذیر نہ ہو سکے گا۔ اس کے علاوہ میں "جنس مخالف" سے ہر ممکن گریز کیا کرتی تھی۔ میرے خیال میں نوخیز لڑکیوں کو نوخیز لڑکوں سے ہمیشہ گریز کا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ ورنہ اس نوعمری میں ذرا سی بھی لغزش ہو جائے تو زندگی بھر لغزشوں کے متواتر تھپیڑوں سے جان غیبت میں آجاتی ہے۔ اگر یز کا آسان اور بہتر طریقہ سادگی و رشان استغنا ہے۔ چنانچہ میں نہایت ہی سادہ لباس پہنا کرتی تھی۔ جس میں عریانیت یا نیم عریانیت کے آرٹ کو مجبوس کرنے کا کافی حد تک اہتمام کیا جاتا تھا۔ کیوں کہ میرے نزدیک عریانی یا نیم عریانی خطرہ کی گھنٹی بجانے والی حیرانی و پریشانی ہے خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

چونکہ لباس عریاں اور نیم عریاں کے ہر قطع و برید اور نوک جھونک میں ہر طرف سے بے باکی اور بے حیائی کی تاک جھانک ہوا کرتی ہے جس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ اسی چاک دامانی اور چاک گریبانی سے (سیرت و کردار کے لیے) "چاک" کا اندیشہ ہو سکتا ہے، جس کی پردہ پوشی نہ تو غازہ اور سرخی کر سکتی ہے، نہ کلیسا کی مقدس رسم ایسے ژولیدہ دماغ کو فردوس کی ضمانت دے سکتی ہے اور نہ کوئی ڈاکٹر اس زخم کا اندمال کر سکتا ہے ——— اس لئے ماحول کی ان عادات و اطوار کا جائزہ لینے کے بعد میں نے اپنے کو سنبھالے رکھا کہ میرے طور و طریق میں زمانہ بھر کی "بھٹکی ہوئی نیکیوں" کو ورغلانے کا موقعہ نہ مل سکے۔

جنگِ فلسطین کے دوران امریکہ میں صیہونی پروپیگنڈا بڑے زور شور سے ہو رہا تھا۔ صیہونی تحریک کی ہمدردی میں امریکن پریس اور ریڈیو نے نہایت ہی منظم طریقہ پر زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ انھوں نے ان ذرائع سے نہ صرف یہودیوں کا ساتھ دیا بلکہ عربوں کے خلاف ایک عام سخت منافرت پھیلا دی۔ مجھے غیر شعوری طور پر صیہونی نعروں کے کھوکھلے پن کا احساس ہونے لگا۔ وہ ایسا ہی تھا جیسے خالی ڈھول زور شور سے بجتے ہوں۔ میرے گھر والوں کو جب معلوم ہوا کہ مجھے عربوں سے ہمدردی ہے تو ان کی سب امیدوں پر پانی پھر گیا۔ میری اس بے منت کی ہمدردی پر انھوں نے مجھے کئی بار ٹوکا بلکہ ایک طرح کی ڈانٹ پلائی اور دھمکایا۔ اُس زمانہ میں جب بھی میں عربوں کے علم و ادب، مذہب و فلسفہ اور تاریخ و تمدن کا مطالعہ کرتی تو متعصب مصنفین کی معاندانہ باتوں پر مجھے سخت خلش ہوتی تھی ——— جتنا زیادہ وہ مخالفت کرتے اتنا ہی زیادہ عربوں کی موافقت میں میرے دل و دماغ بیدار ہو جاگ اٹھتے تھے۔ اور میں اُن کے لئے عدل و انصاف کی تمنا رکھتی تھی۔ مجھے علانیہ صاف نظر آرہا تھا کہ اُن کے خلاف یہ زہریلا پروپیگنڈا سراسر ظلم و زیادتی ہے۔ میں نے عربوں کے متعلق جو چیزیں بھی پڑھیں اُن میں مجھے ایک عجیب سی کشش اور جاذبیت محسوس ہوئی، حالانکہ وہی باتیں ایسی تھیں جو امریکن یا یوروپین کو چراغ پا کر دینے کے لئے کافی تھیں۔

اک روز موسم غیر خوشگوار تھا۔ میری طویل بیماری بڑھتی جارہی تھی۔ جس کی وجہ سے میں نحیف وکمزور ہوگئی تھی۔ میرے پریشان خیالات میں غلطاں و پیچاں تھے۔ مجھے ہول اور بے چینی چھوڑ رہی تھی۔ میں نے اپنی والدہ سے یہ التجا کی کہ وہ مجھے قرآن ایک نسخہ مقامی کتب خانہ سے مستعار لاکر دیں۔ تاکہ اس کو پڑھ کر میں اپنی روح کا قرار اور دماغ کا سکون حاصل کرسکوں۔ انھوں نے استدعا قبول کی۔ میری مدعا برآئی۔ قرآن پاک کو پڑھنے کے دوران پہلے پہل مجھے ایسا محسوس ہوا کہ انجیل مقدس کی مانند یہ بھی کو بھرا پڑا ہے۔ اساطیر الاولین کی کہانیاں میرے لئے داستان پارینہ بن گئی تھیں۔ وہ تو صرف پٹی پٹائی باتیں تھیں۔ جن کی وقعت نزدیک "طوطا مینا" کی کہانیوں سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کو میں نے انگریزی ترجمہ کا سقم اور مترجمین کی نااہلی، خام خیالی، ذ پختگی اور تعصب وغیرہ کو قرار دیا۔ اور حقیقت بھی یہی تھی۔ مگر مجھے انہی پر اکتفا کرنا پڑا۔ ان خامیوں کو نظر میں رکھتے ہوئے میں غیر مصدقہ تراجم کو دوبارہ پڑھنا شروع کیا۔ اب کی بار عام پرانی کہانیوں کے رنگ ڈھنگ کے باوجود ان کے پیرایۂ بیان او خطابت میں مجھے ایک خاص قسم کی سچائی کی جھلک نظر آئی۔ کیونکہ اسلوب بیان اور طرز تخیل کہیں زیادہ اعلیٰ وارفع اور فصیح تھا ــــــ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ فطرت بذات خود درس و تدریس کا کام انجام دے رہی ہے۔ ناصحانہ انداز اتنا زیادہ د دلنشین تھا کہ طبیعت قرآن پاک کو پڑھے بغیر نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس کے بعد سے قرآن اور اسلام کی مذہبی کتابوں سے میر دلبستگی بڑھتی چلی گئی۔ چنانچہ کئی سال تک میں نے قرآن پاک کے مختلف ترجموں کا باضابطہ مطالعہ جاری رکھا۔ اسلامی فلسفہ و، مذہب وتاریخ اور تہذیب و تمدن کے مطالعہ کا مجھ میں ذوق وشوق اتنا زیادہ بڑھا کہ صحت عود کرنے کے بعد میں کئی کئی گھنٹے کی پبلک لائبریری کے السنۂ شرقیہ کے شعبہ میں روزانہ صرف کرتی رہی ــــ میرا اسلام پر مطالعہ اس کی روح تک پہونچ جانے بے تاب تھا۔ مثلاً میں نے مولانا فضل الکریم کے ترجمہ "مشکوٰۃ المصابیح" کی چار ضخیم جلدیں چھان بین کرکے حاصل کرلیں۔ اس کا مطالعہ کیا۔ آنحضرت صلعم کی سیرت پاک کے متعلق اور آپکے اہل وعیال اور صحابہ کرام کے متعلق والہانہ تقدس، جذبۂ عقیدت ا سرشاری وبیخودی کے جو کوائف یا حالات، احادیث میں مروی ہیں، ان کو نہایت ہی غور وخوض سے پڑھتی رہی، جس سے ا عجیب طرح کا کیف وانبساط محسوس ہوا۔ اس کے علاوہ میں نے بہت سے علماء و فضلاء کے مختلف تراجم پڑھے جو مجھے انگریزی میں آسانی سے دستیاب ہوسکتے تھے۔ مثلاً :ــ

قانون اسلام پر ایک مبسوط شرح ہے۔ الغزالی کی مذہبی سائنس کے علوم کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance of Religious Sciences) کا ترجمہ، ابن خلدون کی مشہور ومعروف "مستند تاریخ کا مقدمہ" اور علامہ اقبال کا کلام پڑھا۔ مجھے محمد اسد کی خود نوشت سوانح عمری سے اچھی خاصی مدد ملی۔ چنانچہ ان کی کتاب "مکہ مکرمہ کی راہ" (Road to Mecca) سے مجھے صحیح طور پر رہنمائی حاصل ہوئی۔ اس میں انھوں نے نہایت ہی دلچسپ ودلنشین انداز میں بتایا ہے کہ کس طرح ایک آسٹ یہودی نے مغربی تہذیب ومعاشرت کی رنگینیوں سے منہ موڑ لیا۔ اور آخرکار اسلام کے دامن میں آکر پناہ لے لی تھی۔

کچھ عرصہ کے بعد میری صحت دوبارہ گر گئی۔ کیونکہ میں پھر اعصابی امراض کا شکار ہوگئی تھی۔ اس مرتبہ اس کا حملہ اتنا شدید کہ میں صاحب فراش ہوگئی۔ یہاں تک کہ لکھنے پڑھنے کا شغل بھی پوری طرح برقرار نہ رکھ سکی۔ میں اپنی بیماری پر پچھتا رہی تھی کیونکہ اس نے میرے اسلامی مطالعہ میں رخنہ ڈال دیا تھا۔ میری یہ آرزو تھی کہ جلد صحتیاب ہوجاؤں۔ چنانچہ ہر قسم کے طریقہ ہائے علاج آزمائے گئے۔ اور میں علاجوں کا تختۂ مشق بن گئی۔ مجھے اپنی بیچارگی پر رونا آتا تھا۔ ایک سال "سائیکو تھراپی" (psychotherapy) ــــ اور دوسرے سال (شاک تھراپی) (shock therapy) کے طریقہ ہائے علا

آزمانے میں صرف ہوئے۔ اس کے بعد تین اور ساڑھے تین سال تک (Psycho Analysis) کے طریقہ پر علاج ہوتا رہا۔ لیکن ان میں سے کسی سے بھی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، اس طرح میرے مرض کی شدت انتہا پر پہونچ گئی۔ ایک ہی چارہ رہ گیا تھا۔ یعنی میں دماغی امراض کے ہسپتال میں بیماری کی قید و بند میں سب سے الگ تھلگ رہوں۔ چنانچہ میں نے اس بیماری کی قید تنہائی میں دو سال سے زیادہ گزار دیئے۔ اب تو میری بیماری کی طوالت سے میرے ڈاکٹر بھی ہراساں ہو گئے۔ کیونکہ ان سے میری بیماری کی نہ کوئی صحیح تشخیص ہو سکی تھی اور نہ کوئی موثر دوا تجویز کی جا سکی تھی۔ اس لئے سب نے تھک ہار کر گھٹنے ٹیک دیئے تب میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کہ اب کوئی طبی مدد کارگر نہیں ہو سکتی کیونکہ ماہر ڈاکٹروں نے میرا مرض لا علاج قرار دیا تھا۔۔۔ میں نے تصفیہ کر لیا کہ اب میں کوئی دوا استعمال نہ کروں گی۔ اور نہ کوئی طریقہ علاج اپنے اوپر آزمانے دوں گی۔ اس طرح بغیر دوا اور بغیر کسی علاج کے دو تین سال تک بستر علالت پر پڑی رہی۔ تعجب کی بات ہے کہ کسی علاج اور دوا کے بغیر میں نے محسوس کیا کہ جزوی طور پر میری صحت بحال ہوتی جا رہی ہے ۔۔۔۔۔۔ اس میں نہ تو کسی دوا کا دخل تھا اور نہ میری قوت ارادی کے بس کی بات تھی۔ " ہائے کوئی دوا کرو، ہائے کوئی دعا کرو" کے قول میں میرے لئے پہلا جزو بے معنی معلوم دیتا تھا۔ لیکن دعا کے جزو میں مجھے اعتقاد ہوتا چلا گیا ۔۔۔ اس وقت میں اس نتیجہ پر پہونچی کہ صحت و شفا اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہوتی ہے۔

اس کے بعد میں نے اپنے والدین کو راضی کر لیا کہ وہ علاج و معالجہ کا مجھے مزید تختۂ مشق نہ بننے دیں بلکہ مجھے اپنے حال پر چھوڑ دیں انھوں نے میری گذارش منظور کر لی۔ اور مجھے گھر لے آئے۔ گھر واپس ہونے پر میں نے تہیہ کر لیا کہ اسلام میری تمام تر زندگی پر چھایا ہوا رہے گا۔ اور اس کے روحانی اثرات میرے رگ و پے میں سرایت کرتے رہیں گے۔ وہ میرا ہوگا اور میں اس کی ہو رہوں گی۔ اس لئے میں نے اپنی جد و جہد جاری رکھی۔ اسلامی تعلیمات کا مزید باضابطہ مطالعہ جاری رکھا۔ اور ساتھ ہی اسلامی علماء سے میل ملاقاتیں شروع کیں۔ شہر نیویارک کی مسجد میں میں نے کئی اسلامی عالموں سے تبادلۂ خیال کیا۔ ان کی علم پروری اور علم دوستی سے مجھے بہت زیادہ فیض پہونچا جس سے مجھے روحانی مسرت اور ذہنی حلاوت محسوس ہوتی تھی۔ بعض اوقات بڑے بڑے پایہ کے علماء سے شرفِ نیاز و تلمذ بھی حاصل ہوا۔ جن کی رہنمائی سے میں نے فائدہ اٹھایا، حالانکہ اس سے پیشتر مجھے مایوسی ہو چکی تھی کہ مجھے ایسے بلند پایہ علماء سے نیاز حاصل نہ ہو سکے گا۔ لیکن جو ینده یابندہ کے مصداق میری روحانی کشش نے انہیں میرے دائرۃ المعارف کے ادراک میں کھینچ لیا تھا۔ اور میں نے ان سے خوب استفادہ کیا، علم کی تشنگی بجھانے کے ساتھ ساتھ میں اپنی روح کی سیری بھی چاہتی تھی۔ کیوں کہ سچ کی تلاش اپنی روشنی میں آپ کرنی چاہیئے۔

چنانچہ میں نے علمائے دین سے کسب فیض کرنے کے لئے مسجد میں نمازیں ادا کرنی شروع کر دیں۔ اب مجھے یقین کامل ہوتا رہا تھا۔ اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اسلام ہی ایک ایسا جامع مذہب ہے جس سے تمام تشنگی دور ہو جاتی ہے اور شکوک و شبہات کافور ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اکملت لکم دینکم سب پر اظہر من الشمس ہے۔ جس کو خود اللہ تعالیٰ عز و جل نے صحیح و سالم رکھنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ چنانچہ غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ وہی بالاتر ہستی اب تک اسلام کی کشتی کو کھیتی چلی آ رہی ہے اور ازل سے ابد تک یہی عمل رہے گا۔

صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو اسلام میں صحیح و سالم اور بھرپور سچائی سموئی ہوئی ہے، جو دوسرے مذاہب میں صرف جزوی طور پر نظر آتی ہے۔ اگر سچائی کو چاند سے تشبیہ دی جائے تو وہ آسمانِ اسلام پر بدرِ کامل کے مانند ضیا پاشی کرتے ہوئے نظر آتا ہے اور دوسرے مذاہب کے مطلع پر دوسری راتوں (سوائے چودھویں کے) مانند گھٹتا اور بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔

اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو عصر حاضر کی تہذیب کی بے نکیل دوڑنے والی برائیوں کے منہ میں لگام دے کر روک سکے۔ اس طرح وہ برائیوں کے بدمست ہاتھیوں کے لئے ایک آنکس کا کام دیتا ہے۔ ان خوبیوں کو پرکھ کر میں اسلام کی والہ و شیدا ہو گئی اس کی تعلیمات نے مجھ میں ایک نئی روح پھونک دی۔ چنانچہ میں نے اپنا قلم اٹھایا اور اسلام پر لکھنا شروع کر دیا۔ میرے مقالات اور مضامین کے کئی سلسلے نکلے جو انگلستان، جنوبی افریقہ، سوئٹزرلینڈ، مصر، سیلون، ہندوستان اور پاکستان میں شائع ہوتے رہے، ان سب کا ایک ہی موضوع تھا یعنی مغربیت اور اسلام کا موازنہ۔ اور یہی موضوع ہمارے لئے تہذیب کی دوڑ دکھتی ہوئی رگ ثابت ہوا۔ اس موضوع پر ہر زاویہ نگاہ سے سیر حاصل بحث کی گئی۔ میں نے اپنی توجہ خاص طور پر ان نام نہاد ( ) " (مصلحین) کو بے نقاب کرنے میں صرف کی جو یہ نہیں جانتے کہ مغربی تہذیب جو نظریہ و عمل دونوں اعتبار سے برائی کی طرف راغب ہے۔ اس کا بنیادی سبب کیا ہے! اور اس بے راہ روی میں کیا عوامل کام کر رہے ہیں۔ اور یہ تہذیب کس طرح اسلام سے غیر متعارف ہو گئی ہے۔

مجھے محمد اسد کی کتاب "اسلام دوراہے پر" (ISLAM AT THE CROSS ROAD) سے بہت اچھی مدد ملی۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ اس موضوع پر ایک پُر مغز کتاب ہے۔ میں نے اس کتاب کے ذریعہ ان کے خیالات کی بہت کچھ خوشہ چینی کی ہے۔ مگر میرے مقالات، ان حاصل کردہ معلومات سے مختلف تھے۔ کیوں کہ میرے خیالات و مشاہدات میں ایک طرح کی مرکزیت اور نوعی خصوصیت تھی جن میں موجودہ زمانہ کے تقاضوں کے تحت اسلامی مسائل کی نہایت ہی تفصیل کے ساتھ چھان بین کی گئی تھی۔ میری تحریروں کے طفیل دنیا کے تقریباً تمام ممالک کے مسلمان لیڈروں سے میری خط و کتابت شروع ہو گئی۔ اب اسلامی مدعا حاصل کرنے کے لئے میرا وجود تنہا نہیں رہا تھا۔

ان مشہور ہستیوں میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات بھی شامل ہے۔ مولانا نے محترم نے میرے خط کا حسب ذیل جواب عنایت فرمایا:۔

"آپ کی درد بھری کہانی، دُنیاوی مصائب کے علاوہ ذہنی اذیتوں، دماغی اُلجھنوں اور رُوحانی صدموں سے معمور ہے، اسے پڑھ کر کچھ زیادہ تعجب نہیں ہوا کیونکہ ایسے صبر آزما حالات اہلِ ایمان کے لئے کسوٹی ہوتے ہیں۔ جب کوئی شخص اپنے ناپسندیدہ اور دشوار گزار ماحول کے خلاف مسلسل نبرد آزما ہوتا ہے اور اس جد وجہد میں جب دیکھتا ہے کہ نہ کوئی اس کا غمخوار و یار و مددگار ہے اور نہ کوئی اس کے اجتہادانہ صبر و استقلال کی پشت پناہی کر سکتا ہے ـــــ بلکہ کوئی ایک آدھ کلمہ کا دلاسہ بھی نہیں دے سکتا ـــــ تو ایسے بے بسی کے عالم میں یقیناً یہ غیر معمولی چیز ہو گی کہ اس کے اعصاب جواب نہ دیدیں۔ آپ کے ماحول کی بنیاد، آپ کا میلانِ طبع، آپ کے خیالات و نظریات آپ کی جبلت اور خصلتیں اور عادات و اطوار تمام بنیادی طور پر اُس سوسائٹی سے بالکل متضاد ہیں جس میں آپ رہتی ہیں۔ وہ حالات جنھوں نے آپ کو ماہرین نفسیات ( ) اور دماغی امراض کے دواخانہ کی طرف رجوع کرایا کسی طرح بھی آپ کے فطری تقاضوں، محسوساتی اور متوازن کیفیات کا نتیجہ نہیں ہو سکتے۔ اس سلسلہ میں یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ وہ حالات

آپ کی اور آپ کے ماحول کے مابین فطری نتائج اور عواقب کی توافق پذیری کا حاصل تھے جس کا لازمی نتیجہ اولاً ذہنی کش مکش اور ثانیاً عملی طور پر رسہ کشی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس طرح وہ سوسائٹی جس میں سے آپ گذر رہی ہیں کسی طرح بھی آپ کو "عورت کی صورت" میں جلوہ گر نہیں دیکھ سکتی۔ جب کہ آپ اپنے عالم تخیل میں خود کو "اسلامی عورت" کے پیراہن میں مستور سمجھتی ہیں۔ کیونکہ وہ سوسائٹی ایسی ہے جس کو آپ کی تمام خوبیاں تمام تر خامیاں ہی نظر آتی ہیں۔ اس طرح ایسے دل و دماغ کے ساتھ جو دین فطرت یعنی دین اسلام کی تعلیمات سے ہم رنگ ہے، آپ اپنے جسم کو مساوی طور پر اس غیر فطری دین کے آغوش کے حوالہ نہیں کر سکتیں جس سے آپ کو اجنبیت کی بو باس محسوس ہو رہی ہے۔

اگر آپ پاکستان آجائیں تو اپنے آپ کو ہم خیال دینی بھائیوں، بہنوں کے حلقوں میں مانوس پائیں گی۔۔۔۔ اس کے علاوہ یہ بھی بہت ممکن ہے کہ آپ کو لاہور میں ایک ایسا جوان صالح مل جائے جس کو آپ اپنی زندگی کا رفیق بنانا قبول کر سکیں گی۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ آپ اب کسی بھی مغرب زدہ جدید قسم کے مرد سے شادی نہیں کریں گی۔ بلکہ ایک نوجوان پاکستانی مرد مسلمان سے رشتہ جوڑ کر ازدواجی زندگی کی مسرتیں حاصل کرنا بہتر سمجھیں گی۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ یہ بات آپ اپنے والدین پر واضح کر دیں گی کہ اب آپ کو امریکہ میں زندگی بسر کرنی کیوں مشکل نظر آرہی ہے۔ آپ اُن پر یہ بھی واضح کر دیں کہ آپ کی فلاح و بہبود اسی میں ہے کہ وہ آپ کو پاکستان میں سکونت پذیر ہونے کی اجازت دیدیں۔ آپ اُن کی توجہ اس جانب مبذول کرائیے کہ وہ شخص جو آپ کو نصیحتیں کر رہا ہے اور اس طرح کے اولوالعزم اقدام کی طرف رہنمائی کر رہا ہے، اس کی باتیں محض کاغذی گھوڑے نہیں ہیں بلکہ وہ حقیقی طور پر دست تعاون بڑھا رہا ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ آئندہ کے نتائج سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کامل طور پر ہر طرح کی ذمہ داری لینے کو تیار ہے۔ اگر آپ اور آپ کے والدین مجھ پر اعتماد کریں تو انشاء اللہ تعالیٰ آپ کا اعتماد کبھی مجروح نہیں ہو گا۔"

میں نے مولانا نے محترم کو حسب ذیل جواب دیا:-

"یہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے، جس کے ذریعہ آپ میری مدد کے لئے اپنا دست تعاون پیش کر رہے ہیں، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب میں اس مذہبی جدوجہد میں اکیلی نہیں ہوں میں آپ کی پیشکش بصد شکریہ قبول کرتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی جزائے خیر دے۔ اور عمر و درجات میں ترقی عطا فرمائے۔" آمین ثم آمین۔

کراچی کے لئے میں نیویارک سے یونانی بار بردار سمندری جہاز کے ذریعہ روانہ ہوئی۔ کیونکہ یہی ایک واحد آسان اور سستا سفر تھا جس کے ذریعہ میں اپنی منزل مقصود تک پہونچ سکتی تھی۔ چھ مہینہ کا سفر رہا۔ جہاز کے دوسرے مسافرین اور عملہ

والے جیسا کہ عام طور پر پایا جاتا ہے۔ اخلاق اور روحانی اعتبار سے بالکل گرے ہوئے تھے۔ یہی ایک ایسی چیز تھی جس نے میرے سفر کو میرے لئے بدمزہ اور دوبھر کردیا تھا۔ کیونکہ اُن کی غیر ذمہ دارانہ لا اُبالی اور منچلی طبیعتوں اور اُجڈ حرکتوں کو روکنے کے لئے مجھے انتہائی صبر و ہمت اور دلیری سے کام لینا پڑا۔ جب ہم پورٹ ڈی سوڈان پہونچے تو مجھے اپنے جسم و جان کی حفاظت کے لئے پولس کی امداد حاصل کرنی پڑی۔ جس کی وجہ سے یہ خطرہ ٹل گیا اور مجھے اطمینان ہوگیا۔ اس کے بعد جب بندرگاہ اسکندریہ سوڈان اور جدہ پہونچے تو وہاں ہر جگہ میرے مسلمان بھائیوں نے جس گرمجوشی اور فراخدلی سے میرا استقبال کیا اس سے میرے سفر کی تمام کلفتوں اور اذیتوں کا رنج و غم کافور ہوگیا اور میرے دل و دماغ کو فرحت و تازگی محسوس ہونے لگی —— آخرکار جب کراچی پہونچی تو مولانا مودودی کے دوست احباب نے اپنی بے مثال ہمدردیوں غمگساریوں اور مہربانیوں سے میرا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ انھوں نے نہایت ہی فراخدلی، سیرچشمی اور فیاضی کے ساتھ میری مہمان نوازی کی کئی دنوں بعد میں ہوائی جہاز کے ذریعہ لاہور پہونچی جہاں مجھے مولانائے موصوف اور اُن کے ہم مشربوں کا سایۂ عاطفت حاصل ہوا۔ گو کہ میں اپنے والدین اور مسلمان دوستوں سے جو نیویارک میں ہیں، بچھڑ گئی ہوں، لیکن یہاں آنے پر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے ہی گھر میں ہوں — ایسے ہی جیسے کہ برسوں سے رہتی آئی ہوں۔ اپنے خیالات، رحجان طبیعت اور مشاغل کے لحاظ سے مجھے اب تنہائی کاٹنے نہیں کھاتی۔ بلکہ پردیس بھی مجھے اپنا دیس دکھائی دے رہا ہے۔

میرے خیال میں پاکستان کی سب سے بڑی خوبی یا دلچسپی یہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کے رہن سہن کے مطابق، امن و امان کی فضا پائی جاتی ہے۔ یہاں عوام کی زندگی میں خوشحالی اور مذہبی دلچسپی و انہماک کا اطمینان جھلکتا ہے۔ اس میں ایک کیف انگیز شان و شوکت پائی جاتی ہے۔ جس میں یہاں کا ایک غریب کاشتکار بھی حصہ لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ تاہم مجھے افسوس ہوتا ہے کہ یہاں کے بڑے شہروں میں سینما، فلموں، بڑے ہوٹلوں، کلبوں اور عام پارکوں پر ٹیڈی بوائز اور ٹیڈی گرلز نے دھاوا بول دیا ہے۔ مغرب کے اس ریلے کو اگر برمحل روک دیا جائے تو اس کے زہریلے اثرات سے یہاں کی معاشرت محفوظ رہ سکتی ہے۔ میں نے اسلامی شعار کو اپنا لیا ہے اور ہر طریقہ سے اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہوں۔ میں پردہ کی بڑی حد تک مؤید اور موافق ہوں۔ چنانچہ جب کبھی میں باہر نکلتی ہوں تو برقعہ اوڑھ کر نکلتی ہوں۔ مجھے پاکستانی لباس سنجیدہ اور مہذب معلوم دیتا ہے۔ چنانچہ میں پاکستانی پہناوا ہی پہنتی ہوں۔ اور مغربی طرز کے تراش و خراش کے لباس کو معیوب اور لغو سمجھتی ہوں اور اس کی خواہش بھی میرے اندر نہیں رہی۔

میں نے اُردو بھی سیکھ لی ہے۔ یہ مجھے تھوڑی بہت آگئی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ عربی بھی بہت جلد سیکھ لوں گی۔ جس کے لئے ڈیڑھ دو سال درکار ہونگے۔ مجھے پاک پروردگار سے قوی اُمید ہے کہ میں ایک اچھی وفاشعار بیوی اور ایک غمخوار ماں بننے کے قابل ہوجاؤں گی۔

مجھے اپنے وطن امریکہ جانے کی خواہش نہیں رہی۔ زندگی کے باقی دن یہاں گزار دینا چاہتی ہوں۔ اپنی تمام تر صلاحیتوں اور کاوشوں کو اسلامی اقدار اور اس کی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کروں گی۔ کیونکہ یہی زندگی کی منہ بولتی تصویریں ہیں جن سے ہماری دین و دُنیا بنتی ہے۔ اسلام ہی میں ہماری نجات ہے۔

——×——

پروفیسر سید عبدالرشید فاضل

نیاز فتحپوری کی مشکلات غالب پر!

ماہِ رواں کے "فاران" میں "مشکلاتِ غالب" پر آپ کا تبصرہ پڑھا۔ اس میں شک نہیں کہ آپ تبصرہ نگاری کا حق ادا کرتے ہیں کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد اس کے روشن اور تاریک، دونوں پہلوؤں کا نہایت دقتِ نظر اور پورے خلوص کے ساتھ منظرِ عام پر لانا آپ کا حصہ ہے۔ مگر اس دفعہ "مشکلاتِ غالب" پر جو آپ نے تبصرہ فرمایا ہے اُس میں بعض باتیں ایسی رہ گئیں جو دل میں کھٹک پیدا کرتی ہیں۔ اس لئے اس عریضے کے ذریعے ان کی نشان دہی کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ نیز اس سلسلے میں چونکہ مجھے "مشکلاتِ غالب" میں متعلقہ اشعار کی شرح دیکھنے کا اتفاق ہوا اس لئے اُنہی غزلوں میں، جن سے آپ نے اپنے تبصرے میں اشعار کا انتخاب کیا ہے، اور بھی کچھ اشعار ایسے نظر آگئے جن کی شرح کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

غالب بیچارے کے ساتھ لوگ طرح طرح سے ستم ظریفی کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً اُن کے بعض اشعار کو بہت آسان کہہ کر چھوڑ جاتے ہیں یا بعض کو بہت مشکل بتا کر اُن کے بارے میں جو چاہتے ہیں کہہ ڈالتے ہیں۔ حالانکہ جو شعر آسان کہے جاتے ہیں اُن میں بھی کوئی خاص بات ہوتی ہے۔ اسی طرح اُن کے مشکل اشعار بھی کسی خاص وجہ سے مشکل ہوتے ہیں۔ اس لئے شارح کا فرض ہے کہ وہ آسان شعر کی اُس خاص بات اور مشکل شعر کی وجوہِ مشکلات پر روشنی ڈالے مگر ایسا نہیں کیا جاتا۔ اس طرح غالب کے کلام کی خوبی اور اس کے معانی و مطالب دونوں پردۂ خفا میں رہ جاتے ہیں۔ بہرحال میں اپنی معروضات پیش کرتا ہوں:۔

(۱) نفس موجِ محیطِ بے خودی ہے   تغافلہائے ساقی کا گلہ کیا!

"ہماری ہر سانس خود اپنے دریائے بے خودی کی موج ہے، اس لئے ساقی کی شکایت بے کار ہے کیونکہ اُس کے تغافل سے ہماری بے خودی میں تو کوئی کمی ہو نہیں سکتی۔" (نیاز فتحپوری)

نیاز صاحب کی مذکورہ شرح کئی وجوہ سے توجہ طلب ہے۔ اول "ہماری سانس خود اپنے دریائے بے خودی کی موج ہے" یہ کیا بات ہوئی! "ہماری ہر سانس دریائے بے خودی کی موج ہے" کہنا کافی تھا۔ دوسرے "اُس کے تغافل سے ہماری بے خودی میں تو کوئی کمی ہو نہیں سکتی" کیا معنی! "اُس کے تغافل اور عدم تغافل سے ہماری حالت میں کیا فرق آسکتا ہے!" لکھنا چاہئے تھا۔ تیسرے نیاز صاحب نے یہ نہیں بتلایا کہ بے خودی کا سبب کیا ہے۔

غالب کا ایک ایسا ہی شعر یہ ہے:۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر   بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی

اس شعر میں اور زیرِ بحث شعر میں فرق یہ ہے کہ یہاں بادہ نوشی کو بادہ پیمائی (کارِ عبث) قرار دیا ہے اس لئے کہ جب ہوا ہی میں شراب کی تاثیر پیدا ہوگئی ہے تو بادہ نوشی کی کیا ضرورت رہی۔ اور وہاں تغافلہائے ساقی کی شکایت کو بیکار بتلایا ہے، اس لئے کہ جب خود سانس ہی دریائے بے خودی کی موج بن گیا تو ساقی کا آنا اور ہم کو شراب پلانا تحصیلِ حاصل ہوگا۔ یہ شعر (ہے ہوا میں شراب کی تاثیر) مرزا کے شباب اور رنگ رلیوں کے زمانے کی یاد تازہ کرتا ہے تو زیرِ بحث شعر (نفس موجِ محیطِ بے خودی ہے) اُن کے

بڑھاپے اور آلامِ روزگار کے سبب سے افسردہ خاطر ہونے کی حالت کی ترجمانی کرتا ہے۔

(۲) دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے غمِ آوارگیہائے صبا کیا!

"عطر محض خوشبو کو کہتے ہیں اس لئے "عطر پیراہن" کے معنی خوشبو کے لباس کے ہوئے۔ دماغ نہ ہونا برداشت نہ ہو سکنا ــــــ سوال یہ ہے کہ یہاں کس کا پیراہن مُراد ہے اپنا یا محبوب کا۔ بعض حضرات نے خود غالب کا لباس قرار دیا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہاں لباسِ یار مُراد ہے۔ اور غالب یہ کہنا چاہتا ہے کہ اگر صبا کی آوارگی پیراہن محبوب کی خوشبو کو ادھر اُدھر لئے پھرتی ہے اور ہم تک نہیں پہونچاتی تو اس کا غم کیوں ہو جب کہ خود ہم میں اس خوشبو سے لُطف اٹھانے کی تاب نہیں"۔ (نیاز فتحپوری)

مطلب صحیح ہے مگر وضاحت کے لئے "ہم میں اس خوشبو سے لطف اُٹھانے کی تاب نہیں" کے بجائے یہ کہا جاتا کہ "گردشِ زمانہ اور تغیرِ احوال نے ہمیں ایسا بے حس اور افسردہ خاطر کر دیا ہے کہ ہم پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا" تو مناسب تھا۔ یہ شعر ایسی حالت کا ترجمان ہے جیسی آخر میں انشاء اللہ خاں کی ہو گئی تھی۔ جس نے اُن سے یہ شعر کہلوایا تھا:-

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

غرضکہ غالب کے محوّلہ بالا دونوں شعر ایک ہی کیفیت کے حامل ہیں۔ اُس کیفیت کے جس کے زیر اثر اُنھوں نے یہ قطعہ کہا تھا:-

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا صبحدم جو دیکھئے آ کر تو بزم میں نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

(۳) اسی غزل میں شعر:-

نوازشہائے بیجا دیکھتا ہوں شکایتہائے رنگیں کا گلہ کیا

کی شرح نیاز صاحب اس طرح فرماتے ہیں:-

"دشمن پر آپ کی بیجا نوازشیں دیکھ کر اگر میں شکایت کرتا ہوں تو آپ کو اس کا گلا کیوں ہے؟ شکایتوں کو رنگین اس لئے کہا گیا کہ اُن کا تعلق محبوب اور غیر کے ربطِ رنگین سے ہے"۔ (نیاز فتحپوری)

"ربطِ رنگین" کی ترکیب نامانوس اور غیر مستعمل ہے اور یوں بھی شکایتہائے رنگین کے یہ معنی نہیں۔ شاعر تو "نوازشہائے بیجا" اور "شکایتہائے رنگین" کا تقابل کرتا ہے کہ تم رقیب کے ساتھ نوازشہائے بیجا تک کرو اور میں اُن نوازشہائے بیجا کی شکایت بھی نہ کروں۔ حالانکہ شکایت غم و غصہ کے لہجے میں نہیں رنگین یعنی خوشگوار اور محبت آمیز انداز میں کرتا ہوں۔

قاآنی کا ایک شعر یاد آگیا:-

وہ تم کہ تم نے جفا کی تو کچھ بُرا نہ کیا وہ میں کہ ذکر کے قابل نہیں وفا میری

(٤)　　دلِ ہر قطرہ ہے سازِ "انا البحر"　　ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

"جس طرح پانی کے ہر قطرے کا (اس لحاظ سے کہ وہ سمندر ہی کا ایک جزو ہے) یہ دعویٰ کرنا کہ
"میں سمندر ہوں" بیجا نہیں ہے۔ اسی طرح اگر ہم بھی یہ دعویٰ کریں کہ ہم وہی (یعنی
خدا) ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ ہم بھی اسی کا ایک جزو ہیں"۔　　(نیاز فتحپوری)

غالب نے تو اس احتیاط کے ساتھ کہا ہے کہ "ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا! مگر نیاز صاحب اس طرح بیباکانہ انداز میں فرماتے ہیں کہ "اسی طرح ہم بھی دعویٰ کریں کہ ہم وہی (یعنی خدا) ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ ہم اُسی کا ایک جزو ہیں"۔

شعر کی تشریح اُسی احتیاط سے کرنی چاہیئے تھی جس احتیاط کو شعر میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس اعتبار سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح قطرہ انا البحر کا دعویٰ کرتا ہے کہ میں سمندر ہوں (کیونکہ قطرہ سمندر میں مل کر سمندر ہو جاتا ہے) اسی طرح ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک خاص اعتبار سے ہم بھی خدا کے ساتھ عینیت کا تعلق رکھتے ہیں (اگرچہ قرآن میں جہاں عینیت سے متعلق آیات ہیں وہاں غیریت سے متعلق بھی ہیں۔ مگر شاعر مطلب کی بات لیتا ہے۔ اس لئے عینیت سے متعلق آیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے محتاط انداز میں کہے تو عُریاں انداز کی خطرناکی کے مقابلہ میں اچھا سمجھا جا سکتا ہے۔

(٥)　　ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے　　دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں!

"مفہوم یہ ہے کہ اگر تجھ تک رسائی نہ ہوتی، یعنی دُشوار ہوتی، تو یہ بات ہمارے لئے سہل تھی
کیونکہ اس طرح ہم مایوس ہو کر خاموش بیٹھ جاتے، لیکن چونکہ تیرا ملنا ناممکن نہیں ہے بلکہ
غیر سے مل سکتا ہے اس لئے نہ ہمارا شوق آرزو کم ہوتا ہے اور نہ یہ جذبۂ رقابت کہ تجھ سے
ہر شخص مل سکتا ہے"۔　　(نیاز فتحپوری)

نیاز صاحب نے بہت صحیح فرمایا کہ "کیا جو چیز دشوار ہوتی ہے اس کی طلب دشواری اور دقت کی وجہ سے چھوڑ دی جاتی ہے؟ دشواری ممکن کو نہیں، امرِ مشکل کو کہتے ہیں"۔ اس کے بعد آپ کا یہ فرمانا بھی بالکل دُرست ہے کہ:-

"غالب کے اس شعر کو شارحین نے طرح طرح سے بیان کیا ہے۔ ہمارے خیال میں اس شعر کا
مفہوم یہ ہے کہ تیرا ملنا اگر آسان نہ ہوتا یعنی مشکل ہوتا تو یہ بات سہل تھی کہ کوشش و جستجو
کے ذریعے مشکل کو آسان بنایا جا سکتا ہے، مگر مشکل تو یہ آن پڑی ہے کہ تیرا ملنا دشوار
بھی نہیں ہے، یعنی ناممکن ہے"۔

اسی بات کو اس طرح ادا کرتا ہوں کہ:- اے دوست! تیرا ملنا اگر آسان نہیں تو مشکل ہوگا (کہ آسان کی ضد مشکل ہی ہے) اور یہ ہمارے سہل ہے۔ اس لئے کہ ہیچ مشکلے نیست کہ آساں نشود! مگر تیرا ملنا مشکل ایک طرف، دشوار بھی نہیں، محال ہے۔ اگر دشوار بھی تو ہمارے لئے آسان تھا مگر وائے حسرت کہ وہ محال ہے!

شعر میں، شاعر نے یہ کمال کیا ہے کہ ایک مصرعے میں آسان اور مشکل کو جمع کر دیا ہے اور دوسرے میں دشوار اور محال کو۔ اور جو پہلے مصرعے میں مشکل مذکور نہیں بلکہ قرینے سے نکلتا ہے اسی طرح دوسرے مصرعے میں محال بھی مذکور نہیں ہے۔ اس پر یہی قرینہ دلالت کرتا ہے۔ نیز جس طرح پہلے مصرعے میں آسان اور سہل کہہ کر گویا لفظ آسان کی تکرار کی ہے اسی طرح دوسرے مصرعے میں دشوار ادا کیا ہے۔

(۶) اسی غزل میں شعر :-

ڈر نالہائے زار سے میرے خدا کو مان　　آخر نوائے مرغ گرفتار بھی نہیں

کی شرح نیاز صاحب اس طرح فرماتے ہیں :-

" خدا کو مان = خدا سے ڈر

" مفہوم یہ ہے کہ لوگ جب کسی طائر کو گرفتار کرتے ہیں تو اس کی بے قراری و فریاد پر انہیں رحم آجاتا ہے، لیکن تو میری فریاد و زاری پر مطلق رحم نہیں کرتا - تو کیا میرے نالہائے زار نوائے مرغ گرفتار سے بھی کم ہیں، جن کا اثر تجھ پر نہیں ہوتا " (نیاز فتحپوری)

اول تو یہ بات کہ " طائر کی بے قراری و فریاد پر گرفتار کرنے والوں کو رحم آجاتا ہے "۔ مشاہدے اور تجربے کے خلاف ہے - پھر اگر یہ بات مان بھی لی جائے تو " خدا کو مان " سے کیا کام لیا گیا ؟

مطلب یہ ہے کہ میرے نالہائے زار کوئی مرغ گرفتار کے نالے نہیں کہ بے اثر رہیں - اس لئے ان سے ڈرنا چاہیئے " خدا کو مان " کا مطلب یہ ہے کہ اگر تو خدا کو مانتا ہے کہ وہ دکھتے دلوں کی فریاد سنتا ہے تو میرے نالہائے زار سے غافل کیوں ہے !

(۷) جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا　　اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گُل !

" موج رنگ کے دھوکے میں مر گیا = یعنی موج رنگ پر فریفتہ ہو گیا -

" گل کو نالۂ لب خونیں نوا فرض کرکے افسوس ظاہر کیا ہے کہ دنیا بھی کتنی حقیقت ناشناس ہے کہ وہ پھول کو موج رنگ سمجھ کر خوش ہوتی ہے، حالانکہ در اصل " لب خونیں نوا " ہے، جس پر اظہار غم کرنا چاہیئے " (نیاز فتحپوری)

نیاز صاحب نے گل کو نالۂ لب خونیں نوا فرمایا ہے - معلوم نہیں اس کی ضرورت کیوں پیش آئی، حالانکہ سیدھی سی بات ہے کہ شاعر موج رنگ کو گل کے لب خونیں نوا کا نالہ کہتا ہے - اور جب یہ بات ہے تو گل کے رنگ کو دیکھ کر خوش ہونے کی بجائے لوگوں کو اظہار غم کرنا چاہیئے - کہ نالے پر خوش نہیں ہوا کرتے - افسوس کیا کرتے ہیں - اور نالہ اس لئے کہ گویا گل اپنی بے ثباتی پر نالہ کر رہا ہے -

(۸) اسی غزل کے شعر :-

آزادی نسیم مبارک کہ ہر طرف　　ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گُل

کے بارے میں فرماتے ہیں :-

" غالب کا یہ شعر یوں تو بہت صاف معلوم ہوتا ہے، لیکن مفہوم کے لحاظ سے کافی مبہم ہے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ " آزادی نسیم " کی مبارکباد کس کو دی جا رہی ہے، خود نسیم کو یا کسی اور کو - شعر کے الفاظ سے نسیم کے سوا کسی اور کی طرف خیال نہیں جاتا - اس لئے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ نسیم ہی کو اس کی آزادی کی مبارکباد دی جاتی ہے - لیکن اس سلسلے میں غور طلب امر یہ ہے کہ اس سے پہلے اس کی آزادی میں کونسی چیز حائل تھی - دوسرے مصرعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ " حلقۂ دام ہوائے گل " میں پھنسی ہوئی تھی اور اب ان حلقوں کے ٹوٹ جانے سے آزاد ہو گئی ہے - لیکن " ہوائے گل " اور اس " حلقۂ دام " سے کیا مراد ہے ؟ ہوا علاوہ خواہش

آرزو کے فضا کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ اور غالباً غالب نے اسی معنی میں اس کا استعمال کیا ہے۔
اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ فضائے گل یا فضائے بہار گویا نسیم کے لئے حلقۂ دام تھی
کہ وہ اس سے چھوٹ کر کہیں اور نہ جا سکتی تھی۔ لیکن اب کہ بہار ختم ہو گئی ہے اور اس کے
حلقہ ہائے دام ٹوٹ گئے ہیں۔ نسیم آزاد ہے جہاں چاہے جائے۔ اور اسی آزادی پر اس کو
مبارکباد دی گئی ہے۔ مدعا یہ کہ جب بہار کا وجود ہی ہمارے سامنے ختم ہو گیا تو ہم بوئے
گل کے لئے آرزوئے نسیم کیوں کریں" (نیاز فتحپوری)

شعر جتنا اس شرح سے مبہم ہو گیا ہے اتنا اصل میں نہیں ہے۔ آزادیٔ نسیم کی مبارکباد خود نسیم کو دی جائے تو عبارت یہ ہو گی "آزادیٔ نسیم، نسیم کو مبارک ہو" اور یہ قواعد کے رُو سے سُقم رکھتی ہے۔ پھر نسیم کی آزادی میں حائل بتلایا ہے "حلقۂ دام ہوائے گل" کو حلقۂ دامِ گل بھی کہتے تو کوئی بات تھی۔ اور ہوائے گل سے فضائے گل اور فضائے بہار مراد لینا اور بھی عجیب بات ہے۔ جب فضائے گل اور فضائے بہار مراد لیتے ہیں تو یہ حلقۂ دام کیونکر بنا۔ اور آخر میں تمام غیر مربوط اور بے جوڑ تصریحات کے بعد یہ نتیجہ نکالنا کہ "مدعا یہ ہے کہ جب بہار کا وجود ہی ہمارے سامنے ختم ہو گیا تو ہم بوئے گل کے لئے آرزوئے نسیم کیوں کریں" کس قدر عجیب بات ہے! یہ غالب کے شعر کا تو مطلب نہیں ہو سکتا۔

آزادیٔ نسیم کی مبارکباد ان لوگوں کو دی جا رہی ہے جو اس آزادی کے شدت سے متمنی تھے اور مبارکباد طنزاً دی جا رہی ہے۔ اس لئے کہ بوئے گل کے آزاد ہوتے ہی خواہ وہ حصولِ مقصد کی وجہ سے خواہ کثرتِ گل کی وجہ سے حلقہ ہائے دام ہوائے گل جس میں لوگ گرفتار تھے، ٹوٹ گئے۔ یعنی بوئے گل یا خود گل کی طلب جاتی رہی۔ اور چونکہ انتظارِ یار میں، وصلِ یار اور سفر میں منزل رسی کے مقابلے میں زندگی ہوتی ہے مگر یہ بوالہوس اس کو نہیں سمجھتے اور حصولِ مقصد ہی کے لئے بیقرار رہتے ہیں اس لئے جب حصولِ مقصد سے وہ لذتِ انتظار باقی نہ رہی تو اس کو طنزاً ہی مبارکباد دینی چاہیئے۔

شاعر نے تفنن یا شاعرانہ توجیہ کے لئے کھلے ہوئے پھولوں کو جس کی ایک ایک پنکھڑی الگ ہو جاتی ہے ٹوٹے ہوئے حلقہ ہائے دام کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔

(۹) اہلِ تدبیر کی واماندگیاں — آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

"جب پاؤں میں چھالے پڑ جاتے ہیں تو عموماً اُن پر مہندی باندھ دیتے ہیں تاکہ چھالے اچھے ہو جائیں۔ لیکن غالب کہتے ہیں کہ یہ چارہ سازوں کی واماندگی اور سعی بیجا ہے۔ کیونکہ جب آبلہ پائی مجھے صحرا نوردی سے باز نہ رکھ سکی تو اس کی حنا بندی کیا باز رکھ سکتی ہے"
اس کے بعد فرماتے ہیں کہ "اس صورت میں "بھی" کا استعمال بے محل ہو جائے گا لہٰذا "بھی" کا خیال رکھتے ہوئے یہ مطلب تحریر فرمایا ہے کہ:۔
"اس لئے "بھی" کے پیشِ نظر شعر کا دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ آبلوں پر حنا باندھنا اگر اس لئے ہے کہ میں چل نہ سکوں تو بیکار بات ہے۔ کیونکہ آبلے ہی مجھ کو صحرا نوردی سے باز نہ رکھ سکے تو اُن پر مہندی لگا لینے سے میں صحرا نوردی ترک کر دوں گا؟" (نیاز فتحپوری)

نسیم اور ... [illegible]

آپ نیاز صاحب کی دونوں تشریحوں کو ملاحظہ فرما چکے ہیں اور یقیناً اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس لئے آپ کا یہ فرمانا صحیح ہے کہ "نیاز صاحب نے جو مفہوم بیان کیا ہے اس کے لحاظ سے "بھی" حشو زائد قرار پاتا ہے"۔

میرے خیال میں لفظ "بھی" پر زور دینے کی صورت میں دو معنی نکلتے ہیں اول یہ کہ شاعر حقارت کے طور پر کہتا ہے کہ اہل تدبیر (عقل وخرد) کی واماندگی دیکھئے کہ آبلوں کی جیسی معمولی تکلیف کو بھی اتنا بڑا سمجھتے ہیں کہ ان پر حنا باندھتے ہیں تاکہ وہ اچھے ہو جائیں تو راستہ چلیں۔ اس کے بخلاف اہلِ عشق وجنوں کا یہ حوصلہ ہے کہ وہ آبلوں پر حنا تو کیا باندھیں گے وہ تو آبلوں سے کانٹوں پر چلنا بھی کھیل سمجھتے ہیں۔

دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ غالب تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر فرماتے ہیں کہ اہل تدبیر کی واماندگی دیکھئے کہ آبلے جو چلنے کے لئے مانع ہوئے تو انھوں نے اس پر حنا اور باندھ دی کہ اور بھی چلنے کے قابل نہ رہیں۔ یعنی آرام طلبی اور تن آسانی کا سامان ہاتھ آتا ہے تو یہ اس کو بہت بڑھا چڑھا کر خوب ہی بیکاری و آرام طلبی میں وقت گذارنے لگتے ہیں اور اس پر بھی اپنے آپ کو اہلِ تدبیر کہتے ہیں۔ ذرا اہلِ تدبیر کی واماندگی عقل دیکھئے! ۔ کہ زندگی ہے حرکت میں، سعی وجہد اور تگ ودو میں اور یہ کچھ بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں کہ ذرا بہانہ ملے تو آرام کریں۔

تجاہل اس وجہ سے ہوا کہ لوگ تو مہندی اس لئے باندھتے ہیں کہ آبلے اچھے ہو جائیں اور وہ چلنے کے قابل ہوں اور غالب فرماتے ہیں کہ وہ واماندگی میں اضافہ کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ کیونکہ پیروں میں مہندی لگنے سے رفتار موقوف ہو جاتی ہے۔

(۱۰) سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالئے وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

نیاز صاحب کی شرح صحیح ہے۔ مگر "ایک مشتِ خاک" کے متعلق آپ کی وضاحت بھی خوب ہے۔

(۱۱) اسی غزل کے شعر: ؎

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے

کی شرح فرماتے ہیں: ۔

"شعر کا مفہوم صاف ہے کہ تجھ سا حسین دنیا میں کوئی نہیں اور اگر یہ سوال کبھی پیدا ہوا تو اس کا جواب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ تیرے سامنے آئینہ لا کر رکھ دوں۔ مدعا یہ کہ تو آپ اپنی مثال ہے اور دنیا میں کوئی دوسرا تیرا مقابل نہیں"۔ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ "شعر میں "تماشا کہیں جسے" کا استعمال سمجھ میں نہیں آتا۔ فارسی لفظ تماشا دو معنی میں مستعمل ہے۔ نظارہ اور ہنگامہ اور ان دونوں معنی میں اس لفظ کا استعمال بغیر کسی تاویل کے درست نہیں معلوم ہوتا۔ "آئینہ کیوں نہ دوں" کا مفعول محذوف ہے۔ جو صرف "تجھے" ہو سکتا ہے۔ اس لئے اگر پہلے مصرعہ کا مفہوم کچھ اس طرح ظاہر کیا جاتا کہ "آئینہ کیوں نہ دوں کہ (تو) تماشا کہے جسے"۔ تو تماشا کا صحیح مفہوم پیدا ہو سکتا" (نیاز فتحپوری)

نیاز صاحب نے کس قدر لمبی بحث کی ہے نیز غالب کے شعر میں اصلاح بھی دیدی تاہم "تماشا کہیں جسے" کا استعمال ان

کی سمجھ میں نہ آیا۔ حالانکہ مطلب یہ ہے اور اس صورت میں "تماشہ کہیں جیسے" بھی اچھی طرح چسپاں ہو جاتا ہے کہ :۔ معشوق کہتا ہے میرا نظیر بتلاؤ۔ اس پر عاشق اس کے ہاتھ میں آئینہ دیدیتا ہے کہ اپنا نظیر اس میں دیکھ لے۔ ظاہر ہے عاشق کے اس فعل کو لوگ تماشہ ہی کہیں گے کہ یہ کیا تماشہ ہے کہ معشوق تو اپنے بے نظیر ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے اور عاشق اس کے دعوے کو غلط ثابت کرنے کے لئے خود اسی کو پیش کر رہا ہے (یعنی اس کے عکس کو جو آئینے میں نظر آرہا ہے)۔

یہ اُردو کا شعر ہے۔ اور غالب نے تماشے کے وہی معنے مُراد لئے ہیں جو اُردو میں عام طور پر مستعمل ہیں۔

"صراحیِ مے ناب و سفینۂ غزلے"

غمِ دوراں میں کہاں بات، غمِ جاناں کی
نظم ہے اپنی جگہ خوب مگر ہائے غزل (فضلی)

شفیق جون پوری مرحوم

مٹانا چاہتا ہے انقلابِ روزگار اب تک
مگر تہذیبِ درویشاں ہے بے گرد و غبار اب تک

نہ جانے کونسی ساعت تھی جب نکلے تھے اندلس سے
کہ رہتی ہے زمانہ کی ہوا نا سازگار اب تک

جب اپنے آشیانے تھے، جب اپنے ہی ترانے تھے
نگاہوں میں پھرا کرتا ہے وہ دورِ بہار اب تک

فصلِ گل میں بھی بہاروں کا وہ انداز نہیں
کہ نظر دیکھنے والوں کی چمن ساز نہیں

بے پر و بال نہیں ہیں، ترے مرغانِ حرم
زورِ پرواز تو ہے ہمتِ پرواز نہیں

ایسے ماحول میں خاموش ہی رہنا اچھا
حالِ دل کس کو سناؤں کوئی ہمراز نہیں

اپنے نغموں کی وہی دھوم شفیق آج بھی ہے
گو ہمارا کوئی محفل میں ہم آواز نہیں

راشد اللہ خاں جوہر:—

چھوٹ رہا ہے دامنِ جاناں
ٹھیر ذرا لے گردشِ دوراں

ذکرِ تیرہ شبی سے حاصل
رکھ امیدِ صبحِ درخشاں!

تیرے آگے گرد ہیں سارے
کیا مہ و انجم، کیا گلِ خنداں

دیوانے ہی سلجھائیں گے
اُلجھے اُلجھے گیسوئے دوراں

تحسین جارچوی:—

تیرے لئے یارب یہ بڑی بات نہیں ہے
مانا کہ مری اُن سے ملاقات نہیں ہے

صد حیف کہ برباد ہوئے ہم تری خاطر
صد شکر کہ تو واقفِ حالات نہیں ہے

توحی فائزی:—

مانگنے سے کبھی نہیں ملتی
موت بھی زندگی کے بدلے میں

ادیب سہارنپوری:—

حسن و انداز جو بخشا تھا بتوں کو یارب
دلنوازی کے طریقے بھی سکھاتے ہوتے

بجلی سی لگی، پھر بھی ہر بات اُن کی
بہت ہم نے چاہا، بُرا مان جائیں!

روحِ انتخاب

کسے خبر تھی کہ اس خطۂ پاک کے معرضِ وجود میں آنے کے ساتھ ہی یہاں کی اجتماعی زندگی میں بگاڑ پیدا ہونا شروع ہو جائے گا۔ اصول پرستی کی جگہ مفاد پرستی، ایثار کی جگہ خود غرضی، اتفاق و اتحاد کی جگہ تشتّت و افتراق، دُور اندیشی کی جگہ کوتاہ بینی اور فہم و فراست کی جگہ سطحی جذباتیت لے لیگی۔ پھر یہ ملک رنگ، نسل اور زبان کی جن غیر اسلامی عصبیتوں کو مٹانے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ وہ ختم ہونے کی بجائے پُوری شدت اور قوت کے ساتھ سر اٹھائیں گے اور اسلام کا وہ مقدس اور پاکیزہ رشتہ جس نے اس قوم کے مائل بہ انتشار اجزا کو باہم جوڑ کر اسے منظم قافلہ کی صورت دی تھی وہ آہستہ آہستہ کمزور پڑتا چلا جائے گا۔ اور اس کے اضمحلال کی وجہ سے ملّت پارہ پارہ ہو کر رہ جائے گی۔

آپ پاکستان کے حالات کا اگر گہرائی میں اتر کر مطالعہ کریں تو آپ کو احساس ہوگا کہ اس ملک میں سوائے برق و بخارات کے چند مظاہر کے جو زیادہ تر غیر ملکی سرمایہ کی کرشمہ سازیاں ہیں، زندگی کے کسی شعبہ میں کوئی ترقی نہیں ہوئی بلکہ ہر اعتبار سے انحطاط ہوا ہے۔ خصوصاً حیاتِ انسانی کا وہ شعبہ جسے انسانیت سازی کہا جاتا ہے اور جس سے نوعِ بشری کو روحانی اور فکری غذا میسّر آتی ہے وہ تو بالکل برباد ہو کر ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ لوگوں کے فکر و نظر کے زاویوں میں انتشار اور ان کے قلب و نگاہ میں بڑی تیزی کے ساتھ فساد پیدا ہو رہا ہے۔ اور اس طرح ان کی مادی ترقی بھی ان کے لئے مفید اور کار آمد ہونے کی بجائے ان پر عذاب بن کر مُسلّط ہو رہی ہے۔ صنعتی نظام کی کون سی بھلائی ہے جو اس خطۂ پاک میں پرورش نہیں پا رہی۔ ملک کی بیشتر پیداوار پر ایک نہایت ہی قلیل سا طبقہ دادِ عیش دینے میں مصروف ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے نام پر صنفی انارکی کا ایک طوفان اٹھ رہا ہے۔ بے پردگی، بے حیائی اور فحاشی کا سیلاب عفت و عصمت کے مضبوط سے مضبوط قلعوں کے ساتھ ٹکرا کر انہیں مسمار کرنے کے درپے نظر آتا ہے۔ پھر مختلف طبقات کے درمیان محبت اور مودت کے رشتے ختم ہو رہے ہیں اور ان کی بجائے تلخی، بے اعتمادی اور عناد اجتماعی زندگی کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔

کسی قوم کے اندر اس نوعیت کے تباہ کُن رجحانات کا پیدا ہو جانا کوئی نیک فال نہیں ہوتا۔ یہ ترقی کی علامت نہیں بلکہ تنزّل اور بربادی کا پیغام ہیں۔ یہ اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ ہے کہ قوم کے اندر تعمیری صلاحیتوں کے سارے چشمے سُوکھ گئے ہیں اور اب تخریب کا زہر اس کے رگ و ریشے میں سرایت کر رہا ہے۔

یہ رجحانات بھی اپنے اندر تشویش کا کافی سامان رکھتے ہیں اور کوئی زندہ قوم ان سے صرفِ نظر نہیں کر سکتی۔ لیکن ہمارے نزدیک ان سے کہیں زیادہ تشویشناک یاس و قنوطیت کی وہ خوفناک لہر ہے جس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور جس کی وجہ سے قوم کے عزائم ٹھٹھر کر رہ گئے ہیں اور اس کے احساسات کے اندر افسوسناک حد تک اضمحلال پیدا ہو چکا

ہے۔ جس قوم کی آرزوؤں اور اُمنگوں پر مُردنی چھا جائے اور جس کی تمناؤں کے نخلستان افسردگی کی وجہ سے اُجڑنے لگیں، اُس کے متعلق یہ سوچنا کہ اس پر بہار آچکی ہے ایک ایسی خوش فہمی ہے جس کے ڈانڈے حماقت اور بیوقوفی سے جاملتے ہیں۔

یہاں انسان کے ذہن میں بالکل فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انحطاط کا یہ سلسلہ بالکل غیر متوقع طور پر محض بخت و اتفاق کی وجہ سے شروع ہو گیا ہے یا اس کے کچھ ایسے اسباب ہیں جن میں ہماری غلط روی کا دخل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سُنّت ہے کہ اُس نے آج تک کسی قوم کو ہلاکت اور بربادی سے دوچار نہیں کیا جس نے خود لگے بڑھ کر بربادی کے اس انجام کو پہنچ کر لئے حماقتوں پر حماقتیں نہیں کیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ جو ملک اتنی مقدس آرزوں اور پاکیزہ ارادوں کے ساتھ حاصل کیا گیا تھا وہ پندرہ سال گزرنے کے بعد آج ہر قسم کے فتنہ و فساد کی آماجگاہ بن گیا ہے اور یہاں نیکی اور بھلائی کی تخم ریزی ہونے کی بجائے منکرات کے جھاڑ جھنکار بڑی تیزی کے ساتھ بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اس تشویشناک صورتِ حال کو بدلنے کے لئے یہ بیحد ضروری ہے کہ سب سے پہلے اُن اسباب کا کھوج لگایا جائے جنھوں نے ہماری اجتماعی زندگی میں ان فتنوں کو جنم دیا ہے۔ جب تک فساد کے اصل مرکز کی نشاندہی نہ کی جائے اس کے تدارک کی کوئی تدبیر بھی کارگر نہیں ہو سکتی۔

ہمارے نزدیک اس ساری خرابی کی اصل جڑ ہمارے اصحابِ اقتدار کا وہ منافقانہ رویہ ہے جو انھوں نے اسلام کے بارے میں پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے ساتھ ہی اختیار کیا اور جس میں آج تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

عبدالحمید صدیقی ایم اے

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

حضرت شفیق جونپوری مرحوم

جناب شفیق جون پوری مرحوم کا کلام تو رسالوں میں پڑھتا رہتا تھا، مگر اُن سے میری ملاقات لکھنؤ کے "مشاعرۂ مدح صحابہ" میں ہوئی۔ اس واقعہ کو بھی بیس اکیس سال ہونے کو آئے، اس کے بعد ان سے مشاعروں میں ملنا ہوتا رہا۔ تقسیمِ ہند سے قبل جب میں دکن میں تھا، تو اُن سے کچھ دنوں خط و کتابت بھی ہوئی۔ پاکستان بننے کے بعد جب "فاران" نکلنا شروع ہوا، تو میں نے اُن سے کلام بھیجنے کی درخواست کی، اور انھوں نے میرے نیاز نامہ کو پڑھتے ہی اپنا کلام بھیج دیا۔

حضرت شفیق جون پوری مرحوم کا کلام "فاران" میں اکثر چھپتا رہا ہے، بعض اوقات میری طلب کے بغیر بھی کرم فرماتے اور کئی کئی غزلیں ایک ساتھ بھیج دیتے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ انتخاب میں اُن کی غزل کے اشعار کم ہو جاتے مگر انھوں نے میری اس "جسارتِ انتخاب" کا بُرا نہیں مانا، نہ مجھ سے یہ پوچھا کہ فلاں فلاں شعر تم نے کیوں حذف کر دیئے؟ اس کی وجہ بتاؤ؟ ——
یہ اُن کی عالی ظرفی تھی اور ساتھ ہی راقم الحروف کے ذوقِ انتخاب پر اُن کے اعتماد اور اعتبار کی دلیل!

شفیق مرحوم کا مذہبی رجحان "بریلوی عقائد" کی جانب تھا، کبھی کبھار میرے کسی بدعت شکن مضمون پر نرم لہجہ اور شفقانہ انداز میں گرفت بھی فرماتے۔ میں ہاتھ کے ہاتھ جواب دیتا، اس پر وہ خاموش ہو جاتے، اور اس طرح "جواب الجواب" کا سلسلہ دراز نہ ہونے پاتا، اُن کے اور میرے درمیان بحث و مباحثہ میں ذرہ برابر بدمزگی اور کبیدگی پیدا نہیں ہوئی! میں نے مرحوم کی کتابوں پر "فاران" میں گرفت و تنقید کی، تو اُس کا بھی کوئی ناگوار اثر قبول نہیں کیا۔

حضرت شفیق جون پوری مرحوم نے مرنجان و مرنج طبیعت پائی تھی، اُن کے مزاج میں سادگی کے ساتھ وضعداری بھی تھی جن سے جیسے تعلقات قائم ہو جاتے، انہیں نباہنے اور برقرار رکھنے کی کوشش کرتے، شعر گوئی میں وہ اُستادانہ مہارت رکھتے تھے، غزل اور نظم دونوں کے بادشاہ! اُن کی نظموں میں "حدی اور رجز" کا خوشگوار امتزاج ملتا ہے! زود گوئی، پُرگوئی، خوش گوئی یہ ہیں اُن کی شاعری کی چند خصوصیات! انھوں نے اپنی زندگی میں اپنی قدر شناسی کی تھوڑی بہت بہار دیکھ لی، بڑے بڑے حاکموں اور وزیروں تک نے اُن کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کیا، ہندوستانی حکومت نے ماہانہ وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا۔

حضرت شفیق جون پوری کے چھوٹے بھائی جناب عزیز ربانی (ایڈیٹر — نئی دنیا) نے مجھے لکھا:—

"۔۔۔۔ غالباً آنجناب کو آل انڈیا ریڈیو یا اخبارات کے ذریعہ میرے حقیقی بھائی حضرت مولانا شفیق جون پوری کے سانحہ ارتحال کی خبر مل گئی ہوگی' مرحوم کا انتقال ۵ مارچ ۶۳ء کو ۵ بجے شام کے وقت ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

برادرِ معظم کو آپ کی ذاتِ گرامی سے والہانہ اور پُرخلوص محبت تھی مرحوم اکثر آپ کا ذکرِ خیر کرتے تھے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ کی پُرخلوص روایات جو بھائی مرحوم کے ساتھ وابستہ تھیں اگرچہ میں اس کا اہل نہیں تاہم ناچیز کی دلجوئی کے لئے برقرار رکھیں گے۔ ۔ ۔ ۔"

شفیق صدیقی جونپوری کی موت ——— ایک غیرت مند مسلمان، شریف النسان اور عظیم شاعر کی موت ہے اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے (آمین)

———×———

حاجی محمد اصطفا خاں لکھنوی مرحوم

میں ہائی اسکول میں پڑھتا تھا، اُن دنوں لکھنؤ کا ایک ماہنامہ نظر سے گزرا نام تھا۔ "ترجمانِ نظر" اور اُس پر حاجی لکھنوی کا نام ایڈیٹر یا "سرپرست و نگراں" کی حیثیت سے مرقوم تھا، یہ اُن سے پہلا تعارف تھا! اصغر علی محمد علی تاجر لکھنؤ کے اشتہارات کے ذریعہ اس کا پتہ لگا کہ یہ صاحب عطر سازی کے اس کارخانہ کے مالک بھی ہیں ——— اُن سے ملاقات پاکستان بننے کے بعد کراچی میں ہوئی، حضرت جگر مُرادآبادی شروع شروع میں پاکستان تشریف لائے تو حاجی صاحب ہی کی کوٹھی میں قیام فرمایا، پھر دوبارہ آئے تو کئی مہینہ اُن کے یہاں ٹھہرے! اس طرح حاجی اصطفا خاں صاحب مرحوم سے کے موقعے بار ہا آئے! جگر صاحب کے دورانِ قیام میں اُنکے اہتمام سے حاجی صاحب کے یہاں بڑے دھوم کا مشاعرہ ہوتا!

حاجی اصطفا خاں مرحوم، حضرت جگر کا بڑا احترام بلکہ ناز برداری کرتے تھے مگر ایک رات "رمی" کھیلنے پر خاصے [illegible] انداز میں جگر صاحب کو تنبیہ کی۔ اس نصیحت کا اِتنا اثر ہوا کہ جگر صاحب کئی دن "رمی" کھیلنے سے رُکے رہے اور یہ چند دن اُن پر [illegible]ت گزرے۔

حاجی صاحب مرحوم نے متعدد شادیاں کی تھیں، کثیر الاولاد تھے، مگر اس کے باوجود اُن کی خانگی زندگی سکون و اطمینان کی زندگی تھی! کوٹھیوں اور بنگلوں کے کرایہ کی ہزاروں روپیہ ماہوار کی آمدنی تھی لیکن خرچ آمدنی کے حدود ہی میں رہتا، امیرانہ زندگی تھی مگر تبذیر و اسراف سے دُور! اس احتیاط اور سلیقہ کے ساتھ "بڑے آدمی" کم ہی رہتے ہیں۔

گوری رنگت، بوٹا سا قد، سر پر پٹھے، اور چہرے پر ڈاڑھی کیا بہار دیتی تھی، وضع قطع، رہن سہن پہناوا کھانا پینا خالص مشرقی بلکہ لکھنوی! جوانی کے زمانے میں "اسکیٹنگ" کا شوق تھا اور اس فن میں کمال حاصل کیا، تین چار فٹ قطر کی میز پر "اسکیٹنگ" کرتے، لندن کے کلب میں لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو حیران و ششدر رہ گئے! (اس واقعہ کا حاجی مرحوم نے بڑی تفصیل کے ساتھ مجھ سے ذکر کیا)

شعر و ادب سے خاصی دلچسپی تھی، عاشقانہ غزلیں بھی کہتے اور نعت و منقبت بھی! اُن کے کلام کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں! تاریخ گوئی کی بڑی مشق تھی، میں زیارتِ حرمین شریفین سے واپس آیا تو مبارکباد کی نظم کہہ کر اور اپنے ہاتھ سے لکھ کر دفتر "فاران" میں تشریف لائے۔ خط پاکیزہ تھا، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ انھوں نے خطاطی کی مشق کی ہے! ۱۹۴۹ء کا واقعہ ہے ایک بار اپنے یہاں مجھے اور مسٹر ذوالفقار علی بخاری (سابق ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان) کو کھانے پر بلایا، ۳۱

دعوت کی غرض یہ تھی کہ "شعر وادب" کی ترویج و ترقی کے لئے ایک انجمن یا حلقہ بنایا جائے۔

صوم وصلوٰۃ کے پابند، تہجد گزار، مسجد میں جاکر باجماعت نماز پڑھنے کا اہتمام والتزام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے عقیدت اور تعلق عشق کی حد تک پہونچا ہوا، مدینہ منورہ میں "اصطفا منزل" اُن کے اس عشق و محبت کی یادگار ہے، دو چار نہیں بیسیوں حج اور عمرے کئے یا حرمین شریفین کی سال کے سال زیارت، یہی اُن کا شوق تھا، اور اسی مقدس سفر سے اُن کی زندگی کی ساری دلچسپیاں وابستہ تھیں ——— اور اسی یاد، شوق اور ذکر و فکر میں دُنیا سے سلامتی ایمان کے ساتھ رخصت ہوگئے ——— رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، و برد اللہ مضجعہ!

ضروری تصحیح

"سالنامہ سنہ ۶۳ء" نیاز نمبر دو حصوں میں شائع ہو رہا ہے ———

اول:۔ مئی کے پہلے ہفتہ میں۔ دوم:۔ جون میں ———

قیمت ہر حصہ:۔ چار روپیہ

ہماری نظر میں

تحفۃ الموحدین از:- حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، ترجمہ:- مولانا رحیم بخش دہلوی، ضخامت ۴۰ صفحات، قیمت:- ۶۲ پیسے۔

ملنے کا پتہ:- مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ علیہ کی یہ کتاب "شرک و بدعت" کے رد میں اگرچہ مختصر ہے مگر بہت مفید ہے! اصل کتاب فارسی میں ہے جس کا اردو ترجمہ متن کے نیچے درج کیا گیا ہے، تقریباً پچاس سال قبل یہ کتاب ترجمہ کے ساتھ افضل المطابع دہلی سے شائع ہوئی تھی اب اس کتاب کی اشاعت کی سعادت مکتبہ سلفیہ لاہور کو میسر آئی ہے۔

تحفۃ الموحدین کے خاص عنوانات:-

تصرف در کائنات خاصہ انبیا است —— علم غیب خاصہ خدا است —— در بیان اشراک فی العبادات —— نیاز بزرگاں —— ندائے غیر اللہ —— اکابر پرستی —— بہتر طریق ایصال ثواب —— یا علیؓ وغیرہ ناجائز (—— بعضے آدمی اس کے برعکس یا پیر یا خواجہ، یا علی کہتے ہیں، مومن کو ان باتوں سے پرہیز کرنا واجب ہے) —— (عبدالرسول اور اس طرح کے دوسرے نام ناجائز ہیں)

حضرت شاہ صاحب ایصالِ ثواب کے قائل ہیں، مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی فرماتے ہیں:-

"اگرچہ اعمال کا ثواب بخشنا درست ہے، لیکن شرک کا موجب بھی ہے، کیونکہ عوام الناس تمیز نہیں کرتے کہ ہم ان عبادتوں کا ثواب بزرگوں کو بخشتے ہیں، یا خود بزرگوں کی قربت اور رضامندی کے واسطے عبادت کرتے ہیں، یوں ہی انجام کار غیر خدا کے نام کی عبادت کرنے لگتے اور مشرک بن جاتے ہیں، چونکہ اس زمانہ میں اعمالِ شرک کی کثرت ہے، لہٰذا خاص لوگوں کو مناسب ہے کہ اس قسم کے کاموں سے غفلت اور چشم پوشی کریں تاکہ شرک کا دروازہ بند ہو جائے"۔

مسئلہ اجتہاد پر تحقیقی نظر تالیف:- مولانا محمد تقی امینی ضخامت:- ۱۶۰ صفحات (مجلد رنگین گرد پوش)

ملنے کا پتہ:- ادارۂ علم و عرفان اشرف کا بلڈنگ اسٹیشن روڈ، اجمیر۔

پاکستان میں:- محمد محی الدین ۲۹۴ - اے سٹیلائٹ ٹاؤن، سرگودھا۔

"اجتہاد کے موضوع پر گزشتہ چند سالوں میں متعدد مضامین اور کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر یہ کتاب اپنی جامعیت کے اعتبار سے ممتاز و منفرد کتاب ہے! اس میں بتایا گیا ہے کہ اجتہاد کی حقیقت کیا ہے؟ اجتہاد کا مفہوم کس قدر وسعت رکھتا ہے؟ اجتہاد کی ہر دور میں ضرورت رہتی ہے، موجودہ دور میں کس اجتہاد کی ضرورت ہے —— اجتہاد کی صلاحیت، مصالح و مقاصد اور اس

سے متعلقہ احکام، قرآنِ حکیم اور سُنّتِ رسولؐ سے "اجتہاد" میں کس طرح استفادہ کرنا چاہیئے۔

اور

اجماع، قیاس، استحسان اور مصالح مرسلہ کسے کہتے ہیں؟ اختلافات کو تطبیق دینے کی صلاحیت، اجتہاد کی قسمیں، کن عصور تیں میں اجتہاد کی ضرورت ہے ——— اجتہاد کا طریق کار۔

مولانا محمد تقی امینی وسیع النظر فقیہ ہیں' اس لئے وہ اس پر بھی نگاہ رکھتے ہیں کہ فقہاء متقدمین ومتاخرین میں کس کے یہاں فقہی مسائل میں وُسعت ملتی ہے اور کہاں تنگی پائی جاتی ہے! وہ لکھتے ہیں :۔

"کفو کے مسائل جس انداز سے فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں، موجودہ معاشرہ اُن کا متحمل نہیں ہے، اُن پر عمل درآمد کی صورت میں دُشواری پیش آتی ہے، نیز جس مقصد کے پیشِ نظر ان مسائل کی تخریج ہوئی تھی۔ اب اس کے حاصل کرنے کے لئے ان حدود و قیود کی ضرورت نہیں باقی رہ گئی ہے، اس لئے اس باب کے مسائل از سرِ نو مُرتب کرنے اور ان میں وُسعت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔"

"شہادت" رہن وغیرہ کے احکام شہادت میں عدالت کا جو ظاہری معیار متاخرین کی کتابوں میں ہے، اس پر عمل درآمد اس دور میں سخت مشکل ہے، لیکن متقدمین کی کتابوں میں وسعت اور فراخی موجود ہے، ان کی روشنی میں ایک نیا معیار مقرر کرنے کی ضرورت ہے"

"سفر اور مرض کی بعض مخصوص حالت میں جمع بین الصلوتین کی اجازت اور حالات کے پیشِ نظر نمازِ خوف کی تشکیل وغیرہ۔۔۔"

مگر مولانا موصوف کا یہ بصیرت افروز مشورہ اُن علماء کو ناگوار ہوگا، جو فقہ کی کتابوں میں مدون کئے ہوئے مسائل میں کسی قسم کی ترمیم کو بھی دین میں فساد و خرابی کا باعث سمجھتے ہیں۔ اور جدید مسائل کے بارے میں جن کا زاویہ نگاہ بہت زیادہ تنگ ہے۔

"امام مالکؒ نے مصالح مرسلہ کے استعمال میں زیادہ وسعت سے کام لیا ہے' اور موقعہ محل کے لحاظ سے بعض جگہ مقررہ حدود و قیود کی پابندی کا بھی زیادہ لحاظ نہیں کیا ہے اسی وجہ سے یہ اصُول اُن کی جانب منسوب ہے، ورنہ اس کے نفسِ حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہے" (ص ۱۲۹)

مگر "قیاس و رائے" کے بارے میں اگر کسی حنفی امام پر اس محتاط انداز میں نرم سے نرم تنقید بھی کی جائے تو احناف کے حلقوں میں شور مچ جاتا ہے کہ یہ تنقید نہیں تنقیص ہے! فقہی مسائل میں "آزادئ رائے" اور "تقلید جامد" دونوں غلط انتہائیں ہیں۔

MUSLIMS IN INDIA

از :۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ترجمہ :۔ محمد آصف قدوائی

ضخامت :۔ ۱۵۶ صفحات (مجلد، گرد پوش کے ساتھ) قیمت :۔ سات رُوپے

ملنے کا پتہ :۔ اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے "ہندوستانی مسلمانوں" کے موضوع پر عربی زبان میں لندن ریڈیو سے متعدد مضامین نشر فرمائے تھے۔ ان مضامین کو عام طور پر پسند کیا گیا، پھر یہ مضامین عربی کے ایک مجلد میں مدوّن کر دیے گئے، اس کتاب کو سید محمود الحسن ندوی نے اُردو میں منتقل فرمایا۔

مولانا علی میاں مدظلہ نے اس کتاب پر نظرثانی فرما کر بعض ضروری مضامین کا اضافہ کیا اور اس کتاب کو (اضافہ شدہ مضامین کے ساتھ) ڈاکٹر محمد آصف قدوائی نے انگریزی زبان میں ترجمہ فرمایا، ترجمہ رواں ہی نہیں شگفتہ بھی ہے!

اس کتاب کا ایک باب ہے :-

اس کے مترجم مولانا موصوف کے برادر زادہ محمد الحسنی صاحب ہیں۔

اس کتاب کے عنوانات :-

ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں نے کیا اثر ڈالا؟ —— مسلمان علما اور ان کے کارنامے —— بعض شہرہ آفاق مسلم شخصیتیں —— ہندوستان کے صوفیا کرام اور معاشرے پر ان کے اثرات —— ہندوستانی مسلم کلچر —— قرونِ وسطیٰ کے نظام تعلیمی کی چند اہم خصوصیات —— مسلمانوں کے جدید دینی، تہذیبی اور تعلیمی مراکز —— ہندوستان کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں نے کتنا اہم رول ادا کیا —— مسلمانانِ ہند کی حالیہ مشکلات و مسائل۔

اس کتاب میں بڑی جرأت کے ساتھ تاریخی حقائق بیان کئے گئے ہیں، اور ثابت کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی علمی و تہذیبی اور روحانی ترقی میں مسلمانوں نے کتنے نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں اور حصولِ آزادی کی کوششوں میں وہاں کے مسلمان ابنائے وطن کے نہ صرف دوش بدوش بلکہ ان سے کچھ آگے ہی رہے ہیں، اور انھوں نے اس خطہ کو اپنا محبوب وطن سمجھ کر اپنے خونِ جگر سے اس کی آبیاری کی ہے۔

مگر

اس کو کیا جائے کہ "ظلم" اندھا اور بہرا ہوتا ہے۔

امام الہند از:- ابوسلمان الہندی، ضخامت ۳۸۰ صفحات، قیمت:- چھ روپے۔
ملنے کا پتہ:- پاک اکیڈیمی ۱۴/۱ وحید آباد، کراچی۔

اس کتاب کو مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے خود نوشتہ حالات (تذکرہ اور غبارِ خاطر) کی روشنی میں اُن کی تحریروں کے اقتباسات کے ساتھ مُرتب کیا گیا ہے! اس میں مولانا آزاد کے "نسب" کا بھی مفصل تذکرہ ہے اور اُن کی سوانح حیات کی بھی جھلکیاں ملتی ہیں! مولانا کے حالاتِ زندگی کے علاوہ اُن کے والد، بعض عزیزوں اور اساتذہ کے حالات سے بھی یہ کتاب مزین ہے! یہاں تک کہ مسیتا خاں گویئے کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جس سے مولانا آزاد نے موسیقی سیکھی تھی۔

مولانا آزاد درسِ نظامیہ سے کب فارغ ہوئے؟ کس سے کیا سیکھا؟ کیا مولانا آزاد علامہ شبلی کے شاگرد تھے؟ مولانا آزاد انگریزی اور فرانسیسی، مولانا آزاد کی ابتدائی دور کی تصنیفات اور آزاد کی کہانی ماہ و سال کی زبانی (۱۸۸۸ تا ۱۹۱۲ء) —— ان ابواب نے اس کتاب کی تاریخی حیثیت بہت بلند کر دی ہے اور فاضل مُرتب نے بڑی محنت کاوش اور عقیدت کے ساتھ اس کتاب کو مدوّن فرمایا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی شاعری کے نمونے بھی اس کتاب کی زینت ہیں اور اس کتاب سے پہلی بار یہ بات معلوم ہوئی کہ یہ مشہور شعر:-

سب لوگ جدھر وہ ہیں اُدھر دیکھ رہے ہیں ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا لکھا ہوا ہے! ایڈورڈ ہفتم شہنشاہِ برطانیہ کے جشن تاجپوشی پر مولانا آزاد نے جو مثنوی کہی تھی اُسے بھی اس کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی غیر معمولی ذہانت، اُن کی بے مثال انشاپردازی اور اُن کا علم و فضل اپنی جگہ مُسلّم ہے، ایسے ذہین و طباع لوگ صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اس اعتراف کے بعد یہ بھی حقیقت ہے کہ مولانا آزاد نے اپنے خاندانی حالات وغیرہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اُس میں بعض باتیں متضاد ہیں بعض مشتبہ ہیں اور بعض غیر واقعی ہیں!

"فاران" میں اس موضوع پر مفصل بحث ہو چکی ہے اُس کو ہم بار بار کیا دُہرائیں اس کتاب نے ایک اور اُلجھن پیدا کر دی۔۔۔ وہ یہ کہ مولانا آزاد کی پیدائش ۱۸۸۸ء کی بتائی گئی ہے اور ۹۹ ـ ۱۸۹۸ء میں جب وہ دس گیارہ سال کے تھے اپنی غزلیں امیر مینائی کے پاس اصلاح کے لئے بھیجتے ہیں اور اسی عمر میں "نیرنگِ عالم" کے نام سے ایک گلدستہ جاری فرماتے ہیں! اس واقعہ کو صحیح ماننے کی صرف یہی صورت ہے کہ اس کو مولانا آزاد کی "کرامت" تسلیم کر لیا جائے!

مولانا ابوالکلام آزاد کی اس قسم کی تحریروں پر جب تنقید کی جاتی ہے، تو اُن کے بعض عقیدت مند اہلِ قلم گالیوں پر اُتر آتے ہیں کسی کی مدافعت میں حقائق و دلائل کی بجائے سب و شتم سے کام لینا کمزوری کی دلیل ہے! مثلاً مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ اُن کے والد کے نانا مولانا منورالدین کو مغلیہ عہد میں "رکن المدرسین" کا منصب دیا گیا! حالانکہ مغلیہ عہد کی کسی کتاب، نوشتہ، تاریخ اور وقائع نامہ میں اس نام کا کوئی عہدہ اور منصب نہیں ملتا! اس کتاب کے فاضل مُرتب کو مولانا آزاد کے اس بیان کی تصدیق کسی تاریخی حوالے سے کرنی تھی! مولانا آزاد کی مدافعت مصنف نے جہاں جہاں کی ہے، وہ مقامات محلِ نظر ہیں اور مصنف کا موقف خاصہ کمزور ہے

مسیحیت کی آغوش میں

از:۔ عرشی، ضخامت ۷۲ صفحات، قیمت ۶۲ پیسے۔
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ فیض الاسلام، راولپنڈی۔

مسیحیت کیا ہے؟ اس کے کیا خدوخال اور معتقدات ہیں! انجیلیں حضرت مسیح کے بعد بہت مُرتب ہوئیں ——— مُروجہ مسیحیت کا دین و دانش سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے ——— اس کی تفصیلات اس کتابچہ میں ملتی ہیں! جناب عرشی نے اختصار و اجمال کے باوجود "مسیحیت" کے بارے میں وہ تمام ضروری باتیں بیان کر دی ہیں جن سے یہ مذہب تہ کیسے پاتا ہے! اس کتاب کو پڑھنے کے بعد "مسیحیت" اچھی طرح بے نقاب ہو جاتی ہے! اُن مسلمانوں کی بدبختی اور کور چشمی کو کیا کہئے جو اسلام کو چھوڑ کر مسیحیت قبول کرتے ہیں۔

گھریلو جھگڑے

از:۔ ابن فرید، ضخامت ۱۷۶ صفحات، قیمت دو روپے ۳۷ پیسے۔
ملنے کا پتہ:۔ ادارہ "بتول" ۴ ۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور۔

اس کتاب کے عنوانات ہی سے اُس کی افادیت، ضرورت اور اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:۔

جھگڑے کیوں؟ ——— بچوں کے جھگڑے ——— بڑوں کی رنجشیں ——— گھر والوں سے تلخی ——— ہمسایوں سے کدورت ——— سسرال میں اَن بن ——— ساس، سُسر وغیرہ ——— ازدواجی جھگڑے ——— جھوٹے مدِمقابل ——— خوشگوار زندگی۔

یہ ایک مقبول کتاب ہے جو دو بار ہندوستان میں چھپی ہے اور تیسری بار پاکستان میں شائع ہوئی ہے! جناب ابن فرید نے ازدواجی زندگی اور اُس کے تعلقات و لوازم کا بڑی دقتِ نظر سے مطالعہ کیا ہے، اس لئے اُن تمام رخنوں کی نشان دہی کی ہے، جو اس زندگی کو ناخوشگوار بناتے ہیں! افہام و تفہیم کا انداز عام فہم ہی نہیں دل نشین بھی ہے۔

"آپ کے کپڑے میں ذرا سا کیچڑ لگا ہے"۔ (ص۲۳) فصحا "کیچڑ" کو مونث بولتے ہیں ——— "وہ بات کرتے دیدے کیوں نچاتی ہے" (۴۴) روزمرہ "دیدے مٹکانا" ہے ——— "بکس کیوں الجھ دیا" (ص۶۱) یہ کہاں کی زبان ہے! "یہ لڑکی ہیکڑی مارتی ہے"۔ (ص۵۳) "ہیکڑی مارنا" روزمرہ کے خلاف ہے ——— "صفائی چھوڑتی ہیں تو کمرے کا سارا سامان الجھا پڑا رہتا ہے" (ص۱۳۱) یہ کیا انداز بیان ہے؟ "سارا سامان تتر بتر یا بکھرا پڑا رہتا ہے" لکھنا تھا۔

"آپ چنگاڑی لگانے کے بعد پانی کے لئے دوڑیں" (ص۱۳۵) یہ یقیناً کتابت کی غلطی ہے کہ "چنگاری" کو "چنگاڑی" (ڑ کے ساتھ) پڑھنا پڑا۔ "چنگاری ڈالنا" روزمرہ ہو ... "اور نہ ہی چھوٹوں کو آپ کے برخلاف بے بہار آزادی مل جاتی ہے" (ص۱۳۸) حیرت ہے کہ ابنِ فرید جیسے محتاط و سنجیدہ انشا پرداز بھی "نہ ہی" لکھتے ہیں، کیا یہ غلطی "وبائے عام" بن کر رہے گی (توبہ!)

جناب ابنِ فرید کی کتاب ——— کیسے رہیں ——— پر "فاران" میں تبصرہ ہو چکا ہے حیرت ہے کہ اس کتاب میں زبان و انشاء کا جو رچاؤ ملتا ہے، "گھریلو جھگڑے" میں وہ رنگ نظر نہیں آیا ——— بہرحال جہاں تک کتاب کی افادیت کا تعلق ہے، وہ اپنی جگہ مُسلّم ہے، مسلمان گھرانوں میں یہ کتاب "گھریلو نصاب" کی طرح پڑھی اور پڑھائی جانی چاہیئے!

اسلامی دُنیا (چوتھی صدی میں)

از:- حافظ غلام مرتضیٰ (اُستاد عربی و فارسی الٰہ آباد یونیورسٹی) ضخامت ۱۷۶ صفحات (مجلد، خوب صورت سرِورق) قیمت:- دو روپے آٹھ آنہ۔

ملنے کا پتہ:- حافظ نعمان احمد ۵۔ احمد گنج تکیہ الٰہ آباد ۳

کتاب کا نام ہی خود بتا رہا ہے کہ مجھ میں کیا ہونا چاہیئے؟ چوتھی صدی میں اسلامی دُنیا کے مشہور ملکوں اور شہروں کے جغرافیائی حدود کیا تھے! مذہبی حالات و عقائد کا کیا رنگ تھا؟ مشاہیر علماء کون کون تھے؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملتی ہے! پوری کتاب معلومات سے لبریز ہے! عوام و خواص سبھی اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، کتنی بہت سی کتابوں کا نچوڑ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے! مولانا حافظ غلام مرتضیٰ صاحب اس کتاب کی تالیف پر تبریک و تحسین کے مستحق ہیں!

حکمتِ استخارہ

از:- پروفیسر فضل احمد عارف (ایم۔اے) ضخامت ۵۲ صفحات۔ قیمت گلیز کاغذ ۵۶ پیسے، قیمت نیوز کاغذ ۳۷ پیسے۔

ملنے کا پتہ:- مکتبہ رشیدیہ، میاں چنوں، ضلع ملتان

اس کتابچہ میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ استخارہ کیا ہے؟ اس کی ضرورت کیوں ہوتی ہے! استخارہ کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ استخارے کے کیا شرائط ہیں! ——— استخارہ کن امور میں کرنا چاہیئے!

اس موضوع پر غالباً یہ پہلی کتاب اُردو میں آئی ہے، جس کے مطالعہ سے "تعلق مع اللہ" کی کیفیت اُبھرتی ہے! اللہ تعالیٰ اس کے مولف اور ناشر دونوں کو اجر عطا فرمائے گا، اس خدا ناشناس ماحول میں "ذکر اللہ" کی طرف طبائع کو متوجہ کر دینا دین و اخلاق کی بہت بڑی خدمت ہے!

سُنّت قرآنِ حکیم کی روشنی میں

مرتبہ:- مولانا عبدالغفار حسن، ضخامت ۴۰ صفحات،

ملنے کا پتہ:- شعبۂ نشر و اشاعت جامعہ تعلیمات اسلامیہ ۵ جناح کالونی۔ لائل پور

مولانا عبدالغفار حسن صاحب نے "منکرینِ سُنّت" کے باطل نظریات کی تردید میں اپنے آٹھ سال

قبل مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا، جو "ترجمان القرآن" (لاہور) اور ماہنامہ "مقامِ رسالت" (کراچی) میں بالاقساط شائع ہوا تھا، مولانا موصوف نے اب اس مقالہ کو ضروری حذف و اضافہ کے بعد کتابی شکل میں مرتب فرمایا ہے جسے "شعبۂ نشر و اشاعت جامعہ تعلیماتِ اسلامیہ لائل پور" نے شائع کیا ہے۔

دین میں "سنّتِ نبوی" کی حجیت فاضل مصنف نے قرآنی آیات کے حوالوں سے ثابت کی ہے! "منکرینِ سنّت" جو طرح طرح کے مغالطے پیدا کرتے رہتے ہیں ان کے بھی شافی و مدلل جوابات دیئے گئے ہیں، غرض یہ کتاب اس موضوع پر بڑی جامع کتاب ہے!

قرآن پڑھو از:- عمر احمد عثمانی مشیرِ اسلامیات، ضخامت ۹۰ صفحات۔
ملنے کا پتہ:- ادارۂ قومی تعمیرِ نو، حکومتِ پاکستان کراچی۔

اس کتاب کا موضوع ہے:-

"قرآن کو پڑھو، سمجھو اور اُس پر عمل کرو"

اس موضوع کی افادیت ضرورت بلکہ فرضیت سے کوئی مسلمان انکار نہیں کرسکتا، قرآنِ کریم اسی لئے نازل ہوا ہے کہ اسے پڑھا جائے اور سمجھ کر پڑھا جائے اور ساتھ ہی اُس پر عمل کیا جائے! مگر اس کتاب کے لکھنے والے کی "منکرینِ سنّت" کے گروہ سے وابستگی مشہور ہے، اس لئے انھوں نے "سنّتِ رسول" کا کہیں ذکر نہیں آنے دیا! قرآنِ کریم کی تلاوت و اطاعت کی تلقین اس نیت کے ساتھ کہ "سنّتِ رسول" کی اطاعت کا تصور مسلمانوں کے ذہن سے نکل جائے، اپنی جگہ نہ صرف یہ کہ فتنہ ہے بلکہ قرآنِ کریم کے ساتھ ظلم ہے!

جس طرح اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسول لازم و ملزوم ہیں، اسی طرح قرآن اور سنّتِ نبوی کا چولی دامن کا ساتھ ہے، جس نے اس تعلق کو نظر انداز کردیا، اُس نے قرآن کے منشا ہی کو سرے سے نہیں سمجھا۔

فارقلیط از:- میاں محمد سعید۔ ضخامت ۶۴ صفحات۔
ملنے کا پتہ:- سلطان حسین اینڈ سنز ناشران و تاجرانِ کتب، نزد مولوی مسافر خانہ، بنس روڈ کراچی۔

حضرت عیسٰی مسیح علیہ السّلام نے حضور خاتم النبیین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بشارت دی تھی مبشراً برسول یاتی من بعدی اسمہٗ احمد۔ بشارت دیتا ہوں کہ ایک رسول جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہوگا۔

انجیل یوحنا سے بھی قرآنِ کریم کی اس آیت کی تصدیق ہوتی ہے، جناب مسیح علیہ السّلام فرماتے ہیں۔

"اور میں اپنے باپ سے درخواست کروں گا، اور وہ تمہیں فارقلیط دے گا کہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے"

اس کتاب میں ثابت کیا گیا ہے کہ یونانی تلفظ "برِیکلیطاس" (فارقلیط) کے معنی "حمد کیا گیا" (یعنی احمد) کے ہیں!

اور

انجیل یوحنا کی بشارت سے جو "نشانات" ملتے ہیں، وہ سب کے سب حضور کی ذاتِ گرامی میں پائے جاتے ہیں! یہی وہ نبی آخر ہے، جو دعائے ابراہیم بھی ہے اور نویدِ مسیحا بھی ہے، اور جس کی نبوت پر ایمان لانا انسانی فطرت کا اولین فرض ہے۔

(اشہد ان لا الٰہ الا اللہ واشہد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ)

سلوک و مقصدِ سلوک از :۔ صاحبزادہ محمد عمر صاحب (بیربل شریف) ضخامت ۷۲ صفحات (مجلّد) قیمت ۷۵ پیسے، ملنے کا پتہ :۔ ادارۂ تصوف احمد پارک، موہنی روڈ، لاہور۔

حضرت صاحبزادہ محمد عمر صاحب ایک طرف عالمِ دین ہیں دوسری طرف صاحبِ ارشاد و تصوف ہیں، صاحبزادہ صاحب موصوف نے حافظ سلطان بخش ملنگ کو جو مکاتیب تحریر فرمائے ہیں، یہ کتابچہ اُن کا مجموعہ ہے۔

ان سات مکاتیب میں سلوک، مقصدِ سلوک اور طریقت کے موضوع پر گفتگو کی گئی ہے، ان میں رموز و نکات بھی ہیں اور غموض و عمق بھی ہے ــــ صاحبزادہ صاحب نے یہ کتنی اچھی بات کہی ہے۔

"طریقت کا مقصود بندے کو بندہ بنانا ہے نہ کہ خدا بنانا، نفس کی شناخت سے بندہ بنتا ہے ۔ ۔ ۔"

مگر

صفحہ ۵۴ پر یہ عبارت بھی نظر آئی :۔

"اس وقت ذاکر، ذکر اور مذکور ایک ہو جاتے ہیں" ــــــــ

یہ کیا گورکھ دھندا ہے ــــ تصوف کی زبان جب اس انداز میں گفتگو کرتی ہے، تو وہیں سے طرح طرح کی اُلجھنیں شروع ہو جاتی ہیں، اور اس کتاب میں بھی اسی قسم کی ژولیدگی پائی جاتی ہے!

زمزمہ از :۔ رشید کوثر فاروقی، ضخامت ۱۶۰ صفحات، خوب صورت جلد، دیدہ زیب کتابت، حسین طباعت، سفید چکنا کاغذ، قیمت :۔ تین روپے۔

ملنے کا پتہ :۔ ادارۂ ادبیات عالیہ ۱۳۱، خیالی گنج لکھنو۔

جناب رشید کوثر فاروقی اردو دنیا کے جانے پہچانے شاعر ہیں، اُن کا کلام رسالوں میں شائع ہوتا رہتا ہے اور پسند کیا جاتا ہے! اُن کی عمر تیس سال سے بھی کم ہے، اس جوانی کے عالم میں غزل گو شاعر کی شاعری میں ہوسناک جذبات کی خاصی فراوانی ہوتی ہے مگر رشید کوثر کی غزلوں میں ہوسناک چٹخاروں کی جگہ پاکیزگی ملتی ہے، یہ نہیں ہے کہ اُن کا دل چوٹ کھایا ہوا نہیں ہے اور محبت کے کوچے سے وہ نابلد ہیں۔ اُن کے "تغزل" میں محبت کا رچاؤ ملتا ہے، لیکن اُن کی محبت خوددار اور بلند ہے، رشید کوثر کا یہ مسلک نہیں رہا ــ

؎ کہ ایں آوارۂ کوئے بتاں آوارہ تر بادا!

اس لئے اُن کی غزلوں کو پڑھ کر ذہن و فکر "آوارہ" نہیں ہوتے! اُن کا تغزل سنجیدہ ہی نہیں مقدس بھی ہے! وہ غزل گو ہیں مگر ایسے "غزل گو" جو مجاز سے زیادہ حقیقت کے ترجمان ہیں، انھوں نے غزل کی زبان میں پیغام دیا ہے، اور اُن حقائق کی ترجمانی کی ہے، جن سے ذہن و فکر کو بیداری، تقدیس اور بلندی ملتی ہے!

"زمزمہ" کا آغاز "عرضِ ناشر" سے ہوتا ہے، سید افتخار علی صاحب علوی نے رشید کوثر فاروقی کی زندگی کی جھلکیاں اپنے اس مختصر سے مضمون میں پیش کی ہیں! وہ لکھتے ہیں :۔

"میں نے رشید کوثر کی خلوتوں کو پاکیزہ اور اُن کی جلوتوں کو حسین دیکھا" ــــــــ

کردار کی یہی پاکیزگی اُن کی غزلوں میں بھی نمایاں ہے!

"عرضِ ناشر" کے بعد رشید کوثر فاروقی نے
"میں اور میری شاعری"
کے عنوان سے ۲۸ صفحوں کا "مقدمہ" لکھا ہے، جو اُن کے بلوغ فکر، وسعتِ مطالعہ اور دقتِ نظر کی شہادت دیتا ہے، انھوں نے فن شعر و ادب کے بعض ایسے نکتے بیان کئے ہیں کہ انہیں پڑھ کر ذہن و فکر چونک اُٹھتے ہیں!

"سفیہانہ زیاں شعاریوں اور سخیفانہ وقت گزاریوں" (ص ۱۱) یہ نامانوس ترکیبیں ہیں۔ "قرآن کی انقلابی فکر یہاں کا طغرائے پیشانی ہے"۔ (ص ۲۲) "فکر" کو "طغرائے پیشانی" کہنا عجیب لگتا ہے۔ "روش روش سے جلوہ آشامیاں کرتی ہیں" (ص ۳۳) کیا "جلوے" بھی پیئے جاتے ہیں، جو "بادہ آشامی" کے انداز پر نئی ترکیب وضع فرمائی گئی ہے ــــ "تمام عظیم شعراء کا زمزمۂ زیریں ایک ہی ہوتا ہے"۔ (ص ۲۵) اس جملہ میں ایک تو ذم پایا جاتا ہے، پھر "زمزمۂ زیریں" سے آخر شاعر کی کیا مراد ہے! ــــ "رومی اور اقبال جیسی ہستیاں حکیمانہ درّاکی رکھتی ہیں" (ص ۳۵) "حکیمانہ درّاکی" کتنی غیر شگفتہ اور نامانوس ترکیب ہے ــــ "ذوقِ بامتیاز رکھنے والے" (ص ۳۷) یہ "ذوقِ بامتیاز" کیا چیز ہے؟ اگر رشید کوثر صاحب آئندہ کوئی مضمون لکھیں تو وہ اس قسم کی ترکیبوں سے اجتناب کریں۔

"زمزمہ" کے چند منتخب اشعار:۔

مرے ہمنشیں! اگر تو مرا ہم سفر[1] نہیں ہے
میں چلا خدا تجھے بھی دلِ درد آشنا دے

ہزار چاند بنا کر فضا میں پھینک دیئے،
مگر ہمارے ہی آنگن میں روشنی نہ ہوئی

صاحبِ دل پہ بھی اکثر رازِ دل کھلتا نہیں
اپنی ہی خوشبو سے رم کرتا ہے آہوئے ختن

رہرو! آؤ چنیں خار، اور اس طرح چنیں
کہ جو کل آئیں، انہیں ایک بھی کانٹا نہ ملے

یہ تاجِ خسروی کیا، یہ تختِ قیصری کیا
میں خوش مرا خدا خوش، بندوں کی بندگی کیا

گزرے ہیں کیسے کیسے دورِ بہار ہم پر
خاکِ چمن سے پوچھو، غنچے کی عمر ہی کیا

اٹکل سے چار ہا ہے بے سمت و بے تصور
انسان پر کھلیں گے اسرارِ زندگی کیا

لوگ میرے جنوں پہ ہنستے ہیں
یہ بھی احساسِ کمتری تو نہیں

حسن کیسا، حوصلہ کیا بے خدا تہذیب کا
پاؤں بھی طاؤس کے، طاؤس کی پرواز بھی

ارے او ناخدا! ساحل شناسی ہی نہ لے ڈوبے
ابھی ساحل کو کیا تکتا ہے، طے کر لے بھنور پہلے

او مرے گنگ مُغنی! یہ معمّا کیا ہے
بزم ہو، ساز ہو، مضراب ہو آواز نہ ہو

کہتا ہوں جو کر لیتے ہیں جلدی سے یقیں آپ
غیروں کے کہے میں بھی نہ آ جائیں کہیں آپ

روشنی لیتے ہیں، روشن گر خورشید سے ہم
ہر اُبھرتے ہوئے سورج کے پجاری تو نہیں

جس سے بنتا ہے مزاجِ عالم کون و فساد
میں نے اپنی ذات میں دیکھیں وہ آیاتِ مُبیں

کون سا نغمہ پُر درد کہاں سے چھیڑوں
اک نیستاں مرے سینہ میں نہاں ہے لے دوست

صورت و معنی حجاب اندر حجاب
کس کو چھوڑیں کس کا دامن تھام لیں

[1] کاش ہم سفر کی بجائے "ہم نوا" ہوتا۔

رمتا جوگی، بہتا پانی، صبح یہاں ہر شام وہاں
رہنا کس کو ہے دھرتی پر، دم بھر دھوم مچانے دو

کچھ اور وسعتِ کونین میں اضافہ کر
کہاں رہوں گا ترا دردِ بے اماں لے کر

تم کو چھپنے کے سوا اور بھی کچھ آتا ہے
تم سے اچھے تو ستارے ہیں کہ چھپ کر نکلے

ہوا کا رُخ بدلنے سے گلستاں کا یہ عالم ہے
نشیمن ہی میں بیٹھے ہیں، نشیمن ہی کا ماتم ہے

حیف ایسے طائروں پر جو قفس کے ہو رہے
یا بڑی پرواز کی تو شور و شیون تک گئے

جیسے مطرب گاتے گاتے گیت کی دُھن بھول جائے
وقت کی رفتار کچھ ٹھہری ہوئی پاتا ہوں میں

خدا کے واسطے مجھ کو مری حالت پہ رہنے دو
جو تم سے ناصحو! حالت مری دیکھی نہیں جاتی

امنِ ساحل کی توقع پہ چلی تھیں کشتیاں
یہ ہے ٹکرا کر الٹ جانے سے کچھ پہلے کی بات

سُنا ہے کوئی کسی کا شریکِ حال نہیں
تو کیا یہ سچ ہے تمہیں بھی مرا خیال نہیں

بعد نظارہ تصور کے مزے لیتا ہوں
چھپ گیا کوئی مگر پھر بھی نظر آتا ہے

شبِ فرقت، شبِ فرقت کہاں ہے، تم تو آتے ہو
تصور کی ردا اوڑھے ہوئے دزدیدہ دزدیدہ

محبت معرفت کی منزلوں کو چھونے والی ہے
جنوں شائستہ شائستہ ہے، غم سنجیدہ سنجیدہ

راج محل کے کنگرے دنگ ہیں، یہ اذاں کہاں!
گنگ و جمن کے دیس میں سنجد کی آندھیاں کہاں

جولاں گہ زمان و مکاں سے پرے کبھی دیکھ
تو نے تو سنگِ میل کو منزل بنا لیا

او قدر ناشناس زمانے! جواب دے
سب کچھ تجھی کو سونپ چلے ہم نے کیا لیا

دیکھیے تو کوئی آپ کو سنجیدہ بنے ہیں!
کیا شوخیِ پنہاں نے نئی چھیڑ نکالی!

بھیج کر خط پڑھ رہا ہوں نقل اُس کی بار بار
کون سے جملے کا ان پر کیا اثر ہونے کو ہے

ہاں! ہم تو محبت کے گنہگار رہیں لیکن
الزام یہی تم پہ بھی آجائے تو کیسا ہو

دل دکھانے کا سلیقہ کوئی تم سے سیکھے
مجھ سے ہنس ہنس کے یہ کہتے ہو کہ "آرام تو ہے"

برا ہو رشک کا صورت بگاڑ لی اپنی
کلی سے تیرے تبسم کی نقل بھی نہ ہوئی

کس طرح آئے تجھے گریۂ ہجراں کا یقین
مسکرا اُٹھتی ہیں، آنکھیں ترے آتے آتے

جمالِ زندگی دونوں میں ہے ساحل ہو یا طوفاں
وہی اُڑتا ہوا آنچل، کہیں دھانی، کہیں آبی

غنچے میں تیرے لب کی فسوں کاریاں کہاں
یوں ہی ذرا سا طرزِ تبسم اڑا لیا

کیسی روش ہے فضا کتنے شک میں پڑ جائے
مرکبِ شوق اُڑائے جاتا ہے مجھے

چراغِ صبح کو ہم نے بھڑکتے دیکھا ہے
تمام روشنیاں معتبر نہیں ہوتیں

ساقی! شراب و شاہد و پیمانہ سب قبول
لیکن یہ شرط ہے کہ خدا دیکھتا نہ ہو!

ترے عدم پہ کبھی اتفاق ہو نہ سکا
ترے وجود کی اک یہ دلیل کیا کم ہے

سکھائے ہیں محبت کے نئے آداب مغرب نے
حیا سر پیٹتی ہے، عصمتیں فریاد کرتی ہیں

اللہ رے یہ چشمِ شوق کی شبنم فروشیاں
دامن کو اُن کی یاد نے سیراب کر دیا

حریمِ حسن سے کل رات یہ صدا آئی | جمال پر نہیں، پردہ تری نگاہ پہ ہے
کس درجہ خود فریب ہیں اربابِ عقل و ہوش | سمجھے نہ جس کی بات اُسے دیوانہ کہہ دیا

دُوسرا رُخ :—

غمِ زندگی سے کہہ دو کہ رہے جلو میں ورنہ | غمِ دل سبک عناں ہے، غمِ دل کو راستہ دے (ص۴۷)

مفہوم گنجلک اور ژولیدہ ہے۔

جو بیخودی بھی بہ اندازۂ خودی نہ ہوئی | فسونِ عقل ہوا، شانِ آگہی نہ ہوئی (ص۴۸)

اس مطلع کا مفہوم بھی مُبہم ہے! "فسونِ عقل ہوا" اور "شانِ آگہی نہ ہوئی" نے اس ابہام میں اہمال پیدا کر دیا۔

حیاتِ یار دو عالم ہے اور کچھ بھی نہیں | جو رُوح پیکرِ اخلاق میں ڈھلی نہ ہوئی (ص۴۸)

لہنا چاہیئے تھا۔ "ڈھلی ہوئی نہ ہو" اور کہہ دیا "ڈھلی نہ ہوئی"۔

اشتیاقِ دل رُبا، انتظارِ جاں ستاں | آ کے اغلکِ شکر میں گھل رہی ہے زعفران (۴۹)

"اشتیاقِ دل ربا" کیا ہوتا ہے ——— "زعفران" سے کیا مُراد ہے؟ شاید لہو، مگر زعفرانی رنگ کا لہو، اپنی جگہ خود ایک اعجوبہ ہے۔

جانے کیا تھا، سیر چشمی کا مزہ بھا ہی گیا | ورنہ مجھ کو بھی ملی تھی کاوشِ کام و دہن (ص۵۰)

"بھا ہی گیا" نے شعر کی لطافت کا خون کر دیا ——— "کاوشِ کام و دہن" سے آخر کیا مراد ہے؟ "سیر چشمی کا مزہ" اس پر مستزاد۔

نغمہ زارِ آگہی اک وادیٔ خاموش ہے | مجھ کو بخشا ہے سکوتِ غم نے اعجازِ سخن

مصرعہ ثانی خاصا اچھا ہے ——— مگر مصرعہ اولیٰ کے ابہام نے شعر کو مجموعی طور پر بے معنیٰ بنا دیا ——— "نغمہ زارِ آگہی" مہمل ترکیب ہے۔

ہر ایک داغ پہ اک تازہ داغ اٹھاتا ہوں | الم بہت ہیں مگر کم ہے فرصتِ احساس (۵۱)

شعر کیا ہے چیستاں ہے!

تفو ایسے ذرۂ خاک پہ کہ ہوا اُڑائے پھرے جسے
نہ طلوع میں نہ غروب میں نہ عروج میں نہ زوال میں (۵۲)

فردوسی کے اس مشہور مصرعہ :— ع

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

میں "تفو" جتنا بھلا لگتا ہے، اتنا ہی اس شعر میں وجدان کو ناگوار گزرتا ہے! رہی شعر کی معنویت اور مفہوم تو اُسے کا "بطنِ شاعر" ہی جان سکتا ہے۔

منظور ہم کو لاکھوں خسارے | معلوم ہم کو وہ ہیں ہمارے
جس کو اُنہی نے ٹھکرا دیا ہو! | وہ کس کے آگے دامن پسارے (ص۵۳)

ایسے بے مزہ شعر اس مجموعہ کلام میں دیکھ کر تعجب ہوا۔

عشق و محبت دونوں میں ان بن | ندی کے جیسے رُوٹھے کنارے

ندی کے کنارے بھی روٹھ جاتے ہیں! خوب!

برق چشمک زن، فضا ناساز، گلچیں حیلہ جو　　کیونکہ پائین نشین شاخِ گل بالیدہ ہے　(ص۵۸)

"پائین نشین" بھی محلِ نظر ہے اور "گلچیں حیلہ جو" بھی!

کیا طرزِ تمنا ہے، کیوں شور مچاتا ہے　　صورت گر فردا ہے شکوہ کہ شکیبائی　(ص۶۱)

مفہوم ٹھیک طرح کہاں ادا ہوا؟ اور فردا کی صورت گری نہ تو شکوہ کرتا ہے اور نہ شکیبائی!

کرشمہ ہائے خرد، مارشانۂ ضحاک　　ہنوز الجھی ہوتے حیات کی　(ص۶۲)

مصرعہ اولیٰ کا مصرعہ ثانی سے کوئی ربط نہیں! "مارشانۂ ضحاک" کی تلمیح کتنی بے محل استعمال ہوئی ہے، پھر یہ ترکیب غزل کی لطافت پر کس قدر گراں ہے۔

جنونِ کام جو کو وسعتیں ہی جاتی ہیں　　تو ہر آستیں اک آستیں معلوم ہوتی ہے　(ص۶۳)

"جنونِ کام جو" کتنی غیر شاعرانہ اور جنوں کی نفسیات کے اعتبار سے غیر واقعی ترکیب ہے! پھر جنوں کا تلازمہ آستیں نہیں جیب و دامن ہے!

حسنِ عمل نہیں تو حسنِ خیال کیا ہے　　زندانِ بے کراں میں زنجیر کی صدا ہے　(ص۶۴)

مصرعہ اولیٰ کتنا شگفتہ اور پاکیزہ ہے ——— مگر مصرعہ ثانی اس کے مقابلہ میں پست ہے، اور جو مثال دی گئی ہے، وہ ناقص اور بے جوڑ سی ہے۔

ایثار رنگ و نکہت یا ایں فنا پذیری　　غنچے سے پھول بننا دشوار مرحلا ہے

مصرعہ اولیٰ "صنعتِ اہمال" میں فرمایا گیا ہے! غنچہ کو پھول بننے تک جگر چاک ہونا پڑتا ہے، مگر اسے "ایثار رنگ و نکہت" سے تو تعبیر نہیں کر سکتے!

محترم ہے وہ جبیں مثلِ حرم　　جس کو آتی نہیں دریوزہ گری　(ص۶۶)

ایسے مبہم بلکہ مہمل شعروں کو پڑھ کر، وجدان کس قدر گھٹن محسوس کرتا ہے!

فرقت کی بلائیں ٹلتی نہیں، یہ کالی راتیں ڈھلتی نہیں
تاروں کی بھی شمعیں جلتی نہیں، جب سے مہ کامل بیٹھ گیا　(ص۶۸)

مہ کامل بیٹھ گیا" نے شعر کا سارا لطف خاک میں ملا دیا۔

سحر کو جیسے غنچہ کھل رہا ہو　　ترا انگڑائی لینا مسکرا کے　(ص۷۰)

شاعر اگر یہ کہتا کہ محبوب انگڑائی لے کر مسکرایا، تو اس صورت میں غنچہ کے کھلنے سے تشبیہ درست بھی مگر وہ تو یہ کہتا ہے کہ محبوب نے مسکرا کر انگڑائی لی!

کوئی جگنو ہی سے تہذیب تمنا سیکھلے　　روشنی کا اک دریچہ بند بھی، اک باز بھی　(ص۷۱)

کتنے حسین الفاظ سے یہ شعر عبارت ہے مگر مفہوم؟ یہ نہ پوچھئے! "تہذیبِ تمنا" لانے کی یہاں کیا تک تھی؟ جگنو سے اور تمنا سے کیا واسطہ!

حدی کی لے سے نہ ٹکرا و یاس کی لہرو!　　نہ جانے کتنے مسافر پسِ غبار بھی ہیں　(ص۷۲)

"پانی کی لہروں" کا "حدی سے ٹکرانا" یہ آخر کیا بات ہوئی!

شوق کو اندیشۂ حرماں نے ہلکا کر دیا! ایک ٹھنڈی سانس نے آئینہ دھندلا کر دیا (ص۴۳)

دوسرا مصرعہ کس قدر خوب ہے! مصرعہ اولیٰ میں "شوق کو ہلکا کر دیا" نے شعر کے مفہوم میں ابہام پیدا کر دیا! شاعر غالباً یہ کہنا چاہتا ہے کہ اندیشۂ حرماں نے، شوق کی گرمی کم کر دی! مگر اس مفہوم کو وہ شعر میں پوری طرح ادا نہیں کر سکا۔

موجِ نسیم، جوئے رواں، دورِ ماہتاب ہر منظرِ حیات کو صہبا بنا کے پی (ص۴۷)

منظر کو "شراب" بنا کے پی جانا، اس میں کس درجہ ناگوار تکلف اور بناوٹ پائی جاتی ہے!

حسنِ نظر کا نام تصور ہے شام بھی ہم مستوں کو سحر ہے (ص۵۴)

اس طرح لفظوں کو جوڑ دینا، خود شاعر اور اس کے اشعار پڑھنے والوں کے وقت کا زیاں نہیں تو اور کیا ہے۔

اُن کے شہیدِ غم کی مسجد ہے زیرِ خنجر یا خون سے وضو ہو، یا خاک سے تیمم

اس شعر کا مرکزی تصور، یہ مشہور شعر ہے ؎

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

مگر "مسجد" کے "زیرِ خنجر" ہونے نے شاعر کے ذوق کی رُسوائی کا سامان مہیا کر دیا ــــ (توبہ!)

روح کے پردے میں پنہاں کوئی موسیقار ہے خونِ دل کا موجہ موجہ اک ترنم زار ہے (ص۸۶)

لفظوں کو جوڑ کر، شعر موزوں کیا اور پھر اُسے مجموعہ کلام میں شامل بھی فرما دیا۔

ہوئی منظور جب اک رشتۂ نو کی تعمیر جسم سے توڑ گیا سلسلۂ جاں کوئی (ص۹۱)

رشتہ کیا عمارت ہے، جس کے لئے "تعمیر" لایا گیا ہے، موزوں لفظ "تشکیل" ہو سکتا تھا۔ اب رہا مصرعہ ثانی، تو یہ شاعری کے ساتھ مذاق ہے!

اب ہر نگہ یار میں آثارِ جنوں ہیں اب دل کا ہر انداز حریفانہ ہوا ہے (ص۹۱)

یہ کہنا کہ یار کی ہر نگاہ میں جنوں کے آثار پائے جاتے ہیں ــــ عجیب مشاہدہ اور تجربہ ہے۔

یہ لچک اور یہ رعنائی کہاں سے آئی! پھول کا خون رگِ خار میں جاری تو نہیں (ص۹۲)

کانٹوں میں بھی رعنائی ہوتی ہے، یہ بات اس شعر سے پہلی بار معلوم ہوئی! اس خیال کو جوش ملیح آبادی نے کتنے حسین انداز میں ادا کیا ہے ؎

کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو لالہ زار کا
پالا ہوا ہے یہ بھی نسیم بہار کا

شاعر کو بات حسن اور سلیقہ کے ساتھ کہنی چاہیئے۔

محبت ہو بھی جاتی ہے، محبت کی بھی جاتی ہے وہ مبنی قلبِ انساں پر، یہ مبنی ظرفِ انساں پر (ص۹۶)

"وہ مبنی اور یہ مبنی" شعر کی زبان ہی نہیں ہے!

جاتی ہے جاں تو جائے تقاضائے جاں ہے گزرے جو مجھ پہ گزرے، مگر دل جواں رہے (ص۹۶)

"صنعتِ ایہام" سے رشید کوثر صاحب کی طبیعت کو عجیب مناسبت معلوم ہوتی ہے۔

یاد آیا ہے کہ انساں عیش سے بیزار تھا　　یہ زمیں گل پوش تھی، یہ آسماں گل بار تھا (ص۹۷)

شاعر غالباً یہ کہنا چاہتا ہے کہ جب انسان ہوا و ہوس اور تعیش میں مبتلا نہ ہوا تھا، اُس وقت آسمان سے خدا کی رحمت برستی تھی اور زمین خیر و برکت کے پھول اُگاتی تھی، مگر شعر کے الفاظ سے یہ مفہوم ٹھیک طور پر کہاں ادا ہوا۔

امتحانِ گردشِ ایام لیں!　　آؤ آغازِ حسیں سے کام لیں (ص۹۸)

دولخت مصرعے!

میں نے ہٹا کے بارہا آئینۂ تخیلات　　کی ہے کمالِ ہوش میں سیرِ جہانِ واقعات (ص۹۹)

خیال، الفاظ اور زبان و بیان ہر اعتبار سے سطحی شعر! مصرعِ ثانی کا "میں" سب سے زیادہ محلِ نظر ہے۔

جب دیکھیے ظالم کی نظر میری طرف ہو　　پھر آنکھ اُسے دیکھوں، یہ تمنا نہ بر آئی (ص۱۰۴)

اس "پھر آنکھ اُسے دیکھوں" کا بھی بھلا کوئی جواب ہے!! توبہ! اس کے علاوہ مصرعِ ثانی بحر سے خارج بھی ہے۔

مذاق ترک پہ اختیار کھو بیٹھے　　مُراد مل گئی لیکن وقار کھو بیٹھے
ذرا ہٹے تھے تماشائی کے کچھ دیر کیلئے　　ہنسی ہنسی میں تری رہگذر کھو بیٹھے (ص۱۰۵)

دونوں شعر انتہائی ژولیدہ اور ساتھ ہی بے لُطف بھی!

ارے پپیہے! ارے پپیہے! نظر لگی تیری کیا نظر کو
تو "پی کہاں" کہہ کے ٹیرتا ہے، بتا کہاں تیرا پی نہیں ہے؟

پپیہے کی نظر کو نظر لگ گئی ——— یہ کیا تلمیح ہے؟ کیا "پپیہے" پر کوئی دور ایسا بھی گزرا ہے کہ وہ "پی کہاں" نہیں پکارتا تھا، اور اُس وقت اس کی "نظر" "نظرِ بد" سے محفوظ تھی۔

زیادہ طائر کا یہ چہچہانا، چمن میں دُشمن کو ہے بُلاتا
جہاں نہیں ہے یہ شور و غوغا، وجودِ صیاد بھی نہیں ہے

مفہوم تو واضح ہے مگر شعر کس قدر بے مزہ! نومشقوں کا سا انداز!

اک ہار پہنھاتا ہے مجھے اپنی وفا کو　　اب تک جو لُٹائے ہیں گہر ڈھونڈ رہا ہوں (ص۱۱۱)

"وفا کو بھی ہار پہنائے جاتے ہیں" ــ خوب! یہ کیا کہ جو خیال ذہن میں آیا اُسے لفظوں کے ساتھ جوڑ دیا۔

رُک گئی نظر تیری جا کے ماہ و انجم پر!　　یہ تو پردے ہیں جن میں حسن چھپ کے بیٹھا ہے (ص۱۱۳)

جب حسن ماہ و انجم کے پردوں میں چھپ کر بیٹھا ہے، تو نظر کا ماہ و انجم پر رُک جانا، درست ہے، اس پر طنز و تنقید کیوں؟

اُف گھٹی گھٹی سانسیں اُف! بجھے بجھے تیور　　ہم جہاں کے باسی ہیں کیا یہی وہ دُنیا ہے (ص۱۱۳)

کہنا یوں چاہیے تھا، کہ یہی وہ دُنیا ہے جہاں ہمیں بھیجا گیا ہے۔

سیرِ نفس کی خاطر، عشق کا ضمیر اکثر　　دوسروں کی آنکھیں بھی مستعار لیتا ہے (ص۱۱۳)

اس قسم کے اشعار پڑھ کر طبیعت کس قدر جھنجلاہٹ اور وجدان کتنی اذیت محسوس کرتا ہے! شاعر نے اپنے نزدیک "سیرِ نفس" کہہ کر کتنی بلند تخیل اور علمی فلسفہ کو پیش کیا ہے مگر اس کا اظہار و بیان کس درجہ مضحکہ خیز ہے!

پھر سکونِ زارِ تمنا کروٹیں لینے کو ہے میں نے دیکھا، کچھ شرارے اُڑ کے خرمن تک گئے (ص ۱۱۴)

دوسرا مصرعہ واضح ہے اور بہت خوب ہے! مگر پہلے مصرعہ سے اس کا کوئی ربط نہیں!

نقطۂ پرکارِ ہستی سامنے کی بات تھی گمرہانِ عقل، کوثرؔ حیلۂ وفن تک گئے (ص ۱۱۴)

ـــ کوئی سمجھاؤ کہ ہم سمجھائیں کیا ـــــ! اس "صنعتِ خاص" سے کوثرؔ صاحب کو بڑا لگاؤ ہے۔

یہ کہاں گردشِ ایام کھپی جاتی ہے دھوپ پھیلی ہے مگر رات ہوئی جاتی ہے (ص ۱۱۵)

"کھپی جاتی ہے" یہاں بالکل بے محل استعمال ہوا ہے۔

یہ کیا ہوا کہ آنے لگی حوصلوں کو نیند مشکل بنا کے کام کو آساں بنائیے (ص ۱۱۷)

"حوصلوں کو نیند آنے" میں کس قدر تکلف پایا جاتا ہے! "کام کا مشکل بنانا" بھی محلِ نظر ہے۔

رہ رہ کے دل کو لوٹ رہی ہے کسی کی یاد اشکوں کی کہکشاں سرِ مژگاں بنائیے (۱۱۷)

یاد کا دل کو لوٹنا ہی عجیب سا لگتا ہے اور وہ بھی "رہ رہ کے لوٹنا"! پھر اشکوں کی کہکشاں سرِ مژگاں بنانے سے کیا یاد دل کو لوٹنے سے رُک جائے گی!

محبت کا نام اظہارِ محبت کا نہیں ہمدم نفس سے نفس کی وابستگی دیکھی نہیں جاتی

وہی "صنعتِ اہمال"!

کوثرؔ تو ہے گلے سے وہ معذورِ امتحاں ایسا بضد ہوا کہ پشیماں نہ ہو سکا (ص ۱۲۱)

آخر کوثرؔ صاحب شعر کہہ کر غور کیوں نہیں فرماتے کہ وہ جس مفہوم کو ادا کرنا چاہتے ہیں وہ ادا ہوا کہ نہیں!

چاند کو توڑ کے آغوشِ زمیں میں رکھ دو صبح ہاتھ آ نہیں سکتی ہے تو کیا شام تو ہے (ص ۱۲۱)

اس شعر کی کوئی چول بھی سیدھی نہیں ہے۔

دم نہیں لیتا کہیں سیمابِ مقیاسِ تلاش بر نقابِ مطلعِ امکاں اُٹھا دیتا ہوں میں (ص ۱۲۲)

"سیمابِ مقیاسِ تلاش" ـــــ "نقابِ مطلعِ امکاں"! ان ترکیبوں میں تکلف اور بناوٹ کے سوا اور کیا رکھا ہے! شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ میرا جذبہ جستجو اور ذوقِ تلاش سکون ناآشنا ہے، وہ کسی جگہ دم نہیں لیتا ـــ مگر اس مفہوم کو کس بدسلیقگی کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔

ناشناسِ رمزِ ہستی ہیں ابھی صیاد و برق خون و خاکستر سے بھی گلشن کھلا دیتا ہوں میں

الفاظ موجود اور مفہوم و معنیٰ غائب!!

وہ بیانِ ہوش تھا یا دوزخ و جنت تھا ناصحو! چھیڑو نہ دیوانے سے کچھ پہلے کی بات (ص ۱۲۴)

وہی ابہام، اُلجھن بلکہ اہمال۔

ہائے احساسِ گنہ، جیسے شعاع اک ستارے سے نکل کر رہ گئی (ص ۱۲۸)

تشبیہ میں کوئی معنوی مناسبت ہونی چاہیئے! احساس گنہ اور ستارے سے شعاع نکلنے میں کوئی ربط اور وجہ شبہ نہیں پائی جاتی

خطا معاف مجھے ذوقِ عرضِ حال نہیں کرم کرم ہو تو منت کشِ سوال نہیں (ص ۱۲۹)

"منت کشِ سوال نہیں" ـــــ یہ کس کی طرف اشارہ ہے!

شبنم گلستاں ہوئی مہر فلک سے ہم کنار — شوق سپردگی بجا، شرط ہے انفعال بھی
جذبِ اذاں وہی تو ہو لرزش پا بھی حسن پر — نام فتادگی کا ہے محویتِ جلال بھی ! (صفحہ ۱۳۰)

اس قسم کے مہمل شعر پڑھتے پڑھتے طبیعت کو کس قدر کوفت ہوتی ہے۔

اب سیاست بھی ہے ہر شکست کی وہ دوشیزہ جیسے — نہ سنبھال آتا ہے مشکیزہ نہ بھر آتا ہے (صفحہ ۱۳۱)

مصرعہ ثانی زبان و بیان کے ساتھ مکروہ قسم کا مذاق ہے۔

جو صحرا نے بلائیں عشق سے سرشار ہو تا ہے — بگولا بھی اسے محبوب کا رخسار ہوتا ہے (صفحہ ۱۳۳)

صحرا کے بگولے کو "رخسارِ محبوب" سمجھنا سرشاری نہیں پاگل پن ہے ! رخسار اور بگولے میں کوئی دُور کی بھی مناسبت ہے؟ ایسے اشعار شاعر کی رسوائی کا سبب بنتے ہیں۔

ہیجانِ فرطِ شوق سے اعلا کہیں جسے — اک درجہ ہے — قرارِ تمنا کہیں جسے

شاعری کے ساتھ مذاق !

بساطِ کہکشاں گویا بساطِ شوق و مستی ہے — کوئی دیوانہ گزرا ہے ادھر لغزیدہ لغزیدہ (صفحہ ۱۳۵)

"بساطِ کہکشاں" سے دیوانہ کا گزرنا، امرِ واقعہ کے خلاف ہے ! ہاں ! عالم تخیل میں ہو سکتا ہے جس کا اس شعر میں کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا۔

کلی کلی کو بغل گیر کر رہی ہے نسیم — روش روش پہ ہے بوس و کنار کا عالم (صفحہ ۱۳۷)

شعر اچھا ہے، کاش ! "بغل گیر کر رہی ہے" کی جگہ دوسرے موزوں اور شگفتہ تر الفاظ ہوتے۔

دل ہی نہیں اگر گداز، تابشِ زندگی فریب — اپنی قبا سمیٹ لے ابر تو بجلیاں کہاں (صفحہ ۱۳۸)

مصرعہ اولیٰ خاصہ گنجلک ہے !

سارے سفر کی جان ہے پہلے قدم کی پختگی — صید کو زیر کر سکا، ناوک بے کماں کیا (صفحہ ۱۳۹)

پہلا مصرعہ اسلوب بیان کے اعتبار سے کمزور اور دوسرا مصرعہ مفہوم و معنیٰ کے لحاظ سے "صفر" !

ہم نے رہ حیات میں کانٹے بچھائے ہیں — پھولوں میں اپنی روح بساتے چلے گئے (صفحہ ۱۵۲)

اہمال ہی اہمال اور ژولیدگی ہی ژولیدگی !

کوئی شک نہیں جناب رشید کوثر فاروقی میں شعر کہنے کی بڑی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اُن کی اس کتاب (زمزمہ) میں بڑے جاندار شعر ملتے ہیں ! کہیں کہیں اُن کا آہنگ دوسرے غزل گو شعراء سے منفرد نظر آتا ہے — مگر ہم اُنکی خدمت میں گزارش کرتے ہیں کہ اُن کے یہاں جو ژولیدہ بیانی ملتی ہے، اس اپنی کمزوری کو دور کرنے میں اپنی تمامتر کوششیں صرف کردیں اُن کے اس مجموعے میں کتنے ہی مہمل شعر تک شامل ہوگئے ہیں، اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن وہ "نظرِ ثانی" کے بعد چھپوائیں ! اور اب جو شعر کہیں خوب سوچ کر کہیں ! اس کتاب کے دیباچہ کو پڑھ کر توقع قائم ہوئی کہ شاعر فنِ شعر و سخن میں بڑی بصیرت رکھتا ہے، مگر اُن کے اشعار پڑھ کر یہ توقع کہیں پوری ہوئی، کہیں ادھوری رہی اور بعض مقامات پہ خون ہو کر رہ گئی !

صراطِ مستقیم

از افادات :- حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری، ضخامت ۶۴ صفحات - قیمت :- دس آنہ
ملنے کا پتہ :- ناظم خانقاہ اشرفیہ ۱۲ سب بلاک جی، ناظم آباد ۲ ، کراچی ۱۸

جناب مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ العزیز کے اکابر خلفاء میں شمار کئے جاتے ہیں، شاہ صاحب موصوف نے اس کتاب میں سورہ فاتحہ کے اس جز (اھدنا الصراط المستقیم) کی اپنے مخصوص انداز میں تشریح فرمائی ہے، مقصود یہ ہے کہ مسلمان تزکیہ نفوس کی طرف متوجہ ہوں اور آخرت کی فکر کریں۔

"۔۔۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا، حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو بندے ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں، ہم اُن کے لئے اپنے راستے کھول دیتے ہیں۔ مگر یہ کوشش اپنی رائے سے نہ ہو کسی کامل کی اتباع کے ساتھ ہو۔" (ص۵۲)

"کسی کامل" نہیں ———— "انسانِ کامل" کی اتباع کے تحت ہو، اور وہ "انسانِ کامل" پوری تاریخ انسانی میں ایک ہی گزرا ہے (صلی اللہ علیہ وسلم وارواحنا لہ الفداء۔

حضرت عارف فرماتے ہیں:۔

کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما فکرِ ما درکارِ ما آزارِ ما

حضرت (مولانا تھانویؒ) فرماتے تھے کہ میں نے مصرعہ اولیٰ میں ترمیم کی ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے لئے "فکر" کا لفظ مناسب نہیں ہے، فکر مستلزم ہے، تغیر کو اور ہر تغیر مستلزم ہے حدوث کو اور حدوث منافی ہے، ذاتِ واجب الوجود کے!

مولانا رومی پر اس وقت محبت الٰہیہ کا حال غالب تھا، اور مغلوب الحال معذور ہوتا ہے، میں نے اس میں یہ ترمیم کی ہے:۔

کارسازِ ما بسازِ کارِ ما
فکرِ ما درکارِ ما آزارِ ما

خدا اور رسول کے معاملہ میں ایک مسلمان کو ایسا ہی حساس اور باریک بیں ہونا چاہیئے!

شہاب ثاقب

مولفہ:۔ سید حشمت حسین جعفری ایڈوکیٹ، ضخامت ۹۶ صفحات (سرورق دیدہ زیب)
قیمت:۔ ایک روپیہ پچیس پیسے، ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ افکار اسلامی گاڑی کھاتہ، حیدر آباد۔

ڈاکٹر احمد امین مصر کے مشہور ادیب اور مورخ ہیں؛ انھوں نے "نہج البلاغہ" کے تمام وکمال "کلام علیؓ" ہونے سے انکار کیا ہے۔ جناب سید حشمت حسین جعفری نے ڈاکٹر صاحب موصوف کے اعتراضات کے جوابات بڑی قابلیت کے ساتھ دیئے ہیں، اور یہ ثابت فرمایا ہے کہ "نہج البلاغہ" حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ ہی کا کلام اور بیان ہے!

قرآنِ کریم کی صحت اور یقین کا جو درجہ قرآن کریم کو حاصل ہے، وہ درجہ احادیث رسولؐ کو نہیں دیا جاسکتا اور صحیح احادیث کی صحت و ثقاہت کا جو درجہ ہے وہ "نہج البلاغہ" کو کسی صورت میں بھی حاصل نہیں ہے! "نہج البلاغہ" سے حضرت علیؓ کی نسبت بہت کچھ محل گفتگو رہی ہے! ایسے اہلِ علم جو ایک طرف حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے عقیدت و محبت رکھتے ہیں اور دوسری طرف "کلامِ عرب" کو پہچانتے ہیں، اُن کی رائے یہ ہے کہ "نہج البلاغہ" میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ارشادات بھی شامل ہیں اور الحاقات اور اضافے بھی!

تذکرۂ تہذیبِ ادب

مرتبہ:۔ نصیر کوٹی، ضخامت ۱۴۴ صفحات، قیمت:۔ دو روپے۔

ملنے کا پتہ :- مکتبہ مجلس تہذیب وادب ۱۹ اجیمبرلین روڈ، لاہور۔

اس کتاب میں علامہ تاجور نجیب آبادی، احسان دانش، خواجہ دل محمد، شفیق کوٹی اور منیر چغتائی کا منتخب کلام پیش کیا گیا ہے۔ اور ان کی شاعری پر مختصر مقالے بھی ہیں ——— چند منتخب اشعار :-

علامہ تاجور نجیب آبادی :-

مٹانا مجھ کو محبت کی خود فراموشی! | کہ اپنے بھولنے والے کی یادگار ہوں میں
ضبط فریاد سے ہوجائیں نہ آنکھیں پُرنم | پردہ داری ہی کہیں پردہ در راز نہ ہو
نہ دل بدلا، نہ دل کی آرزو بدلی نہ وہ بدلے | میں کیسے اعتبار انقلاب آسماں کرلوں
دل کا وہ حال کہ ہر وعدے پہ دم دیتا ہے | انکی یہ شان ابھی ہاں ہے گھڑی بھر میں نہیں

احسان دانش :-

نزاعِ دیر وحرم پہ کبھی نظر نہ گئی | جہاں گئے تری محفل سمجھ کے بیٹھ گئے
مجھ کو فکر ہے اس کی ظلمتیں نہ بڑھ جائیں | ان نئے چراغوں سے روشنی تو کیا ہوگی
انھوں نے خود مرا دامن پکڑ لیا تھا مگر | کسی خیال سے پھر مسکرا کے چھوڑ دیا!
جوشِ طوفاں سے ملا ایماں کی خامی کا ثبوت | ناخدا کو لوگ گھبرا کر، خدا کہنے لگے
ٹمٹماتے ہوئے مٹی کے دیئے پر نہ ہنسو | یہ بھڑک کر نہ کہیں آتش کا نشانہ بنے
جامہ ہوش سلامت ہے تو ناقص ہے جنوں | اس عہد[1] میں دامان و گریباں نہیں دیکھا جاتا

خواجہ دل محمد :-

ہستی تیرے کوچے میں مانندِ شرار آئی | آتش بکنار آئی، بجلی پہ سوار آئی

شفیق کوٹی :-

میرا شیرازۂ خاطر جو پریشاں ہے تو ہو | اُن کی زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا جاتا
اُن آنکھوں سے پینے کو جی چاہتا ہے | ابھی اور جینے کو جی چاہتا ہے
عشق میں کھائی بھی ٹھوکر کھا گئے | ہم سزا اپنے کئے کی پا گئے!
میخانہ ہے، ساقی ہے، صراحی ہے، سبو ہے | کہہ دو کہ ادھر گردشِ ایام نہ آئے
ساقی! ترے الطاف کا ممنون ہوں لیکن | پیمانے میں جو کچھ ہے مرے ظرف سے کم ہے

منیر چغتائی :-

رہ عشق دو فاصلے ہو رہی ہے | کبھی وہ لڑکھڑاتے ہیں، کبھی ہم

علامہ تاجور نجیب آبادی کے بارے میں، جناب وارث کامل مرحوم نے لکھا ہے :-

"علامہ کی چوتھی خصوصیت، یہ ہے کہ آپ نے پنجاب میں اردو شاعری اور انشا پردازی کا کچھ اس شان سے صُور پھونکا کہ تعلیم یافتہ نوجوان کے خوابیدہ جذبات بیدار ہوگئے۔"

[1] نہال سیوہاروی مرحوم کی غزل کا ایک مصرعہ — اگر ہے احساسِ جیب ودامن تو پھر جنوں ہوشیار سا ہے۔

تاجور نجیب آبادی مرحوم نے کوئی شک نہیں پنجاب میں ایک "تحریک" بن کر زبان و ادب کی خدمت انجام دی ہے اور بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں نے اُن سے استفادہ کیا ہے۔

"مجلس تہذیب و ادب" سے ہم توقع رکھتے ہیں کہ اس انداز پر اچھی اچھی کتابیں مُرتّب کرکے، منظرِ عام پر لاتی رہے گی۔

تناسخ یا آواگمن کا تحقیقی جائزہ

از:- ابو محمد امام الدین رام نگری، ضخامت ۱۰۸ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ، ملنے کا پتہ:- ماہنامہ انوارِ اسلام، رام نگر بنارس (انڈیا)

ماہنامہ "انوارِ اسلام" کی اس خصوصی اشاعت میں ہندوؤں کے عقیدہ "آواگمن" کا بڑی تحقیق کے ساتھ جائزہ لے کر بتایا گیا ہے کہ یہ عقیدہ ہر اعتبار سے غلط ہے اور خود ہندوؤں کی کتابیں اس بارے میں "تضاد" کا ثبوت دیتی ہیں

"اگر آواگمن کا عقیدہ صحیح ہے، اسے مانا جائے تو ایشور پر جانب داری اور بے انصافی کا الزام عائد ہوتا ہے کہ ان اولین درختوں اور پودوں کو کن بداعمالیوں کی سزا میں درخت اور پودا بنا دیا گیا! ابھی تو انسان کی پیدائش کا سلسلہ بھی جاری نہیں ہوا تھا، چہ جائیکہ کرم پھل اور جزائے عمل کا سلسلہ شروع ہو جائے ——— اسی طرح ہزاروں مردوں اور عورتوں کے متعلق جن کو ابتدا ہی میں توالد و تناسل کے بغیر انسان پیدا کیا گیا، انھوں نے اپنی پیدائش سے پہلے کون سے نیک اعمال کر ڈالے تھے ———"

مولانا ابو محمد امام الدین رام نگری کو اللہ تعالیٰ دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے کہ انھوں نے اس مسئلہ (آواگمن[1]) کی تحقیق کی اور دوسروں کی ہدایت و آگہی کے لئے اُسے چھپوا بھی دیا۔

تسخیر زہرہ

از:- علیم ناصری، ضخامت ۲۴ صفحات - ملنے کا پتہ:- بزمِ حق نصیر آباد، شالامار ٹاؤن، لاہور

حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ دلّی کی طوائفوں کے کوٹھوں پر جا جاکر، انہیں نصیحت فرمایا کرتے تھے اور ان کی گناہ آلود زندگی کا احساس دلاتے تھے، بعض طوائفوں پر حضرت شاہ صاحب کی پند و نصیحت کا اثر ہوا، انھوں نے توبہ کر لی اور اپنے پیشہ کو چھوڑ کر نیکی و تقویٰ کی زندگی گزارنے لگیں جناب حکیم ناصری نے اس واقعہ کو منظوم کیا ہے! اُن کے شعروں میں روانی اور گرمی پائی جاتی ہے۔

ندائے اُمر بالمعروف کے دل پر پڑے کوڑے
وَ تَنْہَوْنَ عَنِ المنکر نے دل کے تار جھنجوڑے

"جھنجھوڑے" بروزن "ہلکورے" نہیں بلکہ اس کا وزن "نگوڑے" اور "ہتھوڑے" ہے!

کسی سے پوچھ کر دُرویش اُس بازار میں پہونچا
ہدایت کا چراغ، عصیاں کے گہرے غار میں پہونچا

مصرعہ ثانی میں "عصیاں" کا "ع" ساقط ہو گیا! شاعر نے "عصیاں" کے "ع" کو "الف" کی صورت میں استعمال کیا ہے جو نادرست ہے!

[1] "آواگون" ہی اب تک سُنا اور پڑھا تھا، اس کتاب سے پہلی بار معلوم ہوا کہ صحیح لفظ "آواگمن" (واوٗ نہیں "میم" کے ساتھ) ہے۔

نومشق ہی نہیں بعض مشاق شعراء کو بھی ہم نے اس غلطی میں مبتلا پایا ہے کہ "ع" اور "الف" کی صوتی مشابہت سے وہ دھوکے میں آجاتے ہیں، ایسے موقعوں پر "ع" کی بجائے (الف، واؤ اور یے کے علاوہ) دوسرے حروف کے ساتھ اس لفظ کو پڑھنا چاہیئے، اور اس طرح غلطی واضح ہوجائے گی ۔

انتظام کتب خانہ

از :- شیخ محبوب قریشی، ضخامت ۸۲ صفحات (سرورق سنہری) قیمت :- ایک روپیہ پچاس پیسے ملنے کا پتہ :- محبوبیہ کارخانہ جلدسازی حیدرآباد کالونی ۱/۱۷ کراچی ۵

جناب شیخ محبوب قریشی "جلدسازی" (تصحیف) کے فن میں اس دور کے مجدد ہیں، ان کے کارخانہ جلدسازی کی بنی ہوئی "جلدیں" یورپ کی ساختہ جلدوں کے مقابلہ میں رکھی جاسکتی ہیں ــــــــ انہی شیخ صاحب نے یہ کتاب "کتب خانہ" کی ترتیب و تنظیم کے موضوع پر لکھی ہے جس میں بتایا ہے کہ لائبریریوں میں کتابوں کو کس طرح رکھنا چاہیئے کہ ایک طرف وہ زیادہ دنوں تک محفوظ اور صحیح و سالم رہیں اور دوسری طرف ان کی داد و ستد میں دشواری پیش نہ آئے !

صنعتِ اکسیر

مرتبہ :- حکیم محمد یوسف حسن، ضخامت ۱۸۴ صفحات (رنگین سرورق) قیمت :- تین روپے ملنے کا پتہ :- اشرف اکیڈیمی، پوسٹ بکس ۱۰۱ لائل پور ۔

کشتہ سازی پر یہ بڑے کام کی کتاب ہے، جسے جناب حکیم محمد یوسف حسن نے بڑی محنت کے ساتھ مرتب کیا ہے! ہر "کشتہ" کے عنوان کے تحت اجزائے نسخہ، ترکیب تیاری، شناخت اور ترکیب استعمال درج ہے! اطباء کو اس نادر کتاب سے فائدہ اٹھانا چاہیئے! کتاب کی عبارت انتہائی سہل اور عام فہم ہے!

گڑانبہ

از :- سید ابو تمیم فرید آبادی، ضخامت ۳۰ صفحات (سرورق رنگین و مصوّر) قیمت :- سات آنہ، ملنے کا پتہ :- اردو اکیڈمی سندھ (کراچی)

کتاب کے سرورق پر لکھا ہے کہ :-

"جملہ حقوق محفوظ ہیں اور یہ کتاب اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے، اردو ترقی بورڈ کے اشتراک سے شائع کی ہے!"

جناب سید ابو تمیم فرید آبادی نے یہ دلچسپ کہانی لکھی ہے، اور بچوں کی نفسیات کے مطابق آسان زبان اور دلنشین انداز میں لکھی ہے مگر زبان و بیان کے اعتبار سے کہیں جھول اور کہیں غلطیاں بھی ملتی ہیں ۔

مثلاً "ایک ہی چٹکی میں پی لی کہ احسن توبہ میری توبہ میری کرنے لگے، ایک ہی چٹکی سے یاروں کا دل ٹھنڈا ہو گیا" (ص۱) "ایک ہی چٹکی میں ـــــ دل ٹھنڈا ہو گیا" اس جملہ میں کتنا جھول پایا جاتا ہے؟ "دل ٹھنڈا ہو گیا" کا یہاں کیا محل تھا، سے "بھی محل نظر ہے ـــــ "بدنیتی سے ٹھنڈا کرلینے کی راہ بھی نہ دیکھی" (ص۱۶) یہ ترجمہ سا معلوم ہوتا ہے! اس طرح کون بولتا ہے کہ فلاں شخص نے کھلونے [illegible] نہیں دیکھی یا راہ دیکھ رہا ہے ۔

"جھٹ سے سامنے آگئے اور کھٹ سے گڑم یا مانگا" (ص۲۶)

"کھٹ سے" یہاں ٹھیک طور پر استعمال نہیں ہوا ۔ "گھر پہونچ کر احسن نے کھانا لانے تقاضے سے مانگا کامی کو اٹھ کر باورچی خانے میں جانا ہی پڑا" (ص۲۸) "تقاضے" اس جملہ میں اکھڑا اکھڑا سا لگتا ہے ـــــ "گڑمبے کی پتیلی اوندھی پڑی تھی، گڑم یا وہاں تک بہہ کر نہر کی طرح بہتا نظر آرہا تھا" (ص۳۰) یہ مبالغہ ہے کہ گڑمبے کے بہنے کو "نہر" سے تشبیہ دی ہے! "پھر وہی شکایت لگائی" (ص۱۱) "شکایت لگائی" روزمرہ نہیں ہے ۔

فاران

کراچی

ترتیب

ایڈیٹر

ماہر القادری

جلد: ۱۵

شمارہ: ۳

ماہ جون سنہ ۱۹۶۳ء

چندہ سالانہ
سات روپے

قیمت فی پرچہ
باسٹھ پیسے

پرنٹر و پبلشر:-
مسرور حسین

مقامِ اشاعت:- دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

مطبوعہ مطبع سعیدی کراچی

کتبہ ساجد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

اپریل ۱۹۴۹ء میں "فاران" کا پہلا شمارہ شائع ہوا تھا، اب ۱۹۶۳ء ہے۔ اس حساب سے "فاران" کی عمر چودہ سال اور تین مہینہ کی ہے! اللہ تعالیٰ کا محض فضل و کرم ہے کہ ہر طرح کے حالات آئے اور گزر گئے، یہاں تک کہ مدیر "فاران" کو طویل علالت سے بھی دوچار ہونا پڑا اور تین مہینہ حجاز کا سفر بھی رہا مگر "فاران" کی کوئی ایک اشاعت بھی ناغہ نہیں ہوئی۔ کس مپرسی، بے سروسامانی اور ناتجربہ کاری کی حالت میں "فاران" کا آغاز ہوا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی عنایت بے پایاں اور کرم بے کراں سے حالات سازگار ہوتے چلے گئے۔ غالبؔ نے شکوہ کیا تھا

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما!
کام گر رک گیا روانہ ہوا!

مگر "فاران" کے اہتمام و بندوبست کے سلسلہ میں نہ تو ہمیں زخم کھانے پڑے، جو لہو نکلنے اور تھمنے کا تلخ تجربہ ہوتا، اور نہ ہمارا کام رکنے پایا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے قربان جائیے کہ اس کا معاملہ ہمارے ساتھ دشواری اور امتحان کا نہیں، آسانی کا رہا! اس سفر میں موڑ بھی آئے اور نشیب و فراز بھی، مگر ہمارے تلووں کو جراحتوں کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ اس دنیا میں فرشِ گل بھی ہے اور خارزار بھی ہیں، یہاں "شب تنور" سے بھی سابقہ پڑتا ہے اور "شب سمور" سے بھی! اس منزل میں دشواریاں ہی نہیں آسانیاں بھی ہیں، اس میخانۂ حیات میں کسی کو شراب ناب ملتی ہے کوئی تلچھٹ ہی پر گزارا کرتا ہے اور کتنے ہیں جو تشنہ لبی کے شکوہ سنج ہیں۔

بہ یک خم دہد ساقیٔ روزگار
ترا صاف صاف و مرا درد درد

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ ہمارے لئے آسانیاں اور سہولتیں ہی مہیا کی گئیں، ہماری کوئی دُنیوی ضرورت رُکنے نہیں پائی، ہم کسی تشویش اور پریشانی میں مبتلا نہیں ہوتے، اب رہیں دُنیا کی تھوڑی سی بہت ناخوشگواریاں، ان سے تو کوئی زندگی بھی محفوظ نہیں ہے، شاہ و گدا، مُفلس و دولت مند اور غلام و آقا سبھی کوئی نہ کوئی خلش ضرور رکھتے ہیں، یہ خلش نہ ہو تو زندگی میں حرکت و روانی اور گہما گہمی باقی نہ رہے ——— انسان بڑا کم ظرف واقع ہوا ہے، وہ ذرا سی چُبھن پر واویلا کرنے لگتا ہے اور معمولی سی خوشی پر آپے سے باہر ہو جاتا ہے، دن رات میں اُمید و بیم اور خوشی و ناخوشی کے کتنے عالم ہر انسان پر گزرتے رہتے ہیں، ہر آدمی کچھ نہ کچھ اُمیدیں اور تمنائیں رکھتا ہے، تمناؤں کے پورا ہونے اور خوشی حاصل کرنے کے معاملہ میں وہ بڑا ہی حریص واقع ہوا ہے، اس لئے جب کوئی تمنا پوری نہیں ہوتی تو آدمی ملول ہو جاتا ہے ——— شاعرانہ زبان میں راقم الحروف نے اس جذبہ، خیال اور واردات کو اس طرح ادا کیا ہے :—

اُسے کیا زندگی کا لطف جس کی یہ تمنا ہے　　مجھی پر صرف سارا التفاتِ یار ہو جائے

ہمارے بعض احباب نے ہمدردی کے لہجہ میں کہا کہ فلاں رسالہ کی اتنی کثیر اشاعت ہے اور اسے اس قدر قیمتی اشتہارات ملتے ہیں! فلاں شاعر اور ادیب موٹر نشین ہے اور اُس کی آمدنی اس قدر فراواں ہے، پھر انھوں نے دوسروں سے ہمارا مقابلہ بھی کیا ——— ایسے مواقع پر آدمی مغرور ہو سکتا ہے بلکہ ہو جاتا ہے، اور شکر کی بجائے شکوہ و فریاد پر اُتر آتا ہے کہ قدرت نے (معاذاللہ) بڑی غلط بخشی سے کام لیا ہے، فلاں فلاں شخص کے مقابلے میں مجھ میں یہ یہ صفات و کمالات زیادہ ——— پائے جاتے ہیں مگر وہ کرسی نشین ہے اور میں خاک نشین ہوں ——— یہ بھی اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس قسم کی باتیں سُن کر نہ تو ہمیں اپنی برائی کا احساس پیدا ہوا اور نہ دوسروں کی زندگیوں سے اپنے حالات کا مقابلہ کرکے ہم متاسف و ملول ہوئے ——— ہم نے اس قسم کے ہمدرد دوستوں اور اپنے خیر خواہوں سے یہی کہا کہ اللہ تعالیٰ ہر کسی کو اُس کے ظرف و استعداد اور خود اپنی مرضی کے مطابق نوازتا ہے، ہم اپنے حالات میں خوش اور مطمئن ہیں اور اللہ کی بندہ پروری اور ذرہ نوازی کا شکر ادا کرتے ہیں اور اُس کی بارگاہ میں سجدۂ سپاس بجالاتے ہیں، اللہ تعالیٰ پر نہ کسی کا زور ہے اور نہ حق ہے، جس کو جو کچھ ملتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے محض فضل و کرم سے ملتا ہے! "فاران" کے صفحات گواہ ہیں کہ ہم نے آج تک ایک لفظ بھی ایسا نہیں لکھا جس سے کسی قسم کی پریشانی اور احتیاج کا اظہار ہوتا ہو اور نہ ہم نے رسالہ کی توسیع و اشاعت کیلئے کوئی اپیل شائع کی، نہ ہم نے نجی طور پر کسی کو لکھا کہ تم فاران کے خریدار بنو اور اس کے لئے جدوجہد کرو! ہماری کسی تحریک و ایما کے بغیر آپ ہی آپ بعض ایسے ہمدرد اور قدرشناس پیدا ہو گئے جنھوں نے خالصۃً لوجہ اللہ "فاران" کی توسیع و اشاعت میں حصہ لیا؛ اور جن کی محبت و نوازش کا سلسلہ منقطع نہیں ہونے پاتا!

رسالوں اور اخبار والوں کو مشتہرین سے اشتہارات کی اُجرت کے سلسلہ میں عام طور پر شکایت رہتی ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے مُشتہرین حضرات نے بھی ہمارے ساتھ اچھا معاملہ کیا۔ کسی کسی کے یہاں رقم کی ادائگی میں تاخیر تو ضرور ہو جاتی ہے، مگر اس کے سوا کوئی تلخی اور ناخوشگواری پیدا نہیں ہونے پائی۔

پاکستان کے ایجنٹ صاحبان نے بھی ہمارے اعتماد کو بحال رکھا اور دیانت و فرض شناسی کا ثبوت دیا، رہے خریدار صاحبان تو ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جن کو ہم "دوامی خریدار" کہہ سکتے ہیں یعنی جب سے وہ خریدار بنے ہیں اُس وقت سے اب تک یہ سلسلہ ٹوٹنے نہیں پایا، بعض خریدار ایسے ہیں جو دھوپ چھاؤں کی طرح آتے جاتے رہتے ہیں، کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی صاحب نے "فاران" وی، پی کے ذریعہ طلب فرمایا، جب اُن کے آرڈر پر اُن کی خدمت میں بھیجا گیا، تو وی۔ پی واپس فرمادیا گیا، کتابوں، رسالوں اور اخباروں کی دُنیا میں ایسا ہوتا رہتا ہے، کسی کتاب، اخبار یا رسالہ کے لئے آرڈر دینے کے بعد، خریدار کی رائے بھی بدل جایا کرتی ہے، ہم ایسے حضرات سے کوئی غبار اور تکدر اپنے دل میں نہیں رکھتے۔

"فاران" کی کتابت، طباعت، جلد سازی اور دوسرے معاملات کا جن لوگوں سے واسطہ اور تعلق ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے اُن سے ہمارا معاملہ صاف ہے اور وہ ہم سے پُوری طرح مطمئن ہیں، کسی کے واجبات (DUES) کی ادائگی میں ہم نے ذراسی تاخیر تک کو روا نہیں رکھا! اب تک تو ہمارا یہی عمل رہا ہے، آئندہ کا انحصار حالات و واقعات پر ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم کو ہمیں اعتماد ہے کہ حالات خدانخواستہ کبھی دگرگوں بھی ہوئے، تو نیت انشاءاللہ بخیر ہی رہے گی۔

مضامین کی اشاعت کے بارے میں "فاران" کا اپنا ایک معیار ہے، نثر و نظم کے جو مضامین اس معیار پر پُورے اُترتے

ہیں، وہ "فاران" میں کسی کی یاد دہانی کے بغیر شائع ہوتے ہیں، جن حضرات کے منظومات اور تحریریں رسالہ میں نہیں چھپ سکیں اُن سے ہم معذرت اس لئے نہیں کرتے کہ ہم سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی، اس سلسلہ میں بعض شاعروں اور انشاپردازوں کے شکایت آمیز خطوط بھی ہمیں ملے ہیں، اور ایسے خطوط ہمیں اُس وقت تک ملتے رہیں گے، جب تک "فاران" کا معیار قائم ہے! جو مضامین "فاران" میں شائع نہیں ہوتے، اور ہم انہیں واپس کر دیتے ہیں، اُن کے بارے میں تفصیل کے ساتھ یہ بتانا مشکل ہے کہ ان میں کیا کیا خامیاں ہیں، اور کہاں کہاں کمزوری پائی جاتی ہے، اگر اس قسم کی ہر غزل، نظم اور مضمون کی کمزوریوں اور خامیوں کی نشاندہی کریں، تو ہمارا ہر خط اپنی جگہ ایک مقالہ بن جائے، اس کام کے لئے جس فرصت کی ضرورت ہے۔ وہ ہم کہاں سے لائیں! جن حضرات کے مضامین "فاران" کی زینت بنتے رہتے ہیں، اُن کے ہم شکرگزار ہیں، ہماری یہ شکرگزاری تو ایک رسمی چیز ہے، اس کا حقیقی اجر تو اللہ تعالیٰ عطا فرمائے گا! شکریہ کے لفظوں سے آدمی کا دل تو خوش ہو جاتا ہے مگر محسوس فائدہ اُسے حاصل نہیں ہوتا، اور جو اجر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا جاتا ہے، اُس میں ظاہر و باطن کے تمام رُوحانی اور مادی فائدے مضمر ہوتے ہیں

"فاران" میں رسالوں اور کتابوں پر جو تبصرے ہوتے ہیں، وہ بڑی دلچسپی اور شوق کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں، ان تبصروں نے نہ جانے کس کس مُصنف اور شاعر کی نگاہ میں ہمیں مبغوض بنا دیا ہے، ہم کیا کریں لوگوں کو خوش رکھنے اور اُن کی پسندیدگی حاصل کرنے کے لئے ہم منافقت نہیں برت سکتے کہ کسی چیز میں ہمیں صریحی طور پر کمزوریاں اور غلطیاں نظر آرہی ہوں، اور ہم اُن سے صرفِ نظر کرکے، مدح سرائی کرنے لگیں، اگر ہم ایسا کریں تو "فاران" کے پڑھنے والوں کو دیدہ و دانستہ دھوکا دیں، اور اس کے لئے ہم کسی طرح اپنے کو تیار نہیں کر سکتے۔

بعض اہلِ قلم کی ناراضی اور ناخوشی کے ہمیں عجیب عجیب تجربے ہوئے ہیں، مثلاً ایک مورخ و انشاپرداز بزرگ کی کتابوں پر "فاران" میں تبصرہ ہوا، اُس تبصرے میں کتاب کے محاسن کے ساتھ اُس کا دوسرا رُخ بھی دکھایا گیا! اگر ہم سے تصویر کا دوسرا رُخ پیش کرنے میں کہیں غلطی ہوئی تھی، تو ہماری فروگذاشت پر ہمیں مطلع کرنا تھا، اگر ہم مُطمئن ہو جاتے تو "فاران" ہی میں اپنی لغزش کا اعتراف کرتے، مگر وہ بزرگ اپنی کبیدگی کو دل میں لئے رہے، اور "فاران" کا "توحید نمبر" جب تبصرے کے لئے اُن کی خدمت میں بھیجا گیا، تو انھوں نے اس اپنے دل کے غبار، تکدر اور کبیدگی و ناخوشی کو "تبصرے" (REWIEW) میں صرف فرما دیا! "توحید نمبر" میں جو نیوز پرنٹ استعمال ہوا ہے سب سے پہلے اس پر اعتراض وارد فرمایا، حالانکہ عام طور پر رسالوں کے خاص نمبر "نیوز پرنٹ" ہی پر شائع ہوتے ہیں، یہ کوئی اعتراض کی بات نہ تھی، پھر یہ بزرگ جس رسالہ سے متعلق ہیں وہ خوشنما ٹائپ کے ساتھ سفید کاغذ پر اس لئے چھپتا ہے کہ اُس کے درجنوں "محسن اور معطی" موجود ہیں، جنھوں نے ہزاروں روپیہ امداد و اعانت کی مد میں دیا ہے، اور اس فہرست میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے! وہ اپنے رسالہ کے حالات پر "فاران" کا قیاس کیوں فرماتے ہیں!

اس اعتراض کے بعد "توحید نمبر" کے مضامین پر جو تنقید فرمائی گئی ہے، اُسے پڑھ کر مجموعی تاثر یہ قائم ہوتا ہے کہ اس نمبر میں توحید کی دعوت اور شرک و بدعت کی تردید میں وہی اگلوں کی کہی ہوئی دلیلیں دُہرائی گئی ہیں، کوئی خصوصیت اور امتیاز فاران کے "توحید نمبر" کو حاصل نہیں ہے۔

یہ اعتراض تو قرآنِ پاک کی ہر تفسیر اور سیرت کی ہر کتاب پر عائد ہو سکتا ہے، اس لئے کہ کوئی مولف، مصنف اور مُفسّر وضع روایتوں میں تو اپنی طرف سے اضافہ نہیں کر سکتا، حالانکہ بہت سی تفسیریں اور سیرتِ نبوی پر ایسی کتابیں ہیں، جن کی اہلِ علم تعریف کرتے ہیں اور ان کے لکھنے والے عظیم مفکر اور بلند انشا پرداز مانے جاتے ہیں، اصل چیز پچھلی کتابوں میں لکھی ہوئی روایتوں اور واقعات کے مطالعہ کے ساتھ، لکھنے والے کا اندازِ بیان اور طریقِ استدلال ہے!

فاران کے " توحید نمبر " میں مشرکانہ رسوم و بدعات " کی تردید میں جس موثر اور متنوع انداز پر مضامین لکھے گئے ہیں اور " توحیدِ خالص " کو جس مُثبت اسلوب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، نقد و تبصرہ میں اس سے سرسری طور پر گزر جانا، اور پڑھنے والوں کو اس قسم کا مجموعی تاثر دینا کہ یہ شمارہ خاص کوئی خصوصیت نہیں رکھتا، معمولی سے گھٹیا کاغذ پر پچھلی کہی ہوئی باتوں اور دلیلوں کو نقل کر دیا گیا ہے ــــــ یہ کوئی منصفانہ ریویو نہیں ہے۔

جس واقعہ کا ابھی ہم نے ذکر کیا ہے، وہ معمولی سی بات ہے، ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کے اظہار پر تنگ نظری اور تنک مزاجی کی پھبتی چُست کی جا سکتی ہے، مگر ہم نے اس واقعہ کا خاص طور سے اظہار یہ دکھانے کے لئے کیا ہے کہ " فاران " میں کتابوں پر جو تنقید ہوتی ہے، اس کا بعض اہلِ قلم کتنا بُرا مانتے ہیں اور جب انہیں موقع ملتا ہے تو اس کے جواب میں اپنی اس کبیدگی اور ناخوشی کو کام میں لاتے ہیں!

نام نہاد " ترقی پسند شعر و ادب " پر (اُردو زبان میں) اس کے آغاز ہی سے ہم سخت تنقید کرتے رہے ہیں، اور کبھی کبھی تو ایسا ہوا ہے کہ اس محاذ پر ہم تنِ تنہا ہی تگ و دو کرتے ہوئے پائے گئے ہیں جس کے سبب ہم ان حلقوں میں مبغوض ہیں، اور اُردو ادب پر ترقی پسند اور نیم ترقی پسند ہی چھائے ہوئے ہیں، مگر ہم نے اظہارِ حق کی خاطر اس کی پروا نہیں کی کہ اس دور میں شاعروں اور ادیبوں کی شخصیتیں جن سہاروں اور ذریعوں سے اُبھرتی ہیں ان سہاروں اور واسطوں سے ہم اپنی روش کے سبب محروم ہو رہے ہیں جب سے " فاران " نکلنا شروع ہوا ہے اپنے نزدیک جسے ہم منصفانہ تنقید سمجھتے ہیں اس کی بدولت ترقی پسندوں کے علاوہ دوسرے حلقوں کے اہلِ قلم اور شاعروں میں بھی ہمارے مداحین اور پسند کرنے والوں کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے یہاں تک کہ بعض تعمیر پسند ادیب و شاعر بھی ہم سے خوش نہیں ہیں، اس نقصان کو یہ ہر حال ہمیں اس وقت تک گوارا کرنا ہوگا، جب تک عدل و انصاف، حق شناسی اور حق گوئی ہمارا مطمحِ نظر رہے گا!

" فاران " میں شعر و شاعری کی کتابوں پر جو تنقید آتی ہے، اُس میں کہیں کہیں شعروں پر، ہماری تنقید کا یہ انداز بھی ہوتا ہے:

" یہ شعر وجدان کو سخت ناگوار ہے ــــــ اس سے ذوقِ شاعری مجروح ہوتا ہے ــــــ
اسے پڑھ کر وجدان گھٹن محسوس کرتا ہے ــــ "

شعر پر نقد و نظر کا یہ اسلوب ہمارا ایجاد کردہ نہیں ہے، تنقید کی کتابوں اور عام ادبی صحبتوں میں اس انداز پر ہمیشہ تنقید کی جاتی رہی ہے! مثلاً غالب کے اس شعر پر: ؎

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

اس کی کوئی خوبی ظاہر کئے بغیر اس طرح تبصرہ کرسکتے ہیں ـــــ کہ "اس شعر سے ذوق و وجدان نشاط و بالیدگی حاصل کرتے ہیں" ـــــ یہاں "ذوق و وجدان" سے صحت مند اور عمومی ذوق و وجدان مراد ہیں، اور ہر وہ شخص جس کا مذاق صحیح ہوگا، غالب کے اس شعر کو پسند کرے گا اس کے مقابلہ میں غالب کے اس شعر پر ـــ

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے　　　بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے

اس انداز پر تنقید ہو سکتی ہے ـــــ "اس شعر کو سن کر وجدان اذیت محسوس کرتا ہے!"

ہم روزمرہ بولتے، لکھتے اور سنتے ہیں کہ "عقل سلیم اس بات کو قبول نہیں کرسکتی" اب اس پر کوئی یہ اعتراض جڑ دے کہ ہر شخص کی اپنی جداگانہ "عقل" ہوتی ہے، ناقد جس بات کو عقل سلیم کے خلاف بتاتا ہے، ہو سکتا ہو کہ دوسروں کی "عقل" اُسے خوشی سے قبول کرلے ـــــ کیا اس قسم کی تنقید اور گرفت کو "صائب" کہا جاسکتا ہے؟ اسی طرح شعروں کے بارے میں جب "وجدان و ذوق" کا ذکر کیا جاتا ہے! تو اس سے وہی وجدان و ذوق مُراد ہیں، جو صحت مند ہوتے ہیں! مثلاً ذوقؔ کے اس شعر کو ـــ

واہ رے! شورِ جراحت خوب ہی چھڑکا نمک
ہڈیاں میری ہُما کس کس مزے سے کھائے ہے

"وجدان صحیح" پسند کر ہی نہیں سکتا، اس باب میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں، جو کوئی اس شعر کو پسند کرتا ہے اس کا وجدان بیمار اور اُس کا ذوق ناقص ہے، اس کے مقابلہ میں ذوقؔ ہی کے اس شعر کو ـــ

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوقؔ
اُس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

ہر صاحب ذوق پسند کرے گا۔ اہلِ ذوق کے درمیان اس طرح کا اختلاف تو ہوتا ہے کہ ایک کے نزدیک شعر بہت اچھا ہے، دوسرے کے نزدیک "بہت" نہیں صرف "اچھا" ہے! مگر اُن کے یہاں اس قسم کے اختلاف کی مثال شاذ و نادر ہی ملے گی کہ ایک کے نزدیک کوئی شعر بہت اونچے درجہ کا ہو اور دوسرے کی نگاہ میں انتہائی سطحی اور پست ہو! یہ لوگوں کا وجدان اور ذوق ہی تو ہے جو ناسخؔ کے مقابلہ میں آتشؔ کو پسند کرتا ہے اور ذوقؔ پر غالبؔ کو ترجیح دیتا ہے ـــــ

پاکستان میں حکومتوں کے کتنے بہت سے دور گزرے ہیں اور ان آنکھوں نے کیا کیا تماشے دیکھے ہیں۔ کرسیاں بچھی ہیں اور اوندھی ہوئی ہیں، عزتیں ملی ہیں اور چھین لی گئی ہیں، پچھلے دور کے کتنے بہت سے "عزت مآب" ہیں، جنہیں آج کوئی نہیں پوچھتا، جب تک وہ برسرِ حکومت تھے، تو اُن کے کردار کو مثال میں پیش کیا جاتا تھا، اور اُن کی تدبیر و رائے اور فہم و دانش کی کیا کیا تعریفیں کی جاتی تھیں، حکومت سے ہٹنے کے بعد اب لوگوں کی ان کے بارے میں یہ رائے ہے، کہ کرسی کے ساتھ عقل و تدبیر بھی ان سے چھن گئی! "فاران" نے ہر دورِ حکومت کی غلطیوں، کمزوریوں اور کوتاہیوں پر احتساب کیا ہے! جس بات کو ہم نے حق سمجھا ہے، اُس کا اظہار پوری بے باکی سے کیا ہے! "اظہارِ حق" کا حق ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو رازق نہیں سمجھتے، اور اس پر ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم و مشیت کے بغیر کوئی کسی کو نہ تو نفع پہونچا سکتا ہے اور نہ نقصان! حکومت پر ہماری تنقید و احتساب کا انداز ہمیشہ "تعمیری" رہا ہو اور تعمیر و اصلاح؟

اس فرض کو ہم ہمیشہ انجام دیتے رہیں گے۔

سال دو سال میں دل چاہنے لگتا ہے کہ "فاران" کے کرمفرماؤں اور دوستوں سے کچھ "فاران" کی باتیں کرلیں! آج کی صحبت میں ہم نے باتیں کرکے دوستی، محبت اور رفاقت کی تجدید کی ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق پہچاننے، حق پر قائم رہنے اور حق کے لئے کچھ نہ کچھ قربانی دینے کی توفیق عطا فرمائے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہمیں حاصل ہوجائے اور جسے یہ نعمت مل گئی وہ دین و دنیا میں بامُراد اور کامیاب رہا (وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ)

ماہر القادری

۲۸ مئی سنہ ۶۳ء

ماہر القادری

اسلام اور دعا

اسلام نے جہاں انسانوں کو عمل و حرکت بلکہ کائنات کو مسخر کرنے کی تعلیم اور دعوت دی ہے، وہاں یہ بھی کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو، اُس سے مدد مانگو، اُس کے حضور اپنی تمنائیں اور التجائیں پیش کرو۔ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جانا اور صرف دعائیں کرتے رہنا، اسلام ایسی نکمی زندگی کو پسند نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک حرکت میں برکت ہے! اسلام کی نگاہ میں "عمل بے دعا" اور "دعائے بے عمل" یہ دونوں چیزیں غلط ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے میدانوں میں فوجوں کو لڑایا ہے یہاں تک کہ زخم بھی کھاتے ہیں اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں بھی کی ہیں اور اپنے درد و غم کو پیش کیا ہے! اسلام دینِ فطرت ہے، اسی لئے اُس نے دعا کی تعلیم دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پکارنا اور اس سے مدد چاہنا انسان کی فطرت ہے۔ تجربہ اور تاریخ بتاتی ہے کہ وہ لوگ جو اپنی بدنصیبی کے سبب اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتے، کبھی کبھار مصیبت اور پریشانیوں سے گھبرا کر اُن کی زبان سے بھی بے ساختہ "اللہ" نکل جاتا ہے۔

قرآن کریم بتاتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جب اپنی لغزش کا علم ہوا تو وہ اللہ تعالیٰ کے حضور یوں عرض کرنے لگے۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ ۔ "اے ہمارے رب! ہم نے اپنا نقصان کر لیا اگر تو ہماری مغفرت نہ فرمائے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو واقعی ہمارا بڑا نقصان ہو جائے گا۔"

حضرت نوح علیہ السلام کی سرکش اور باغی قوم نے جب قدم قدم پر اللہ کے اس سچے نبی کو جھٹلایا تو انھوں نے فریاد کی۔ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۔ "میں عاجز (اور درماندہ) ہوں میرے پروردگار! تو بدلہ لے"

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی پریشانی کی حالت میں اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں:۔ رَبِّ اِنِّیْ لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ۔ "اے پروردگار! جو نعمت بھی تو بھیج دے، میں اس کا حاجت مند ہوں"۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے غم و الم کے ہجوم میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنا درد و غم پیش کیا۔ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ "مجھ کو یہ تکلیف پہنچ رہی ہے اور (اے اللہ) تو سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے"

حضرت یونس علیہ السلام نے رنج و غم کے گھٹا ٹوپ کے اندھیرے میں پکارا۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۔ "اے میرے رب! تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو پاک ہے۔ میں ہی بے شک قصوروار ہوں"

خدا کے آخری نبی سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دن رات کا بہت کچھ حصہ نماز اور دعا ہی میں گزرتا تھا۔ جب کوئی مشکل اور کٹھن کام پیش آتا تو اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے۔

یا حیُّ یا قیّوم برحمتک استغیث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "دعا" کی اس حد تک تاکید فرمائی ہے کہ کسی کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو اس کے لئے بھی اللہ تعالیٰ سے دعا اور التجا کرے۔

جب تمام نبی اور رسول ہر کام میں اللہ تعالیٰ سے مدد چاہتے، دعا کرتے اور اسی کو پکارتے تھے تو ہمیں بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی جن، فرشتہ، قبر یا روح سے دعا نہیں مانگنی چاہیے اور نہ مدد کے لئے ان کو پکارنا چاہیے۔ دلوں کا حال اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ ہر کسی

دُکھ درد سے وہی واقف ہے، نزدیک و دُور سے سب کی فریادیں وُہی سُنتا ہے۔

دُعا مانگنے کا طریقہ اسلام نے یہ بتایا ہے کہ دُعا عاجزی اور تضرع کے ساتھ مانگی جاتے۔ جیسے ایک بھکاری کسی کے سامنے گڑگڑا کر اور مجسم سوال بن کر دستِ طلب دراز کرتا اور اپنا دامن پھیلاتا ہے۔ پھر دُعا اس اُمید اور یقین سے کرنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے وہ چاہے گا اور اس کو منظور ہوگا تو ہماری پریشانی دُور ہوجائے گی اور ہماری مشکلات کے بند عقدے کھول دیئے جائیں گے

دُعائیں جائز اور نیک کاموں کے لئے کرنی چاہئیں مثلاً اپنی صحت کے لئے دُعا کرنی چاہیئے۔ اسلام نے جن باتوں کو ناجائز بتایا ہے اُن کے لئے دُعا کرنا بڑا گناہ ہے!

مثلاً کوئی تاجر سٹہ لگا کر سٹے کی کامیابی کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہے تو اُس کی یہ دُعا اُس کے منہ پر مار دی جائے گی!

دُعا کا پورا کرنا یا نہ کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، وہی حکیم و خبیر اس بات کو جانتا ہے کہ کون سی چیز ہمارے حق میں بہتر ہے اور کس چیز سے دین و دُنیا میں ہمیں نقصان پہنچے گا! جس چیز کی ہم نے دُعا میں طلب کی ہے۔ وہ ہمیں چاہے ملے یا نہ ملے۔ دُعا کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ جتنی دیر تک ہم دُعا میں مشغول رہتے ہیں۔ اتنی دیر تک اللہ تعالیٰ سے ہمارا تعلق قائم رہتا ہے۔ اپنی بندگی اور درماندگی اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور ربوبیت کا احساس، بلکہ اس پر یقین! کتنی بڑی نیکی ہے جو دُعا مانگنے والوں کو ہاتھ کے ہاتھ مل جاتی ہے! دُعا اللہ تعالیٰ کی یاد اور اُس کا ذکر ہے، اس لئے یہ عبادت ہے۔

دُعا ایک نعمت ہے، برکت ہے، سعادت ہے، مُبارک ہے وہ جس نے اس سعادت کو حاصل کیا اور اس نعمت و برکت سے غافل نہیں رہا۔

ماہر القادری

غلافِ کعبہ کا جلوس و نمائش

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی زیرِ نگرانی، لاہور میں جو "غلافِ کعبہ" تیار ہوا تھا۔ اس کا جلوس نکالا گیا اور شہروں میں لے جا کر اس کی نمائش کی گئی ——— اس سلسلہ میں کئی سوالنامے اور خطوط ہمیں موصول ہوئے۔ بعض حضرات نے تیز لہجہ میں لکھا کہ تم نے چپ کیوں سادھ رکھی ہے، "فاران" کے صفحات میں یہ بحث کیوں نہیں آرہی ہے؟ حالانکہ "فاران" شرک و بدعت کے معاملہ میں بہت زیادہ حساس اور تیز نگاہ واقع ہوا ہے۔

ہم نے بعض خطوں کے جواب میں لکھا کہ مولانا مودودی سے اس بارے میں استفسار کیا گیا ہے۔ اُن کا جواب آنے کے بعد ہی "فاران" میں اس موضوع پر ہم کچھ عرض کر سکیں گے! چنانچہ مولانا موصوف کی خدمت میں ہم نے "سوالنامہ" بھیجا، جس کا انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود، بروقت بلکہ یوں کہیے ہاتھ کے ہاتھ جواب دیدیا۔ مولانا کا جواب، جب ہمیں ملا ہے، تو اپریل کا شمارہ شائع ہو چکا تھا، یہ جواب "فاران" میں چھپتا تو مئی کے شمارے میں چھپ سکتا تھا!

مگر

ماہِ مئی کا "فاران" ابھی زیرِ ترتیب تھا کہ سہ روزہ "ایشیا" (لاہور) میں مولانا مودودی کا یہ مکتوب جو ہمارے خط کے جواب میں لکھا گیا تھا شائع ہو گیا! "ایشیا" میں مولانا کے "جواب" کی اشاعت کے بعد "فاران" میں اس کے چھاپنے کی ہم نے ضرورت محسوس نہیں کی۔ اپریل کے تیسرے ہفتہ میں مولانا موصوف حجاز جانے کے لئے کراچی تشریف لائے، اور ان سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی مگر مختصراً! انھوں نے فرمایا کہ "ترجمانُ القرآن" میں یہ بحث تفصیل کے ساتھ آرہی ہے ——— "ترجمانُ القرآن" کا یوں تو ہمیشہ انتظار رہتا ہے، مگر اس بار یہ انتظار اور زیادہ شدید اور صبر آزما ثابت ہوا! وقت گزرتا گیا اور آتشِ شوق تیز تر ہوتی گئی! میں مکان پر کام کر رہا تھا کہ آج ۳ مئی کی صبح میں میرے چھوٹے بھائی (مسرور حسین) نے فون پر یہ خوشخبری سُنائی کہ ترجمانُ القرآن آگیا ہے! اس اطلاع کے ملنے کے بعد میں دفتر "فاران" پہونچا اور مولانا کا لکھا ہوا مضمون بڑے شوق و توجہ کے ساتھ پڑھ ڈالا، اور اس وقت سہ پہر (شام کے پانچ بجے) تک کئی بار اسے پڑھ چکا ہوں! اب مولانا مودودی سے کوئی بات دریافت طلب نہیں رہی! "غلافِ کعبہ" کے جلوس کے سلسلہ میں کیا واقعات پیش آئے اور اس خصوص میں اُن کا نقطۂ نگاہ کیا ہے؟ ہر بات تفصیل کے ساتھ وہ اپنے مضمون میں بیان فرما چکے ہیں۔

مولانا مودودی نے اپنے اس مضمون میں بجا شکوہ کیا ہے ۔

> "اس معاملہ میں مختلف دینی حلقوں سے جو اعتراضات کئے گئے ہیں، وہ سب میری نگاہ سے گزرتے رہے ہیں، مگر ان میں جو زبان استعمال کی گئی ہے اور جس اندازِ بیان سے کام لیا گیا ہے، اس کا حریف بننا کسی طرح میرے بس میں نہ تھا۔"

"غلافِ کعبہ کے جلوس و نمائش سے بہت پہلے اس خبر کے مشہور ہوتے ہی کہ مولانا مودودی کی نگرانی میں غلافِ کعبہ تیار ہو رہا ہے

بعض اخباروں اور رسالوں نے مولانا موصوف پر رکیک حملے شروع کر دیئے!

(۱۰)

غلافِ کعبہ کے جلوس و نمائش کے بعد تو نقد و احتساب اور گرفت کے لئے انہیں قانونی اصطلاح میں "مُمِدّا" (EXIBIT) ہاتھ آگیا اس خصوص میں بعض رسالوں اور اخباروں نے مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی پر جس انداز میں تنقید کی ہے، وہ انداز اہلِ علم اور اصحابِ قلم کو کسی طرح زیب نہیں دیتا! اس قسم کی بعض تحریریں ہماری نظر سے گزری ہیں، جن میں نفسِ مسئلہ کی تحقیق و تنقیح سے تجاوز کر کے مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کو بدنام کرنے کی پُوری کوشش کی گئی ہے۔

ایک تو ہوتا ہے نقد و احتساب، اور ایک ہوتی ہے تنقیص و تحقیر! ——— تو اس سلسلہ میں جتنے مضامین ہماری نگاہ سے گزرے ہیں، اُن میں متعدد مضامین کا اسلوب بیان اور زبان تحقیر آمیز ہے اور کسی کسی ناقد کا دلی بُغض تو اسکی تحریر سے صاف ظاہر ہو رہا ہے، بلکہ اُبل رہا ہے!

کسی سے کوئی اُونچ نیچ یا بے عنوانی ہو جائے، تو اُسی کے بقدر اُسے سزا ملنی چاہیئے، یہ کیا کہ ذرا سی پھانس چبھی اور اس کا انتقام یہ لیا گیا کہ سینہ میں خنجر پیوست کر دیا، نقد و احتساب اور سزا و جزا میں حق و انصاف اور عدل و توازن کا خیال رکھنا ضروری ہے

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ہزاروں صفحے لکھے ہیں، اُن کی درجنوں کتابیں موجود ہیں، جن میں "شرک و بدعت" کی کسی استعارہ اور کنایہ کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا، جیسی بے غبار توحید مولانا مودودی نے پیش کی ہے، اس کی مثالیں اسلامی ادب میں کم ملیں گی! ہماری نگاہ سے اُن اکابر کی کتابیں تک گزری ہیں، جنھوں نے "شرک و بدعت" کے خلاف جہاد کیا ہے، مگر "تصوف کے رموز" کی زبان میں جب وہ گفتگو فرماتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ نعرۂ توحید میں "بریلوی لے" کیسے شامل ہو گئی! مولانا مودودی کی جو شخص کتابیں پڑھے گا، وہ بدعات اور مشرکانہ رسوم کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتا، جماعتِ اسلامی کا مزاج و فکر خالص توحیدی واقع ہوا ہے بدعت کی پرچھائیں سے بھی نفرت، اور عملاً ان خرافات کی تردید! جماعتِ اسلامی پر تو اہلِ بدعت 'وہابیت' کی پھبتیاں کستے ہیں! جماعتِ اسلامی نے عوام میں ہر دلعزیزی اور مقبولیت حاصل کرنے کے لئے کبھی کسی بدعت آمیز رسم میں نہ تو شرکت کی، اور نہ اپنے کسی قول و عمل سے ایسی باتوں کو غذا پہنچائی!

غلافِ کعبہ مولانا مودودی کی نظر میں!

"غلافِ کعبہ" کا قیاس قبروں کی چادروں پر نہیں کیا جا سکتا، مسلمانوں کی قبریں عہدِ رسالت اور خلافتِ راشدہ کے دور میں موجود تھیں مگر اُن پر نہ چادریں چڑھائی جاتی تھیں اور نہ غلاف ڈالے جاتے تھے۔ لہٰذا یہ کھُلی ہوئی "بدعت" ہے! مگر کعبہ پر غلاف چڑھانے کی رسم پہلے سے چلی آتی تھی، جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی رکھا! اس لئے کعبۃ اللہ کے لئے غلاف بنانا اور غلاف بنا کر اُس پر چڑھانا جائز ہے بلکہ مُستحب ہے! سجدہ تو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہی کیا جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو یہ شرف بخشا ہے کہ اُسے "قبلۂ صلوٰۃ" قرار دیا ہے۔ پھر دنیا کی تمام عمارتوں میں یہ امتیاز و خصوصیت صرف کعبۃ اللہ کو حاصل ہے کہ اُس کا طواف کیا جاتا ہے اور اُس میں نصب شدہ "حجرِ اسود" کو چوما جاتا ہے! ہر مسلمان کے دل میں کعبۃ اللہ کی محبت اور احترام پایا جاتا ہے اور پایا جانا چاہیئے اسی نسبت سے "غلافِ کعبہ" کو محترم سمجھنا، شرعی نقطۂ نگاہ سے نہ تو قابلِ اعتراض ہے اور نہ محلِ نظر ہے! "غلافِ کعبہ" اللہ تعالیٰ کے گھر پر چڑھانے کے لئے تیار کیا ہوا ہو، یا اُس پر چڑھا ہوا ہو، یا اُس پر چڑھا کر اتار لیا گیا ہو، ہر حالت میں ایک مسلمان کا دل اُس کے لئے احترام کا گوشہ رکھتا ہے!

پاکستان میں غلافِ کعبہ کا تیار ہونا ـــــــــ یہ بالکل نئی صورت ہے جو پیش آئی! مسلمانوں کو جب غلاف کے بنائے جانے کا علم ہوا تو اُن کے اندر اُس کے دیکھنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ غلافِ کعبہ کا محبت و احترام کی نگاہ سے دیکھنا دینی اعتبار سے کوئی قابلِ اعتراض فعل نہیں ہے! مسلمانوں کے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے یہ تجویز کی گئی کہ اسے بعض مشہور شہروں میں لے جایا جائے اور لاہور میں جہاں یہ غلافِ کعبہ بنا تھا، اور جہاں کے مسلمان سب سے زیادہ اس کے دیکھنے کے مشتاق تھے، وہاں غلاف کو ایئرپورٹ تک پہونچانے کے لئے عام جلوس کا اہتمام کیا جاتے! "غلافِ کعبہ کے سلسلہ میں جو کمیٹی بنی تھی اس میں معزز شہریوں اور جماعتِ اسلامی کے دو نمائندوں کے علاوہ، دیوبند کے ایک عالم اور جمعیت اہلِ حدیث کے ناظم نشر و اشاعت بھی شریک تھے! غلافِ کعبہ کا جلوس و نمائش دینی نقطۂ نگاہ سے پسندیدہ نہ تھا تو ان علماء کو مشورہ دینا تھا اور نکیر کرنی تھی کہ ایسا کرنے میں یہ قباحتیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے "غلافِ کعبہ کے اہتمام جلوس و نمائش کی پوری کمیٹی پر جو اٹھارہ ارکان پر مشتمل تھی، اس مسئلہ میں خیر کی نیت کے ساتھ ذہول طاری ہو گیا اور علماء تک سے "اجتہاد" میں سہو ہو گیا سب کے سامنے اس تصویر کا یہ رُخ تھا کہ غلافِ کعبہ کی نمائش سے مسلمانوں میں دینی جذبہ بیدار ہو گا اور شہروں میں اللہ تعالیٰ کا فکر اور ذکر گونجے گا۔

اہلِ بدعت کا جو مزاج اور اندازِ فکر ہوتا ہے۔ وہ سب کو معلوم ہے۔ مگر مولانا مودودی نے اس خصوص میں جو وضاحت کی ہے وہ اس قابل ہے کہ اُن کے ناقدین غور سے پڑھیں، وہ فرماتے ہیں:۔

"۔۔۔۔۔ اس اصولی وضاحت کے بعد اب میں عرض کرتا ہوں کہ غلاف کے کپڑے کا جلوس نکالنا اور اُس کی نمائش کا انتظام کرنا، بلاشبہ ایک نیا کام تھا۔ جو عہدِ رسالتؐ اور زمانۂ خلافتِ راشدہؓ میں نہیں ہوا۔ مگر میں نے یہ کام اس بنا پر نہیں کیا کہ میں اصلاً اس کی نمائش کرنا چاہتا تھا اور ایسے دھوم دھام کے ساتھ بھیجنا ابتدا ہی سے میری اسکیم میں شامل تھا، بلکہ میں نے یہ پروگرام اُس وقت بنایا، جب سارے ملک میں اُس کے لئے عوام کے اندر بے پناہ جذبۂ شوق خود بخود بھڑک اُٹھا اور مجھے اندیشہ ہوا کہ یہ شوق اگر خود اپنا راستہ نکالے گا، تو بڑے پیمانے پر گمراہی پھیلنے کا موجب بن جائے گا (چنانچہ جہاں جہاں بھی اس نے موقع پاکر اپنا راستہ نکالا، بہت بُری طرح نکالا) اس لئے میں نے اُس مضرت کو دفع کرنے کی خاطر یہ کام کیا جو شریعت کی نگاہ میں ایک بڑی مضرت تھی، اُس کے لئے ایک ایسا طریقہ تجویز کیا جس سے لوگوں کے جذبات کا سیلاب حدودِ شرع کے اندر محدود رہ سکے۔ اس کو سیئات کے بجائے اُن حسنات کی طرف موڑنے کی کوشش کی جو شرعاً پسندیدہ ہیں۔ میرا ہرگز یہ دعویٰ نہ تھا کہ لوگوں کو ضرور غلافِ کعبہ دیکھنا اور اُس کے جلوس میں شامل ہونا چاہیے! نہ آئیں گے تو گناہگار ہوں گے۔ اور آئیں گے تو یہ اور یہ اجر ملے گا۔ اور میرا یہ ارادہ بھی نہیں ہے کہ آئندہ اگر پاکستان ہی میں غلاف بننے لگے اور اُس سے میرا کوئی تعلق ہو تو میں اس کی زیارت کے اہتمام اور جلوسوں کے انتظام کو ایک مستقل طریقہ بنالوں، اب میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کس فقہی قاعدے سے میں بدعتِ ضلالت کا مرتکب ہوا ہوں ۔۔۔۔۔۔"

غلافِ کعبہ کی دینی حیثیت کیا ہے، اس کے بارے میں مولانا کی یہ رائے ہے:۔

"کوئی کپڑا خواہ کعبہ پر چڑھایا گیا ہو، یا چڑھانے کے لئے تیار کیا گیا ہو، دونوں صورتوں میں وہ ایسا متبرک نہیں ہو جاتا، کہ اس سے برکت حاصل کرنے کے لئے اُسے چھوا جائے، چوما جائے، اُسکی زیارت کرائی جائے، اور اُسے دھوم دھام سے روانہ کیا جائے، بلکہ فقہائے نے کعبہ پر سے اُترے ہوئے غلاف سے بھی لباس بنانے کو جائز قرار دیا ہے، بشرطیکہ اس پر کلمہ طیبہ، یا آیاتِ قرآنی یا اسماءِ الٰہی لکھے ہوئے نہ ہوں، لیکن اگر لوگ اس بنا پر اُس کا ازخود (نہ کہ کسی شرعی حکم اور فتوے کی حیثیت سے) احترام کریں کہ یہ اللہ کے گھر کے لئے جا رہا ہے، یا وہاں سے اُتر کر آیا ہے، تو اس کا احترام ناروا بھی نہیں کہا جا سکتا، یہ تو اُس نسبت کا احترام ہے، جو اُسے اللہ کے گھر سے حاصل ہوگئی ہے، اس احترام کے لئے اللہ کی محبت و عظمت کے سوا کوئی دوسرا محرک نہیں ہے، اس احترام کو کوئی شخص واجب اور اس کی کسی خاص شکل کو لازم قرار دے تو غلط ہے، لیکن کوئی اسے مذموم ٹھیرائے، اور خواہ مخواہ شرک قرار دے، تو یہ بھی زیادتی ہے" (ترجمان القرآن ماہ اپریل ۱۹۶۳ء)

مولانا مودودی کی اس وضاحت سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ کوئی "نیا کام" کب بدعت بنتا ہے، اور بدعت کا دراصل کیا مزاج ہے، مولانا موصوف "بدعت" کے تمام مفاسد اور اُس کے پہلوؤں پر بھی نظر رکھتے ہیں! "غلافِ کعبہ" کو وہ کیا سمجھتے ہیں اس کا اظہار بھی اُنھوں نے کر دیا ہے، جو شخص بدعات سے ذرا سا بھی شغف رکھتا ہے، اُس کی زبان و قلم سے یہ بات نکل ہی نہیں سکتی کہ غلافِ کعبہ سے برکت حاصل کرنے کے لئے نہ اُسے چھونا چاہیئے اور نہ چومنا چاہیئے! یہ تو بدعتیوں کا نہیں بدعت شکنوں کا مزاج اور اندازِ فکر ہے ـــــــ اور مولانا کی فکر، اللہ تعالیٰ کے فضل سے "بدعت شکن" ہی واقع ہوئی ہے۔

دُوسرا رُخ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے رسالہ "ترجمانُ القرآن" میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے، اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ :-

- "غلافِ کعبہ کی نمائش و جُلوس کا کوئی ارادہ نہ رکھتے تھے"
- "غلافِ کعبہ کی اس طرح شہر شہر زیارت کرانے اور اُس کا جُلوس نکالنے کا کوئی پروگرام اُن کے سامنے نہ تھا"
- "یہ پروگرام اُس وقت بنایا گیا، جب عوام میں ایک جذبہ خود بخود بھڑک اٹھا تھا، اور اس کے بنانے کی اصل غرض یہ تھی کہ اس جذبے کے سیلاب کو منکرات کی طرف جانے اور صحیح راستے پر موڑنے کے لئے جو کچھ کیا جا سکتا ہے، کیا جائے، اگر میں ایسا نہ کرتا تو یہ بہت زیادہ مکروہ راستہ اختیار کر لیتا اور کسی کے روکے نہ رُکتا"

ـــــــ اُن کی اس تحریر سے "غلافِ کعبہ کے جلوس و نمائش" کا موقف اور اُس کی حیثیت آپ ہی آپ واضح ہو جاتی ہے ـــــــ یعنی یہ کہ اگر ایسا کرنا کوئی نیکی کی بات ہوتی، تو وہ شروع ہی سے جدّوجہد کرتے اور اس کے لئے کوئی پروگرام اور اسکیم بناتے! مولانا موصوف اس بات کے تو خود معترف ہیں کہ "غلافِ کعبہ کی نمائش و جلوس" دینی اعتبار سے کوئی ایسا پسندیدہ کام نہیں ہے، جس کے لئے سعی و اہتمام کیا جائے! مولانا موصوف کی تحریر پڑھنے کے بعد "غلافِ کعبہ کے نمائش و جلوس" کے نفسِ مسئلہ کی صورت یہ بنتی ہے کہ اس فعل، رسم اور مظاہرے کو دین کی پسندیدگی بہرحال حاصل نہیں ہے، اور اس طرح اُن کے ناقدین کا موقف، مضبوط قرار پاتا ہے کہ انھوں نے اس فعل پر تنقید کی، جسے مولانا مودودی خود بھی پسندیدہ نہیں سمجھتے تھے اگر وہ اسے پسندیدہ اور سبب خیر سمجھتے، تو شروع ہی سے ایسا کرنے کا کوئی پروگرام بناتے!

مسلمانوں کے بے پناہ ذوق و شوق کو دیکھ کر اور ان کے اس جذبہ شوق و محبت کو غلط رُخ کی بجائے، صحیح راستہ پر ڈالنے کے لئے مولانا مودودی نے غلافِ کعبہ کے جلوس و نمائش کا اہتمام اپنی نگرانی میں کیا اگر مسلمانوں میں یہ ذوق و شوق پیدا نہ ہوتا تو وہ ایسا نہ کرتے ——— یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غلافِ کعبہ عہدِ رسالت اور دورِ خلافت میں بھی موجود تھا۔ دوسرے شہروں اور ملکوں کے مسلمان ہمارے اس زمانہ کے مسلمانوں سے زیادہ دینی شغف رکھتے تھے، اس بنا پر کعبہ اور غلافِ کعبہ سے بھی انہیں زیادہ دل چسپی اور محبت ہونی چاہیے تھی، مگر اُس دور کے مسلمانوں میں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا یا تو اُن میں پاکستان کے مسلمانوں کی طرح زیارتِ غلافِ کعبہ کا بے پناہ شوق و جذبہ ہی پیدا نہیں ہوا، اور پیدا ہوا تو اُس کی پذیرائی کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی! خلافتِ راشدہ کے دور میں یہ بات بہت آسان تھی کہ غلافِ کعبہ اُتارے لئے کے بعد بڑے شہروں میں زیارت کے لئے بھیج دیا جاتا۔ یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ اُسی مبارک دور کے حالات اُمّت کے لئے نمونہ ہیں، اور شعائر اللہ کے بارے میں صحابہ کرام اور تابعین عظام کا ذوق و شوق، نسبت اور محبت اور پھر اس محبت کا اظہار ہمارے لئے قابلِ اتباع ہے۔

"بدعت" اسی چیز کا نام ہے کہ وہ چیز عہدِ رسالت اور خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں پائی جاتی ہو۔ اور اُس کا کرنا اور برتنا امکان میں ہو مگر خیر و ثواب کی نیت سے اُس کو نہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً مدینہ اور مکہ میں پھول بھی موجود تھے اور قبریں بھی پائی جاتی تھیں لیکن قبروں پر کبھی کسی نے کوئی پھول نہیں چڑھایا — اس لئے قبروں پر پھول چڑھانا "بدعت" ہے۔ اسی ایک واقعہ پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ "غلافِ کعبہ" اس مُبارک دور میں موجود تھا۔ اُس کی تیاری بھی ہوتی تھی، وہ کعبۃ اللہ سے اُتارا بھی جاتا تھا، مگر اُس کی نمائش و جلوس کی کوئی ایک نظیر بھی نہیں ملتی۔

مسلمانوں کا ذوق و شوق زیارتِ غلافِ کعبہ کے لئے جلوس و نمائش کا مطالبہ کر رہا تھا، تو اس کے اہتمام و پذیرائی کے لئے جو زحمت برداشت کی گئی، اُتنی زحمت اگر غلافِ کعبہ کی کمیٹی اور جماعتِ اسلامی' رسالوں' اخباروں، اشتہاروں' اور وعظ و تقریر کے ذریعہ لوگوں کو یہ بتانے کے لئے کرتی کہ غلافِ کعبہ کی زیارت کے واسطے جلوس و نمائش کا اہتمام شرعاً پسندیدہ نہیں ہے ——— تو توقع ہے کہ مسلمانوں کا یہ جوش "بے پناہ" نہ ہونے پاتا یا اعتدال پر آجاتا اور بہت سوں کی سمجھ میں صحیح بات آجاتی۔

دینی معاملات میں لوگوں کے شوق اور جذبات کے لئے رعایت اور رُخصت کا تصور خطرات سے خالی نہیں۔ اس سے بڑی مضرتیں پیدا ہو سکتی ہیں! خاص طور سے اس دور میں جب کہ عوام "بدعات" سے بڑا شغف رکھتے ہیں' اس قسم کی رعایتوں اور رُخصتوں سے اُن کے اس شغف کو غذا ملتی ہے!

بدعت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ایک حال پر کبھی نہیں رہتی، شروع شروع میں وہ معمولی، ہلکی اور بے ضرر سی نظر آتی ہے مگر رفتہ رفتہ اُس میں اضافے ہوتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ وہ "ضلالت" بن جاتی ہے۔

"غلافِ کعبہ" کے جلوس و نمائش پر قریب قریب تمام دینی پرچوں نے نکیر کی ہے اور ان ناقدین میں سب لوگ جماعتِ اسلامی کے معاندین ہی نہیں ہیں' بلکہ ان میں وہ حضرات بھی ہیں' جو جماعتِ اسلامی سے بعض مسائل میں اختلاف رکھتے ہیں مگر انہیں جماعت سے' مولانا مودودی کی ذات سے کد نہیں ہے، اور انھوں نے یہ گرفت جماعتِ اسلامی کو بدنام کرنے کے لئے نہیں بلکہ دین کی خیر خواہی اور اظہارِ حق کی نیت سے کی ہے، یہاں تک کہ ہندوستان کی جماعتِ اسلامی کے ایک ممتاز رہنما تک نے اس واقعہ پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے[1]

[1] دلی سے ایک ماہنامہ "منادی" نکلتا ہے' خواجہ حسن نظامی کے صاحبزادے اُس کے ایڈیٹر ہیں' یہ رسالہ مشرکانہ رسوم اور بدعات کا پرجوش مبلغ اور مؤید ہے' صرف اس رسالہ نے غلافِ کعبہ کے "جلوس و نمائش" کی تحسین کی ہے اور لکھا ہے کہ مولانا مودودی اب تک تو بھٹکے ہوئے تھے، اب وہ راہِ راست پر آگئے ہیں! اسکے دس بارہ دن بعد ماہنامہ "تجلّی" ملا اس میں مولانا مودودی کے موقف کی تائید و مدافعت میں بڑے موثر کا مضمون آیا ہے۔

جن صوفیوں نے ہندوستان کے نومسلموں کے ذوقِ رقص وسُرود اور شوقِ لہو ولعب کو سماع اور قوالی کی طرف موڑ دیا تھا، جو اُس فتنہ کے مقابلہ میں بلحاظ ضرر اکم مضرت رساں تھی ——— قوالی پر گرفت کیوں کی جاتی ہے ——— بارہ ربیع الاول کو جو لوگ جلوس نکالتے ہیں، وہ بھی اس کے جواز میں یہ دلیل پیش کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے والہانہ محبت ہے، وہ کہیں عیسائیوں اور ہندوؤں کے میلوں ٹھیلوں اور تہواروں کی طرح کوئی مشرکانہ صورت اختیار نہ کرلے، اس لئے ہم نے اسے "جلوس" کے رُخ پر ڈال دیا ہے ——— وہلم جراً !

مولانا مودودی نے اپنے اس مضمون میں لکھا ہے :-

"عجیب تر بات یہ ہے کہ ان حضرات کو سارا غم اُس غلاف کا ہے جو لاہور میں تیار ہوا تھا، کراچی میں جو غلاف بنا تھا، نمائش اُس کی بھی ہوئی، اور شہر شہر وہ بھی پھرا، مگر اُس کا ماتم کسی سے نہ سُنا گیا۔"

کراچی میں جو غلاف بنا تھا، اور اُس کی نمائش وجلوس کا اہتمام جن لوگوں نے کیا تھا، اُن سے جو باتیں ظہور میں آئیں، وہ خلافِ توقع نہ تھیں، ان میں تو وہ علماء بھی شامل تھے، جو قبروں کو بوسہ دیتے ہیں اور جن کے یہاں مزاروں پر چڑھانے کے لئے چادروں تک کے جلوس نکلتے رہے ہیں ——— جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی سے اس "نمائش" کی توقع نہ تھی !

ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ غلافِ کعبہ کے جلوس ونمائش میں چونکہ جماعت اسلامی خاصی دخیل تھی، اس لئے یہ جلوس بہت شائستہ اور سنجیدہ رہا، اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی کیا گیا، لوگوں میں دینی جذبہ بھی اُبھرا ——— مگر عرس ومیلاد اور دوسری بدعتوں کی طرح یہ بھی "رسم" بن گیا، تو اس میں طرح طرح کی دینی قباحتوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔

اس سلسلہ میں آخری بات ہمیں یہ عرض کرنی ہے کہ کوئی شک نہیں غلافِ کعبہ کی تیاری اور اُس کے بھجوانے میں حصہ لینا سعادت اور کارِ خیر ہے، مگر اس کے جلوس ونمائش کے مظاہروں سے یہ سعادت مکدر ہو جاتی ہے، اس لئے جماعتِ اسلامی کو آئندہ کے لئے غلافِ کعبہ کے سلسلہ میں جلوس ونمائش کا کوئی اہتمام نہیں کرنا چاہیئے، اس سے اجتناب ضروری ہے۔

——— اور اگر ———

اس کو اس کا اندیشہ ہو کہ مسلمانوں کے شوقِ بے پناہ کی پھر اُسے رعایت کرنی پڑے گی، تو پھر غلافِ کعبہ کی تیاری کی ذمہ داری ہی سرے سے اُسے نہیں لینی چاہیئے !

بدعت ضلالت ہی ہوتی ہے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس مضمون میں "بدعت" پر جو کچھ لکھا ہے، وہ بالکل نیا قسم کا مضمون ہے جو پہلی بار ہمارے سامنے آیا ہے، اُن کے لکھے ہوئے ہزاروں صفحات ہماری نگاہ سے گزرے ہیں، اُن میں کہیں یہ اندازِ تاویل اور اسلوبِ فکر نظر نہیں آیا، مولانا موصوف نے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کا قول پیش فرمایا ہے، جس میں "بدعات" کی قسمیں بیان کی گئی ہیں ! اور بدعت کو "مندوب" اور "مباح" بھی قرار دیا گیا ہے۔

حدیث شریف میں "بدعت" کی کوئی قسم بیان نہیں کی گئی، اُس میں ہر "بدعت" کو "ضلالت" (کل بدعۃ ضلالۃ) قرار دیا گیا ہے۔ پچھلے بزرگوں اور اسلاف واکابر کے یہاں ہر طرح کے خیالات وافکار ملتے ہیں، کتنی بڑی بڑی شخصیتیں ہیں، جنکی بارگاہوں میں "سجدۂ تعظیمی" تک کی رسم جاری تھی ! شیطان کے موحد اور فرعون کے مومن ہونے پر دلیلیں لائی گئی ہیں، اور عقائد واعمال جن سے توحید غبار آلود بلکہ مجروح ہوتی ہے، وہ تک پچھلی کتابوں میں پائے جاتے ہیں، تفاسیر میں بعض ایسی اسرائیلی روایات تک شامل ہو گئی ہیں جن میں

انبیاء کرام کے کردار پر حرف آتا ہو ــــــــ اس لئے کسی مفسر، محدث، فقیہ اور عالم و متکلم کے کسی قول کو حجت میں پیش نہیں کرنا چاہیے اس فن میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی خاص بصیرت رکھتے ہیں کہ اکابر و اسلاف کے اقوال کو کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ کی کسوٹی پر جانچتے اور پرکھتے ہیں، اور جس کسی کا قول اس کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔ اُسے رد کر دیتے ہیں۔

"بدعت" کے بارے میں امام نوویؒ کے مقابلہ میں صحیح بات حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے کہ بدعت میں کسی قسم کا حسن ہو ہی نہیں سکتا، حضرت مجدد صاحب بدعت کی اس تقسیم کو قبول نہیں کرتے بلکہ اس کا رد فرماتے ہیں کہ بدعت سیئہ ہونے کے علاوہ "حسنہ" بھی ہو سکتی ہے! یہ حقیقت بھی ہے کہ جس طرح اندرائن کا پھل کڑوا ہی ہوتا ہے، میٹھا ہو ہی نہیں سکتا، اسی طرح "بدعت" جس شکل میں بھی پائی جائے گی وہ "ضلالت" ہی ہو گی! بدعت میں اور حسن و خیر اور اباحت و استحباب پایا جائے، یہ ناممکن ہے۔

"فاران" کے "توحید نمبر" میں مولانا مودودی کا جو بلند پایہ مقالہ شائع ہوا ہے، اس میں انھوں نے بدعت کی کسی قسم کو "حسنہ" تسلیم نہیں کیا ہے، لکھتے ہیں:-

> "شرعی اصطلاح میں جس چیز کو بدعت کہتے ہیں، اس کی کوئی قسم حسنہ نہیں ہے" بلکہ ہر بدعت سیئہ اور ضلالہ ہی ہے" جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے "کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ"۔

مولانا موصوف نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قول "نعمت البدعۃ" کو بھی اپنے اس تازہ ترین مضمون میں پیش کیا ہے، حالانکہ اس کے بارے میں وہ اب سے چھ سال پہلے یہ فرما چکے ہیں:-

> "۔۔۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نماز تراویح باجماعت کے بارے میں "نعمت البدعۃ ھٰذا" کے الفاظ جو فرمائے تھے، ان میں بدعت سے مراد اصطلاحی بدعت نہیں لغوی بدعت ہی ہو سکتی ہے، اس لئے اسے بدعت کی ایک قسم "حسنہ" قرار دینے کے لئے دلیل نہیں بنایا جا سکتا"۔
>
> (توحید نمبر ــ فاران ۵۷ء)

اس سے ظاہر ہے کہ "تراویح باجماعت" کو بدعت" نہیں کہا جا سکتا (وہ بدعت جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ضلالت" فرمایا ہے) فاران کے "توحید نمبر" میں مولانا مودودی نے خود اس کی تشریح فرمائی ہے:-

> "جہاں تک نفس تراویح کا تعلق ہے، یعنی رمضان میں نمازِ عشا کے بعد قیامِ لیل تو وہ صرف جائز ہی نہیں مندوب اور مسنون ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ترغیب دی ہے، بلکہ دوسرے دنوں کے قیامِ لیل سے زیادہ اہمیت دی ہے اور خود اس پر عمل فرمایا ہے، جہاں تک اس کے جماعت کے ساتھ پڑھنے کا تعلق ہے، اس پر بھی حضورؐ کے زمانہ میں اور حضورؐ کے علم میں عمل ہوا ہے اور آپ نے اسے جائز رکھا ہے، چنانچہ مسند احمد میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ مسجدِ نبویؐ میں مختلف مقامات پر مختلف لوگ رمضان میں رات کے وقت نماز پڑھتے تھے! جس کو جتنا قرآن یاد ہوتا، وہ اتنا ہی پڑھتا۔ اور کسی کے ساتھ ایک، کسی کے ساتھ پانچ کسی کے ساتھ سات یا کم و بیش مقتدی کھڑے ہو جاتے تھے، پھر جہاں تک ایک جماعت میں سب کو جمع کر کے ایک امام کے پیچھے تراویح پڑھانے کا تعلق ہے، اس پر بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کئی مرتبہ عمل فرمایا ہے، ترمذی، ابوداؤد اور دوسری کتب سنن میں حضرت ابوذر رضی اللہ

عنہ ایک رمضان کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ مہینہ ختم ہونے میں سات دن باقی تھے کہ رات کے وقت حضورؐ نے ہم کو نماز پڑھائی، یہاں تک کہ ایک تہائی شب گزر گئی پھر ایک دن چھوڑ کر ایک روز آدھی رات تک پڑھائی، اور اس کے بعد ایک دن چھوڑ کر پھر ایک روز سحری کے وقت تک پڑھاتے رہے۔ بخاری اور مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک روز رمضان کا حال بیان فرماتی ہیں کہ حضورؐ نے دو یا تین دن مسلسل نماز تراویح پڑھائی، پھر تیسرے یا چوتھے روز جب لوگ جمع ہوئے تو آپ نماز پڑھانے کے لئے نہ نکلے، اور بعد میں اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ کہیں یہ فرض نہ قرار دیدی جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ تو مسنون تھا، اب جس چیز کو نئی بات کہا جاسکتا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس طریقہ کو ہمیشہ کے لئے جاری کر دیا، اس چیز کو بدعت اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ حضورؐ نے ہمیشہ جماعت کے ساتھ تراویح نہ پڑھانے کی وجہ صرف یہ بیان فرمائی تھی کہ کہیں یہ لوگوں پر فرض نہ قرار دے دی جائے۔ یہ وجہ خود اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ آپ کے نزدیک یہ رائج ہونا، اور تمام حیثیتوں سے تو پسندیدہ تھا۔ البتہ فرض قرار پا جانے کا اندیشہ اس میں مانع تھا، کہ آپ اسے رائج فرمائیں، حضورؐ کی وفات کے بعد اس اندیشہ کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہی، کیونکہ کسی دوسرے شخص کا عمل کسی چیز کے شریعت میں فرض نہ ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا، اس لئے حضرت عمرؓ نے حضورؐ کے اس منشاء کو پورا کر دیا، جو آپؐ کی اس توجیہ میں مضمر تھا۔ ۔ ۔"

نماز تراویح با جماعت کا قیاس کسی عنوان بھی "غلافِ کعبہ کے جلوس و نمائش" پر نہیں کیا جاسکتا، خود مولانا مودودی نے مستند روایات کے ساتھ اس کی تشریح فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نماز تراویح با جماعت پڑھی گئی ہے اور خود حضورؐ نے بھی یہ نماز پڑھائی ہے ــــــ مگر "غلافِ کعبہ کے جلوس کا نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہتمام کیا اور نہ صحابہ نے! اور نہ اس بارے میں حضورؐ کا کوئی ایما اور اشارہ ملتا ہے، "غلافِ کعبہ کے جلوس و نمائش" پر حضرت عمرؓ کے قول "نعمت البدعۃ" کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا۔

مولانا عامر عثمانی مدیر "تجلی" نے حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول "نعمت البدعۃ" پر تفصیل سے لکھا ہے اُسے پڑھنے کے بعد اس بارے میں کوئی خلجان، خلش اور التباس باقی ہی نہیں رہتا۔ "فاران" کے توحید نمبر میں ان کا یہ مضمون ملاحظہ فرمایا جاسکتا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر ہم یہ کہتے ہیں حضرت عمرؓ کو تو بے شک یہ حق تھا کہ رسول اللہ کے کسی حکم عام میں کسی خاص دلیل سے کوئی استثناء نکال لیں، ان کی دین شناسی، اصابتِ رائے اور تفقہ پر بعض ان کا اسوہ ہی نہیں، بلکہ سب سے مضبوط شہادت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، علاوہ ازیں ان کی "بدعت" کو تمام صحابہ کا بخوشی قبول کر لینا بھی اس بات کی شافی دلیل ہے کہ یہ بدعت شرعی بدعت تھی ہی نہیں، آخر صحابہؓ کے کردار اور کمالِ ایمان سے کون واقف نہیں، وہ دین کے معاملہ میں کیا حضرت عمرؓ سے دب کر خلافِ حق کوئی فیصلہ قبول کر سکتے تھے، ایسا کوئی بے سواد ہی سوچ سکتا ہے ہمارا تو ایمان ہے کہ صحابہ کا جان دے دینا آسان تھا، مگر خلافِ شریعت فیصلہ

پروفیسر سید معین الحق
(ایم۔ اے)

ایک خط

(القاب و آداب) السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ماہ مارچ واپریل کا ماہنامہ "تجلی" آپ کے پاس پہنچ چکا ہوگا اور آپ نے وہ ریمارک پڑھ لئے ہونگے جو مولانا عامر عثمانی صاحب نے میرے خط پر دیئے ہیں مجھے بہرحال افسوس ہے کہ اس خط کو شائع نہ کرکے آپ نے مدیر تجلی کی خفگی و ناراضی مول لی۔ نیز یہ بات سمجھ میں نہ آسکی کہ آپ نے ان کا جواب شائع کرنے سے کیوں گریز کیا؟ اگر ان کا جواب بغیر کسی حاشیہ کے شائع کردیتے تو ہر لحاظ سے مناسب ہوتا۔ "بیجا عقیدت، مفرط محبت، ناواقفیت اور فریب خوردگی" کہ ان عام حالات میں اگر وہ صحیح بات کو واضح فرمادیتے تو اسے تسلیم کرلینے میں کیا تامل ہوسکتا تھا۔ مقصد بہرحال "کج بحثی اور قلم درازی" کا نہ تھا۔ محض اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت مقصد تھی اور یہ کوئی بری بات نہ تھی۔ تقریباً دو سال سے خود مدیر تجلی حضرت امیر معاویہؓ کے موقف کی مضبوطی، ان کے فہم و تدبر کی بے مثالی اور ان کی حق بینی و حق پرستی کی تفصیل پیش فرما رہے ہیں۔ میں نے اس کے برعکس اپنے خط میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ کا موقف صداقت اور صحت پر مبنی ہے۔ یہ بات ہرگز ایسی نہ تھی کہ جس پر اتنی خفگی اور غصہ کا اظہار کیا جاتا اور کچھ الزام دھر کر اور کچھ قلم کا زور صرف کرکے یہ یقین دلانے کی کوشش کی جاتی کہ لامحالہ حضرت علیؓ کا اقدام ظلم پر مبنی تھا اور امیر معاویہؓ کو معزول کرکے انھوں نے مطلق العنانی کا مظاہرہ کیا ہے۔ چونکہ مدیر تجلی کا جواب شائع نہ ہوسکا۔ اس لئے یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ ان دعاوی کی پشت پر وہ کیا عقلی و نقلی دلائل رکھتے ہیں اور میرے اس خط کو جو انھوں نے بناء الفاسد علی الفاسد، کا مجموعہ قرار دیا ہے اس کے پیچھے کون سی حق بینی و حق پرستی کارفرما ہے۔ بہرحال میں چند باتیں قارئین فاران و تجلی کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔

اثر قبول کرنا اور اثر ڈالنا انسان کی جبلت میں داخل ہے اس لئے یہ دعویٰ تو کیا ہی نہیں جاسکتا کہ میں تمام اثرات سے بے نیاز ہوکر باتیں کر رہا ہوں۔ مگر انگریزی تعلیم کا اگر میں کوئی اثر قبول کرتا تو یقیناً وہ اس سے مختلف ہوتا جس کا اظہار میرے خط سے ہورہا ہے۔ عیسائی مورخین و محققین باستثناء چند امیر معاویہؓ کے موقف کے حامی ہیں اور انہیں ایک عظیم مدبر، ایک زبردست سیاست داں اور باعظمت حکمراں تسلیم کرتے ہیں یہ قدرتی بات ہے۔ حضرت علیؓ کو اس سیاست کاری سے دور کا بھی لگاؤ نہیں جس کی تعریف مستشرقین کرسکتے ہوں اور نہ ان کے حلقہ میں دور دور تک کوئی عیسائی نظر آتا ہے۔ لہٰذا حضرت علیؓ کے موقف کی حمایت ان کے بس کی بات نہیں۔ اس کے برعکس امیر معاویہؓ کی سیاسی تنظیم اور ان کا نظم حکومت اپنے اندر قابل لحاظ حد تک بازنطینی خصوصیات رکھتے ہیں۔ مزید برآں ان کے قریبی حلقہ میں عیسائی نظر آتے ہیں جن میں دبیر خاص سرجون اور طبیب خاص ابن آثال خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایسی صورت میں یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ میں نے عیسائی مورخین کا

اثر قبول کیا ہے۔

رہا تشیع کا الزام تو اس کے متعلق مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیعیت چند مخصوص عقائد و تصورات سے عبارت ہے اُس کی کوئی جھلک میرے خیال میں اُس خط میں نہیں پائی جاتی، میں نے صرف یہ کوشش کی ہے کہ حضرت علیؓ کو ان الزامات سے بری ثابت کروں جو اُن پر عائد کئے جاتے رہے ہیں۔ یہ کوشش بہرحال مستحسن ہے۔ جب مدیر تجلی کی رائے کے مطابق امیر معاویہؓ کے ملعون ہونے سے طبقہ صحابہ پر حرف آتا ہے تو حضرت علیؓ کے مجروح ہو جانے سے تو معظم و جلیل القدر اصحاب رسول "السابقون الاولون" (خدا کی پناہ) داغدار نظر آنے لگتے ہیں اس لئے اگر امیر معاویہؓ کی مدافعت جو کا حکم رکھتی ہے تو حضرت علیؓ کی مدافعت بلاشبہ فرض اور اجر عظیم کی ضامن ہونی چاہیئے۔ یہ ایک ظاہر اور تسلیم شدہ بات ہے کہ حضرت علیؓ ایک ایسی سیرت کے مالک ہیں جس کی پیروی بلا تذبذب کی جا سکتی ہے۔ آپ کا نقش قدم صراط مستقیم کی طرف راہنما، آپ کی محبت مسلم قوم کے درمیان اتحاد کا ایک وسیلہ اور آپ کی ذات فیضان کا سرچشمہ ہے۔ پھر تاریخی و عقلی دلائل بھی پوری طاقت کے ساتھ اُس مقام کی حمایت کر رہے ہیں جو تاریخ اسلام نے آپ کو عطا کیا ہے۔ ایسی صورت میں یہ بات بہت ہی مضحکہ خیز ہو جاتی ہے کہ امیر معاویہؓ کی حمایت کرنے والے پر کسی طرح کا الزام لگانے کے بجائے اُس شخص کو شیعی انداز فکر کا طعنہ دیا جائے جس نے خلیفہ راشد کے موقف کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ منطق کچھ سمجھ میں نہ آسکی کہ تجاوز کا الزام لامحالہ حضرت علیؓ کے سر کیوں ڈال دیا جائے اور قلم کے زور سے ڈال ہی دیا جائے تو پھر اُن احادیث صحیحہ کا کیا بنے گا جو آپ کی عظمت و جلالت کو پوری تابانی کے ساتھ واضح کر رہی ہیں؟

مدیر تجلی نے اس بات کا گلہ کیا ہے کہ مکتوب میں ٹھوس اور اصولی باتیں نہیں ہیں اگر ہوتیں تو ممکن تھا اُن پر گفتگو کی جاتی۔ حالانکہ میں نے تو اصولی طور پر سب سے پہلے استقلال خلافت کا ہی مسئلہ چھیڑا تھا اور میرے خیال میں اسی مسئلہ کی وضاحت پر دوسرے تمام اقدامات کی صحت یا عدم صحت کا دار و مدار ہے۔ اگر اس سے بھی مقدم کوئی اصولی بات تھی تو نا چیز اُسے رہنمائی کے بغیر سمجھنے سے قاصر ہے۔

مدیر تجلی نے یہ شکایت بھی کی ہے کہ مکتوب میں نہ قرآنی محکمات کا کہیں تذکرہ ہے نہ بخاری و مسلم کی روایات کا۔ نہ کسی فقیہ و مجتہد سے میں نے استشہاد کیا ہے اور نہ مستند مآخذ سے۔ معلوم نہیں یہ تحریر فرما کر وہ کیا فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اس کا مقصد میرے خط کو بے وقعت ثابت کرنا ہے تو مجھے اُس کے وقیع ہونے پر کوئی اصرار نہیں۔ ویسے ہر شخص کو معلوم ہے کہ نزول وحی کا سلسلہ بہت پہلے منقطع ہو چکا تھا اس لئے قرآن مجید میں کوئی ایسی آیت تلاش نہیں کی جا سکتی جو براہِ راست زیر بحث قضیہ سے متعلق ہو۔ رہی یہ صورت کہ اُن واقعات کو مقدمات کی شکل میں پیش کر کے قرآنی محکمات سے فیصلے حاصل کئے جائیں تو میرے خیال میں یہ راہ بڑی خطرناک ہے اور اب تو یہ صورت ممکن بھی نہ رہی اس لئے کہ مقدمات لامحالہ تاریخی روایات پر مبنی ہونگے اور جب وہ خود مجروح شکستہ اور غیر مستند ہیں تو انہیں پیش کر کے آخر فیصلہ حاصل کرنے کی کون جسارت کرے گا؟ کم از کم مدیر تجلی کے لئے تو یہ راہ یقینی بند ہو چکی ہے۔ ا۔ مجھے تو قرآنی محکمات والی بات دیکھ کر بے ساختہ واقعہ صفین یاد آگیا ۔۔۔۔۔۔

احادیث کی بھی تقریباً یہی صورت ہے، چند احادیث جو زیر بحث واقعات پر روشنی ڈالتی ہیں اُنکو دوسرے

حضرات پیش کرچکے ہیں اور اُن تک سے ایک حدیث " تقتلک الفئۃ الباغیۃ " کی تاویل مدیر تجلی پیش فرما رہے ہیں۔ فقہا اور مجتہدین سے بھی دوسرے لوگوں نے استشہاد کیا ہے مگر جب مدیر تجلی نے حضرت امام ابوحنیفہ کی رائے کو یہ کہہ کر رد کیا کہ تاریخ میں اُن کا کوئی مقام نہیں ہے تو مجھے خیال ہوا تھا کہ وہ اس سلسلہ میں تاریخی روایات کو قبول کریں گے اس لئے فقہا و مجتہدین کے اقوال سے استشہاد نہ کرتے ہوئے میں نے اپنی بحث کے لئے تاریخ کو بنیاد بنایا تھا۔ مگر اب جبکہ اُنھوں نے طبری، مسعودی، سیوطیؒ اور ابن قتیبہ وغیرہم کو قابل استناد نہیں سمجھا ہے تو ظاہر ہے کہ جب تک وہ خود نہ بتائیں یہ معلوم کرلینا آسان نہیں کہ اُن کے علم کا آخر ذریعہ کیا ہے اور مستند ماخذ سے اُن کی کیا مُراد ہے؟ میں نے ابن سعد اور ابن اثیر کے حوالے بھی دیئے تھے۔ خاص طور پر حضرت سعدؓ ابن وقاص کی بیعت کے سلسلہ میں ابن سعد ہی کی شہادت پیش کی تھی۔ معلوم نہیں ان دونوں کے متعلق وہ کیا رائے رکھتے ہیں؟

مدیر تجلی نے فرمایا ہے کہ امیر معاویہؓ نے قاتلین عثمانؓ کے ذریات تک کو تحت الثریٰ میں پہنچا کے چھوڑا۔ معلوم نہیں انہیں یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی اور ذریات سے اُن کی کیا مراد ہے؟ ممکن ہے اُن کا اشارہ حضرت حجرؓ اور اُن کے ساتھیوں کی طرف ہو جنہیں امیر معاویہؓ نے قتل کی سزا دی تھی اور جن کی رہائی کے لئے حضرت عائشہؓ نے قاصد دوڑائے تھے۔ یا ممکن ہے اُن کا اشارہ خوارج کی طرف ہو۔ اگر اس طرف ہے تو اس کا کریڈٹ بھی حضرت علیؓ کو ملے گا جنھوں نے نہروان کی جنگ میں اُن کی طاقت کو کچھ اس طرح پامال اور منتشر کیا کہ ایک عرصہ تک وہ سنبھل نہ سکے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو عہد معاویہؓ کی امن وسکینت کی تاریخ ہی مختلف ہوگئی ہوتی اور یہ واحد خصوصیت بھی کہیں نظر نہ آتی۔ نیز قتل و قید کے واقعات سے یہ نتیجہ کس طرح برآمد کیا جاسکتا کہ قیدی اور مقتولین قاتلین عثمانؓ کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور کس عدالتی کارروائی کے ذریعہ انہیں مجرم قرار دیا گیا تھا؟ اور اس کا علم مدیر تجلی کو کس طرح ہوا؟ ایسی بے سروپا باتوں کے لکھنے کا کیا فائدہ کہ آیت قرآنی کو رہنما بنا کر اُن تمام افراد کی گوشمالی وسرکوبی کرڈالی جو فتنہ وانتشار کے بانی مبانی تھے۔" (صفحہ ۸۶) اور انھوں نے جو یہ تحریر فرمایا کہ اُن کا عزم وحوصلہ اور تدبر کار فرمائی نہ کرتا ۔۔۔۔۔۔۔ منہ کے بل آرہتی"۔ تو اس کے جواب میں حضرت حسن بصریؒ کے اقوال نقل کردیتا ہوں "۔ معاویہؓ نے چار باتیں ایسی کیں کہ اُن میں سے ایک بھی ہوتی تو نامناسب تھی (۱) اُمت پر جاہلوں کو مسلط کیا (۲) شراب خوار بیٹے کو ولی عہد مقرر کیا۔ (۳) زیاد کو اپنے خاندان میں شریک کیا۔ (۴) حجر ابن عدی کو قتل کیا" (طبری وابن اثیر) اور اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو اسلام میں تاقیامت خلافت رہتی (سیوطی)

مدیر تجلی نے ایک جگہ میرے مبلغ علم کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ بات تو صحیح ہے کہ میرا مطالعہ بہت ہی محدود ہے اور میرے علم کی کوئی گہرائی نہیں جسے ناپنے کی کوشش کی جائے مگر جس موقع پر یہ کوشش کی گئی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ میرا خط شائع ہوچکا ہے اور ماہِ جنوری کے فاران میں دیکھا جاسکتا ہے۔ میں نے تو ایک مفروضہ قائم کرکے یہ بات کہی تھی کہ اگر اسی طرح تحقیقی مقالے پیش کئے جاتے رہے اور مولانا عامر جیسی شخصیتوں کی طرف سے اُسے داد تحقیق ملتی رہی تو کل ایک محقق ایسا پیدا ہوگا جو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے گا کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت انتہائی حد تک نامقبول تھی اور جو شورشیں برپا ہوئیں اور بغاوتیں پھوٹ پڑیں وہ اسلام کے خلاف نہیں بلکہ خلافت صدیقؓ کے خلاف تھیں۔ اس کے ثبوت میں وہ یہ بھی لکھے گا کہ حضرت علیؓ نے حضرت صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت

نہیں کی اور تاریخ کے حوالے بھی پیش کرے گا۔ اگر یہ کہا جائے گا کہ آپ نے قدرے تاخیر سے بیعت کر لی تھی تو وہ جواب دیگا کہ جب کوششیں ناکام ہو گئیں تو مجبوراً انہیں بیعت کرنی پڑی۔ ظاہر ہے کہ جب حضرت زبیر رضؓ و طلحہ رضؓ کے متعلق یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان سے تلوار کی نوک پر بیعت لی گئی تو یہی بات حضرت علی رضؓ کے متعلق کیوں نہیں کہی جا سکتی؟ میں اپنی حد تک تو ان دونوں باتوں ہی کو رد کرتا ہوں اور تاریخی روایات ہی کی بنیاد پر یہ رائے رکھتا ہوں کہ حضرت علی رضؓ نے حضرت ابوبکر رضؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے میں تاخیر نہیں کی اور نہ یہ صحیح سمجھتا ہوں کہ حضرت طلحہ رضؓ و زبیر رضؓ سے تلوار کی نوک پر بیعت لی گئی۔

مدیر تجلی نے امیر معاویہؓ اور اُس جماعت کے موقف کے درمیان جو قصاص کا مطالبہ لے کر اٹھی تھی۔ ہم آہنگی پیدا کر کے واقعات کو الجھانے کی کوشش کی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ انصار و مہاجرین کی کسی ایسی جماعت کا علم تاریخ کے کسی ہوش مند طالب علم کو نہیں جس نے حضرت علی رضؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کیا ہو۔ دوسری بات یہ کہ اگر دونوں کے موقف کے درمیان ایسی ہی ہم آہنگی تھی اور امیر معاویہؓ کا مقصد بھی محض قصاص تھا تو ایک نے دوسرے کا تعاون حاصل کیوں نہیں کیا؟ بلکہ ایک قدم بھی اس کی جانب نہیں اٹھایا گیا؟ یہاں تک کہ سرے سے گفت و شنید ہی کو کیوں نظر انداز کیا گیا؟ کیا ایک کو دوسرے کے موقف کا علم نہ تھا؟ یا کچھ اور بات تھی؟ اس کی وضاحت ہونی چاہیئے تھی۔ ایسی وضاحت کے بغیر دونوں کو ایک مقام پر کھڑا کر دینا اپنے موقف کے لئے کمزور سہارا تلاش کرنا ہے۔

حضرت طلحہ رضؓ اور حضرت زبیر رضؓ اور حضرت سعد رضؓ کے عمل سے سند لی جا سکتی ہے اور ان کی بیعت اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت قائم ہو چکی تھی۔ اُن کے مطالبۂ قصاص اور امیر معاویہؓ کے انکار بیعت کو ایک ہی معنی نہیں پہنائے جا سکتے۔ حضرت سعد رضؓ کی بیعت سے متعلق مدیر تجلی نے لکھا ہے کہ یہ غلط بیانی ہے (یعنی انھوں نے بیعت نہیں کی) نہیں معلوم ان کے علم کا ماخذ یا ذریعہ کیا ہے؟ اگر کوئی اونچی کتاب ہے تو فراخ دلی سے اس کا نام بتا دینا چاہیئے تھا دوسرا بھی وہاں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا اور اگر اس کی اونچائی بھی بتا دیتے تو اور بھی مناسب بات ہوتی۔

مُدیر تجلی نے جنگ میں پہل اور اقدام کا الزام حضرت علی رضؓ پر عائد کیا ہے۔ یہی وہ الزام ہے جس کی میں نے بااصرار تکذیب و تردید کی ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ امیر معاویہؓ نے معزولی کا حکم پہنچنے سے پہلے ہی جنگ کی تیاری شروع کر دی تھی اس کے لئے ثبوت پیش کرنا کسی مورخ کو کباڑیئے کا خطاب عطا کرنا ہے۔ لہٰذا جب وہ مستند ماخذ کی تفصیل پیش فرمائیں گے تو ثبوت انشا ءاللہ فراہم کر دیا جائے گا۔ یہ تو خیر بعد کی بات ہے۔ ... تو ان کے اس جملہ پر ہے کہ اقدام کرنے والا وہ ہے جو لشکر کو آگے بڑھا لائے" پہل کرنے والے کی یہ تعریف خوب ہی۔ خدا کی پناہ اس تعریف کے تحت تو حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کا یمامہ پر حملہ اقدام قرار پائے گا۔ یہاں مسلم اور غیر مسلم کا فرق قائم کر کے جارحیت کی تعریف کو بدلنا دشوار ہو جائے گا۔ لامحالہ اس سے بچنے کے لئے جو دلیل مدیر تجلی ... وہی اس قضیہ سے متعلق پیش کر کے امیر معاویہؓ کو پہل کرنے والا قرار دیا جا سکے گا۔ مزید عہد عثمانؓ کو قطعاً نظر انداز کر کے حضرت علی رضؓ کے اقدام پر رائے زنی کرنا ذمہ داری کی بات نہیں۔ گفتگو کچھ اس انداز میں کی جا رہی ہے گویا پہلے ایک خلا تھا۔ اچانک حضرت علیؓ امیر معاویہؓ اور قاتلین عثمانؓ وغیرہ اسٹیج پر آتے ہیں اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے اس پر فیصلہ دیا جا رہا ہے۔ یہ کیا بے تکی بات ہوئی؟ گویا ہر طرف امن و امان تھا۔ حضرت عثمانؓ کی حکمت عملی اور ان کے عمال کے خلاف کوئی شکایت

نہ تھی۔ بستر پر آپ کی موت واقع ہوئی تھی۔ امیر معاویہؓ دمشق میں مطمئن بیٹھے تھے۔ ایسی حالت میں حضرت علیؓ نے عثمانی والیوں کے خلاف اتنا سخت قدم اٹھایا اور انتشار کو خود سے دعوت دیدی۔ ان معاملات پر رائے زنی سے پہلے یہ بات کیوں نظر انداز کردی جاتی ہے کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت آخر عہد میں فتنہ وفساد سے دوچار ہوئی۔ نظامِ حکومت کی گرفت ڈھیلی پڑگئی خود خلیفہ کے خلاف انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھا یہاں تک باغیوں نے آپ کے گھر کا محاصرہ کرکے آپ کو شہید کردیا۔ ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اور آپ کی شہادت کے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے حضرت علیؓ نے جو کچھ کیا اُس پر رائے زنی کرنی چاہیئے۔ والیوں کی معزولی کے سلسلہ میں ایک عجیب بات مدیر تجلی نے لکھی ہو کہ "بعض کے عزل ونصب پر تو ایک برسات بھی نہ گزری تھی"۔ (ص۸۸) میں نے تو عہد فاروقؓ کے اُن افسروں کے نام دیدیئے تھے جنہیں حضرت عثمانؓ نے معزول کیا۔ اُن میں حضرت سعدؓ ابن وقاصؓ حضرت عمرو بن العاصؓ۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ہیں۔ ان پر تو کتنی برساتیں گزر چکی تھیں اور ان کے کارنامے تو اتنے درخشاں ہیں جن کی وضاحت کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر ان میں سے کس کے خلاف وہاں کے باشندوں نے احتجاج کیا تھا؟۔ میں نے ولید ابن عقبہ کا تذکرہ نہیں کیا تھا جس پر شراب خوری کا الزام ثابت ہوا اور حد جاری کی گئی اور نہ سعد بن العاص کا نام لیا تھا جس کے خلاف لوگوں نے احتجاج کیا تھا۔ امیر معاویہؓ کی بیس سالہ گورنری اس بات کے لئے کوئی جواز فراہم نہیں کرتی کہ انہیں اس عہدہ پر بحال رہنا چاہیئے تھا اس کے برعکس اُن کے عزل کو انتہائی ضروری اور لازمی بنادیتی ہے۔ اُنھوں نے اس طویل گورنری کے زمانہ میں کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا تھا۔ ہاں امراء کا ایک طبقہ پیدا کرکے ملوکیت کی گاڑی کو چلانے کا سامان ضرور جمع کرلیا تھا۔ ملازمت کی یہ طویل مدت ہی تھی جس کی بنا پر اُنھوں نے قصاص کا مطالبہ کیا۔ اگر اہلِ شام حضرت علیؓ سے واقف ہوتے، یا صورتِ حال کا اُنہیں صحیح علم ہوتا ساتھ ہی اُن کا سیاسی مفاد خاندان بنو اُمیہ سے وابستہ نہ ہوتا یا امیر معاویہؓ ہی کہیں دوسری جگہ ہوتے تو تاریخ میں اُن کی طرف سے قصاص کی کوئی پکار سُنائی نہ دیتی۔ ممکن تھا ولی بننے کی ذمہ داری حضرت عثمانؓ کے حقیقی وارث آپ کے بیٹوں ہی پر ڈالدی جاتی اور وہ خلافت سے قصاص کا مطالبہ کرتے۔ بہرحال ان تمام باتوں کو اور خود امیر معاویہؓ کے سیاسی مفاد کو قصداً نظرانداز کرکے جو اس قضیہ ہی سے وابستہ تھے۔ ایسی رائے دینا کہ اُن کا موقف طلب قصاص کے سوا کچھ نہ تھا"۔ (ص ۶۳) انصاف پر مبنی نہیں۔

میں نے اپنے مکتوب میں مدیر تجلی سے یہ بات دریافت کی تھی کہ اُنہیں امیر معاویہؓ کی عظمت وفضیلت سے متعلق کیا شہادتیں دستیاب ہوئی ہیں جن کی بنا پر وہ اُنہیں جلیل القدر، مقتدر، عظیم المرتبت اور حلم وتدبر کے پیکر کہتے ہیں۔ مفسرین نے بعض آیات کی تفسیر میں یہ بات لکھی ہے کہ یہ فلاں موقع پر نازل ہوئی اور فلاں صحابی کے فلاں واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ میرا مقصد یہ تھا کہ کم از کم اس طور پر بھی کہیں امیر معاویہؓ کا ذکر آیا ہے؟ یا بخاری ومسلم میں ایسی کوئی حدیث ملتی ہے؟ یا کوئی باب مناقب موجود ہے؟ ظاہر ہے کہ جب مقتدر اصحاب رسول کا ذکر ہو اور وہاں اُن کے مقابلہ میں فضیلت کے یہ جملے امیر معاویہؓ کے لئے استعمال کئے جائیں تو یقیناً یہ سوال کیا جائے گا کہ اُن کی جلالت قدر کے آخر ثبوت کیا ہیں؟ یہ برہم ہونے کی نہیں تحقیق کی بات ہے۔ اور میں نے یہ کوئی نئی بات بھی نہیں کہی۔ امام نسائیؒ سے متعلق یہ واقعہ ملتا ہے کہ جب وہ دمشق تشریف لے گئے تو اہل شام نے اُن سے امیر معاویہؓ کے

فضائل دریافت کئے انھوں نے جواب دیا، میں اُن کی کسی فضیلت سے واقف نہیں ہوں۔ اس پر لوگوں نے امام نسائیؒ کو بُری طرح زد و کوب کیا۔

خط طویل ہو چکا ہے اس لئے معافی کے ساتھ اسے ختم کرتا ہوں۔ اگر مناسب سمجھیں تو فاران میں اسے شائع کر دیں۔

فاران

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، مولانا عامر عثمانی مدیر "تجلّی" نے مجھے کوئی خط پروفیسر سید عین الحق صاحب کے مضمون کے جواب میں نہیں بھیجا تھا، بلکہ مجھے لکھا تھا کہ میں اس کا جواب "فاران" میں چھپوانا چاہتا ہوں۔ میں نے اُن کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ وہی باتیں اپنے خط میں لکھیں گے، جواب تک لکھتے رہے ہیں۔ مجھے آپ کے خط پر جا بجا اختلافی نوٹ دینا پڑیں گے ــــــــ!

میں نے تو مولانا عامر عثمانی کو بارہا خطوں میں لکھا ہے کہ میرے اور اُن کے درمیان نقطۂ اختلاف یہ ہے کہ عامر صاحب نے محمود احمد عباسی کی اُس کتاب کی حمایت، تائید، تحسین، تصویب اور اشاعت کی ہے، جو ہر اعتبار سے ناپسندیدہ کتاب ہے! اس میں تاریخی حوالوں کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے، احادیث اور تاریخ کی کتابوں پر اس انداز میں تنقید کی گئی ہے، جیسے یہ معاذاللہ تمام تر غلط بیانیوں سے لبریز ہیں! پوری کتاب کا رنگ یہ ہے کہ حضرت علیؓ کو امیر معاویہؓ کے مقابلہ میں غلط کار ٹھیرانے اور یزید کے مقابلہ میں حضرت حسینؓ کے موقف کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے! یہ وہ موقف ہے جو جمہور امت کے بالکل خلاف اختیار کیا گیا ہے، جس کی تائید نہیں کی جا سکتی، اور مولانا عامر عثمانی ابھی تک اسی غلط اور شاذ موقف کی تائید کئے جا رہے ہیں۔

بندہ بشر ہے، اُس سے کسی چیز کے جانچنے اور پرکھنے میں غلطی بھی ہو جاتی ہے اور اُس پر ذہول بھی طاری ہو جاتا ہے، مولانا عامر عثمانی پر بھی اس کتاب کی تائید کے سلسلہ میں فرض کر لیجئے ذہول طاری ہو گیا تھا ــــــ مگر حیرت اس پر ہے کہ سنجیدہ علمی حلقوں سے اس کتاب پر نقد و جرح ہونے کے بعد بھی وہ نہ صرف اپنے موقف پر جمے رہے بلکہ اس بدنام کتاب کی تائید و تحسین میں اور زیادہ سرگرمی دکھلانے لگے! مجھ تک یہ روایت پہونچی ہے کہ عامر صاحب کے والد ماجد حضرت مولانا مطلوب الرحمٰن مرحوم و مغفور نے اس کتاب کی تائید سے انھیں روکا تھا، اور یہاں تک کہا تھا کہ اس کتاب کی تائید کرتے کرتے تم میں اموییت پیدا ہو جائے گی، اُن کی پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی!

اس کتاب کی اشاعت سے کئی سال پہلے سے ماہنامہ "تجلّی" شائع ہو رہا تھا، اگر یہ مسائل مولانا عامر صاحب کے ذہن میں تھے تو اُن پر انہیں ضرور لکھنا چاہیئے تھا، لیکن افسوس یہ ہے کہ محمود عباسی کی کتاب سے متاثر ہو کر انھوں نے یہ موقف اختیار فرمایا، اور یہی چیز "فساد" کی اصل جڑ ہے! یعنی اُن کے افکار و جذبات کا محرک ایک "مغلط عامل" ہے! اس لئے اس "ٹیڑھی اینٹ" پر جو دیوار اٹھی ہے، وہ بھی ٹیڑھی ہے اور جتنی وہ اونچی ہوتی گئی ہے، اُس میں کجی پیدا ہوتی چلی گئی ہے۔

کراچی میں مولانا عامر کے سامنے وہ لوگ بھی پیش ہوئے، جن کے رُوبرو محمود عباسی نے حضرت علی کرم اللہ وجہ اور حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شان میں نازیبا کلمات کہے تھے، جس شخص کی فطرت میں ناصبیت شامل ہو، اُس کی زبان و قلم سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ علیؓ اور اولادِ علیؓ کے معاملہ میں حق و انصاف سے کام لے گا، اُس کی تو ساری کوششیں اسی میں صرف ہوں گی کہ یہ حضرات مطعون ہوں اور عزت و شرف کی تمام خصوصیات ان کے حریفوں کے حصہ میں آئیں ــــــــــ

چنانچہ محمود عباسی نے اپنی کتاب میں اس ناصبی ذہنیت کا پورا پورا مظاہرہ کیا ہے، اور مولانا عامر عثمانی عباسی صاحب کی مدح سرائی کرتے کرتے اس سطح پر آ گئے ہیں کہ حضرت علیؓ ان کی نگاہ میں معاذاللہ غلط کار ہیں اور امیر معاویہؓ حق پر ہیں ــــ اس کتاب کی

تائید و تحسین کا یہی نتیجہ ظہور میں آنا چاہیئے تھا، جو آ کر رہا۔

اس بدنام کتاب کی دونوں جلدیں مکتبہ تجلی سے فروخت ہو رہی ہیں، جلی اور نمایاں انداز میں اس کے اشتہارات "تجلی" میں آتے ہیں اور اس کتاب کی تائید و تحسین میں کسی ایک آدھ رسالہ میں کوئی عبارت نظر آجاتی ہے، تو وہ رسالہ "تجلی" میں نقل فرمائی جاتی ہے ——— اس ناپسندیدہ کتاب کے چمکانے اور اس غلط مسلک کو فروغ دینے میں سب سے زیادہ نمایاں حصہ مدیر تجلی نے لیا ہے! اس کتاب کی محبت ان کے دل و دماغ میں اتنی رچ بس گئی ہے کہ شاید اب ان کے بس کی بات ہی نہیں رہی کہ وہ اپنے قلم کو روک سکیں ان کی اس روش سے اُن کے مخلص دوستوں اور قدرشناسوں کو بڑا دکھ ہوتا ہے کہ صراط مستقیم کا شہسوار، ان بھول بھلیوں میں کہاں پھنس گیا ؟!

پاکستان اور ہندوستان کے علماء کی بہت سی کتابیں ہم نے پڑھی ہیں ان کی تقریریں ہم نے سنی ہیں، وہ نہ جمل و صفین کا ذکر چھیڑا کرتے تھے اور نہ اب چھیڑتے ہیں، اور نہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر تنقید کرتے ہیں، حضرت علی کرم اللہ وجہ کی مدح کے ساتھ امیر معاویہؓ کے موقف کو وہ بیان ہی نہیں کیا کرتے۔ مشاجرت صحابہؓ سے وہ دانستہ گریز کرتے رہے ہیں۔

مگر

محمود عباسی کی اس کتاب نے امیر معاویہؓ کی شخصیت پر زبانِ تنقید کھلوائی ہے؟ ایسا ہونا ہی چاہیئے تھا، جب حضرت علی کرم اللہ وجہ کو "غلط کار" قرار دیا جائے گا، تو اس کے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں کہ یا تو ان کو معاذ اللہ "غلط کار" مان لیا جائے، یا پھر اُن کے حریف کو غلط کار تسلیم کیا جائے ——— تو اس بدنام کتاب کے مصنف نے یہ کتاب لکھ کر امیر معاویہؓ کے حق میں کسی دانشمندی اور خیر خواہی کا ثبوت نہیں دیا بلکہ اسکا موقع فراہم کر دیا کہ حضرت علیؓ سے امیر معاویہؓ کے فضائل و اوصاف کا تقابل کیا جائے، اور ظاہر ہے کہ امیر معاویہؓ حق و صداقت کے اس کوہ بلند و گراں کے مقابلہ میں سبک و پست ہی نظر آئیں گے ——— اور جو کوئی فضائل و کمالات کی اس ترتیب کو اُلٹنے کی کوشش کرے گا، وہ قدم قدم پر حق ناشناسی جہل و نادانی، ہٹ دھرمی اور دھاندلی کا ثبوت دیگا!

ایک طرف علیؓ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ ہیں، بعثت نبوی سے لیکر وفات تک حضورؐ کے ساتھ رہتے ہیں، اور ساتھ بھی کیسا دن رات کا ساتھ! جنگ ہو، صلح ہو، نماز ہو، مسجد کی تعمیر ہو، وفود کی باریابی ہو، غرض ہر موقعہ پر علیؓ حضورؐ کے ساتھ نظر آتے ہیں! علیؓ کے دینی کاموں کی حضورؐ نے کس قدر تحسین فرمائی ہے! کافروں کے ساتھ کتنی جنگیں ہیں جن کا پانسہ اسداللہ کی شجاعت نے پلٹا ہے! زہد و عبادت، فقر و بے نفسی، خداترسی اور للہیت تو علیؓ کے نام سے پہچانی جاتی ہیں — "فقرِ بوتراب" اسلامی ادب میں ضرب المثل بن کر رہ گیا ہے، حضورؐ کی چہیتی بیٹی فاطمۃ الزہراؓ کے شوہر، حسنؓ و حسینؓ کے باپ، اُن کے جن کے لبوں کو حضورؐ چومتے تھے، اور جن کو دوشِ مبارک پر چڑھا کر سرکار قلبی مسرت محسوس فرماتے تھے! علیؓ ——— رضی اللہ عنہ و کرم اللہ وجہ ——— شیخین کے مشیر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفۂ راشد! زمامِ خلافت ہاتھ میں آئی، تو بھی اپنی وضع کو نہ بدلا وہی نانِ شعیر اور پیوند لگی ہوئی عبا! دین کے معاملہ میں بصیرت کا یہ حال کہ اُن سے بہتر اسلامی تاریخ میں کوئی "قاضی" نہیں گزرا۔

دوسری طرف امیرِ معاویہؓ ہیں، فتح مکہ کے وقت ایمان لائے ہیں، جن صحابہ کرام کو حضورؐ کی خاص طور پر معیت کا شرف حاصل تھا، اُن میں معاویہؓ کا نام نظر نہیں آتا، اُن کے علم و فضل اور زہد و عبادت کی کوئی خاص اور نمایاں شہرت نہیں ہے! گورنر ہوتے ہیں تو عمر فاروقؓ انہیں "کسرائے عرب" کے لقب سے یاد کرتے ہیں، خلیفہ راشد علی کرم اللہ وجہ انہیں معزول کرتے

ہیں تو اُن کا حکم نہیں مانتے، صُلح و جنگ کے موقعے آتے ہیں تو اُن کے یہاں "سیاسی تدبیر" (ڈپلومیسی) نظر آتی ہے۔ اپنے جیتے جی بیٹے کو ولی عہد بنا کر خلافت اور شوریٰ کی جگہ ملوکیت کی بنیاد قائم فرماتے ہیں، رہنے سہنے کا انداز امیرانہ بلکہ شاہانہ ہے، فقر کی تو پرچھائیں بھی شاید اُن پر نہیں پڑی ہی!

ان دو کرداروں اور دو شخصیتوں ———

میں خلافت و حکومت کے لئے نزاع و کشمکش تاریخ میں ملتی ہے ——— تو یہ چیز کہ ملک و جاہ کی کس کے دل میں تمنا ہو سکتی ہے، اس کا فیصلہ کس کے حق میں ہو گا؟ یہ بات جس کسی کی سمجھ میں آجائے گی وہ امیرِ معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہ کے موقف کو حق و صواب پر سمجھے گا۔ اور یہی جمہورِ اُمت کا فیصلہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کا شرفِ صحابیت اپنی جگہ مُسلّم مگر علیؓ کے مقابلہ میں وہ غلطی پر تھے! اب رہے سیدنا حسینؓ اور یزید اُن کے درمیان تو فضل و شرف کی وہ نسبت بھی نہیں ہے جو علیؓ اور معاویہؓ کے درمیان پائی جاتی ہے۔

ہم حضرت علی کرم اللہ وجہ کو حق پر اور امیرِ معاویہؓ کو غلطی پر مانتے ہوئے امیرِ معاویہؓ کا احترام کرتے ہیں اور شرفِ صحابیت کے سبب اُن کے لئے محبت کا گوشہ اپنے اندر رکھتے ہیں ——— لیکن یزید کے لئے ہمارے دل میں احترام و محبت کا کوئی گوشہ موجود نہیں ہے، اس شخص کا نام سُن کر طبیعت میں کراہت اور وحشت پیدا ہوتی ہے، اس کے مقابلہ میں حضرت حسینؓ کا نام نامی سُن کر دل درود پڑھنے لگتا ہے، اور ہم اس پر فخر و ناز کرتے ہیں کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محبوب ہے، وہ ہمارا بھی محبوب ہے!

———— × ————

(بقیہ مضمون صفحہ ۱ سے آگے)

کو بخوشی قبول کر لینا ممکن نہ تھا۔۔۔۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:-

علیکم بسنتی وسنتہ الخلفاء الراشدین المھدیین۔

اس لئے خلفائے راشدین کی سُنت بھی درحقیقت سُنتِ رسولؐ ہی کی ترجمانی اور نمائندگی کرتی ہے، اُن کے کسی قول و عمل پر جسے اجماعِ صحابہ کی تائید بھی حاصل ہو۔ چاہے وہ دیکھنے میں نیا "نظر آئے" "بدعت" کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ "بدعت" میں نہ حسن ہے اور نہ پاکیزگی ہے، اور نہ یہ اُمت کے لئے سببِ خیر بن سکتی ہے، بدعت سے اور ایسی نئی باتوں سے جو بدعات سے ملتی جلتی ہیں، مسلمانوں کو اجتناب ہی کرنا چاہیئے! کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ پوری نیک نیتی کے ساتھ کسی "نئے کام" کے بارے میں جو احداث یا بدعت سے مشابہ ہوتا ہے، اہلِ علم کے اجتہاد میں غلطی ہو جاتی ہے۔ یہ غلطی جب واضح ہو جائے تو پھر غلطی پر اصرار اور اس کی تاویل نہیں کرنی چاہیئے!

———— × ————

از :- ڈاکٹر لطف علی صورتگر
(پی۔ ایچ۔ ڈی۔ لندن)
ترجمہ :- شہپر نیازی

اسلامی مملکت
اور مغربی دُنیا پر ایران کا اثر

اسلامی دنیا میں قرون وسطیٰ درحقیقت جاگیرداری اور طوائف الملوکی کا دور تھا اس لئے کہ مختلف صوبوں کے والی GOVERNORS
اگرچہ اصولی طور پر خلافتِ بغداد کے مقررہ اور محکوم ہوتے تھے لیکن عملی طور پر وہ خود مختار حکمراں تھے اور بسا اوقات یہ حکمرانی وراثت بن
جاتی تھی۔ یہ خود مختار حکمراں علما اور تاجروں کی سرپرستی کرنے میں ایک دُوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ ان کی
داد و دہش کا شور دُور دُور تک پہنچا تھا اور اسی وجہ سے شاعر اور عُلماء قسمت آزمائی کے لئے اُن کے درباروں کی طرف سمٹ آتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ
ایرانی علماء و فضلاء جن کو یا تو وزیر کی ناراضگی کا مسئلہ درپیش ہوتا یا علم و فضل کی خاطر خواہ قدر و منزلت نہ ہونے کا دکھ۔ وہ عموماً کہیں اور
جاکر قسمت آزمائی کے گرویدہ رہتے تھے۔

عہدِ عباسی میں بہت سے ایرانی عالم اپنے ملک میں حالات کو ناسازگار پاکر مصر، مراقش اور اندلس جاکر آباد ہوگئے تھے جہاں،
عباسیوں کے بمقابل مصر میں فاطمی اور اندلس میں اموی حکومتیں قائم تھیں۔ نویں صدی کے آخر میں محمد بن موسیٰ الکنانی الرازی جو رے
کے باشندہ تھے بغرض تجارت اُندلس گئے اور چونکہ عربی ثقافت میں ایک بڑا درجہ رکھتے تھے اس لئے ان کو پڑھے لکھے طبقہ میں ہاتھوں ہاتھ
لیا گیا اور امیر محمد بن عبدالرحمان نے ان کو اندلس اور مشرقی ممالک جانے وغیرہ کے سلسلہ میں اہم خدمات سُپرد کردیں۔ ان کے لڑکے احمد
بن محمد (۸۸۷ء - ۹۵۵ء) نے بحیثیت مورخ اور "واقعہ نگار" کے اُندلس میں بڑی شہرت حاصل کی۔ علی ابن بندار برمکی بھی
تجارت کی غرض سے اُندلس گئے اور آباد ہوگئے اور اسی طرح سہل ابن علی نیشاپوری نے بھی اُندلس کا سفر اختیار کیا اور وہیں سکونت
اختیار کرلی۔ اس ایک عجب مصنف حیاز کی کہانیوں اور امثال کو اس نئی امارت میں شہرت ملی۔ شیخ تاج الدین سرخسی ایران سے
ترک سکونت کرکے مراقش چلے گئے اور وہاں انھوں نے والی مراقش ابو یوسف المنصور کی ملازمت اختیار کرلی۔

صاحب نفح الطیب کا کہنا ہے کہ شیخ تاج الدین سرخسی نے کم و بیش اسی کتب و رسائل لکھے تھے۔ جن میں سے دو کتابیں ماہیتِ
اشیا اور "تنظیم مملکت" (STATE MANAGEMENT) کے موضوعات پر بہت مقبول ہوئیں۔ خصوصاً اسلامی ریاست کے
مغربی علاقہ میں۔ انھوں نے اپنے سرپرست امیر کی سوانح حیات "عطف الذیل" کے نام سے لکھی تھی۔ ایرانی علاقہ سلماس کا ایک شہزادہ
عمر بن مودود الفارسی البخاری بھی تیرھویں صدی میں اندلس چلا گیا اور اُس نے مراقش میں وفات پائی۔

بعینہٖ اُندلس اور مراقش سے بہت عربوں نے ایران کا سفر کیا اور ایران کے ہر قریہ میں جاکر علما اور فضلا سے ملے اور نجوم، دینیات اور
فلسفہ پر تبادلۂ خیالات کیا۔ ابتدائی گیارھویں صدی عیسوی میں۔ اشبیلیہ کے رہنے والے محمد بن یوسف بن عباس البرزلی نے ایران کا
سفر کیا اور اُس نے بغداد۔ اصفہان اور نیشاپور کا دورہ کیا۔ اور خاص طور پر اپنے وقت کے بڑے عالموں میں سے ابا نصر ابن حمیل

شیرازی اور ابوالحسن مؤید طوسی سے ملاقات کی۔

اجتماعِ مکّہ (حج)

حج کعبۃ اللہ جسے محمدؐ[1] رسول اللہؐ نے فرض کیا۔ ایرانی فلسفہ کی عالمِ اسلام میں ترویج کے لئے ایک اور بڑا ذریعہ بنایا۔ حج کے موقعہ پر اسلامی مملکت کے ہر گوشہ سے لوگ مکہ کا سفر کرتے تھے اور پانچ سو میل لمبے صحرا کو عبور کرنے کے لئے بڑے بڑے کاروانوں کی شکل میں تیس چالیس میل روزانہ کی رفتار سے چلتے تھے۔ راہ میں آنے والے نخلستانوں میں پڑاؤ کرتے تھے۔

سمندری راستے کے علاوہ جو اُس زمانہ تک کشتیوں میں سفر کرنے کے خطرات کی وجہ سے عام نہیں تھا۔ پھر بھی کافی تعداد میں ایران اور انڈیا سے لوگ کشتیوں ہی کے ذریعہ جدہ آتے تھے۔ جہاں تک خشکی کے راستوں کا تعلق ہے مختلف ممالک کے مسافروں نے اجتماعی طور پر پانچ راستے مخصوص کئے ہوئے تھے۔

مثلاً مصری قافلہ صرف مصری حاجیوں کو نہیں لاتا تھا بلکہ اس میں اندلس۔ مراقش اور بحر قلزم کے دیگر عربی مقبوضات کے حاجیوں کو بھی شامل کر لیتا تھا۔ اسی طرح شام سے آنے والا قافلہ شامی۔ فلسطینی اور ایشیائے کوچک کے حاجیوں کو براہ دمشق و مدینہ مکہ لاتا تھا۔ یہی راستہ تجارتی قافلوں کے لئے بھی اختیار کیا جاتا تھا۔ یمنی قافلہ میں جنوبی عرب کے سب حاجی شامل ہوتے تھے۔ نجدی قافلہ میں عرب کے اندرونی علاقوں کے حاجی شامل کئے جاتے تھے۔ اور عراقی قافلہ میں ایران کے تمام علاقوں کے حاجی شریک ہوتے تھے۔ اور عراقی قافلہ میں ایران کے تمام علاقوں کے حاجی شریک ہوتے تھے جو قافلہ کی روانگی سے قبل ہی بغداد میں جمع ہو جاتے تھے

اِن قافلوں میں مختلف قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ ان میں شہزادے۔ فقیر۔ تاجر اور عالم سبھی طرح کے لوگ جمع ہو جاتے تھے اور یہ لوگ اس حیثیت سے قافلہ در قافلہ ہوتے تھے کہ ہر ایک علاقہ یا شہر کے مسافر اپنا الگ الگ حلقہ بنا لیتے تھے مکہ معظمہ پہنچنے تک جابجا نخلستانوں میں یہ لوگ ایک جگہ قیام کرتے تھے اور اسی طرح خود مکہ میں بھی۔ سب لوگ حج کے بعد اپنے اپنے مذاق کے مطابق فرصت کے لمحات گزارتے تھے۔ جو لوگ عابد و زاہد ہوتے وہ اپنے خیموں کے اندر مصروف عبادت رہتے اور باقی لوگ دُنیا کی اور دلچسپیوں میں مشغول ہو جاتے۔ مختلف الخیال و مختلف الحال لوگوں کے اس عظیم اجتماع میں دانشمند اور قابل لوگ ایک دوسرے ملک کے عالموں سے ملتے جلتے تھے اور فلسفہ و دینیات کے مسائل پر تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔

ان لوگوں میں بہت ہی دوستانہ ماحول برقرار رہتا تھا اور یہ لوگ اکثر اپنے سفر ناموں میں مقامی کہانیوں کا اور واقعات کا ذکر کیا کرتے تھے۔ فارسی کے مشہور شاعر اور معلم دینیات ناصر خسرو نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ وہ کس طرح بادِ مخالف کی وجہ سے حج کے لئے مکہ جاتے ہوئے غراب کے مقام پر قیام کرنے کے لئے مجبور ہوا تھا اور جب اُس کی تمام رقم وہاں خرچ ہو گئی اور پاس پیسہ نہ رہا تو شہر اسوان (ASSOUAN) میں اتفاقیہ ایک شخص ابوعبید اللہ محمد ابن فلیح سے ملاقات ہو گئی جس نے اس کو اپنے ایجنٹ کے نام ایک چٹھی دیدی اور اسے سفر جاری رکھنے کے لئے کافی رقم مل گئی حالانکہ ابوعبید اللہ ایک اجنبی تھا اور اس کی اُس سے کوئی واقفیت پہلے سے نہیں تھی۔ اور نہ ہی اس رقم کی واپسی کا کوئی امکان نظر آتا تھا۔

اِسی ایک اور موقعہ پر جب وہ معرۃ سے گزر رہا تو عرب کے مشہور نابینا شاعر اور صوفی ابوالعلاء نے اس کا پُرجوش استقبال کیا تھا اور اس کی خاطر تواضع کی تھی۔

---

[1] ڈاکٹر صدیقی نے یہ بات غلط لکھی ہے کہ حج کعبۃ اللہ محمدؐ رسول اللہؐ نے فرض قرار دیا۔ حج۔ روزہ۔ نماز کو مسلمانوں پر اللہ نے فرض کیا ہے

فارسی کے مقبول ترین شاعر سعدیؒ نے بھی اجنبی شہروں کے ہمعصر عالموں کی خاطر و تواضع کے حوالے دیئے ہیں اور ذکر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دورِ وسطیٰ کے اُن مسافروں کی نسبت جو دُنیاوی سامان لے کر چلتے تھے۔ وہ مسافر جو علم کی دولت ملتے پھرتے تھے کم خطرہ میں تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سڑکیں ناپید اور ذرائع آمد و رفت دشوار و خطرناک تھے۔ سعدیؒ نے "سفر کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ان فضلاء کا ذکر بھی کیا ہے جن کو بغیر کسی زحمت کے سفر باعثِ ظفر رہا۔

سفر کرتے رہنے والے علماء

سفر کرنے والے سیاح قسم کے عالموں کے لئے ہر شہر کے علما و فضلاء سے ملاقات کرنا نہایت آسان تھا۔ اس لئے کہ یہ لوگ یا تو مسجد میں عام اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے مل جاتے تھے اور یا اپنے مکان پر لوگوں کو درس دیتے ہوئے جہاں ہر شخص کو داخل ہونے کی صورت میں اجازت تھی۔ ان عام اجلاسوں میں اکثر اجنبی لوگوں نے مقرر پر اعتراض کرکے یا جرح کرکے اپنی حیثیت کو منوایا اور ان لوگوں کی بڑی قدر و منزلت کی گئی۔ سعدیؒ نے اپنی مشہور کتاب "بوستان" میں ایک ایسے ہی واقعہ کا ذکر کیا ہے :-

ترجمہ :- —— "ایک مفلس اور بدحال عالم جس کے بدن پر چیتھڑے لٹک رہے تھے۔ ایک محقق اور فقیہ کی محفل میں صفِ اول میں جا بیٹھا۔ قاضی کی نظر جب اُس پر پڑی تو اُسے گھورا۔ محافظ اُس کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر چیخا اور کہا کہ تجھ جیسوں کے بیٹھنے کے لئے یہ جگہ نہیں ہے۔ وہاں پیچھے جا اور اگر وعظ سننا ہو تو اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہ کر سن۔ یہ آدمی کو یہاں مشاہیر کی جگہ بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔

اس لئے کہ اس محفل میں مراعات علم و فضل کی بنا پر ملتی ہیں اور درجے شہرت کی بنا پر۔ یہ سُن کر رنج اور درد بھری اور اس کے دل سے دُھواں سا اُٹھا۔ جب وہ اور پیچھے چلا گیا جہاں عام اور معمولی لوگ کھڑے تھے تو علمائے دین نے اپنی بحث کا آغاز کیا اور بڑے غرور سے "ہاں" اور "نہیں" کہنے کے لئے اپنی گردنوں کو جھٹکنا شروع کیا لیکن ان میں سے کوئی بھی مسئلہ کو حل نہ کر سکا اور عین اس وقت جب کہ کوئی حل ان لوگوں کو سجھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ مفلوک الحال عالم جو سب سے پیچھے بیٹھا تھا۔ اُٹھ کر اُن سے مخاطب ہوا۔ اور شیر کی طرح دھاڑ کر کہا کہ دلائل مضبوط و معقول ہونے چاہئیں۔ اس لئے کہ صرف غصّے سے گلے کی رگیں پھلا کر کوئی بات نہیں منوائی جا سکتی میں بھی اس دانشمندانہ بحث میں حصہ لینا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا "بولو" "اگرچہ تم اس سلسلہ میں کوئی خاص بات نہیں کہہ سکتے" یہ غریب اس حیرت زدہ مجمع میں کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے زورِ بیان سے سب کے منہ بند کر دیئے فقیہ شہر اُس کے استقبال کے لئے اپنی کرسی سے اتر کر نیچے آیا اور اُسے جس کو نظر انداز کیا گیا تھا بطور اعزاز اپنی عبا پیش کی اور کہا۔ "افسوس کہ میں یہ نہ دیکھ سکا کہ تم میں کس قدر قابلیت موجود ہے اور میں تم کو اس طرح خوش آمدید نہ کہہ سکا جس کے تم مستحق تھے"۔

ایرانی ادب کی وسیع اشاعت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ عالمِ اسلام میں لوگوں کو کتابوں کی اشد ضرورت تھی اور یہ ضرورت ایران کے ذریعہ زیادہ آسانی سے پوری ہو سکتی تھی جہاں چین سے کاغذ سازی کی صنعت تاجروں کے ذریعہ آئی۔ اُس وقت یہ کاغذ پہلے پہل ریشم کے بچے ہوئے گچھوں سے بنتا تھا اور بعد میں ریشمی چیتھڑوں سے بننا شروع ہوا۔ یہ کاغذ پیپرس (PAPYRUS) چمڑے کی کھالوں کی نسبت بہت سستا تھا جس کی کتابیں عوام کو آسانی مل سکتی تھیں ورنہ اس سے پہلے کتابیں جمع کرنا بہت

لوگوں کی دسترس سے باہر تھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام یورپ کو بھی انہی کارخانوں سے کاغذ سپلائی ہوتا تھا جو شاطبہ (XATIVA) میں موجود تھے۔

کتابوں کی ترویج اور قیمتوں میں کمی کی وجہ سے عرب کے ہر بڑے شہر میں کتابوں کی دکانیں کھل گئیں جہاں ماہرین کی نگرانی میں کتابوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی اور جہاں تمام عالمِ اسلامی سے کتابیں آکر بکتی تھیں۔ طلبا اور عالموں کے لئے یہ کتابوں کی دکانیں ملاقاتوں کا مرکز بن گئی تھیں جہاں وہ کتابوں کے نئے ایڈیشن تلاش کرتے ان کی قیمت اور موضوع پر تبادلۂ خیالات کیا کرتے تھے۔ بارھویں صدی میں صرف بغداد ہی میں کتابوں کی ایک سو بڑی دکانیں تھیں جو عموماً مساجد کے اردگرد ہوتی ہوتی تھیں اور جن کے مالک و معاون عموماً مشہور عالم ہوتے تھے۔ عرب کا مشہور شاعر الحزیری کتابوں کا بڑا مشہور ایجنٹ تھا۔ یہ مشرقی ایران کے علاقہ سجستان کے ایک بڑے کتب فروش ابو حاتم سہل ابن محمد سے کتابیں لیتا تھا جس کی بغداد میں بھی ایک بہت بڑی دُوکان تھی۔ یہ صرف ایجنٹ اور شاعر ہی نہ تھا بلکہ تاریخ و جغرافیہ کا بڑا عالم تھا۔

کُتب بطور زادِ سفر

بہت سے سیاحی کرنے والے عالم و فاضل لوگ سفر پر روانہ ہوتے وقت اپنے ساتھ کچھ قابلِ فروخت کتابیں بھی لے لیتے تھے تاکہ اگر راہ میں مالی مشکل پیش آئے تو وہ ان کتابوں کو بیچ کر کام چلالیں۔ فارسی شاعر ناصر خسرو نے اپنے سفرنامہ میں اسی طرح کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ صحرائے عرب میں اُس کے پاس تمام رقم خرچ ہوگئی اور اُس کے پاس صرف کتابوں سے بھری ہوئی دو ٹوکریاں رہ گئیں جن کو اُس نے بدوؤں کے ہاتھ فروخت کرنے کی کوشش کی مگر یہ قیمتی سودا اُن کے کام کا نہ تھا اس لئے اسے ناکامی ہوئی۔

کتابوں کی قیمتیں اگرچہ نسبتاً کم ہوگئی تھیں لیکن ابھی کتابیں اس قدر سستی نہ تھیں کہ ہر آدمی اپنی پسند اور ضرورت کی کتابیں خرید کر جمع کرلے اس لئے پبلک لائبریریوں کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ وہ لوگ بھی ان کتابوں سے فائدہ اُٹھا سکیں جو کتابیں نہیں خرید سکتے ابتدا میں اس طرح کی پبلک لائبریریاں عموماً حاکموں اور حکمرانوں کے ذاتی کتب خانے ہوتے تھے جن کو عوام کے استعمال کے لئے کھول دیا جاتا تھا۔ اور اس کام کو "کارِ خیر" سمجھا جاتا تھا۔ ابتدا میں یہ کتب خانے صرف طلبا کے لئے تھے۔ لیکن بعد میں ان کو عام کردیا گیا اور ان کے ساتھ ایک دوکان بھی کتابوں کی خرید و فروخت کے لئے ہر جگہ قائم کردی گئی تاکہ آمدنی سے کتابوں میں مزید اضافہ ہوسکے۔ اسلامی دنیا کے اس مشرقی علاقہ کی پبلک لائبریریوں کے علاوہ جن میں ہر شخص جاسکتا تھا۔ اندلس میں بہت اچھے ذاتی کتب خانے موجود تھے۔ جہاں امرا کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر چیز کے بغیر صبر کرسکتے تھے مگر ہر ایک کے لئے ایک اچھا ذاتی کتب خانہ ہونا ضروری تھا۔ ان میں سے بعض لوگ علم کی محبت میں ایسا کرتے تھے اور بہت سے اُمرا اسے صرف شان و شوکت کی وجہ سے ضروری سمجھتے تھے۔

ان کتابوں کو جمع کرنے والے ہر سال میں ایک مخصوص رقم اخراجات میں سے علیحدہ کرلیتے تھے تاکہ عالمِ اسلامی میں ہر جگہ سے نئی کتابیں خرید کر اپنے کتب خانہ کی زینت میں اضافہ کریں۔ خلیفہ الحکم المستنصر (۹۶۱ — ۹۷۶) نے اندلس سے "الاغانی" کے مُصنّف ابو الفرج اصبہانی کو اُس کی کتاب کی ایک کاپی خریدنے کے لئے ایک ہزار دینار بھیجے تھے اور ایک وفد کو سفر خرچ اور کافی رقم دے کر روانہ کیا تھا تاکہ وہ علم و حکمت کی اچھی کتابیں خرید کرے۔ ایران سے کتابوں اور قلمی نسخوں کی مانگ نے تجارتِ کتب کو کافی فروغ دیا اور ہر جگہ دفتر کھول لئے اور اپنا نمائندہ مقرر کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اور اس طرح ایرانی مصنفین کی کتابیں اور رسائل بڑی احتیاط سے نقل ہوکر اور مضبوط جلدیں بندھ کر تمام عالمِ اسلامی اور مغربی ممالک میں فروخت ہونے لگیں۔

اِس دوران وہ کتب خانے جو صرف طالب علموں اور محققین کے لئے کھلے تھے اب عوام کے لئے بھی استعمال ہونے لگے۔ ان کتب خانوں کو گویا تو عوام کے لئے اس لئے کھولا گیا تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ استفادہ کریں اور پھر یا اس لئے کہ ان کو اسلامی درسگاہوں کے ساتھ منسلک کرکے طلبا کو اعلیٰ تعلیم کے لئے مواقع فراہم کئے جائیں۔ ایسے کالج جن کے ساتھ لائبریریاں بھی ہوں۔ غزنی۔ مرو۔ ماوراء النہر۔ رے۔ بخارا۔ شیراز ایرانی شہروں میں اور عربی شہروں میں سے بغداد۔ موصل۔ بصرہ۔ حلب۔ طرابلس (شام) قاہرہ۔ قرطبہ اور فاس میں کھولے گئے تھے جہاں سے مقامی اور دوسرے علاقوں کے عالم استفادہ کرتے تھے۔ اور اس طرح بھی ایرانیوں کی تصانیف ضبطِ تحریر میں آنے کے ساتھ ہی عرصہ میں پھیل جاتی تھیں۔

اُندلس کے علماء اور حکماء نے اپنی تصانیف میں اکثر و بیشتر ایرانی ہمعصر مصنفین کی کتابوں کے بالکل صحیح حوالے دیئے ہیں اُن کے یہاں سے نہ صرف عبارتیں نقل کی ہیں بلکہ حوالوں کے لئے صفحہ بھی درج کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاہرہ اور اُندلس کے اساتذہ مشرقی فلسفہ سے کما حقہٗ واقف تھے۔ اور مشرقی فلسفہ وہاں کی مساجد اور درسگاہوں میں زیرِ مطالعہ تھا اور عربوں نے جو کچھ یورپ کو دیا اس میں ان تصانیف کا بڑا حصہ تھا۔

مغربی دُنیا

نویں صدی سے گیارھویں صدی عیسوی تک "عالمِ اسلامی" اور "عیسائی یورپ" کو ربط و ضبط کے کئی مواقع ہاتھ آئے اس لئے کہ یہی وہ زمانہ ہے جب مسلمانوں نے اندلس۔ صقلیہ کو فتح کیا اور صلیبی جنگوں کا آغاز ہوا۔ ان تینوں مواقع میں سے سب سے زیادہ موقعہ صلیبی جنگوں کی وجہ سے ملا۔ اگر فلسطین کا قبضہ عیسائی اور مسلمانوں کے درمیان سالہا سال تک کشت و خون کا باعث بنا رہا لیکن اس خرابی میں ایک بھلائی کا پہلو بھی تھا اور وہ یہ کہ مشرق و مغرب نے پہلی دفعہ تعلیمی اور ثقافتی میدان میں ایک دُوسرے سے بہت کچھ سیکھا اور سکھایا۔

طویل صلیبی جنگوں کے دوران گاہے گاہے "عارضی صُلح" کے مواقع آئے اور اس طرح اہلِ مغرب کو مسلمان حاکموں سے ملنے اور ان کے دربار میں جانے کے مواقع ملے جہاں انھوں نے مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کا مطالعہ کیا اسی طرح اسیرانِ جنگ بھی "خون بہا" یا تبادلہ کی وجہ سے آزاد ہونے کے ساتھ اپنے ذہن میں مُقید کرنے والے کی تہذیب۔ تمدن۔ معاشرت۔ اور اخلاق کی ایک مٹی سی یاد بھی ساتھ لے جاتا تھا۔ ان قیدیوں کی زبانی مسلمانوں کی خوشحالی اور شان و شوکت کے قصّے سُن سُن کر اہلِ مغرب کو اسلامی فلسفہ اور ثقافت میں گہری دلچسپی پیدا ہوگئی۔

یہی صورت حال ایران کی بھی اور اُس کے ربط و ضبط کی نوعیت بھی یہی تھی اس لئے کہ ایران بھی اسلامی سلطنت کا جُزو تھا اور اسی لئے اس کے اثرات۔ عراق۔ شام۔ مصر۔ اور اندلس کے حکمرانوں پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ یورپ کے ساتھ ایران کے اُن روابط کے علاوہ بھی جو اسلامی سلطنت کا ایک حصّہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ وہ اپنی تجارتی اور سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے عیسائی دُنیا میں متعارف ہوچکا تھا۔ اٹلی کے سیاح اور تجارتی قافلے چین جانے کے لئے ایران کی تجارتی گزرگاہوں پر ہی چلا کرتے تھے۔ ۱۲۷۱ء میں مارکو پولو ایرانی راستہ سے ہی چین میں قبلائی خاں کے دربار میں پہنچا تھا۔ یہ خلیج فارس کے شمالی جزیرہ ہرمز میں اُترا تھا جو مشرقی و مغربی تاجروں کی ملاقات کا بڑا مرکز تھا۔ یہاں سے چل کر اس نے ایران کے مشرقی علاقہ کا سفر کیا اور وسط ایشیا کے علاقہ بدخشاں میں پہنچ گیا۔ اس کی باریک بین نظر نے ایرانیوں کے اخلاق و عادات کا گہرا مطالعہ کیا۔ وہاں سے ان کی کتابیں خریدیں اور قدیم کہانیاں لیتے

سفرناموں اور تصانیف کی زینت کے لئے حاصل کیں جو یورپ والوں کیلئے بہت دلچسپی کا باعث ہیں۔

وفود کی ایران کو روانگی

ایشیائے کوچک میں سلجوقیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اُن سے خطرہ کی بنا پر عیسائی حکمرانوں اور اسقف کو دشمن سے محفوظ رہنے اور اپنا دائرہ وسیع کرنے کے لئے مزید دوستوں کی ضرورت محسوس ہوئی اور انھوں نے براہِ ایران خیر سگالی کے چند وفود چین، ترکستان کے مغل شہنشاہوں کے پاس بھیجے تاکہ سلجوقیوں کے خلاف ان کو مدد مل جائے۔ ۱۲۴۵ء میں پوپ انوسینٹ چہارم نے دو وفود صرف اس لئے روانہ کئے تھے کہ وہ ایشیا میں مغلوں کے متعلق اطلاعات فراہم کریں۔ کئی مہینے کی مشقت برداشت کرنے کے بعد کہیں یہ وفود جولائی ۱۲۴۶ء میں مغل شہنشاہ (GUYUK) کے دربار میں پہنچے تھے۔ ۱۲۴۸ء میں فرانس کے بادشاہ لوئس نہم نے اپنے ترجمان فرا اینڈریو کو اور دوسرے پادریوں کو خطوط دے کر آرمینیہ کے گورنر الکتائی اور ایران کے مغل حکمرانوں کے پاس بھیجا تھا۔ اس کے بعد ۱۲۵۳ء میں لوئس نے ایک اور وفد ولیم آف ربروک کی قیادت میں روانہ کیا جو بحر اسود کو عبور کرکے کیسپین کے شمالی حصہ میں سفر کرتے ہوئے مغل اعظم خان منگو کے دربار میں پہنچا تھا۔ ان وفود کے علاوہ بھی اور وفود جنوبی علاقہ میں سفر کرتے ہوئے براہ ایران مغل بادشاہوں تک پہنچے تھے۔ ۱۲۹۱ء میں آرڈر آف مائنر فرائرز (ORDER OF MINOR FRIARS) کے زیر حمایت پادری جان آف مانٹ کاروینو سے جان۔ اینڈریو اور ان کے ساتھیوں کو تبلیغی مشن کی صورت میں چین روانہ کیا تھا۔ جان نے ایران میں بہت عرصہ قیام کیا اور پھر پوپ نکولا چہارم کے نام کچھ پیغامات لے کر واپس ہوا۔ جہاں سے اس کو دوبارہ ۱۲۸۹ء میں چین جانے اور خان اعظم سے ربط و ضبط بڑھانے کا حکم ملا۔

ایران کے متعلق معلومات

فرا جان اور پوپ کلیمنٹ کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی تھی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی ایران کے متعلق یورپ کو قابلِ اعتماد معلومات حاصل تھیں۔ اور اہلِ یورپ ایرانیوں کے رسم و رواج۔ عادات اور ادب سے بخوبی واقف تھے۔ لاطینی زبان میں ایک مخطوطہ ملا ہے جس میں "برادر جان" کا روزنامچہ درج ہے۔ یہ ۱۳۲۸ء کا لکھا ہوا ہے اور اس کا ترجمہ درج ذیل ہے:—

> "برادر جان آف مانٹ کاروینو جو آرڈر آف مائنر فرائرز" سے تعلق رکھتے ہیں اپنے سفر پر روانہ ہوتے اور ایران سلطنت میں پہنچے تاکہ وہ کافروں کو تبلیغ کریں۔ برادر جان دیگر پادریوں کے ساتھ شہر تبریز میں جہاں پہلے سے اور پادری موجود تھے بہت دن تک مقیم رہے اور کافروں کو دین مسیحی کی تعلیم دی"۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان عیسائی مبلغین کو فارسی زبان اچھی طرح آتی تھی اس لئے کہ جان نے ایک خط میں پوپ کو لکھا تھا کہ: "میں نے لوگوں کو انجیل اور توریت کے عہد نامۂ قدیم و جدید سے کئی واقعات کو تصویر میں ظاہر کیا اور ان پر لاطینی اور فارسی زبان میں عبارت کندہ کی ہے"۔

اسی دور میں اطالوی تاجروں نے مشرقی دساور کی مانگ کی وجہ سے تقریباً تمام تجارتی راستے اختیار کر لئے تھے وہ یا تو ایران کے شمال مغربی علاقہ میں تبریز سے ہوتے ہوئے بحر کیسپین کے کنارے چل کر ترکستان اور چین جاتے تھے یا خلیج فارس میں جزیرہ ہرمز

میں اتر جاتے تھے اور پھر ایرانی نخلستانوں میں سے گزرتے ہوئے وہ ترکستان اور چین جاتے تھے اور واپسی میں اپنے ساتھ مشرق کے قصے کہانیاں بھی یاد کر لاتے تھے۔

بہرحال ان تجارتی اور سیاسی روابط سے مغربی ادب پر کوئی علمی اثر نہیں پڑا اس لئے کہ جو معلومات حاصل کی گئی تھیں ان کی حیثیت علمی نہیں تھی اور نہ کسی نے تحقیق و انکشاف کے طور پر محنت سے انہیں حاصل کیا تھا۔ ہاں ان کہانیوں سے جو مشرق سے واپس آنے والے مغربی تجار اپنی منڈیوں میں بیٹھ کر لوگوں کو سنایا کرتے تھے۔ مغربی محققین کی مشرقی علوم میں دلچسپیاں بڑھنا شروع ہو گئیں اور ان کو مشرق کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش پیدا ہوئی۔

بہرحال مشرق و مغرب کے درمیان جن مقامات پر سب سے زیادہ اسلامی اور عیسائی عالموں کو ایک دوسرے سے واسطہ پڑا اور جہاں ادبی اور علمی معلومات کے تبادلے کے مواقع ہاتھ آئے وہ اندلس۔ اٹلی اور شام کے علاقے تھے۔

پہلا مرکز ملاقات

سب سے پہلے اسلامی ادب اور اس میں چھپے ہوئے ایرانی افکار اہل مغرب کو سرزمین اندلس پر طلیطلہ کے شہر سے پہنچے۔ یہ شہر تقریباً چار سو سال سے مسلمانوں کے زیر اقتدار تھا اور یہاں اسلامی ثقافت اور مذہب اسلام خوب پھل پھول رہے تھے۔ جب ۱۰۸۵ء میں الفانسو ششم نے اس شہر کو فتح کیا تو معاہدہ میں یہ شرط بھی تھی کہ شہریوں کو اپنے اپنے مذہب پر رہنے کی آزادی ہوگی اور اس کے نتیجہ میں مسلمان اور عیسائی پُرامن طریقے پر دوش بدوش رہے، ایک اور بات جس نے اہل مغرب کو اسلام کی طرف متوجہ کیا وہ چند عیسائیوں کی مسلمانوں کے دربار روم میں موجودگی تھی۔

آرک بشپ ریمونڈ جو اندلس کے امرا میں سے تھا۔ اس بات کا دلدادہ تھا کہ عربی فلسفہ کو عیسائیوں تک پہنچائے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے اس نے ایک "دارالترجمہ" قائم کیا اور اس کے انتظامات آرکیڈیسی ایکون ڈومینک گونڈسلوی (ARCHDEDCON DOMINIC GUNDISALVI) کے حوالے کر دیئے اور یہ ہدایت دی گئی کہ وہ فلسفہ اور سائنس پر عمدہ عربی تصانیف کے تراجم پیش کریں۔ اس ادارہ میں بہت سے مترجم کام کرتے تھے۔ اور انھوں نے ارسطو کی کتابوں کے عربی تراجم کئے تھے اور ایرانی حکما میں سے ابن سینا اور فارابی کی کتابوں پر حاشیہ اور شرح لکھی تھیں۔ اور پھر یہاں سے ان کی نقلیں دور دراز ملکوں میں فروخت کیلئے پھیلائی جاتی تھیں۔ اور پیرس کی یونیورسٹی تو ان متکلمین کی تصانیف کا سب سے بڑا مرکز بن گئی تھی جہاں بہت عمدہ کتابیں جمع کر لی گئیں تھیں۔

سنہ ۱۲۰۹ء میں بمقام پیرس ایک اجلاس میں اعلان کیا گیا کہ ارسطو کی کتابیں نہ پڑھی جائیں اور سنہ ۱۲۱۵ء میں بابائے روم نے حکم دیا کہ یونانی مابعد الطبیعات اور نیچرل فلاسفی اور اس کی شرحوں کا مطالعہ نہ کیا جائے البتہ عربی سے کئے ہوئے تراجم کچھ نئے اور کچھ پرانے پڑھ لینے کی اجازت دی گئی تھی۔ اس لئے اب علم کا تمام تر سرچشمہ عربی تراجم ہی تھے۔

ان قوانین سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ یورپ اس وقت تک ایرانی لٹریچر سے واقف ہو چکا تھا۔ اندلس میں طلیطلہ کی مشہور مسجد کی لائبریری جو اسلامی ادب و ثقافت کا بہت بڑا مرکز تھی شمالی علاقہ کے عیسائیوں کے لئے بے پناہ کشش کا باعث تھی۔ چاروں طرف سے عرب مترجمین ادھر کا رخ کر رہے تھے۔ ان عربوں میں وہ بھی تھے جو یہودی تھے اور وہ بھی جو عیسائی ہو گئے تھے۔ بہرحال ان لوگوں نے اندلس کے عیسائیوں کے ساتھ اس کام میں پورا پورا تعاون کیا۔ بارھویں صدی کے مترجمین

میں سے دو شخص قابلِ ذکر ہیں ایک ڈومینکس کنڈس الینس ـــ (DOMINICUS CUNDISALINUS) تھا اور
دوسرا جوہنس ہسپےنس (JOHANNES HISPANUS) جس نے فارابی کی مشہور کتاب "کتاب الحکماء" (DE SCIEN
THIS) غزالی کی کتاب الفلسفہ ۔ اور ابن سینا کی کتاب "الشفاء" کا ترجمہ کیا جو فلسفہ کی اچھی خاصی انسائیکلو پیڈیا ہے ۔
اس کو فرانسیسی زبان میں "SUFFICIENTIA" کہا جاتا ہے ۔ ۱۲۰۰ء میں لے ۔ ڈسی ۔ الفریڈز ALFREDUS
ANGLICUS) نے ارسطو کی "علم سماوی" کے موضوع پر تصنیف کے ایک حصہ کا اس ترجمہ سے ترجمہ کیا جو ابن سینا نے کیا تھا
شیخ نے ارسطو کی چوتھی کتاب میں بطور ضمیمہ تین ابواب کا اضافہ کیا تھا ۔ یہ ترجمہ "DE MINERALILUS" یا
"DE CONGELATIS" کے نام سے کیا گیا تھا ۔ اسی طرح اور بھی اس ابتدائی ادب کا طلیطلہ میں ترجمہ کیا گیا جو اندلس میں
دستیاب ہوسکتا تھا ۔ ۱۱۲۶ء میں نجوم کے خوارزمی جدول ایڈیلارڈ آف باتھ نے ترجمہ کئے تھے ۔ قریمونہ (CREMONA)
کے رہنے والے جیراڈ (GERARD) نے سکندر افرادوسی (ALEXAUDER OF APHRODISLAS) کے تصانیف کے تراجم
میں بھی علم الطب کے معاملہ میں حاشیہ پر شیخ بوعلی سینا کی کتاب "قانون" کے حوالے دیئے ہیں ۔

دوسرا مرکز ملاقات

مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان دوسرا مرکز ملاقات زیریں علاقہ اطالیہ اور جزیرہ صقلیہ تھے جہاں پہلے پہل مسلمان فاتح
کی حیثیت سے آئے اور بعدہ نورمنوں کے ساتھ ایک معاہدہ کے تحت باقاعدہ طور پر بس گئے اور پُرامن زندگی گزارتے رہے تیرھویں
صدی کی ابتدا میں فریڈرک شہنشاہ (۱۱۹۸ ـــ ۱۲۵۰) ہوا اور جزیرہ صقلیہ کی باقاعدہ حکومت تسلیم کرلی گئی ۔ ولیم
فرانسس کو پہلے پہل اپنی طالب علمی کے زمانہ میں اور بعد میں بادشاہ بن کر عربوں کی ثقافت و تہذیب کو جاننے کی زبردست
لگن تھی اور خصوصاً نورمنز کے ساتھ ان کے تعلقات کی تاریخ اس کو اپنے صقلیہ کے قیام اور صلیبی جنگوں کے دوران مسلمانوں کو قریب
سے دیکھنے کے کافی مواقع ہاتھ آئے اور اس کو مسلمان علماء و فضلاء سے جو کلید بردار خزانۂ علم تھے ملاقات کا شوق پیدا ہوا اور
اس نے راہ و رسم پیدا کرلی ۔ اور اس نے ان کے علم و سائنس کا بڑے ذوق و شوق سے گہرا مطالعہ کیا ۔

فریڈرک نے اہلِ مشرق سے متاثر ہوکر کافی حد تک مشرقی لباس اور رسم و رواج کو اختیار کرلیا تھا اور وہ مشرقی علماء
سے خود انہی کی زبان میں جس پر اس نے قدرت حاصل کرلی تھی بڑی آزادی سے فلسفیانہ موضوعات پر بحث و مباحثہ کیا کرتا
تھا ۔ اس نے خط و کتابت کے ذریعہ اندلس کے مسلمان حکماء سے تعلقات پیدا کئے اور ان سے بعض اخلاقی مسائل پر تفصیل سے
سوالات کئے اور جواب پائے ۔ اس نے براہِ راست خود ابن سبعین عبدالحق سے بھی خط و کتابت کی تھی جو فارابی اور ابن سینا کے
نظریات کا پیرو تھا اور ان کی تصانیف پر بڑا عبور رکھتا تھا اور روح کے غیر فانی ہونے کا قائل تھا ۔ اس نے بھی فریڈرک کے
لئے مختصر طور پر ایسا ہی جامع مواد فراہم کیا، جیسا کہ کئی صدی پیشتر یونانی حکماء نے ایران کے بادشاہ نوشیرواں کے لئے فراہم کیا تھا
۱۲۲۴ء میں شاہ فریڈرک نے نیپلز (NAPLES) یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی جس کو بعد میں تامس ایکوناس (THOM
AS AQUINAS) جیسے عالم نے اس کو ایک ایسی درسگاہ بنادیا جہاں مغربی دنیا کو عربی علوم سے روشناس کرانے
کے لئے بڑے پیمانہ پر کام کیا ۔ یہیں پر عربی زبان سے لاطینی اور عبرانی زبان میں کتابوں کے ترجمے کئے گئے ۔ شہنشاہ فریڈرک کی
قدردانی اور حوصلہ افزائی کی سبھی وجہ سے میچل اسکاٹ (MICHAL SCOT) طلیطلہ پہنچا اور دیگر تصانیف کے علاوہ

اُس نے ارسطو پر ابن سینا کے مقالات اور خود ارسطو کی "کتاب الحیوان" (DE ANIMALILUS) کا ترجمہ کیا اور اس کا انتساب بادشاہ سے کیا گیا۔ ایک دوسرا مترجم جرمنی کا رہنے والا ہرمن (HERMAN) تھا جس نے فارابی کے "علم الکلام" کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔ البرٹ میگنس (ALBERTUS MAGNUS) اور اُس کا شاگرد تھامس ایکویناس۔ شاہ فریڈرک کے دربار کی علمی سرگرمیوں کی ہی پیداوار تھے۔ متذکرہ بالا تصانیف کی نقلیں شہنشاہ فریڈرک کی خواہش کے مطابق بلوگنا (BOLOGNA) نیپلز (NAPLES) سلرمو (SALERMO) اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں تقسیم کی گئی تھیں۔ اوران عالمانہ کوششوں کا جو نتیجہ نکلا وہ یہ تھا کہ مغربی دنیا مشرقی دنیا کے علوم عقلی اور حکمت سے بخوبی واقف ہوگئی۔

تیسرا مرکز ملاقات

شام تیسرا مرکز تھا جہاں مغرب کے نصرانیوں اور مشرقیوں یعنی ایران اور مشرق کے دیگر اسلامی ممالک کے لوگوں کی ملاقاتیں ہوتیں۔ بہت قدیم زمانہ سے اہل شام مشرقی ممالک سے وسیع پیمانے پر تجارت کرتے رہے ہیں اور ایک زمانہ میں تو شام مشرقی تجارت کی سب سے بڑی منڈی بن گیا تھا، جہاں سے ہوکر تمام دنیا کا مال ایک دوسری جگہ پہنچتا تھا۔

اور شام نے اس تجارتی گرماگرمی کے ساتھ ساتھ ایک قوم کی حکمت دوسری قوم تک قرون وسطیٰ میں آسانی سے پہنچادی۔ جب کہ خیالات کا ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچنا دشوار تھا۔ بغیر کسی شک و شبہ کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شام ہی وہ جگہ تھی جہاں صدیوں تک دو بڑی سلطنتوں یعنی رومی اور ایرانی سلطنتوں کے درمیان ربط و ضبط کے مواقع فراہم ہوتے۔ شام ہی وہ سرزمین ہے جہاں سے یونانی فلسفہ عدلیہ (EDDISA) اور انطاکیہ سے آکر نیسیبیوں (NISSIBIS) کے مدارس اور جندی شاپور میں مُروج و مقبول ہوا۔ عیسائیت کے آغاز میں جب اُس کے تین مکاتب فکر قائم ہوئے تو شام میں کیتھولک چرچ اور ایران میں نسطوری کلیسا (NESFORIAU CHURCH) قائم ہوئے۔

سریانی زبان یکساں طور پر مشرقی و مغربی کلیساؤں کی زبان تھی لیکن اس کے برخلاف خود شام (SYRIA) میں خصوصاً عدلیہ (EDDISA) ۔ قنسرین اور حرّان میں یونانی زبان پڑھائی جاتی تھی۔ جس کی سرپرستی بعد میں چند سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ساسانی بادشاہوں نے بھی کی۔ اور اس طرح شام نے مغربی دُنیا کو مشرقی فلسفہ کے ساتھ ساتھ مشرق کی کہانیوں اور حکیمانہ اقوال سے بھی آشنا کردیا۔

آغاز اسلام کے بعد یونانی فلسفہ میں مسلمانوں کی دلچسپی کی ابتدا کتابوں کے تراجم سے ہوئی اور حرانیوں (HARRANAEUS) نے اس میں سبقت کی جن کا ایرانیوں اور عربوں سے آٹھویں صدی سے دسویں صدی تک یکساں طور پر گہرا ربط و ضبط رہا۔ اور دوسری طرف اپنے مذہب و ثقافت کی وجہ سے عیسائیوں سے بھی ذہنی قرب حاصل رہا۔

شام میں یونانی سے تراجم کا دور آٹھویں صدی سے گیارھویں صدی تک کا زمانہ ہے اور ان میں سے زیادہ تر تراجم سُریانی زبان سے ہوئے جن میں یونانی فلسفی پیلوس پرسا (PALUS PERSA) کی وہ تصانیف بھی شامل تھیں جو اس نے خسرو نوشیرواں شاہ ایران کے لئے سریانی زبان میں پیش کی تھیں۔

بعد میں زیادہ تر یونانی کتابوں کا ترجمہ براہ راست یونانی سے کیا گیا۔ اہل شام نے دو مضامین میں سب سے زیادہ دلچسپی لی ایک اُس لٹریچر میں جو قدیم تاریخ اور فلسفہ تصوف سے عبارت تھا اور جس کے لئے فیثاغورث۔ سقراط۔ پلوٹارک۔ ڈایونیس وغیرہ

جیسی عظیم شخصیتوں سے سند لی گئی تھی۔ اور دوسرے منطق۔ تاکہ یونانی تحریروں کو واقعی سمجھا جا سکے۔

نویں صدی عیسوی میں مترجمین نے طب اور علوم طبیعی کی کتابوں کے تراجم پر خاص طور سے توجہ دی۔ اور بقراط۔ جالینوس بطلیموس (PTALEUUT) اور اقلیدس کی تصانیف کا عربی ترجمہ کر لیا گیا۔ اور اس کے بعد ہی شام کے مترجمین نے افلاطون و ارسطو کی تصانیف کے علاوہ فلاطونس (PLOTINUS) کی اینیڈز (ENNBADS) اسکندر افرادوسی کی شرحیں اور جون فلاپونس (JOHN PHILOPONUS) کی کتابوں کو بھی عربی زبان میں منتقل کر دیا۔ اور اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ شام علوم و فنون کا مرکز بن گیا اور مشرق و مغرب کے عالموں نے شام کا رخ کیا تاکہ وہ ارسطو اور دیگر یونانی فلسفیوں کے کارناموں سے کماحقہ استفادہ کر سکیں اور اُن پر عبور حاصل کریں اس لئے کہ اُن لوگوں کو یہ کتابیں اُن کے اپنے ملک میں میسر نہیں آ سکتی تھیں۔

شام تک اہلِ مغرب کے باآسانی پہنچنے کے دو اسباب تھے۔ اوّل تو شام میں ان کے ہم مذہب عیسائیوں کی موجودگی اور دوسرے شام کا سمندری راستے سے اٹلی اور قسطنطنیہ سے اُس کا قرب۔ اسی طرح عربوں اور ایرانیوں کو اس سے بھی زیادہ آسانی اس لئے تھی کہ شام ایک اسلامی علاقہ بن چکا تھا اور ویسے بھی شام کا دارالخلافہ دمشق جو تجارتی مرکز تھا اُس راہ میں پڑتا تھا جو مکہ جاتا تھا۔ اس لئے شام کو دیگر تجارتی مرکز کی نسبت یہ فوقیت حاصل ہے کہ یہیں مشرق و مغربی فلسفہ کے امتزاج نے جنم لیا اور یہیں سے پہلے پہل مشرقی فلسفہ۔ طب۔ اور کیمیا کا فن مغرب میں پہنچا۔ یہیں سے لیڈیا کے مصنف کی پرسکین کی کتابیں یورپ پہنچیں اور ان کا لاطینی میں ترجمہ ہوا۔

یہ تراجم نویں صدی میں جوّن اسکاٹ (JOHN SCOTUS ERRIGENA) نے کئے تھے۔ اس مقالہ میں پرسکین (PRISCIAN) نے ایرانی بادشاہ نوشیرواں (۵۳۱ قبل مسیح) کے اُن نو سوالوں کا جواب دیا تھا جو نفسیات طبیعات اور نیچرل سائنس سے تعلق رکھتے تھے۔

گلہائے رنگ رنگ

محمد عمر سیفی :-

خوشا وہ دل! جو رہِ انتظار میں گم ہے — زہے! وہ آنکھ جو دیدارِ یار میں گم ہے
سیاہ خانۂ غم میں یہ روشنی کیوں کر — کہ صبحِ وصل شبِ انتظار میں گم ہے
وہ اعتبارِ محبت جسے جنوں کہیئے — خرد ہنوز اسی اعتبار میں گم ہے
کسے دماغ کہ سوچے مآلِ کارِ چمن — ابھی نگاہ فریبِ بہار میں گم ہے
ہجومِ یاس ہے تارے ہیں کچھ سرِ مژگاں — کرن امید کی شب ہائے تار میں گم ہے
رواروی کا یہ عالم یہ جھٹ پٹے کا سماں — زمانہ گردشِ لیل و نہار میں گم ہے

پیامِ زیست ملا تھا جہاں سے اے سیفی
متاعِ زیست اسی رہگذار میں گم ہے

زکی زاکانی :-

جب سامنے ہو دور میں پیمانہ دوستو — قابو میں کیا رہے دلِ دیوانہ دوستو
تم ہی بتاؤ مجھ کو مرے عشق کا مقام — سنتے رہے ہو تم مرا افسانہ دوستو
رکھے خدا ہی اب مرے جوشِ جنوں کی لاج — پھر کر رہا ہوں جراتِ رندانہ دوستو
جب ہو گیا جنونِ محبت کا راز فاش — افسانہ پھر نہ رہ سکا افسانہ دوستو
وہ کیا تھا جس کے رخ پہ روا تھی نہ تھی نظر — میری سمجھ میں آج بھی آیا نہ دوستو
تم نے کئے ہیں مجھ پہ ستم اپنا جان کر — میں کس طرح کہوں تمہیں بیگانہ دوستو
غم رفتہ رفتہ میرے رگ و پے پہ چھا گیا — دل ہوتے ہوتے ہو گیا دیوانہ دوستو
گردش نہ تھی تو دل تھا مرا ایک مشتِ خاک — گردش میں آ کے بن گیا پیمانہ دوستو
بازارِ زندگی میں غنیمت ہے میرا دم — ملتا کہاں ہے گوہرِ یکدانہ دوستو

محوِ طرب ہوں محفلِ خوباں میں رات دن!
ہے شان اس فقیر کی شاہانہ دوستو!

جوہر سعیدی :-

دوشیزۂ صحرا کے طرب جاگ رہی ہے — اے نیند کے ماتو، اٹھو شب جاگ رہی ہے
پھر ہمت پرواز میں گم دام و قفس ہیں — پھر آپ سے ملنے کی طلب جاگ رہی ہے
پھر گردشِ دوراں سے کہو سامنے آئے — پھر خواہشِ زلف و رخ و لب جاگ رہی ہے
ہیں صبح کے آثار سرِ شام نمایاں! — کیا سوئی ہوئی روحِ طرب جاگ رہی ہے

رشید اثر:۔ یہ زلف، یہ رخسار، یہ ابرو، یہ نگاہیں　　آئینہ بھی حیران ہے اور آئینہ گر بھی
تم سامنے جب تک تھے تو ہر شام سحر تھی　　تم جب سے گئے لوٹ کے آئی نہ سحر بھی

اب کوچۂ دلدار کی رونق ہے محبت　　اے ذوقِ طلب زحمتِ یک گام ادھر بھی
کیا جانیے کس جرم کی پاداش میں ہم نے　　اک عمر گزاری ہے سرِ راہگزر بھی

راشد اللہ خاں جوہر:۔ گم گشتگیٔ شوق کا عالم ارے توبہ!　　ہوں یاد میں کس کی، مجھے یہ بھی نہ رہا یاد
کیا ظلم ہے کہتے ہیں اُسے دشمنِ ایماں　　وہ بُت کہ جسے دیکھ کے آتا ہے خدا یاد
جوہر کو نہیں جانتے اللہ رے تغافل　　کیا وہ بھی ہے "پیمانِ وفا" جو نہ رہا یاد

فصیح اکمل قادری:۔ زبانِ بے زباں کو کس طرح سمجھیں جہاں والے　　حدیثِ عشق سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے جہاں والے
دل میں آگ اور آنکھ ہے پُر نم　　ہائے! یہ ربطِ شعلہ و شبنم

محمد عباس آرزو کاشمیری:۔ جو تم ایسی نظر سے دیکھتے ہو ہم غریبوں کو　　تو موقع اور مل جاتا ہے ہنسنے کا رقیبوں کو

قوی فائزی ٹونکی:۔ ہم نے کھایا تھا جو فریبِ نظر　　وہ تلافی تو عمر بھر نہ ہوئی
اُن کے آنے کا ہوش تو ہے قوی　　اُن کے جانے کی کچھ خبر نہ ہوئی

نخشب جارچوی:۔ دل تماشا ہو مگر دُنیا تماشائی نہ ہو　　مجھ پہ جو گزرے سو گزرے آپکی رسوائی نہ ہو
اس ہجومِ یاس کے عالم کی مجبوری نہ پوچھ　　جب کہ دل رونے کو چاہے اور تنہائی نہ ہو

تابش دہلوی:۔ غرورِ حُسن کا تیرے جواب کیا دوں گا　　دل آئینہ تو نہیں ہے مگر دکھا دوں گا

ساقی امروہوی:۔ اس بھری بزم میں کوئی بھی ہم آواز نہیں　　ایک تنہا مری آواز کہاں تک پہنچے

قمر جلالوی:۔ راستے بند کئے دیتے ہو دیوانوں کے　　ڈھیر لگ جائیں گے، بستی میں گریبانوں کے

ماہر القادری

وہ طرح طرح کی شوخی، وہ نئی نئی ادائیں　　انھیں یاد کیا نہیں ہے، انھیں یاد کیا دلائیں
مرے شوق کی صداقت، مری بے غرض وفائیں　　یہ طلسمِ عاشقی ہے وہ قریب میں نہ آئیں
کوئی خوش جمال ہوگا، کوئی بے مثال ہوگا　　ہمیں کس سے ہے محبت، تمہیں نام کیا بتائیں
تری خامشی کو سمجھا تو چٹک گئے شگوفے　　ترے گیسوؤں کو دیکھا تو ٹھٹک گئیں گھٹائیں
مرے عرضِ غم پہ ان کو ابھی سوچنا پڑے گا　　یہ معاملہ ہے دل کا وہ سمجھ کے مسکرائیں

مجھے دل کی دھڑکنوں کا نہیں اعتبار ماہرؔ
کبھی ہو گئی ہیں شکوے، کبھی بن گئی دعائیں

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

رُوحِ انتخاب

انسان خوشی سے زیادہ غم اور راحت سے زیادہ تکلیف محسوس کرتا ہے۔ اور یہ کچھ فطری بات ہے کہ جو چیز انسان کے حیات کو جتنی زیادہ ٹھیس لگاتی ہے وہ اتنی ہی زیادہ اس کی قوت فکر کو حرکت میں لاتی ہے۔ جب کوئی چیز ہم کو حاصل ہوتی ہے تو اس کی خوشی میں ہم یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ یہ کہاں سے آئی؟ کیونکر آئی اور کب تک رہے گی؟ لیکن جب کوئی شے ہم سے کھو جاتی ہے تو اس کا صدمہ ہمارے توسن فکر پر ایک تازیانہ لگا دیتا ہے۔ اور ہم یہ سوچنے لگتے ہیں کہ یہ کیسے کھو گئی؟ کہاں گئی؟ اب کہاں ہوگی اور کیا یہ ہمیں پھر حاصل ہوگی یا نہیں؟ یہی وجہ ہے کہ زندگی اور اس کے آغاز کا سوال ہمارے لئے اتنی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ جتنی اہمیت موت اور اس کے انجام کو حاصل ہے۔ اگرچہ دنیا کی اس تماشا گاہ اور اس میں خود اپنے وجود کو دیکھ کر ہمارے دل میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ یہ ہنگامہ کیسا ہے؟ کیسے شروع ہو گیا؟ کس نے برپا کر دیا؟ لیکن یہ سب فرصت کی باتیں ہیں۔ اور گہری فکر رکھنے والے خواص کو چھوڑ کر عام انسان ان سوالات میں کم الجھتے ہیں۔ بخلاف اس کے موت اور اس کی تلخیوں سے ہر شخص کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ہر شخص کی زندگی میں بہت سے مواقع ایسے آتے ہیں جب وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے عزیزوں، دوستوں، دریباروں کو مرتے دیکھتا ہے۔ بیکس اور کمزور بھی مرتے ہیں۔ طاقت اور ہیبت والے بھی مرتے ہیں۔ حسرتناک موتیں بھی واقع ہوتی ہیں عبرتناک موتیں بھی پیش آتی ہیں۔ اور آخر میں ہر شخص کو خود اسی راہ پر گزرنے کا یقین ہوتا ہے جس پر سب گزرتے ہیں۔ ان مناظر کو دیکھ کر شاید ہی کوئی انسان دنیا میں ایسا ہو جس کے دل میں موت کے سوال نے ایک الجھن نہ پیدا کی ہو۔ اور جس نے اس امر پر غور نہ کیا ہو کہ موت کیا ہے؟ انسان اس دروازے سے گزر کر آخر کہاں چلا جاتا ہے؟ اور اس دروازے کے پیچھے کیا ہے؟ بلکہ کچھ ہے بھی یا نہیں؟

یہ تو ایک عام سوال ہے جس پر عوام اور خواص سب نے غور کیا ہے۔ ایک معمولی کسان سے لے کر ایک بڑے فلسفی اور حکیم تک سب ہی اس میں الجھے ہوتے ہیں۔ لیکن اسی ضمن میں بعض اور سوالات بھی ہیں جو قریب قریب ہر صاحب فکر آدمی کے دل میں کھٹکتے ہیں۔ اور زندگی کے بہت سے تلخ واقعات اس کھٹک کو اور زیادہ بڑھا دیتے ہیں۔

یہ چند برس کی زندگی جو ہم میں سے ہر شخص کو اس دنیا میں ملتی ہے ہر لمحہ اور ہر آن کسی نہ کسی کام، کسی نہ کسی سعی اور کسی نہ کسی حرکت میں بسر ہوتی ہے۔ جس کو ہم سکون سمجھتے ہیں وہ بھی ایک حرکت ہے۔ جس کو ہم بیکاری خیال کرتے ہیں وہ بھی ایک کام ہے۔ ان سب میں ہر فعل کا ردفعل۔ ہر حرکت کی بازگشت، ہر کوشش کا ثمرہ اور ہر سعی کا انجام ضرور ہونا چاہیئے! نیکی کا پھل اچھا اور بدی کا پھل برا ملنا لازم ہے۔ اچھی کوشش کا نتیجہ اچھا اور بری کوشش کا نتیجہ برا ہونا ضروری ہے۔ مگر کیا ہماری تمام کوششوں کے نتائج، تمام مساعی کے ثمرات، تمام افعال کے جواب ہماری اس زندگی میں ہم کو مل جاتے ہیں؟ ایک بدکار نے تمام عمر شرارتوں میں گزاری بعض شرارتوں کا پھل بلاشبہ اس کو دنیا میں مل گیا۔ کسی شرارت نے اسے بیماری میں مبتلا کر دیا۔ کسی شرارت نے اس کو تکلیفوں اور مصیبتوں اور پریشانیوں میں پھنسا دیا۔ مگر بہت سی شرارتیں ایسی ڈھکی چھپی رہیں کہ ان کی وجہ سے اس کو بدنامی اور رسوائی تک نہ ہوئی اور اگر بالفرض بدنامی ہوئی بھی تو جس غریب پر اس نے ظلم کیا تھا اس کے نقصان کی کونسی تلافی ہوئی؟ پھر کیا اس شریر کے

یہ ظلم اور مظلوموں کے صبر، سب کے سب بے نتیجہ ہی رہیں گے؟ کیا ان کا کوئی انجام کبھی ظاہر ہی نہ ہوگا؟ یہی حال نیکیوں کا بھی ہے بہت سے نیک انسان عمر بھر نیکی کرتے رہے اور ان کا پورا پورا ثمرہ انہیں دنیا میں نہ ملا۔ بعض نیکیوں پر انہیں سزائیں ملیں۔ بعض نیکیوں کا حال کبھی دنیا پر کھلا ہی نہیں۔ پھر کیا ان غریبوں کی سب نیکیاں اکارت گئیں۔؟ کیا اتنی سخت محنتوں اور کوششوں کا صرف اتنا سی ثمرہ کافی ہے کہ انہیں ضمیر کا اطمینان نصیب ہو گیا؟

یہ سوال تو صرف اشخاص و افراد سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اس کے بعد ایک اور سوال انواع اور اجناس اور عناصر اور اس کے تمام عالم کے انجام سے بھی تعلق رکھتا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی مرتے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے پیدا ہو جاتے ہیں۔ درخت اور جانور سب فنا ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی جگہ دوسرے درخت اور جانور پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر کیا مرنے اور جینے کا سلسلہ یونہی جاری رہے گا؟ کیا کہیں پہنچ کر یہ ختم نہ ہوگا؟ یہ ہوا، یہ پانی، یہ زمین، یہ روشنی، یہ حرارت اور یہ قدرتی طاقتیں جن کے ساتھ یہ کارخانہ عالم ایک خاص ڈھنگ پر چل رہا ہے۔ کیا یہ سب لازوال ہیں؟ کیا ان کے لئے کوئی عمر مقرر نہیں ہے؟ کیا ان کے نظم اور ان کی ترتیب میں بھی کوئی تغیر واقع نہ ہوگا؟

اسلامی تصورِ آخرت

اسلام نے ان تمام سوالات کو حل کیا ہے اور اس کے نزدیک ان کا جواب یہ ہے کہ:۔

(۱) انسان کی دنیوی زندگی در اصل اس کی اُخروی زندگی کا مقدمہ ہے۔ یہ زندگی عارضی ہے اور وہ پائیدار ہے۔ یہ ناقص ہے اور وہ کامل۔ تمام اعمال کے پورے پورے نتائج اس عارضی زندگی میں مترتب نہیں ہوتے۔ اور نہ ہر وہ بیج جو یہاں بویا جاتا ہے اپنے فطری ثمرات کے لحاظ اس ناقص زندگی میں بار آور ہوتا ہے۔ اس نقص کی تکمیل اس دوسری زندگی میں ہوگی۔ اور جو کچھ یہاں بے نتیجہ اور بے ثمرہ رہ گیا ہے وہ اپنے حقیقی نتائج اور ثمرات کے لحاظ وہاں ظاہر ہوگا۔

(۲) جس طرح دنیا کی ہر چیز فرداً فرداً اپنی ایک عمر رکھتی ہے۔ جس کے ختم ہو جانے کے بعد اس میں فساد رونما ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس پورے نظامِ عالم کی بھی ایک عمر ہے جس کے تمام ہونے پر یہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا۔ اور کوئی دوسرا نظام اس کی جگہ لے گا جس کے قوانین طبعی اس نظام قوانین طبعی سے مختلف ہونگے۔

(۳) اس نظام کے درہم برہم ہوتے پر ایک زبردست عدالت قائم ہوگی جس میں ہر چیز کا حساب لیا جائے گا۔ انسان کو اس روز پھر ایک نئی جسمانی زندگی ملے گی۔ وہ اپنے خدا کے سامنے حاضر ہوگا۔ اس کے تمام اعمال جو اس نے اپنی پہلی زندگی میں انجام دیئے تھے ٹھیک ٹھیک جانچے اور تولے جائیں گے۔ حق اور انصاف کے ساتھ اس کے مقدمے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اچھے اعمال کی اچھی جزا ملے گی اور بُرے اعمال کی بُری سزا دی جائے گی۔

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیئے!

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

شوکت تھانوی مرحوم

اب سے تقریباً ۳۶ سال قبل ۱۹۲۶ء میں شوکت تھانوی مرحوم کے چند مزاحیہ افسانے رسالوں میں نگاہ سے گزرے، یہ اُن سے میرا پہلا غائبانہ تعارف تھا ——— ایک صاحب تھے نسیم سندیلوی (بی ۔ اے ۔ آنرز) ماہنامہ "اضطراب" اُن کی ادارت میں نکلتا تھا، اس رسالہ میں میری غزلیں اور مضامین بھی چھپتے تھے، اور شوکت تھانوی کا شمار تو اس ماہنامہ کے سرپرستوں میں ہوتا تھا، ان کا مشہور افسانہ "امروُ کا چورہ" مجلہ اضطراب ہی کی بدولت پڑھنے کو ملا، یہ وہ زمانہ ہے جب ملا رموزی کی "گلابی اُردو" کے ہر طرف چرچے تھے، اور اُس دور میں شاید ملا رموزی ہی وہ تنہا انشا پرداز تھے، جن کے مضامین کا بعض رسالے معاوضہ دیتے تھے ۔

۱۹۳۳ء میں سہ روزہ "مدینہ" (بجنور) روزنامہ کی حیثیت سے بھی شائع ہوا، مالک نصر اللہ خاں عزیز اس کے ایڈیٹر تھے، میں ان دنوں حیدر آباد دکن میں تھا، اور ہر طرح آرام سے تھا، مگر صحافت نگاری کے شوق میں اس پُر سکون ماحول کو چھوڑ کر روزنامہ "مدینہ" کی ادارت میں شامل ہو گیا، بجنور آکر معلوم ہوا کہ جناب شوکت تھانوی نے بھی اسسٹنٹ ایڈیٹری کے لئے درخواست بھیجی تھی، لیکن تنخواہ کا معاملہ طے نہ ہو سکا ۔

روزنامہ "مدینہ" چھ مہینہ نکل کر بند ہو گیا، اور میں پھر حیدر آباد دکن واپس آگیا۔ ۱۹۳۸ء میں وہاں سے کانپور کے مشاعرے میں آنا ہوا، کانپور سے لکھنؤ کیا دور تھا، پھر وہاں میرے ایک عزیز بھی رہتے تھے، اُن سے ملنے کے لئے لکھنؤ چلا آیا، چارباغ ریلوے اسٹیشن پر حضرت ارشد تھانوی نظر آئے، وہ بڑے تپاک سے بغل گیر ہوتے ہوئے بولے :۔

"ان سے تو ملئے یہ شوکت تھانوی ہیں، شوکت تھانوی ۔ ۔ ۔"

شوکت مرحوم سے یہ میری پہلی ملاقات تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا

بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

اُن سے بس مصافحہ ہو کر رہ گیا، چال ڈھال، وضع قطع اور چہرے مُہرے سے وہ بڑے شائستہ اور سنجیدہ نظر آئے۔ میں حیران تھا کہ اتنا سنجیدہ آدمی، ادب و انشاء کی دُنیا میں مسکراہٹیں بکھیرتا اور قہقہے لُٹاتا ہے ۔

اس کے بعد ۱۹۳۵ء یا ۱۹۳۶ء میں شوکت مرحوم سے ملاقات دلی کے کارونیشن ہوٹل کی ایک دعوت میں ہوئی، ان دنوں بھوپال میں بڑے پیمانے پر ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ شوکت صاحب نے اس مشاعرے کا ذکر اس انداز میں کیا جیسے اُس کے انتظام و اہتمام سے اُن کا تعلق ہے، فرمانے لگے آپ کو اُس مشاعرے میں آنا ہے ——— بعد میں معلوم ہوا کہ بھوپال کے کوئی ہندو مجسٹریٹ اس مشاعرے کے کنوینر ہیں، اور دلی کے چند شاعروں کے نام دعوت نامے آچکے ہیں، ایک دو شاعروں نے مجھ سے کہا کہ اُن صاحب

تمہارا پتہ معلوم نہیں ہے، تم اپنا پتہ انہیں لکھ کر بھیج دو ——— میں نے عرض کیا کہ خدا کی مجھ پر لعنت ہو، جو میں مشاعرے کے داعی یا کسی منتظم کو اپنا پتہ لکھ کر بھیجوں، پھر وہ کہنے لگے تو ہم تمہارے پتہ کی انہیں اطلاع دیئے دیتے ہیں، میں نے تاکید اور شدومد کے ساتھ انکار کیا کہ آپ ایسا ہرگز نہ کریں، بھوپال کا مشاعرہ بڑی دھوم دھام سے ہوا، مگر میرا وہاں جانا نہ ہو سکا۔

پاکستان بننے سے پہلے ہندوستان میں شوکت تھانوی مرحوم سے جن دو ملاقاتوں کا میں نے ذکر کیا ہے، وہ "ملاقاتیں" کیا تھیں، بس "آمنا سامنا" تھا، اُن سے اصل ملاقاتیں تو پاکستان بننے کے بعد ہوئیں، ہر مُلاقات کے بعد میل جول میں اضافہ ہو جاتا، پھر اُن سے اتنی بے تکلفی ہوئی اور اس قدر یارانہ بڑھا کہ رکھ رکھاؤ، خودداری، تکلف اور متانت و سنجیدگی کا کوئی پردہ بھی حائل نہیں رہا۔

تقسیم ہند سے قبل شوکت تھانوی مرحوم مزاح نگار انشاپرداز کی حیثیت سے مشہور اور معروف تھے، میں نے ہندوستان کے کسی ایک مشاعرے میں بھی اُنہیں نہیں دیکھا، اُن کی شاعری کے جوہر تو پاکستان بننے کے بعد نمایاں ہوئے! اُن کی مزاحیہ نظمیں مشاعروں کو سچ مچ "کشتِ زعفران" بنا دیتیں، سُننے والوں کو مشاعروں میں اُن کا انتظار رہتا، ہر بڑے مشاعرے میں اُنہیں بلایا جاتا، اور وہ کامیاب رہتے۔

شوکت تھانوی جب تک خاموش رہتے بڑے ہی سنجیدہ کم سخن اور متین نظر آتے، مگر جب بولتے تو پتہ چلتا کہ وہ تو بلبلِ ہزار داستان ہیں، علم مجلسی (TABLE TALK) کے تو وہ بادشاہ تھے۔ دوسروں کی کیسی کیسی نقلیں کرتے، کیسے کیسے مزیدار لطیفے سناتے اور اپنی نقلوں، لطیفوں اور چٹکلوں سے پوری محفل کو "دیوارِ قہقہہ" بنا دیتے! بارہا ایسا ہوا کہ دوستوں کی بے تکلف صحبت میں ایک لطیفہ میں نے بیان کیا، اُس کے جواب میں دوسرا لطیفہ شوکت نے! جواب الجواب اور عمل و ردِ عمل کا یہ سلسلہ دیر تک چلتا رہا، مگر بذلہ سنجی، اور لطیفہ گوئی کا میدان اُنہی کے ہاتھ رہتا جس انداز میں وہ کسی کی نقل اتارتے تھے، وہ بس اُنہی کا حصہ تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا کہ دُوسروں کی حرکت و ادا (GESTURES) کا وہ کس دیدہ ریزی کے ساتھ مطالعہ کرتے تھے، خاص طور سے جھوائی ٹولہ (لکھنؤ) کے ایک مشہور طبیب کی "نقل" تو شاعر کی مشہور و مقبول نظم کی طرح اُن سے منسوب ہو کر اور چسٹ کر رہ گئی تھی، بے تکلفی کی ہر محفل میں اس "نقل" کے لئے اُن سے فرمائش بلکہ اصرار کیا جاتا! شاید اسی شوق کی بدولت انہیں اپنے ادبی منصب سے نیچے اترنا پڑا، اور پاکستان کی ایک فلم (گلنار) میں انہیں ایکٹنگ کرتے ہوئے دیکھا گیا، کیا عجب ہو کہ اس کا سبب اُن کے معاشی حالات بھی ہوں!

جب وہ بے تکلف ہوتے اور موج میں آتے، تو چاہے اُن کے اہلِ خانہ ہی کیوں نہ موجود ہوں، مذاق کرنے سے نہ چوکتے، اور کبھی کبھی تو استعارہ اور کنایہ کا حجاب بھی اُٹھا دیتے۔ اُن کی باتوں میں بڑی گھلاوٹ پائی جاتی تھی، اور آواز و لہجہ کے بدلنے میں تو انہیں کمال حاصل تھا۔

بڑے بڑے مشاعروں میں شعر خوانی کے علاوہ شاعروں کی فہرست ترتیب دینے اور اُن کے ناموں کا اعلان کرنے کی خدمت بھی وہ انجام دیتے، بزمِ شعر و سخن کے وہ "کامیاب کنڈکٹر" تھے! شوکت تھانوی مرحوم سے لاہور میں آخری ملاقات اسی سال فروری میں ہوئی، جب میں مشاعرہ گاہ پہنچا ہوں، تو وہ صدرِ مشاعرہ کے قریب اسٹیج پر تشریف فرما تھے، اس مشاعرے میں ایک ناخوشگوار بات یہ پیش آئی کہ ایک شاعر کا نام جب شوکت مرحوم نے پکارا تو وہ ناراض ہو گئے، کہ مجھے میرے مقام پر نہیں بلایا گیا، اور شوکت صاحب ہر مشاعرے میں میرے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں، اپنی غزل پڑھ کر وہ صاحب مشاعرے ہی سے چلے گئے، شوکت مرحوم نے اعلان کیا کہ یہ فہرست مشاعرہ کے منتظمین کی مُرتب کی ہوئی ہے، اس میں میرا کوئی دخل نہیں ہے! اُن شاعر کی اس حرکت کو سبھی نے اُن کی تنک ظرفی پر محمول کیا۔

اس مشاعرے میں شوکت تھانوی کو میں نے ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش پایا، بیماری کی تھوڑی سی جھلک بھی اُن کے چہرے بشرے

سے نمایاں نہ تھی، وہی ہنسی خوشی کی باتیں اور مزیدار گفتگو! اس کے چند دن بعد اخبارات میں اُن کی علالت کی خبر پڑھی! پھر اُنکی حالت بگڑتی اور ابتر ہوتی ہی چلی گئی ۲۱ مارچ کو حیدرآباد کے مشاعرے میں مشہور و مقبول مزاحیہ شاعر سید محمد جعفری سے ملاقات ہوئی، اُنھوں نے شوکت تھانوی کی علالت کا حال تفصیل کے ساتھ سُنایا، میں نے اُن سے کہا کہ خدا کے لئے شوکت کو ان ڈاکٹروں کے چکّر سے کسی طرح نکالو، یونانی علاج کراؤ، اس سے اُنھیں انشاء اللہ فائدہ ہوگا۔

بہت دنوں تک تو ڈاکٹروں کی سمجھ میں یہی بات نہیں آئی کہ شوکت تھانوی کو کیا مرض لاحق ہے، پہلے یہ کہا گیا کہ اُن کا دل بڑھ گیا ہے، پھر دل میں "کینسر" تشخیص کیا گیا، جناب فضل کریم فضلی کے یہاں ۳ مئی کو "بزمِ جگر" کی نشست تھی، وہ شوکت مرحوم کو دیکھنے گئے تھے فرماتے تھے کہ انہیں دیکھ کر شوکت کی آنکھوں میں آنسو آگئے، مایوسی کی سی کیفیت! پھر وہ ذرا سنبھلے تو بسترِ مرگ پر بھی اُن کی طبیعت نے شوخی دکھلائی کہنے لگے:-

"ڈاکٹر کہتے ہیں کہ تم وسیع القلب ہوگئے ہو"——————

بزمِ جگر کی اس گفتگو کے دوسرے دن بقر عید سے ایک روز پہلے شوکت تھانوی کے انتقال کی خبر ملی، اور اُن کے دوست، احباب، شناسا اور مداحین بلکہ ساری اُردو دُنیا غم و الم میں ڈوب گئی! اُن کی موت پر ادیبوں، شاعروں، صحافت نگاروں، اسمبلی کے ممبروں، وزیروں یہاں تک کہ پاکستان کے عالی وقار صدر نے بھی غم کا اظہار کیا اخبارات نے تعزیتی مقالے لکھے—————اللہ تعالیٰ اُن پر اپنی رحمت و مغفرت نازل فرمائے (آمین)

شوکت تھانوی کی خانگی زندگی بڑی دُکھی زندگی تھی، وہ طرح طرح کی اُلجھنوں میں مبتلا تھے، مگر یہ انہی کا دل گردہ تھا کہ سینہ میں غموں کی بھٹی سلگ رہی ہے اور وہ لوگوں کے دامنوں کو مسکراہٹوں کے پھولوں سے بھرے جا رہے ہیں۔

شوکت تھانوی مرحوم کی شہرت کا ستارہ "سودیشی ریل" کے اُفق سے طلوع ہوا، اس کے بعد اُن کی شہرت بڑھتی اور پھیلتی ہی چلی گئی، انھوں نے درجنوں کتابیں لکھیں اور ہر کتاب مقبول ہوئی، طنز و مزاح میں وہ ممتاز مقام رکھتے تھے! اُن کی تحریریں خاص و عام شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھتے تھے! ریڈیو پاکستان سے انھوں نے برسوں "قاضی جی" کے نام سے فیچر نشر کئے ہیں اور کروڑوں آدمیوں کے دل و دماغ کو نشاط و انبساط اور فرحت و آسودگی دی ہے————— اُن کے بارے میں ایک بات تو عجیب سُننے میں آئی—————یہ کہ وہ ایک ایک نشست میں صفحے کے صفحے لکھ ڈالتے، مگر اُس پر نظرِ ثانی نہ کرتے، جو ایک بار لکھدیا، بس وہی مسودہ ہوتا اور مبیضہ بھی! اُن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودے میں کوئی سطر کہیں سے کٹی ہوئی نہ ہوتی! یہ دلیل ہے اُن کی پختہ مشقی، خود اعتمادی اور حاضر دماغی کی! سُنا ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی مرحوم کا بھی ایسا ہی اندازِ تحریر تھا کہ وہ مضمون لکھ کر اُسے دوبارہ نہیں پڑھتے تھے! اور مجھے تو یہ بات عجیب ہی نہیں "کرامت" معلوم ہوتی ہے کہ میں اپنی تحریر کو بار بار پڑھتا ہوں، اور ہر بار کچھ نہ کچھ کاٹ چھانٹ اور اضافہ ہو جاتا ہے————— کئی سال سے وہ روزنامہ "جنگ" (راولپنڈی) کے مدیرِ اعلیٰ تھے اور ایک ہی وقت میں سیاسی اداریہ فکاہی کالم لکھتے!

شوکت تھانوی شاعری میں حضرت آسی الدنی (جو بعد میں اپنے نام کے ساتھ "الدنی" کی بجائے لکھنوی لکھا کرتے تھے) کے شاگرد تھے، انھوں نے بہت سی سنجیدہ غزلیں بھی کہی ہیں، جو "گہرستان" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں، سنہ ۱۹۲۵ء اور سنہ ۱۹۲۳ء میں لکھنؤ، الہ آباد اور اس نواح کے مشاعروں میں شوکت تھانوی مشاہیر کے ساتھ شریک ہوتے تھے، مگر اُن کا یہ رنگ اُن کی مزاح نگاری اور ظریفانہ شاعری کے آگے نہ صرف یہ کہ پھیکا پڑ گیا، بلکہ دب کر رہ گیا۔

پچھلے دو تین سال اُردو دنیا کے لئے کتنے غمناک اور الم انگیز ثابت ہوئے ایک نامور ادیب یا شاعر کی موت کا زخم بھرنے نہیں پاتا کہ کوئی دوسرا سانحہ اور المیہ پردۂ غیب سے ظہور میں آجاتا ہے! کیا ہماری قسمت میں ماتم گساری اور سوگواری ہی لکھی ہوئی ہے! کچھ دنوں سے شعر و ادب کی دنیا میں سچ مچ چل چلاؤ لگ رہا ہے! سب سے زیادہ غم اس بات کا ہے کہ دُنیا کی مکروہات نے دلوں کو سخت کردیا ہے' ان سانحوں اور المیوں سے قلوب عبرت حاصل نہیں کرتے ہماری وہی غفلتیں اور آخرت فراموشیاں ہیں جیسے یہ وقت ہم پر آنا نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو وہ گداز عطا فرمائے، جو عبرت کے نقوش قبول کرسکے، اور ہمیں اپنی دُنیا بنانے کی جتنی فکر ہے اپنی آخرت کی بھلائی کے لئے بھی کچھ کرسکیں۔

ہماری نظر میں

تعلیماتِ غزالیؒ

از :- مولانا محمد حنیف ندوی ، ضخامت ۵۷۰ صفحات (مجلد)
ملنے کا پتہ :- ادارۂ ثقافت اسلامیہ ، کلب روڈ ، لاہور

جناب مولانا محمد حنیف ندوی نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کو بڑے سلیقہ کے ساتھ اُردو میں پیش کیا ہے اور خاص طور سے امام غزالی کی اس خصوصیت کو اُجاگر کیا گیا ہے کہ انھوں نے کیونکر فقہ کی تفصیلات کو تصوف کے رنگ میں بیان کیا ہے ——— مولانا موصوف نے اس کتاب پر عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے اپنے مقدمہ میں "تصوف" کو جس انداز میں پیش فرمایا ہے ، اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا صوفیاء کی مشہور اصطلاحات (مثلاً قبض و بسط ، محو و اثبات ، صحو و سکر ، لوائح ، طوالع اور لوامع وغیرہ) کی انھوں نے عام فہم تشریح کی ہے :—

"تعلیماتِ غزالی" کے چند اقتباسات :—

"خلوت کا اعلیٰ مرتبہ بہرحال یہی ہے کہ انسان "کائن و بائن" رہے ، یعنی بیک وقت اپنے گرد و پیش پھیلی ہوئی کائنات سے بھی تعلق رکھے اور دل کے لطائف سے بھی بیگانہ نہ ہونے پائے"

اور

"نفس کے اندر بجائے خود ایک اقلیم افکار آباد ہے ، ایک دُنیا ہے تصورات ہنگامہ آرا ہے ، اس کے باطن میں اتنے ہنگامے اور شورشیں ہیں مقامات ہیں ، منزلیں ہیں ، حُسن ہے دلآویزی اور دلبری کے انداز اور تیور ہیں ، شرط یہ ہے کہ کوئی شخص بیرونی جاذبیتوں سے عنانِ توجہ کو موڑ کر نفس کے اندر جھانک کر دیکھے غور و تعمق کی خو ڈالے ، اور اس بحرِ بیکراں میں ڈوب جانے کی لذت سے آشنا ہو ، پھر دیکھئے کن کن لذات سے دوچار ہونے کا موقع ملتا ہے اور کیا کیا لطائف اور گہر ہائے معانی ہاتھ آتے ہیں ، اور اگر اس غور و خوض کا مقصد اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی ہو ، اور اس کا محبوب نصب العین کا حصول ہو ، جس کے جمال جہاں افروز کی ادنیٰ جھلک کا ظہور یہ گلستانِ حیات ہے ، جس کو آپ خارجی مادی دُنیا سے تعبیر کرتے ہیں ، تو اندازہ کیجئے ، یہی ذات اپنے عشاق اور دیوانوں کے لئے دُنیائے باطن میں کن کن دلچسپیوں کا سامان مہیا نہیں کر سکتی ، اور ان کے دلِ ویراں کے لئے آبادی و معموری کا کیا اہتمام نہیں کر سکتی ؟"

عورتوں کو کن اخلاق و عادات کا حامل ہونا چاہیئے ——— اس کے بارے میں امام غزالی قدس سرہٗ کی رائے کتنی وزنی اور اخلاق و غیرت کے تقاضوں کے کس قدر مطابق ہے :—

"اپنے گھر کو تگ و دو کا مرکز قرار دیں، اور بغیر کسی ضرورت کے گھر سے باہر نہ نکلیں، پڑوسیوں سے گفتگو اور بے تکلفی کا سلسلہ نہ بڑھائیں تاکہ وہ انہیں حالات میں اُس کے یہاں آنے کی جرأت کریں جب کہ آنا ضروری ہو، اور کوئی اہم کام ہو، شوہر کی غیر حاضری میں بھی عزت و ناموس کے تقاضوں کا خیال رکھیں اور ہر بات میں اُس کی خوشنودی مدِ نظر رکھیں گھر سے نکلیں تو اجازت لے کر، اپنے کو چھپاتے ہوئے تردّی اور گھٹیا لباس پہن کر! جس پر کسی کی نظر نہ پڑے!——
معروف بازار اور بارونق گزرگاہوں کو چھوڑ کر ایسے راستوں پر چلیں جہاں بھیڑ کم ہو، کوئی جان پہچان نہ ہو، اور کوئی اجنبی اُن کی آواز کو سُن نہ سکے، اپنے شوہر کے دوستوں سے کوئی چیز طلب نہ کریں، بلکہ اگر یہ معلوم ہو کہ فلاں شخص اس کے شوہر کا دوست ہے، تو اُس پر کچھ ظاہر نہ کریں، اپنی اصلاح، گھر کی دیکھ بھال اور نماز روزہ میں مصروف رہیں، کوئی شخص اگر دروازہ کھٹکھٹائے، اور اُس کے شوہر کے بارے میں پوچھے تو اس سے زیادہ کلام نہ کریں ———"

آج کی دُنیا پر غور کیجئے کہ "عورت" اس تعلیمات کے بالکل خلاف جا رہی ہے، اس لئے ایسی ایسی اخلاقی بُرائیاں عام ہوتی جا رہی ہیں، جن کے تصور سے شرافت و غیرت کے ماتھے پر پسینہ آجاتا ہے۔

کیا حُسن و جمال سے لُطف اندوزی کا محرک ہمیشہ جنسی جذبہ ہی ہوتا ہے؟ اس عنوان کے تحت امام غزالیؒ کی تعلیمات کا خلاصہ اِن الفاظ میں پیش کیا گیا ہے:—

"——— انسان کبھی کسی شخص کو محض اس کے حسن و جمال یا کسی مخفی مناسبت کی وجہ سے چاہتا ہے، اور اس سے کوئی دنیوی یا اُخروی مقصد وابستہ نہیں کرتا، چاہنا ضروری نہیں کہ جنسی جذبہ کی وجہ سے ہو، اور مادی خواہشات ہی اس کا باعث اور سبب ہوں، اگر ہم آبِ رواں کو دیکھ کر محظوظ ہوتے ہیں، عُمدہ پھولوں سے دل بہلاتے ہیں، گوناگوں پھلوں کو دیکھ کر نظرو بصر کے لئے سامانِ راحت پیدا کرتے ہیں، اور سیب کی سُرخی سے طرب و انبساط کی کیفیتیں دل میں پاتے ہیں اور اس میں کوئی معصیت اور گناہ نہیں سمجھتے، تو کوئی وجہ نہیں کہ اچھی شکلوں کو دیکھ کر دیدہ و دل متاثر نہ ہوں، مجرد تاثر کی یہ کیفیت فی نفسہٖ نہ بُری ہے نہ اچھی۔ یہ محض تقاضائے فطرت ہے جو بالکل جائز اور روا ہے ہاں! اسے اگر بُرے جذبات سے آلودہ کریں، تو بلاشبہ یہ گناہ و معصیت کی صورت اختیار کرلے گی، محبت کی یہ قسم "الحب فی اللہ" کے دائرے میں بہرحال داخل نہیں ہے۔" (ص ۲۳۲)

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا! ایک نامحرم حسین عورت کے چہرے کو دیکھ کر جو تاثر ہوتا ہے، وہ اس تاثر سے بڑی حد تک مختلف ہے، جو آبِ رواں، لالہ و گل اور قوسِ قزح کو دیکھ کر ہوتا ہے! ان مناظر کو دیکھ کر جنسی جذبات میں تحریک پیدا نہیں ہوتی کہ ان اشیاء کو دیکھا جا رہا ہے، وہ خود جذبات نہیں رکھتیں ——— مگر حسین عورت کو دیکھ کر جنسی جذبات میں حرکت پیدا ہوتی ہے کہ ادھر بھی جذبات موجود ہیں یہ فطری بات ہے! اسی لئے تو حدیث شریف میں

آنکھ سے دیکھنے کو "نگاہ کا زنا" فرمایا گیا ہے، ہاں! پہلی نظر جو اتفاقیہ پڑ جائے، تو وہ معاف ہے، اس کے بعد جو نگاہ ڈالی جائے گی، وہ یقیناً ہوس آلود ہوگی، اس لئے لالہ و گل، آب رواں، سبزہ زار، اور قوس قزح کے نظارے کی طرح، غیر عورتوں اور مردوں کے چہروں کا بالقصد دیکھنا اور اُن سے لطف اندوز ہونا معصیت ہے۔

قدرت اپنی حکمیوں اور اُستواریوں کے باوجود۔ ۔ ۔ (ص ۱۳۰) "حکمیوں" عام طور پر بولا اور لکھا نہیں جاتا ——— "اس پر بوجھ یا بار ثابت ہوتا ہے"۔ (ص ۲۵۱) کیا "بوجھ" اور "بار" مفہوم و معنی کے اعتبار سے کچھ فرق رکھتے ہیں ——

"یہی نکتہ دلنواز کو بشر نے محسوس کیا"۔ (ص ۳۲۸)

غالباً بشر سے مشہور صوفی بشر حافی (رحمۃ اللہ علیہ) مُراد ہیں، اگر متن میں صرف بشر لکھا گیا ہے، تو ترجمہ میں "حافی" کا اضافہ کر دینا چاہیے تھا

"معاصی اس کے (یعنی اللہ تعالیٰ کے) ہاں ناپسندیدہ نہیں مگر مُراد ہیں" (ص ۳۶۵)

یہ کتابت کی فاحش غلطی ہے کہ "پسندیدہ نہیں" یا "ناپسندیدہ ہیں" کی جگہ "ناپسندیدہ نہیں" چھپ گیا۔

". . . اُس کی دلچسپیاں اُس کے فراغوں کو کس حد تک بھرتی اور معمور رکھتی ہیں"۔ (ص ۴۷۵)

"فراغوں" نہ جانے کس لفظ کا ترجمہ کیا گیا ہے، اس ایک لفظ نے اس جملہ میں بڑا اُلجھاؤ پیدا کر دیا، اُردو میں "فراغ" کی جمع نہیں آتی

مولانا محمد حنیف ندوی عربی ادب کے عالم ہیں، فلسفی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے دینی فکر و مزاج بھی رکھتے ہیں، اُردو زبان و ادب کے وہ شگفتہ نگار انشا پرداز بھی ہیں۔ اگر صاحب موصوف علامہ ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ جیسے اکابر کی تعلیمات و افکار کو بھی اُردو میں منتقل فرما دیں، تو اُن کا اُردو دنیا پر بڑا احسان ہوگا۔

"تعلیماتِ غزالی" کوئی شک نہیں بڑے اُونچے درجے کی کتاب ہے، یہ ایک طرف اخلاق و تزکیہ نفس کا صحیفہ ہے تو دوسری طرف نفسیات اور علم و فکر کا دفتر ہے، مولانا محمد حنیف ندوی اس کتاب کی تالیف و ترتیب اور ترجمانی پر علمی دنیا کی طرف سے مُبارکباد کے مستحق ہیں۔

مروجہ معاشیات اور اسلام

از :- چودھری محمد اسماعیل، ضخامت ۱۴۴ صفحات، قیمت :- ایک روپیہ

ملنے کا پتہ :- (مصنف سے) ۷۶۹/۱ تیلی محلہ، مری روڈ، راولپنڈی۔

فاضل مصنف نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ مسلمانوں کا نظام معاشیات، جن خطوط پر چل رہا ہے، وہ اسلام کے مطابق نہیں ہے، سود کسی نہ کسی عنوان سے ہر شعبہ معیشت میں داخل ہو گیا ہے، جس طرح بھی ممکن ہو "نفع اندوزی کرو" یہ مسلمانوں کا یہ عام ذہن ہو گیا ہے! کوئی شک نہیں اس کتاب میں بہت سی اچھی باتیں بیان کی گئی ہیں مگر وہ "سود خواری" کی تردید کرتے ہوئے اس انتہا تک پہونچ گئے ہیں کہ کمپنیوں کے حصوں اور مکان کے کرایہ اور تجارت وغیرہ کے منافع میں بھی انہیں سُود نظر آتا ہے، اُن کی کتاب میں جہاں جہاں یہ فکر جھلکتی ہے، وہ غیر متوازن ہے اور دینی نقطۂ نگاہ سے نادرست ہے۔

ضبطِ ولادت عقلی اور شرعی حیثیت سے

از :- محمد تقی عثمانی، ضخامت ۱۲۰ صفحات (مجلد) قیمت :- ڈیڑھ روپیہ۔

ملنے کا پتہ :- دار الاشاعت مولوی مسافر خانہ، کراچی

اس کتاب پر مقدمہ پروفیسر خورشید احمد صاحب نے لکھا ہے اور "ضبطِ ولادت کی شرعی حیثیت" یہ باب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے تحریر فرمایا ہے؛ مولانا محمد تقی صاحب

نوجوان عالم ہیں اور اپنے والد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی مدظلہ کے تربیت یافتہ ہیں، اس لئے "الولد سرٌ لابیہ" کے مصداق ہیں!

مولانا محمد تقی عثمانی نے عقل ونقل کے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ "ضبط ولادت" ایک غلط قسم کی تحریک ہے اور اس کے نتائج انسانیت کے حق میں معصیت رساں ہی ثابت ہوں گے! پروفیسر خورشید احمد صاحب کے مقدمہ نے اس کتاب کی افادیت اور علمی وزن میں اور اضافہ کردیا ہے، کاش! یہ کتاب ان حضرات کی نگاہ سے گزر جائے، جو بڑھتی ہوئی آبادی سے سہمے جاتے ہیں اور "ضبط ولادت" کے علاوہ اس کا کوئی دوسرا حل انہیں نظر ہی نہیں آتا!

ابن مبارک

از:- محمد یوسف اصلاحی، ضخامت ۴۸ صفحات، قیمت:- ۵۰ نئے پیسے۔
ملنے کا پتہ:- مکتبہ "الحسنات" رام پور (انڈیا)

اس کتاب میں مشہور محدث حضرت عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی کو، عام فہم اور سلیس انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کتاب کے مطالعہ سے خوش اخلاقی اور زہد و پاکیزگی کا جذبہ ابھرتا ہے!

"جس کے پاس نہ روپیہ پیسہ تھا، نہ کوئی گھر اور نہ ہی کسی اونچے گھرانے سے اس کا تعلق تھا" (ص ۹)

کیا سنجیدہ اور علمی طبقوں میں بھی "نہ ہی" لکھنے اور بولنے کی وبا پہونچ چکی ہے ——— صفحہ ۲۱ پر کتابت کی غلطی کے سبب "اندر ہی اندر کڑھنے" کی بجائے "اندر ہی اندر کھڑنے" چھپ گیا۔

یہ کتابچہ زیادہ سے زیادہ اشاعت کا مستحق ہے کہ اس میں شروع سے لے کر آخر تک نیکی اور بھلائی کی تلقین پائی جاتی ہے۔

میٹھے بول

از:- عابد نظامی، ضخامت ۸۰ صفحات (کتابت، طباعت، کاغذ، سرورق، ہر چیز دیدہ زیب!)
قیمت:- ایک روپیہ ۲۵ پیسے۔ ملنے کا پتہ:- مکتبہ تعمیرِ انسانیت، موچی دروازہ، لاہور!

اس کتاب میں جناب عابد نظامی کی نظموں کو یکجا کیا گیا ہے، جو بچوں اور بچیوں کے لئے کہی گئی ہیں، نظمیں ہلکی پھلکی اور سادہ و دلنشین ہیں، ان میں اخلاق کا رنگ جابجا جھلکتا ہے، نظمیں بچوں کی نفسیات کے عین مطابق ہیں۔

نمونہ کے لئے ایک نظم یہاں درج کی جاتی ہے:-

پہلے تو لو! پھر منہ کھولو
جھوٹ برا ہے جھوٹ نہ بولو
جب بھی بولو سچ ہی بولو
تول ہمیشہ پوری تولو
صبح کو جلدی آنکھیں کھولو
پیار کے رس میں زہر نہ گھولو
علم و ادب کے
موتی رولو!

کتاب میں کہیں کہیں اس قسم کے اکھڑے اکھڑے مصرعے بھی آگئے:-

شام کو اباجی سنئے کے
[illegible]

اس کتاب پر مولانا کوثر نیازی، جناب احمد ندیم قاسمی اور ماہر القادری نے تعارف، دیباچہ اور پیش لفظ لکھا ہے، یہ کتاب بچوں کے سب سے بڑے شاعر مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کے نام معنون کی گئی ہے! جناب عابد نظامی کی یہ نظمیں بچوں میں یقیناً مقبول ہونگی، اور اُن کے یہ "میٹھے بول" دلوں کو موہ لیں گے۔

اُردو زبان اور عورت

از:- محترمہ وحیدہ نسیم، مقدمہ:- حضرت جوش ملیح آبادی، تقریظ:- جناب اختر رحمانی، ضخامت ۱۲۲ صفحات، ملنے کا پتہ:- ماہنامہ "انتخاب نو" کراچی۔

"اُردو زبان اور عورت" یہ ایک مقالہ نہیں پوری کتاب ہے، جو ماہنامہ "انتخابِ نو" کی خصوصی اشاعت کی زینت ہے! اس کتاب کے ان عنوانات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اپنے موضوع پر یہ کتنی جامع اور تحقیقی کتاب ہے۔

زبان مادری کیوں کہلاتی ہے ——— عورت اور اُردو کی ابتدا ——— عورتوں کی زبان مغلیہ دور میں ——— عورتوں کی زبان مغلیہ دور کے بعد ——— عورت کے ایجاد کردہ الفاظ ——— ایسے الفاظ جو خانہ داری کے لئے ایجاد ہوئے ——— عورتوں کی زبان کے ایسے الفاظ جن کے ہم معنی الفاظ موجود نہیں ——— کیفیات اور صوتی اثرات ——— الفاظ کی تراش خراش ——— ایسے الفاظ جن کے معنی عورتوں نے بدل دیئے ——— عورتوں کی زبان کا معاشرت پر اثر ——— عورتوں کی زبان میں اظہارِ جذبات ——— عورتوں کا حساب کتاب —

یہ پہلی کتاب ہے جو اس قدر تحقیق و کاوش کے ساتھ اس موضوع پر لکھی گئی ہے، اس کتاب نے اُردو زبان کی لفظی تحقیق کے بارے میں سوچنے کی نئی راہیں کھول دی ہیں، محترمہ وحیدہ نسیم ایک شاعرہ اور افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت رکھتی ہیں، اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ "اُردو لسانیات" میں بھی انہیں بصیرت حاصل ہے۔

آمنہ کا لال

از:- جلال ایم۔ اے (کڑپوی) صفحات ۶۴ صفحات، قیمت:- ۶۲ نئے پیسے۔ ملنے کا پتہ:- مکتبہ مظفری نیوٹون، وانمباڑی (ضلع شمالی ارکاٹ، انڈیا)

جناب جلال (ایم۔ اے) اسلامیہ کالج وانمباڑی میں اُردو اور فارسی کے چیف لیکچرار ہیں، موصوف متعدد کتابوں کے مصنف ہیں! اس کتاب میں اُن کی نعتیہ غزلیں اور نظمیں شامل ہیں! جو عشقِ رسول سے لبریز ہیں اور اُن میں خاصی روانی پائی جاتی ہے ——— بعض مقامات اس انداز کے بھی ہیں:-

جس نے کبھی چرائیں حلیمہ کی بکریاں　　اک کائناتِ علم کا وہ رہنما ہوا (ص ۱۲)

"کائناتِ علم" کیا ہوتی ہے اور پھر اُس کی رہنمائی!!

زمینِ کربلا کے سُرخ ذرے اب بھی کہتے ہیں
اقلیت کے حق میں کیمیا ہے سر کی قربانی (ص ۲۵)

سر کی قربانی کو "کیمیا" کہنا، عجیب فکر اور انداز بیان ہے۔

اے رسولِ ہاشمی! تیرا جو پیارا ہو گیا　　فضلِ حق ٹھیک ہوا، اُس کا اجالا ہو گیا (ص ۲۶)

"فضلِ حق ٹھیک ہوا" اس نے مصرعِ ثانی کو کمزور بنا دیا۔

ثنائے محمد کئے جا رہا ہوں　　عقیدت کی نبضوں کو تھرکا رہا ہوں (ص ۳۸)

اول تو "عقیدت کی نبضیں" ہی وجدان کو کھٹکتا ہے، پھر ان کا "تھرکانا" اُس پر مستزاد!

تمہاری ذات کا عرفاں، صفاتِ حق کا عرفاں ہے　　خدائی اور خدا میں حجاب درمیاں تم ہو
ہوا ثابت یہی بدر و احد کی فتح یابی سے　　جدھر تم ہو اُدھر حق ہے جہاں حق ہے وہاں تم ہو

کتاب میں جہاں یہ رنگ ہے، وہاں ذوق و طبیعت نشاط و فرحت محسوس کرتے ہیں۔

قادیانی اور مسلمان

از:- حکیم عبدالرحیم اشرف۔ ضخامت ۱۶ صفحات،
ملنے کا پتہ:- مکتبہ المنبر، پوسٹ بکس ۲۱، لائل پور۔

اس کتابچہ میں مرزا غلام احمد قادیانی (علیہ ما علیہ) کے اقوال و دعاوی پیش کئے گئے ہیں، جن سے یہ بات کسی شک و شبہ کے بغیر ثابت ہوتی ہے کہ اس شخص نے جھوٹی نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اور اس کے نزدیک تمام مسلمان جو اسے نبی نہیں مانتے کافر ہیں! یہ شخص بدزبان بھی تھا اس نے دعویٰ کیا ہے کہ جو لوگ اُسے نبی تسلیم نہیں کرتے، وہ سور ہیں اور اُن کی عورتیں کتیاں ہیں!

قادیانی اخبارات نے کچھ دن سے سر ظفر اللہ خاں کی حمایت میں جارحیت کی روش اختیار کی ہے۔ اور وہ ایسی باتیں کہہ رہے ہیں، جن سے پاکستانی مسلمانوں کے قلوب مجروح ہوتے ہیں! مولانا حکیم محمد اشرف نے قادیانی اخباروں کی اس روش پر جائز گرفت کی ہے۔

مولانا حکیم محمد اشرف صاحب نے افادۂ عام کے لئے یہ پمفلٹ بر وقت مرتب فرمایا ہے، جس کے لئے اللہ تعالیٰ اُنہیں دارین میں اجرِ عظیم عطا فرمائے گا! یہ پمفلٹ انہیں مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر "صدقِ جدید" کی خدمت میں ضرور بھیجنا چاہیئے، جو قادیانیت کی تائید و مدافعت میں بڑی سرگرمی کا اظہار کر رہے ہیں، اور اس طرح اُن کے "سوءِ ایمان" کا قوی خطرہ پیدا ہو گیا ہے!

وجدانِ سلیم

از:- اسعد شاہجہاں پوری، ضخامت ۲۵۲ صفحات (مجلد، رنگین گردپوش) قیمت:- پانچ روپے
ملنے کا پتہ:- مکتبہ دوارن، ۲۴ جوبلی مینشن بارنس اسٹریٹ، کراچی۔

جناب اسعد شاہجہاں پوری کا شمار اساتذۂ عصر میں ہوتا ہے، وہ ایک کہنہ مشق اور صاحبِ علم شاعر ہیں، اور پچاس سال سے خاموشی کے ساتھ زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں! اسعد شاہجہاں پوری کے کلام میں سنجیدگی اور شائستگی پائی جاتی ہے! حسن و محبت کی انھوں نے ترجمانی کی ہے مگر متانت کے حدود میں رہ کر! صاحب موصوف غزل، قطعہ، رباعی قصیدہ اور مرثیہ سبھی کچھ کہتے ہیں، اس طرح اُن کی فنکاری جامعیت کی خصوصیت رکھتی ہے، ان کا کلام قدامت اور جدت کا برزخ ہے! اسعد صاحب کے خمخانۂ شعر و سخن میں "شرابِ کہنہ" کے ساتھ ساتھ "بادۂ نوکشیدہ" بھی ملتی ہے۔

اُن کے چند منتخب اشعار:-

پھر مرے زخمِ کہن تازہ کئے جائیں گے　　پھر مرا ذکر بہ تقریبِ گلستاں نکلا
خدا کی سلطنت میں بندۂ آزاد ہو کر بھی　　بُتوں کی بندگی بیچارگی سے کچھ نہیں ہوتا
یُوں خرابات سے نکلا، تو نئی دُنیا تھی　　غم سے بیگانہ ہوا، فکر سے آزاد آیا
بس لگی تھی ترے دیوانے کو بہت پیار ہو گیا　　اپنا سنبھالنا مجھے دشوار ہو گیا
یا میری اُمیدوں پہ کرو رحم خدارا　　یا مجھ سے یہ کہدو کوئی پیماں نہ کیا تھا
دیوانہ ہوں کسی کو نہیں میرا اعتبار　　اب انکشافِ حال بھی پردہ ہے راز کا
لالہ و گل میں مرے خونِ جگر ہی سے ہے تاب　　میں جو گلشن میں نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
بہار آئی مگر میرے تماشا کون ہوتا ہے　　کھلے گل اور اُن کا عارضِ بے غازہ یاد آیا

بے حجابی کا بھی پردہ کچھ تو رکھنا چاہیئے
ہائے! وہ صبح جوانی، ہائے وہ عہد شباب
اس کی رحمت نے نظر کی جو گنہگاروں پر
ہم نہ سمجھے تھے کہ اتنی جلوہ سامانی کے بعد
یاد رکھنے کے لئے ہوتی ہے کب واعظ کی پند
کہے کون اب فسانہ، مری حسرت نکلا
آغاز میں ہر چیز نظر آتی ہے دلکش
سہل جاتی تھیں افسردگیاں برسوں کی!
غم اتنے ہیں اک جام میں سب غرق نہ ہونگے
ایسے نامحرم کا میرے کارواں میں کام کیا
اک جرعہ اس طرف بھی شرابِ کہن کی خیر
اک دردمند نالہ کرلے یار پرجوش
ہاں! اُٹھا لے جام ساقی کی اجازت کے بغیر
اسعد نفس سرد ہے بیگانۂ تاثیر
بقدرِ ذوق نہیں انجمن کا سوز و گداز
عجیب سی ہے مری رند مشربانہ حیات
اپنا دیدار دکھا دے مجھے بے زحمتِ چشم
جی چاہتا ہے سرد کریں دل کے ولولے
اب جو سنتے ہیں کسی سے تو تڑپ جاتے ہیں
ہم اس حیات پہ تہمت لگائے بیٹھے ہیں
نہ وہ تزئینِ سحر ہے، نہ وہ رنگینیٔ شام
دل کی بے تابی چھپاؤں تو چھپا سکتا نہیں
موسم توبہ شکن، مہر ساقی رنگیں مزاج
کمالِ عشق کی تصویر زرنگار ہوں میں
دے چکا ہوں بارہا موجِ حوادث کو شکست
جھیلنا ہے اے جنوں! طولِ شبِ غم حشر تک
جھوٹی تسلیوں سے وہ بہلائے جاتے ہیں
بڑا سفاک ہے ظالم! تبسم زیرِ لب تیرا
ذرہ ذرہ مہر رخشاں، پتا پتا نخل طور

میں بھی مجبور مری آنکھوں کو دھوکا ہو گیا
برق سی چمکی، شرر سا مسکرا کر رہ گیا
مجھ سا ناکردہ گنہ ہوں پہ پشیماں نہ ملا
خود ہمیں کو پردہ حائل بنایا جائے گا
وہ نظر دی کہ جلوۂ محراب و منبر ہو گیا
نہ چراغ انجمن کے، نہ ستارہ ہے سحر کا
دنیا تھی کبھی میری تمنا کی طرح شاد
چہرے جھلکیں گے مگر گردش صد جام کے بعد
اے پیر مغاں اور مرے پیر مغاں اور
جو اٹھاتا ہوں قدم دشوار و آساں دیکھ کر
ساقی تری شرابِ مقدس شکن کی خیر
پندارِ حسن و ناز کی یلغار دیکھ کر
تشنہ لب رہ جائے گا رندانہ جرأت کے بغیر
یہ مزرعِ امید ہے حاصل سے بہت دور
نکھار دیجئے نغمہ ابھار دیجئے ساز
کہ شب بہ نغمہ و رامش، سحر بہ عبرت و ہوش
اپنی آواز سنا دے مجھے بے منتِ گوش
کچھ آگ لے کے ساقیٔ توبہ شکن سے ہم
ہم بھی کھاتے تھے کبھی اپنی جوانی کی قسم
کہ جس کے ایک نفس کا بھی اعتبار نہیں
اس میں خود گردش دوراں کا زیاں ہے کہ نہیں
عشق ہے وہ جرم کوئی عذر لا سکتا نہیں
رخصت اے تقویٰ کہ میں محروم جا سکتا نہیں
بہار تم ہو تو آئینۂ بہار ہوں میں
ڈوبنا ممکن نہیں گو ڈوبتے پانی میں ہوں
یوں گریباں چاک کرنے سے، سحر ہوتی نہیں
لیکن پھر فریب میں ہم آئے جاتے ہیں
لے کتنی بہاروں سے بچایا تھا گریباں کو
دیکھنے والے تجلی کم نہیں ہے، کم نہ دیکھ

ہر حادثہ کو سینہ سپر ہو کے دے شکست
ہر دردِ زندگی کی طرف مسکرا کے دیکھ

سجاتے تھے ہزاروں حسرتوں کی انجمن ہم بھی
لیے ہیں خود تراشیدہ بتوں کے برہمن ہم بھی

طاقت کسے یہ رنج گوارا کرے کوئی
دیکھے مجھے پھر اُن کی تمنا کرے کوئی

تم تابِ حسن میں ہو سوا آفتاب سے
یہ بھی نہیں کہ دُور سے دیکھا کرے کوئی

زاہد قسم ہے، کم تو نہیں اس سے میکدہ
تو نامے میں بھول گیا، اُس کا نام بھی

لو تو دیں میرے شبستانِ تصور کے چراغ
دیکھنا کچھ بھی نہ ہونے پہ یہاں سب کچھ ہے

دو گھونٹ دے رہا ہے تو ساقی معاف رکھ
میرے سُرور کے نہ شکستِ خمار کے

اس کے لئے حرام ہے سیرِ بہارِ حُسن
جو احتیاطِ جیب و گریباں نہ کر سکے

ضبطِ وحشت کس قدر مجبوریوں کا نام ہے
پاؤں صحرا تک نہ پہونچے، ہاتھ داماں تک نہ جائے

زباں پہ رہتا ہے ذکرِ کوثر مئے سے واقف نہیں ہو واعظ
بچی کھچی رہ گئی تو اک دن ضیافتِ پارسا کریں گے

ہم خزاں میں بھی منا سکتے ہیں یوں جشنِ بہار
تم ہنسو، پھول کھلیں، آنکھ اُٹھے جام آئے

ناشناسی ہے زمانے پہ بھروسا کرنا
کبھی زہر لئے ہے، ابھی تریاک لئے

کچھ اُمیدیں دے رہی ہیں آرزوؤں کو فریب
عشق نے الجھا دیا کس خوابِ بے تعبیر سے

یہ بھی بہتر نہیں دُنیا کو بنا لے معبود
یہ بھی اچھا نہیں بیگانۂ دُنیا ہو جائے

بہاروں میں گزاری ہے بہاروں میں گزر جاتے
پیئے جا جام جب تک عمر کا پیمانہ بھر جائے

یارانِ تشنہ کام! تمہیں تجربہ نہیں
محروم رہ گئے جو تکلف میں آ گئے

کہتے ہیں دو عالم میں ہر زینت مرے دم سے
سنتا ہوں کہ تکوینِ دو عالم کی بنا ہوں

حضرت اسعد شاہجہاں پوری کی نظموں میں بلندیِ فکر اور شگفتگی کے ساتھ جوشِ بیان اور تنوع بھی پایا جاتا ہے، خاص طور سے "خود شناسی" —— "فرشتوں سے سوال و جواب" —— "عقیدے" —— "شعلے سے دو دو باتیں" —— "استغنا" —— "علومِ جدیدہ" —— بڑے معرکے کی نظمیں ہیں۔

"شعلے سے دو دو باتیں" انھوں نے اس انداز میں کی ہیں ؎

کوئی الجھا ہوا عقدہ نہ سلجھا ملک و ملت کا
تمہیں فرصت کہاں مشاطگیِ زلفِ پیچاں سے

کروں کیا تذکرہ سپاہیوں کی فتح و نصرت کا
تمہیں فرصت کہاں بے تابیِ شب ہائے ہجراں سے

سُنانا چاہتا تھا داستانِ تلخیِ دوراں
تمہیں فرصت کہاں شیرینیِ گفتارِ خوباں سے

"رندانِ مست" کتنی اچھی نظم ہے :-

کوئی لمحہ حادثوں کی زد سے بیگانہ نہیں
وقت کا اژدر ہمیشہ زہر اگلتا ہی رہا

شاخِ گل پر آسماں سے بجلیاں گرتی رہیں
وادیوں سے خون کا چشمہ اُبلتا ہی رہا

ہر سحر تیغِ دو پیکر تیز تر ہوتی رہی
ابنِ آدم پہ برابر وار چلتا ہی رہا

قسمتیں اعیانِ عالم کی پلٹتی ہی رہیں
یہ جہانِ شور و شر کروٹ بدلتا ہی رہا

آفریں بادا بہ جانِ ہمت رندانِ مست

اس کشاکش میں بھی ان کا دور چلتا ہی رہا

کاش! مصرعہ اولیٰ بھی اُردو میں ہی ہوتا! فارسی مصرعہ میں "جان" حشو وزائد ہے!

جناب اسعدؔ کی رُباعیوں کا یہ رنگ ہے :-

دُنیا کے نظامِ خام کیا تجھ کو کہوں   بازیچہ صبح و شام کیا تجھ کو کہوں
تسکین کا کوئی پھول دامن میں نہیں   اے جنتِ ناتمام کیا تجھ کو کہوں

بڑی ہمت ہے محرابِ حرم میں رہنے والوں کی   وہاں عمر گزاریں، دل جہاں دم بھر نہیں رہتا (ص ۲۵)

"دل جہاں دم بھر نہیں لگتا" کہنا تھا۔ "دل کا دم بھر رہنا" روزمرہ نہیں ہے۔

جنوں کو بھی گوارا ننگِ رُسوائی نہیں لیکن   بجز چاکِ جگر، جب چارۂ دیگر نہیں رہتا (ص ۲۶)

"چارۂ دیگر" بے شعر کی زبان نہیں ہے۔

وہ شبِ غم تیرگی درماندگی آشفتگی   آسماں بیچارہ خرمن لئے تنویر کا (ص ۲۸)

شعر گنجلک اور مبہم ہے —— دوسرے مصرعہ میں آورد ہی آورد ہے!

کس قدر مایوس کن ہے وعدۂ باطل کی شام   صبح کا تارا وہ عالم ہے چراغِ شام کا (ص ۲۹)

شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے، وہ ٹھیک طرح ادا نہ ہو سکا! خاص طور سے مصرعہ ثانی میں خاصا ابہام پایا جاتا ہے۔

موسمِ گل میں عروج شیوۂ رندانہ تھا   میرے دامن میں تھی جنت، ہاتھ میں پیمانہ تھا (ص ۳۰)

"شیوہ" کے ساتھ "عروج" کی نسبت و اضافت بے جوڑ سی ہے، یوں کوئی نہیں بولتا کہ شیوۂ رندی کو عروج حاصل ہے یا وہ مائل بہ زوال ہے۔

مرے دل کی نشوونما ہوئی، تجھے کیا خبر کہ کہاں ہوئی

نہ جہاں تفاخرِ غزنوی، نہ جہاں نیازِ ایاز تھا (ص ۳۲)

اول تو یہ "تلمیح" ہی غور طلب ہے کہ انسان کے دل کی کسی دور میں نشوونما بھی ہوئی مگر اگر ہوئی تھی تو شاعر کے کہنے کے مطابق ایسے زمانہ میں ہوئی تھی جب "حسن و عشق" کی کرشمہ سازیاں سرے سے موجود ہی نہ تھیں —— تو یہ کون سا دور تھا؟ ——

پھر مصرعہ ثانی میں "تفاخر" وجدان کو گراں گزرتا ہے، کوئی دوسرا موزوں لفظ لانا تھا۔

مجھے توبہ کرنے سے عار کیا، مگر اس یقین کو کیا کروں

نہ بہار ہے، نہ جواز ہے، جو بہار تھی تو جواز تھا (ص ۳۴)

ایسا سطحی شعر انتخاب میں چھانٹ دینا چاہیئے تھا۔

نہ پوچھو نازِ رندانہ ہمارا   جہاں برکت ہے میخانہ ہمارا (ص ۳۳)

سپاٹ اور بے مزہ شعر!

بتائے کون وہاں نامہ بر پہ کیا گزری   مرا پیام بھی کو سُن کے ڈوب گیا (ص ۳۵)

نامہ بر "غم و الم میں ڈوب گیا" یا دریا میں جا کر ڈوب مرا؟

وہ جیب کہ اُڑ گئی تھی نظرِ اتفاق سے اب یہ کہ مُستقل سا گنہگار ہو گیا (ص۳۸)

مصرعِ ثانی کا "سا" اور دونوں مصرعوں کے "کہ" کھٹکتے ہیں جس کے سبب شعر کا لفظی دروبست ہی ٹھیک نہیں رہا — مفہوم بھی واضح نہیں ہے۔

زلفوں میں مقید تھی جنوں خیز ہوائیں غنچوں نے ابھی چاکِ گریباں نہ کیا تھا (ص۴۱)

یہ آخر بات کیا ہوئی ؟

پتلیاں تک پھر چکیں اب کیوں ہے چشمِ التفات خیر خوابِ مرگ تک افسانہ پورا ہو گیا (ص۴۵)

اسعد صاحب کی نومشقی کے زمانے کا یہ شعر معلوم ہوتا ہے — "خیر" کس بری طرح مصرعِ ثانی میں کھٹکتا ہے۔

جام اٹھائے کہ بہارِ رخِ ساقی ہے بہت وہ بھی سایۂ گل ہائے گلستاں نہ ملا (ص۵۵)

کیا پھولوں کے سایہ ہی میں شراب پی جاتی ہے — جو اسے ایک کلیہ کے طور پر اس شعر میں بیان کیا گیا ہے۔

حسن کو دینا ہے کافرماجرائی کا جواب اک اچھوتا سا نظامِ دل بنایا جائے گا (ص۵۶)

"اچھوتا نظامِ دل" کیا ہوتا ہے ! پھر "نظامِ دل" کا بنانا بھی محلِ نظر ہے — اچھا "اچھوتا نظامِ دل" بن بھی گیا تو حسن کی کافرماجرائی کا وہ جواب کس طرح ہو گا ؟

صلوٰۃ کنشت کلیسا تو نادارِ حقیقت کو دیدے
سب کچھ ہے طوافِ کعبۂ دل، دریوزہ گری سے کیا ہو گا (ص۵۸)

پہلا مصرعہ غالباً غلط چھپ گیا ہے، ورنہ موجودہ صورت میں تو یہ مہمل ہے۔

سرِ دامن آئے آئے کئی جنتیں لٹا دیں یہ لہو ہے حسرتوں کا، یہ لہو کہاں جگر کا

شعر کا مفہوم "بطنِ شاعر" ہی میں گھٹ کر رہ گیا۔

خود مجھ کو رشک ہے کہ نظر کامراں ہے آج پردہ نہیں تو دل کی تڑپ درمیاں ہے آج (ص۶۵)

"کامراں" قافیہ کی مجبوری کے سبب لایا گیا ہے، ورنہ "کامیاب" کا محل تھا ! مصرعِ ثانی میں "تو دل کی تڑپ درمیاں ہے آج" اس سے شعر کے بنیادی تخیل کا کیا جوڑ ہے۔

تمکنت بھی کسی ظالم کی وفاکوش ہے آج ایک ہنگامہ ساز زیرِ لب خاموش ہے آج

"تمکنت" کا "وفاکوش" ہونا ہی عجیب ہے ! پھر اس شعر میں اس کا کوئی ثبوت نہیں دیا کہ محبوب کی تمکنت میں "وفا" کی جھلک کس طرح آگئی — "زیرِ لب خاموش ہنگامہ بپا ہونا" عجیب تر !!

جانے کب اُن کا جلالِ ناز و تمکیں جائے گا رہ گئی اُمید کچھ خوابِ پریشاں دیکھ کر (ص۷۰)

شعر میں ابہام کے سوا اور کیا رکھا ہے — "جلال کا جانا" زبان و روزمرہ کے اعتبار سے بہت زیادہ محلِ نظر ہے۔ مصرعِ ثانی بہت شگفتہ ہے، مگر مصرعِ اولیٰ سے مل کر جو شعر ترکیب پایا ہے، وہ مبہم ہے۔

تو تو ساقی کر چکا، اپنے کرم کی انتہا کون اُٹھتا ہے تری محفل سے حسرت کے بغیر (ص۷۳)

مفہوم تو واضح ہے، مگر مصرعِ ثانی شعر کے مفہوم سے زیادہ مربوط و ہم آہنگ ہونا چاہیئے تھا۔

کہوں اب کیا فرشتوں سے ترا افسانۂ گیسو کہ دنیا سر بہ سودا ہے مرے حرفِ پریشاں سے (ص۷۹)

اگر مجازی محبوب مُراد ہے تو "فرشتوں" سے افسانۂ گیسو کہنے کی کیا تُک ہے ـــــ اور اگر معشوقِ حقیقی سے خطاب ہے تو "افسانۂ گیسو" کی تلمیح ہماری سمجھ سے بالاتر ہے!

ان کے کرم سے ہوا ایک زمانہ مگر　　　میرے لئے ہے ارم حلقۂ گریاں ہنوز　(ص۹۵)

سپاٹ، سطحی بلکہ بچکانہ شعر!

خیر تھوڑی دیر اپنے جی کو بہلائیں گے ہم　　　جانتے ہیں درد کہہ کر درد ہی پائیں گے ہم　(ص۱۰۱)

"درد کے ساتھ "کہنا" بہت کچھ کھٹکتا ہے، خاص طور سے اس مصرعہ کے لفظی دروبست کے ساتھ!

وہ اب بہار کا نکھرا ہوا شباب کہاں　　　ترے تبسمِ خلد آفریں کی تاب کہاں　(ص۱۱۲)

محبوب کے تبسم خلد آفریں کی تاب نہ لاکر بہار کے شباب کا نکھار ہی جاتا رہا — یہ اندازِ فکر و بیان پسندیدہ نہیں ہے۔

شرارت سی رہی، ناز آفریں لب پر نہیں سو لی　　　رہا تیروں کے سائے میں دلِ اندوہ گیں برسوں　(ص۱۱۳)

اس قسم کے اشعار اسعد صاحب کو کتاب میں شامل نہیں کرنے چاہیئے تھے۔

رہینِ واقعہ ہر سانس تھی عشق و جوانی کی　　　نہ بیٹھے چین سے دم بھر کراماً کاتبیں برسوں　(ص۱۲۰)

"رہینِ واقعہ" نے شعر کو کمزور کر دیا۔

ذرا دل سے خیالِ ننگ و رسوائی نکل جائے　　　ابھی دیکھا ہے تم نے اضطرابِ پا بجولاں کو　(ص۱۳۰)

مصرعہ ثانی کس قدر کمزور ہے!

چمیلی کرتی ہے نگاہِ متبسم اُن کی!　　　لاکھ اوہام میں ڈوبی ہوئی دُنیا مجھ کو　(ص۱۴۲)

"اوہام میں ڈوبی ہوئی دُنیا" میں کس قدر تکلف پایا جاتا ہے!

تری نظر کے ہزار احساں، کرم میں تیری نظر یگانہ

لگا کے زخم دروں کے جڑ کے بنا دیا اک نگار خانہ　(ص۱۵۶)

"زخموں" کو "نگار خانہ" سے کوئی مناسبت نہیں! ہاں "گلستاں" سے مناسبت ہے۔

چومتا ہوں کسی کے نقشِ قدم　　　لذتِ بندگی نہیں جاتی　(ص۱۶۴)

مصرعہ ثانی میں اہمال کی کارفرمائی ہے ۔

خلد میں اک گناہ رقصاں تھا!　　　خلد رقصاں مرے گناہ میں ہے　(ص۱۶۹)

آدم کے گناہ کو "خلد میں اک گناہ رقصاں تھا" کہنا عجیب سی بات ہے، مصرعہ ثانی اور زیادہ عجیب اور مبہم ہے —

بہار روئے رنگین مایۂ روح مجرد ہے　　　وہ ہے ادراک کی منزل جہاں فردوس کی حد ہے　(ص۱۸۰)

پورا شعر "صنعتِ اہمال" میں فرمایا گیا ہے "مایۂ روح مجرد" غزل کی لطافت پر کس قدر گراں ہے!

کبھی شکوے، کبھی لب پہ حدیثِ آرزو مندی　　　ہلا دیتی ہوں کسی کی تمکنت کا شانہ برسوں سے　(ص۱۸۶)

"تمکنت کا شانہ ہلانا" اس میں کس قدر غیر شاعرانہ تکلف پایا جاتا ہے — ـــــ پھر تمکنت کے شانہ ہلانے" سے شاعر کی مُراد کیا ہے۔ کیا شکوے کرنے اور حدیثِ آرزو لب پر لانے سے محبوب کی "شانِ تمکنت" جنبش میں آجاتی ہے —

دُنیا اجڑ رہی ہے آتشِ تحلول کی اک آنچ　　　زاہد کی طبیعت میں ذرا جھول رہا ہے　(ص۱۹۵)

پہا یہ پلے تو کچھ پتا نہیں کہ شاعر آخر کہنا کیا چاہتا ہے!

نظر کو بے خبرِ امتیاز رہنے دے ۔ مجاز ہی میں ہلاکِ مجاز رہنے دے (صـ ۲۰۳)

شعر کیا ہے " کہ مُکرنی " ہے ۔

مجھے داغِ محبت، داغِ حرماں داغِ ناکامی
خوشا! وہ دل جہاں گنجینۂ چند یں درم نکلے (صـ ۲۰۴)

اس قسم کے شعروں سے شاعر کی شہرت نہیں "تشہیر" ہوتی ہے ۔

تم ہنس دیتے جو چاکِ گریباں پہ ایک بار ۔ سب کی حدیثِ شوق کے عنواں بدل گئے (صـ ۲۰۵)

محبوب عاشق کے چاکِ گریباں پہ ایک بار ہنسا تھا، تو دوسروں کی حدیثِ شوق کے عنواں کیوں بدل گئے ———— "حدیثِ شوق کے عنواں بدلنے سے" شاعر کس مفہوم کو واضح کرنا چاہتا ہے ۔

چشمِ خونبار سے نازک سا چمن پیدا کر ۔ کچھ نہ کچھ لالہ و گل بوجھ ہیں داماں کے لئے (صـ ۲۰۷)

چمن بھی "نازک" ہوتا ہے ———— خوب! رہا شعر کا مفہوم، سو اُس کا دور دور پتا نہیں ۔

رقصِ مستاں، دورِ ساغر، فرشِ گل، بانگِ طرب ۔ خلد سے اب میکدہ کم ہے تو ذوق کم سے ہے (صـ ۲۰۹)

مصرعِ اولیٰ میں "بانگِ طرب" کی جگہ "سازِ طرب" ہونا چاہیئے تھا ———— اب رہا مصرعِ ثانی تو اس کے الفاظ مفہوم کے اعتبار سے ناقص ہیں ۔

خدا آنا ہے دائم، کچھ ایسا رنگِ مستی ہو ۔ مذاقِ جم مرا پیمانہ بادہ پرستی ہے (صـ ۲۲۴)

شعر کیا ہے شاعری کے ساتھ اچھا خاصہ مذاق ہے ۔

اگر سلامت ہے جذبۂ دل، انہیں وفا آشنا کریں گے
ہم اپنی بے تابیاں بڑھا کر تسلّیوں تک رسا کریں گے (صـ ۲۲۶)

"تسلّیوں تک رسا کریں گے" ۔ یہ کس قدر نامانوس اندازِ بیان ہے ۔

دل کو بہلاتا رہا، شب بھر کسی کا انتظار ۔ حشر اُٹھا انجمِ سحر کی آخری تنویر سے (صـ ۲۳۵)

دوسرا مصرعہ کتنا بناوٹی ہے ———— نرا تکلف ہی تکلف!

ہنسی بھی اُن کی کیا کیا سانحہ پرداز ہوتی ہے ۔ مگر میں ضبط کرتا ہوں کہ مشقِ ناز ہوتی ہے (صـ ۲۳۶)

حیرت ہے کہ جناب اسعد شاہ جہاں پوری اس قدر کہنہ مشقی کے بعد ایسے مبہم اور گنجلک شعر بھی کہتے ہیں ۔

حسن منت کشِ تمنا ہے ۔ رنگ سے حسن نہاتے میں لگتا ہے (صـ ۲۴۱)

آورد ———— تکلف ———— اہمال ———— یہ ہیں اس مطلع کے عناصرِ ثلاثہ!

اک شکستہ زندگی کی کیجیئے تعبیر کیا ۔ غم نہیں خلشِ محبت دل نہیں ناسور ہے (صـ ۲۵۰)

وہی "صنعتِ ایہام و اہمال"!

عمرِ وادی کی بے کلی جو آپڑی سی گزار دی ۔ قباحتوں کے سایہ میں کٹھن گھڑی گزار دی (صـ ۲۲۲)

بے کلی "کو یوں کہنا کہ" وہ آپڑی "ہے روزمرہ کے خلاف ہے ۔" قباحتوں "نے مصرعِ ثانی کو کمزور کر دیا ۔

گفتار میں جادو اثر سی، معجزہ جاہی رفتار میں شعلہ صفتی، خلد پناہی
شہکار ہے فطرت کا وہ مجموعہ اضداد وہ حور شمائل وہ چنگیز نگاہی

"معجزہ جاہی" یہ کیا ترکیب ہے! رفتار کے ساتھ "خلد پناہی" کا کیا جوڑ؟ پھر محبوب کو "چنگیز" سے نسبت دینا کس قدر نامناسب ہے، محبوب کو ظالم، سفاک، بے درد سب کچھ کہہ سکتے ہیں، مگر اُسے ہلاکو، چنگیز، نیرو اور حجاج نہیں کہہ سکتے! اس میں محبوب کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔

نشاطِ فانی دُنیا و رنجِ فانی کیا کبھی کوئی تری زنجیرِ در ہلا نہ سکے (ص ۲۷۵)

آخر شاعر کیا کہنا چاہتا ہے؟ پہلے مصرع میں تکلف اور آورد پائی جاتی ہے۔

نئے عنوان سے لکھی ہے کتابِ زندگی میں نے مٹا کر رکھدیئے سارے خیالاتِ خفی میں نے (ص ۲۷۷)

"مٹا کر رکھدیئے" اور "خیالاتِ خفی" نے شعریت کو غارت کر دیا۔

ہنگامۂ جورِ قدِ خوباں سے بچا لے دُنیا ئے وفا حشر خراماں سے بچا لے (ص ۲۸۰)

"قدِ خوباں" کا "ہنگامۂ جور" کیا ہوتا ہے؟ اس طرح لفظوں کے جوڑ دینے سے شاعر کے فن اور قادر الکلامی پر حرف آتا ہے۔

صبح اُٹھ کر زندگی کے نام پہ نازاں نہ ہو ایک دن کی اور گردش نے گنوائی زندگی (ص ۲۸۶)

صبح اُٹھ کے زندگی کے نام پر کون نازاں ہوتا ہے؟ یہ کیا تجربہ و مشاہدہ اور کس قسم کا اندازِ بیان ہے ــــ "گنوائی زندگی" نے شعر کو اور زیادہ پھُس پھُسا بنا دیا ــــ مرکزی خیال یہ ہے کہ انسان اس غرّے میں مبتلا ہے کہ اس کی عمر بڑھ رہی ہے، حالانکہ ہر طلوع ہونے والی صبح اُس کی عمر کے ایک دن کو کم کر دیتی ہے ــــ مگر یہ خیال کس غیر شاعرانہ انداز میں ادا کیا گیا ہے۔

تجھ کو تعلیم شہنشاہ و حجازی کی قسم تجھ کو روحِ بوذر و سلمان و رازی کی قسم (ص ۲۹۶)

رازی کی روح کی قسم بھی کھائی جا سکتی ہے مگر غزالی، ابن مسکویہ اور ابن تیمیہ جیسی شخصیتوں کے ساتھ! ابوذر و سلمان کے ساتھ امام رازی کا کیا جوڑ!!

زمانے گرم جاتی ہے، دلوں کا جوش جاتا ہے نظر کا لُطف جاتا ہے، سروں کا ہوش جاتا ہے (ص ۳۱۰)

"سروں کا ہوش" یہ کیا ترکیب ہے! اس طرح کون بولتا ہے کہ اُس کے سر کا ہوش جاتا رہا! اصل روزمرہ یوں ہے ــــ اُسے سر پیر کا ہوش نہیں ہے۔

غلام ذہنیتوں کو ذرا یہ سمجھا دو یہ زندگی کا تلذذ نہیں ہلاکت ہے (ص ۳۱۳)

یہ شعر ہی بھرتی کا شعر ہے ــــ "زندگی کا تلذذ" اسے پڑھ کر وجدان کس قدر بے کیفی اور تلخی محسوس کرتا ہے۔

کہاں سلف کو ملا عزمِ خوشتریں تیرا خلف میں کون ہے جو خوشہ چیں نہیں تیرا (ص ۳۲۱)

"مقامِ غالب" اس نظم کا عنوان ہے ــــ اس شعر میں "عزمِ خوشتریں" نے شعر کا سارا لطف غارت کر دیا۔ غالب کوئی سپہ سالار یا سیاسی لیڈر، یا بادشاہ تھا جس کے "عزم" کا خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے۔ "عزم" کی جگہ "طرز" کہنا تھا۔

کون تھا آماجگاہ صد ستم تیری طرح غم کش صحرا بہ صحرا بیم بہ یم تیری طرح (ص ۳۳۲)

رہبر اعتبار سے پوچ اور کمزور ہے! "آماجگاہ ستم" وزن میں نہ آیا تو "صد" کا اضافہ کر کے وزن پورا کر دیا ــــ پھر غالب کو جس "غم کش" اور پریشان روزگار اس شعر میں دکھایا گیا ہے ــ اس میں ضرورت سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔

تیرے تصور کی عظمتوں نے عجیب سی انجمن بپا کی — عجیب سی انجمن میں تو نے جلا کے جان و جگر ضیا کی (ص۳۲۳)

تصور کی عظمتوں کا عجیب سی انجمن بپا کرنا ——— پھر اس عجیب سی انجمن میں علامہ اقبال کا جان و جگر جلا کے "ضیا کرنا"۔ یہ خیال اور یہ زبان ——— شاعری کے ساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہے۔

وہ جگر گوشۂ علی و بتول — وہ جگر پارۂ رسولِ کرام (ص۳۲۸)

"رسولِ کریم" لکھنا تھا "کرام" "کریم" کی جمع ہے، واحد شخصیت کے لئے "کرام" لانا درست نہیں۔

فلک تیرے دامن میں کتنے قمر ہیں — کہ شایانِ چندیں قمر ہے مدینہ (ص۳۴۵)

"چندیں قمر" نے شعر کو "غیر شاعرانہ بنا دیا۔

بہار نگارِ عرب دیکھتا ہوں — بساطِ نشاطِ نظر ہے مدینہ (ص۳۴۵)

"بساطِ نشاطِ نظر" ——— کس قدر نامانوس اور بناوٹی ترکیب ہے!

ہمارا خیال ہے اور خدا کرے یہ صحیح ہو کہ حضرت اسعد شاہ جہاں پوری اپنی علالت اور پیرانہ سالی کے سبب اپنے کلام پر نظرِ ثانی نہ فرما سکے، جو کچھ لکھا ہوا، اُن کی بیاضوں میں موجود تھا، اُسے جوں کا توں چھاپ دیا! جن اسقام اور تسامحات کی ہم نے نشاندہی کی ہے، اُن میں بعض اتنے شدید ہیں جو جناب اسعد شاہ جہاں پوری جیسے مشاق و قادر الکلام اُستاد کے یہاں ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔ کوئی شک نہیں "وجدانِ سلیم" مجموعی طور پر شعر و سخن کا ایک ایسا رنگا رنگ مجموعہ اور گلدستہ ہے، جس کو ہم زبان و ادب میں "اضافہ" سے تعبیر کریں تو یہ کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

آپ کا ہونہار لڑکا یقیناً ایک اچھا کھلاڑی بن سکتا ہے

اسکی صحت پر خاص توجہ دیجئے!

آپ اپنے ہونہار لڑکے کو جو کچھ بھی بنانا چاہیں اس کی صحت کا خیال رکھنا بہرحال لازم ہے کیونکہ اچھی صحت پر ہی اس کی آئندہ کامیابی کا دارومدار ہوگا۔

بچپنے کی عمر میں جسم کو مناسب غذائی اجزا کی ضرورت ہوتی ہے جن سے دماغی اور جسمانی قوتیں اچھی طرح پرورش پاسکتی ہیں۔
سنکارا ایسے ہی اجزاء سے مرکب ایک خوش مزا قوت بخش ٹانک ہے جسمیں تمام ضروری وٹامنز بھی شامل ہیں۔

یہ ہر عمر کے لوگوں کیلئے ہر موسم میں
یکساں طور پر مفید اور صحت بخش ہے

سنکارا
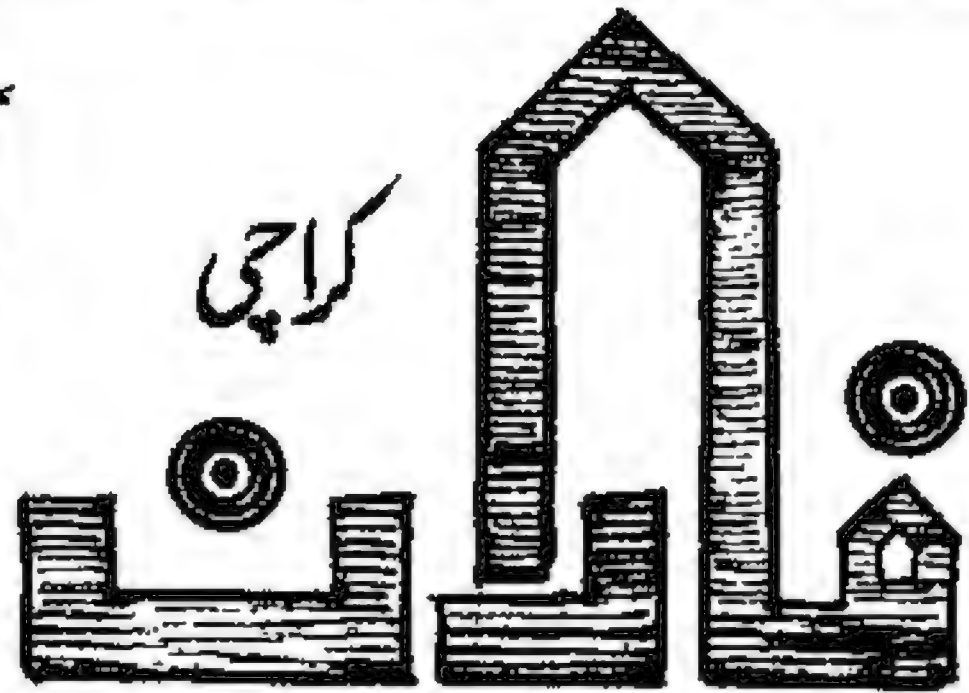
ہمدرد

B.C.B/107

UNITED

فاران

کراچی

جلد :- ۱۵

شمارہ :- ۴

ایڈیٹر :- ماہر القادری

ماہِ جولائی سنہ ۱۹۶۳ء

ترتیب

قیمت فی پرچہ باسٹھ پیسے

چندہ سالانہ سات رُوپے

کتبہ : ساجد

مقامِ اشاعت :- دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

پرنٹر و پبلشر :- مسرور حسین

مطبوعہ مطبع سعدی کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

انگریزی دور میں جب فرقہ وارانہ فسادات ہوتے تھے تو کہا جاتا تھا کہ ان میں حکومت کی (DIVIDE AND RULE) کی پالیسی کا خفیہ ہاتھ کام کر رہا ہے، انگریزی حکومت ہندوستانیوں کی آپس کی پھوٹ ہی کے سہارے قائم ہے، اُس کے ایجنٹ ہر فرقہ اور مذہب و ملت میں موجود ہیں، وہ لڑائیاں کراتے رہتے ہیں اور لوگوں کو آپس میں متحد نہیں ہونے دیتے!

مگر

پاکستان میں جو حال ہی میں سُنّی شیعہ فسادات کئی مقامات پر ہوئے ہیں، اُن کی ذمہ داری کس کے سر ڈالی جائے؟ پاکستان بننے کے بعد جو حکومتیں برسرِ اقتدار آئی ہیں، انھوں نے کوئی شک نہیں کہ انگریزی سیاست، انگریزی تہذیب اور انگریزی ڈپلومیسی کو بہت کچھ برت کر اور انگریز کے نقشِ قدم پر چل کر دُنیا کو دکھایا ہے لیکن پاکستان میں فرقہ وارانہ فسادات کے خانہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے صفر (ZERO) ہی ہمیشہ نظر آیا! "ختمِ نبوت" کا جو ایجی ٹیشن ہوا تھا وہ کوئی فرقہ وارانہ فساد نہ تھا، بلکہ مسلمانوں کا ایک متفقہ مطالبہ تھا، جو اُس دور کی حکومت کی بے تدبیری اور غلط اندیشی کے سبب خوفناک شدّت اختیار کر گیا! مسلمانوں کے دو فرقوں کا ایسا افسوسناک تصادم کہ جس کا انجام خون خرابہ ہو، پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار رُونما ہوا! پاکستان کے دُشمنوں اور بدخواہوں کو ان واقعات سے یقیناً خوشی ہوئی ہوگی کہ اس سے ایک طرف تو دُنیا میں پاکستان کی بدنامی ہوئی اور دوسری طرف پاکستان کی یک جہتی و اتحاد کو صدمہ پہونچا! وہ قلوب جن میں پاکستان کی محبت رچی ہوئی ہے، اور پاکستان کی شیرازہ بندی جن کا مطلوب اور مقصود ہے اُن کو ان سانحوں نے جو جراحتیں پہونچائی ہیں، اُن کی شدّت اور الم انگیزی لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی۔

پاکستان یوں ہی بہت سی داخلی اور خارجی مشکلات میں گھرا ہوا ہے، پاکستان کے بیرونی دُشمن ان مشکلوں میں نئے دن اضافہ کرتے رہتے ہیں، اُلجھنیں سُلجھنے کی بجائے اور پیچیدہ ہوتی جاتی ہیں، حکمرانی کی ہوس اور کرسیوں پر مرتے دم تک جمے رہنے کی بھوک اور ہوس نے حالات میں جو ابتری پیدا کر دی ہے، اُس پر کسی دلیل کے لانے کی ضرورت نہیں ہے! اس عالمِ انتشار و اضطراب میں فرقہ وارانہ فسادات کا ہونا اتنا بڑا المیہ ہے کہ جس کی خطرناکی کا اندازہ نہیں ہو سکتا! یہ واقعات اگر اچانک ہوئے ہیں، تو بھی بُرے ہیں اور ملامت کے مستحق ہیں، اور اگر کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ظہور میں آئے ہیں تو اور زیادہ بُرے ہیں! مذہب کے نام پر یہ لوٹ مار، خونریزی اور مار دھاڑ ذرہ برابر ثواب کا کام نہیں، جو فساد و ابتری کی باتوں سے اللہ تعالیٰ کے غضب اور ناخوشی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

دین و اخلاق کے علاوہ عام انسانی نقطۂ نگاہ سے بھی اس قسم کے خونریز جھگڑے انتہائی قابلِ نفرت ہیں، مذہبی عقائد کے اختلافات کے باوجود انسانی اخوت کے حقوق کا ہر کسی کو لحاظ رکھنا چاہیئے، بندروں اور ریچھوں کی طرح ایک دوسرے پر چڑھ دوڑنا کوئی بھلمنساہت اور شرافت کی بات نہیں ہے! جس نے انسانی حقوق کو نہ پہچانا، وہ اللہ رسولؐ اور دین کے حقوق کو بھی نہیں پہچان سکتا! انسانی حقوق ہیں، شہری حقوق ہیں، ملکی حقوق ہیں، ہمسائگی کے حقوق ہیں اور پھر دین و اخلاق کے حقوق ہیں ان سے بہت سے حقوق کو نظرانداز کر کے، لڑائی جھ

اُتر آنا اور نزاع و تصادم کو آناً دانہ خونریز جنگ تک پہونچا دینا، حیوانیت نہیں تو اور کیا ہے !

ایسے موقعوں پر شریر اور مُفسد لوگ تو بھُس میں چنگاری ڈال کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں، خمیازہ بیچارے شریفوں اور ناکردہ گناہوں کو بُھگتنا پڑتا ہے اور سب سے بڑی اذیت تو امن و امان کی فضا کو مکدّر اور غبار آلود دیکھ کر ہوتی ہے ! اور یہ غبار جب انسانی لہو سے شفق رنگ اور لالہ گوں ہو جائے تو اُس کی اندوہناکی کا کیا پوچھنا !

ہم اس حقیقت کے نہ تو مُنکر ہیں اور نہ اس سے بے خبر ہیں کہ اس دُنیا میں آدمی اس طرح نہیں رہ سکتا کہ دُوسروں کے حالات و خیالات سے کسی قسم کا کوئی سروکار ہی نہ رکھے، آدمی کی یہ فطرت ہے کہ جب وہ اپنے نزدیک کسی دوسرے آدمی کو کوئی غلط کام کرتا اور کسی غیر صحیح عقیدہ میں مبتلا پاتا ہے، تو وہ اُس کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے ! اصلاح و تبلیغ کی یہ کوششیں ہر دور میں ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی مگر اصلاح و تبلیغ نرمی، حکمت و تدبیر اور "جدال احسن" کے ساتھ ہونی چاہیئے، دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں چلتی - لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ یہ اصول ہے تبلیغ و موعظت کا ! انبیاء کرام نے کسی ملحد اور کافر پر بھی دین کے معاملہ میں جبر نہیں کیا ! غلط کاروں اور فاسد العقیدہ لوگوں کو دلیلوں سے سمجھانے کی ضرورت ہے کہ اُن کے کس قول و فعل اور عقیدہ و عمل میں کیا خرابی پائی جاتی ہے ! گفتگو کا انداز حریفانہ نہیں ہمدردانہ ہونا چاہیئے ! تاریخ گواہ ہے کہ حکمت و موعظت کے ساتھ تبلیغ کے ذریعہ لاکھوں مُسلمانوں کو فاسد عقیدوں سے توبہ کی توفیق نصیب ہوئی ہے ! اصلاح و تبلیغ کا کام بڑا تحمل اور ضبطِ نفس چاہتا ہے، اس منزل میں لوگوں کی گالیاں بھی سُننی پڑتی ہیں اور بعض اوقات پتھر بھی کھانے پڑتے ہیں ! جس مُبلّغ نے صبر و استقامت سے کام لیا وہ اپنے مشن میں انجام کار کامیاب ہوا۔ حضرت مُجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے، اُن کی استقامت اور عزیمت و صداقت نے دربار شاہانہ کے فسادِ عقیدہ و عمل کی اصلاح کا کارنامہ انجام دیا اور اس مردِ درویش کے آگے شہنشاہ کو جُھکنا پڑا۔

غلط عقائد کی تردید ہر دور میں ہوتی رہی ہے اور یہ سلسلہ کسی کے روکے رُک نہیں سکتا، مگر یہ کام بڑی نزاکت اور احتیاط چاہتا ہے، بیشتر ورواعظین اپنے جلوے مانڈے کے لئے نزاکت و احتیاط کی تمام اخلاقی حدوں کو پھلانگ کر، عقائد کے اختلاف کو فرقہ وارانہ نزاع کا رنگ دیدیتے ہیں اور ایسی فضا پیدا کر دیتے ہیں کہ آپس میں لڑ مرنے ہی کو لوگ کارِ ثواب سمجھنے لگتے ہیں ! اس قسم کے مُنہ پھٹ اور بدزبان واعظین چاہے وہ کسی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں، اس کے مستحق ہیں کہ اُنہیں قابو میں رکھا جائے اور اُن کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے !

سوچیے !

شیعہ سُنی فسادات کی سرکاری طور پر تحقیقات ہو گی۔ ملک کی مختلف سیاسی اور دینی جماعتوں کے نمائندے اسبابِ فساد معلوم کرنے کے لئے فساد زدہ شہروں اور بستیوں کا دورہ کریں گے ! اس کے بعد رپورٹیں شائع ہوں گی اور لوگ اپنے اپنے تاثرات اور مُشاہدات منظرِ عام پر لائیں گے ! ہم حکومت اور دوسرے اربابِ فکر اور امن و صلح کے لئے جدوجہد کرنے والوں کی خدمت میں بعض ضروری اور اہم باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں۔

اصل بات دیکھنے، سمجھنے اور غور کرنے کی یہ ہے کہ فساد کا اصل سرچشمہ کہاں ہے؟ یہ ڈور اُس وقت تک نہیں سُلجھ سکتی، جب تک اُس کا سرا ہاتھ میں نہ آجائے ! حقائق سے گریز اور واقعات سے منہ چھپانا یہ شتر مُرغانہ ذہنیت کبھی مفید اور کارآمد ثابت نہیں ہوتی

بالکل سامنے کی باتیں ہیں، روزِ روشن سے زیادہ کھلی اور واضح تر حقیقت، ایسی حقیقت جس کو ہر کوئی جانتا ہے ——

یہ کہ حضرت علی، حضرت حسین، حضرت حسن، حضرت سیدہ فاطمہ اور دوسرے اہل بیت (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) جو شیعوں کے نزدیک محبوب و محترم ہیں، اُن سے اہلِ سُنّت والجماعت بھی محبت کرتے ہیں، عقیدت رکھتے ہیں اور ان نفوسِ قدسیہ کو محترم سمجھتے

ہیں ! اس تیرہ سو سال کی مدت میں کروڑوں سُنّی مَردوں اور عورتوں کے نام اہل بیت کے مُبارک ناموں پر رکھے گئے ہیں ! سُنّی شعراء نے ان بزرگوں کی مدح میں قصائد کہے ہیں اور ادیبوں اور انشاپردازوں نے کتابیں لکھی ہیں ، عقیدت و محبت اور عزت و احترام کا یہ عالم ہے کہ اہل سنّت والجماعت نمازِ جمعہ کے خطبہ میں حضرت علیؓ ، حضرت حسنؓ ، حضرت حسینؓ اور سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء (رضی اللہ عنہم) کے نام پڑھتے ہیں اور اُن پر صلوٰۃ وسلام بھیجتے ہیں ! دُوسری طرف حضرت صدیق اکبر ، حضرت عمر فاروق ، حضرت عثمان اور دوسرے بہت سے اجل صحابہ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) ہیں جن پر طعن وطنز بلکہ ملاحیوں اور گالیوں سے شیعوں کی کتابیں بھری پڑی ہیں اور ان نفوسِ قدسیہ پر سبّ وشتم اور تبرا بازی اس فرقہ کا مشرب ہے ! یہ وہ بزرگ ہیں جن کی سیرت و کردار کی تعریفیں غیرمسلم مورخین اور اہلِ فکر نے کی ہیں اور آج تک کسی عیسائی ہندو اور یہودی مورخ اور مصنف نے ان پر یہ الزام نہیں لگایا کہ یہ حضرات اسلام کے بارے میں مخلص نہ تھے یا (خاک بدہن گستاخ) اسلام سے در پردہ دُشمنی رکھتے تھے یا اُن کے وجود سے اسلام کو نقصان پہونچا ہے ! بلکہ معاملہ تو اس کے بالکل برعکس ہے ان کی تعریفوں سے غیرمسلم مورخین کی کتابیں مزیّن ہیں اُن کے دورِ حکومت کو تو اسلام کا شاندار دور قرار دیا گیا ہے ان کے عہد میں تو ہر اعتبار سے اسلام کو ترقی اور عروج حاصل ہوا ہے ! رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس دور میں جن نواہی پر قدغن تھا اور جو معروف قائم کئے گئے خلافتِ راشدہ کے زمانے میں بھی نواہی کی ممانعت اور معروف کے قیام کی ٹھیک وہی حالت تھی ، اسی لئے اس خلافت کو "علیٰ منہاج النبوۃ" کہا جاتا ہے اور یہ لقب اُسے زیب بھی دیتا ہے ! متحدہ ہندوستان میں جب پہلی بار صوبوں میں قومی حکومتیں قائم ہوئی تھیں تو گاندھی جی نے کانگریسی وزراء کو مشورہ دیا تھا کہ وہ عدل و انصاف اور سادہ زندگی میں ابوبکرؓ اور عمرؓ کی پیروی کریں اور اُن کے نقشِ قدم پر چلیں ——— تو وہ بزرگ شخصیتیں جو مُسلمانوں کی غالب اکثریت کے نزدیک قابلِ احترام ہیں اور جن کی عقیدت ومحبت سے کروڑوں سینے معمور ہیں اور جن کی غیرمسلم دُنیا بھی عزت کرتی ہے اُن کو کسی اسلامی فرقہ کا بُرا سمجھنا ، بُرا کہنا اور اُن پر زبانِ طعن دراز کرنا ، بس یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے دینی اتحاد واخوت کے تکدر کا آغاز ہوتا ہے اور آپس میں بدمزگی پیدا ہوتی ہے فساد کی راہیں مدح ومنقبت اور عزت واحترام سے نہیں ، تحقیر وتنقیص اور تبرا بازی سے کھلتی ہیں ، ماحول اور فضا کو مکدر دُعائیں اور تعریفیں نہیں کوسنے اور گالیاں کرتی ہیں ، پس جو اربابِ فکر وہ سرکاری لوگ ہوں یا عوام کے نمائندے ہوں ، صلح وآشتی امن وامان ، انسانی اخوت اور دینی بھائی چارے کی فضا پیدا کرنا چاہتے ہیں اور پاکستان کے حالیہ فرقہ وارانہ فسادات کے اسباب ودواعیات معلوم کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کر رہے ہیں انہیں اس پر ضرور غور وفکر کرنا چاہیئے کہ پانی کہاں مرتا ہے ، بدمزگی اور تکدر کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے ، کون زبانیں ہیں جو مدح ومناقب سے معطر ہیں اور کون سی زبانیں گالیوں سے آلودہ ہیں ! خوش بیانی اور بدزبانی میں کتنا فرق ہے اور اُن کے دل ودماغ اور ذہن وفکر پر کیا مختلف اور متضاد اثرات ہوتے ہیں !

شیعہ کسے کہتے ہیں ؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی یہاں تک کہ خلفاء ثلاثہ سے بھی کوئی مذہبی فرقہ منسوب نہیں ہے حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے بھی کسی جُداگانہ فرقہ یا جماعت کی بنیاد نہیں ڈالی ! دورِ رسالت میں جس طرح صحابہ کرام کے بنیادی عقائد واعمال تھے ، عہدِ خلافت میں بھی صحابہ اور تابعین کے عقائد اور دینی اعمال کا وہی رنگ تھا - جہاں تک اسلام کے بنیادی عقائد کا تعلق ہے اُن میں تو صحابہ (جن میں اہلِ بیت کرام بھی شامل ہیں) کے درمیان سرِمو فرق نہ تھا - ہاں دینی ارکان ، اعمال اور فرائض وسنن میں جزئی اختلافات ملتے ہیں ، جن کا پایا جانا فطرت کے عین مطابق تھا - اس لئے کہ ہر قانون ودستور کی تعبیر وتفصیل اور اُس کی جزئیات وفروع میں کچھ نہ کچھ اختلاف ضرور واقع ہوجاتا ہے ! حضرت

ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں حضرت علیؓ دوسرے اجلِ صحابہ کی طرح اسلامی حکومت کے ماننے والے بلکہ مشیر کی حیثیت سے نظر آتے ہیں، نہ کوئی احتجاج نہ کسی قسم کا اختلاف! بہت سے اہم معاملات میں تو حضرت علی کرم اللہ وجہ کی رائے اور مشورت کو ترجیح دی گئی ہے، اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ "لولا علیؓ لہلک عمرؓ" یعنی حکومت اور دین کے معاملات میں اگر عمرؓ کو علیؓ کا تعاون حاصل نہ ہوتا، تو عمرؓ برباد ہوجاتا، فاروق اعظم جیسا عظیم خلیفہ اور شیرِ خدا علی مرتضیٰ جیسا بلند پایہ مشیر، اس حکومت کو بابرکت اور دنیا کے لئے رحمت ہی ہونا چاہیئے تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے "لولا علیؓ لہلک عمرؓ" کہہ کر جس بلیغ وجامع انداز میں حضرت علیؓ کی تحسین کی ہے اور آپ کی فراست وبصیرت کا اعتراف فرمایا ہے، وہ عمرؓ اور علیؓ کے درمیان دینی اخوت ورفاقت، محبت، ربط واتحاد اور آپس کے یارانہ کی دلیل ہے، تاریخ کا مشہور ترین واقعہ ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مکان پر جب بلوائی چڑھ کے آتے ہیں، تو حضرت علی کرم اللہ وجہ نے اپنے صاحبزادوں (حسنؓ وحسینؓ) کو خلیفہ ثالث کی مدافعت کے لئے بھیج دیا تھا، اگر حضرت علیؓ کے دل میں حضرت عثمانؓ کی طرف سے کبیدگی شکر رنجی اور عداوت ہوتی، تو اپنے دشمن اور تختِ خلافت کے غاصب سے انتقام لینے کا موزوں ترین یہی موقعہ تھا! لیکن حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ سے وہ سلوک کیا، جو ایک دوست، ہمدرد، رفیق اور مخلص خیرخواہ کے ساتھ کیا جاتا ہے! حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کی مدافعت میں اپنے جوان بیٹوں کی جانوں کو خطرے میں ڈال دیا، اسی دوستی، مودت اور تعلقات کی خوشگواری کے سبب خلفاءِ اربعہ کے لئے "چار یار" کا لقب ضرب المثل بن گیا ہے!

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہ زمامِ خلافت ہاتھ میں لیتے ہیں اور اب جب کہ طاقت ان کے ہاتھ میں ہے، وہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ پر نہ تو زبانِ طعن دراز کرتے ہیں اور نہ ان سے اظہارِ برأت وبیزاری فرماتے ہیں، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ اور حضرت امام زین العابدین کی زبانوں سے بھی خلفاء ثلاثہ کے لئے کوئی نامناسب لفظ نہیں سنا گیا! اور نہ ان نفوسِ قدسیہ میں سے کسی نے یہ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد گنتی کے چند صحابہ کو چھوڑ کر باقی تمام صحابہ معاذ اللہ دین سے پھر گئے تھے! مقصود عرض کرنے کا یہ ہے کہ خلفاء ثلاثہ اور دوسرے صحابہ کو برا بھلا کہنا اور ان کی بدگوئی کرنا، یہ حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ وحسینؓ اور دوسرے ائمہ اہل بیت کا شعار اور مسلک ہی نہیں رہا۔ جو کوئی یہ سمجھتا ہے کہ خلفاء ثلاثہ پر تبرا بازی کرکے علیؓ اور ان کی اولاد امجاد کی خوشنودی حاصل کر رہا ہے، وہ بڑی سی غلط فہمی میں مبتلا ہے! حضرت علیؓ اور اہلِ بیت کی محبت کا یہ تقاضا ہرگز نہیں ہو کہ خلفاء ثلاثہ اور دوسرے صحابہ کرام سے بغض وعداوت سکھا جاتے!

حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہ نے خلیفہ ہونے کے بعد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو شام کی گورنری سے جو معزول فرمایا تھا، تو ان پر یہ الزام نہیں لگایا تھا کہ اے معاویہؓ! تم دین سے پھر گئے ہو، یا تم نے ان چیزوں کو جنہیں اللہ اور رسولؐ نے حلال کیا ہے، حرام کرکے اور حرام کو حلال سے بدل دیا ہے، یہ معزولی خالص انتظامی نوعیت کی تھی، امیر معاویہؓ نے خلیفہ وقت کے اس حکم کی اطاعت نہیں کی اور قصاص عثمانؓ کا مطالبہ کھڑا کردیا، یہاں تک کہ اس کے انجام میں جمل وصفین کی خونریز جنگیں ہوئیں! جمل میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو تنبہ ہوا، اور انھوں نے اپنے موقف سے رجوع فرمالیا، امیر معاویہؓ اپنے موقف پر جمے رہے، یہاں تک کہ خلافتِ مرتضوی کے مقابلہ میں انھوں نے جداگانہ حکومت کو قائم رکھا، اس دور میں جو حضرات حضرت علیؓ کے ساتھ تھے وہ "شیعانِ علیؓ" اور جو اصحاب امیر معاویہؓ کے ہمدرد اور دست وبازو تھے "شیعانِ معاویہؓ" کہلاتے، تو "شیعہ" کا لقب کسی مخصوص دینی فلسفہ یا خاص عقائد کی بنا پر وجود میں نہیں آیا، بلکہ یہ لقب خلیفہ راشد اور ان کے حریف امیر شام کے ساتھیوں کا لقب تھا، حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ اور حضرت زین العابدین (رضی اللہ عنہم) کے دور میں "شیعیت" کسی مخصوص

فرق اور خاص طور سے عقائد کا نام نہ تھا؟

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا شرفِ صحابیت اپنی جگہ ثابت ہے، مگر علیؓ اور معاویہؓ کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کا موقف صحیح تھا امیر معاویہؓ غلطی پر تھے، جمہور امت کا یہی مذہب ہے، ہم اپنے بارے میں عرض کرتے ہیں کہ جمل و صفین میں ہم ہوتے تو خدا دلوں کا حال جانتا ہے کہ ہم حضرت علیؓ کے جھنڈے تلے ہوتے، اس لئے ہم بھی اپنے کو "شیعانِ علیؓ" میں شامل سمجھتے ہیں!

امیر معاویہؓ (معاذ اللہ) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکم عدولی اور ان سے جنگ کرکے بے دین نہیں ہو گئے تھے اگرچہ ان سے اجتہاد میں غلطی ہوئی مگر وہ ہر حیثیت سے مسلمان تھے، اور ان کی حکومت کا شعار بھی اسلامی شعار تھا، یہ نہیں تھا کہ شام میں مسجدوں کو ڈھا دیا گیا تھا، قرآن جلا دیئے گئے تھے، شراب و زنا کو حلال کر دیا گیا تھا، ان میں سے کوئی بات بھی ظہور میں نہیں آئی، اگر خدانخواستہ امیر معاویہؓ حضرت علیؓ کی مخالفت کے سبب بے دین ہو گئے ہوتے، یا اسلام کے مخالف ہوتے، تو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ یہ بات کر ہی نہیں سکتے تھے کہ ایک بے دین اور مخالف اسلام شخص سے صلح کریں، اس کے حق میں خلافت سے دست بردار ہوں اور اسلامی حکومت اس کو سونپ کر خود گوشہ نشین ہو جائیں۔ امام حسنؓ نے امیر معاویہؓ کو صحابیٔ رسول، صاحب ایمان اور حکومت چلانے کا اہل جان کر ہی ان سے صلح کی تھی، اور اس طرح انھوں نے امت کو فتنہ و فساد سے بچانے کا بہت بڑا کارنامہ انجام دیا جس کی تحسین رہتی دنیا تک کی جائے گی، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اس ایثار اور قربانی کا انہیں اجر ملے گا حضرت حسن کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ میرے والد ماجد امام وقت اور خلیفہ برحق حضرت علیؓ کی حکم عدولی یا ان کی مخالفت کے سبب امیر معاویہؓ دین سے خارج ہو گئے ہیں، امام حسن جان دینا قبول کر سکتے تھے مگر اسلامی حکومت ایک بے دین شخص (معاذ اللہ) کو ہرگز نہیں سونپ سکتے تھے!

دینی شعار اور بدعات

ہم اوپر کہہ چکے ہیں اور ہم کیا کہہ چکے ہیں، صحیح و مستند تاریخ یہی کہتی ہے۔ "شیعانِ علیؓ" ان حضرات کا لقب تھا جو امیر معاویہؓ کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کے ساتھی تھے! شیعانِ علیؓ اور شیعانِ معاویہؓ کے درمیان بنیادی عقائد اور دینی ارکان کا کوئی اختلاف نہ تھا، اور نہ انھوں نے اپنی مسجدیں الگ الگ بنائی تھیں! ان دونوں گروہوں کے مابین یہ چیز بھی وجہ اختلاف نہ تھی کہ ایک گروہ تو شہیدوں کا ماتم کرتا اور ان کے تابوت نکالتا ہے اور دوسرا گروہ ایسا نہیں کرتا! جمل و صفین میں حضرت علیؓ کے کتنے ساتھی اور رفقاء شہید ہوئے تھے، مگر ان کے لئے نہ تو ماتم کیا جاتا تھا اور نہ ان کے جنازوں کی نقلیں بنا کر تابوت نکالے جاتے تھے!

اللہ کے دین میں کسی فرد، چند آدمیوں یا کسی گروہ، ٹولی یا جماعت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی رسم یا طریقہ کو نکال کر اس پر "دینی شعار" کا ٹھپہ لگا دے، ایسا کرنا دین کا فساد ہے، اور یہیں سے خرابیوں اور جھگڑوں کا آغاز ہوتا ہے، مثلاً ڈاڑھی رکھنا دینی شعار ہے، ڈاڑھی کتنی ہونی چاہیئے اس کی کمیت میں اختلاف ملتا ہے، لیکن مسلمانوں کے ہر فرقہ کے نزدیک ڈاڑھی دینی شعار سمجھی جاتی ہے! مگر یہ جو بعض مسلمانوں کے یہاں رسم ملتی ہے کہ بزرگوں کے نام پر بچوں کے سروں پر بالوں کی چوٹیاں رکھاتے ہیں، اور انہیں قبروں پر جا کر منڈواتے ہیں، یہ دینی شعار نہیں بیہودہ اور لغو رسم ہے! اب کچھ لوگ یا کوئی جماعت اس پر اصرار کرے کہ ہم تو اسے دینی شعار سمجھتے ہیں، تو کیا اس دعوے کو درست تسلیم کیا جا سکتا ہے! اسی طرح قبروں پر چادریں چڑھانے کے لئے اور ان پر صندل ملنے کے لئے جو چادروں اور "صندل شریف" کے جلوس نکلتے ہیں وہ دینی شعار تو کیا ہوتے، دین کے ساتھ کھلا ہوا مذاق ہے!

غم ہو خوشی ہو، ان کا اظہار اسلامی حدود میں رہ کر ہی کرنا چاہیئے، مثلاً غزوۂ احد میں حضرت سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا تمام صحابہ کو خاص طور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت غم ہوا، مدینہ کے گھروں سے شہداء کے غم میں گریہ و بکا کی آوازیں

کرنے لگیں، حضورؐ پر رقت طاری ہوئی، اور سرکارؐ نے اسی عالم میں فرمایا :-

اما حمزۃ فلا بواکی لہ لیکن حمزہؓ کا کوئی رونے والا نہیں -

اور

" انصارؓ نے یہ الفاظ سنے تو تڑپ اٹھے، سب نے جا کر اپنی بیویوں کو حکم دیا کہ دولت کدہ پر جا کر حضرت حمزہؓ کا ماتم کریں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو دروازہ پر پردہ نشینانِ انصار کی بھیڑ تھی، اور حضرت حمزہؓ کا ماتم بلند تھا، اُن کے حق میں دعائے خیر کی اور فرمایا میں تمہاری ہمدردی کا شکر گزار ہوں لیکن مُردوں پر نوحہ کرنا جائز نہیں (عرب میں دستور تھا کہ مُردوں پر عورتیں زور زور سے نوحہ اور بین کرتی تھیں، کپڑے پھاڑ لیتی تھیں، گال نوچتی، گالوں پر تھپڑ مارتی تھیں اور چیخیں چلاتی تھیں) یہ رسم بد اسی دن سے بند کر دی گئی اور فرمایا گیا کہ آج سے کسی مُردہ پر نوحہ نہ کیا جائے، یہ بھی بعد میں ارشاد ہوا کہ اس طرح ماتم کرنا مسلمان کی شان نہیں "-

(سیرۃ النبی، علامہ شبلی نعمانی بحوالہ ابن ہشام، مسند احمد، اور صحیح بخاری)

اس دن کے بعد غزوات میں صحابۂ کرام جن میں اہل بیت بھی شامل ہیں، شہید ہوئے، مگر نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کے غم میں ماتم کرنے کا حکم دیا، اور نہ کسی کے تابوت کا جلوس مدینہ کی گلیوں میں نکالا گیا، مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ غم کا دن وہ دن تھا جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی ہے مگر اُس دن کسی صحابی نے نہ تو سینہ کوبی کی نہ گریبان چاک کئے گئے نہ سیاہ لباس پہنا گیا، اور جسم اطہر کی تدفین کے بعد، نہ آپ کا تیجا ہوا، نہ دسواں، بیسواں اور چالیسواں! خلفائے راشدین کے دور میں بھی شہدا کے غم میں ماتم و سینہ کوبی اور تیجا اور چالیسواں کرنے کی کوئی مثال نہیں ملتی! حضرت علی کرم اللہ وجہ حاکم وقت اور اپنے دور کے راشد خلیفہ تھے، اگر اظہار غم کے لئے سینہ کوبی اور شہدا کے فرضی تابوت اور جنازے نکالنے کی رسم دینی شعار ہوتا تو حضرت علی کرم اللہ وجہ، حضرت جعفر طیارؓ اور حضرت حمزہؓ کے دردناک شہادت کے دنوں اور تاریخوں میں ایسا کیا کرتے مگر نہیں کیا گیا، اس سے یہ بات کسی شک و شبہ اور التباس کے بغیر سامنے آتی ہے کہ شہدا کی عزاداری سینہ کوبی اور علم و تابوت کے جلوس اور گشت کے ساتھ حضرت علیؓ اور شیعان علیؓ کا شعار نہیں رہا، یہ سب بعد کے لوگوں اور خاص طور سے بادشاہوں کی نکالی ہوئی رسمیں ہیں، جن کی کوئی دینی اہمیت نہیں ہے اور ان خود ساختہ رسموں اور مظاہروں سے مسلک " شیعیت " کو خواہ مخواہ وابستہ کر دیا گیا ہے!

ہم نے اُوپر جو کچھ کہا ہے وہ سُنی شیعہ اختلافات سے متاثر ہو کر نہیں کہا، کسی خاص فرقہ کی جانب داری اور اُس کے مدمقابل دوسرے فرقہ کی مخالفت ہمارا مسلک ہی نہیں ہے، دینی مسائل کو شیعہ، سُنی اور وہابی و دیوبندی نقطۂ نگاہ سے ہم نہیں سوچتے، اہل بدعت سُنی جو فاسد عقائد رکھتے ہیں اور عرس اور نذر و نیاز کے نام سے جو حرکتیں کرتے ہیں اُن کی تردید میں ہم نے کئی سو صفحوں کا " توحید نمبر " شائع کیا ہے! دینی مسائل کے جانچنے کی کسوٹی " کتاب و سُنت " ہے، اس کسوٹی پر چاہے وہ سُنی ہو شیعہ ہو مُقلد ہو اور غیر مقلد ہو جس کا بھی کوئی عقیدہ اور عمل پورا نہیں اُترتا، اُس کو ہم درست تسلیم نہیں کرتے، اور اُس کا غلط اور نادرست ہونا، اُن لوگوں پر جو اِن میں مبتلا ہیں، ظاہر بھی کر دیتے ہیں!

دین کے بنیادی عقائد کی طرح تمام مسلمان فرقوں کے دینی شعار بھی مُشترک ہیں اور ہونے چاہئیں، مثلاً اضحیٰ اور فطر کی عیدیں ہیں،

اللہ تعالیٰ کے نام پر جانوروں کی قربانی ہے، دُنیا میں جہاں جہاں بھی مُسلمان بستے ہیں ان دینی شعائر کا اشتراک نظر آتا ہے، مگر جہاں کہیں بھی کسی فرقہ کے یہاں کوئی خاص رسم، خاص تقریب اور مخصوص شعار پایا جاتا ہے، جو دوسرے اسلامی فرقوں کے یہاں نہیں ملتا، تو اس رسم، تقریب یا شعار کی یہ انفرادیت اور اس کا تمام مسلمانوں میں مشترک نہ ہونا اس کی دلیل ہے کہ وہ رسم و تقریب "دینی شعار" نہیں ہے، اس کے مُوجد اور مخترع چند دماغ ہیں جس کو رفتہ رفتہ مذہبی حیثیت حاصل ہو گئی ہے!

ہوتا یہ ہے کہ بڑے پیر صاحب کے نام پر جو بڑی گیارھویں کی جاتی ہے، اس دن کچھ لوگوں نے جھنڈے ہاتھ میں لئے اور چل پڑے، اُن کی دیکھا دیکھی، راستہ میں لوگ شامل ہوتے گئے، اور یہ اچھا خاصہ جلوس بن گیا، اسی طرح کسی شہید کے نام پر کچھ لوگوں نے علم اور تابوت لے کر ایک جُلوس مرتب کر لیا۔ بیچاری پُولس ہے کہ انتظام کے لئے دوڑی دوڑی پھر رہی ہے کہ کہیں کوئی ناخوشگوار واقعہ ظہور میں نہ آجائے! ادھر جلوس والے، اُدھر تماشائیوں کا اژدھام! پردہ نشین عورتیں مَردوں سے خلط ملط ہو رہی ہیں، ہزار احتیاط کے باوجود چہروں پر نقابیں نہیں ٹھیر سکتیں، عورتوں کے چہرے کھلے جا رہے ہیں! ممکن ہے کہ سو میں ایک دو آدمیوں کو نماز پڑھنے کی توفیق میسر آتی ہو، ورنہ سچ بات تو یہ ہے کہ پُورا جلوس اور یہ سارا میلہ نماز سے غافل ہے! اور وہ اس لئے کہ اس ماحول کا مزاج ہی خشیت و تقوی کا مزاج نہیں ہے ـــــ اتنی بہت سی بے عنوانیوں، اور بے احتیاطیوں اور "صلوٰۃ" جیسے ضروری فریضے سے غفلت بَرت کر آخر ملا کیا؟ دوسری طرف مسلمانوں کی وہ تقریبیں اور دینی شعار ہیں، جو سب کے نزدیک مشترک ہیں، مثلاً عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی تقریبیں ہیں، ان میں وہ مسلمان تک جنہیں شاید جمعہ کی نماز پڑھنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز دیکھے گئے ہیں، اسی طرح حج کے موقعہ پر کوئی غافل سے غافل مُسلمان بھی نماز ترک نہیں کر سکتا!

ـــــ ہاں تو جن جلوسوں کا ـــــ

اُوپر ذکر کیا گیا ہے، اُن میں کسی ایک شریر آدمی کا کوئی شرارت کر کے فساد پیدا کرا دینا بہت آسان ہے، ایک اینٹ، ایک پٹاخہ، ایک نعرہ، سائیکل کے معمولی سے تصادم پر چند آدمیوں کا بھاگ پڑنا، جلوس میں ابتری، انتشار اور فساد پیدا کر سکتا ہے، اس طرح فضا تو مکدر بہرحال ہو ہی جاتی ہے، اب یہ مجمع کے مزاج اور موقعہ کی نزاکت پر منحصر ہے کہ یہ فساد خرابی کی کس حد　تک پہونچتا ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ سے بڑھ کر اور کس کا روضہ مقدس ہو سکتا ہے۔ اگر حضورؐ کے روضہ کی نقل بنا کر اُس کا جلوس نکالا جائے، اور اُسے لوگ گلی گلی لئے پھریں، اس پر ملیدے اور بتاشے چڑھائے جائیں، اُس سے مُرادیں مانگی جائیں، تو ایسا کرنا اجر تو کیا اُلٹے وبال اور خسران کا موجب ہوگا! اور وہ اس لئے کہ کتاب و سُنّت میں ایسا کرنے کا نہ تو کوئی حکم دیا گیا ہے، اور نہ صحابۂ کرامؓ اور اہلِ بیتِ عظام کا یہ معمول رہا ہے! اسی سے دوسرے بزرگوں کے قبروں اور مزاروں کی نقلیں بنا کر اُن کے جلوس نکالنے پر قیاس کیا جا سکتا ہے!

قبروں پر گنبد بنانا، اُن کی دہلیزوں اور در و دیوار پر چاندی سونے کے پتر منڈھنا، اُن پر چراغاں کے لئے سُنہری اور رُوپہلی ہانڈیاں اور فانوس لٹکانا، قبروں کے اردگرد قیمتی کٹہرے، بیش قیمت چادریں اور غلاف، دروازوں پر نوبت اور روشن چوکی کا اہتمام یہ نہ رسول اللہؐ نے کیا، نہ صحابہ، اہلِ بیت اور تابعین نے! نہ کسی امام، فقیہہ اور محدث نے! یہ بادشاہوں کی نکالی ہوئی بدعتیں ہیں! اس لئے ان بدعات کی ہو بہو نقل وہی اُتارے گا، جسے بادشاہوں کی سُنّت اور سلاطین کا طریقہ پسند ہوگا۔ اور جسے سُنّت نبویؐ، آثارِ صحابہ اور طریقِ اہلِ بیت محبوب ہوگا، وہ ان بدعات میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ پاکستان کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ یہاں کے حکمرانوں کو اس کا دھیان نہیں آیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں زمین میں تمکن واقتدار عطا فرمایا ہے، تو ہم اُس کے حکم کے مطابق قیامِ صلوٰۃ کے

لئے جدّوجہد کریں! اُنہیں اس کے مقابلہ میں مسٹر محمد علی جناح قائدِ اعظم مرحوم کے مقبرہ بنانے سے بہت زیادہ شغف ہے، جو تاج محل اور مقبرہ جہانگیر کی طرح مقامِ عبرت اور آخرت کی یاد دلانے کی بجائے مقامِ سیر و تفریح ہو جائے گا! پھر پاکستان میں جو حکومتیں آتی رہی ہیں، اُنھوں نے قبروں کی مجاورت کی ذمہ داری اپنے سر لے رکھی ہے، باہر سے جو بڑے لوگ اور وفود آتے ہیں، اُن کو سرکاری اہتمام کے ساتھ قبروں پر لے جایا جاتا ہے، اور قبروں کی گلپوشی کی رسم ادا کی جاتی ہے، اس کے جواب میں پاکستان کے اکابر اور وفود لینن کی قبر اور گاندھی جی کی سمادھ پر پھول چڑھاتے ہیں! یہ ذکر یہ دکھانے کے لئے کیا گیا ہے کہ بادشاہوں اور حکمرانوں نے "مذہب و عقیدہ" کے نام پر کیسی کیسی غلط رسموں کی بنا ڈالی ہے، اور لوگوں نے اپنی غلط فہمی کے سبب اُنہیں دین سمجھ لیا ہے۔۔

ہم نے جن حقائق کا اُوپر تجزیہ کیا ہے، اُنہیں پڑھ کر معلوم ہو سکتا ہے کہ فرقہ وارانہ تکدر، ناگواری اور پھر فساد و تصادم کے محرکات و عوامل کیا ہیں! کس عمل کا کیا ردِ عمل ہو سکتا ہے؟ فساد کا سرچشمہ کہاں ہے! کن رسموں اور مظاہروں کے سبب مفسدین اور شرارت پسندوں کو چھیڑ خانی کرنے کے مواقع میسر آتے ہیں! جہاں تک امن و امان، صلح و آشتی اور بھائی چارے کا تعلق ہے اس کے لئے ہر کوشش اور اقدام کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں! شیعہ اور سُنی تو مسلمان ہیں، اور دینی بھائی ہیں، ہم تو پاکستان میں کسی ہندو عیسائی اور یہود۔ یہی ذراسی زیادتی دیکھنا گوارا نہیں کر سکتے کہ اسلام فتنہ و فساد اور نزاع و تصادم کا نہیں سلامتی کا دین ہے! پاکستان اسی وقت وجود میں آیا تھا، جب مسلمانوں کے تمام فرقوں نے متحد ہو کر جدّوجہد کی تھی، اور پاکستان کو ترقی و استحکام مسلمانوں کے آپس کے اتحاد و اتفاق ہی سے حاصل ہوگا!

ماہرالقادری

۲۳ [illegible]

مولوی محبوب الرحمٰن (آزاد کشمیر)

قرآن اور مسلمان

انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی باری تعالیٰ نے پیغمبروں کے ذریعہ اس کی ہدایت کا سلسلہ شروع فرمایا اور انسانوں کی بستی جب بسی تو انسان دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک وہ جنہوں نے انبیاء کی پیروی اختیار کی۔ دوسرے اس ہدایت سے انکار کرنے والے۔ پہلے قبیل کے لوگوں کا راستہ اسلام کا راستہ ہے اور اس کے برخلاف دوسروں کی راہ کفر کی راہ ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فرمانبردار لوگوں کے لئے مسلمان نام حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تجویز کردہ ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (الحج) — دین تمہارے باپ ابراہیم کا۔ اُسی نے نام رکھا تمہارا مسلمان۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت جس امت مسلمہ یعنی ایک فرمانبردار امت کے وجود کے لئے دعا فرمائی تھی اس کی قبولیت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی صورت میں ہوئی کہ آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں اور آپ کی امت کو امت مسلمہ کا لقب ملا۔ آئیے اب دیکھیں کہ قرآن کے نزدیک مسلم کی تعریف کیا ہے لفظ مسلم کے معنی فرمانبردار کے ہیں۔ اس معنیٰ کی تصدیق قرآن خود کرتا ہے

اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ (النمل) — خبردار زور نہ کرو میرے مقابلہ میں اور چلے آؤ میرے سامنے حکمبردار ہو کر۔

ایک با عظمت و شوکت ہستی کے مقابل ادنیٰ فرد کے لئے سوائے اطاعت و حکمبرداری کے کوئی چارہ نہیں۔ اسی مفہوم میں حضرت سلیمانؑ کا پیغام ملکہ بلقیس کے نام ہے کہ بغیر ترائی دکھائے میری حکمبرداری میں داخل ہو جاؤ۔ گویا جب ہم مسلمان ہیں تو لازم ہے کہ اپنے مالک و خالق رب کے حضور اطاعت کے لئے جھکے رہیں۔

اس سے آگے پھر ارشاد ہوتا ہے:-

قَالَ يٰاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ (النمل) — بولا اے دربار والو تم میں کوئی ہے کہ لے آئے میرے پاس اُس کا تخت پہلے اس سے کہ وہ آئیں میرے پاس حکمبردار ہو کر۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا اشارہ ہے کہ اگر بلقیس کی نافرمانی کی صورت میں اس پر غلبہ کی نوبت آجائے تو اس وقت اسے میرے حکم کی اطاعت اور فرمانبرداری کے سوا چارہ نہیں۔ اس سے پہلے ہی آپ اس کے تخت کو طلب فرماتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جس طرح غالب طاقت کے مقابل مغلوب کو اطاعت کئے بغیر چارہ نہیں۔ بس ایسی ہی مسلمان کی شان ہونی چاہیئے کہ وہ اپنے غالب رب کی اطاعت میں ہر دم جھکا رہے۔ اس کے ساتھ ہی سورۃ والصّٰفّٰت کی یہ آیت بھی پیش نظر رکھئے

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ — پھر جب دونوں نے حکم مانا اور پچھاڑا اسکو ماتھے کے بل

گویا اسلام یہ ہے کہ ہر مسلمان ان دونوں باپ بیٹے کی طرح خدا کی رضا کی خاطر صرف اس کی طرف جھک جائیں جس طرح باپ ذرا سا اشارہ پاتے ہی خدا کی خاطر بیٹے کو قربان کرنے پر تیار ہو گیا۔ اور ساتھ ہی بیٹے نے خدا کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ اور ذرا سی بھی کمزوری یا جھجک نہیں دکھائی پس مسلمان بھی خدائی اشارہ پاتے ہی ہر قسم کی قربانی کرنے پر تیار ہو جاتا ہے اور کسی حیل وحجت اور چون وچرا سے کام نہیں لیتا۔

سورۃ بقرہ کے پندرھویں رکوع سے خداوند تعالیٰ اپنی حکمبرداری کا ذکر اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ بنائے کعبہ کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ہمراہ دعا فرمائی "اے پروردگار ہمارے کر ہم کو حکمبردار اپنا۔ اور ہماری اولاد میں بھی کر ایک جماعت فرمانبردار اپنی" اس دعا سے دونوں باپ بیٹوں کی صفائی قلب اور اخلاص نیت کا کس قدر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دونوں اپنے رب کے حضور فرمانبردار بننے کی التجا کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام اس قدر بلندیٔ شان کے باوجود بھی اپنی شان خداوند تعالیٰ کی حکمبرداری میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ قرآن پھر اس سے آگے بیان کرتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود بھی خدا کے حضور حکمبرداری کا اظہار کیا

إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ (بقرہ)

جب ابراہیم علیہ السلام کو اس کے رب نے کہا کہ حکمبرداری کر تو میری۔ بولا کہ میں حکمبردار ہوں تمام عالم کے پروردگار کا۔

اسی کے آگے قرآن کہتا ہے کہ حضرت ابراہیم ویعقوب علیہما السلام نے اپنی اولاد کو یہی وصیت کی تھی "سو تم ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان" یعنے مسلمان کی زندگی کے شب وروز صرف خداوند تعالیٰ کی مرضی میں صرف ہوں۔ اور جب موت کا وقت آئے تو اس وقت بھی اس کا خاتمہ ایمان اسلام اور اطاعت وفرمانبرداری پر ہو۔

گذشتہ اقوام میں یہ عام طور پر خامی نظر آتی ہے کہ انبیاء کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ان کی امت کے اکثر افراد انبیاء کا راستہ چھوڑ بیٹھے اور غیر اللہ کی پرستش شروع کر دی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی موت کے وقت اپنی اولاد سے یہ اقرار لیا کہ وہ صرف خداوند تعالیٰ کی پرستش کریں گے اور یہ کہ سب اسی کے فرمانبردار رہیں گے۔

کائنات کا ذرہ ذرہ اس حقیقت کی گواہی دیتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اس جہان کو پیدا کیا۔ ہر چیز اسی کی مطیع ہے۔ زمین ذروں سے لیکر فلک الافلاک اور اس سے بھی ماوراء ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مطیع ومنقاد ہے اور اس کے حکم سے مسخر ہے۔ ان تمام حقائق کا مشاہدہ کرنے کے بعد لازم آتا ہے کہ انسان بھی اپنے مالک وخالق سے تعلق قائم کرے۔ بادی النظر میں بھی یہ بات بڑی ناشکری کے مترادف ہے کہ کائنات کو پیدا کرنے والا تو خدا ہو۔ لیکن انسان تمام احسانات کے باوجود خداوند تعالیٰ کے سوا دوسروں سے بندگی کا معاملہ کرے

قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ قُلْ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ أَوَّلَ مَنْ أَسْلَمَ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (انعام)

تو کہہ دے کہ کیا اور کسی کو بناؤں اپنا مددگار اللہ کے سوا جو بنانے والا ہے آسمانوں اور زمین کا اور وہ سب کو کھلاتا ہے اور اس کو کوئی نہیں کھلاتا۔ کہہ دے مجھ کو حکم ہوا ہے کہ سب سے پہلے حکم مانوں۔ اور تو ہرگز نہ ہو شرک کرنے والا۔

دوسری جگہ ارشاد باری ہے:۔

إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِي حَرَّمَهَا وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ۔ (القصص)

مجھ کو حکم ہے کہ بندگی کروں اس شہر کے مالک کی جس نے اس کو حرمت دی اور اسی کی ہے ہر چیز اور مجھ کو حکم ہے کہ رہوں میں حکمبردار۔

اسلام نام ہی گردن بہ طاعت نہادن کا ہے، اللہ تعالیٰ کے حکم کی خوش دلی کے ساتھ پیروی اور اطاعت، اس طرح مسلمانوں کے

تہذیب وتمدن کی اساس ایک بنیادی عقیدہ پر قائم ہوتی ہے۔ مسلمان اپنے عقیدے کی رو سے تمام انبیا کی نبوت کی تصدیق کرتا ہے اور ان کو اپنا پیشوا سمجھتا ہے۔

وَلَا تُجَادِلُوْا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْا اٰمَنَّا بِالَّذِیْۤ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَاُنْزِلَ اِلَیْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (العنکبوت)

اور جھگڑا نہ کرو اہل کتاب سے مگر اس طرح پر جو بہتر ہو مگر ان ان میں بے انصاف ہیں اور یوں کہو کہ ہم مانتے ہیں جو اترا ہم کو اور اترا تم کو اور بندگی ہماری اور تمہاری ایک ہی کو ہے۔ اور ہم اسی کے حکم پر چلتے ہیں۔

اور اگر اہل کتاب سے بہ صورت تمہاری نہ بن سکے۔ تو پھر مسلمانوں کو تاکید ہے کہ تم اپنی دینی روش پر قائم رہو۔ ایسی حالت میں ان لوگوں سے تعلق قائم رکھنا مسلمان کے لئے مناسب نہیں۔

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْـًٔا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (آل عمران)

تو کہہ اے اہل کتاب آؤ ایک بات کی طرف جو برابر ہے ہم میں اور تم میں کہ بندگی نہ کریں ہم مگر اللہ کی اور شریک نہ ٹھیرائیں اس کا کسی کو اور نہ بنا دے کوئی کسی کو رب سوا اللہ کے اگر وہ قبول نہ کریں تو کہدو کہ گواہ رہو کہ ہم تو حکم کے تابع ہیں۔

دراصل اسلام ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ جو عقیدۂ ایمان وتقوی سے خالی نہ ہو۔ ان کا اپنا اصول دین۔ تہذیب وتمدن کی اساس اور نظام زندگی کے جملہ قواعد حکم خداوندی کے مطابق ہوں۔ غرضیکہ ایمان ہی وہ خوبی ہے جس کے حصول سے خدا تعالیٰ کی طرف رہنمائی ہوتی ہے اور اسلام یعنی حکمبرداری کے سب خصائل اعضاء وجوارح سے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر ایمان کمزور ہے تو سمجھ لیجئے کہ اسلام میں بھی پختگی نہیں آئی اس لئے زبان سے اسلام کا دعویٰ کرنا کچھ معنی نہیں رکھتا جب تک ایمان دل میں موجود نہ ہو۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۖ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ

کہتے ہیں اعراب کہ ہم ایمان لائے تو کہہ تم ایمان نہیں لائے پر تم کہو ہم مسلمان ہوئے اور ابھی نہیں گھسا ایمان تمہارے دلوں میں

اور جب ایمان کی حرارت دل میں آجائے تو ساری زندگی کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ بس پھر مسلمان کے سامنے صرف ایک مقصد یعنی اللہ کی خوشنودی رہ جاتی ہے۔ فرعون کے بلائے ہوئے جادوگر حضرت موسیٰؑ سے مقابلہ کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے جب ان پر حقیقت منکشف ہو گئی اور ایمان کی لذت انہوں نے چکھ لی تو اب وہ فرعون کی جھوٹی خدائی کے منکر ہو جاتے ہیں اور یہ دعا کرتے ہیں کہ ان کی موت حالت اسلام میں آئے۔

وَمَا تَنْقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰیٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ؕ رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ۔

اور تم کو ہم سے یہی دشمنی ہے کہ مان لیا ہم نے اپنے رب کی نشانیوں کو جب وہ ہم تک پہنچیں۔ اے رب ہمارے دہانے کھول دے ہم پر صبر کے اور ہم کو مسلمان کی موت عطا فرما۔

یہی سب سے بڑی سعادت ہے کہ ایک بندہ خداوند تعالیٰ کا سچا فرمانبردار بن جائے۔ قرآن ایسے لوگوں کے لئے ہدایت رحمت اور خوشخبری کا پیام دیتا ہے۔

وَنَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِیْنَ (النحل)

اور اتاری ہم نے تجھ پر کتاب۔ کھلا بیان ہر چیز کا اور ہدایت اور رحمت اور خوشخبری حکم ماننے والوں کے لئے۔

ہدایت درصل یہی ہے کہ بندہ اپنی گردن خدا کے سامنے جھکا دے ایسی صورت میں اس کی زندگی کے شب و روز خداوند تعالے کی مرضی میں صرف ہوں گے۔ سورہ جن میں جنوں کے الفاظ اس طرح نقل ہیں۔

وَاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ط فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ط　　　اور یہ کہ کچھ ہم میں حکم بردار ہیں اور کچھ بے انصاف ہیں سو جو لوگ حکم میں آئے سو انہوں نے ڈھونڈلی نیک راہ۔

بادی النظر میں جس طرح ایک اندھا دن کی روشنی کے باوجود راستہ گم کر بیٹھتا ہے۔ بعینہ ہدایت بھی اسی کو حاصل ہو سکتی ہے جو اللہ تعالی پر کامل ایمان رکھتا ہو۔ اور پوری زندگی اس کی اطاعت اور حکمبرداری میں گزار دے۔

وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِی الْعُمْیِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ (الروم)　　　اور نہ تو راہ سجھائے اندھوں کو ان کے بھٹکنے سے تو تو سنائے اسی کو جو یقین لائے ہماری باتوں پر سو وہ مسلمان ہوئے

انسان کو زندگی اللہ تعالی نے عطا فرمائی ہے اور وہ جن طاقتوں اور توانائیوں کے سہارے زندہ ہے وہ سب خداوند تعالی کے احسانات کا نتیجہ ہیں۔ ایک بندہ جب عقل و شعور کی مدد سے جب اس اصلیت سے واقف ہو جاتا ہے تو پھر وہ بے اختیار اللہ تعالے کا شکر بجا لاتا اور اس کی حمد بیان کرتا ہے۔ قرآن اس موقع پر ایسے شکر گذار بندے کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

" یہاں تک کہ جب پہنچا اپنی قوت کو اور پہنچ گیا چالیس برس کو کہنے لگا اے رب میرے میری قسمت میں کر کہ شکر کروں تیرے احسان کا جو تو نے مجھ پر کیا۔ اور میرے ماں باپ پر۔ اور یہ کہ کروں نیک کام جس سے کہ تو راضی ہو اور مجھ کو دے نیک اولاد میری بیشک تو بہ کی تیری طرف اور میں ہوں حکمبردار "

بس معلوم ہوا کہ خداوند تعالی کے ہاں شکر گذاری یہی ہے کہ بندہ اس کا حکمبردار بن جائے۔ جب پوری زندگی ہی خدا کے سپرد ہو جائے تو خداوند تعالی ایسے فرمانبردار بندوں کی کوششیں کیسے رائگاں کریں گے۔ ایسے لوگ بے شک آخرت میں جنت کے انعامات سے مستفیض ہونگے۔ سورہ احزاب کے پانچویں رکوع میں اہل جنت کی تعریف قرآن ان الفاظ سے کرتا ہے:۔

"بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں۔ اور ایمان دار مرد اور ایمان دار عورتیں۔ بندگی کرنے والے مرد اور بندگی کرنے والی عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور محنت جھیلنے والے مرد اور محنت جھیلنے والی عورتیں۔ اور دبے رہنے والے مرد اور دبی رہنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور حفاظت کرنے والے مرد اپنے مقامات شہوت کے اور حفاظت کرنے والی عورتیں، اور یاد کرنے والے مرد اللہ کو بہت سا اور یاد کرنے والی عورتیں۔ رکھی ہے اللہ نے ان کے واسطے معافی اور ثواب بڑا"

یہ اہل جنت کے خصائل ہیں۔ اور سرفہرست حکمبردار بندوں اور عورتوں کا ذکر موجود ہے۔ اسی طرح قیامت کے روز جب نفسی نفسی کا عالم ہوگا کسی کی دوستی کام نہ آئے گی۔ خوف و ہراس ہر نفس کو پریشان کئے ہوئے ہوگا۔ لیکن حکمبردار بندے ان تمام پریشانیوں سے محفوظ ہوں گے جس طرح دنیا میں یہ لوگ باہمی الفت اور رحم و شفقت کے جذبات رکھتے تھے آخرت میں بھی باہمی دوستی سے ہمکنار رہیں گے۔

اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ o یٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاٰیٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِیْنَ　　　جتنے دوست ہیں۔ اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہونگے مگر جو لوگ ہیں ڈر والے۔ اے بندو میرے نہ ڈر ہے تم پر آج کے دن اور نہ تم غمگین ہوگے جو یقین لائے ہماری باتوں پر اور رہے حکمبردار۔

ان آیات سے متقی کی تعریف کا پتہ چلا کہ وہ لوگ ایمان دار اور حکم بردار ہوتے ہیں۔ مذکورہ بالا مفہوم کو ذہن میں رکھ کر خود اندازہ لگائیے کہ اسلام کا مقصد کس معاشرہ کو قائم کرنا ہے۔ خلاصہ کے طور پر یوں سمجھئے کہ خداوند تعالیٰ کے ہاں ایسے ایمان دار پسند ہیں۔ جو صرف اسی کے ہو جائیں۔ اسی کو اپنا رب اور معبود سمجھیں اور اس کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کی جدوجہد میں لگے رہیں یہاں تک کہ اسی حالت میں انہیں موت آجائے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ — اے ایمان والو ڈرتے رہو اللہ سے جیسا چاہیئے اس سے ڈرنا اور نہ مریو مگر مسلمان۔

یہاں خداوند تعالیٰ نے دو باتوں کی ایمان داروں کو تاکید فرمائی ہے۔ اول ایمانداروں کو صرف خدا ہی سے ڈرنا چاہیئے۔ دوسرے ساری کی ساری زندگی اطاعت الٰہی میں بسر ہو۔ یہاں تک کہ جب موت کا وقت آئے تو مومن حالت اسلام میں جان دے۔

قرآن کے نزدیک اسلامی معاشرہ کی حدود ایک خاص حلقہ تک ہی محدود نہ ہوں۔ بلکہ اس کا ہر فرد دعوت و ارشاد کا پیکر ہو اور اپنی ذات سے بھی نیک ہو اور دوسروں کو بھی نیک بننے کی دعوت دے۔

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۔ (حٰمٓ السجدہ) — اور اس سے بہتر کس کی بات ہے جس نے بلایا اللہ کی طرف اور کیا نیک کام اور کہا میں حکم بردار ہوا۔

آپ پڑھ چکے ہیں کہ قرآن کے نزدیک اسلام کا مفہوم اور مسلمان کی تعریف کیا ہے مسلمان کو کیسا ہونا چاہیئے۔ اس کے کیا فضائل خصائص اور فرائض ہیں؟ قرآن نے جو مسلم کے کردار کا آئینہ پیش کیا ہے۔ آئیں ہم سب کو اپنے چہرے دیکھنے چاہئیں تاکہ ہمیں اصلاح حال کی توفیق نصیب ہو۔

از :۔ مریم جمیلہ (امریکن نومسلمہ)

ترجمہ :۔ لالۂ صحرائی

اپنے والدین کے نام کھُلا خط

بخدمت مسٹر و مسز ہربرٹ ایس۔ مارکوس
لارچ مانٹ ایکرز اپارٹ ۲۲۳۔ سی
لارچ مانٹ۔ نیویارک ریاستہائے متحدہ امریکہ

میری بہت ہی پیاری امی اور بہت ہی پیارے ابا !

میں آپ کی اس نوازش کی حقیقتاً ہمیشہ ہمیشہ تہِ دل سے ممنون رہوں گی کہ آپ نے میرے نئے عقیدہ کا غیر معمولی کشادہ دلی اور خوشدلی مزاج کے ساتھ استقبال و احترام فرمایا۔ حالانکہ یہ نیا عقیدہ آپ کے اپنے عقیدہ کے یکسر خلاف تھا۔ میں یہاں لاہور میں مولانا مودودی کے گھر آپ کی کامل رضامندی اور حوصلہ افزائی کے ماتحت آئی ہوں اگر آپ نے میرے ساتھ اس طرح تعاون نہ فرمایا ہوتا تو میں غالباً یہاں تک کبھی نہ پہنچ پاتی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ فی زمانہ امریکہ کے بہت کم، بلکہ چند ایک والدین ہی اپنی لڑکی کو وہ کچھ کرنے کی اجازت دیں گے جو میں آپ کی عالی ظرفی کے سہارے کر چکی ہوں۔

آپ کو اگرچہ میرا نیا عقیدہ پسند نہیں آیا۔ اس کے باوجود آپ نے میرے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی، اور نہ آپ نے میرے عقائد پر کبھی ملامت، یا تضحیک کا اظہار کیا، تاہم باہمی افہام و تفہیم اور باہمی احترام کی سعیٔ بسیار کے باوجود، بدقسمتی سے ہمارا اختلاف رفتہ رفتہ شدید تر ہوتا گیا، اور ہمارے ذہنوں کے مابین حائل شدہ خلیج وسیع تر ہوتی گئی۔ آپکا احترامِ آدمیت کا مظہر، عقیدۂ "لاادریت[1]" اور اس عقیدہ سے آپکے دل میں پیدا شدہ غیر معمولی محبت اور شفقت بھی بدقسمتی سے آپ کو ان امور کی صحیح قدر و منزلت کا احساس نہ دلا سکی جو ان دنوں میری عزیز ترین متاع ہیں۔

جب کوئی شخص مسلمان ہوتا ہے، تو اس کے لئے محض یہی کافی نہیں ہوتا کہ وہ کلمہ۔ نماز۔ روزہ اور حج کے متعلق زبان سے کچھ کہہ سن لیا کرے' ان سب ارکان کی اہمیت اپنی جگہ پر مُسلّم ہے تاہم جب تک کسی نومسلم کا ذہنی۔ اخلاقی اور رُوحانی زاویۂ نگاہ مکمل طور پر تبدیل نہیں ہوجاتا۔ اس وقت تک اس کے لئے محض ارکانِ اسلام کی پیروی بے اثر رہتی ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد جو سب سے اہم تبدیلی میرے اندر رونما ہوئی وہ یہ تھی، کہ میرا ذہن ایکا ایکی ایک کافر ذہن کی بجائے ایک مسلم ذہن بن گیا۔ ایک مسلم ذہن کے طرزِ فکر سے آپ کو قدرے واقف کرنے کی خاطر میں آپ کو اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں یہ بتانے کی کوشش کروں گی کہ ایک مسلمان دنیا کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے ؟ زندگی کی قدر و قیمت اس کے نزدیک کیا ہے ؟ اور اس کے عقیدہ کا اثر۔ اس کے اخلاق، اس کے برتاؤ، اس کے ذوق، اور اس کی

[1] عقیدۂ لاادریت کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے متعلق کچھ نہیں جانتے اور نہ جان سکتے ہیں۔ اسے بظاہر الحاد کی ایک دبی سی قسم کہا جا سکتا ہے (مترجم)

اُمنگوں اور آرزوؤں پر کیا ہوتا ہے؟ میں محسوس کرتی ہوں کہ آپ کے لئے شروع شروع میں میری بہت سی باتیں بڑے تعجب بلکہ وحشت کا باعث ہوں گی تاہم جب آپ اصل اسلامی اقدار کے اندرونی معانی اور اُن کی حقیقی افادیت معلوم کرنے کے لئے گہری بصیرت سے کام لیں گے تو آپ کی یہ حیرانی اور وحشت یقیناً دور ہو جائے گی۔

اللہ کی غلامی کا نظریہ

اسلام کا سب سے بڑا اور سب سے اہم عقیدہ یہ نظریہ ہے کہ آدمی در اصل خدا کا بندہ اور خدا کا غلام ہے۔ عربی زبان میں بندۂ خدا یا غلامِ خدا کے لئے "عبداللہ" کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عربی کا یہ نام تمام اسلامی ممالک میں مسلمانوں کے ہاں کثرت سے مستعمل ہے۔ خود لفظ "اسلام" کے معنی بھی "اطاعتِ رضائے خدا" کے ہیں۔ اور جو لوگ بھی اس اطاعت کے لئے آمادہ ہو جائیں وہ "مسلم" کہلاتے ہیں۔ اس عقیدہ کے مطابق چونکہ حقیقت میں دنیا کا واحد حقیقی اور اعلیٰ ترین حاکم اللہ تعالیٰ ہی ہے اس لئے اہلِ مغرب کا وہ نظریہ جو ریاست اور دین میں تفریق پیدا کرتا ہے ایک مسلمان کے نزدیک لغو اور لایعنی قرار پاتا ہے۔ ایک اسلامی حکمران کا فرض صرف اتنا ہی ہے کہ وہ اس قانونِ خداوندی کو اپنی سلطنت میں نافذ کر دے جو پہلے سے قرآن اور حدیث میں بیان کیا جا چکا ہے۔ کوئی اسلامی حکمران قانون کا سرچشمہ اپنی ذات کو قرار نہیں دے سکتا۔ اور نہ اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی فہم کے مطابق خود ہی کوئی قانون گھڑ کر بندگانِ خدا پر نافذ کر دے۔ قانونِ الٰہی یعنی شریعت میں کوئی تغیر و تبدل کسی مرحلہ پر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس کی حدود کی کامل پابندی ملحوظ رکھتے ہوئے اس کی تشریح و تعبیر کی جا سکتی ہے۔ — دنیا میں کسی بھی جگہ جمہور کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی لامحدود حاکمیت کے آڑے آئے۔ حکومت صرف حق کے لئے زیبا ہے نہ کہ جمہوری اکثریت کے لئے لہٰذا ایک صحیح مسلمان کے نزدیک یہ امر محلِ اعتراض ہوگا کہ سربراہ حکومت کو عوامی یا جمہوری انتخابات کے ذریعے چنا جائے۔ ایسے اہم معاملہ کو عام لوگوں کی فہم و فراست پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس کی بجائے حاکمِ ملک کا چناؤ صرف قوم کے صالح اور عالمِ باعمل افراد کے مشوروں سے ہوگا۔ اور حاکمِ ملک کے لئے صالحیت، علم اور تجربہ نیز صلاحیت کے اعتبار سے دوسروں سے ممتاز ہونے کا وصف ضروری قرار پائے گا۔ ہر چیز کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ آدمی کسی چیز کا مالک نہیں ہے۔ اور مطلقاً خدا کا محتاج ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمان ذخیرہ اندوزی اور بنکوں میں ارتکازِ زر کو غلط سمجھتا ہے اور اس کی بجائے اپنی فاضل کمائی کو کم نصیب غرباء کے لئے غذا اور لباس مُہیا کرنے کے لئے، اور قابلِ اعتماد رفاہی اداروں شفاخانوں۔ اسکولوں اور ایسی تنظیموں کے قیام اور بقا کے لئے صرف کرنے کا قائل ہے جو تبلیغ دین کے لئے کام کر رہی ہوں۔ ان اُمور کے لئے اپنی دولت صرف کرتے وقت مسلمان پورے انشراحِ صدر کے ساتھ اس امر پر مطمئن ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے اس ایثار کا صلہ کبھی ضائع نہ ہوگا اور اس کے لازوال خزانوں سے انشاء اللہ ایک روز اسے بھرپور حصہ ملے گا۔ آدمی کی ملک میں جو کچھ ہے حتیٰ کہ اپنا جسم بھی محض خدا کی عطا فرمودہ ایک مستعار شے ہے اور وہ اسے صرف کسی بہتر فائدہ کے لئے استعمال کرنے کا ہی مجاز ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی اس ذمہ داری کو ادا کرنے میں ناکام رہے گا۔ تو اسے سخت سزا دی جائے گی۔ آدمی چونکہ خدا کا بندہ اور غلام ہے۔ لہٰذا اس کے لئے لازم آتا ہے کہ وہ اپنے آقا کی خوشنودی کی خاطر بشرطِ ضرورت اپنی ذاتی مسرتیں، آرزوئیں، راحتیں، آسائشیں اپنی دولت، اپنی املاک غرضیکہ ہر چیز اور ہر شے قربان کرنے کے لئے تیار رہے، حتیٰ کہ موقعہ آنے پر اپنی جان تک قربان کر دینے سے بھی اسے دریغ نہیں کرنا چاہیئے۔ ایک سچا مسلمان کبھی موت سے نہیں ڈرتا، کیونکہ موت اس کے نزدیک اپنے مولا کے ساتھ ابدی ملاقات کا راستہ قرار پاتی ہے۔ مسلمان کی راہ خدا میں یہ تمام جد و جہد "جہاد" یعنی ایک مقدس جنگ کے نام سے موسوم کی جاتی ہے اسلام کسی ذاتی یا نفسانی غرض سے کوئی جنگ برپا کرنے کو تو حرام قرار دیتا ہے تاہم مسلمان بلا وجہ کے انفعال کا قائل نہیں ہے۔ ہمارا قرآن پاک ہمیں یہ تعلیم دیتا

کہ جب کبھی ہم پر کوئی طاقت حملہ آور ہو تو ہمیں اپنے دفاع کے لئے کھڑا ہو جانا چاہیئے اور حملہ آور کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ مشہور مسلمان شاعر، علامہ محمد اقبال کا ایک شعر ہے کہ ؎

با توانائی صداقت توام است　　گر خود آگاہی ہمیں جام جم است

اسی طرح اُن کا ایک اور شعر بھی قابل ملاحظہ ہے ؎

گر نہ گردد حق ز تیغ ما بلند　　جنگ باشد قوم را نا ارجمند

قرآن کریم ایک مسلمان سپاہی کو میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھلانے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا خواہ وہ اپنی فتح کے بارے میں قطعی مایوس ہو چکا ہو اور غنیم اس پر کامل غلبہ پا چکا ہو۔ قرآن کے فرمان کے مطابق سپاہی کے لئے لازم ہے کہ اپنی زندگی کے آخری سانس تک جنگ جاری رکھے اس لئے صحیح مسلمان اپنی زندگی کی عارضی راحتوں اور مسرتوں کو ایک عظیم تر خیر کے لئے قربان کر دینے میں کبھی دریغ نہ کرے گا کیونکہ اسے یقین ہے کہ یہ قربانی بالآخر اس کے لئے لازوال ابدی مسرتوں نیز مکمل طمانیتِ قلب کا ذریعہ ثابت ہوگی۔ آدمی کے بندۂ خدا ہونے کا نظریہ اسے یک قلم انسانوں کی خدائی اور ان کے استبداد و ظلم سے آزادی عطا کر دیتا ہے ایک سچا مسلمان دنیا کے کسی آدمی سے نہیں ڈرتا وہ صرف خدا سے ڈرتا ہے۔

زمرۂ اسلام اور زمرۂ کفر

ایک مسلمان کے نزدیک یہ دُنیا دو زمروں میں منقسم ہے ایک زمرۂ اسلام اور دوسرا زمرۂ کفر۔ بنی نوع انسان کا اصل دشمن، افلاس، بیماری یا جہالت نہیں بلکہ کفر ہے جن بیا ہی مائیں، امراضِ خبیثہ، اسقاط اور زنا بالجبر کے واقعات ناجائز بچے، راہوں میں پڑے ہوئے مدہوش شرابی، آئین شکنی کی روز افزوں وبائیں، یہودیت۔ نازیت اور اشتراکیت سب کے سب کفر ہی کے مختلف مظاہر اور نتائج ہیں، اس دنیا میں جو چیز بھی مسلّم ہے وہ سراسر خیر اور فلاح ہے اور اس خیر اور فلاح کے خلاف جو کچھ بھی پایا جاتا ہے وہ کفر ہے جسے حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے خلاف ایسی کھلی بغاوت کہنا چاہیئے جو بہرحال ناقابلِ برداشت ہے۔ ایک مسلم اپنے کسی انسان بھائی کے متعلق کوئی اندازہ قائم کرنے کے لئے صرف یہ دیکھے گا کہ اس شخص کا عقیدہ کس قدر صحیح ہے اور اس عقیدہ کے عملی مظاہر اس کی روزانہ زندگی میں کس حد تک نظر آتے ہیں کسی شخص کی نسل اس کی قومیت یا اس کی دولت یا اس کا سماجی مرتبہ ایک مسلمان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا اگر کسی شخص کے اعمال اس عقیدہ کے مطابق نہیں ہیں جس کا وہ مدعی ہے تو اس کی حیثیت محض ایک ریاکار کی ہے اور یہی کہا جائے گا کہ حقیقت میں وہ اچھے یا بُرے کسی عقیدہ کا بھی مالک نہیں، انسان پرست لاادریوں کا یہ قول کہ آدمی کا اصل مقام اس کے اعمال سے متعین ہوتا ہے، نہ کہ اس کے مذہب سے، ایک مسلمان کے نزدیک بے معنی قرار پاتا ہے، کیونکہ مسلمان اس امر کا قائل ہے کہ آدمی کے اعمال کا تمام تر انحصار اس کے مذہب پر ہے مذہب اور اعمال کو ایک دوسرے سے الگ کرنا محال ہے۔ ایک مسلمان کے لئے انسانی آداب و اخلاق کے متعلق دینی اور مافوق الطبیعی بنیادوں سے ہٹ کر کچھ سوچنا ممکن ہی نہیں ہے۔

اسلام کی کشادہ دلی

ایک سچا مسلمان کبھی جنونی نہیں ہوتا، قرآن پاک نے تجسس، غیبت اور بیہودہ حملہ سے منع فرمایا ہے مسلمان کفر بازی کا بھی قائل نہیں ہے۔ کوئی مسلمان خواہ وہ کتنا ہی غلط کار کیوں نہ ہو اسے کوئی دوسرا مسلمان اپنی دینی برادری سے خارج نہیں کر سکتا۔ البتہ اسلام میں ارتداد کو کسی صورت برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اور شریعت میں اس کی سزا موت ہے کسی کور نظر متعصب کے لئے اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔ مسلمان کسی دوسرے مذہب والے کو خوف زدہ نہیں کرتا اور نہ وہ

جبر اور قوت سے کسی شخص کا عقیدہ تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک مسلمان ریاست میں تمام مذہبی اقلیتیں خود مختار اور خود مکتفی برادریوں کی مانند رہتی ہیں اور انہیں اپنے مذہبی قوانین پر عمل کرنے اور بچوں کو اپنی خواہش کے متعلق تعلیم دلانے اور اپنے مخصوص کلچر یا ثقافت کے مطابق زندگی گذارنے کی مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسلامی ریاست میں ان کی زندگیوں اور ان کی املاک کی حفاظت کی مکمل ضمانت بھی دی جاتی ہے تاہم ان تمام حقوق و مراعات کے باوجود جو شریعت الٰہیہ کی رُو سے اسلامی ریاست میں غیر مسلم اقلیتوں ذمیوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ ایک غیر مسلم کسی حال میں بھی ایک مسلمان کے برابر قرار نہیں دیا جاسکتا ایک مسلمان اپنے ہر دینی بھائی کے لئے خواہ اس کی نسل اور قومیت کچھ ہی کیوں نہ ہو، اخوت اور یگانگت کا ایک انتہائی گہرا رشتہ محسوس کرتا ہے اور اس کے برعکس وہ غیر مسلموں کے اندر رہ کر کبھی سکون یا راحت محسوس نہیں کر سکتا۔

تبلیغ کا فریضہ

اسلام ایک کائناتی مذہب ہے اور ہر دم اپنے لئے نئے پیرو کار پیدا کرنے کے لئے سرگرمی سے کوشاں رہتا ہے۔ عیسائیوں کی مانند یہاں پیشہ ور مبلغوں کی کوئی ضرورت نہیں ہر مسلمان اپنی جگہ پر ایک مبلغ ہے اور ہر ممکن حد تک اسلام کی اشاعت اس کا ایک مقدس دینی فریضہ قرار پاتی ہے۔ آپ کو یہ جان کر شاید تعجب ہوگا کہ دنیا کے تمام بڑے بڑے علاقوں خصوصاً جنوب مشرقی ایشیا اور افریقہ کے وسیع خطوں میں اسلام پیشہ ور مشنریوں کے ذریعہ نہیں پھیلا۔ بلکہ ان علاقوں میں اس کی اشاعت میں اکثر عام عرب تاجروں اور ہندوستانی سوداگروں کی سرگرمیوں کا دخل زیادہ ہے۔ جو وہاں بسلسلہ تجارت آیا جایا کرتے تھے۔ ان خطوں میں اسلام کی اشاعت کے لئے کوئی جبر اور کوئی طاقت استعمال نہیں کی گئی اور نہ ان سوداگروں نے وہاں جاکر سیاسی ریشہ دوانیوں کے ذریعے کسی ملک کو مفتوح بنا کر اپنا مذہب لوگوں پر بزور نافذ کیا۔ ان تاجروں کی کامیابی کا اصل سبب یہ تھا کہ انھوں نے پردیس میں جاکر بھی اپنے دین کے تقاضوں کو اپنے کاروبار پر عملاً مقدم رکھا۔ اور اپنے عمل ہی کی زور سے وہاں کی آبادی کو مسخر کرلیا۔

اسلام کی عالم گیر برادری

ایک صحیح مسلمان اپنے رسول برحق کے طریقے کی پیروی اس کی تمام جزئی تفصیلات کے ساتھ کرنے میں سدا کوشاں رہتا ہے، چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرب تھے۔ نیز قرآن عربی میں نازل ہوا پھر عرب ہی کے ملک میں دنیا کے اندر پہلی بار ایک صحیح اور سچا الٰہی معاشرہ وجود میں آیا اس لئے ہر مسلمان عرب کی سرزمین اور عربی زبان سے بہت محبت کرتا ہے۔ اور دنیا بھر کے مسلمان عربی زبان کو گویا اپنی مادری زبان کی طرح خیال کرتے ہیں۔ ایک مسلمان خواہ وہ جنوبی افریقہ میں بستا ہو یا امریکہ میں۔ انگلستان میں رہتا ہو یا سویڈن میں وہ اپنے کلچر کے لحاظ سے ایک عرب ہی ہوگا۔ لہٰذا تمام مسلمان ہر جگہ کم و بیش عربوں کی مانند زندگی گذارتے ہیں۔ ملک عرب کے ساتھ یہ نسبت اسلام کی آفاقیت میں مطلقاً مانع نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف ارشاد فرمایا ہے کہ کسی عرب کو کسی غیر عرب پر کوئی فوقیت نہیں ہے۔ اور ایک انسان کو دوسرے انسان پر صرف تقویٰ اور نیک اعمال کی بنیادوں پر ہی فضیلت دی جاسکتی ہے۔

لہٰذا ایک نو مسلم خواہ وہ کسی نسل، قوم، یا ملک سے تعلق رکھتا ہو مسلمانوں کے ہاں ہمیشہ کھلے دل اور پرخلوص محبت کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے اور ایمان لاتے ہی اُسے پیدائشی مسلمانوں کے بالکل مساوی حقوق حاصل ہو جاتے ہیں۔

عقیدہ اور عمل کی ہم آہنگی

مسلمان کا عقیدہ ہے کہ آدمی کے لئے اللہ تعالیٰ کے مقدس فرامین اور قوانین کی پیروی قربِ الٰہی کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے مذہبی ضوابط یعنی فقہ اور عام اخلاقیات کے مابین کوئی حد فاصل نہیں کھینچتا۔ کیونکہ یہ دونوں ہی اس کے نزدیک باہمدگر پیوست ہیں۔ مسلمان روح اور جسم کی تفریق کا بھی

قائل نہیں ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ جب تک کسی عقیدے کے عملی اظہار کی قوت موجود نہ ہو یہ بے اثر و بے معنی قرار پائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث میں بیان کردہ وہ تمام جزئی احکامات جن کا تعلق مثلاً حیا اور لباس پہننے، داڑھی بڑھانے، کھانے پینے کے آداب، طہارت کے آداب اور اشیا کی حلت و حرمت سے ہے۔ ایک مسلمان کے نزدیک ہرگز چھوٹے چھوٹے اور معمولی کام قرار نہیں پاتے مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ نماز پڑھنے یا وضو کرنے کے لئے آدمی کو ہو بہو وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ جن پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مسلمان جب محض خدا کے خوف سے اور اسی کی خوشنودی کی خاطر ہر مخفی و ظاہر حال میں اپنی نماز کو ہمیشہ صحیح طریقے کے مطابق ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو مجاہدۂ نفس کی اس تربیت کے بعد وہ بالآخر ضمیر کی پاکیزگی اور بیداری اور کردار کی بلندی کے اعلیٰ ترین مدارج پر فائز ہو جاتا ہے۔ دنیا کا کوئی اور مذہب آدمی کے لئے جسمانی صفائی اور طہارت پر اسلام سے زیادہ زور نہیں دیتا اسی سبب سے مسلمانوں کو اپنے گھروں میں پالتو کتے رکھنے کی اجازت نہیں اگرچہ بعض حالات میں وہ چوکیداری کی خاطر یا شکار کی خاطر یا جانوروں کی رکھوالی کی خاطر یا سراغرسانی کی خاطر کتا پال سکتے ہیں۔ لیکن ایسی صورت میں بھی اس جانور کو گھر میں داخل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ مسلمانوں کے لئے لازم ہے کہ وہ کتے کو بہر حال گھر سے باہر رکھیں۔ کتے[1] کو چھو لینے کے بعد کوئی مسلمان بغیر وضو کئے نماز ادا نہیں کر سکتا۔ اس طرح مسلمان کو ہر آن جسمانی طور پر پاکیزہ اور طاہر رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ جسم کی صفائی آدمی کی روح کی صفائی کا ذریعہ بنتی ہے اور آدمی کی خارجی شخصیت اس کی باطنی شخصیت کی آئینہ داری کرتی ہے اگرچہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان تمام صحت مندانہ تفریحوں کی ضرورت مسلّم ہے جو عسکری قدر و قیمت کی حامل ہوں اور آدمی کی ذہنی و جسمانی نشو و نما کا ذریعہ ثابت ہو سکتی ہوں تاہم اسلامی طرز حیات میں ان سوامی منظم اور پیشہ ورانہ کھیلوں کے نمائشی مقابلوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جن کا آخری نتیجہ ایک تو قوم کے لئے وقت، طاقت اور دولت کے ضیاع کی صورت میں نمودار ہوتا ہے دوسرے یہ لوگوں کے اندر رقابت اور افتراق کے رجحانات پیدا کرنے کا موجب ہوتے ہیں۔

اسلام کے تعزیری قوانین کی حکمت قرآن کے تعزیری قوانین جن کی رُو سے شادی شدہ مرد و عورت کے لئے زنا کی سزا سنگساری کے ذریعہ موت ہے اور غیر شادی شدہ مرد و عورت کے لئے زنا کی سزا ایک سو دُرّے، شراب نوشی کی اسّی دُرّے اور چوری کے لئے قطع ید، غیر مسلموں کے لئے بہت سی غلط فہمیوں کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ درحقیقت قصہ یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک جو امور بدترین سنگین معاشرتی جرائم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں مغربی ممالک میں سرے سے جرم ہی نہیں سمجھا جاتا چنانچہ متذکرہ جرائم میں سے صرف چوری کا جرم ہی مغربی ممالک میں قابل سزا قرار پاتا ہے۔ ویسے بھی مسلمان کے نزدیک قانون کی نرم خوئی کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور نہ وہ معاشرے کے مقابلے میں مجرم کے ساتھ زیادہ ہمدردی اختیار کرنے کا قائل ہے۔ مسلمان، قرآن کے تعزیری قوانین کو نہ تو ظالمانہ قرار دیتا ہے، اور نہ انہیں ساتویں صدی عیسوی کے نیم وحشی عربی قبائل کی بربریت آمیز ذہنیت کا ایسا مظہر قرار دیتا ہے۔ جس کو کسی طرح جدید متمدن دور میں اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برعکس مسلمان خلوص دل سے اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ

قرآن کے تعزیری قوانین بہر حال اُن ماڈرن جیلوں کی قاتل فضا سے بدرجہا بہتر اور انسانیت آموز ہیں جہاں بدنصیب قیدیوں کو شدید ترین نفسیاتی عذاب اور عقوبت کا ہدف بنایا جاتا ہے اور زبردستی اخلاقی گراوٹ میں مبتلا کر کے انہیں شرفِ انسانی سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

[1] اگر کتے کا جسم نجاست سے آلودہ نہ ہو، خشک اور بے نجاست ہو تو اس کے چھو لینے سے وضو ساقط نہیں ہوتا (م۔ق)

تت میں ایک سچے اور صحیح اسلامی معاشرہ کے اندر ایسے جرائم کے سدباب کے لئے قرآنی قوانین کے مقابلہ میں انسان کا بنایا ہوا کوئی
ین کامیاب نہیں ہو سکتا۔

سلام کا عائلی نظام

مسلمان کا عقیدہ ہے کہ معاشرہ میں عورت اور مرد کو الگ الگ دائروں میں سرگرم رکھنا نہایت ضروری ہے۔ بالفاظ دیگر اسلام میں عورتوں اور مردوں کا آزادانہ اختلاط ممنوع ہے۔ اس
سے ایک مسلمان مخلوط پارٹیوں مخلوط تعلیم اور شادی سے پہلے میاں بیوی کی کورٹ شپ (میل ملاپ) کو کبھی پسند نہیں کر سکتا۔
مان مردوں کے لئے لازم ہے۔ کہ وہ غیر محرم عورتوں کی سمت نگاہ اٹھا کر نہ دیکھیں۔ اسی طرح مسلمان عورتوں کو بھی لازم ہے وہ
رم مردوں کی طرف نہ دیکھیں۔ لباس کے معاملہ میں بھی مسلمان حیاداری پر بہت زور دیتا ہے۔ مسلمان عورتوں کے لئے ضروری
کہ وہ گھر سے باہر جاتے وقت اپنے تمام بدن کو پردے میں چھپائے رکھیں، اور جہاں تک ممکن ہو گھر سے باہر حیاداری سے کام
ں۔ عورت کی خوب صورتی صرف اس کے شوہر کی ملک ہے۔ اور اس کے بدن کو بہر حال اجنبی مردوں کی نگاہ ہوس کے سامنے
یاں نہیں ہونا چاہیئے۔ اسی لئے ماڈرن مغربی عورت کے وہ تمام فیشن جن کی مطابقت میں وہ آستینوں سے عاری چست قمیص اور
نوں سے اونچا اسکرٹ اور بے حد تیکھی اور نکیلی ایڑی کی جوتی پہنتی ہے۔ ہونٹوں پر شوخ رنگ کی سرخی اور ناخنوں پر پھر کیلی
ش لگاتی ہے ایسی باتیں کبھی اسلام کے ساتھ لگا نہیں کھا سکتیں۔ ایک مسلمان کے نزدیک اس سے زیادہ اور کوئی بات نفرت
یز نہیں ہو سکتی۔ کہ عورتوں کی خوب صورتی کے انتخاب کے لئے حسن کے مقابلے ہوں۔ عورتوں اور مردوں کے مابین برسر عام اظہار
بت کسی مسلمان ملک میں قابلِ برداشت نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً اگر کوئی لڑکا کسی کوچہ یا بازار میں کسی لڑکی کا بوسہ لیتا ہوا نظر
جائے تو پولیس ان دونوں کو گرفتار کر لے گی۔ اسلام میں مرد گھر سے باہر کی تمام معاشرتی ذمہ داریوں اور فرائض کی تکمیل کا پابند ہے
ر عورت اندرونِ خانہ کے تمام فرائض کی ذمہ دار ہے۔ لہٰذا عورتوں کے لئے یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ وہ سیاست یا کاروبار ی
یدان میں مردوں کے مقابلہ میں اتریں۔ عورتوں کی سب سے بڑی اور اہم ترین ذمہ داری ایک مضبوط اور متحد خاندانی زندگی کا قیام
ہے اور ایک مسلمان اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہے کہ جب عورت گھر سے رخصت ہو جائے تو اس کے ساتھ ہی گھر کی عافیت بھی رخصت
ہو جاتی ہے۔

تعددِ ازدواج کی حکمت:-

اسلام میں تجرد کو پسند نہیں کیا جاتا اور ہر مرد اور ہر عورت کو شادی کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے ایک مرد کو چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے بشرطیکہ وہ ان کی کفالت
کر سکتا ہو اگر کوئی عورت اپنے خاوند کی ضروریات کو بیمار ہونے یا بانجھ ہونے کے سبب پورا نہ کر سکتی ہو تو اس کے خاوند کو دوسری شادی
کرنے کی اجازت ہو گی اس مسئلہ کے متعلق اہل مغرب کی عام غلط فہمیوں کے برعکس اسلام ایک سے زائد شادی کا نہ تو حکم دیتا ہے نہ
اس کی ترغیب دیتا ہے بلکہ اس کی محض حسب ضرورت اجازت دیتا ہے۔ مسلمانوں میں ایک نہایت ہی معمولی اقلیت کا اس اجازت پہ
عمل پایا جاتا ہے اور ان کی غالب اکثریت عموماً ایک ہی بیوی پر قانع رہتی ہے اسلام میں تعدد ازدواج کی جو محدود اجازت دی گئی
ہے وہ در اصل عورتوں اور مردوں کی صنفوں میں ناجائز تعلقات کے امکانات کو بہت حد تک گھٹا دیتی ہے کیونکہ ایسے حالات میں جبکہ
بھی کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کا خواہش مند ہو گا تو اسے لازماً اس کے ساتھ شادی کرنا ہو گی اور پھر اس کی کفالت
نیز اس کی اولاد کی پرورش کی ذمہ داریاں بھی سنبھالنا پڑیں گی۔ اس کے برعکس مغربی ممالک میں کوئی بھی مرد بڑی آزادی کے ساتھ
کسی دوسری عورت سے ناجائز تعلقات استوار کر لیتا ہے کیونکہ اس کی غرض محض لطف اندوزی ہوتی ہے۔ اور وہ ہر قسم کی ذمہ داری

سے بری رہتا ہو۔ اسلام میں ضبط ولادت کے جدید طریقوں کو انتہائی مذموم سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اسلام میں شادی کا مقصد افزائش نسل ہے۔ تاکہ دنیا میں مزید اچھے مسلمانوں کا اضافہ کیا جا سکے۔ اگر بیوی مریض ہو اور قرار حمل کی صورت میں اس کی صحت کو شدید خطرہ لاحق ہو تو خاوند کو اجازت ہو کہ وہ قربت میں اعتدال ملحوظ رکھے یا کوئی دیگر مناسب مانع حمل تدبیر اختیار کرے۔

تاہم محض اقتصادی وجوہ سے بچوں کی تعداد پر کوئی پابندی لگانے کا عذر ناقابل لحاظ سمجھا جائے گا۔ کیوں کہ دنیا میں پیدا ہونے والی مخلوق کا رازق حقیقت میں خود اللہ تعالیٰ ہے' نہ کہ کوئی دوسرا انسان، خواہ وہ باپ ہی کیوں نہ ہو۔

صنفی محبت کا جذبہ صرف عائلی زندگی ہی میں محمود قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور کسی شخص کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ ایسے صنفی تعلقات قائم کر کے اپنے لئے لطف کا سامان پیدا کرے جس میں اس پر کوئی حقیقی ذمہ داری عائد نہ ہوتی ہو۔ یا جس پر وہ ایسی کوئی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔

اگرچہ قرآن پاک خویش واقارب میں مردوں اور عورتوں کے ناجائز تعلقات کو شدت سے منع فرماتا ہے۔ تاہم عم زادگان کو رشتۂ نکاح میں باندھنے کی نہ صرف مسلمانوں کو اجازت ہے بلکہ ایسے نکاح کو ہمیشہ افضل سمجھا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ خود پیغمبر خدا کا بھی اس پر اپنا عمل رہا ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس طرح خاندانی رشتے مزید مستحکم ہو جاتے ہیں۔ اگر میاں بیوی اپنے نکاح سے پہلے بھی باہم قرابت دار ہوں تو ان کی شادی زیادہ کامیاب اور پُر مسرت ثابت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں انہیں بہت سی قدریں مشترک حاصل ہوں گی۔ اسلام ماؤں کے لئے ضروری قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو صرف اپنی چھاتی کا دودھ پلائیں۔ ہاں اگر کوئی ماں کسی وجہ سے بیمار ہو تو پھر وہ اپنے بچے کے لئے کسی اور دودھ پلائی خاتون کا انتظام کر سکتی ہے ڈبے کے دودھ کے مقابلہ میں ماں کی چھاتی کا دودھ ماں اور بچے دونوں کی جسمانی اور ذہنی نشو ونما کے لئے جو اہمیت رکھتا ہے، وہ محتاج بیان نہیں قرآن پاک کی رُو سے بچے کو کم از کم دو سال تک دودھ ضرور پلانا چاہیئے۔ اگر بعض والدین مطلقاً غریب ہوں یا کسی اور وجہ سے قطعی معذور ہوں تو انہیں شریعت کی طرف سے اس بات کی اجازت ہوگی کہ وہ اپنی اولاد کی پیدائش میں ضبط واعتدال پیدا کرنے کی تدابیر اختیار کریں لیکن عام حالات کے اندر کسی ریاست کو والدین کا یہ اختیارِ خصوصی اپنے ہاتھ میں لینے یا اس کے اندر مداخلت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں فرد کی نجی زندگی میں کسی کا بیرونی دخل نہیں ہونا چاہیئے۔

اسلام اور فنونِ لطیفہ

اسلام دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں آرٹ کے ناجائز استعمال سے زبردست اختلاف رکھتا ہو کوئی جدید قسم کا مصور، موسیقار، بت تراش یا شاعر[1] کسی اسلامی معاشرہ میں بار نہیں پا سکتا۔ چنانچہ یہی وجہ ہو کہ آپ کو مسلمانوں کے شہروں میں ناچ گھر اور پراوپرا، تھیٹر اور تصاویر کے نگار خانے شاذ ونادر ہی نظر آئیں گے مسلمانوں کی شریعت نے انسانوں یا حیوانوں یا دیگر جانوروں کی تصویر کشی یا مجسمہ سازی قطعی طور پر ممنوع قرار دے رکھی ہے کیونکہ ان فنون کا تعلق بُت پرستی سے جا ملتا ہے۔ اگر آپ کا یہ خیال ہو کہ بُت پرستی کا قبیح فعل ماضی کے تاریک دور سے تعلق رکھتا تھا اور جدید متمدن زمانہ میں یہ فعل بدرائج نہیں ہو سکتا تو میں آپ سے درخواست کروں گی کہ آپ ذرا جدید ترکی، جدید رُوس اور جدید مصر کی طرف نگاہ دوڑائیں کہ کس طرح وہاں لوگوں نے جا بجا اپنے بڑے بڑے لیڈروں کے مجسمے پبلک مقامات پر نصب کر رکھے ہیں۔ اور کس طرح وہ ان مجسموں کی تعظیم کیا کرتے ہیں۔ جدید مغربی آرٹ میں جس طرح یونان کے دورِ قدیم سے عریاں عورتوں کے موضوع کو زبردست

[1] شاعر کو مصور، بُت تراش اور مطرب ومغنی کے درجہ میں رکھنا درست نہیں۔ (م۔ ق)

بت دی جاتی ہے۔ وہ اسلامی تصورات و عقائد کے یکسر منافی ہے۔

اگرچہ مذکورہ بالا وجوہ سے اسلام نے فن شیشہ سازی کو مطلقاً حرام قرار دے رکھا ہے۔ تاہم اس نے فن آرائش و تزئین پر کوئی پابندی نہ نہیں کی، چنانچہ آرائشی تصاویر یا آرائشی نقوش بنانا اسلام میں بالکل جائز قرار پاتا ہے۔ رسولِ خدا کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ بت خود جمیل ہے، اور وہ جمال یعنی خوب صورتی کو پسند کرتا ہے۔ لہٰذا ہم سب کو بھی خوبصورتی سے پیار کرنا چاہیئے، اور ہر فعل ں حسنِ کاری کو ملحوظ رکھنا چاہیئے

جب دُنیا میں اسلامی تہذیب اپنے عُروج پر تھی تو مسلمانوں نے آرٹ کو زندگی سے ی الگ چیز قرار دے کر اسے محض نگارخانوں میں بند کر کے نہیں رکھ دیا تھا۔ بلکہ وہ اسے اپنے معاشرے کا ایک روری جزو قرار دے کر اسے ہر امیر غریب کی روزانہ زندگی میں ایک لازمی عنصر کی مانند موجود رکھنے کے قائل تھے۔ انچہ ان کے ہاں آرٹ کی اقدار آدمی کے لباس اس کے مکان اس کے ساز و سامان اس کے اسلحہ حتیٰ کہ اس کی بیوی کے ریندھنے پکانے والے م برتنوں میں بھی نمایاں ہوا کرتی تھیں۔ اسلامی آرٹ کی عظمت و رفعت کا ایک مظاہرہ مسلمانوں کا فنِ تعمیر اور فنِ خطاطی بھی ہے ےکے اوجِ کمال کو آج تک کوئی دوسرا نہیں پہنچ سکا۔

سازوں کی موسیقی بھی مسلمانوں کے لئے حرام ہے۔ کوئی شخص عبادت گاہوں یعنی مسجدوں میں ساز اپنے ہمراہ نہیں لا سکتا۔ دیگر امات پر بھی سازوں کی موسیقی سے گریز کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے مُسلم دُنیا میں گویّوں اور موسیقاروں کا سماجی مرتبہ، قابلِ عت نہیں سمجھا جاتا، کوئی شخص اپنے جذبات کی ترنم و صدا سے ہی تسکین چاہتا ہو تو وہ دھیمی لَے میں کچھ گا کر آسودگیٔ جذبات و قعہ پیدا کر سکتا ہے لیکن اسے سازوں کے تال میل سے اپنے اور دوسروں کے جذبات میں ہیجان برپا کرنے کی بہرحال اجازت نہیں دی سکتی، اسلام صرف ایک ہی موسیقی کو قابلِ تحسین سمجھتا ہے اور وہ ہے قرآن پاک کی تلاوت اور اس کی قرأت۔

عورتوں اور مردوں کا مخلوط رقص صنفی ہیجان پیدا کرنے میں شاید اپنی کوئی مثال نہیں رکھتا اس وجہ سے اسلام میں اس کی ںل ممانعت آئی ہے۔

ڈراموں وغیرہ میں اداکاری خواہ اسٹیج پر ہو یا پردۂ فلم پر یا ٹیلی ویژن پر رقص کی مانند ممنوع ہے، کیونکہ یہ مشغلے ایک قسم ںی کے جذبات کو اخلاقی انحطاط کی طرف مائل کرتے ہیں۔ دوسرے یہ ڈرامے اور ناٹک (حتیٰ کہ بعض جدید ادبی ناول بھی) اپنے ناروں اور اپنے تماشائیوں دونوں ہی کو اپنے اپنے ذاتی تصورات میں اس قدر مستغرق کر دیتے ہیں کہ وہ خیالی دنیا کے باشندے بن کر رہ جاتے ہیں۔ اور حقیقی دنیا کے سنگین حقائق کا مقابلہ کرنے کی تاب ان کے اندر مفقود ہو جاتی ہے۔ یہ صورتحال ایک ایسے دین لئے بہرحال قابلِ برداشت نہیں ہو سکتی جو اپنے پیروکاروں کو بدی کی قوتوں سے مقابلہ کرنے کے لئے جیالے اور دلیر مجاہد بنا کر ندگی کے میدانِ وغا میں اتارنا چاہتا ہو۔

فنونِ لطیفہ کے باب میں اسلام فنِ ادب کو سب سے زیادہ مفید اور برتر قرار دیتا ہے۔ کیونکہ ادب کا تار پود محض الفاظ قرار پاتے ں اور الفاظ کی "علامت" بہرحال دوسرے فنون یعنی موسیقی، مصوری، اور سنگتراشی کی "علامات" کی مانند آدمی کے لئے فی نفسہٖ گمراہی ذریعہ نہیں بن سکتی۔ اصنافِ ادب میں پُرجوش اور فصیح و بلیغ شاعری کو ہر جگہ کے مسلمان جی جان سے پسند کرتے ہیں۔

سلام میں ترقی کا نظریہ

ان تمام امور کے علاوہ اور ان سے کہیں بڑھ کر مسلمان "ترقی" کے مغربی نظریہ کی یکسر تردید کرتا ہے۔ آج کی دنیا میں "ترقی" کا مفہوم ہمیشہ مادیت آمیز فلسفہ کی تشکیل

اور مشینوں کی زبردست برتری اور ان کی روز افزوں اہمیت کے مطابق انسانی معاشرہ کی تنظیم سے لیا جاتا ہے مسلمانوں کے نزدیک ایسی ترقی بنی نوع انسان کے لئے انتہائی مضر ثابت ہوگی کیونکہ اس کا نتیجہ بالآخر دنیا کی ہر اچھی اور خوب صورت شے کی تباہی کی صورت میں رونما ہوگا۔ مسلمانوں کے نزدیک محض تبدیلی کی خاطر کسی تبدیلی سے کوئی فائدہ متوقع نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں کا احساس یہ ہے کہ بحیثیت انسان کے لوگ عصر حاضر کی نسبت متعدد صدیاں پہلے کہیں زیادہ اعلیٰ وارفع مقام رکھتے تھے۔ بہ الفاظ دیگر جدید تہذیب میں خیر کا کوئی پہلو موجود نہیں ہے اور جدید سوسائٹی مقام انحطاط میں داخل ہو رہی ہے۔ نہ کہ اوج ترقی پر۔ لہٰذا ایک مسلمان ماڈرن یا اپٹوڈیٹ کہلانے کی دُھن میں مبتلا نہیں ہوتا۔ اور اس کے نزدیک زمانہ کی ہوا کے ساتھ چلنا یا مُرغ باد نما کی طرح ہر آن بدل جانا کسی صورت گوارا نہیں ہو سکتا۔

اسلامی طرز حیات کی بنیاد خالصتاً غیر فانی اخلاقی اقدار پر ہے۔ صداقت اور اعلیٰ اخلاق حقیقی، ابدی اور کائناتی اقدار ہیں ان کا خالق براہ راست ہمارا رب ہے، نہ کہ کوئی انسان۔ لہٰذا کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان اقدار کو مسخ کرنے کی کوشش کرے۔ مسلمان کا عقیدہ ہے کہ قرآن، محمدؐ کی تصنیف نہیں ہے۔ بلکہ خدا کی کتاب ہے۔ اس کا عقیدہ ہے، کہ قرآن کا ایک ایک لفظ معنوی لحاظ سے بالکل سچا ہے۔ لہٰذا اس کی تعمیل لازم ہے۔ حقیقت میں قرآن ہی تمام علوم کا سرچشمہ ہے، اور اس کے کسی بھی جزو کے متعلق کسی شک و شبہ کا اظہار کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے روگردانی اختیار کرنے کا خطرہ مول لے !

حدیث (یعنی رسول پاکؐ کے اقوال) قرآن کی تشریح و تفسیر کے لئے ایک ناگزیر ذریعہ ہے۔ اور قرآن کا جزو لاینفک ہے ایک کے بغیر دوسرا تنہا رہتا ہے۔ محمدؐ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی تھے اور قرآن اللہ تعالیٰ کی ہر لحاظ سے یقینی کامل و اکمل اور آخری کتاب ہے۔ لہٰذا اسلام میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق "کوئی تبدیلی" یا "اصلاح" وارد نہیں کی جا سکتی۔ اور نہ اس میں کوئی "جدید ترقی" پیدا کی جا سکتی ہے۔ مسلمان کے نزدیک آدمی کی اصل ترقی یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کو قرآن کے احکام کی روح اور ان کے الفاظ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ کرے۔ اس کی دنیاوی زندگی کا نصب العین کوئی مادی کامیابی نہیں بلکہ عاقبت کے لئے زیادہ سے زیادہ توشۂ اعمال فراہم کرنا ہے۔

اسلام اپنے پیروکاروں سے مکمل اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے۔ ایک مسلمان زندگی کے ہر لمحہ اور ہر ثانیہ میں مسلمان ہوتا ہے، اور کسی وقت بھی اپنے مذہب کے تقاضوں کو فراموش نہیں کر سکتا۔ یہ تقاضے اس کی پیدائش سے لے کر اس کی موت تک برابر اس کی زندگی پر حاوی ہوتے ہیں۔ اسے اپنے مسلمان ہونے کو زندگی کے کسی لمحہ میں بھی فراموش کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اسلام دُنیا کے ہر دوسرے مذہب سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ اپنے پیروکار سے اطاعت کا طالب ہوتا ہے اسلام عقائد کے معاملہ میں کبھی کسی کی بے حسی اور محض قولی ہمدردی پر اکتفا نہیں کرتا۔ نہ یہ آج کل کی عیسائیت کی مانند مذہبی معاملات میں پھیکی سیٹھی جذباتیت کا حامل ہے۔ اسلام میں کسی بناوٹی خوش کلامی کی گنجائش موجود نہیں ہے۔

جدید مسلمانوں کے اعمال

میرے بزرگو!

یہ ہے ایک مسلمان ذہن کی صاف، سیدھی اور سچی تصویر، یہ تصویر دیکھ کر یقیناً بہت سے لوگ کہہ اٹھیں گے کہ "اسلام کی موجودہ شکل تو اس تصویر سے بہت مختلف ہے۔ وہ کہیں گے اور بڑے طول طویل دعووں کے ساتھ کہیں گے کہ "اپنی اس تصویر کے ساتھ ساتھ ذرا قاہرہ کی ان مسلمان لڑکیوں کو بھی دیکھو جو پیرس کے جدید ترین فیشن کے مطابق لباس پہنے ہوتے نظر

آتی ہیں اور ترکی کی وہ مسلمان لڑکیاں جو تیراکی کے تالابوں میں غسل کے لئے مردوں کے شانہ بشانہ نیم عریاں ہو کر اترتی ہیں اور پھر پاکستان میں بھی کم مسلمان عورتیں پردہ کرتی ہیں۔ اور برقعہ پوش عورتوں کی تعداد روز بروز سرعت کے ساتھ کم ہوتی جا رہی ہے۔ اور پھر ابھی مسلمانوں کے اندر کروڑہا لوگ ایسے ہیں جو نہ تو پنج وقتہ نماز پڑھتے ہیں اور نہ روزے رکھتے ہیں۔ ان حالات میں تمہاری اس تصویر پر بھلا کس طرح ایمان لایا جا سکتا ہے۔ جو موجودہ دور کے چوکھٹے میں کسی طرح بھی فٹ نہیں آتی۔ لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو اگر جدید دنیا کے اندر رہنا ہے اور اگر انہیں بیسویں صدی کی بے شمار ترقیوں سے کچھ فائدہ اٹھانا ہے۔ تو انہیں لامحالہ اپنے مذہب کو نئے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا ہو گا۔۔۔"

امی جان" اور ابا جان!

خدا کے لئے اس قسم کی باتیں سن کر آپ کہیں دھوکہ نہ کھا جائے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام وہ نہیں ہے جو اس کے بعض ماڈرن قسم کے نام لیوا بیان کرتے ہیں۔ یا جو یہ لوگ اپنے مشاغل میں پیش کرتے ہیں۔ بلکہ اسلام کی اصل صورت آپ کو قرآن اور حدیث میں صرف قرآن اور حدیث میں ملے گی!

جب میں اپنے گھر میں رہا کرتی تھی تو آپ میرے ساتھ اسلامی معتقدات کے متعلق بحث و مباحثہ سے ہمیشہ گریز کیا کرتے تھے آپ مجھے کہا کرتے تھے کہ جب ہم نے تمہارے اسلام قبول کر لینے کا احترام کیا ہے اور تمہارے عقیدہ کی آزادی کے حق میں ہم مخل نہیں ہوتے تو تمہیں بھی اپنے عقائد زبردستی ہم پر ٹھونسنے کی کوشش سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

امی جان' اور ابا جان!

آپ میرے لائق احترام والدین ہیں اور میں آپ کی بیٹی ہوں لہٰذا مجھے واقعی والدین اور اولاد کے مقدس رشتے کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ خود اسلام بھی مجھے یہی حکم دیتا ہے کہ میں ہر آن آپ کا احترام ملحوظ رکھوں اور جب تک آپ زندہ ہیں آپکے ساتھ اپنا رشتہ اور ناتہ پوری طرح قائم رکھوں اس کے ساتھ ہی اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں کسی انسان کے لئے یہ واجب نہیں ہے کہ وہ اپنے عقائد کو دوسروں پر زبردستی تھوپنے کی کوشش کرے کیونکہ ایمان حقیقت میں کسی انسان کی متاع نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک خدائی انعام ہے اور اسی سبب سے کوئی مسلمان تنہا اپنے آپ ہی کو اس بات پر مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتا کہ وہ اپنی تبلیغ سے کسی کو حتیٰ کہ اپنے والدین کو بھی قائل نہیں کر سکا اسکی ذمہ داری تو بس اسی قدر ہے کہ وہ اسلام کے پیغام کو عمدہ سے عمدہ ممکن پیرائے میں دوسروں تک پہنچا دے اور میرے اس خط کا مقصد بھی ایک ایسی ہی کوشش ہے' میں سمجھتی ہوں کہ جب تک آپ اسلام کو مغربی زاویہ نظر سے دیکھتے رہیں گے آپ اسکی اصل حقیقت سے آشنا نہیں ہو سکتے میرے اس خط کی تحریر کا اصل مدعا یہی ہے کہ میں آپ کو اسلام کی اصل حقیقت سے روشناس کراؤں تاہم مجھے اس امر کا اعتراف کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہے کہ دوسروں کو قائل کرنے کے لئے محض الفاظ کا ذریعہ ہمیشہ ناکافی ثابت ہوتا ہے اور اس ضمن میں آدمی کی ذاتی مثال اور اس کے عملی مظاہرہ کی اہمیت، وافادیت الفاظ واقوال کی نسبت کہیں زیادہ معتبر اور مؤثر قرار پاتی ہے۔ للہٰذا میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اسلام کے حقیقی تقاضوں کے مطابق عملی طور پر بھی اپنی زندگی گذارنے کی بیش از بیش توفیق عطا فرمائے تاکہ آنے والے سالوں میں میرے جسمانی بلوغ کے ساتھ ساتھ میرے روحانی بلوغ میں بھی برابر اضافہ ہوتا چلا جائے اور آپ میرے اقوال کے علاوہ میرے اعمال سے بھی اسلام کی حقانیت کا کوئی اندازہ قائم فرما سکیں۔ آمین

میں ہوں آپ کی پیاری بیٹی

مریم جمیلہ

(مارگریٹ مارکوس)

حبیب احمد صدیقی بدایونی
(بی۔ اے علیگ)

محسن کاکوروی کی نعتیہ شاعری

کسی نے سچ کہا ہے کہ ادب کا سوسائٹی پر اس قدر اثر نہیں پڑتا جتنا سوسائٹی کا ادب پر۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اودھ کی حکومت اور اُس کے خواص و عوام نے ملک میں وہ ماحول پیدا کر دیا تھا کہ ہمارے بیشتر شعرا اُسی رنگ میں رنگ گئے تھے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اودھ اور لکھنؤ نے بقول مولانا شررؔ "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" پیش کیا تھا جس میں کئی عمدہ پہلو بھی تھے۔ بعض ارباب حکومت و اصحاب اقتدار کی انصاف پسندی اور فیاضی۔ علماء اور اہلِ ہنر کی قدر دانی۔ معقولات و ادب کی ترقی سے ہمیں انکار نہیں۔ لیکن اس ماحول میں خرابیاں بھی تھیں جن کا اثر مجموعی طور پر بُرا پڑا۔ اگر اس اجمال کی یہاں تھوڑی سی تفصیل کر دی جائے تو شاید بے محل نہ ہو۔

اودھ کی حکومت کے بانی سعادت خاں برہان الملک تھے جو نیشاپور سے ہندوستان آئے اور مختلف عہدوں پر فائز ہونے کے بعد سلطنتِ دہلی کی طرف سے صوبہ دار اودھ مقرر ہوئے۔ جتنا زمانہ بڑھتا گیا مرکزی سلطنت کمزور اور صوبے خود مختار ہوتے گئے۔ تاہم اس سلسلہ کے پانچویں نواب وزیر (سعادت علی خاں) کے عہد تک اودھ کا دہلی سے تعلق قائم رہا۔ بالآخر انگریزوں نے مرکز کا زور توڑنے کی غرض سے غازی الدین حیدر کو خطاب شاہی اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ یہاں تک کہ پانچویں بادشاہ (واجد علی شاہ) کو انگریزوں نے معزول کر کے اودھ کا الحاق کر لیا۔ ان نوابوں اور بادشاہوں میں سعادت خاں جیسے مدبر۔ شجاع الدولہ جیسے جوصلہ مند۔ سعادت علی خاں جیسے منتظم اور امجد علی شاہ جیسے مذہبی افراد بھی تھے۔ لیکن شجاع الدولہ کا حسین عورتوں سے اختلاط۔ آصف الدولہ کا لہو و لعب میں انہماک۔ دوسرے فرمانرواؤں خصوصاً واجد علی شاہ کی رنگ رلیاں کون نہیں جانتا۔ دولت کی افراط۔ ہر طرف ہنگامۂ عیش و نشاط۔ ملک میں امن و امان جو کچھ نہ ہونا تھا تھوڑا تھا۔ اُن کو دیکھ کر اُمراء اور اُمراء کی دیکھا دیکھی عوام بھی "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" پر کاربند تھے۔ اِسراف۔ نزاکت۔ تکلف اور تعیش کا ہر جگہ دور دورہ تھا۔ اس صورتِ حالات کا اثر شعر و ادب پر پڑنا لازمی تھا۔ چنانچہ شاعری میں ابتذال۔ خارجیت۔ تصنع۔ صنعت گری۔ رعایتی انداز بلکہ فحاشی اور ہزل گوئی۔ ہرزیہ[2] نگاری اور ریختی[3] کو فروغ ہوا۔ تصوف[4] (جس سے مقاصد میں بلندی اور جذبات میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے) یا تو مفقود تھا یا رسمی۔ غرض ناسخ سے لے کر امیر[5] تک عموماً تخییل اور تکلف کی کار فرمائی تھی۔[1]

---

[1] اس میں کہیں کہیں مستثنیات ملتے ہیں مگر عام رنگ یہی تھا۔

[2] مرثیہ کے مقابلہ میں ہرسیہ یا ہرزیہ وجود میں آیا جس میں مخالفین پر دشنام طرازی ہوتی تھی۔ یہ خاص لکھنؤ کی ایجاد تھی۔

[3] اگرچہ ریختی کی بنیاد دہلی میں پڑ چکی تھی مگر لکھنؤ میں اس پر عمارتیں تعمیر ہوئیں۔

[4] حکومت اودھ کا مذہب شیعہ تھا اور شیعیت اور تصوف میں بعد المشرقین ہے۔

[5] امیر مینائی کے کلام میں روانی اور بیساختگی بھی پائی جاتی ہے۔　　(م۔ ق)

ہم نے اس دور کی شاعری کا سرسری جائزہ لیا ہے، مگر آتش، انیس، دبیر اور اُن کے بعد محسن کاکوروی نے شاعرانہ بدمذاقی کا کفارہ ادا کر دیا۔ اور اُن کی تخلیقات نے اُردو زبان و ادب کے سرمایہ میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ ہم آج کی صحبت میں صرف حضرت محسن کاکوروی کے کلام پر مختصراً اظہارِ خیال کریں گے جن کی نعت گوئی کا اسلوب آج تک عدیم النظیر ہے۔

محسن[1] نسباً علوی تھے۔ اُن کا خاندان جس کے اکثر افراد علم و فضل میں نامور ہوئے ہیں ایران سے ہندوستان آکر قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ میں مقیم ہو گیا تھا۔ یہیں سنہ ۱۲۴۳ھ میں محسن کی ولادت ہوئی۔ محسن نے ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے دادا اور والد کی خدمت میں رہ کر پائی۔ پھر دوسرے اہلِ علم سے اکتسابِ فیض کیا۔ نو سال کی عمر میں حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے خواب میں مشرف ہوئے اور اس کی خوشی میں پہلی نظم لکھی جو فارسی میں تھی۔ بعد فراغتِ تعلیم وکالت کا امتحان دیا اور پاس ہو کر آگرہ میں اور مین پوری میں وکالت اختیار کی۔ اور صوبہ کے ممتاز وکلا میں شمار ہوئے۔ اُن کی عالی دماغی اور خوش بیانی کا دور دور شہرہ تھا۔ محسن کی پرورش مذہبی ماحول میں ہوئی وہ شروع سے دیندار، عبادت گذار تھے۔ ہمدردی اور خوش اخلاقی کے اوصاف سے متصف تھے۔ عشقِ رسولؐ ان کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ وہ ایک بزرگ شاہ کرامت علی قلندر سے بیعت تھے۔ اور امارت کے باوجود سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ آخر ۱۳۲۳ھ یا ۱۹۰۵ء میں انھوں نے رحلت فرمائی۔

حضرت محسن نے کبھی کبھی بطور تفنن عاشقانہ شاعری بھی کی۔ مگر اُن کا عمر بھر کا مشغلہ جس کو وہ حاصلِ زندگی سمجھتے تھے، نعت گوئی تھا یوں تو نعت گو شعرا اور بھی ہوئے۔ خود اُن کے معاصرین میں منشی امیر مینائی کا ایک مکمل دیوان (محمد خاتم النبیینؐ) نعت میں موجود ہے نیز انھوں نے کئی نعتیہ مثنویاں اور مسدس کہے ہیں مگر ایسے نعت گو جنھوں نے اسی حیثیت سے شہرت پائی اور تمام کشورِ ہند میں علم یکتائی بلند کیا، محسن اور صرف محسن تھے۔

سچ پوچھیئے تو نعت گوئی جس کو عوام آسان سمجھتے ہیں، بڑا مشکل مرحلہ ہے۔ پروفیسر ضیا احمد بدایونی ایک[2] جگہ فرماتے ہیں نعت کا میدان جس قدر عظیم الشان ہے اُسی قدر دشوار گذار بھی۔ ذرا قدم ڈگمگایا اور انسان کہیں کا نہ رہا۔ اس فن کی نزاکت کا یہ عالم ہے کہ افراط و تفریط سے بچنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ بعض نعت گو شعرا رسالت کے ڈانڈے توحید سے ملا دیتے ہیں اور بعض وہ طرزِ تخاطب اختیار کرتے ہیں جو دنیاوی حسینوں کے لئے موزوں ہو تو ہو مگر محبوبِ خدا کی شانِ اقدس کے سراسر منافی ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ خسرانِ مبین کے سوا کچھ نہیں۔ مگر محسن اس راہ میں بہت سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہیں۔ ایک آدھ جگہ لغزش کا مقام آیا تو حتی الامکان بچ کر نکل گئے۔ محسن کی شاعری تقلیدی نہیں ہے۔ اُن کی نعت میں روایتی انداز کہیں نہیں ملے گا۔ اُن کا سرمایۂ شعر تمام تر اُن کا اپنا ہے بقول غالب: —

خوں گشتہ ایم و باغ و بہارِ خودیم ما

لیکن ماحول سے بالکل کنارہ کش رہنا بھی مشکل تھا۔ اس لئے انھوں نے دو چیزیں اپنے ماحول سے مستعار لیں۔ زبان اور صنعت گری۔ یہ حقیقت ہے کہ ناسخ اور اُن کے تلامذہ نے اصلاحِ زبان کے سلسلہ میں اُردو کی بڑی خدمت کی ہے۔ ڈاکٹر ابو اللیث کہتے ہیں[3] "ناسخ نے یہ اصول خود اختیار کئے اور اُن کی پابندی اپنے تلامذہ پر لازم کر دی۔ ناسخ کا یہ کارنامہ ایسا ہے جس کی مثال نہ اُن سے پہلے نہ اُن کے بعد

---

[1] مقدمۂ کلیاتِ محسن۔

[2] فارسی شعرا اور نعتِ رسولؐ۔ از پروفیسر ضیا احمد بدایونی۔ مطبوعہ فاران کراچی جنوری ۱۹۵۶ء۔

[3] لکھنؤ کا دبستانِ شاعری۔ از ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی۔

آج تک اُردو زبان میں ملتی ہے۔ زبان کی صفائی اور اصلاح میں تھوڑی بہت جو کمی باقی رہ گئی تھی وہ ان کے شاگردوں نے پوری کردی۔ اس لئے محسنؔ نے اسی منجھی اور شستہ زبان کو اختیار کیا۔ رہی صنعت گری، تو اس کا یہ حال ہے کہ لکھنؤ کے اساتذہ کے کلام میں یہ چیز اس قدر رچ بس گئی تھی۔ جیسے رگوں میں خون۔ یہ "رعایتیں" اکثر اس قسم کی ہوتی ہیں کہ طبیعت کو وحشت بلکہ نفرت ہونے لگتی ہے چند مثالیں حاضر ہیں:-

(ناسخ)	چشم بد دور آج کیا اُمڈے نظر ہیں گلِ مشاں	سبزۂ خط کیا غزالِ چشم کا چارہ ہوا!
(رشک)	چاول الماس۔ گوشت لختِ جگر	فرقتِ یار میں پلاؤ نہیں
(منیر)	دل ڈھونڈوں جو چھپے ہیں کہ چھپاؤ میں تمہارے	ہاتھوں سے بتانے کا اشارہ نہیں کرتے
(آتش)	بعدِ فنا کنوئیں کے پانی سے غسل دینا	کھوئی ہے میں نے جانِ شیریں جو ذفن میں
(امانت)	لبِ شیریں سے تیرے چاشنی ممکن نہ ہوئی	رس سے شکر ہوئی شکر سے بتاشے پیدا

محسنؔ نے بھی ان صنائع کو برتا ہے مگر ان شعرا سے ان کو کیا نسبت۔ ہیرے کو تو لعل و یاقوت بھی پتھر ہیں مگر ان کی صفات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ محسنؔ کی رعایات عالمانہ اور نادر ہیں اور ان کی بلند تخیل کی پیداوار۔ جن کو سن کر یک گونہ استعجاب اور سمجھ کر طبیعت کو انبساط ہوتا ہے۔ مثلاً صبح کے ذکر میں یوں رقم طراز ہیں:-

بیضاوی صبح کا بیاں ہے — تفسیر کتاب آسماں ہے
عنوانِ فلک ہے درِ منثور — لوحِ زریں ہے سورۂ نور
مضمونِ طلوعِ صبحِ صادق — مشہور روایتِ مشارق
موقوف حدیثِ شب کی تصحیح — رکھ دیجیے طاق[1] پہ مصابیح

رات کا بیان بھی سننے کے قابل ہے:-

بھیگی ہوئی رات آبرو سے — داخل ہوئی کعبہ میں وضو سے
اوڑھے ہوئے لیلیٰ گل اندام — شبنم کی ردا بقصدِ احرام
کیا سعی صفا سے رنگ فق ہے — سر سے پا تک عرق عرق ہے
ناخن کی جگہ ہلال کی مد — دفتر سے طلوع کے تدارد
قطبین کے سایۂ ضیا میں — مشغول دوگانے کی ادا میں

ان کے کلام میں تشبیہات و استعارات بکثرت ہیں۔ تشبیہات و استعارات ایک طرف تو شاعر کی تخیل کی مضمون آفرینی کی دلیل ہیں۔ دوسری طرف کلام کا اثر اور زور بڑھا دیتی ہیں۔ اس سرمایۂ بیش بہا کے لئے محسنؔ کی طبع نادرہ کا امبدءِ فیاض کے سوا کسی کی مرہونِ احسان نہیں فرماتے ہیں:-

گردوں کے غلاف میں ہے پنہاں — مشکوٰۃ شریف مہرِ تاباں
ہے شرق سے غرب تک پریشاں — نورِ عینین پیرِ کنعاں

---

[1] طاق کا لفظ بھی لطف سے خالی نہیں۔ طاق کو عربی میں مشکوٰۃ کہتے ہیں۔ چراغوں کو مصابیح۔ اور مشکوٰۃ المصابیح (چراغ دان) حدیث کی ایک کتاب ہے۔

وہ سورۂ یوسفؑ تجلی — یہ مطلعِ مصر کی عزیزی
روپوش دبیرِ چرخِ اخضر — ظلمت کا سیاہ کرکے ابتر
اہلِ مہ کہکشاں ہے مغرور — پروانہ نویسِ شمع کا نور
ظلمت میں ہے نور کی تجلی — بکھری ہوئی طور کی ہے چوٹی
ہر قطرہ وضو کی فکر میں گم — ہر ذرہ کئے ہوئے تیمم
ہر سرو کو بندگی پہ ہے میل — ہر لٹکے کی لو ہے قائم اللیل[۱]
ہر بزمِ طرب میں اقتضا جمع — قعدے[۲] میں لگن، قیام میں شمع
کہتا ہے جھکا ہوا اندھیرا — ہو جائے قبول سجدہ میرا
اک شاخ رکوع میں رکی ہے — اور دوسری سجدہ میں جھکی ہے

ڈاکٹر لیث کی رائے ہے کہ محسن کی تشبیہات استعارات اور کنائے آسانی سے فہم کے قابو میں آجاتے ہیں لیکن ہم ادب کے تحت اس رائے سے اختلاف کرتے ہیں ہمارے نزدیک بعض اشارات و تشبیہات وغیرہ اس قدر دقیق اور مشکل ہیں کہ جب تک مختلف علوم اور ان کی اصطلاحات پر نظر نہ ہو وہ سمجھ میں نہیں آتیں۔ مثال کے طور پر تفسیر بیضاوی۔ تفسیر درمنثور۔ سورۂ نور۔ مشارق الانوار۔ (حدیث کی کتاب) مشہور و موقوف (اقسامِ حدیث) مصابیح۔ مشکوٰۃ المصابیح (حدیث کی کتابیں) سعی صفا (مناسکِ حج میں داخل ہے) ہی طرح احرام سے باہر آنے کے بعد ناخن اور بال کتروانا۔ شرق کی رعایت سے تجلی طور سورۂ یوسفؑ۔ غرب کی مناسبت سے مصر اور تفسیر عزیزی وغیرہ وغیرہ ۔ عام فہم تشبیہات و رعایات بھی دلآویزی اور لطافت میں لاجواب ہیں ۔ فرماتے ہیں:-

عشق کی تعریف :-

ذرا عشق ادھر دیکھے بھالے ہوتے — قدم اے ستمگر سنبھالے ہوتے
کیا تیرے زنداں نے یوسفؑ کو بند — ہوئے تیرے مقتل کو عیسیٰ پسند
نمک تیرا زخموں میں ایوبؑ کے — کھٹک تیری دیدوں میں یعقوبؑ کے
کہیں تو ہے آتش کہیں رودِ نیل — بچیں یا الٰہی کلیمؑ و خلیلؑ
جفا تیری چتون میں لے لیے وفا — سروہی[۳] کے قبضہ میں دستِ قضا
ترا نجد اچھے بتوں کا لیگاڑ — ترا بے ستوں[۴] بگڑے دل کو پہاڑ
ترا طور کیف انا الحق سے مست — ترا وادیِ ایمن آتش پرست

---

[۱] قائم اللیل رات کو عبادت میں کھڑا رہنے والا۔
[۲] قعدہ اور قیام نماز کے ارکان ہیں۔
[۳] سروہی۔ ایک ہتھیار۔
[۴] بے ستون، ایران کا ایک پہاڑ جسے فرہاد نے کاٹا تھا۔

تپش مہرِ محشر کی بڑھتی ہوئی ! تیرے حسن کی دھوپ چڑھتی ہوئی

ابر و باراں کی کیفیت :-

ڈھرکا[1] ترسا بچہ ہے برق لئے جل میں آگ — ابر چوٹی[2] کا برہمن ہے لئے آگ میں جل
ابرِ پنجاب تلاطم میں ہے اعلیٰ ناظم — برق بنگالۂ ظلمت میں گورنر جنرل
کبھی ڈوبی۔ کبھی اچھلی مہِ نو کی کشتی — بحرِ اخضر میں تلاطم سے پڑی ہے ہل چل
شیشۂ ساعتِ اندھیرے میں ہے بادل کے نہاں — لیلیٰ محمل میں ہے ڈالے ہوئے منہ پہ آنچل
شاہدِ فکر ہے مکھڑے سے اٹھائے گھونگھٹ — چشم کافر میں لگائے ہوئے کاجل
جوگیا بھیس ہے جیسے چرخ لگائے ہے بھبوت — یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمبل
ڈوبے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے — نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل
مینھ کھلا آٹھ پہر میں کبھی دو چار گھڑی — پندرہ روز ہوئے پانی کو منگل منگل

مدحِ جبریلؑ :-

عمانِ کرم کے درِ منثور — قرآنِ شرف کے سورۂ نور
فہرست اخبارِ اصفیا کی — تاریخ فرشتۂ انبیا کی

پُل صراط :-

پیمبر چلے جیسے حق کا پیام — ولی جیسے روحِ نبیؐ پر سلام

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ انداز ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔ اور محسنؔ نے اس کو برو ئے کار لاکر اُردو ادب کا دامن جواہر ریزوں سے بھر دیا ہے۔ تشبیہات کہاں تک دی جائیں۔ گویا جواہرات کی ایک نمائش ہے جو دور تک سجی ہوتی ہے۔ تاہم دل نہیں مانتا۔ اس لئے "سراپائے رسولِ اکرمؐ" سے چند اور تشبیہیں ملاحظہ کرتے چلئے :-

زلف و رُخِ حضورؐ[3] :-

سایہ ہے فرقِ ہمایوں پہ جنابِ حق کا — ہر و بالِ افسرِ شہ پر نہیں کھولے ہے ہُما

---

[1] ڈھرکا = انتہا درجہ کا
[2] چوٹی کا = اعلیٰ قسم کا یا اونچی ذات کا۔
[3] ہمارے نزدیک صرف اس بنا پر یہ کہنا صحیح نہیں کہ "محسنؔ خالص ہندوستانی فضا کے شاعر ہیں" کیونکہ یہ رنگ اُن کے باقی کلام میں نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ خود انھوں نے قصیدۂ نعت میں ہندی اور ہندوانہ تلازمہ استعمال کرنے کی جو توجیہ کی ہے اور معذرت کی ہے اس کے ہوتے ہوئے مذکورہ دعویٰ کیونکر درست ہو سکتا ہے۔

عالمِ غیب کا سردار ہوا جلوہ نما نہیں سرکار یہ سلطانِ حبش کی حاشا

کشورِ کاکُلِ پُر پیچ و خم سرور ہے

نہ ختن ہے نہ خطا ہے نہ یہ عنبر سر ہے

رُخِ پُر نور کا ہے کاکلِ شبگوں سے ظہور دیکھ لو دامنِ موسیٰ کے تلے شعلۂ طور

سنبلہ میں ہے عیاں جلوۂ ماہِ پُر نور ابرِ رحمت میں ہو خورشیدِ قیامت مستور

شبِ معراج میں ہے شمعِ تجلی روشن

لیلۃ القدر میں ہے نورِ الٰہی روشن

حضورؐ کے اُمّی ہونے کی توجیہ :-

روبرو جلوۂ خورشید کے سایا کیا ہے سامنے شمعِ منور کے اندھیرا کیا ہے

عاقلو غور سے دیکھو کہ یہ نکتہ کیا ہے اُمّی ہونے میں بھلا آپ کے شبہا کیا ہے

کوئی تدبیر تو پڑھنے کی بجا ہی نہ رہی

نورِ رخسار سے حرفوں میں سیاہی نہ رہی

خیالات کی ندرت اور زبان پر قدرت - نیز فکر کی رفعت اور بیان کی شوکت میں جو شعریت کے لوازم ہیں اُن میں کوئی شبہ ہی نہیں مگر اُن سب سے بڑھ کر اُن کے جذبات کی صداقت اور حُسنِ عقیدت ہے جس نے کلام کے زور و تاثیر کو عرش پر پہنچا دیا ہے۔ یوں تو تمام مثنویات - قصائد اور غزلیات پر کم و بیش یہ رنگ چھایا ہوا ہے - مگر بعض مقامات تو اُردو شاعری کے لئے وجہ فخر و نازش ہیں :-

آرزو ہے کہ تیرا دھیان رہے تا دمِ مرگ

شکل تیری نظر آئے مجھے جب آئے اجل

رُوح سے میری کہیں پیار سے یوں عزرائیل

کہ مری جان مدینہ کو جو چلتی ہے تو چل

دمِ مردن یہ اشارہ ہو شفاعت کو مری

فکرِ فردا تو نہ کر دیکھ لیا جائے گا کل

یادِ آئینہ رخسار سے حیرت ہو مجھے !

گوشۂ قبر نظر آئے مجھے شیش محل

میزباں بن کے نکیرین کہیں گھر ہے ترا

نہ اُٹھانا کوئی تکلیف نہ ہونا بیکل

اور :-

صدقے میں ترے یہ آرزو ہو دم گیرِ رہِ آخرت کروں طے

ہو حشر کا دن خوشی کی تمہید جس طرح سے صبحِ صادقِ عید

یوں سر پہ ہو مہرِ آتشیں خو — ٹوپی میں کسی کے جیسے جگنو
دشمن پہ کڑی ہو پہلی منزل — میں سوؤں لحد میں ہو کے غافل
پردہ رہے نامۂ عمل کا — کھل جاتے نہ قبر میں لفافا
اُس دم کھلے چشمِ آرزومند — جب دفترِ حشر ہو چکے بند

سچ پوچھئے تو شعریت کے دوش بدوش یہی خلوص اُن کے کلام کی مقبولیت کا راز ہے۔ اور جس کسی نے اُن کو حسّان الہند کہا اُس نے ہرگز مبالغہ نہیں کیا۔ اب چونکہ قرآن و حدیث اور علوم قدیمہ کی تلمیحات و اصطلاحات سے لوگ بیگانہ ہوتے جاتے ہیں اس لئے یہ حقیقت ہے کہ اس رنگ کے کہنے والے اب شاذو نادر ہی پیدا ہوں گے!

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

(یہ مقالہ مجلس زمرۃ المصنفین کراچی کی نشست بتاریخ ۶؍جنوری ۱۹۶۳ء میں پڑھا گیا)

مُلّا واحدی

۲ شخصیتیں

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی جو بات میرے نزدیک سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے، وہ اُن کا اُردو زبان پر قابو پالینا ہے، اور ویسی مثل اُردو لکھنا اور بولنا ہے۔ مولانا مکہ معظمہ میں ایک عرب خاتون کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ مولانا کی والدہ ایسی سخت عرب تھیں کہ مولانا کے والد کو اُردو کا کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالنے دیتی تھیں۔ والد نے ایک بنگالی مولوی ملازم رکھا کہ مولانا کو قرآن مجید پڑھائے گا۔ مولانا کی خالہ کے کان میں بنگالی کی آواز پڑ گئی۔ وہ بنگالی لہجے کے ساتھ قرآن پڑھا رہا تھا۔ خالہ نے اُسی دم بنگالی کا پتہ کاٹ دیا کہ میرے بھانجے کا لہجہ خراب ہو جائے گا۔ خود مولانا کے والد اُردو لکھنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ اُن کی کتابیں عربی اور فارسی میں ہیں۔ مولانا پیدا مکے میں ہوتے اور اُس عمر تک وہیں رہے، جس عمر میں بچہ زبان بغیر سکھائے سیکھتا ہے اور جو مادری زبان کہلاتی ہے۔ پھر آٹھ نو برس کی عمر میں ہندوستان آئے تو دلّی، لکھنؤ، آگرہ اور لاہور وطن نہیں بنا۔ کلکتہ وطن بنا، جہاں اُردو کا چرچا نہیں تھا۔ اس کے باوجود مولانا اُردو کے ادیب ہیں، اور ایسے بلند پایہ ادیب کہ مولوی محمد حسین آزاد سے بازی لے گئے ہیں، مولوی محمد حسین آزاد اپنے ہم عصروں میں نمبر اول کے ادیب تھے۔ مولوی نذیر احمد کی تحریر کا بانکپن مولوی محمد حسین آزاد کی تحریر کے جلال کے مقابلے میں ماند تھا۔ مولوی الطاف حسین حالی کے ہاں صرف سلاست ہے اور علامہ شبلی بھی سادہ نویس ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا طرز ادا مولوی محمد حسین آزاد کے طرز ادا کی طرح رعب دار اور پُر جلال ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے خدا معلوم کیونکر دلّی اور لکھنؤ کے اسٹائل (S T Y L E) اپنا لئے اور اُردو کو چار چاند لگا دیئے، انھوں نے اُردو میں بہترین لٹریچر کا اضافہ کیا ہے۔ اُن کی انشا پردازی سے اُردو کی عزت بڑھی ہے۔ وہ ایسے طرز ادا کے موجد تھے جو اُنہی پر ختم ہو گیا

میں نے ابوالکلام کو کم عمری میں دیکھا تھا۔ لہٰذا مجھے ابوالکلام کی عمر کے متعلق شبہ نہیں ہے۔ میری آنکھیں اس بات کی گواہ ہیں کہ وہ میرے ہم سن تھے۔ میں اور خواجہ حسن نظامی لکھنؤ سے دلّی واپس جا رہے تھے۔ کانپور گاڑی بدلنے اُترے، دیکھتے کیا ہیں، چھریرا بدن، نہایت حسین چہرہ، ڈاڑھی مونچھیں اتنی صاف، گویا ابھی مسیں نہیں بھیگیں، اچھے کپڑے اور اچھی تراش کی شیروانی، علی گڑھ فیشن کا پاجامہ، پیروں میں پمپ شو، سر پر ایرانی وضع کی ٹوپی، جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور شیروانی کے دامن اُچکتے ایک جوان رعنا ہماری طرف بڑھ رہا ہے، میں اس نوجوان کا نام جانتا تھا نوجوان کو پہچانتا نہیں تھا، خواجہ صاحب نے کہا، ابوالکلام؟ ابوالکلام، آغا، خواجہ صاحب کہتے نزدیک پہنچ گئے، یہ ۱۹۱۰ء کا واقعہ ہے۔ ۱۹۱۰ء میں مولانا ابوالکلام قطعی میرے ہم سن تھے۔ مجھے جس طرح اپنی تاریخ پیدائش ۱۷؍مئی ۱۸۸۸ء کا یقین ہے اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کے سنہ پیدائش ستمبر ۱۸۸۸ء کا یقین ہے۔ اپنی تاریخ پیدائش ۱۹۴۲ء میں مولانا نے خود بتائی تھی، مسٹر آصف علی کے گھر میں، اُس وقت ہم تین ہی آدمی تھے۔ اور اتفاق سے تینوں ایک سنہ کی پیدائش تھے۔ میں اور مولانا بڑھاپے میں بھی یکساں عمر کے نظر آتے تھے۔ مولانا کا ۱۹۱۰ء سے بہت پہلے غلغلہ مچ چکا تھا، اُن کے

علم و فضل اور ذہانت و طباعی کی دھوم تھی۔ اپنے سے دگنی تگنی عمر کے علما کے ساتھ ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں مولانا ابوالکلام ہندوستان کے ممتاز علما کی حیثیت سے جارج پنجم کے دربار دہلی کی تقریبات میں بلائے گئے تھے۔ علما و مشائخ اور پنڈتوں اور سادھوؤں کو ہاتھیوں پر بٹھا کر جارج پنجم کے حضور لے جایا گیا تھا۔ مولانا اس تقریب میں شریک تھے۔ ہاتھی پر سے ایک مولوی کے گرنے کا حال مولانا نے میرے ہاں آکر سنایا اور خواجہ حسن نظامی صاحب نے رسالہ نظام المشائخ میں جبّہ و عمامہ کی کورنش کے عنوان سے مضمون لکھا، جسے انگریز گورنمنٹ نے ناپسند کیا اور مجھ سے اور خواجہ صاحب سے باز پرس کی گئی۔

۱۹۰۶ء یا ۱۹۰۷ء میں مولانا میرے دلّی کے گھر کے بالکل سامنے دفتر رسالہ مخزن میں شیخ عبدالقادر صاحب کے مہمان رہ گئے تھے۔ ۱۹۰۶ء یا ۱۹۰۷ء میں مولانا کا کوئی ماہنامہ نکلتا تھا۔ اس میں مولانا نے شیخ عبدالقادر کی میزبانی کا ذکر چھاپا تھا۔ علاوہ ازیں خواجہ صاحب مولانا کی ذہانت کے قصے اکثر دہرایا کرتے تھے۔ میں سن کر متاثر تھا۔ ۱۹۱۰ء میں دیکھ کر مرعوب ہو گیا۔ کانپور کے اسٹیشن پر مولانا نے خواجہ صاحب سے فرمایا۔ یہاں کب تک انتظار کیجیے گا۔ گاڑی راستے کے دس بجے جائے گی اور ابھی دن کے گیارہ بجے ہیں۔ حافظ حلیم کی کوٹھی چلیے۔ میں وہیں مقیم ہوں۔ حافظ محمد حلیم چمڑے کے ملک التجار تھے۔ پورا دن ہم دونوں کا مولانا کے ساتھ گزرا! مولانا رعب جمانے نہیں تھے، رکھ رکھاؤ اتنا پختہ، پائیدار اور غیر مصنوعی تھا کہ رعب خود بخود جمتا تھا۔ اس احساس کے باوجود کہ مولانا میرے ہم سن ہیں، کوئی چیز تھی جو انہیں بڑا سمجھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ان کی عظمت منوا رہی تھی۔ ابوالکلام سے زیادہ رعب دار بوڑھوں کا میں تصور کر سکتا ہوں، ابوالکلام سے زیادہ رعب دار نوجوان کا تصور نہیں کر سکتا۔ گاندھی جی سے مولانا ۱۹۲۰ء میں ملے تھے، جب کہ مولانا بتیس سے زیادہ کے نہ ہوں گے اور گاندھی جی پچاس اور ساٹھ کے درمیان تھے۔ گاندھی جی کے پرائیوٹ سکریٹری مہادیو ڈیسائی کا بیان ہے کہ گاندھی جی نے علی الاعلان کہا کہ میں مولانا ابوالکلام سے مرعوب ہوا، انگریزوں میں بھی اس دماغ کا انسان نہیں ہے۔ میں مولانا کی رہنمائی میں منزلیں طے کروں گا۔

مولانا گاندھی جی کے گھر ملنے نہیں گئے تھے، کسی مشترک دوست نے ملاقات کا اپنے گھر پر انتظام کیا تھا۔ تعلقات قائم ہو جانے کے بعد بھی مولانا گاندھی کے پیچھے پیچھے نہیں پھرے، گاندھی جی مولانا کے پیچھے پیچھے پھرے۔[1]

اس قدر متاثر ہونے کے باوجود میں کہتا ہوں کہ مولانا کے زمانے میں نہ سہی، مسلمانوں کی تاریخ میں بے شمار ذہین علما موجود ہیں، ڈیڑھ سو برس پہلے مولانا شاہ عبدالعزیز ہی نے سولہ سال کی عمر میں طالب علموں کو پڑھانا شروع کر دیا تھا اور مولانا کے زمانے میں بھی مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی اپنی علمی قابلیت کا نہایت اچھا استعمال کیا ہے، اور علامہ اقبال بھی تو مولانا ہی کے زمانے میں تھے۔ مولانا کی سی ذہانت اور طباعی کے نمونے اور بھی ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ مگر اس قسم کا آدمی دوسرا نہیں دکھائی دیتا کہ ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۲ء میں ٹوٹی پھوٹی اردو بولتا تھا اور ۱۹۰۹ء میں اس نے میرے رسالہ نظام المشائخ کے لئے سرمد شہید کے متعلق مضمون لکھا جسے پڑھ کر انسان جھومنے لگتا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں جب میں مولانا سے اوّل مرتبہ ملا ہوں تو مولانا بولتے نہیں تھے چہکتے تھے۔ عربی کی آمیزش مولانا کی روزمرہ کی بات چیت میں غیر معمولی حسن پیدا کر دیتی تھی۔

---

[1] جہاں تک لغوی اور ظاہری الفاظ کا تعلق ہے تو نہ مولانا ابوالکلام آزاد گاندھی جی کے پیچھے پیچھے پھرتے تھے، اور نہ گاندھی جی مولانا کے پیچھے! اور یہ بھی درست ہے کہ گاندھی جی مولانا آزاد کا بہت احترام کرتے تھے! مگر کانگریس کے "پالیسی بنانے والے" گاندھی جی تھے اور کانگریس کی پوری سیاست گاندھی جی کے اردگرد گھومتی تھی، اس لحاظ سے یہ کہنا خلاف واقعہ نہیں ہے کہ سیاسی مسائل میں مولانا ابوالکلام آزاد نے گاندھی جی کی رہنمائی قبول کر لی تھی! (م۔ق)

مولانا ابوالکلام کے علمی کارنامے سیاست میں پڑ جانے کی وجہ سے منزلِ حقیقی نہیں پا سکے، لیکن مولانا کی جادو بیانی کو سیاست نے چمکا دیا تھا۔

مولانا ابوالکلام کے اس خیال سے خواہ کتنا بھی اختلاف کیا جائے کہ وہ تقسیم ہند کے مخالف تھے۔ لیکن اس احسان سے انکار ناممکن ہوگا جن حضرات نے مسلمانانِ ہند میں سیاسی بیداری پیدا کی ہے اُن میں مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ مولانا ابوالکلام ہی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ لاریب مسٹر محمد علی جناح سب سے بڑھ گئے۔ مسٹر جناح واقعی قائدِ اعظم تھے۔ مگر قائدِ اعظم نے مسلمانوں کو بیدار نہیں کیا تھا، بلکہ بیدار مسلمانوں میں حرکت کی رُوح پھونکی تھی۔ بیدار کرنے والے اور سابقون الاولون مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خاں تھے۔

مورخ کا قلم ضرور لکھے گا کہ مولانا ابوالکلام نے پاکستان کے قیام کو روکنا چاہا تھا۔ لیکن اُن کی نیت کا علم صرف اللہ کو ہے'۔۔۔ ہمیں اُذْكُرُوْا مَوْتَاكُمْ بِالْخَيْرِ کا حکم ملحوظ رکھنا چاہیے۔ حکم ہے کہ اپنے مرنے والوں کو ذکرِ خیر (یعنی بھلائی) سے یاد کیا کرو!

نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی

نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی ایک اخبار نویس تھے' اور اخبار نویس بھی ادنیٰ پایہ کے نہیں' لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اقبال ایسا دیا تھا کہ اپنے زمانے کے بہت ممتاز شخص کہے جا سکتے ہیں۔ اپنی اخبار نویسی کا بھرم انھوں نے بڑی شان سے قائم رکھا تھا۔ ۱۹۱۰ء میں جرمنی کا ولی عہد ہندوستان کی سیاحت کرنے آیا تھا۔ ولی عہد جہاں جاتا تھا، اُردو اخباروں کے نمائندے کی حیثیت سے نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی اُس کے ساتھ ہوتے تھے۔ نواب صاحب اخبار نویس معمولی، بلکہ برائے نام سہی، مگر اس میں شک نہیں کہ ولی عہد جرمنی کے ساتھ لگانے کے لئے اُن سے بہتر اخبار نویس کا انتخاب انگریز حکومت نہیں کر سکتی تھی۔

ولی عہد دلّی پہنچا تو نواب صاحب سلطان نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ میں حاضر ہوئے اور خواجہ حسن نظامی صاحب سے ملے۔ پھر خواجہ صاحب اور نواب صاحب میرے پاس دلّی تشریف لائے۔ خواجہ صاحب نے میرا اور نواب صاحب کا تعارف کرایا۔

۱۹۱۰ء میں ولی عہد نے ہندوستان کا دورہ کیا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں جارج پنجم کا دربار تاج پوشی دلّی میں منعقد ہوا۔ جارج پنجم کے ساتھ بھی نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی ہی متعین تھے۔

دربار کے لئے دلّی سے باہر خوب صورت خیموں کا بڑا پُر بہار شہر آباد ہوا تھا۔ اُس میں شہنشاہ کے خیمے کے قریب نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی کا خیمہ تھا، آراستہ و پیراستہ، ضرورت کی ہر چیز مہیا اور نوکر چاکر موجود، لیکن نواب صاحب شاندار خیمے کو چھوڑ کر میرے ہاں ٹھہرے تھے۔ خیمہ خالی پڑا رہا۔

میرے ہاں دربار کی وجہ سے کافی مہمان تھے۔ بیس آدمیوں کا قافلہ تو لاہور کے فقط زبدۃ الحکماء حکیم غلام نبی مرحوم کا تھا۔ سب زمین پر بستر بچھاتے تھے۔ نواب صاحب کو بھی زمین پر سونا پڑتا تھا، اور نواب صاحب زمین پر سونے سے خوش تھے۔

ہر شاہی تقریب میں نواب صاحب کی شرکت لازمی تھی۔ صبح سے رات کے گیارہ بجے تک کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا تھا۔ نواب صاحب ایک بجے میرے گھر پہنچتے تھے، لیکن پہنچتے ضرور تھے، اور ایک بجے لیٹیں یا دو بجے' اُٹھ جاتے تھے ہمیشہ اندھیرے سے۔ تہجد کے وقت۔ میں بیدار ہوتا تو انہیں قرآن مجید پڑھتے یا مثنوی مولانا روم پڑھتے پاتا تھا۔ قرآن اور مثنوی اتنے موثر لحن سے پڑھتے تھے کہ دل چوٹ کھاتا تھا۔ عبادت ختم کر کے نواب صاحب ڈاڑھی مونڈتے۔ کپڑے بدلتے اور ہلکا سا ناشتہ لیتے اور رات کے ایک بجے تک کے واسطے

رخصت ہو جاتے۔

کپڑے نواب صاحب کے سوٹ کیس میں زیادہ نہیں رہتے۔ کڑاکے کی سردی میں دو گرم شیروانیاں، اوور کوٹ مطلق نہیں، چھوٹی ٹھنڈی سی قمیصیں، چھ سات لٹھے کے آڑے پاجامے، ایک ترکی ٹوپی، جوتوں کا شاید ایک ہی جوڑا تھا۔ جامہ زیب جوان تھے، گٹھا جسم اور موزوں قد، لباس اُن پر پھبتا تھا، مگر قمیص اور پاجامہ جو نکلتا اُدھڑا نکلتا، کپڑوں سے بے نیازی نے اُن کی زندگی غیر نوابانہ بنادی تھی اور صبح کی عبادت شامل کر لیجئے تو زندگی کو غیر نوابانہ نہیں، درویشانہ کہنا چاہیئے۔ جو شخص تہجد ترک نہ کرتا ہو، وہ فرض نماز کا کس قدر پابند ہوگا۔ سنا ہے نواب صاحب نے مرتے مرتے نماز ادا کی۔

دربار کے زمانے میں نواب صاحب میرے ہاں رہے تھے تو بعد میں بھلا اور کہاں جاتے۔ مدتوں یہ وضع نبھائی۔ اُن کے سلام کو حیدرآباد دکن کے لیسے لیسے "جنگ" اور "دولہ" آتے تھے۔ جنہیں میں نے دیکھا کہ میرے مکان کی ڈیوڑھی کا مختصر سا فاصلہ اس جھٹکے سے طے کرتے تھے کہ تین چار منٹ لگ جاتے تھے۔ نواب صاحب آرام کرسی پر پڑے پڑے خطاب کی بجائے نام لے کر اُن کے سلام کا جواب دیتے تھے۔ بس اتنا کہتے۔ آؤ بھئی فلاں صاحب۔

نواب صاحب میرے آدمی سے سواری کبھی نہیں منگاتے تھے۔ راستے میں سواری لے لیتے ہونگے۔ تیسے لیے سواری اور لیے کروفر بھی جہاں چاہتے تھے گھس جاتے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف گورا فوج کھڑی ہے۔ تماشائیوں کا ہجوم ہے، لیکن تماشائی اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر نہیں آجا سکتے، مگر نواب صاحب گورے کے کان میں چپکے چپکے کچھ فرماتے ہیں اور سڑک کراس کر لیتے ہیں۔

قلعہ معلّٰے کے دیوان خاص میں خاص الخاص چائے پارٹی ہے انگریز کرنل دیکھ بھال کرکے مہمانوں کو اندر جانے دے رہا ہے۔ مہاراجہ پٹیالہ آتے ہیں مگر بُلاوے کا کارڈ نہیں لاتے۔ کرنل مہاراجہ سے ناواقف ہے، مہاراجہ سے جواب سوال کرتا ہے۔ مہاراجہ بگڑ جاتے ہیں اور کرنل سے اُلجھتے ہیں۔ نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی بڑھتے ہیں اور دونوں کی عزت بچا لیتے ہیں اور دونوں کو ممنون کر دیتے ہیں۔

نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی کی زندگی کا ایک رُخ یہ تھا کہ اُدھڑے ہوئے کپڑے پہننے اور زمین پر سونے سے مطلق ہیں۔ زبان اللہ، رسولؐ اور بزرگانِ اسلام کے سوا دوسرا ذکر نہیں کرتی۔ بے ڈاڑھی کا چہرہ بھی تہجد گزاری کا پتہ دیتا ہے چہرے پر نور برستا ہے۔ بے حد منکسر، بے حد سادے، بے حد خلیق، پھول کی مانند شگفتہ، لکھنؤ سے تار وصول ہوا کہ فلاں بینک فیل ہوگیا۔ کہا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ میں نے پوچھا بینک میں آپ کا کتنا روپیہ تھا۔ بولے، ساٹھ ہزار، لیکن ذرا ملال نہیں، وہی قرآن کی آیتیں، وہی مثنوی کے اشعار۔ غرض کہ نواب صاحب کی زندگی کا ایک رُخ تو یہ تھا۔ اور دوسرا رُخ یہ کہ امیروں اور رئیسوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ کسی "جنگ" اور "دولہ" کی تعظیم نہیں کرتے۔ وزیر اعظم ریاست حیدرآباد، مہاراجہ سرکشن پرشاد سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ نظام دکن اپنا مہمان بناتے ہیں۔ ملک کے تمام ہندو مسلمان راجہ نوابوں کو یقین ہے کہ انگریزوں سے جو کہہ دیں گے، وہ پتھر کی لکیر ہے، انگریز سمجھتے ہیں کہ راجہ نواب انہیں مانتے ہیں۔

نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی کی شہرت و عظمت اپنے طبقے میں محدود تھی۔ انھوں نے بڑائی خواص پر جمائی۔ عوام پر دھونس نہیں بٹھائی۔ عوام کو بھی اُن سے فائدہ ہوتا تھا، نقصان دینا ان کا کام نہیں تھا۔

انگریزی دانوں میں پابند اسلام اور خدا شناس اور بھی ہیں، اُن ہی میں میرے نزدیک نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی تھے اُن کا اچھا مسلمان ہونا ممکن ہے وہ پوشیدہ طاقت ہو، جس نے انہیں کامیاب کیا۔ دنیا میں نواب صاحب کامیاب تھے، امید ہے آخرت میں بھی نوازا گیا ہوگا۔

فاران:- نواب کیوں کہلاتے تھے۔ ایسے میں نے نہ پوچھا۔ نہ مجھے معلوم۔ میں نواب صاحب کو اخبار نویس کی حیثیت سے جانتا تھا۔ نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی کی زندگی کسی نہ کسی حد تک پُراسرار ضرور تھی۔ وہ حیدرآباد گئی گئے تو نظام حیدرآباد کو اتنا متاثر کر دیا۔ سُنا ہے کہ کنگ کوٹھی میں اُنہیں بیٹھنے کے لئے کرسی دی جاتی اور حضور نظام کے سامنے وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھتے، میر عثمان علی خاں اُنہیں مسئلہ برار کے سلسلہ میں لندن بھیجنے پر آمادہ ہو گئے تھے مگر (غالباً) سر محیین امام کے ایماء پر عبداللہ خاں کسمنڈوی کا یہ پلان ناکام ہو گیا!

سید معین الحق (ایم۔اے)

تاریخ کی اہمیت وافادیت

حضرات:

یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ تاریخ قوموں کے عروج وزوال کی ایک دلچسپ مگر عبرتناک داستان ہے۔ جہاں یہ بات صحیح ہے وہاں یہ بھی صحیح ہے کہ قوموں کے بناؤ اور بگاڑ میں تاریخ اہم حصہ ادا کرتی رہی ہے۔ کل لوگ کیا سوچیں گے اور کیا کریں گے بہت حد تک اس پر منحصر ہے کہ آج انہیں کون سی تاریخ اور کس نہج پر پڑھائی جارہی ہے۔ بیدار قومیں اپنی تاریخ کے معاملہ میں بہت ہی حساس واقع ہوئی ہیں۔ ان کے ہوشمند افراد کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اپنی تاریخ کے بدنما دھبوں کو اگر مٹا نہ سکیں تو ممکن حد تک ہلکا کرکے دکھائیں اور اس کے روشن پہلوؤں کو نکھار نکھار کر پیش کریں۔ یہ بات پھر بھی اتنی حیرت انگیز نہیں۔ حیرت انگیز تو یہ ہے کہ جن قوموں کے پاس اپنی کوئی تاریخ نہیں انھوں نے تاریخ گڑھ لینے کی خدمت انجام دی ہے۔ اس کی ایک نظیر ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ملتی ہے اور بعض قومیں ایسی بھی ہیں جنھوں نے تاریخ کو مسخ کرکے حریف قوموں کے کارناموں کو اپنی تاریخ سے جوڑ لیا ہے۔ اس کی ایک نادر مثال ہندوستان کی ہندو تاریخ ہے۔ یہاں ہندو سے مراد آریہ نسل کے لوگ ہیں۔ ان کے گھڑ گھڑ پھیلاتے ہوئے افسانے گو حقیقت نہ بن سکے اور تمام کوششوں کے باوجود نہ ہستناپور کا شہر برآمد ہو سکا۔ نہ اندرپرستھ کا کوئی نشان ملا نہ رام چندر کے قلعہ کا پتا چلا حد تو یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کے ادنیٰ آثار ظروف اور آلات کی شکل میں بھی کہیں سے دستیاب نہیں ہے پھر بھی وہ تاریخ کا شاندار حصہ بنے ہوئے ہیں اس ذیلی براعظم کی اس قدیم ترین قوم کے کارناموں کو، جو ایک تمدن کی مالک تھی جس نے بڑے بڑے شہر آباد کر رکھے تھے، جس کے تجارتی تعلقات دور دراز ملکوں سے تھے۔ جس نے علوم و فنون کو ترقی دی تھی اور جسے تباہ کرنے میں خود آریوں کو تقریباً نصف صدی لگ گئی اپنی طرف منسوب کر لینے میں انھوں نے کوئی عار محسوس نہیں کیا۔ کارناموں کی یہ قزاقی اسی میدان تک محدود نہ رہی جہاں نسلی جنگیں ہو رہی تھیں بلکہ اس کا اعادہ وہاں بھی ہوا جہاں مذہبی لڑائیاں لڑی جارہی تھیں۔ بدھوں اور اچھوتوں کے تمام کارنامے ہندو تاریخ میں شامل کر لئے گئے اور ٹیکسیلا اور اجنتا کی عمارتیں ہندو فن تعمیر کی شاہکار شمار کی جانے لگیں۔ یہ سب کچھ کر لینے کے بعد یہ قوم تہذیب و تمدن کی وارث بن کر کارناموں کے سنگھاسن پر بیٹھی اور کچھ یوں اس انداز میں اس نے تاریخ ہند کی ابتدا کی آریوں کی آمد سے پہلے اس ملک میں کچھ جنگلی اور وحشی قسم کے لوگ رہا کرتے تھے۔ آریوں نے یہاں آکر تہذیب و تمدن کی داغ بیل ڈالی، گویا تاریخ ہند کے اوراق سادہ پڑے تھے ان کے شاندار کارناموں ہی نے انہیں رنگین بنایا۔

تو اریخ کے گھڑ لینے سیرتوں کے ڈھال لینے اور حریف قوموں کے کارناموں کو مال غنیمت کی طرح ان سے چھین کر اپنی تاریخ سے جوڑ لینے کی مثالیں ہندوستان ہی تک محدود نہیں۔ اس فن کے شاہکار ایران میں بھی پائے جاتے ہیں۔ تین ہزار سال پر پھیلے ہوئے کیومرث، ہوشنگ، جمشید، فریدوں، کیکاؤس اور کیخسرو کے افسانے آج بھی تاریخ ایران کا روشن ترین باب ہیں۔ افسوس اور بیسویں صدی میں جب محکمۂ اثریات نے ہزارہا سال کی مدفون چیزوں کو برآمد کرکے گڑھی ہوئی تاریخ کی ان عمارتوں پر کاری ضرب لگانی شروع کی اور یہ یقین ہو گیا کہ نہ تو جام جم کا کوئی نشان ملے گا اور نہ اصطخر کا شہر برآمد ہوگا تو قوم کے ہوشمندوں نے ان نکلے ہوئے

آثار ہی میں سے چند کو تخت جمشید اور نقش رستم کا نام دے کر آباؤ اجداد کی صدق بیانی پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ یہ سلوک تو پھر بھی اُس عہد کے ساتھ کیا گیا جسے نیم تاریخی عہد کہا جاتا ہے۔ صریح ظلم تو انھوں نے تاریخی دور کے روشن ترین عہد پر کیا۔ عدل و انصاف، اخوت و مساوات اور شجاعت و شہامت کی بے نظیر تاریخ کو اپنی افسانوی تاریخ کی افسانوی عظمت کو برقرار رکھنے کی خاطر ملوکیت کا بدترین دور قرار دیدیا۔

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تاریخ کی کیا اہمیت ہے جن کی بنا پر قومیں اخلاق و صداقت اور عدل و شرافت کی تمام حدوں کو پھلانگ کر کذب و کبر کے مقام پر جا کھڑی ہوتی ہیں۔ یہ قصہ گوئی کا کوئی فطری داعیہ نہیں بلکہ یہ نسلی اور لسانی قومیت کا شدید احساس ہے جو حق و باطل کے لئے بھی ایک میزان بن جاتا ہے اور جو وطنی عصبیت پیدا کر کے اس مقام تک اُنھیں پہنچا دیتا ہے۔ بیدار قومیں اس بات کو اچھی طرح سمجھتی ہیں کہ کسی شاندار اور تاریخ کے بغیر نہ قومی اتحاد ممکن ہے، نہ کوئی قومیت تشکیل پذیر ہو سکتی ہے اور نہ کسی توسیع و ترقی کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔

تاریخ مختلف طریقے اور پہلوؤں سے اثر انداز ہوتی ہے۔ ایک طرف وہ روایات کے ذخیرے گھر گھر پہنچا دیتی ہے جو ذہنوں کو ڈھالنے، جذبات و احساسات کو متعین راہوں پر لگانے، افراد کے افکار و اعمال میں وحدت پیدا کرنے اور حیات انسانی کے رنگا رنگ شعبوں سے متعلق اُن کی پُشت پر طاقتوں کے سرچشمے فراہم کرنے کا فریضہ انجام دیتی ہیں جن کا لازمی نتیجہ افراد کے درمیان ہم آہنگی، گھرانوں کے اندر سکون، معاشرہ میں استحکام اور حکومت کے اندر نظم و ضبط کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

دوسری طرف تاریخ اقدار اعلیٰ کو اُسوۂ و سیرت کی شکل میں قوم کو عطا کرتی ہے۔ اعلیٰ قدروں کے لئے ہر زبان میں الفاظ ملتے ہیں مگر ایسی سیرتوں کے بغیر جن میں وہ رچے اور بسے ہوں یہ محتاج تشریح ہی رہتے ہیں۔ یہ سیرتیں اُنھیں بامعنی بنا کر قومی اتحاد کے لئے وہ مواد فراہم کر دیتی ہیں جن کے بغیر کسی پائدار اجتماعیت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ مزید یہ کہ یہ سیرتیں اُن صفات کے باعث جو اُن قدروں سے پیدا ہوتی ہیں۔ انتہائی حد تک جاذب نظر آنے لگتی ہیں اس لئے ایک طرف تو وہ فیضان کا سرچشمہ بنتی ہیں اور دوسری طرف اُن افراد کے درمیان اتحاد کا ایک وسیلہ ثابت ہوتی ہیں جو اُن سے یکساں محبت و عقیدت رکھتے ہیں۔

تیسری طرف تاریخ گوناگوں تجربات و مشاہدات کے مقدمات تشکیل کرتی ہے جن کے بغیر علوم و فنون اور حکمت و فلسفہ کا کارواں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ساتھ ہی یہ تجربات تنبیہ کا فرض ادا کر کے اُن اسباب کی نشاندہی کرتے رہتے ہیں جن کے جمع ہو جانے کے بعد قومیں لازمی طور پر ہلاکت سے دوچار ہوتی ہیں۔

چوتھی طرف تاریخ شجاعت و شہامت کے کارنامے بیان کر کے دلوں میں ولولہ پیدا کرتی ہے جو قوم کو بڑے بڑے منصوبوں کی تکمیل پر آمادہ کر دیتا ہے۔

ممکن ہے یہ باتیں بعض قوموں اور ملتوں کی تاریخ پر پوری طرح صادق نہ آتی ہوں مگر تاریخ اسلام پر بہرحال صادق آتی ہیں۔ تاریخ اسلام جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کسی ایسی قوم کی تاریخ نہیں جو نسلی، لسانی اور جغرافیائی بنیادوں پر تشکیل پذیر ہوئی ہو بلکہ یہ ایک دین کی تاریخ ہے جو بلا لحاظ رنگ و نسل اور امتیاز زمان و مکان ہر اُس نسل، جماعت، گروہ، قبیلہ، ذات اور خاندان کو محیط ہے جس نے اپنا رشتہ اسلام سے جوڑ لیا ہے۔ لہٰذا اس کی روایات کی جڑیں اُن تعلیمات کے درمیان پھیلی ہوئی ہیں اور وہیں سے غذا حاصل کرتی ہیں جن کی صداقت، کاملیت اور آفاقیت پر صرف ناعاقبت اندیش کو شبہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رنگ روپ قبیلہ، زبان، مکان، آب و ہوا، مزاج اور طبیعت کے بے انتہا اختلافات کے باوجود اس دینی قومیت کے

افراد کے اندر پسند و ناپسند کے پیمانے، جذبات و احساسات کے اظہار کے طریقے کرنے اور برتنے کے سلیقے، رفتار و گفتار کے انداز اور سوچنے سمجھنے کے ڈھنگ میں وہ ہم آہنگی رہی ہے جس کی نظیر کسی دوسری قوم و ملت کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مقامی طرز زندگی انفرادی مذاق اور شخصی بے راہ روی کے متصادم اور متعارض اثرات کے باوجود اسلامی روایات کا ڈھانچہ قومی زندگی پر مضبوط جما رہا ہے ۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اسلام ایک ایسے موڑ پر نمودار ہوا جب کہ عالم انسانیت بچپن اور لڑکپن کے مراحل سے گزر کر بلوغت کی منزل پر قدم رکھ چکا تھا۔ جہاں اُسے اس منزل کے اعتبار سے بدلتے ہوئے تقاضوں کو پورا کرنے کی خاطر لوازمات کی ضرورت تھی وہاں اُسے اُن لوازمات کے استعمال کا شعور و ادراک بھی پیدا ہو گیا تھا اور محفوظ کر لینے کے طریقے بھی معلوم ہو گئے تھے لہٰذا اسلام نے جو اُسے اسباب و سامان فراہم کئے اُسے وہ بچا لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس طرح اسلام کی تاریخ ایک صحیح تاریخ بن گئی اور اُس کی روایات حق و صداقت پر مبنی نظر آنے لگیں۔ افسانہ اور تاریخ میں جتنا بُعد ہے اُسی لحاظ سے اُن کے نتائج میں بھی بُعد ہونا چاہیئے تھا۔ ایک نے قدرتی طور پر صداقت سے غذا حاصل کر کے ایقان عطا کر دیا اور دوسرے نے کذب کی آغوش میں پرورش پا کر وہم و گمان کا جال پھیلا دیا۔ لہٰذا اسلامی روایات مطابقت و مماثلت اور اتفاق و اتحاد کی جتنی پائدار بنیادیں فراہم کر سکیں دوسری روایات سے ممکن نہ ہو سکا۔

اسلامی تاریخ نے جو سیرتیں پیش کیں وہ بھی روایات کی طرح اپنے مقاصد انجام دینے میں پوری طرح کامیاب رہیں۔ وہ نہ صرف فیضان کا ذریعہ ہی بنیں بلکہ فی الواقع تاریخی ہونے کے باعث قابل پیروی بھی ثابت ہوئیں۔ اسلامی تاریخ سے ہٹ کر اگر دیکھا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ اگر اکابر کی اقتدا کا داعیہ موجود بھی ہو تو سیرت کے بغیر نہ یہ ممکن ہے اور نہ مفید! حالت تو یہ ہے کہ اگر کسی کا نام معلوم ہے تو مقام معلوم نہیں۔ جائے پیدائش کا پتا چلا ہے تو سن پیدائش معلوم نہیں۔ اُن کی پوری زندگی کے خدوخال کا کیا سوال فصل زمانی تک کا لوگوں کو علم نہیں ایسی صورت میں پیروی تو ممکن نہیں رہی ہاں وہ سرمایہ افتخار ضرور بن سکے اس کے برعکس اسلامی سیرتیں وہ مقام حاصل کر سکیں جہاں سے لوگ اکتساب فیض کر سکیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے اقدار اعلیٰ کی عملی شکلیں اور صورتیں پیش کر کے انھیں بامعنی بنا دیا ورنہ وہ بھی فلسفہ کی محض خوب صورت اصطلاحات بن کر رہ گئے ہوتے۔ یہ عقیدت نہیں ایک حقیقت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی سیرت کے بغیر لفظ صداقت تشنۂ مطالب ہی رہ گیا ہوتا اور حضرت خبیبؓ کی سیرت کے بغیر لفظ شہادت اپنی معنویت کھو دیتا۔ تدبر کا لفظ سیرت فاروقؓ کے بغیر سمجھ میں نہ آتا اور نہ شجاعت کی کوئی تشریح سیرت مرتضیٰؓ کے بغیر ممکن ہوتی۔ عزیمت کا کیا مفہوم قائم کیا جاتا اگر حضرت حسینؓ کی سیرت سامنے نہ آتی اور عشق و محبت کی کیفیت کا کیا اندازہ لگایا جاتا اگر تاریخ حضرت ابوذرؓ کو پیش نہ کرتی۔ بصیرت کا کیا مطلب لیا جاتا اگر حضرت ابوعبیدہؓ سامنے نہ ہوتے اور عروج عبدیت و کمال بشریت کا کیا تصور قائم کیا جاتا اگر تاریخ کے اوراق حضور اکرمؐ کی سیرت سے خالی ہوتے۔ حق تو یہ ہے کہ ان سیرتوں نے اس قوم کے لئے فیضان کے وہ سرچشمے مہیا کر دیئے ہیں اور قومی اتحاد کی وہ بنیادیں فراہم کر دی ہیں جن کی نظیر کوشش کے باوجود دوسری قوم کی تاریخ میں نہ مل سکے گی۔

اس طرح اسلامی تاریخ نے جو تجربات و مشاہدات منتقل کئے ہیں وہ بھی حیرت انگیز اور بے مثال ہیں۔ وہ مادی بھی ہیں اور روحانی بھی۔ ایک طرف وہ کاروان علوم کے لئے وافر اور طاقت بخش زاد راہ فراہم کرتے ہیں اور دوسری طرف روحانی مقامات کی نشاندہی کر کے [illegible]

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تاریخ کی یہ افادیت ہے اور تاریخ اسلام فلاح و ارتقاء اور توسیع و ترقی کے اس قدر اسباب و سامان سے مالا مال ہے تو پھر مسلم قوم کیوں زوال پذیر ہوئی اور مائل بہ پستی و تباہی کے عالم میں کیوں پڑی ہے۔ اس کا تفصیلی جواب تو اس وقت ممکن نہیں مختصراً عرض کرتا ہوں۔

اوائل میں اس کے زوال کے تین اہم اسباب ہیں۔ دولت کی فراوانی، موروثی حکومت کی برائیاں اور شخصی بے راہ روی۔ ان میں سے ہر ایک سبب کو دوسرے سے طاقت ملتی رہی اور ان تینوں کے متحدہ اثرات نے اس قوم کو تساہل پسند اور عیش پرست بنا دیا جس کے لازمی نتائج غفلت، جہالت اور باہمی تنازع کی شکل میں ظاہر ہوتے۔ یہاں تک کہ یہ مائل بہ زوال ہوئی اور بالآخر محکومی و محرومی کے مقام تک پہنچی۔ یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی چونکہ اس کی روایات مضبوطی کے ساتھ اس پر سایہ فگن تھیں۔ اس کی تعلیمات اسے اشارے کر رہی تھیں اور اس کی ولولہ انگیز تاریخ اسے ابھار رہی تھی اس لئے وہ غلامی پر مطمئن نہ ہو سکی اور کروٹیں بدلنے لگی۔ ممکن تھا کہ فوراً اٹھ کھڑی ہوتی مگر اب کچھ دوسرے اسباب جمع ہو گئے تھے۔ جنھوں نے اسے روکے رکھا۔ ایک طرف بے جا افلاس تھا اور دوسری طرف مصلحت اندیشوں، کوتاہ بینوں اور خوشامدیوں کا ایک جتھا تھا جو اسے زمانہ سازی کا سبق پڑھا رہا تھا اور اس پر غلامی کے اسرار اور محکومی کے فوائد منکشف کر رہا تھا لہٰذا وہ ایک عرصہ تک متوحش و متفکر پڑی رہی۔ اس طرح اپنی چودہ سو سالہ تاریخ میں تقریباً سو ڈیڑھ سو سال اسے غلامی کے عالم میں بسر کرنے پڑے۔ پھر بھی وہ غلامی سے ہم آہنگی پیدا نہ کر سکی۔ بیسویں صدی میں اس کی کروٹیں تڑپ بن گئیں اور وہ ایک کش مکش کے بعد بالآخر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس وقت وہ عالم پستی و تباہی میں نہیں بلکہ عالم کشاکش میں مبتلا ہے یہ کشاکش مختلف انداز اور مختلف نوعیت کی ہے۔ ایک طرف وہ حضرات ہیں جو چند دنوں پہلے اس تڑپ اور کرب کو دیکھ دیکھ کر دور کھڑے مسکرا رہے تھے اس کی رہنمائی کے لئے آگے بڑھ آئے ہیں اور اپنے حوصلہ کے مطابق مقامات عالیہ میں سے کسی ایک مقام کا تعین کر کے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دوسری طرف ترقی کے وہ علمبردار ہیں جو صرف طاقت کو حق سمجھتے ہیں اور اس قوم کی فلاح ان افکار و نظریات میں دیکھ رہے ہیں جن کے پیچھے عظیم مادی طاقتیں کار فرما ہیں۔ تیسری طرف وہ قائدین ہیں جو اس قوم کے لئے ایک تجویز حیات لائے ہیں جو فیضان شرک و بت پرستی کی تاریخ سے حاصل کرتا ہے جس کے تانے بانے نظام الحاد سے لئے گئے ہیں اور جن میں گل بوٹے کے طور پر اسلامی سیرتوں کو فٹ کیا گیا ہے۔ یہ تجویز ایک ایسا جال ہے جس سے تو چمٹ گئے ہیں اور کچھ دور کھڑے دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں۔ چوتھی طرف ایک غیر متحرک جماعت ہے جس نے اکابر کی سیرتوں سے فیضان حاصل کرنے کے بجائے کرامات و عجائبات میں اپنے لئے تسلی کا سامان تلاش کر لیا ہے۔ پانچویں طرف وہ ماہرین تعلیم ہیں جو تاریخ اسلام کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس کی تعلیم کو عام کرنا چاہتے ہیں مگر تاریخ اسلام کے بجائے سلاطین و امراء کی سیاسی تاریخ قوم کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ سیاسی تاریخ بہرحال اسلامی تاریخ کا ایک حصہ ہے اور جزو پر کل کا اطلاق نہیں ہو سکتا لہٰذا نامکمل تاریخ سے ناقص نتائج ہی کی توقع کی جا سکتی ہے۔

یہ کشاکش کے چند اہم اسباب ہیں جنھوں نے قوم کو حالت التوا میں ڈال دیا ہے مگر مقام قیادت کی طرف اس کی پیش قدمی اور رسائی ایک یقینی بات ہے۔ (انشاء اللہ العزیز)

(یہ مقالہ بزم تاریخ اسلامیہ کالج کراچی کے افتتاح کے موقع پر پڑھا گیا) ——

——✻——

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا مکتوب

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۳۰ر مئی ۱۹۶۳ء

القاب وآداب سلام مسنون!

بعض کرم فرما میری نجی تحریروں یا خطوط کو، جو وقتاً فوقتاً ان کو یا کسی اور کو لکھے گئے، علیحدہ علیحدہ یا مجموعہ کی شکل میں نیز میری سیرت وشخصیت اور خدمات کو منظر عام پر لانے کے لئے اپنے گرانقدر اخبار یا رسائل کے خاص نمبر شائع کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک پتہ چل سکا ان عزیزوں کو نہایت ادب وخلوص سے ممانعت ومعذرت کے عریضے لکھ دیئے کہ اس طرح کے اہتمام میری حیات ہی میں نہیں بلکہ اس کے بعد بھی نہ فرمائیں۔ انھوں نے میری درخواست قبول فرمائی۔ اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور مجھے اپنا گرویدۂ احسان بنایا، علاوہ بریں کبھی میری یادگار منانے یا قائم کرنے کے لئے نہ کوئی عام چندہ کیا جائے نہ کوئی خاص عطیہ یکمشت کسی سے قبول کیا جائے۔

لیکن اسکا اندیشہ ہے کہ عام طور پر میری اس خواہش وگزارش کا علم دوسرے عزیزوں اور بزرگوں کو شاید نہ ہو اس لئے آپکے مقبول عام وکثیر الاشاعت رسالے سے اعانت کا خواستگار ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ مذکرہ صدر خطوط یا تحریریں کسی بہانے شائع نہ فرمائی جائیں نہ کسی اور طرح محفوظ رکھی جائیں بلکہ بہ نظر احتیاط ان کو تلف کرا دیا جائے تاکہ آئندہ کبھی انکی اشاعت کا امکان باقی نہ رہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی عرض کرونگا کہ میری اس گزارش کو معرض بحث میں لایا جائے

معمولی تبدیلیوں کے ساتھ جو ناگزیر یا نادانستہ تھی اس مضمون کے عریضے میں نے دوسرے اخبارات ورسائل کو بھی لکھے ہیں۔ ان جزوی اختلافات کو نظر انداز فرمایا جائے اس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ یہ خطوط یا متفرق تحریریں یا پرزے جو میں نے کسی کو کبھی کسی غرض سے لکھے ہوں وہ کسی حال میں شائع نہ فرمائی جائیں نہ میری زندگی میں نہ میرے مرنے کے بعد نہ اس سلسلہ میں کسی اخبار یا رسالہ کا کوئی خاص نمبر شائع کیا جائے۔

امیدوار ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان کے مقتدر اخبارات ورسائل اس معروضہ کو بعینہٖ ورنہ اس کا خلاصہ شائع فرما کر ممنون فرمائیں گے!

خاکسار — رشید احمد صدیقی

غزلیں!

تسکین قریشی

میرے عشق کامل میں، حسن بھی ادا بھی ہے
میں نے دل دیا بھی ہے، میں نے دل لیا بھی ہے

عاشقی و خودداری، جبر بھی جفا بھی ہے
زخم ہی نہیں دل میں، زخم میں مزا بھی ہے

اہل دل یہی کہتے ہیں اور یہ واقعہ بھی ہے
کفر، کفر ہے لیکن عشق میں روا بھی ہے

شکر کیا شکایت کیا، خیر ہو محبت کی
وہ جو دشمن جاں ہے، یار باوفا بھی ہے

حسن ہو اگر برہم، اور چھیڑ دیجے پیہم!
برہمی کے عالم میں لطفِ التجا بھی ہے

کچھ تو وہ حسین آنکھیں شرم سے نہیں اٹھتیں
اور کچھ نظر اپنی حسن آزما بھی ہے

عقل و آگہی بھی گم، ہوش و بیخودی بھی گم
تیری یاد کی ملنے دوست کوئی انتہا بھی ہے

میکدے میں رہ کر بھی بے نیازِ بدمستی
جتنا رند ہے تسکینؔ اتنا پارسا بھی ہے

عروجؔ زیدی

جو بزمِ کون و مکاں کو ہے جگمگاتے ہوئے
اسی چراغ سے ہم بھی ہیں لو لگاتے ہوئے

بشر وہاں سے بھی بیگانہ وار گزرا ہے
جہاں فرشتے کھڑے تھے پرے جمائے ہوئے

وہ کہہ رہے ہیں "مری قوم کو ہدایت دے"
جو اپنے خون سے طائف میں ہیں نہائے ہوئے

خدا کے سامنے جھکنے کا یہ نتیجہ تھا!
ہمارے سامنے دُنیا تھی سر جھکائے ہوئے

کسی کی شانِ شفاعت کو ہے تلاش ان کی!
کھڑے ہیں حشر میں جو لوگ منہ چھپائے ہوئے

سموم و ریگ کی دُنیا میں جن کی آنکھ کھلی
بہارِ دین کے زمانہ پہ ہیں وہ چھائے ہوئے

طلوعِ مہرِ صداقت کا وقت آپہونچا
ہزاروں لات و ہبل ہیں دیئے جلائے ہوئے

عروجؔ! نسبتِ شاہِ رسلؐ کے صدقے میں
کلاہِ فخر ہوں ماتھے پہ میں جھکائے ہوئے

راہی بلند شہری

آوارگانِ شہرِ نگاراں ہمیں تو ہیں
یعنی خرابِ چشمِ غزالاں ہمیں تو ہیں

سُلجھائی ہم نے زلفِ پریشانِ زندگی
اس پر بھی زندگی سے پریشاں ہمیں تو ہیں

غیروں کے جو کرم کو بھی کرتے نہیں قبول
اپنوں کے جور و ستم پہ ہیں نازاں ہمیں تو ہیں

صیاد و برق و باد کی نظریں گواہ ہیں
جانِ بہار و جانِ گلستاں ہمیں تو ہیں

شاید سوادِ شامِ خزاں کو نہیں خبر
رخشندگیِ صبحِ بہاراں ہمیں تو ہیں

افسانۂ حیات کو ترتیب دیں گے ہم
افسانۂ حیات کا عنواں ہمیں تو ہیں

اس خستگی و خاک نشینی کے باوجود

ہیں سازِ دل کے تار شکستہ مگر ندیم
تاروں پہ سازِ دل کے غزل نواں ابھی تک ہیں

محمد عمر سلیقی

مانوس غم عشق جو دُنیا نہ رہے گی
گل رنگی صد داغ تمنا نہ رہے گی

بیدار تو ہونے دو، ذرا اہلِ حرم کو
نیرنگی اربابِ کلیسا نہ رہے گی

پھر کس کے سہارے یہ رہے گا دلِ ناشاد
جب تیری محبت بھی سہارا نہ رہے گی

کیوں جی سے گزر جاؤں نہ میں آج ہی سلیقی
دل میں تو کوئی حسرتِ فردا نہ رہے گی

نہ رہنما۔ نہ کوئی ہم سفر تلاش کرو
الگ جہاں سے کوئی رہگذر تلاش کرو

یہ بے خبر سے جو بیٹھے ہوئے ہیں محفل میں
انھیں میں ہوگا کوئی باخبر، تلاش کرو

تاج الدین اشعر رام نگری

وہ شبِ طور تھی یا صبحِ ازل یاد نہیں
اس سے پہلے بھی مگر آپ کو دیکھا ہے کہیں

تم کو اس جانِ جہاں کا ہی جب ادراک نہیں
خاک تم کرتے ہو پیمائشِ افلاک و زمیں

کور ہو جائیں تو ان کا نہ ملے کوئی نشاں
اور جو دیکھیں تو وہی وہ، ہیں کوئی اور نہیں

دور کر دی مری آوارہ نگاہی تم نے
اب کوئی حسن نگاہوں میں ٹھہرتا ہی نہیں

عزیز حاصل پوری

روشنی صبحِ مسرت کی ہے شب فام ابھی!
غمِ جاناں ہے اسیرِ غمِ ایام ابھی!

دل میں پوشیدہ ہے اک حسرتِ ناکام ابھی
ہے تہی جام میں کچھ دُردِ تہِ جام ابھی

"لوح تاریخ وصال"

۱۳ ھ ۸۲

"شاعر باشعور صاحب قال"

۱۳ ھ ۸۲

"بلبل بوستان جناب صابر صاحب مرحوم دہلوی"

۱۳ ھ ۸۲

"اثر خامہ طوطی لسان عزیز حاصل پوری"

۱۹ ء ۶۳

چل بسے صابر دہلوی، حسرتا	بخشے اُن کو جنت خدائے غفور
صاحبِ طرز اک شاعرِ خوش گلو	اُنکی آواز میں درد دل تھا ضرور
اُسکو پاتا ہوا احساں دل کے قریب	کوئی ہوتا جس وقت آنکھوں سے دور
یاد آتا ہے رہ رہ کے اُن کا خلوص	کر گئے آہ صابر ہمیں ناصبور
وہ نہیں آج ہم میں تو ہے انکی یاد	بادۂ مرگ ہے زندگی کا سُرور

بہر تاریخ برجستہ کہہ دو عزیز
"صابر دہلوی آہ بالغ شعور"

۱۹ ء ۶۳

ماہر القادری — **شب جائیکہ من بودم**

چہ وجد و کیف حاصل بود شب جائیکہ من بودم
دلم ہشیار و غافل بود شب جائیکہ من بودم

نگاہِ شوق خود دل بود شب جائیکہ من بودم
تماشا کارِ مشکل بود شب جائیکہ من بودم

نوائے مطرب و سازے، گہے سجدہ، گہے سقفے
شریکِ رنگِ محفل بود شب جائیکہ من بودم

زہے نزدیکی و دوری، بہ نام وصل و مہجوری
محبت حدِ فاصل بود شب جائیکہ من بودم

خوشا آں چشمِ خونخوارے کہ از بارِ حیا لرزاں
عجب قاتل کہ بسمل بود شب جائیکہ من بودم

نظر حیراں نفس لرزاں، ہمہ آشوبِ قلب و جاں
مقامِ قربِ منزل بود شب جائیکہ من بودم

درآں بزمِ صفا ماہر کہ تاج قیصر و سنجر

رُوحِ انتخاب

کتنے خرمن اطاعت ہیں جو نزع کے وقت وقدمنا الی ما عملوا من عمل فجعلناه هباءً منثورا کی بے نیازی کی آندھی کے
رہ جاتے ہیں، اور کتنے آباد سینے ہیں، جن کو سکرات و موت میں وبدا لهم من الله ما لم یکونوا یحتسبون کا فرمان سلطانی
یران کر دیتا ہے، کتنے چہرے ہیں جن کو لحد میں قبلہ سے پھیر دیتے ہیں، کتنے آشنا ہیں جن کو پہلی شب میں بیگانہ کہہ دیتے ہیں، کتنے ہیں جن
ے کہا جاتا ہے "نم کنومة العروس" اور دوسرے سے ارشاد ہوتا ہے "نم کنومة المنحوس" کبھی ایسا رد کرتے ہیں، جو کسی طاعت پر بھی
اپس نہیں لیتے۔

من لم یکن للوصال اهلا فکل احسانہ ذنوب

در کبھی ایسا قبول کرتے ہیں کہ پھر کسی معصیت کی پروا نہیں ہوتی۔

فی وجہہ شافع یمحو اساءتہ
من القلوب ویاتی بالمعاذیر

کبھی لطفِ بے علت کہتا ہے کہ اندر آجا، یہاں کتے کے پاؤں کی گرد کو دوستوں کی آنکھوں کا توتیا بناتے ہیں اور وکلبهم باسط
ذراعیہ بالوصید کہہ کر قیامت تک کے لئے کتے کے مرتبہ کو بڑھاتے ہیں، اور کبھی قہر بے علت آواز دیتا ہے کہ خبردار! خبردار یہاں
معلم الملکوت کے سر سے جو سات لاکھ سال معتکف درگاہ رہا ہے، لباس فلکی اتار کر ان علیک لعنتی کا داغ اس کی پیشانی پر لگاتے ہیں
دروازہ کرم کھلا ہوا ہے، اور دسترخوان لگا ہوا ہے، جلدی کرو، اپنے کو پالو، لے بھائی! بشر کیا، بشر کی طلب کیا! لیکن کرم بے
نہایت نہ آقا کو چھوڑتا ہے، نہ غلام کو، نہ غنی کو نہ فقیر کو! جس طرح آفتاب جب اپنے برج سے طلوع کرتا ہے اگر اہل عالم کمر ہمت
باندھ لیں کہ اس کے نور کا ایک ذرہ اپنے ہاتھ میں لے لیں، اس پر وہ قادر نہیں لیکن وہ خود اپنی سخاوت و فیض عالم کی بنا پر جس طرح
کوشکِ سلطانی پر اور سرائے امراء پر چمکتا ہے، فقیروں اور بے نواؤں کے کلبۂ احزاں کو بھی روشن کرتا ہے، تم خاک و آب کے مست
دیکھو۔ اس دولتِ اقبال کو دیکھو کہ یحبہم ویحبونہ ارشاد ہے، ایک جگہ فرماتا ہے اللہ ولی الذین آمنوا دوسری جگہ فرماتا ہے
وسقاهم ربهم، مقرب فرشتے کو بھی یہ عزت و خلعت حاصل نہیں، جو تم کو حاصل ہے۔
اے بھائی! تم کتنے ہی آسودہ و ملوث ہو، دامن توبہ تھام لو، اور امیدوار رحمت بن جاؤ کہ تم نہ ساحرانِ فرعون سے آلودہ تر
ہو، اور نہ اصحاب کہف کے کتے سے زیادہ گندے، نہ طور سینا کے پتھر سے زیادہ بڑھ کر جامد، اور نہ ستون حنانہ سے بڑھ کر بے
قیمت، غلام کو اگر حبش سے پکڑ کر لاتے ہیں تو کیا عجیب کی بات ہے، جب کہ آقا اس کو کافور کا لقب دیتا ہے، جب ملائکہ نے عرض
کیا کہ ہم کو اس مشتِ خاک کے فساد کی طاقت نہیں، آواز آئی اگر ہم اس کو تمہارے دروازے پر بھیجیں تو رد کر دینا، اگر تمہارے
ہاتھ نہ بیچیں تو مت خریدنا۔ تم ڈرتے ہو کہ ان انسانوں کی معصیت ہماری رحمت سے زیادہ ہوگی، یا اس سے ڈرتے ہو کہ ان کی آلودگی
ہمارے کمال قدوسیت پر داغ ڈال دے گی، یہ مشتِ خاک ہیں، جو ہماری بارگاہ میں مقبول ہیں، اور تمہیں قبول ہیں، ان کی معصیت

آلودگی سے کیا نقصان شاعر نے خوب کہا ہے ؎

سراسر ہیمہ عیبم بدیدی و خریدی تو
زہے کالائے پر عیب و زہے لطفِ خریداری

آدمِ خاک کا مرتبہ بلند ہے اور ہمت بڑی، ہر چند فقر و فاقہ گدائی و بے نوائی اس کے خمیر میں داخل ہے، لیکن جب آفتاب آسمانِ وجود میں درخشاں ہوا، ملائکہ ملکوت نے جو سات لاکھ سال سے تقدیس و تسبیح کے چمنستان سے اپنی غذا حاصل کر رہے تھے او "نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ" کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔ عاجزانہ اپنی بے بسی کا اظہار اور اپنے عجز کا اعتراف کیا "فابین ان یحملنہ" اس بارِ گراں کے اٹھانے سے معذوری ظاہر کی، آسمان نے کہا کہ میری صفت رفعت ہے، زمین نے کہا میرا خلعت فرشِ خاکی ہے، کہا میرا منصب بہرہ داری اور پاؤں پر کھڑا رہنا ہے، جواہرات نے عرض کیا کہ کہیں ہمارے شیشہ میں بال نہ آجاتے، اس خاک کے ذرہ نے فقر و فاقہ کی آستین سے دستِ نیاز نکالا، اور اس بارِ امانت کو سینہ سے لگا لیا، اور دو عالم میں سے کسی چیز کا غم نہ کیا، اس میرے پاس کیا ہے جس کو چھین لیں گے، جب کسی چیز کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں مٹی میں ملا دیتے ہیں، مٹی کو کس میں ملائیں گے، مردانہ وار اس بوجھ کو جس کو سات آسمان و زمین نہ سہار سکے، ہنسی خوشی اٹھا لیا۔

(ملفوظات حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ مُنیری رحمۃ اللہ علیہ)
ترجمہ:۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

قرآن کی پکار

ماہنامہ انوارِ اسلام کا قرآن نمبر

ماہنامہ انوارِ اسلام ہند و پاک میں مقبول و مشہور صاحبِ قلم ابو محمد امام الدین کی نگرانی میں شائع ہوتا ہے۔ اس رسالے کا مقصد مذاہبِ عالم اور جدید علوم و نظریات پر اسلام کی حقانیت و برتری ثابت کرنا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں اسلام سے متعلق غیر استفسارات و اعتراضات کے مدلل جواب دیئے جاتے ہیں۔ اسی سلسلے میں اس رسالے میں سوامی دیانند کی کتاب ستیارتھ پرکاش قرآن مجید سے متعلق چودھویں باب کے گمراہ کن اور متعصبانہ جرح و قدح کے قسط وار جوابات شائع ہوتے رہے ہیں اور اب پورے چودہ باب کا رد و جواب قرآن نمبر کی صورت میں شائع ہو رہا ہے یہ جواب مباحثہ و مجادلہ کے اسلوب سے ہٹ کر تفہیمی و تبلیغی انداز میں غیر مسلموں کو قرآن مجید کے اصل مقاصد سمجھانے گئے ہیں اس لئے اس کا مطالعہ مسلمانوں کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگا۔ ستیارتھ پرکاش قریباً سو برس سے شائع ہے اور تمام ملکی زبانوں کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ اس نمبر کی قیمت چار روپے ہوگی لیکن جو حضرات چار روپے سالانہ چندہ بھیج کر خریدار ہو جائیں گے ان سے علیحدہ قیمت نہ لی جائے گی۔ پاکستان میں چندہ اس پتہ پر بھیجیں:۔ جناب ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی ماہنامہ اردو ڈائجسٹ ۳ مین روڈ سمن آباد لاہور اور دفتر کے پتہ پر ارسال فرمائیں!

مہتمم ماہنامہ انوارِ اسلام رام نگر بنارس (بھارت)

ماہرالقادری

یادِ رفتگاں

ڈاکٹر ہادی حسن مرحوم

علی گڑھ نمائش جب یاد آتی ہے تو نہ جانے کتنی چوٹیں ابھر آتی ہیں۔ اور کتنے واقعات فلمی مناظر کی طرح نگاہوں کے سامنے سے گذر نے لگتے ہیں۔ ہاں تو سنہ ۱۹۴۰ء میں علی گڑھ نمائش میں مشاعرہ تھا۔ جناب عبدالمجید قرشی پروفیسر شعبہ ریاضیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اس مشاعرے میں شریک ہونے کے لئے مجھے خط لکھا۔ مشاعرے کے صدر پروفیسر عبدالعزیز پوری مرحوم تھے۔ مسٹر ابوطالب نقوی ان دنوں علی گڑھ کے کلکٹر اور مسٹر ہم۔ بی۔ احمد سشن جج تھے۔ مشاعرے کے بعد کئی دن علی گڑھ ٹھیرنا ہوا۔ شام کو کلکٹر صاحب کے خیمے میں پروفیسروں، عہدیداروں اور اہل علم کا اژدہام ہوتا تھا۔ وہیں ڈاکٹر ہادی حسن سے میری ملاقات ہوئی، نام تو ان کا حیدرآباد کے زمانہ قیام ہی سے سن رکھا تھا۔ مگر اب تک ملنے کا موقع نہیں آیا تھا، دوسری یا تیسری ملاقات میں وہ مجھ سے فرمانے لگے کہ کل آپ مسلم یونیورسٹی آئیں ضرور آئیں۔ ابھی وہ بات پوری بھی نہ کرنے پائے تھے کہ میں جھٹ سے بول پڑا ——— میں اس طرح "دفتری مشاعروں" میں شریک نہیں ہوا کرتا۔ ڈاکٹر صاحب اس پر بولے ——— نہیں؛ عام مشاعرہ نہیں ہوگا، اس سے آپ بے فکر رہیں، مگر آئیے ضرور!

میں دوسرے دن مسلم یونیورسٹی پہنچا، ڈاکٹر صاحب میرے منتظر تھے۔ وہ ایم۔ اے کلاس میں لیکچر دے رہے تھے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ کلاس میں لے گئے، اور کلاس کے دروازے بند کر دیئے، وہاں گنتی کے چند طلبا تھے۔ پھر ان کے اصرار پر میں نے اپنا کلام سنایا اس کے بعد انہوں نے میری شاعری پر مختصر سی تقریر کر ڈالی۔ عبارت خاصی مسجع اور مقفیٰ تھی اور عربی فارسی کی بعض ترکیبیں خاصی نامانوس تھیں۔ انھوں نے ایک یہ جملہ بھی فرمایا جس کا مفہوم و مراد نہ میں اس وقت سمجھا اور اب سوچتا ہوں تو بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ ڈاکٹر ہادی حسن نے یہ بات کیوں کہی! وہ میرے لئے کیا کرنا چاہتے تھے۔ فرمایا۔

"سنہ ۱۹۴۰ء میں ماہرالقادری کے لئے ہادی حسن کچھ نہیں کر سکتا، تو کیا آئندہ بھی
کچھ نہ کر سکے گا"

اس کے بعد ان سے دو چار بار اور ملنا ہوا۔ اور پھر آخری ملاقات مدراس میں ہوئی۔ یہ غالباً سنہ ۱۹۴۴ء کی بات ہے۔ وہاں کے اسلامیہ کالج کی سلور جوبلی تھی۔ ڈاکٹر عبدالحق[1] مرحوم اس کے پرنسپل تھے، انہوں نے بمبئی سے مجھے تار دے کر بلایا۔ میں مشاعرے کے دن مغرب کے بعد مدراس پہنچا۔ اس دن شام کو ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کا لیکچر تھا۔ گورنر مدراس جلسہ کے صدر تھے۔ ان کی تقریر بہت زیادہ کامیاب رہی۔ میں جب ان سے ملا ہوں تو جلسہ گاہ سے تقریر کر کے آئے ہوئے انہیں چند منٹ ہوئے تھے۔ تحسین و ستائش کا نشہ ابھی اترا نہ ہوگا، میں نے ڈاکٹر ہادی حسن کو بہت زیادہ خوش اور شگفتہ پایا۔ چھوٹتے ہی مجھ سے انگریزی میں بولے۔

"Mahir ——— you have missed
a good lecture"

[1] بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نہیں، یہ مدراس کے ڈاکٹر عبدالحق تھے۔

میں نے کہا مجھے آپ کی تقریر کے پروگرام کی پہلے سے کوئی اطلاع نہ تھی میں تو ڈاکٹر عبدالحق صاحب کا تار ملتے ہی بمبئی سے چل پڑا۔

اس کے بعد ڈاکٹر ہادی حسن سے پھر ملاقات نہیں ہوئی۔ پاکستان آنے کے بعد اس کی اطلاع اور خیر خبر نہیں ملی کہ وہ کہاں ہیں! یہاں تک ایک مہینہ ہوا، جب اخباروں میں ان کی موت کی خبر پڑھی۔ یہاں کے اخبار نویسوں کی بے خبری کا یہ عالم کہ ڈاکٹر ہادی حسن کے انتقال کی خبر کو ذرا بھی نمایاں کر کے نہیں چھاپا۔

ڈاکٹر ہادی حسن نواب محسن الملک کے چھوٹے بھائی مولوی امیر حسن کے فرزند تھے۔ یہ پورا گھرانا ایم۔ اے اور پی۔ ایچ ڈیوں کا گھرانا ہے ڈاکٹر صاحب برسوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پروفیسر رہے، طلبا میں وہ بہت مقبول بلکہ محبوب تھے شعبہ فارسی کے علاوہ شعبہ نباتیات کی صدارت پر بھی وہ فائز رہے۔ بلا کے ذہین اور طباع تھے، خاص طور سے ان کا حافظہ بڑا قوی تھا، تقریروں میں انگریزی مصنفین کے صفحے کے صفحے ان کے ناموں کے حوالے کے بغیر سنا دیتے! ان کی والدہ ایرانی تھیں اس لئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ فارسی ان کی مادری زبان تھی۔

ان کی زندگی کا یہ واقعہ خاص طور سے قابل ذکر ہے　　　کہ ایک بار سخت بیمار پڑ گئے۔ یہاں تک کہ ہسپتال میں کافی دنوں تک رہنا پڑا۔ وہاں ایک نرس نے ان کی بڑی خدمت اور ٹہل کی، جب وہ ہسپتال سے اچھے ہو کر جانے لگے تو اس نرس سے انہوں نے کہا کہ میں تمہیں کوئی تحفہ دینا چاہتا ہوں، اپنی کسی پسندیدہ چیز کا انتخاب کر کے مجھے بتاؤ، نرس بڑی باوفا اور مزاج شناس تھی بولی "میں آپ کو پسند کرتی ہوں" اور اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اس سے شادی کر لی۔

میں نے علی گڑھ میں ان کی بیوی کو دیکھا ہے۔ دونوں کی عمروں کے علاوہ ان کی رنگت صورت اور ناک نقشہ میں بھی خاصا تفاوت تھا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی بیوی سے ہر حیثیت سے بڑھ چڑھ کر تھے۔ انہوں نے کس خوشدلی کے ساتھ اس تعلق زوجیت کو نباہا۔ ڈاکٹر صاحب کے مرنے کے بعد جو ان کے حالات اخبارات میں نظر سے گذرے ان سے پتہ چلا کہ چند سال ہوئے ڈاکٹر صاحب کی بیوی کا انتقال ہو گیا اور اس صدمہ کو انہوں نے بہت شدت کے ساتھ محسوس کیا۔

ڈاکٹر ہادی حسن کی شخصیت اور ان کی باتوں میں بڑی کشش تھی۔ مسلم یونیورسٹی کے میڈیکل کالج کے لئے طوفانی دورہ کیا اور تیس لاکھ روپے کے قریب چندہ جمع کر کے دم لیا! ان کی موت سے علمی دنیا میں کوئی شک نہیں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے!

ہماری نظر میں

تاریخ دعوت و عزیمت
حصہ سوم

از :- سید ابوالحسن علی ندوی، ضخامت ۴۱۲ صفحات (مجلد، گرد پوش کے ساتھ، کتابت، طباعت اور کاغذ خوب سے خوب تر) قیمت مجلد چھ روپے، غیر مجلد پانچ روپے
ملنے کا پتہ :- مجلس تحقیقات و نشریات اسلام دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی اس کتاب کے دو حصے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں' اس تیسرے حصہ میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی، سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا اور حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ مُنیری رحمہم اللہ تعالیٰ کے ——— سوانح حیات صفات و کمالات' تجدیدی و اصلاحی کارنامے پیش کئے ہیں اور ان بزرگوں کے منتسبین و تلامذہ کا تذکرہ اور تعارف بھی ملتا ہے!

یہ کتاب اپنے موضوع پر ہر اعتبار سے کامیاب دینی پیش کش ہے' حضرت خواجہ اجمیری کا تذکرہ بہت مختصر ہے مگر خواجہ نظام الدین اولیاؒ اور مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ مُنیری کے یکجا حالات اس قدر تفصیل و تحقیق کے ساتھ شاید ہی کہیں اور مل سکیں! متعدد ملفوظات تذکروں اور سوانح عمریوں سے جو مواد (MATTER) ملا ہے، اُسے فاضل تذکرہ نگار نے اس حسن و خوبی کے ساتھ پیش کیا اور اُن کی ترتیب کی ہے کہ علامہ شبلی نعمانی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

مولانا علی میاں نے یہ کتاب اس ارادے' نیت اور جذبہ و کوشش کے تحت مرتب کی ہے کہ صوفیائے کرام کے بارے میں جو چہ میگوسیاں لوگ کیا کرتے ہیں' اُن کا ازالہ ہو جائے اس لئے انھوں نے اپنی اس بیش قیمت تصنیف میں بتایا ہے کہ ان صُوفی بزرگوں کا علمی پایہ کتنا بلند تھا انھوں نے دین کی اصلاح و تجدید کا کیا کارنامہ انجام دیا؟ بادشاہوں کے سامنے وہ کس بیباکی کے ساتھ کلمۂ حق بلند کرتے تھے، اُن کے تقوی اور خشیتِ الٰہی کا کیا رنگ تھا، اور وہ اتباعِ سُنّت کا کس قدر اہتمام فرماتے تھے۔

حضرت خواجہ نظام الدین سماع سُنتے تھے مگر مزامیر سے سختی کے ساتھ منع فرماتے تھے:-

> "مجلس میں ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت سلطان المشائخ سے عرض کیا کہ ان دنوں بعض حاضر باش درویشوں نے ایک ایسی مجلس میں' جس میں چنگ و رباب اور مزامیر تھے، شرکت کی' اور رقص کیا فرمایا اچھا نہیں کیا' جو خلافِ شرع ہے وہ ناپسندیدہ ہے' اس پر ایک شخص نے عرض کیا کہ یہ لوگ جب باہر آئے اور لوگوں نے اُن سے کہا کہ یہ آپ نے کیا کیا اس مجلس میں مزامیر تھے، آپ نے سماع کس طرح سُنا اور رقص کیا؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم سماع میں ایسے مُستغرق تھے کہ ہمیں کچھ پتہ نہیں چلا کہ مزامیر ہیں یا نہیں؟ حضرت سلطان المشائخؒ نے سُن کر فرمایا کہ یہ جواب بھی کچھ نہیں، یہ بات تو ہر معصیت کے متعلق کہی جا سکتی ہے"۔

خواجہ صاحب نے فرمایا:-

"جب عورت کو نماز میں امام کو غلطی پر متنبہ کرنے کے لئے دستک دیتے وقت اس کی ممانعت ہو کہ

ہتھیلی پر ہتھیلی ماری جاتی کہ اس سے تالی کی آواز پیدا ہوتی ہے اور یہ لہو ہے، عجیب لہو و لعب ہے
اتنا پسند کیا ہے، تو سماع میں بطریق اولیٰ مزامیر کی ممانعت ہونی چاہیئے"۔

حضرت مخدوم شیخ شرف الدین منیری[1] رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال و ملفوظات کے جو اقتباسات دل نشین و رواں ترجمہ کے ساتھ اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں وہ دین و تقویٰ، اخلاق و ادب اور فضیلت کے شاہکار ہیں، انہیں پڑھتے ہوئے روح وجد کرتی ہے۔

"خواجہ نجیب الدین نے ان کو اطمینان دلایا کہ یہ معاملہ اشارۂ غیبی سے ہوا ہے، اور ان کی تربیت نبوت کی طرف سے ہوگی"۔ (ص ۱۹۶)

مگر صحابہ کرام، تابعین عظام اور ائمہ فقہ و حدیث کے حالات میں کہیں نہیں ملتا کہ فلاں کی تربیت نبوت کی طرف سے ہوتی تھی، تو علی میاں کو یا تو یہ بات نقل کرنی ہی نہیں چاہیئے تھی۔ اور نقل کی تھی تو اس کی صراحت ضروری تھی کہ نبوت کی طرف سے تربیت کس طرح ہوتی ہے؟ اور اس عقیدے اور تصور کی اصل کیا ہے؟

اس کتاب میں صوفیا سے وجد و بیخودی، تحیر و سرگشتگی اور مستی کی نسبتیں ملتی ہیں مگر یہی نسبتیں صحابہ کرام کے بارے میں سوء ادب ہیں! اس لئے صوفیا کرام کے حالات کے مطالعہ کے ساتھ سیرت النبی اور سیر صحابہ ضرور پیش نظر رہنے چاہئیں! کہ اصل نمونے وہ ہیں!

"۔۔۔۔ انہوں نے شیخ الاسلام شیخ فرالدین کا تذکرہ کیا، یہ سنتے ہی میرے دل کو بے اختیار کشش ہوئی اور ان کی محبت وارادات میرے دل میں ایسی بیٹھ گئی کہ مجھے ان کا نام لینے میں مزا آنے لگا، اور میں ہر نماز کے بعد مزے لے کر ان کے نام کی رٹ لگاتا"۔

نماز کے بعد تسبیح و تہلیل کی بجائے کسی بزرگ کے نام کو جپنا اور اس کی رٹ لگانا، خاصہ محل غور ہے۔

صفحہ ۵۲ پر بدایوں کے دریا کا نام "سوٹھ" (ٹ کے ساتھ) لکھا ہے، صحیح نام "سوتھ" ہے۔ (صفحہ ۵۴) "مجھے یہ سن کر بڑا ذوق آتا تھا"۔ "ذوق آنا" روزمرہ نہیں ہے ایسے موقعوں پر "لطف آیا" بولتے ہیں۔

صوفیا کرام کا تذکرہ اور مولانا علی میاں کا قلم، جگہ جگہ کاغذ پر ادب و انشا کے پھول مہکے ہوتے ہیں اور عرفان و روحانیت کی تجلیاں جھلملا رہی ہیں۔

مقالات سرسید (حصہ دوم)

مرتبہ:۔ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، ضخامت ۲۵۸ صفحات (خوش نما ٹائپ) قیمت:۔ دو روپے پچاس پیسے۔ ملنے کا پتہ:۔ مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور

یہ مقالات سرسید احمد خاں کے تفسیری مضامین سے عبارت ہیں، سرسید کوئی شک نہیں ملت کا درد اپنے اندر رکھتے تھے اور اسلام کی ترقی کے بھی خواہش مند تھے مگر ان پر "عقلیت" یعنی مسلک اعتزال کا غلبہ تھا، اس لئے انھوں نے قرآن پاک کی تفسیر میں جابجا جمہور مفسرین کے مسلک و عقائد سے ہٹ کر ایسی باتیں کہی ہیں، جن کی داد مغربی علماء یا تجدد پسند مغرب زدہ مسلمان تو دے سکتے ہیں، مگر قرآنی علوم میں بصیرت رکھنے والے مسلم ارباب فکر انہیں رد کر دیں گے ——— مثلاً:۔

وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ تَرْمِيهِم بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ ——— سے سرسید آفت، مصیبت اور چیچک کی وبا وغیرہ مراد لیتے ہیں، اور اسے درست نہیں مانتے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پرندوں کے غولوں نے پتھر کی کنکریاں اصحاب فیل پر پھینکی تھیں،

[1] عام طور پر لوگ "منیری" بروزن "امیری" بولتے ہیں، مگر اس کتاب سے معلوم ہوا کہ یہ لفظ ——— منیری ——— بروزن مُلتجی اور مُتمنی ہے۔

جن کے سبب وہ ہلاک و برباد ہوگئے! قرآن کریم میں "جن" کو ایک مستقل مخلوق کی حیثیت سے جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے مگر سرسید "جن" سے جنگلی اور وحشی انسان اور "انس" سے شہری انسان مراد لیتے ہیں!

سرسید نے "روح الامین" کو، جو فرشتہ تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک قرآن پہونچاتا تھا، "ملکۂ نبوت" سمجھا ہے —— وہ اسے بھی نہیں مانتے کہ حضرت ابراہیم ؑ کو درحقیقت میں آگ میں ڈال دیا گیا تھا اور حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں —— "کوئی نص صریح قرآن میں موجود نہیں ہے کہ وہ (حضرت مسیح ؑ) بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے" —— سرسید احمد خاں کی تفسیر کی یہ وہ لغزشیں ہیں جو صریحی طور پر دینی معتقدات کے خلاف ہیں، اور ہم اُن کی ایسی واہی تباہی باتوں سے نفرت اور بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔

سرسید اُردو زبان کے معماروں میں ہیں، مگر وہ بہرحال انسان ہیں، اُن کے قلم سے "ارواح" کی بجائے "ارواحوں" اور "سبح اور صبح" کی جگہ "سبح، وصبح" بھی نکل گیا ہے، صفحہ ۲۷ پر وہ لکھتے ہیں: —— "ان جاہلوں میں بیٹھ کر شیخی کرنے کو..." عام طور پر "شیخی مارنا یا شیخی بگھارنا" بولا جاتا ہے!

سرسید احمد خاں نے یہ بات بالکل صحیح لکھی ہے کہ ہمارے مفسرین فلکیات میں یونانی حکماء سے خاصے متاثر تھے، اور قرآن کریم میں جہاں کواکب و افلاک کا ذکر آیا ہے، اُس کی تفسیر میں اسی تاثر اور مرعوبیت کی جھلک ملتی ہے۔

روشن ستارے

از:- محمد یوسف اصلاحی، ضخامت ۱۰۴ صفحات، سرورق رنگین و دیدہ زیب!
قیمت ۷۰ نئے پیسے، ملنے کا پتہ:- مکتبہ الحسنات، رامپور

(حصہ اول) ہمارے بزرگوں نے علم دین کس شوق، محنت، ریاضت اور عقیدت و اخلاص کے ساتھ حاصل کیا اور کیسی کیسی مشقتیں برداشت کیں، اس کی دلچسپ تفصیل حکایت و تمثیل کے انداز میں ملتی ہے! کتاب کی زبان عام فہم ہے اور بچوں کی فہم اور نفسیات کے عین مطابق ہے۔

"ایک انصاری لڑکا میرا ہمجولی تھا۔" (ص۳۱) "ہمجولی" لغت کے اعتبار سے مذکر کے لئے بھی استعمال ہوسکتا ہے مگر عام طور پر یہ لفظ "سہیلی" کے معنی میں بولا جاتا ہے —— اس کتاب میں بھی "نہ ہی" (ص۵۸) لکھا ہوا ملا اور اسے پڑھ کر وجدان نے گرانی محسوس کی!

بچوں اور بچیوں کے لئے یہ کتاب ہر اعتبار سے مفید اور کارآمد ہے، مولانا محمد یوسف اصلاحی نے یہ نہایت ہی مفید سلسلہ شروع فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ اُن کے کام میں برکت عطا فرمائے! (آمین)

عثمان بطور

مصنف:- گوڈفرے لیاس - مترجم:- شاہد احمد دہلوی - ضخامت ۳۵۲ صفحات -
قیمت:- ایک روپیہ پچیس پیسے - ملنے کا پتہ:- نیشنل اکاڈمی ۹- انصاری مارکیٹ دریا گنج، دہلی

اس کتاب میں کمیونسٹ چین سے قازق مسلمانوں کی ہجرت کی داستان جو انتہائی دردانگیز ہے بیان کی گئی ہے! ان قازقوں کا آبائی وطن سنکیانگ ہے، یہ لوگ اشتراکی حکومت کے مظالم کی تاب نہ لاکر اپنے وطن سے قافلہ در قافلہ چل پڑے اور بے آب و گیاہ صحراؤں اور خوفناک دشوار گزار پہاڑوں کو طے کرکے کشمیر پہونچے، اس سفر میں نہ جانے کتنے مہاجرین مرکھپ گئے، عثمان بطور جدید قازقوں کا سب سے زیادہ مخلص اور قابلِ اعتماد رہنما تھا، اُسے بھی جامِ شہادت پینا پڑا۔

جناب شاہد احمد دہلوی نے ترجمہ میں بڑی مہارت، زبان دانی اور انشا پردازی کا ثبوت دیا ہے —— چند نمونے:-

"قازقوں کا سب سے مرغوب شوق شکرے سے شکار کھیلنا تھا، مگر ان کے شکاری پرندے، شکرے، بہری وغیرہ نہ تھے بلکہ شاہین جو دو دو فٹ اونچے ہوتے اور ان کے کھلے ہوئے پروں کی لمبائی چھ فٹ سے زیادہ نہ ہوتی، آسودہ حال قازق اور بہت سے ایسے بھی جو زیادہ آسودہ نہ ہوتے، شاہین کی آنکھوں پر ٹوپیاں چڑھائے، چمڑے کے لمبے دستانے پہنے، کلائی پر شاہین کو بٹھائے گھوڑوں پر سوار، زمین میں لگے ہوئے لکڑی کے اڈے پر کلائی ٹکائے، شکار کھیلنے نکلتے تھے۔"

"سورج نکلا ہی تھا کہ گھڑ سواروں کا ایک دستہ ہنستا بولتا روانہ ہوا اور شاہین کے مالک کے پیچھے ایک ٹیڑھی میڑھی قطار بنا کر پہاڑی راستے پر چل پڑا، پہاڑ کی تین چوٹیاں جو "تین بہنیں" کہلاتی ہیں کمر کمر سفید بادلوں میں چھپی ہوتی ہیں، ان کے سروں پر برف کے تاج دھرے ہیں ۔ ۔ ۔ !

بل کھاتے راستوں پر گھوڑے اپنے سواروں کو لئے چڑھے چلے جاتے ہیں اور کوئی من چلا گانے لگتا ہے، گانے کی آواز سنتے ہی شاہین اپنے آقا کی کلائی پر کچھ بے چین ہونے لگتا ہے، لیکن اس کی آنکھوں پر ٹوپی چڑھی ہوتی ہے اس لئے اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا کہ اڑ جائے، اس کے علاوہ اتنے دن سے مقید ہے کہ اُسے اپنے آقا پر بھروسا کرنا آگیا ہے، اس لئے وہ صرف یہ کرتا ہے کہ چمڑے کی کلائی پر وہ بیٹھا ہوا ہے اس پر اپنے پنجے زور سے جما دیتا ہے، اور زیادہ توجہ سے اپنے جسم کو سنبھالے رہتا ہے تاکہ گھوڑے کی جنبش سے اس کا جھونک نہ بگڑنے پائے۔"

"قازق نمائندوں کے نام قصیتین اور سلطان تھے، ان کے لباس عثمان بطور کے لباس سے ملتے تھے، فرق صرف یہ تھا کہ ارغوانی بھورے رنگ کی جو مخملیں ان کے سروں پر تھیں، ان میں پیر دل کے طرّے لگے ہوئے تھے، کیونکہ نعیمان قبیلے ان کا تعلق تھا اور ان کے ہاں اس کا رواج نہیں تھا، نمک کے چوڑے گردے پر لومڑی کی ملائم کھال کی گوٹ لگی ہوئی تھی، کانوں کو ڈھانکنے والے پاکھے ان تینوں مندوبوں نے نیچے اتار کر ٹھوڑی کے نیچے باندھ رکھے تھے، ان کے پھولدار ریشم کے چغے بھی ایک جیسے تھے، ان کے استر سمور کے تھے اور ان پر نفیس سوزن کاری ہوئی تھی، تینوں قازقوں کی ڈاب میں لمبی کٹاریں تھیں۔"

"عثمان اچھی طرح بڑا ہوتا چلا گیا" (ص۳۷) "اچھی طرح" اس جملہ میں کھٹکتا ہے۔ "جب دو شخص نہایت مقدس قربت میں منسلک ہو جائیں" (ص۶۲) یہ لفظی ترجمہ معلوم ہوتا ہے ـــ "وہ ایک عسیر المدت بادشاہت میں پہونچا" (ص۷) "عسیر المدت" کتنی نامانوس اور ساتھ ہی مبہم ترکیب ہے ـــــ "جس کے ساتھ احترامی سلوک کیا جاتا ہے" (ص۱۰۳) جس کے ساتھ باعزت سلوک کیا جاتا ہے" لکھنا تھا ـــــ "اس کا کچا گوشت بھوک بجھانے کے لئے لگتا رہے"۔ (ص۱۲۳) "بجھانا" پیاس کے لئے آتا ہے ـــ "اس ملاقات کے بعد سے ان دونوں کے مقدر ایسے ایک ہوئے کہ مرتے دم تک جدا نہیں ہوئے (ص۱۳۹)

"مقدر ایسے ایک ہونے" کی بجائے "ان دونوں کی قسمت کے ستارے ایسے ملے" ترجمہ کرنا تھا ـــــــ "اور کچھ تعداد دستی گولوں کی" (ص۱۸۱) "دستی بم" کی طرح "دستی گولوں" مانوس ترجمہ ہے ـــــــ "انہیں اپنے اصول ٹھکرانے لگے (ص۱۸۵) بُرا ترجمہ ہے ـــــــ "اتنی بڑی تعداد چونکہ کسی جانی پہچانی راہ سے نظروں پر چڑھے بغیر نہیں گزر سکتی تھی" (ص۲۳۹) "نظر پر چڑھنا" ان معنوں میں نہیں بولا جاتا۔ جن معنی اور مفہوم کی ترجمانی یہاں کی گئی ہے ـــــــ صفحہ ۲۷۷ پر "مُعَلّن" (Announcement) کے ل پر "تشدید" نظر آئی، یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے کیونکہ "معلن" "موثر" اور "مفکر" کے وزن پر نہیں، "مظہر" اور "منعم" کے وزن پر ہے۔

ہر کسی سے لکھنے پڑھنے میں سہو و تسامح ہو ہی جاتا ہے، "عثمان بطور" کوئی شک نہیں بڑی دلچسپ اور عبرت انگیز کتاب ہے، اور جناب شاہد احمد دہلوی نے اس کا بڑا رواں اور شستہ ترجمہ کیا ہے۔

حکمت بیدار

از:- کرم حیدری، ضخامت ۴۸ صفحات، قیمت :- ۵۰ پیسے۔
ملنے کا پتہ :- مکتبہ فیض الاسلام راولپنڈی۔

جناب کرم حیدری معروف قدرِی شاعر ہیں، اُن کی نظمیں دل کش اور پیغام انگیز ہوتی ہیں، "حکمتِ بیدار" اُن کی طویل نظم ہے، جو انجمن فیض الاسلام راولپنڈی کے انیسویں سالانہ اجلاس میں پڑھی گئی، اور لوگوں نے اسے پسند کیا۔ مکتبہ فیض الاسلام نے اس نظم کو اپنے اہتمام سے چھپوایا ہے۔

"حکمتِ بیدار" ایک ولولہ انگیز نظم ہے، جس میں شاعر نے اپنے دل کا سوز بھر دیا ہے، اس میں قوم کی غفلت، فرض ناشناسی اور خود فراموشی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ بڑا عبرت انگیز ہے! نظم میں جوش کے ساتھ روانی بھی پائی جاتی ہے ـــــــ چند منتخب اشعار:-

جس قوم نے بخشے ہیں زمانے کو خد و خال　　　ہے جس کا لہو غازۂ رُخسار مہ و سال
یہ قوم تو آغوشِ حوادث میں پلی ہے　　　یہ شمع سدا بادِ مخالف میں جلی ہے
ہے فکر غلط کوش، تخیل غلط اندیش　　　ہمت میں تذبذب ہے، ارادوں میں پس و پیش
ہر سختیِ حالات کو سہہ سکتے ہیں انساں　　　شیروں کے کچھاروں میں بھی رہ سکتے ہیں انساں
اپنا تو سفینہ ہے نہ دریا نہ کنارے　　　چلتے تو ہیں ہم بھی مگر اوروں کے سہارے
مٹی اسی جادو سے اُگلتی ہے سفینے　　　چلتے ہیں اسی سحر سے خشکی میں سفینے

دُوسرا رُخ :-

جھلسے ہوئے چہروں پہ ہیں مایوس نگاہیں　　　مایوس نگاہوں میں چھلکتی ہوئی آہیں　(ص۷)

نگاہوں سے آہوں کا کیا علاقہ! پھر اشکوں کی طرح آہوں کا محسوس طور پر چھلکنا، اس پر مستزاد!

حالات کی دہلیز پہ سر پھوڑتے انساں　　　افلاس کی آغوش میں دم توڑتے انساں

مصرعِ اولیٰ میں کس قدر تکلف اور آورد پائی جاتی ہے!

آئینۂ حیرت ہوئی ہر چشم تماشا!　　　اس قوم نے جب ایک نیا ملک تراشا

یہاں "تراشنا" بنانے کے معنیٰ میں ٹھیک استعمال نہیں ہوا۔ "تراشا" میں یہاں خفیف سا ذم بلکہ طنز بھی پائی جاتی ہے۔

اس خاک کا جو ذرہ ہے پامالِ ہوس ہے　　　ہر کنجِ چمن بے در و دیوار قفس ہے

شعر پُر تکلف ہے اور مصرعِ ثانی میں شاعر کا مافی الضمیر پوری ادا نہیں ہو رہا ہے۔

ان کی ہوسِ زر کا ٹھکانا ہی کہاں ہے — زر جیسے انہی کی ہے زمانہ میں جہاں ہے

بات بنی نہیں! ——— خیر! اور ہاں "زر" جو بالاتفاق مذکر ہے اُسے حیرت ہے کہ کرم حیدری صاحب نے مونث باندھا ہے شاید چاندی پر سونے کا قیاس کیا ہو۔

ہر مملکتِ دل پہ خیانت کی ہے شاہی — ہر چہرے پہ تابندہ ہے رشوت کی سیاہی

مصرعہ ثانی میں آورد کے سوا اور کیا دھرا ہے! اور یہ بھی مبالغہ ہے کہ پاکستان کے ہر شخص کے چہرے پر رشوت کی کالک لگی ہوتی ہے

ہر ایک یہی چاہے کہ ہو لوٹنے والا — نادار پہ بجلی کی طرح ٹوٹنے والا

پہلا مصرعہ خاصہ کمزور ہے! دوسرے مصرعہ میں تشبیہ ناقص ہے۔

ہو عدل میسر تو ہے ہر شخص فدائی — بے سود ہے ورنہ وطنیت کی دہائی

گنجلک شعر! سپاٹ اور بے مزہ بھی!

افلاک سے ہوتا تھا جنہیں بر سرِ پیکار — کرنا تھا جنہیں وقت کی نبضوں کو گرفتار

"نبضوں کو گرفتار کرنا" یہ کیا اندازِ بیان ہے۔

دنیا میں وہی لوگ ترقی کے ہیں حق دار — رہتے ہیں شب و روز جو دانش کے پرستار

دوسرا مصرعہ تو متشاعروں کے کہنے کا تھا!

داتا! ہمیں پھر دے وہ بصیرت کا خزینہ — کھو یا ہے جسے ہم نے تو یہ حال ہوا ہے

"داتا" اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو نہیں کہنا چاہئے، اور اس عقیدہ کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی سارے جہان کی فریاد نہیں سُنتا اللہ تعالیٰ ہی سے فریاد و دُعا کرنی چاہئے۔

"حکمتِ بیدار" کے یہ شعر کتنے حقیقت افروز اور دل نشین ہیں۔:

ایمان کی دولت کبھی غلامی میں سلامت — آزاد ہوتے ہیں تو یہ سرمایہ لُٹا ہے

آہیں ہیں کہ تپتے ہوئے صحرا کی ہوائیں! — آنسو ہیں کہ اک چشمۂ خونِ شہدا ہے

نصرۃ الحدیث

مولف:- مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن اعظمی ضخامت ۲۱۴ صفحات۔ قیمت:- دو روپے آٹھ آنہ، ملنے کا پتہ:- مفتاحی بک ڈپو ایجنسی، مئو اعظم گڑھ (یوپی - انڈیا)

نصرۃ الحدیث کا دوسرا ایڈیشن ضروری اضافوں اور جدید مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ یہ کتاب "فتنۂ انکارِ حدیث" کے رد میں لکھی گئی ہے اور اس موضوع پر کوئی شک نہیں بڑے معرکہ کی کتاب ہے۔ احادیث کے بارے میں منکرینِ حدیث جو وسوسے پیدا کرتے اور شوشے چھوڑتے رہتے ہیں۔ "نصرۃ الحدیث" میں اُن کو دفع کیا گیا ہے! ایک صاحب تھے "حق گو" (جو انتہائی لغو گو تھے ——— برعکس نہند نام زنگی کافور) نہ جانے زندہ ہیں یا مرگئے۔ مقبول احمد نام تھا۔ انگریزی حکومت کے ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر تھے اُن کے مضامین رسالہ "نگار" میں اب سے ۲۰ - ۲۵ سال پہلے چھپا کرتے تھے "حق گو" پوری طرح تجدد زدہ تھے۔ اور ان کا مسلک "انکارِ سُنّت" تھا۔ اُنھوں نے بعض احادیث پر جو اعتراضات وارد کئے ہیں اُن کی بڑے سلیقہ سے علمی انداز میں صاحبِ "نصرۃ الحدیث" نے تردید کی ہے اور حق گو کی لغو گوئی کی پول کھول دی ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اس کتاب کی تالیف پر اُمّتِ محمدیہؐ کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں، کتاب کی

زبان عام فہم مگر انداز عالمانہ ہے، مولوی محمد یوسف صاحب ناظم مدرسہ مفتاح العلوم کو بھی جن کی فرمائش پر یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ دارین میں اجر عطا فرمائے گا۔

ہمارے عائلی مسائل

از :۔ مولانا محمد تقی عثمانی، (اُستاد دارالعلوم کراچی) ضخامت ۲۵۰ صفحات (مجلد، رنگین سرورق) قیمت :۔ تین روپے ۷۵ پیسے۔

ملنے کا پتہ :۔ دارالاشاعت مولوی مسافر خانہ، کراچی ۱۔

اس کتاب میں پوتے کی میراث، تعدد ازدواج، احکام طلاق اور عمر نکاح کے مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور عائلی کمیشن میں دینی نقطۂ نگاہ سے جو خامیاں، کمزوریاں اور غلطیاں پائی جاتی ہیں، اُن کی نہ صرف یہ کہ نشاندہی کی گئی ہے، بلکہ اُن کے غلط ہونے پر عقلی و نقلی دلیلیں لائی گئی ہیں۔

پاکستان کے "عائلی قوانین" کو "منکرینِ سُنّت" نے سب سے زیادہ سراہا ہے، اور یہ کام دراصل انہیں کے کرنے کا تھا کہ وہ ہر اُس چیز کی تائید کرتے ہیں، جس سے دین کے تقاضے مجروح ہوتے ہیں۔ اس کتاب میں مولانا محمد تقی صاحب نے اس گروہ کے اربابِ فکر کے اعتراضات کا رد کیا ہے اور اُن کے معقول، مسکت بلکہ دنداں شکن جوابات دیئے ہیں۔

مولانا محمد تقی عالمِ دین اور جوانِ صالح ہیں، اس عمر میں اُن کے قلم میں کتنی پختگی اور اُن کی رائے میں کس قدر اصابت پائی جاتی ہے، اُن کا علمی اور دینی مستقبل بہت شاندار ہے، اور ہم اُن سے بڑی اچھی توقعات رکھتے ہیں۔

محبت

شبیر الحسن (ایم ۔ اے علیگ) ضخامت ۱۴۴ صفحات (مجلد) قیمت :۔ دو روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ :۔ پبلشنگ ہاؤس نورانی مارکیٹ بی ایریا، لیاقت آباد، کراچی۔

کتاب کے نام سے ایسا لگتا ہے کہ یہ کوئی "رومانی ناول" ہے، یا اس میں لوگوں کی تفریح و دلچسپی کے لئے عشق عاشقی کی باتیں بیان کی گئی ہیں! مگر کتاب ہاتھ میں لی اور پڑھنی شروع کی، تو شوق و دلچسپی بڑھتی چلی گئی، اور ہر صفحہ پر ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی زنگ آلود قلب پر صیقل کر رہا ہے! یہ کتاب تو اخلاق اور تزکیۂ نفس کا صحیفہ نکلی! اندازِ بیان دل نشین، خیالات پاکیزہ اور متوازن، فکر دینی اور صائب! ہر صفحہ منتخب شعروں سے مزیّن! جو لکھنے والے کی شاعرانہ خوش ذوقی کی زندہ شہادت ہے!

چند اقتباسات :۔

"خار و گل ایک ہی پودے سے نکلتے ہیں، ایک ہی چمن میں پرورش پاتے ہیں۔ ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں، لیکن ایک کی تاثیر چبھنا اور زخم پیدا کرنا ہے، اور دوسرے کی نظر کو خوش کرنا اور دل و دماغ کو معطر کرنا۔"

"نماز ادا نہ کرنا، گویا اپنی لذیذ ترین غذائے حیات سے منہ موڑتا ہے، اگر کسی کی جسمانی حیات بغیر تازہ ہوا کے قائم رہ سکتی ہے، روحانی زندگی بھی نماز کی پاکیزگی کے بغیر ناممکن ہے۔"

"مسئلہ تقدیر کو درمیان میں لانا راہِ فرار اختیار کرنا ہے، اور اگر تقدیر پر اعتقاد ہے اور یہ اعتقاد ہے بھی لازمی تو علامہ اقبال کے عقیدہ کو تسلیم کر لینا چاہیئے —

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

"جو خود اپنی نگاہ سے دوسروں کی تقدیر بدل دے، وہ خود تقدیر کا بہانہ کرکے ایمان سے ہاتھ دھولے، اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوسکتی ہے"۔

"ہمارے نمازی بھائی نماز تو پڑھتے ہیں، ذرا اس کو زبان سے اُتار کر دل تک پہونچادیں، ظاہر تو موجود ہی ہے، ذرا اس میں حقیقت بھی پیدا کرلیں، نماز پڑھیں نہیں بلکہ اس کو قائم کریں، صلوٰۃ کی حقیقت اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ میں پوشیدہ ہے، سب سے شدید اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں ہے تو ہر عمل کسی مشین کی حرکت ہے، قلبِ مومن کا فعل نہیں"۔

"جب اقامتِ صلوٰۃ کی نوبت آئے، تو تصور عالمِ احسان کے جمال سے منور ہو، تعمیلِ ارشاد کے اظہار کے لئے کمر خمیدہ ہو شدتِ محبت سے سر جمال کے قدموں پر ہو"۔

"عجزِ محبت اگر سجدۂ صلوٰۃ میں نہیں ہے، تو زمین جو مجسمہ عجز ہے، فوراً فتویٰ دے گی"۔

ع ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

"دُنیا دُنیوی منافع کے پیچھے دوڑ رہی ہے، مسلمان بھی اُس کے ساتھ بھاگا جارہا ہے، وہ نہیں دیکھتا کہ اُس کے مسلک کا اصل مقصود کیا ہے جب موت کی ٹھوکر لگے گی تو آنکھ کھل جائے گی، مادیت کا غلبہ ہے، رُوح کا تصور غائب ہے، عقیدہ کی حقیقت مفقود ہے"۔

پُوری کتاب کا یہی رنگ ہے! جناب ضمیر الحسن ایک صاحبِ دل مفکر اور انشاپرداز ہیں، وہ اب تک گمنام اور غیر معروف تھے، اُن کی یہ کتاب اُن کا بہت اچھا تعارف ہے! دین و اخلاق اور پند و نصیحت کی باتیں اس قدر شاعرانہ، ادیبانہ اور دل نشین انداز میں کم ہی سُننے اور پڑھنے میں آئی ہیں۔

میرے خوابوں کی سرزمین از:۔ صہبا لکھنوی۔ ضخامت ۲۳۲ صفحات (مجلد رنگین و مصور سرِ ورق) قیمت:۔ چار روپے
ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ افکار، رابسن روڈ، کراچی۔

مشرقی پاکستان اب سے دو سال پہلے پانچ مدیرانِ رسائل اور صحافیوں کا ایک وفد حکومت پاکستان کے اہتمام میں مشرقی پاکستان کی سیر و سیاحت کے لئے گیا تھا۔ جناب صہبا لکھنوی مدیر "ماہنامہ افکار" زیرِ تنقید کتاب کے مصنف کے علاوہ جناب رازق الخیری مدیر "عصمت"، جناب شریف المجاہد صدر شعبہ صحافت کراچی یونیورسٹی، جناب قیوم ملک مدیر انٹر پرائز، اور جناب ذاکر علی نمائندہ تعمیر راولپنڈی اس وفد کے ارکان تھے۔

اس وفد نے مشرقی پاکستان کے اہم مقامات کا دورہ کیا، اور دو ہفتے اپنے سفر کو مسلسل جاری رکھا۔ اُن کے سفر اور قیام و طعام کا ہر جگہ حکومت کی طرف سے آرام دہ اور قابلِ اطمینان انتظام کیا گیا، مشرقی پاکستان کے صحافیوں نے بھی اس وفد کی شایانِ شان پذیرائی کی۔ جناب صہبا لکھنوی نے اس سفر و سیاحت کے مشاہدات خاصے رواں اور دل نشین انداز میں قلمبند کئے ہیں، یہ سفر نامہ دلچسپ بھی ہے، اور ساتھ ہی معلومات آفریں بھی ہے، اس میں سندر بن کے جائزہ سے لے کر تاملی پیپر مل تک کی تفصیل ملتی ہے۔

ہر علاقہ اور شہر کے مختصر جغرافیائی اور تاریخی حالات ! ان مقامات کا تمدن ، تہذیب ! اُن کی خصوصیات ! آبادی پیداوار، صنعتوں اور بندرگاہوں کا بیان؟ کون سا قابلِ ذکر تعلیمی ادارہ کہاں؟ غرض معلومات کا سمندر ہے جو اس کوزے میں بند کر دیا گیا ہے ! چاٹگام کی بندرگاہ کا ذکر کیا ہے تو یہ تک لکھ دیا ہے کہ اس بندرگاہ سے سالانہ ۳۰ لاکھ ٹن سے زائد سامان کی باربرداری ہوتی ہے ۔

اس کتاب میں بعض دلچسپ مناظر اور تاریخی عمارتوں کے فوٹو بھی شامل ہیں، یہاں تک کہ مسجدوں کے فوٹوؤں کے ساتھ بُلبُل اکیڈیمی کے ایک رقص کی تصویر بھی اس کتاب میں نظر آئی ۔

اُردو اور بنگلہ ادب اور شعر و ادب کی مشہور شخصیتوں پر جو چند صفحات کتاب کے آخر میں شامل ہیں، انھوں نے اس کتاب کی علمی حیثیت کو بلند تر کر دیا ہے ۔

جناب صہبا لکھنوی کا یہ سفرنامہ[1] اُن کے خوابوں کی حسین تعبیر ہے توقع ہے کہ اسے قبولِ عام حاصل ہوگا ۔

انشا پردازوں اور صحافیوں کا یہ وفد جب مشرقی پاکستان کے دورے پر گیا ہے ، تو جنرل اعظم خاں اُن دنوں وہاں کے گورنر تھے ! دفد مذکوران سے بھی گورنر ہاؤس میں ملا ، اور مختلف مسائل پر تبادلہ خیال کیا ، جنرل موصوف کے یہ ارشادات کتنے حقیقت افروز ہیں

"۔ ۔ ۔ مادیت کے اس دور میں انسانی قدریں ختم ہو رہی ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کی اعلیٰ قدروں کو عام کیا جائے ، مشرقی پاکستان کے عوام عام طور پر مذہبی رجحانات رکھتے ہیں ، یہ ہمارے علمار کی کوششوں کا نتیجہ ہے ! اسلامی اثرات کے باعث عوام مصائب اور مشکلات کے دنوں میں حوصلہ نہیں ہارتے ، خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں ۔"

کاش ! ہمارے ادیب ، انشا پرداز ، صحافی اور خاص طور سے ادبی رسالوں کے ایڈیٹر "اسلام کی قدروں" کو عام کرنے کے لئے جد و جہد کریں ! اور وہ اپنے رسالوں کی فائلوں کا جائزہ لیں کہ انھوں نے اسلامی قدروں کی اشاعت کے لئے کیا کیا ! ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے اُن پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اور دین و دُنیا کے مابین اُنھوں نے کس توازن کو قائم رکھا ہے ۔

حدیثِ دل

از :- ڈاکٹر جسٹس ایس ، اے رحمٰن ۔ مرتبہ :- منشی عبدالرحمٰن خاں ، ضخامت ۲۶۸ صفحات (مجلد، سنہری ڈائی) قیمت :- پانچ روپے

ملنے کا پتہ :- مکتبہ اشرف المعارف ، پہلیک ، ملتان شہر ۔

اس کتاب کا پیش لفظ جو خاصہ طویل ہے جناب منشی عبدالرحمٰن خاں نے لکھا ہے ۔ جس میں انھوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ جسٹس رحمٰن سے اُن کی پہلی ملاقات کہاں ہوئی ، پھر وہ اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور وہ ہر بار کس محبت اور شفقت کے ساتھ پیش آتے ؟ یہاں تک کہ ؎

کلاہِ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید

اپنے اس مضمون میں فاضل مرتب نے جسٹس رحمان کے خطبات اور تقریروں کے اقتباسات پیش کر کے اُن کی اخلاقی خوبیوں کو اُجاگر کیا ہے ! منشی عبدالرحمٰن خاں نے نہ جانے کس کس اخبار اور رسالے سے یہ تحریریں اور تقریریں جمع کی ہیں ! جسٹس رحمٰن کو خوش ہونا چاہیے کہ اُنہیں اتنا مخلص اور محقق قدر شناس مل گیا !

[1] "ٹیلے پر سلطان بایزید بسطامی کا مقبرہ ہے" (ص ۱۳۱) جس طرح ملتان میں کوئی بزرگ شمس گزرے ہیں، جن کو لوگ "شمس تبریز" سمجھ بیٹھے، اسی طرح بایزید نام کے کوئی بزرگ چاٹگام میں مدفون ہوں گے ، یار لوگوں نے اُن کو "بایزید بسطامی" سمجھ لیا !

جسٹس رحمان شاعر ہیں، ادیب ہیں، قانون داں ہیں، مقرر اور مفکر ہیں! تعلیم و سیاست، مذہب و ادب، تاریخ و فقہ یہاں تک کہ ریاضیاتی منصوبہ پر بھی جسٹس موصوف نے اپنے افکار کا اظہار فرمایا ہے! ان خطبات میں موضوعات کی بڑی رنگا رنگی پائی جاتی ہے، خیالات نچے تلے اور باوقار ہیں!

لادینیت کے شیدائیوں کے مسلک اور مشہور مفکر میکیاؤلی کی تعلیمات کا کتنا حقیقت افروز تجزیہ کیا ہے ۔

"۔ ۔ ۔ مخالف نظریات کے حامیوں نے لادینیت کو بھی ایک دین کی تقدیس عطا کر دی ہے، اُن کے دین میں مملکت یا قوم خدائے قدوس کی جگہ لے لیتی ہے، اس دین کا سب سے مقتدر رسول اطالوی میکیاؤلی تھا۔ اس مذہب کے پجاری اخلاقی سطح پر اپنے مقصد کے حصول کے لئے ہر ذریعہ خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز اپنانے میں تامل نہیں کرتے درست یا نادرست کے کسی معروضی معیار کے مقابلہ میں سیاسی مصلحت ہی ان کے الہام کا سرچشمہ ہوتی ہے"۔

مذہب کی ہمہ گیری اور جامعیت پر کتنی قیمتی بات کہی ہے۔

"ہمارے عقیدہ کے مطابق مذہب کوئی لباس نہیں ہے، جسے مسجد میں داخل ہوتے وقت پہن لیا جائے، اور عبادت سے فراغت کے بعد سنبھال کر رکھ دیا جائے۔ ہمارے نزدیک مذہب ایک ضابطۂ حیات کا نام ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہماری تعلیم کا مقصود نہ تو لا مذہب فلسفیوں کی تخلیق ہے اور نہ تنگ نظر ذوق ہستی سے بے خبر زاہدوں کی اجارہ داری، اسلام نے روحانی اور مادی اقدار میں توازن قائم کیا ہے"۔

لسان العصر اکبر الٰہ آبادی کی شاعرانہ شخصیت پر ایک جملہ میں بہت کچھ کہہ دیا: ۔

"میری رائے میں اردو کے مزاحیہ ادب کی تطہیر میں وہ امام کا درجہ رکھتے ہیں"۔

"حدیثِ دل" ایک مفید، کارآمد بلند پایہ اور سبق آموز دلچسپ کتاب منظرِ عام پر آئی ہے، جس کا ہم خوش دلی کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔

معبودِ حقیقی

از: ۔ مولانا خالد محمود روپڑی، ضخامت ۱۶ صفحات، (رنگین سرورق) قیمت ۱۹ پیسے
ملنے کا پتہ: ۔ مکتبہ تنظیم متصل چوک دالگراں، لاہور۔

اس کتابچہ کے عنوانات حسب ذیل ہیں: ۔

تخلیق ـــ خالق ـــ اللہ اور ہم ـــ اللہ اور کائنات ـــ نظامِ کائنات ـــ ہم اور انصاف ـــ تکمیل انصاف ـــ نیکی بدی ـــ فاضل مصنف نے بڑے اخلاص کے ساتھ اپنے دینی افکار کو پیش کیا ہے، جن کے مطالعہ سے خالق اور مخلوق کے رشتہ اور تعلق کا احساس پیدا ہوتا ہے، یہی احساس اخلاق کی جا

ماہنامہ "نگار" رامپور

ایڈیٹر: ۔ اکبر علی خاں ۔ قیمت فی پرچہ: ۔ ۷۵ پیسے، سالانہ: ۔ دس روپے
ملنے کا پتہ: ۔ "نگار" رام پور (انڈیا)

پاکستان میں چندہ بھیجنے کا پتہ: ۔ نمائندہ نگار، ۶۱۷/N سمن آباد، لاہور۔

جناب نیاز فتحپوری کے پاکستان چلے آنے کے بعد، "نگار" کو ہندوستان میں بند ہو جانا چاہیے تھا، مگر جناب اکبر علی خاں نے

اس کو بند نہیں ہونے دیا، لکھنؤ کی بجائے رام پور اس کا مرکز اور مطلع قرار پایا "نگار" اسی سج دھج اور آن بان سے شائع ہو رہا ہے۔ خاص طور سے "غالبیۃ" کے عنوان سے غالب پر جو علمی نوادر اس پرچے میں آئے ہیں، انھوں نے "نگار" کو انفرادیت اور ممتاز خصوصیت کا حامل بنا دیا ہے!

"نگار" (رام پور) کا ادبی معیار شروع ہی سے بلند ہے اور روز بروز بلند تر ہوتا جا رہا ہے، اچھے درجے کے انشا پردازوں کا تعاون اسے حاصل ہے، اکبر علی خاں صاحب بڑے سلیقہ کے ساتھ اس مجلّہ کو مرتب فرماتے ہیں۔ توقع ہے کہ "قدیم نگار" کا حلقہ "جدید نگار" کو مل گیا ہوگا!

جلد: ۱۵
شمارہ: ۵

فاران کراچی

ایڈیٹر
ماہر القادری

ماہ اگست سنہ ۱۹۶۳ء

ترتیب

چندہ سالانہ سات روپے

مقام اشاعت
دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی

قیمت فی پرچہ باسٹھ پیسے

پرنٹر و پبلشر: مسرور حسین
مطبوعہ: مطبع سعید کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اول

نواب بہادر یار جنگ مرحوم خطیب اسلام تھے۔ قائدِ ملت تھے اور یہ خطابات ہر حیثیت سے اُن کو زیب بھی دیتے تھے۔ قیادت کی قبا اُن کے قدِ موزوں پر کتنی بھلی لگتی تھی، رئیس الاحرار مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد یہ دوسرا رہنما منظرِ عام پر آیا جس کے فکر و نظر خالص اسلامی اور جس کی زندگی دینی زندگی تھی! قائدِ اعظم کے تعارفِ عام اور مسلم لیگ کی ہر دلعزیزی کا نواب صاحب کی تقریر و خطابت اور شعلہ بیانی سے بڑا گہرا تعلق ہے، نواب صاحب مرحوم نے نظریہ پاکستان کی حمایت اور مسلم لیگ کی تائید اسلام کی محبت اور دین کی خیر خواہی کے جذبے کے تحت کی تھی۔

مسلم لیگ کا آخری اجلاس اسی شہر کراچی میں ہوا۔ یہ ۱۹۴۳ء کا واقعہ ہے، بہادر یار جنگ مرحوم نے کھلے اجلاس میں معرکہ آرا تقریر کی تھی، وہ اُن کی یادگار تقریر تھی: اُنھوں نے فرمایا۔

"اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہم پاکستان صرف اس لئے نہیں چاہتے کہ
مسلمانوں کے لئے ایک ایسی جگہ حاصل کر لیں، جہاں وہ شیطان کے آلۂ کار بن کر ان
دساتیر کافرانہ پر عمل کریں، جس پر آج ساری دنیا کاربند ہے
اگر پاکستان کا
یہی مقصد ہے تو کم از کم میں ایسے پاکستان کا حامی نہیں ہوں۔ ہمارے تصور کے مطابق
مجوزہ پاکستان ایک انقلاب ہوگا۔ اس کا قیام ملت کی نشاۃ ثانیہ کا موجب ہوگا،
یہ ایک حیاتِ نو ہوگی جس میں فراموش کردہ تصوراتِ اسلامی ایک مرتبہ پھر رو بہ عمل
لائے جائیں گے، ہندوستان کی سرزمین میں حیاتِ اسلامی ایک مرتبہ پھر کروٹ لے گی۔"

قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ، آج اگر زندہ ہوتے تو اُن کا دل یہ دیکھ کر لہو لہو ہو جاتا کہ پاکستان میں نہ تو ملتِ اسلامیہ کو نشاۃ میسر آئی، اور نہ یہاں اسلام کے بھولے ہوئے تصورات متشکل ہوئے اور نہ یہاں کی سرزمین میں حیاتِ اسلامی نے کروٹ لی!۔ ہندوستان کی تقسیم جب عمل میں آئی ہے، اُس وقت قوم دین سے جس قدر قریب تھی، پاکستان بننے کے بعد وہ دین سے دور ہوتی گئی، پاکستان کو قائم ہوتے اب سولہ سال ہو چکے ہیں، اس مدت میں فرنگی اخلاق کی وہ کون سی قدر ہے، جو جراحتوں سے محفوظ

"پلاننگ کمیٹی کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کے لئے عموماً اور مسلمانانِ پاکستان کے لئے
خصوصاً اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیمی و معاشرتی اور سیاسی نظامِ عمل مرتب کرے، تاریخ
عالم شاہد ہے کہ قوم کو عملی انقلاب سے گزرنا پڑتا ہے، تاریخی دنیا میں صرف محمدی انقلاب ہی

ایک ایسا تاریخی واقعہ ہے' جس نے ۲۳ برس کی قلیل مدت میں ان دونوں منزلوں کو طے کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مستقبل کے لائحہ عمل میں سب سے پہلا مقام تعلیمی نظام کو دیا جائے جس کی بنیاد کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ؐ پر ہو، جس نظامِ تعلیم سے گزرنے کے بعد مسلمان کا بچہ اسلامی نظام میں نشوونما پائے تاکہ وہ اپنی عملی زندگی میں ملتِ اسلامیہ کی صحیح خدمت انجام دے سکے "۔

مگر

اے قائدِ ملت اور لسان الامت ! پاکستان کا تعلیمی نظام انگریز کے طرزِ فکر پر بدستور چل رہا ہے' یہاں اس انداز پر سوچا نہیں گیا کہ نئی نسل کو ملتِ اسلامیہ کی خدمت کے لئے تیار کرنا ہے ۔ اخلاقی تربیت کے لئے یہاں ایک قدم بھی نہیں اٹھا گیا ۔ اس ذہنی غلامی اور افلاسِ فکر و نظر کی کوئی حد ہے کہ سولہ سال کی مدت ہونے کو آئی مگر ابھی تک انگریزی زبان جو دورِ غلامی کی سب سے نمایاں یادگار ہے' ہماری درسگاہوں پر مسلط ہے ، ہمارے اسکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ماحول پر مغرب چھائی ہوئی ہے : اسلام نے کس سختی کے ساتھ ، نامحرم مرد و زن کے اختلاط اور ایک دوسرے سے ملنے جلنے سے روکا ہے مگر پاکستان میں جوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے تعلیم کے نام پر یکجائی کے مواقع اور سہولتیں مہیا کی گئی ہیں ، اس مخلوط تعلیم کے اخلاقی اعتبار سے جو بھیانک نتائج سامنے آ رہے ہیں ، وہ ایک غیرت مند اور حساس ذہن کے لئے سخت اذیت کوش اور تکلیف دہ ہیں ! یورپ مرد و زن کے اسی بیباکانہ اختلاط اور آزادانہ میل جول کے سبب چکلا اور قحبہ خانہ بن چکا ہے ، پاکستان بھی اسی پستی کی طرف جا رہا ہے

؎ ڈر ہے خبرِ بد نہ مرے منہ سے نکل جائے

اور

نظامِ تعلیم کی یہ خرابی اسی حد پر جا کر ختم نہیں ہو جاتی ، پاکستان کی درسگاہوں میں ناچ گانے اور ڈراموں کے ذریعہ بداخلاقی ، بے حیائی اور فحاشی کی باقاعدہ ترویج ہو رہی ہے ! جن بچیوں کی زندگیوں میں عائشہ ؓ اور فاطمہ ؓ کے مقدس کردار کی جھلک پیدا ہونی چاہئے تھی ، انہیں دیوکارانی اور گریٹا گاربو بنایا جا رہا ہے ! یہ اتنی دردناک ٹریجڈی ہے کہ اس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے ۔ رسم الخط کا مسئلہ ہو یا پاکستان کی قومی زبان کا معاملہ ، فرنگی گوروں کے دماغ سے ان پر غور کیا جاتا ہے ! ایک طرف ملک میں عیسائیت کو فروغ ہو رہا ہے ، دوسری طرف انگریزی تہذیب کی ہمت افزائی کی جا رہی ہے ، دس بارہ سال اسی عالم میں اور گزر گئے ، تو پاکستان میں محمد عربی ؐ کے لائے ہوئے اسلام کی جگہ مصطفےٰ کمال اور بورقیبہ کا "اسلام" غلبہ حاصل کرے گا ، اور کرسٹانوں ، مجوسیوں اور یہودیوں کی تہذیب یہاں کی سوسائٹی پر چھا جائے گی ! خدا نہ کرے کہ ایسا ہو ، اس کے تصور سے خدا جانتا ہے دل کو بڑا دکھ ہوتا ہے مگر آثار و علائم کو کیا جائے کہ وہ ہوا کا کچھ اور ہی رُخ بتا رہے ہیں ۔

"اسلام کا آفتاب دنیا کے اُفق پر اُس وقت طلوع ہوا ۔ جب انسانیت ایک طرف بہیمیت و افلاس سے دوچار تھی ، تو دوسری طرف نام نہاد پیشواؤں نے مذہب کو آلۂ کار بنا کر نوعِ انسانی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے اور خود ساختہ اصول کے تحت اعلیٰ و ادنیٰ کا امتیاز قائم کر رکھا تھا ، شہنشاہیت اور سرمایہ داری کا دور دورہ تھا ، محمد رسول اللہ ؐ نے بیک جنبش لا الٰہ الا اللہ کی ایک ہی ضرب سے باطل کا طلسم توڑ دیا ، توحید نے کفر و طغیان کی

عماروں کو کلمۂ واحد میں مسمار کر دیا۔ اور ان غاروں کو پاٹ دیا، جو افلاس و نکبت نے انسانی معاشرے میں پیدا کر دیئے تھے۔ اور انسانیت کو ایک سطح پر لا کھڑا کیا۔ محمد عربی کی محفل میں بلال حبشی ہمدوش ابوبکر اور عمار یاسر ہم نشین عمر ابن خطاب نظر آتے ہیں۔ امتناع سود سے سرمایہ داری کی جڑیں کٹ گئیں۔ توریث کے قانون نے اکتناز کے راستے روک دیئے، زکوٰۃ کے ذریعہ جمع شدہ دولت تقسیم کر دی گئی۔ جمع مال کی مذمت اور انفاق فی سبیل اللہ کی تلقین نے عہد رسالت کے آخری ایام میں مدینہ منورہ کو مسکین کے وجود سے خالی کر دیا گیا۔"

مگر

ستان میں "لاالٰہ الا اللہ" کے ربانی تیشہ سے کسی بت کو گرانے کا کوئی کام نہیں لیا گیا۔ یہاں سود پر کلب گھروں اور گھوڑ دوڑ کی ارباز ی پر کوئی پابندی نہیں، یہاں بدکاری کو تعزیری جرم ہی نہیں سمجھا جاتا، پاکستان کے شہروں کے گلی کوچوں میں بھکاری ر جگہ دکھائی دیتے ہیں، غریبوں کے دکھ درد کا قصر نشینوں کو کوئی احساس ہی نہیں ہوتا، رشوت کی یہاں وہ گرم بازاری ہے کہ ب تک مٹھی گرم نہ کر دی جاتے، سرکاری محکموں میں شنوائی ہی نہیں ہوتی، پرمٹوں اور لائسنسوں پر متعلقہ عہدیدار وں کے فی صدی حقوق" مقرر ہیں اور روپیہ کمانے، دولت بٹورنے اور ہر جائز و ناجائز طریقے سے سرمایہ جمع کرنے اور اپنے رشتہ داروں بلند و بالا عہدوں سے فائدہ اٹھانے کا سلسلہ نہ جانے کہاں کہاں پہونچتا ہے! دولت کمانے کا جب کسی کو استغنا ہو جاتے تو ہر تجارت اور کاروبار کے نام پر "جرائم" سرزد ہوتے ہیں!

اس مرد مجاہد نے مسلم لیگ پنڈال کے اسٹیج سے اس جرات، دلیری اور ایمانی عزیمت کے ساتھ صدائے حق بلند کی

"اسلام کی بنیاد وجود باری کے عقیدے پر رکھی گئی ہے، اگر مسلمان اس عقیدے سے بیگانہ ہے، تو وہ اسلام سے خارج ہو رہا ہے، میں اس پلیٹ فارم سے اعلان کرتا ہوں کہ وہ لوگ ہمارے پنڈال سے اٹھ جائیں۔ جو خدا کے انکار پر معاشی نظام کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ مجوزہ پلاننگ کمیٹی جب پاکستان کے لئے معاشی نظام مرتب کرے گی۔ تو اس کی بنیاد قرآنی و اسلامی نظام معاشی پر ہو گی۔"

مگر

ستان کی زمام اقتدار جن کے ہاتھوں میں رہی ہے، انھوں نے زندگی کے کسی مسئلہ کو اسلامی نقطۂ نگاہ سے کم ہی سوچا ہے۔ اس طرف ی خدا کے بندے کا شاذ و نادر ہی دھیان گیا ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے اور اسلام کے لئے وجود میں آیا ہے، اس لئے ہاں سیاست و معاشرت اور تجارت و حکومت کا ہر مسئلہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے حل ہونا چاہیئے، اسلامی نظام افلاطون کی یاست کی طرح کوئی خیالی ریاست (UTOPIAN STATE) نہیں ہے کہ جس کا وجود صرف ذہن و خیال میں پایا جاتے اور رعملی دنیا میں اسے برتا نہ گیا ہو۔ اسلامی قانون صدیوں مسلمان حکومتوں کے معاملات کی بنیاد رہا ہے اور ملوکیت کے گونا گوں تاسد کے باوجود اسلامی قانون نے طہارت فکر اور پاکیزگی عمل کے امکانات کو باقی رکھا ہے، ہمارے سامنے خلافت راشدہ کی معیاری دست ہو کہ جس سے بہتر حکومت کا تصور نہیں کیا جا سکتا، یہ نمونہ پیش نظر ہے تو پھر کسی دوسرے نظام سے روشنی اور ہدایت

لینے کی ضرورت ہی نہیں !

لیکن

اس کام کو وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں، جو اس بات کا احساس اور خوف رکھتے ہوں کہ قیامت کے دن اُن کے اعمال پر محاسبہ ہوگا اور جن کی ذمہ داریاں جتنی زیادہ ہونگی، اتنی ہی اُس کی جواب دہی سخت ہوگی، ذمہ داریوں کے اس احساس اور محاسبۂ آخرت کے خوف سے مسلمانوں کے اکابر اور مشاہیر نے حکومت کے عہدے اور منصب قبول کرنے سے گریز کیا ہے اور جب یہ ذمہ داری اُن کے سر آپڑی ہے، تو نفس کی تمام لذتوں کو قابو میں رکھ کر اپنے فرائض کو اس طرح انجام دیا ہے کہ آج تک سیاست و حکومت اور عدل و انصاف میں اُن کے کارنامے مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں ——— لیکن جہاں حکومت کرنے کی بے پناہ ہوس پائی جاتی ہو، کرسیوں پر جمے رہنے کے لئے توڑ جوڑ اور سازشیں کی جاتی رہی ہوں، زندگی کا مقصد اور غرض و غایت ہی منصب و عہدہ کا حصول ہو، وہاں اس کی توقع رکھنا ہی فضول ہے کہ اسلام کے کسی تقاضے کو پورا کرنے کے لئے کسی قسم کی جدو جہد کی جائے گی، اگر اس راہ میں کوئی قدم اٹھا بھی ہوگا، تو اُس کے دو سبب ہونگے ——— پبلک کا دباؤ یا پبلک میں ہر دلعزیزی حاصل کرنے کا داعیہ !

لسان الامت قائد ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم نے قائد اعظم کو خاص طور سے خطاب کرکے فرمایا :—

"قائد اعظم ! پاکستان کے متعلق میرا اپنا تصور یہ ہے، اور اگر آپ کا پاکستان یہ نہیں ہے تو ہمیں کسی پاکستان کی حاجت نہیں "

اس پر قائد اعظم نے مسکرا کر کہا ——— " آپ مجھے قبل از وقت چیلنج کیوں دیتے ہیں " ——— بہادر یار جنگ تقریر جاری رکھتے ہوئے بولے :—

"نہیں قائد اعظم ! میں آپ کو چیلنج نہیں کر رہا ہوں، میں اس استفسار کے ذریعے آپکے عوام کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ آپ کے پیش نظر وہی پاکستان ہے، جس کا اس وقت اجمالی تصور پیش کیا گیا ہے ——— برادرانِ ملت ! یاد رکھئے کہ پلاننگ کمیٹی آپ کے لئے جو دستور و سیاسی نظام مرتب کرے گی، اُس کی بنیادیں کتابُ اللہ اور سُنّتِ رسول اللہ پر ہونگی، سُن لیجئے اور آگاہ ہو جائیے کہ جس سیاست کی بنیاد پر کتابُ اللہ اور سُنّتِ رسول اللہ پر نہیں ہے، وہ شیطانی سیاست ہے، اور ہم اس سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

اور

پاکستان میں یہاں کے دستور و قانون اور سیاسی نظام کو کتابُ اللہ اور سُنّتِ رسول اللہ سے دور رکھنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں اور جو چالیں چلی گئی ہیں، اُس کے تصور سے غیرتِ ایمانی پسینہ پسینہ ہو جاتی ہے ! نواب بہادر یار جنگ نے جس شیطانی سیاست سے خدا کی پناہ مانگی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ شیطانی سیاست ۔ ۔ ۔ ! آہ ! کیا کہیں کس سے کہیں، یہ زخم کسے دکھائیں، یہ داغ کس کے پاس لے جائیں ۔ "صاحب لوگوں" کی بزمِ نازو نوش میں "مُلّاؤں" کی سنتا کون ہے ؟

نواب صاحب مرحوم نے آخر میں فرمایا :—

"میں آپ کی توجہ اس امر کی جانب خصوصیت کے ساتھ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ پاکستان کا مطالبہ کرکے آپ ایسا مُلک چاہتے ہیں، جس میں پاک لوگ بستے ہوں، جو خیالات کے

لحاظ سے افکار کے لحاظ سے اور اعمال کے لحاظ سے پاک ہوں، میرے دوست! جسمانی
ناپاکی دور ہو سکتی ہے، لیکن ذہن و فکر اور قول و عمل کی ناپاکی وہ گندگی ہے، جس کو دور کرنے
کے لئے خدا نے انبیا جیسی ہستیاں پیدا کیں۔ ناپاکیوں میں آلودہ ہو کر جھوٹ کو اپنا شعار
بنا کر، مکر و فریب میں مبتلا رہ کر ظلم و استبداد کو جاری رکھ کر کیا اپنی پاکبازی اور پاکدامنی کا
دعویٰ کر سکتے ہیں؟ ان گندگیوں سے آلودگی کے باوجود اگر ہمیں ہندوستان کے دونوں شمالی
گوشوں میں خود مختار حکومت بھی حاصل ہو جاتے، تو کیا وہ پاکستانی کہلانے کی مستحق ہو سکے گی؟"

ملت بہادر یار جنگ مرحوم نے پاکستان کے بارے میں جس اندیشہ کا اظہار کیا تھا، اور جو باتیں اُن کے دل میں کھٹکی تھیں وہ واقعہ
کر رہیں، قول و عمل اور ذہن و فکر کی وہ کون سی گندگی ہے، جو اس پاکستان میں نہیں پائی جاتی! انگریز کے دور حکومت کی
م اخلاقی برائیاں بدستور باقی رہیں بلکہ اُن میں کئی گنا اضافہ ہو گیا، انگریز کے زمانے میں مسلمان عورت کا سگرٹ تک پینا
یوب سمجھا جاتا تھا، مگر پاکستان میں کتنی بہت سی عورتیں ہیں، جو خلوت میں نہیں جلوت میں شرابیں پیتی ہیں، نہ خدا کا خوف
بندوں کی شرم، ان کم بختوں کے دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے!

انگریز اپنی شہنشاہی طاقت اور اسلام دشمنی کے باوجود مسلمانوں کے فقہی مسائل میں دراندازی، اور اُن کے عائلی قوانین میں
ل بدل کرنے کی جرات نہ کر سکا۔ مگر پاکستان میں کتاب و سنت کے (معاذ اللہ) علی الرغم عائلی قوانین مرتب و نافذ کئے گئے! ان
ائین نے اُن عورتوں کی جرائتیں بڑھائی ہیں جو اسلام کے حدود غیرت و حجاب توڑنے کو اپنی زندگیوں کا بہت بڑا کارنامہ سمجھتی
ں! اور وہ علماء اور ارباب فکر جو عائلی مسائل میں کتاب و سنت کے صحیح تقاضے سامنے لاتے ہیں اُن کو یہ "میم صاحبات"
نیاں سُناتی ہیں! انگریز کے زمانے میں جب "شاردا بل" پیش ہوا تھا، اور علماء نے اس کی مخالفت کی تھی، تو اس وقت کسی آزاد
ا مسلم خاتون کو اس غیر اسلامی "بل" کی حمایت اور علماء دین کی مخالفت کی جرأت نہ ہوئی تھی، مگر پاکستان میں یہ "اپوا
دیاں" کتاب و سنت کے صریحاً مخالف قانون کی حمایت میں پورا زور صرف کر رہی ہیں!

اسلام کا ضابطۂ اخلاق یہ ہے کہ فریضۂ حج کے ادا کرنے کے لئے بھی عورت تنہا یا غیر محرم کے ساتھ سفر نہیں کر سکتی، اس
قدس سفر میں محرم کی ہمراہی ضروری ہے، مگر پاکستان میں مسلمان عورتوں کے ڈیلی گیشن دوسرے ملکوں میں جاتے رہتے ہیں۔
بمبئی میں کرکٹ میچ ہوتا ہے، تو کھیل تماشے کی شوقین عورتوں کی ٹولیاں بمبئی پہونچتی ہیں!

روس ہو، جاپان ہو، انگلستان اور فرانس یا امریکہ اور جرمنی ہوں، ان ملکوں کا پورا ماحول اخلاقی اعتبار سے انتہائی گندہ
ر ناپاک ہے، سر راہ بوس و کنار، پارکوں میں مرد و زن کا جسمانی اتصال و اختلاط، شراب فروشی، قمار بازی، ننگے کلب، ایک [illegible]
ا اور اجنبی مرد و عورت کا شب گزارنے کے لئے یارانہ ہو گیا ——— تصور کیجئے کہ ایسے معصیت آلود ماحول میں عورتوں کا
یا تنہا جانا، وہاں کے ہوٹلوں میں ٹھیرنا، پارکوں اور تماشا گاہوں کی سیر کرنا، کلب گھروں اور رقص خانوں کی تفریحات میں
حصہ لینا کتنا خطرناک ہے ان تمام بے اعتدالیوں اور بے باکیوں کے بعد بھی کوئی اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ عورت کا کچھ نہیں
بگڑتا اور اُس کی عصمت اچھوتی رہتی ہے، تو ایسا شخص یا تو عقل و شعور سے بالکل کورا ہے اور یہ بات نہیں ہے تو وہ اپنی فطرت کے
زاج سے "قرمساق" بن چکا ہے!

خود ہمارے ملک پاکستان میں کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے، کالجوں کے لڑکے اور لڑکیوں کی پارٹیاں پکنک پر جاتی ہیں اور وہاں

طرح طرح کی خوش فعلیاں کرتی ہیں، ضرورت مندوں اور مصیبت زدوں کی امداد و اعانت کے لئے فلم ایکٹرسوں کے کرکٹ میچ ہوتے ہیں، اور اس طرح "کارِ خیر" کے جذبہ کو بھی ہوا و ہوس سے ملوث کیا جاتا ہے! کہیں "گرلز گائیڈ" کا فتنہ ہے اور کسی جگہ "ثقافت" کے نام پر ناچ گانے کی لغویتیں اور فسوں کاریاں ہیں! اس طوفانِ بدتمیزی کو روکنے کے لئے کوئی تدبیر نہیں کی جاتی بلکہ اس کے برعکس ان بداخلاقیوں کو شہ دی جاتی ہے، اسکیم یہ معلوم ہوتی ہے کہ ملک کی تمام فضا اور پورے ماحول کو رنگین اور سیاہکار بنا دو تاکہ اسلام اور اخلاق کے نام پر کسی احتجاج کا کوئی امکان ہی سرے سے باقی نہ رہے! جس طرح یورپ کے حاکموں اور فرمانرواؤں کو وہاں کے عوام کسی اخلاقی لغزش اور بدکاری پر نہیں ٹوکتے کہ یہ گندی باتیں ان کی نگاہ میں بری نہیں رہیں، اسی طرح پاکستان کے عوام کا طرزِ فکر بدل جائے، تاکہ پاکستان کے قصر نشینوں کے بارے میں وہ کچھ سوچ ہی نہ سکیں اور "اخلاق و پاکیزگی" کے نام پر احتجاج اور واویلا کا کھٹکا ہی باقی نہ رہے!

اللہ تعالیٰ کے فضل سے ابھی تک پاکستان میں ایسی عورتوں اور مردوں کی غالب تعداد پائی جاتی ہے، جو اسلامی اخلاق سے محبت کرتے ہیں اور یہاں کے معاشرے کو نیک اور پاکیزہ دیکھنے کے آرزومند ہیں، اور مغربی تہذیب و تمدن کو جو ناپسند کرتے ہیں مگر چند سال اگر اسی حالت میں اور گزر گئے، تو کمیونزم، الحاد، عیسائیت اور مغربی زندگی کے فتنوں کے آگے اسلامی قدریں دب کر رہ جائیں گی اور پھر یہاں اسلامی نظامِ حکومت کے قیام کے لئے کوئی امکان باقی نہیں رہے گا، اور نہ اس وقت معاشرے کی اصلاح کے لئے کوئی تدبیر کارگر ہو سکے گی! ترکی اور مصر و ایران کی زندہ مثالیں ہمارے سامنے ہیں، وہاں قبائے اخلاق و پاکیزگی اس انداز پر تار تار ہوئی ہے کہ اس کی رفوگری بہت دشوار نظر آتی ہے۔

اس طوفانِ ہوا و ہوس اور سیلابِ فحش و منکر کے روکنے کی ایک ہی تدبیر ذہن میں آتی ہے کہ کسی "منکر" کو متعین کر کے اس کے مٹانے کے لئے پوری تیاری کے ساتھ جدوجہد کی جائے۔ جب اس میں کامیابی ہو جائے تو پھر دوسرے "منکر" کو لیا جائے، اس طرح ایک ایک کر کے منکر و فحشا کا قلع قمع ہوتا جائے گا، اور قیامِ معروف کے لئے راہیں نکلتی آئیں گی! اور یہ جزوی انقلاب ہی ان شاء اللہ العزیز "کلی انقلاب" بن جائے گا۔ یہ انقلاب بارود دھاڑ کا انقلاب نہیں سلامتی پاکیزگی اور امن و نیکی کا انقلاب ہوگا "منکر" کی حفاظت اور مدافعت کے لئے بدکار اور آزاد پسند لوگ، اہلِ حق کا زیادہ دن تک مقابلہ نہیں کر سکتے، نیکی کے سامنے بدی ٹھہر ہی نہیں سکتی، بشرطیکہ بدی کو مٹانے اور نیکی کو قائم کرنے کے لئے جدوجہد کی جائے!

ماہر القادری
۲۷ جنوری سنہ ۶۳ء

کعبۃ اللہ شریف قبلہ اوّل و آخر

(از مولانا سید مقصود علی خیرآبادی - پروفیسر آدم جی کالج کراچی)

رُوئے زمین کا برگزیدہ اور مقدس ترین گھر یہی کعبۃ اللہ شریف ہے اسی کے زیر سایہ مکہ شہر میں پہلی انسانی تربیت گاہ اور اسلامی یونیورسٹی ہے۔ یہی قبلۂ عالم ہے۔ یہی دار الامن ہے اور دار الاحترام ہے۔ یہی آسمانی افواج کا ابتدائی اور انتہائی پڑاؤ ہے۔ یہی حکومتِ الٰہیہ کا پایۂ تخت ہے۔ اسی کے تحت دنیا کی آبادی ہے۔ اس کی سلامتی دنیا کی سلامتی ہے اور اس کی بربادی سے دُنیا کی بربادی ہے۔ دُنیا پہ قیامت جب ہی آئے گی۔ جب یہ گھر دُنیا میں باقی نہیں رہے گا۔ اسی لئے ان مُستند دلائل اور روایات کے تحت اسی گھر اور اسی شہر سے انسانی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ اسی گھر اور اسی شہر کے اردگرد تاریخی شعائر اللہ اور حرمات اللہ کے یقین آفریں و خرد افروز مقامات ہیں۔ قرآن حکیم کی روشنی میں مندرجہ بالا روشن ترین خدوخال روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ قرآن مجید میں اس مقدس گھر کے متعدد نام ہیں۔ اور ہر نام ہر حیثیت سے اس بلند و بالا مرتبہ کا شاہد حال ہے۔ اس مقدس گھر کا نام "بیتُ اللہ الحرام" بھی ہے لفظ "حرام" اس کی ابتدائی اور انتہائی حرمتوں پر دال ہے۔ رُوئے زمین پر کوئی مقام ایسا نہیں ہے۔ جو اس جیسی حرمتیں رکھتا ہو۔ مکی عظمتوں اور حرمتوں سے مالا مال یہی گھر اور یہی شہر ہے کوئی اور نہیں۔ اس گھر کا دوسرا نام "بیت اللہ العتیق" بھی ہے۔ اور عتیق کے معنی آزاد اور قدیم کے ہیں تو اس گھر کی زمین روئے زمین کی نمود اول ہے۔ اور اس کی آبادی دنیا کی آبادی سے پہلے ہے اور دنیا کے معبدوں میں سب سے پہلا معبد یہی ہے۔ آسمانی کتابیں کہتی ہیں کہ آدم و حوا اور حضرت ابراہیمؑ کی مرکزی تعلیمات کا گہوارہ یہی بیت اللہ العتیق اور شہر بکہ یا مکہ ہے اور بیت اللہ العتیق ہی مقصد تخلیق عالم ہے۔ تاکہ صحیح معارف علمیہ سے کائنات کے نبی جان و انس خالق کائنات کو پہچانیں اور اس گھر کے نوافل کے ذریعہ جنت سے نکلنے کے بعد پھر جنت میں پہونچ جائیں۔

بنائے کعبہ بدستِ آدمؑ اسی مقصد تخلیق کے لئے آدم و حوا جنت سے نکلے اور سرگرداں زمین پر ہر طرف پھرتے رہے تا آنکہ بحکم قضا و قدر اس بیت اللہ کی زمین پر پہونچ گئے اور اولین معمار بیت اللہ بننے کا شرف پایا۔ یہیں توالد و تناسل سے پہلی انسانی آبادی اور پہلی دینی و دنیوی تعلیم گاہ بنی۔ اور حضرت آدمؑ پہلے خلیفۃ اللہ فی الارض قرار پائے اور اس اسلامی یونیورسٹی میں پہلا اسلامی درس "لا الٰہ الا اللہ" سے شروع ہوا کہ جن و انس اور ساری کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ ہم سب کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اور ہم کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ کائنات کی ہر چیز اس کے خالق ہونے کی دلیل ہے۔ اور اس ذات کے سوا ہر چیز محتاج اور لاچار ہے معبود بنانے کے قابل نہیں ہے۔ یہ کلمۂ نجات ہے اور کلمۂ توحید ہے اور ہر قسم کے شرک کی اس میں کاٹ ہے۔ شرک سے ابدی جہنم ملتی ہے اور ایمان سے ابدی جنت! عہد موسیٰ میں کتاب توراۃ کے اندر پہلا بڑا باب کتاب پیدائش کا ہے۔ اور بڑی شرح و بسط سے پیدائش کائنات سے کائنات کے پیدا کرنے والے پر استدلال ہے۔ اور قرآن مجید چونکہ فصاحت و بلاغت میں معجزہ ہے اس لئے سورۂ فاتحہ میں باب پیدائش کو دو لفظوں میں ختم کیا ہے۔ مگر

پائیں ہم اس کے مقابلہ میں کتاب توراۃ کی شرح و بسط اور تفصیلات ناتمام ہیں۔ اور وہ دو لفظ "رَبِّ الْعَالَمِيْنَ" ہیں کہ دنیا جہان اور تمام عالموں کا پیدا کرنے والا اور رکھوالی کرنے والا اللہ ہے۔ اور حمد و ثنا کا استحقاق صرف اسی کو ہے۔ یعنی معبود صرف وہی ہو سکتا ہے اور کوئی شے اس قابل نہیں ہے۔ عہد نوحؑ میں اصحاب سفینہ کے سوا سب مشرک ہو گئے تھے اس لئے ان کو پوری دنیا دیدی گئی اور جملہ مشرکین کو ختم کر دیا گیا۔ طوفان نوحؑ کے وقت حضرت نوحؑ کی بد دعا یہ تھی۔

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ دَيَّارًا ○ إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ○

اے پروردگار (پوری قوم مشرک ہو چکی ہے) اب ان کو زندہ نہ چھوڑئے۔ اگر ان کو تو زندہ چھوڑے گا تو یہ اور بندوں کو کافر بنا دیں گے اور جو بچے جنیں گے وہ کافر اور بدکار ہوگا۔ طوفانِ نوح سے سبق ملا کہ شرک اور کفر سے عالم کی موت ہے۔ اور توحید سے عالم کی حیات اور تعمیر ہے۔ اور اسی قانون کے تحت کعبۃ اللہ کو شرک سے محفوظ رکھنے کے لئے شروع تاریخ انسانی ہی سے اہتمام کیا گیا ہے۔ اور اسی لئے حج کو ارکان دین میں شامل کیا گیا ہے کہ توحیدی گھر کی توحیدی تعلیمات ہمیشہ دنیا میں پھیلتی رہیں۔ ان آسمانی فیصلوں سے معلوم ہوا کہ دنیا پہ قیامت جب ہی آئے گی جب اسلام باقی نہ رہے۔ اور اسلامی توحیدی یونیورسٹی باقی نہ رہے۔

ابراہیمی نشاۃِ ثانیہ

پھر یہی مرکز نور معرفت مرکز حکومت الٰہیہ اور قبلۂ عالم و قبلۂ آدم و حوا ایک زمانے میں انسانی آبادی سے خالی ہو گیا اور مکہ اور اطراف مکہ کی زمین صحرا اور بیابان بن گئی جہاں آدم زاد کا گزر نہیں تھا۔ اور پوری زمین بے آب و گیاہ بن گئی تھی اس وقت رب البیت نے حضرت ابراہیم صلوٰۃ اللہ علیٰ نبینا و علیہ کو حکم دیا کہ پھر سے اس گھر اور اس کے اجڑے دیار کو آباد کریں چنانچہ حضرت ابراہیمؑ ملک شام سے اس زمین میں آگئے۔ اور اپنے ساتھ اپنی برگزیدہ بیوی حضرت ہاجرہ اور برگزیدہ خورد سال اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو ساتھ لائے۔ اور رب البیت کی حفاظت میں اسی بے آب و گیاہ زمین میں ان کو بسا دیا حضرت ابراہیمؑ برگزیدہ نبی تھے۔ اور رب البیت کی ابتلائی آزمائشوں پر کامل یقین رکھتے تھے مگر حضرت ہاجرہ بھی عزم و جزم کے امتحان میں رب البیت کی نوازشوں کی متمنی ہر ابتلاء و آزمائش میں ثابت قدم تھیں۔ آدم و حوا بھی اسی طرح سخت محنتوں اور ابتلاؤں میں اس مقدس زمین میں پہنچے تھے۔ بعینہ یہی سماں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت ہاجرہ کے سامنے آیا کہ ماں بیٹے ہزاروں خطرات سے گزرتے رہے۔ مگر عزم و جزم کی وجہ سے صبر و رضا میں سر مو فرق نہیں آیا۔ رب البیت کی خوشنودی میں تینوں برگزیدہ بندگان نے اپنی زندگیاں نثار کر دی تھیں پھر حضرت ابراہیمؑ ان دونوں کو یہیں چھوڑ کر ملک شام روانہ ہو گئے اور یہ دونوں گھر دار انسانی آبادی غلے دانے اور پانی سے بھی بے سہارا تھے بس ایک سہارا تھا کہ رب البیت کا گھر اور وہ قادر مطلق ہر شے پر قادر ہے پھر حضرت ابراہیمؑ کے واپس ہو جانے کے بعد حضرت اسماعیلؑ پیاسے ہوتے تو پانی ناپید تھا حضرت ہاجرہ بہ حالت اضطراب کبھی صفا کی پہاڑی پر دوڑ کر جاتیں۔ اور کبھی مروہ کی پہاڑی پر کہ کہیں پانی کے آثار پائیں تو وہاں سے پانی حاصل کریں ادھر حضرت ہاجرہ کا یہ حال تھا ادھر قادر مطلق رب البیت نے حضرت جبریلؑ کو بھیجا انھوں نے اسی بیت اللہ کی زمین ٹھوکر ماری جس سے پانی کا چشمہ ابل پڑا اور یہی چشمہ بہ برکت ہاجرہ و اسماعیل دنیا کے لئے چشمۂ فیض بنا اور اسی کا نام "زمزم" آب شفا مشہور ہوا پھر اسی طرح قادر مطلق رب البیت نے بنی جرہم کے قبیلے سے آبادی بھی قائم کر دی اور دونوں ماں بیٹے آرام سے رہنے لگے۔ اور حضرت ابراہیمؑ بار بار شام سے مکہ شریف آتے رہے تا آنکہ حضرت اسماعیلؑ بڑے ہو گئے تو تینوں برگزیدہ بزرگوں کا ایک اور امتحان رب البیت نے لیا کہ خواب میں حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا کہ رب البیت کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنے عزیز جان کی قربانی رب البیت کے لئے دو پھر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ اور بی بی ہاجرہ سے رضا جوئی کی رائے طلب کی تو دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور رب البیت کی رضا جوئی کو مقدم رکھا یہاں تک کہ ایک دن منیٰ کے مقام پر حضرت اسماعیلؑ کے گلے پر ذبح کرنے کے

ارادے سے چھری رکھدی اور تینوں کا امتحان ختم ہوا کہ رب البیت نے جنت کا دنبہ چھری کے نیچے رکھدیا اور حضرت اسماعیلؑ کو بچا دیا اور پھر ملتِ ابراہیمی کے لئے اس دن کو عید قرباں بنادیا جو آج تک جاری ہے اور ان امتحانوں کے بعد حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ابراہیمؑ نے بحکم خدا قدیم نقش آدم پر زمین بیت اللہ پر ایک کوٹھری بنادی اور پھر ان برگزیدہ بزرگوں نے اس کا طواف کیا اور حضرت ابراہیمؑ نے حج و طواف کا عام اعلان کردیا کہ بنی نوع انسان پر اس گھر کا طواف فرض ہے اس لئے کہ زمین پر انسانوں کی عبادت اور طواف کے لئے یہی مرکزی قبلۂ عالم ہے اور دعا مانگی کہ اے ربّ البیت! ہم دونوں ابراہیم و اسماعیل کی نسل سے آخری امتِ مسلمہ کو ظاہر فرما اور اس امت کے برگزیدہ نبی کو ظاہر فرما جس وقت منیٰ میں حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کرنے کے لئے جا رہے تھے تو مردود شیطان ماں بیٹے باپ تینوں کو بہکا رہا تھا اور حضرت ابراہیمؑ ایمانی عزیمت کے ساتھ اس کو کنکریاں مارتے تھے رمی جمرات منیٰ ایامِ حج میں اسی ابراہیمی رمی جمرہ کی یادگار ہے اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی حضرت ہاجرہ کی مضطربانہ دوڑ کی یادگار ہے۔ اور مردود شیطان حضرت آدم کو جنت سے نکالنے میں کامیاب ہوا اور حضرت آدم بھی نبی اور معصوم تھے۔ مگر بہ فرمانِ قرآن مجید حضرت آدم کو جنت سے نکالنے میں کامیاب ہوا اور حضرت آدم بھی نبی اور معصوم تھے۔ مگر بہ فرمانِ قرآن مجید ہم نے حضرت آدم میں عزم نہیں پایا بس اتنی لغزش تھی اور حضرت ابراہیمؑ اور حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیلؑ کے عزم و حزم میں لغزش نہیں ہے۔ اسی لئے ملتِ ابراہیمی کی پیروی کی قرآن مجید دعوت دے رہا ہے المختصر ربّ البیت کے معارف کا گہوارہ بیت اللہ اور شہر مکہ ہے اور حج بیت اللہ میں حضرت آدم و حوا اور حضرت ابراہیمؑ و ہاجرہ و حضرت اسماعیلؑ کی ابتلائی آزمائشوں کی یادگاریں ہیں۔ اس مقام پر جہاں جہاں جو جو افعال افعال و حرکات ان بزرگوں سے ظاہر ہوئے۔ وہ حج کے ذریعہ دنیا کو یاد دلائے جاتے ہیں تاکہ دنیا اپنے قبلہ بیت اللہ سے واقف رہے۔ اور ربّ البیت کی مرکزی تعلیمات نہ بھولے اور اسی لئے ان کے افعال حج اور مقامات حج اور ایام حج شعائر اللہ اور حرمات اللہ ہیں۔ بعض افعال ارکان حج ہیں اور بعض واجبات حج۔

مقصدِ حج ربّ البیت کا اس حج کے قیام سے مقصد یہ ہے کہ مرکزی اشیاء کی تعلیمات سے صحیح انتظامی توحیدی تعلیم دنیا کے کونے کونے میں پھیلتی رہے۔ اور شرک و کفر کا ربع مسکون سے قلع قمع ہوتا رہے پایۂ تخت حکومت الٰہیہ یعنی شہر مکہ کے اندر ابتدائی عہد آدم میں "ابتدائی درس گاہ عالم" تھی اور عہد حضرت ابراہیم خلیل اللہ میں "رشدی درس گاہ عالم" بنی جس سے دینی اور دنیوی معارف نظری اور فکری میدانوں میں جلوہ افروز ہوگئے اور عہد خاتم النبیینؐ میں پوری دنیا کی عالمی درسگاہ بنی اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ حیات کا مکمل دستور تیار ہوگیا۔ جو اس قانونِ حیات کی پیروی کرے گا وہ دنیا میں تاجدار رہے گا اور آخرت میں جنت الفردوس کا وارث ہوگا اور جو کفرانِ نعمتِ الٰہی کرے گا وہ دین و دنیا میں ہر حیثیت سے خسارے میں رہے گا۔ اور ہر انسان کے لئے دین و دنیا کی کامرانیوں کے لئے ضروری ہے کہ مثل آدم و حوا سرگرداں ژولیدہ سر در مولیٰ پر پہونچے اور میل کچیل سے پاک صاف ہوکر زیارت بیت اللہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی زمین میں اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرے اور اس کے نظام کو قائم کرے! حضرت آدم کا جہاد فی سبیل اللہ یہی تھا اور عہد خاتم النبیین کے لئے آسمان کی طرف سے منادی تھی کہ حج بیت اللہ کو دنیا پر فرض کردیا۔ ایسے ہر اولوالعزم انسان کا فرض ہے کہ راہِ استقامت میں لغزش سے بچتے رہے۔ ربّ البیت کی خوشنودی کے لئے خواہشوں کو ترک کرکے ربّ البیت کی اطاعت میں زندگی گزارے اور آنحضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جہاد علم و عمل پوری آسمانی طاقتوں کے ساتھ نمودار ہوگیا اور اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مسئلہ حیات انسانی میں آفتاب نصف النہار بنا

سچ آفتاب آمد دلیل آفتاب!

عہد خاتم الرسالۃ اور قرآنی شہادتیں

پہلا پارہ ربع اول "اے بنی اسرائیل سابقہ عہود کے تحت ایفائے عہد کرو" اور اسی میں دوسری آیت ہے "پہلے منکر راہ حق نہ بنو" پہلا پارہ آخری ربع "اے ابراہیم پیغمبر میں تم کو جنس انسانی کے لئے امام ہدایت بناتا ہوں"۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ اور حنفی ملت کے امام بنے اور ابوالانبیاء قرار پائے۔ تیسرا پارہ ۱۵ رکوع "ابراہیم پیغمبر نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ کج روی سے پاک مسلم تھے اور مشرکین سے نہ تھے"۔ یعنی قابل اتباع ابراہیم ہیں اس لئے کہ وہ مشرک نہیں تھے۔ یہودی اور نصرانی تو مشرک ہو چکے ہیں آگے آیت ہے "بلاشبہ ابراہیم پیغمبر کے خصوصی متبع وہ لوگ ہیں جو ان کے پیروکار ہیں اور یہ لوگ حضرت محمد رسول اللہؐ پر ایمان لانے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان ہی کا حامی ہے"۔ چوتھا پارہ پہلا رکوع "اے رسول اللہؐ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے سچ کہا ہے کہ اے لوگو ملت ابراہیمی کی پیروی کرو وہ ہر کج روش سے پاک تھے اور مشرک نہ تھے اور یقیناً پہلا گھر بنی نوع انسان کے لئے خانہ کعبہ ہے۔ اور وہ مکہ میں ہے۔ اور برکت والا اور دنیا جہانوں کے لئے رہبر ہے"۔ یعنی جملہ اہل کتاب کو حکم دے دیا گیا ہے کہ وہ آخری دین کی پیروی کریں اور قبلہ عالم بیت اللہ ہے جس کو تقدم رتبی اور زمانی ہر حیثیت سے حاصل ہے۔ سورہ حج ۱۷ پارہ رکوع ۹ و ۱۰ "جن لوگوں نے کفر کیا اور مسجد حرام کعبۃ اللہ سے روکا اور مقامی آدمیوں اور دور دراز مقامات سے آنے والوں کو روکا تو ان کو ہم اس بے دینی پر دردناک عذاب دیں گے"۔ یعنی مشرکین اور یہود و نصاریٰ جو اس راہ میں حائل ہیں وہ مستحق عذاب الٰہی ہیں آگے آیت ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کی تعمیر اس وقت کی تھی جب کہ اس زمین پر عمارت نہیں تھی مگر اللہ تعالیٰ نے نقش آدم پر حضرت ابراہیمؑ کو عمارت کعبہ بنانے کے لئے جگہ بتا دی تھی۔

آیت "اور یاد کیجئے اے رسول اللہؐ اس وقت کو جب کہ ہم نے ابراہیم پیغمبر کو جگہ بتائی تھی"۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ عمارت کی تعمیر کا خداوندی حکم تھا۔ اور نقش آدم پر بنانے کا حکم تھا تاکہ بیت اللہ کی قدامت ثابت ہو اور اس کی اولیت عہد ابراہیمؑ سے بھی پہلے ثابت ہو۔ اور اسی سلسلہ میں آیت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو حج اور طواف بیت اللہ کے لئے جملہ بنی نوع انسان پر فرض ہو جانے کے اعلان کا حکم دے دیا گیا تھا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "اور حضرت ابراہیم کو حکم دیا گیا تھا کہ بنی نوع انسان پر حج کے فرض ہونے کا اعلان کردو تاکہ پیدل اور سوار دور دراز زمینوں سے حجاج تمہارے پاس آئیں"۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کا گھر شرک سے محفوظ ہے اور اس ذریعہ سے دنیا شرک سے محفوظ رہے گی۔ حج کعبۃ اللہ کا حکم شریعت کعبۃ اللہ سے متعلق ہے قدیم الایام میں بھی ایسا ہی تھا اور عہد خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی ایسا ہی ہے۔ چنانچہ پارہ چار پہلے رکوع میں حج ابراہیم اور فضائل کعبہ کے بعد آیت ہے "اور اللہ کے واسطے اس گھر کا حج کرنا ان لوگوں کے لئے جو وہاں تک پہونچنے کی طاقت رکھتے ہوں فرض ہے۔ اور جو شخص اس کا منکر ہو تو اللہ تعالیٰ تمام جہان والوں سے غنی ہے"۔ یہ آیت اس روشنی میں ہے کہ حج جملہ بنی نوع انسان کے لئے فرض ہے۔ اور یہ حق اللہ ہے جس کی ادائی بنی نوع انسان پر فرض ہے پارہ ۱۳ رکوع ۱۸ وہ دعائے ابراہیمؑ ہے جو کعبۃ اللہ شریف کے قریب آل اسماعیلؑ کے بسا دینے کے بعد مانگی تھی۔ "اے ہمارے رب البیت میں نے اپنی ذریت اسماعیلؑ کو تیرے محترم کعبۃ اللہ کے پاس بسا دیا ہے تاکہ وہ نماز قائم کریں"۔ یعنی مکارم اخلاق اور اقامت نماز کے لئے ایسی ہی جگہ مناسب ہے۔ مرغزار زمینیں، سوئٹزرلینڈ اور کشمیر اور عیش و ہوس میں ڈوبے ہوئے شہر لندن اور واشنگٹن اس کے اہل نہیں ہیں پارہ ۷ سورہ مائدہ "ہم نے کعبۃ اللہ کو جو حرمت کی جگہ ہے اس کو انسانوں کے قائم اور آباد رہنے کا سبب بنایا ہے"۔ یعنی دنیا کی آبادی یہیں سے شروع ہوئی ہے اور قیامت سے پہلے کعبۃ اللہ کو ایک حبشی کافر ڈھا دے گا اور اس کو اس فعل شنیع پر قدرت ہوگی سو کفر کی اشاعت سے دنیا پر قیامت آنے والی ہوگی اور انسانی آبادی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ پارہ ۶ سورہ مائدہ رکوع ۵ حجۃ الوداع آیت نازل ہوئی "آج کے دن میں نے تمہارے دین کو

کامل کر دیا۔ اور تم پر اپنا انعام ختم کر دیا۔ اور اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کیا۔" یعنی جملہ دین ختم ہو چکے ہیں اب تا قیامت صرف دین اسلام رہے گا کمال کے بعد کوئی ناسخ دین نہیں بس اس کے بعد قیامت آ جائے گی۔ محدود الرقبہ و مقید بہ قید زمان و مکان ادیان اور ان کا قبلہ ہر چیز ختم ہو چکی ہے۔ پارہ ۱۴ سورہ حجر پہلا رکوع "ہم نے قرآن مجید کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں"۔ چنانچہ اگلی کتابیں چونکہ منسوخ ہونے والی تھیں۔ اس لئے محفوظ نہیں رکھی گئیں اور قرآن و صحیت لفظاً اور معنیً سے محفوظ بلکہ قبلہ کعبۃ اللہ اور اس کے تحت حرم اور شعائر اللہ بھی محفوظ ہیں۔ پارہ اول آخری ربع اللہ تعالیٰ نے (ابراہیم پیغمبر سے کہا کہ" میں تم کو لوگوں کا امام بنا دوں گا تو حضرت ابراہیم نے عرض کیا اور میری ذریت۔ کو بھی سرفراز فرما تو جواب دیا گیا میری نبوت کا عہدہ ظالموں کو نہیں مل سکتا ہے" تو تفرقہ کرنے والے یہودی و نصرانی اور مشرک ہو جانے والے منصب نبوت و امامت کے اہل نہیں رہے ہیں۔ یعنی اسلام کے بعد تفریقی اہل کتاب اور مشرک لوگوں کو نبوت نہیں مل سکتی ہے۔ اور ان سے پہلے انبیاء بنی اسرائیل کا قرآن مجید مصدق ہے۔ پارہ اول ختم کے قریب اور جو دین اسلام کے سوا کوئی اور دین ڈھونڈ نکالے گا تو وہ مقبول نہیں ہوگا۔

یہود و نصاریٰ کا قبلہ منسوخ

مندرجہ بالا قرآنی آیات اور ان کے دلائل کی روشنی میں اسلام کے بعد یہود و نصاریٰ کے ادیان اور ان کا قبلہ منسوخ ہے۔ اور اب یہ لوگ منسوخ الامامت ہیں۔ حدیث۔ نبیٔ کریمؐ کا ارشاد ہے کہ شیطان جزیرۃ العرب میں شرک کے عود کرنے سے مایوس ہے۔ ہاں آپس کی جنگ سے ان میں افراتفری رہے گی پوری قوم کی تباہی صرف شرک سے ہے۔

حدیث۔ "میں نے اپنی امت کے لئے تین دعائیں کیں جن میں سے دو مقبول ہوئیں۔"

نمبر (۱) اے اللہ میری امت کو آسمانی آفتوں سے تباہ نہ کر یہ دعا مقبول ہوئی اور اسی سے امت محفوظ ہے۔

نمبر (۲) اے اللہ میری امت کو دنیا کے بادشاہ مل کر فنا کرنا چاہیں تو کامیاب نہ ہوں۔ یہ دعا بھی مقبول ہوئی پوری غیر اسلامی دنیا دشمن ہے مگر امت مسلمہ محفوظ ہے۔

نمبر (۳) اے اللہ میری امت میں آپس میں تلوار نہ چلے تو یہ دعا مقبول نہیں ہوئی اسی سے آپس میں نااتفاقی اور پھوٹ پڑی ہے مگر کلی تباہی نہیں ہے۔

تبصرہ۔ از راہ فنا و بقائے امم حکومت الٰہیہ کا فیصلہ یہی ہے کہ توحید کو بقا ہے اور شرک کو فنا۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم　　چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

حدیث۔ ارشاد نبی ہے وہ دین کیسے ختم ہو سکتا ہے جس کے شروع میں میں ہوں اور آخر میں عیسیٰ ابن مریم (بحیثیت اتباع دین اسلام ہوں) بہ فحوائے حدیث امت مسلمہ کے دین توحید کے لئے بقا بھی ہے اور سابقہ عروج بھی ہے۔

"ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما"

کعبۃ اللہ سے متعلق مستند روایات کے تحت علماء و فضلا اور عقلا کی نظروں میں کعبۃ اللہ کی برتری حد کمال کو پہونچی ہوئی ہے۔ اور عین الیقین ہے شکوک و شبہات کی اس میں مطلقاً گنجائش نہیں ہے۔ اور نہ مزید دلائل اور بحث کی ضرورت ہے۔ کعبۃ اللہ اور دین کعبۃ اللہ بے مثل اور بے مثال ہے مگر اس دین کی حکمتیں بلند ترین نظریات کی حامل ہیں اسی سے اس امت مسلمہ کے دین کو سابقہ ادیان کا جائزہ لینا بھی اس کے پیش نظر ہے۔ اس لئے کون و مکان کے مالک نے تحویل قبلہ کے ذریعہ ہمیشہ کے لئے کعبۃ اللہ کو قبلہ عالم بنا دیا ہے۔ آخری نبی اگلے دینوں کے مصدق بھی ہیں اور ناسخ

تھی۔ احکامِ خداوندی کے تحت اس مسئلہ میں عملی نمونہ بن کر قبلہ کا مسئلہ حل فرمارہے ہیں کہ سابقہ عارضی قبلہ کو جو محدود دائرہ اور مقید بقید زمان و مکان تھا اس کی طرف مدینہ پہونچکر سولہ یا سترہ مہینے نماز پڑھی تھی تاکہ شامی قبلہ اور اس کے ادیان کی تصدیق ہوجائے۔ توراۃ زبور اور انجیل تین آسمانی کتابوں کا اسی بیت المقدس شامی قبلہ سے تعلق ہے۔ صحف ابراہیم پیغمبر کے بعد مزید آسمانی احکام انہیں آسمانی کتب میں نازل ہوچکے ہیں اور آنحضور کے خاتم النبیین ہونے سے وہ قبلہ اور اس کے ادیان منسوخ ہوچکے ہیں لیکن آنحضور کی عملی تصدیق اور عملی تنسیخ کے ذریعہ تحویل قبلہ یا تنسیخ شامی قبلہ اور تنسیخ ادیان قبلہ کا آسمانی مظاہرہ ہوا ہے۔ اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تعمیل احکام خداوندی میں مصروف العمل ہیں نیز اس حکمت عملی سے واقف ہیں اسی لئے شدید الاشتیاق تھے کہ قبلہ شامی سے محبوب ترین قبلہ کی طرف حکم تحویل جلد تر نازل ہوجائے اللہ حکیم، نبی حکیم، دین حکیم ہے اس لئے اس حکمت عملی کا مظاہرہ نبی کے ہر دو عملوں سے ہوا ہے۔ یہود اور نصاریٰ کو چاہیے تھا اپنی کتابوں کی صدا پیشین گوئیوں کے تحت آخری دین حق پر ایمان لے آتے اور بے چون و چرا عارضی قبلہ سے اوّلی قبلہ کو تسلیم کرتے اور جانتے پہچانتے منکر حق اور کافر دین حق نہ بنتے مگر قدیم منافقین نیز یہود نے مفتریانہ شکوک و شبہات پیدا کردیئے۔ خود عنادی دشمن پہلے سے ہی تھے مگر دوسرے احمقوں اور بے وقوفوں کو بھی اعتراضات پر لگا دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کا منہ توڑ جواب دیدیا تاکہ حق کا بول بالا ہو اور قبلہ اول ہی آخری قبلہ عالم قرار پائے جملہ انبیا تشریعی امور میں احکام خداوندی کی تعمیل کرتے ہیں اسی لئے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے عہد میں کعبۃ اللہ کی تعمیر کی تھی اور عراق سے ہجرت کرکے شام کو وطن بنایا تھا۔ مگر وہاں انھوں نے کوئی مسجد نہیں بنائی تھی عہد داوٗد اور عہد زبور میں بیت المقدس کی تعمیر ہوئی تھی۔ اس لئے کہ اس وقت سمت نماز نہیں تھی اور کعبۃ اللہ کی نماز طواف کعبہ تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے سفہا معترضین کے جواب میں اسی حقیقت کو ظاہر فرمایا ہے۔ کہ اس وقت کی حقیقت یہی تھی۔ سمت قبلہ تو آخری عہد نبوت میں متعین کی گئی ہے۔ آنحضورؐ شروع عہد میں کعبۃ اللہ کی سمت میں نماز پڑھتے تھے اور مدینہ میں آسمانی مذکورہ حکمت کے تحت سمت بیت المقدس اختیار کی تھی۔ شب معراج میں رات کے زمینی سفر کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندے رسول اللہؐ کو راتوں رات مسجد حرام کعبۃ اللہ سے مسجد اقصیٰ کی طرف لے گیا اقصیٰ کے معنی دور کنارے کی مسجد کے ہیں تو کعبہ مرکزی مسجد تھی اور مسجد اقصیٰ جانب شمال و مغرب آخری کونے کی مسجد تھی اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی معبد کعبۃ اللہ ہے نہ مسجد اقصیٰ۔

ان مندرجہ بالا حقائق کے تحت نبی کریمؐ اور تابع فرمان امت مسلمہ کا حال تحویل قبلہ سے پہلے اور تحویل قبلہ کے بعد حسب ذیل تھا نبی کریم حقیقت شناس تھے اور یقیناً ان کو معلوم تھا کہ شامی قبلہ سے مکی قبلہ کی طرف تحویل کا حکم آنے والا ہے اس لئے آپ کو شدت سے انتظار تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے ترجمہ آیت "ہم دیکھ رہے ہیں اے رسول اللہؐ آپ کو کہ آپ اپنے منہ کو بار بار آسمان کی طرف پلٹا رہے ہیں تو ہم آپ کو آپ کے قبلہ کی طرف پلٹا رہے ہیں جو آپ کو محبوب ہے۔ بس آپ اپنے منہ کو کعبۃ اللہ مسجد حرام کی طرف پلٹا دیجئے (اور اے مسلمو) جہاں کہیں تم ہو اپنے منہ کو کعبۃ اللہ کی طرف پلٹا دو"۔ یہ آیت ہے جس سے قبلہ شامی سے قبلہ مکی کی طرف تحویل کا حکم اس وقت نازل ہوا تھا جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد بنی سلمہ میں ظہر کی نماز باجماعت ادا کر رہے تھے اور دو رکعتیں قبلہ شامی کے رخ پر ادا کرچکے تھے کہ آیت نازل ہوئی اور آپ نے فوراً اپنا منہ قبلہ کی طرف پھیر لیا اور باقی دو رکعتیں قبلہ مکی کی رخ پر پڑھیں اور جملہ مقتدیوں نے بھی فوراً اپنے رخ بجانب قبلہ مکی کر دیئے تھے اور ایک صحابی جو اس جماعت میں شریک تھے ان کا گذر عصر کے وقت ایک جماعت میں ہوا جماعت سے نماز عصر شام کے رخ پر پڑھ رہی تھی صحابی مذکور نے یہ دیکھ کر اطلاع دی کہ تحویل قبلہ ہوچکی ہے۔ میں ظہر کی نماز آنحضورؐ کے ساتھ پڑھ کر آرہا ہوں تو اس جماعت نے اس خبر واحد

کے تحت تحویل قبلہ کر دی اس لئے کہ نبی اور جماعت مسلمہ منتظرہ حالت میں تھی۔

یہ کعبۃ اللہ وہ گھر ہے جو تاریخ انسانی میں انسان کا ماوی و ملجا رہا ہے۔ یہ وہ گھر ہے جس کے لئے آدم و حوا جنت سے نکلے اور اسی گھر سے جنت کی طرف سدھار گئے اس کا نام نامی بیت الحرام ہے۔ جس سے عظمت حرمتوں والا گھر مراد ہے۔ اس کا گرامی نام بیت العتیق ہے جو ہمیشہ آزاد رہا ہے اور قدامت کا حامل ہے حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ ذبیح اللہ اس کے مجاور ہیں نصرانی ابرہہ نے جب ہاتھیوں کے فوج سے اس پر حملہ کیا تھا اور اس وقت اس کے مجاور مشرک کافر تھے تو اللہ نے مشرک قریش کو بچایا اور ابرہہ نصرانی کے لشکر کو ابابیل کی کنکریوں سے بھر کس کر دیا۔ اس لئے کہ عہد خاتم النبیینؐ ابھی باقی تھا اور ابھی دنیا کو باقی رکھنا مقصود تھا چونکہ انسان اور انسانیت کی بقا کعبۃ اللہ کے تحت ہے اس لئے طواف کعبہ و حج بنی نوع انسان پر فرض ہے اور اس قدیم تاریخ کو یاد دلانے اور آخری تکمیلی عہد کی بشارتوں کے لئے بحکم خدا حضرت ابراہیمؑ آنے والی آسمانی حکومت کے اعلانات کر گئے۔ جزیرۃ العرب کا ہر صوبہ صرف اسی گھر کو قبلہ و کعبہ مانتا تھا اس لئے عرب جاہلیت اسی قبلہ کے سوا کسی اور قبلہ کو محبوب نہیں رکھتا تھا پس محبوب کعبہ کو قبلہ بنانے کی تلاش محبوب تلاش تھی اور اسی لئے اللہ تعالیٰ کے پاس نبی کریمؐ کا انتظار تنسیخ قبلہ شام محبوب انتظار تھا۔ یہی آیت اس حیثیت سے نبی کریمؐ کے تمنا اور آرزو کی صحت و حکمت کی تصدیق کرتی ہے، اور یہ کہ منافقین یہود کا اتہام جھوٹا ہے۔ مرضی مولیٰ پر چلنے والے نبی کو کسی قوم سے بغض و حسد رکھنا ان کی شان سے بعید ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی ہے کہ عارضی قبلہ اور وقتی دین ختم ہوں اور اول اور آخری قبلہ اس کا آخر دین باقی رہے۔ اہل کتاب کعبۃ اللہ اور اس کے دین اور اس کے آخری نبی سے خوب واقف تھے۔ چنانچہ ان کی معرفت حقائق کا حال اسی تحویل قبلہ کے سلسلہ میں آیت ہے کہ وہ نبی آخر الزمان کو ایسا ہی پہچانتے ہیں جیسے باپ اپنے بیٹے کو۔

توراۃ اور انجیل میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نسب اور مقام بعثت۔ کوہ صفا کوہ فاران اور ایسی صفات فارقلیط اور احمد ستودہ صفات اور شکل و شمائل اور قبلۂ عالم کعبۃ اللہ اور دین کعبۃ اللہ ملت ابراہیم اور کلام اللہ قرآن مجید کی بشارتیں پیش گوئیاں موجود ہیں اور امت مسلمہ کو قدوسی جماعت کہا گیا ہے۔ اور بنی اسحاق کو آل اسماعیل سے شرمایا گیا ہے اور حضرت ہاجرہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ جس پتھر کو عمارت سے نکال پھینکا تھا وہی عمارت کا سرا بنا، یعنی دین کعبۃ اللہ کا پایہ مکہ شریف میں آل ہاجرہ اور آل اسماعیل کی تولیت میں رکھا گیا اور حضرت عیسیٰؑ نے دین عیسوی کی اصلاح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں رکھی ہے۔ اور مسئلہ تحویل سے متعلق پیش گوئی ہے کہ آنے والے نبی کچھ دنوں بیت المقدس کی طرف نماز پڑھیں گے اور پھر کعبۃ اللہ کی طرف نماز پڑھا کریں گے ان کی کتابی پیش گوئیوں کے ہوتے ہوئے اہل کتاب کی قبلتین سے متعلق تفریقیں سراسر حماقت جہل اور ہٹ دھرمی ہے۔ اور ان اہل کتاب کی حقیقت صرف اتنی رہ گئی ہے کہ وہ اپنی کتابوں اور اپنے انبیا کی تکذیب کے مجرم ہیں۔ اس دین حق سے انکار دین موسوی اور عیسوی سے انکار ہے اور عرب جاہلیت میں بھی اس بیت اللہ اور رب بیت اللہ سے عشق رکھتا تھا اس لئے کہ اس کی تاریخی عظمتیں ان کی نظروں میں تھیں قریب العہد زمانے میں رب البیت نے قریش کی حفاظت میں ابرہہ کی فوج کو ابابیل کی کنکریوں سے تباہ ہوتے دیکھا تھا۔ الغرض کعبۃ اللہ کی عام مرکزی عظمتیں کے ہوتے ہوئے۔ اور ان کے ساتھ آسمانی بشارتوں کے ہوتے ہوئے یہ آیت ترجمان حقیقت ہے کہ احمق لوگ تحویل قبلہ سے انکار کر رہے ہیں۔ اور پھر آیت ہے اے رسول اللہؐ اگر آپ جملہ آسمانی آیات اور نشانیاں اور دلائل ان کے سامنے رکھ دیں تو جب بھی یہ واضح امر حق کی پیروی نہیں کریں گے اور امر حق ہونے کی وجہ سے آپ کے بارے میں بھی آیت ہے کہ اگر آپ بھی ان ہی اہل کتاب کی نفسانی ترغیبی خواہشات کی پیروی کریں گے تو آپ بھی بفرض محال

ظاہر ہوں گے اور یہ قطعاً محال ہے پس آخری آیت فیصلہ یہ ہے اے امت مسلمہ تم صرف مجھ سے ڈرو تاکہ میں تم پر نعمت دین کا مکمل کردوں۔ اور تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کردوں یعنی شامی اہل قبلہ اس ودیعت اور امانت کاملہ کے مستحق نہیں ہیں تکمیل دین ہم اور وہ مکمل دین تھے۔ بس مکمل دین کو چھوڑ کر ناقص دین کو اختیار کرنا سفاہت ہے اہلِ شام کے ہزار سالہ عہد گذشتہ کا دس سالہ عہد میں زیادہ ہمہ گیر اور مکمل ہے۔ اور اب تو ربع مسکون پر دین کعبۃ اللہ کی حکومت ہے۔ الحق یعلو۔ حق اونچا جاتا ہے اور اس کی بلندیوں کی ضامن اس کی تکمیل ہوتی ہے اور ظلم حق گرتا ہے اور اس کا سبب اس کا ذاتی نقص ہوتا ہے۔ اور یہی حقیقت قرآنی نہج اور آیات سے مسئلہ تحویل قبلہ میں ظاہر ہوتی ہے۔

ماہر القادری

عقیدت کے نام پر!

ماہِ مئی (۱۹۶۳ء) کے "فاران" میں ابوظفر حسین صاحب (ملتان) کا ایک خط شائع ہوا تھا، جو موصوف نے مدیر "فاران" کے نام بھیجا تھا۔ اس میں لکھا تھا:۔

"روزنامہ حالات لاہور نے مولانا احمد علی صاحب لاہوری مرحوم کی پہلی برسی پر ایک خاص نمبر شائع کیا ہے، جس میں ایڈیٹر "خدام الدین" جناب مناظر حسین نظر کا مضمون بعنوان "حضرت شیخ التفسیر قدس سرہٗ العزیز بارگاہِ نبوی میں"۔ درج کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے ساتھ مولانا احمد علی صاحب لاہوری مرحوم کے درسِ قرآن میں تشریف لایا کرتے تھے واقعہ اس طرح درج ہے ——

ایک شخص جاذبیت کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ تھا، اس نے مولانا سے آکر عرض کیا کہ جب آپ درسِ قرآن میں مشغول ہوتے ہیں میں دیکھتا ہوں کہ ایک بلند و بالا مقام پر مسند بچھی ہے، رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم، اس پر جلوہ فرما ہیں، صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی جمعیت ساتھ ہے، آپ حضرت (شیخ التفسیر) درس کا جملہ ختم کر کے سکوت فرماتے ہیں تو زبانِ نبوت حرکت میں آجاتی ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں صدقت، صدقت، صدقت۔ گویا آپ کے ہر جملہ درسِ قرآن پر تین مرتبہ نبوت کی مہر تصدیق ثبت ہوئی۔ حضرت شیخ التفسیر سے جب اس واقعہ کی تفصیل کسی صاحب نے طلب اور عرض کیا کہ وہ شخص یہ سب کچھ دیکھتا کیسے تھا تو حضرت شیخ التفسیر نے مشفقانہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ نوجوان مقامِ ابدالیت پر فائز ہونے والا تھا، اور ابدالیوں کو یہ کیفیت حاصل ہوتی ہے اور اس قسم کے مشاہدات سے وہ دوچار ہوتے رہتے ہیں۔"

"فاران" میں اس واقعہ پر تنقید کرتے ہوئے عرض کیا گیا کہ "اس قسم کا عقیدہ رکھنا ہی غلط ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اس طرح زندہ ہیں کہ وہ محفلوں اور جلسوں میں شرکت فرماتے ہیں اور گفتگو کرتے ہیں۔۔۔"

جن حضرات کے پاس ماہِ مئی (۱۹۶۳ء) کا "فاران" محفوظ ہے، وہ اس مضمون (مذہبی کمین گاہوں سے) کو ایک بار پھر ملاحظہ فرمالیں، ہم اُن باتوں کو دُہرائیں گے تو بات بہت لمبی ہو جائے گی! ہماری ان معروضات اور گزارشوں کے جواب اور تردید میں ہفت روزہ "خدام الدین" (لاہور) کی ۲۸ جون کی اشاعت میں ایک طویل مقالہ شائع ہوا ہے۔ اس کے لکھنے والے کوئی بزرگ —— "راس المحققین، اسوۃ الصالحین، حضرت مولانا سید امین الحق مدظلہٗ (شیخوپورہ) —— ہیں!

ابوظفر حسین صاحب کے خط میں بعض خوابوں کا بھی ذکر تھا۔ ہم نے اپنے مضمون میں ان "خوابوں" کی تردید نہیں کی اور نہ یہ کہا کہ خواب میں رویتِ رسولؐ نہیں ہو سکتی۔ جب عام لوگ وفات پانے کے بعد خوابوں میں دکھائی دے سکتے ہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب میں آنا بدرجۂ اولیٰ ثابت ہے! اس حلقہ "خدام الدین" کے بعض وابستگان مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تنقیص و تحقیر کا فریضہ کارِ ثواب سمجھ کر انجام دے رہے ہیں، اس سلسلہ میں ہم نے لکھا تھا:۔

"ان تہمت طرازوں کو جب کوئی دلیل نہ مل سکی تو مودودی صاحب پر یہ خیالی الزام لگایا کہ وہ "مجدد" ہونے کا دعویٰ کرنے والے ہیں مگر دنیا نے دیکھ لیا کہ مولانا مودودی کسی دعوے کے بغیر اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت کئے جا رہے ہیں مگر اس کے برخلاف اُن کے بدنام کرنے والوں، انہیں گمراہ سمجھنے والوں اور انہیں "مثلِ مودودی" کہنے والوں کے یہاں کشف و کرامت کے دعوے ملتے ہیں، کہیں مریدین کا یہ مبالغہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام کے ساتھ اُن کی محفلوں میں تشریف لاتے ہیں، کہیں یہ مشاہدہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "شیخ التفسیر" کے زانو سے زانو ملائے بیٹھے ہیں اور حضرت والا کے کشف و کرامت کے یہ دعوے کہ وہ لوگوں کے ایمان کی کیفیت جان لیتے ہیں۔"

ہم نے جس بات پر اعتراض کیا تھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مولانا احمد علی لاہوری کے درسِ قرآن میں صحابہؓ کی معیت میں تشریف لانا اور "صدارت" فرمانا ہے، ہم نے مضمون کے شروع میں جو عبارت نقل کی ہے اُسے ایک بار پھر پڑھ لیا جائے۔ ہم نے اس سلسلہ میں عرض کیا تھا:۔

"صحابۂ کرامؓ اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی کرتے تھے، اور مسلمانوں کو دین کی تعلیم بھی دیتے تھے، لیکن کسی ضعیف سے ضعیف روایت سے بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ کسی صحابی کی محفلِ وعظ و تبلیغ میں حضورؐ وفات کے بعد تشریف لائے ہیں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے سب سے زیادہ ضروری موقعے جمل و صفین کے خونریز معرکے ہیں۔ حضورؐ تشریف لاکر مسلمانوں کو بتا سکتے تھے کہ تم میں کون حق پر ہے؟ اور اس طرح مسلمان بہت بڑے فتنے سے محفوظ رہ سکتے تھے، وفات پانے کے بعد انبیاء کرام کا محفلوں اور جلسوں میں شریک ہونا نہ تو کتاب و سنت سے ثابت ہے، نہ آثارِ صحابہؓ اس کی تائید کرتے ہیں اور نہ ائمہ حدیث و فقہ کے یہاں اس کی دلیل ملتی ہے ۔ ۔ ۔ !

اس قسم کا عقیدہ رکھنا ہی غلط ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام اس طرح زندہ ہیں کہ وہ محفلوں اور جلسوں میں شرکت فرماتے ہیں اور گفتگو کرتے ہیں۔"

ہم نے جو تنقید اور گرفت کی ہے، اس کی تردید اسی صورت میں ہو سکتی تھی کہ کتاب و سنت سے کوئی دلیل پیش کی جاتی یا آثار سے اس کے لئے ثبوت لایا جاتا۔ مگر ان "رأس المحققین" صاحب نے بات کو اُلجھانے کے لئے اصل مسئلہ کو چھوڑ کر خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت و مشاہدہ کی متعدد مثالیں پیش کر دی ہیں! ہم نے اپنے مضمون میں اس بات سے کب انکار کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت خواب میں نہیں ہو سکتی! جس چیز کا ہم نے انکار ہی نہیں کیا اس کے اثبات میں اتنی بہت

مثالیں پیش کرنے کی زحمت آخر کس لئے برداشت فرمائی گئی ، اس "زحمتِ بیجا" سے حاصل کیا ہوا۔

یہ کوئی فقہ کا فروعی مسئلہ نہیں ہے جس میں ادھر یا اُس سے زیادہ رائیں ہو سکتی ہیں یہ درحقیقت عقیدہ کا سوال ہے کہ وفات پانے کے بعد انبیاء کرام یا صحابۂ کرام عالمِ کون وفساد اور دُنیائے آب و گِل کے رہنے والوں کی محفلوں میں تشریف لے جایا کرتے ہیں اور گفتگو بھی فرماتے ہیں! کتاب و سنّت اور آثارِ صحابہؓ سے اس عقیدہ کی تائید نہیں ہوتی ، لہٰذا اس قسم کا عقیدہ رکھنا غلط ہے نادرست ہے . اور اس عقیدہ کے رکھنے سے طرح طرح کے مفاسد کے دروازے کھلتے ہیں ' یہ جو اہلِ بدعت رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "حاضر و ناظر" کہتے اور جانتے ہیں اور اپنے اس شرک آمیز عقیدہ پر اصرار کرتے ہیں ' اور جو کوئی اس عقیدہ کو دُرست نہیں مانتا اس کو اُلٹا گمراہ اور معاندِ رسول سمجھتے ہیں ' اُن کے اس گمراہ کُن عقیدہ کو شہ اور غذا اسی قسم کے کشف و رویت کے عجائب و غرائب سے ملتی ہے۔

جیسے رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس عالمِ آب و گِل میں جسدِ عنصری کے ساتھ حیات تھے ، تو وہ صحابۂ کرام جو مدینہ کے علاوہ باہر کی بستیوں ——— مکہ ، طائف ، رابغ ، ینبوع وغیرہ ——— میں رہتے تھے ، اُن کے حالات میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا کہ انھوں نے اپنی کسی محفل میں رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح دیکھا ہو۔ جس طرح مولانا احمد علی لاہوری کے درسِ قرآن میں اُن کے ایک عقیدت مند نے حضورؐ کو کشف کے ذریعہ دیکھنے کا واقعہ بیان کیا ہے ——— اور نہ تابعین میں کسی بزرگ نے یہ کہا کہ ہماری محفل میں رسولُ اللہؐ اور صحابۂ کرام تشریف لاتے ہیں اور ہمارے درس و وعظ کی تحسین و تصدیق فرماتے ہیں ! کتابُ اللہ سے بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ وفات پانے کے بعد انبیاء کرام دُنیا والوں کی محفلوں اور جلسوں میں اپنے صحابہ کے ساتھ نہ صرف تشریف لاتے ہیں بلکہ گفتگو فرماتے ہیں ' اور اُن کی آواز سُنی جاتی ہے ——— سُنّتِ رسولؐ سے بھی اس قسم کے عقیدہ اور رویت و مشاہدہ کی تصدیق نہیں ہوتی اور صحابۂ کرامؓ کے سوانح و حالات بھی اس کی تائید اور تصویب نہیں کرتے ، وفات پانے کے بعد اگر رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ اس دُنیا کے لوگوں کی محفلوں ، صحبتوں اور نشستوں میں تشریف لاتے تو حسن بصریؒ ، عمر ابن عبدالعزیزؒ ، امام جعفر صادق ، امام ابو حنیفہ ، عبداللہ ابن مبارک ، امام مالک ، امام بخاری (رحمہم اللہ تعالیٰ) کے درس و تبلیغ کی محفلیں اس کی بدرجہ اولیٰ مستحق تھیں ' ان تمام بزرگوں کی محفلوں اور مجلسوں کو نظر انداز فرما کر رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابۂ کرام کی معیت میں مولانا احمد علی لاہوری مرحوم کے درسِ قرآن میں تشریف لانا اور مولانا مرحوم کے ایک ایک جملہ پر تین تین بار "صدقت" فرمانا ، کس قدر عجیب ' قابلِ غور اور محلِ نظر ہے۔

اور آثارِ صحابہ و تابعین

میں یہ بھی نہیں ملتا کہ کسی شخص نے ان بزرگوں کی محفلوں سے کشف کے ذریعہ حضورؐ اور صحابہ کو عالمِ بیداری میں دیکھا ہو اور نہ صرف دیکھا ہو بلکہ حضورؐ کی زبانِ مبارک سے الفاظ آواز کے ساتھ سُنے ہوں !

"خدام الدین"　　کے راس المحققین صاحب لکھتے ہیں :۔

"محافل اور مجلسوں میں رسالت مآبؐ کے تشریف لانے کا ڈاکٹر صاحب موصوف دعویٰ اور اثبات ہی نہیں کرتے "۔

اس کے بعد وہ اصل عبارت ملاحظہ فرمائیے جو روزنامہ "حالات" (لاہور) کے ایک مضمون کی لفظاً لفظاً نقل ہے :۔

"ایک شخص جاذبیت کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ تھا ، اُس نے مولانا سے آکر عرض کیا کہ جب آپ درسِ قرآن میں مشغول ہوتے ہیں ۔ میں دیکھتا ہوں کہ ایک بلند و بالا مقام پر مسند بچھی ہے ' رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس پر جلوہ فرما ہیں ' صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جمعیت

> آپ کے تھا ہے آپ حضرت (شیخ التفسیر) درس کا جملہ ختم کر کے سکون فرماتے ہیں تو زبانِ نبوت حرکت میں آجاتی ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "صدقت، صدقت، صدقت، صدقت، گویا آپ کے ہر جملہ درسِ قرآن پر تین مرتبہ نبوت کی مُہر تصدیق ثبت ہوتی ہے . . ."

اس عبارت کو پڑھیئے' بار بار پڑھیئے اور غور و خوض کے ساتھ پڑھیئے اس کے سیاق و سباق سے یہی مفہوم ذہن میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کے ساتھ مولانا احمد علی لاہوری مرحوم کے درسِ قرآن میں بہ حالتِ بیداری اُس شخص نے دیکھا ہے! اس عبارت کو جو کوئی بھی پڑھے گا، اُس کے ذہن میں یہی مفہوم آئے گا ——— راقم الحروف نے بھی اس عبارت کا یہی مفہوم سمجھا اور ایسا سمجھ کر نہ کسی پر میں نے زیادتی کی ہے نہ کسی پر تہمت جڑی ہے' اور نہ کسی کے قول کو توڑ مروڑ کر بیان کیا ہے، جس پر "راس المحققین" صاحب کو طیش آگیا ہے! اس عبارت میں یہ کہاں لکھا ہے کہ اور اس کنایہ کے لئے اس میں کہاں گنجائش نکلتی ہے کہ اُس شخص کے لئے برزخ، قبر، عالم ارواح یا جنت اور مقام علیین تک کے تمام حجابات اُٹھا دیئے گئے تھے۔ اور حضورؐ مولانا احمد علی لاہوری کے درسِ قرآن میں بہ مقام لاہور تشریف نہیں لائے تھے بلکہ انہی مقامات میں سے کسی مقام پر رونق افروز تھے! اس مفہوم کے اخذ کرنے کے لئے اس عبارت میں کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا۔ اپنی بات کی پچ کے لئے کوئی پانی کہہ کر آگ مُراد لے اور اس کی یہ تاویل کرے کہ پانی جب زیادہ گرم ہو جاتا ہے تو اُس میں آگ کی سی حرارت پیدا ہو جاتی ہے ——— اس قسم کی نکتہ آفرینیاں کم از کم اُن حضرات کو زیب نہیں دیتیں جو صرف محقق ہی نہیں بلکہ "راس المحققین" ہیں!

مولانا سید امین الحق صاحب "راس المحققین و اسوۃ الصالحین" نے کتاب و سُنّت اور آثارِ صحابہؓ سے ایک بھی ایسا واقعہ یا دلیل پیش نہیں کی جس سے یہ ثابت ہو کہ وفات پانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی رویت بہ حالتِ بیداری کسی کو ہوئی ہو' اور نہ صرف رویت بلکہ رویت و مشاہدہ کرنے والے نے حضورؐ کی آواز لفظوں کے ساتھ بھی سُنی ہو۔

راس المحققین صاحب کو بہ حالتِ بیداری رویتِ رسولؐ و صحابہؓ کی کوئی دلیل' ثبوت اور مثال نہ مل سکی، اور ملتی کہاں سے جبکہ دین میں اس قسم کے تصورات و عقائد سرے سے پائے ہی نہیں جاتے! اس صورت میں ایک محقق اور طالبِ حق کی حیثیت سے اُن کا فرض تھا کہ اگر وہ اپنے پیر و مُرشد کے درسِ قرآن سے متعلق مذکورہ بالا واقعہ سے اظہارِ برات نہ کر سکتے تھے، تو سکوت اختیار فرما سکتے تھے، یعنی نہ تصدیق نہ تردید' مگر انھوں نے اس واقعہ کی تصویب و تائید میں تین ایسی مثالیں پیش کی ہیں جن پر قیاس مع الفارق کا اطلاق ہوتا ہے۔

پہلی مثال: ——— "حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ جنت کے باغیچوں میں سے مومن کی قبر ایک باغیچہ ہے' اور جہنم کے گڑھوں میں سے غیر مخلص مومن کی قبر ایک گڑھا ہے، مراد یہ ہے کہ مومن اور کافر کی قبر بہشت کی نعمتوں اور جہنم کے عذاب سے جنت کا ٹکڑا یا جہنم کا گڑھا بنتی ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ جنت اور جہنم قبروں میں بہ ہو بہو پہنچائے جاتے ہیں"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول صحیح ہے' اس پر ہمارا ایمان ہے مگر "راس المحققین" صاحب اس سے آخر ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں' اس حدیث سے وفات پانے کے بعد حضورؐ کی رویت بہ عالمِ بیداری کہاں ثابت ہوتی ہے! حضورؐ کی ایک اور حدیث ہے کہ میری قبر اور منبر کے درمیان کا حصہ "روضۃ من ریاض الجنۃ" ہے! ظاہر ہے کہ مسجد نبویؐ کے جس حصہ کو حضورؐ نے ریاض جنت کا روضہ فرمایا ہے' اُس میں نہ کسی کو حوریں نظر آتی ہیں' نہ وہاں لالہ و گل کھِلے ہوئے ہیں اور نہ وہاں نہریں بہتی ہیں' نہ سونے چاندی کے مکان دکھائی دیتے ہیں' یہ حضورؐ نے تمثیلاً فرمایا ہے کہ برکت، سکون اور اللہ کی رحمت کے اعتبار سے وہ گویا کہ بہشت کا ایک ٹکڑا ہے' ایک مُسلمان کو اُس مقدس و مُبارک قطعہ ارض میں بیٹھ کر ذکر الٰہی کرنا چاہیئے تاکہ طبیعت کو نشاط و راحت محسوس ہو' اور

آخرت میں جنّت کی نعمتیں میسر آئیں!

دوسری مثال: — "انس بن نضر نے فرمایا اے سعد! میں اُحد کے پیچھے جنّت کی خوشبو پاتا ہوں" اس کے معنی یہ ہے کہ حضرت انس کو اُحد کے پیچھے بہشت کی خوشبو عالمِ غیب کے ایک امر کا مشاہدہ اور وجدان ہو رہا ہے، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اُحد پہاڑ کے پیچھے جنت اپنے مقام سے لائی گئی ہے"

شہداء کو اللہ تعالیٰ ابدی زندگی اور جنّت کی نعمتیں عطا فرماتا ہے حضرت انس بن نضر کے دل و دماغ شوقِ شہادت سے معمور تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے وعدے پر ان کے یقین کا یہ عالم تھا کہ انہیں اُحد میں گویا کہ باغِ بہشت کی خوشبو آرہی تھی، یہ واقعہ بھی ہو سکتا ہے اور تمثیلی انداز بھی! میں عرض کرتا ہوں کہ کوئی شخص اگر کسی مسجد میں، خانقاہ میں اور وعظ و ارشاد کی محفل میں یہ کہدے کہ اس مقام پر تو مجھے جنت کی بہار نظر آرہی ہے، تو اس پر اعتراض نہیں کیا جائے گا، وہاں کے ماحول کو دیکھ کر اُسے جو کچھ محسوس ہوا کہ اُس نے اُس کو تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے ——— مگر زمین و آسمان کا فرق ہے اُحد میں جنت کی خوشبو سونگھنے اور اس واقعہ میں کہ ایک شخص بیداری کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتا ہے اور حضورؐ کی آواز سنتا ہے!

تیسری مثال: — "حضرت حنظلہؓ فرماتے ہیں جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور آپ ہم کو دوزخ یا بہشت کی یاد دلاتے ہیں تو ہم اُس وقت ایسے ہوتے ہیں گویا کہ ہم کھلی آنکھوں بہشت اور دوزخ کو دیکھ رہے ہیں، حضرت حنظلہ کی مُراد یہ ہے کہ حضورؐ کی صحبت میں بہشت و دوزخ کا استحضار ہمارے قلوب پر اس قدر قوی اور غالب ہوتا ہے کہ اس کا اثر حاسۂ بصر تک پہونچتا اور سرایت کرتا ہے اور ہم آنکھوں سے حضورؐ کی صحبت میں بہشت اور دوزخ کو دیکھتے ہیں، مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ حضورؐ کی صحبت میں بہشت اور دوزخ صحابہ کے سامنے لائے جاتے ہیں"

ٹھیک اسی طرح حضرت شیخ کی صحبت میں کسی صاحبِ حال کو کتاب و سُنّت کے درس میں رسالت مآبؐ اور صحابہؓ کا ذکر کرتے وقت رسالت مآبؐ اور صحابہؓ کی رویت اور مشاہدہ ہو سکتا ہے"۔

"ایسا ہو سکتا ہے"، "اس کا امکان ہے" ——— یہ اندازِ بیان نہ دلیل ہے نہ حجت ہے اور نہ ثبوت ہے، دینی عقیدہ کے معاملہ میں ظن و تخمین اور قیاس سے کام نہیں چلتا، اس کے لئے واضح دلیل اور کوئی مُستند واقعہ پیش کرنا چاہیئے کہ فلاں صحابی کے ساتھ ایسا معاملہ پیش آچکا ہے، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ارشاد فرمایا ہے کہ وفات پانے کے بعد بہ حالتِ بیداری لوگ مجھے دیکھا کریں گے اور میری آواز اور گفتگو سُن سکیں گے!

ملہ یہ راس المحققین صاحب کی محض قیاس آرائی اور نکتہ آفرینی ہے کہ یہ تاثر صحابہ کے حاسۂ بصر تک پہونچتا تھا اور وہ اپنی آنکھوں سے واقعی جنت و دوزخ کا مشاہدہ کرتے تھے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک کا جو ذکر احادیث و سیر کی کتابوں میں ملتا ہے کہ صحابہ اس طرح حضورؐ کی مجلس میں بیٹھتے تھے گویا کہ اُن کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں تو کیا صحابہ کرام کے سروں پر واقعی گوشت پوست کی زندہ چڑیاں بیٹھا کرتی تھیں! حیرت ہے کہ صاحب موصوف واقعیت اور پیرایۂ بیان میں فرق نہیں کرتے۔

جنت و دوزخ کا حال سُن کر اس قسم کی کیفیت کا پیدا ہو جانا گویا کہ جنت و دوزخ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس میں اور اگر روایت میں جو "گویا کہ" کی تمثیل سے ہرگز ملتی جلتی نہیں ہے بلکہ واقعاتی حیثیت رکھتی ہے کہ دیکھنے والے نے رسول اللہ کو اپنی آنکھ سے جاگتے میں دیکھا اور حضورؐ کی آواز بھی سُنی، زمین و آسمان کا فرق ہے! اس طرح تو جس کسی کا بھی ذکر ہو، ہر سُننے والا کہہ سکتا ہے کہ صاحبِ ذکر کو گویا کہ میں دیکھ رہا ہوں، اس میں کشف و کرامت کی کوئی بات نہیں ہے، یہ تو اظہارِ تاثر کا پیرایہ ہے! مثلاً یوں بولتے اور لکھتے ہی ہیں ـــــــ جنگ کے میدان میں اس قدر گھمسان کا رن پڑا کہ ہر طرف موت منڈلاتی دکھائی دے رہی تھی ـــ یہ جنگ کی شدت کا پیرایہ بیان ہے ورنہ ظاہر ہے کہ موت مادی جسم نہیں رکھتی جو لوگوں کو مجسم اور متجسد ہو کر نظر آئے۔

"راس المحققین" صاحب نے جو تین مثالیں پیش کی ہیں، ان میں سے کسی مثال سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وفات پانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت حالتِ بیداری میں ہو سکتی ہے! اس عبارت کے ذیل میں صاحب موصوف نے ایک نوٹ دیا ہے، فرماتے ہیں :-

> "موجودہ دور میں سائنس نے اس مسئلہ کو اور صاف کر دیا ہے، اگر ایک شخص امریکہ میں تقریر کر رہا ہو۔ اور پاکستان میں ٹیلی وژن پر اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، اور اس کی آواز سُنی جا سکتی ہے، تو روحانی ذریعے سے کیوں حضور علیہ السلام کی رویت حاصل نہیں ہو سکتی۔"

یہ تو ٹھیک وہی اندازِ بیان ہے، جو اہلِ بدعت اس قسم کے مباحث میں اختیار کرتے ہیں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقیدت کے جس غلو سے روکا تھا، اور جس غلو کے سبب پچھلی اُمتیں تباہ ہو چکی ہیں۔ اپنے بزرگوں اور پیروں کے بارے میں اس غلوِ عقیدت میں مبتلا ہونے کا یہی نتیجہ نکلنا چاہیئے کہ "شرک و بدعت" کی تردید کرنے والے بھی "اہلِ بدعت" کی سطح پر آ جائیں! اہلِ بدعت اسی انداز سے سوچتے ہیں اور اسی قسم کی دلیلیں لاتے ہیں کہ جب موت کا فرشتہ بیک وقت ہزاروں مقامات پر پہونچ کر روحیں قبض کر سکتا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو فرشتوں کیا انبیاء سے بھی افضل ہیں، ایک ہی وقت میں ہر جگہ "حاضر و ناظر" کیوں نہیں ہو سکتے۔ مولانا امین الحق صاحب کی طرح وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ لوہے کا بنا ہوا ریڈیو ٹرانسمیٹر جب دُنیا بھر میں خبریں پہونچا سکتا ہے" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا والوں کی التجا اور فریاد کیوں نہیں سُن سکتے ـــــــ اے حضرت راس المحققین! اور قبلہ اسوۃ الصالحین! سوچئے تو سہی کہ اس اندازِ فکر کے بعد توحید کا کوئی گوشہ مجروح ہونے سے محفوظ رہ سکتا ہے؟ خدا کے نیک بندو ٹھنڈے دل سے غور تو کرو کہ اپنے بزرگوں اور پیروں کی روحانیت، ولایت اور کشف و کرامت ثابت کرنے کے لئے تمہارے قلم و زبان سے کیسی کیسی سخت قابلِ اعتراض باتیں نکل جاتی ہیں! ہمیں کتاب و سنت پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے کہ بزرگوں کے ملفوظات پر کسی بزرگ کے کشف و وجدان کے نہ ماننے سے دین کا، ذرا سا نقصان بھی نہیں ہو سکتا مگر توحید و سُنت غبار آلود ہو جانے سے اسلام اور ایمان کا نقصان ہی نقصان ہے!

یہ بات اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں ہے کہ مولانا احمد علی لاہوری کی تفسیر کو حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے یہاں تک کہ مولانا موصوف کو مولانا احمد علی صاحب کی تفسیر کی غلطیوں پر ایک رسالہ (التقصیر فی التفسیر) تحریر کرنا پڑا، ایک طرف تو ان ابدال صاحب کا یہ مشاہدہ اور سماع کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مولانا احمد علی صاحب لاہوری کی تفسیر کے ایک ایک جملہ پر تین تین بار "صدقت" فرمائیں، اور دوسری طرف حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کو مولانا احمد علی قدس سرہٗ کی تفسیر میں کوتاہیاں، خامیاں اور غلطیاں نظر آئیں! اس واقعہ رویتِ رسولؐ کو درست ماننے کے بعد

حضرت مولانا تھانوی کا کیا موقف رہ جاتا ہے؟

اس مضمون میں راس المحققین صاحب نے صحیح مسلم کی ایک حدیث پیش کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جس نے مجھے خواب میں دیکھا، وہ عنقریب مجھے بیداری میں دیکھ لے گا" ——— اس حدیث کا تعلق حضورؐ کی اس زندگی سے ہے، جب حضورؐ اس دُنیائے آب و گل میں جسدِ اطہر کے ساتھ زندہ تھے، حضورؐ یہ فرما رہے ہیں کہ میری زندگی میں جو کوئی مجھے خواب میں دیکھے گا، وہ مجھے بیداری کی حالت میں یعنی اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لے گا۔ اور بالمشافہ میری زیارت کرے گا۔ حضورؐ نے یہ کہاں فرمایا ہے کہ وفات پانے کے بعد میں لوگوں کو نظر آیا کروں گا۔

برسبیلِ تنزل فرض کر لیجئے کہ اس حدیث سے یہی مُراد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عالمِ بیداری میں بھی حضورؐ کی رویت ہوا کرتی ہے مگر حضرت مولانا احمد علی لاہوری کے درسِ قرآن میں رویت کا جو واقعہ پیش آیا ہے، اس سے صرف "رویت" ہی نہیں، حضورؐ کا تکلم فرمانا بھی ثابت ہے! اور اس واقعہ میں یہ بھی ملتا ہے کہ اس شخص نے نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالمِ بیداری میں دیکھا بلکہ صحابہ کو بھی دیکھا! پھر صوفیا کے حالات میں یہ تک ملتا ہے کہ فلاں فلاں وفات پا کے ہوئے بزرگوں سے عالمِ بیداری میں اُن کی ملاقاتیں ہوئی ہیں ——— اس طرح "رویت و مشاہدہ" اور "کشف و کرامت" کے بعد مرنے والوں کے بارے میں جو عقیدہ اور تصور قائم ہوتا ہے وہ کس درجہ خطرناک اور اضطراب آمیز ہے اور اس میں کتنے مزلّات ہیں۔

کشف و کرامات کے ذریعہ "رویت و مشاہدہ" کے اس قسم کے واقعات کا کھلا ہوا نقصان اور ظاہری خطرہ یہ ہے کہ کوئی غلط قسم کا صوفی یا بدعتی عالم جس کے بہت سے معتقدین اور مُریدین ہیں، کتاب و سُنّت کی اپنے عقائد کے مطابق غلط اور مشتبہ شرح کرتا ہے، اب کوئی معتقد جو اس محفل میں موجود ہے کہتا ہے کہ میں نے ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا۔ حضورؐ مسکرا رہے تھے اور تحسین آمیز انداز میں دستِ مبارک کو جنبش دے رہے تھے کہ کتنی اچھی شرح کی جا رہی ہے ——— راس المحققین صاحب فرمائیں کہ کیا آپ اس شخص کو جھٹلا سکتے ہیں جب کہ آپ کا خود یہی عقیدہ ہے کہ کشف و کرامت کے ذریعہ رویتِ رسولؐ عالمِ بیداری میں ہو سکتی ہے اسی لئے بزرگوں کے کشف، وجدان اور کرامت کو دین میں حجّت نہیں مانا گیا، اُن کی بنیاد پر نہ کوئی فقہی مسئلہ متفرع ہو سکتا ہے اور نہ کسی عقیدہ کی تشکیل کی جا سکتی ہے، اسی طرح صوفیا کے رسوم و اشغال کی بھی دین میں کوئی حیثیت نہیں ہے ——— تو جو چیزیں دین میں حجت اور لائقِ استناد ہی نہیں ہیں، اُن کو دینی مباحث میں پیش کیوں کیا جاتا ہے! سوال کسی بزرگ کی ذات پر اعتماد و اطمینان اور بے اعتمادی و بے اطمینانی کا نہیں ہے، سوال اصول کا ہے۔ جو شخصیتوں سے بلند ہے، حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک صحابی نے حدیث بیان کی، آپ نے فرمایا اس کی تائید میں شہادت لاؤ ورنہ احتساب و مواخذہ کیا جائے گا، صحابی نے اس حدیث کی تائید میں دوسرے شاہد کو پیش کیا، تب جا کر حضرت عمرؓ مطمئن ہوئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اُن صحابی کو جھوٹا نہیں سمجھتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے پیشِ نظر روایتِ حدیث کے اصول کی حفاظت تھی۔

کتاب و سُنّت، سیرۃ النبی اور سیرۃ الصحابہ کے مطالعہ سے جو دینی فکر، دینی مزاج اور علم و تقویٰ کی زندگی کا منہج و انداز متشکل ہوتا ہے، اُس کا پرتو ائمۂ فقہ اور ائمۂ حدیث کی زندگیوں میں نظر آتا ہے، وہاں نہ "انا الحق" کا نعرہ ہے نہ وحدت الوجود کی نکتہ آفرینیاں ہیں، نہ قبر پر چلّہ کشی، اعتکاف اور مراقبے ہیں، نہ رقص و سماع ہے، وہاں نہ طریقت کے خانوادے ہیں، اور نہ پیر مُریدوں کو شجرے پڑھنے کی اجازت دی جاتی ہے ——— اس کے مقابلے میں صوفیا کے احوال و کوائف کا رُخ اس رُخ کے مطابق نظر نہیں آتا ہے!

طریقہ فکر، لب و لہجہ اور زندگیوں کا انداز بدلا ہوا سا ہے، باریکیاں ہیں، نہ الجھنیں، گہرائیاں اور تکلفات ہیں، ایسے ایسے پیچیدہ مباحث ہیں کہ جو سلجھانے سے اور الجھ جاتے ہیں! آپ امام ابو حنیفہ اور امام بخاری کی زندگیوں کو پڑھیئے اور اس کے ساتھ شیخ محی الدین ابن عربی اور شیخ عبدالوہاب شعرانی کے حالات کا مطالعہ فرمایئے ان زندگیوں میں آپ کو کیفیت ہی نہیں انداز فکر اور لب و لہجہ تک کا خاصہ فرق نظر آئے گا۔ اور ایسا محسوس ہوگا جیسے امام ابو حنیفہؒ اور امام بخاریؒ آب سادہ پیتے ہیں، جس کے سبب ان کے حالات میں فطرت کا قانون نظر آتا ہے، مگر شیخ عربیؒ اور عبدالوہاب شعرانیؒ نے آب سادہ کی جگہ کوئی ایسا محلول نوش فرمایا ہے، جس نے ان میں مستی و سرشاری پیدا کر دی ہے!

صوفیاء کرام کے ملفوظات اور مکاشفات کی یہ صورت ہے کہ ان میں اخلاق و تقویٰ، حکمت اور تزکیہ و نفس کے لعل و گہر بھی پائے جاتے ہیں، یہ جہاں پائے جائیں گے ان کی قدر کی جائے گی، ان ملفوظات میں بعض ایسی باتیں بھی ہیں جن کی نہ تصدیق کی جا سکتی ہے اور نہ تائید، بس سکوت!! ان ملفوظات و مکاشفات میں بعض ایسے اجزا بھی ہیں جو "متشابہات" کا درجہ رکھتے ہیں، اور بعض میں خطرات اور مزلات پائے جاتے ہیں، جن سے اجتناب ہی کرنا چاہیئے، صوفیاء کرام کے بعض شطحیات کی تاویل بھی نہیں ہو سکتی! اس کے مقابلہ میں صحابہ کرامؓ، تابعین عظام، اور ائمہ فقہ و حدیث کے ملفوظات اور سوانح حیات میں کسی قسم کا ایچ پیچ اور باریکی نہیں پائی جاتی، سیدھی سچی صاف و سادہ زندگی، کوئی الجھاؤ اور ایہام و ابہام نہیں، کتاب و سنت کی جلوہ گری! جس نے صوفیاء کرام کے ملفوظات ہی پر تکیہ کیا، اس نے اپنے کو خطرے میں مبتلا کیا، اور جس نے سیرۃ النبی، اور صحابہ و تابعین کے آثار و احوال کو ذہن میں رکھ کر صوفیاء کے حالات و ملفوظات کو پڑھا، وہ خطرات سے محفوظ رہے گا! اس لئے کہ اس کے سامنے کسوٹی ہوگی، اس کسوٹی پر جس کی بات پوری اترے گی، اسے قبول کر لیا جائے گا، جس کسی کی بات اس معیار کے مطابق نہ ہوگی، اسے چھوڑ دیا جائے گا۔

سو فیصدی بات اللہ اور رسول کی سچ ہے، اس کے بعد صحابہ کرام کے آثار و اقوال ہیں کہ جن میں ہمارے لئے نمونہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت کردہ اور فیض یافتہ ہیں، اب رہیں دوسری کتابیں تو ان میں ہر طرح کی باتیں ملتی ہیں، یہ اہل تحقیق کا فرض ہے کہ وہ کھرے اور کھوٹے میں تمیز کریں!

صوفیاء کرام کے جو حالات، ملفوظات اور مکاشفات و کرامات کتاب و سنت کے مطابق ہیں، وہ ہمارے سر آنکھوں پر، مگر جہاں اس قسم کے واقعات ملیں کہ فلاں بزرگ نے وجد و بیخودی کے عالم میں نعرہ لگایا اور بستی سے جنگل کو نکل گئے، اور وہاں سات برس درختوں کی پتیاں کھا کر زندگی بسر کی ——— اس واقعہ کو پڑھ کر وہ شخص جس کی نگاہ صحابہ کرام اور تابعین عظام کے حالات پر ہے چونک پڑے گا کہ ان نفوس قدسیہ کے یہاں اس قسم کے واقعات نہیں ملتے ——— پھر جنگل میں صرف درختوں کی پتیوں پر سات سال تک زندگی گزارنا مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے اور پھر جنگل میں رہنے کے سبب وہ بزرگ نماز با جماعت کے عظیم ثواب سے جو محروم ہو گئے! اس زندگی میں عام مسلمانوں کے لئے کوئی نمونہ نہیں ہے کہ اس واقعہ کی تقلید اور اسے عملی جامہ پہنانا انسانوں کی عام فطرت کے مطابق نہیں ہے! کسی بزرگ کے حالات میں ملتا ہے کہ انھوں نے کھانا تناول فرمایا اور کھانا کھانے میں زبان کو جو لذت حاصل ہوئی تو انھوں نے اپنی زبان اپنے دانتوں سے چبا ڈالی، اس واقعہ پر بھی پڑھنے والے کو خاصی کھٹک محسوس ہوگی کہ کھانے کی لذت کا زبان سے محسوس کرنا کوئی گناہ کی بات نہیں ہے جس پر زبان کو یہ سزا دی گئی! اللہ تعالیٰ نے جو قوتیں عطا فرمائی ہیں ان سے جائز حدود میں رہ کر فائدہ اٹھانا دین میں کوئی ناپسندیدہ بات نہیں ہے، پھر کسی شخص کے کسی عضو سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے مثلاً آنکھ سے نامحرم عورت کی نظارہ بازی ——— تو ایسا کرنے پر توبہ و استغفار کرنی چاہیئے، ایسا کرنے کا حکم نہیں ہوا کہ وہ آدمی جس کی نگاہ

گناہ کی مرتکب ہوئی ہے اپنی آنکھوں کو پھوڑ لے۔

ایک صوفی بزرگ قرآن کریم کی شرح و تفسیر کرتے ہوئے حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی پیدائش کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جبریلؑ نے حقیقتِ محمدی رحمِ مریم میں پھونک دی تھی اس لئے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تمثالی ابنیت کا تعلق حضرت نبیٔ آخر سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے ہے ــــــ قرآن کی اس تفسیر کو ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا بلکہ اس پر نکیر کی جائے گی کہ یہ نکتہ آفرینی خود قرآن کریم کے مفہوم و منشاء کی مخالفت ہے ــــــ کسی بزرگ کی عبادت گزاری کا یہ حال کہ وہ ایک رات میں دو ہزار رکعت نفل پڑھ لیا کرتے تھے، پڑھنے والے کو کھٹکے گا کہ بیان کرنے والے نے مبالغہ سے کام لیا ہے کہ اگر کوئی شخص مغرب سے لے کر فجر تک کسی وقفہ کے بغیر اس عجلت کے ساتھ نماز پڑھے کہ ایک منٹ میں ایک رکعت پوری ہو جائے تو وہ سات سو بیس رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھ سکتا۔

کوئی بزرگ فرماتے ہیں کہ فرشتوں نے جسدِ آدم میں تجلّیٔ الٰہی کو دیکھ کر سجدہ کیا تھا حالانکہ قرآنِ کریم کے بیان سے جو چیز کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کے محض حکم کی تعمیل و اطاعت میں حضرت آدمؑ کے آگے سجدہ ریز ہوئے تھے ــــــ واعبد ربک حتیٰ یاتیک الیقین ــــــ کی اس انداز میں تفسیر کہ "یقین" حاصل ہونے کے بعد تکلیفاتِ شرعی ساقط ہو جاتی ہیں بالکل غلط تفسیر ہے صحابۂ کرامؓ سے بڑھ کر یقین اور کس کو حاصل ہو سکتا ہے مگر یہ نفوسِ قدسیہ مرتے دم تک شریعت کے ایک ایک جزئیہ کی پابندی کرتے رہے ــــــ کسی صوفی کا اس قسم کا بیان کہ میرے پیر و مرشد تو ہر دم میرے ساتھ ساتھ رہتے ہیں، حالانکہ اس قسم کی "معیت" صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔

یہ چند نمونے یہ دکھلانے کے لئے پیش کئے گئے ہیں کہ صوفیاء کے ملفوظات و حالات میں جب اس قسم کی باتیں ملتی ہیں تو دل کھٹک محسوس کرتا ہے! اس قبیل کے ملفوظات ہرگز اس قابل نہیں کہ انہیں سند و مثال کے طور پر پیش کیا جائے، مگر وہ لوگ جو بزرگوں کے غلو عقیدت میں مبتلا ہیں، انہیں سب سے زیادہ شغف اسی قسم کے اضطراب اور خلجان پیدا کرنے والے "نکات و مکاشفات" سے ہے چنانچہ حلقہ خدام الدین کے راس المحققین صاحب بھی یہی ذوق رکھتے ہیں، اس ذوق و مزاج کا آدمی اہلِ تحقیق ہو ہی نہیں سکتا، چہ جائیکہ اُسے "راس المحققین" کے لقب اور خطاب سے یاد کیا جائے ــــــ "لطائف المنن" سے شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ کے یہ مکاشفات انھوں نے نقل کئے ہیں:۔

> "اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ انعام فرمایا ہے کہ مصر میں ہوتے ہوئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اس طرح گفتگو کرتا ہوں جیسے کوئی اپنے ہم مجلس سے بات کرتا ہے، میں مصر میں ہوتا ہوں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آرامگاہ پر میرے ہاتھ ہوتے ہیں اور فرمایا جس کو یہ حال و ذوق حاصل نہیں ہے، اس قسم کی گفتگو اور مشاہدہ کا انکار کرتا ہے"۔

ہم جیسے بے ذوق نیاز مند گزارش کرتے ہیں کہ کیا صحابۂ کرام کو یہ حال و ذوق حاصل تھا، اور اُن کا اس قسم کا کوئی مستند واقعہ، قول، مکاشفہ یا کرامت و مشاہدہ ملتا ہے ــــــ اور سنئے:۔

> "شیخ ابی العباس مرسی فرماتے ہیں، میں نے اس ہاتھ سے حضورؐ کے سوا اور کسی سے مصافحہ نہیں کیا ہے اور فرمایا اگر میں ایک لمحہ کے لئے حضورؐ کی زیارت کے شرف سے محروم ہو جاؤں، تو میں اپنے آپ کو مسلمانوں کے زمرہ میں شمار نہ کروں (الحاوی)

حالانکہ خود حضورؐ کی زندگی میں صحابہ کرامؓ باہر کی بستیوں سے چل کر حضورؐ کی زیارت کے لئے آتے تھے، کسی صحابی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ہم حضورؐ سے دور رہ کر ہر لحہ آپؐ کی زیارت کرتے رہتے ہیں اور اپنے گھروں میں بیٹھے ہوتے ہی حضورؐ سے مصافحہ کر لیا کرتے ہیں ــــ اور نہ حضورؐ کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ کو اس قسم کے مکاشفات کا تجربہ ہوا۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

ہر شخص اس بات کو جانتا ہے کہ دین میں حجت کتاب و سنت ہیں اور پھر آثار صحابہ کا درجہ ہے! جب دین کی بحث چھڑی تھی تو راس المحققین صاحب کو کتاب و سنت اور آثار صحابہ سے اس کی کوئی دلیل پیش کرنی تھی کہ کسی صحابی نے وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (خواب میں نہیں) بحالت بیداری دیکھا ہے، حضورؐ سے گفتگو کی ہے، حضورؐ کے ساتھ نماز پڑھی ہے اور حضورؐ سے مصافحہ کیا ہے ــــ صوفیا کے مکاشفات اگر دین کے معاملات میں حجت ہوتے تو پھر مولانا احمد علی لاہوری مرحوم کا قول اس باب میں کافی تھا! جس جماعت، مکتبہ فکر و خیال اور حلقہ وجد و حال کے اصحاب پر گرفت کی جا رہی ہے حیرت ہے کہ انہیں کے مکاشفات دلیل کے طور پر پیش فرمائے جا رہے ہیں! بحث و مناظرہ اور تحقیق کا آخر یہ کیا انداز ہے؟ مثلاً ایک شاعر جو "وحدت الوجود" کا قائل ہے، اللہ تعالیٰ کے بارے میں کہتا ہے ــــ

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ

اس پر یہ اعتراض وارد کیا جاتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسا سوچنا اور یہ عقیدہ رکھنا، درست نہیں ہے ــــ تو دوسرا شخص جو اس نظریہ اور عقیدہ کا حامی اور اس شاعر کا عقیدت مند ہے کتاب و سنت سے دلیل پیش کرنے کی بجائے وہ دوسرے متعدد شعراء کے اشعار نقل کر دیتا ہے کہ انھوں نے بھی تو اپنے اشعار میں اسی عقیدہ اور نظریہ کی ترجمانی کی ہے! راس المحققین صاحب نے اپنے مضمون میں یہی انداز اختیار فرمایا ہے، جو کم سے کم اہلِ تحقیق کو کسی طرح زیب نہیں دیتا۔

مولانا سید امین الحق (راس المحققین) نے علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال و ارشادات متعدد مقامات پر پیش کیے ہیں! حافظ سیوطیؒ کے ان اقوال کو پڑھ کر اس بات کی مزید تصدیق ہو گئی کہ ان کو جو "حاطب اللیل" کہا جاتا ہے، وہ خلافِ حقیقت نہیں ہے، حافظ جلال الدین سیوطیؒ کی جلالتِ علمی سے انکار نہیں ہے مگر ان کے یہاں رطب و یابس سبھی کچھ پایا جاتا ہے ان کا حال اس شخص (حاطب اللیل) کا سا ہے، جو رات کی تاریکی میں لکڑیوں کے ساتھ سانپ بھی گٹھے میں باندھ دیتا ہے! "اہلِ تحقیق" کا یہ فرض ہے کہ وہ علم و اطلاع اور ملفوظات و ارشادات کے ان گٹھوں سے کام کی لکڑیاں چن لیں اور سانپوں اور بچھوؤں کو اٹھا کر پھینک دیں!

حافظ جلال الدین سیوطیؒ کے رسائل و نوادر کا ماخذ کیا ہے اس بارے میں شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ عجالہ نافعہ میں تحریر فرماتے ہیں ــــ

طبقہ رابعہ ــــ احادیثے کہ نام و نشان او در قرون سابقہ معلوم نہ بود، و متاخراں آں را روایت کردہ اند پس حال آں از دو شق خالی نیست یا سلف تفحص کردہ اند و آں را اصلے نیافتہ اند تا مشغول بروایت آں شوند۔ یا یافتند و در آں قدحے و علتے دیدند کہ باعث شد ہمہ آں را بر ترک روایت آں ــــ و علیٰ کل تقدیر ایں احادیث قابل اعتماد نیستند کہ در اثبات عقیدہ یا عملے بآنہا تمسک کردہ شود و مایہ شیخ جلال الدین سیوطی در رسائل و نوادر خود ہمیں کتاب ہا است و اشتغال بہ

احادیث ایں کتب باستنباط احکام از آں باطائل می نماید۔ ۔ ۔"

ترجمہ :۔ "محدثین کا چوتھا طبقہ وہ ہے کہ جو ایسی حدیثیں بیان کرتے ہیں کہ قرونِ سابقہ میں اُن کا نام و نشان نہیں ملتا، اور متاخرین اُن کو روایت کرتے ہیں، پس ان کا حال دو شقوں سے خالی نہیں ہے، یا تو سلف نے ان حدیثوں کے بارے میں جستجو کی اور ان کی کوئی اصل نہ پائی کہ وہ ان روایتوں کو کام میں لائیں —— یا پھر یہ روایتیں انھوں نے پائیں لیکن ان میں کسی نقص اور خرابی کو دیکھا۔ جس کے سبب انھوں نے ان کا روایت کرنا ترک کر دیا۔ ہر صورت میں یہ احادیث اعتماد کے قابل نہیں ہیں کہ ان سے کسی عمل اور عقیدہ کے لئے ان سے تمسک کیا جائے —— شیخ جلال الدین سیوطیؒ کی تصانیف کا سرمایہ ان کے رسائل و نوادر یہی کتابیں ہیں۔ اور ان کتابوں کی احادیث سے کام لینا اور ان سے استنباطِ احکام لاطائل (بیکار اور عبث) ہے"

کاش ! راس المحققین صاحب یہ سوچنے کی زحمت گوارا فرمائیں کہ حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کے جن اقوال کو انھوں نے شدو مد کے ساتھ پیش فرمایا ہے اُن کی علمی حیثیت کیا ہے ؟ اور انھوں نے اپنے پیر و مرشد کی مدافعت میں کتنے کمزور سہارے تلاش کئے ہیں —

انبیاء کرام کے معجزات اور اولیاء اللہ کی کرامات کے ہم منکر نہیں ہیں، مگر معجزات و کرامات کی بھی اقوال و روایات کی طرح صحت ضروری ہے، یہ معجزہ کس قدر مشہور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اطہر کا سایہ نہ تھا، لیکن جب تحقیق کی گئی تو پتہ چلا کہ یہ بات حد درجہ کمزور ہے ! اولیاء اللہ کی کرامات کو بھی کتابِ سنت اور آثارِ صحابہ کی کسوٹی پر جانچا اور پرکھا جائیگا ہفتہ وار "خدام الدین" میں جو مقالہ ہمارے مضمون کے جواب میں شائع ہوا ہے، اُس میں صوفیاء کے کشف و کرامات کی جو روایتیں نقل کی گئی ہیں، اُن سے یہ صورت ملتی ہے —— کہ وفات پاتے ہوئے بزرگوں کو لوگ بہ حالتِ بیداری نہ صرف یہ کہ دیکھتے ہیں بلکہ اُن کے ساتھ نمازیں پڑھتے ہیں، اُن سے گفتگو کرتے ہیں، یہاں تک کہ اُن سے مصافحہ بھی کرتے ہیں —— کیا اس عقیدہ اور مکاشفہ کی کتاب و سنت سے تائید ہوتی ہے ! نہیں ہوتی۔ کیا صحابہ کرامؓ کشف و کرامات میں کسی صوفی سے کمتر تھے، اُن کے یہاں اس قسم کے مکاشفات اور مشاہدات ملتے ہیں ؟ نہیں ملتے !

اور سنئیے، راس المحققین صاحب ارشاد فرماتے ہیں :—

" ۔ ۔ ۔ جو شخص حضرت مولانا احمد علی صاحب قدس سرہٗ کے درس کے وقت ایک صاحبِ حال کی کرامت اور حضورؐ کے رویت اور مشاہدے میں کیڑے نکالتا ہے، تو وہ صرف اولیاء کی کرامت میں کیڑے نہیں نکالتا، بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے دلائل اور صدق کے شواہد میں، معجزات نبوت کی شان اور مشکوٰۃ نبوت کی روشنی میں طہارتِ نفس اور تزکیہ نفس اور اقبال علی اللہ کے انوار و برکات میں کیڑے نکالتا ہے"—

سُنا آپنے اس منطق کا بھی بھلا کوئی جواب ہے کہ مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے درسِ قرآن میں جس شخص نے اپنا مشاہدہ بیان کیا تھا

کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرامؓ کی جمعیت کے ساتھ دیکھا تھا۔ اور حضورؐ کی زبان سے تین بار "صدقت" سنا تھا، اس کی تصدیق نہ کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے دلائل اور صدق کے شواہد میں کیڑے نکالے جا رہے ہیں ــــ خدا کے نیک بندو! غور تو کرو اپنے بزرگوں کی عقیدت میں مبتلا ہو کر تم کس سطح پر پہونچ گئے ہو، تمہارے زبان و قلم سے کیسی پر خطر باتیں نکل رہی ہیں، ایک مجہول شخص کے کشف و مشاہدہ کو نبوت کے صدق کے لئے دلیل سمجھنا کتنی غلط بات ہے! اب رہا طہارت نفس اور تزکیۂ نفس کا معاملہ تو صحابہ کرام جن کا حضورؐ نے براہِ راست تزکیۂ نفس فرمایا تھا، انھوں نے کسی ایسے واقعہ کا ذکر نہیں کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات پانے کے بعد ہم نے حضورؐ کو بہ حالتِ بیداری دیکھا ہے' اور حضورؐ کی آواز سنی ہے! تزکیۂ نفس کا وفات پاتے ہوئے لوگوں کو بہ حالتِ بیداری دیکھنے سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہے ــ

"فاران" میں ابوظفر حسین صاحب کا جو خط چھپا تھا، اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ میں مسجد میں سویا ہوا تھا۔ خدام الدین کے دفتر کے پاس اُوپر والے حجرے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زانوئے مبارک سے زانو ملے ہوئے ہیں ــ کس کے؟ مولانا احمد علی لاہوری صاحب کے"!

ہم نے اپنے مضمون میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں رویت سے انکار کہیں نہیں کیا، اس خواب کے بارے میں البتہ یہ لکھا :-

"۔ ۔ ۔ کہیں یہ مشاہدہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شیخ التفسیر صاحب کے زانو سے زانو ملائے بیٹھے ہیں ــــ

اور

۔ ۔ ۔ ان لوگوں کے غلو عقیدت کو کیا کہیے، جو اپنے پیروں کی بزرگی، کرامت، ولایت اور تقدس ثابت کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کے وقار تک کی پروا نہیں کرتے"

راس المحققین صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا ہے کہ حضورؐ کی زندگی میں صحابۂ کرامؓ حضورؐ کے قریب بیٹھتے تھے ــــ یقیناً بیٹھتے تھے، اس سے کسے انکار ہے! پھر انھوں نے وہ حدیث نقل کی ہے جس کے چند الفاظ یہ ہیں :-

حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ کے سامنے حضورؐ کی خدمت میں ایک ایسے صاحب حاضر ہوئے، جن کا لباس سفید ستھرا تھا، بال سیاہ تھے، سفر کے آثار اس پر ظاہر نہیں ہوتے تھے، اور کوئی بھی صحابہ میں سے اُن کو نہیں جانتا تھا۔ وہ صاحب حضورؐ کے سامنے، زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گئے۔ ۔ ۔ "

راس المحققین صاحب نے پوری حدیث نقل کر دی ہے مگر انھوں نے یہ نہیں لکھا کہ یہ صاحب تھے کون؟ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ جبرئیل علیہ السلام تھے، لیکن صاحب موصوف نے ان کا نام اس لئے بیان نہیں کیا کہ حالتِ خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زانو سے مولانا احمد علی لاہوری کے زانو ملانے پر موکد دلیل مل جائے کہ ایسے غیر معروف لوگ جن کو صحابہ جانتے تک نہ تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زانو سے زانو ملا کر بے تکلفی کے ساتھ بیٹھ جایا کرتے تھے! کہاں جبرئیل علیہ السلام کہ جن کی شان قرآن شریف میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ "علمہ شدید القویٰ"! حضرت جبریلؑ اور صحابۂ کرامؓ کے مقابلہ میں احمد علی صاحب لاہوری کا

کیا حیثیت ہے (چہ نسبت خاک را با عالم پاک) جو اس قسم کی مثالیں لائی گئی ہیں! ہماری گذارش کا مقصود یہ ہے کہ جو مریدین و معتقدین اپنے پیروں کے بارے میں غلو عقیدت میں مبتلا ہیں، اُن کے خواب اور کشف کے واقعات میں مبالغہ کا پایا جانا کچھ بعید نہیں ہے اور ایسے غالی عقیدت مندوں کے بیانات کم سے کم شبہ سے خالی نہیں ہیں۔

ہم نے اپنے مضمون میں عرض کیا تھا:-

"احادیث میں ضرور ملتا ہے کہ شبِ معراج میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے انبیاء کرام کی ملاقات ہوئی، اور آپ نے حضرت موسیٰؑ کو قبر میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا مگر ان واقعات کا تعلق عالمِ ارواح اور عالمِ برزخ سے ہے اور وہاں کے معاملات، واردات اور مشاہدات کی حیثیت متشابہات کی سی ہے، اس کی کنہ اور لِم معلوم کرنے کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے۔"

ہماری اس محتاط اور بہت سے اندیشوں، وسوسوں اور بحثوں سے نجات دلانے والی تحریر پر راس المحققین صاحب نے خاصی طویل تنقید فرمائی ہے، وہ کہتے ہیں:-

"لیکن رسالت مآبؐ کا معراج عالمِ شہادت کا واقعہ ہے اور یہ تمام جسمانی واقعات ہیں، ان پر عالمِ ارواح اور عالمِ برزخ کے واردات و معاملات پر متشابہات کا پردہ ڈالنا ماہر القادری کی بڑی زیادتی ہے۔"

یہ کس نے کہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج جسمانی نہیں رُوحانی ہوئی تھی۔ یقیناً حضورؐ کو شبِ اسریٰ میں جسم و رُوح کے ساتھ بہ حالتِ ہوش و بیداری لیجایا گیا، مگر احادیث میں جن آیات والواء کے دیکھنے اور انبیاء سے ملنے کی تفصیل ملتی ہے، اُس کا تعلق عالمِ ارواح اور عالمِ برزخ سے ہے! مثلاً حضورؐ کو جنت و دوزخ کا مشاہدہ کرایا گیا، حضورؐ نے مجرموں کو دوزخ کے عذاب میں مبتلا دیکھا، ظاہر ہے کہ "یوم الدین" یعنی قیامت میں اعمال کے وزن اور جواب دہی کے بعد لوگوں کو جنت اور دوزخ میں بھیجا جائے گا دوزخ میں اس وقت کسی مجرم کو عذاب نہیں دیا جارہا ہے —— تو یہ جو حضورؐ کو دوزخ میں عذاب کا مشاہدہ کرایا گیا اس کا تعلق اس عالمِ کون و فساد سے نہیں بلکہ کسی دوسرے ہی عالم سے ہے، جسے عالمِ ارواح یا عالمِ برزخ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے

آسمانوں پر انبیاء کرام سے جو حضورؐ کی ملاقات ہوئی تھی اُس کا تعلق بھی عالمِ آب و گل سے نہیں عالمِ ارواح سے ہے، یعنی حضورؐ نے بہ حالتِ جسم و جان بیداری میں عالمِ ارواح میں انبیاء کرام سے ملاقات فرمائی۔

اور

وہ جو مشہور ہے کہ بیت المقدس میں حضورؐ نے نماز میں انبیاء کرام کی امامت فرمائی تھی، اگر یہ روایت مستند اور صحیح ہے، تو اس کی یہی توجیہ کی جائے گی کہ بیت المقدس میں حضورؐ کی نماز میں امامت کا تعلق عالمِ ارواح سے ہے! اس توجیہ کے مقابلہ میں کوئی اس پر اصرار کرے کہ بیت المقدس کے درمیان انبیاء کرام بہ حالت جسد موجود تھے، تو وفات پانے کے بعد اس دنیا میں کوئی لوٹ کر نہیں آتا، چاہے وہ نبی ہی کیوں نہ ہو —— ومن ورائھم برزخ الی یوم یبعثون (المومنون) کی شرح و تفسیر میں شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

---

۱؎ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا کہ آپ پر موت ہی واقع نہیں ہوئی —— اللہ تعالیٰ نے آپ کو اُٹھا لیا تھا۔

"معلوم ہوا جو لوگ کہتے ہیں کہ آدمی مر کر پھر آتا ہے سب غلط ہے، قیامت کو اُٹھیں گے،
اس سے پہلے ہرگز نہیں۔" (موضح القرآن)

حیرت ہے کہ جن لوگوں کی عمریں علوم دینی کی تحصیل اور درس و تدریس میں گزری ہیں اُن کی سمجھ میں سامنے کی باتیں بھی نہیں آتیں، وہ سوچتے ہیں تو اُلجھے ہوئے ذہن سے سوچتے ہیں اور جو کچھ سوچتے ہیں اس کا زبان و قلم سے جب اظہار کرتے ہیں تو یہ اُلجھن اور بڑھ جاتی ہے! معلوم ایسا ہوتا ہے کہ "خانقاہی تصرفات" نے ان کے ذہنوں کو عجیب بنا دیا ہے" ورنہ صاحبِ ایمان کی فراست تو بہت جلد بات کی تہہ تک پہونچ جاتی ہے۔

یہ جو راس المحققین صاحب نے بہت سے صوفیوں کے کشف و کرامت کی مثالیں پیش کی ہیں، اُن کے بارے میں اس طرح سوچئے کہ یہی واقعہ جو مولانا احمد علی لاہوری مرحوم کے درسِ قرآن کا مابہ البحث ہے، جب ان کے ملفوظات میں درج ہو جائے گا۔ تو ایک دو صدی کے بعد لوگ کہیں گے، کہ لاہور میں ایک بزرگ گزرے ہیں، جو "امام الاولیاء" تھے اُن کی محفلوں میں "ابدال" شریک ہوا کرتے تھے، اس ابدال نے مشاہدہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت امام الاولیاء کی تفسیر قرآن کی تصدیق فرما رہے ہیں ——— اور اسی زمانہ میں مولانا سید امین الحق صاحب جو راس المحققین اور اسوۃ الصالحین تھے۔ انھوں نے دین و شریعت کے نقطۂ نگاہ سے اس واقعہ کی تائید اور تصویب کی ہے! لہٰذا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ! حالانکہ نہ مولانا احمد علی لاہوری "امام الاولیاء" ہیں، اگر وہ "امام الاولیاء" ہیں، تو خواجہ معین الدین اجمیری، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور شیخ نظام الدین اولیاء رحمہم اللہ تعالیٰ کیا رہے! ان "امام الاولیاء" صاحب کے مقتدی؟ اور وہ شخص واقعی ابدال تھا یا یہ بجائے خود مشتبہ ہے ——— اُس کی ابدالیت سے انکار بھی کیا جا سکتا ہے، اور مولانا امین الحق صاحب جو اس واقعہ کے پرجوش مؤید ہیں اُن کو ہفتہ وار خدام الدین نے "راس المحققین اور اسوۃ الصالحین" کے خطابات عنایت فرمائے ہیں حالانکہ علم و تحقیق کی دنیا میں اُن کا کوئی تحقیقی کارنامہ نہیں آیا!

ہم نے "فاران" میں جو تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا: ۔

"جو اپنے پیروں کی بزرگی، کرامت، ولایت، اور تقدس ثابت کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے وقار تک کی پروا نہیں کرتے۔"

اُس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ ہفتہ وار "خدام الدین" کی تازہ ترین اشاعت میں اسی حلقہ کے ایک مولوی صاحب غلام غوث ہزاروی صاحب کو "بوذرِ عصر" لکھا گیا ہے! تابعین چونکہ صحابہ کرامؓ کے تربیت یافتہ تھے، اُن میں سے تو کسی کسی کے بارے میں ایسا لقب دیکھنے میں آیا ہے، مثلاً حضرت عمر ابن العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے نام کے ساتھ کہیں کہیں "عمر ثانی" لکھا ہوا دیکھا گیا ہے مگر علماء متاخرین میں کسی کو "ابوبکرِ عصر" "فاروقِ زمانہ" "عثمانِ دوراں" "علیِ وقت" یا "بلالِ عصر" ۔ ۔ نہیں کہا گیا، نہ کہنا چاہیے اور جو کوئی ایسا کہتا ہے وہ صحابہ کی عظمت و بزرگی کے تقاضوں کو نہیں پہچانتا، اسی غلو عقیدت نے گزشتہ اُمتوں کو تباہ کیا ہے، اور یہی غلو عقیدت آج بھی خانقاہوں کی راہ سے مسلمانوں میں در آمد ہو رہا ہے! ہفتہ وار "خدام الدین" کے اسی شمارے میں مولانا احمد علی لاہوری کو "قطب الارشاد والتکوین" بھی لکھا گیا ہے ——— یہ "والتکوین" کیا چیز ہے اگر اس سے یہ مراد ہے کہ قطب ایک رُوحانی منصب ہوتا ہے، اور جو کوئی اس منصب پر فائز ہوتا ہے وہ تکوینی معاملات میں تصرف کرتا ہے، اور اپنے علاقے کے تکوینی نظام کو چلاتا ہے ——— تو خدا کی قسم اس عقیدے میں شرک کی آمیزش پائی

جاتی ہے (استغفر اللہ)

راس المحققین صاحب نے اپنے مضمون میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے بارے میں حسب عادت یعنی جیسا کہ حلقہ خدام الدین کا شعار ہے نامناسب باتیں کہی ہیں اور حکومت امریکہ سے مالی امداد لینے کا مودودی صاحب پر الزام لگایا ہے، ہم حیران ہیں کہ اس کھلے ہوئے جھوٹ اور افترا کے جواب میں کیا کہیں! کیا چودھویں صدی میں علم و تقویٰ (؟) اور روحانیت اس مقام پر آگئی ہے جہاں شریف لوگوں پر تہمتیں جوڑی جاتی ہیں اور ان کے بارے میں جھوٹ تصنیف کیے جاتے ہیں، اگر ولایت و روحانیت و امامت و قطبیت کی تربیت و فیضان اور توجہ سے اسی مزاج و فکر کے لوگ پیدا ہوتے ہیں تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

آخر میں جو بات ہم عرض کر رہے ہیں، اس پر اچھی طرح غور کیجئے ——— پیر طریقت "امام الاولیا اور قطب الارشاد والتکوین" ——— ان کی محفل میں جو کوئی اس مشاہدہ کو بیان کرے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ کو صحابہ کی جمعیت کے ساتھ دیکھا تو آپ کے ہر جملہ پر تین بار "صدقت" فرماتے تھے، اس صاحب مشاہدہ کے بارے میں "امام الاولیا صاحب" فرمائیں کہ یہ "ابدال" تھا ——— مریدین و معتقدین اس قسم کے خواب دیکھیں کہ امام الاولیا حضرت شیخ التفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زانوئے مبارک سے اپنا زانو ملائے بیٹھے ہیں ——— اور ———

"اس شمارے میں ایک مضمون بعنوان "صدیقِ دوراں سے آخری ملاقات" میں ایک خواب اس طرح مندرج کیا گیا ہے کہ ایک جگہ سے اور لوگ بتا رہے ہیں کہ یہ حضرت صدیق اکبرؓ اور بقیہ صحابہؓ کے مکانات ہیں حضرت صدیق اکبرؓ کے مکانات کے دروازے سبز تھے میں نے دستک دی اندر سے ایک بچہ نکلا میں نے اس سے پوچھا حضرت صدیق اکبر کہاں ہیں، تو اس نے چوبارہ کی طرف اشارہ کیا کہ وہ سامنے درس قرآن دے رہے ہیں میں نے جب دیکھا تو وہ حضرت لاہوری تھے۔

دوسرا خواب یوں عرض کیا گیا ہے کہ حضرت کا جنازہ جا رہا تھا (یعنی حضرت لاہوری صاحب کا) اتنے میں حضرت لاہوری چارپائی سے نیچے اترے اور کھڑے ہو گئے، ہاتھ میں معمول کے مطابق لمبا عصا لیا اور فرمایا میں اس وقت تک نہیں جاؤں گا، جب تک حضرت صدیق اکبرؓ تشریف نہ لے آویں۔"

——— وہ رویت یہ خواب ———

پیر و مرشد حضرت لاہوری "صدیقِ دوراں" اُن کے ایک واعظ مُرید "بوذرِ عصر"! (صدیقیت اور بوذری کے بعد "نبوت" ہی کا مقام باقی رہ جاتا ہے) اُن واقعات کی علمی طور پر تصدیق و تائید کرنے والے "راس المحققین اور اسوۃ الصالحین"۔ آخر یہ کیا گورکھ دھندا ہے، یہ کیسا حلقہ ارشاد و تصرف ہے، کیا اس قسم کی باتیں صحابہ کرام کے مزاج اور مسلک سے کوئی مناسبت رکھتی ہیں؟

——— x ———

از علی احمد زاہد جبلپوری

پختہ قبریں!

قبروں کو پختہ اور اونچی بنانے اور ان پر گنبد، قبے وغیرہ بنانے کی حرمت احادیث شریف سے

۱۔ عَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّجَصَّصَ الْقَبْرُ وَاَنْ يُّبْنٰى عَلَيْهِ وَاَنْ يُّقْعَدَ عَلَيْهِ۔ (مسلم۔ مشکوٰۃ)

حضرت جابرؓ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو پختہ کرنے، ان پر عمارت بنانے اور ان پر (مجاورین کر) بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔

۲۔ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ تُجَصَّصَ الْقُبُوْرُ (ترمذی شریف)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو چونے گچ کرنے سے منع فرمایا ہے۔

مسند امام احمدؒ، نسائی اور ابو داؤد وغیرہ میں بھی یہ حدیث مختلف الفاظ سے مروی ہے۔ سنن نسائی کی روایت میں "اَوْ يُزَادُ عَلَيْهِ" کے الفاظ بھی ہیں یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قبر کھودنے میں جو مٹی قبر سے نکلی ہو اس سے زیادہ دوسری مٹی نہ ڈالی جائے۔ یعنی ہر قسم کی زیادتی اور اونچائی قبر پر حرام ہے جو کہ خلاف شرع ہو۔

۳۔ عَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ تُجَصَّصَ الْقُبُوْرُ وَاَنْ يُّكْتَبَ عَلَيْهِ وَاَنْ تُوْطَأَ (ترمذی۔ مشکوٰۃ) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ منع فرمایا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو پختہ کرنے سے اور قبروں پر (نام و تاریخ وغیرہ کے) لکھنے سے اور قبروں کو روندنے، ان پر چلنے سے۔

پختہ اور اونچی قبریں بنانے اور ان پر قبے وغیرہ تعمیر کرنے کی ممانعت ائمہ اربعہؒ کے اقوال سے

(۱) حضرت امام ابو حنیفہؒ:۔ حنفی مذہب کی فقہ کی معتبر کتاب فتاویٰ قاضی خاں برحاشیہ عالمگیری مطبوعہ مصر جلد ۱ صفحہ ۱۷۸ میں ہے۔

رُوِیَ عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی اَنَّهٗ قَالَ لَا یُجَصَّصُ الْقَبْرُ وَلَا یُطَیَّنُ وَلَا یُرْفَعُ عَلَیْهِ بِنَاءٌ وَّسَقْطٌ۔

یعنی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں قبر پختہ نہ بنائی جائے اور نہ مٹی سے لیپی جائے اور نہ قبر پر کوئی بنا (قبہ وغیرہ) کھڑی کی جائے اور نہ خیمہ لگایا جائے۔

شامی مطبوعہ دارالکتب مصر ج ۱ صفحہ ۶۶۲ میں ہے۔

عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ یُکْرَہُ اَنْ یُّبْنٰی عَلَیْہِ بِنَاءٌ مِّنْ بَیْتٍ اَوْ قُبَّۃٍ اَوْ نَحْوِ ذَالِکَ۔

یعنی حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں قبروں پر کسی قسم کی بھی عمارت بنانی مکروہ ہے خواہ کوئی گھر یعنی مقبرہ وغیرہ بنایا جائے خواہ گنبد یا اس جیسی کوئی عمارت بنائی جائے سب مکروہ ہیں۔

منیۃ المصلی کی شرح کبیری مطبوعہ مصر صفحہ ۶۰۰ میں لکھا ہے۔

عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ اَنَّہٗ یَکْرَہُ اَنْ یُّبْنٰی عَلَیْہِ بِنَاءٌ مِّنْ بَیْتٍ اَوْ قُبَّۃٍ اَوْ نَحْوِ ذَالِکَ۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ قبر پر بنا بنانے خواہ وہ گھر ہو یا قبہ یا اس کے مانند کچھ اور ہو سب کو برا جانتے تھے۔

شرح الیاس جزء اول میں ہے:۔

کَرِہَ اَبُوْحَنِیْفَۃَ رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی الْبِنَاءَ عَلَی الْقَبْرِ۔

یعنی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے قبر پر کسی قسم کی عمارت بنانا مکروہ کہا ہے۔

شامی مطبوعہ مصر جلد اول صفحہ ۶۶۱ میں ہے۔

رَوَاہُ مُحَمَّدُ بْنُ الْحَسَنِ فِی الْاٰثَارِ اَخْبَرَنَا اَبُوْحَنِیْفَۃَ قَالَ حَدَّثَنَا شَیْخٌ لَّنَا یَرْفَعُہٗ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ نَھٰی عَنْ تَرْبِیْعِ الْقُبُوْرِ وَتَجْصِیْصِھَا۔

یعنی امام محمدؒ امام ابوحنیفہ کے شاگرد اپنے استاد امام ابوحنیفہ سے اور امام صاحبؒ اپنے استاد سے روایت کرتے ہیں اور وہ اس روایت کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے ہیں کہ آپؐ نے قبر کو چوگوشہ بنانے اور اس کو چونہ گچ کرنے سے منع فرمایا۔ دیکھئے جناب! امام صاحبؒ کا قول، ان کے شاگردوں کا قول، ان کے استادوں کا قول، یہاں تک کہ امام ائمہ سرور انبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان بھی پختہ قبریں بنانے کی حرمت میں موجود ہے اور وہ بھی فقہ کی معتبر کتابوں سے۔

حضرت امام مالکؒ:۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ اپنی مشہور کتاب "المدونۃ الکبریٰ" جلد اول صفحہ ۱۸۹ مطبوعہ مصر میں فرماتے ہیں کہ:۔

اَکْرَہُ تَجْصِیْصَ الْقُبُوْرِ وَالْبِنَاءَ عَلَیْھَا وَھٰذِہِ الْحِجَارَۃَ الَّتِیْ یُبْنٰی عَلَیْھَا (ابن الہیسم) عَنْ بُکَیْرِ بْنِ سَوَادَۃَ قَالَ اِنْ کَانَتِ الْقُبُوْرُ تُسَوّٰی بِالْاَرْضِ (ابن وہب) عَنْ ابْنِ الْھَیْعَۃِ عَنْ یَزِیْدَ بْنِ اَبِیْ حَبِیْبٍ عَنْ اَبِیْ رُمْعَۃَ الْبَلَوِیِّ صَاحِبِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ اَمَرَ اَنْ یُّصْنَعَ ذَالِکَ بِقَبْرِہٖ اِذَا مَاتَ (قال سحنون) ھٰذِہِ الْاٰثَارُ فِیْ تَسْوِیَتِھَا فَکَیْفَ بِمَنْ یُّرِیْدُ اَنْ یَّبْنِیَ عَلَیْھَا

میں قبروں کو پختہ بنانا، ان پر عمارتیں تعمیر کرنا اور پتھروں کو عمارت کی خاطر رکھنا پسند نہیں کرتا۔ بکر بن سوادہ کہتے ہیں کہ قبروں کو زمین کے ساتھ برابر کر دینا ضروری ہے۔ ابورمعہ بلوی صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت کی تھی کہ جب وہ وفات پاجائیں تو ان کی قبر برابر کر دی جائے۔ پھر اس شخص کی بدبختی اور حرماں نصیبی کا کیا پوچھنا جو ان قبروں پر عمارت بنانے کا ارادہ کرے۔ (المدونۃ الکبریٰ ج ۱ صفحہ ۱۸۹۔ مطبوعہ مصر)

وَتَطْيِينُ قَبْرٍ أَوْ تَبْيِيضُهُ أَيْ كُرِهَ تَطْيِينُ قَبْرٍ بِأَنْ يُلْبَسَ بِالطِّينِ وَكَذَا تَبْيِيضُهُ بِالْجِيرِ وَهُوَ مَعْنَى التَّجْصِيصِ وَبِنَاءٌ عَلَيْهِ أَوْ تَحْوِيزٌ وَإِنْ بُوهِيَ بِهِ حَرُمَ يَعْنِي أَنَّهُ يُكْرَهُ الْبِنَاءُ عَلَى الْقُبُورِ۔ الخ (المختصر الجلیل وشرح)

یعنی مکروہ ہے قبر پر مٹی تھوپنا اور اس پر سفیدی وغیرہ کرنا اور منع ہے اس پر گنبد یا مکان بنانا اس کے گرد کوئی ع:

۳ امام شافعیؒ :۔ حضرت امام شافعی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں :۔

وَأُحِبُّ أَنْ لَا يُبْنَى وَلَا يُجَصَّصَ فَإِنَّ ذَالِكَ يُشْبِهُ الزِّينَةَ وَالْخُيَلَاءَ وَلَيْسَ الْمَوْتُ مَوْضِعَ وَاحِدٍ مِنْهُمَا وَلَمْ أَرَ قُبُورَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ مُجَصَّصَةً (کتاب الأم جلد اول ص۲۴۶)

قبروں پر عمارتیں بنانا اور انہیں پختہ تعمیر کرنا میرے نزدیک پسندیدہ فعل نہیں ہے اس لئے کہ یہ زینت اور تکبر کی چیزیں ہیں موت سے ان چیزوں کو کوئی تعلق نہیں۔ میں نے مہاجرین و انصار کی قبروں کو مضبوط اور چونے گچ اور پختہ بنا ہوا نہیں دیکھا

پھر اس کے آگے تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

وَقَدْ رَأَيْتُ مِنَ الْوُلَاةِ مَنْ يَهْدِمُ بِمَكَّةَ مَا يُبْنَى فِيهَا فَلَمْ أَرَ الْفُقَهَاءَ يَعِيبُونَ ذَالِكَ (کتاب الأم

یعنی میں نے مکہ مکرمہ میں دیکھا کہ وہاں کے حکام قبروں پر کی عمارتوں کو گراتے تھے اور میں نے کسی فقیہ کو برا کہتے نہیں دیکھا

وَأُحِبُّ أَنْ لَا يُزَادَ فِي الْقَبْرِ تُرَابٌ مِنْ غَيْرِهِ۔

یعنی میں دوست رکھتا ہوں کہ قبر میں سے جو مٹی نکلی ہے اس کے سوا قبر پر کچھ نہ ڈالا جائے۔

(کتاب الأم۔ مطبوعہ بولاق مصر۔ جلد اول ص۲۴۵)

لَا يُرْفَعُ نَعْشُ الْقَبْرِ إِلَّا بِقَدْرِ شِبْرٍ وَلَا يُجَصَّصُ وَلَا يُطَيَّنُ۔ (الوجیز)

یعنی قبر ایک بالشت سے زیادہ اونچی نہ کی جائے اور نہ چونا لگا کر گچ کی جائے اور نہ اس کو مٹی سے لیپا جائے۔

مذہب حنبلی :۔ حنبلی مذہب کی مشہور کتاب "کشاف القناع" میں ہے۔

وَيُكْرَهُ رَفْعُ الْقَبْرِ فَوْقَ شِبْرٍ لِقَوْلِهِ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ لِعَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ لَا تَدَعْ تِمْثَالًا إِلَّا طَمَسْتَهُ وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا إِلَّا سَوَّيْتَهُ رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔ وَيُكْرَهُ الْبِنَاءُ عَلَى الْقَبْرِ سَوَاءٌ لَاصَقَ الْبِنَاءُ الْأَرْضَ أَوْ لَا وَلَوْ فِي مِلْكِهِ مِنْ قُبَّةٍ أَوْ غَيْرِهَا لِلنَّهْيِ عَنْ ذَالِكَ لِحَدِيثِ جَابِرٍ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يُجَصَّصَ الْقَبْرُ وَأَنْ يُبْنَى عَلَيْهِ وَأَنْ يُقْعَدَ عَلَيْهِ۔ (رواہ مسلمؒ)

یعنی قبر کا ایک بالشت سے زیادہ اونچا کرنا منع ہے اس لئے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ کو حکم دیا تھا کہ تصویروں کو مٹا دو اور اونچی قبروں کو توڑ کر برابر کر دو۔ اور قبر پر گنبد وغیرہ عمارت بنانا بھی مکروہ ہے زمین سے ملی ہوئی ہو یا اونچی ہو اور اپنی ملکیت میں ہو یا اس کے سوا ہو۔ اس واسطے کہ حدیث شریف میں حضرت جابر روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ قبر کو چونا گچ نہ کیا جائے اور نہ اس پر کوئی عمارت بنائی اور نہ اس پر (مجاور بن کر) بیٹھا جائے۔

بڑے پیر یعنی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

۱۔ وَاِنْ جُصِّصَ کُرِہَ۔ یعنی قبر کو پکا بنانا مکروہ ہے۔ (غنیۃ الطالبین ص ۱۵۲ سطر ۶۔ مطبوعہ اسلامیہ لاہور)

۲۔ وَیُرْفَعُ الْقَبْرُ مِنَ الْاَرْضِ قَدْرَ شِبْرٍ۔
یعنی قبر کو زمین سے بس ایک بالشت کی مقدار بلند کیا جائے۔ (غنیۃ الطالبین ص ۴۹۲ سطر ۱۔ مطبوعہ اسلامیہ لاہور)

۳۔ وَیُسَنُّ تَسْنِیْمُ الْقَبْرِ دُوْنَ تَسْطِیْحِہٖ۔
یعنی قبر کی ایک بالشت اونچائی کو اونٹ کے کوہان نما رکھنا مسنون ہے۔ (چوکوشہ بنانی منع ہے)
(غنیۃ الطالبین ص ۱۲۶ ۔ مطبوعہ اسلامیہ لاہور)

۴۔ قبر کو بوسہ دینا :۔

وَاِذَا زَارَ قَبْرًا لَمْ یَضَعْ یَدَہٗ عَلَیْہِ وَلَا یُقَبِّلُہٗ فَاِنَّہٗ مِنْ عَادَۃِ الْیَہُوْدِ۔
یعنی جب کوئی قبر کی زیارت کو جائے تو اس پر ہاتھ نہ رکھے نہ اس کو بوسہ دے کیونکہ یہ یہود کی عادت ہے (غنیۃ الطالبین)

۵۔ وَلَا یَمْسَحُ الْقَبْرَ وَلَا یُقَبِّلُ فَاِنَّ ذَالِکَ مِنْ عَادَۃِ النَّصَارٰی۔ (عالمگیری)
قبر کو نہ چھوا جائے اور نہ بوسہ دیا جائے کیونکہ یہ نصاریٰ کی عادت ہے۔

مذہب شیعہ کا فتویٰ

شیعہ حضرات کی مشہور و معروف کتاب "کافی" میں ہے۔

عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی اَنْ یُّزَادَ عَلَی الْقَبْرِ تُرَابٌ لَمْ یَخْرُجْ مِنْہُ۔
یعنی حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ جو مٹی قبر میں سے نکلی ہے اس سے زائد اس پر نہ ڈالی جائے۔
اور یہ روایت بھی ہے۔ عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ السَّلَامُ قَالَ لَا تُطَیِّنُوْا مِنْ غَیْرِ طِیْنِہٖ۔
یعنی قبر پر سوائے اس مٹی کے جو قبر سے نکلی ہو دوسری مٹی نہ ڈالو۔

امام ابوجعفر صادق رحؒ کی وصیت

عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ عَلَیْہِ السَّلَامُ اِنَّ اَبِیْ قَالَ یَا جَعْفَرُ اِذَا اَنَا مِتُّ فَغَسِّلْنِیْ وَکَفِّنِّیْ وَارْفَعْ قَبْرِیْ اَرْبَعَ اَصَابِعَ۔

ابوعبداللہ (امام جعفر صادقؒ) سے روایت ہے۔ میرے والد نے فرمایا کہ اے جعفر! جب کہ میرا انتقال ہو جائے تو مجھے غسل دینا، کفن پہنانا اور بقدر چار انگشت کے میری قبر کو اونچا کرنا۔

امام محمدؒ شاگرد خاص حضرت امام ابوحنیفہؒ اپنی کتاب "الآثار" ص ۴۵ میں لکھتے ہیں :۔
لَا نَرٰی اَنْ یُّزَادَ عَلٰی مَا خَرَجَ مِنْہُ وَنَکْرَہُ اَنْ یُّجَصَّصَ اَوْ یُطَیَّنَ اَوْ یُجْعَلَ عِنْدَہٗ مَسْجِدًا اَوْ عَلَمًا اَوْ یُکْتَبَ عَلَیْہِ وَ اَکْرَہُ الْاٰجُرَّ اَنْ یُّبْنٰی بِہٖ۔
یعنی ہمارے نزدیک جو مٹی قبر میں سے نکلی ہے اس کے سوا اور نہ ڈالنی چاہیئے۔ اور ہم قبر کو پختہ بنانا، اس پر لکھنا، مٹی سے

لیپنا، اس کے پاس مسجد بنانا، نشان کھڑا کرنا بھی مکروہ جانتے ہیں اور اینٹوں وغیرہ سے اس پر کوئی عمارت کھڑی کرنا بھی مکروہ ہے ۔

حنفی مذہب کی فقہ کی معتبر کتابوں سے قبروں کو پختہ اور اونچی بنانے کی حرمت

۱۔ یکرہ الآجر والخشب لانہما لاحکام البناء والقبر موضع البلی ثم بالآجر اثر النار فیکرہ تفاؤلاً ۔ (ہدایہ مجتبائی جلد اول ص ۱۶۲)

یعنی پختہ اینٹوں اور لکڑیوں کا استعمال قبر پر ناجائز ہے ۔ اس وجہ سے بھی کہ ان چیزوں سے مضبوطی اور پختگی ہوتی، اور قبر تو آزمائشوں کی جگہ ہے اور اس سبب سے بھی کہ پختہ اینٹ میں آگ کا اثر ہے اور یہ بدفالی ہے ۔

۲۔ لا الآجر والخشب ویکرہ ان یزاد علی التراب الذی اخرج من القبر ویسنم القبر قدر الشبر ولا یربع ولا یجصص ویکرہ ان یبنی علی القبر ۔

یعنی پکی اینٹیں اور لکڑی قبر پر نہ لگائے اور جو مٹی قبر سے نکلی ہے اس کے سوا اور مٹی بھی نہ ڈالے اور قبر کو بقدر ایک بالشت کوہان نما بنائے اور چبوترے کی طرح چار کونوں والی نہ بنائے اور نہ پختہ بنائے اور نہ قبر پر کوئی عمارت کھڑی کرے۔

(فتاویٰ عالمگیری مطبوعہ میمنہ مصر جلد اول ص ۱۶۹)

۳۔ ولا یسطح ای لا یربع ۔ یعنی قبر چوکوشہ نہ بنائی جائے ۔ (ہدایہ جلد اول ص ۱۶۳ مطبوعہ مجتبائی)

۴۔ یکرہ الآجر والخشب ویھال التراب ویسنم القبر ولا یسطح ۔

یعنی قبر پر پکی اینٹیں اور لکڑیاں لگانا مکروہ ہے صرف مٹی ڈالی جائے اور کوہان نما بنائی جائے چوگوشہ نہ بنائی جا

(شرح وقایہ مطبوعہ یوسفی جلد اول ص ۲۰۱)

۵۔ ویکرہ ان یبنی علی القبر مسجد او غیرہ ۔ یعنی قبر پر مسجد بنانی بھی مکروہ ہے اور کسی قسم کی عمارت مکروہ ہے ۔ (فتاویٰ عالمگیری مطبوعہ میمنہ مصر ج ۱ ص ۱۶۶)

۶۔ وان یکون مسنماً مرتفعاً من الارض قدر شبر ولا یجصص القبر ۔

یعنی قبر کوہان نما، زمین سے ایک بالشت کے برابر اونچی ہونی چاہیے اور پختہ نہ بنائی جائے ۔

(فتاویٰ قاضی خاں برحاشیہ عالمگیری مطبوعہ میمنہ مصر ج ۱ ص ۱۴۸)

۷۔ ولا یبنی علیہ بیت ولا یجصص ولا یطین بالالوان ۔

یعنی قبر پر کوئی گھر مثلاً قبہ وغیرہ بنانا اور مٹی وغیرہ سے منقش کرنا منع ہے ۔ (فتاویٰ بزازیہ برحاشیہ عالمگیری مطبوعہ مصر)

۸۔ ولا یجصص ولا یطین ۔ یعنی قبر کو نہ پختہ کیا جائے نہ مٹی سے لیپا جائے ۔ (تنویر الابصار)

۹۔ ولا یجصص التجصیص طلی البناء بالجص ۔

یعنی قبر کو عمارات کی طرح چونا گچ نہ کیا جائے نہ پختہ بنایا جائے ۔

(طحطاوی جلد اول ص ۱۶ مطبوعہ کلکتہ)

مکروہ کیا ہے؟ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :-
اِنَّ کُلَّ مَکْرُوْہٍ حَرَامٌ ـــــ یعنی جس چیز پر لفظ مکروہ استعمال کیا گیا ہے اس سے مراد حرام ہے -
حضرت امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہا اللہ فرماتے ہیں - اِنَّہٗ اِلَی الْحَرَامِ اَقْرَبُ - لفظ مکروہ حرام کے لگ بھگ ہے یعنی جس چیز پر اس کا اطلاق ہو تقریباً وہ حرام ہی ہوتی ہے -
وَظَاھِرُہٗ اَنَّ الْکَرَاھَۃَ تَحْرِیْمِیَّۃٌ ـــ ظاہر یہی ہے کہ یہاں مکروہ سے مراد مکروہِ تحریمی ہے - یعنی یہ کام قبروں پر کرنے حرام ہیں -
لفظ مکروہ کی تاویل مکروہ تنزیہی سے کرنے والے شامی جلد اوّل کا صفحہ ۹۷ ملاحظہ فرمائیں جہاں صاف لکھا ہے -
اَحَدُھُمَا مَاکُرِہَ تَحْرِیْمًا وَھُوَ الْمَحْمَلُ عِنْدَ اِطْلَاقِھِمُ الْکَرَاھَۃَ -
یعنی مکروہ کی دو قسمیں ہیں :- (۱) تحریمی (۲) تنزیہی - جب مطلق مکروہ بولا جائے تو اس سے مراد حرام ہوتا ہے -
ان سب عبارتوں میں لفظ مکروہ مطلقاً وارد ہے لہٰذا یہاں ہر جگہ مکروہ سے مراد حرام ہے -

قبر کتنی اونچی رکھی جائے

(۱) رَاَیْتُ قَبْرَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ شِبْرًا اَوْ نَحْوَ شِبْرٍ -
یعنی میں نے دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک ایک بالشت یا قریب ایک بالشت کے زمین سے اونچی تھی - (ابی داؤد)
۲- عَنْ سُفْیَانَ التَّمَّارِ اَنَّہٗ رَاٰی قَبْرَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مُسَنَّمًا -
یعنی حضرت سفیان تمار کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کو دیکھا جو اونٹ کے کوہان کی مانند تھی -
(بخاری شریف و مشکوٰۃ شریف)

۱- حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں :-
اَمَرَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ لَا تَدَعَ قَبْرًا مُشْرِفًا اِلَّا سَوَّیْتَہٗ وَلَا تِمْثَالًا اِلَّا طَمَسْتَہٗ (مسلم)
جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ اے علی! تم جہاں کہیں کوئی اونچی قبر دیکھو اسے گرا دو اور جہاں کوئی تصویر دیکھو اسے مٹا دو -
۲- حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے شاگرد ابوالہیاج کو پکی اور اونچی قبریں توڑنے پر مقرر کرتے ہوئے فرمایا -
لَا تَدَعْ تِمْثَالًا اِلَّا طَمَسْتَہٗ وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا اِلَّا سَوَّیْتَہٗ - (مشکوٰۃ شریف)
ہر تصویر کو مٹا کر چھوڑو اور ہر پکی قبر کو منہدم کر دو -
۳- عَنْ اَبِی الْھَیَّاجِ الْاَسَدِیِّ قَالَ قَالَ لِیْ عَلِیٌّ اَلَا اَبْعَثُکَ عَلٰی مَا بَعَثَنِیْ عَلَیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ لَا تَدَعَ تِمْثَالًا اِلَّا طَمَسْتَہٗ وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا اِلَّا سَوَّیْتَہٗ (مسلم - مشکوٰۃ)
ابوہیاج اسدی سے مروی ہے انھوں نے کہا مجھ سے حضرت علی نے فرمایا میں تم کو اس کام پر مقرر کرکے بھیجتا ہوں جس پر مجھے

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کرکے بھیجا تھا۔ جہاں کہیں کسی جاندار کی تصویر دیکھو اُسے مٹا دینا اور جہاں کوئی اُونچی قبر دیکھو اسے برابر کر دینا۔

۴۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :۔

رَأَیْتُ الْاَئِمَّۃَ بِمَکَّۃَ یَأْمُرُوْنَ بِھَدْمِ مَا یُبْنٰی (نیل الاوطار)

میں نے مکہ شریف میں بڑے بڑے اماموں کو دیکھا کہ وہ پکی قبروں کو منہدم کرنے، گرانے کا حکم دیتے تھے۔

۵۔ مسند احمد جلد اوّل صفحہ ۸۷ میں ہے :۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہم ایک جنازے میں تھے آپ نے فرمایا تم میں کوئی ایسا ہے جو مدینے جائے اور تمام بُت توڑ ڈالے، تمام قبروں کو برابر کر دے اور تمام تصویروں کو مٹا دے ؟ ایک شخص نے کہا میں جاتا ہوں۔ وہ چلا۔ لیکن مدینے والوں سے ڈرا، اور واپس چلا آیا۔ اب حضرت علیؓ نے فرمایا۔ حضورؐ ! میں جاتا ہوں۔ آپؐ نے انہیں اجازت دی۔ تشریف لے گئے اور واپس آکر کہا۔ حضورؐ ! میں نے تمام بُت توڑ ڈالے، تمام قبروں کو برابر کر دیا اور تمام تصویریں مٹا دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

مَنْ عَادَ لِصَنْعَۃِ شَیْءٍ مِّنْ ھٰذَا فَقَدْ کَفَرَ بِمَآ اُنْزِلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔

یعنی جو کوئی ان میں سے کسی چیز کا پھر اعادہ کرے تو اُس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اُتری ہوئی شریعت کا انکار کر دیا۔

قبروں پر مسجد بنانے اور عبادت کرنے کی ممانعت حدیث شریف سے

۱۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اپنی وفات سے پانچ روز پیشتر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :
اَلَا وَاِنَّ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ کَانُوْا یَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ اَنْبِیَآئِھِمْ مَسَاجِدَ اَلَا فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ اِنِّیْ اَنْھَاکُمْ عَنْ ذٰلِکَ۔

خبردار ہو جاؤ کہ تم سے پہلے کے لوگ اپنے نبیوں اور نیک بندوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا کرتے تھے۔ خبردار ! ایسا نہ کرنا میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں۔ (رواہُ الطَّبْرَانِیُّ وَمُسْلِمٌ)

۲۔ لَعَنَ اللّٰہُ الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِیَآئِھِمْ مَسَاجِدَ۔ (بخاری و مسلم)

اللہ تعالیٰ لعنت کرے یہود و نصاریٰ پر کہ انھوں نے انبیاءؑ کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔

۳۔ اِنَّ مِنْ شِرَارِ النَّاسِ مَنْ تُدْرِکُھُمُ السَّاعَۃُ وَھُمْ اَحْیَآءٌ وَمَنْ یَّتَّخِذُ الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ (طبرانی)

یعنی دو قسم کے لوگ بدترین ہیں ایک تو وہ کہ جن پر قیامت قائم ہوئی اس حال میں کہ وہ زندہ ہوں۔ دوسرے وہ جو قبروں کو سجدہ گاہ بنائیں۔

۴۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو یہ وصیّت فرمائی۔ لَا تَتَّخِذُوْا قَبْرِیْ عِیْدًا (سُنن نسائی)
میری قبر پر میلے اور عرس نہ کرنا۔ عید کی طرح وہاں جمع نہ ہونا۔

۵۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر طرح مسلمانوں کو سمجھا دیا۔ پھر بھی اللہ تعالیٰ سے دُعا فرمائی۔

اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا یُّعْبَدُ اِشْتَدَّ غَضَبُ اللّٰہِ عَلٰی قَوْمٍ اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِیَآئِھِمْ مَسَاجِدَ

(موطا امام مالکؒ۔ مشکوٰۃ)

اے اللہ! میری قبر کو ایسی نہ بنانا کہ لوگ بُت کی طرح اس کی پوجا کریں۔ جو لوگ انبیاء کی قبروں کو مسجدیں بنا لیتے ہیں ان پر اللہ کا غضب نازل ہوتا ہے۔

قبر پر پتھر نصب کرنا

مُطلب بن ابی وداعہ کہتے ہیں کہ جب عثمان بن مظعون کا انتقال ہُوا تو اُن کا جنازہ اٹھایا گیا اور دفن کیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو حکم دیا کہ پتھر لائے۔ وہ شخص پتھر اٹھا کر نہ لاسکا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف لے گئے اور اپنی آستینیں چڑھائیں۔ مُطلب کہتے ہیں جس شخص نے مجھ سے روایت بیان کی ہے اس نے ذکر کیا کہ گویا میں اب بھی اس سفیدی کو دیکھ رہا ہوں جو آستین چڑھانے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بغلوں کی مجھ اس وقت نظر آئی تھی۔ پھر آپ نے اس پتھر کو اٹھایا اور قبر کے سرہانے رکھدیا اور فرمایا نشان لگا یا میں نے اپنے بھائی کی قبر پر اور دفن کروں گا میں اس قبر کے پاس اس شخص کو جو مرے گا آئندہ میرے خاندان سے۔ (ابوداؤد۔ مشکوٰۃ)

قبروں پر لکھنے کی ممانعت

عَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّجَصَّصَ الْقُبُوْرُ وَاَنْ يُّكْتَبَ عَلَيْهَا وَاَنْ تُوْطَأَ (ترمذی مشکوٰۃ)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ منع فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو پختہ کرنے سے اور قبروں پر نام تاریخ وغیرہ) لکھنے سے اور قبروں کو روندنے سے۔

كُرِهَ اَنْ يُّكْتَبَ عَلَيْهِ وَاَنْ يُّبْنٰى عَلَيْهِ بِنَاءٌ وَّيُنَقَّشَ وَيُصْبَغَ وَيُرْفَعَ وَيُجَصَّصَ ۔ (جامع الرموز ص ۱۲۳)

یعنی قبر پر کچھ لکھنا، اس پر عمارت کھڑی کرنا، اسے منقش کرنا اس پر رنگ و روغن کرنا، اُسے بلند کرنا اور پختہ بنانا سب مکروہ ہے۔

يُكْرَهُ تَطْيِيْنُ الْقُبُوْرِ وَتَجْصِيْصُهَا وَالْبِنَاءُ عَلَيْهَا وَالْكِتَابَةُ عَلَيْهَا ۔ (جوہرہ نیرہ شرح قدوری)

یعنی قبر کو مٹی سے لیپنا بھی مکروہ ہے، اُسے پکی بنانا اور اس پر کوئی عمارت کھڑی کرنا اور اس پر کچھ (نام و تاریخ) لکھنا بھی مکروہ ہے۔

وَكُرِهَ اَنْ يُّكْتَبَ عَلَيْهِ اِسْمُ صَاحِبِهٖ وَاَنْ يُّبْنٰى عَلَيْهِ بِنَاءٌ وَّيُنَقَّشَ وَيُصْبَغَ وَيُرْفَعَ وَيُجَصَّصَ۔ وَنَهٰى عَنِ الْاِكْلِيْلِ ۔ (جامع الرموز قہستانی۔ جلد ۱ ص ۱۹۵)

یعنی مکروہ ہے قبر پر قبر والے کا نام وغیرہ لکھنا۔ اور اس پر عمارت کھڑی کرنا اور نقش و نگار بنانا اور رنگ روغن کرنا اور بلند کرنا اور پکی بنانا وغیرہ۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کتاب الآثار میں لکھتے ہیں:۔

قبر کھودتے وقت جو مٹی نکلی ہے اس کے سوا اور مٹی قبر پر نہ ڈالے۔ ہمارے نزدیک قبر کو پکا بنانا، اس پر لکھنا، لیپنا پوتنا، اس کے آس پاس مسجد بنانا، قبر پر نشان اور علم کھڑا کرنا یہ سب کام مکروہ، بُرے ہیں۔

قبر پر چادر یا غلاف چڑھانا یا شامیانہ یا خیمہ لگانا

۱۔ تُكْرَهُ السُّتُوْرُ عَلَى الْقَبْرِ۔ (شامی جلد اول مصری ص ۶۶۲) یعنی قبروں پر۔ پردے، غلاف، سائبان، خیمہ وغیرہ

لگانے مکروہ ہیں ۔

۲۔ یُکْرَہُ اَنْ یُّبْنٰی عَلَی الْقَبْرِ مَسْجِدٌ یُّصَلّٰی فِیْہِ وَاَنْ یُّضْرَبَ عَلَیْہِ فُسْطَاطٌ اَوْ قُبَّۃٌ یُقَامُ فِیْہِ وَیُسْتَظِلُّ الْقُبُوْرَ فَاِنَّمَا یَسْتَظِلُّ الْمَیِّتَ عَمَلُہٗ ۔ (شرعۃ الاسلام)

یعنی نماز پڑھنے کے لئے قبر پر مسجد بنانا مکروہ ہے اور قبر پر خیمہ لگانا یا قبّہ بنانا جس کے سائے میں کھڑا ہوا جائے اور قبر پر سایہ ہے یہ بھی مکروہ ہے ۔ میت پر سایہ اُن کے عملوں کا ہوگا ۔

۳۔ تَسْجِیْۃُ الْقَبْرِ غَیْرُ مَشْرُوْعَۃٍ اَصْلًا ۔ (نصابُ الاحتساب)

یعنی قبر کو کسی بھی چیز سے ڈھانکنا بالکل خلافِ شرع ہے ۔

قبروں پر چراغ جلانا

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ زَائِرَاتِ الْقُبُوْرِ وَالْمُتَّخِذِیْنَ عَلَیْہَا الْمَسَاجِدَ وَالسُّرُجَ ۔ (سنن ابی داؤد ۔ ترمذی ۔ نسائی)

یعنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافِ شرع قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ۔ اور اُن لوگوں پر بھی جو قبروں پر سجدہ کریں اور چراغ جلائیں ۔

یعنی شریعتِ محمدیہ کے نزدیک خلافِ شرع قبروں کی زیارت کرنے والی عورتیں ، قبروں پر سجدہ کرنے والے اور قبروں پر چراغ جلانے والے ملعون ہیں ۔

۲۔ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی نے اپنی کتاب "مالابدمنہ" میں تحریر فرمایا ہے ۔

ترجمہ :۔ اولیاء اللہ کی قبروں پر جو اونچی اونچی عمارتیں بناتے ہیں اور چراغ جلاتے ہیں ۔ اور اسی طرح کے دوسرے کام رواج پاگئے ہیں وہ یا تو حرام ہیں یا مکروہ ہیں ۔

پروفیسر اسرار احمد

یادِ رفتگاں پڑھنے کے بعد

مکرمی - السلام علیکم !

جولائی کا فاران پڑھا - مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے ڈاکٹر ہادی حسن صاحب مرحوم کی وفات کا ذکر کیا اور بڑی محبت
ے ڈاکٹر صاحب کے متعلق لکھا - میں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم سے کئی سال پڑھا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے آج تک ایسا استاد نظر
یں آیا - درمیان میں میں اختلاج قلب کے مرض میں مبتلا ہو گیا تھا اور دو سال تک تعلیم جاری نہ رکھ سکا یقین مانیے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم
ر کلاس چھوٹنے کا اس قدر صدمہ تھا کہ دو سال تک متواتر خواب میں ان کی کلاس کو دیکھتا رہا اور صبح آنکھ کھلتی تو خود کو حسرت زدہ پاتا

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی عجیب و غریب شخصیت تھی - یونیورسٹی سے سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے لئے وظیفہ حاصل کر کے انگلستان گئے لیکن
شہور فارسی کے عالم اور مستشرق ڈاکٹر براؤن سے ملاقات ہوئی تو ان کی فرمائش پر فارسی میں ڈاکٹریٹ کر لیا - ڈاکٹر براؤن کا ذکر
ڑی محبت اور احترام سے کرتے تھے ایک دن ان کے ذکر میں ڈرامہ کا ذکر نکل آیا تو بولے کہ ڈاکٹر براؤن کی لڑکی کے ساتھ شیکسپیئر کے
ناٹک رومیو جولیٹ میں حصہ لیا تھا - گفتگو سے کچھ ایسا ظاہر ہوا کہ صاحبزادی ڈاکٹر صاحب مرحوم کو محبت کی نظر سے دیکھتی تھیں
ر شادی ہونے کا امکان تھا لیکن ڈاکٹر صاحب پہلو بچا گئے - بھلا ڈاکٹر صاحب کی قسمت میں تو وہ بیوی لکھی تھیں جن کا آپ نے
ھی اپنی تحریر میں ذکر کیا ہے - ڈاکٹر صاحب نہایت حسین آدمی تھے علیگڑھ کی نمائش میں بغل میں ہاتھ دے کر گھومتے تو طلبہ اور
اساتذہ ہی نہیں عام لوگ بھی اس جوڑے کو دیکھ کر خوب ہنستے - اور ڈاکٹر صاحب کی قسمت پر رحم کھاتے اور ان کی بیوی کی قسمت
ر رشک کرتے - ڈاکٹر صاحب بڑے اچھے اداکار تھے - علیگڑھ میں کئی ڈرامے اسٹیج کئے - شکنتلا کو ایک مرتبہ تن تنہا اسٹیج پر
یش کیا اور لوگوں کو حیران کر دیا - ڈاکٹر صاحب بہترین اداکار ہی نہیں بلکہ بہترین مقرر بھی تھے - اس زمانے میں ڈاکٹر عبد العزیز
یمنی اور ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کا فن تقریر میں کوئی مقابل نہ تھا لیکن ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کو عزیز صاحب پر کسی طرح فوقیت حاصل تھی
اکٹر صاحب اردو - فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں پر پوری قدرت رکھتے تھے - کہتے تھے کہ قدِ آدم آئینوں کے سامنے تقریر کرنے کی
گھنٹوں مشق کرتا رہا ہوں جب جاکر کہیں اتنا ملکہ حاصل ہوا ہے -

ڈاکٹر صاحب مرحوم کا ایک کمال یہ دیکھا کہ دنیا کے ہر موضوع پر بے تکان اور اونچے سے اونچے مخاطب کے سامنے گھنٹوں
گفتگو کر سکتے تھے - ڈرامہ - موسیقی - معاشرت - معیشت - سیاست - سائنس - غرضکہ کوئی موضوع ہو ڈاکٹر صاحب کا
دماغ حاضر ہے اور معلومات کا ایک دریا ہے جو امڈا چلا آتا ہے اور زبان کو ذرا لکنت نہیں ہوتی - اسی وجہ سے جب یونیورسٹی
یں آئی سی ایس اور پی سی ایس کے لئے اسپیشل کوچنگ کلاس شروع کی گئی تو ڈاکٹر صاحب کو اس کا انچارج بنایا گیا - ڈاکٹر صاحب
ور فیلڈن صاحب مل کر لڑکوں کو ان مقابلے کے امتحانات کے لئے تیار کرتے تھے خصوصاً ڈاکٹر صاحب انٹرویو کے لئے تیار کرنے
یں بڑے ماہر خیال کئے جاتے اور پہلے سال سے ہی نتائج میں بڑا فرق محسوس ہونے لگا - ڈاکٹر صاحب مرحوم کے یوں تو بہت وقیر

سے بڑے اچھے تعلقات تھے لیکن حبیب صاحب۔ حلیم صاحب اور بشیر صاحب لائبریرین سے تعلقات بہت زیادہ خوشگوار رہتے۔ خالی وقت میں ہمیشہ لائبریری میں بشیر صاحب کے پاس جاکر بیٹھ جاتے اور خوب گپ بازی ہوتی۔ پڑھاتے پڑھاتے تھک جاتے یا کسی بات پر بہت زیادہ کبیدہ ہو جاتے۔ یا موضوع کی وجہ سے پڑھانے میں ہنسی سے بے قابو ہو جاتے تو کلاس چھوڑ کر چلے جاتے اور بشیر صاحب کے پاس بیٹھ جاتے ہم لوگ سمجھ لیتے کہ اب چھٹی ہے کلاس نہیں ہوگی۔ ہمیں جانے کی اجازت ہے۔ حاجی بابا اصفہانی پڑھاتے میں اکثر اسی قسم کے ہنسی کے دورے پڑتے۔ ڈاکٹر صاحب اور ایم اے فائنل کے طلبہ ہنستے ہنستے بے خود ہو جاتے۔ اور ڈاکٹر صاحب کلاس چھوڑ کر باہر چلے جاتے اور لائبریری میں جاکر بیٹھ جاتے۔ اسی طرح کبھی کبھی رو بھی پڑتے تھے۔ اپنی ہمشیرہ مرحومہ کو کبھی یاد کرتے تو ضرور رو پڑتے اور یہ شعر نظیری کا پڑھتے ؎

کس حدیث آشنائی در جواب ما نہ گفت

مہر خاموشی نظیری بر لب گویا نہ دیم

ایک مرتبہ ایرانی شاعر جہاں گیر خاں کا مرثیہ جو غالباً دہخدا نے لکھا ہے پڑھا رہے تھے جہاں گیر خاں کو بادشاہ نے بغاوت کے الزام میں پھانسی دیدی تھی۔ مرثیے کا پہلا بند یاد رہ گیا۔ پڑھاتے پڑھاتے رو کر باہر چلے گئے تھے

اے مرغ سحر چو ایں شب تار　　بگذاشت ز سر سیاہ کاری

یزداں بکمال شد نمودار　　واہریمن زشت خو حصاری

یاد آر ز شمع مردہ یاد آر

مرحوم شاگردوں سے بڑی خصوصیت رکھتے تھے اور رمضان شریف میں کئی مرتبہ افطار کی دعوت کرتے۔ عید بقر عید کو ضرور دعوت ہوتی لیکن تمام دعوتیں بیگم کے خوف سے شعبے میں ہی ہوتیں۔ گھر پر لڑکوں کی دعوت کرنے کی اجازت بیگم کی طرف سے نہیں تھی وہاں صرف احباب مدعو ہو سکتے تھے۔ لیکن کثر یہ دیکھا گیا کہ درد گردہ میں تڑپ رہے ہیں بوتلیں بندھی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹروں نے بستر سے اٹھنے کو سختی سے منع کیا ہے بیگم پہرہ دے رہی ہیں لیکن اگر کوئی لڑکا مزاج پرسی کے لئے پہونچ گیا تو بیگم ہزار روکیں لیکن اگر اس لڑکے کو اندر آنے کی اجازت نہ دی گئی اور انہیں معلوم ہو گیا تو زبردستی اُٹھ کر باہر چلے آتے۔

خلافت کے زمانے میں سیاست میں بہت حصہ لیا۔ بڑی تقریریں کیں تو یونیورسٹی سے بھی نکلنا پڑا اور حیدر آباد میں بھی داخلہ ممنوع قرار دیا گیا والد نے نظام کے دباؤ سے جاگیر سے بھی محروم کر دیا تو دہلی اسٹیشن پر سگریٹ فروخت کر کے گذارا کیا اور فرماتے تھے کہ رات کو اکثر دوکانوں کے تھڑے پر سو کر وقت گزارا لیکن خلافت کے بعد سیاست کو بالکل ترک کر دیا تھا۔ فرماتے تھے کہ سیاست فریب کاری کا دوسرا نام ہے۔ مرحوم عوام کے حافظے کی کمزوری کے بھی اس سلسلے میں بہت شاکی تھے الغرض اب یہ سب چیزیں ایک خواب خیال معلوم ہوتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی ایک لمحے کی تھی۔ جو ختم ہو گئی ہمارا سب کا یہی حال ہے ؎

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم　　دیدیم کہ باقی است شب فتنہ غنودیم

والسلام - اسرار احمد

از گوجرانوالہ

سوز و ساز

شفقت کاظمی

مارا ہوا ہوں وعدۂ بے اعتبار کا
چسکا سا پڑ گیا ہے ترے انتظار کا
کیا جانے شاق چھوڑ دیا دوستوں نے کیوں
بتلا کے راستا مجھے تیرے دیار کا
ہر لحظہ اپنے پیشِ نظر ہے جمالِ دوست
مجھ پر بڑا کرم ہے شبِ انتظار کا
شفقت! خیالِ دوست میں اچھی گزر گئی
مجھ پر اثر ہوا نہ غمِ روزگار کا

تش پرتاب گڑھی

لمحے یہ آ گئے ہیں ترے انتظار کے
میں خود جواب دیتا ہوں تجھ کو پکار کے
میں کیا کہوں خدا سے مری التجا ہے کیا
اکثر اٹھا کے دستِ دعا سوچنا پڑا
حیف ایسی میکشی پہ کہ بدمستیوں میں بھی
ہم کو مآلِ لغزشِ پا سوچنا پڑا

سدا اللہ خاں جوہر

جھیلا ہے میرے سر پہ، جو کرم ہے مجھ پر
اور کوئی نہیں لئے گردشِ دوراں جیسے
اس طرح طنز کیا کرتے ہیں ناصح ہم پر
بس یہی ایک ہیں دنیا میں مسلماں جیسے
آپ لئے ہیں قول کسکے
جانے دیجئے ایسے ہیں عہد شکن

نجابت سرحدی: — وہ ایک تم کہ کُھل دیا ہمیں ان راہوں میں!
وہ ایک ہم ہیں کہ کانٹوں پہ چل رہے ہیں دوست

آرزو کاشمیری

وہاں گردش میں پیمانہ ہے، دورِ جام رہتا ہے
یہاں ہر وقت ذکرِ قسمتِ ناکام رہتا ہے

ریاض ادیب مرزاپوری

ہم سے آباد ہیں یہ دیر و حرم
لاکھ خانہ خراب ہیں ہم لوگ

ماہر القادری

اُن کی جانب سے کبھی پیغام کوئی لائی ہے
یا نسیمِ سحر یونہی چلی آئی ہے
شوق تنہا ہے مگر اس کے ہزاروں عالم
حسن کے پاس فقط انجمن آرائی ہے
ذوقِ گرفتارِ محبت پہ خدا رحم کرے!
آج اس شخص کی پہلی شبِ تنہائی ہے
آپ اور مجھ پہ توجہ کی نظر فرمائیں
یہ تصور کی مرے حاشیہ آرائی ہے
انگلیاں اٹھتی ہیں کس کس کے سلام آتے ہیں
عشق اک قافلۂ شہرت و رسوائی ہے
ہائے! وہ لوگ جو طوفان کا گلہ کرتے ہیں
ان کی کشتی کبھی ساحل سے بھی ٹکرائی ہے
اے اجل! نزع کی فرصت کو بڑھا اور بڑھا
یاد کر لوں مری کس کس سے شناسائی ہے
یہ جہاں حسنِ مشیت کا ہے پرتو ماہر
آدمی صرف مناظر کا تماشائی ہے

روحِ انتخاب

حج کے مبارک موقعہ پر امیر فیصل وزیراعظم حجاز
کا
زائرینِ بیت اللہ سے خطاب

محترم دوستو!

ہم آپ کو اس جگہ سے خطاب کر رہے ہیں جو آپ سب کا روحانی وطن ہے، اور جس مبارک سرزمین میں رہ کر ہم کو حجاج کے استقبال اور ان کی خدمت کا موقع نصیب ہوتا ہے، اور جہاں اہل وطن کے لئے ہم عدل و انصاف کی روشنی میں ترقی کے وہ مواقع فراہم کرتے ہیں جو ان کو اپنی آنے والی ذمہ داریوں کا پوری طرح اہل بنا سکیں۔

دوستو! ہم کسی لیڈری یا حکمرانی کے دعویدار نہیں اور نہ آپ پر اس طرح اپنی فوقیت جتانا چاہتے ہیں۔ بلکہ ہم آپ کے بھائی ہیں، اور ان ذمہ داریوں کو جو ہم پر ڈالی گئی ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آزمائش تصور کرتے ہیں، تاکہ اللہ تعالیٰ نیک و بد کو الگ الگ کر دکھائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجئے کہ تم لوگ عمل کرو۔ تمہارا عمل اللہ اور اس کے رسول عنقریب دیکھ لیں گے اور جو شخص اللہ کے لئے کوئی عمل کرے گا وہ اس کی جزا پائے گا۔

محترم دوستو! جب سے یہ حکومت قائم ہوئی ہے اس کا نعرہ کلمۂ توحید و شہادت "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہؐ" ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے عربوں کو محمد رسول اللہؐ کے ذریعہ فضیلت و شرف عطا فرمایا ہے، اسی شرف نے ان کو اتنا بلند و غالب بنایا کہ وہ روئے زمین کے چپے چپے پر پہنچے اور آوازِ حق کو بلند کیا۔ وہ آوازۂ حق یہ تھا:۔

"اللہ اور اس کی کتاب پر ایمان لاؤ، اور زندگی کو اللہ کے لئے خالص بناؤ، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت اور اللہ کی محبت کے جھنڈے تلے جمع ہو جاؤ۔"

اہل عرب کو بجز اس دعوت و پیغام کے اور کسی وجہ سے کوئی فضیلت نہیں حاصل ہے، اسی پیغام نے ان کو اس دین کی خدمت کا اہل بنایا، اور جب بھی انھوں نے اس پیغام کی خلاف ورزی کی وہ طرح طرح کی ذلت و خواری، اور ظلم و ستم کے پنجے میں پھنسے ——— مسلمان بھائیو! آپ سب لوگ دنیا کے چپے چپے سے اس شہر میں خلوص نیت کے ساتھ جمع ہوئے ہیں۔ اس سفر سے آپ کی دنیاوی غرض وابستہ نہیں ہے، اور نہ کوئی مادی فائدہ مقصود ہے، آپ کا مقصد صرف یہ ہے کہ خانہ کعبہ کا حج کریں۔ اور رسول اللہ صلعم کی مسجد کی زیارت کر کے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کریں، میں آپ سب بھائیوں سے یہ درخواست کرونگا کہ وہ اپنی نیتوں کو بالکل خالص رکھیں، اور جو گناہ ہماری پچھلی زندگی میں ہوتے ہیں ان کو دوبارہ نہ کرنے کا عزم کریں۔

بزرگو اور دوستو! آپ سب کو معلوم ہے کہ اسلام کا دستور زندگی قرآن ہے، اللہ تعالیٰ نے سارے انسانوں کو پیدا فرمایا ہے اور ان کے مصالح سے واقف ہے۔ ہر طرح کے غیب و شہادت کا علم رکھتا ہے، اس نے اپنی حکمت سے قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر

نازل فرمایا تاکہ وہ سارے عالم کا دستور بن سکے، اور اس نے کسی قوم کو دوسری قوم پر فضیلت نہیں بخشی، اور نہ کسی فرد کو کسی فرد پر فوقیت عطا فرمائی، اس کے نزدیک سب سے افضل وہی ہے جو سب سے زیادہ اس سے ڈرنے والا ہو، اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کریں، اور اپنی طاقت کو متحد اور مستحکم بنا دیں اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا کر سکیں تو ہم کو اپنی گزشتہ حالت کی طرف لوٹنا ہوگا یا دوسرے لفظوں میں ہم کو ان اسلاف کی زندگی کو مشعل بنانا ہوگا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری امت کی ایک جماعت اپنے عہد پر قائم رہے گی، اور وہ کامیاب و بامراد رہے گی، کوئی مخالفت اس کو نقصان نہیں پہنچا سکے گی، یہاں تک کہ قیامت آ جائے۔ صحابہ کرامؓ نے فرمایا کہ وہ کون لوگ ہوں گے یا رسول اللہ؟ آپؐ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے جو میرے طریقہ پر قائم رہیں گے، دوستو! ہم اس ملک میں لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی شریعت کو خلوص نیت اور عزم راسخ کے ساتھ قانون زندگی بنانے کی دعوت دیتے ہیں اور ہم کو یقین ہے کہ اگر مسلمان اسی طریقہ حیات کو اپنا لیں تو ان کو کسی ایسے قانون اور اصول کی قطعاً ضرورت نہ ہوگی جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون سے میل نہیں کھاتا۔ ہمارا دین اسلام زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے اس میں عدل و مساوات، حفظ امن و حدود اور سارے معاملات پوری تفصیل سے موجود ہیں۔ یہاں تک کہ میاں بیوی، پڑوسی، اور ہر شخص کے معاملات کی تفصیل موجود ہے۔ ان تمام تفصیلات کے ہوتے ہوئے ہم اور کیا چاہتے ہیں؟ اگر ہم مصلحت کے تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے کسی اور طرف نظر اٹھاتے ہیں تو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ شریعت اسلامیہ کی ضرورت ہر انسانی مصلحت پر حاوی ہے، لیکن اگر ہم مسلمانوں میں کچھ ایسے لوگ موجود ہوں جو قانون شریعت کو احترام کی نگاہ سے نہ دیکھتے ہوں اور اس کے مفہوم سے وہ اچھی طرح واقف نہ ہوں تو یہ چیز ہمارے لئے ان کے نقش قدم پر چلنے کا جواز نہیں بن سکتی، بلکہ اس طرح کے لوگ سراسر حق سے دور اور مرکز شر و فساد ہیں، پھر آپ ہی بتائیں میرے معزز دوستو کہ ہم اپنی حقیقی قدروں کو اپنے تصورات سے بدلنے پر کیسے راضی ہو سکتے ہیں؟ جن کے متعلق کم از کم یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ انسانیت کی فلاح و کامیابی کی صلاحیت نہیں رکھتے، ہم اس پر کیف اور روح پرور مجلس میں جبکہ مہمانان بیت اللہ دنیا کے گوشے گوشے سے آتے ہوتے ہیں، یہاں جمع ہیں تم مسلمانوں سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ اپنے دین کی بنیادوں کو سمجھنے اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کے لئے پوری طرح تیار ہوں، اور اگر کوئی شخص اس دین کو ترقیوں کی راہ میں رکاوٹ تصور کرتا ہے تو اس کی یہ بات ناقابل قبول ہے اور وہ شخص ضدی اور متکبر ہے اور ہمارے اور اس کے درمیان اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت ہے ہم اس سے کہیں گے کہ تم غلطی پر ہو، ہم تم کو ایک ایسی بات کی طرف بلا رہے ہیں جو ہم سب میں مشترک ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

—— محترم بھائیو! آپ کو معلوم ہے کہ یہ دین اخلاص و ایمان کی طرف بلاتا ہے، اور ہم میں سے ہر شخص پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کو پوری کرنے کی دعوت دیتا ہے، چنانچہ ہم میں سے ہر فرد اور ہر جماعت اور حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ اس دین حنیف کی خدمت کرنے کے لئے ہمہ تن مستعد ہو، اور حکمت و موعظت کے ساتھ لوگوں کو اس کی طرف دعوت دے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے — اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ — اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو جب فرعون کے دربار میں جانے کا حکم دیا اِذْھَبَا اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی فَقُوْلَا لَہٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّہٗ یَتَذَکَّرُ اَوْ یَخْشٰی — اے موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) تم کل فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے نرم بات کہو، ہو سکتا ہے کہ وہ نصیحت حاصل کرے یا ڈر جائے۔ ہمارا دین محبت و اخلاص کی تعلیم، باہمی تعاون اور عدل و مساوات کا دین ہے، اگر اس صریح حقیقت کا کوئی انکار کرے تو وہ حق کا منکر اور باطل پرست ہے، معزز بھائیو! عرب قوم کے لئے تو سب سے بڑی فخر و سعادت کی بات ہے وہ نبی اکرمؐ کا ان کے اندر مبعوث ہونا، یہ وہ شرف و فضل ہے جو عرب قوم کے سوا اور کسی کو نصیب نہیں ہوا، اس لئے ہم کو بھی عرب ہونے کی حیثیت سے وہی بات پسند ہے جو ان خوش نصیب عربوں کو پسند تھی اور وہ بات

ناپسند ہے جو ان کو ناپسند تھی۔ ان کی ذمہ داریاں آج ہم پر عائد ہوتی ہیں، اور اس میں کوئی غلط یا خلاف حقیقت بات نہیں ہے، ہم عرب اتحاد کی دعوت نہایت اخلاص و محبت کے ساتھ اپنے بھائیوں کو پیش کرتے ہیں، اور ہماری انتہائی خواہش ہے کہ عرب ایک اُمت بن کر دنیا کے سامنے آئیں، جہاں ہر ایک دوسرے کا ہمدم و ہم ساز ہو اور ہر ایک دوسرے کے لئے فنا ہونے اور مر مٹنے کا جذبہ رکھتا ہو، اس اتحاد کی بنیاد سچائی، محبت، اخلاص اور تعاون کے جذبہ پر ہو، یہی وہ دعوت ہے جس کی طرف ہم آپ کو بُلا رہے ہیں، جس کی بنیاد پر ہمارے اس ملک کی سیاست شاہ عبدالعزیز بن سعود مرحوم کے وقت سے قائم ہے اسی لئے ہم کو اس خطۂ مقدس میں حق کی خدمت کے ساتھ خانہ کعبہ کی خدمت کا شرف حاصل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دیار میں اہلِ وطن اور زائرین حرم کے حقوق ادا کرنے کے لئے اللہ نے ہم کو توفیق عطا فرمائی ہے، جس کی تفصیل میں جانا میں پسند نہیں کرتا۔ والسّلام۔

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

ادیب سہارن پوری مرحوم

تقسیم ہند سے قبل بھساول (صوبہ بمبئی) میں سال کے سال بڑی دھوم کا مشاعرہ ہوا کرتا تھا، اسی مشاعرے میں ادیب مرحوم سے پہلی بار ملاقات ہوئی، اب سے تقریباً بائیس سال پہلے کی بات ہے، اُن کی غزل جو مشاعرے میں کامیاب بھی رہی، اور جس نے مجھے بھی متاثر کیا، اس کے دو شعر یہ تھے: ؎

آنکھوں کی تمنا کہ وہ کچھ دیر ٹھہر جائیں اور دل کا تقاضا کہ وہ جلدی سے گزر جائیں
یہ جوشِ بہاراں، یہ ہوائیں، یہ گھٹائیں دیوانے نہ ہو جائیں اگر لوگ تو مر جائیں

پھر غزل کے بعد انھوں نے نظم سنائی، عنوان تھا "برسے کی شام" اُس کا یہ شعر تو اُسی وقت دل پر نقش ہو کر رہ گیا، اور آج تک نقش ہے ؎

دُھواں برستا ہوا کھپریل کے رخنوں سے رہ رہ کر
کہ جیسے برف کی سِل پر کوئی تیز اب ڈال آئے

منظر نگاری کا یہ حال تو کسی دوسرے شاعر کی نظم میں دیکھنے ہی میں نہیں آیا، اچھوتی تشبیہ اور بے مثل عکاسی! شعر کا یہی وہ آرٹ ہے جہاں مصوری اپنے عجز و درماندگی کا اعتراف کرتی ہے!

جناب ادیب سہارن پوری سے پھر مشاعروں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں، ایک بار دھولیا کے مشاعرے میں تین دن اُن کا ساتھ بھی رہا! مگر اُن سے بے تکلفی اور یارانہ پاکستان بننے کے بعد کراچی میں ہوا۔ ہر ملاقات کے بعد ہم ایک دوسرے سے قریب تر ہو جاتے!

سنہ ۱۹۴۹ء کا ذکر ہے راولپنڈی میں ریلوے انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے "کل پاکستان مشاعرہ" ہوا، پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان (بالقابہ) اُن دنوں صرف "بریگیڈیر" تھے، صاحب موصوف نے مشاعرے کی صدارت فرمائی، طرحی مشاعرہ تھا ادیب سہارن پوری کی غزل کا یہ شعر ؎

راستے جب کبھی ہموار نظر آتے ہیں اور بڑھ جاتا ہے احساسِ شکستہ پائی

حاصلِ مشاعرہ رہا۔ کراچی سے اس مشاعرے میں حضرت سیماب اکبر آبادی، نہال سیوہاروی، ادیب سہارن پوری اور میں شریک ہوئے تھے۔ وہ تینوں تو اللہ کو پیارے ہو گئے اک میں ہی سخت جان ہوں، جواب تک جئے جا رہا ہوں۔

جب بھی باہر کے مشاعرے میں ادیب کا ساتھ ہوتا تھا تو سفر میں اور قیام گاہوں پر کیا کیا قہقہے اور چہچہے رہتے تھے، پورا سفر لطیفوں، چٹکلوں اور ہنسی خوشی میں گزرتا۔ ایک لطیفہ تو الہامی ہے، جو شعراء کی بے تکلفی کی محفلوں میں ہمیشہ دہرایا جاتا ہے!

غالباً سنہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے، سکھر میں اُردو کانفرنس اور مشاعرہ منعقد ہوا، بابائے اُردو مولوی عبدالحق بھی اس میں شریک

ہوتے تھے، مشاعرے میں ایک صاحب نے "شہر آشوب" سُنایا، درجنوں بندوں کا مُسدس تھا، سُننے والے بُری طرح اکتاہٹ محسوس کر رہے تھے، اس کے بعد شعراء صاحبان کی شہر میں دعوتیں ہوئیں' ان دعوتوں میں شعر خوانی لازمی تھی یہ صاحب بھی ہر دعوت میں موجود پائے گئے، ذرا سے اشارے پر جیب سے بیاض نکالی اور نظم سُنانی شروع کر دی' سب لوگ بور ہو رہے ہیں مگر یہ ہیں کہ پڑھے جا رہے ہیں ——— ہم ایک دن دوپہر میں ایک دعوت سے قیام گاہ پر آئے، ایک پلنگ پر ادیب سہارن پوری لیٹے تھے اور دوسری چارپائی پر میں دراز تھا، ایک نوجوان جو شاعروں کے قیام وطعام کے منتظمین میں شامل تھے اور بڑے خلوص وعقیدت سے شعراء کی خاطرداری کر رہے تھے، ہمارے قریب کرسی پر بیٹھے تھے، میں ایک ساتھ تڑپ کر اٹھا، اور کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ادیب بے ساختہ بول پڑے :—

"ماہر صاحب! وہ ان کے والد ہیں"۔

اُن کے اس جُملہ پر میرا ہنسی کے مارے یہ عالم کہ پلنگ پر پیروں سے تالیاں بجانے لگا وہ نوجوان خاموش بیٹھا رہا، اُس بیچارے کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟

میں جو پلنگ سے تڑپ کر اُٹھا تھا، تو وہ شاعر جو لمبی لمبی نظمیں سُناتا تھا، اُس پر عُریاں قسم کی طنز کرنا چاہتا تھا۔ ادیب تاڑ گئے اور اُن کی ذہانت نے میرے ارادے کو بھانپ لیا! ایک نوجوان اپنے باپ کی شان میں نازیبا کلمات کس طرح سُن سکتا تھا' ادیب مرحوم کی ذہانت نے مجھے اس مخمصے سے بچالیا!

ایک صاحب کے یہاں کھانے کی دعوت تھی' سب لوگ کھانا کھا چکے تو اُس کے بعد شعر وسخن کی محفل جمی، شعر خوانی شروع ہو چکی تھی۔ اتنے میں سامنے کے کمرے سے ہوا کے زور سے پردہ ہٹ گیا، پردے کے پیچھے خواتین بیٹھی تھیں، میری نگاہ بیساختہ اُٹھتے ہوئے پردے پر پڑی' اس پر ادیب مرحوم بولے :—

"خبردار، ہوشیار، خبردار"

کیا بتاؤں کہ اُن کے اس جملے میں کتنے رموز واشارات اور کتنی بہت سی شوخیاں اور نفسیاتی نزاکتیں پنہاں تھیں۔

وہ جو مجھے بحث وگفتگو میں کبھی کبھی جلال آجاتا ہے' تو ادیب سہارن پوری نے میری طبیعت کے اس جلال اور تیزی کو گوارا کیا ہے، اُن کی زندگی میں اس کا خیال نہ آتا تھا، اب سوچتا ہوں تو ندامت محسوس کرتا ہوں۔

ایک محفل میں وہ اپنی مشہور اور کامیاب ترین غزل خوب لہک لہک کر سُنا رہے تھے، اُن کے اس شعر پر :—

باندھ کر عہدِ وفا مجھ سے گیا ہے کوئی

اے مری عمرِ رواں! اور ذرا آہستہ

تو داد وستائش کی دھوم مچ گئی' جب وہ غزل پڑھ چکے، تو میں نے اسی وقت موزوں کر کے یہ شعر سُنایا :—

سِکھ بھی بیٹھے ہیں تری بزم میں او مستِ شباب!

چھوڑ سگریٹ کا دُھواں اور ذرا آہستہ ——— !

سب لوگ ہنسنے لگے، ادیب بھی خوب مسکرائے، اُن کی جگہ کوئی دوسرا شاعر ہوتا تو نہ جانے کتنا بُرا مانتا۔

میں جناب ادیب سہارن پوری مرحوم کا انتہائی بے تکلف دوست تھا اور اُن کی شاعری کا بیباک نقاد بھی! میرے کہنے اور ٹوکنے پر انھوں نے اپنی غزلوں میں تبدیلیاں کی ہیں! بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ وہ اپنی بات پر اڑے رہتے اور دیر

شورے کو قبول نہ کرتے ! باہر کے مشاعروں میں ایسا بھی ہوا کہ مشاعرہ گاہ میں جانے سے پہلے ادیب مرحوم نے مجھے اپنی بیاض دکھا کر فرمایا بھائی ! میں نے یہ نئی غزل کہی ہے، آج مشاعرے میں پڑھنا چاہتا ہوں تمہاری کیا رائے ہے ؟ میں غزل پڑھ کر آزادی کے ساتھ اپنا تاثر بیان کر دیتا، میرے مشورے اور رائے پر وہ اعتماد کرتے تھے !

ادیب کا ترنم بڑا پرسوز تھا۔ اُن کے لہجہ میں خاص کھنک تھی، اور تو اور حضرت جگر مرادآبادی جو شعر و ترنم کے بادشاہ تھے ادیب کے ترنم کو بہت پسند کرتے تھے! غزل میں ادیب نے اپنا آہنگ پیدا کیا، مُشاعروں اور شعر و ادب کی محفلوں کی تو وہ رونق تھے، اُن کی کئی غزلیں خاصی مشہور ہوئیں! اُن کا مجموعہ کلام "رنگ و آہنگ" کئی سال ہوئے جب چھپا تھا، اس کے بعد سے اب تک انھوں نے بہت کچھ کہا۔ دیکھئے! اُن کے مرنے کے بعد دُنیا ان کے کلام کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے جو شاعر ایسے اچھے شعر کہتا ہو ؎

ہزار باندھ لئے عقل و آگہی نے حصار — ترا خیال نہ جانے کہاں سے آتا ہے
آرزوئے قرب بھی بخشی دلوں کو عشق نے — فاصلہ بھی میرے اُن کے درمیان رہنے دیا
یا رب! متاعِ دیں کو کہاں تک کوئی بچائے — ملتے ہیں روز دُشمنِ ایماں نئے نئے
کتنے دل راہ میں لوگوں نے بچھا رکھے ہیں — اے مرے سروِ رواں ! اور ذرا آہستہ

ایسے اہلِ دل اور اربابِ ذوق کس طرح بھول سکتے ہیں !

ادیب سہارنپوری کی زندگی کا زیادہ تر حصہ ریاست اندور میں گزرا۔ مالوے کی سہانی راتوں کی جھلک اُن کے کلام میں پائی جاتی ہے، اندور میں وہ کوئی چھوٹا سا کاروبار کرتے تھے، اور اس کاروبار سے اتنا مل جاتا تھا کہ بس گزارا کر سکیں پاکستان آنے کے بعد وہ شروع شروع میں خاصے پریشان رہے پھر کموڈور خالد جمیل کی نوازش سے نیوی (NAVY) میں مُلازمت مل گئی انتقال کے وقت وہ ڈاکیارڈ میں لائبریرین تھے !

کئی سال سے اُنہیں رمی کھیلنے کی لت پڑ گئی تھی۔ اس معاملہ میں جگر مرادآبادی کے صحیح جانشین تھے اور اُن کی گدی سنبھالے ہوئے تھے، ان آنکھوں نے اُن کو نماز پڑھتے بھی دیکھا ہے، اللہ اور رسولؐ کا ذکر چھڑ جاتا تو فرطِ عقیدت سے چہرے کا رنگ بدل جاتا، بہت سی نعتیہ غزلیں کہیں اور تقریباً دو سال تک ایک ایک ہفتہ کے وقفہ سے اُنہی کی زبان سے یہ نعتیہ غزلیں ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتی رہیں۔

فوج کے محکمہ میں سال کے سال ملازمین کا طبی معائنہ ہوا کرتا ہے اس سال ادیب مرحوم کے پھیپھڑوں میں معمولی سی تکلیف پائی گئی، جس کے ازالہ کے لئے ہسپتال میں وہ داخل ہو گئے، ایک مہینہ تک اُن کا علاج ہوتا رہا، اس کے بعد انہیں ایکا ایکی تیز بخار آگیا، ڈاکٹروں نے لاکھ تدبیریں کیں مگر بخار کم نہیں ہوا، کمزوری بڑھتی اور حالت تشویشناک ہوتی چلی گئی !

مرنے سے دو دن پہلے مجھے یاد کیا، دوسرے دن مجھے اُن کی شدید بیماری کی خبر ملی، میں نے جناب تابش دہلوی کو ٹیلی فون کیا! ہم دونوں جب ہسپتال پہنچے ہیں تو انہیں گلوکوز پہونچایا جا رہا تھا، بخار تیز تھا اور ہچکی لگی ہوئی تھی، تابش صاحب کو دیکھ کر اُن کا ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا، پھر میرے ہاتھ کو تھاما، بہت غور سے دیکھا، کئی بار بولنے کی کوشش کی، مگر زبان نہ اٹھ سکی، شاید یہ شکایت کرنا چاہتے ہوں ؎

نہ جانا کہ دُنیا سے جاتا ہے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

ان کی آنکھیں دھندلا سی گئی تھیں، نہ جانے پوری طرح ہمیں پہچانا یا نہیں پہچانا، ہم باہر آئے تو ایک صاحب نے جو غالباً نیوی میں ملازم تھے مجھ سے چپکے سے کہا کہ میں ہیڈ کوارٹر سے آ رہا ہوں، ہسپتال سے ان کے خطرے کا سگنل پہنچ چکا ہے!

دوسرے دن ادیب کے لڑکے رشید نے ٹیلی فون کیا کہ ڈاکٹروں نے بالکل جواب دیدیا ہے، حالت غیر ہے! شام کے چار بجے ادیب مرحوم کے قدردان دوست مرزا مقبول، ان کی بیگم صاحبہ، تابش دہلوی اور میں ہسپتال پہنچے اور وہاں وارڈ میں قدم رکھتے ہی یہ المناک خبر ملی کہ کوئی پانچ منٹ ہوتے ہوں گے، وہ اللہ کو پیارے ہو گئے! کتنی دردناک اور ملال انگیز خبر تھی ایسا محسوس ہوا جیسے فضا میں دھند چھا گئی، سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے! پھر ان گنہگار اور پتھر آنکھوں نے اس چہکتے ہوئے بلبل کو بستر مرگ پر خاموش دیکھا، مگر اب کیا دھرا تھا، پنچھی اڑ گیا تھا، پنجرہ خالی تھا!

ادیب مرحوم کے چہرے پر بیماری اور نقاہت کی زردی اور موت کی سپیدی ملی جلی تھی، مگر اس کے باوجود چہرہ شگفتہ تھا اور ہونٹوں پر تبسم کی نمود! تقریباً دو گھنٹہ انتظار کے بعد میونسپل کارپوریشن کی لاری آئی، اتنے میں جناب فضل کریم فضلی بھی تشریف لے آئے، وہ صبح اخباروں میں ان کی علالت کی خبر پڑھ کر بیمار پرسی کے لئے آئے تھے، مگر یہاں آ کر وہ بھی سوگواروں میں شامل ہو گئے!

دوسرے دن ادیب سہارنپوری کو سوسائٹی کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا، ان سخت جان اور سنگدل ہاتھوں نے ان کی قبر پر مٹی ڈالی، اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر اپنی رحمت کے پھول برسائے (آمین)

ریڈیو اور اخباروں نے ان کی موت پر غم کا اظہار کیا، مگر مرنے والے کے ساتھ لوگوں کی داد و تحسین نہیں، اس کے اپنے اعمال جاتے ہیں، اور ہم سب اسی طرف سے غافل ہیں، اسی غفلت نے ہماری زندگیوں کو بہت کچھ "غیر دینی" بنا دیا ہے! قلب غافل سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیئے!

ہماری نظر میں

المدنی از :- مولانا راحت گل، تقریظ :- مولانا سید محمد اسعد صاحب اور مولانا مفتی قاضی محمد زاہد الحسینی
(جلد اول) ضخامت ۲۰۸ صفحات، قیمت :- دو روپے - ملنے کا پتہ :- دار التصنیف جامعہ اسلامیہ پاکستان اکوڑہ خٹک ضلع پشاور، ہندوستان میں ملنے کا پتہ :- مولانا سید محمد ازہر شاہ دار العلوم (دیوبند)

یہ کتاب حضرت مولانا سید احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات پر مشتمل ہے، مولانا موصوف کی ولادت سے لے کر حضرت مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی وفات تک کے حالات بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں، اس کتاب کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تحریک آزادی اور جنگ آزادی میں علمائے کس جوش اخلاص کے ساتھ حصہ لیا ہے، اور کتنی قربانیاں دی ہیں۔

حضرت مولانا شیخ الہند اور حضرت مولانا حسین احمد (رحمہما اللہ تعالیٰ) پر ہندوستان اور مالٹا میں کیا گزری؟ انگریزی حکومت میں خدا کے ان نیک بندوں کو کس کس طرح ستایا گیا۔ یہ تفصیل اس کتاب میں ملتی ہے، فاضل مرتب نے واقعات کے فراہم کرنے میں خاصی محنت و کاوش کی ہے، اور بڑی عقیدت کے ساتھ کتاب کو مرتب فرمایا ہے۔

جناب راحت گل افسوس ہے انشا پرداز نہیں ہیں، اس کی کمی کتاب میں جگہ جگہ محسوس ہوتی ہے ——— کتاب کے ایک باب (سعادت) کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :-

"گلستانِ دیوبند کے در و دیوار پر اُداسی چھائی ہوئی ہے، نونہالانِ چمن اور عنادل باغ سر بگریباں
پیغام فراق سے ہمہ تن گریاں ہر خورد و کلاں محوِ آہ و فغاں، آج اس بوستاں کی چہکتی ہوئی بلبل
اور مہکتے ہوئے گل کے الوداع کا دن ہے ---"

حیرت ہے کہ اس دور میں فسانۂ عجائب اور سروش سخن کے انداز کی تقلید کرنے والے بھی پائے جاتے ہیں!

"لیلائے شب جب کہ پورے جوبن سے اپنی زلفِ مشک آثار پھیلائے کائناتِ عالم کو
اپنی آغوش میں لئے ہوتے تھی" (ص ۱۴)

"جوبن" اس عبارت میں کتنا بے جوڑ لگتا ہے، "پھر" سے" کا استعمال بالکل غلط ہوا ہے، علاوہ اس کے لکھنے کا یہ انداز اس دور میں پسند نہیں کیا جا سکتا۔

"فاضل اثاثہ اور جائداد کا اکثر و بیشتر حصہ راجہ علی حسین صاحب رئیس ٹانڈہ پر فروخت
کر کے ---" (ص ۲۷)

"پر" کی جگہ "کو" لکھنا چاہیئے تھا۔

"کیونکہ وہ پتنگان شمع نبوت -------" (ص ۳۵)

"پتنگہ" اُردو لفظ ہے، فارسی لفظ کے ساتھ اس کی اضافت درست نہیں۔

"علمی میدان میں ان سے گوئے سبقت لے جانے کی ہوس آسمان پر تھوکنے کے مترادف
سمجھی جانے لگی"۔　(صفحہ ۴۶)

لکھنے کا انداز کس قدر ناپختہ ہے۔

"اب مولانا مدنی کا شہر بدر ہونے کا تانا بننے لگے"۔ (صفحہ ۵۳)

یہ طرزِ تحریر زبان و ادب کے ساتھ اچھا مذاق ہے!

لیکن ان تف مارنے والوں کی نہ صرف ڈاڑھیاں آتش گیر ہوئیں بلکہ موئے ریش کے تھا
خود بھی جل کر خاکستر ہو گئے"۔

"تف مارنا" کہاں کی زبان ہے؟ پھر اس عبارت میں طنز کس قدر بازاری قسم کا ہے۔

"اگر کسی نے طائفہ مقدسہ کو دیکھنا ہو۔۔"

"نے" کا اس طرح استعمال زبان و روزمرہ کے خلاف ہے۔

"باقی تمام حضرات سے فیوضات حاصل کئے"۔

"فیض" کی جمع "فیوض" ہے پھر اس کی جمع الجمع (فیوضات) بنانے کی کیا ضرورت ہے، یہ لفظ —— فیوضات ——
کتاب میں بار بار آیا ہے اور جہاں آیا ہے ذوق پر گراں گزرتا ہے۔

صفحہ ۱۳۰ پر حیرت ہے کہ عربی دانی کے باوجود "غیظ" کو "غیض" لکھا گیا ہے۔ "مکہ معظمہ پہونچتے ہی جان نثارانِ مدنی پروانہ وار منڈلانے لگے"۔ (صفحہ ۱۳۱) "منڈلانے لگے" میں خفیف ذم کی جھلک پائی جاتی ہے، عام طور پر "منڈلانا" پرندوں اور ان میں بھی چیلوں کووں اور شکروں وغیرہ کے لئے بولتے ہیں —— "تمام معتقدین اس آفتِ ناگہانی سے سر بگریباں اشک ریز تھے" (صفحہ ۱۲۹)
"تھے" غلط استعمال ہوا ہے، پھر "سر بگریباں" نے پورے جملہ کو "عجیب" (؟) بنا دیا۔

"بس باب اسارت زنداں مقدر ہو چکا ہے"۔ (صفحہ ۱۳) "اسارت" بالاتفاق مونث ہے —— "اور اپنی مُدّعا واضح کردی" (صفحہ ۱۴) "مُدّعا" مذکر ہے اور اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں —— حیرت ہے کہ جن حضرات کو لکھنے کی مشق نہیں ہے اور جو انشا پرداز نہیں ہیں، وہ کتابیں لکھنے اور پھر انہیں چھپوانے کی جرأت کیسے کرتے ہیں۔

"اللہ اللہ وہ دستار، تاجِ افتخار، جس پر قیصر و کسریٰ کے افسر شاہانہ نثار، جس کے سامنے تاجِ
اورنگ شاہ جہاں ہیچ، جس کی عظمت تا قیامت امانت، اقران و ادوار گزر جائیں، برجِ
حمل دور پھر جائیں، مگر اس میں کسی نوع کسی طور خلل نہ آئے"۔ (صفحہ ۹۲)

یہ مولانا مدنی کے سر پر دستارِ خلافت باندھے جانے کی تعریف اور کیفیت بیان کی گئی ہے —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو چادر اور کوئی دوسری چیز عطا فرمائی ہو، تو اس کے لئے آخر کون سے الفاظ استعمال کئے جائیں گے!

"۔۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے بعد کسی جانشین
رسولؐ کو بارگاہِ رب العزت میں جو مقام حاصل ہو سکتا ہے وہ اعزاز حضرت مدنی کو
ضرور حاصل ہوگا"۔ (صفحہ ۶۲)

صحابہ کرامؓ کے بعد تو تابعین اور تبع تابعین کا درجہ ہے، اس کتاب کے مرتب نے جس خیال کا اظہار کیا ہے اُس کے مطابق مولانا حسین احمد

مدنی مرحوم حسن بصری، عمرؒ ابن عبدالعزیز، امام ابو حنیفہ، امام مالک، عبداللہ ابن مبارک، سفیان ثوری اور بعد کے اولیا ربین شیخ عبدالقادر جیلانی وغیرہ (رحمہم اللہ تعالیٰ) کے درجہ کے بزرگ قرار پاتے ہیں۔

> "میاں ظہیر! لوگوں نے مولانا حسین احمد کو پہچانا نہیں، خدا کی قسم ان کی روحانی طاقت اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ اگر وہ اس طاقت سے کام لے کر انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالنا چاہیں تو نکال سکتے ہیں، لیکن چونکہ عالمِ اسباب ہے، اس لئے اُن کو ایسا کرنے سے منع کردیا گیا ہے، اور اس غرض کے لئے ان کو وہی طریقے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جو اس دنیا میں برتے جاتے ہیں" (ص ۹۳)

یہ مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے جو انھوں نے "عالمِ جذب" میں فرمایا تھا ——— اگر یہ روایت صحیح ہے تو مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی کی خدمت میں ہم عرض کرتے ہیں کہ وہ اس کی تشریح فرمادیں ——— مولانا حسین احمد مدنی کی روحانی طاقت اتنی بڑھی ہوئی تھی تو انھوں نے انگریزوں کے دفع ہونے کے بعد ہندوؤں کے راج میں اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کے لئے کوئی انقلاب کیوں برپا نہیں کردیا! آخر یہ سوچنے کا انداز کیا ہے؟

> "ارضِ طیبہ کا ہر فرد بشر مشتاقِ دید مثل ماہیٔ بے آب شرفِ ملاقات کے لئے بےتابانہ چشم براہ تھا" (ص ۶۷)

حضرت شیخ الہند اور مولانا مدنی کے لئے مدینہ کے ہر فرد و بشر کا ماہیٔ بے آب کی طرح مشتاقِ دید ہونا، کس قدر مبالغہ آمیز ہے۔

> "پھر علی الصباح عروہ کی طرف ایک سے ایک آگے قدم بڑھتا چلا جارہا تھا، گویا تیرہ سو سال پہلے کا وہ منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی بار مکہ معظمہ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لارہے تھے" (ص ۹۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت فرماکر جب مدینہ پہونچے ہیں اور اہلِ مدینہ نے حضورؐ کا خیر مقدم کیا ہے اُس کو شیخ الہند مولانا محمود حسین اور مولانا حسین احمد مدنی کے استقبال کی مثال میں لانا، غلوِ عقیدت کی کتنی بڑی مثال ہے ——— ذرۂ حقیر کا آفتابِ جہاں تاب سے بھلا کیا مقابلہ ——— استغفر اللہ!

اپنے اسلاف و اکابر کے بارے میں دیوبندی حلقہ کی یہ مفرط عقیدت کتنی بہت سی خطرناکیاں اپنے اندر رکھتی ہے۔

مذہب عشق از:- نہال چند لاہوری، مرتبہ:- خلیل الرحمٰن داؤدی ۱۵۴ صفحات (ٹائپ) رنگین سرورق - قیمت دو روپے، ملنے کا پتہ:- مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور

پنڈت دیا شنکر نسیم کی مشہور مثنوی "گلزارِ نسیم" کے بارے میں عام تاثر یہی ہے کہ شاعر کی طبع زاد مثنوی ہے مگر "مذہب عشق" اور اس کے تحقیقی معلومات خیز دیباچہ کو پڑھ کر پتہ چلا کہ نہال چند لاہوری کی نثری تالیف "مذہب عشق" اس کے پس منظر میں نظر آتی ہے۔ فاضل مرتب دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

> "بہ ظاہر قصہ تاج الملوک اور بکاؤلی کی یہی کڑیاں نظر آتی ہیں کہ یہ قصہ اصلاً فارسی نثر میں عزت اللہ بنگالی نے سنہ ۱۱۳۴ھ ہجری میں لکھا، اس کے بعد اردو نثر میں نہال چند لاہوری نے ۱۲۱۵ھ میں منتقل کیا اور "مذہب عشق" عنوان قرار دیا، آخر میں دیا شنکر نسیم لکھنوی نے

سنہ ۱۲۵۴ھ میں اُردو نظم کا جامہ پہنایا اور گلزارِ نسیم نام رکھا۔ لیکن مجھے اس قصہ کی تحقیق کے دوران اور بہت سی گم شدہ کڑیوں کا سُراغ ملا ہے، جس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ قصہ عزت اللہ بنگالی کی فارسی نثر ۱۱۲۴ھ سے پہلے بھی اُردو زبان میں محفوظ تھا اور نسیم لکھنوی کی گلزارِ نسیم (سنہ ۱۲۵۴ھ) سے بھی یہ قصہ اُردو نظم کے قالب میں ڈھل چکا تھا۔ نہ تو عزت اللہ بنگالی کا فارسی قصہ ان کا طبع زاد ہے اور نہ دیا شنکر نسیم کی گلزارِ نسیم بکاؤلی کے قصے کی پہلی اُردو نظم ہے!

عزت اللہ بنگالی کی تصنیف (۱۱۲۴ھ) سے پہلے دو کتابوں کا سُراغ ہمیں شاہانِ اودھ کے کتب خانوں کی فہرست (مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۴ء) مرتبہ ڈاکٹر اسپرنگر سے ملتا ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے لکھا ہے کہ ایک اُردو مثنوی "تحفۂ مجلس سلاطین" میں بھی قصہ گل بکاؤلی نظم کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر مثنوی کے اس نام کو تاریخی بتلاتے ہیں اور اس سے سن ۱۱۵۱ ہجری نکالتے ہیں، یہ غلط ہے کیونکہ اس سے ۱۰۸۶ برآمد ہوتے ہیں۔ گارساں دی تاسی نے بھی ڈاکٹر اسپرنگر کا بیان جوں کا توں نقل کر دیا ہے اور اس نام سے تاریخ نکالنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ گارساں دی تاسی کی معلومات کی کیفیت یہ تو یہ ہے کہ وہ گلزارِ نسیم کے مصنف نسیم کو آگرہ کالج کا پروفیسر بتاتے ہیں۔

"ہمیں گارساں دی تاسی سے زیادہ تعجب رام بابو سکسینہ پر آتا ہے جو تاریخ ادب اُردو میں اس مثنوی کا نام "تحفۃ المجالس" لکھ کر اس سے سن ۱۰۵۳ نکالتے ہیں اور اپنا ماخذ نہیں بتلاتے۔ ڈاکٹر گیان چند نے پی، ایچ، ڈی کے لئے مقالے "اُردو کی نثری داستانیں" کی ترتیب کے دوران رام بابو سکسینہ کو متعدد خطوط لکھے کہ وہ اپنے ماخذ کا نام بتا دیں تاکہ مثنوی کے درست نام اور صحیح سن کا پتہ چل جائے۔ لیکن سکسینہ صاحب ہمیشہ ٹالتے رہے، یہاں تک کہ وہ یہ راز اپنے سینے میں لے کر اس جہانِ فانی سے رُخصت ہو گئے۔"

"جس طرح یہ مُسلّم ہے کہ عزت اللہ بنگالی کا فارسی قصہ تاج الملوک اور گل بکاؤلی کی داستان اوّلین نہیں ہے، اسی طرح یہ بھی ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزارِ نسیم (۱۲۵۴ھ) کا ماخذ نہال چند لاہوری کا اُردو قصہ مذہبِ عشق ۱۲۱۷ھ ہی نہیں ہے بلکہ نسیم کے سامنے اس قصہ پر مشتمل کم از کم ایک اُردو مثنوی مسمّٰی بہ "باغ و بہار" (سنہ ۱۲۱۴ھ) مصنفہ ریحان الدین ریحان لکھنوی اور ایک فارسی مثنوی مصنفہ رفعت لکھنوی بھی رہی ہیں، یہ دونوں مثنویاں نسیم سے پہلے لکھی جا چکی تھیں۔ نسیم نے ان دونوں مثنویات سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا ہے، اُن کے اشعار کے مطالب ہی اپنے یہاں نہیں لئے بلکہ لاتعداد اشعار اور مصرعے بلا کسی لفظی تبدیلی کے جُوں کے توں اپنے یہاں بلا کسی اعتراف کے نقل کر لئے ہیں۔

مگر کاتب کی غلطی کے سبب سنہ ۱۲۱۴ ہجری چھپ گیا ہے۔ "مثنویاں" لکھنا چاہیئے تھا "دونکے تھا "مثنویات" وجدان کو کس قدر کھٹکتا ہے۔
مقالہ نگار کو چند اشعار ضرور درج کرنے چاہیئے تھے جس سے اندازہ ہوتا کہ پنڈت دیا شنکر نسیم کو کہاں توارد ہوا ہے اور کہاں سرقہ کیا ہے۔ (م - ق)
تعداد اشعار اور مصرعے [illegible] "لکھنا چاہیئے تھا (م - ق)

اور وہ اشعار اپنی تصنیف ظاہر کئے ہیں خیانت اور سرقہ کی اس سے بدتر اور شرمناک مثال کیا ہوگی"۔

"مذہبِ عشق" نہال چند لاہوری کی تالیف کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ صرف مطبع نول کشور (لکھنؤ) سے یہ کتاب ۲۰ بار شائع ہو چکی ہے! خلیل الرحمٰن صاحب داؤدی نے افسوس کیا ہے کہ نہال چند کے حالاتِ زندگی نہیں معلوم ہو سکے!

کتاب دلچسپ بھی ہے اور اس میں زبان و روزمرہ کا بڑا چٹخارہ پایا جاتا ہے صرف ایک نمونہ:۔

"محل میں حسن آرا نے بھی اپنی مصاحبوں اور خواصوں کو بہ آئینِ شائستہ آراستہ کیا، اور آپ نیا لباس اور زر و جواہر کا پہنا، اس کے بعد شبھ گھڑی نیک ساعت دیکھ کر شہزادے کو ایک جڑاؤ چوکی پر بٹھلا کر شہانہ جوڑا پہنایا اور شملہ سر پہ رکھ کر پیچھے گوشوارہ، آگے موتیوں کا سہرا اور اس پہ پھولوں کا سہرا باندھا، جیغہ، کلغی سرپیچ لگایا، طرہ رکھا گلے میں موتیوں کی مالا، پھولوں کی بدھی پہنائی، مرصع کے نورتن بازوؤں پر باندھے، پھر ایک پری پیکر گھوڑے کے کنگا جمنی ساز لگا کر موتیوں کا سہرا باندھ کے سوار کر دیا"۔

مجلس ترقی ادب لاہور نے قدیم کتابوں کی اشاعت کا جو اہتمام کیا ہے اس پر یہ مجلس اردو دنیا کی طرف سے مبارکباد کی مستحق ہے۔

برگِ خزاں

از:۔ عبدالعزیز خالد، ضخامت ۱۹۲ صفحات (خوشنما ٹائپ، مجلد، دیدہ زیب رنگین سرورق)
قیمت:۔ چار روپے، ملنے کا پتہ:۔ مطبوعات مشرق، کراچی

جناب عبدالعزیز خالد کی سب سے پہلی منظوم پیش کش "زرِ داغِ دل" تھی، جس پر اب سے کئی سال پہلے "فاران" میں تبصرہ ہو چکا ہے! اس کے بعد خالد نے جس تیزی کے ساتھ ترقی کی ہے وہ اپنی جگہ حیرت انگیز ہے! فارسی اور عربی ادب کا انھوں نے خاصہ مطالعہ کیا ہے اور اس مطالعہ سے انھوں نے اپنی شاعری میں فائدہ اٹھایا ہے، کیسی کیسی حسین تشبیہیں اور تلمیحات ہیں جو اردو شاعری کے قالب میں ڈھل کر "سحرِ حلال" بن گئی ہیں۔

یہ کتاب تین منظوم ڈراموں —— قابیل، فلکناز، اور آشور بنی پال —— پر مشتمل ہے، چند کردار: اقلیمیا، بختیارک، ازبک، بیلا اسلین، فلکناز، ققنس —— اردو دانوں کے لئے یہ نام کتنے عجیب اور پُراسرار ہیں۔

خالد کے ان منظوم ڈراموں میں بڑی روانی اور جوش و ولولہ پایا جاتا ہے، اُن کا مطالعہ، مشاہدہ اور تفکر اور جذبات مل جل کر کہیں طوفان بن گئے ہیں اور کسی جگہ آبشار! شاعر کی طبیعت نے اس کتاب میں شعلۂ جوالہ کا پارٹ ادا کیا ہے! مناظر، افکار، کردار اور ماحول کی بوقلمونی اور رنگارنگی نے عجیب سماں پیدا کر دیا ہے۔

ان شعروں میں تلمیحات اور کرداروں کا لطف دیکھئے:۔

دمن و ہیلن و رودابہ و شیریں و شکر	سجے مُنی، بھاگ بھری، ماروی، سسی، عشرہ
کہیں نوشابہ و بلقیس کہیں دُنیا زاد	قرۃ العین کے نغمات سر رکنا باد
ہر فسوں ساز نے افسونِ محبت پھونکا	کہیں مادام لوازی تو کہیں ریبیکا
روت و چندربدن و روشنک و قیدافہ	کہیں گلچہر و پری دخت و رباب و عذرا

زہرہ آواز و انا نار رخ و برجیس جمال
دیدہ پھرتے ہیں ماندہ شکستہ، بدحال

نذر ہے تنگلت و سرعت و مناحریب کی یاد
سطوت و صولت قطما نصر و شمس عداد

بمج ہوں قاف و ارارات کے چاہ کیفا
یا ابلیس کا پہری گوشہ گوہر آگیں

"برگِ خزاں" کا آغاز حمد سے ہوتا ہے ——

ہے بے نیاز خلائق وہ ذات بے ہمتا
صفات و ذات میں یکسر منزہ و یکتا

تمام حمد و ستائش اسی کو ہے زیبا
وہ جس نے کن سے کیا کائنات کو پیدا

وہ جس نے دے کے مذاق تفحص اشیا
کفِ غبار کو سونپی خلافتِ دنیا

بدیعِ ارض و سما لا الٰہ الا اللہ

چند اور منتخب اشعار :—

صبا سموم شرر بار ہے تمہارے بغیر
گلاب پیرہن خار ہے تمہارے بغیر

رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے یہ لہو بن کر
لبوں پہ حرف غزل بزم میں جلو بن کر

ترانہ بوالہوسوں کا دکھی دلوں کی پکار
سرود خانہ ہمسایہ حسن راہگذار

نوائے عاشق مہجور صوت صلصل و شار
مولف عبرات و مصنف نظرات

ہر ایک شے متحجر، مہیب و وحشتناک
سم کی طرح گراں، ذرد کی طرح سفاک

یہ بددعا ہے مری تم بھی نامراد رہو
ہمیشہ ہمسفر ابر و خاک باد رہو

پردۂ قاف تھیں شب ہائے دمشق و بغداد
ہر طرف عارض روشن کے شبستاں آباد

شوخ مجوت جواں کامنیاں گوکل کی
گاگریں سر پہ چھلکتی ہوئی جمنا جل کی

شام کشمیر فدا ہو وہ بہار آنچل کی
سحر بنگال ہوا ہو وہ گھٹا کاجل کی

فقر فخری کی صدا نعرۂ لاہوتی ہے
کارِ دنیا غم و محنت کے سوا کچھ بھی نہیں

شعر حکمت بھی تو ہوتا ہے بیاں جادو بھی
لطف گفتار، صداقت کے سوا کچھ بھی نہیں

یہ دف و دائرہ و چنگ و رباب و سرچنگ
سر خموشانِ خوش آواز و شنگول و شنگ

وہ رخ کے چاند کی مانند نمودار ہوئیں
چال جھرنے کی طرح، نیل کمل سی آنکھیں

آسمان تخت و اسد بخت و فلک بار گیا
کہکشاں سیر و پرن صید و ثریا جاہا

جھولداری ہو نہ ڈیرا نہ سرادق نہ خیام
جوئے شیر یں کے کنارے کریں رہ رو آرام

جاد ئے شب کے جگاتی ہے صدائے قلقل
عمر رفتہ کو بلاتی ہے صفیر صلصل

اچھریاں جن سے خجل لولوئے منثور کی آب
قید پوشاک سے آزاد، برافگندہ نقاب

قرۃ العین سحر، مہر منور بن کر
درۃ التاج صباحت گل احمر ہو کر

نظم عالم ہے کہ مجموعۂ ویرانی ہے
دہر شیرازۂ اسباب پریشانی ہے

جس جگہ گرم تھا بازار حیات آج وہاں
پئے گلگشت سفیرانِ عدم آتے ہیں

دوسرا رُخ :-

کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا مزخرفات کو سمجھا، خلاصہ خوبی کا (ص۱۵)

شعر ترجمہ سا لگتا ہے " خلاصہ خوبی کا " یہ ٹکڑا خاص طور پر کمزور ہے۔

فروغِ آگہی سے اپنے آپ کو پہچان حقیقت ابدی ہے تفلسف و تبیان (ص۲۲)

"تفلسف" کی جگہ کوئی دوسرا موزوں تر اور حسین تر لفظ آنا چاہیئے تھا ——— "تفکر" آسکتا تھا۔ اس کے علاوہ ابلیس کا "تبیان" کو حقیقت ابدی کہنا بے معنی سی بات ہے!

ہر ایک کل پرزہ مبتلائے سازش ہو تمہارے حال پہ ہر رنگ میں نوازش ہے (ص۳۵)

"پرزہ" اسی وقت بحر میں آسکتا ہے جب "ر" کو متحرک پڑھا جائے (یعنی پرزہ بروزن "خطرہ" نہیں بلکہ بروزن حسنہ)

راہ عظمت کی ہے سُنسان، کٹھن پیٹیلی (ص۵۵)

"پیٹیلی" یہ ترکیب پہلی بار نگاہ سے گزری! اگر یہ شاعر کی ایجاد کردہ ہے تو لسے ذوق لطیف گوارا نہیں کر سکتا۔

جوگنیں جن کی چھنال اور نین متوالے دو وفادار کسی کی، نہ کسی کی پابند (ص۶۸)

"نین" بروزن "عین" ہے مگر اس شعر میں بروزن "کرن" لایا گیا ہے۔

نازنینان پری چہرہ و شیریں حرکات کاکلیں عطر بسی، چمپئی پنڈے، پری گات (ص۸۰)

پری گات" پر مصرعہ اس بُری طرح ٹوٹتا ہے کہ نغمگی کا لطف غارت ہو جاتا ہے۔

کیسے برداشت اٹھائے جو تا نکتوڑا دست و بازو میں ابھی تابِ تواں باقی ہے (ص۸۲)

نور اللغات میں اس کا املا "نکتوڑا" نہیں "نکشورا" ہے! "نکتوڑے" کی جگہ مصرعہ میں "نازونخرہ" لاتا تھا۔

مرا اک مختصر ارمان تو پورا کر دو مری آغوش ہے محروم نگاراں کب سے (ص۸۵)

"مختصر ارمان" بھلا نہیں لگتا! اس طرح بولا بھی نہیں جاتا کہ "مرا ارمان بہت مختصر ہے"۔

اور پھر منزل و ماویٰ ہو مغاکِ دلگیر (ص۹۱)

"مغاک" (گھاٹی یا پہاڑ کی کھوہ) کو "دلگیر" کون کہتا ہے اور بولتا ہے۔

ہر طرف سنگتے پھنکارتے آسیبوں کو اپنی کرنوں کے تغلب سے ہراساں کر دے (ص۹۲)

صوتی طور پر "تغلّب" نے شعریت کا خون کر دیا، عربی میں "تغلّب" کے معنیٰ "غلبہ" کے ہیں، مگر اُردو میں "تغلّب" خیانت کے معنیٰ میں بولا جاتا ہے۔

کبھی دیتے نہیں خوشبوئیاں درمٹ کے پھول (ص۱۰۳)

"خوشبو" کی جگہ "خوشبوئی" اب متروک اور محاورہ سے باہر ہے۔

اے شکر خوارِ دورمئے دوشینہ کب تک شوقِ بلور و رخام ولبِ نوشیں کب تک (ص۱۰۸)

سیاق و سباق کے اعتبار سے اول تو یہاں "شکر خوار" لانے کی تُک سمجھ میں نہیں آتی ——— پھر "لبِ نوشیں" کے ساتھ بلور و رُخام کا کیا جوڑ! نثر میں ہم یوں کہیں کہ فلاں شخص کو نازک لبوں اور بلور و مرمر سے بہت دل چسپی ہے، تو یہ بے جوڑ سی بات ہو گی۔

گنج ادراک نثار رہ جاناں نہ ہوا (ص۱۱۳)

"گنج ادراک" کیا ہوتا ہے ؟

امن و آزادی و بیراگ کی لذت لوٹیں ! 	یوگ سادھیں خدم و خیل کی رنج سے چھوٹیں (ص ۱۲۷)

آزادی فارسی لفظ ہے بیراگ ہندی ہے ان کے درمیان اضافت لانا درست نہیں !

ہم نے تاسفتہ جوانی کی حلاوت لوٹی 	سوز وارفتگیٔ شوق کے انگارے چنے (ص ۱۲۶)

مصرعہ ثانی میں بڑا تکلف پایا جاتا ہے !

؎ اور اکثر بدعتِ تیر مطاعن بھی رہی (ص ۱۲۹)

"تیر" حشو و زائد ہے ، "بدعت مطاعن" سے مفہوم پوری طرح ادا ہو جاتا ہے ۔

یم سیا مری پکھراج پری زریں تاج! 	جاں نثاری کے اس ایمائے جنوں میں کیا ہے (ص ۱۳۰)

"جان نثاری کا ایمائے جنوں" مہمل ترکیب ہے ۔

گردشِ دیبِ مشوق
مژدۂ کربِ عظیم ! ص ۱۳۲

مصرعہ اولیٰ کس قدر مبہم ہے ۔

اس سلیمیٰ کے تخاطب کی صمیمیت میں 	فصلِ نسیانِ جوانی کے تقاضے مدفون (ص ۱۴۲)

عبدالعزیز خالد کی پہلی کتاب "زرداغِ دل" میں جو ناپختگی پائی جاتی ہے یہ شعر اس کی "باقیاتُ السئیات" میں شامل ہے

بے خطر شام و سحر داد ہوس دی ہوتی 	مثل مستوں کے علانیہ بسر کی ہوتی (ص ۱۴۳)

"علانیہ" اس شعر کے دامن پر کتنا بدنما داغ ہے !

عبدالعزیز خالد نے کوئی شک نہیں اردو شاعری میں نئے لہجہ اور جدید طرز کا اضافہ کیا ہے ، وہ بڑی قوت کے ساتھ شعر کہتے ہیں ، جہاں تک تلمیحات کا تعلق ہے اس صنعت میں وہ تمام اردو شاعری سے منفرد ہیں ، ان کی نظموں کا پس منظر اور پیش منظر سمجھنے کے لئے مختلف قوموں اور ملکوں کے تہذیب و تمدن کا مطالعہ ضروری ہے !

"برگِ خزاں" میں کتنے ہی اشعار سپاٹ بھی ہیں ، خاص طور سے وہ مقامات جہاں ایک دو شعروں میں کرداروں کے "سوال و جواب" منظوم کئے گئے ہیں ——— عبدالعزیز خالد کا مطالعہ اور مشاہدہ دونوں وسیع ہیں ، جب کسی منظر اور کیفیت کو پیش کرتے ہیں تو ایک ایک جزیہ پر ان کی نگاہ رہتی ہے ! فلسفہ کی بزم ہو ، رزم کا میدان ہو ، حسینوں کی خلوت اور ہجانج اور مردنگ کی بجا ہو ، خالد ان تمام مناظر کا بیان پورے تلازمے کے ساتھ کرتے ہیں ، ان کی شاعری لطف انگیز ہی نہیں فکر انگیز بھی ہے ۔

فاران کراچی

جلد: ۱۵ شمارہ: ۶،۵

ایڈیٹر:۔ ماہر القادری

ماہِ اگست ستمبر ۱۹۶۳ء

ترتیب

قیمت فی پرچہ باسٹھ پیسے

چندہ سالانہ سات روپے

مقامِ اشاعت:۔ دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

پرنٹر و پبلشر مسرور حسین

مطبوعہ مطبع سعیدی کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

نقشِ اوّل

یہ دور جس سے آج کی انسانی دنیا گزر رہی ہے، فتنوں کا دور ہے، اللہ تعالیٰ کی زمین پر فتنے گھاس پھونس کی طرح چاروں طرف اُگ رہے ہیں، ایمان و یقین اور اخلاق و نیکوکاری کو قدم قدم پر طرح طرح کی آزمائشوں، خطروں اور فتنوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، تجارت و سیاست اور معیشت و معاش میں جو اخلاقی فساد پایا جاتا ہے، شعروادب اور فکرو دانش کی دُنیا بھی اُس فساد سے محفوظ نہیں رہی، بلکہ یہاں تو اور زیادہ ابتری نظر آتی ہے، تعلیم کی وہ کثرت کہ فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے موچی بھی اخبار اور رسالے پڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، مگر علم جسے "نیکی" کا ہم معنی اور مترادف کہا گیا ہے، اُس کا ساری دُنیا میں قحط ہے!

اس دور میں بعض ایسے فتنے بھی پائے جاتے ہیں جو بظاہر بے ضرر نظر آتے ہیں مگر اُن کی مضرتوں اور خطرناکیوں کی کوئی حد و انتہا نہیں! مثلاً شعروادب کی دُنیا میں "انسان" نگارش و گفتگو کا موضوع بنا ہوا ہے اور اُس کی عظمت اور بڑائی کو طرح طرح سے اجاگر کیا جا رہا ہے! یہ بات سو فیصدی درست ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بڑا شرف اور عظمت و بزرگی عطا کی ہے مگر یہ کوئی ایسا راز نہیں ہے جو ہمارے دور کے شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں پر منکشف ہوا ہے اور اس سے پہلے کی دُنیا انسان کو ذلیل اور کمتر سمجھتی تھی اور لوگ خود اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں سے ناآشنا تھے۔

اس نظریہ اور کلیہ بلکہ عقیدے کو انسانی تاریخ کے ہر دور میں تسلیم کیا گیا ہے کہ مخلوقات میں سب سے زیادہ عظمت و بزرگی اور شرف و برتری "انسان" کو حاصل ہے، جمادات، نباتات اور حیوانات کی تمام خصوصیات کا جوہر "حضرتِ انسان" میں پایا جاتا ہے، اس لئے اُس کی ذات خلاصہ کائنات ہے اور اس اعتبار سے اس "عالمِ صغیر" (انسان) میں پوری کائنات یعنی "عالمِ کبیر" سما گیا ہے، انسان تمام عناصر کائنات کا جوہر اور رُوح ہے، اور اسی کے ذوق و شوق کی پذیرائی کے لئے عالمِ کون و فساد کو رنگینیاں اور رعنائیاں دی گئی ہیں! اور دُنیا کی یہ محفل آدمی ہی کے لئے سجائی گئی ہے قرآن انسان کو زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ کہتا ہے۔

ترقی پسندی کے نام سے جو ادب منظرِ عام پر آ رہا ہے، اُس میں انسان کو اس حیثیت سے نمایاں کیا جاتا ہے جیسے انسان مذہب کے پیش کئے ہوئے "خدا" کا حریف اور مدِ مقابل ہے، اور اس کی صلاحیتیں اور توانائیاں خدائی صفات کو معاذاللہ شکست دیدیں گی اور اس مادی کائنات کے پورے نظام پر کسی غیر مادی طاقت کی نہیں، بلکہ صرف انسان کی جو مادی طاقتوں کا سرچشمہ ہے حکمرانی ہوگی! چنانچہ ملحد ادیبوں اور شاعروں نے لا الٰہ الا اللہ کے مقابلہ میں "لا الٰہ الا الانسان" اپنا کلمہ ایجاد کیا ہے! لوگ اس انداز کے مفکرین اور انشاپردازوں کو انسان کا بہت بڑا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھتے ہیں!

دعوے یہ کئے جا رہے ہیں کہ انسان کی توانائیاں اور صلاحیتیں بالآخر اُس دور میں پہونچ جائیں گی، جب آدمی موت پر قابو پالے گا، وہ پیدا ہونے کے بعد پھر فنا اور نابود نہ ہوگا۔ اور نہ بیماریاں اُسے ستائیں گی، نہ اُس کے ارادے ٹوٹا کریں گے اور نہ اُسے فکر و غم لاحق ہوگا! یہ دعویٰ کس حد تک صحیح ہے، اس کا فیصلہ تو مستقبل ہی کر سکے گا، انسان کا ماضی اور حال جو ہمارے سامنے کر

اُن پر نظر کرتے ہوئے اس قسم کے بلند بانگ دعوے کھوکھلے اور بے بنیاد دکھائی دیتے ہیں!

غلط کہتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ وجودِ ذاتِ باری کے عقیدہ کے سبب انسان کی توانائیاں اور صلاحیتیں دبی دبی رہی ہیں جیسے فصل کو پالا مار جائے اور روئیدگی کی قوت ٹھٹھر کر رہ گئی ہو۔ تمدن و تہذیب اور فلسفہ و سائنس کی اب تک جتنی ترقیاں ہیں، اُن کا نہ تو ذاتِ باری کے عقیدے سے کوئی تصادم ہوا ہے اور نہ یہ مقدس و معصوم عقیدہ سائنس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنا ہے، اگر مریخ و مشتری اور ماہتاب پر عطارد میں اس زمین کے آدمی جاکر بود و باش بھی اختیار کر لیں اور سائنس کی ایجادات اس مقام تک پہونچ جائیں کہ کرۂ ہوا میں ریل اور موٹر دوڑنے لگیں تو ایسا ہو جانے سے وجودِ باری کا عقیدہ ذرہ برابر متاثر نہیں ہوتا۔ سائنس و تہذیب کی یہ ایجادات اور ترقیاں تو اللہ تعالیٰ کے وجود اور اُس کی عظمت و ربوبیت کی زندہ دلیلیں ہیں!

مذہب کہتا ہے، دین کہتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اسلام کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو پیدا فرمایا، اور اسے پیدا فرمانے کے بعد وہ اس سے غیر متعلق نہیں ہو گیا بلکہ اس کی رحمت، ربوبیت اور مشیت اس کارخانہ کو چلا رہی ہے، اور کائنات کے نظام کو تھامے ہوئے ہے۔ اور ایک لمحہ کے لئے بھی کسی قسم کی فترت، غفلت اور ڈھیل واقع نہیں ہوتی! سائنس جتنی ترقی کرتی جاتی ہے، یہ بات اور زیادہ آشکارا ہوتی جا رہی ہے کہ یہ کائنات جتنی زیادہ پیچیدہ ہے اُس سے زیادہ منظم ہے، خاک کا ایک ذرہ اور درختوں کی ایک ایک پتی اپنے اندر تنظیم و ترتیب کا ایک عالم رکھتی ہے اور عقلِ سلیم کسی طرح اس بات کو باور نہیں کر سکتی کہ کائنات آپ ہی آپ پیدا ہو گئی ہے، اور مادہ نے جو بالکل بے شعور ہے اپنی تنظیم آپ کی ہے! جو کوئی اس قسم کا عقیدہ رکھتا ہے یا تو پاگل ہے اور اُس کی مت ماری گئی ہے، یا پھر وہ جان بوجھ کر حقیقت کو جھٹلاتا ہے!

سائنس داں اشیاء کے موجد ہیں خالق نہیں ہیں، کسی سائنس داں نے ایک ذرہ بھی آج تک تخلیق نہیں کیا، وہ خود جن صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہیں اور ان صلاحیتوں کو سائنس داں جن کیمیاوی عناصر میں صرف کرتا ہے وہ بھی کائنات کی شانِ تخلیق کا مظہر ہیں، جس عقل و فراست کے زور سے سائنس دانوں نے "اسپٹنک" ایجاد کیا، وہ عقل و فراست بھی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہے، اگر عقل و فراست آپ ہی آپ پیدا ہو جایا کرتی تو نباتات و جمادات بھی صاحبِ عقل اور اہلِ شعور ہوتے۔ انسان کو عقل اس لئے دی گئی کہ اُس کی ذمہ داریاں تمام مخلوقات سے زیادہ عظیم، پیچیدہ، نازک اور وسیع و بسیط ہیں، تمدن و تہذیب اور علم و دانش کی تمام رنگ آرائیاں اور بوقلمونیاں انسان ہی کے دم قدم سے پائی جاتی ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُسے وہ صلاحیتیں عطا کی ہیں، جو دوسری مخلوقات کو نہیں دی گئیں! جب سے دُنیا میں حیوانات کے وجود کا اتا پتا ملتا ہے، وہ جس انداز سے رہتے ہیں، غار اور کھوہ میں، گھونسلوں اور درختوں کے کھوکھلے تنوں میں کیچڑ اور پانی میں سوراخوں اور بھٹوں میں! لاکھوں سال کی مدت گزر جانے کے بعد بھی اُن کی بود و باش، طرزِ رہائش اور کھانے پینے اور چرنے چگنے کے انداز و طور طریق میں ذرہ برابر اضافہ نہیں ہوا مگر اس کے برخلاف انسان نے فنِ تعمیر میں جو ترقیاں کی ہیں وہ کس قدر حیرت انگیز بلکہ سحر کارانہ اور معجز نما ہیں، پھر مادی ترقیوں کا سلسلہ کسی حد پر جاکر رُک نہیں گیا، اس میں برابر کانٹ چھانٹ، ترقی، اضافہ اور نزاکتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں، آدمی کے جسم کی ساخت ہی اس قسم کی ہے کہ اُسے مدنی الطبع ہونا چاہیئے، اور مدنیت کا یہ تقاضا ہے کہ مادی وسائل خوبی و ترقی کے نئے نئے رُوپ دھارتے رہیں!

اُن لوگوں کی عقل و فکر کا دیوالہ نکل چکا ہے جو سائنس کی ترقیوں کے نام پر اللہ تعالیٰ پر طنز کرتے ہیں، سائنس کی ترقیوں سے اللہ تعالیٰ کی خلاقی اور قدرت و عظمت کے لئے نئے نئے ثبوت فراہم ہوتے ہیں! ذہن و فکر اور دل و دماغ کی قوتوں کے اس اقلا

بھلا کوئی انتہا ہے کہ سائنس کی جو ایجادات اللہ تعالیٰ کے وجود کے یقین کو بڑھانے والی ہونی چاہئیں اُن سے وہم و انکار اور کفر و الحاد کی طرف ذہن جاتا ہے! اس قسم کی باتیں دماغی امراض کا ثبوت دیتی ہیں، اور اس دور میں دماغی امراض عام ہوتے جاتے ہیں! اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ یہ دماغی مریض اپنے کو صحت مند سمجھتے ہیں، اور جو کوئی اُن کے مرض کی نشان دہی کرتا ہے اسے الٹا بیوقوف اور قدامت زدہ بتاتے ہیں!

سائنس کی رنگا رنگ ایجادات اور نت نئی ترقیاں تو دینی عقائد کی صحت کے لئے دلیلیں فراہم کر رہی ہیں ——— مثلاً "اسپٹنک" کی ایجاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ معراج کی کتنی واضح اور روشن مادی دلیل ہے یہ ایجاد جسم کی مادی ساخت اُس کی پرواز اور خلاء و ملاء کے بہت سے نازک مسائل کی گرہیں کھول دیتی ہے اور واقعہ معراج کے سمجھنے میں انسانی عقل جس حیرت و استبعاد سے متوحش ہو جاتی تھی، اسپٹنک کی ایجاد اُس حیرت و استبعاد اور توحش میں عقلی طور پر امکانات کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ قرآن کریم قیامت برپا ہونے کے منظر کو ان لفظوں میں پیش کرتا ہے:-

يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ ، وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ

(جس دن ہوویں آدمی جیسے پتنگے بکھرے ہوئے اور ہوویں پہاڑ جیسے رنگی ہوئی اُون

(یا رُوئی) دُھنکی ہوئی)

کیا جوہری توانائی کی دریافت و ایجاد نے قیامت برپا ہونے کے اس منظر کے لئے مادی ثبوت فراہم نہیں کر دیا؟ اور ہیروشیما میں دنیا نے اپنی آنکھوں سے قیامت کے اس منظر کو نہیں دیکھ لیا؟ سائنس کی ایجادات درحقیقت اللہ تعالیٰ کے وجود پر محسوس و مشہود حجت ہیں! عقلِ انسانی کی سب سے بڑی فضیلت اللہ تعالیٰ کو ماننا اور اُس کی ربوبیت کی گواہی دینا ہے، جس کسی نے اللہ تعالیٰ کا انکار کیا، اُس نے عقل کی فضیلت و شرف کو ضائع کر دیا!

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں

انسان نے سائنس کے شعبہ میں جو ترقیاں کی ہیں وہ یقیناً حیرت انگیز ہیں۔ مگر ان تمام ترقیوں کے باوجود انسان کی درماندگی، بیچارگی اور بے خبری کا یہ عالم ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا سائنس داں نہیں بتا سکتا کہ اُس کے بدن پر بالوں کی کتنی تعداد ہے، اُس کے جسم میں خون کی کتنی مقدار موجود ہے؟ وہ دن رات میں کتنی سانسیں لیتا ہے، اُس کے معدے میں کتنی حرارت پائی جاتی ہے؟ وہ سائنس کی اس حیرت انگیز ترقی کے دور میں بھی اپنی پیٹھ کو نہیں دیکھ سکتا یہ تو سائنس والوں کا خود اپنے جسم کے بارے میں بے خبری کا عالم ہے! جو انسان اپنی پیٹ کی آنتوں اور اپنے جسم کے بالوں کو بھی نہ گن سکے کیا اُسے یہ زیب دیتا ہے کہ وہ خدائے علیم و خبیر کا حریف اور مدِ مقابل بن کر سامنے آئے، اس تصور، اس جذبہ۔ اس فکر اور اس جرأت و جسارت پر ہزار بار لعنت، اور کروڑ بار پھٹکار!

جوہری توانائی کے اس انتہائی ترقی یافتہ دور میں بھی انسان (جس میں سائنس داں بھی شامل ہیں) کی بے خبری کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے گھربار میں برتنے کی چیزوں کے بارے میں نہیں جانتا کہ وہ کب ایجاد ہوئیں، کس نے ایجاد کیں اور سب سے پہلے زمین کے کس خطہ میں وہ وجود میں آئیں! پلنگ، کرسی، تخت، دیگچی، توا، پھنکنی، چمٹا، بیلن، یہاں تک کہ پاجامے، کرتے، ٹوپی، عمامے، اچکن، فرغل اور تکموں اور بٹنوں کی ایجاد کے بارے میں عام طور پر لوگ بے خبر ہیں! یہ تو گنتی کی چند چیزیں ہم نے بیان کی ہیں ورنہ تمام اشیاء کے بارے میں لوگ بہت کم علم رکھتے ہیں! کون بتا سکتا ہے کہ گیہوں کا پودا سب سے پہلے کس ملک میں پیدا ہوا، اور اس کی تحقیق آج تک نہیں ہو سکی کہ تخم اور پودے ان دونوں میں کس کا وجود مقدم ہے! پھر اس کا حال بھی کوئی نہیں بتا سکا کہ سب سے پہلے گیہوں کا آٹا کہاں پیسا

گیا اور اس آٹے کی روٹی سب سے پہلے کس نے پکائی، اور آٹے کے پیسنے کا نمبر تو بعد میں آتا ہے، اسی چیز کی تحقیق سے لوگ عاجز ہیں کہ پہلی چکی کس طرح اور کہاں وجود میں آئی! زندگی میں برتنے کی عام چیزوں کے بارے میں انسان کی بے خبری کا یہی عالم ہے، اس معاملہ میں وہ تاریکی میں ہے۔ اور اس کے چاروں طرف جہالت و بے خبری کے پردے پڑے ہوئے ہیں!

اس عالم رنگ و بو، جہان کون و فساد اور دنیائے آب و گل کے ماضی میں انسانوں کے درمیان کیا واقعات پیش آئے، اس کا تھوڑا بہت علم تاریخی کتابوں اور نسلاً بعد نسلٍ بیان کی ہوئی روایتوں کے ذریعہ انسانوں کو حاصل ہے۔ مگر انسانوں کے حافظے اور تاریخی کتابیں ان واقعات وحوادث کا عشر عشیر بھی محفوظ نہیں کر سکیں جو وجود میں آئے ہیں، انسان کے ماضی کے بارے میں تاریخی معلومات انتہائی محدود ہیں! یوں سمجھیے کہ واقعات وحوادث کے اتھاہ سمندر کی چند موجیں تاریخی کتابوں اور حافظ کی تختیوں پر ابھری ہوئی ہیں! اور تاریخ جو کچھ بتاتی ہے، اُن میں بھی نہ جانے کتنی باتیں مبالغہ آمیز ہیں، کتنی باتوں میں افراط و تفریط پائی جاتی ہے، کتنی باتیں مشتبہ ہیں اور کتنی بے اصل ہیں اور کتنی عین واقعہ کے مطابق ہیں۔

دوسرے جانوروں کے مقابلہ میں آدمی کی جسمانی کمزوری کا یہ عالم ہے کہ وہ بھینسے، گدھے، خچر اور اونٹ کی برابر بھی وزن نہیں اُٹھا سکتا، جنسی اختلاط کے معاملے میں آدمی بندر اور ریچھ سے ہر جہت اور حیثیت سے کمزور ہے! چیتے، کتے، ہرن، گھوڑے اور خرگوش کے مقابلے میں آدمی دوڑ نہیں سکتا، اس میں چیلوں، کووں اور شکروں کی طرح ہوا میں اُڑنے کی صلاحیت ہی سرے سے نہیں پائی جاتی، نہ وہ مچھلیوں اور گھڑیالوں کی مانند پانی میں رہ سکتا ہے!

آدمی زندہ رہنے کے لئے اس کائنات میں سراپا احتیاج نظر آتا ہے ایک ایک قدم پہ محتاجی اور ایک ایک سانس کے لئے سہارے کی ضرورت! کھانا اور پانی نہ ملے تو وہ زندہ نہیں رہ سکتا، جسم ڈھکنے کے لئے وہ کپڑوں کا محتاج ہے! قلم پنسل اور کاغذ یا کاغذ نما کوئی چیز نہ ہو تو وہ لکھ نہیں سکتا، سفر کے لئے وہ سواری کی احتیاج رکھتا ہے، کپڑے پر کوئی داغ دھبہ لگ جائے تو اُسے دُور کرنے کے لئے آدمی کو صابن اور اسی قسم کی کسی چیز کی ضرورت پڑتی ہے۔ رہنے کے لئے وہ مکان کا محتاج ہے، اور مکان بنانے کے لئے اینٹ، پتھر، چونا، سیمنٹ، لکڑی اور لوہے وغیرہ کی ضرورتوں سے اُس کا سابقہ پڑتا ہے، مینہ برس رہا ہو تو پیدل چلنے میں بارش سے بچنے کے لئے آدمی برساتی یا چھتری کی پناہ ڈھونڈتا ہے، آدمی نے بے شمار مشینیں ایجاد کی ہیں مگر کسی مشین کا کوئی پُرزہ خراب ہو جاتے یا کھو جاتے، تو جب تک وہ پُرزہ دستیاب ہو کر مشین میں فٹ نہ ہو جاتے، آدمی اُس مشین کو صرف اپنی ذہانت و فراست کے زور سے نہیں چلا سکتا، کسی انجن یا مشین کی وہ نالی جس کے ذریعہ پیٹرول پہونچتا ہے، اگر اُس میں کنکری پھنس جائے تو مشین بند ہو جاتی ہے۔

انسان کے جسم میں ذرا سی پھانس چبھ جائے، ہلکا سا بخار آجائے اور نزلہ زکام ہو جائے، تو وہ طبیعت میں کس قدر بے لطفی اور بے کیفی محسوس کرتا ہے، کتنی بیماریاں ہیں جو آدمی کو اتنا کمزور کر دیتی ہیں کہ اُس کے لئے اٹھنا بیٹھنا بلکہ ہلنا جلنا مشکل ہو جاتا ہے، آنکھ میں ذرا سا ذرہ پڑ جائے تو آدمی کس قدر بے چین ہو جاتا ہے، اس کے دُور کرنے کے لئے وہ کیا کیا جتن کرتا ہے، ایک ذرا سا کھٹمل اور مچھر آدمی کو مضطرب کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔

انسان کی کمزوری، بے بسی اور مجبوری کا یہ عالم ہے کہ وہ بہت دور تک دیکھ نہیں سکتا اور دُور کی چیزیں جو اُسے دکھائی دیتی ہیں وہ اپنی حقیقی جسامت سے بہت چھوٹی اور دھندلی دھندلی نظر آتی ہیں۔ بہت دُور دیکھنے پر ایسا نظر آتا ہے جیسے آسمان زمین سے ملا جا رہا ہے، حالانکہ انسان کا یہ دیکھنا واقعہ کے بالکل خلاف ہے، پھرکنی، لٹو، بنیٹی یا کوئی گول چیز تیزی

کے ساتھ گھومتی ہوتی ہے تو آدمی کی نگاہ ایک دائرے کا مشاہدہ کرتی ہے حالانکہ جب گھومنے والی چیز ٹھہر جاتی ہے تو یہ دائرہ نظر نہیں آتا!

انسان کی انفعالیت کا یہ عالم ہے کہ ترش چیز کے صرف ذکر اور تصور سے اس کے منہ میں پانی بھر آتا ہے، ایک گالی سن کر آدمی کا موڈ کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے، اور دوسروں کے منہ سے ذرا سی تعریف سن کر آدمی کتنی مسرت محسوس کرتا ہے، حزن وملال، قبض وانبساط اور خوشی وناخوشی کے یہ عالم ہر انسان پر گزرتے رہتے ہیں گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ! اس قدر کم ظرفی اس درجہ اوچھا پن! انسانی طبیعت اور مزاج ہر آن جھکولے کھاتے رہتے ہیں، دنیا کی کوئی مخلوق انسان کی برابر متلون نہیں ہے۔ انسان کے ارادے ٹوٹتے ہیں اور اس کی امیدیں ناکام ہوتی رہتی ہیں، سوچا کیا ہے اور ہو کیا جاتا ہے۔ تاش کے پتوں میں، گھوڑ دوڑ کی شرطوں میں، تجارتی سودوں میں آدمی کے اندازے کس قدر غلط ثابت ہوتے ہیں، اندازے کی اس غلطی کے سبب آدمی کو کیسی کیسی کوفت اٹھانی پڑتی ہے اور کتنے عظیم نقصانات برداشت کرنے پڑتے ہیں!

لکھنے پڑھنے میں آدمی سے کیسی بھول چوک ہو جاتی ہے، کتنی کتنی بار اسے اپنی لکھی ہوئی عبارت کاٹنی پڑتی ہے، اس کا حافظہ کیسی کیسی غلطیاں کرتا ہے، اس کی یاد کتنا دھوکا دیتی ہے، انسان رسی کے ٹکڑے کو سانپ سمجھ کر ڈر جاتا ہے اور موج سراب اسے موج آب دکھائی دیتی ہے! مستقبل کے بارے میں آدمی کی بے خبری کا یہ عالم ہے کہ آنے والے ایک لمحے کے متعلق وہ قطعی حکم نہیں لگا سکتا کہ کیا ہونے والا ہے؟ سانس جو اندر جاتی ہے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ پھر واپس آئے گی بھی یا نہیں، پلک جھپکنے میں نہ جانے کیا سے کیا ہو جائے آدمی کو کچھ خبر نہیں! ریلیں لڑتی اور پٹڑی سے اترتی ہیں، ہوائی جہاز ٹکراتے ہیں، کوئلہ کی کانوں میں دھماکے ہوتے ہیں مکانوں اور گوداموں میں آگ لگتی ہے پانی کے جہاز ڈوب جاتے ہیں۔ دوست عزیز بیمار ہوتے اور مرتے ہیں، آدمی کسی حادثہ کو نہیں روک سکتا، قضا وقدر کے آگے انسان بالکل بے بس اور مجبور ہے۔

آدمی کو نہیں معلوم کہ وہ جہاں بیٹھا ہے، اس کے پاس دیوار کے پیچھے کیا ہو رہا ہے! اپنی بے خبری کو دور کرنے کے لئے آدمی کس شوق ودلچسپی کے ساتھ اخبار پڑھتا ہے، ٹیلی فون پر بات کرتے کرتے لائن کٹ گئی اور بات چیت کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ قلم سے لکھتے ہیں کاغذ پر روشنائی کا دھبہ پڑ گیا، ہوا کا جھونکا ایکا ایکی آیا جس نے انتہائی ضروری اور کام کے کاغذوں کو تتر بتر اور منتشر کر دیا خود اپنا ازار بند کھولتے میں گرہ لگ گئی، کھانا کھاتے میں شوربہ بکھر گیا، پانی کا گلاس الٹ گیا، کھانے میں نمک تیز ہو گیا اور حلوے میں میٹھا پھیکا رہا ——— یہ روزمرہ کی وہ ناگواریاں ہیں، جن سے ہر کسی کو سابقہ پڑتا ہے اور ہر کوئی اس قسم کی کوفت اور ناگواریوں کے چرکے سہتا رہتا ہے۔

دوستوں کی دعوت میں عین کھانے کے وقت پتہ چلا کہ کھیر کے لئے جو دودھ چولھے پر گرم ہو رہا تھا وہ پھٹ گیا اور کسی کام کا نہیں رہا۔ سب لوگ بھوک کے مارے بے تاب ہوئے جا رہے ہیں مگر ایک صاحب ابھی تک تشریف نہیں لائے۔ ان کا انتظار ہو رہا ہے، صاحب خانہ بار بار ٹیلی فون کرتے ہیں، اور ہر بار یہی جواب آتا ہے کہ ان کو تو گھر سے روانہ ہوئے ایک گھنٹہ ہو گیا، وہ صاحب تشریف لائے تو اپنے تاخیر سے آنے کا دکھڑا لے بیٹھے کہ راستہ میں میری موٹر کار، سائیکل رکشا سے ٹکرا گئی، کار کا مڈگارڈ ٹوٹ گیا، وہ تو اللہ نے خیر کر دی کہ چوٹ پھینٹ نہیں آئی ورنہ تصادم خاصہ شدید تھا۔ جو بھی کچھ ہو جاتا، تھوڑا تھا۔ آدمیوں کی پوری کی پوری محفل کوفت میں مبتلا ہے۔

عربی میں نیند کو "موت کی بہن" کہتے ہیں اردو کی کہاوت بھی اس سے ملتی جلتی ہے کہ سوتا اور مرا آدمی برابر ہوتا ہے، سوتے

ہوئے آدمی کو اپنے سرہانے اور پائنتی تک کی بھی خبر نہیں رہتی، اُس کے پلنگ کی پٹی کے نیچے کیا ہو رہا ہے، اُسے کچھ خبر نہیں، اس دُنیا کی ہر چیز اور ہر واقعہ سے غافل اور غفلت ہر آدمی پر طاری ہوتی رہتی ہے! لوگوں کی نیند ہی سے فائدہ اُٹھا کر چوروں کی بن آتی ہے، رات کی تاریکی میں مکانوں کی دیواروں میں نقب لگتے ہیں، جیبیں کاٹی جاتی ہیں، دروازوں میں لگے ہوئے قفل ٹوٹے جاتے ہیں —

انسان کی سننے، دیکھنے اور چھونے کی قوتیں محدود ہیں، عقل جو انسان کے لئے سب سے بڑا شرف ہے وہ تک غلطیاں کر جاتی ہے، اُس کے اندازے اور اخذ کئے ہوئے نتیجے بعض اوقات غلط اور مضحکہ ثابت ہوتے ہیں، سہو و نسیان تو انسان کی فطرت میں شامل ہے، اُس سے کوئی انسان محفوظ نہیں، یہاں تک کہ انبیاء کرام جو تمام انسانوں میں برگزیدہ اور خدا رسیدہ ہیں ان تک سے کبھی کبھار تقاضائے بشریت بھول چوک ہو گئی ہے!

بیماری کے زمانے میں آدمی چڑچڑا ہو جاتا ہے، بڑھاپا آدمی کو بہت زیادہ نازک مزاج بنا دیتا ہے، شدید غصہ کی حالت میں آدمی توازن کھو بیٹھتا ہے، غم ہو یا خوشی ان کی شدت آدمی کے معتدل حالات میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے! دفع مضرت اور جلب منفعت یہ انسان کی فطرت ہے مگر اس کش مکش میں انسان کو کیسے کیسے پاپڑ بیلنے اور لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں —

آدمی کی بہت سی خوشیاں اور تمنائیں ایسی ہیں جن کی بنیاد ہوا پر ہوتی ہے، وہ اپنے جی ہی جی میں کیسے کیسے خیالی پلاؤ پکاتا ہے، آدمی کی زندگی پانی کے بلبلے سے بھی زیادہ نازک اور ناپائدار ہے ——— کہ

ع ذرا سی ٹھیس لگی اور حباب ٹوٹ گیا

چلتے میں ٹھوکر لگی اور دم نکل گیا، ہچکی آئی اور طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا، موت سے دُنیا میں کسی کو مفر نہیں، بس آگے پیچھے کا معاملہ ہے، یہاں ریچ پیچ چل چلاؤ لگا ہوا ہے زندگی کی ہر سانس آدمی کی عُمر کو گھٹا دیتی ہے، آدمی وقت کے ایک لمحہ کو بھی نہیں ٹھیرا سکتا، واقعات و حادثات کے سمندر میں جس کا اور چھور نہیں ملتا اور جو ہر وقت شدید ہیجان میں رہتا ہے، آدمی کا وجود ایک تنکے سے بھی کمتر ہے —

اللہ اکبر انسان کی کمزوری، مجبوری، بے دست و پائی اور تلون و اضطراب کی جو تفصیل اوپر پیش کی گئی ہے، اُس کی غرض و غایت انسان کی تذلیل و تحقیر نہیں ہے، ہم خود بھی فرشتہ اور جن نہیں ہیں انسان ہی ہیں اور کوئی شخص اپنی ذلت کو گوارا نہیں کر سکتا، ملحدانہ ادب جو آج کی دنیا میں انسان کو اللہ تعالیٰ کا حریف اور مد مقابل بنا کر پیش کرتا ہے، اُس کے جواب میں انسان کی کمزوری، درماندگی اور بیچارگی کی روشن و واضح دلیلیں پیش کی گئی ہیں کہ جو اس قدر کمزور، مجبور، بے دست و پا اور بے چارہ ہو، وہ اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کا حریف اور مقابل کس طرح بن سکتا ہے، جو ادیب، شاعر اور مفکر دور حاضر کی نسل کو اس قسم کے بڑھاوے دیتے ہیں اور انسان کی شخصیت کو غلط انداز میں اُجاگر کرتے ہیں ——— وہ انسانیت کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کرتے، یہ خدا دُشمنی ہی نہیں انسان دُشمنی بھی ہے۔ ذرے اور آفتاب، قطرے اور دریا میں جو تناسب اور مماثلت و مشابہت پائی جاتی ہے، انسان اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں اس سے بھی سنکھوں درجے پست و ذلیل ہے، معبود اور عبد کا بھلا مقابلہ ہی کیا، باقی کو فانی سے کیا نسبت و مماثلت (سبحان اللہ عما یصفون) اگر مخلوق خالق کی برابری کا دعویٰ کرنے لگے تو یہ دُنیا کی سب سے بڑی جہالت ہے، جہالت ہی نہیں رذالت اور کمینہ پن بھی! انسان کی عظمت کو اللہ تعالیٰ کی کبریائی کے مقابلہ میں وہی لوگ لا سکتے ہیں جن کی عقلیں بانجھ اور جن کے دل و دماغ بالکل ماؤف ہو چکے ہیں

صحتِ ہوش وحواس کی حالت میں اس قسم کا کوئی طنزیہ جملہ انسان کے زبان وقلم سے نکل کیسے سکتا ہے۔ جن دماغوں نے اس اعلان پر سوچا ہے وہ دماغ نہیں نجاست خانے ہیں! رفعِ حاجت کرنے والا انسان اللہ تبارک و تعالیٰ کی ہمسری کا دعویٰ کرے کتنی بے عقلی کی بات ہے، اس قسم کے دماغوں سے انسانیت کی فلاح وبہبود کی توقع رکھنا ہی حماقت ہے! دماغوں کی اس کجی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ ــــ استغفر اللہ!

اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، نہ تو وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ اُس سے کوئی پیدا ہوا وہ حی وقیوم ہے اُس کی صفت قیومیت میں اُس کا کوئی شریک نہیں، اس کا کوئی مثل، ثانی اور مشابہ نہیں، وہ خود وہی ہے جیسا کہ وہ ہے، اُس کی مثال آخر کس سے دی جائے ؎

خاک بر ما خاک بر تمثیل ما

اللہ تعالیٰ جسمانیت سے منزہ ہے اس لئے نہ اُسے نیند آتی ہے، نہ اونگھ! نہ وہ دُنیا کے کارخانے کے چلانے میں تھکن محسوس کرتا ہے اُسے کسی شے کی احتیاج نہیں! اُس کے سب محتاج ہیں! اُس پر کسی کا زور نہیں، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، سارے جانداروں کی چوٹیاں اُس کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ اپنی ذات کے قیام میں کسی سہارے کا محتاج نہیں، ہاں! ساری کائنات اُسی کے سہارے قائم واستوار ہے، اُس کی رحمت، قدرت اور ربوبیت سارے عالم کو گھیرے ہوئے ہے، وہ تمام مخلوق کا داتا رکھوالا اور پالنے والا ہے، وہ حاضر وناظر ہے، سب کا فریاد رس اور مشکل کشا ہے، وہی عزت عطا کرتا ہے اور وہی ذلت دیتا ہے، آفتاب ماہتاب، زمین وآسمان، آگ، پانی ہوا، بھاپ، بجلی سب اُس کے حکم کے ماننے والے ہیں، درخت پودے اور فصلیں اُسی کے حکم سے اُگتی ہیں، زمین کا کوئی ذرہ آسمان کا کوئی تارا، درخت کا کوئی پتہ اور پانی کا کوئی قطرہ اُس سے اوجھل نہیں، اُس کا ارادہ ٹوٹتا نہیں، اُس کا حکم رُکتا نہیں، اُس کی بات ٹلتی نہیں، اُس کا کوئی مددگار اور شریک نہیں! خیر وشر اُسی کی طرف سے ہیں اور مومن وکافر سب اُسی کے در سے پلتے ہیں! اگر ساری دنیا ہر لمحہ اُس کی بڑائی بیان کرتی رہے تو ایسا کرنے سے اُس کی ذات وصفت میں ذرہ برابر اضافہ نہیں ہو سکتا اور اُسے ایک بھی سجدہ نہ کیا جائے اور کوئی زبان اُس کا نام نہ پکارے، تو اس سے اللہ تعالیٰ کی شان میں رائی کے برابر بھی کمی نہیں آ سکتی، عبادت، پرستش اور بندگی سے اللہ تعالیٰ کی ذات کو کوئی فائدہ نہیں پہونچتا اور کفر وشرک اور معصیت اُس کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہونچا سکتی، نفع وضرر، موت وحیات، عزت وذلت، بناؤ اور بگاڑ سب اُس کے دستِ قدرت میں ہے۔

اللہ تعالیٰ عادل ہے مگر اُس کا عدل کسی ضابطہ کا پابند نہیں، وہ گناہوں کو بخشنے اور توبہ کو قبول کرنے والا ہے۔ اُس کے حکم کے بغیر کوئی ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا، وہ غفور ورحیم بھی ہے اور منتقم وشدید العقاب بھی ہے، اُس کی پکڑ سے کوئی جاندار بچ نہیں سکتا، اور اُس کی حکومت سے کوئی مجرم بھاگ کر جا نہیں سکتا! اُس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہے، اُس کی حکمت کی باریکیاں سب کی سب اور پوری کی پوری ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتیں اُس نے کوئی چیز بیکار پیدا نہیں کی یہاں تک کہ سانپ، بچھو کسی ضرورت اور حکمت کے تحت پیدا کئے گئے ہیں اور امراض اور بیماریوں کے پائے جانے میں بھی حکمت پنہاں ہے! ایک معصوم تندرست کھیلتا کھاتا خوبصورت بچہ مکان کی چھت سے گر کر یا کسی موٹر سے کچل کر مر جاتا ہے، تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ عادل اور رؤف رحیم ہی ہوتا اور رہتا ہے۔ اور ایک کافر، مُشرک ظالم وبدکار کو طویل عمر اور ہر طرح کی مسرتیں اور راحتیں دی جاتی ہیں تو ایسا ہونے میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت، مشیت اور عدل پر کوئی حرف نہیں آ سکتا۔ اُس کے حضور تذلل وعجز اور بندگی وبیچارگی پیش کرنا ہی اصلی

کی سب سے بڑی عزت ہے! ہم شمار کا تو ذکر ہی کیا ہے انبیاء اور اولیاء تک اُس کے در کے بھکاری اور اُس کے فضل و کرم کے محتاج ہیں! جو اُس سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے، وہ ہی اللہ تعالیٰ کا پیارا اور محبوب ہے! کوئی قبر، کوئی گنبد، کوئی درگاہ، کوئی چوکھٹ اور کوئی آستانہ اس قابل نہیں ہے کہ اُس کے سامنے سر جھکایا جائے، جبینِ نیاز اللہ تعالیٰ ہی کے حضور جھکنی چاہیئے اور اُس کی ذاتِ پاک اس کی سزاوار ہے کہ اُسی سے دُعا کی جائے! اللہ کے بھیجے ہوئے نبیوں اور رسولوں پر جب کوئی سخت وقت آیا ہے، تو انھوں نے اللہ تعالیٰ ہی سے فریاد کی ہے اور اُسی کے سامنے اپنا دُکھ درد پیش کیا ہے! یہ جو کائنات میں ہر آن اربوں اور سنکھوں آوازیں بلند ہوتی رہتی ہیں ان سب آوازوں کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی نہیں سُن سکتا، وہی سمیع الدعا اور مجیب الدعوات ہے۔

والدین کو اولاد سے اور اولاد کو ماں باپ سے، دوست کو دوسرے دوست سے جو محبت اور لگاؤ ہوتا ہے اور اسی طرح آپس کے جو دوسرے تعلقات و روابط ہیں، دلوں میں اُن کی بنا اللہ تعالیٰ کی ربوبیت ڈالتی ہے! کیسے کیسے بے سہارے، لُولے لنگڑے اور اپاہج لوگ ہیں جن کو رزق اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے، اور دوسروں کے دلوں میں اُن کی امداد کرنے کا جذبہ پیدا فرماتا ہے! یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و ربوبیت ہے جس کے اشارے اور ایماء سے کوئلیں کوکتی، بلبلیں چہکتی اور کلیاں چٹکتی ہیں! کسان جو زمین میں دانہ بوتا ہے اُسے اللہ نے پیدا کیا، دانہ کا خالق بھی وہی ہے، زمین بھی اُسی کی بنائی ہوئی ہے، اور زمین کو قوتِ روئیدگی بھی اسی نے بخشی ہے، یہاں تک کہ تخم ریزی سے لے کر پودے کے برگ و بار لانے تک اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی قوتیں اُس پودے کی نشوونما میں صرف ہوتی ہیں! —— پس شکر و سپاس کی مستحق اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے! زمین کی قوت نمو ہے، ابر کی تر دستیاں ہیں، سُورج کی حرارت و روشنی ہے، ہواؤں کی نمی اور پودوں اور درختوں کو حرکت دینے کی طاقت ہے، یہ تمام قوتیں ایک دانہ کی نشوونما میں کس اعتدال و توازن کے ساتھ حسب ضرورت صرف ہوتی ہیں!

ان دماغوں کو کیا ہو گیا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے خالق و رازق اور رب ہونے کی اتنی بہت ہی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی الحاد کی جانب میلان رکھتے ہیں، اس جہالت، ہٹ دھرمی، کٹ حجتی اور دھاندلی کی بھلا کوئی انتہا ہے! پھر اس پر طرفہ تماشا یہ ہے کہ اس جہالت کو علم و حکمت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اس تاریکی کو روشنی سمجھا جاتا ہے۔

انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ نے فہم و عقل عطا فرمائی ہے، اسی بنا پر اُس کی ذمہ داریاں کمیت و کیفیت میں تمام مخلوقات سے بڑھی ہوئی ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت وحی کے ذریعہ فرمائی، وحی نے نیکی اور بدی کے راستوں کو واضح کر دیا، یہ وحی اللہ تعالیٰ نے انسانی معاشرے کے بہترین افراد پر نازل کی، ان مقدس افراد کو دین کی اصطلاح میں نبی اور رسول کہا جاتا ہے۔

نبیوں اور رسولوں کی آمد کا سلسلہ برابر چلتا رہا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نبوت کے سلسلہ کو ختم کر دیا اب قیامت تک کوئی نبی اور رسول آئے گا اور نہ کتاب نازل ہو گی، دین مکمل ہو گیا نعمتوں کا اتمام فرما دیا گیا اس کے بعد کسی نبی کے آنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی، اب جسے ہدایت ملے گی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و اتباع میں ملے گی، صراطِ مستقیم اُسی راستہ کا نام ہے جہاں نبی آخرؐ کے قدموں کے نشان نظر آتے ہیں۔

سائنس کی ایجادات ہوں یا تہذیب و تمدن کی دوسری ترقیاں یہ اگر حضور نبی آخرؐ کے پیش کئے ہوئے ضابطۂ اخلاق کے تحت پروان چڑھیں گی تو دُنیا کے لئے وجہ خیر و برکت بن جائیں گی، اور اگر معاملہ برعکس ہو گا تو ان ایجادوں اور ترقیوں سے دُنیا میں ابتری پھیلے گی! انسانیت کی یہ بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ دورِ حاضر کی سائنس اُن لوگوں کے ہاتھوں میں پڑ گئی ہے جو اخلاقی قدروں سے واقف نہیں ہیں اور واقف ہیں تو عملاً ان کو اہمیت نہیں دیتے اسی لئے سائنس کی بعض خوفناک ایجادات کا نام سُن کر دُنیا سہمی جاتی ہے

امریکہ روس کو اور روس امریکہ کو تباہی اور بربادی کی دھمکیاں دیتا ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ ان طاقتوں میں سے کس کی نیت میں کب فساد آجائے، اور سائنسی ایجادات قیامت سے پہلے قیامت کا نمونہ کب پیش کردیں۔

سائنس کی دوڑ میں ان طاقتوں کی برابری کرنا ممکن نہیں اُس کے لئے جن مادّی وسائل کی ضرورت ہے ان کا فراہم کرنا واقعی "کارے دارد" ہے! مسلمان اس کمی کو ایمان و یقین اور سیرت و کردار کی طاقت سے پورا کرسکتے ہیں اور اصل طاقت ایمان اور کردار ہی کی طاقت ہے! جس قوم کے بارے میں دوسروں کو اس کا یقین ہو جائے کہ یہ قوم مٹ جانا قبول کرے گی مگر کسی حریف اور باطل طاقت کے آگے سر نہیں جھکائے گی، اُس قوم سے ٹکر لینے کے لئے بڑا دل گردہ چاہیئے۔

ملّتِ اسلامیہ نے قرنِ اولیٰ میں جو چار دانگ عالم میں اسلام کا پرچم بلند کیا تھا، اور ساری دُنیا میں وہ ہی وہ نظر آتی تھی، اس کا سبب یہ تھا کہ مادّی طاقت کے ساتھ اخلاق و کردار کی قوت بھی اُس کے پاس تھی، ملّتِ اسلامیہ کی تلوار نے شر و فساد کا قلع قمع کیا ہے، اور اُس کے اخلاق نے دلوں کو فتح کیا ہے، اور حقیقی فتح دلوں کا جیت لینا ہی ہے! آؤ ہم سب مل جل کر اخلاقی طاقت فراہم کرنے کی امکانی جدوجہد کریں تاکہ تاریخ اپنے کو پھر دُہرا سکے، جس چیز نے ملّتِ اسلامیہ کے ماضی کو روشن اور شاندار بنایا تھا، وہی چیز ملّت کے حال و مستقبل کو کامیاب اور تابناک بنائے گی۔

اللہ کا خوف، رسولؐ کی محبت و اطاعت، آپس میں اتحاد، آخرت کے محاسبہ کی فکر، دوا کے ساتھ دُعا اور تدبیر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر بھروسا ہو، تو پھر کسی بڑی سے بڑی طاقت سے بھی ملّتِ اسلامیہ مرعوب اور خوف زدہ نہیں ہوسکتی، حد سے حد کوئی ظالم ہماری جان لے سکتا ہے مگر جان تو ایک نہ ایک دن جانی ہے، جب مرنا اور جان کا جانا ناگزیر ٹھیرا تو پھر اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنے کی جدوجہد میں جان کیوں نہ جائے ـــــ کہ اس کے بعد پھر بشارتیں، مژدے، خوش خبریاں اور حیاتِ ابدی کی مسرتیں ہی مسرتیں ہیں! اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے کرم و رحمت سے آخرت کی نعمتیں عطا فرمائے!

ماہر القادری

۲۰ اگست ۱۹۶۳ء

ایک مصری غیرت مند خاتون کا مکتوب!

جناب مدیر مجلہ فاران کراچی ——— ! جب میں پہلی بار کراچی آئی، تو میرا قلب مسرت سے لبریز تھا کہ میں ایک ایسے شہر میں آئی ہوں جس کے باشندوں نے ۱۹۴۷ء میں پرچم اسلام کو بلند رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے جہاد فی سبیل اللہ کا عہد کیا ہے ——— پاکستان بن گیا تو جو اس عہد مقدس کے طفیل میں بنا، جس کی اعلیٰ مثال کی تقلید روئے زمین کی تمام اسلامی حکومتوں کے لئے باعثِ افتخار تھی!

مگر آہ! میں نے بڑی وحشت انگیز خبر سنی — کاش! میں اسے نہ سنتی کہ یہاں پاکستان میں جس قوم کا شیرازہ اسلامی اصولوں کی اساس پر مجتمع ہوا تھا، اس میں کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے جو مغربی طرز فکر سے بے حد متاثر ہیں اور اپنے مغربی استادوں کی لے میں لے ملاتے ہیں اور ان قوانین کے نفاذ کا مطالبہ کرتے ہیں، جن میں مغربی ذہن بہت کچھ کارفرما نظر آتا ہے! ان قوانین کے بارے میں ان لوگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ یہی قوانین عورت کے حقوق کی حفاظت کر سکتے ہیں اور خاندان و عیال کے باہمی روابط اور عزت و وقار کے محافظ بن سکتے ہیں۔

کیا یہ حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ ساڑھے تیرہ سو برس کی اس مدت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین، صحابہ، تابعین، مصلحین اور اکابر علماء سبھی سب معاذ اللہ (خاک بدہن گستاخ) حقوق نسواں اور عائلی مفاد کے سمجھنے سے عاجز اور بے خبر تھے۔ اور روشن و بیدار عقل ان متجددین کو ملی ہے، جو عورت اور گھر بار کے حقوق کو سمجھتی ہے! ایسے تصور سے سو بار توبہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے اس کی عائلی زندگی کے لئے جو قوانین بتائے، تو اللہ تعالیٰ سے خطا ہو گئی (استغفر اللہ) اور اسے "بدا" ہو گیا، اور اے گروہ متجددین! تمہیں حقوق نسواں اور عائلی معاملات میں مشورہ کے لئے طلب نہیں کیا گیا۔

اور تم اے میری دینی بہنو! جو کھڑی ہو کر اس کی رٹ لگا رہی ہو کہ بالکل اسی طرح کے قوانین مصر میں نافذ کئے گئے ہیں — تو کیا تم مصریوں سے زیادہ عربی زبان جانتی ہو ——— پھر میں تم سے پوچھتی ہوں کہ مصر والے اور وہ سب لوگ جو عربی زبان بولتے ہیں کیا وہ سب کے سب اسلام کے نمائندے ہیں یا وہ دوسرے خدا ہیں جو گناہ و ثواب اور مفاد و مضار کا اللہ تعالیٰ سے زیادہ علم رکھتے ہیں!

میں مصر کی رہنے والی ہوں، اور میں تمہیں اور تمہاری تمام دوسری ہمنواؤں اور ہم نشینوں کو مصر آنے کی دعوت دیتی ہوں تاکہ تم لوگ (تم بہنیں) وہاں کے واقعات و حالات کا کماحقہ مشاہدہ کرو اور تم دیکھو کہ مصر کی وحدت معاشرہ باقی نہیں رہی اور اس ملک کا بنیادی پتھر اور پہلی اینٹ ہی سرے سے ختم ہو چکی ہے، اس معاشرتی تباہی کا سبب وہ قوانین ہیں جو کتاب و سنت کی حدیں توڑنے والوں نے اس دعوے کے ساتھ وضع کئے ہیں کہ عائلی روابط کے تحفظ اور عورت کی عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے یہی بہترین قوانین ہیں۔

ہاں! ..... اس قانون نے عائلی روابط کی حفاظت کی مگر کس طرح؟ کہ اس نے خاندانوں کی ناشگفتہ کلیوں کو سڑکوں اور

اہوں پر کھلے بندوں چھوڑ دیا، زعم یہ تھا کہ حکومت اور اُس کا قانون ان کی حفاظت اور نگرانی کریں گے ــــــ مگر
انون نے عورت کی عزت و آبرو کی اس طرح حفاظت کی کہ بے چاری عورت کو شبینہ محفلوں میں، عام شاہراہوں اور دفتروں
ردباختہ لوگوں کی ہوس رانیوں کا تختۂ مشق بنا دیا۔ اور معاشرہ کے اسّی فیصدی نوجوانوں کو خطرناک امراض خبیثہ میں مبتلا
جن کا علاج اللہ جل شانہٗ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ اور یہ سب کچھ صرف اس لئے ہوا کہ عورتوں کو ان قوانین (یا ایسے
ن) نے اس دائرے میں قدم رکھنے کی اجازت دیدی، جس کے پاس پھٹکنے سے بھی شریعت غرّا نے منع کیا تھا، اس کا انجام جو
تھا وہ ہوا۔

یقین مانئے کہ مصر کی عورتوں کو انہی قوانین کے سبب یہ دن لگے ہیں، جن قوانین کی مدح سرائی تم کر رہی ہو اور اُس کے
کے مطالبہ کے لئے آسمان سر پر اٹھا لیا ہے۔

ـــــ اگر ـــــ

اللہ پر ایمان رکھتی ہیں تو میں اُس ذات پاک کی قسم دلا کر آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ خدا کے لئے اس غیر اسلامی مطالبے سے
جاؤ۔

اے علمار اسلام! میں تم سے فریاد کرتی ہوں کہ اور اللہ تعالیٰ کی نصرت کا واسطہ دلا کر تم سے کہتی ہوں کہ تم پاکستان کی
ں کو اس ٹیڑھے راستے سے نکال کر حق کی راہ پر لگانے کی جدّ و جہد کرو، تم اُن کے سامنے شریعتِ حقہ کو بیان کرو جو عورتوں
وق بھی دیتی ہے اور خاندان و معاشرہ کے نظام کو بھی برقرار رکھتی ہے ساتھ ہی تم ان لوگوں کو بے راہ رو مغرب کی
ت سے آشنا کرو، جس نے جاہل مشرق کے ظلم اور اخلاق زوال سے دوچار ہو کر فطری آئین و قوانین کی حدود کو پامال کے
ے کو بدترین عذاب میں مبتلا کر دیا ہے! تم ان لوگوں کی آنکھوں سے پردے ہٹا دو تاکہ نور اور روشنی کو اپنی آنکھوں سے
لیں۔

اے علمار اسلام! تمہاری مثال اور باغبان اور چمن بندکی سی ہے جو بڑے اصیل اور اعلیٰ نسل کے درخت کی حفاظت پر
ہو! جب وہ کسی شاخ کو جھکا ہوا پاتا ہے تو دوڑ کر اسے سیدھا کر دیتا ہے!

اے علمار اسلام! ملت کے معاشرے کی چمن بندی میں آپ اپنے فرض کو پہچانیں اور اپنے فرض کو صحیح طور پر ادا کریں
تعالیٰ تمہیں توفیقِ عمل اور جزائے خیر دے۔

السیدہ اصلاح اقبال (عربی سے اردو ترجمہ)

ـــــ ✕ ـــــ

ماہر القادری

عذرِ گناہ

ہم اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس زعم و پندار اور غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہیں کہ جو بات ہمارے قلم سے نکل جاتی ہے وہ لازمی طور پر حق ہی ہوتی ہے ہم بھی دوسروں کی طرح انسان ہیں، اور انسان سے بھول چوک ہو ہی جاتی ہے، ہم بھی سہو و نسیان، بھول چوک اور لغزش و گناہ سے محفوظ نہیں ہیں سو فیصدی بات تو اللہ اور رسول ہی کی سچ ہوتی ہے! دینی مسائل پر جب بھی ہم نے کچھ لکھا ہے تو امکانی حد تک احتیاط کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھا ہے، ہم نے ایسا کبھی نہیں کیا کہ کوئی چیز ہو تو مباح، اور ہم اُسے "بدعت" ٹھیرا دیں، یا محض تنقید برائے تنقید کے شوق میں کسی بے غبار علمی اور دینی نکتے سے کوئی قباحت منسوب کر دیں! اس چودہ سال کی مدت میں سینکڑوں کتابوں پر ہم نے تبصرہ کیا ہے، مگر کسی کتاب پر دین و اخلاق کے مسائل میں اس قسم کی تنقید نہیں کی، جسے فسادِ نیت، خرابیٔ عقیدہ یا شوخیٔ قلم سے تعبیر کیا جائے، ہم اس تصور سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں کہ بزرگانِ دین کے اقوال و ملفوظات پر تنقید کرتے ہوئے "شوخیٔ قلم" سے کام لیں، یا اُن کے جس قول کی موزوں اور مطابقِ شریعت تاویل ہو سکتی ہے، اُس قول کو لوگوں کے سامنے مکروہ بنا کر پیش کریں۔!

ہم نے دین و اخلاق اور فقر و تصوف کے انہی مسائل پر تنقید کی ہے، جن میں کھٹک پائی جاتی ہے، اور یہ کھٹک اور جھول اسی قابل تھا کہ اُس کی نشاندہی کی جاتی، مثلاً ایک فقہ کی کتاب ہمارے پاس تبصرے کے لئے آئی، جس میں فتاویٰ عالمگیری کے حوالے سے لکھا تھا کہ قرآن کریم کا منظوم ترجمہ کفر ہے، ہم نے اس پر گرفت کی کہ قرآنِ کریم کا منظوم ترجمہ احتیاط کے خلاف ہے اور نہایت نامناسب بات ہے مگر اُسے "کفر" نہیں کہا جا سکتا! اگر یہ "کفر" ہے تو پھر اس ہمارے دور کے علماء کے اس فعل کو کیا کہیے گا، جنھوں نے قرآن کے منظوم تراجم (اردو) کی تعریفیں کی ہیں، اُن کو سراہا ہے، اور علماء کی یہ رائیں، باقاعدہ شائع ہوئی ہیں!

اس پر

کوئی یہ طنز کرے کہ تمہیں تو فقہ کی الف، ب بھی نہیں آتی، تمہاری یہ جرات کہ "فتاویٰ عالمگیری" پر تنقید کرتے ہو، تم تو اُن فقہا کی جوتیوں میں بھی بیٹھنے کے قابل نہیں ہو! جہاں تک ہماری کم علمی کا تعلق ہے جو کچھ ہمارے بارے میں کہا گیا ہے وہ دُرست و بجا مگر جو گرفت اور تنقید ہم نے کی ہے وہ بھی بالکل دُرست ہے! ہمیں ملاحیاں سُنانے، پھبتیاں چُست کرنے اور بے علم ٹھیرا دینے سے ہماری تنقید غلط قرار نہیں دی جا سکتی

لاہور کا حلقہ خدام الدین برسوں سے دین کی خدمت کر رہا ہے اُس کے حلقہ میں علما بھی شامل ہیں مگر اس حلقہ کے بانی مولانا احمد علی لاہوری مرحوم کو جو "صدیقِ دوراں" اور اُن کے یہاں کے ایک مولوی صاحب غلام غوث ہزاروی کو "بوذرِ عصر" لکھا گیا ہے، اس پر ہم نے گرفت کی ہے اور اس غلو عقیدت کو دینی نقطہ نگاہ سے ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم اصل موضوع پر آتے ہیں ـــــ یہ کہ ماہِ نومبر ۱۹۵۹ء کے فاران میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دیوبند کی کتاب "آفتابِ نبوت" (جلد اول) پر تبصرہ کیا گیا تھا، اس کتاب میں یہ عبارت بھی ہماری نظر سے گزری :ـــ

"چنانچہ بہ تصریحِ قرآن جبرئیل علیہ السّلام نے ایک کامل الخلقت اور بالفاظِ قرآن بشر سوی کی صورت

میں نمایاں ہوکر مریم پاک کے گریبان میں پھونک ماری، جس سے وہ حاملہ ہوئیں، اُس وقت جبریلؑ صورتِ محمدیؐ میں تھے (جیساکہ رُوح المعانی میں اس بارے میں بعض آثار و روایات منقول ہیں) اور ہر صورت اپنے مناسب ہی حقیقت کا تقاضا کرتی ہے، اس لئے یہ صورتِ محمدیؐ، کمالاتِ محمدؐ ہی کی نوعیت کی متقاضی تھی، اگرچہ وہ اس وقت جبریلؑ کا چولہ بنی ہوئی تھی، اور انھوں نے گویا اس صورت میں، حقیقت محمدیؐ ہی کی نوعیت کو لے کر مریم پاکؑ کے گریبان میں پھونک ماری، جس سے مسیح علیہ السّلام کا ماں کے پیٹ میں وجود ہوا، جس کے یہ معنیٰ ہوئے کہ گویا مسیح علیہ السّلام کی حقیقت میں بواسطہ شبیہہ محمدیؐ خود حقیقتِ محمدیہؐ کی نوعیت شامل تھی"۔

ہم نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اس عبارت پر گرفت کی!

اس کے بعد قاری محمد طیب صاحب کی ایک دوسری تصنیف "اسلام مغربی تہذیب" میں یہ عبارت پائی گئی۔

"یہ دعویٰ تخیل یا وجدان محض کی حد سے گزر کر ایک شرعی دعوے کی حیثیت میں آجاتا ہے کہ مریم عذرا کے سامنے جس شبیہہ مبارک اور بشر سوی نے نمایاں ہوکر پھونک ماری وہ شبیہہ محمدیؐ تھی"۔

"اس ثابت شدہ دعویٰ سے بیّن طریق پر خود بخود کھل جاتا ہے کہ حضرت مریم رضی اللہ عنہا اس شبیہہ مبارک کے سامنے بمنزلہ زوجہ کی تھیں، جب کہ اس کے تصرف سے حاملہ ہوئیں"۔

"پس حضرت مسیحؑ کی ابنیت کے دعویدار ایک حد تک ہم بھی ہیں مگر ابن اللہ مان کر نہیں ابنِ احمدؐ کہہ کر خواہ وہ ابنیت تمثالی ہی ہو"۔

"حضورؐ تو بنی اسمٰعیل میں پیدا ہوکر کُل انبیا کے خاتم قرار پائے اور عیسٰی علیہ السّلام بنی اسرائیل میں پیدا ہوکر اسرائیلی انبیا کے خاتم کئے گئے، جس سے ختمِ نبوت کے منصب میں ایک گونہ مشابہت پیدا ہوگئی ——— الولدُ سرٌّ لابیہ۔

"بہرحال اگر خاتمیت (تمیت) میں حضرت مسیح علیہ السلام کو حضورؐ سے کامل مناسبت دی گئی تھی تو اخلاقِ خاتمیت اور مقامِ خاتمیت میں بھی مخصوص مشابہت و مناسبت دی گئی، جس سے صاف واضح ہوجاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی بارگاہِ محمدیؐ سے خلقاً و خُلقاً، رتبتاً و مقاماً ایسی ہی مناسبت ہے، جیسی کہ ایک چیز کے دو شریکوں میں یا باپ بیٹوں میں ہونی چاہیئے"۔

ایک صاحب نے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی لکھی ہوئی یہ عبارت دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی مولانا سید محمد مہدی حسن صاحب کے پاس استفتاء کی صورت میں بھیجدی، مفتی صاحب موصوف نے اس عبارت کے لکھنے والے کو "ملحد و بے دین ٹھیرایا" اور یہ بھی فرمایا کہ "عیسائیت و قادیانیت کی رُوح اُس کے جسم میں سرایت کئے ہوئے ہے"۔

قاری محمد طیب صاحب کی کتاب کی اصل عبارت اور اُس پر سید محمد مہدی حسن صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ اخبار(ات) میں شائع ہوگیا! اگر یہ عبارت کسی دُوسرے شخص کی لکھی ہوئی ہوتی تو دارالعلوم دیوبند کے مدرسین اور علماء، اپنے یہاں کے صدر مفتی صاحب کے فتوے کی تردید و تغلیظ کی ہرگز ہرگز زحمت گوارا نہ کرتے بلکہ کوئی دُوسرا مفتی اور عالم اس فتویٰ پر تنقید کرتا تو صدر مفتی دارالعلوم دیوبند کی پُوری طرح تائید، حمایت اور مدافعت فرماتے، اور یہی کہتے جو مولانا سید مہدی حسن صاحب نے کہا ہے کہ :-

"۔۔۔۔ اس کا قائل قرآن عزیز میں تحریف کر رہا ہے بلکہ درپردہ قرآنی آیات کی تکذیب اور اُن کا انکار کر رہا ہے ۔۔۔"

مگر

چونکہ اس فتوے کی زد دارالعلوم دیوبند کے مہتمم صاحب پر پڑتی ہے لہٰذا اس فتوے کو رد کرنے اور غلط ٹھیرانے کی ضرورت محسوس ہوئی ! اور صدر مفتی صاحب کے فتوے کی تردید میں دارالعلوم دیوبند کے چند علماء نے ایک فتویٰ مرتب فرمایا جس میں قاری محمد طیب صاحب کی تحریر کی تاویل، تصویب اور تائید کی گئی ! تفقہ و استفتاء کی تاریخ کا یہ بھی ایک اعجوبہ ہے کہ ایک ہی مکتب فکر و خیال اور درسگاہ سے دو فتوے شائع ہوتے ہیں، ایک فتوے میں جس عبارت سے "کفر و الحاد" منسوب کیا گیا ہے دوسرے فتوے میں اسی عبارت کو صحیح ثابت کیا جاتا ہے ! یا للعجب !

؎ ناطقہ سربگریباں کہ اسے کیا کہیے

دونوں فتوے ایک دوسرے کی ضد، ایک آگ دوسرا پانی ، زمین و آسمان کا فرق !!

مفتی سید مہدی حسن کا یہ فتویٰ اگر غلط ہے، یا اس میں شدت سے کام لیا گیا ہے ! یعنی یہ کہ کفر و الحاد کی بجائے وہ لغزش، غلطی، فساد عقیدہ و خیال یا گمراہی لکھ سکتے تھے تو اس کی زد بھی دارالعلوم دیوبند پر پڑتی ہے کہ وہاں کے صدر مفتی فقہی مسائل بتانے میں اعتدال و توازن سے کام نہیں لیتے ، مغلوب الغضب ہو جاتے ہیں، جس درسگاہ کے صدر مفتی کی ذمہ داری کا یہ عالم ہو ، تو۔

پھر کیسے رہنما کرے کوئی

اس فتوے کی اشاعت کے بعد قاری محمد طیب صاحب کو چونک جانا چاہیئے تھا ۔ اور اس انداز پر سوچنا چاہیئے تھا کہ اُن کے دارالعلوم کے صدر مفتی نے قاری صاحب کی جس عبارت کو "کفر و الحاد" ٹھیرایا ہے ، وہ قابلِ اعتراض ، ناپسندیدہ اور کراہت آمیز ضرور ہے، یہ کام تو کوئی مسلوب الحواس شخص ہی انجام دے سکتا ہے کہ کسی عبارت میں دینی نقطۂ نگاہ سے کوئی بات اعتراض کے قابل نہ ہو اور ایک مفتی اس سے "کفر و الحاد" منسوب کر دے !

قاری محمد طیب صاحب قبلہ کو یہ کرنا چاہیئے تھا کہ وہ اپنے اس عقیدے کا اظہار فرماتے کہ حضرت عیسیٰ مسیح کسی مرد کے بیٹے نہیں ہیں وہ "ابنِ مریم" ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ میں کسی اور کو کسی حیثیت سے بھی خاتم النبیین نہیں مانتا اس کے بعد وہ یہ لکھتے کہ فلاں فلاں بزرگ صوفی ، عالم یا مفسر کے فلاں قول کی بنا پر میں نے یہ جملے لکھے ہیں اب مجھ پر یہ واضح ہو گیا ہے اور یہ حقیقت کھُل کر سامنے آگئی ہے کہ میرے لکھے ہوئے جملے غلط فہمی کا سبب بن رہے ہیں لہٰذا میں ان سے رجوع کرتا ہوں اور یہ جملے اب مجھ سے منسوب نہ کئے جائیں ۔۔۔۔۔ قاری صاحب کے اس اعتراف کے بعد یہ قضیہ نامرضیہ خوش اسلوبی کے ساتھ ختم ہو جاتا ! ایسا کرنے سے اُن کا علمی وقار، شہرت اور عزت ذرہ برابر متاثر نہ ہوتی بلکہ وہ کچھ اور بڑھ جاتی ! قاری صاحب موصوف اپنے کو معصوم یقیناً نہیں سمجھتے ، اُن سے فکر و نظر کی غلطیاں ہو سکتی ہیں ۔۔۔۔ تو اُنہیں اس "عبارت" کو جو وجہ نزاع ہے ، اور جس پر صدر مفتی دارالعلوم دیوبند نے "کفر و الحاد" کا فتویٰ صادر کیا ہے ، اپنی غلطی سمجھ کر اس سے رجوع فرمانا تھا مگر افسوس ہے ایسا نہیں کیا گیا ، صدر مفتی صاحب کے فتوے کی تردید دارالعلوم کے دُوسرے مفتی صاحبان فرماتے ہیں ، اور قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے موقف کی تصویب و مدافعت کی جاتی ہے ! یہ تو سیاسی لیڈروں کی ذہنیت اور مزاج ہے کہ ایک ہی ادارے اور پارٹی کے لوگ ایک دوسرے کے بیان کی تردید اور توثیق حسب ضرورت و حالات کرتے رہتے ہیں، کہ

"دارالافتاء" میں جب یہ رنگ پیدا ہو جائے تو اسے علمِ دین کی ٹریجڈی اور ملت کی بدنصیبی نہ کہیئے تو اور کیا کہیئے! چونکہ یہ فتویٰ محمد طیب صاحب کی لکھی ہوئی عبارت سے متعلق ہے اور قاری صاحب دارالعلوم دیوبند کے مہتمم ہیں اور دارالعلوم کے مُ صاحبان نے قاری صاحب کے موقف کی تائید میں یہ زحمت گوارا کی ہے اس لئے قاری صاحب موصوف کے علم و اطلاع میں آنی چاہیئے بلکہ آئی ہوگی کہ مفتی مہدی حسن صاحب کی تردید میں ایک فتویٰ دارالعلوم کے مفتی صاحب تیار فرما رہے ہیں، اس لئے محتاط میں کہا جا سکتا ہے کہ قاری صاحب اس فتوے کی ترتیب و تسوید سے بے خبر اور بے تعلق نہیں رہے۔

فقہ کی پوری تاریخ میں یہ غالباً پہلا فتویٰ ہے جس میں کتاب سنت آثار صحابہ اور اقوال ائمہ کے حوالوں کے بغیر شاعرانہ قسم و نکتہ سنجی سے "لطائف و ظرائف" کی تائید و توثیق فرمائی گئی ہے! قاری محمد طیب صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

"یہ دعویٰ تخیل یا وجدانِ محض کی حد سے گزر کر ایک شرعی دعوے کی حیثیت میں آجاتا ہے کہ مریم عذرا کے سامنے جس شبیہ مبارک اور بشر سوی نے نمایاں ہو کر پھونک ماری وہ شبیہ محمدی تھی"۔

دیوبند کے مفتی صاحبان کو کتاب سنت، آثار صحابہ سے اس عبارت کی تائید میں کوئی قول پیش کرنا تھا! مگر نہیں کیا گیا، کہاں سے، جب کہ اس قسم کا کوئی تصور سرے سے اسلامی ادب میں پایا ہی نہیں جاتا ——— پھر قاری صاحب جب اس با اس تاکید کے ساتھ فرماتے ہیں۔

"یہ دعویٰ تخیل یا وجدانِ محض کی حد سے گزر کر ایک شرعی دعوے کی حیثیت میں آجائے۔۔"

پھر تو اس کی تائید و توثیق کے لئے "شرعی ثبوت" کا فراہم کرنا لازمی تھا۔ لیکن دارالعلوم دیوبند کے مفتی صاحبان کوئی "شرعی ثبوت" نہ فرما سکے، یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ان کا فتویٰ شرعی اعتبار سے بے وزن ہے اور اس کی حیثیت تصوف کے ایک لطیفہ کا

ہم نے مارچ سنہ ۱۹۶۳ء کے "فاران" میں اسی فتوے کے بارے میں "احتساب و جائزہ" کے عنوان سے مضمون لکھا، جن حضرات پاس یہ شمارہ محفوظ ہے وہ اسے ایک بار ضرور پڑھ لیں! ہمارے اس مضمون کا جواب پندرہ روزہ "میثاق" (دیوبند) نے تبصرہ میں دیا ہے، قاری محمد طیب صاحب کے لائق فرزند مولانا محمد سالم قاسمی صاحب جو اس جریدہ کے نگرانِ اعلیٰ اور رئیس التحریر ہیں یہ جوابی مضمون ان کا لکھا ہوا ہے۔

بے بنیاد اعتراضات

مولانا محمد سالم قاسمی صاحب فرماتے ہیں:-

"وہ تبصرے میں ہر ضروری اور غیر ضروری موضوع پر طویل آورد سے مخاطب کے ذہن کو منتشر کر دینے والے معترضانہ پہلوؤں میں اُلجھا دینے میں ایک ممتاز نفسیاتی مہارت رکھتے ہیں"۔

(میثاق ——— ۱۶ مئی سنہ ۱۹۶۳ء)

جو حضرات "فاران" پڑھتے رہتے ہیں، وہ سوچ کر بتائیں اور ہمیں لکھیں کہ کس کس تبصرے میں ہم نے "غیر ضروری" باتیں کی ہیں، اور موضوع سے ہٹ کر پڑھنے والوں کے ذہن کو اُلجھا دینے کی کوشش کی ہے! اسی مضمون "احتساب و جائزہ" ہی کو پڑھ جائیے اس سے پتہ چل جائے گا کہ کیا ہم نے غیر ضروری باتوں میں ذہنوں کو اُلجھا دیا ہے؟ مولانا محمد سالم صاحب نے ہماری تبصرہ نگاری میں جو عیب نکالا ہے وہ بالکل بے بنیاد ہے! ہم تو نثر و نظم میں اور دوسرے علمی و دینی مباحث میں "اُلجھاؤ" کے سخت مخالف ہیں، ہمارا تو یہ مسلک ہے کہ نازک سے نازک بات اور دقیق سے دقیق مسئلہ سلجھا کر بیان کرنا چاہیئے! سخت قسم کی رمزیت یا اشا

ہے پڑھ کر طبیعت سخت قسم کی گھٹن اور الجھن محسوس کرتی ہے" یہ تو مولانا محمد سالم صاحب کے جد بزرگوار حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ کی تحریروں کی خصوصیت ہے کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے متبحر عالم تک اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی تحریریں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔

مولانا محمد سالم صاحب نے ہماری تحریر پر جو پہلا الزام لگایا ہے وہی غلط ہے۔ اس سے اندازہ کر لیجیے کہ اس بنیاد پر جو عمارت اٹھی ہے اُس کی کجی کا کیا عالم ہو گا۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:-

"دوسرا حصہ اپنے ذوق اور پندارِ علم پر اعتماد کے ساتھ دوسروں کی غیر علمی اور غیر ادبی انداز میں تغلیظ پر مشتمل ہوتا ہے"۔

کاش! فاضل معترض اس کی ایک آدھ مثال پیش کر دیتے کہ دینی مسائل میں ہم نے اپنے ذوق کی بنا پر کوئی بات کہی ہے! "فاران" کے صفحات گواہ ہیں کہ ہم تو مسلسل اس چیز کو عنوان اور پیرایہ بیان بدل بدل کر پیش کرتے رہے ہیں کہ دین میں کسی کا ذوق، وجدان اور کشف و مشاہدہ کوئی وزن نہیں رکھتا اور ذرہ برابر قابلِ حجت نہیں ہے! یہ اعتراض تو اُن حضرات پر صادق آتا ہے جو علم دین کے ساتھ تصوف کا ذوق رکھتے ہیں اور اس ذوق کی بنا پر صوفیا کے شطحیات کو قبول کر لیتے ہیں، اس کی زندہ مثال قاری محمد طیب صاحب کی یہی مابہ النزاع تحریر ہے کہ انھوں نے اپنے ذوق کی بنا پر جناب عبدالغنی نابلسی کے قول کو پیش فرما دیا۔ اور اس کی واضح غلطی انہیں نظر نہیں آئی! ہم اپنے اُس ذوق پر لعنت بھیجتے ہیں جو کتاب و سنت کے مقابلہ میں کوئی جدید تصور یا مشتبہ لطیفہ یا نکتہ پیدا کرتا ہو!

اور سنیئے:-

"اور تیسرا حصہ اکابر و اسلاف کی برملا تغلیط و تجہیل کے بعد رسمی تواضع اور انکسار کے اُن کلمات پر مشتمل ہوتا ہے کہ اکابر کی تغلیط، کم فہمی اور اپنے ذوق مستند کے بلند بانگ دعووں کے بعد جن کے کوئی معنیٰ باقی نہیں رہ جاتے"۔

"میثاق" کے فاضل رئیس التحریر نے یہ اعتراض بھی برائے اعتراض کیا ہے، انہیں ایک دو مثالیں ضرور پیش کرنی چاہیے تھیں کہ ہم نے اکابر و اسلاف میں سے کس کے صحیح قول کو غلط ٹھیرایا ہے اور (معاذ اللہ) اُن سے حماقت منسوب کی ہے! اللہ ہمیں غارت کرے اگر اکابر و اسلاف کی تغلیط و تجہیل کا جذبہ ہم اپنے اندر رکھتے ہوں! لیکن ہم مولانا محمد سالم اور اُن کے ہم خیال اہلِ علم کی طرح اکابر و اسلاف کی مفرط عقیدت میں مبتلا نہیں ہیں اور انہیں معصوم نہیں سمجھتے، اس لیے اُن کی کسی غلطی کی نشاندہی نہ اکابر و اسلاف کی تغلیط ہے اور نہ تجہیل ہے! اگر صاحبزادہ سالم میاں کے اس نظریہ کو درست مان لیا جائے تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قابلِ فخر شاگردوں پر اس اعتراض کی سب سے زیادہ شدید زد پڑتی ہے کہ انھوں نے اپنے اُستاد سے سینکڑوں مسئلوں میں اختلاف کیا ہے۔ اور اُن کے اس اختلاف کو کسی نے "تغلیظ" اور "تجہیل" کے جذبہ پر محمول نہیں کیا۔ حق شخصیتوں سے بلند ہے، اور شخصیتوں کے احترام و عقیدت پر حق کو قربان نہیں کیا جا سکتا اور نہ حق و صداقت کو توڑا موڑا جا سکتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کتنی عظیم شخصیت کے حامل ہیں مگر اُن کی کتابوں کے بارے میں یہ کہنا کہ اُن میں کمزور، ضعیف بلکہ بے سند احادیث و اقوال تک پائے جاتے ہیں اُن کی تغلیظ و تجہیل نہیں ہے! شیخ مصلح الدین سعدی رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے معلّم اخلاق ہیں مگر انھوں نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف اور بے مثال کتاب "گلستاں" میں جو وہ حکایت بیان کی ہے کہ شاہ فارس نے

ایک طبیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ بے اصل ہے ! مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ سب کے نزدیک محترم ہیں مگر اُن کی مثنوی میں بعض قابلِ اعتراض باتیں بھی پائی جاتی ہیں، جب اُن کا ذکر آئے گا اُن غلطیوں اور کمزوریوں کی نشان دہی کی جائے گی ! مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی جلالتِ علمی اپنی جگہ مُسلّم ہے مگر انھوں نے ڈاک خانہ کے منی آرڈر کو جو "سود" کہا ہے یہ بالکل غلط ہے ۔ اسی طرح مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے ریڈیو کو آلۂ مزامیر کہا ہے اور نماز میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو ناجائز قرار دیا ہے ، وہ دُرست نہیں ہے ، شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا رشید احمد گنگوہی کی وفات پر جو مرثیہ لکھا ہے اور مولانا مرحوم کی مدح و منقبت اس غیر محتاط انداز میں کی ہے ۔

اُٹھا دُنیا سے جیسے بانیٔ اسلام کا ثانی

اس پر نہ صرف گرفت بلکہ اُس سے اظہار برأت کرنا چاہیئے ! "فاران" میں نقد و تبصرہ کا یہی انداز رہا ہے ، اس پر جو کوئی اکابر و اسلاف کی "تحمیق" و "تغلیط" کی طنز کرتا ہے ، وہ نہایت ہی غیر ذمہ دارانہ بات کہتا ہے !

"فاران" میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب "التشکف عن مہمات التصوف" پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور اس کتاب کی بعض کمزوریوں کی نشان دہی کی گئی ہے ! جب یہ تبصرہ چھپ چکا ، تو ہم نے حضرت مولانا تھانوی کے بعض خلفا اور دیوبند کے علما سے عرض کیا کہ ہم سے اگر تبصرہ و تنقید میں کوئی غلطی ہو گئی ہے تو آپ اس سے مطلع فرمائیں ، ہم آپ کی تحریر "فاران" میں شائع کریں گے ، مگر کسی صاحب نے کوئی تحریر ، مضمون ، یا تنقید ہمارے یہاں نہیں بھیجی ، وہ یہی کہتے رہے کہ "تصوف تمہارا موضوع نہیں ہے" ! اس "لائن سے تم بے خبر ہو" ۔ ہم نے عرض کیا کہ سوال ہماری بے خبری اور آگہی کا نہیں ہے آپ ہماری کہی ہوئی باتوں کے بارے میں بتائیے کہ ہم نے کیا غلط کہا ہے !

مولانا محمد سالم صاحب نے اس پر بھی طنز کی ہے ہم جب اکابر کی تحریروں پر گرفت کرتے ہیں تو تواضع و انکساری کا بھی رتہ ہی اظہار کرتے رہیں (اُن کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اکابر کی تعریف و توصیف بھی کرتے رہیں) ! ——— تو کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ جس عالم یا صوفی سے کوئی غلطی ہو گئی ہے ، اُس پر ہم اس انداز میں تنقید کیا کریں جیسے وہ عالم یا صوفی ہر بات غلط کہتا ہے ! اور کسی سے ایک یا چند غلطیاں سرزد ہو جائیں تو اُسے گمراہ اور غلط کار ٹھیرا دیں ۔ مثلاً قاری محمد طیب صاحب کی کتاب "آفتابِ نبوت" (جلد اول) پر ہم نے جو تنقید کی ہے اور قاری صاحب کی جس عبارت پر اعتراض وارد کیا ہے ، اس تنقید کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے :—

> "حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کو اللہ تعالیٰ نے سحر آفریں زبان خوش رقم قلم اور حکمت شناس فہم عطا فرمائی ہے ۔ قاری صاحب موصوف کی زندگی تبلیغِ دین کے لئے وقف ہے ، اور اُن کی ذات سے مسلمانوں کو بڑا دینی نفع پہونچ رہا ہے ۔ یہ کتاب اُنکے علمی تبحر اور ذاتِ رسالت مآب سے عقیدت و شغف اور نسبت و محبت ، کی یادگار رہے"

کیا صاحبزادہ محمد سالم صاحب اس بات کو پسند کرتے کہ اُن کے والدِ محترم کو اُن کے قلم کی ایک دو جگہ لغزشوں کے سبب ہم اُن کو گمراہ اور غلط کار ٹھیرا دیتے اور اُن کی جلالتِ علمی اور دینی خدمات کا ذکر ہی سرے سے نہ کرتے ! صاحبزادہ صاحب نے اپنے مضمون کے آغاز میں ہماری تحریر پر جو تین الزامات لگائے ہیں وہ بالکل بے بنیاد ہیں ، اور اُن کی یہ تحریر پڑھ کر "میثاق" پڑھنے والے ہمارے بارے میں جو بلا وجہ کا غلط تاثر اپنے ذہنوں میں قائم کریں گے اس کی ذمہ داری اُن (مولانا محمد سالم صاحب) پر عائد ہوتی ہے

آہ! یہ دلائل!؟

مولانا قاری محمد طیب صاحب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو "خاتم انبیاء بنی اسرائیل" لکھا تھا، اس پر جنھوں نے گرفت کی، اس کا جواب مولانا محمد سالم صاحب نے اپنے مضمون میں دیا ہے، صاحب موصوف لکھتے ہیں۔

"...... اور مسئلہ معلومہ میں تو اضافی مُناسبت ہی نہیں بلکہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے آخری نبی ہیں، اس حقیقت واقعیہ کے اظہار اور بنی اسرائیل کی لازمی قید کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام پر خاتم انبیاء بنی اسرائیل کا اطلاق کر دیا جاتے تو ہم نہیں سمجھتے کہ اس سے عوام یا خواص کے عقائد کی دُنیا میں کس قیامت کے وقوع کا خطرہ ہے جس کے لئے مُدعیانِ علم و دانش کو الفاظ کے تیور دیکھنے اور دکھانے پڑرہے ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام کی بنی اسرائیل میں نبوت خاتم ہونے کی شرعی اور تاریخی حقیقت کو "متوہم خاتمیت" کہنے والے تعبیر و بیان کی بدل سدل میں خود تا رضرور ہیں لیکن حقائق و واقعات کی بدل سدل بالیقین ان کے قبضۂ اختیار سے باہر ہے، علم کے وسیع دائروں میں تو اعتبارات تک کی تبدیلیوں سے حکمتیں پیدا سمجھی گئی ہیں، چہ جائیکہ آج واقعات سے بھی لطائف و حِکَم کے استنباط کے دروازے بند کرائے جا رہے ہیں۔"

انہی "لطائف و ظرائف" کا تو سارا رونا ہے کہ اس ذوق کی بدولت مولانا قاری محمد طیب صاحب جیسے صحیح العقیدہ مُتبحر عالم جناب شیخ عبدالغنی نابلسیؒ کے اس "لطیفہ" کو اپنی کتاب میں درج کر دیا۔ جس پر انہی کے دارالعلوم کے صدر مُفتی نے "کفر و الحاد" کا فتویٰ داغ دیا، اسی قسم کے "لطائف" کا ذوق ہے جیسے "انا الحق" جیسے خطرناک نعرے میں جو سرتاپا شطحیات ہے کوئی عیب نظر نہیں آتا، اسی ذوقِ لطیفہ سنجی کی بدولت وہ علماء جو دین و شریعت میں بصیرت رکھتے ہیں، جو خوش اوقات بھی ہیں اور شرک و بدعت کی تردید جن کا مشن ہے، اُن تک کی زبان و قلم سے ایسی باتیں نکل گئی ہیں جن سے اہلِ بدعت کے مسالکِ ضلالت کو خاصی شہ ملتی ہے! دارالعلوم دیوبند کے دفتری خط کے کاغذ (LETTER PAD) پر جو "انما انا قاسم" واللہ یُعطی" لکھوایا گیا ہے وہ اسی ذوقِ "لطیفہ سازی" کا نتیجہ ہے! لطائف کا یہ ذوق اپنے اندر بڑی خطرناکیاں رکھتا ہے، یہ ذوق دینی نقطۂ نگاہ سے پسندیدہ نہیں ہے! مولانا جلال الدین رُومی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مثنوی میں جو "قل یا عبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسہم" میں "عبادی" کی ضمیر کا مرجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ رہا ہے کہ آپ یہ کہہ دیں ـــــ کہ "اے میرے یعنی مجھ محمد رسول اللہ کے بندو۔ ۔ ۔") یہ اسی نکتہ آفرینی اور ذوقِ لطیفہ سنجی کا پرتو ہے، یہ حکایت چونکہ لذیذ نہیں بلکہ بے مزہ اور تکلیف دہ ہے، اس لئے ہم لسے دراز کرنا اور طول دینا نہیں چاہتے۔

مولانا محمد سالم صاحب فرماتے ہیں کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کو "خاتم انبیائے بنی اسرائیل" لکھ دیا گیا تو ـــــ "ہم نہیں سمجھتے کہ اس سے عوام یا خواص کے عقائد کی دُنیا میں کس قیامت کے وقوع کا خطرہ ہے" ـــــ ہم عرض کرتے ہیں کہ اگر یہ لطیفہ بیان نہ کیا جاتا تو دین و دانش کی دُنیا میں کونسی کمی رہ جاتی، اس لطیفہ کے بیان کرنے کی کیا ضرورت پڑی تھی! اس سے کون سی اُلجھن دُور ہوئی علمی طور پر دینی افکار کو اس سے کیا فائدہ پہونچا؟ اس علمی لطیفہ نے کس ابہام کا ازالہ کیا، وہ کون سا مابہ النزاع مسئلہ تھا جس کو طے کرنے میں اس لطیفہ سے مدد مل سکتی ہے! اس علمی لطیفہ کو پڑھ کر قلب میں کیا کسی قسم کا انشراح و انبساط ہوتا ہے؟ ـــــ اس لطیفہ نے تو بیٹھے بٹھائے اُلجھن پیدا کر دی!

قرآنِ پاک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "خاتم النبیین" کہتا ہے۔ مگر قاری محمد طیب صاحب قرآن کریم کے اس محکم فرمان سے یہ لطیفہ اور علمی نکتہ پیدا کرتے ہیں ــــــ

"حضور تو بنی اسرائیل میں پیدا ہوکر کل انبیاء کے خاتم قرار پائے اور عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں پیدا ہوکر اسرائیلی انبیاء کے خاتم کئے گئے، جس سے ختمِ نبوت کے منصب میں ایک گونہ مشابہت پیدا ہوگئی"۔

اس علمی لطیفہ سے کیا قرآنِ کریم کے پیش کئے ہوئے "خاتم النبیین" کے بارے میں یہ وہم پیدا نہیں ہوتا کہ خاتم النبیین کی قطعیت اور انفرادیت کے وصف میں سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے شریک حضرت عیسیٰ علیہ السّلام بھی ہیں! فرق اتنا ہے کہ حضور کل انبیاء کے خاتم ہیں اور حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل کے انبیاء کے خاتم ہیں مگر ہیں دونوں "خاتم انبیاء"! کس قدر گمراہ کُن ہے یہ علمی لطیفہ! قرآن کریم نے ختمِ نبوت کا جو عقیدہ پیش کیا ہے اور احادیث سے جس کی مزید توضیح و تفسیر ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ "خاتم النبیین" کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہوجاتا ہے، پھر کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا، مگر قاری صاحب نے حضرت عیسیٰ کو "خاتم انبیاءِ بنی اسرائیل" کہہ کر لفظ خاتم کے قرآنی مفہوم کی قطعیت میں وہم پیدا کردیا یہ کہ خاتم انبیاء کے بعد بھی نبی آسکتا ہے! اس لطیفہ کو لے کر قاری محمد طیب صاحب مدظلہ نے قادیانیوں کے مسلکِ ضلالت کے لئے ایک نکتہ اور لطیفہ فراہم کردیا جسے وہ دلیل و برہان بناکر پیش کریں گے ــــ یہ کہ "خاتم انبیاء" کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نبوت کا سلسلہ ہی ختم ہوجائے، "خاتم انبیاء" کے بعد بھی نبی آسکتا ہے جیسا کہ مولانا قاری محمد طیب صاحب نے فرمایا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام "خاتم انبیاء بنی اسرائیل" تھے مگر آپ کے بعد حضرت محمد عربی (علیہ الصلوٰۃ والسّلام) کا ظہور ہوا۔ تو اس مسئلہ کی صورت یہ قرار پائی ہے کہ انبیاءِ بنی اسرائیل کے خاتم حضرت عیسیٰ ہوگئے اور بنو اسماعیل میں یہ رتبہ (ختمِ نبوت) حضرت محمد ابن عبداللہ کو ملا، اور ان دونوں خاندانوں کے بعد ہندوستان کے ایک "مرزا خانوادہ" کے فرد غلام احمد کو اللہ نے "نبی" بناکر بھیجا (معاذ اللہ، استغفر اللہ، نقل کفر کفر نباشد)! قاری صاحب کی اس لطیفہ سنجی اور نکتہ آفرینی میں اس کی گنجائش نکلتی ہے کہ قادیانی اپنے مسلک کی تائید میں اس کو پیش کرسکیں اور لوگوں کو دھوکا دے سکیں!

عیسائی اس لطیفہ سے یہ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں کہ ختمِ نبوت میں تمہارے نبی کی کیا خصوصیت ہے، تمہارے اتنے بڑے عالم قاری محمد طیب صاحب کے بقول حضرت عیسیٰ علیہ السّلام تمہارے نبی (محمد عربی) سے "ختمِ نبوت کے منصب میں یک گونہ مشابہت" بلکہ خصوصی مشابہت و مناسبت رکھتے ہیں ــــــ "ایسی ہی مناسبت جیسی ایک چیز کے دو شریکوں ـــ میں ہونی چاہیئے"

قادیانیوں سے اصل بحث لفظ "خاتم النبیین" پر ہے، اُمتِ مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ "خاتم النبیین" کے معنی یہ ہیں کہ نبوت کا دروازہ بند کردیا گیا۔ تمام انبیاء میں یہ لقب سیدنا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے مگر قاری محمد طیب صاحب جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "خاتم انبیاء بنی اسرائیل" کہتے ہیں اُس سے "خاتم" کی اس قطعیت میں وہم پیدا ہوجاتا ہے کہ ــ "خاتم الانبیاء" کے بعد کوئی نبی آ ہی نہیں سکتا! کوئی شک نہیں قاری صاحب موصوف "ختمِ نبوت" پر ایمان و یقین رکھتے ہیں اور اس باب میں وہ معاذ اللہ کسی شک اور وہم میں مبتلا نہیں ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کے ظہور کے امکان کو وہ کفر سمجھتے ہیں مگر اُن کا "علمی لطیفہ" اس قطعی مسئلہ میں بلاوجہ کا وہم اور اُلجھن پیدا کرتا ہے۔

جو حضرات اس قسم کے لطائف کا ذوق رکھتے ہیں، اُن کا یہی حال ہے کہ وہ صحیح العقیدہ ہیں، کسی مشرکانہ رسم و بدعت میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ شرک و بدعت کی تردید تو اُن کا مشن ہے مگر اس ذوق کی بدولت ایسے علمی لطائف اُن کے زبان و قلم سے نکل

جاتے ہیں جن سے اہل بدعت کے مسلک کو تقویت پہونچتی ہے۔

صاحبزادہ محمد سالم صاحب قاسمی نے قرآن کی یہ آیت درج کی ہے: –

" وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ -

(اور جب کہ عیسیٰ بن مریم نے فرمایا کہ اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں کہ مجھ سے پہلے توراۃ میں اس کی تصدیق کرنے والا ہوں اور میرے بعد ایک نبی آنے والے ہیں اُن کی بشارت دینے والا ہوں جن کا نام احمدؐ ہے)

اہل بدعت کا یہ قاعدہ اور اُن کی خاص عادت ہے کہ وہ اپنے مزعومہ عقائد کو دُرست و صحیح ثابت کرنے کے لئے قرآن کی آیت پیش کر دیتے ہیں حالانکہ اُس آیت سے اُن کے عقیدے کا کوئی واسطہ ہی نہیں ہوتا، مثلاً وہ یوں کہتے ہیں، حضورؐ تاجدارِ مدینہ کی شان میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: –

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ

دیکھا حضورؐ "رحمۃ اللعالمین" ہیں، مشکل کشا ہیں، حاجت روا ہیں، عالم الغیب ہیں، حاضر و ناظر ہیں، ہر اُمتی کے دل کا حال جانتے ہیں اور ـ ـ ـ ـ ـ " یہی رنگ مولانا محمد سالم صاحب نے اپنے مضمون میں اختیار فرمایا ہے۔

اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان وحی ترجمان سے یہ کہاں کہلوایا گیا ہے کہ "میں بنی اسرائیل کے نبیوں کا خاتم ہوں"۔ ساری بحث تو اسی لفظ "خاتم" کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کسی نبی کے لئے "خاتم النبیین" نہ تو قرآن میں استعمال کیا گیا اور نہ احادیث میں! یہ واقعہ اپنی جگہ سو فیصدی دُرست ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد پھر بنی اسرائیل میں کوئی نبی اور رسول نہیں آیا، مگر اس واقعہ کا اس طرح اظہار نہیں کیا جائے گا اور نہ کرنا چاہیے کہ حضرت عیسیٰ "خاتم انبیاء بنی اسرائیل" ہیں اور "خاتمیت" میں حضرت مسیح علیہ السلام کو حضورؐ سے مناسبت کامل دی گئی ہے! ہم عرض کرتے ہیں حضرت عیسیٰ ؑ کے بعد بنی اسرائیل میں تو کوئی نبی پیدا نہیں ہوا مگر بنو اسماعیل میں پیدا ہوا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر نبوت کا دروازہ بند کر دیا گیا، اس لئے "ختمِ نبوت" کے مسئلہ میں حضرت عیسیٰ ؑ اور حضرت محمدؐ کے درمیان کوئی مشابہت نہیں پائی جاتی! "خاتم الانبیاء" کا وصف یہ ہے کہ اُس کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا مگر عیسیٰ ؑ کے بعد حضورؐ مبعوث ہوئے اور حضورؐ کے بعد اب کوئی نبی نہیں آئے گا، اس لئے اس خاتم الانبیاء یا خاتم النبیین کے وصف، لقب، صفت اور خصوصیت کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اطلاق نہیں ہوگا، چاہے وہ "مشابہت و مناسبت" کے لفظوں کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو "ختمِ نبوت" کے وصف خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی شریک نہیں ہے اور نہ صرف شریک اور مثیل بلکہ کوئی نبی حضورؐ کا اس صفت میں مشابہ بھی نہیں ہے۔

صاحبزادہ محمد سالم قاسمی صاحب نے جس طرح قرآن کی آیت کو پیش کیا ہے جس کا اس بحث اور موضوع مابہ النزاع سے کوئی تعلق نہیں ہے، اسی طرح انھوں نے مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "فتح الملہم" کی ایک عبارت نقل کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

" ـ ـ ـ عیسیٰ علیہ السلام کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کی مشہور اور مخصوص صفتِ عبدیت میں خصوصی مناسبت ہے"۔ (اُردو ترجمہ)

مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم نے جو صفتِ عبدیت میں " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

کو خصوصی مناسبت دی ہے کیا "عبدیت" اور "ختم نبوت" ہم معنیٰ اور مترادف الفاظ ہیں؟ جو اس قول کو یہاں درج فرمایا گیا ہے! ہم نے یہ کب کہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت مسیح کی صفتِ عبدیت جُدا جُدا ہے! انبیاء کرام کی نبوت اور اُن کے پیغام میں حد درجہ کی مشابہت پائی جاتی ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ انبیاء علاتی بھائیوں کی طرح ہیں! حضرت عیسیٰ تو اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، حضورؐ اگرچہ "خیر الناس" اور "افضل البشر" ہیں مگر بہرحال "بشر" ہیں۔ اس لئے خواص بشری کے لحاظ سے تمام انسانوں سے آپ مشابہت رکھتے ہیں، اور بشر ہونے کی حیثیت سے تمام انسانوں اور حضورؐ کے درمیان قدرِ مشترک پائی جاتی ہے!

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "خاتم انبیاء بنی اسرائیل" کہہ کر پھر یہ کہنا کہ آپ "خاتمیت" کے وصف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شریک بھی ہیں، اور حضورؐ سے مشابہت اور مناسبت رکھتے ہیں، اس علمی لطیفہ سے نہ تو دین کی کوئی ضرورت پوری ہوتی ہے، نہ کوئی الجھن دور ہوتی ہے، نہ اس سے قلب و وجدان کو انشراح حاصل ہوتا ہے، نہ اس سے کسی دینی قدر کو تقویت ملتی ہے بلکہ یہ علمی لطیفہ ذہن کو بلاوجہ خلجان میں مبتلا کرتا ہے اور وہ گمراہ لوگ جو "ختم نبوت" پر یقین نہیں رکھتے اُن کے مسلکِ ضلالت کی تائید کے لئے اس علمی لطیفہ سے ایک نکتہ ہاتھ آتا ہے

ابنیتِ مسیحؑ

جس موضوع پر ابھی ابھی گفتگو ہو گئی ہے فرض کر لیجئے بر سبیل تنزل اس کی کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر اور دل پر انتہائی جبر کر کے کوئی تاویل کی جا سکتی ہے مگر قاری محمد طیب صاحب نے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا "ابنِ تمثالی" کہا ہے اُس کی کوئی تاویل ممکن نہیں! فرماتے ہیں:-

"یہ دعویٰ تخیل یا وجدانِ محض کی حد سے گزر کر ایک شرعی دعوے کی حیثیت میں آجاتا ہے کہ
مریم عذرا کے سامنے جس شبیہ مبارک اور بشر سوی نے نمایاں ہو کر پھونک ماری تھی وہ شبیہ
محمدی ہی تھی"

ایک غلط بات پر جمنے اور اصرار کرنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ بات جو علمی لطیفہ اور کشف و وجدان کہی جاتی تھی، قاری محمد طیب صاحب اُس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ اب شرعی دعویٰ کی حیثیت میں آجاتی ہے، آخر یہ بات "شرعی دعویٰ" کس بنیاد پر قرار پائی، کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ سے اس کے لئے کوئی دلیل ملی؟ اگر کوئی دلیل ملتی تو اُس کا ضرور حوالہ دیا جاتا، مگر نہیں دیا گیا! قاری صاحب کے بقول حضرت عیسیٰ کو "ابنِ احمد تمثالی" ماننا شریعت کا کوئی اصولی کلیہ نظریہ یا جزئیہ ہے، تو پھر اس کا جو کوئی انکار کرتا ہے وہ گنہگار قرار پاتا ہے حالانکہ نزولِ قرآن سے لے کر اب تک اُمت اس عجیب و غریب نظریہ سے ہر دور میں ناآشنا اور بے خبر رہی ہے اور شریعت اس قسم کی خرافات سے کوئی سروکار ہی سرے سے نہیں رکھتی!

قاری محمد طیب صاحب کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی کے فتوے کے جواب میں دیوبند کے جن علماء نے دو مرتبہ تردیدی فتویٰ مرتب فرمایا ہے، اور اس کے بعد قاری محمد سالم صاحب جو اپنے والد ماجد کے پُرجوش وکیل رہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اس مسئلہ میں اپنے موقف کی تائید میں کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ سے کوئی دلیل نہیں لا سکا، یہ اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ یہ واہی تباہی بات ہے، جس کی کوئی ذرہ برابر اصل نہیں۔

محمد سالم صاحب قاسمی نے ہمارے مضمون کے جواب میں اپنے اخبار "میثاق" میں جو تین اداریے لکھے ہیں، اُن میں اکثر و بیشتر موضوعِ بحث سے غیر متعلق مثالیں دی ہیں! حضرت عیسیٰؑ کا دُنیا میں نزول، آپ کا اُمتِ محمدیہ کے ایک صالح شخص کی امامت میں نماز پڑھنا، صلیب کا توڑنا، خنزیر کو ذبح کرنا، ان سے کس نے انکار کیا تھا، جو اس سلسلہ میں روایتیں درج کرنے کی زحمت اُٹھائی گئی ہے! الزام ہم پر لگایا جاتا ہے کہ ہم بے ضرورت باتوں میں دماغوں کو اُلجھاتے ہیں، حالانکہ بے ضرورت اور غیر متعلق باتیں آپ خود

کرتے ہیں! ہم شروع ہی سے یہ کہتے چلے آتے ہیں کہ اگر قاری صاحب کی بات اور اس "علمی لطیفہ" میں کوئی وزن ہے تو کتاب و سُنّت اور آثارِ صحابہ سے دلیل لائیں! مگر نہ قاری صاحب اب تک کوئی دلیل لا سکے ہیں اور نہ اُن کے موئدین الحد مکلاء!

"میقات" ہی میں ایک حدیث درج کی گئی ہے :-

"قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیف انتم اذا انزل فیکم ابن مریم وامامکم منکم

(فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کیسے ہوگے جب کہ ابن مریم تم میں نزول فرمائیں گے اور تم ہی میں سے تمہارا امام ہوگا -)

اس حدیث سے تو ہمارے موقف کی تائید ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عیسٰی کو "ولدی" (میرا بیٹا) یا "ابنِ تمثالی" نہیں فرمایا بلکہ "ابنِ مریم" کہا ہے -

حضرت عیسٰی علیہ السلام کو قرآنِ کریم "ابنِ مریم" کہتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "ابنِ مریم" فرماتے ہیں، پورے اسلامی ادب میں حضرت عیسٰیؑ کو "ابنِ مریم" کہا گیا ہے، قرآنِ کریم کسی مرد سے حضرت عیسٰی کی "ابنیت" اور آپ کی والدہ معصومہ سے "زوجیت" کی نسبت سے انکار کرتا ہے ــــــ مگر قاری محمد طیب صاحب اسلام کے اس محکم عقیدہ اور واقعہ کے مقابلہ میں حضرت عیسٰیؑ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا "تمثالی بیٹا" اور حضرت مریمؑ کو "تمثالی زوجہ" قرار دیتے ہیں ــــــ دین کے ساتھ یہ مذاق نہیں تو اور کیا ہے! قرآنی محکمات کے مقابلہ میں "علمی لطیفہ سنجی" کے نام پر اتنی بڑی جرأت! (استغفر اللہ)

مولانا محمد سالم قاسمی لکھتے ہیں :-

"عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما انا لکم بمنزلۃ الوالد -

دوسری استنباطی حجت کتاب اللہ کی آیت ہے -

النبی اولی بالمومنین من انفسھم وازواجہ امھاتھم -

ازواج نبی سے امومیت کا رشتہ ان کے خصوصی اکرام اور توقیر کے لئے ہے - اسی وجہ سے اس امومیت کے احترام کی رعایت سے فرمایا گیا -

ولا تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابداً

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے "انما انا لکم بمنزلۃ الوالد" تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح باپ اولاد کے حق میں شفیق، غمخوار اور خیر خواہ ہوتا ہے، حضورؐ اُمت کے حق میں باپ کی طرح (بلکہ باپ سے بہت زیادہ) شفیق اور خیر خواہ ہیں، یہ تو شفقت و رحمت کے اظہار کا پیرایہ ہے! اور حضورؐ کی ازواج مطہرات کو "ام المومنین" خاص طور سے اس لئے کہا گیا ہے کہ اُن کے ساتھ کسی بھی اُمتی کا نکاح حرام قرار دیدیا گیا تھا! اور وہ عظمت، حُرمت اور عزت میں تمام مسلمانوں کی ماؤں کی مانند ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن کہتا ہے :-

مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّن رِّجَالِکُمْ وَلٰکِن رَّسُولَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیِّیْنَ

اس لئے ازواج مطہرات کو "ام المومنین" کہتے، بولتے اور لکھتے ہیں مگر حضورؐ کے نام کے ساتھ "ابو المومنین" نہ لکھا جاتا ہے اور نہ بولا جاتا ہے -

مولانا محمد سالم قاسمی صاحب نے قاری محمد طیب صاحب کی مدافعت میں اپنے نزدیک جو سب سے زیادہ وزنی دلیل پیش کی ہے، وہ یہ حدیث ہے: —

انما انا لکم بمنزلۃ الوالد ——

(یعنی تمام اُمتیوں کے لئے بمنزلہ باپ کے ہوں —— کے عموم سے حضرت عیسٰی مسیحؑ کو کیسے خارج کیا جا سکتا ہے)

آدم و حوا کی تخلیق کے بعد جب سے نسلِ انسانی چلی ہے، پُوری تاریخ انسانیت میں حضرت عیسٰی علیہ السلام ہی وہ بشر ہیں جو بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں اور حضرت مریمؑ ازدواجی تعلق و تصرف کے بغیر بچہ کی ماں بنی ہیں، قرآن کریم حضرت عیسٰیؑ کو "ابنِ مریم" کہتا ہے، لہٰذا اس حدیث کے ہوتے ہوئے بھی حضرت عیسٰیؑ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی قسم کا بھی فرزند (تمثالی یا ظلّی) ہرگز ہرگز نہیں کہا جائے گا، کیونکہ قرآن جیسے دو ٹوک انداز میں "ابنِ مریم" کہتا ہے۔ کسی مردِ انسان سے اُس کی "ابنیت" کی نسبت دُرست نہیں چاہے وہ "تمثالی" ہی کیوں نہ ہو، حضرت عیسٰی ابنِ مریم علیہ السّلام کو "ابن احمد" (تمثالی) کہنا قرآن کریم کی محکم آیت کے مقابلہ میں ایک ایسی جسارت ہے جس کی کوئی ہوش مند انسان تائید نہیں کر سکتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اُمتِ مسلمہ کے حق میں رؤف و رحیم ہیں اپنی شفقت و رحمت اور رافت و کرم کو اس پیرایہ میں بیان فرمایا ہے۔

"انا انا لکم بمنزلۃ الوالد"

اُس کا اطلاق اُمتِ محمدیہ پر ہوتا ہے، یعنی وہ لوگ جو کافر تھے پھر ایمان لائے، یا جو حضورؐ کی وفات کے بعد اُمت میں پیدا ہوتے رہیں گے۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نبی بنایا ہے، اُن کا معاملہ صحابہؓ جیسا نہیں ہے۔ جو پہلے کافر تھے پھر ایمان لائے حضرت عیسٰیؑ دوسرے بعد کے امتیوں کی طرح پیدا بھی نہیں ہونگے، ہاں! آپ اسلام کے ایک مُجدّد کی حیثیت سے دوبارہ دُنیا میں تشریف لائیں گے، اور آپ عبادات و اعمال میں شریعتِ محمدی کے مطابق عمل فرمائیں گے! لیکن آپ کا تمام اُمتیانِ محمدؐ سے بالکل جداگانہ اور منفرد معاملہ ہے کہ آپ حضورؐ کی بعثت سے صدیوں پہلے بہ حیثیت نبی اس دُنیا میں رہے، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اٹھا لیا، آپ پر موت واقع نہیں ہوئی، اور پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے، اس لئے دُوسرے اُمتیوں کی طرح آپ کے ساتھ القاب و آداب کا معاملہ نہیں کیا جا سکتا! اور حضرت عیسٰیؑ

"انا لکم بمنزلۃ الوالد"

کے تحت نہیں آتے! اس کی ایک وجہ جو سب سے بڑی وجہ ہے وہ قرآن کریم کی محکم شہادت ہے کہ قرآن کریم حضرت عیسٰی علیہ السلام کو "ابنِ مریم" کہتا ہے، اور کسی مرد سے "ابنیت" کے کسی قسم کے تعلق اور نسبت کا اظہار نہیں کرتا، اس لئے قرآن کریم کے اس محکم و ناطق فیصلہ اور تاریخی واقعہ کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام جو اُمتِ محمدیہ کی اصلاح و تجدید کے لئے دُنیا میں تشریف لائیں گے اُن کو اس حدیث (انا لکم بمنزلۃ الوالد) کے تحت رسول اللہؐ کا "ابنِ تمثالی" اور حضورؐ کو حضرت عیسٰی کا "والد روحانی" نہ کہا جائے، بلکہ اس طرز پر سوچنا بھی دماغ کی کجی کی دلیل ہے۔

دوسری وجہ یہ ہیں کہ حضورؐ نے جو یہ فرمایا ہے آپ اُمت کے لئے "بمنزلہ والد" کے ہیں۔ اس کی توجیہ یہ ہے کہ باپ کے بیٹے کے وجود، پیدائش اور حیاتِ دُنیوی کا ذریعہ قرار پاتا ہے اور حضورؐ اُمتیوں کے لئے اُن کی حیاتِ رُوحانی و اخلاقی کا ذریعہ اور واسطہ ہیں، مگر عیسٰی علیہ السلام حضورؐ سے صدیوں قبل پیدا ہو چکے تھے، وہ شروع ہی سے مومن تھے، صحابہ کی طرح

انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے حیاتِ رُوحانی و اخلاقی نہیں ملی ——— پھر باپ بیٹے کو اخلاقی تعلیم دیتا ہے، اور اُسے نیک، شریف اور بھلا آدمی بنانے کے لئے جدو جہد کرتا اور اس کی تمنا رکھتا ہے، اس لئے ایک معلم اخلاق بھی "بمنزلۃ الوالد" ہوتا ہے مگر حضرت عیسٰی علیہ السلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاق و نیکو کاری کی تعلیم نہیں دی اس لئے حدیث "مذکورہ بالا" کے تحت آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا "ابنِ تمثالی" یا "فرزندِ رُوحانی" نہیں کہہ سکتے، حضرت عیسٰی علیہ السلام پر اس حدیث کا انطباق ہر حیثیت سے غلط اور خلافِ واقعہ ہے کیونکہ دوسرے اُمتیوں کی طرح حضرت عیسٰی علیہ السلام کو ایمان، اسلام اور اخلاق و پاکیزگی کی دولت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت اور آپ کے درسِ حکمت و سُنّت سے نہیں ملی۔

اسلامی ادب کی پُوری تاریخ میں شروع سے لے کر اس ہمارے زمانہ تک اس عقیدہ کی بنا پر کہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام چونکہ اُمتِ محمدیہ میں مُجدّد و مُصلح کی حیثیت سے تشریف لائیں گے، اس لئے اُن کا رتبہ صحابہ، تابعین یا اولیاء و صُلحاء اُمت کی برابر ہوتا چلا آپکے نام کے ساتھ "رضی اللہ عنہ" یا "رحمۃ اللہ علیہ" یا "قدس سرہٗ" نہیں لکھا گیا۔ اور نہ کسی نے ایسا کہا۔ اس لئے بھی اس حدیث کا انطباق پُوری امت پر ہوگا، مگر حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی ذات پر نہیں ہوگا۔ یہ جمہور اُمت کا فیصلہ اور عمل ہے۔

قاری محمد طیب مدظلہٗ نے جو یہ کہا ہے :—

"پس حضرت مسیح کی ابنیت کے دعویدار ایک حد تک ہم بھی ہیں مگر ابن اللہ مان کر نہیں ابنِ احمد کہہ کر خواہ وہ ابنیت تمثالی ہی ہو"۔

وہ "انا لکم بمنزلۃ الوالد" کو پیشِ نظر رکھ کر نہیں کہا، یہ نکتہ تو اُن کے صاحبزادے نے تراشا ہے اور وہ بات کہی ہے جو قائل کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھی۔ قاری صاحب تو یہ فرماتے ہیں :—

"مریم عذرا کے سامنے جس شبیہ مُبارک اور بشر سوی نے نمایاں ہو کر پھُونک ماری، وہ شبیہ محمدیؐ تھی"۔

حالانکہ یہ مفروضہ اجماعِ اُمت کے خلاف ہے، کتاب و سُنّت آثارِ صحابہ، اور ائمہ فقہ و حدیث کے یہاں یہ قول نہیں ملتا کہ حضرت جبریلؑ کو جو "بشر سوی" کہا گیا ہے وہ "شبیہ محمدیؐ" تھی، اس کے بعد قاری صاحب لکھتے ہیں :—

"اس ثابت شدہ دعوے سے بیّن طریق پر خود بخود کھل جاتا ہے کہ حضرت مریم رضی اللہ عنہا اس شبیہ مبارک کے سامنے بمنزلہ زوجہ کے تھیں جب کہ اس کے تصرف سے حاملہ ہوئیں"۔

اس خوش فہمی کو تو دیکھئے کہ حضرت جبریلؑ جو "بشر سوی" کی صورت میں متمثل ہوئے تھے وہ شبیہ محمدیؐ تھی یہ بات جو بالکل بے اصل ہے اُس کو قاری صاحب "ثابت شدہ دعوی" سے تعبیر کرتے ہیں — یہ دعویٰ آخر کس دلیل اور ثبوت سے ثابت ہوا، احادیث و آثار سے کوئی ضعیف و منکر قول بھی تو قاری صاحب پیش نہیں کر سکے، اس خیالی مفروضہ کو "ثابت شدہ" کہنے کے بعد فرماتے ہیں کہ "بیّن طریقہ پر خود بخود کھل جاتا ہے" ——— اس مبہم رمز کو "بیّن طریقہ سے کھل جانا" کہہ کر قاری صاحب اپنے ذہن کو تسکین دینا چاہتے ہیں ——— ہم عرض کرتے ہیں کہ فرض کر لیجئے کہ وہ "بشر سوی" جبریلؑ کے بھیس میں "شبیہ محمدیؐ" تھی۔ لیکن اس پر بھی حضرت عیسٰی علیہ السلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا "ابنِ تمثالی" نہیں کہا جائے گا، اور وہ اس لئے کہ حضرت جبریلؑ کا آنا، اور "بشر سوی" کی صورت میں متمثل ہو جانا، پھر حضرت مریم کو بچہ کی ولادت کی خوشخبری دینا، اس پر حضرت مریم کا یہ فرمانا کہ مجھے تو کسی انسان نے چھوا تک نہیں ہے ——— قرآن، اس گفتگو، بیان و تفصیل اور واقعہ کے بعد بھی حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کو ابنِ مریم کہتا ہے! اور قاری صاحب کے نقطۂ نگاہ کے مطابق "ابنِ جبریلؑ" نہیں کہتا! اللہ تعالیٰ کے جس حکم کو قاری صاحب شبیہہ محمدیؐ کا تصرف کہتے ہیں، اُس کے اعتبار سے تو حضرت عیسیٰؑ کو "ابنِ جبریلؑ" کہنا زیادہ ٹھیک ہوگا! حالانکہ نہیں ہے! سیدھی سچی، صاف اور سامنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رحمِ مریم پر حکم (کلمہ) نازل فرمایا کہ وہ کسی مرد کے لمس و تصرف اور عملِ زوجیت کے بغیر اُس "چیز" سے سیراب ہوجائے، جو رحم میں جنین کی صورت اختیار کرلیتا ہے، یہاں تک کہ بچہ کی ولادت واقع ہوجاتی ہے، اللہ تعالیٰ کے اس "حکم" کو جبریل یا شبیہہ محمدیؐ کا تصرف "کہنا درست نہیں، حضرت عیسیٰؑ کسی کے تصرف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پیدا ہوئے اور بغیر باپ کے پیدا ہوئے، آپ کا نہ کوئی حقیقی باپ تھا، اور نہ تمثالی باپ تھا۔

پندرہ روزہ "میثاق" (دیوبند) کے فاضل رئیس التحریر نے حضرت عیسیٰ کو "تمثالی ابن احمدؐ" کہنے کے ثبوت میں روایت نقل کی ہے :—

"انا لکم بمنزلۃ الوالد"

کیا اس حدیث کی بنا پر یوں کہہ سکتے ہیں کہ حضورؐ جن کے لئے "بمنزلہ والد" کے ہیں، اُن کی مائیں حضورؐ کی "تمثالی ازواج" ہیں! ایک معلمِ اخلاق کو اُس کے شاگرد کا تمثالی پیرایہ میں "روحانی باپ" تو کہہ سکتے ہیں مگر اس انداز پر کوئی نہیں سوچتا کہ اس طالب علم کی ماں اُس معلم (روحانی باپ) کے سامنے "بمنزلہ زوجہ" کے ہے۔

قرآن حضرت عیسیٰؑ کو ابنِ مریم کہتا ہے اور کسی مرد سے بھی آپ کی ابنیت کی قطعاً نفی کرتا ہے، مگر قرآن کے مقابلہ میں قاری صاحب "علمی لطیفہ" کی آڑ لے کر یہ جسارت فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کو "تمثالی ابن احمدؐ" ٹھیراتے ہیں، اُن کے اندازِ بیان کے تیور تو دیکھئے :—

"مریم عذرا کے سامنے جس شبیہہ مبارک اور بشر سوی نے پھونک ماری وہ شبیہہ محمدیؐ تھی"

"... حضرت مریم رضی اللہ عنہا اس شبیہہ مبارک کے سامنے بمنزلہ زوجہ کے تھیں، جیسے اس کے تصرف سے حاملہ ہوئیں"

"... عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں پیدا ہو کر اسرائیلی انبیاء کے خاتم کئے گئے۔ جس سے ختمِ نبوت کے منصب میں ایک گونہ مشابہت پیدا ہوگئی — الولدُ سرٌّ لابیہ[1]

"حضرت عیسیٰؑ کی بارگاہِ محمدیؐ سے خلقاً، خلقاً، رتبتاً و مقاماً ایسی ہی مناسبت ہے جیسی ایک چیز کے دو شریکوں میں یا باپ اور بیٹوں میں ہونی چاہیئے۔"

دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی سید مہدی حسن صاحب نے ان عبارتوں پر جو یہ حکم لگایا ہے :—

"یہ اقتباسات قرآن و حدیث اور جملہ مفسرین اور اجماعِ اُمت کے خلاف ہیں ..."

---

[1] عربی کی یہ ضرب المثل اخلاقی اور روحانی معلموں کے لئے استعمال نہیں ہوتی، کوئی شخص اس طرح نہ بولتا ہے اور نہ لکھتا ہے کہ — فلاں شاگرد چونکہ فلاں اُستاد کا شاگرد ہے' اس لئے وہ الولدُ سرٌّ لابیہ کے مصداق بہت لائق اور ذہین ہے — یہ ضرب المثل باپ اور بیٹے یا پھر دادا یا نانا کے اُن رشتوں میں استعمال ہوتی ہے جہاں نسل و نطفہ کا رشتہ اور تعلق پایا جاتا ہے! اس طرح کسی نے آج تک نہیں کہا اور نہ کہنا چاہیئے کہ صحابہ کرام چونکہ حضورؐ کے تربیت یافتہ تھے۔ اس لئے متقی، پاکیزہ اور نیکوکار تھے کما قال الولدُ سرٌّ لابیہ!

وہ دُرست ہے! قاری محمد طیب صاحب، مفتیانِ دیوبند اور مولانا محمد سالم قاسمی اپنی اس غلطی پر نہ صرف اصرار کرتے ہیں بلکہ اپنے ناقدین کو اُلٹا غلط کار ٹھیرا تے ہیں، اس لیے اُن کی یہ غلطی گمراہی کا رنگ اختیار کر چکی ہے۔ انہیں اپنی ان عبارتوں سے رجوع کرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو اپنی غلطیوں کے خلوصِ دل سے اعتراف اور رجوع و توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔

ماہ مارچ سنہ ۱۹۶۲ء کے "فاران" میں جو ہمارا مضمون شائع ہوا ہے اُسے قارئین "فاران" ایک بار پڑھ لیں، ہم نے کس ادب و احترام کے ساتھ تنقید کی ہے مگر اس کے جواب میں قاری صاحب کے فرزند دلبند مولانا سالم قاسمی صاحب نے جو "اداریہ" اپنے اخبار میں تحریر فرمایا ہے، اس کے لب و لہجہ کا یہ انداز ہے:—

"پندارِ علم کے زعم بیجا اور اپنی نارواباتوں کی پچ کرنے میں وہ (یعنی ماہر القادری) حقائق دُشمنی کی آخری حد کو بھی پار کر چکا ہے"۔

"فاران کے پچیس صفحات اس لغویت کی نذر کر کے اس پر ایک مستقل حجت قائم کی ہے"۔

"مدیرِ فاران نے یہ تبصرہ نہیں فرمایا بلکہ علم و بصیرت کا مُنہ چڑایا ہے، کاش! تبصرہ نگار صاحب کو مجالس اہلِ علم میں خاموش بیٹھنے اور اپنے آپ کو تولنے کی توفیق نصیب ہو"۔

قاری محمد طیب صاحب کی جو عبارتیں اُوپر درج کی گئی ہیں، اُن کو عرب و عجم کے کسی عالم اور فقیہ یا پھر کسی معمولی علم و قابلیت کے مسلمان کے سامنے پیش کر دو، ان میں سے ہر شخص ان عبارتوں کو ناپسند کرے گا۔ ہم نے کراچی میں خود دیوبند کے بعض علماء سے گفتگو کی ہے، اور انھوں نے قاری صاحب موصوف کے ان "علمی لطائف و نکات" کو سخت ناپسند کیا ہے! ہمارے پاس دیوبند سے بھی خط آئے ہیں، جن میں ہمارے اُس تنقیدی مضمون کو سراہا گیا ہے، اور "فاران" کے اُس شمارے کی جلدیں طلب کی گئی ہیں، نہ جانے یہ حضرات دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہیں یا طالب علم ہیں، مگر انھوں نے "فاران" کے شمارے دارالعلوم دیوبند کی بجائے قصبہ دیوبند کے دوسرے پتوں پر منگوائے ہیں، اس سے ماہنامہ "تجلی" کے اُس لکھنے کی تصدیق ہو گئی کہ دارالعلوم دیوبند کے طلباء اور دوسرے وابستگان رسالے اور اخبار منگانے میں پوری طرح آزاد نہیں ہیں۔

صُوفیاء کے ملفوظات میں جہاں حکمت و عرفان کی دل نشین باتیں ملتی ہیں، وہاں بہت سی خطرناک باتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ یعنی لالہ و گل کی ان شاخوں میں سانپ اور بچھو بھی لپٹے ہوتے ہیں۔ عوام تو چوپایوں کی طرح ہوتے ہیں اُن کا ذکر چھوڑیئے، علماءِ ربّانی میں تو یہ ذوق پرکھ اور سمجھ بوجھ ہونی چاہیئے کہ وہ ان ملفوظات کی مشتبہ، خطرناک اور غلط باتوں کی اگر تردید کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے، تو کم سے کم سکوت اختیار فرمائیں اور ان غلطیوں کا اپنی تقریروں اور تحریروں میں اعادہ نہ کریں! قاری محمد طیب صاحب سے بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے "صوفیانہ لطیفہ" کو قبول کر لیا، اور جب وہ قبول کر چکے اور اُس کی اشاعت ہو چکی تو اپنے تسامح اور غلطی کی وہ اور اُن کے خیر خواہ طرح طرح سے تاویلیں کر رہے ہیں، اور اس طرح یہ غلطی شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔

ا۔ حضرت عیسیٰؑ کو نہ صرف "خاتم انبیاء بنی اسرائیل" بلکہ خاتمیت کے وصف میں شریک سمجھنا اور آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا "ابنِ تمثالی" اور آپ کی والدہ محترمہ حضرت مریمؑ کو حضورؐ کی "بمنزلہ زوجہ" نہ کہنا "حقائق دُشمنی" ہے! کیا اس چودھویں صدی میں خرافات و لغویات کا نام "حقائق" پڑ گیا ہے۔

ا۔ اور ساتھ ہی دیوبند کے ان علماء کو بھی علمی لطائف کے نام پر اس قسم کی خرافات و لغویات سے اجتناب کرنے کی توفیق نصیب ہو۔

جس شخص نے بھی سب سے پہلے حقیقتِ محمدیؐ پر گفتگو کی اُس نے ایک خطرناک دروازے کو کھول دیا، صحابۂ کرام، تابعین اور دوسرے ائمہ فقہ وحدیث نے حقیقتِ محمدیؐ کا پتہ لگانے اور اُس پر غور وفکر اور گفتگو کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی، اللہ تعالیٰ نے اُمت کے نہ عوام پر اور نہ خواص پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ وہ حقیقتِ محمدیؐ کی جستجو کریں' ہمارا کام حضورؐ کی اطاعت ہے، حضورؐ کی حقیقت معلوم کرنا نہیں ہے ——— یہ تصور اور عقیدہ کہ ——— "نفس مُنفعل پر عقل فعال کی تاثیر سے معانی کی تشکیل ہوتی ہے، جسے صوفیہ "اتحاد" سے تعبیر کرتے ہیں اور عقل فعال فیض الٰہی کو کہتے ہیں اور فیض الٰہی نور محمدیؐ کا نام ہے" یہ عقیدہ قرامطہ اور سالکیہ کا ہے! یونان کے علماء بھی عقل فعال کے بارے میں "بروز" کا عقیدہ رکھتے تھے، اس عقیدے نے صُوفیا میں نور محمدیؐ کے بُروز کا رُوپ دھار لیا! یہ قول چاہے شیخ نابلسیؒ کا ہو یا علامہ آلوسیؒ کا، قاری محمد طیب صاحب نے جس سے بھی لیا ہے اسلامی افکار وعقائد سے مناسبت نہیں رکھتا کہ شبیہ محمدیؐ کے تصرف سے حضرت مریمؑ حاملہ ہو گئی تھیں استغفر اللہ۔

قرآنی عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ مسیح "ابن مریم" ہیں' آپ کا حقیقی یا تمثالی کسی قسم کا کوئی باپ نہیں ہے، آپ بغیر باپ کے پیدا ہوئے، آپ کی والدہ حضرت مریمؑ بھی کسی انسان یا فرشتے سے "تصرف زوجیت" کی کوئی نسبت حقیقی یا تمثالی نہیں رکھتیں' اس عقیدے کے علاوہ جو کوئی دوسرا عقیدہ رکھتا ہے یا علمی لطیفے اور نکتے تراشتا ہے وہ قرآن کے خلاف ہونے کے سبب گمراہی کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔

سیرتُ النبیؐ کی چار کتابیں مُفت

اخبار "الجماعت" کراچی کی طرف سے ہر سال ربیع الاول اور میلاد النبیؐ کے موقع پر حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام رحمت کی نشر واشاعت کے سلسلہ میں ہزاروں کتابیں شائع کر کے مفت تقسیم کی جاتی ہیں۔ اس سال بھی حسب معمول سیرت النبیؐ کی چار کتابیں چھپ رہی ہیں جن کی مفت تقسیم ربیع الاول کے آخری ہفتہ سے شروع ہو جائے گی۔ ہر مسلمان اور غیر مسلم۔ ہندو ہو یا سکھ یا عیسائی، یہ چار کتابیں پتہ ذیل سے مفت حاصل کر سکتا ہے۔

(۱) بارگاہ رسالتؐ میں غیر مسلموں کا ہدیۂ عقیدت ——— (۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے میٹھے بول

(۳) سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ——— (۴) سیرت النبی کی تقریریں

ہر مسلمان محصول ڈاک کے لئے چار آنے کے ڈاک کے نئے پیسہ پیسہ والے یا دو دو پیسہ والے بھجوا کر یہ پاکیزہ کتابیں مفت حاصل کر سکتا ہے غیر مسلم اصحاب کو ڈاک کا محصول بھی ہم خود لگا کر مفت بھجوائیں گے ——— الجماعت کا ایک ۲۵ سالہ سلور جوبلی نمبر جو میلاد النبیؐ نمبر ہوگا اور جو سو صفحات آرٹ پیپر سے زیادہ پر مشتمل ہوگا جس میں حرمین شریفین کے بے شمار فوٹو ہوں گے۔ اس کی بابت خط لکھ کر معلومات حاصل کریں یہ "الجماعت" کا ایک یادگار میلاد النبیؐ نمبر ہوگا اور ستمبر میں شائع ہوگا۔

سید سرور شاہ گیلانی

چیف ایڈیٹر - "الجماعت" پکنوریل، کراچی ۳

رفیق خاور جسکانی
(ایم۔ اے)

"خاکپائے حسرت" سے شفقت کاظمی تک

"حسرت کدہ" کی تعمیر اور "نغمۂ حسرت" کی تخلیق کے مابین برسوں کا فاصلہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ شفقت کاظمی کے دونوں مجموعے معمولی وقفے کے بعد ہی شائع ہوتے ہیں۔ کوئی بھی "کدہ" ہو، تعمیر کا اصول ہی کچھ ایسا ہے کہ پہلے اس کے لئے ایک خاکہ تیار ہوتا ہے۔ اور اگر تعمیر شاعری کی فضا کی ہو تو اس کے لئے راہیں متعین ہوتی ہیں۔ پھر ایک مثال کو سامنے رکھ کر فنکار اپنی محنت کا آغاز کرتا ہے۔ اور اگر یہ محنت اور کاوش شعر و سخن سے عبارت ہو تو کلاسیکی روایات کی تقلید لازم آتی ہے۔ اس طرح جب فنکار یا شاعر اپنا "کدہ" تعمیر کر لیتا ہے۔ تو پھر اس کی تزئین و آرائش کا سوال در پیش ہوتا ہے۔ یہی مرحلہ سب سے زیادہ کٹھن اور وقت طلب ہے۔ فنکار کے لئے اپنی شخصیت اور اپنے نظریات کا عکس اپنے فن میں سمونا جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس کے لئے بڑا ریاض کرنا پڑتا ہے اور یوں "قطرے پہ گہر ہونے تک" ایک زمانہ گزر جاتا ہے۔

شفقت کاظمی نے بھی اپنے "کدہ" کی تعمیر جسے اس نے اپنے شہرہ آفاق استاد حسرت موہانی کے نام نامی سے منسوب کرتے ہوئے "حسرت کدہ" کا نام دیا ہے۔ انہی اصولوں کے تحت کی ہے جہاں تک اس کی شاعری کے ادوار کا تعلق ہے۔ ہم بہ آسانی انہیں دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اس کا پہلا دور ۱۹۲۶ء سے لے کر ۱۹۵۰ء تک ہے۔ جو اس کے لئے بہ اعتبار شاعری "خاکپائے حسرت" ہونے کا زمانہ ہے۔ اس دوران میں اس نے کشت زار غزل کی آبیاری اپنے استاد کے شانہ بشانہ چل کر کی ہے اور استاد کے رنگ کو اس خوبی سے اپنایا ہے کہ ذہنی اور قلبی اعتبار سے دونوں ایک نظر آتے ہیں بقول مولانا سالک مرحوم شفقت کاظمی کی غزل میں وہی خوشبو محسوس ہوتی ہے جس سے کلام حسرت مہک رہا ہے۔ شاعری کے اس پہلے دور میں شفقت کے دوسرے فکری پہلوؤں کی طرح اس کے نظریۂ عشق و محبت کی ساخت بھی اپنے استاد کے نظریہ سے پورے طور پر متاثر ہوئی ہے۔ اس کی جولانگہ غزل میں بھی روایتی اصنام اور افسانوی معشوقوں کی بجائے وہ غزال آباد ہیں۔ جنہیں لذتِ رم نصیب ہوتی ہے۔ واردات محبت کے بیان کرنے میں اس کا انداز بھی وہی شرمیلا سا ہے، جس پر اس کے استاد نے اپنے طرز سخن کی بنیاد رکھی تھی۔ بقول اشرف جہاں قزوینی ؎

نہاں از وے برخش داشتم تماشائے نظر بجانب من کرد و شرمسار شدم

کچھ یہی انداز شفقت کاظمی کا بھی ہے ؎

آنکھ ہر چند تری دید سے محروم رہی شوق نے تجھ کو بہ انداز دگر دیکھ لیا

شفقت کے پہلے مجموعۂ کلام "حسرت کدہ" سے متعلق مولانا نیاز فتحپوری کی یہ رائے کہ "ہم کیوں۔۔۔۔۔ جناب شفقت کو حسرت کا حقیقی متبع کہتے ہیں؟ اس پر کسی دلیل و برہان کے لانے کی ضرورت نہیں بلکہ ان دونوں۔۔۔۔۔ حضرات کے کلام سے یہ حقیقت از خود واضح ہو سکتی ہے" یقیناً یہ رائے اس کے پہلے دور کی غزلوں سے متعلق ہے۔ اور اس امر کے پیش نظر میں یہ سمجھتا

ہوں کہ "حسرت کدہ" کو آج سے کم از کم ۱۵ سال پہلے چھپ جانا چاہیئے تھا۔ اس صورت میں شفقت کے موجودہ نقادوں اور مبصروں کو کم از کم یہ کہنے کا موقع نہ ملتا کہ شفقت کی تمام تر شعری کاوشیں تقلیدِ حسرت کے سوا کچھ نہیں اور شفقت نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو اپنے اسلوب کے تعین کے لئے استعمال نہیں کیا۔ میری رائے میں یہ اعتراض محض اس لئے وارد ہوا ہے کہ "حسرت کدہ" شفقت کی زندگی کے اس دور میں شائع ہوا ہے جو در حقیقت "نغمۂ حسرت" کی اشاعت کا زمانہ تھا۔ چونکہ "نغمۂ حسرت" اپنے نام کی معنوی خصوصیت کے متضاد شفقت کے اپنے زخمِ پنہاں کی دلدوز آواز ہے۔ اور اس کی ہر غزل شامِ غریباں کی راگنی بن کر سننے والوں کے دلوں کا درد جگاتی ہے۔

غالباً اب آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے، جو کچھ میں نے شروع میں کیا تھا کہ "حسرت کدہ کی تعمیر اور "نغمۂ حسرت" کی تخلیق کے مابین برسوں کا فاصلہ ہے۔ اب یہی بات میں اس طرح دہرا رہا ہوں کہ "خاکپائے حسرت" سے لے کر شفقت کاظمی تک پورے ایک دور کا فاصلہ آ گیا ہے۔ شفقت کے دوسرے مجموعۂ کلام میں اس کی اکثر غزلیں جدید رنگ کی حامل ہیں کاش اس مجموعے کا نام "نغمۂ حسرت" کی بجائے "غمِ رائیگاں" یا آوازِ شکستِ دل" کی قسم کا ہوتا۔ لیکن شاید اب کے بھی استاد کے ساتھ شفقت کی گہری وابستگی آڑے آئی ہے اور اس مجموعے کے نام کو بھی "حسرتیات" سے دور نہیں رکھا جا سکا۔ ان جدید انداز کی غزلوں کے مجموعے کا نام "نغمۂ حسرت" حسبِ حال نہ تھا بلکہ اس بیانِ درد کے لئے کچھ اور وسعت چاہیئے تھی!

آئندہ سطور میں مجھے واضح کرنا ہے کہ نقاد حضرات کی یہ رائے منصفانہ نہیں ہے کہ شفقت کا اپنا کوئی اسلوب نہیں بلکہ تمام تر حسرت کے گلستانِ فکر کی گلچینی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شفقت کی ایک مخصوص آواز، ایک منفرد لے ہے، جس پر شروع میں ضرور "نغمۂ حسرت" کا دھوکہ ہوتا تھا مگر اب آواز نکھر سنور کر غمِ دوراں کا آہنگ بن گئی ہے اور تجربہ، تخیل اور اسلوبِ اظہار نے اس کے ہاں وضعی شعور میں گھل مل کر بڑے حسین قالب اختیار کئے ہیں ؎

یہ کس مقام پہ لائی ہے جستجو تری
نہ فکرِ راہ، نہ احساسِ دوریٔ منزل

وہ ہم کہ ہیں ترے جلووں سے کامگار بہت
ہلاکِ تلخیٔ ہجراں ہوئے تو کیا ہوگا

وہ التفات کہ سو آج یہ سبب مجھ پہ
اُس التفات میں بھی کوئی گھات ہے اے دوست

تری نگاہ نے کی مفت پرسشِ احوال
ہم اس قدر غمِ ہجراں سے بے قرار نہ تھے

دل بدستور رہے گا بے تاب
بھول جائیں کہ تجھے یاد کریں!

تری ادائے تلوّن کو اس میں دخل نہیں
غمِ فراق تھا انجامِ دوستی اے دوست

بجا ہیں تیری محبت کے سلسلے اے دوست
نہ راس آئے جو یہ سلسلے تو کیا ہوگا

ظاہر ہے کہ یہاں شاعر کے ذاتی تجربات اور وارداتِ قلب، الفاظ کے لالہ و گل میں نمایاں ہو گئے ہیں اور اسلوب کے اعتبار سے اس نے غزل کی وہ مخصوص لے بگڑنے نہیں دی جو ایجادِ میرؔ و غالبؔ تھی۔

اب میں "نغمۂ حسرت" کے وہ اشعار پیش کروں گا جن میں شاعر کے انفرادی جذبے کا اظہار ہے اور جو حسرتیات سے ہٹ کر مواد کے اعتبار سے جدید ترین قدروں کے حامل ہیں۔ مگر اس سے پہلے ایک اعتراض سن لیجئے:-

عابد علی عابدؔ صحیفہ کے اوراق میں "حسرت کدہ" پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں "ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کس خلوص کیفیت کو

شفقت نے کس طرح محسوس کیا ہے ۔ اور کس منفرد انداز میں ہم تک منتقل کیا ہے ۔ حسرت کا اپنا رنگ دیکھنا مقصود ہو تو اس کا کلیات موجود ہے ، ہر وقت دیکھا جا سکتا ہے اور " نقالی " کتنی ہی کامیاب کیوں نہ ہو آخر نقالی ہوتی ہے ۔ ایسی نقالی جس سے اپنی شخصیت مٹ جائے ، دنیائے شعر گوئی میں کوئی اچھی بات نہیں "۔

میرے خیال میں عابد ایسے فاضل اور بالغ نظر نقاد کے ذہن میں " نقالی " اور " تقلید " کے مفاہیم کا فرق ضرور واضح ہوگا یا تو انہیں تقلید کا لفظ استعمال کرنا چاہیے تھا اور اگر انھوں نے دیدہ و دانستہ " نقالی " کا لفظ استعمال کیا ہے ۔ تو یہ شفقت کے ساتھ صریحاً بے انصافی ہے ۔ استاد کے رنگ کو اس خوبی کے ساتھ اپنانے کو کون اہل ذوق نقالی کہہ سکتا ہے ؟ بقول احمد ندیم قاسمی ایک استادِ فن کا رنگِ سخن اس انتہا تک اپنانا یقیناً بہت مشکل کام ہے ۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں حسرتیات کے علاوہ شفقت کی شاعری کے کئی پہلو اور بھی ہیں ۔ " نغمۂ حسرت " میں تو شفقت کا اپنا اسلوب بہت حد تک اُجاگر ہے ؎

دل بھی تھا اک مقام ترا لائے اُمید وصل ۔۔۔ اس گھر میں تیری جلوہ نمائی نہ ہو سکی
خاک اُڑتی ہے خانۂ دل میں ! ۔۔۔ جب سے لے یادِ یار تو نہ رہی
یاد رکھیں گے آسماں والے ۔۔۔ مجھ پہ جو زیرِ آسماں گزری
میری خاموشیاں بقیدِ قفس ۔۔۔ ایک تحریک تھیں رہائی کی !
ربطِ ماضی کا صلہ کہیے تو اس کو جانِ قبول ۔۔۔ آپ نے بخشا ہے اچھے داغِ تنہائی مجھے
یاس و اُمید کو فرصت ، کہ تمنا اپنی ۔۔۔ ان مراحل سے بہت دور نکل آئی ہے

△

جوابِ رنجش بیجا کسی کو کیا دیتے ۔۔۔ ہم اپنی عرضِ تمنا پہ شرمسار سے ہے
تجھ سے جو درد ملے گا ہم کو ۔۔۔ مایۂ نازِ تمنا ہوگا !
تیرے احسان ہم کو یاد آتے ۔۔۔ دل کے داغوں کا جب شمار کیا
وہ یاد کہ وجہ غم تھی پہلے ۔۔۔ اب عیش دوام ہو گئی ہے
کچھ نہ پایا ترے در سے لیکن ۔۔۔ یہ الگ بات کہ ہم شاد گئے

ظاہری خوشی اور غم شفقت کے ہاں اپنی خالص اور معطر صورت میں نمودار ہو کر قاری کے دل میں ایک احساسِ جمال پیدا کرتا ہے ، اس کے ہاں نغمہ و خیال کی ایک ایسی آمیزش ہے ، جس میں ایک کو دوسرے سے جدا کر کے دیکھنا بے حد دشوار ہو جاتا ہے ۔ وہ اپنی آواز میں ڈوب کر کہنے کا عادی ہے ۔ ترنم و تغزل کی کیفیات ایک قسم کے غلاف کا کام دیتی ہیں ۔ جو خیال اور جذبے پر بڑی نفاست سے چڑھا جاتا ہے ۔

" حسرت کدہ " کی طرح " نغمۂ حسرت " میں بھی کلام شفقت کا محور حسن و عشق ہے ، مگر " نغمۂ حسرت " میں غمِ جاناں وسعت پا کر جزوِ غمِ انسانیت بن گیا ہے ۔ یہاں وہ غمِ جاناں کی سطح سے سماجی حقیقتوں کا بھی ادراک کرتا نظر آتا ہے ؎

دُنیا کے حال و قال سے کیا واسطہ ہمیں ۔۔۔ ہم اپنے واقعات کی صورت گری کریں
بہار آئی ہے سلانِ رنگ و بو لے کر ۔۔۔ چمن میں پھول نہ پھر بھی کھلے تو کیا ہوگا

اپنے گھر میں وہی اندھیرا ہے کیا خبر کس جگہ چراغ جلے

حسبِ ذیل اشعار میں تو شفقت جدید شعراء کی صفِ اوّل میں نظر آتا ہے۔ اس کی شاعری اور نظریات کا ارتقا اسے کہاں لے گیا ہے۔ شاعری، سمت اور تنوع ...... کے اعتبار سے لامتناہی ہے چنانچہ دوسروں کی طرح شفقت نے بھی اپنے رنگِ شاعری کو محض حسرتیات تک محدود نہیں رکھا ؎

ہم اپنی وفا کی لاج رکھیں — دنیا تو ہے بے اصول یارو
دنیا ابھی ملتفت نہیں ہے — وہ قصۂ غم کو طول یارو

ہم کو ایامِ طرب یاد نہیں! — صحبتیں ان سے تھیں کب یاد نہیں
تجھ پہ آیا دل شیدا کیوں کر — تیری چاہت کا سبب یاد نہیں
وقت کے ساتھ گئی وقت کی بات — قصۂ دورِ طرب یاد نہیں

حریمِ دل پہ بٹھائے ہیں پاسباں پہرے — ترا خیال نہ جانے کدھر سے آیا ہے
رنج سہتے رہے مسکراتے رہے — اپنی مجبوریاں ہم چھپاتے رہے
کوئی اُمید ہے باقی نہ کوئی آس ہمیں — یہ اور بات ہے کہ ہم تجھ سے پیار کرتے ہیں
احترام تمنا تجھے، نہ قدرِ وفا — ترے دیار میں آئے تو کوئی کیا آئے
اُن سے ملنے کی رکھیں نہ امید ہم — اب بہت دُور ساتھی ہمارے گئے
ہر زباں پر انہیں کا فسانہ رہا — تیرے ہاتھوں جو بے جرم مارے گئے
وہیں سے اہلِ ہوس کو ملی متاعِ سکوں — جہاں سے رُوحِ وفا بے قرار گزری ہے

یہ قدیم و جدید روایت کی بات تھی اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ شفقت کی انفرادیت کہاں نمایاں ہے۔ جسے جناب نیاز نے "بے چارانہ معصومیت" کا نام دیا ہے۔ میری رائے میں اس "بے چارانہ معصومیت" کے علاوہ ایک عاشقانہ وضعداری شفقت کا خاص رنگ ہے، جہاں محبوب کی پیہم ستم کاریوں کے مقابلے میں شفقت نے ایک وضعدارانہ روش اختیار کی ہے۔ اسے آپ عشق کی افتاد سمجھیں یا پندارِ مجبور کی سحر سازی۔ کہ اس نے ہمیشہ محبوب کے پشیمان ہونے سے پہلے اپنی محرومی کا کوئی جواز ضرور ڈھونڈ لیا ہے، اور اس ستم پیشہ کی لاج رکھ لی ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے۔ آخر اور کس چیز کو شفقت کا اسلوب کہا جائے ؎

اپنی محفل سے اٹھا کر نہ پشیماں ہو کہ ہم — آئے تھے جرمِ تمنا کی سزا پانے کو
خود ہم کو ہوئی ترکِ تمنا پہ ندامت — دیکھی نہ گئی آپ کی افسردہ نگاہی

نغمۂ حسرت میں یہ انداز اور بھرپور ہے ؎

تری ادائے تلون کا اس میں دخل نہیں — غمِ فراق تھا انجام دوستی اے دوست
جوابِ رنجشِ بے جا کسی کو کیا دیتے — ہم اپنی عرضِ تمنا پہ شرمسار رہے

اور اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ ؎

شامِ وصال تو ہی لے زندگی مُعادے — آتا ہے ورنہ ان پر الزامِ بے وفائی

شفقت کے ہاں قدیم روایات کی اہمیت، جدید رنگ سے ہم آہنگی اور اپنے جذبے کی انفرادیت کا ذکر کرنے کے بعد کچھ

آخر میں مولانا سالک مرحوم کا قول دہراؤں گا جو شفقت کے مستقبل سے متعلق ہے فرماتے ہیں :۔

"مجھے یقین ہے کہ ابھی شفقت کاظمی کی شاعری مزید بلندیوں کو چھونے والی ہے۔ اور چند سال کے اندر، یہ شراب سہ آتشہ ہو کر غزل کی گرمیٔ محفل کا سامان بننے والی ہے"۔

شفقت نے ایک استادِ فن کے رنگ کو مکمل طور پر اپنایا پھر اپنی آواز میں اپنی انفرادیت کو نمایاں کیا اب سوال اسے عظمتِ انسانی کا نغمہ بنانے کا ہے۔ ضروری ہو کہ اس کی شاعرانہ صلاحیتیں اب اس مقصد کے لئے بروئے کار آئیں۔ غمِ جاناں سے تو وہ بے نیاز ہو ہی چکے ہیں ؎

کوئے جاناں سے اب نہیں مطلب ہم نے وہ راستہ ہی چھوڑ دیا

رنگا رنگ

ماہی بلند شہری

ہزاروں پیچ و خم ہوں گے ہزاروں امتحاں ہونگے
مگر ہم رہبرِ ہر منزل و ہر کارواں ہونگے
یہی دامن کشانِ دنیا ہمیں سر پہ بٹھائے گی!
مگر اُس دن جب اس دنیا سے ہم دامن کشاں ہونگے
غنیمت ہیں یہ لمحے کل نہیں معلوم کیا ہوگا
نہ جانے تم کہاں ہوگے نجانے ہم کہاں ہونگے ——
خبر کیا تھی جنہیں دُردِ تہہ ساغر نہ ملتی تھی
زمانہ رنگ بدلے گا تو وہ پیرِ مغاں ہونگے
ہمیں ہیں آج جن کی قدر و قیمت کچھ نہیں لیکن
نہ ہونگے ہم تو دشمن بھی ہمارے قدرداں ہونگے

منظر صدیقی سیمابی

نہ ہو حیراں جو ہم اس بزم میں پائے نہیں جاتے
وفا کے نام لیوا یاد فرمائے نہیں جاتے
کشش ہے فطرتاً ایسی ہی کچھ اب تک بیاباں میں
یہاں آتے ہیں خود اہلِ جنوں لائے نہیں جاتے
محبت رُوح و دل میں ڈال دیتی ہے بنا جن کی
وہ شعلے خود بھڑک اُٹھتے ہیں بھڑکائے نہیں جاتے
وہ کیا سلجھا سکیں گے پیچ و خم گیسوئے ہستی کے
کہ جن سے اپنے پیچ و خم ہی سلجھائے نہیں جاتے
اب اس کو موسمِ گل کہیے یا دورِ خزاں کہیے
بہاروں کے ہیں دن اور پھول برسائے نہیں جاتے
جو تھے باطل شکن ضربِ کلیمی کی طرح منظر
وہ نعرے پھر بڑے کار کیوں لائے نہیں جاتے

اختر سکندروی

سوزِ ضبط و الم کے اثر سے کبھی موم کی طرح دل کو پگھلنا پڑا
اہلِ محفل کو یہ کیا خبر بزم میں شمع کے ساتھ کس کس کو جلنا پڑا
آنسوؤں کو ہمارے برائے مصلحت روز جھوٹے تبسم میں ڈھلنا پڑا
اپنے سینے میں اپنے ہی جذبات کو سینکڑوں بار اختر کچلنا پڑا
زخم کھاتے رہے، مسکراتے رہے خار کو لالہ و گل بتاتے رہے
اپنی مجبوریاں کیا کہیں آپ سے پھر بھی ہم کو چمن سے نکلنا پڑا
دن نکلنے نہ پایا کہ شام آگئی، روشنی صبح کی زیرِ دام آگئی
زلف بکھرانے والے تجھے کیا خبر آج سورج کو بے وقت ڈھلنا پڑا
رہبروں پر ہی کیا منحصر ہے یہاں منزلِ راہِ ہستی میں اختر ہمیں
غم چھپاتے ہوئے سر جھکاتے ہوئے رہزنوں کے اشاروں پہ چلنا پڑا

ماہر القادری —— غم کی شوخی صرف کشتی پر عمل ہوتی رہی ۔ سامنے بیٹھے رہے وہ اور غزل ہوتی رہی

بسمل سعیدی

سوز و ساز!

عشق میں کوئی زماں اور نہ مکاں ہوتا ہے
وہ دو عالم سے الگ ایک جہاں ہوتا ہے

کس قدر اُن کی طبیعت پہ گراں ہوتا ہے
جس فسانے میں وفاؤں کا بیاں ہوتا ہے

شدتِ شوق کا اللہ رے فسوں اُف رے فریب
اُن کی نفرت پہ محبت کا گماں ہوتا ہے

صرف اک دل ہی وہ معبد ہے وہ اک معبدِ عشق
جس میں ناقوس ہم آوازِ اذاں ہوتا ہے

اُن سے اس طرح جدا ہو کے ہم آئے ہیں کہ ہائے
آنکھ سے جیسے کوئی اشک رواں ہوتا ہے

حسن کے حق سے کوئی عہدہ برآ کیا ہوگا
عشق کا حق بھی ادا ہم سے کہاں ہوتا ہے

اپنی سوزش میں بھی ہوتا ہے جہنم محسوس
غیر کی آگ کا شعلہ بھی دھواں ہوتا ہے

ایک اِدھر اشک بہ چشم ایک اُدھر دست بہ دل
ہائے کیا قہر جدائی کا سماں ہوتا ہے

سننے والے ہی پہ ہے منحصر اندازۂ غم
ورنہ جو حال ہے وہ کس سے بیاں ہوتا ہے

ساتھ ہر سانس کے آتا ہے زباں پر ترا نام
دل میں جو کچھ ہو وہی وردِ زباں ہوتا ہے

غیر کی آگ میں جلنے کا مزہ ہے کچھ اور
ورنہ پروانہ بھی خود شعلہ بجاں ہوتا ہے

جس جتانے پہ برستی ہوئی حسرت دیکھوں
اُس جتانے پہ مجھے اپنا گماں ہوتا ہے

عشق میں ہائے طبیعت کا وہ عالم بسمل
عالمِ عشق بھی جب دل پہ گراں ہوتا ہے

×

سید ابوالاعلیٰ مودودی

رُوحِ انتخاب

یہ ہے وہ نقطۂ عدل اور مقام توسط جس کی دنیا اپنی ترقی اور خوشحالی اور اخلاقی امن کے لئے محتاج اور سخت محتاج ہے۔ جیسا کہ ابتداء میں بیان کر چکا ہوں، تمدن میں عورت، یعنی عالم انسانی کے پورے نصف حصہ کی جگہ متعین کرنے میں دنیا ہزاروں سال سے ٹھوکریں کھاتی رہی ہے۔ کبھی افراط کی طرف جاتی ہے اور کبھی تفریط کی طرف۔ اور یہ دونوں انتہائیں اس کے لئے نقصان دہ ثابت ہوئی ہیں، تجربات اور مشاہدات اس نقصان پر شاہد ہیں۔ ان انتہاؤں کے درمیان عدل و توسط کا مقام، جو عقل اور فطرت کے عین مطابق اور انسانی ضروریات کے لئے عین مناسب ہے۔ وہی ہے جو اسلام نے تجویز کیا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں متعدد ایسے موانع پیدا ہوگئے ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کے لئے اس صراط مستقیم کو سمجھنا اور اس کی قدر کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

ان موانع میں سب سے اہم مانع یہ ہے کہ زمانہ جدید کا انسان عموماً "یرقان" میں مبتلا ہو گیا ہے اور مشرق کے فرنگیت زدہ لوگوں پر اس یرقان کی ایک اور زیادہ خطرناک قسم کا حملہ ہوا ہے جسے میں "یرقان ابیض" کہتا ہوں۔ میں اپنی اس صاف گوئی پر اپنے دوستوں اور بھائیوں سے معافی کا خواستگار ہوں، مگر جو حقیقت ہے اس کے اظہار میں کوئی مروت مانع نہ ہونی چاہیئے۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اسلام کا کوئی حکم اور کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو ثابت شدہ علمی حقائق کے خلاف ہو۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ جو کچھ علمی حقیقت ہے وہی عین اسلام ہے۔ مگر اس کو دیکھنے کے لئے بے رنگ نگاہ کی ضرورت ہے تاکہ ہر چیز کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھ سکے۔ وسیع نظر کی ضرورت ہے تاکہ ہر چیز کے تمام پہلوؤں کو دیکھ سکے۔ کھلے دل اور سلیم فطرت کی ضرورت ہے تاکہ حقائق جیسے کچھ بھی ہوں، ان کو ویسا ہی تسلیم کرے اور اپنے رجحانات کے تابع بنانے کے بجائے رجحانات نفس کو ان کے تابع کر دے۔ جہاں یہ چیز نہ ہو وہاں اگر علم ہو بھی تو بیکار ہے۔ رنگین نگاہ جو کچھ دیکھے گی اسی رنگ میں دیکھے گی جو اس پر چڑھا ہوا ہے۔ محدود نظر مسائل اور معاملات کے صرف انہی گوشوں تک جا سکے گی جو اُس زاویہ کے سامنے واقع ہوں جس سے وہ انہیں دیکھ رہی ہے۔ پھر ان سب کے باوجود جو کچھ علمی حقائق اپنی اصلی حالت میں اندر تک پہنچ جائیں گے ان پر بھی دل کی تنگی اور فطرت کی کجی اپنا عمل کرے گی۔ وہ حقائق سے مطالبہ کرے گی کہ اُس کے داعیات نفس اور اُس کے جذبات و رجحانات کے موافق ڈھل جائیں۔ اور اگر وہ نہ ڈھلیں گے تو وہ اُن کو حقائق جاننے کے باوجود نظر انداز کر دے گی اور اپنی خواہش کا اتباع کرے گی۔ ظاہر ہے کہ اس مرض میں جب انسان گرفتار ہو تو علم، تجربہ، مشاہدہ کوئی چیز بھی اس کی رہنمائی نہیں کر سکتی اور ایسے مریض کے لئے قطعی ناممکن ہے کہ وہ اسلام کے کسی حکم کو ٹھیک ٹھیک سمجھ سکے، کیونکہ اسلام دین فطرت بلکہ عین فطرت ہے، دُنیا مغرب کے لئے اسلام کو سمجھنا اسی لئے مشکل ہو گیا ہے کہ وہ اس بیماری میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اُس کے پاس جتنا بھی "علم"[1] ہے۔ وہ سب کا سب اسلام ہے۔ مگر خود اُس کی اپنی نگاہ رنگین ہے۔ پھر یہی رنگ "یرقان ابیض" بن کر مشرق کے نئے تعلیم یافتہ طبقہ کی نگاہوں پر چھا گیا ہے اور یہ بیماری ان کو بھی حقائق علمیہ سے صحیح نتائج نکالنے اور مسائل حیات کو فطری نگاہ سے دیکھنے میں مانع ہوتی ہے۔ ان میں سے

[1] "علم" یعنی حقیقت کا علم، نہ کہ نظریات، اور حقائق سے اخذ کردہ نتائج۔

جو مسلمان ہیں وہ ہو سکتا ہے کہ دینِ اسلام پر ایمان رکھتے ہوں، اُس کی صداقت کے معترف بھی ہوں۔ اتباع دین کے جذبے سے بھی خالی نہ ہوں' مگر وہ غریب اپنی آنکھوں کے یرقان کو کیا کریں کہ جو کچھ ان آنکھوں سے دیکھتے ہیں اس کا رنگ ہی انہیں صبغۃ اللہ کے خلاف نظر آتا ہے۔

دوسری وجہ جو فہمِ صحیح میں مانع ہوتی ہے، یہ ہے کہ عام طور پر لوگ جب اسلام کے کسی مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو اُس نظام اور سسٹم پر بحیثیت مجموعی نگاہ نہیں ڈالتے جس سے وہ مسئلہ متعلق ہوتا ہے۔ بلکہ نظام سے الگ کر کے اُس خاص جز و کو من حیث ھو ھو لے لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جز تمام حکمتوں سے خالی نظر آنے لگتا ہے اور اس میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہونے لگتے ہیں۔ سود کے مسئلہ میں یہی ہوا کہ اس کو اسلام یعنی فطرت کے اُصول معیشت اور نظام معاشی سے الگ کر کے دیکھا گیا۔ ہزاروں سقم اس میں نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے صاحب علم لوگوں کو بھی مقاصد شریعت کے خلاف اس میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ غلامی اور تعدد ازدواج اور حقوق الزوجین اور ایسے ہی بہت سے مسائل میں یہی بنیادی غلطی کا اعادہ کیا گیا ہے۔ اور پردہ کا مسئلہ بھی اس کا شکار ہوا ہے۔ اگر آپ پوری عمارت کو دیکھنے کے بجائے صرف اس کے ایک ستون کو دیکھیں گے تو لامحالہ آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ آخر کیوں لگایا گیا ہے۔ آپ کو اس کا قیام تمام حکمتوں سے خالی نظر آئے گا۔ آپ کبھی نہ سمجھ سکیں گے کہ انجینیر نے عمارت کو سنبھالنے کے لئے کس تناسب اور کس موزونیت کے ساتھ اس کو لگایا ہے اور اس کو گرا دینے سے پوری عمارت کو کیا نقصان پہنچے گا۔ بالکل ایسی ہی مثال پردے کی ہے۔ جب وہ اُس نظامِ معاشرت سے الگ کر لیا جائے گا جس میں وہ عمارت کے ستون کی طرح ایک ضرورت اور مناسبت کو ملحوظ رکھ کر نصب کیا گیا ہے تو وہ تمام حکمتیں نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گی جو اس سے وابستہ ہیں، اور یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہ آسکے گی کہ نوعِ انسانی کی دونوں صنفوں کے درمیان یہ امتیازی حدود آخر کیوں قائم کئے گئے ہیں۔ پس ستون کی حکمتوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس پوری عمارت کو دیکھ لیا جائے جس میں وہ نصب کیا گیا ہے۔

اب اسلام کا حقیقی پردہ آپ کے سامنے ہے۔ وہ نظامِ معاشرت بھی آپ کے سامنے ہے جس کی حفاظت کے لئے پردہ کے ضوابط مقرر کئے گئے ہیں۔ اس نظام کے وہ تمام ارکان بھی آپ کے سامنے ہیں جن کے ساتھ ایک خاص توازن کو ملحوظ رکھ کر پردے کا رکن مربوط کیا گیا ہے۔ وہ تمام ثابت شدہ علمی حقائق بھی آپ کے سامنے ہیں جن پر اس پورے نظامِ معاشرت کی بنا رکھی گئی ہے۔ ان سب کو دیکھ لینے کے بعد فرمائیے کہ اس میں کہاں آپ کوئی کمزوری پاتے ہیں؟ کس جگہ بے اعتدالی کا کوئی ادنیٰ سا شائبہ بھی نظر آتا ہے؟ کونسا مقام ایسا ہے جہاں —— کسی خاص گروہ کے رجحان سے قطع نظر —— محض علمی و عقلی بنیادوں پر کوئی اصلاح تجویز کی جاسکتی ہو؟ میں علی وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ زمین اور آسمان جس عدل پر قائم ہیں۔ کائنات کے نظم میں جو کمال درجہ کا تسویہ پایا جاتا ہے۔ ایک ذرہ کی ترکیب اور نظامِ شمسی کی بندش میں جیسا مکمل توازن و تناسب آپ دیکھتے ہیں ویسا ہی عدل و تسویہ اور توازن و تناسب اس نظامِ معاشرت میں بھی موجود ہے۔ افراط و تفریط اور یک رُخی جو انسانی کاموں کی ناگزیر کمزوری ہے' اُس سے یہ نظام یکسر خالی ہے۔ اس میں اصلاح تجویز کرنا انسان کی قدرت سے باہر ہے۔ انسان اپنی عقلِ خام کی مداخلت سے اگر اس میں کوئی ادنیٰ رد و بدل بھی کرے گا تو اس کی اصلاح نہ کرے گا بلکہ اس کے توازن کو بگاڑ دیگا۔

افسوس! میرے پاس ایسے ذرائع نہیں ہیں کہ اپنے اُن انسانی بھائیوں تک اپنی آواز پہنچا سکوں جو یورپ' امریکہ اور جاپان میں رہتے ہیں۔ وہ ایک صحیح اور معتدل نظامِ تمدن نہ پانے ہی کی وجہ سے اپنی زندگی کو تباہ کر رہے ہیں اور دنیا کی دوسری قوموں کی تباہی کے بھی موجب بن رہے ہیں۔ کاش میں ان تک وہ آبِ حیات پہنچا سکتا جس کے وہ درحقیقت پیاسے ہیں۔ چاہے

پیاس محسوس نہ کرتے ہوں! تاہم میرے اپنے وطن کے ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی میری دسترس سے قریب ہیں۔ ان میں سے اکثر میری زبان بھی سمجھتے ہیں، میں انہیں دعوت دیتا ہوں کہ مسلمانوں کے ساتھ تاریخی اور سیاسی جھگڑوں کی بدولت جو تعصب ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف پیدا ہو گیا ہے اس سے اپنے دلوں کو صاف کرکے محض طالبِ حق ہونے کی حیثیت سے اسلام کے اس نظامِ معاشرت کو دیکھیں جسے میں نے بے کم و کاست اس کتاب میں بیان کر دیا ہے، پھر اس مغربی نظامِ معاشرت سے اس کا موازنہ کریں جس کی طرف وہ بے تحاشا دوڑے چلے جا رہے ہیں اور آخر میں میری یا کسی اور کی خاطر نہیں بلکہ خود اپنی بھلائی کی خاطر فیصلہ کریں کہ ان کی حقیقی فلاح کس طریقہ میں ہے۔

اس کے بعد میں عام ناظرین کی طرف سے رُخ پھیر کر چند الفاظ اپنے ان گمراہ بھائیوں سے عرض کروں گا جو مسلمان کہلاتے ہیں۔

ہمارے بعض نئے تعلیم یافتہ مسلمان بھائی ان تمام باتوں کو تسلیم کرتے ہیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں، مگر وہ کہتے ہیں کہ اسلام کے قوانین میں حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے شدت اور تخفیف کی تو کافی گنجائش ہے جس سے تم خود بھی شاید انکار نہیں کر سکتے۔ پس ہماری خواہش صرف اس قدر ہے کہ اسی گنجائش سے فائدہ اٹھایا جائے۔ موجودہ زمانے کے حالات پردہ میں تخفیف کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مسلمان عورتیں مدرسوں اور کالجوں میں جائیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ ایسی تربیت حاصل کریں۔ جس سے وہ ملک کے تمدنی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اس کے بغیر مسلمان زندگی کی دوڑ میں ہمسایہ قوموں سے پیچھے رہے جاتے ہیں۔ اور آگے چل کر اندیشہ ہے کہ اور زیادہ نقصان اٹھائیں گے۔ ملک کی سیاسی زندگی میں عورتوں کو جو حقوق دیئے جا رہے ہیں، اگر ان سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت مسلمان عورتوں میں پیدا نہ ہوئی، اور پردے کی قیود کے سبب سے وہ فائدہ نہ اٹھا سکیں تو ملک کی سیاسی ترازو میں مسلمانوں کا وزن بہت کم ہو جائے گا۔ کیونکہ دنیائے اسلام کی ترقی یافتہ اقوام مثلاً ترکی اور ایران نے بھی زمانے کے حالات کو دیکھ کر اسلامی حجاب میں بہت کچھ تخفیف[1] کر دی ہے۔ اور اس سے چند ہی سال کے اندر نمایاں فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اگر ہم بھی انہیں کے نقشِ قدم پر چلیں تو آخر اس میں کیا قباحت ہے؟

یہ جتنے خطرات بیان کئے جاتے ہیں۔ ہم ان سب کے جوں کا توں تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ اگر خطرات کی فہرست میں اس سے دس گنا اور اضافہ ہو جائے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ بہرحال اس نوعیت کے کسی خطرے کی بنا پر بھی اسلام کے قانون میں ترمیم یا تخفیف جائز نہیں ہو سکتی درحقیقت ایسے تمام خطرات کی نوعیت یہ ہے کہ مثلاً آپ قصداً اپنی حماقت سے یا مجبوراً اپنی کمزوری کی وجہ سے ایک کثیف اور مضرِ صحت ماحول میں رہتے ہوں اور وہاں حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل کرنا آپ کے لئے نہ صرف مشکل ہو رہا ہو بلکہ گندے لوگوں کی بستی میں آپ کے لئے گندگی اختیار کئے بغیر جینا تک دشوار ہو ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ حفظانِ صحت کے اصولوں کی ترمیم یا تخفیف کا کوئی سوال پیدا نہیں ہو سکتا اگر آپ ان اصولوں کو صحیح سمجھتے ہیں تو آپ کا فرض ہے کہ اپنے ماحول سے لڑ کر اسے پاک بنائیں۔ اگر لڑنے کی جرأت و ہمت نہیں اور اپنی کمزوری کی وجہ سے آپ اپنے ماحول سے مغلوب ہیں تو جائیے اور جو جو کثافتیں بھی آپ پر مسلط ہوں ان میں آلودہ ہو جائیے۔ آخر آپ کے لئے قوانینِ صحت میں ترمیم یا تخفیف کیوں کی جائے؟ اگر آپ واقعی ان قوانین کو غلط سمجھتے ہیں اور اس گندگی سے آپ کی اپنی طبیعت بھی مانوس ہے تو آپ اپنے لئے خود جو چاہیے قانون بنا لیجئے۔ پاکی اور طہارت کے قانون میں ان لوگوں کی خواہشات کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے جو گندگی کی طرف میلان رکھتے ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ ہر قانون کی طرح اسلامی قانون میں بھی حالات کے لحاظ سے شدت اور تخفیف کی گنجائش ہے مگر ہر قانون کی طرح اسلامی قانون بھی اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ شدت یا تخفیف کا فیصلہ کرنے کے لئے حالات کو اسی نظر سے اور

[1] تخفیف؟ یہ لفظ محض بحث کی خاطر استعمال کیا جاتا ہے۔ ورنہ درصل وہاں تخفیف نہیں تنسیخ کی گئی ہے۔

اسی اسپرٹ میں دیکھا جائے جو اسلام کی نظر اور اسلام کی اسپرٹ ہے۔ کسی مختلف نقطۂ نگاہ سے حالات کو دیکھنا اور پھر تخفیف کی تبلیغ کرکے دفعتاً قانون پر حملہ آور ہوجانا تخفیف کی تعریف میں نہیں آتا بلکہ یہ سادہ اور صریح تحریف ہے۔ جن حالات کو غیر اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھ کر قانون اسلامی میں "تخفیف" کرنے کا مطالبہ کیا جارہا ہے، ان کو اگر اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ ایسے حالات میں تخفیف کی نہیں بلکہ مزید شدت کی ضرورت ہے۔ تخفیف صرف اس وقت کی جاسکتی ہے جب کہ قانون کے مقاصد دوسرے ذرائع سے بآسانی پورے ہوجاتے ہوں اور تحفظات میں زیادہ سختی کی حاجت نہ ہو۔ مگر جب کہ قانون کے مقاصد دوسرے ذرائع سے پورے نہ ہورہے ہوں، بلکہ دوسری تمام قوتیں ان کو ضائع کرنے میں لگی ہوئی ہوں اور ان مقاصد کے حصول کا تمام مدار صرف تحفظات ہی پر آٹھیرا ہو تو ایسی حالت میں صرف وہی شخص تخفیف کا خیال کرسکتا ہے جو قانون کی اسپرٹ سے قطعی نابلد ہو۔

پچھلے اوراق میں ہم تفصیل کے ساتھ بیان کرچکے ہیں کہ اسلامی قانون معاشرت کا مقصد ضابطۂ ازواج کی حفاظت، صنفی انتشار کی روک تھام اور غیر معتدل شہوانی تحریکات کا انسداد ہے۔ اس غرض کے لئے شارع نے تین تدبیریں اختیار کی ہیں۔ ایک اصلاح اخلاق، دوسرے تعزیری قوانین، تیسرے انسدادی تدابیر یعنی ستر و حجاب۔ یہ گویا تین ستون ہیں جن پر یہ عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ جن کے استحکام پر اس عمارت کا استحکام منحصر ہے۔ اور جن کا انہدام دراصل اس پوری عمارت کا انہدام ہے۔ آئیے اب اپنے ملک کے موجودہ حالات پر ایک نظر ڈال کر دیکھئے کہ ان تین ستونوں کا آپ کے ہاں کیا حال ہے؟

پہلے اپنے اخلاقی ماحول کو لیجئے۔ آپ اس ملک میں رہتے ہیں جس کی پچھتر فیصدی آبادی آپ ہی کی اگلی پچھلی کوتاہیوں کے سبب اب تک غیر مسلم ہے، جس پر ایک غیر مسلم قوم حکمراں ہے۔ جس پر ایک غیر مسلم تہذیب آندھی اور طوفان کی طرح چھائی چلی جارہی ہے۔ پلیگ اور ہیضہ کی جراثیم کی طرح غیر اسلامی اخلاق کے اصول اور غیر اسلامی تہذیب کے تخیلات تمام فضا میں پھیل گئے ہیں۔ ——
آب و ہوا ان سے مسموم ہوچکی ہے، ان کی سمیت نے ہر طرف سے آپ کا احاطہ کرلیا ہے۔ فحش اور بے حیائی کی جن باتوں کے خیال سے بھی چند سال پہلے تک آپ کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے وہ اب اس قدر معتاد ہوچکی ہیں کہ آپ انہیں روزمرہ کے معمولات سمجھ رہے ہیں۔ آپ کے بچے تک اخباروں اور رسالوں اور اشتہاروں میں فحش تصویریں روز دیکھتے ہیں اور بے حیائی کے عادی ہوتے جاتے ہیں۔ آپ کے بوڑھے اور جوان اور بچے سب کے سب سینما دیکھ رہے ہیں۔ جہاں عریانی اور بے حیائی اور شہوانی محبت سے زیادہ دلچسپ چیز اور کوئی نہیں۔ باپ اور بیٹے، بھائی اور بھائی، مائیں اور بیٹیاں، سب ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھ کر علانیہ بوس و کنار اور اختلاط و ملاعبت کے مناظر دیکھتے ہیں اور کوئی شرم محسوس نہیں کرتے۔ انتہا درجہ کے گندے اور ہیجان انگیز گیت گھر گھر اور دوکان دوکان بج رہے ہیں اور کسی کے کان ان آوازوں سے محفوظ نہیں۔ ہندی اور فرنگی اعلیٰ سوسائٹی کی خواتین نیم عریاں لباسوں کے ساتھ پھر رہی ہیں اور نگاہیں ان لباسوں کی اس قدر خوگر ہوچکی ہیں کہ کوئی شخص ان میں کسی قسم کی بے حیائی محسوس نہیں کرتا۔ اخلاق کے جو تصورات مغربی تعلیم و تہذیب کے ساتھ پھیل رہے ہیں ان کی بدولت نکاح کو ایک فرسودہ رسم، زنا کو ایک تفریح، مردوں اور عورتوں کے اختلاط کو ایک ناقابل اعتراض بلکہ مستحسن چیز، طلاق کو ایک کھیل، ازدواجی فرائض کو ایک ناقابل برداشت بندھن، توالد و تناسل کو ایک حماقت، شوہر کی اطاعت کو ایک نوع کی غلامی، بیوی بننے کو ایک مصیبت اور معشوق بننے کو ایک خیالی جنت سمجھا جارہا ہے۔

پھر دیکھئے کہ اس ماحول کے اثرات آپ کی قوم پر کیا پڑ رہے ہیں۔ کیا آپ کی سوسائٹی میں اب غضِ بصر کا کہیں وجود ہے؟ کیا لاکھوں میں ایک آدمی بھی کہیں ایسا پایا جاتا ہے جو اجنبی عورتوں کے حسن سے آنکھیں سینکنے میں باک کرتا ہو؟ کیا علانیہ آنکھ اور زبان کی زنا نہیں کی جارہی ہے؟ کیا آپ کی عورتیں بھی تبرج جاہلیہ اور اظہار زینت اور نمائش حسن سے پرہیز کررہی ہیں؟ کیا آج آپ کے

گھروں میں ٹھیک وہی لباس نہیں پہنے جا رہے ہیں جن کے متعلق آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ نساءٌ کاسیاتٌ عاریاتٌ ممیلاتٌ مائلاتٌ کیا آپ اپنی بہنوں اور بیٹیوں اور ماؤں کو وہ لباس پہنے نہیں دیکھ رہے ہیں جن کو مسلمان عورت اپنے شوہر کے سوا کسی کے سامنے نہیں پہن سکتی؟ کیا آپ کی سوسائٹی میں فحش قصے اور عشق و محبت کے گندے واقعات بے تکلفی کے ساتھ کہے اور سنے نہیں جاتے؟ کیا آپ کی محفلوں میں لوگ خود اپنی بدکاری کے حالات بیان کرنے میں بھی کوئی شرم محسوس کرتے ہیں؟ جب حال یہ ہے تو فرمائیے کہ طہارت اخلاق کا وہ پہلا اور سب سے زیادہ مستحکم ستون کہاں باقی رہا جس پر اسلامی معاشرت کا ایوان تعمیر کیا گیا تھا؟ اسلامی غیرت تو اب اس حد تک مٹ چکی ہے کہ مسلمان عورتیں صرف مسلمانوں ہی کے نہیں کفار تک کے ناجائز تصرف میں آرہی ہیں۔ انگریزی حکومت میں نہیں مسلمان ریاستوں تک میں اس قسم کے واقعات علیٰ رؤس الاشہاد پیش آرہے ہیں۔ مسلمان ان واقعات کو دیکھتے اور سنتے ہیں، مگر ان کے خون متحرک نہیں ہوتے۔ ایسے بے غیرت مسلمان بھی دیکھے گئے ہیں جن کی اپنی بہنیں کسی غیر مسلم کے تصرف میں آئیں اور انہوں نے فخریہ اس کا اظہار کیا کہ ہم فلاں بڑے کافر کے برادر نسبتی ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی بے حیائی اور اخلاقی انحطاط کا کوئی درجہ باقی رہ جاتا ہے؟

اب ذرا دوسرے ستون کا حال بھی دیکھئے۔ تمام ہندوستان سے اسلامی تعزیرات کا پورا قانون مٹ چکا ہے۔ زنا اور قذف کی حد نہ مسلمان ریاستوں میں جاری ہوتی ہے۔ نہ برٹش انڈیا میں۔ صرف یہی نہیں بلکہ جو قانون اس وقت ملک میں نافذ ہے وہ سرے سے زنا کو جرم ہی نہیں سمجھتا۔ اگر کسی شریف بہو بیٹی کو کوئی شخص بھگا کر بدکار بنانا چاہے تو آپ کے پاس کوئی قانونی ذریعہ ایسا نہیں جس سے اسکی عصمت محفوظ رکھ سکیں۔ اگر کوئی شخص کسی بالغ عورت پر اس کی رضامندی سے ناجائز تصرف کرے تو آپ کسی قانون کے ذریعہ سے اس کو سزا نہیں دلوا سکتے۔ اگر کوئی عورت علانیہ فحش کاری پر اتر آئے تو آپ کے پاس کوئی قوت ایسی نہیں جس سے آپ اس کو روک سکیں۔ قانون صرف زنا بالجبر کو جرم ٹھیراتا ہے، مگر جو لوگ قانون پیشہ ہیں ان سے پوچھئے کہ زنا بالجبر کا ثبوت دینا کس قدر مشکل ہے منکوحہ عورت کا بھگا لے جانا بھی جرم ہے۔ مگر انگریزی قانون جاننے والوں سے دریافت کیجئے کہ اگر منکوحہ عورت خود اپنی رضامندی سے کسی کے گھر جا پڑے تو اس کے لئے آپ کے فرمانرواؤں کی عدالت میں کیا چارہ کار ہے؟

غور کیجئے! یہ دونوں ستون منہدم ہو چکے ہیں۔ اب آپ کے نظم معاشرت کی پوری عمارت صرف ایک ستون پر قائم ہے۔ کیا آپ اسے بھی مسمار کر دینا چاہتے ہیں؟ ایک طرف پردے کے وہ نقصانات ہیں جن کو آپ نے اوپر گنایا ہے۔ دوسری طرف پردہ اٹھا دینے میں اخلاق اور نظام معاشرت کی کامل تباہی ہے۔ دونوں کے درمیان موازنہ کیجئے۔ مصیبتیں دونوں ہیں اور ایک کو بہرحال قبول کرنا ہے۔ اب آپ خود ہی اپنے دل سے فتویٰ طلب کیجئے کہ ان میں سے کون سی کم تر مصیبت ہے؟

پس اگر احوال زمانہ ہی پر فیصلہ کا انحصار ہے تو میں کہتا ہوں کہ ملک کے احوال پردے میں تخفیف کے نہیں اور زیادہ اہتمام کے مقتضی ہیں، کیونکہ آپ کے نظام معاشرت کی حفاظت کرنے والے دو ستون گر چکے ہیں اور اب تمام دار و مدار صرف ایک ہی ستون پر آپڑا ہے۔ تمدن اور معیشت اور سیاست کے مسائل آپ کو حل کرنے ہیں تو سر جوڑ کر بیٹھئے۔ غور کیجئے، اسلامی حدود کے اندر ان کے حل کی دوسری صورتیں بھی نکل سکتی ہیں۔ مگر اس بچے کھچے ستون کو جو پہلے ہی کافی کمزور ہو چکا ہے، اور زیادہ کمزور نہ بنائیے۔ اس میں تخفیف کرنے سے پہلے آپ کو کم از کم اتنی قوت پیدا کرنی چاہئے کہ اگر کوئی مسلمان عورت بے نقاب ہو تو جہاں اس کو گھورنے کے لئے دو آنکھیں موجود ہوں وہیں ان آنکھوں کو نکال لینے کے لئے پچاس ہاتھ بھی موجود ہوں

لہ یہ واقعہ جنوبی ہند کا ہے۔ میرے ایک دوست نے مجھے ایک اس سے بھی زیادہ افسوسناک واقعہ سنایا۔ مشرقی ہند میں ایک ضلع کی مسلمان عورت ایک بڑے دولت مند غیر مسلم کے ساتھ علانیہ تعلق رکھتی ہے اور اس کے نتیجہ میں اس نے بڑی جائداد حاصل کی ہے۔ میرے دوست کا بیان ہے کہ انھوں نے بارہا مقامی مسلمانوں، نام نہاد مسلمانوں، کو اس بات پر خوشی کا اظہار کرتے دیکھا ہے کہ غیر مسلم کے پاس سے "مسلمانوں میں" اتنی بڑی دولت آگئی!

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

مولوی تمیز الدین خاں مرحوم و مغفور

مولوی تمیز الدین خاں مرحوم کو میں نے سب سے پہلے کراچی کے سیرۃ النبیؐ کے جلسوں میں دیکھا، ایک ہی اسٹیج پر وہ بہ حیثیت صدر کے فروکش ہیں، اور میں مقررین اور شعراء کی صف میں بیٹھا ہوں، دُور ہی سے علیک سلیک ہو جاتی، ایک آدھ بار مصافحہ بھی ہوا، سرکاری عہدیداروں اور بڑے آدمیوں سے قریب ہونے کی میں نے کبھی کوشش نہیں کی، یہ دوسری بات ہے کہ ان لوگوں سے ملنے جلنے کے مواقع میری کوشش کے بغیر میسر آگئے! ہاں! یہ ضرور ہے کہ اسلامی وضع قطع کو دیکھ کر طبیعت اُن کی طرف کھنچتی تھی، مسٹر غلام محمد (سابق گورنر جنرل) نے جب اسمبلی کو توڑا ہے، اُس کے بعد مولانا ظفر احمد انصاری کے یہاں مولوی تمیز الدین خاں مرحوم کا آنا جانا رہا اور وہاں اُن سے ملنے کے موقعے بار ہا ملے! جب بھی مرحوم سے ملاقات ہوتی وہ بڑی شفقت اور محبت سے ملتے!

مولوی تمیز الدین خاں مرحوم جمعیۃ الفلاح کے سرپرست، صدر اور بانی تھے، جمعیۃ کی پارٹیوں اور جلسوں میں مولوی صاحب مرحوم سے ملاقات ہوتی رہتی۔ میں نے کئی بار اُن کی موجودگی میں نظمیں سُنائیں، اُن کی مادری زبان بنگالی تھی مگر اُردو شاعری سے وہ دلچسپی رکھتے تھے، ایک دفعہ جمعیۃ الفلاح میں نعتیہ مشاعرہ بھی ہوا، اور مولوی صاحب مرحوم آخر وقت تک مشاعرے میں بیٹھے رہے!

جمعیۃ الفلاح کی طرف سے ایک بار شب میں دعوت کا اہتمام ہوا، کھانے کے بعد مولوی تمیز الدین خاں نے اُردو میں تقریر فرمائی، بولے جمعیۃ الفلاح کے کسی جلسہ میں اتنا مجمع نہیں ہوا جتنا آج کی دعوت میں ہوا ہے، بھائی ہوا! لوگوں کی طبیعت کا یہی رنگ ہے تو اب جمعیت کے جلسے کے ساتھ کھانا بھی رہے گا، کیا کیا جائے ......! اُن کی تقریر بڑی دلچسپ تھی، سب لوگ مسکرانے لگے اور کوئی کوئی ہنس بھی دیا ــــــ مرحوم سے آخری ملاقات چند ماہ قبل جمعیۃ الفلاح کے ایک اجتماع میں ہوئی امریکہ کے سفیر کے علاوہ بعض دُوسرے سُفرا بھی اس جلسہ میں خصوصی مہمانوں کی حیثیت سے شریک تھے!

پاکستان کے مفلوج بدنام گورنر جنرل مسٹر غلام محمد نے جب پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کو توڑا ہے، وہ وقت مولوی تمیز الدین خاں کے لئے بہت نازک تھا۔ اُن کی کوٹھی کا ٹیلی فون کاٹ دیا گیا، سکندر مرزا جو اُن دنوں محکمہ فوج کے سکریٹری تھے مسٹر ابوطالب نقوی کے ساتھ مولوی صاحب مرحوم کے یہاں پہونچے، اور بڑی بدتمیزی سے گفتگو کی، انھوں نے کہا کہ مولوی صاحب! آپ اب اسمبلی کے اسپیکر نہیں رہے، آپ گورنر جنرل کے حکم کے خلاف عدالت میں چارہ جوئی نہ کریں، ورنہ آپ کو شدید نقصان پہونچنے کا احتمال ہے۔ مولوی صاحب نے نہایت سنجیدگی سے فرمایا کہ میں اپنا یہ معاملہ قانونی مشیروں کے سپرد کر چکا ہوں ....." یہ تک سننے میں آیا کہ مولوی صاحب مرحوم ان دنوں گرفتار ہوتے ہوتے رہ گئے! انھوں نے گورنر جنرل کے آرڈیننس کے خلاف اُس وقت عدالت میں دعویٰ دائر کیا جب استبداد کی تلوار لٹک رہی تھی! مولوی صاحب مرحوم کی اس جرأت نے پاکستان میں جمہوریت کی لاج رکھ لی، پاکستان کی تاریخ جب بھی لکھی جائے گی، مولوی تمیز الدین خاں کی عزیمت و استقامت کو ہر مورخ خراجِ عقیدت و منقبت پیش کریگا

مولوی صاحب مرحوم اپنے خاندان کے ضرورت مند لوگوں کی مالی امداد بڑی فراخ دلی کے ساتھ کیا کرتے تھے جس کے سبب آسمبلی کی صدارت کے زمانے میں بھی زیادہ خوشحال نہیں رہے، تنخواہ پوری کی پوری ٹھکانے لگ جاتی، اس حادثہ کے بعد وہ مالی مشکلات میں گھر گئے، اپنی زمین اور موٹر کار تک انہیں بیچ دینی پڑی، یہ زمانہ انھوں نے بڑے شکر و صبر کے ساتھ گزارا، پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ بنیادی جمہوریتوں کے واسطے سے جو انتخابات ہوتے تو اس میں وہ مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور قصر نشینوں کی خواہشوں اور کوششوں کے علی الرغم ارکانِ دستور ساز اسمبلی کی صدارت کے لئے انہی کا انتخاب کیا —— حق بہ حق دار رسید —— کس عزت، شان اور وقار کے ساتھ وہ اپنی چھنی ہوئی کرسی پر واپس آئے ہیں! ان کے لئے فضا کس قدر سازگار ہو گئی تھی، پاکستان کے دونوں حصوں کا انہیں کس درجہ اعتماد حاصل تھا۔ کس عزت و محبت کے ساتھ عوام میں ان کا ذکر ہوتا تھا۔

مولوی تمیز الدین خاں مرحوم حال ہی میں کئی ملکوں کا دورہ کرکے واپس آئے تھے، مریض تو وہ پہلے ہی سے تھے اور سب سے بڑا مرض تو ان کا بڑھاپا تھا، اس دورے نے شاید ان کے اعصاب کو متاثر کیا، بیمار پڑے، ہسپتال میں داخل ہوئے۔ مرنے سے ایک دن پہلے طبیعت بحال ہونے کی خبر اخباروں میں آئی اور دوسرے دن وہ اللہ کو پیارے ہو گئے! ان کے سوگ میں پاکستان کے جھنڈے جھکا دیئے گئے۔ ریڈیو میں گانے بجانے کا پروگرام بند کرکے قرآن کی تلاوت شروع کر دی گئی، بڑے بڑے لوگوں نے ان کی موت کو پاکستان کے لئے ناقابلِ تلافی حادثہ کہا، ہر طرف مرحوم کا ذکر، یہی چرچا، اخباروں نے ماتم کیا اور لیڈروں نے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مرنے سے پہلے وصیت کی کہ "میرے جنازے کا فوٹو نہ لیا جائے"۔ ان کی وصیت پوری کی گئی! —— اللہ اللہ! نزع کے عالم میں شریعت کا اس قدر پاس اور احترام!

مولوی تمیز الدین خاں مرحوم نے اس بے یقینی کے دور میں ثابت کرکے دکھا دیا بلکہ مثال قائم کر دی کہ ایمان کی قوت آج بھی کتنا بڑا کارنامہ انجام دے سکتی ہے، اور ایمانی طاقت کے آگے حکومتوں کو جھکنا اور تاریخ کو اپنا رُخ بدلنا پڑتا ہے! اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور آخرت میں انہیں صالحین کا قرب اور ہم نشینی نصیب ہو (آمین)

——×——

ہماری نظر میں!

اسلامی معاشرت تالیف :- ابوالبشیر پالوا، ضخامت ۴۳۶ صفحات (مجلد گردپوش کے ساتھ) ہدیہ :- پانچ روپے
ملنے کا پتہ :- پالوا برادرس ناشران تسہیل القرآن ۴۲/۲ ایل پاکستان ایمپلائز ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی ۲۹

"اسلامی معاشرت" کا آغاز اس "تعارف" سے ہوتا ہے :-

"مضامین قرآنی کو عام فہم سلیس اردو زبان میں مرتب کرنے کا یہ کام جنوری ۱۹۴۲ء میں دہلی میں شروع کیا گیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کی اشاعت کی صورتیں پیدا فرمائیں اور اب تک بحمداللہ اس کے پانچ حصے (ایمان، پیدائش، مذہب، سیاست بعنوان آئینِ خداوندی اور معاشرت) شائع ہو چکے ہیں، جن میں سے حصہ معاشرت آپ کے ہاتھوں میں ہے باقی ماندہ پانچ حصے (اقتصادیات، تبلیغ، قصص القرآن، سائنس اور متفرق) بھی طباعت کے لئے تیار ہیں، جو رفتہ رفتہ شائع ہوتے رہیں گے۔

جناب مولانا ابوالبشیر محمد حسین پالوا نے دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم کے ساتھ عمل کی بھی توفیق عطا فرمائی ہے، اُن کی صورت وضع قطع، گفتگو اور نشست و برخاست سے طبیعت متاثر ہوتی ہے، دین اور ملّتِ اسلامیہ کی خیرخواہی کا موصوف اپنے اندر جذبہ اور بڑی تڑپ رکھتے ہیں' اُن کی تالیف "تسہیل القرآن" اسی دینی تڑپ اور مذہبی جذبہ کی زندہ یادگار ہے فاضل مولف نے اس کتاب کی ترتیب، تالیف اور تبویب میں بڑی محنت اور جانفشانی سے کام لیا ہے اور وہ تقریباً پچیس سال سے اسی نیک کام میں لگے ہوئے ہیں، انھوں نے قرآنِ کریم کے مضامین کو "تسہیل الفرقان" کے نام سے مختلف عنوانات کے تحت آسان اور عام فہم اُردو ترجمہ کے ساتھ مرتب کیا ہے، مثلاً اس کتاب کا پہلا باب محاسبہ اعمال ہے، اس کے ذیلی عنوانات حسب ذیل ہیں :-

٭ — دعوتِ فکر و تصحیح نیت —— اعمال لکھے جاتے ہیں — جزا و سزا —— مومنوں کے اعمال، کفار کے اعمال —

ہر عنوان کے تحت قرآنی آیت کا ترجمہ کر دیا ہے۔ پوری کتاب کا یہی رنگ ہے۔ قرآنی آیات کے ساتھ عنوان کی مناسبت سے احادیثِ نبوی بھی درج کی ہیں' اور جہاں ضرورت محسوس کی ہے وہاں خود فاضل مولف نے فوائد بھی لکھے ہیں اور دوسرے مفسرین کی عبارتیں بھی نقل فرمائی ہیں، خاص طور سے مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سے "تسہیل الفرقان" میں بہت کچھ اخذ و استفادہ کیا گیا ہے —

صفحہ ۵۲ پر یہ شعر درج ہے :-

محمدؐ سے شانِ خدا پوچھو اور خدا سے پوچھو شانِ محمدؐ

جو بحر اور وزن سے خارج ہے' اسے کتابت کی غلطی پر محمول نہیں کیا جا سکتا!

"پھر وہ سبزہ زور و شور پر آتا ہے، پھر تمہارے دیکھتے دیکھتے زرد ہو جاتا ہے، اور پھر روندا ہوا گھانس ہو کر رہ جاتا ہے" (ص ۵۸)

"زوروں پر آتا ہے"۔ یہ روزمرہ نہیں ہے، اس کے علاوہ "ر دندا ہوا گھانس" کی جگہ "روندی ہوئی گھانس" لکھنا چاہیئے تھا۔
صفحہ ۶۲ پر "پیار و محبت" نظر آیا۔ اُردو اور عربی و فارسی لفظوں کے درمیان نہ اضافت آتی ہے اور نہ عطف!

"وہ عزیز بار کو احسان جتاتی ہیں" (ص۶۲) "کو" نہیں "پر" کا محل تھا ——— "اور اُن کی مثال اُس پتھر کی ہوگی جس پر تھوڑا سا گرد ہو" ——— "گرد" بالاتفاق مذکر ہے ——— قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرماتا ہے، وہاں ترسین میں "اے میرے حبیب" لکھا ہے "اے نبی!" لکھنا چاہیئے تھا۔

"قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ" کا ترجمہ ——— بلاشبہ وہ لوگ خسارہ پا گئے ۔ ۔ ۔ ۔ " (ص۳۲) خسارے کے ساتھ "پانا" کھٹکتا ہے، "خسارے میں پڑ گئے"۔ یہ ترجمہ زبان و بیان کے اعتبار سے بہتر ہے۔ صفحہ ۳۳ پر "فَمَنِ اضْطُرَّ" کا ترجمہ "جو کوئی بھوک کی شدت سے بے قرار ہو جائے" درست نہیں ہے "بے قرار ہو جائے" کی جگہ "لاچار ہو جائے یا مجبور ہو جائے" ترجمہ کرنا چاہیئے تھا ——— صفحہ ۳۴۷ پر "حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ" کا ترجمہ "اعمال ناپید ہو جاتے ہیں" کیا گیا ہے۔ زیادہ صحیح ترجمہ "اعمال برباد ہو گئے" یا "اعمال ضائع ہو گئے" ہے۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
"تم اپنی آنکھوں کو ان قسم قسم کی چیزوں کی طرف مت پسارو، جو اللہ تعالیٰ نے کافروں اور مختلف قسم کے لوگوں کو دنیا کی زندگی کو رونق بنا کر برتنے کو دی ہیں" ۔ ۔ ۔ (ص۳۹۷)

فاضل مرتب نے "لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ" کا ترجمہ "آنکھوں کو مت پسارو" کیا ہے، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے بھی "آنکھوں کو پسارنا" ہی لکھا ہے، ممکن ہے اب سے ۵۰ ۔ ۶۰ برس پہلے آنکھوں کے لئے پسارنا بولتے ہوں مگر آج کل روزمرہ دامن پسارنا، ہاتھ پسارنا، اور پاؤں پسارنا ہے "آنکھ پسارنا" کوئی نہیں بولتا ——— اس آیت کی ترجمانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ان لفظوں میں کی ہے:۔

"اور نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھو دُنیوی زندگی کی اس شان و شوکت کو جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو دے رکھی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

صفحہ ۴۱۳ پر ایک باب کا عنوان "راگ رقص" ہے، اس کا عنوان یوں ہونا چاہیئے تھا۔

"لہو و لعب (راگ رنگ)"

"لہو الحدیث" میں ہر وہ خوش فعلی شامل ہے، جس سے انسان کے سفلی جذبات کو غذا ملتی ہو، اور وہ تفریح بھی جس میں اتنا انہماک ہو جائے کہ آدمی نماز روزے یعنی حقوق اللہ اور حقوق العباد سے غافل ہو جائے۔

پاکستان اور ہندوستان کے متعدد علماء نے اس کتاب کو سراہا ہے، جن کی قیمتی رائیں "اسلامی معاشرت" کی زینت ہیں، جناب ابوالبشر صاحب پالوا کو اللہ تعالیٰ اس محنت، جذبہ اور لگن کا اجر عطا فرمائے گا۔

موضوعاتِ کبیر
از:۔ مُلّا علی قاری۔ ترجمہ:۔ مولانا حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی۔ ضخامت ۶۰۸ صفحات (مجلد، رنگین گرد پوش) قیمت مجلد آٹھ روپے۔
ملنے کا پتہ:۔ قرآن محل، مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی۔

محدثین و علماء کا یہ بہت بڑا علمی کارنامہ ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے ضبط و حفظ کی امکانی

کوشش کی اور دُوسری طرف اُمت میں ایسے ناقدین پیدا ہوئے جنھوں نے اقوال اور روایتوں کو جانچا، پرکھا، اور جس روایت اور راوی میں کسی قسم کی کمزوری محسوس کی اُسے ظاہر کردیا، دُنیا میں کسی انسان کے اقوال وارشادات اور اُس سے منسوب روایتوں کو محفوظ رکھنے اور انہیں پرکھنے کے لئے اس قدر اہتمام نہیں کیا گیا، جس قدر اہتمام احادیثِ نبوی کے حفظ و صحت کے لئے کیا گیا ناقدین نے بتا دیا ہے کہ احادیث کی لڑیوں میں سچے موتیوں کے ساتھ کہاں کہاں جھُوٹے نگینے بھی شامل ہوگئے ہیں! ابن جوزی، احمد بن حنبل، نووی، ابن حجر عسقلانی، صغانی، ابن تیمیہ (رحمہم اللہ تعالیٰ) وغیرہ محدثین اور ناقدین نے احادیث کے جانچنے اور پرکھنے کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے، ان میں مُلّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ بھی ایک معروف شخصیت رکھتے ہیں، جن کی "الموضوعات الکبیر" بہت مشہور کتاب ہے!

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کاندھلوی نے اس کتاب کا اُردو میں ترجمہ فرماکر اور محمد سعید اینڈ سنز نے اسے چھاپ کر اُردو جاننے والوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

یہ حدیث ــــ علماء اُمتی کانبیاء بنی اسرائیل ــــ کتنی مشہور ہے مگر عسقلانیؒ کہتے ہیں کہ اس کی کوئی اصل نہیں، یہی زرکشی رح کا خیال ہے، سیوطیؒ نے اس سے سکوت اختیار کیا ہے!

"العلم علمان علم الادیان وعلم الابدان" ــــ خلاصہ میں ہے یہ بھی موضوع ہے ــــ روی مسلسلاً عن الحسین عن حذیفہ سالت النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن علم الباطن ما ھو فقال سالت جبریل عنہ فقال عن اللہ ھو سر بینی وبین احبائی واولیائی واصفیائی اودعہ فی قلوبھم لا یطلع علیہ ملک مقرب ولا نبی مرسل قال العسقلانی ھو موضوع والحسن ما لقی حذیفہ۔

حضرت حذیفہؓ سے مسلسل روایت کیا گیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ علم باطن کیا ہے، حضورؐ نے فرمایا میں نے جبرئیلؑ سے دریافت کیا تھا۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فرمایا کہ یہ (علم باطن) میرے اور میرے دوستوں، اولیاء اور نیک لوگوں کے درمیان ایک راز ہے، جو میں ان کے دل میں ودیعت کرتا ہوں، جس پر نہ کوئی مقرب فرشتہ مطلع ہوا اور نہ کوئی نبیِ مرسلؐ ــــ امام عسقلانی فرماتے ہیں یہ موضوع ہے، اور حسن بصری نے حذیفہ سے ملاقات نہیں کی۔

"الفقر فخری" کو حدیث کی حیثیت سے کس قدر شہرت حاصل ہے، امام عسقلانی فرماتے ہیں، یہ باطل ہے موضوع ہے ــــ امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں ـ "ھو کذب" (یہ جھوٹ ہے)

"فی الحرکات البرکات" (حرکت میں برکت ہے) یہ بعض سلف کا کلام ہے حدیث نہیں ہے جیسا کہ ابن الربیع کا قول ہے، رسالہ قشیریہ میں ہے کہ میں نے استاد ابو علی سے سُنا وہ فرماتے تھے لوگوں کا قول ہے کہ "حرکت میں برکت ہے"۔

"القلب بیت الرب" دل خدا کا گھر ہے ـ اس کی مرفوعاً کوئی اصل نہیں ہے، جیسا کہ سخاویؒ فرماتے ہیں، زرکشی کہتے ہیں اس کی کوئی اصل نہیں، ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں، یہ موضوع ہے۔۔۔!

• ــ الصلوٰۃ خلف العالم باربعۃ آلاف واربعمایۃ و اربعین صلوٰۃ۔ عالم کے پیچھے نماز پڑھنے سے چار ہزار چار سو چالیس نمازوں کا اجر ملتا ہے ــــ یہ باطل ہے!

• ــ السر عند الاحرار راز آزاد لوگوں کے پاس ہے۔

ــــ اور ــــ

صدور الاحرار قبور الاسرار　　آزاد آدمیوں کے سینے رازوں کی قبریں ہیں ۔

یہ دونوں قول حدیث نہیں ہیں ——— بلکہ بعض نیک لوگوں کا کلام ہے ۔

لبس الخرقه الصوفیه وکون الحسن البصری　　صوفیاء کا خرقہ پہننا اور حسن بصری نے اس خرقہ کو حضرت

لبسه من علی　　علیؓ سے پہنا ۔

ابن وجیہ اور ابن الصلاح فرماتے ہیں یہ باطل ہے اور اسی طرح امام عسقلانی کہتے ہیں کہ ان کی سندوں میں کوئی سند بھی ایسی نہیں جو ثابت ہو اور اس مضمون پر کوئی حدیث جو صحیح ، حسن یا ضعیف ہو موجود نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی صحابی کو خرقہ اس شکل میں پہنایا ہو جو صوفیاء میں متعارف ہے اور نہ کسی صحابی کو اس فعل کا حکم دیا اور جو اس بارے میں روایتیں بیان کی جاتی ہیں وہ سب باطل ہیں ' پھر حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ان تہمت لگانے والوں کے جھوٹ میں یہ بات بھی موجود ہے کہ حضرت علیؓ نے یہ خرقہ حضرت حسن بصریؒ کو پہنایا ، حسن بصری ائمہ حدیث میں شمار ہوتے ہیں ' لیکن تمام محدثین اس پر متفق ہیں کہ حسن بصری کو حضرت علیؓ سے سماع حاصل نہیں (یعنی حسن بصریؒ نے حضرت علیؓ سے کوئی روایت نہیں سنی کجا کہ حضرت علیؓ کا ان کو خرقہ پہنانا)

• —— لسان اهل الجنة العربية والفارسية الدرية　　اہل جنت کی زبان عربی اور عمدہ فارسی ہوگی —— یہ موضوع ہے!

• —— من عرف نفسه فقد عرف ربه　　جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا ، اس نے خدا کو پہچان لیا ۔

ابن تیمیہؒ کہتے ہیں ' یہ موضوع ہے ، سمعانیؒ کہتے ہیں یہ حدیث مرفوعاً نہیں پہچانی جاتی ، امام نوویؒ فرماتے ہیں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تو ثابت نہیں لیکن معنیٰ اس کے صحیح ہیں !

الولد سر لابیه ——— سخاوی کہتے ہیں کہ اس کی کوئی اصل نہیں ، زرکشی نے بھی ان سے پہلے یہی تحریر کیا تھا ۔

• —— حدیث —— ولدت فی زمن الملک العادل　　میں ملک العادل کے زمانہ میں پیدا ہوا ہوں ۔

سخاوی کہتے ہیں اس کی کوئی اصل نہیں ، زرکشی کہتے ہیں یہ جھوٹ ہے ، سیوطیؒ کہتے ہیں بیہقی شعب الایمان میں فرماتے ہیں ہمارے شیخ ابو عبد الحافظ ان روایات کے بطلان کے قائل تھے کہ جو بعض جہلاء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ میں ملک العادل یعنی نوشیروان کے زمانے میں پیدا ہوا ۔

" موضوعات کبیر " پڑھ کر اس کا اندازہ ہوا کہ بعض نیک لوگوں کے اقوال اور نصیحت کی باتیں حدیث کے نام سے مشہور ہو گئیں مثلاً یہ خلق الله التربة یوم السبت " (اللہ تعالیٰ نے مٹی کو ہفتہ کے دن پیدا فرمایا) قول تو ہے کعب الاحبار کا اور مشہور ہو گیا حدیث کے نام سے ! ——— اس کتاب سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کتنی ضعیف اور انتہائی مجروح روایتیں ہیں جن کو دیلمی نے قبول کر لیا ہے !

فاضل مترجم نے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ پر بھی تنقید فرمائی ہے ۔

" ملا علی قاری کے نزدیک ہر ضعیف روایت قابل قبول ہے ' اس حد تک تو خیر کچھ زیادہ اختلاف نہ ہوتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ملا علی قاری کی یہ سعی ہوتی ہے کہ موضوع کو درجہ ضعیف تک پہونچا دیا جائے ، اور ضعیف کو درجہ حسن تک ——— میں نے اپنے والد مرحوم مفتی اشفاق الرحمٰن سے بارہا سنا کہ ملا علی قاری اور جلال الدین سیوطی ضعف پرست ہیں "

" موضوعات کبیر " کا اردو ترجمہ ، اردو دنیا کے لئے بہت بڑی نعمت ہے !

فخرِ کونین

از :- محشر رسول نگری   ضخامت ۱۹۲ صفحات   (مجلد ، گرد پوش کے ساتھ)

قیمت :- پانچ روپے   ملنے کا پتہ :- پنجاب بک ڈپو ، سرکلر روڈ ، لاہور۔

جناب محشر رسول نگری مشہور تعمیر پسند اور اسلام دوست شاعر ہیں۔ انھوں نے مسدس کے انداز پر "فخرِ کونین" ، خلاصۂ موجودات نبیٔ آخر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مقدس سیرت کو نظم کیا ہے! ان کی اس منظوم سیرت میں جوش ، روانی ، اخلاص ، سوز و دردمندی اور تاثیر پائی جاتی ہے۔ بعض مقامات پر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روح القدس نے سچ مچ اُن کی تائید کی ہے!

اس کتاب پر جناب مختار صدیقی نے جو دیباچہ لکھا ہے وہ اس کتاب کے شایانِ شان ہے، یہ دیباچہ شاعر اور اس کے کلام کا خاصہ حسین تعارف ہے! دیباچے میں کہیں کہیں کھٹک محسوس ہوئی!

"جس ہستی کو پیدا کرنے کے لئے تخلیق کا طول طویل کھیل رچایا گیا۔" (ص۱۹) اول تو "کھیل رچانا" ہی محلِ غور ہے، پھر تخلیقِ کائنات کو "کھیل" کہنا دینی نقطۂ نگاہ سے صحیح نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے جو بزمِ تخلیق کو برپا کیا ہے، کائنات کو سجایا ہے، یہ "کھیل" نہیں ہے —— "کیونکہ اس جوش میں اس والہانہ شیفتگی کی مسلسل ناصبوری اور اَن مٹ تڑپ ہے۔" (ص۳۱) "والہانہ شیفتگی کی مسلسل ناصبوری" یہ کیا بات ہوئی! —— "اس طرح ہر بند فی ذاتہٖ بھی ڈرامائی ہیئت (ابتدا ، وسط اور انتہا) رکھتا ہے ، اور سارے بند مل کر نظم کو بھی ڈرامائی ہیئت ، دل چسپی ، تحیر کا عنصر ، الجھاؤ ، عروج اور سلجھاؤ عطا کرتے ہیں۔" (صفحہ ۳۲) اس عبارت میں کس قدر ناپختگی پائی جاتی ہے! "فی ذاتہٖ بھی" میں "بھی" کتنا اکھڑا اکھڑا لگتا ہے، اور یہ پہلی بار معلوم ہوا کہ مسدس کا ہر بند نظم کو سلجھاؤ کے ساتھ "الجھاؤ" بھی عطا کرتا ہے —— کس قدر گنجلک اور مبہم ہے یہ فکر اور اندازِ بیان! پھر "تحیر کا عنصر" ایک اور بے جوڑ بات ہے جو اس مختصر سی عبارت میں کہی گئی ہے۔

"فخرِ کونین" کے منتخب اشعار :-

آئینِ روزگار کی تشکیل ہو چکی ——— مدت ہوئی کہ دین کی تکمیل ہو چکی
آیاتِ بینات کی تنزیل ہو چکی ——— دنیا میں بند آمدِ جبریلؑ ہو چکی
انسانیت کا اُسوۂ کامل حضورؐ ہیں
اس کاروانِ زیست کی منزل حضورؐ ہیں

روشن ہے نقشِ سیدِ ابرارؐ آج بھی ——— محفوظ ہے حضورؐ کا کردار آج بھی
سنتے ہیں کان آپ کی گفتار آج بھی ——— نظروں میں ہے وہ عالمِ انوار آج بھی
اک اک ادا حضورؐ کی مشہود ہے یہاں
میرا رسولؐ ، آج بھی موجود ہے یہاں

قائم اسی سے دعوتِ حق کا وقار تھا ——— یہ اعتبار عالمِ نا اعتبار تھا

گزرا نہ ایک پل بھی کلی دل کی کھل گئی ——— اک بے نوا کو دولتِ بیدار مل گئی

ایک ایک لمحہ ان کا خدا کی نظر میں ہے ——— گوہر کی آبرو بھی تو آبِ گہر میں ہے

سن لیں وہ جن کو اپنی تجارت پہ ناز ہے ——— "حسنِ معاملہ" میں ترقی کا راز ہے

دونوں طرف تھا صدق و صفا کا مظاہرہ ——— طاہر تھے "الامیںؐ" تو خدیجہؓ تھیں طاہرہ

ہر چیز اس جہاں کی سرابِ ظہور تھی ؎ — جتنی حسیں تھی اتنی حقیقت سے دور تھی
مدت ہوئی کہ جادۂ تسلیم کھو گیا — ان ظلمتوں میں دینِ براہیم کھو گیا
ہر گام۱؎ پہ ہے منفعل ادراکِ آدمی — ہے آفتابِ وحی کی محتاج زندگی
طبعِ سلیم کرتی ہے بس اتنی پیروی — جتنی شبِ سیاہ میں جگنو کی روشنی

عقدے کھلے نہ عقل سے توحیدِ ذات کے !
سربستہ کتنے راز ہیں اس کائنات کے

دستورِ کائنات کا عنواں ہے لا الٰہ — انسانیت کے درد کا درماں ہے لا الٰہ
اس زندگی کا نکتۂ پنہاں ہے لا الٰہ — دل ہے صدف تو گوہرِ ایماں ہے لا الٰہ

باطل کے در پہ ناصیہ سائی روا نہیں
جز ذاتِ حق کسی کی خدائی روا نہیں

توریت نے جلائے تھے نیکی کے جو چراغ — توحید کی شراب سے چھلکے تھے جو ایاغ
انسان کو ملا تھا حقیقت کا جو سراغ — حق کی شمیم سے مہک اٹھے تھے جو دماغ

دنیائے آب و گل میں کسی کا نشاں نہ تھا !
باقی کوئی بھی نقش تہِ آسماں نہ تھا !

حق کے معاملہ میں یہ کوتاہ دست تھے — ذہن ان کے ابتدا سے مظاہر پرست تھے
اہلِ عرب نے دینِ حقیقی بھلا دیا — ہر ماسوا کے سامنے سر کو جھکا دیا
رشتہ بتوں کا ذاتِ خدا سے ملا دیا — ان کو شریکِ حاکمِ مطلق بنا دیا

پھر تو قدم قدم پہ صنم خانے بن گئے
لات و ہبل کے سینکڑوں افسانے بن گئے

شامل تھے ان میں ایسے بھی احباب و اقربا — رہتا تھا جن سے آپ کا ہر وقت سابقہ
ایک ایک لمحہ آپ کا ان کی نظر میں تھا — ایمان سب سے پہلے وہی لائے برملا

ہر بات بے دریغ انھوں نے قبول کی !
کتنی قوی دلیل ہے صدقِ رسولؐ کی !

یوں معشرِ قریش سے بولے وہ دیدہ ور۲؎ — تمثیل تھی یہ میری نبوت کی سر بسر
جس طرح دیکھتا ہوں میں ٹیلے خشک و تر — رکھتا ہوں یونہی عالمِ غیبی پہ میں نظر
محکم ہوا شعورِ حقیقت جفا کے بعد — نکھرا یہ چاند اور بھی کالی گھٹا کے بعد

۱؎ یہ مصرعہ اس انداز کا ہونا چاہیے تھا۔

؎ وہم و گماں کے موڑ پہ حیراں ہے آدمی

۲؎ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "دیدہ ور" نہیں کہنا چاہیے۔ یہ تو ایک عام آدمی کی صفت ہے۔

گو سہل تھا نہ ترکِ وطن کا معاملہ — ایماں تھا زادِ راہ، توکل تھا راحلہ
نکلا خدا کی راہ میں چھوٹا سا قافلہ — تھا سخت اگرچہ صبر و رضا کا یہ مرحلہ
دامن کشاں تھا عشق خدائے جلیل کا
نقشہ کھنچا تھا ہجرتِ لوطؑ و خلیلؑ کا
دانش متاعِ سود و زیاں تولنے لگی — قدرت کسی کے دل کی گرہ کھولنے لگی
ہجرت کے مرحلے سے گزارے گئے ہیں سب — اس آگ میں تپا کے نکھارے گئے ہیں سب
پاکیزہ رو، کشادہ[1] رُخ و صاحبِ جمال — ٹھیرے نگاہ چہرۂ انور پہ کیا مجال
پیوستہ وہ بھویں، وہ گھنیرے سیاہ بال — انداز پُر شکوہ تو آواز پُر جلال
گفتار دل پذیر خموشی میں اک وقار
الفاظ جیسے سلک گہر کے آبدار

دوسرا رُخ:-

گزرا ہے سب سے پہلے جو راہِ نجات سے — سیکھو خدا کے خلق اسی حق صفات سے (ص ۲۸)

حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل ہزاروں انبیاء صراطِ مستقیم اور راہِ نجات سے گزر چکے ہیں!

گردوں ہوا ادب سے زمین بوسِ آستاں — اور بوسہ زن جبیں پہ ہوئی صبح ضوفشاں (ص ۳۲)

"بوسہ زن" کی ترکیب کتنی نامانوس ہے! مصرعہ ثانی میں "پہ" بھی کھٹکتا ہے۔

روح الامیں نے گائی تری نے میں تہنیت — ناگاہ آئی جوش میں قدرت کی مرحمت
دی مومنوں کو مشرق و مغرب کی سلطنت — روشن ہوئی جہان میں قندیلِ حریت

اس بند کے دوسرے مصرعہ کے بعد خواجہ الطاف حسین حالیؔ کا یہ مصرعہ پڑھیے۔

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت ـــــ

اس باب کا عنوان "ظہورِ قدسی" ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا سماں دکھایا گیا ہے، مگر ولادت باسعادت کے وقت لوگ مسلمان کب ہوتے تھے اور انہیں مشرق و مغرب کی سلطنت کہاں ملی تھی جو اس کا اظہار یوں ـــــ دی مومنوں کو مشرق و مغرب کی سلطنت ـــــ کیا گیا ہے۔

لیلیٰ کو ہو نوید کہ آئے شہِ اُمم — پرچم تمام ہو گئے دنیا کے سر بہ خم
شیرازہ شرع دیں کا ہوا آج پھر بہم — صدیوں کے بعد جاگ اٹھی قسمتِ حرم
اصنامِ کفر لرزہ بہ اندام ہو گئے
کافر شکارِ کاوشِ انجام ہو گئے (ص ۳۳)

"پرچم خم ہو گئے" روزمرہ ہے "پرچم سر بہ خم ہو گئے" پہلی بار پڑھنے میں آیا، پھر "دنیا" کی جگہ "شاہوں" لانا چاہیئے۔ حضورؐ کی ولادت کے وقت "شرع و دیں" کا شیرازہ بہم کب ہوا تھا، شریعت اور دین کی تعلیم کا آغاز تو حضورؐ کے اعلانِ نبوت

[1] "کشادہ جبیں" کہنا چاہیئے تھا، "رو" کی تعریف کے بعد "رُخ" کا ذکر تکرار ہے!

(بعثت) کے بعد ہوتا ہے ——— اس بند کا چھٹا مصرعہ کس قدر ناپختہ ہے " شکار کاوش انجام ہو جانا " یہ کیا بات ہوئی !

اللہ رے ولادتِ احمد کا دبدبہ سب خاک ہو کے رہ گیا شاہوں کا طنطنہ
ارباب جاہ گردِ رہِ کارواں ہوئے
اہلِ نشاں تھے جتنے بھی سب بے نشاں ہوئے

"ولادتِ احمدؐ کا دبدبہ" یہ انداز بیان ہی عجیب ہے، پھر شاہوں کے طنطنہ کا خاک ہو جانا عجیب تر ! اور حضورؐ کی ولادت کے وقت یہ واقعہ کب ظہور میں آیا تھا کہ تمام جاہ و دولت والے مٹ کر اور فنا ہو کر رہ گئے ۔ اور وہ بے نام و نشان ہو گئے !

اٹھے محیطِ عشق میں طوفاں نئے نئے کھلنے لگے وفا کے دبستاں نئے نئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کو اس استعارے کے ساتھ ظاہر کرنا کہ بحرِ عشق میں نئے نئے طوفان اٹھنے لگے تھے کوئی اچھا انداز بیان نہیں ہے ، اسی بند کے پانچویں مصرعے ؎

آئین کافری کا اثر گرد ہو گیا

میں تو یہی "آورد" پائی جاتی ہے ۔

ہوش و حواس نقش بہ دیوار ہو گئے قلب و نگاہ کشتۂ دیدار ہو گئے (ص۴۴)

حضورؐ کے پیدا ہونے کے بعد آپ کے دادا نے جب چہرہ انور کو پہلی بار دیکھا ، تو اس کیفیت کو اس طرح ظاہر کرنا کہ عبدالمطلب کے ہوش و حواس نقش بہ دیوار ہو کر رہ گئے اور قلب و نگاہ کشتۂ دیدار ہو گئے ——— واقعیت اور شاعرانہ انداز بیان دونوں اعتبار سے ناپسندیدہ ہے !

کتنا عجیب نام تھا ، کیا پیارا نام تھا کعبہ بھی شادکام تھا کیا پیارا نام تھا (ص۴۵)

مصرعہ ثانی نے پورے مصرعہ کو کمزور اور پھس پھسا بنا دیا ——— "کعبہ بھی شادکام تھا" یہ کتنی بے جوڑ بات کہی گئی ہے

روزِ ازل سے پہلے بھی مولائے کل تھے آپؐ آدم تھا ما و طین میں کہ ختم الرسل تھے آپ (ص۴۹)

جس حدیث کی اس شعر میں ترجمانی کی گئی ہے اس میں "کنت نبیا" آیا ہے "کنت ختم الرسل" نہیں آیا ۔ حضورؐ "ختم الرسل" تو دنیا میں بعثت کے بعد بنے ہیں ، جب تمام انبیاء کا ظہور ہو چکا !

ناگاہ چشمِ حق میں ابو طالب آ گئے حضرت سے کی جو اُن کو عقیدت جتا گئے (ص۵۸)

نومشقوں کا سا انداز بیان !

غرضیکہ جب خدیجہ سے طے پا چکے اُمور مکّے سے لے کے مالِ تجارت چلے حضورؐ (۶۲)

"غرضیکہ" سے اچھا تو "القصہ" تھا !

بعثت کے بعد پائی خدیجہ نے جب وفات مرحومہ کی جو چھیڑتا حضرت سے کوئی بات
سُنتے یہ چشمِ تر وہ پرستارِ حسنِ ذات کہتے تھے ذکر آپؐ بھی سردارِ کائنات
بھولے نہ اُس خیالِ دمساز کو کبھی
ظاہر پرست سمجھے نہ اس راز کو کبھی

پورا بند سپاٹ ہے ! پھر "ظاہر پرست" آخر کن لوگوں پر طنز ہے ، اور وہ کیا راز تھا جسے "ظاہر پرستوں نے نہیں سمجھا ! رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت خدیجہؓ سے شادی، اور حضرت خدیجہؓ کا "دمساز ہونا"، اور حضورؐ کا خدیجہؓ کی وفات کے بعد انہیں یاد فرمانا ـــــ ان میں سے کون سی بات آخر "راز" تھی!

ایثارِ نفس کی یہ اک اعلیٰ مثال ہے — انگلی سے مہر و مہ کو چھپانا محال ہے (ص ۴۹)

یہ کہاں کا محاورہ نظم کیا ہے کہ "انگلی سے مہر و مہ کا چھپانا محال ہے"!

تھیں سیرتِ خدیجہ میں حضرت کی جھلکیاں — اک وجہِ اشتراک تھی دونوں میں بے گماں (ص ۵۶)

دوسرا مصرعہ کس قدر بچکانہ ہے!

پھر سنگِ اسود آپ نے خود نصب کر دیا — ایک ایک بے بصر کو مذاقِ نظر دیا (ص ۴۲)

مصرعہ ثانی کا اس واقعہ سے آخر کیا تعلق ہے ــــــ سنگِ اسود کو کعبہ کی دیوار میں نصب کر دینے کے بعد جو جھگڑا مٹ گیا تھا، اس کی وجہ سے کفارِ قریش میں کیا "مذاقِ نظر" پیدا ہو گیا تھا ــــــ یہ کیا کہ جو خیال ذہن میں آیا اسے نظم کر ڈالا۔

کرتے تھے آپ غور نظامِ حیات میں — کیا حکمتیں ہیں سلسلۂ کائنات میں
کیوں شرک ہو رہا ہے خدا کی صفات میں — کیا کیا مواقعات ہیں توحیدِ ذات میں

چوتھا مصرعہ مبہم اور نا پختہ ہے! "مواقعات" نے شعریت کا خون کر دیا۔

سمجھے تھے وہ بتوں کو شفیعِ خدائے پاک — شاید نہ تھا عرب میں کوئی مردِ ہوشناک (ص ۶۷)

"ہوشناک" کتنی وحشت ناک ترکیب ہے۔

چھوڑا بتوں کو مسلکِ تسلیم کے لئے — مضطر رہا طریقِ براہیم کے لئے

"تسلیم" تنہا عام طور پر اردو میں "سلام و آداب" کرنے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ "مسلکِ تسلیم و رضا" کہنا چاہیئے تھا۔ "مضطر" مجبور و ناچار کو کہتے ہیں، "مضطرب" بے قرار کو نہیں کہتے۔

جھنجلا اٹھے جو اس کی تقاریر سے تمام — بے چارہ بن گیا ہدفِ تیرِ انتقام (ص ۸)

اندازِ بیان کس قدر خام اور غیر موثر ہے!

اٹھا عرب سے عفت و عصمت کا اعتبار — دامن ہوا شعورِ طہارت کا تار تار (ص ۹)

"شعورِ طہارت" پھر اس کا دامن اور اس کا تار تار ہونا، آورد ہی آورد!

ظلمت بڑھی تو اور ضیا بار ہو گیا — ہر ایک نذرِ آتشِ رخسار ہو گیا (ص ۱۳۲)

آتشِ رخسار کی نذر ہو جانا ــــ یہ اندازِ بیان وجدان کو بُری طرح کھٹکتا ہے۔

یمن کا ایک جادوگر مکہ میں آتا ہے، کفارِ قریش اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جادو اتارنے اور آسیب کا خلل دور کرنے کے لئے بھیجتے ہیں، حضورؐ اسے قرآن کی آیات سناتے ہیں، جن کے سننے سے وہ بیحد متاثر ہوتا ہے، اس واقعہ کو شاعر نے نظم کیا ہے ؎

بولا حضورؐ سے کہ دوبارہ سنا دیجئے
بیخود بنا دیجئے۔ مجھے بیخود بنا دیجئے!

مصرعہ ثانی نے اس واقعہ کے سارے اثر اور لطف ہی کو غارت کر دیا!

اس قسم کی کمزوریاں اس کتاب میں جگہ جگہ پائی جاتی ہیں ــــ مگر مجموعی طور پر "فخرِ کونین" پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہے،

جناب محشر رسول نگری نے اپنی شاعرانہ قوتوں کو برمحل صرف کیا ہے ـــــ مثلاً غارِ حرا میں حضور جو تحنث اور تفکر فرماتے تھے اس کا اظہار کس حسن و خوبی اور جوش قوت کے ساتھ کیا ہے۔

پکڑا کبھی نظر نے گریبانِ آفتاب　　آیا کبھی خرد میں کبھی دامنِ سحاب
تھا دستِ شوق میں کبھی دامانِ ماہتاب　　لیکن کسی سے پرسشِ مشکل کا تھا جواب

اک اعترافِ عجز تھا، اک انفعال تھا
سارا جہان خود ہی مجسم سوال تھا

اسی "یاسین" کا ایک اور بند کس قدر دلکش ہے۔

موجِ بہار، سبزۂ نو خیز و آبِ جو　　جامِ شرابِ شاہد و طوفانِ آرزو[1]
ہنگامہ نشاط و جوانانِ تازہ رو　　گلہائے نو بہار و حسینانِ مشک بو

ہر چیز اس جہاں کی سرابِ ظہور تھی
جتنی حسین تھی اتنی حقیقت سے دور تھی

حضرت سراقہؓ کو عہدِ فاروقی میں جو کسریٰ کے کنگن پہنائے گئے ہیں، اس کو کس قدر دلکش و موثر پیرایہ میں نظم کیا ہے۔

جلوہ فگن تھے تختِ خلافت پہ جب عمرؓ　　گونجے اذانِ حق سے مدائن کے بام و در
لایا گیا وہاں سے غنیمت کا مال و زر　　یہ پیش گوئی پوری ہوئی قصہ مختصر!

کسریٰ کے کنگن اور سراقہ کے ہاتھ میں
ہیں ساری عزتیں مرے مولا کے ہاتھ میں

دیوانِ درد　مرتبہ:۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ریڈر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات، قیمت تین روپیہ پچاس پیسے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر دہلی۔

جناب ظہیر صدیقی نے شعر و ادب کے گھرانے میں پرورش پائی ہے اور وہ علمی ماحول میں پروان چڑھے ہیں۔ تعلیم و تجربہ اور مشاغل نے شعر و ادب کے خاندانی ذوق کو اور نکھار دیا، موصوف متعدد کتابوں کے مصنف اور مولف ہیں۔ "دیوانِ درد" انھوں نے بڑے سلیقے سے مرتب فرمایا ہے اور اس پر تحقیقی اور عالمانہ دیباچہ لکھا ہے، جو بار بار پڑھنے کے لائق ہے۔

خواجہ میر درد کا ایک شعر ہے ؎

نہیں ممکن کہ ہم سے ظلمتِ امکان زائل ہو　　چھڑا دے آہ کوئی کیونکہ زنگی سے سیاہی کو

مصرعہ ثانی کا توارد حضرت شیخ سعدیؒ کے اس شعر کے دوسرے مصرعہ سے ہو گیا۔

ملامت از دلِ سعدیؔ فرو نشوید عشق　　سیاہی از حبشی کے رود کہ خود رنگ است

فاضل مرتب نے دیوانِ درد کے مختلف نسخوں کو دورانِ ترتیب میں پیشِ نظر رکھا ہے، اور ذیلی حاشیہ میں لفظوں کے ان اختلافات کو بھی درج کر دیا ہے جو ان نسخوں میں ملتے ہیں ـــــ مثلاً:۔

ذکر وفا کیجئے اس سے کہ واقف نہ ہو　　کہتے ہو کس سے یہ تم تک تو ادھر دیکھنا

[1] "طوفانِ آرزو" اس مصرعہ میں بے جوڑ لگتا ہے۔ جامِ شرابِ شاہد ہی کے جوڑ کے موزوں الفاظ لانے تھے۔

دوسرے نسخوں میں "کہ" کی جگہ "جو" ملتا ہے ——— اور "جو" ہی یہاں زیادہ موزوں ہے !

اس کتاب میں بعض متروکات کی فہرست اُن کے معنی کے ساتھ دی گئی ہے ، حیرت ہے کہ فاضل مرتب "پہنٹ" کو متروک قرار دیتے ہیں، اس سلسلہ میں "پرکھا" کے معنی ۔ پرکھو اور فکر ——— بتائے گئے ہیں حالانکہ "پرکھا" آزمائش و تجربہ کو کہتے ہیں اور "پرکھا کرنا" گلہ ، شکوہ اور شکایت کے معنی میں بولا جاتا ہے !

دیوانِ درد پھر اس پر ڈاکٹر ظہیر صدیقی کا فاضلانہ دیباچہ ، اور "نورٌ علیٰ نور" یہ کہ کتاب کا گیٹ اپ بہت خوب ہے ! یوں کہیے عروسِ جمیل کو لباسِ حریر میسر آگیا ہے ۔

رسولؐ نمبر خاتونِ پاکستان

مدیر :- شفیق بریلوی ، ضخامت ۴۰۰ صفحات ، (سرورق رنگین اور حسین و دلکش)
قیمت :- پانچ روپے ، ملنے کا پتہ :- دفتر خاتونِ پاکستان ۵ گارڈن روڈ ، کراچی ۳

خاتونِ پاکستان کا "رسول نمبر" بڑے اہتمام اور آب و تاب کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ہے جس نے آتے ہی ارباب نظر کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے ! اس کے لکھنے والوں میں چوٹی کے انشا پرداز اور علماء شامل ہیں، مضامین بلند پایہ اور متنوع ہیں ! حصہ نثر کے علاوہ منظومات کا حصہ بھی دلکش و حسین ہے ! اتنے اچھے نثر نگار اور شعراء کسی "خاص نمبر" کو کم ہی میسر آتے ہیں ! "رسولؐ نمبر" کی ترتیب میں شفیق صاحب نے بڑی خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے ، رسول نمبر کا ایک ایک ورق محبتِ رسولؐ کی خوشبو سے مہکا ہوا ہے ! مضامین میں جناب حسن مثنیٰ ندوی کا مقالہ خاص طور سے تحقیقی ہے ، جس میں انھوں نے دلائل و قرائن سے ثابت کیا ہے کہ حضرت ماریہ قبطیہ ، کنیز (جاریہ) نہ تھیں ، وہ دوسری ازواج النبیؐ کے برابر درجہ رکھتی تھیں ۔

نعتیہ غزلوں اور نظموں نے تو اس شمارۂ خاص کو "باغ و بہار" بنا دیا ہے ، ہندو شعراء کا نعتیہ کلام بھی اس میں شامل ہے ، اس باب کا "سرنامہ" یہ مصرعہ ہے ۔

اے کہ در مدحت نہ تنہا دوستاں رطب اللساں

چودھری غلام احمد پرویز کے مضمون کو دیکھ کر حیرت ہوئی ، کیا شفیق صاحب کو اس کا علم نہیں کہ علمائے کرام متفقہ طور پر اس شخص کو کافر قرار دے چکے ہیں ——— اس کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی کے نام اور اُس کے کلام کو رسول نمبر میں دیکھ کر اور زیادہ اذیت ہوئی ! اس صحیفۂ مصفا پر یہ بدنما داغ کیوں ؟

خاتونِ پاکستان کا "رسول نمبر" یقین ہے کہ عوام و خواص میں مقبول ہوگا ، اور اس کے مطالعہ سے قلب و نگاہ کو روشنی ملے گی ۔

نعت نمبر

ایڈیٹر :- عارف دہلوی (بی ۔ اے) ضخامت ۱۳۲ صفحات
قیمت ۷۵ پیسے ، ملنے کا پتہ :- دفتر ہفت روزہ "سیر و سفر" ملتان ۔

ہفت روزہ "سیر و سفر" علم و ادب اور دین و اخلاق کی قابلِ ذکر اور لائق قدر خدمت انجام دے رہا ہے ، اس جریدہ کا "نعت نمبر" بڑے اہتمام اور سلیقہ کے ساتھ شائع ہوا ہے ، جس میں عربی ، فارسی ، اُردو اور پنجابی شعراء کی منتخب نعتیہ غزلیں اور نظمیں شامل ہیں !

"نعت نمبر" کا آغاز مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے پیغام سے ہوتا ہے ، مولانا موصوف نے کتنی سچی اچھی اور کام کی بات کہی ہے :-

"آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے ہماری عقیدت و محبت کا اظہار ایک فطری اور مستحسن ذریعہ ہے بشرطیکہ اس میں حدودِ شرعیہ کو ملحوظ رکھا جائے، مشرکانہ عقائد و تخیلات سے اجتناب کیا جائے اور عشقیہ شعر و شاعری کی مبتذل ترکیبات و تلمیحات کو استعمال میں نہ لایا جائے۔"

حیرت ہے کہ اس غزل کو :-

بے حجابانہ درآ از درِ کاشانۂ ما
کہ کسے نیست بجز دردِ تو در خانۂ ما

کو "نعت" سمجھ کر منتخب کیا گیا ہے، یہ تو ایک عاشقانہ اور صوفیانہ غزل ہے، خاص طور سے اس شعر کو ؎

گر بگیر آید و پرسد کہ بگو رب تو کیست
گویم آنکس کہ ربود ایں دلِ دیوانۂ ما

"نعتِ رسول" سے کیا مناسبت ہے! پھر شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے جو فارسی دیوان منسوب ہے، وہ حضرت شیخ کا نہیں ہے، اور نہ یہ غزل اُن کی ہے، کوئی فارسی شاعر محیؔ تخلص کرتا تھا۔ اُس کے دیوان کو یار نے شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب کر دیا۔

حضرت امیر خسروؔ کی مشہور غزل ؎

نمی دانم کہ منزل بود شب جائیکہ من بودم

کو "نعت" کہنے میں ــــ راقم الحروف کو تامل ہے۔ ہاں! اُس کا مقطع نعتیہ ہے ؎

خدا خود میرِ سامان بود اندر لامکاں خسروؔ
محمد شمعِ محفل بود شب جائیکہ من بودم

اس غزل کا یہ شعر ؎

پری پیکر نگارے، سرو قدے، لالہ رخسارے
سراپا آفتِ جاں بود شب جائیکہ من بودم

خالص عشقیہ ہے! اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "پری پیکر نگارے" کہنا سوءِ ادب ہے، پھر "آفتِ جاں" پر مستزاد!

سیر و سفر کا "نعت نمبر" کوئی شک نہیں شعر و اخلاق کا سدا بہار گلدستہ ہے!

مرتب و ناشر :- مولانا حبیب احمد ندوی - ضخامت ۳۰ صفحات -
قیمت :- ایک روپیہ -
ملنے کا پتہ :- کتابی مرکز لمیٹڈ ۸۲۷ محمدی ہاؤس، میکلوڈ روڈ، کراچی -

مولانا محمد علی جوہر کے آخری الفاظ

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان کی آزادی کے نقیب اور ملّہ درد مند قائد تھے، آکسفورڈ کے گریجویٹ، انگریزی کے بلند پایہ انشا پرداز اور شعلہ نوا خطیب مگر دل سے اور سر سے پیر تک مردِ مومن! مولانا مرحوم نے یکم جنوری ۱۹۳۱ء کو لندن میں جو معرکہ آرا خط برطانوی وزیرِ اعظم کو

جو مولانا محمد علی مرحوم کے آخری الفاظ تھے، اس کتابچے کی زینت ہیں! یہ خطاب سے تیس برس پہلے کی ہندوستانی سیاست کا ایک مرقعہ پیش کرتا ہے! مولانا شوکت علی نے اس خطاب پر جو مقدمہ لکھا تھا' وہ بھی اس میں شامل ہے' مولانا حبیب احمد بدوہی جو مولانا شوکت علی مرحوم کے برسوں پرائیویٹ سکریٹری رہے ہیں اور کراچی میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انھوں نے یہ کتابچہ اپنے اہتمام سے شائع کیا ہے!

رئیس الاحرار مولانا محمد علی کے جنازے کے مختلف فوٹو اس کتابچے میں دیئے گئے ہیں' سرورق پر مولانا کی تصویر ہے جس پر اُن کے ہاتھ کا آٹوگراف بھی ہے!

———×———

کارمینا

درد شکم، بدہضمی، بھوک کی کمی،
اپھارہ، قبض، قے، دست،
ہضم کی خرابی ———

یہ اور معدہ اور جگر کے دوسرے امراض آج کل عام ہیں۔ اور ان شکایتوں کی وجہ سے نہ صرف صحتیں خراب رہتی ہیں بلکہ کاروبار اور زندگی کے دوسرے مشاغل پر بھی اثر پڑتا ہے۔ اچھا ہاضمہ اور صحیح معدہ اچھی صحت کا ضامن ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ آپ وہی ہیں جو کچھ آپ کھاتے ہیں۔ لیکن جب آپ کا کھایا ہوا جسم کو نہ لگے، اور جزوِ بدن ہوکر، خون بن کر آپ کو طاقت نہ پہنچائے تو کھانا پینا ہی بے کار نہیں ہوتا بلکہ اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا مشکل ہوجاتا ہے اور جینا دوبھر۔

ہمدرد کی لیباریٹریوں اور ہمدرد مطبوں میں چیدہ جڑی بوٹیوں اور ان کے قدرتی نمکیات پر طویل تجربات اور سائنسی تحقیقات کے بعد ایک متوازن اور مفید دوا "کارمینا" تیار کی گئی ہے جو ہضم کی جملہ خرابیوں کو دور کرنے میں خصوصیت رکھتی ہے۔ "کارمینا" معدے پر نہایت خوشگوار اثر کرتی اور اس کے افعال کو درست کرتی ہے۔ ہضم کے فعل کے لیے جو رطوبتیں ضروری ہیں کارمینا ان کو مناسب مقدار میں پیدا کرتی ہے۔ جگر کی اصلاح کرتی اور جگر کی جملہ خرابیوں کو درست کرتی ہے۔

سینے کی جلن، تیزابیت، پیٹ کا بھاری پن، تخمہ، بدہضمی، پیٹ کا درد، کھٹی ڈکاریں، درد شکم، متلی اور قے، بھوک کی کمی، قبض یا معدہ اور جگر کی دوسری بیماریوں میں "کارمینا" کا استعمال نہایت مفید ہوتا ہے۔

"کارمینا" نظامِ ہضم کو درست اور قدرتی کرنے کی یقینی دوا ہے۔ ہر موسم اور ہر آب و ہوا میں ہر مزاج کے لوگوں کے لیے فائدہ بخش اور مؤثر ہے۔ بلا خطر استعمال کی جا سکتی ہے۔

کارمینا ہر گھر کی ایک ضرورت ہے

کارمینا

ہمدرد

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی　ڈھاکہ　لاہور　چاٹگام

ماہنامہ فاران کراچی

جلد:- ۱۵

شمارہ:- ۷

ایڈیٹر:- ماہر القادری

ماہ اکتوبر ۱۹۶۳ء

ترتیب

قیمت فی پرچہ ۶۲ نئے پیسے

دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

چندہ سالانہ سات روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

شرک کتنا بڑا گناہ اور ظلم عظیم ہے، اس کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے :-

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا

ترجمہ :- اللہ بس شرک کو معاف نہیں کرتا، اس کے ماسوا جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لئے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے، اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھیرایا، اس نے بہت بہت بڑا جھوٹ گھڑا، اور بڑے سخت گناہ کی بات کی۔

یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان "شرک" کے بارے میں یوں گویا ہوتی ہے۔

واخراج احمد عن معاذ بن جبل قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تشرک باللہ شیئاً وان قتلت اورحرقت۔

امام احمد نے ذکر کیا کہ معاذ ابن جبل نے روایت کی مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چاہے تجھے قتل کیا جائے یا جلایا جائے مگر تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرانا۔

عقیدہ و عمل کے فساد میں شرک کے بعد "بدعت" کا نمبر ہے "بدعت" کیا ہے! اس کی ضلالت پر قول رسولؐ ناطق شہادت ہے۔

انّ خیر الحدیث کتابُ اللہ وخیر الھدیٰ ھدی محمدٍ وشرّ الامور محدثاتھا وکل بدعۃ ضلالۃ۔

(بہترین) کلام خدا کی کتاب ہے، اور راستوں میں بہترین راستہ محمدؐ کا راستہ ہے، اور بدترین باتیں (دین میں) نئی نکلی ہوئی باتیں ہیں اور (دین میں) ہر نئی نکلی ہوئی بات (یعنی بدعت) گمراہی ہے۔

کتاب اللہ کی جو آیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی جو دو حدیثیں اوپر درج کی گئی ہیں، ان میں نہ تو کسی قسم کا کوئی ابہام اور رمزیت ہے نہ کوئی تشابہ اور ذو معنویت ہے کہ جس کے بارے میں ایک سے زیادہ رائیں ہو سکیں اور جس کی تاویل و توجیہ کی ضرورت محسوس کی جائے! "شرک" وہ ظلم عظیم ہے جس کی مغفرت نہیں اور "بدعت" وہ برائی ہے جو ضلالت ہے اور ضلالت آدمی کو کشاں کشاں جہنم کی طرف ہی لے جاتی ہے۔

اللہ اور رسولؐ کے اس ارشاد کے بعد ایک مسلمان کو شرک و بدعت سے طبعاً وحشت اور نفرت ہونی چاہیئے، مردِ مومن کی فطرت شرک و بدعت کے کسی مظہر، رسم تصور و عقیدہ اور تاویل کو گوارا کر ہی نہیں سکتی، جس طرح نجاست کو دیکھ کر آدمی کی طبیعت میں نفرت پیدا ہوتی ہے اس سے زیادہ احساسِ نفرت شرک و بدعت کو دیکھ کر ہونا چاہیئے! شرک و بدعت کے مظاہر و رسوم میں جو کوئی عفو و درگزر سے کام لیتا ہے اُس کے ایمان میں کھوٹ پائی جاتی ہے۔

شرک و بدعت پر نکیر ایک فریضہ ہے، جس کا ادا کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے! یہ کوئی فرقہ وارانہ نزاع نہیں ہے، جو لوگ اپنی جہالت اور ہوائے نفس کے سبب شرک و بدعت میں مبتلا ہیں، وہ اگر کوئی فرقہ بنا لیں، یا اس قسم کے فاسد و گمراہ کن عقائد رکھنے والوں کی کوئی پارٹی، گروہ اور جمعیت بن جائے، تو یہ "گروہِ ضلال" ہے جس کے عقائد و اعمال کی تردید و ابطال سے فرقہ واریت کو منسوب کرنا، خود اپنی جگہ گمراہی ہے!

انسان کا مرنجان و مرنج ہونا کوئی شک نہیں خوبی کی بات ہے، لوگوں پر زبانِ نقد و احتساب دراز کرنے سے احتراز کرنا یہ بھی اچھی عادت ہے، اور نزاعی مسائل سے دور رہ کر سچی باتوں کو مثبت انداز میں پیش کئے جانا یہ بھی شرافتِ نفس کی دلیل ہے مگر شرک و بدعت کے معاملات میں درگزر اور چشم پوشی کی روش حقیقت میں دینی نقطۂ نگاہ سے بہت بڑا جرم ہے، صلح و آشتی کے اس مصنوعی جذبہ سے متاثر ہو کر شرک و بدعت کے مسائل پر گرفت کرنے سے مسلمانوں کے مابین تلخیاں پیدا ہوتی ہیں، غیر جانبدار رہتے رہتے طبیعت کو شرک و بدعت سے ایک قسم کی مناسبت ہو جاتی ہے اور یہ مناسبت دین و ایمان کا بہت بڑا نقصان ہے!

دُنیوی معاملات میں ناگوار امور پر صبر کرنا اور شکوہ و تنقید سے بچنا یہ قابلِ تعریف روش ہے، اس تحمل اور اعلیٰ ظرفی کی ستائش ہی کی جائے گی، یا پھر فقہ کے جزئی اختلافات میں درگزر سے کام لینا سلامتیِ طبع کی دلیل ہے، مثلاً نماز میں زور سے یا آہستہ سے آمین کہنا، رفع یدین کرنا یا نہ کرنا ------- اس قسم کے مسائل میں نزاع و جدال دین کی حکمت کے خلاف ہے، ان اُمور میں اختلاف ہی نہیں شدت برتنے سے بھی گریز کرنا چاہیئے کہ ہر گروہ کچھ نہ کچھ دلائل رکھتا ہے اور معاملہ حق و باطل کا نہیں راجح و مرجوح کا ہے۔

اس کے برخلاف

بدعات و شرک جہاں بھی اور جس شکل میں بھی پائے جائیں گے، وہ ناحق اور باطل ہی ہوں گے اور باطل کی نہ تو تائید کی جا سکتی ہے اور نہ اس سے چشم پوشی کسی حق پسند کا شعار ہو سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مشرکینِ مکہ اور کفارِ قریش پر توحید پیش کی تھی اور شرک و بت پرستی کی تردید فرمائی تھی تو اہلِ شرک نے حضورؐ پر یہ الزام لگایا تھا کہ (خاک بدہن گستاخ) اس شخص نے ہمارے گھروں میں نااتفاقی پیدا کر دی ہے اور ہمارے نوجوانوں کو بہکا دیا ہے! مشرکین اور اہلِ بدعت کا ہر دور میں ایک ہی مزاج رہا ہے، آج بھی جو لوگ شرک و بدعات سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ شرک و بدعت کی تردید پر فرقہ واریت اور مسلمانوں کے درمیان نااتفاقی پیدا کرنے کی اور پھوٹ ڈالنے کی پھبتیاں چست کرتے ہیں! اس قسم کی طنز اور پھبتی نہ کوئی وزن رکھتی ہے اور نہ معقولیت!

توحید انبیاء کرام کی مقدس تعلیمات کی بنیاد ہے، دین کی پوری عمارت اساسِ توحید ہی پر ٹکی ہوئی ہے، توحید کا مجروح اور غبار آلود ہو جانا دین کا سب سے بڑا نقصان ہے، اس نقصان کو گوارا کر لینے کے بعد دین و ایمان صحیح سلامت نہیں رہ سکتے!

مسلمانوں کے کسی فرقہ، گروہ اور جماعت کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ شادی و غمی اور مسرت و تعزیت کے نام پر کچھ رسمیں نکال کر ان پر دینی شعار کا ٹھپہ لگا دے اور جب اس قسم کی بدعات پر نکیر کی جائے، تو وہ گروہ فریاد و واویلا کرنے لگے اس طرح فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکا کر وحدتِ ملی کو صدمہ پہونچایا جا رہا ہے! قوم و ملت کی شیرازہ بندی شرک و بدعت

نہیں توحید و سُنّت ہے! شرک و بدعت کی خاصیت تفریق و انتشار اور توحید کا مزاج اتحاد و اتفاق ہے! وہ کلمہ جس پر قرآنِ کریم تمام عالمِ انسانیت کو مُتحد ہونے کی دعوت دیتا ہے وہ کلمۂ توحید ہے! اس لئے توحید کی تبلیغ اور شرک کی تردید انسانوں کو متفرق نہیں کرتی بلکہ انہیں جوڑتی ہے۔ عرب کی مثال ہمارے سامنے ہے شرک نے ان کی وحدت اور جمعیت کو پارہ پارہ کر رکھا تھا، اُن میں نہ تنظیم تھی نہ یک جہتی تھی، مگر توحید نے اُن کو اتحاد و اتفاق کی طاقت دے کر بُنیانِ مرصوص بنا دیا، اپنے زمانے کے وہ سب سے بڑے فاتح اور کشور کشا تھے دُنیا کی کوئی بڑی سے بڑی قوت ان توحید شناسوں کے آگے ٹھہر نہیں سکتی تھی۔ جو طاقت بھی ان سے ٹکرائی اُسے بالآخر پاش پاش ہو جانا پڑا!

آج مسلمان چاہے اقلیت میں ہوں یا اکثریت میں، وہ محکوم ہوں یا حاکم، ہر جگہ پریشان روزگار، بدحال اور مقہور جو نظر آتے ہیں اُس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ شرک و بدعت کی پھٹکار اُن پر پڑ رہی ہے، اور اُنھوں نے اپنے عقائد و اعمال سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی جگہ اُس کے غضب کو دعوت دے رکھی ہے!

اس لئے

شرک و بدعت کی تردید اور توحید و سُنّت کی تبلیغ اُمّت کے حق میں سب سے بڑی خیر خواہی ہے، جو لوگ شرک و بدعت کی طرح طرح سے تاویلیں کرتے اور اُن کے جواز کے لئے نکتے تراشتے ہیں وہ در حقیقت ملتِ اسلامیہ کے بدخواہ ہیں۔

مُشرکانہ رُسوم اور بدعات کے سب سے بڑے ذمہ دار یہ پیشہ ور واعظین و ذاکرین اور میلاد خواں ہیں، جن کا روزگار اسی قسم کے لطائف و نکات اور چٹکلوں کے سہارے چلتا ہے، یہ اپنی گلے بازی، شعر خوانی، اداکاری اور وعظ و تقریر کے ذریعہ بیچارے سیدھے سادے مُسلمانوں کو غلط عقائد پر جمائے رکھتے ہیں اور اُن کی اس بد عقیدگی کو غذا پہنچاتے رہتے ہیں! ان لوگوں کے وعظ و تقریر کی ٹیک تک یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی کوئی آیت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث پڑھ کر، جو جی میں آتا ہے، بکتے چلے جاتے ہیں، بیچارے عوام قرآن و حدیث کا علم نہ رکھنے کے سبب یہی سمجھتے ہیں کہ قبلہ مولوی صاحب جو کچھ فرما رہے ہیں اسی آیت اور حدیث کی شرح و تفسیر کر رہے ہیں حالانکہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اُس کا آیت و حدیث سے دُور کا تعلق بھی نہیں ہوتا، پھر یہ گروہ عام طور پر ضعیف، مشتبہ اور موضوع روایتیں بیان کرنے کا عادی ہے، مثلاً مولود خواں قسم کے واعظین مواہبِ لدُنیہ کی عربی عبارتیں سیرت کے جلسوں میں بڑی قرأت کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اُن کو حجت و بُرہان کے طور پر پیش کرتے ہیں، عوام بیچاروں کو اس بات کا سرے سے پتہ ہی نہیں ہوتا کہ مواہبِ لدنیہ کس درجہ کی کتاب ہے، اور اُس میں کیسی کیسی کمزور، بے سند اور موضوع روایتیں لکھی ہوئی ہیں، بدعتی واعظوں کی گمراہ کن لطیفہ گوئی اور عوام کی دین سے جہالت و بے خبری کے سبب شرک و بدعت کو فروغ ہو رہا ہے!

بدعتی واعظین و علماء کو اُن کے اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہیئے اُن سے بحث و مناظرہ سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ گروہ اپنے موقف سے بال برابر ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہے، ان پر کوئی حجت اور دلیل و نصیحت کارگر نہیں ہو سکتی، ان سے بحث و مناظرہ میں اُلجھنا گویا فتنہ کا دروازہ کھول دینا ہے، اور فتنہ کوئی اچھی چیز نہیں ہے! اگر ان لوگوں سے بحث و مناظرہ کسی جگہ ناگزیر سمجھا جائے کہ ایسا نہ کیا جائے گا تو عوام پر یہ اثر ہوگا کہ داعیانِ توحید کا موقف کمزور ہے، اُس صورت میں شائستگی اور نرمی کے ساتھ قرآنِ کریم کے بتلائے ہوئے انداز (جدال احسن) پر گفتگو کی جا سکتی ہے! ضرورت اس کی ہے کہ عوام کے سامنے دل نشین انداز میں توحید و سُنّت کو پیش کیا جائے اور اس حکمت و خوبی کے ساتھ پیش کیا جائے کہ شرک و بدعت کی تردید و نفی بھی ہوتی چلی جائے!

عوام کو کوئی شک نہیں اللہ اور رسولؐ اور دین سے عشق رکھتے ہیں مگر انھوں نے اپنی جہالت اور بے خبری کے سبب غلط قسم کی رسموں اور فاسد عقیدوں کو عشق کا مظہر سمجھ رکھا ہے، ان کو اگر کوئی اس طرح سمجھائے کہ فلاں رسم جو تم انجام دیا کرتے ہو اس کے لئے اللہ کی کتاب اور رسولؐ کی سنت میں کوئی سند اور دلیل نہیں ملتی، اس لئے اس رسم سے اللہ اور رسولؐ کی خوشنودی کی بجائے اللہ اور رسولؐ کی ناراضگی تمہیں میسر آئے گی۔

تو

عوام اس رسم کو چھوڑ سکتے ہیں۔ اور اس تعلیم و تبلیغ کا کم سے کم یہ اثر تو عوام پر ضرور ہوگا کہ اس قسم کی رسموں کے مصنوعی تقدس اور انہیں دینی فریضہ سمجھنے کا جذبہ نرم پڑ جائے گا۔ ہم نے اس کا تجربہ کیا اور یہ تجربہ کامیاب رہا! عوام تو یہی سمجھے ہوتے ہیں کہ عرس، فاتحہ، میلاد و قیام اور عزاداری کے نام سے جو کچھ ہوتا ہے وہ عین اسلام ہے، جب ان کو پہلی بار اس کا علم ہوتا ہے کہ کتاب و سنت، صحابہ کرام اور اہل بیتِ عظام کے اقوال و آثار میں ان باتوں کے لئے کوئی دلیل نہیں ملتی، تو وہ ایک دم چونک پڑتے ہیں اور انہیں بڑی حیرت ہوتی ہے کہ جن رسموں کو ہم نے دین سمجھ رکھا تھا، وہ تو بڑی کمزور، مشتبہ، بے سند اور بے دلیل نکلیں مشرکانہ رسوم و بدعات اور فاسد عقائد کے بارے میں عوام کا چونک پڑنا بہت بڑی چیز ہے، یہیں سے ان کا ذہن اصلاح کی طرف مائل اور متوجہ ہو جاتا ہے اور ان میں ان مسائل کی حقیقت معلوم کرنے کی تڑپ پیدا ہو جاتی ہے، یہ تڑپ جس کسی میں بھی پیدا ہو گئی ہے، رفتہ رفتہ شرک و بدعات سے دور ہوتا چلا گیا ہے۔

اہلِ بدعت کا سب سے زیادہ کارگر حربہ یہ ہے کہ وہ ایسی رسموں کو جن کا دین سے دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا، بزرگانِ دین کی عزت و تکریم کا سبب ٹھیرا دیتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے بیچارے عوام کے دلوں میں یہ بات اتار دی ہے کہ جو کوئی گیارھویں شریف کو نہیں مانتا، وہ بڑے پیر صاحب کو نہیں مانتا؟ حالانکہ لوگوں کی نکالی ہوئی رسموں سے کسی بزرگ کی عزت و تکریم کا کوئی تعلق نہیں ہے، اور اولیاء اور بزرگوں کا ماننا اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ انھوں نے کتاب و سنت کے مطابق جو زندگی گزاری ہے، اس زندگی سے ہم بھی روشنی حاصل کریں۔ ان بزرگوں کے لئے ہمارے دلوں میں جذبۂ تکریم صرف اس لئے پایا جاتا ہے کہ یہ نفوسِ قدسیہ اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار بندے تھے اور انھوں نے اپنی مرضیات اور خواہشوں کو اللہ اور رسولؐ کے حکم و فرمان کے تابع کر دیا تھا قرآن پاک سے بڑھ کر سچی، روشن اور کھلی ہوئی کتاب اور کون سی ہو سکتی ہے، اس میں کسی نبی رسول اور مصلح کی پیدائش اور وفات پر دن منانے کا کوئی ذکر نہیں ہے، صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت و وفات اور حضورؐ کی مقدس زندگی کے کسی واقعہ کا کوئی دن نہیں منایا۔ اس کے بعد خلفاء راشدین، دوسرے صحابہ کرام اور اہل بیت عظام اور فقہ و حدیث کے ائمہ میں ان کی پیدائش اور وفات پر دن منانے کا امت میں رواج نہیں رہا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت خواجہ معین الدین اجمیری اور سلطان نظام الدین اولیاء اور دوسرے بزرگوں (رحمہم اللہ تعالیٰ) کے ملفوظات موجود ہیں، ان میں کسی بزرگ نے اپنے لئے کوئی "یوم" مقرر نہیں کیا ـــــــ یہ تو عوام نے اپنی جہالت کے سبب دوسری قوموں کے تیوہاروں اور میلوں ٹھیلوں سے متاثر ہو کر بزرگانِ دین سے "یوم" منسوب کر دیئے ہیں، اور یہ جاہلانہ رسوم رفتہ رفتہ دینی عقیدہ بن گئی ہیں! حضرت شیخ جیلانی بڑے پیر صاحب قدس سرہٗ کی کتابیں موجود ہیں ان میں خالص توحید کی تعلیم دی گئی ہے، مگر "قادریوں" کی خاصی بڑی تعداد نے اس مبلغ توحید اور داعیٔ سنت کو "معبود" بنا لیا ہے، قیامت کے دن یہ تمام بزرگ اپنے غالی معتقدین کے عقائد و اعمال سے اپنی بیزاری کا اظہار کریں گے! اور یہ دن جہالت آمیز عقیدت مندوں کی رسوائی

کا دن ہوگا۔

ہندوؤں کے یہاں جب کوئی مرجاتا ہے، تو اُس کی تیرھویں کرتے ہیں اور کنوار کے مہینہ میں شروع کے پندرہ دنوں میں برہمنوں کو مردوں کے نام پر کھانا کھلاتے ہیں اسے کناگت اور سرادھ کہتے ہیں، ہندوستان کے مسلمانوں میں تیجا، دسواں، بیسواں اور چالیسواں ہندوؤں کی ان رسموں سے لیا گیا ہے، جس کی حیثیت دینی شعار کی بن گئی ہے، جو کوئی ان جاہلانہ رسموں پر ٹوکتا ہے اُس پر اہلِ بدعت کی طرف سے وہابیت، دیوبندیت، بلکہ بے دینی کی پھبتیاں چُست کی جاتی ہیں! "ایصالِ ثواب" اپنی جگہ دُرست ہے مگر عوام مسلمانوں نے اس کے لئے جو طریقے نکالے ہیں وہ غیر اسلامی ہیں، اس طرح اس نیک کام کو بھی جاہلانہ رسوم نے عیب دار بنا دیا ہے۔

ان رسموں سے عوام کے اس قسم کے گمراہ کن عقائد و تصورات وابستہ ہوگئے ہیں ——— کہ کسی بزرگ کے نام کی جب فاتحہ دی جاتی ہے تو اُس بزرگ کی رُوح وہاں آتی ہے، میلاد شریف کے جلسوں کی صدارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوحِ مقدس فرماتی ہے اور جب کھڑے ہوکر سلام پڑھا جاتا ہے تو حضورؐ میلاد میں تشریف لاتے ہیں ——— بدعات کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ عقائد میں فساد پیدا ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ عقیدۂ توحید شرک آلود ہو جاتا ہے۔

اسلام دینِ کامل ہے جو انسان کی پُوری زندگی کو محیط ہے، کتابُ اللہ ہے، سُنّتِ رسولؐ ہے، صحابۂ کرام (جس میں اہلِ بیت بھی شامل ہیں) کے آثار ہیں، ان میں غمی اور شادی کے واقعات بھی ملتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمان شہید ہوتے ہیں پھر خلفاء راشدین کے دور میں کافروں سے جنگیں ہوتی ہیں اور مجاہدوں کو شہادت کا شرف میسّر آتا ہے، مگر قرنِ اوّل کے بعد صدیوں تک نہ کسی شہید کا بازاروں میں ماتم کیا جاتا ہے نہ کسی کے جنازے کا جلوس نکلتا ہے نہ کسی کے نام کے علم نصب ہوتے ہیں، نہ کسی کی قبر اور مزار کی شبیہیں بنا کر بستیوں میں گشت کرائی جاتی ہیں، عزاداری کے ان مراسم و مظاہر سے شہیدانِ کرام کی تعظیم و محبت اور اظہارِ غم کو وابستہ کر دینا، دینی نقطۂ نگاہ سے کوئی وزن اور اصلیت نہیں رکھتا، ہر رسم اور عقیدہ کے لئے کتاب و سُنّت اور آثارِ صحابہ سے سند درکار ہے، ہر ایسی رسموں کو دینی شعار سمجھنا، یہ خود بے دینی کی بات ہے! دین میں نکتے، لطیفے اور چٹکلے نہیں چلتے، ہر عقیدہ اور رسم کے لئے کتاب و سُنّت سے واضح دلیل چاہیئے۔

کسی شہید کے جنازے کی نقل بنانا، پھر اُس میں تیر چھیدنا، اُس پر خون چھڑکنا اور اس تابوت کو گلی گلی لیے پھرنا اس کے لئے عقل و نقل کی آخر کوئی دلیل بھی تو ہونی چاہیئے؟ بھارت کے ہندوؤں کے یہاں البتہ اس قسم کی رسمیں ملتی ہیں کہ ان کے یہاں مصنوعی رام چندر اور رام لچھمن بنتے ہیں، پھر اُن کے ڈولے اور رتھ نکالے جاتے ہیں، لنکا کے راجہ راون کی بہن کالی تلوار لے کر گلیوں میں جلوس کے ساتھ گشت کرتی ہے، پوری رام کہانی کو اسٹیج پر ڈرامہ کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے یہاں تک کہ رام لیلا کے آخری دن راون اور اُس کے بھائی کنبھ کرن کے پتلے بنا کر نصب کئے جاتے ہیں، ان پر مصنوعی رام چندر اور رام لچھمن اپنی کمانوں سے بان چلاتے ہیں اور اس کے بعد ان پتلوں کو آگ لگا دی جاتی ہے، یہ ڈھیلے، تخت، رتھ، شبیہیں، ڈرامہ کے انداز پر مصنوعی اداکاری، پھر ان کے جلوس اور میلے ٹھیلے۔ یہ ہندوؤں کی نکالی ہوئی رسمیں اور اُن کے مذہبی تیوہار اور دینی شعار ہیں، ملّتِ اسلامیہ کو ان کھیل تماشوں سے کیا واسطہ! مسلمانوں کے کسی گروہ یا فرقہ نے غیر مسلموں کی دیکھا دیکھی کچھ رسمیں اختیار کرلی ہوں، تو ایسا کر لینے سے وہ "دینی شعار" تو نہیں بن سکتیں، مثلاً ہندو

دوالی پر کھانڈ کے ہاتھی گھوڑے بناتے اور کھیلوں اور مرمروں کے ساتھ انہیں کھاتے ہیں، مسلمان شب برات کو حلوے مانڈے، حریرہ اور مسور کی دال پکاتے ہیں، ہندو دیوالی پر جوا کھیلتے ہیں اور مسلمان شب برات میں آتش بازی چھوڑتے ہیں ——— تو کیا جہلا کی اختیار کی ہوئی رسمیں "دینی شعار" بن سکتی ہیں؟

ہم نے اس سے پہلے بھی کہا تھا اور اب پھر اس حقیقت کو دہراتے ہیں کہ مسلمانوں کے تمام فرقے بنیادی عقائد اور دینی شعائر میں متحد و متفق ہیں ہاں! ان کے درمیان فقہی اختلافات پائے جاتے ہیں، یہ اختلاف "اصل" کا نہیں "فرع" کا ہے اور یہ وہ فروعی اختلافات ہیں جن کا پایا جانا فطرت کے عین مطابق ہے

مگر

مسلمانوں کا کوئی فرقہ اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ غمی اور شادی یا اظہار عقیدت و تعظیم کی فلاں فلاں رسم و تقریب اور رسم و تہوار ہمارے اپنے فرقہ کا شعار ہے، دین میں "ہمارے اور تمہارے" کی تفریق نہیں پائی جاتی، اگر کوئی رسم، تقریب مظہر اور شعار دینی ہے تو وہ تمام اسلامی فرقوں کے درمیان مشترک پایا جانا چاہیئے، کسی ایک فرقہ کے یہاں کسی مخصوص رسم و تقریب کا وجود ہی اس کے بے سند ہونے کی دلیل ہے!

عرس و نیاز وغیرہ کے نام پر جو رسمیں اور تقریبیں مسلمانوں میں رواج پا گئی ہیں چونکہ وہ دینی نقطہ نگاہ سے کوئی اصل اور سند نہیں رکھتیں اس لئے ان میں جگہ جگہ طرح طرح کی جدت طرازیاں پائی جاتی ہیں، بدعات کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ایک حال نہیں رہتیں ان میں اضافے ہوتے رہتے ہیں، مثلاً کہیں مدار صاحب کی چھڑیاں ہیں، کسی جگہ سدّو کا بکرا ہے، کسی کے نام کے کونڈے ہیں اور کسی کی فاتحہ کی صحنک ہے، کہیں پنکھے کا جلوس نکل رہا ہے، کہیں قبروں کی چادروں اور گاگروں کا دھوم دھڑکا ہے، حیدرآباد دکن میں "صندل شریف" کا جلوس بڑی دھوم دھام سے نکلتا ہے، بدعت کی اس رنگا رنگی سے خدا کی پناہ! اسی طرح عزاداری کے نام پر کہیں گھوڑے نکلتے ہیں، کہیں براق، کہیں جھولے، کسی جگہ "مہندی" کا جلوس اور حیدرآباد دکن میں تو یہ بدعات اس گراوٹ تک پہونچ گئی ہیں کہ محرم کے زمانے میں وہاں لوگ لنگور اور بندر کی شکلیں بنا کر بازاروں سے گزرتے ہیں اور جہلا کے نزدیک یہ سب دینی شعائر ہیں ——— علی گڑھ میں محرم کی (غالباً) سات تاریخ کو وہاں کی طوائفیں سیاہ لباس پہن کر نوحے اور سلام پڑھتی ہوئی شہر کے باہر ایک ہندو کے باغ میں کیلے کا درخت کاٹنے کے لئے جاتی تھیں اور علی گڑھ میں اس رسم نے ایک مستقل تقریب اور تہوار کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ہزاروں آدمی طوائفوں کے محلے میں اس جلوس کے دیکھنے کے لئے جمع ہوتے تھے، پولس کے دستے اس جلوس کا انتظام کرتے تھے۔ ایک بار باغ کے ہندو مالک نے مزاحمت کا ارادہ ظاہر کیا تو جاہل مسلمان مرنے مارنے کے لئے تیار ہو گئے! ایک طرف حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کے اعوان و انصار کی مقدس شہادت ہے اور دوسری طرف طوائفوں کی نکالی ہوئی "کیلا کاٹنے" کی یہ رسم ہے، ان دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں ہے، ادھر تقدس ادھر کراہت، لیکن جہلا کے ذوق بدعت کا برا ہو انہوں نے اس لغویت کو بھی دینی شعار سمجھ لیا تھا!

مسلمانوں میں مسرت و غمی، میلاد و قیام اور نیاز و فاتحہ کے نام پر جو رسمیں رواج پا گئی ہیں، ان میں بہت سی رسمیں بادشاہوں کی نکالی ہوئی ہیں۔ "سنتِ ملوک" اور دین کا شعار بن جائے، دین کی یہ کتنی بڑی بدبختی ہے!

بدعات دین ہی کے نام پر فروغ پاتی ہیں اور یہ امراض صحت کے دھوکے میں متعدی ہوتے چلے جاتے ہیں، بدعات

پر نکیر کو جو کوئی فرقہ واریت سے تعبیر کرتا ہے، وہ خود فرقہ واریت کے تعصب میں مبتلا ہے، کتاب و سُنّت کو ہاتھ دینے والوں نے ہر دور میں بدعات پر نکیر کی ہے مثلاً اب سے چار سو سال پہلے جب ہندوستان کے مسلمانوں میں "میلاد" کی محفلوں کا رواج ہونے لگا تو حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر ٹوکا اور کھُل کر تنقید فرمائی!

ہمارا موقف

قرآنِ کریم توحید و شرک کفر و اسلام اور حق و باطل کے درمیان تفریق کرتا ہے، اور ایسا کرنے سے قرآنِ کریم پر (معاذ اللہ) یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ اُس نے مومن و کافر اور موحد و مشرک کی تفریق پیدا کر کے، انسانی وحدت کو متفرق کر دیا ہے، غلط باتوں پر احتساب و تنقید کو جو کوئی تفریق و انتشار سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ اتحاد و اتفاق کے وہم میں مبتلا ہے، اس طرح تو اصلاح و انقلاب کی ہر کوشش کو مطعون کیا جا سکتا ہے! کتاب اللہ اور احادیثِ نبوی میں "شرک و بدعت" کی جو مذمت آئی ہے، تو کیا یہ گمراہیاں صرف خیالی، وہمی اور فرضی ہیں، عالمِ واقعہ میں ان کا وجود کہیں نہیں ملتا؟ ہم اللہ اور رسول کے بارے میں یہ بدگمانی نہیں کر سکتے کہ کلامِ الٰہی اور قولِ رسول میں مفروضات اور ناممکنات پر اس قدر شدت کے ساتھ نکیر کی جائے! اس میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں ہے کہ صدیوں سے مسلمانوں میں مشرکانہ رسوم اور بدعات رواج پا گئی ہیں، اور ہر دور میں ان پر نکیر کی گئی ہے۔ "مشرکانہ رسوم و بدعات پر" "فاران" میں جو احتساب کیا جاتا رہا ہے، وہ کوئی نئی بات نہیں ہے!

متحدہ ہندوستان میں یہی ہوتا تھا کہ جب محرم اور شب برات کا زمانہ آتا تھا تو اہلِ علم اخباروں، رسالوں اور پوسٹروں کے ذریعہ مسلمانوں کو آگاہ کرتے تھے کہ ان موقعوں پر کون سی ایسی باتیں کی جاتی ہیں جو دینی نقطۂ نگاہ سے ناپسندیدہ ہیں، اس انتباہ و آگاہی کا مقصد یہ تھا کہ جن مسلمانوں کی سمجھ میں علمائے کرام کی بات آ جائے وہ ان کھیل تماشوں سے الگ تھلگ رہیں۔

"فاران" اسلامی اخوت کا داعی اور دینی وحدت کا نقیب رہا ہے، ہم نے فرقہ وارانہ عصبیت کے تحت کسی پر نقد و احتساب نہیں کیا، حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے ہماری عقیدت و محبت کی شہادت "فاران" کے وہ سینکڑوں صفحات دے رہے ہیں! جن میں ہم نے محمود عباسی کی کتاب "خلافتِ معاویہ و یزید" پر شدت کے ساتھ احتساب کیا ہے اور اس حق گوئی کے جرم میں بعض ناصبی سرشتوں اور خارجی مزاجوں کی گالیاں کھائی ہیں! حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی عقیدت سے ہمارا قلب معمور ہے مگر اُن کی مشہور کتاب "ازالۃ الخفا" (جلد اول) کا جب ترجمہ ہمارے سامنے آیا تو اُس پر ہم نے تفصیل کے ساتھ تنقید کی، ہماری اس تنقید کو امامیہ مذہب کے بعض رسالوں نے اپنے یہاں نقل کیا!

"فاران" کے "توحید نمبر" میں اُن مشرکانہ رسوم و عقائد اور بدعات پر نکیر و تنقید کی گئی جن میں زیادہ تر وہ لوگ مبتلا ہیں جو اپنے کو "اہلِ سُنّت والجماعت" کہتے ہیں، لاہور میں کعبۃ اللہ کا غلاف تیار ہوا تھا، اُس غلاف کا جلوس نکلا تھا اور اُس کی جو نمائش ہوئی تھی، اُس سلسلہ میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے جو توجیہ اور تصریح کی تھی، ہم نے اُس پر بھی تنقید کی! ہماری یہ روش اس کی دلیل ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے فضل سے کسی گروہی عصبیت میں ملوث نہیں ہیں اور نہ کسی شخص کی محبت و عقیدت کے سبب حق بات کہنے میں پس و پیش کرتے ہیں! ہم اس غلط فہمی میں بھی مبتلا نہیں ہیں کہ حق گوئی کے اس دُنیا میں تنہا ہمیں اجارہ دار ہیں اور جسے ہم حق کہہ دیں حق ہے اور جسے ناحق کہہ دیں وہ بات لازمی طور پر ناحق ہوتی ہے، بھُول چوک ہم سے بھی ہو سکتی ہے، اہلِ علم اور اصحابِ نظر کو پُورا حق حاصل ہے کہ وہ ہماری غلطیوں پر ہمیں ٹوکیں اور نشاندہی کریں کہ فلاں مسئلہ میں ہماری رائے ان دلیلوں کی بنا پر درست نہیں ہے، حق واضح ہونے کے بعد

رجوع الی الحق میں ہم ایک لمحہ کے لئے بھی تامل اور پس و پیش نہیں کریں گے۔

مگر

جس بات کو ہم حق یا ناحق سمجھتے ہیں، اُس کی غلطی محکم دلیلوں کے ساتھ ہم پر واضح نہ کر دی جائے اور ہم مطمئن نہ ہو جائیں اُس وقت تک کوئی دھمکی یا کسی دُنیوی نقصان کا خوف ہمیں ہمارے موقف سے نہیں ہٹا سکتا۔

اسلامی اخوت اور دینی وحدت کو ٹھیس تو وہ لوگ پہونچاتے ہیں جو یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمارے لئے اسکولوں اور کالجوں میں تاریخ کا جداگانہ نصاب مرتب کیا جائے! ہم نے اسے پہلے بھی کہا تھا اور اب پھر کہتے ہیں کہ تلخی اور بدمزگی کی بنا بدکلامی اور گالیاں ہیں، وہ نفوس قدسیہ جو مسلمانوں کی اکثریت کے نزدیک محبوب و محترم ہیں اور مسلمان تو مسلمان غیر مسلم تک جن کی عزت کرتے ہیں اور جو اسلامی تاریخ کے صفِ اول کے نامور اکابر اور محسنینِ ملت ہیں، اُن کو بُرا کہہ کر جو لوگ اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں، وہ ملت میں تلخی، بدمزگی اور افتراق پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں، کاش! ان لوگوں کو اپنے موقف پر غور کرنے کی توفیق نصیب ہو۔

وعظ و تلقین

اہلِ بدعت چاہے وہ مسلمانوں کے کسی گروہ اور فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں ان سب کی ایک ہی جیسی ذہنیت اور ایک ہی قسم کا مزاج ہے، جب اُن کے کسی خلافِ شریعت فعل پر انہیں ٹوکا جاتا ہے تو وہ کتاب و سُنّت اور آثارِ صحابہ (جن میں اہلِ بیت بھی شامل ہیں) سے کوئی دلیل لانے کی بجائے قیاس و رائے کے تیر تکے لڑاتے ہیں، اور بزرگانِ دین کی اہانت کا شور مچا کر واویلا کرتے اور آوازِ حق کو دبانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں! یہ ان لوگوں کا آزمایا ہوا حربہ ہے، جو عوام پر آسانی سے چل جاتا ہے۔ حالانکہ ان بدعات سے بزرگانِ دین کے احترام و عقیدت کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ میرے ذکر کی ہر محفل میں میری ولادت کا ذکر لازمی طور پر کیا کرنا اور پھر کھڑے ہو کر صلوٰۃ و سلام پڑھنا، صحابہ کرام نے بھی ایسا عمل نہیں کیا، نہ کتاب و سُنّت سے شہداء کے لئے بازاروں میں ماتم و سینہ کوبی کی دلیل ملتی ہے اور مسلمانوں کے کسی فرقہ میں بعثتِ نبوی سے لے کر کئی صدی تک بزرگانِ دین کی قبروں کی شبیہیں بنا کر اُن کے جلوس نکالنے کا رواج بھی نہیں پایا جاتا، حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا کے نام کی صحنک، اور حضرت امام جعفر صادق کے کونڈے بھرنے کی کوئی ضعیف سے ضعیف دلیل بھی اہلِ بیتِ کرام کے یہاں نہیں ملتی، نہ قولی اور نہ فعلی! اور نہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے "گیارھویں" کرنے کے لئے ارشاد فرمایا تھا، یہ تمام رسمیں بادشاہوں، امیروں اور دُوسرے لوگوں کی نکالی ہوئی ہیں اپنے تخیل رسموں کو دین سمجھنا اور جو اُنھیں دین نہ سمجھے اُس پر بے دینی کی پھبتیاں کسنا دین کا کتنا بڑا المیہ ہے!

نصاریٰ کے غلو عقیدت نے حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کو "ابن اللہ" بنا کر چھوڑا اور اس ستم ظریفی کی بھلا کوئی حد و نہایت ہے کہ حضرت عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا کہنے اور ماننے کے بعد بھی یہ لوگ "توحید" کے مدعی ہیں، اسی طرح بعض مسلمانوں کی عقیدت کی شدت اور غلو نے بزرگانِ دین کو معبود بنایا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کو دور و نزدیک سے پکارا جاتا ہے اور اُس سے استغاثہ کیا جاتا ہے اسی طرح بزرگانِ دین کے نام کی دُہائی دی جاتی ہے اور اُن کو فریاد رس، مشکل کشا اور حاجت روا سمجھا جاتا ہے (نعوذ باللہ)

توحید کی اشاعت و تبلیغ اور مشرکانہ رسوم و بدعات کی تردید اور روک تھام اسی طرح ممکن ہے کہ جو مسلمان ان مفاسد سے اچھی طرح واقف ہیں اور توحید کے تقاضوں کو پہچانتے ہیں، وہ نرمی اور حکمت کے ساتھ عوام کو سمجھائیں اور بتائیں کہ شرک و بدعت کے لئے کتاب و سُنّت میں کس قدر خوفناک وعیدیں آئی ہیں! عوام کے دلوں میں یہ بات اُتر جائے کہ فلاں کام کرنے

سے اللہ اور رسولؐ کی خوشنودی کی بجائے ناراضگی میسّر آئے گی' تو وہ اس کام سے باز رہ سکتے ہیں' افسوس اس کا ہے کہ عوام تک ٹھیک طور پر بات پہونچنے نہیں پائی۔ وہ بیچارے بڑے اندھیرے میں ہیں! قوم کے لئے ایسے واعظین اور مقررین کی ضرورت ہے کہ جو عوام میں اپنے نامقبول اور غیر ہر دلعزیز ہونے کے ڈر سے بے پروا ہوکر، شرک و بدعت کی تردید کریں جب سیرت النبیؐ کے جلسوں میں توحید شناس علماء اور بدعتی واعظوں کی تقریروں کا ایک ہی رنگ ہو، تو بیچارے عوام کا کیا قصور ہے، وہ خود تو غلط اور صحیح میں تمیز نہیں کر سکتے، اُن کو دل نشین انداز اور شیریں لب و لہجہ میں بار بار بتایا جائے تو ان کی سمجھ میں ٹھیک بات آسکتی ہے۔

تقسیم ہند سے قبل بمبئی کے بعض محلّوں میں اہلِ بدعت کا وہ زور تھا کہ اپنی مسجدوں میں کسی اہلِ حدیث اور دیوبندی کو محلے والے نماز پڑھتا دیکھ لیتے تھے تو اُس غریب کی شامت آجاتی تھی مگر بعض توحید شناس علماء نے جرأت کے ساتھ جب ان محلّوں میں تقریریں کیں اور مشرکانہ رُسوم اور بدعتوں کو عوام کے سامنے کھول کر رکھا تو پھر ان محلّوں کی فضا ہی بدل گئی اور بمبئی کے جو محلّے بدعتیوں کے گڑھ سمجھے جاتے تھے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہاں اب توحید اور کتاب و سُنّت کا چرچا ہے اور وہاں فساد انگیز ذہنیت کی بجائے امن و آشتی کا ماحول پیدا ہو گیا ہے۔

کوئی شک نہیں "عوام کالانعام" ہوتے ہیں مگر اُن کی تربیت اور اُن پر محنت کی جائے تو یہ "کالانسان" بھی بن سکتے ہیں اور اس انقلاب کی بہت سی مثالیں موجود بھی ہیں! کراچی کے ایک محلہ میں سیرت کا جلسہ تھا وہاں ایک خوش بیان واعظ نے نرم و شیریں انداز میں پہلے توحید کی اہمیت کو بیان کیا اور پھر مشرکانہ عقائد کی تردید کی، شروع شروع میں تو سُننے والے اچنبھے میں پڑ گئے کہ ایسی باتیں انھوں نے پہلی بار سُنی تھیں' اس کے بعد رفتہ رفتہ ان کی یہ حیرت، وحشت اور اجنبیت کم ہوتی گئی، یہاں تک کہ تقریر ختم ہونے کے بعد انھوں نے بڑی عقیدت کے ساتھ واعظ صاحب سے مصافحہ کیا۔

دُنیا کا ہر کام کچھ نہ کچھ قربانی اور محنت چاہتا ہے، محنت، ایثار اور اخلاص و صداقت کے بغیر اصلاح و انقلاب کی کوئی کوشش بارآور نہیں ہو سکتی' توحید کی تبلیغ اور شرک و بدعت کی تردید بھی محنت' ایثار اور اخلاص چاہتی ہے، جو مسلمان جہاں کہیں بھی ہے اور جیسے ماحول میں بھی زندگی بسر کر رہا ہے اُسے چاہیئے کہ اپنے دوستوں' عزیزوں اور محلّہ والوں سے ربط پیدا کرے، اُن سے دوستی بڑھائے اُس کے بعد اُن میں توحید کی تبلیغ کرے لہٰذا اس مہم میں بے صبری سے کام نہ لے انشاء اللہ اس تبلیغ و محنت کے اچھے نتائج برآمد ہونگے، مسلمان عوام فطرتاً دین سے عشق رکھتے ہیں مگر دین سے بہت کچھ بے خبر ہیں، اُن کے سامنے جب صحیح دین پیش کیا جائے گا تو جتنی جتنی اُن کی دین سے واقفیت بڑھتی جائے گی، اُتنے ہی فاسد عقائد' جاہلانہ رسوم اور بدعات کے بادل چھٹتے چلے جائیں گے! اس کام کے لئے کسی انجمن بنانے کی ضرورت نہیں جو شخص جہاں بھی ہے' اُسی ماحول میں کام کا آغاز کر دے' مفسدین ایسے موقعوں پر اصلاح و تعمیر کی جدّ و جہد میں کھنڈت ڈالنے کے لئے جان بوجھ کر دنگا فساد پیدا کرتے ہیں، ایسے موقعے آجائیں تو تحمل اور صبر و استقامت کے ساتھ فساد اور جھگڑوں کو ٹالنے کی ہر امکانی کوشش کی جائے' اس راہ میں کامیابی پتھر کا جواب پتھر سے دینے میں نہیں بلکہ پتھر کھانے سے ہوتی ہے اور اس طرح مفسدین کی شورش، بلوے اور فساد کی کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں! اللہ تعالیٰ ہمیں اعلاء کلمۃ الحق کے ساتھ صبر و استقامت اور تحمل و عزیمت کی توفیق بھی عطا فرمائے (آمین)

ماہرالقادری ۲۷ ستمبر سنہ ۶۳ء

ایک حق پسند عالمِ دین کا

اعلانِ حق

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی کے خلاف بعض علمأ نے جو ہنگامہ اور فتنہ برپا کر رکھا ہے، وہ دینی، اخلاقی اور عام انسانی نقطۂ نگاہ سے سخت معیوب ہے! عام جلسوں میں مولانا مودودی کو گالیاں دی جاتی ہیں، اور ان سے بالکل بے سر و پا اور غلط باتیں منسوب کی جاتی ہیں۔ عوام بے چارے ان تقریروں کو سن کر غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں! وہ ان لوگوں کے بارے میں جن کے چہروں پر لانبی ڈاڑھیاں اور پیشانیوں پر سجدوں کے نشان ہیں اور جن کی زبانیں "قال اللہ" اور "قال الرسول" دہراتی رہتی ہیں، یہ تصور کر ہی نہیں سکتے کہ یہ حضرات صریح جھوٹ بھی بول سکتے ہیں! یہ کس قسم کا علم و تقویٰ ہے جو افترا پردازی اور کذب و تہمت تراشی کو جائز قرار دیتا ہے۔ یہ بات ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ ان علماء نے اس جھوٹ کے لئے کونسا حیلہ شرعی تلاش کر لیا ہے۔

جمعیۃ علماء اسلام کے بعض ارکان خاص طور سے اس فتنہ کو ہوا دے رہے ہیں اور مولانا مودودی کی مخالفت جن کا مشن بن گیا ہے۔ ہزارہ کے ایک مولوی صاحب اس فتنہ پردازی میں پیش پیش ہیں۔ ہمارے پاس مختلف مقامات سے خطوط اور اطلاعیں آئی ہیں کہ ان صاحب نے جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کو یہ یہ گالیاں دیں اور انکے خلاف اس طرح زہر اگلا اور فلاں فلاں جھوٹی باتیں منسوب کیں

مولانا مودودی کے خلاف جب کوئی دلیل نہ ملی تو پھر کشف کے ذریعہ ان کو مطعون کیا گیا!

علماء میں سب ہی ہزاروی صاحب جیسے نہیں ہیں، ان میں وہ حق پسند ارباب علم و فضل بھی ہیں جو جماعت اسلامی کی دینی جد و جہد کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہیں، اور مولانا مودودی سے بعض علمی اختلافات کے باوجود ان کے زبان و قلم کو دین کے لئے مفید سمجھتے ہیں۔

ہفت روزہ "سیر و سفر" (ملتان) کا ایک تراشا ہمارے سامنے ہے جس میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا ایک خط درج ہے جس میں موصوف لکھتے ہیں :-

"جمعیۃ علماء اسلام کو شروع میں حضرت مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں ہم نے قائم کیا تھا۔ مگر مارشل لاء سے کچھ پہلے کچھ دوسرے لوگوں نے غلط طریقہ سے اس نام کی یہ جمعیۃ بنا ڈالی جو آجکل چل رہی ہے۔ ہم نے صرف اس لئے کہ اگر ہم اصل جمعیۃ کو جاری رکھتے ہیں، تو ان حضرات علماء سے اختلاف کا اظہار اخبار و اشتہار میں ناگزیر ہوگا۔ جمعیت سے دست برداری دیدی۔ اب میں اس میں شریک نہیں اور نہ اس طرز عمل کو پسند کرتا ہوں جو مودودی صاحب کے بارے میں اہل جمعیۃ نے اختیار کر رکھا ہے، اس سے زائد میرے بس کی بات نہیں۔"

دیوبند کے علما میں حضرت مولانا محمد چراغ (صدر مدرس مدرسہ عربیہ گوجرانوالہ) بھی ہیں جو کسی گروہی عصبیت میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے مبتلا نہیں ہیں اور طبعاً حق پسند اور صاحب فراست ہیں! مولانا موصوف جانتے ہیں کہ اس زمانے میں جب کہ اسلام کے خلاف مغربی زندگی انکار حدیث، اشتراکیت وغیرہ محاذ کھلے ہوئے ہیں جماعت اسلامی کس خلوص و استقامت کے ساتھ ان فتنوں کا مقابلہ کر رہی ہے ـــــ اس لئے جزئی اختلافات کو نظر انداز کر کے یہ وقت اس قسم کی حق پسند اور حق کے لئے عملاً جد و جہد کرنے والی جماعت کی حوصلہ افزائی اور تائید و معاونت کا ہے!

حضرت مولانا محمد چراغ مدظلہ نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابوں اور تحریروں کا بھی مطالعہ فرمایا ہے۔ اور مولانا موصوف مودودی صاحب کی دینی فکر اور اصابت رائے کے مداح و معترف ہیں۔

ہفتہ وار "خدام الدین" (لاہور) میں جو کشف و رویا کے لطائف شائع ہوتے تھے جن کا ذکر "فاران" میں بھی آچکا ہے۔ اس سلسلہ میں ابوظفر حسین صاحب نے ملتان سے مولانا محمد چراغ صاحب کی خدمت میں ایک "سوالنامہ" بھیجا تھا، مولانا موصوف نے اس کا جو جواب عنایت فرمایا تھا وہ بلفظہ درج ذیل ہے۔

اس خط سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دماغ سلجھا ہوا، نیت بخیر، فکر صحیح اور زاویۂ نگاہ درست ہو تو الجھے سے الجھے مسئلہ میں بھی زبان و قلم سے ایسی بات نکلتی ہے جو حق کی ترجمان ہوتی ہے۔ یہ خصوصیت مرد مومن کی فراست کا طرۂ امتیاز ہے (م - ق)

مکرم و محترم وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

(۱) آپ نے اخبار "حالات" کا جو قصہ نقل کیا ہے میں نے بھی "حالات" میں پڑھا تھا۔ کتاب و سنت سے تو میرے علم میں اس قسم کے واقعات کا ثبوت نہیں ملتا یہ شاید دیکھنے والے کے تخیلات و تصورات ہوتے ہوں جو شریعت میں حجۃ نہیں۔ نہ اس قسم کے واقعات کو کوئی ثبوت سمجھا جا سکتا ہے۔

(۲) رسالہ "خدام الدین" سے جو آپ نے خوابوں کا ذکر کیا ہے میں نے وہ رسالہ نہیں دیکھا اور خواب شریعت میں کوئی سند یا حجت تو نہیں ہوا کرتے۔ بعض فقہا لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کہے کہ مجھے خواب آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

کہ ایسے چاند انتیس کا ہوگا تو اس خواب کو دلیل نہ سمجھا جائے گا بلکہ چاند کا ثبوت رویت پر ہی موقوف ہوگا۔ حضرت مولانا حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ لوگوں کے خوابوں کے جواب میں عموماً فرمایا کرتے ہے۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

(۳) احیاء العلوم کے حوالے سے جو کشف کا آپ نے ذکر کیا ہے تو اس احیاء کو بھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا جو لوگ دلائل سے عاجز ہوتے ہیں وہ کشفوں کا سہارا لیا کرتے ہیں کسی کے ہدایت یافتہ یا گمراہ ہونے یا مسلم و کافر ہونے کے ثبوت میں کشف کیا حجت بن سکتے ہیں؟ حضرت مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں " احکام شریعت کے ثبوت میں اعتبار بس کتاب و سنت اور مجتہدین کے قیاس اور اجماع امت کا ہے۔ ان چاروں دلائل شرعیہ کے بعد کوئی پانچویں دلیل نہیں ہے جس سے کوئی شرعی حکم ثابت کیا جاسکے۔ مقربین بارگاہ خداوندی کا الہام اور اہل قلوب کا کشف ایسی چیز نہیں ہے جس سے کسی چیز کی حلت و حرمت یا اس کا فرض و سنت ہونا ثابت کیا جاسکے "

مکتوب ۵۵ بحوالہ ماہنامہ " الفرقان " لکھنؤ ماہ رجب ۶۳ھ ص ۳۰ ۔ بھلا ایسے کشفوں سے مولانا السید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب مدظلہ العالی کی تردید کی جاسکتی ہے یا ان تکوں کا سہارا لیا جاسکتا ہے؟؟

مولانا السید موصوف اقامت دین کی تحریک چلا رہے ہیں اور بہترین خدمت اسلام کر رہے ہیں انکی اعانت کرنی چاہیئے جو علماء ان کی مخالفت کر رہے ہیں اور کشفوں اور الہاموں پر اپنی عمارت استوار رہے ہیں ان کو ان کی رہنگ ذمہ داری کا احساس دلانا میرا اور آپ کا کام نہیں ہے وہ اس شغل میں مگن ہیں کسی کے روکنے سے رکنے والے نہیں ہیں ۔

مولانا السید[1] مدظلہ کی صداقت کی کیا یہی دلیل کافی نہیں کہ لوگوں کی مخالفت اور بے جا سب و شتم کے جواب میں وہ بالکل خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتے جارہے ہیں اور اگر کبھی کسی کا جواب دیتے ہیں تو اپنے وقار کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے کسی کی بدزبانی یا گالیوں کے جواب میں اسی بدزبانی کو کام میں نہیں لاتے ۔ اللہ تعالیٰ انہیں استقامت بخشے آمین ۔

آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ۔ مولانا موصوف کے کام اور جدوجہد کو دیکھ کر آپ خود فیصلہ کرسکتے ہیں کہ وہ حق پر ہیں یا باطل پر؟ اور ان کی گمراہی کا ثبوت ٹھوس دلائل کا محتاج ہے ۔ کشفوں اور خوابوں یا الہاموں پر فیصلہ نہیں دیا جاسکتا ۔

کنز العمال کی جو عبارت آپ نے لکھی ہے تو کنز العمال میرے پاس موجود نہیں ہے ۔ والسلام

محمد چراغ صدر مدرس مدرسہ عربیہ گوجرانوالہ ، ۱۵ $\frac{۳}{۶۳}$

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی

محمد اسد اللہ کاشمیری

میلاد النبیؐ اور اُس کی رسوم

کسی پیغمبر کے "میلاد" منانے کی شرعاً کوئی اہمیت نہیں۔ اہمیت ان تعلیمات کو ہے۔ جو اللہ کی طرف سے اُس نے دُنیا میں پیش کی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دُنیا والوں کو جو پیغام دیا۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ جس کے معنی ہیں۔ کہ اللہ کے سوا کوئی بھی بندگی اور اطاعت کے لائق نہیں ہے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لایا جائے تو اس کے لئے ان تمام احکام وعبادات پر ایمان لانا اور اُن پر چلنا ضروری ہو جاتا ہے۔ جو اللہ کی طرف سے پیغمبرؐ کی وساطت سے ہمیں ملیں۔ توحید و رسالت کے بعد اللہ تعالیٰ کے فرشتوں پر اس کی کتابوں پر۔ اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر بھی ایمان لانا ضروری ہو جاتا ہے۔ ان امور پر ایمان لانے کے بعد نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ اور حج کی عبادتیں فرض کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے بنی نوع انسان کے حقوق واخلاق کے متعلق جامع ہدایات دیں۔ کہ والدین سے اچھا سلوک کرو۔ ہمسایوں سے اچھا سلوک کرو۔ رشتہ داروں۔ غلاموں اور محتاجوں سے اچھا سلوک کرو۔ بیویوں اور ماتحت لوگوں اور مسافروں اور مہمانوں سے اچھا سلوک کرو۔ انسان اور حیوان سے اچھا سلوک کرو۔ بچوں سے حسن سلوک کرو۔ غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ کی اصلاح کی بابت آپ نے مکمل اور جامع ہدایات پیش کی ہیں۔ اور دین کو کامل کر دیا ہے۔ یہ تمام تعلیمات وہدایات خدا کی کتاب قرآن مجید میں موجود ہیں۔ اور ہم ہر وقت ان سے آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اِدھر اُدھر بھٹکنے کی بجائے قرآن اور سُنت رسولؐ کی طرف رجوع کریں۔ اور ان کے احکام پر عمل کریں۔ اسی صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے دن کا حق ادا ہو سکتا ہے اور آپؐ کی بعثت کا مقصد پورا ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے۔ تو صرف میلاد کا جشن منانے اور اس پر لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے باوجود آپؐ کی بعثت کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ جس کے لئے آپؐ نے بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کیں۔

موجودہ جشن میلاد

آجکل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جنم دن کی خوشی میں جو جشن منایا جاتا ہے۔ اس کا نام "میلاد النبیؐ" رکھا گیا۔ جس کی نمائش وآرائش میں بڑا روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ یہ روپیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو عام کرنے اور اسلام کی تبلیغ پر خرچ کیا جاتا۔ جس کی اِس وقت اشد ضرورت تھی۔ اور تبلیغ واشاعت ہی آپؐ کی بعثت کا مقصد تھا مگر افسوس! اس مقصد سے ہٹ کر مسلمان رسمی اور غیر اہم کاموں کی طرف لگ گئے ہیں۔ اس زمانے کے دوسرے بگڑے ہوئے منسوخ مذاہب کے پیرو جو عرصہ تک ایسی ہی رسوم واختراعات میں مبتلا ہو کر قعرِ مذلت میں گر گئے۔ وہ تک اب یہ سمجھ گئے ہیں۔ کہ اصل کام تو اپنے مذہب کا پرچار کرنا ہے۔ نہ جنم دن۔ سالگرہ اور دیگر نام نہاد جشن اور میلے منانا۔ چنانچہ وہ اب بھی روپیہ جو ان نام نہاد دنوں پر پہلے دریغ خرچ کر ڈالتے تھے۔ اپنے مذاہب کے

تبلیغ پر خرچ کرتے ہیں۔ جس سے سینکڑوں مسلمان اسلام چھوڑ کر عیسائیت، اشتراکیت اور لادینیت قبول کر چکے اور کرتے جا رہے ہیں۔ مگر ایک سچے دینِ اسلام کے پیرو اب خود انہی رسوم و اختراعات میں مبتلا ہو گئے ہیں اور دعوت و تبلیغ کا مقصد چھوڑ بیٹھے ہیں۔ اور میلاد کے جشنوں۔ عرسوں اور میلوں کے نام نہاد دنوں پر بے دریغ روپیہ خرچ کر ڈالتے ہیں۔

جو لوگ میلاد کا جشن مناتے ہیں ان کو یہ سوچنا چاہیئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات بھی اسی ماہ ربیع الاول میں سوموار کے دن ہوئی ہے۔ چنانچہ ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ عام طور پر "بارہ وفات" ہی کے نام سے مشہور ہے۔ آخر جشن منانے کا موقع ہی کونسا ہے۔ اگر میلاد کی خوشی منانا درست ہے۔ تو آپؐ کی وفات کے غم میں "عرس" منانا یا ماتم کا جلوس نکالنا کیوں درست نہیں؟ مگر واضح رہے کہ شریعت میں میلاد منانے کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ بلکہ یہ رسوم مسلمانوں میں غیر قوموں کی دیکھا دیکھی رائج ہو گئی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہزاروں پیغمبر پیدا ہوئے اور پھر فوت ہو گئے۔ اگر میلاد منانا جائز ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کم سے کم ان میں سے بڑے بڑے پیغمبروں ہی کا یوم میلاد مناتے مثلاً اپنے اور ہم سب کے باپ حضرت آدم علیہ السّلام یا حضرت نوح علیہ السّلام کا میلاد مناتے، اُمت کے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا میلاد مناتے یا حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا میلاد مناتے۔ آپؐ سے زیادہ ان پیغمبروں سے کسی کو محبت و عقیدت نہ تھی۔ اور اگر میلاد یا عُرس منانے سے اظہارِ عقیدت و محبت ہوتا جیسا کہ کہا جاتا ہے تو پھر حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ۔ تابعینؒ۔ تبع تابعینؒ میں سے کوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا میلاد مناتا۔ کیونکہ ان سے زیادہ تو آپ سے محبت کرنیوالا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ جب انھوں نے میلاد نہیں منایا تو اب ہمارے لئے میلاد منانا کیسے جائز ہو سکتا ہے ہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سابق پیغمبروں کی تعلیمات اور ان کی تبلیغ کے لئے ان کی مساعی کا بار بار تذکرہ کیا اور خود قرآن ایسے تذکروں سے بھرا پڑا ہے تاکہ وحدانیت الٰہی کی اہمیت واضح ہو جائے اور آپؐ اعلان فرماتے رہے کہ میں بھی وحدانیت الٰہی ہی کو قائم کرنے کے لئے مبعوث ہوا ہوں۔ بس اسی کی بندگی کرو۔

جشنِ میلاد کی ابتداء

سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جب نہ کتاب و سُنّت میں میلاد منانے کا تذکرہ ہے۔ نہ خیر القرون میں اس کی کوئی مثال ملتی ہے۔ تو پھر یہ کب سے اور کیسے ایجاد ہوا؟

سو اس کا جواب یہ ہے۔ جیسا کہ تاریخ ابن خلکان میں مذکور ہے۔ کہ سب سے پہلے میلاد منانے کی رسم ۶۰۴ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ۵۹۲ سال بعد ایجاد ہوئی ہے۔ اور اس کو ایجاد کرنیوالا موصل کا ایک عجمی بادشاہ سلطان ابو سعید مظفر تھا۔ جو عیاشانہ زندگی گزارنے کی وجہ سے رعایا میں غیر مقبول ہو رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ مقبول ہو۔ چنانچہ اس نے عوام کو اپنی طرف راغب کرنے اور انہیں اپنی دینداری اور محبت نبویؐ کا یقین دلانے کے لئے جشنِ میلاد منانا شروع کیا۔ تاکہ اس طرح اس کی زندگی پر پردہ پڑا رہے چنانچہ علامہ ذہبی کے قول کے مطابق وہ ہر سال "میلاد النبیؐ" کے جشن اور اس کی آرائش و نمائش پر تین لاکھ روپیہ خرچ کر ڈالتا تھا۔ اس بدعت کو شرعی حیثیت دینے کے لئے اس نے ایک تنگ نظر اور خوشامدی مولوی عمیر بن دحیہ کو بھی لالچ دے کر ساتھ ملا لیا تھا۔

.... ۔ علامہ فاکہانی نے اس مسئلہ پر ایک کتاب لکھی جس میں ثابت کیا کہ میلاد منانا بدعت ہے۔ انھوں نے واضح کیا۔ کہ کسی نعمت کے ظہور کی تاریخ کو ہر سال جشن کے طور پر منانے کی شریعت میں کوئی بنیاد نہیں ہے۔ ذکر رسولؐ ہر وقت کیا جا سکتا ہے ۔ اسے ۱۲ ربیع الاوّل کی تاریخ سے خاص کرنا اور اسے مختلف قیود و شرائط سے مقید و مشروط کر دینا اور لوگوں کو بیجا تکلفات کا پابند بنانا اور اس پر کثیر رقم صرف کرنا ایک آسان امر کو مشکل بنا دینا شریعت کے مطابق نہیں ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جشن میلاد منانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اظہار عقیدت و محبت کا ایک طریقہ ہے۔ سو واضح ہو کہ اظہار محبت و عقیدت کا وہی طریقہ درست ہو سکتا ہے جو کتاب و سنت سے ثابت ہو یا ان کی منشا کے مطابق ہو۔ نہ وہ جو اس کے خلاف ہو۔ سو آئیے دیکھیں کہ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری کیا رہنمائی کی ہے۔ اور انھوں نے اظہار محبت و عقیدت کا کیا طریقہ بتایا ہے۔ مگر یاد رہے۔ کہ کسی انسان سے محبت کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی محبت ہے، جسے اللہ سے محبت ہے، اُسے اس کے پیغمبرؐ سے بھی ہے جسے اللہ سے محبت نہیں ہے اسے اس کے پیغمبرؐ سے بھی محبت نہیں ہے۔ کیونکہ مومن کو سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ سے ہوتی ہے۔

قرآنی نقطۂ نظر

سو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے ساتھ محبت کا معیار یہ ہے کہ میرے پیغمبر کی اطاعت کی جائے۔ فرمایا۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ ...... "اے پیغمبر! دُنیا والوں سے کہدے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا چاہتے ہو۔ تو میری تابعداری کرو۔ تب اللہ تعالیٰ تم سے بھی محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا۔ یقین جانو کہ اللہ تعالیٰ ہی بخشنے والا مہربان ہے۔ اے پیغمبر! اعلان کر دیجے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ لیکن اگر وہ اطاعت سے منہ موڑ لیں۔ تو یقین رکھو۔ کہ اللہ تعالیٰ منکروں سے محبت نہیں رکھتا" ایک اور مقام پر فرمایا:۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ......"

دراصل تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ جو شخص اللہ کی اور پچھلے دن کی اُمید رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرتا رہتا ہے۔"

ان آیات میں ہدایت کی ہے۔ کہ اطاعت سے منہ نہ موڑیں۔ اور ہر معاملہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلیں چنانچہ ایک اور موقعہ پر فرمایا:۔

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ...... جس نے پیغمبر کی اطاعت کی اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی۔

اس طرح بے شمار آیات ہیں۔ جن میں یہی ہدایت ہے۔ کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اطاعتِ رسولؐ ہی مومنوں کا اظہارِ محبت ہے۔ اور اطاعت ہی محبت کا واحد معیار ہے۔ اور اطاعت ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سچے معنی میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرتا ہے اور جو اطاعت میں جتنا زیادہ بڑھا ہوا ہو وہ شخص اتنا ہی محبت میں بڑھا ہوا ہو گا۔ اور جو شخص فرائض و واجبات کا تارک ہے۔ رشوت اور مال حرام سے اجتناب نہیں کرتا۔ جھوٹ بولنے کا عادی ہے۔ ناپ تول میں کمی کرتا ہے۔ لوگوں کے حقوق کی پروا نہیں کرتا۔ سُود لیتا اور یتیموں اور عاجز لوگوں کا مال کھاتا ہے لین دین میں اچھا نہیں، اور سال بھر نافرمانی کرتا ہے، وہ صرف جشن میلاد کا اہتمام کرنے اور اس پر روپیہ پیسہ خرچ کرنے سے کیسے محبِ رسول ہو سکتا ہے۔ وہ تو رسولؐ کی تعلیمات کو روند رہا ہے۔ ایسا شخص محبِ رسولؐ نہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اطاعت ہی کو ایمان و محبت کا معیار قرار دیتا ہے۔ فرمایا۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ اگر تم مومن ہو تو اللہ اور اس کے پیغمبرؐ کی اطاعت کرو۔

ارشاداتِ نبویؐ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومنوں کو میرے ساتھ کیسی محبت ہونی چاہیئے؟ فرمایا:۔

"کوئی شخص تم میں سے مجھ پر ایمان نہیں رکھتا جب تک وہ مجھ سے اپنے باپ، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبت نہ رکھے"

اس حدیث میں محبت سے مراد ایمانی محبت ہے نہ طبعی محبت، اور ایمانی محبت سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے ماں باپ اور اولاد اور تمام لوگوں کی اطاعت کے مقابلے میں رسولؐ کی اطاعت کو ترجیح دیدے۔

بعض لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبالغہ آمیز تعریفیں کرتے ہیں، اور اس سے لوگوں کو یقین دلاتے ہیں کہ وہ بہت بڑے محبِ رسول ہیں اور نہیں سمجھتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے کہ میری بابت بیجا اور مبالغہ آمیز تعریفیں مت کرو ارشاد ہے:-

لَا تُطْرُوْنِیْ کَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ وَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ۔ "مجھے بڑھا چڑھا کر مت بیان کرو جیسا کہ نصاریٰ نے عیسیٰ ابن مریم کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ صرف یہ کہا کرو کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔"

آپ کے احسانات کے شکریہ کا طریقہ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ درست ہے کہ اطاعت ہی محبت کا واحد معیار ہے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خدا کا راستہ بتایا اور یہ اُن کا ہم پر بڑا احسان ہے۔ سو میلاد کا جشن آپ کے احسان کے شکریہ کا ایک طریقہ ہے۔ واضح ہو کہ شکریہ کا وہی طریقہ درست ہے۔ جو خود اسلام نے ہمیں سکھایا۔ نہ وہ جو اسلام کے خلاف ہو۔ اگر یہ طریقہ درست ہوتا تو صحابہ کرام ایسا کرتے اور اللہ کا شکر ہے۔ کہ ہمیں کتاب و سنت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہمیں کس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات کا شکریہ ادا کرتے رہنا چاہیئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِکَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔
"یقیناً اللہ اور فرشتے اس پیغمبر پر رحمت بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی اس پر درود رحمت اور بہت بہت سلام بھیجتے رہو۔"

اسی حکم کے مطابق مسلمانوں کو سکھایا گیا ہے۔ کہ وہ اپنی نمازوں میں آپؐ پر درود و سلام بھیجا کریں۔ چنانچہ دن میں پانچ مرتبہ ہر مسلمان ہر نماز میں آپؐ پر اور آپ کے تابعداروں پر درود و سلام بھیج کر آپؐ کے احسانات کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ "التحیات" میں پڑھتا ہے:-

اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّهَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُهٗ، اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِیْنَ
"اے نبیؐ! تجھ پر اللہ کا سلام۔ اس کی رحمت و برکت ہو اور ہم پر اور تمام نیک بندوں پر بھی سلام ہو۔"

.... پھر آپؐ کی رسالت کی شہادت نماز کی ہر "التحیات" میں دہرائی جاتی ہے۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔
"میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمدؐ اللہ کے بندے اور اس کے رسولؐ ہیں۔"

اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے آپؐ کے لئے خاص طور پر درود رحمت اور برکت نازل فرمانے کی استدعا کی جاتی ہے۔ اور اسی سلسلہ میں آپؐ کی خدمات و احسانات ہی کا شکریہ پیش نظر ہوتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰٓی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرَاهِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰهُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰٓی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرَاهِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝

"اے اللہ۔ حضرت محمدؐ پر درود بھیج اور آپؐ کے تابعداروں پر بھی جیسا تو نے حضرت ابراہیمؑ اور آپکے تابعداروں پر درود بھیجا
اے اللہ حضرت محمدؐ پر اور اُن کے تابعداروں پر برکت بھیج جیسا تو نے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے تابعداروں پر برکت بھیجی"
ظاہر ہے کہ میلاد منانے والے جو سال بھر میں ایک جشن منانے کو آپؐ کے احسانات کا شکریہ سمجھتے ہیں۔ اُن مومنوں کی برابر کیسے ہوسکتے ہیں؟ جو اپنی نمازوں میں دن میں بیسیوں مرتبہ آپؐ پر درود اور سلام بھیجتے ہیں۔ اس طرح ہر نماز کی اذان میں مسلم آبادیوں کی بلندیوں اور بستیوں میں اعلان ہوتا ہے۔

أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللهِ "کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمدؐ اللہ کے رسول ہیں"۔

اسلام میں اظہارِ عقیدت ومحبت اور پیغمبر کے احسانات کا شکریہ ادا کرنے کے یہی طریقے ہیں۔ اور ہر پیغمبر نے اپنے اپنے زمانے میں اپنی اپنی اُمتوں کو یہی طریقے سکھلائے ہیں۔ انہی طریقوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوحِ مُبارک کو ثواب بھی پہونچتا ہے۔ جشن منانے اور آرائش ونمائش سے تو کوئی ثواب نہیں پہونچتا۔ اسی لئے کسی پیغمبر نے یہ نہیں کیا۔ کہ میرے بعد میرا میلاد مناتے رہنا۔ نہ صحابہ کرام تابعین اور تبع تابعین کے بہتر زمانہ میں ایسے امور عمل میں آئے۔ اسی لئے مذہب:۔
حنفی ——— مالکی ——— شافعی ——— حنبلی ——— کے بڑے بڑے علمائے نے بالاتفاق میلاد منانے پر نکتہ چینی کی ہے۔

میلاد اور چار مذاہب

قاضی شہابُ الدین دولت آبادی کی کتاب "تحفۃ القضاۃ" میں لکھا ہے کہ "ان سے میلاد کی مجلس منعقد کرنے کے بارے میں سوال کیا گیا۔ انھوں نے جواب دیا۔ کہ یہ مجلس منعقد نہ کی جائے"۔ کیونکہ:۔

"یہ تین بہتر زمانوں کے بعد کی بدعت ہے۔ اور یہ جو بعض لوگ ہر سال ربیع الاول میں جشن مناتے ہیں۔ کوئی شے نہیں۔ اور آپؐ کی ذکرِ ولادت کے موقعہ پر سارے اس اعتقاد سے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوحِ مُبارک آجاتی ہے اور حاضر ہے یہ خیال اور نظریہ دُرست نہیں۔ چاروں اماموں نے منع کیا ہے"۔

——— احمد بن محمد مصری مالکیؒ نے اپنی کتاب "القول المعتمد" میں چاروں مذاہب کے علمائے کے اقوال میلاد منانے کی مذمت میں نقل کئے ہیں۔ اور لکھا ہے:۔

"چاروں مذاہب کے علماء میلاد منانے کی مذمت میں متفق ہیں"۔

چنانچہ علامہ نصیرالدین الاودی شافعی اور علامہ شرف الدین حنبلی ابوالحسن علی بن فضل المالکی۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی حنفی اور دیگر بڑے بڑے علمائے نے اس کی ممانعت میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:۔

"میلاد نہ منایا جائے۔ کیونکہ سلف صالحین سے ثابت نہیں۔ تین بہتر زمانوں کے بعد بُرے زمانہ کی ایجاد ہے اور ہم پچھلے لوگوں کی تابعداری ایسے معاملات میں نہیں کر سکتے۔ جنھیں اگلے بزرگوں نے مہمل سمجھا تھا۔ ہمیں گذشتہ صالح لوگوں کی اتباع ہی کافی ہے۔ ہمیں بدعتیں ایجاد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اکثر یہ مجالس دُنیادار لوگ مناتے ہیں۔ اور ان احکام کو نہیں جانتے جو صاحبِ شریعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیئے ہیں"۔

میلاد کی موجودہ خرابیاں

میلاد منانے کے سلسلہ میں آجکل اتنی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں کہ کسی سمجھ دار اور دیندار آدمی کا دل خوش نہیں ہو سکتا۔ اگر ان خرابیوں کا سدِّباب نہ کیا گیا تو اسلام بھی دوسرے مذہب کی

طرح قصوں اور جشنوں کا مذہب اور مسلک بن کر رہ جائے گا۔ چند ایک خرابیوں کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔

۱۔ جشنِ میلاد کا اتنا اہتمام کیا جاتا ہے۔ کہ نماز باجماعت۔ جمعہ اور عیدوں کے موقعہ پر اتنا اہتمام نہیں کیا جاتا حالانکہ فرائض و واجبات کی انجام دہی سے زیادہ کسی اور تقریب کا اتنا اہتمام "خیر القرون" میں نہیں ہوا۔

۲۔ جشنِ میلاد اور اس کی رسوم کو ترک کرنا اتنا شاق گذرتا ہے کہ فرائض و واجبات کو ترک کرنا اتنا شاق نہیں گزرتا بلکہ اگر کوئی شخص دین کی خیر خواہی کے پیشِ نظر ایسے امور سے منع کرے تو جاہل لوگ بد زبانی اور طعن و تشنیع پر اتر آتے ہیں۔ اور اس کے درپے آزار ہو جاتے ہیں۔

۳۔ ضرورت سے زیادہ نمائشی سامان خرچ کیا جاتا ہے۔ اور بیجا تکلفات کئے جاتے ہیں۔ مثلاً چراغاں میں جہاں ایک لیمپ یا بلب کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں درجنوں بلکہ سینکڑوں چراغ روشن کئے جاتے ہیں۔ اس طرح جگہ جگہ دروازے بنائے جاتے ہیں اور یہ اسراف اور فضول خرچی ہے۔ جس سے قرآن مجید نے منع فرمایا ہے لَا تُسْرِفُوْا فضول خرچی نہ کرو۔

۴۔ میلاد کی مجالس میں خوبصورت اور خوش آواز لڑکوں سے نعت خوانی کرائی جاتی ہے اور یہ چیز رفتہ رفتہ فتنہ و فساد کا باعث بن جاتی ہے۔

۵۔ جو نعتیں اور نظمیں پڑھی جاتی ہیں۔ ان کے اشعار خلافِ شریعت۔ مبالغہ آمیز اور بعض خلافِ واقعہ ہوتے ہیں جس سے دین میں "غلو" اور گمراہی کا راستہ پیدا ہوتا ہے۔ بعض اشعار سے خدا۔ پیغمبر۔ ملائکہ کی توہین کا پہلو بھی صریحی یا کنایۃً نکلتا ہے۔ چند ایسے شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں:۔

شریعت کا ڈر ہے نہیں صاف کہہ دوں　　خدا خود رسولِ خدا بن کے آیا

اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے　　جو کچھ ہمیں لینا ہے لے لیں گے محمدؐ سے

خدا گر پکڑ لے چھڑا لے محمدؐ　　محمدؐ جو پکڑے چھڑا لے نہ کوئی

اس قسم کے اشعار پر مشتمل نعتیں جن پر لوگ جذبات میں آکر نعرے مارتے ہیں۔ اور وجد و حال میں آجاتے ہیں۔ جاہلوں کی تصنیف ہیں۔ اور فی زمانہ تو بیشتر نعتیں فلمی گانوں کے ریکارڈ لتا۔ نور جہاں وغیرہ کے طرز پر گائی جاتی ہیں۔ جو اسلام کے شایانِ شان نہیں۔

پھر یہ فلمی طرز پر گانے والے عموماً جاہل۔ بے نماز۔ اور ڈاڑھی منڈے ہوتے ہیں۔ مگر انہیں صرف مالداری یا آواز یا کسی اور سبب سے مجلس کا سرپرست اور روحِ رواں بنا دیا جاتا ہے۔ جو ان مجالس کے تقدس اور وقار کے قطعاً خلاف ہے۔

پھر وعظ خواں بے سر و پا کہانیاں اور موضوع روایات بیان کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ آپ کا سایہ نہ تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

——— ان مجالس میں غیر اسلامی حرکات کا رسوم۔ شرعی امور کی خلاف ورزی بھی ہوتی ہے۔ مگر تادیب کرنے والا اور روکنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ بعض دفعہ فرض نماز فوت ہو جاتی ہے۔ یا وقت تنگ ہو جاتا ہے۔ مگر پروا نہیں کی جاتی۔ یہاں تک کہ جو نعتیں پڑھی جاتی ہیں۔ ان کی جانچ کرنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔ جو کم سے کم یہ دیکھے کہ کونسی نعت پڑھنے کے قابل ہے اور کونسی نہیں اور پھر ایسی مجالس کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں۔ (نعوذ باللہ)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جشنِ میلاد منانے سے اسلام کی شوکت کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر نہیں جانتے کہ رسموں اور جشنوں سے اسلام کی شوکت کا اظہار نہیں ہوتا۔ اسلام کی شوکت کا اظہار اسلام کے احکام پر عمل کرنے سے ہوتا ہے۔ اگر عمل ہی نہ ہو تو شوکت کس کام کی!
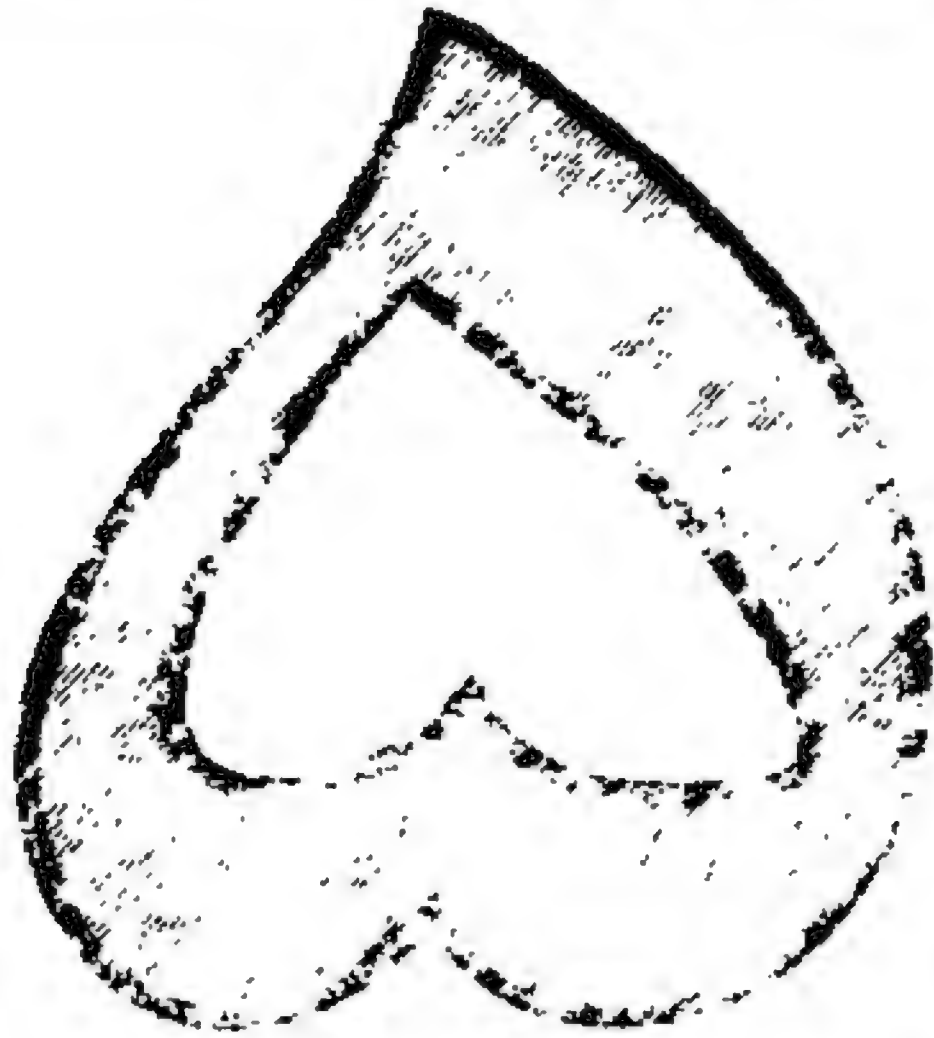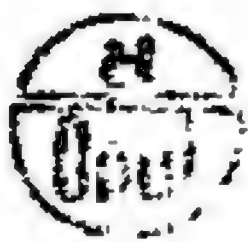
———×———

از:- پروفیسر خواجہ محمد اسلم
پرنسپل اسلامیہ کالج (لاہور)

اسلام کا نظریۂ مملکت

جناب صدر گرامی قدر، خواتین و حضرات!

وہ لوگ جنھوں نے قرآن و سنّت کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہیں کہ اسلام عابد و معبود کے درمیان کسی انفرادی تعلق کا عنوان نہیں۔ بلکہ یہ ایک ہمہ گیر نظام حیات ہے۔ جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سارے پہلوؤں کا پوری طرح سے احاطہ کرتا ہے۔ ذاتی اور شخصی زندگی کے معمولی سے معمولی مسائل سے لے کر اجتماعی زندگی کے اہم سے اہم معاملات میں اس سے رُشد و ہدایت حاصل کی جا سکتی ہے۔ حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو اس کی حیات آفریں شعاعوں سے منوّر نہ ہو۔ یہ اگر ایک وقت انسان کے اندر قلبی سوز و گداز اور رُوحانی لطافت و طہارت کی تخم ریزی کرتا ہے تو دوسری طرف انسان کی اجتماعی زندگی کو عدل و انصاف کی بنیاد پر استوار کرنے کے لئے نہایت ہی محکم اصول بھی فراہم کرتا ہے۔ تاکہ زندگی کی فطری وحدت کو قائم اور برقرار رکھا جا سکے۔ اور اخلاق و اقتدار باہم مل کر انسانیت کی تہذیب کا مقدس فرض سرانجام دیں۔ غالباً اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دُنیا کے سب سے بڑے عارف ربانی ؒ نے فرمایا:-

> "اسلام اور ریاست دو توام بھائی ہیں۔ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر دُرست نہیں ہو سکتا۔ اسلام کی مثال ایک عمارت کی ہے۔ اور ریاست گویا اس کی نگہبان ہے۔ جس عمارت کی بنیاد نہ ہو۔ وہ گر جاتی ہے اور جس کا نگہبان نہ ہو وہ لوٹ لیا جاتا ہے"۔

تمدن کا صحیح توازن قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ امور مملکت بھی اسی طرح تعلیماتِ الٰہی کے پابند ہوں۔ جس طرح کہ افراد پر ان کی پابندی لازم کی گئی ہے۔

آج کی اس محفل میں مجھے ریاست کے بارے میں اسلام کے اساسی تصورات کے متعلق چند معروضات پیش کرنی ہیں۔ اس موضوع پر جب بھی غور و فکر کیا جاتا ہے۔ تو پہلے قدم پر یہ سوال سامنے آتا ہے۔ کہ اس میں حاکمیت کا حق کسے حاصل ہے۔ کیا یہ حق کسی خاص فرد۔ گروہ یا کسی خاص خاندان قبیلہ یا قوم یا کسی فوق الفطرت ہستی کو حاصل ہے۔ یہ وہ بنیادی سوال ہے۔ جس کا جواب دیئے بغیر ہم ریاست کے متعلق کوئی چیز طے نہیں کر سکتے۔ اس سوال کے جواب کے لئے ہم قرآن مجید کی طرف رُجوع کرتے ہیں۔ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں حاکمیت اُسی بلند و بالا اور ارفع و اعلیٰ ذات کی ہے۔ جو اس پوری کائنات کی واحد خالق اور مالک ہے۔ اور جس کے قبضۂ قدرت میں مخلوق کی ہر چھوٹی بڑی چیز ہے۔ چنانچہ قرآن مجید اپنے مخصوص بلیغانہ انداز میں ارشاد فرماتا ہے۔

اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ　　　خبردار! خلق اسی کی ہے۔ اور امر (یعنی حکم) بھی اسی کا ہے۔
سورۃ الاعراف آیہ ۵۴

علامہ اقبالؒ نے اپنی کتاب (The Reconstruction of Religious thoughts in Islam) یعنی "اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید میں" اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے:۔

(His is the creation and His is Directive.)

اس کا مطلب یہ ہے۔ جس طرح پوری کائنات اس کے امر تکوینی کی پابند ہے۔ اسی طرح انسان کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ وہ اپنی زندگی کے اختیاری گوشوں میں بھی اس کے احکام کی پابندی کرے۔ چنانچہ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر اس کی صراحت کی گئی ہے۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ　　　حکم تو صرف اللہ کے لئے ہی ہے۔ اس کا فرمان ہے
ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (سورہ یوسف۔ ۴۰)　　　کہ تم بندگی کرو۔ تو صرف اللہ کی۔ کہ یہی صحیح دین ہے۔

یہ آیت اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ فیصلہ کرنے کا اختیار اور فرمانروائی کا حق بالفاظ دیگر حاکمیت اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے۔ یہاں کوئی لفظ یا قرینہ ایسا موجود نہیں ہے۔ جس کی بنا پر اس حاکمیت کو محض تکوینی حاکمیت کے مفہوم میں مقید کر دیا جائے۔ اللہ کی حاکمیت جس طرح کائناتی ہے۔ اسی طرح سیاسی اور قانونی بھی ہے اور اخلاقی اور اعتقادی بھی۔

حدیث میں اسی امر کی طرف نہایت واضح الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین نام اس شخص کا ہے۔ جس کو شہنشاہ کہا جائے۔ یہ روایت بخاری میں درج ہے۔ اور اسی مفہوم کی روایت صحیح مسلم میں بھی تھوڑے سے لفظی تغیر کے ساتھ یوں مرقوم ہے۔

"قیامت کے روز اللہ کی ناراضگی کو سب سے زیادہ انگیخت کرنے والا سب سے زیادہ خبیث وہ شخص ہوگا۔ جسے دنیا میں شہنشاہ کے لقب سے پکارا گیا ہو۔"

اللہ کی حاکمیت کا یہ تصور کوئی فروعی مسئلہ نہیں۔ بلکہ اسلامی نظام حیات کا یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ جس پر امت میں پورا پورا اتفاق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ شیخ محمد خضریؒ اپنی مشہور کتاب اصول الفقہ میں اس کی تصریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"درحقیقت حکم اللہ کے فرمان کو کہتے ہیں۔ پس حکم دینے کا حق اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ اور یہ ایک ایسی بات ہے جس پر تمام مسلمان متفق ہیں۔"

علامہ اقبالؒ کا یہ ارشاد ؎

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے　　　حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری

محض شاعرانہ احساس نہیں۔ بلکہ اسلامی تصور ریاست کی حقیقی بنیاد اور اساس ہے۔ مندرجہ بالا تصور ریاست کا فطری اور منطقی تقاضا یہ ہے کہ اطاعت اور فرمانبرداری کا مرجع بھی خالق اور اس کی ہدایات ہوں اور ریاست میں باقی وفاداریاں اسی بنیادی وفاداری کے تابع ہوں۔ اس اصول کی وضاحت قرآن کریم نے اس طرح کی ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ　　　اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ

اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (نساء - ۵۹) کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔

یہ آیت اسلام کے نظامِ اطاعت کی اوّلین دفعہ ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کے نزدیک اصل مُطاع اللہ تعالیٰ ہے اور باقی جو کچھ بھی ہے۔ وہ اس کے تابع ہے۔ رسولؐ کی اطاعت کا جو یہ حکم دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے۔ کہ رسولؐ ہی وہ مستند ذریعہ ہے۔ جس سے ہم تک خدا کا فرمان اور اس کے احکام پہنچتے ہیں۔ ہم خدا کی اطاعت صرف رسولؐ کے احکام کی پیروی کر کے ہی کر سکتے ہیں۔

چنانچہ قرآن مجید نے رسول کی اس حیثیت کی بھی وضاحت فرما دی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ (نساء - ۶۴) ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے۔ اس لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

حافظ ابن قیم نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف اعلام الموقعین[1] میں اسلام کے نظام اجتماعی میں اطاعت اور اس کے شرائط اور حدود پر جو بحث فرمائی ہے۔ وہ بڑی فکر انگیز ہے۔ اور اس مسئلے کی تصریح میں اس سے راہ نمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

اَطِیْعُوْا کے لفظ کو جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے استعمال کیا ہے۔ اسی طرح اپنے نبی کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ مگر اطاعت امر کا ذکر کرتے ہوئے فعل کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ امیر کی اطاعت اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے تابع ہے۔ اگر امیر اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے احکام کے مطابق حکم دیتا ہے تو اس کا ماننا فرض ہے۔ لیکن اگر اس کا کوئی حکم فرمانِ خداوندی یا فرمانِ رسولؐ کے خلاف ہے تو اس کا ماننا حرام ہے۔

اسی حقیقت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ہے:-

"خدا اور رسولؐ کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں۔ اطاعت جو کچھ بھی ہے۔ وہ معروف میں ہے"

خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بار خلافت اٹھانے کے بعد سب سے پہلا خطبہ جو ارشاد فرمایا۔ اس میں اس امر کی پوری طرح تصریح موجود ہے۔ انھوں نے فرمایا:-

اے لوگو! جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں۔ تم میری اطاعت کرو اور جب میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کروں۔ تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں[2]۔

اس اہم ترین دستوری مسئلے کا فیصلہ ہو جانے کے بعد کہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی قانونی حاکمیت کے نمائندے ہیں۔ جن کے ذریعہ ہمیں شارع، (Law giver) کے احکام پہنچتے ہیں۔ یہ حقیقت خود بخود منکشف ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی جو ایجنسی بھی انبیاء علیہم السلام کی پیروی میں اللہ تعالیٰ کی قانونی حاکمیت کو نافذ کرنے کا فرض ادا کرے گی وہ لامحالہ خود حاکم اعلیٰ تو نہ ہوگی۔ بلکہ اس حاکم اعلیٰ کی نائب ہوگی۔ نیابت کا لفظ سن کر آپ کے ذہن ظل اللہ پاپائیت اور بادشاہوں کے حقوق ربانی (Divine Right of Kingship) کی طرف نہ منتقل ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے سارے فتنوں کے دروازے یہ کہہ کر بند کر دیئے ہیں کہ خلافت یا نیابت کسی فرد واحد یا کسی خاندان یا کسی مخصوص طبقے کا خدائی حق نہیں۔ بلکہ اس سے تمام وہ لوگ سرفراز کئے گئے ہیں جو اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔

[1] حصہ اول صفحہ ۵۰ مصری ایڈیشن - [2] البدایہ والنہایہ ج ۵ صفحہ ۲۴۸۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ (النور - ۵۵)

اللہ نے وعدہ کیا ہے۔ ان لوگوں سے جنہوں نے تم میں سے ایمان قبول کیا اور عمل صالح کیا کہ وہ انکو زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا۔

یہ خلافت اور نیابت پوری ملت بیضا کا حق ہے اور اگر وہ انتظامی سہولتوں کے لئے بعض اہل لوگوں کو منتخب کر کے انہیں یہ حق تفویض (delegate) کر دیتی ہے تو اس سے اس کا حق نیابت سلب نہیں ہو جاتا۔ یہی وہ اصل بنیاد ہے جو اسلامی خلافت کو قیصریت۔ پاپائیت اور تھیاکریسی کے برعکس ایک جمہوریت بناتی ہے۔

اسلامی ریاست میں رئیس مملکت اور مقننہ کا انتخاب کسی خاندانی تفوق یا کسی نسلی برتری کی بنیاد پر نہیں کیا جاتا۔ بلکہ عامۃ المسلمین کی رائے سے کیا جاتا ہے۔ مسلمان ہی نہیں اپنا سربراہ بنانے اور انہیں معزول کرنے کے مختار ہیں۔ سارے انتظامی معاملات اور تمام وہ مسائل جن کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے۔ مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے پاتے ہیں اور الٰہی قانون جہاں تعبیر طلب ہو وہاں کوئی خاص انسان یا مخصوص طبقہ یا نسل نہیں۔ بلکہ عام مسلمانوں میں سے ہر وہ شخص اس کی تعبیر کا مجاز ہے جس نے اجتہاد کی قابلیت بہم پہنچائی ہو۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے۔ تو اسلامی ریاست ایک جمہوری ریاست ہے۔ اس کے اس جمہوری مزاج کو حضرت ابو بکر صدیق رضؓ کے پہلے خطبے میں بڑی اچھی طرح واضح کیا گیا ہے آپ نے فرمایا:—

> "لوگو! میں تمہارا امیر بنا دیا گیا ہوں۔ حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ پس اگر میں اچھا کام کروں۔ تو تم میری مدد کرو۔ اور اگر برا کام کروں تو تم مجھے سیدھا کرو۔ سچائی ایک امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے۔ تم میں جو کمزور ہے۔ وہ میرے نزدیک قوی ہے۔ میں اس کا شکوہ دور کر دوں گا۔ اور تم میں جو قوی ہے۔ وہ میرے نزدیک کمزور ہے۔ جب تک کہ میں اس سے دوسروں کا غصب شدہ حق نہ واپس لے لوں"[1]

اس خطبے کا اگر ذرا گہرائی میں اتر کر مطالعہ کیا جائے۔ تو معلوم ہو گا کہ اسلام میں خلیفہ کا لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ جن معنوں میں کہ حقوق ربانی کے تحت قرون وسطیٰ کے بادشاہ اور مذہبی رہنما اسے استعمال کیا کرتے تھے۔ وہ لوگ اپنے آپ کو اس دنیا میں ظل خداوندی سمجھتے تھے اس لئے ان کا یہ دعویٰ تھا کہ ان کا ہر لفظ فرمودۂ الٰہی ہے اور اس بنا پر وہ بالکل مطلق العنان اور تنقید سے یکسر بالاتر ہیں۔ اسلام میں اس تخیل کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حکمران اور فرمانروا تو الگ رہا۔ خود پیغمبر جسے ہم ہر گناہ سے معصوم سمجھتے ہیں۔ وہ بھی حقوق العباد یا دنیوی معاملات میں انہی قوانین کا پابند ہوتا ہے۔ جو عوام کے لئے ہوتے ہیں۔ پس جب خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق الوہیت کا عقیدہ نہیں ہو سکتا۔ تو خلیفہ رسولؐ کے متعلق یہ عقیدہ کیونکر درست ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیعت کے بعد جب لوگوں نے حضرت ابو بکرؓ کو یا خلیفۃ اللہ کہہ کر مخاطب کیا۔ تو آپ نے فوراً اس کی تردید کی اور بڑے زوردار الفاظ میں فرمایا۔ "میں اللہ کا خلیفہ نہیں البتہ اللہ کے رسولؐ کا خلیفہ ہوں"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آج کل کی مروجہ دستوری اصطلاح میں جس طرز حکومت کو تھیاکریسی (دینی حکومت) کہا جاتا ہے۔ اس کے اعتبار سے اسلامی حکومت ہرگز دینی نہیں ہے۔ البتہ اس حیثیت سے وہ بلا شبہ دینی حکومت ہے۔ کہ اس حکومت کا منشور اور دستور قانون الٰہی ہے۔ جس کی رو سے فرمانروا اور عامۃ المسلمین

[1] البدایہ والنہایہ ج ۵ ص ۲۴۸

اللہ اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد کرتے ہیں۔ اور اوامر و نواہی میں شریعت کے پابند رہتے ہیں۔

اسلامی ریاست میں تمام مسلمان خلافت میں برابر کے شریک ہیں۔ اس میں کسی طبقاتی تقسیم کو پرورش کرنے کا موقع نہیں مل سکتا۔ یا کوئی معاشرتی امتیاز راہ نہیں پا سکتا۔ یہاں تمام افراد بحیثیت مجموعی اور پرہیزگاری کے مساوی حیثیت اور مساوی مرتبہ ہیں۔ فضیلت جو کچھ بھی ہے۔ وہ شخصی قابلیت اور سیرت کے اعتبار سے ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے۔ جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار بہ تصریح بیان فرمایا ہے۔

"کسی کو دوسرے پر فضیلت نہیں اگر ہے تو دین کے علم و عمل اور تقوی کے اعتبار سے ہے سب لوگ آدم کی اولاد سے ہیں۔ اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ نہ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت ہے اور نہ عجمی کو عربی پر نہ گورے کو کالے پر اور نہ کالے کو گورے پر فضیلت ہے" تو تقوی کی بنا پر ہے"۔

فتح مکہ کے بعد جب تمام عرب اسلامی اسٹیٹ کے دائرے میں آگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے خاندان کے افراد کو جنہیں عرب میں مذہبی پیشوائی کا منصب حاصل تھا۔ خطاب کر کے فرمایا۔

"اے اہل قریش! اللہ نے تمہارے اندر جاہلیت کی نخوت اور اپنے آباؤ اجداد پر فخر و ناز کو ختم کر دیا ہے۔ لوگو! تم سب آدم کی اولاد ہو۔ اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ نسب کا فخر ہیچ ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فخر نہیں تم میں بزرگ وہ ہے جو تم میں سب سے متقی ہے" (خطبۃ الوداع)

خواتین و حضرات! گزشتہ معروضات میں میں اس امر کی صراحت کر چکا ہوں۔ کہ اسلامی ریاست میں حقوق شہریت کے اعتبار سے سب برابر ہیں۔ اور خلافت میں پوری ملت شریک ہے۔ یہاں کوئی فرد خواہ اس کا رتبہ کتنا ہی بلند ہو اپنے ذاتی تصورات یا رجحانات کو نافذ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں حکومت کرنے کے لئے جو رہنما اصول دیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ امور مملکت کو باہمی مشاورت کے ساتھ چلایا جائے۔

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ فِي الْأَمْرِ — مسلمانوں کے اجتماعی معاملات باہمی مشورے سے طے پانے چاہئیں۔ ان کے معاملات میں مشورہ کرو۔

علامہ عبداللہ یوسف علی قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ میں اس آیت پر اپنے ایک نوٹ میں لکھتے ہیں:۔

"اس آیت میں مشاورت باہمی کا جو اصول بیان کیا گیا ہے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عائلی اور معاشرتی زندگی میں پورے طور پر عمل کیا۔ اور آپ کے بعد جو ابتدائی دور کے حکمران تھے انہوں نے بھی اس کی مکمل پیروی کی۔ موجودہ نمائندہ حکومت (Representative form of Government) ریاستی امور میں اسی اصول پر عمل کرنے کی ایک نامکمل سی کوشش ہے"۔

وحی اور الہام کا سلسلہ چونکہ حضور سرور کائنات پر ختم ہو چکا ہے۔ اس لئے کوئی شخص بھی اپنی کسی رائے کو الہامی کہہ کر لوگوں کو اسے بے چون و چرا قبول کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ یہی وہ فرق ہے جو قرون وسطی کی مذہبی ریاست اور اسلامی نظام مملکت میں صاف دکھائی دیتا ہے۔

مذہبی حکومت کے سارے تصورات میں سب سے زیادہ عجیب و غریب تصور وہ ہے۔ جو ہمیں یہودیوں سے ملتا ہے۔ ان کا عقیدہ تھا۔ کہ کاہن (Religians Head) خیمہ کے اندر جاکر قدوس الاقداس سے براہِ راست احکام اخذ کرتا تھا۔ بلنتشی (Bluntschli) نے اپنی کتاب (Theory of State) میں نہایت ہی دلچسپ پیرائے میں ان احکام کو اخذ کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ وہ لکھتا ہے :

"قانونِ الٰہی ایک سونا منڈھے ہوئے صندوق میں رکھا ہوتا ہے جس کی دو محافظ حفاظت کرتے اور جس کی تعظیم الہام ربانی کے مرکز کی حیثیت سے کی جاتی تھی۔ تابوت خیمہ کے اندر ایک پردہ کے پیچھے قدوس الاقداس میں رہتا تھا۔ اور کاہنوں کی طرف سے پورے اہتمام کے ساتھ اس کی نگرانی ہوتی تھی۔ یہی کاہن اعظم خداوند تعالیٰ کے احکام معلوم کرتا اور لوگوں کو مطلع کرتا"

اسلام میں جیسا کہ میں پہلے گزارش کر چکا ہوں۔ اس قسم کی خرافات کی کوئی گنجائش نہیں جو احکام اللہ اور رسول نے ہمیں دیئے ہیں۔ وہ بہر حال ہمارے لئے واجب الاطاعت ہیں۔ اور باقی ایسے امور جن میں قرآن و سُنّت کی کوئی تصریح موجود نہیں۔ ملّت اسلامی کے اہل افراد باہمی مشاورت سے تصفیہ کرنے کے مجاز ہیں۔ اس ضمن میں یہ بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ اسلام کے نزدیک مملکت ایک انسانی ادارہ ہے۔ اور اس میں الوہیت کا کوئی عنصر شامل نہیں۔ اسلامی مملکت کا یہ تصور اُسے ریاست کے مسیحی تصور اور جدید تصورات سے ممیز اور ممتاز کرتا ہے۔ مسیحی تصورِ ریاست کی بنیاد یہ ہے کہ حکومت گناہ کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا محکومیت اور جبر و استبداد جو حکومت کا لازمی جزو ہے۔ سب اُسی ایک گناہ کی سزا ہیں۔ ریاست کے وجود میں آنے کا سبب بھی یہی ہے کہ انسان نے خدا کے احکام سے روگردانی کر کے شیطان کا کہا مانا۔ اس لئے اس پر ریاست مُسلّط کر دی گئی۔ پروفیسر کولنس ( ) اپنے مشہور لیکچر بعنوان (Unity Catholic and Papal) میں لکھتا ہے :-

"حکومت ایک ایسا ادارہ ہے جس کی بنیاد انسانوں کی بجائے خدا نے رکھی ہے لہٰذا جس نوعیت کی حکومت بھی ہو وہ عین منشاءِ الٰہی کے مطابق ہوگی۔ اس لئے اس میں ردّ و بدل کا معمولی خیال بھی راہِ راست سے انحراف ہے"۔

اسلام اس نظریہ کے برعکس مملکت کو انسانی ادارہ سمجھتے ہوئے جو انسانوں کی خدمت کے لئے وجود میں آیا احتساب پر زور دیتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں اس اہم مسئلے پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے کہا ہے:

"امام اور خلیفہ کا تقرر ان ہی مصالح کے قیام اور استحکام کے لئے ہے۔ جن کی بدولت ملّت بیضا اور تمدن کا نظام احسن طریق پر قائم رہ سکتا ہے"۔

یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدینؓ نے نہ صرف احتساب کو بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ بلکہ اس امر کا ہمیشہ خیال رکھا کہ کہیں لوگوں کے اندر یہ جذبہ مُردہ نہ ہو جائے۔ کیونکہ اس کے ختم ہو جانے سے ریاست کی جمہوری رُوح ختم ہو جاتی ہے اور پھر قوم فاشزم کی طرف بڑھنے لگتی ہے چنانچہ حدیث میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ لوگوں میں کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ آدمی پر صرف اس کے اپنے عمل ہی کی ذمہ داری ہے۔ جماعت کے دوسرے لوگ جو چاہیں کرتے رہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو جب اس کا علم ہوا۔ تو آپ نے لوگوں سے کہا :-

"اے لوگو! تم اس آیت کا حوالہ دیتے ہو یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ اور ہم نے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے کہ لوگ جب برائی دیکھتے ہیں اور اس کی اصلاح نہیں کرتے تو بہت ممکن ہے کہ اس کے سبب سے جو عذاب آئے۔ وہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔"

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ رعایا کے حقوق و فرائض کی تشریح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

> تم میرے نفس کے مقابلے میں میری مدد اس طرح کر سکتے ہو کہ مجھے بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو نیز خدا نے تمہاری جو ذمہ داری مجھ پر ڈالی ہے اس کے بارے میں میری خیر خواہی یہی ہے کہ مجھے نصیحت کرتے رہو۔

یہ تصریحات اس حقیقت کی پوری طرح غمازی کرتی ہیں کہ اسلام میں مملکت مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہ محض مجازی اور اعتباری طور پر مقتدر ہے۔ اس لئے اس میں الوہیت کی شان پیدا کرنا اسلام کے منشا کے یکسر منافی ہے اور اس بنا پر اس کا رئیس یا دوسرے کارکن مبرا عن الخطا ([illegible]) نہیں ہو سکتے۔

اپنی بات ختم کرنے سے پیشتر یہاں اس امر کی وضاحت کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلام کا نظریہ ریاست معاہدۂ عمرانی (Social Contract) کے نظریہ سے بھی بالکل مختلف ہے۔ جس کی رُو سے مشیت عامہ ([illegible]) جو کثرت رائے سے متعین ہوتی ہے۔ ہر ملکی اقتدار کا منبع تصور کی جاتی ہے۔ یہ مشیت عامہ سیاہ سفید کی مالک ہے۔ وہ غیر اخلاقی افعال کو اخلاقی اور ناحق کو حق قرار دینے کی اپنے آپ کو پوری طرح مجاز سمجھتی ہے اسلام میں یہ حق مشیت عامہ کو نہیں۔ بلکہ خداوند تعالیٰ کو حاصل ہے۔ اس لئے اسلامی نظریہ سیاست میں ملکی قوانین و ضوابط اور اخلاقی اصول ارادۂ الٰہی سے ماخوذ ہیں۔ حکمران کی ذات یا افراد کے مجموعی ارادہ کو اس قانونی نظام اور اخلاقی ضابطے کی تشکیل میں کچھ دخل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں قانونی اور اخلاقی ضابطہ پر وہ اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ جو ہوبس۔ لاک اور [illegible] کی بنائی ہوئی مملکتوں کے قانون پر وارد ہوتا ہے۔ ان تینوں مفکرین میں نقطہ نظر کے تھوڑے سے اختلاف کے باوجود یہ چیز قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے کہ مملکت کا قانون ایسے افراد کے ذہن یا ارادہ سے وجود میں آیا ہے۔ جنہیں اپنے جذبات و خواہشات پر قابو نہ تھا اور جن کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے لئے مملکت کا قیام ضروری تھا۔

اس کے برعکس اسلامی معاشرے کا قانون اس ذات کا رہین منت ہے۔ جو ہر عیب سے پاک اور ہر خامی سے مبرا ہے۔ جس کے احاطہ علم سے کوئی چیز۔ خیال یا احساس بھی باہر نہیں۔ اس لئے اس کا بنایا ہوا قانون اور اس کا وضع کیا ہوا آئین ہر اعتبار سے مکمل و اکمل ہوگا۔ اور صرف یہی قانون تکمیل ذات اور تسخیر النفس و آفاق کے لئے انسان کی رہنمائی کر سکتا ہے۔

خواتین و حضرات! یہ ہے اس حکومت کا مختصر سا تعارف جسے ہم اسلامی حکومت کہہ سکتے ہیں۔ یہ حکومت حاکمیت الٰہی کی بنیاد پر مسلمانوں کے باہمی تعاون و اشتراک اور ان کے مشورے سے معرض وجود میں آتی ہے۔ یہ مقصود بالذات نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے منشا کو اس دنیا میں نافذ کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ آپ اس کے لئے جو اصطلاح بھی استعمال کرنا چاہیں۔ استعمال کر سکتے ہیں۔ پس ہمیں جس چیز پر اصرار ہے۔ وہ صرف یہ ہے کہ نظام

---

[1] کتاب الخراج از قاضی محمد یوسف

زندگی اور نظام حکومت اُسی کے بتلائے ہوئے اور مقرر کئے ہوئے اصُولوں پر قائم ہو۔
جناب صدر محترم! مجھے اس موضوع پر جو کچھ اختصار کے ساتھ کہنا تھا۔ میں کہہ چکا۔ میں یہ نہیں کہتا۔ کہ حکایت لذیذ تھی اس لئے دراز ہو گئی۔ البتہ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ بات طویل ہو گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں خواتین و حضرات کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ان غیر دلچسپ افکار کو صبر و تحمل کے ساتھ سُنا۔

(۲۵ / اگست ۱۹۶۳ء کو انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں پڑھا گیا)

وارث سرہندی

اِنسانیتؔ اور محبت

آنچہ بر چشیم دکم دیدیم وبسیارست ونیست
نیز جز آدم دریں عالم کہ بسیارست ونیست

انسانیت

عزیز مکرم! تم نے پوچھا ہے کہ انسانی اقدار کیا ہیں؟

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے میں تمہاری توجہ مندرجہ بالا شعر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اس شعر پر ذرا غور کرو۔ شاعر اس بات پر حیرت کا اظہار کر رہا ہے کہ دُنیا میں ایسی کوئی چیز نہیں جو بہت ہونے کے باوجود ناپید ہو، لیکن انسان ہے کہ تعداد کے لحاظ سے بہت ہوتے ہوئے بھی نہیں ملتا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم لوگ شکل وصورت کے لحاظ سے اور اولادِ آدم ہونے کی وجہ سے تو انسان ہیں۔ لیکن ان خصوصیات و صفات سے محروم ہیں جو ایک انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتی ہیں۔ اس لئے اربوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود حقیقی انسان معدوم ہے۔ اگر معدوم نہیں تو النادر کالمعدوم کا مصداق ضرور ہے۔ غالباً میرؔ نے کہا ہے اور کتنا خوب کہا ہے ؎

اس بتکدہ میں معنی کا کس سے کریں سوال
آدم نہیں ہے صورتِ آدم بہت ہیں یاں

یہ شعر ہماری موجودہ حالت پر پوری طرح منطبق ہے۔ واقعی ہم انسانی صورت کے بُت ہیں جو انسانی صفات سے عاری ہیں اور ہماری حالت اس ارشادِ ربانی کے مطابق ہے کہ کالانعام بل ہم اضل۔ یعنی بہائم سے بھی بدتر۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان بننا بہت مشکل ہے جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

فرشتے سے بہتر ہے انسان ہونا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

انسان بننے میں محنت تو ضرور زیادہ پڑتی ہے، لیکن یہ اتنا مشکل بھی نہیں کہ جی چھوڑ دیا جائے اور پھر ایسا کون سا کام ہے جس کے لئے محنت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر انسان بننا واقعی مشکل ہے تو پھر کوئی کام بھی آسان نہیں بقول غالبؔ ؎

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

جب کوئی کام بھی محنت کے بغیر انجام پذیر نہیں ہو سکتا تو پھر انسان بننے کے لئے محنت سے جی چرانا کیسا؟ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر انسان بننا محال نہیں تو پھر یہ قحط الرجال کیوں؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے کوتاہ نظری کے باعث اپنی سمت تبدیل کر کے غلط راستہ اختیار کر لیا ہے اس لئے ہم اس غلط راستے

پرجتنا آگے بڑھتے جاتے ہیں، اتنے ہی اپنی صحیح منزل اور صراط مستقیم سے دُور ہوتے جاتے ہیں۔

ہم نے اپنی تمام توجہ مادی ترقی کے حصول کے لئے وقف کر دی ہے اور رُوحانی ترقی کو یکسر فراموش کر دیا ہے۔ ہمارا ہر کام تن پروری کے لئے ہوتا ہے، رُوح کی بالیدگی کے لئے ہم کچھ نہیں کرتے۔ اس مادی فلسفہ نے ہمیں اور بھی تباہ کر دیا ہے کہ ہمارا ہر فعل انفعال محض چند کیمیائی اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کی رُو سے ہر حقیقت اضافی واعتباری حیثیت رکھتی ہے یا دوسرے لفظوں میں حقیقت کا کوئی وجود ہی نہیں۔ یہ امر مسلم ہے کہ اعتبارات واضافات کا وجود حقیقت کے اثبات پر موقوف ہے۔ اگر حقیقت کا وجود ہی نہیں تو اضافت کیسے پیدا ہوئی۔ لیکن یہ مادیت پرست ہماری بات کیوں سننے لگے۔

ہاں! تو اس سوال کا جواب رہ جاتا ہے کہ انسانی اقدار کیا ہیں اور انسان کیا ہے؟

لفظ انسان انس سے مشتق ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انس و محبت کو انسانی وجود میں اساسی حیثیت حاصل ہے لیکن ہماری کج نظری نے اس جذبہ کو بھی غلط راستے پر ڈال کر حرص و آز اور ہوس میں تبدیل کر دیا ہے۔

انسان ایک ہنگامہ خیر و شر ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان روحانیت و مادیت کا ایک عجیب نادر امتزاج ہے۔ جب تک مادیت رُوحانیت کے تابع رہتی ہے انسان حقیقی معنوں میں انسان رہتا ہے اور شر بھی خیر کے زیر اثر مفید خدمات انجام دیتا ہے۔ لیکن جوں ہی توازن بگڑتا ہے اور مادیت کا غلبہ ہوتا ہے، شر اپنی تمام تباہناک قوتوں کے ساتھ ابھرتا ہے اور حقیقی انسان کو بھسم کر دیتا ہے۔ ہماری بدقسمتی یہی ہے کہ ہمارا ہر کام مادہ پرستی کے زیر اثر ہے۔ مثلاً ہم نے علم و عقل سے قلب رُوح کی بیداری اور انسانی فلاح کا کام لینے کی بجائے ان کو مادیت کے خونی دیوتا کی بھینٹ چڑھا دیا مولانا جلال الدین رُومی نے کتنے پتے کی بات کہی ہے ؎

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

ہم نے علم سے مادیت کی خدمت لی اور آج ہمارا علم ہمیں سانپ بن کر ڈس رہا ہے۔ ہم نے عقل کو مادہ کا غلام بنا دیا اور یہی عقل ہمارے لئے وبال بن چکی ہے۔ اقبال نے اسی مادیت زدہ عقل کے متعلق کہا ہے ؎

فریب کشمکش عقل دیدنی دارد
کہ میر قافلہ و ذوق رہزنی دارد

ہم نے علم و عقل سے غلط کام لیا، جس کا بھیانک نتیجہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم جیسے تباہ کن ہتھیاروں کی صورت میں ہماری آنکھوں کے سامنے ہے جن کی ہیبت نے اقوام عالم کو لرزہ براندام کر رکھا ہے۔ اور آج دُنیا کے بڑے بڑے سائنسدان اور اکابر فلاسفہ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ مادی ترقی سے قیام امن ممکن نہیں، قیام امن کے لئے رُوحانی و مذہبی اقدار کا فروغ ضروری ہے۔

یہ سب کچھ کیا ہے؟ یہ ان اشعار کی عملی تفسیریں اور ہماری مادہ پرستی کا بھیانک نتیجہ ہیں۔ جس علم کو حدیث میں حجاب اکبر کہا گیا ہے، اس سے مراد یہی علم ہے، جس کے زیر اثر انسان مادہ کا پرستار بن کر راہِ راست سے بھٹک گیا ہے اور اپنے مقصد حیات کو بھول گیا ہے۔ جب انسان رُوحانی اقدار سے محروم ہو جاتا ہے تو اس کے ذہن سے خوب و زشت کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ وہ ہر کام میں فانی مفاد کو مدِ نظر رکھتا ہے اور اتنا خود غرض ہو جاتا ہے کہ اپنے حقیر سے حقیر فائدہ کے لئے دوسرے کا بڑے سے بڑا نقصان

کرنے میں بھی کوئی عار یا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ علم و عقل اگر روحانی روشنی سے محروم ہوں تو ان سے زیادہ مہلک کوئی اور چیز نہیں۔

اس تمام گفتگو سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تن پروری اور مادیت کو قطعاً نظر انداز کر دیا جائے۔ سوال توازن کے صحیح استعمال کا ہے۔ مادیت کو مقصود بالذات نہ بنایا جائے بلکہ روحانی اور انسانی اقدار کے حصول کا ذریعہ بنایا جائے۔ اگر مادیت روحانیت کے زیر اثر رہے تو تخریب تعمیر سے بدل سکتی ہے اور شر خیر کے فروغ کا سبب بن سکتا ہے۔ اصل چیز تو صحیح توازن ہے۔ انسان کو مادی جسم اسی لئے دیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ اس کی روحانیت اجاگر ہو سکے، کیونکہ اس مادی دنیا میں روحانیت بلاواسطہ مادیت عمل و ادراک میں نہیں آسکتی۔ روحانیت اور مادیت کا توازن ہی حقیقی زندگی ہے۔ چونکہ اسلام ربانی دین ہے اور تمام نوع انسانی کی رہنمائی کے لئے ہے، اس لئے خداوند حکیم نے اس میں روحانیت و مادیت کا وہی متوازن امتزاج پیدا کیا ہے جو انسان کی تخلیق میں رکھا گیا تھا۔ اسلام کی حقانیت کا سب سے بڑا ثبوت یہی توازن ہے۔

اگر آج ہم کو اسلام کے بعض اصول خلاف فطرت نظر آتے ہیں، جیسا کہ بعض مغرب زدہ و مادہ پرست اصحاب کا ادعا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنا صحیح توازن برقرار نہیں رکھ سکے۔ اس عدم توازن نے ہماری فطرت کو بگاڑ دیا ہے۔ جب ہماری فطرت ہی صحت سے عاری ہے تو اسلام کے صحیح اصول اس سے کیسے ہم آہنگ نظر آسکتے ہیں۔ ہماری کج نظری کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم نے اپنی مسخ شدہ فطرت کو معیار بنا لیا ہے۔ اسلام کے اصول تو اٹل اور غیر مبدل ہیں، وہ ہماری تبدیل شدہ صورت سے کیسے مطابقت کر سکتے ہیں۔ صحیح طریق کار تو یہ ہے کہ ہم اسلام کو معیار بنا کر اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالیں۔ لیکن اس کے برعکس ہم اپنی بگڑی ہوئی حالت کو معیار بنا کر اسلام کو اس کے مطابق بنانا چاہتے ہیں۔ ایسی صورت میں خلفشار اور کشاکش پیدا ہونا ضروری ہے۔ اسی لئے میں بار بار انسانی اقدار کے حصول کی تاکید کرتا ہوں۔

انسانی اقدار کیا ہیں؟ ہمدردی، خلوص، بذل، ایثار، اتحاد، حق گوئی، باہمی تعاون اور خوفِ خدا کو انسانی اقدار میں اساسی حیثیت حاصل ہے اور ان تمام صفات کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔ ان صفات سے متصف ہونے کے لئے روح کا بیدار ہونا ضروری ہے اور روح بیدار ہوتی ہے محبت سے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ تمام صفات محبت ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے محبت کرو اور دل کی گہرائیوں سے کرو۔ سوزِ عشق ہماری روح کو تپا کر کندن بنا دیتا ہے۔ ایک مشہور مقولہ ہے "العشق نارٌ یحرق ماسوی المعشوق"۔ یعنی عشق ایک ایسی آگ ہے جو معشوق کے سوا ہر چیز کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عاشق کو حصولِ مقصد میں جن رکاوٹوں کا سامنا ہوتا ہے، ان کو عشق دور کر دیتا ہے، اگر وہ پہاڑ ہوں تو ان کو موم بنا کر پگھلا دیتا ہے اور عاشق بہر صورت منزل پر پہنچ کر دم لیتا ہے۔ محبت پلاؤ اش عمل کی طرح خام کو ہمارے دل سے نکال دیتی ہے۔ محبت کرو تو تمہیں پتہ چلتا ہے کہ جو لطف کچھ دینے میں ہے وہ لینے میں نہیں۔ محبت ہی ہمیں اس لذت سے آشنا کرتی ہے، جو درد سروں کو دکھ جھیلنے میں ملتی ہے۔ محبت ہی ہمیں خود شناس بناتی ہے اور خود شناسی خدا شناسی کی شرط اولین ہے۔

ذرا نظام کائنات پر نگاہ ڈالو تو معلوم ہوگا کہ اس کے قرار و نظم میں بھی محبت کار فرما ہے۔ ایک بے جان کل ہی کو لے لو، جب تک تمام پرزے مل کر کام نہ کریں وہ کبھی نہیں چل سکتی۔ انسان کا اپنا جسم ہے، اگر تمام اعضاء و جوارح ایک دوسرے سے بے نیاز ہو جائیں اور تعاون نہ کریں تو کیا نتیجہ ہوگا؟ ظاہر ہے کہ موت!

ہر چیز کے لئے ربط و تعاون ضروری ہے اور یہ محبت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ غور سے دیکھو تو ہر چیز میں محبت کی کار فرمائی

نظر آتی ہے۔ محبت ہی سے حقیقی زندگی بنتی ہے، آرزو لکھنوی نے کیا خوب کہا ہے ؎

گزری ہے جن کی عمر محبت کئے بغیر
وہ بدنصیب مر گئے گویا جئے بغیر

چونکہ بات بہت طویل ہوگئی ہے اس لئے فی الحال اسی پر اکتفا کرتا ہوں، انشاء اللہ آئندہ محبت کی ماہیت پر تفصیلی گفتگو کروں گا، فی الحال اتنا ذہن نشین کر لینا کافی ہے کہ کسی مقصد کے حصول کے لئے اتنی تندہی اور کامل توجہ سے کوشش کرنا کہ اس کے سوا کسی اور چیز کا دھیان نہ رہے، عشق ہے، اور وہ مقصد جس کے حصول کے لئے انسان نے اپنی زندگی وقف کردی ہو اس کا معشوق ہوتا ہے۔ مقصد میں جو کشش اور اس کے حصول میں سکون و مسرت پنہاں ہے اسی کا نام حسن ہے۔

محبت

عشق آں نار است کہ چوں برفروخت
ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

عزیز گرامی! تمہیں طعنۂ اغیار کی شکایت ہے، لیکن تم لوگوں کی باتوں کا خیال ہی کیوں کرو۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بقول غالب ؎ ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں۔

سب سے پہلے اپنے کردار پر احتسابی نظر ڈالو اور سوچو کہ جو قدم تم اٹھا رہے ہو وہ غلط تو نہیں؟ جب اچھی طرح غور کرنے کے بعد تمہیں یقین ہو جائے کہ تمہارا فعل ہر لحاظ سے صحیح اور بجا ہے، تو پھر کسی کی پرواہ نہ کرو، اور بلا پس و پیش جو کرنا چاہتے ہو کر گزرو۔ تمام دنیا تو خدا سے بھی خوش نہیں، ہم تو انسان ضعیف البنیان ہیں۔ ہم میں یہ طاقت کہاں کہ سب کو خوش کر سکیں۔ دنیا کے طعنوں اور جھوٹی شرم سے گھبرا کر پسپائی اختیار کرنا خامکاری کی دلیل ہے۔ ناصر علی سرہندی نے کیا خوب کہا ہے ؎

عشق تا خام است، باشد بستۂ ناموس و ننگ
پختہ کاران جنوں را کے حیا زنجیر پاست

کامیابی کے لئے پختہ کاری جنوں ضروری ہے، جب انسان میں یہ صفت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ دنیا کی ملامتوں سے بے پروا اپنی منزل کی طرف تیزی سے بڑھتا چلا جاتا ہے، تم بھی لوگوں کی پرواہ نہ کرو اور آگے بڑھو!

ہاں! تو میں نے گزشتہ خط میں محبت کے موضوع پر گفتگو کرنے کا وعدہ کیا تھا، میں اپنا وعدہ بھولا نہیں، عنوان کا شعر اس بات کی دلیل ہے۔

اس شعر میں مولانا جلال الدین رومی نے عشق کا جوہر نکال کر رکھ دیا ہے، یہ شعر اسی مشہور عربی مقولہ کا فارسی ترجمہ جس کا ذکر میں اپنے عریضۂ ماقبل میں کر چکا ہوں "العشق نار یحرق ماسوی المعشوق" یعنی عشق ایک ایسی آگ ہے، جب بھڑک اٹھتی ہے تو معشوق کے وجود کے سوا ہر چیز کو جلا کر نابود کر دیتی ہے ہر چیز سے مراد وہ مشکلات و موانع ہیں جو راستے میں حائل ہوتے ہیں، اب میں اس موضوع پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو کروں گا تا کہ تم پر عشق کی ماہیت کسی حد تک روشن ہو جائے۔

یہاں میں اس بات پر افسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ محبت کو ہمیشہ غلط سمجھا گیا ہے اور اس کو بازیچۂ اطفال بنا کر رسوا کیا گیا ہے ادیب سہارنپوری مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

ابتک بھی محبت ہے وہ مظلوم حقیقت
وقعت نہ ہوئی جس کی توہم سے زیادہ

مگر ایسا کیوں ہوا؟ اگر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ محبت خالصۃً ایک رُوحانی چیز ہے، اگرچہ اس میں مادی وسائل کا بھی دخل ہوتا ہے کیونکہ اس عالم ناسوت میں رہتے ہوئے مادی وسائل سے صرف نظر نہیں کی جا سکتی، لیکن ان کی حیثیت اضافی ہے اور ان کا روحانیت کے تابع رہنا ضروری ہے۔ جب تک روحانیت کا دور دورہ رہا، محبت کو نمایاں مقام حاصل رہا۔ جیسے جیسے انسانی روحانی اقدار سے محروم ہوا ہے اور اس نے مادی ترقی کو مقصد نظر بنا لیا ہے، محبت اپنی اہمیت کھو بیٹھی ہے اور اس کی جگہ ہوس نے لے لی ہے جو سراسر مادی چیز ہے، دُنیا میں جتنے بھی مذاہب ہیں ان کا مقصد انسان کی رُوحانیت کو بیدار کرنا ہے، اس لئے جملہ مذاہب عالم میں محبت کو نمایاں اور اہم مقام حاصل رہا ہے، یہ الگ بات ہو کہ اسلام کے سوائے تمام مذاہب کی اصل تعلیمات محرف ہو چکی ہیں اور غلو کے باعث مذہبی تصورات افراط و تفریط کا شکار ہو چکے ہیں، تاہم ان کی موجودہ صورت میں بھی محبت کو کچھ نہ کچھ مقام ضرور حاصل ہے۔ میرا مقصد مذاہب عالم کی تحلیل و تجزیہ نہیں، بلکہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ اس گئی گزری حالت میں بھی ان سے محبت کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے، اگرچہ اس کی صورتیں مختلف ہیں، لیکن گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو اصلیت کا سُراغ مل سکتا ہے۔

بُت پرست اقوام نے تو محبت کے الگ الگ دیوتا بنا کر ان کی پرستش کی ہے اور ان کو اتنا قوی ظاہر کیا ہے کہ دوسرے دیوتا ان کے سامنے دم نہیں مار سکتے۔ بالفاظ دیگر محبت کی تجسیم کر کے ایک محسوس و مرئی صورت میں پیش کیا گیا تھا۔ یہ ایک تمثیلی رنگ تھا، جس کو لوگوں نے حقیقت سمجھ لیا اور بھٹک گئے، جس طرح شروع شروع میں حضرت عیسٰی کو خدا کا محبوب پیغمبر ظاہر کرنے کے لئے تمثیلی طور پر ابن اللہ کہا گیا تھا لیکن بعد میں تمثیل کو حقیقت بنا لیا گیا اور حضرت عیسٰی کو خدا کا نسبی بیٹا کہا جانے لگا، میں اس بحث میں اس وقت پڑنا نہیں چاہتا۔ مطلب یہ ہے کہ ان تمثیلات سے محبت کی قوت غالبہ کا اظہار مقصود ہے۔

اس وقت آسمانی مذاہب میں اسلام اور عیسائیت ہی دو ایسے مذہب ہیں جن کو دُنیا میں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ یہ الگ بحث ہو کہ عیسائیت اپنی حقیقی اقدار کی حامل ہے یا نہیں، اور یہ بحث میرے موضوع سے خارج ہے، بہرحال عیسائیت کی موجودہ صورت میں اعتقادی لحاظ سے محبت کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ خدا کہا گیا ہے "God is Love" عیسائیت کا مشہور اصُول ہے، اگرچہ محبت کا یہ تصور مبالغہ سے خالی نہیں، لیکن اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ محبت کو رُوحانی دنیا میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

اسلام نے محبت کو خدا کا درجہ تو نہیں دیا، لیکن محبت کو صفاتِ خداوندی میں شامل قرار دیا ہے اہلِ صفت کے ذریعہ حق تک رسائی بہت جلد ہوتی ہے۔ صُوفیائے اسلام نے محبت ہی کے ذریعہ حق تک پہنچنے کا راستہ اختیار کیا ہے۔

میں محبت کو حقیقت و مجاز کے خانوں میں بانٹنے کا قائل نہیں ہوں۔ محبت خواہ خالق سے ہو یا مخلوق سے بہرحال حقیقی ہوتی ہے۔ اگر کائنات مظہر خداوندی ہے تو بھی مخلوق سے محبت خالق سے محبت کے مترادف ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہو کہ مجاز و حقیقت کو محبت کے ادنیٰ و اعلیٰ مدارج سے تعبیر کیا جائے۔ میرے اس خیال کی تصدیق صوفیاؤں کے اس مشہور قول سے بھی ہوتی ہے کہ المجاز قنطرۃ الحقیقت!

اگر انسانی محبت کو اس لحاظ سے بھی مجازی کہا جائے کہ انسان اور کائنات کا وجود حقیقی نہیں بلکہ مجازی ہے۔ یعنی

انسان و کائنات کو خداوند تعالیٰ نے مرتبۂ حس و وہم میں خلق فرمایا ہے، جس کے باعث اس کی حیثیت نمود بے بود کی ہے، تو درست کہ یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہاں وجودِ وہمی سے مراد وہ وجود نہیں کہ ہم خیال کریں تو موجود ہو جائے اور نہ خیال کریں معدوم ہو جاتے، جیسا کہ بعض فلاسفہ خیال کرتے ہیں۔ دراصل وجود وہمی کی دو قسمیں ہیں یعنی وہمی اختراعی اور وہمی واقعی۔ وہمی اختراعی وہ ہے کہ ہم تصور کریں تو موجود ہو جائے ورنہ کچھ بھی نہیں مثلاً گدھے کے سینگ۔ اگر ہم گدھے کے سینگوں کا تصور کریں تو یہ ذہن میں متشکل ہو جائیں گے، جب ہم اس تصور کو چھوڑ دیں گے تو سینگ ناپید ہو جائیں گے کیونکہ خارج میں ان کا کوئی وجود نہیں۔

وہمی واقعی وہ ہے کہ ہمارے وہم کے ازالہ سے اس کا ازالہ نہیں ہوتا، کیونکہ وہ موجود فی الخارج ہوتا ہے اگرچہ وہمی طور پر۔ مثلاً شعلہ جوالہ کا وجود یعنی اگر ایک لکڑی کو روشن کر کے تیزی سے گھمایا جائے تو فضا میں ایک دائرۂ آتشیں پیدا ہو جائے گا، جس کو ہم دیکھ سکتے ہیں اور ہمارے وہم کے ارتفاع سے اس کے وجود کا انعدام نہیں ہوتا، کیونکہ اس دائرہ آتشیں کا وجود خارج میں پیدا ہو جاتا ہے، حالانکہ یہ وجود بھی سراسر وہمی ہوتا ہے۔ ہر ذی شعور انسان جانتا ہے کہ دائرہ آتشیں کا فی الاصل کوئی وجود نہیں ہوتا بلکہ فریب نظر ہوتا ہے۔ صوفیائے نے اسی وجود کو وہمی واقعی اور نمود بے بود کہا ہے اور دنیا و ما فیہا کے وجود کو اسی نوع سے بتلایا ہے —— تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس لحاظ سے انسانی محبت کو مجازی کہا جا سکتا ہے لیکن اس صورت میں حقیقی محبت کا کوئی وجود نہ ہوگا اور خدا سے محبت کو بھی حقیقی نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ محبت کرنے والا بہرصورت انسان ہے، جس کا وجود وہمی و مجازی ہے۔ جب عاشق کا وجود ہی غیر حقیقی ہے تو اس کی محبت کیسے حقیقی ہو سکتی ہے۔ اس لئے بہرحال ہمیں یا تو محبت کو بلا استثنائے خالق و مخلوق حقیقی تسلیم کرنا ہوگا یا مجازی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک کو حقیقی اور دوسری کو مجازی کہا جائے۔ البتہ اگر ادنیٰ درجہ کا نام مجازی ہو یعنی جب یہ خالص نہ ہو اور اس میں ہوس اور غرض کا شائبہ ہو اور اعلیٰ درجہ یعنی پرخلوص اور بے لوث محبت کو حقیقی کہا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

بات طویل ہوتی جا رہی ہے، اس لئے میں اختصار سے کام لے کر جلد بات ختم کرنے کی کوشش کروں گا۔ اب یہ بات رہ گئی ہے کہ محبت ہے کیا چیز؟ محبت ایک درکی اور عرفانی چیز ہے۔ ہر روح میں قدرت نے ایک تشنگی رکھی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض بے حس لوگوں کو اس کا احساس نہ ہو۔ خیر جب ایک روح دوسری روح میں اپنی بنیادی اقدار کو مشترک پاتی ہے اور اس کو اپنا انگلہ محسوس کرتی ہے تو اس سے ہم آہنگ ہو کر اس میں جذب ہونا چاہتی ہے تاکہ اپنی تشنگی فرو کر سکے اور وہ ایک دوسرے میں مدغم ہو کر تکمیلی مراحل طے کر سکیں اسی جذبۂ انضمام کا نام روحانی محبت ہے۔ اور یہ ایک وجدانی چیز ہے جس کا اظہار الفاظ میں کماحقہ نہیں ہو سکتا، جوں جوں یہ مدارج ارتقا طے کرتی جاتی ہے اس کے مقاصد میں وسعت، اور رفعت پیدا ہوتی جاتی ہے اور نقطۂ کمال پر پہنچ کر انسان سراپا ایثار بن جاتا ہے۔

یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ کوئی چیز فی نفسہٖ بری نہیں ہوتی، بلکہ اس کے خوب و زشت کا انحصار اس کے استعمال پر ہوتا ہے۔ اگر انسان کا نصب العین صحیح ہے اور وہ کوئی کام اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے کرتا ہے تو خوب ہے ورنہ صورت معکوس میں زشت۔ ایک ہی فعل محض مقصد کی تبدیلی سے اچھے سے برا اور برے سے اچھا بن جاتا ہے۔ اچھائی اور برائی مقصد میں پنہاں ہے۔ یہاں اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ بعض اشیاء کو فی نفسہٖ برا کہا گیا ہے، تو کیا وہ واقعی بری نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ بعض اشیاء کو انسان نے برے مقاصد کے لئے اس کثرت و تواتر سے استعمال کیا ہے کہ وہ بذات خود برائی بن چکی ہیں اور ان سے بھلائی

کا تصور وابستہ کرنا محال ہو گیا ہے۔ ایسی صورت میں ان سے اجتناب لازمی ہے۔ کیونکہ ان سے برائی کی روایات اس طرح وابستہ ہیں کہ انسان ان کو اختیار کر کے برائی سے دامن نہیں بچا سکتا۔ اسلام نے اسی نکتہ کو پیش نظر رکھ کر ایسی باتوں سے بھی منع کیا ہے جن میں برائی کی ہلکی سی مشابہت بھی پائی جاتی ہے۔ ہاں! تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اصل چیز مقصد اور استعمال ہے۔ مثلاً خونریزی وقتال کا مقصد اگر پست ذاتی اغراض ہیں، تو یہ موجب تخریب و فساد ہے اور نہایت شدید جرم ہے۔ لیکن اگر خونریزی و قتال کا مقصد ذاتی اغراض سے مبرّا اور بلند ہے تو یہ موجب تعمیر و اصلاح ہے اور اس کو جہاد کہا جاتا ہے، جس سے بہتر و خوب تر کوئی عمل نہیں۔ ایک ہی فعل مقصد کے تبدیل ہونے سے اچھا یا برا ہو گیا۔ ایک کو فساد کہا گیا اور دوسرے کو جہاد۔ قاضی عبدالغفار مرحوم نے "لیلیٰ کے خطوط" میں اسی نکتہ کو بیان کیا ہے۔

"کمہار نے ایک خوب صورت آبخورہ بنایا لوگوں نے اس کو جام صہبا بنا لیا یا کمہار نے اس کو جام صہبا بنایا اور لوگوں نے اس کو آبخورہ سمجھ کر مسجد کی دیوار پر رکھ دیا، تو پھر کیا اس سے مٹی کی حقیقت بدل گئی؟ جام میں چاہے شراب بھر دو چاہے زمزم"

قاضی صاحب نے بات تو درست کہی ہے، لیکن اس نکتہ کو فراموش کر گئے کہ خوب و زشت کا معیار استعمال ہے۔ مٹی کی حقیقت میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ مٹی بذات خود نہ اچھی ہے نہ بری۔ لیکن مقصد کی تبدیلی سے اس کی صفات ضرور تبدیل ہو گئیں۔ اچھائی اور برائی کا انحصار اس مقصد پر ہے، جس کے لئے اس کو استعمال کیا گیا۔ وہی مٹی چولھے میں استعمال ہوتی ہے اور وہی بیت الخلاء میں ان کے مختلف مناصب نے ان کی حیثیت کو ایک دوسرے سے قطعاً جدا کر دیا، ایک کو پاک کر دیا اور دوسری کو ناپاک۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل چیز مقصد اور استعمال ہے۔ جس سے کسی چیز کی قدر و قیمت کا تعین کیا جاتا ہے۔

ایک مثال اور پیش کرتا ہوں۔ موسیقی کے تمام سُر یکساں ہوتے ہیں۔ ان میں نہ کوئی خوش آہنگ ہوتا ہے نہ بد آہنگ ان کی مناسب ترکیب سے کوئی نغمہ ترتیب دیا جائے تو بہت دلکش اور خوش آئند ہو گا لیکن اس ترتیب کو بگاڑ کر سنا جائے تو یہ آواز مکروہ اور دلخراش معلوم ہو گی کیوں؟ اس لئے کہ اصل چیز استعمال ہے۔ صحیح استعمال ایک چیز کو اچھا بنا دیتا ہے تو غلط استعمال اسی کو برا بنا دیتا ہے۔ یہی حال محبت کا ہے۔ محبت خواہ والدین سے ہو یا اولاد سے، عزیزوں سے ہو یا دوستوں سے عورت سے ہو یا مرد سے خالق سے ہو یا مخلوق سے، ایک ہی چیز ہے، لیکن اس کے لئے علوِ جذبات، طہارت افکار اور روحانیت لازمی ہے۔ اگر اس میں جذبات سفلیہ کی کارفرمائی ہو گی تو یہ محبت نہ ہو گی، بلکہ اس کو ہوس کہا جائے گا جو انسانیت کے لئے سمّ قاتل ہے جبکہ محبت جوہر انسانیت ہے۔ ہمدردی و دلسوزی، خلوص و پاکیزگی، جانبازی و ایثار اس کے عناصر ترکیبی ہیں، جو صحیح و بالیدہ نظام حیات کے استقرار و بقا کے لئے اساسی اہمیت رکھتے ہیں۔ محبت کے اثرات و کیفیات کے بیان کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں۔ اور یوں بھی یہ ایک ایسی چیز ہے۔ جس کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے، لیکن بیان نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال میرے اس بیان سے تم اپنے ذہن میں محبت کا ایک دھندلا سا خاکہ ضرور بنا سکو گے۔ زیادہ کیا لکھوں ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

———x———

معاون ادارہ "فاران"

فرانسیسی کیمپوں میں مسلمانوں کی حالتِ زار

پیرس کے ایک کثیر الاشاعت اخبار لاآمانڈ نے ۲۰ - ۲۱ جون سنہ ۶۳ء کی اشاعتوں میں دو طویل مضمون چھاپے ہیں جن میں اس نے اپنی اس تازہ ترین انکوائری کی رپورٹ شائع کی ہے جو تمام "عبادٔ ہیراکیتز" کے فرانس میں ایک سالہ قیام کے بعد ان کے حالات کے بارے میں کی گئی ہے۔ ان مضمونوں میں الجیریا میں پیدا ہونے والے مسلمان سپاہیوں کو فرانسیسی بنانے کی تکنیک اور اس سلسلے کے تجربات کے نتائج کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ معاملہ ایسا ہے کہ اس کی خوب تشہیر ہونی چاہیے اور اس کے بارے میں مسلمانوں کا ردِ عمل فوری طور پر سامنے آجانا چاہیئے۔

یہ بدقسمت فریب خوردہ لوگ گذشتہ فوجی سپاہی ہیں اور ان کو فوجی نگرانی ہی میں چند کیمپوں میں بانٹ دیا گیا ہے کسی باہر کے مسلمانوں کو ان کیمپوں میں جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ بہانہ یہ بتایا جاتا ہے کہ قوم پرستوں کی طرف سے انتقامی کارروائی اور قتل و غارت کا خطرہ ہے۔ وہاں سوشل کاموں کے لئے کیتھولک پادریوں اور راہبات کو متعین کیا گیا ہے۔ انہیں بتایا جاتا ہے کہ چونکہ وہ اب فرانسیسی شہری ہیں اس لئے انہیں اپنے آپ کو ہر لحاظ سے فرانسیسی بنا لینا چاہیئے۔ انہیں نہ صرف فرانسیسی زبان سیکھنی چاہیئے بلکہ فرانسیسی نام بھی اختیار کر لینے چاہیئے چنانچہ اب عبداللہ اور محمدؐ پال اور برنارڈ کہلانے لگے ہیں عائشہؓ اور خدیجہؓ نے روزا اور یووانی قسم کے نئے نام اختیار کر لئے ہیں۔ ان میں اکثریت ناخواندہ لوگوں کی ہے۔ ان کو کسی ہنر کی ابتدائی تربیت دے کر جنگلوں میں لکڑی کاٹنے کے لئے بھیج دیا جاتا ہے یا اسی نوع کے دوسرے مشقت کے کاموں پر لگا دیا جاتا ہے کیونکہ ایسے کاموں کے لئے فرانسیسی مزدور میسر نہیں آتے۔ مساجد بنانے کی اجازت نہیں ہے اور میزبان ملک کی طرف سے مسجدیں تعمیر کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لاآمانڈ کی رپورٹ کے مطابق یہ محض اتفاقات نہیں ہیں بلکہ یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق عمل میں آ رہا ہے۔ اسلامی تعلیمات پر مکمل پابندی ہے لیکن کیتھولک عقائد کا دن رات پرچار ہوتا رہتا ہے اب تو ان کے چھوٹے بچے تک عیسائیوں کی دعائیں اور عقائد از بر یاد رکھتے ہیں۔

لاآمانڈ لکھتا ہے کہ فرانس کے ان مہمانوں کی "مدد" کی خاطر عام لوگوں اور پبلک اداروں سے امدادی رقوم جمع کرنے کے لئے فرانس میں کیتھولک مذہب کے سب سے بڑے سربراہ کارڈینل فلٹن کے زیرِ نگرانی ایک کمیٹی بنائی گئی ہے۔ اخبار کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

"فرانسیسی اور الجیرین اتحاد کے دیہات، پیرس کے لاٹ پادری کارڈینل فلٹن کی زیرِ نگرانی ایک کمیٹی کے سپرد کئے گئے ہیں جس کے خاص خاص ممبروں کے نام یہ ہیں:—

ایم جی آر روڈرن — سکریٹری جنرل کیتھولک سکر

ریورنڈ فادر (مقدس باپ) پکٹ

" " " ڈینیلو

ریورنڈ فادر (مقدس باپ) کار
وگینر

ایم جین گیوٹن ۔ ممبر فرینچ اکیڈمی
ایم جی ڈین فیکر بگو ـــ جو "فرانس کیتھولک" نامی جریدہ سے منسلک ہیں ۔

"ان پناہ گزینوں کا پس منظر"

جولائی ۱۹۶۲ء کے آغاز میں فرانس نے اپنے ایک سو تیس سالہ تسلط سے دست بردار ہو کر الجیریا کے لوگوں کو حق آزادی کو مان لیا ۔ یہ نتیجہ تھا بہادر الجزائری مسلمانوں کی آخری جنگِ آزادی کا ۔ اس جنگ کا جس میں انہیں جان و مال کا بھاری نقصان اٹھانا پڑا ۔

اس سے پہلے الجیریا کو فرانس کا ایک حصہ ہی سمجھا جاتا تھا یہاں ان جبری فوجی خدمات کو خاص طور پر ذہن میں رکھنا چاہیئے جو ان لوگوں کو زبردستی فوج میں بھرتی کر کے لی جاتی تھیں ۔

الجزائر کی جنگ کے علاوہ دوسری جنگوں مثلاً جرمنوں کے فرانس پر حملے ۔ مڈغاسکر میں فرانسیسی نوآبادیات کی بغاوت ہند چینی کی لڑائی وغیرہ میں الجزائری باشندے کثیر تعداد میں توپوں کی خوراک بنتے رہے ۔ اس وقت ضمیر کے تقاضوں نے اتنی اہمیت اختیار نہیں کی تھی ۔ لیکن الجزائر کی جنگ کی بات دوسری تھی ۔

شروع شروع میں فرانس کے فوجی سربراہ الجزائری فوجیوں کو اپنے بھائیوں کی بغاوت دبانے کے لئے استعمال کرنے سے ہچکچاتے رہے ۔ وجہ ظاہر تھی کہ انہیں ان پر اعتماد نہیں تھا اور ان کی وفاداری مشکوک تھی ۔ بعد میں فیصلہ کیا گیا کہ الجزائریوں کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فیصلہ کی بنا دو وجوہ تھیں ــــــــ

1. لڑائی بڑے علاقے میں پھیلتی جا رہی تھی اور پانچ لاکھ سے بھی زیادہ فوج بغاوت فرو کرنے میں ناکام رہی تھی ۔
2. جب الجزائر کی آزادی یقینی معلوم ہونے لگی تو انتقامی جذبے کے زیرِ اثر ان میں خانہ جنگی کے اسباب مہیا کرنے کی کوشش کی گئی ۔

یہ کوئی آسان کام نہ تھا لیکن بہرحال ناممکن بھی نہ تھا ۔ چنانچہ ایک تھا الجزائریوں کو ایسے مخلوط دستوں میں بھرتی کیا گیا ۔ جن میں اکثریت غیر الجزائریوں کی تھی ۔ ان میں سے کچھ فرانس کے سپاہی تھے اور کچھ خاص فرانس کے ۔ اس حیلے سے الجزائریوں کو جنگ کی ان دونوں حالتوں میں آسانی سے کنٹرول کیا جا سکتا تھا ۔

پھر افراد کے ذمے یہ کام لگایا جاتا تھا اور مختلف ذرائع سے انہیں مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ قوم پرستوں اور ان کے اقرباء کے خلاف کوئی گھناونا جرم کر گزریں ۔ اس طرح وہ قدرتی طور پر انتقام کی زد میں آجاتے تھے ۔ اب کسی مناسب موقع پر ان گناہ کے آلہ کاروں کو جتلا دیا جاتا تھا کہ اگر تم پورے طور پر قوم پرستوں کے خلاف جنگ میں شامل نہیں ہوتے تو ہم تمہیں چھوڑ دیتے ہیں تجربے نے بھی انہیں یہی سکھایا کہ اب گناہ کئے چلے جانا ہی ضروری ہے ۔ اس طرح ظلم اور اس کے ردعمل کا ایک چکر چل پڑتا تھا

جنگِ آزادی کے دوران جن لکھو کھا الجزائریوں کو بھرتی کیا گیا ان میں سے تقریباً دو لاکھ ایسے کرتوت کر گزرے کہ وہ بجا طور پر قوم پرستوں کی ناراضگی کا نشانہ قرار پائے ۔ انہی لوگوں کو "ہیراکیز" کا نام دیا گیا ۔

جنگ کے اختتام پر فرانس نے بڑی "فراخدلی" سے کام لیتے ہوئے انہیں اپنے ملک میں ٹھہرانا منظور کر لیا۔ اکثر ہیرکیز اپنے خاندانوں کے ساتھ دھکے سہتے فرانس پہونچے۔ یہاں انہیں سر چھپانے کی بھی جگہ میسر نہ آئی اور نتیجہ یہ ہوا گذشتہ موسم سرما میں سینکڑوں سردی سے مرگئے۔ جو زیادہ سخت جان نکلے وہ اپنے آپ کو نئی زندگی کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

دونوں میں سے بُرا

یُوں بھی ہو سکتا تھا کہ الجزائر میں رہنے والے مسلمان اپنے مقدس پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اسوۂ پر عمل کرتے کہ حضورؐ نے ۲۲ سال کی اذیتوں اور جنگوں کے بعد جب مکہ فتح کیا اور اپنے کافر دشمنوں میں اعلان کر دیا کہ آج تم پر کوئی گرفت نہیں، جاؤ تم آزاد ہو۔ کفار مکہ بھی آخر انسان تھے ایسے نازک موقع پر اتنی نفسیاتی رعایت نے ان پر اس قدر اثر کیا کہ ان کے دل یکلخت بدل گئے اور وہ راہ راست پر آگئے۔ جو بات وہ ۲۲ سال کی قرآنی تبلیغ سے نہ سمجھ سکے تھے وہ قرآنی عمل نے انہیں چند لمحوں میں سمجھا دی۔ مشہور واقعہ ہے کہ:-

عتاب (یا اتاب) ابن اُسید پر اس معافی کا ایسا اثر ہوا کہ وہ آگے بڑھے۔ اپنا تعارف کرایا اور تہ دل سے اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ردِ عمل فوراً ان الفاظ میں ظاہر ہوا۔

"میں تمہیں مکہ کا گورنر نامزد کرتا ہوں"

چند ساعت پہلے کا ایک دشمن اپنے ہی علاقہ میں گورنر بنا دیا گیا حضورؐ مفتوحہ شہر کی حفاظت کے لئے ایک بھی مدنی سپاہی چھوڑے بغیر واپس مدینہ تشریف لے گئے اور اس عمل پر حضورؐ کو کبھی پچھتانا نہ ہوا۔

فرانس کے سامنے بھی دو متبادل راستے کھلے تھے:-

(۱) ان مسلمانوں کے ساتھ بھی وہ وہی سلوک کرتا جو اس نے یہودیوں وغیرہ کے ساتھ کیا تھا۔ یعنی ان کی فوری ضرورت کا انتظام کر دیتا۔ تدریجاً انہیں روزگار مہیا کر دیتا۔ ان کے تہذیبی اور مذہبی معاملات میں دخل انداز نہ ہوتا۔ اس طرح نہیں اس ملک کے پرانے حکمرانوں (جن کے ذمہ دار ترین افراد اب یا تو جیل میں یا جلا وطن ہیں) نے جو زخم لگائے تھے وہ کسی حد تک مندمل ہو جاتے اور فرانس کو چند انتہائی شکر گزار اور وفادار شہری مل جاتے۔ مزید یہ کہ فرانس کو بین الاقوامی پروپیگنڈا کا ایک گراں ذریعہ مل جاتا جو مسلمان ملکوں کو اپیل کرتا اور انہیں فرانس کا دوست بنا دیتا۔

(۲) اس مشکل وقت میں ان کے مصائب سے ناجائز فائدہ اُٹھاتا۔

لاماند اخبار کے مذکورہ بالا بیان کے مطابق موخرالذکر راستہ اختیار کرنے کا ہی فیصلہ ہوا ہے اور اسی کو روبہ عمل لایا جا رہا ہے۔

اس معاملہ میں سبھی قصوروار معلوم ہوتے ہیں اور اس قصور میں مسلمانوں کا حصہ کسی سے کم نہیں ہے خواہ وہ الجزائر کے رہنے والے ہوں یا دنیا کے کسی اور ملک کے۔

دیر سے سنبھل جانا (یا توبہ کر لینا) کبھی نہ سنبھلنے (یا کبھی نہ توبہ کرنے) سے بہرحال بہتر ہے۔

(مسلم نیوز انٹرنیشنل سے براہ راست ترجمہ)

———x———

از:—
محمد زکریا مائل

شعر و حکمت

یعنی

احادیث پر مبنی رباعیات

(۱) اَلطُّھُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ (مسلم)

اِس خلق میں بانکپن ہے، رعنائی ہے
ہر اک کو طہارت کی ادا بھائی ہے
پاکیزگی کو شعار کر لو اپنا
نصف ایمان صفائی ستھرائی ہے

(۲) کُلُّکُمْ رَاعٍ وَّ کُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ
(بخاری و مسلم وغیرہ)

تم میں سے ہر ایک حاکم اور راعی ہے
ہر اک کو خدا نے اک رعیت دی ہے
ہر ایک کو اس بات کا دینا ہے جواب
کس طرح رعیت پہ حکومت کی ہے

(۳) اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ وَالْاِثْمُ مَا حَاکَ فِیْ صَدْرِکَ وَکَرِھْتَ اَنْ یَّطَّلِعَ عَلَیْہِ النَّاسُ (مسلم)

نیکی کیا شے ہے؟ نام خوش خلقی کا
اور کیا ہے بدی؟ جس کا ہو دل میں کھٹکا
وہ بھی ہے بدی جس پہ عمل کرنے سے
لاحق ہو جائے تم کو خوفِ افشا!

(۴) اِعْلَمُوْا اَنَّ الْجَنَّۃَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّیُوْفِ
(جنت تلواروں کے سایوں میں ہے) (بخاری)

حق سے متصادم ہو جو باطل ناگاہ
میدان میں اترو لے کے نامِ اللہ
ضامن ہے خلد کا جہادِ برحق
ملتی ہے دمِ تیغ سے فردوس کی راہ

(۵) اَلْحَیَاءُ لَا یَاْتِیْ اِلَّا بِخَیْرٍ (بخاری)

ہر خلق شرف اور کرم دیتا ہے
انساں کو خیر بیش و کم دیتا ہے
سرچشمہ وہ خیر کا حیا ہے لیکن
جو صرف بھلائی کو جنم دیتا ہے

(۶) تَصَافَحُوْا یَذْھَبِ الْغِلُّ وَتَھَادَوْا
تَحَابُّوْا یَذْھَبِ الشَّحْنَاءُ۔
(مسند امام مالک)

باہم جو ملاؤ ہاتھ، دل مل جائے
کینہ کوئی آپس میں نہ رہنے پائے
ہدیہ دینے کی رسم ہو تم میں اگر
اس رسم سے بغض جائے اُلفت آئے

بزمِ غزل

عیش ٹونکی:

ہزار گردشِ دوراں بہ اہتمام آئی　　جھجک کے رہ گئی جب سوئے اہلِ جام آئی
تمہارا ذکر ہے وردِ زبانِ لالہ و گل　　بہار سے کے چمن میں تمہارا نام آئی
نفس نفس میں ہے اُس زندگی کے عیشِ دوام　　وہ زندگی جو کسی ہم نفس کے کام آئی

راہی بلند شہری:

بہکنے دے، بہکنے دے کہ موسم ہے بہکنے کا　　چھلکنے چھلکنے دے شرابِ ارغواں ساقی
ترے نقشِ قدم اُبھرے ہیں ہر دو راہ بن بن کر　　تری گردِ سفر چمکی ہے ہو کر کہکشاں ساقی
تری محفل میں شاید یاد فرمایا گیا ہوگا　　مجھے کیوں آ رہی ہیں ہچکیوں پر ہچکیاں ساقی
صُراحی بھر اُٹھا ساغر، ملا آنکھیں پلا صہبا　　کہ ہر محفل کی محفل لوٹ بھر کی مہماں ساقی
تصور میں سجی رہتی ہے بزمِ میکدہ راہی
اِدھر شیشے اُدھر ساغر یہاں بادہ وہاں ساقی

راشد اللہ خاں جوہر:

یہ پیچ و خم راہِ محبت ہیں غضب کے　　پہونچے تو یہاں خضر کو رستہ نہ رہا یاد
بھولے سے کبھی ہم نے نہ بھلایا جسے دل سے　　بھولے سے بھی اُس شوخ نے ہم کو نہ کیا یاد
پھر پیشِ نظر ہے مرے ٹوٹا ہوا ساغر　　پھر آ گیا اک شوخ کا پیمانِ وفا یاد!
رہِ وفا تھی قدم سوز و خار دار مگر　　برنگِ نکہتِ گل ہم رواں دواں گزرے

سید حرمت الاکرام:

اُٹھ کر جھکی ہے، جھک کے اُٹھی ہے کوئی نگاہ　　اک اک فسانے کے کئی عنواں لئے ہوئے
کہتا ہوں عقل سے کہ مری رہبری کو آ　　ہاتھوں میں اپنے چاک گریباں لئے ہوئے
ترے غم کی فطرت ہے کتنی عجیب　　کوئی مسکرایا تو ہم رو دیئے
اُبھرتے گئے عصرِ نو کے خطوط　　بدلتے گئے وقت کے زاویئے
جنہیں اپنی پہچان خود بھی نہیں　　اُلجھتے ہیں مجھ سے وہ بہروپیئے

ماہر القادری:

دل جو دھڑکا تو اُن کا خیال آ گیا　　ساز چھڑتے ہی صوفی کو حال آ گیا
خانقاہیں تو مدت سے ویران تھیں　　میکدوں پر بھی اب کے زوال آ گیا
جام و مینا بھی تھے، لطفِ ساقی بھی تھا
غیرتِ تشنگی کا سوال آ گیا!

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

روحِ انتخاب

توحیدِ خالص کا مطلب ہے کہ خدا کی ذات۔ صفات۔ حقوق اور اختیارات میں کوئی شریک نہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۔ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۔

اے نبی کہدو کہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا نہ وہ کسی سے جنا گیا اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔

یہ بالکل ابتدائی زمانے کی سورۃ ہے اور اس کے نزول کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی رسالت کا اعلان فرمایا۔ تو لوگ اکثر پوچھتے تھے سنجیدگی سے بھی اور مذاق سے بھی۔ ان میں ایسے لوگ بھی رہتے تھے جو ناواقف تھے اور سمجھنے کے لئے پوچھتے تھے۔ اور سوال ان کا یہ ہوتا تھا کہ وہ خدا جس کی طرف تم بلاتے ہو۔ وہ کیسا ہے۔ ہمیشہ قاعدے کی بات یہ ہوتی ہے کہ کوئی تحریک جب بھی شروع ہو اور اسے پوری قوت کے ساتھ چلایا جائے تو کثرت سے لوگوں کے ذہنوں میں سوالات پیدا ہوتے ہیں اور لوگ اس شخص کے پاس پہنچ کر اس کی طرف وہ دعوت دے رہا ہو۔ اس کے متعلق سوالات کرتے ہیں۔

اب ایک دعوت کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی دعوت کا سب ڈیٹا تین لفظوں میں بیان کر دے۔ اگر تفصیل میں آئے تو کتابوں کی کتابیں بھی کافی نہ ہوں۔ لیکن اگر کوئی شخص اس کا خلاصہ یہ سمجھنا چاہے تو دو چار فقروں میں بیان کر دیا جائے۔ تاکہ ہر آدمی کے لئے سمجھانا بھی آسان ہو جائے۔ اور اس کو یاد رکھنا بھی کسی کے لئے مشکل نہ ہو اور بات مخالف کے ذہن میں بھی اتر جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی دعوت کا آغاز کیا تو دعوت کے دو ہی بنیادی نکات تھے۔ ایک اللہ تعالیٰ کی توحید۔ اور دوسرا آخرت یہ دو بنیادیں تھیں جن کے اوپر دعوت کی پوری عمارت قائم تھی۔ یہ آخری زمانے کی جو سورتیں ہیں آپ نے دیکھا کہ ان میں مسلسل آخرت کے متعلق بیان کیا گیا ہے اور چھوٹے چھوٹے فقروں میں آخرت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ سورۂ اخلاص وہ ہے جس کے اندر توحید کا عقیدہ جو اسلام کا ہے مختصراً اس کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ پورا قرآن توحید کے مضمون سے بھرا ہوا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات و ارشادات جمع کئے جائیں تو ایک پوری کی پوری کتاب اسی چیز کی شرح میں بن سکتی ہے۔ اس چیز کی شرح میں نہایت مختصر الفاظ میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے غالباً دنیا کی کسی کتاب میں توحید کو ایسے مختصر اور جامع الفاظ میں نہیں بیان کیا گیا اور اسی وجہ سے اس کے لئے سورۃ الاخلاص کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی وہ سورہ جو خالص توحید بیان کرتی ہے اور خالص توحید پر مشتمل ہے اس میں کوئی دوسرا مضمون نہیں ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ نبی کے پاس آتے تھے اور پوچھتے تھے کہ آپ جس خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں وہ کیا ہے۔ یعنی آپ کا تصورِ خدا کیا ہے۔

اللہ کا اقرار

اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر دنیا میں ہمیشہ قلیل تعداد میں رہے ہیں۔ اور آج بھی بہت قلیل تعداد

میں ہیں ۔ آج اتنا زور ہے الحاد اور دہریت کا ۔ لیکن اگر گنا جائے تو معلوم ہوگا کہ آج بھی دُنیا میں ان لوگوں کی تعداد ایک فی ہزار بھی نہیں ہے جو خدا کے وجود کے منکر ہوں ۔

قدیم زمانے میں بھی یہ خیال نہ کیجیے کہ لوگ اللہ کی ہستی کے منکر تھے ۔ آخر ان کی زبان میں اللہ کا لفظ موجود تھا ۔ قرآن میں بھی اللہ کا لفظ موجود تھا ۔ قرآن میں بھی اللہ کا لفظ استعمال ہوا ہے ۔ ان کی زبان میں یہ لفظ تھا ۔ تب ہی تو "اللہ" استعمال کیا گیا ۔ رسول کی پیدائش سے پہلے اُن کے والد کا نام عبداللہ تھا تو وہ اسی لئے کہ اللہ کا لفظ اُن کے ہاں موجود تھا ۔ اور نہ صرف یہ کہ اللہ ہے بلکہ وہ ان کا معبود ہے ۔ اب سارا جھگڑا جس بات کا تھا وہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعوت دے رہے تھے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ اور وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ بھی معبود ہے جو سب سے بڑا ہے اور دُوسرے بھی معبود ہیں ۔ اسی کے ساتھ جو غلط فہمیاں لوگوں کے دماغوں میں تھیں وہ اللہ کی ذات میں بھی کثرت کے بارے میں تھیں ۔ اللہ کے متعلق وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اللہ اولاد رکھتا ہے ۔ چنانچہ نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ قرار دیتے ہیں ۔ اور دُوسری بہت سی مشرک قومیں ہیں جو اللہ کے متعلق یہ تصور رکھتی ہیں ۔ ان چیزوں کی تردید کے لئے اور ایک صحیح تصور اللہ تعالےٰ کی وحدانیت کو نکھار کر پیش کرنے کے لئے یہاں فرمایا گیا کہ اے نبی لوگوں سے کہدو کہ اللہ ایک ہے ۔ وہ اللہ کہ جس کے بارے میں تم مجھ سے پوچھ رہے ہو "ایک ہے" ۔ اللہ کے لئے "احد" کا لفظ استعمال کیا ۔ واحد کی بجائے احد کا لفظ استعمال کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ اپنی ذات میں کوئی کثرت نہیں رکھتا ۔

○ — احد کی تشریح

دیکھیے مثلاً یہ میز ہے ۔ آپ کہیں گے کہ یہ ایک میز ہے لیکن یہ کتنے اجزاء سے مرکب ہے ۔ یا مثلاً آپ کہیں گے کہ یہ ایک آدمی ہے لیکن دیکھیے کہ کتنے اجزاء سے مرکب ہے ۔ کتنی چیزیں اس کے ظاہر میں ہیں اور کتنی اس کے باطن میں ہیں ۔ جن کے جمع ہونے سے وہ ایک شخصیت بنتی ہے ۔

مگر اللہ تعالیٰ اس طرح کا "واحد" نہیں وہ اس معنی میں واحد نہیں ہے کہ اس کی ذات بہت سے اجزاء سے بنی ہوئی ہے اور بہت سی قوتیں اور بہت سی قابلیتیں اس میں جمع ہو کر ایک ہستی بنی ہو ۔ تو وہ گویا کہ مجموعہ ہو ۔ تو وہ ایک مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک ذات ہے پھر اس معنی میں بھی احد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی جنس کا فرد نہیں ہے ۔ جیسے آپ ہیں ۔ کہ انسانوں میں سے ایک فرد ہیں ۔ ایک پوری نوع پائی جاتی ہے جس میں سے ایک فرد ہیں ۔ وہ ایسا نہیں ہے کہ الٰہوں اور معبودوں کی کوئی نوع پائی جاتی ہو تو وہ ان میں سے ہو ۔ جس کا ایک فرد اللہ ہو ۔ یہ غلط فہمی عوام میں ہے اور وہ یہ کہ بہت سے الٰہ ہیں جن میں سے ایک اللہ ہے جو سب سے بڑا ہے تو یہ جو غلط فہمی ان میں تھی اس غلط فہمی کو یہی لفظ احد ظاہر کرتا ہے ۔ ذات میں بھی اس کے کثرت نہیں ہے ۔ بلکہ اپنی ذات میں بالکل یکتا یگانہ ہے کوئی کسی چیز سے مرکب نہیں ہے ۔ اس کی ذات میں کسی قسم کی کثرت نہیں پائی جاتی ۔ واحد خالص ۔ اور دُوسری طرف وہ کسی نوع کسی جنس کا فرد نہیں ۔ بلکہ وہ اپنی ذات میں ایک ہی ہے ۔ کوئی اس کا ہم جنس نہیں ۔

○ — صمد کے معنی

اس کے بعد فرمایا کہ اللہ صمد ہے ۔ صمد عربی زبان میں ایسے سردار کو کہا جاتا تھا جس کے اُوپر کوئی ہستی نہ ہو ۔ کوئی دوسرا سردار اس سے بالاتر نہ ہو ۔ دُوسرے اس معنی میں وہ بولتے تھے کہ وہ ایسا سردار ہے کہ سب اس کے حاجتمند ہیں اور وہ کسی کا حاجتمند نہیں سب اس کی طرف دوڑتے ہیں اپنی حاجتوں اور ضروریات کے لئے اس سے مانگتے ہیں ۔ وہ کسی سے مانگنے کے لئے نہیں جاتا ۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ۔

یہاں الصّمد کا لفظ اللہ کے لئے استعمال کیا گیا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ صفت اسی ایک میں پائی جاتی ہے دُوسرے سرداروں وغیرہ کے لئے الصّمد کا لفظ استعمال نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ ایسے ہی ا ۔ ل ہے جیسے انگریزی زبان میں " The " کہتے ہیں ۔ تو الصّمد کا مطلب یہ ہوا کہ وہی ایک ایسی ذات ہے جس سے بالاتر کوئی ذات نہیں ۔ اور اسی کی سرداری ایسی ہے کہ اس سے اُوپر کوئی سرداری نہیں ہے اور دُوسرا یہ کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور ہر ایک اس کا محتاج ہے ۔ ہر ایک اپنی حاجات اور اپنی ضروریات کے لئے اسی کی طرف دوڑتا ہے ۔ قطع نظر اس کے کہ وہ شعوری طور پر دوڑتا ہو یا غیر شعوری طور پر ۔ چنانچہ غیر شعوری طور پر تو وہ لوگ بھی اسی کی طرف دوڑتے ہیں جو اس کی ذات کے منکر ہیں ۔ وہ بھی اسی کے محتاج ہیں اگر وہ نہ دے تو کچھ بھی نہیں پا سکتے ۔

• ۔۔ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ

اس کے بعد ارشاد ہوا " لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ " نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ کسی سے جنا گیا ۔ قدیم زمانے میں بھی اور آج بھی مشرکین کی جو غلط فہمیاں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اولاد رکھتا ہے ۔ مشرکین عرب ملائکہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی بیٹیوں کا لفظ استعمال کرتے تھے ۔ ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ ہم با اولاد ہوں اور اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ بے اولاد ہی ہو ۔ مشرکین اپنی دیویوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے ۔ وہ یہ سمجھتے کہ وہ اللہ کی چہیتی بیٹیاں ہیں ۔ اسی طرح ہندوؤں کے ہاں بھی پُوری دیو مالا موجود ہے ۔ اس کے اندر نقشہ کچھ ایسا ہی سامنے آتا ہے کہ اس ایک ذات نے اپنے اندر سے دُوسری ہستیوں کو نکالا ہے ۔ تو کوئی چیز جو اس کے اندر سے نکلی ہوئی ہے اس کی پیدا ہوئی ہے ۔ جننے کا لفظ تو بہت ہی بھونڈا لفظ ہے ۔ اور جنھوں نے فلسفے بگھارے ہیں انھوں نے بھی یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ذاتِ واحد نے اپنے اندر سے ان ساری اشیاء کو نکالا ہے ۔ اللہ نے فرمایا یہ بات بالکل غلط ہے کہ ذاتِ باری نے اپنے اندر سے کسی کو پیدا کیا ۔ بلکہ ذاتِ واحد نے اپنے ارادے سے اور اپنی صنعت سے ان ساری چیزوں کو پیدا کیا ہے اور یہ غلط فہمی بھی پُرانے زمانے سے چلی آرہی ہے کہ اگر خدا نے سب کچھ پیدا کیا ہے تو آخر اس کو بھی تو کسی نے پیدا کیا ہوگا ۔ عام طور پر جاہل لوگ اس طرح کا سوال کرتے ہیں وہ اتنا نہیں سوچتے کہ خدا کو کسی نے پیدا کیا ہو تو پھر اس کو بھی کسی اور نے پیدا کیا ہوگا ۔ تو پھر کہیں جا کر یہ سلسلہ ختم نہیں ہوگا ۔ بہر حال کوئی ایسی ہستی چاہیئے جس کا کوئی پیدا کرنے والا نہ ہو ۔ اور وہ سب کا پیدا کرنے والا ہو ۔ تب جا کر یہ مسئلہ طے ہوتا ہے ۔ جب آپ کسی ایسی جگہ جا کر ٹھہریں کہ اس کے اوپر کوئی خالق نہیں ہے اور وہ سب کا خالق ہے ۔ تب مسئلہ ختم ہوتا ہے ۔ ورنہ یہ سلسلہ کہیں جا کر نہیں رُکتا ۔ جس کو کسی اور نے پیدا کیا ہو اس کے لئے لفظ خالق استعمال نہیں ہو سکتا ۔ خالق تو وہ ہے جس کا کوئی اور پیدا کرنے والا نہیں اور وہ سب کا پیدا کرنے والا ہے ۔ تو اسی غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے فرمایا گیا کہ نہ وہ کسی سے جنا گیا ہے وہ ایک ایسی واحد ذات ہے جس کے اندر کثرت نہیں ۔ وہ ایک ایسی واحد ذات ہے جو کسی جنس کا فرد نہیں ۔ بلکہ وہ اپنی ذات سے فرد فرید ہے ۔ اس سے بالاتر کوئی دوسرا اقتدار نہیں ہے اور وہ ایسی ذات ہے کہ نہ اسے کسی نے جنا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا کوئی خالق نہیں ہے اور نہ کوئی اس سے جنا گیا ہے یعنی اس نے اپنے اندر سے کسی کو نہیں نکالا ہے بلکہ خلق کیا ہے ۔ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ " اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے ۔ ہمسر سے دراصل یہ مُراد ہے کہ جو کام اس کے ہیں وہی کام دُوسرا بھی کوئی کرنے والا ہو ۔ جو صفات اس کی ہیں وہ صفات کسی دوسرے میں بھی پائی جاتی ہوں چاہے کمتر ہی ۔ لیکن کسی اور میں بھی پائی جاتی ہوں ۔ جو اختیارات اس کے ہیں ان اختیارات میں دُوسرا بھی کوئی شریک ہو ۔ دوسرے بھی اسی طرح کے اختیارات رکھتے ہوں ۔ جو حقوق اس کے ہیں کوئی دُوسرا بھی وہ حقوق رکھتا ہے یہ گویا کفو ہونا ہے ۔ ہمسر ہونا ہے ۔ یہاں ان چاروں باتوں کی نفی کی گئی ہے ۔ یعنی نہ اللہ کی صفات میں کوئی شریک ہے اور نہ اس کا

اس معنی میں ہمسر ہے۔ نہ اللہ تعالیٰ کے اختیارات میں کوئی ہمسر ہے اس معنی میں اور نہ اللہ تعالیٰ کے حقوق میں کوئی ہمسر ہے اس معنی میں۔ اور نہ کوئی ایسی ہستی ہے کہ جو کام اللہ تعالیٰ نے کئے ہیں وہ کوئی دوسرا کر سکے۔ ان ساری حیثیتوں سے یہ نفی کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ دیکھئے کہ مشرکین کیا اپنے ذہن میں سمجھتے ہیں۔ الوہیت کے بارے میں مشرکین یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام الہٰوں سے بالاتر ایک الٰہ ہے۔ یہ مشہور ہے، مہا تما ہے۔ وہ بڑے "جی" (G) سے لکھا ہوا گوڈ ہے اللہ کے ان کے ہاں بہت سے تصورات ہیں کہ چھوٹے (g) سے گوڈ بہت سارے ہیں اور بڑے "جی" (G) کا گوڈ صرف ایک ہے۔

○ — کفو کی نفی کا مطلب

یہ ساری چیزیں یہ بتاتی ہیں کہ مشرکین کے ذہن میں یہ تصور ہو کہ اللہ تعالیٰ کے جو اختیارات ہیں۔ کچھ دوسری کو بھی ویسے ہی اختیارات ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ جیسا کام کرتا ہے۔ ویسے ہی دوسرے بھی کام کرتے ہیں۔ چاہے چھوٹے پیمانے پر کرتے ہوں یا اس کے حکم سے کرتے ہوں۔ جو لامحالہ ان کے حقوق بھی اسی طرح کے ہیں۔ جس طرح کے اللہ کے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ ان جیسی ہستیوں کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں اور ما تھا ٹیکتے ہیں۔ اور نذریں نیازیں پیش کرتے ہیں۔ یہ خدائی کے حقوق اور صفات کسی دوسرے میں بھی ہیں۔ مثال کے طور پر آپ دیکھیں گے کہ اگر ایک آدمی یہ سمجھتا ہو کہ کس طرح اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اسی طرح دوسری ہستی بھی دیکھ سکتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دیکھنے اور بصیر ہونے کی جو صفت ہے وہ دوسری ہستیوں کو بھی حاصل ہے۔

اللہ کے متعلق یہ شخص یہ سمجھتا ہو کہ وہ ہر ایک کی سنتا ہے۔ ساری کائنات میں کوئی ایسی آواز نہیں جو وہ نہیں سنتا۔ بیک وقت سنتا ہے۔ اگر ایسا ہی تصور چاہے محدود پیمانے پر کوئی کرے۔ مثلاً اسی زمین پر کوئی ایسی ہستی ہے۔ کہ پورے کرۂ ارض سے جہاں اسے پکارو۔ وہ بیک وقت سن رہی ہے۔ جو بھی اس کو پکار رہا ہے۔ اس کی پکار اس تک پہنچ رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہو کہ چھوٹے پیمانے پر وہی صفات اپنے اس ہستی کی فرض کرلیں جو اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ کے اختیارات ہیں کہ اللہ تعالیٰ اولاد دینے والا ہے۔ وہی رزق دینے والا ہے۔ وہی بیماروں کو تندرست کرنے والا ہے۔ وہی تمام حاجات انسانوں کی، تمام مخلوقات کی پوری کر رہا ہو۔ اگر کسی دوسری ہستی کے متعلق یہ فرض کرلیا جائے۔ کہ وہ بھی اسی طرح سے لوگوں کو اولادیں دیتی ہے۔ وہ بھی اسی طرح لوگوں کو بیماریوں سے شفا دیتی ہے۔ وہ بھی لوگوں کی رزق رسانی کا کچھ انتظام کر رہی ہے۔ نوکریاں دلوا رہی ہے۔ کاروبار چمکا رہی ہے۔ اس طرح کے تصورات اگر قائم کرلئے جائیں۔ تو لامحالہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا اسے ہمسر قرار دیا گیا۔ اسی طرح کے اختیارات اس کے ہیں جیسے کہ اللہ تعالیٰ کے ہیں۔ اور شرک ہو نہیں سکتا۔ جب تک کہ یہ تصور نہ قائم کیا جائے۔ اگر آدمی یہ سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ کے جو اختیارات ہیں وہ کسی کے نہیں ہیں۔ کوئی دوسرا ان کے اندر ذرہ برابر شریک نہیں۔ اگر وہ یہ سمجھ لے کہ جو کام اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔ وہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ تو شرک ممکن ہی نہیں۔ آدمی بے اختیار کے سامنے نہیں جھکا کرتا۔ آدمی جھکا ہی اس کے سامنے کرتا ہے جس کے متعلق اس کا کچھ اس طرح کا تصور ہو کہ اس کے بھی کچھ اختیارات ہیں۔ لہٰذا اس بات کو واضح طور پر فرمایا گیا۔ کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی ہمسر نہیں۔ کسی بھی معنی میں کوئی ہمسر نہیں۔ کسی کے پاس کوئی طاقت نہیں ہے۔ جو خدائی کے کام چلا سکے۔ کسی کے اندر خدائی کی صفات نہیں ہیں۔ اور پھر لازماً کسی کو یہ حق بھی نہیں پہنچتا کہ اس کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو خدا کے ساتھ کیا گیا ہے۔

○ — کفو کا تقاضا

یعنی کفو ہونے کی نفی کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ پھر عبادت اور عبادت سے متعلق جتنی چیزیں ہیں وہ ساری کی ساری بھی کسی اور کو حاصل نہیں ہیں۔ جب ایک مرتبہ یہ نفی کر دی گئی کہ کوئی کفو نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا تو لامحالہ اس کے اندر سے اس بات کی خود بخود

نفی ہو جاتی ہے کہ دوسری ہستی عبادت کی بھی مستحق نہیں اور عبادت کے معنی لازماً نماز کے نہیں ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں۔ جب ان سے کہا جائے کہ آپ غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ صاحب ہم ان کی نماز کب پڑھتے ہیں۔ حالانکہ عبادت کا لفظ وسیع ہے اس کے اندر دعا بھی شامل ہے اگر آپ دعا مانگ رہے ہیں مدد مانگ رہے ہیں استغاثہ کر رہے ہیں پکار رہے ہیں اپنی حاجتوں کے لئے، تو یہ بھی دعا ہے، اسی طرح عبادت کی بے شمار شکلیں ہیں آپ مشرکین کو جاکر دیکھئے کہ اپنے بتوں کے سامنے کیا کیا کرتے ہیں نیازیں پیش کرتے ہیں یا کہ نہیں کرتے؟ نذریں پیش کرتے ہیں کہ نہیں کرتے ان کے گرد گھومتے ہیں کہ نہیں ان کے آستانوں کو چومتے ہیں کہ نہیں۔ یہ سارے کام عبادت میں شامل ہیں۔ ان میں سے ہر چیز اللہ کے لئے خاص ہے کسی دوسرے کا اس میں ذرہ برابر حصہ نہیں اور جب کبھی آپ تجزیہ کریں گے تو کوئی شخص جو شرک میں مبتلا ہے آپ جب کبھی اس سے بات کریں گے تو آپ دیکھیں گے کہ جس طرح وہ رکوع میں عبادت غیر اللہ کے سامنے انجام دے رہا ہے۔ اسی طرح سے وہ اس کے متعلق صفات ایسی بیان کرے گا کہ جس سے معلوم ہوگا کہ یہ سمجھتا ہے کہ الوہیت کا کچھ حصہ اس کو بھی پہنچا ہے۔ یہ عالم الغیب ہر جگہ موجود ہے یہ سب کی مدد کو پہونچ رہا ہے لوگوں کو بیٹے دے رہا ہے یہاں سے روزگار ملتے ہیں یہاں سے شفا ملتی ہے یہ ساری چیزیں جب وہ بیان کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ان ساری چیزوں میں قریبی تعلق ہے یہ عبادت کے مراسم اسی لئے بیان کرتے ہیں کہ یہ صفات اس کے لئے تصور کر لی گئی ہیں اگر ایک مرتبہ کفو ہونے کا تصور دماغ سے نکل جائے تو غیر اللہ کی عبادت کا امکان ہی نہیں ہے اسی لئے مختصر الفاظ میں جو بات ذہن نشین کی گئی اس نے پورے شرک کی جڑ کاٹ دی اور ان چند فقروں نے پوری طرح نکھار کے توحید کے عقیدے کو بیان کر دیا اس لئے اس کے لئے سورۂ اخلاص کا لفظ استعمال کیا گیا یعنی یہ خالص توحید پیش کرتی ہے۔

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

نظر حیدرآبادی مرحوم

نظر کے والد سید علی اختر مرحوم سے میری ملاقات سب سے پہلے سنہ ۱۹۳۰ء میں ہوئی، اُس وقت نظر مرحوم کی عمر بہت سے بہت دس گیارہ برس کی ہوگی، پھر میں جدید ملک پیٹ کے نو تعمیر سرکاری کوارٹروں میں رہنے لگا اور علی اختر صاحب کا ہم محلہ ہوگیا۔ اُن کے یہاں دن رات کا اٹھنا بیٹھنا رہتا۔ شعر خوانی، علمی و ادبی تذکرے اور تاش کی بازی بھی۔ ان مشاغل میں کافی وقت علی اختر مرحوم کی صحبت میں گزرتا۔

میں شعر و شاعری کے معاملہ میں اُستادی اور شاگردی کا زیادہ قائل نہیں ہوں۔ ایک ہزار اساتذہ بھی اپنی کوشش اور توجہ سے کسی غیر شاعر کو شاعر نہیں بنا سکتے، میں نے خود کسی اُستاد کے آگے شاعری میں زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا، ہاں! یہ ضرور ہے کہ جس شاعر سے کوئی نو آموز شعر گو متاثر ہوتا ہے تو اُس کی صحبت سے، شعر و سخن کے باہمی مذاکروں سے اور اُس کے کلام کے مطالعے سے فائدہ ضرور پہونچتا ہے! اگر حیدرآباد دکن کے چھپے ہوئے تذکروں میں یہ واقعہ بیان نہ ہوتا تو میں اس کا ذکر بھی نہ کرتا کہ نظر حیدرآبادی نے اپنے والد مرحوم سید علی اختر کے ایما سے آغازِ شعر گوئی میں مجھ سے مشورہ کیا تھا۔ یہ سلسلہ دو تین سال تک چلتا رہا۔ میں نے جس کسی کو بھی شعر و سخن میں مشورہ دیا ہے، اپنی حیثیت اُستاد کی نہیں مُشیر کی سمجھی ہے اس لئے نہ میں کسی کا شاعری میں اُستاد ہوں اور نہ میرا کوئی شاگرد ہے! اگر کوئی شخص فطری اور حقیقی شاعر ہے تو اُس کی اپنی شخصیت وزن رکھتی ہے اربابِ نظر کی طرف سے جس کا اعتراف ہونا چاہیئے، نہ کہ شاگردوں کے واسطے سے اُس کی شخصیت پہچانی جائے۔

حضرت جگر مرادآبادی غالباً ۱۹۲۶ء میں سب سے پہلے حیدرآباد دکن تشریف لے گئے۔ اُن کی وہاں بڑی پذیرائی ہوئی، قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم، جگر کے کلام کے نہ صرف یہ کہ مداح بلکہ شیدائی تھے، انھوں نے اپنی ڈیوڑھی میں جناب جگر کے اعزاز میں ایک عام مشاعرے کا اہتمام کیا، وہ منظر میری نگاہوں میں اب تک پھر رہا ہے کہ نواب صاحب کی ڈیوڑھی سامعین سے کھچا کھچ بھری تھی۔ اور بلدہ حیدرآباد کے تمام جدید و قدیم شعراء اس مشاعرے میں کھنچ کر آگئے تھے۔ جگر کی غزل، جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف — میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

ان دنوں بہت مشہور تھی، گانے بجانے کی محفلوں میں یہ غزل عام طور پر گائی جاتی تھی۔ نظر مرحوم نے اس مشاعرے میں جگر صاحب کی اس غزل پر اپنی غزل جو سُنائی، تو دھوم مچ گئی وہ مشاعرے پر چھا گئے۔ حیدرآباد کے عوام سے اُن کی شاعری کا یہ پہلا تعارف تھا، اس کے بعد وہ دکن میں مشہور اور مقبول ہوتے چلے گئے!

مخدوم محی الدین، سکندر علی وجد اور میکش اکبرآبادی یہ شعراء نظر سے عمر میں بڑے اور پہلے سے مشہور تھے مگر نظر کا شمار ان شعراء کی صف میں ہونے لگا، پھر اتحاد المسلمین کے عظیم الشان جلسوں میں نظر نظمیں پڑھنے لگے اور اس طرح وہ دکن میں غزل گو

کے علاوہ قومی شاعر بھی سمجھے جانے لگے، نواب بہادر یار جنگ مرحوم نظرؔ کے مداح اور قدر شناس تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نظرؔ نے سب سے پہلی رومانی نظم جو کہی تھی اُس کا عنوان تھا ——— "میرے گھر کے سامنے" ——
یہ دور اُن کے عنفوانِ شباب کا تھا، جب شاعری رنگین موضوعات چاہتی ہے، خیالی بھی اور عالمِ واقعہ میں بھی! اس زمانے میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ میرے یہاں رات کو ایک دو بجے آتے، عمر مہاجرؔ صاحب خاص طور پر اُن کے ساتھ ہوتے، پھر صبح کے تین چار بجے تک شعر خوانی، گفتگو، ادبی لطیفے اور ہنسی خوشی کی باتیں رہتیں، اس طرح مہینہ میں دو تین بار ضرور شب بیداری کی نوبت آجاتی، علامہ اقبالؔ نے سوزِ نیم شبی اور آہِ سحرگاہی کا طرح طرح سے ذکر کیا ہے، ہم چند دوستوں اور ہم نشینوں کو لطفِ نیم شبی اور نغمۂ سحرگاہی میسّر تھا!

بلدہ حیدرآباد میں ادارۂ شرقیہ نام کی ایک مشہور درسگاہ تھی، مولانا حمید الدین قمر فاروقی سنبھلی (فاضل دیوبند) اس کے بانی، سرپرست اور صدر معلم تھے، پنجاب کے علوم مشرقیہ کے امتحانات میں شریک ہونے کے لئے طلبا اس ادارے میں تعلیم پاتے تھے، نظرؔ حیدرآبادی نے ادارۂ شرقیہ میں تعلیم پائی اور پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔

اُردو شاعری کے لئے عربی سے ایک حد تک اور فارسی سے کامل مناسبت بہت ضروری ہے، چاہے کسی اردو شاعر کو انگریزی نہ آتی ہو مگر عربی اور فارسی سے اُسے لگاؤ ضرور ہونا چاہیئے، نظرؔ حیدرآبادی نے منشی فاضل کے نصاب کی سبقاً سبقاً تکمیل کی تھی، فارسی سے اُن کی یہ مناسبت اُردو شاعری میں کام آئی۔

تقسیم ہند سے قبل نظرؔ حیدرآبادی کی شاعرانہ شہرت دکن تک محدود نہ رہی تھی، دکن کے باہر بھی لوگ اُن کو جانتے تھے، پاکستان آنے کے بعد تو اُن کی شہرت کو چار چاند لگ گئے! اقبالؔ اکیڈیمی سے نثر میں اُن کی ایک کتاب (اقبالؔ اور حیدرآباد) بھی شائع ہوئی، جس کا معاوضہ اُنہیں دیا گیا، اس کتاب کی تصنیف سے پہلے اُن کا کوئی نثر کا مضمون میری نگاہ سے نہیں گزرا تھا، جب یہ کتاب تبصرے کے لئے آئی، تو اسے پڑھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ اندازِ تحریر ایک مشاق انشا پرداز کا سا تھا، جو بات بھی کہی سلیقہ سے کہی اور دل نشین انداز میں کہی۔

نظرؔ کے والد علی اخترؔ مرحوم کو شروع شروع میں حیدرآباد ٹرسٹ سے تنخواہ ملتی تھی، مگر جتنی تنخواہ یا پنشن ملتی تھی، اُس سے کئی گنا اُن کے گھر کا خرچ تھا، پھر وہ پنشن بھی بند ہو گئی، علی اخترؔ صاحب مسلسل علالت کے سبب معذور ہو گئے تھے، اتنے بڑے گھر کو چلانے کے لئے نظرؔ مرحوم ہی کو پاپڑ بیلنے پڑے، علی اخترؔ صاحب کے انتقال کے بعد ان کی ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں، کسی کسی دن ناداری اور افلاس کا یہ عالم بھی اس گھرانے پر گزر جاتا کہ آذوقۂ حیات بھی پوری طرح میسّر نہ آتا، کم و بیش پچیس افراد کھانے والے اور ایک دو آدمی کمانے والے!

ہر فن کار کو اُس کی شہرت سے اس دُنیا میں مادّی فائدہ بھی پہونچتا ہے، سالہا سال کی عسرت و پریشانی کے بعد اب وقت آیا تھا کہ نظرؔ حیدرآبادی اپنی شہرت کی بہار دیکھیں اور اس سے فائدہ اُٹھائیں، تین چار مہینہ سے اُن کے معاشی حالات بہتر ہوتے جا رہے تھے اور آئندہ اور زیادہ بہتر ہونے کی توقعات تھیں کہ ——— تیرہویں عید دے شام کو ———

ﻋﻪ محمد عمر مہاجرؔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قابلِ فخر گریجویٹ ہیں، اچھے مقرر اور اکثر سے زیادہ اچھے مضمون نگار! "میرے سو شعروں" پر انہی نے مقدمہ لکھا تھا، حکومتِ دکن میں گزیٹڈ افسر تھے، یہاں پاکستان ریڈیو میں برسوں پروگرام ڈائرکٹر رہے، اور اب پبلیکیشن ڈپارٹمنٹ میں عہدیدار ہیں! نظرؔ مرحوم سے ان کی خاص درجہ کی بے تکلفی اخلاص اور گہرا یارانہ تھا۔

والا معاملہ اُن کے ساتھ پیش آیا اور چار پانچ دن بیمار رہ کر وہ چٹ پٹ ہو گئے !

نبیوں، رسولوں، صحابہ کرامؓ اور علمائے اُمّت کے علاوہ دُوسرے مشاہیر مثلاً سیاسی لیڈروں، انشاپردازوں، ناول نگاروں اور شاعروں کی زندگیوں کے کچھ پہلو دوسروں کے لئے قابلِ تقلید اور بعض پہلو عبرت انگیز ہوتے ہیں، "ہمیں مرے ہوؤں کے بارے میں بھلائی کے ساتھ ذکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے" اس لئے اشارتاً اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھا گیا کہ نظرؔ حیدرآبادی کی زندگی کا رنگ مجازؔ لکھنوی سے ملتا جلتا تھا، اس چیز نے اُن کی صحت کو متاثر کیا اور اُن کی آواز میں پہلی سی لَطافت باقی نہیں رہی، نظرؔ کی زندگی کا یہ رُخ نئی نسل اور جدید شعراء کو زبانِ حال سے خطاب کر رہا ہے ؎

من نہ کردم شما حذر بکنید

نظرؔ کے دادا سید کاظم علی باغؔ اور اُن کے دادا کے حقیقی بھائی نواب نثار یار جنگ بہادر مزاجؔ (سابق کلکٹر، حکومت دکن) دونوں حضرت داغؔ دہلوی کے شاگرد تھے، علی اخترؔ مشہور شاعر اُن کے والد تھے، اس لئے یہ کہنا عین واقعہ کے مطابق ہے کہ شاعری تو نظرؔ کی گھٹی میں پڑی تھی، وہ جتنی اچھی غزل کہتے تھے، اسی انداز کی نظمیں انھوں نے کہی ہیں، حیدرآباد کی غارت گری اور مسلمانوں کی تمام جمائی بادشاہت کی تباہی نے نظرؔ کے قلب میں گداز اور اُن کی شاعری میں اور زیادہ سوز پیدا کر دیا تھا۔ اُن کی غزل کا تنہا یہ ایک مطلع مکمل مرثیہ ہے، فرماتے ہیں :۔

بدلی جو چشم ساقی پیمانہ چھوڑ آیا
کس تشنگی میں کیسا میخانہ چھوڑ آیا

اس غزل کا ایک شعر ہے ؎

جنگل کا گوشہ گوشہ دامانِ باغباں ہے
صحرا میں کیا شگوفہ دیوانہ چھوڑ آیا

شاعری کے علاوہ کثرتِ اولاد میں بھی وہ اپنے والد کے جانشین تھے ——— الولد سرٌ لابیہ ——— کے مصداق اُن کی شادی کو غالباً بیس سال سے زیادہ مدت نہیں ہوئی، اور ان کے سولہ سترہ بچے پیدا ہوئے، گیارہ زندہ ہیں، چار پانچ فوت ہو گئے، ایک بچہ ہونے والا ہے ! اللہ تعالیٰ ہی اتنے بڑے کُنبہ کی پرورش فرمائے گا ! (وَاللّٰہُ خَیْرُ الرّٰازِقِیْن)

نظرؔ کا جنازہ بڑے دُھوم سے اٹھا، خاص طور سے حیدرآبادیوں نے پوری طرح سے حقِ وطنیت ادا کیا، اور میری ان آنکھوں نے جس کے گلے میں شادی کے پھول دیکھے تھے، ان آنکھوں نے اُس کے جنازے کو بھی دیکھا اور قبر میں اُس کا آخری دیدار کیا ——— اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے (آمین)

ہماری نظر میں

حیات امام ابن القیم از:۔ عبدالعظیم شرف الدین (ایم۔اے) مترجم:۔ سید رشید احمد ارشد (ایم اے)
ضخامت ۵۲۶ صفحات (مجلد) قیمت:۔ بارہ روپے
ملنے کا پتہ:۔ نفیس اکیڈیمی بلاسس اسٹریٹ، کراچی ۱

جناب عبدالعظیم شرف الدین مصر کے نوجوان محقق عالم اور علامہ شیخ محمد ابو زہرہ اور جناب شیخ محمد زفزاف پروفیسر اسلامیات قاہرہ یونیورسٹی کے تلمیذ رشید ہیں، فاضل مصنف نے دارالعلوم قاہرہ سے ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے یہ تحقیقاتی مقالہ پیش کیا تھا، مصر کے بلند پایہ علماء کے ایک بورڈ نے اس مقالہ کو پسند کیا اور مقالہ نگار کی علمی کاوش و تحقیق کا کھلے دل سے اعتراف فرمایا۔

اس کتاب میں امام ابن قیم الجوزیہ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے حالات اور فقہ، عقائد اور تصوف پر امام موصوف کے دینی افکار پوری تحقیق و تدقیق کے ساتھ پیش کئے گئے۔ مصنف پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ جوانی میں اُن کو تجربہ کار اور جہاں دیدہ شیوخ اور علماء کی دانش و بصیرت عطا فرمائی گئی ہے۔

جناب عبدالعظیم شرف الدین کا مطالعہ وسیع ہے اور فکر مستقیم ہے، انھوں نے امام ابن قیمؒ کے دینی افکار کا اس کتاب میں ست نکال کر رکھدیا ہے، پوری کتاب علمی جواہر کا گنجینہ ہے، اس کے مطالعہ سے نہ صرف یہ کہ دینی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ دینی تعلق کو بھی قوت ملتی ہے!

فاضل مصنف علامہ ابن قیمؒ کے بہت بڑے مداح ہیں مگر کہیں کہیں اُن کے افکار کی کمزوری پر تنقید بھی کی ہے اور یہ دلیل ہے صاحب تصنیف کی دیدہ وری اور حق پسندی کی! مثلاً ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ حوادثِ افعال کو قائم کرنے میں ابن قیمؒ سے جو چوک ہو گئی ہے اور وہ اس مسئلہ میں فرقہ کرامیہ کے ہمنوا ہو گئے ہیں اُس کا اظہار فاضل مصنف نے کھل کر کیا ہے۔

بہ یک وقت تین طلاقیں ایک ہیں یا تین ہیں، اس بارے میں امام ابن قیمؒ کے افکار و مباحث کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:۔

۱:۔ صحابہ کرامؓ عہدِ نبوی میں صرف ایک طلاق دیتے تھے اور وہ قرآنِ کریم کے اس قول کا اتباع کرتے تھے کہ "طلاق دو مرتبہ ہوتی ہے"۔

۲:۔ ان میں سے جو کوئی تین طلاقیں دیتا تھا تو اس کی بیوی اُس سے جدا ہو جاتی تھی جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ نے فتویٰ دیا تھا۔

۳　حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جو طریقہ اختیار کیا وہ عہد نبوی ؐ کے طریقے کے عین مطابق تھا کیونکہ عہد نبوی ؐ میں جو شخص تین یا اس سے زیادہ طلاقیں دیتا تھا۔ تو اس کی عورت اُس سے الگ ہو جاتی تھی جیسا کہ مذکورہ بالا روایات میں بیان کیا گیا ہے۔ لہٰذا حکم یکساں ہے دونوں حالتوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ عہد نبوی ؐ میں تین طلاق دینے کا رواج کم تھا اور جو طلاق دیتا تھا، اس کے مطابق عمل ہوتا تھا البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اس کا رواج زیادہ ہو گیا تھا۔

اس لئے یہ سمجھنا غلط ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا فیصلہ رسول کرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے خلاف تھا اور صرف مصلحت عامہ کے لئے اس کو نافذ کیا گیا جیسا کہ امام ابن القیم بیان کرتے ہیں۔

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی علمی شان و جلالت اپنی جگہ مسلم ہے مگر اُن کے قابل فخر شاگرد ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں شدت کی جگہ جو توازنِ فکر پایا جاتا ہے اُس کے پیش نظر "تین طلاقوں" کے بارے میں اُن کی رائے اہلِ حدیث حضرات کے لئے قابلِ غور ہے۔

نفیس اکیڈمی جو علمی اور دینی کتابوں کی نشر و اشاعت کے سبب پاکستان میں اچھی شہرت رکھتی ہے "حیاتِ ابن قیم" کی اشاعت پر مبارکباد کی مستحق ہے، کتاب کا اُردو ترجمہ عام فہم، شستہ اور رواں ہے اور کتابت، طباعت اور کاغذ کے خاص اہتمام سے یہ کتاب شائع کی گئی ہے! اللہ تعالیٰ مصنف، مترجم اور ناشر کو اس کا اجر عطا فرمائے گا۔

تین کتابیں　از:- محبوب خزاں، محب عارفی اور قمر جمیل، ضخامت ۲۲۳ صفحات قیمت دو روپیہ پچاس پیسے
ملنے کا پتہ :- مکتبہ آسی ۱۶۲۵ جوہر آباد، فیڈرل بی ایریا اسکیم ۱۶ کراچی ۱۹

اس کتاب میں تین نوجوان شاعروں کی غزلیں اور نظمیں شامل ہیں، سب سے پہلے محبوب خزاں کا کلام "اکیلی بستیاں"[1] کے نام اور عنوان سے پیش کیا گیا ہے ——— منتخب اشعار :-

میں سوچتا ہوں کہ اس شور و شر کے بعد ہے کیا
فضا تمام نظر ہے، نظر کے بعد ہے کیا
شبِ انتظار سحر ہے، سحر کے بعد ہے کیا
دُعا برائے اثر ہے اثر کے بعد ہے کیا
یہ رہگذر ہے تو اس رہگذر کے بعد ہے کیا

لیکن تجھے کیا اُداس ہیں ہم　　راتیں ہیں بہت چراغ کم ہیں
گھبرا کے نہ فاصلوں کو دیکھو　　تیری ہی ادا کے پیچ و خم ہیں
دل لے کر اب جائیں کہاں　　دُنیا چھوڑی دل کے لئے
دیکھتے ہیں بے نیازانہ گزر سکتے نہیں　　کتنے جیتے اس لئے ہوں گے کہ مر سکتے نہیں
ہجرت ہے شہر شہر وطن کی تلاش میں　　بادِ صبا چلی ہے چمن کی تلاش میں
اپنی تلاش کون کرے دُور کون جائے　　اہلِ سخن ہیں اہلِ سخن کی تلاش میں

[1] کاش! اس میں "شتر گربگی" کا عیب نہ ہوتا۔

آنکھوں میں چمک سی ہے تو نظر کیوں نہیں آتا　　پلکوں پہ گہر ہیں تو بکھر کیوں نہیں جاتے
تیری ہی طرح اب یہ ترے ہجر کے دن بھی　　جاتے نظر آتے ہیں مگر کیوں نہیں جاتے
تجھے اب کیا کہیں اے مہرباں اپنا ہی رونا ہے　　کہ ساری زندگی ایثار ہی کرتے نہیں بنتا
خاک سے کس نے اٹھتی دیکھی ہو　　وہ قیامت کا استعارہ نہیں
تمام عمر یہ افسردگانِ محفلِ گل　　کلی کو چھیڑتے ہیں بیکلی سے کھیلتے ہیں

ایک نظم ہے "اکیلی بستیاں" اس کے دو شعر ہیں ؎

جنگل میں رستے، رستوں میں پتھر، پتھر پہ نیلم پری　　لہریلی سڑکیں، چلتے مناظر، بکھری ہوئی زندگی (ص۹)

"نیلم پری" سے کیا سبزہ اور خودرو گھانس مُراد ہے؟ اگر ہری گھانس مُراد ہے تو راستے میں جو پتھر پڑے ہوتے ہیں، اُن پہ گھانس نہیں ہوتی! ہاں! پہاڑوں کی گھاٹیوں اور راستوں کے ادھر ادھر جو پتھر اور چٹانیں ہوتی ہیں ان کی دراڑوں میں البتہ ہرے پودے اُگ آتے ہیں' "لہریلی سڑکیں" نامانوس ترکیب ہے' زہر سے جس طرح "زہریلی" مشتق ہے اسی وزن پر "لہر" سے "لہریلی" بنایا گیا ہے، اب اس کے بعد دوسرا قدم "کہرے" سے "کہریلی" ہوگا! پھر "بکھری ہوئی زندگی" کی کُنہ تک سمجھ میں نہیں آتی اور "چلتے ہوئے مناظر" ان سب پر مستزاد!

بدلی پہ چہرے، چہروں میں آنکھیں، آئی جوانی چلی　　ٹیلوں پہ جوبن ریوڑ کے ریوڑ کھیتوں پہ جھالر چڑھی

شاعر نہ جانے کیا کہنا چاہتا ہے؟ اُس نے کیا دیکھا ہے؟ کچھ نہیں کھلتا، پورا شعر عجیب ہے، "ٹیلوں پر جوبن" نے شعریت کو غارت کر دیا، "کھیتوں پر جھالر چڑھی" ـــــ یہ بے جوڑ سی بات فرما دی گئی! کھیتوں پر آخر کس چیز کی جھالر چڑھی ہوئی ہے، کہرے کی یا ہریالی کی! پھر جھالر ٹانکی جاتی ہے' غلاف کی طرح چڑھائی نہیں جاتی

ایک نظم ہے "دیوار سے گفتگو" اُس کا پہلا بند ہے: ؎

کسی ہنستی بولتی جیتی جاگتی چیز پر　　یہ گھمنڈ کیا، یہ گمان کیوں
کہیں اور آپ کی جان کیوں　　(ص۱۱)

"چیز" سے آخر شاعر کی مُراد کیا ہے؟ پھر یہ جو "دیوار سے گفتگو" ہو رہی ہے، تو بیچاری دیوار کو کس چیز پر گھمنڈ ہو سکتا ہے جس پر یہ طنز فرمائی جا رہی ہے ـــــ یہ مصرعہ ؎

کہیں اور آپ کی جان کیوں

مُبہم نہیں مہمل ہے ـ

یہ تو سلسلے ہیں اسی فریبِ خیال کے　　غمِ ذات و غیر و جمال کے
وہی پھیر اہلِ سوال کے
ابھی ٹھیک ہے یہ وفا کا زہر نہ گھولیے　　ارے آپ جھوٹ ہی بولیے
نہیں سب کے بھید نہ کھولیے
یہ سنبھلتے ہاتھوں میں کانپتی ہے کماں کیوں　　یہ سرک رہی ہے مچان کیوں
یہ کھسک رہے ہیں مکان کیوں

"غم ذات" یہ کس غم کا نام ہے ! "غم خیر و جمال" یہ کس طرح کا غم ہوتا ہے ! پھر اہلِ سوال کے پھیر کیا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد یہ ایکا ایکی گریز ——— کہ "ابھی ٹھیک ہے یہ وفا کا زہر نہ گھولئے" یہ کس سے تخاطب ہے ——— پھر یہ "سنبھلتے ہاتھ" کس منظر اور کیفیت کی آخر ترجمانی ہے، اس پر مستزاد مچان کا سرکنا اور مکان کا کھسکنا ! اس قدر ابہام اتنی گھٹن پیدا کر دینے والی اشاریت ! فکر و خیال اور اظہار میں کوئی ربط نہیں ! مصرعوں میں کوئی لطفِ شاعری نہیں !

ایک نظم "رات اور دن" ہے، اس میں فرماتے ہیں۔

یہ چراغاں، یہ چمن کیسے ملے ان سے نجات

سانس لینے کو ٹھہر جاؤ، تو جادو کا حصار

ہر طرف شعلہ زباں ناگ ہیں پھن جھومتے ہیں

سر اٹھاتے ہیں نئے راگ نئی راگنیاں

پاؤں پڑتے ہیں گلے پڑتے ہیں انجانے خیال

کیا مرے پاس مگر ایک تھکن ایک امنگ

ایک جینے کی لگن، ایک محبت کا لہو

نہ اندھیرے نہ اجالے سے عداوت ہے مجھے (صفحہ ۵۱)

چراغاں اور چمن سے شاعر آخر کس لئے اکتا گیا ہے جو ان سے نجات چاہتا ہے ! بات کہنے کا کوئی قرینہ بھی تو ہونا چاہیئے، پھر سانس لینے کے لئے اگر کوئی ٹھہر جائے تو پھر ٹھہرنے والے کے ارد گرد جادو کا حصار کون کھینچ دیتا ہے ؟ یہ کیا کہ جو الم غلم خیال ذہن میں آیا، اُسے جھٹ سے نظم کر ڈالا ! یہ کس وادی، کس محفل اور کس منظر کا آخر بیان ہو رہا ہے جہاں سانپوں کے پھن جھوم رہے ہیں اور راگ راگنیاں سر اٹھا رہی ہیں ——— راگوں کا سر اٹھانا، یہ کہاں کی زبان ہے ! ان جانے خیال کس لئے پاؤں اور گلے پڑ رہے ہیں، شاید اس لئے کہ شاعر انہیں شعر کے قالب میں ڈھال دے، مگر یہ بات اس طرح کہی جاتی ہے ؎

جب کوئی معرکۂ کون و مکاں ہوتا ہے ذرہ ذرہ مری جانب نگراں ہوتا ہے (جگر مراد آبادی)

"کیا مرے پاس" مصرعے میں کتنا برا لگتا ہے ! پھر یہ "تھکن" کہاں سے آگئی ——— اس کے بعد :۔

ایک جینے کی لگن، ایک محبت کا لہو

اس بے تکے مصرعے نے پوری نظم کی ریڑھ مار دی !

وہ حسین تھی مہ جبین تھی	بے گماں تھی بے یقین تھی
زندگی کی نرم نرم آہٹیں	بے سبب یوں ہی مسکراہٹیں
اور پھر حیا کی زندگی کی مار	معرفت کا بوجھ جبر و اختیار
یہ گناہ کیوں بھول کیوں نہیں	باغ میں تمام پھول کیوں نہیں (کیف سے غبار تک صفحہ ۶۱)

زندگی کی نرم نرم آہٹوں کا یہاں کیا محل ہے ! "حیا" کو زندگی کی مار کہنا اور زیادہ بے تکی بات ——— پھر یہ مصرعہ ع

معرفت کا بوجھ جبر و اختیار

شاعری کے ساتھ مذاق ——— اور یہ اَن مل بے جوڑ بول :۔

یہ گناہ کیوں بھول کیوں نہیں　　باغ میں تمام پھول کیوں نہیں

تو وجدان کے لئے سخت اذیت کوش ہیں! توبہ!

دلربا یہ دیکھتے ہیں اس کے آنکھ ہی نہیں ہے
اس کا کیا کریں

معشوق یا عاشق ان میں سے آخر کون کانا ہے؟

کیا بتائیں کیوں بتائیں، کون ہے جسے بتائیں
چھیڑتی چلیں ہوائیں جاگی شبیں جگائیں　(ص ۲۴)
دن بہار کے

"جاگی شبیں جگائیں" یہ کیا انداز بیان ہے!

اب چھری ہے یا گلا ہے
دل کشی بڑی بلا ہے
یہ بدن کدھر چلا ہے

جاگتے رہا کروگے
اتنا حسن کیا کروگے　(ص ۲۶)

کس کا گلا؟ کہاں کی چھری؟ پھر گلے اور چھری کے بعد "دل کشی" کہاں سے آگئی! اس کے بعد یہ مصرعہ:- ع

یہ بدن کدھر چلا ہے

وجدان اس کرب اذیت کی کس سے فریاد کرے!

پھر پنڈی سے لاہور چلے　　آنکھوں میں دل کا چور چلے
من کے جنگل مور چلے　(ص ۳۰)

"آنکھوں میں دل کے چور کا چلنا" یہ کس دیس کی زبان ہے!

تم امر ہو تم کچلی ٹہنیوں کی ماتا ہو　(ص ۳۱)

"ماتا" تو ماں کی محبت کو کہتے ہو، کچلی ٹہنیوں کا "ماتا" سے کیا تعلق؟ کوئی موزوں لفظ ذہن میں نہیں آیا تو "ماتا" لکھ مارا۔

؎ ہے نئے فانوس پر گرتی ہوئی پروانگی ہو

"پروانگی" غالباً "پروانہ" سے (پتنگے کے معنی میں) بنایا ہے، جس کا مونث اردو میں نہیں بولا جاتا، اور بنایا بھی جائے تو جس طرح "دیوانہ" سے "دیوانی" بنتا ہے۔ اسی طرح پروانہ سے "پروانی" بنے گا ــــــ اردو میں "پروانگی" اجازت اور حکم و فرمان کو کہتے ہیں امانت لکھنوی کا مصرعہ ہے ع

پتنگے کو نہیں پروانگی محفل میں آنے کی

غزل کا ایک شعر ہے:-

دوست کہیں یا دشمن تجھ کو　　روح نے سونپا دامن تجھ کو　(صفحہ ۵۲)

خوب! روح کے پاس کوئی کرتہ بھی ہوتا ہے جس کا دامن وہ لوگوں کو سونپ دیا کرتی ہے۔

کیسے آجاتی ہے کونپل پہ یہ جادو کی لکیر　　دن گزر جاتے ہیں محسوس کرو یا نہ کرو　(صفحہ ۶۲)

کس درخت اور پودے کی کونپل کا یہ ذکر ہو رہا ہے جس پر جادو کی لکیر آجاتی ہے "جادو کی لکیر" آخر کس چیز کی علامت (Symbol) ہے! "جادو کی چھڑی" تو سنا ہے!

بزم امکاں ہوئی دو گھونٹ لہو آنکھوں میں　　حرص کہتی ہے کہ کونین کو پیمانہ کرو　(صفحہ ۶۲)

اس شعر کی کوئی چول بھی سیدھی ہے! توبہ! اس شعر کا مرکزی خیال جو کچھ میری سمجھ میں آیا ہے وہ اگر درست ہے تو پھر جی چاہتا ہے کہ حضرت جگر مرادآبادی کا شعر یہاں نقل کر ہی دوں:-

عشق وہ تشنہ کام ہے کہ جسے　　زہر کا گھونٹ بھی ہے آب حیات

محبوب خزاں کی غزل کا مطلع ہے:-

سنبھالنے سے طبیعت کہاں سنبھلتی ہے　　وہ بیکسی ہے کہ دنیا رگوں میں چلتی ہے　(صفحہ ۶۴)

"دنیا کا رگوں میں چلنا" عجیب مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ لاحول ولاقوۃ

کتراتے ہیں بل کھاتے ہیں گھبراتے ہیں کیوں لوگ　　سردی ہے تو پانی میں اتر کیوں نہیں جاتے

لفظوں کے جوڑ دینے سے مطلب ہے، کیا کہا، کس طرح کہا؟ اس سے کوئی سروکار نہیں

دیکھئے خواب سحر چاٹئے دیوار ازل　　رات جاتی نظر آتی ہے مگر جائے کہاں　(صفحہ ۶۹)

"دیوار ازل" سے کیا مراد ہے اور پھر اس دیوار کا چاٹنا ——— "مگر جائے کہاں" نے شعر کے ابہام کو زیادہ یقینی بنا دیا

یہ نرم خواب سفینے، جزیرہ ہائے تلاش　　وہ ہم خرام کناروں کی بستیاں دیکھو　(صفحہ ۷۱)

صرف لفظ جوڑ کر شعر فٹ کر دیا

دنیا کے رنگ جھیلئے کمرے میں بیٹھ کر　　کھڑکی کے پاس جائیے حسرت خرید یئے　(صفحہ ۷۷)

مصیبت جھیلنا تو سنا ہے۔ مگر دنیا کے رنگ جھیلنا ان کانوں نے سنا ہو تو، کان گنہگار! یہ شاعری کے ساتھ ساتھ بیچاری زبان کی کیوں مٹی پلید کی جا رہی ہے۔

حال دل اتنے پیار سے مت پوچھ　　حال آئندہ ہے، گذشتہ نہیں　(صفحہ ۷۹)

ہمارے پلے تو کچھ پڑا نہیں ———

سنتے ہیں اک جزیرہ ہو کہ جہاں　　یہ بلائے حواس خمسہ نہیں　(۸۰)

اور

یہ بتاؤ جان چھوٹے کس طرح　　اب تو ہے چاہت کہو جھگڑا کہو

ہم حیران ہیں کہ اس قسم کی تک بندی پر کن لفظوں میں اپنی روحانی تکلیف اور طبیعت کی بدمزگی کا اظہار کریں۔

دوسری کتاب "گل آگہی" ہے جناب محب عارفی (علیگ) کا کلام اس کتاب میں شامل ہے ——— چند منتخب اشعار ———

انتہا ہر غروب کی ہے طلوع صبح ہوتی ہے نیم شب سے شروع
فرد مایہ دنیچ ہی ہم سہی ہم اس باغ ہستی کی شبنم سہی
خرد یقیں کے سکوں زار کی تلاش میں ہے یہ دھوپ سایہ دیوار کی تلاش میں ہے
چھلک چلا ہے بقائے حیا سے اس کا شباب شراب جرأت میخوار کی تلاش میں ہے
اس شوق میں کہ دیکھیں صید افگنی ہماری مڑ مڑ کے آہوان صحرا ٹھہر گئے ہیں
ماحول ہے کہ سایہ ہمراہ چل رہا ہے اے شوق! چل رہے ہیں یا ٹھہر گئے ہیں
زندگی بے کیف کردی اور اب بھی زندہ ہے یہ خلش دل کی کہ ایسا ہو کہیں ایسا نہ ہو
ایک لہر سی دیکھی گئی پائے نہ گئے ہم حالانکہ یہیں تھے، کہیں آئے نہ گئے ہم
راز ہستی تو کیا کھل سکے گا کبھی مل گئے تھے مگر کچھ کنائے ہمیں
دھوپ میں زندگی کی چلے ہیں بہت لے چلو دوستو! سائے سائے ہمیں

نظم ہے "انتشار" اس کا ایک شعر ہے :-

اپنے آپ کو دیکھ رہا ہے بے بس پڑا ہوا کوئی جیسے بدن کے پاس کھڑی ہو روح بدن سے جدا کوئی

خیال اچھا ہے مگر اس کے اظہار کے لئے موزوں پیرایہ بیان نہیں مل سکا! نغمگی جو شعر کی جان ہے اس کا اس نظم میں کہیں اتا پتا تک نہیں ملتا۔

کچھ موہوم لکیریں سی ہیں بے مفہوم ساخاکہ ہے دھبا دھبا چڑھا رہا ہے پوچھو چہرہ کس کا ہے (صفحہ ۸)

پہلا مصرعہ جتنا اچھا ہے، دوسرا مصرعہ اتنا ہی پست، سپاٹ اور بے مزہ ہے۔

میرے دریا میں طوفان پلتا رہا اپنی آغوش میں میں مچلتا رہا (صفحہ ۱۰)

مصرعہ ثانی میں ــــــ میں میں ــــــ کتنا ناگوار لگتا ہے

"ازل سے پہلے" کوئی شک نہیں فکر انگیز نظم ہے کہتے ہیں :-

ابھی تشریح سے نکتے نہ ہوئے تھے پامال ابھی تفصیل سے رسوا نہ ہوا تھا اجمال

مگر اس نظم کے بعض اشعار میں خاصا جھول پایا جاتا ہے

عصمت وقت ابھی لمحوں کی گنہگار نہ تھی دھار قطروں کی روانی میں گرفتار نہ تھی (صفحہ ۱۲)

عصمت کا گنہگار ہونا" یہ نہ روزمرہ ہے نہ محاورہ ہے اور نہ عام بول چال ہے! اور جب "وقت" تھا تو لمحے ضرور ہونے چاہئیں لمحات کے بغیر وقت کا تصور ممکن نہیں، یہ اس شعر میں معنوی غلطی ہے!

تھی تمنا کے تصرف میں تصور کی فضا تیر سرچشمہ ایجاد ہدف تھے گویا (صفحہ ۱۴)

پورا شعر مہمل ہے "سرچشمہ ایجاد ہدف" یہ کس بلا کا نام ہے

ہو سجدہ ریز اسے سر بے باکی خیال روز ازل جو تھا وہی قصہ ہے آج بھی (صفحہ ۱۶)

"بے باکی خیال" کا "سر" بھی ہوتا ہے۔ عجیب دریافت ہے۔

گرم روی سے تری دوری منزل ہلاک زود ترے قدر سے ہر خار تری راہ کا (صفحہ ۱۷)

اس بات کو یوں کہنا چاہیئے تھا کہ تیری گرم روی کے آگے دوریٔ منزل فاصلہ یک گام نظر آتی ہے۔ مگر کہا یہ گیا ہے کہ تیری گرم روی سے دوریٔ منزل ہلاک ہے۔ یہ انداز فکر اچھا خاصا مضحکہ ہے۔

تو ہو مقابل تو لغزیدہ پیچ و خم قدسیاں　　تو ہو مخالف تو ہیچ خود مرد کبریا (صفحہ ۱۸)

"قدسیاں" تو قدسی یعنی فرشتے کی جمع ہے۔ فرشتے کیا راستے یا زلفیں ہیں جن میں پیچ و خم ہوتے ہیں، دوسرا مصرعہ اور زیادہ مہمل ہے۔

پہلا خط مختصر سی نظم ہے اور اس میں جدت فکر پائی جاتی ہے۔ لیکن اس میں جبین دلنوازی" وجدان کو بہت کچھ کھٹکتی ہے

ہم کو سائے بھی سخت لگتے تھے　　ہم کو دلنے درخت لگتے تھے (صفحہ ۳۴)

مصرعہ ثانی میں ابہام نہیں اہمال پایا جاتا ہے۔

لیکن اے مقطع فسانۂ ہوش　　اے دل لے شمع یاس خانۂ ہوش (صفحہ ۳۴)

"یاس خانہ ہوش" کس قدر مہمل ترکیب ہے۔ اسی نظم میں اس مہمل شعر کے بعد کا یہ شعر:-

انتہا ہجر غزدہ کی ہے طلوع　　صبح ہوتی ہے نیم شب سے شروع

کتنا اچھا ہے

ہر طرف شیوۂ زلیخائی　　ہم سے ہے محو دامن آلائی (صفحہ ۳۶)

مصرعہ ثانی زبان و بیان اظہار اور فکر و خیال ہر اعتبار سے پست ناپختہ بے جوڑ اور مہمل،

ہم نے دنیا اسی کو جانا ہے　　اپنی ہمت کا کیا ٹھکانا ہے (صفحہ ۳۹)

"ہمت" لانے کی یہاں کوئی تک ہی نہ تھی۔

دماغوں سے انکے اُبلتا ہے زہر　　نظر پہ نظر پہ اگلتا ہے زہر
صراحی و جام اس کے قلب و جگر　　طرب کے خزانے تراوٹ کے گھر

جس نظم کے یہ دو کاواک شعر ہیں وہ نظم ——— جراثیم کی مناجات ——— مثنوی کے انداز پر خاصی جاندار نظم ہے

مل تو جائے اپنے بھنور کو دریا کے چکر سے نجات
لیکن آہ اگر رہ جاؤں ہو کر میں ہمہ تن اپنا (صفحہ ۶۲)

شاعر آخر کہنا کیا چاہتا ہے! "ہمہ تن اپنا ہو کر رہ جانا" یہ انداز بیان اور زیادہ عجیب ہے۔

یہ کائنات ساری تصنیف ہے ہماری　　اک مسئلہ محب ہم جس کا ٹھہر گئے ہیں (صفحہ ۶۶)

یہ خیال ہی سرے سے واقعہ کے خلاف ہے کہ کائنات انسان کی قوت تخلیق کا مظہر ہے

سمجھتے ہیں کسی ساحل نشیں کی شوخی ہے　　جو رازِ مستی موج رواں سمجھتے ہیں (صفحہ ۷۲)

موج رواں کی مستی کیا ہوتی ہے! ساحل نشین سے آخر کیا مراد ہے محبوب مجازی یا محبوب حقیقی کچھ نہیں کھلتا۔

اس کتاب میں ترتیب کے لحاظ سے جناب قمر جمیل کا کلام سب سے پہلے ہونا چاہیئے تھا کہ وہ اس کتاب کے تینوں شعراء میں سب سے اچھے شاعر ہیں۔ چند منتخب اشعار:-

طاق ایواں میں جھلملاتی ہوئی　　روشنی کچھ کبود کچھ گلفام

وہ زعفرانی کشتیوں میں دھواں　　　عود میں بس گئے ہوں جیسے شام
کیا صبح دریا، کیا شام ساحل　　　اپنی چمک میں دونوں برابر
جگنو کی چمک تاروں کی جھل مل

اک عمر گزاری پاس تیرے　　　آخر میں کھلا کہ خواب دیکھا
آتے ہیں رہرو جاتے ہیں رہرو　　　اپنی جگہ پر قائم ہے منزل
زنجیر بپا حباب جیسے　　　ہم پھر بھی ہیں آفتاب جیسے
اے دامن گل ! گواہ رہنا　　　کچھ داغ بھی ہیں گلاب جیسے
ہر رات کسی کی یاد آئی　　　وہ رات بھی کیسی خواب جیسے[1]
ہم نشیں ! دل کے قریب اور آ　　　یہ کلی سائے سے کمھلاتی ہے
اگر خزاں میں بھی ہم نیم جاں گزرتے ہیں　　　تو گلستاں کی زمیں پر گراں گزرتے ہیں
بہت حسین ہیں یہ روز و شب جوانی کے　　　مگر وہ سانحے جو ناگہاں گزرتے ہیں
جمیل جب بھی گزرتے ہیں اپنے شہر سے ہم　　　بیاد جلوۂ شعلہ رخاں گزرتے ہیں
بیتابی تو خیر رہے گی ، بے تابی کی بات نہیں　　　مرنا اتنا سہل نہیں ہے جینے کی تدبیر کریں

ایک نظم " دجلہ کے خواب " ہے جس کے بعض اشعار خاصے شگفتہ اور رواں ہیں ۔ مگر اس قسم کے شعروں نے اس نظم کے تاثر کو غارت کر دیا ۔

مل کے جب جھکتی ہیں لگتی ہیں کلی منہ بندسی　　　اور جب تنتی ہیں کس درجہ بھلی دلبند سی　　(صفحہ ۹)

اول تو یہ تشبیہ ہی عجیب ہے کہ لڑکیاں جب ایک ساتھ مل کے جھکتی ہیں تو " منہ بند کلیوں " کی مانند دکھائی دیتی ہیں ——— پھر دوسرے مصرعہ میں " کس درجہ بھلی دلبند سی " نے شعر کی خواری لگا دی ۔

وہ جبینوں کے عرق میں جیسے شعلوں کا سراب　　　جیسے صندل میں شراروں کے تبسم محو خواب

" شعلوں کا سراب " کیا ہوتا ہے ؛ پھر صندل میں شراروں کے تبسم کا محو خواب ہونا عجیب مشاہدہ اور انوکھا خیال ہے

تار مطرب میں ناوک پرفن　　　مغبچے ہاتھ میں لئے زہراب　　(صفحہ ۱۱)

" ناوک پرفن " کتنی نامانوس ترکیب ہے ۔ دوسرا مصرعہ اس طرح ہونا چاہئیے تھا ـــ مغبچوں کے ایاغ میں زہراب

یہ طلسمی لوگ پتھرائے ہوئے　　　سو رہے ہیں اپنے ارمانوں کے ساتھ

اس قسم کے شعر بالکل نومشقی کے زمانے میں کہے جاتے ہیں ۔

چاندنی نکلتی ہے
سونے سونے منظر ہیں
رات شاہراہوں سے
اُٹھ کے آٹھ ملتی ہے

---

[1] کیسی کی جگہ " یاسے " ہوتا تو شعر کی تاثیر بڑھ جاتی ۔

شاعر کا مفہوم تو سمجھ میں آگیا مگر مفہوم ادا کس بُری طرح سے ہوا ہے۔

حسین کلیوں کے پٹ نہ کھولو
فضا میں اک رقص جاگتی ہے
ہوائے گلشن سے کچھ نہ بولو

یہ کس سے خطاب ہے ؟ کلیوں کی نازک و لطیف پتیوں کو "پٹ" کہنا کلیوں کی لطافت اور نازکی پر ظلم ہے ——
"رقص جاگتی" کہاں سے آگیا ؟ کوئی تمہید، اشارہ اور قرینہ !!

یہ پھول پتے چاندنی یہ صورتیں من موہنی — ایسے میں اپنی جاگتی ان سے چھپائیں کس طرح (ص ۴۹)

اودو، ابہام، اہمال، بے تعلقی !!

طائر جاں کی خبر لاتی ہے — کوئی آواز اگر آتی ہے

یہ کون سا قضیہ ہے ! پھر طائر جاں کیا کہیں قفس [illegible] ہے ! آخر شاعر کیا کہنا چاہتا ہے !

اب بھی کسی بازار کا محتاج نہیں — احساس کی کلیوں میں چمکتا ہوا کندن (ص ۶۵)

شاعر کا مفہوم اُس کے بطن شاعری میں رہ گیا۔ احساس کی کلیاں کیا ہوتی ہیں۔

یہ پیالہ ہے کہ دل ہے ، یہ [illegible]

[illegible]
کے کسی دست مہرباں کے

"دست مہرباں" کا سایہ بھی ہوتا ہے ، جیسے شاعر درخت کا سایہ [illegible] ہے ! ؟ چشم بددور کیا سمجھ ہے۔

جناب محبوب خزاں ، جناب محب عارفی اور جناب قمر [illegible] شاعرانہ صلاحیتیں پائی جاتی ہیں ، جن کی جھلک اُن کی بعض نظموں اور غزلوں میں ملتی ہے ! مگر یہ حضرات "ترقی پسند [illegible]" سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں اسی چیز نے اُن کے کلام میں شدید قسم کی رمزیت اور اشاریت پیدا کردی [illegible] ہیں ابہام کا روپ دھار لیا ہے اور جو کہیں اہمال بن گئی ہے ! نئی ترکیبیں ہیں مگر نامانوس فکر و خیال میں جدت ہے لیکن [illegible] اور قبیح اظہار اور انداز بیان اور زیادہ اُلجھا ہوا ہے ، پوری نظمیں گورکھ دھندا معلوم ہوتی ہیں ، سپاٹ پھیکے مزہ ، نغمگی کا دُور دور پتا نہیں ! اگر اس قسم کی نظموں کی کتابیں بکتی رہیں اور لوگ انھیں دل چسپی کے ساتھ پڑھتے رہیں تو یوں کہنا چاہیے کہ جو بدمذاقی چند ترقی زدہ شاعروں اور ادیبوں تک محدود تھی وہ اب عام ہوتی جا رہی ہے ! اگر یہ ذوق عام ہوگیا تو اُردو جسے حکومتوں کی مخالفت اور غفلت نہ مٹا سکی ، اس بدمذاقی کے سبب ایک بے رُوح زبان بن کر رہ جائے گی !

اس کتاب کی بعض نظموں کی بحریں عروض اور موسیقی دونوں سے مختلف ہیں ، جن کو پڑھتے ہوئے شدید کوفت ہوتی ہے ! نئی بحر ، نیا خیال ، نیا انداز بیان اس "نئے پن" کے ہوکے نے ایسی بے تکی نظموں کو جنم دیا ہے کہ وجدان اور ذوق چیخنے لگتے ہیں !

جلد: ۱۵

شمارہ ۸

فاران
کراچی

ایڈیٹر:- ماہر القادری ✷ ماہ نومبر ۱۹۶۳ء

ترتیب

چندہ سالانہ
سات روپے

مقامِ اشاعت
دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

قیمت فی پرچہ
باسٹھ پیسے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نقشِ اوّل

اسی مہینہ اکتوبر کے وسط میں اسلامی جمعیۃ طلبہ کا سالانہ اجلاس کراچی میں منعقد ہوا، جس کی دو نشستوں میں شرکت کی مسرت سعادت راقم الحروف کو حاصل ہوئی۔ ریلوے اسٹیڈیم جہاں اب تک کھیل تماشے ہوتے رہے ہیں۔ تین دن تک عبادت گاہ بنا رہا اور علم واخلاق کی خوشبو سے اُس میدان کا ماحول اور فضا معطر رہی۔ اگر اُس میدان کو تھوڑی دیر کے لئے گویائی کی قوت مل جاتی تو وہ اپنے دل کی بات کہے بغیر نہ رہتا کہ خدا کرے اب آٹھوں پہر:۔

؎ یہی منظر ہو، یہی انجمن آرائی ہو

اور

؎ ! ایں کرم بارِ دگر کُن

جلسوں میں وقت کی پابندی، خوش انتظامی، شامیانہ، قناتیں، کرسیاں اور کتبے ہر چیز اپنی جگہ دل کش و دیدہ زیب اور قابلِ تعریف! اور ان تمام خوبیوں سے بڑھ کر اس اجتماع کا دینی اور اخلاقی ماحول! مغربی پاکستان کے نمائندوں کے علاوہ مشرقی پاکستان سے بھی مندوبین طلبا اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ نوجوان طلبہ کے بہت سے چہروں پر ڈاڑھیاں کر بھلی لگتی تھیں، ہر ڈاڑھی مغرب زدگی پر زندہ طنز اور اطاعتِ رسول ؐ کا جیتا جاگتا اعلان اور ثبوت تھی، یہ وہ صاحب عزیمت نوجوان ہیں جو اللہ تعالیٰ کے پورے کے پورے دین کو اپنی زندگیوں پر عملاً نافذ کرتے ہیں اور دین کے چھوٹے سے چھوٹے جزیہ اور شعار کو بھی غیر اہم نہیں سمجھتے اور اس نفسیاتی حقیقت سے باخبر ہیں کہ فرع اور جزئیہ کو نظر انداز کرتے کرتے بات "کل" تک پہونچتی ہے کہ ہر "کل" اپنے اجزا ہی کا تو مجموعہ ہوتا ہے۔

بعض طلبہ کی تقریریں بھی سنیں، اس نوجوانی کے زمانے میں اظہارِ خیال میں اس قدر پختگی، سنجیدگی اور متانت! تقریروں میں کس قدر ربط اور سلجھاؤ تھا۔ پھر جو بات کہی اُس میں کسی قسم کا تذبذب اور معذرت نہیں، یقین و عزیمت ایک ایک جملے سے نمایاں! آج کی دُنیا میں سینکڑوں نوجوان جہاں جمع ہو جائیں، وہاں کس قدر شور و شر، خوش فعلیاں اور ہنگامہ ہوتا ہے مگر اسلامی جمعیۃ طلبہ کے اس اجلاس میں وقار و سنجیدگی اور تہذیب و متانت کے مناظر دیکھ کر جی خوش ہو گیا اور دل نے اس کا اعتراف کیا کہ اسلام جس کے دل میں اُتر جاتا ہے تو جوانی بھی مہذب، باوقار، اور غیرت مند و حیادار بن جاتی ہے اور دل کو یہ کیفیت نصیب نہ ہو تو پھر ہم نے بڑے بڑے بوڑھوں کو ڈوم ڈھاڑیوں کی طرح ٹھٹھول کرتے اور عملاً بے حیائی کی باتوں میں مُبتلا پایا ہے!

اسلام کوئی شک نہیں اپنی فطرت سے تحریک اور انقلاب واقع ہوا ہے، جس میں جمود اور ٹھیراؤ نہیں، ہر آن عمل حرکت

بڑھے چلے جانے کا جذبہ :۔

کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون

ان نوجوانوں کے جوش، جذبہ، استقامت اور یقین کو دیکھ کر دل بلاشبہ کچھ پُر اُمید ہو گیا، اور ایسا محسوس ہوا کہ ہم اخلاق و نیکی اور تہذیب و شرافت کی کسی تجربہ گاہ میں آ گئے ہیں۔

اسلام اس کی تاکید کرتا ہے کہ جب بچہ نو سال کا ہو جائے تو نماز پڑھنے کی اُسے تاکید کی جائے یہاں تک کہ نماز سے غفلت برتے تو مناسب انداز پر حکمت کے ساتھ تادیب بلکہ گوشمالی بھی کی جا سکتی ہے، نو سال کی عمر میں جب اقامتِ صلوٰۃ کی یہ تاکید آئی ہے تو بلوغ کے بعد ایک نوجوان اقامتِ دین کے فریضہ سے کیسے غافل رہ سکتا ہے چاہے وہ کسی اسکول اور کالج کا طالب علم کیوں نہ ہو، اسلامی جمعیت کے کارکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے اقامتِ دین کے تقاضوں کو پہچانتے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت کا احساس رکھتے ہیں! یہ نوجوان تعلیمی درسگاہوں میں اپنی ذات سے نیکی اور شرافت کے مبلغ اور عملی نمونے بنے ہوئے ہیں، ان کو اُن مدارس میں بھی بدرجہ مجبوری پڑھنا پڑتا ہے جہاں مخلوط تعلیم رائج ہے، لیکن کالجوں کی لڑکیاں اس کی گواہی دیں گی کہ اس جمعیۃ سے جو طلبہ وابستگی رکھتے ہیں وہ تعلیم گاہوں کی رُومانی زندگی سے الگ تھلگ رہتے ہیں!

دوسرے طالب علموں کی طرح یہ اسلام پسند نوجوان بھی اپنے سینوں میں جذبات کے شعلے رکھتے ہیں اور ان کی جوانی بھی رُومانی ہنگامے چاہتی ہے مگر نیکی اور تقویٰ کا احساس ان کے جنسی جذبات کو شعلہ فشاں اور ان کی جوانی کو بے راہ نہیں ہونے دیتا مخلوط تعلیم کی دلدل میں یہ نوجوان کنول کی طرح زندگی گزارتے ہیں، ان کی پیشانیوں سے مسجدیں آباد ہیں اور ان میں بعض نوجوان تو تہجد گزار تک ہیں اور ماہِ صیام میں اعتکاف کی سعادت حاصل کرتے ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ یہ "صُلحاءِ اُمت" ہیں، تو شاید یہ کوئی بیجا مبالغہ نہ ہوگا صالح کسی عجیب مخلوق کا نام نہیں ہے اور نہ صالحیت کی سند اور خرقہ کسی ادارے سے عطا ہوتا ہے، جو کوئی اسلامی اخلاق کے تحت نیک زندگی گزارتا اور نیکی و تقویٰ کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتا ہے وہی صالح ہے

یہ نوجوان سینما ہالوں، کلب گھروں، رقص گاہوں اور آرٹ کونسلوں میں نظر نہیں آئیں گے کہ ان کی دلچسپی کے مشاغل ہی نہیں ہیں، ان مقاماتِ تفریح و ہوس سے یہ فطری طور پر کسی قسم کی کوئی مناسبت اور لگاؤ نہیں رکھتے، ان کو آپ مسجدوں میں، قرآن و حدیث کے درس میں، اور علمی اجتماعات میں دیکھ سکتے ہیں، ان کی سب سے بڑی تفریح مشاعرے ہیں اور ان مشاعروں میں بھی ان نوجوانوں کو ہم جیسے شاعروں سے شکایت ہی رہتی ہے کہ غزل کی بجائے کوئی مقصدی نظم کیوں نہیں سُنائی گئی!!

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے یہ اسلام پسند نوجوان اپنے ساتھیوں سے پیچھے نہیں ہیں بلکہ ان سے کچھ آگے ہیں، ان میں سے بہت سوں نے خاص امتیازات کے ساتھ امتحانات میں کامیابی حاصل کی ہے، اور امتحان کے دوران میں کسی ادنیٰ بے اعتدالی اور بے ضابطگی کو روا نہیں رکھا، ان میں علم کی صحیح تڑپ پائی جاتی ہے، مطالعہ کے شوقین اور کتابوں سے محبت کرنے والے ہیں، ضرورت مند اور نادار طلبہ سے یہ نوجوان زبانی نہیں عملی ہمدردی کرتے ہیں، ان کے والدین اور سرپرستوں کو ان کے اخلاق پر اعتماد ہے ان کی گھریلو زندگی میں کسی قسم کا اضطراب اور کشمکش نہیں پائی جاتی ان میں سے بعض تو ایسے ہیں کہ ان کی اسلامی زندگی سے متاثر ہو کر ان کے والدین کے حالات میں دینی انقلاب پیدا ہوا ہے اور گھروں کا ماحول بدلا ہے ـــــــ یہ نوجوان دوسروں کی طرح نہ فضول خرچ ہیں اور نہ چٹورے ہیں، ان کی ضد اور کسی بے جا خرچ کے سبب ان کے والدین کو کوئی پریشانی

نہیں اُٹھانی پڑتی!

تعلیم گاہوں کے ڈسپلن کے یا انتہائی پابند ہیں ہڑتالوں اور ہنگامہ آرائیوں کی لائن پر یہ سوچتے تک نہیں ان میں کا کوئی فرد یہ بات کر ہی نہیں سکتا کہ امتحان گاہ سے پرچہ پھاڑ کر احتجاجاً واک آوٹ کر جائے الزام یہ کہ پرچہ سخت تھا اور نصاب کی کتابوں سے باہر سوالات کئے گئے تھے، جن جن درسگاہوں میں اسلامی جمعیۃ طلبہ کا اثر ہے وہاں کمیونزم پروان نہیں چڑھ رہا ہے' کمیونسٹ طلبا اپنے مقاصد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اسی جمعیۃ کو سمجھتے ہیں اور اس کو بدنام کرنے اور طلبہ میں بے اثر اور غیر مقبول بنانے کے لئے طرح طرح کی ریشہ دوانیاں اور سازشیں کرتے رہتے ہیں! اسلامی جمعیۃ طلبہ والے اپنے اساتذہ کا احترام کرتے ہیں۔ ان اسلام پسند نوجوانوں کی یہ کوشش رہتی ہے کہ طلبا اور حکومت کے نظام تعلیم کے مابین نزاع و کش مکش پیدا نہ ہو۔ طلبا کے جائز مطالبات منوانے کے لئے صرف آئینی ذرائع استعمال کئے جائیں کہ تعلیم گاہیں سیاست کے اڈے نہیں ہیں اور نہ طلبہ کو سیاسی لیڈروں کا رویّہ اختیار کرنا چاہیئے۔

اسلامی جمعیۃ طلبا کے ارکان اچھے شہری، پسندیدہ طالب علم اور نیک سیرت نوجوان ہیں ان کے مستقبل سے اسلام اور پاکستان بہت کچھ اچھی توقعات اور نیک امیدیں رکھتا ہے، پاکستان کی سرزمین میں سیرت و کردار کی یہ بہت اچھی فصل تیار ہو رہی ہے۔ یہ اسلام پسند نئی پود جب زندگی کی عملی جدوجہد میں داخل ہوگی تو ملک کے بہت سے بگڑے ہوئے کام سنبھل جائیں گے ان کی فراست اور سیرت اس فساد زدہ معاشرے کو سنوارے گی اور یہ تخریب کو تعمیر سے بدل دیں گے، کیا عجب ہے کہ یہی نونہال مستقبل میں پاکستان کے چمن بند ہوں اور زمام کار انہی کے ہاتھوں میں ہو! جو نوجوان جوانی ہی میں اتنے مہذب نیک کردار اور فرض شناس ہوں جب ان پر زندگی کی ذمہ داریوں کا بار پڑے گا تو ان کی ہر خوبی میں اور زیادہ پختگی پیدا ہو جائے گی کہ زر خالص آگ میں تپ کر اور زیادہ نکھر جاتا ہے

اسلامی جمعیۃ طلبا کا ماضی بہت شاندار رہا ہے حال اس سے زیادہ شاندار ہے اللہ تعالیٰ کی ذات سے توقع ہے کہ مستقبل اور زیادہ تابناک و درخشاں ہوگا۔ یہ اسلام پسند نوجوان تعلیم سے فارغ ہو کر جس محکمہ' دفتر اور شعبہ سے بھی متعلق ہوئے ہیں وہاں نیک نام رہے ہیں۔ انہوں نے بعض ایسے عہدوں سے استعفیٰ دے دیا ہے جہاں رشوت کے بغیر ان عہدوں پر رہنا دشوار تھا تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے رزق حلال کی تلاش کی اور اپنی دنیا بنانے کے لئے دین کے تقاضوں کو پس پشت نہیں ڈالا۔

اسلامی جمعیۃ کے طلبا سے مل کر ان کی صحبت میں رہ کر اور انھیں دیکھ کر نیکی کے جذبات ابھرتے اور خدا و آخرت کی یاد آتی ہے اس معصیت پرور دہ ماحول اور گناہ آلود معاشرے میں ان نوجوانوں کا وجود۔ ہدایت کا نشان اور روشنی کا مینارہ ہے! "کنویسنگ" کا لفظ بدنام ہو چکا ہے مگر ان نوجوانوں نے اس بدنام لفظ کو تقدس عطا کی ہے، طلبا میں ان کی کنویسنگ نیکی اور تقویٰ کے لئے ہوتی ہے ان کی کنویسنگ اور جدوجہد سے نمازی نوجوان، نمازی بن گئے ہیں، بہت سوں نے اپنی آزاد زندگی کو اخلاق کا پابند بنا لیا ہے، ان میں بعض نوجوان تو پارس پتھر کی خاصیت رکھتے ہیں کہ ان سے جو چھو گیا وہ سونا بن گیا۔

اس مادی دور میں جب کہ از کار رفتہ بوڑھے لوگ تک کسی نہ کسی عنوان سے غلط قسم کے چٹخاروں میں مبتلا ہیں۔ ان نوجوانوں کا نیکی اور تقویٰ کے کلمہ جامعہ پر اکٹھا ہو جانا اور اس مقصد کے لئے عملاً جدوجہد کرنا کتنی بڑی بات ہے، کتنی بہت لذتیں ہیں جو ان کے لئے بڑی آسانی سے حاصل ہو سکتی ہیں مگر خوف خدا کے سبب ان لذتوں کو انہوں نے ترک کر دیا ہے۔ نوجوانی میں جنھوں نے ضبط نفس کیا ہو بڑے ہو کر وہ کتنے نیک اور معاشرے کے لئے کس قدر مفید اور کارآمد ثابت ہوں گے۔

ہم خواص و عوام کی خدمت میں گزارش کرتے ہیں کہ وہ اسلامی جمعیۃ طلبا کے کام کو دیکھیں، ان کے کارکنوں سے رابطہ پیدا

کریں اور اگر وہ اپنے مشاہدے مطالعے اور تجربے سے اس جمعیۃ کو مفید نیک اور کارآمد جماعت پائیں تو پھر ان کا یہ فرض ہے کہ اس ادارے سے اپنی ہمدردی اور تعاون کا عملاً ثبوت دیں، آج کی دنیا میں سوسائٹیوں، پارٹیوں، آرگنائزیشنوں اور اداروں کی کمی نہیں ہے مگر ان میں سے کتنی جماعتیں ایسی ہیں جن پر پوری طرح اعتماد کیا جا سکتا ہے، آج ہمارے معاشرے کا جس کا ایک فرد راقم الحروف بھی ہے یہ رنگ ہے کہ فقیر کو ایک آنہ دیتے ہوئے دل میں کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ یہ شخص بھیک مانگ کر کہیں چرس اور سلفہ تو نہیں پیتا۔

آہ! یہ مخلوط تعلیم اسلامی جمعیۃ طلبہ کے حکومت سے بعض مطالبات ہیں۔ ان کا ایک مطالبہ یہ بھی ہے کہ درسگاہوں میں مخلوط تعلیم کو ختم کیا جائے، لڑکوں اور لڑکیوں کے مدارس جداگانہ ہونے چاہئیں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک جگہ تعلیم پانا اور ملنا جلنا اخلاقی اعتبار سے سخت اندیشہ ناک ہے اور ہزار احتیاط کے باوجود ہر قسم کی اخلاقی لغزش کا امکان ہے یورپ سالہا سال سے مخلوط تعلیم کا تجربہ کر رہا ہے۔ اور اس خوفناک تجربہ کے بعد اس کے بعض غیرت مند دانشمند چیخ رہے ہیں کہ خدا کے لئے مرد و زن کی اس ملی جلی تعلیم کو بند کرو، اس نے ہمارے معاشرے کو جنسی آوارگی کی انتہائی گراوٹ تک پہنچا دیا ہے۔ ۱۹ اگست کا روزنامہ جنگ ہمارے سامنے ہے اور اس کی یہ عبارت ہم پڑھ کر اپنے یہاں کے نظام تعلیم کی خرابیوں پر افسوس کر رہے ہیں

> "لڑکے اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کے اخلاقی پہلو پر پاکستان ہی میں نہیں بلکہ مغرب میں بھی عام بحث ہو رہی ہے۔ ہمارے ہاں عام خیال یہ ہے کہ مخلوط تعلیم کا نوعمر لڑکے اور لڑکیوں کے اخلاق پر بالعموم بُرا اثر پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مخلوط تعلیم کا نظام بھی ہمیں مغرب سے ورثہ میں ملا ہے مگر اب خود مغربی ممالک میں بھی بعض ذمہ دار لوگ جنس لطیف کی بے راہ روی سے متوحش ہو کر اس مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے لگے ہیں یارک شائر برطانیہ میں بیس ہزار آبادی کا ایک قصبہ ہے "ایلانہ" اس قصبہ میں "کنواری ماؤں" کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ایک مقامی ڈاکٹر نے جو بیس سال سے پریکٹس کرتا ہے، یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ـــــ

اس جنسی آوارگی اور انارکی کا سب سے بڑا سبب وہ اسکول ہیں جہاں لڑکے اور لڑکیوں کو ایک ساتھ تعلیم دی جاتی ہے ڈاکٹر میکزلین نے برٹش میڈیکل جرنل میں لکھا ہے کہ پہلے ایلانہ میں لڑکے اور لڑکیوں کے اسکول الگ الگ تھے مگر ان کی جگہ جب مخلوط تعلیم کی اسکیم کے تحت ایک ہی گرامر اسکول قائم کیا گیا تو اس کے بعد ایک سال کے اندر قصبہ میں "کنواری ماؤں" کی تعداد دُگنی ہو گئی ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ میرے پاس جنسی مسائل اور غیر متوقع حادثات حمل لے کر آنے والی لڑکیوں کی تعداد میں تشویشناک

حد تک اضافہ ہو گیا ہے ظاہر ہے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ یہ صورت حال مخلوط طریقہ تعلیم کے رواج ہی کا نتیجہ ہے۔ ۔ ۔ ۔ میرا یہ ایمان ہے کہ یہ جنسی غارت گری مخلوط تعلیم کا نتیجہ ہے۔

۔ ۔ ۔ چنانچہ یارک شائر (برطانیہ) کے ایک خصوصی اجتماع نے ایک قرارداد منظور کی ہے جس میں اس امر کا واشگاف اعلان کیا گیا ہے کہ شادی سے قبل اختلاط جنسی ناجائز، غیر قانونی اور انسانیت کے خلاف سنگین جرم ہے!

ان حقائق کو پیش کرنے کے بعد روزنامہ جنگ کا یہ چونکا دینے والا مضمون ان جملوں پر ختم ہوتا ہے:-

"مغرب کی ہوس پرستی اور جنسی انارکی کے وہ مقلدین جو ہمارے مشرقی خطہ ارض میں آوارگی و بے راہ روی کے نقیب ہیں، ان کی سرزنش ہونی چاہیئے کیونکہ آج ہمارے یہاں بھی ایک ایسا طبقہ پیدا ہو چکا ہے، جو مغرب کے مذہب آوارگی پر جان و دل سے فدا ہے"

سچ کہا اس غیرت مند مقالہ نگار نے جو لوگ جنسی انارکی کو تہذیب و ثقافت کا نشان سمجھتے ہیں اُن کی واقعی سرزنش ہونی چاہیئے یہ لذت پرست گروہ نفرت و ملامت کا مستحق ہے، یہ لوگ اپنے ناپاک خیالات کی ترویج سے باز نہ آئیں تو سوسائٹی کو اس کا حق پہونچتا ہے کہ ان کا بائیکاٹ کر دیے، یہ لوگ جن گلی کوچوں سے نکلیں ان پر آوازے کسے جائیں، یہ بے حیا اور بے غیرت ٹولی معاشرے میں مقام عزت کی ہرگز ہرگز مستحق نہیں ہے۔

پاکستان میں بے حجابی، بے حیائی اور جنسی آوارگی کی روک تھام ہو سکتی ہے، پانی ابھی تک سر سے اُونچا نہیں ہوا ہے، ابھی حالات اتنے نہیں بگڑے ہیں کہ ان کو سنبھالا نہ جا سکے، ابھی مرض اپنے اس آخری درجہ کو نہیں پہونچا کہ جب علاج معالجہ کی تدبیروں سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، عوام و خواص اور خاص طور سے حکومت اپنی ذمہ داری کو اگر محسوس کرے تو طاقت کے زور سے ان خرابیوں کو دور کیا جا سکتا ہے جن کے ہاتھوں میں "آرڈیننسوں" کی قوت ہے کاش! وہ اپنی پوری قوت اُن مفاسد کے دور کرنے اور اُن برائیوں کے مٹانے اور روکنے میں صرف فرمائیں، جن کی بدولت یورپ "قحبہ خانہ" بن چکا ہے اور وہاں کے بعض غیرت مند اور حساس اہل دانش اس خرابی اور بگاڑ پر فریاد اور واویلا کر رہے ہیں۔

لکھے پڑھے طبقہ سے جو پاکستان کے مسلمانوں کو اس انداز پر تلقین کی جاتی ہے کہ اسلام میں اجتہاد کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور اسلام تنگ نظری نہیں سکھاتا، اس سے کوئی فائدہ نہیں! ان نکتوں پر تو اس وقت غور کیا جا سکتا ہے جب کھلی ہوئی برائیوں پر جو پوری کی پوری اُمت مسلمہ کے نزدیک کسی ایک فرد کے اختلاف کے بغیر مسلّم ہیں، پابندی عائد کی جائے اور نیکیوں کو قائم کیا جائے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بغیر اجتہاد و ترقی کی تلقین کرنا بے معنی ہے، جہاں تک منکرات کا تعلق ہے ان کے بارے میں اسلام بے شک جامد واقع ہوا ہے کسی ایک منکر کے لئے بھی وجہ جواز اور رخصت پیدا کرنے کے لئے اجتہاد نہیں کیا جا سکتا، ایسا اجتہاد کھلی ہوئی معصیت اور

دین سے عملاً بغاوت ہے اس فرض کو مسلمان نہیں ملاحدہ کی کوئی جماعت ہی انجام دے سکتی ہے! اسی طرح نیکیوں کے معاملہ میں اسلام سے بڑھ کر کوئی دوسرا مذہب وسیع النظر نہیں مگر جہاں تک برائیوں کا تعلق ہے ان معاملات میں اسلام سے بڑھ کر کوئی تنگ نظر نہیں اسلام ہر برائی پر اللہ تعالیٰ کی وسیع زمین کو تنگ کر دینا چاہتا ہے بے شک اسلام میں برائیوں کے لئے انتہائی جمود اور تنگ نظری پائی جاتی ہے اور نیکیوں کے بارے میں اسلام زیادہ سے زیادہ متحرک آزاد، کشادہ قلب اور وسیع النظر ہے۔ برائیوں کے لئے اسلام کے اندر تل برابر بھی گنجائش نہیں بچاوٹ ہی بچاوٹ ہے مگر نیکیوں کے لئے اسلام کا سینہ کھلا ہوا ہے وسعت ہی وسعت اور کشادگی ہی کشادگی!

نہ جانے حکومت کے خفیہ کارندے اسلامی جمعیۃ طلبہ کی سرگرمیوں کو کس انداز اور کس رنگ میں پیش کرتے ہیں اور اوپر کے لوگ ان رپورٹوں کا کیا اثر قبول فرماتے ہیں، ہماری مخلصانہ گزارش ہے کہ حکومت کے ارباب کار اس جمعیۃ اور تنظیم کا پورے غور و فکر سے مطالعہ کریں اس کے ایک ایک جزئیہ کا پتہ لگائیں اور اس کے بعد وہ اپنے حالات، کردار، ملکی نظم و نسق اور کاروبار کا موازنہ کریں، کیا عجب ہے کہ ایسا کرنے سے ان کو کچھ عبرت، بصیرت اور ہدایت مل سکے!

اسلامی جمعیۃ طلبہ پاکستان کا یہ مطالبہ اور تمنا ہے کہ پاکستان کے تعلیمی اداروں کا نصاب پاکستان کے مقصد وجود —— اسلام —— کے نظریوں کے عین مطابق ہونا چاہیے اور نئی نسل کی تربیت نیکی اور اخلاق کی بنیادوں پر کی جائے، اس لئے اسکولوں اور کالجوں میں رقص و سرود کے مظاہرے، مینا بازار، گرلز گائیڈ اور اس قسم کی تمام باتیں اخلاق و ایمان کے لئے بہت بڑے فتنے ہیں، جن کی روک تھام ہونی چاہیے، جو ملک اسلام کے نام پر بنا ہے وہاں اسلام کے ضابطۂ اخلاق ہی کی عملاً نفی و تردید کتنی بڑی ٹریجڈی ہے!

اس دور میں جب کہ پکی عمر کے لوگوں کے اخلاق مشتبہ اور زندگیاں گناہ آلود ہیں ان نیک و سلیم الفطرت نوجوانوں کا اخلاق و نیکوکاری کے لئے جد و جہد کرنا، زبان سے بھی اور عمل سے بھی کتنا عظیم کارنامہ ہے، اگر ہماری حکومت پاکستان میں کتاب و سنت کے پیش کئے ہوئے اور صحابہ کرامؓ کے برتے ہوئے ضابطۂ اخلاق کو نافذ کرنا چاہتی ہے، تو اسلامی جمعیۃ طلبہ اس کی مستحق ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کی جائے! ان کی نیکی، پاکیزہ زندگی، ذہانت و فراست اور جوش و ولولہ سے حکومت کو کام لینا چاہئے، منظم، تربیت یافتہ، نیک کردار اور حوصلہ مند نوجوان ہر حکومت کو کہاں میسر آتے ہیں۔

اسلامی جمعیۃ طلبہ کے ساتھ حکومت کی کیا روش رہتی ہے، یہ روش حکومت کی نیت، عزائم، افکار و تصورات اور اس کے اعمال کے جانچنے کی کسوٹی اور پیمانہ ہے!

عبداللہ زبیر ندوی

حضرت ابوہریرہؓ اور تحریر و تدوینِ حدیث

نام عبدالرحمٰن بن صخر الدوسی لقب ابوہریرہؓ یمن کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ہجرت سے ۲۱ ویں برس قبل ولادت ہوئی پیدائش کے کچھ روز بعد یتیم ہوگئے اس لئے بچپن اوائل عمر اور جوانی تنگدستی و پریشان حالی میں بسر ہوئی رشتہ داروں اور احباب میں بھی کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی کچھ روز تک تو والدہ گھریلو قسم کی ملازمت کرکے گھر کے اخراجات پورے کرتی رہیں لیکن ابوہریرہؓ کی طبیعت اس کو کب تک گوارا کرسکتی تھی آخرکار ایک یمنی رئیس کے گھر ملازمت کرلی کام یہ سپرد ہوا کہ جانوروں کی دیکھ بھال کریں سفر میں ساتھ رہیں لیکن اس ملازمت کا معاوضہ صرف دو وقت کی روٹی ہوتی تھی کافی عرصہ تک یہی ملازمت کرتے رہے اچانک مالک کا انتقال ہوگیا اور کچھ روز کے بعد اس کی بیوی سے ان کی شادی ہوگئی اس طرح آپ کے معاشی حالات بہتر ہوگئے۔

اسلام کی روزافزوں ترقی، اسلام کی پاکیزہ دعوت، اسلام لانے والوں کے اخلاق ان سے متاثر ہوکر ابوہریرہؓ کا دل بھی اس دینِ علیمی کی طرف خودبخود مائل ہونے لگا اس ارادہ کو پوشیدہ طور سے دل میں لے کر مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے ساتھ میں ان کا اپنا ایک غلام اور چند آدمیوں کی ایک جماعت بھی تھی راستہ میں یہ شعر زبان پر تھا ؎

یا لیلۃ من طولھا وعنائھا　　　　علیٰ انھا من حارۃ الکفر نجت

ــــ اُف کس قدر طویل اور مشقت والی رات ہے مگر اس کے باوجود اس نے کفر کے دائرے سے نجات دیدی۔

ہجری ۷ھ کا واقعہ ہے مدینہ پہونچکر معلوم ہوا کہ حضورؐ خیبر کی مہم میں مصروف ہیں ابوہریرہؓ جس وقت مدینہ منورہ پہونچے تھے تو صبح کا سہانا وقت تھا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں ہر سمت سناٹا اور تاریکی چھائی ہوئی تھی فجر کی نماز میں قرآن مجید کی تلاوت ہورہی تھی جس کی آواز ان کے کانوں میں پہونچی بے اختیار مسجد کی طرف بڑھے اور جماعت میں شریک ہوگئے اس وقت نماز کی امامت حضورؐ کے نائب بنی غفار کے ایک شخص جن کا نام سباع بن عرفطہ تھا کررہے تھے نماز سے فارغ ہوکر حضرت عرفطہؓ کے پاس گئے ان سے اپنی آمد کا مقصد اور سفر کے حالات بتائے اور حضورؐ کے متعلق معلوم کیا جب یہ معلوم ہوا کہ آپؐ خیبر کے مقام پر موجود ہیں تو ابوہریرہ کسی وقفہ انتظار کے بغیر فوراً کچھ توشہ لے کر خیبر کو روانہ ہوگئے وہاں پہونچکر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اپنے اسلام کا ذکر کیا آپؐ کے سامنے اپنا توشہ پیش کردیا حضورؐ نے بہ خوشی قبول کیا حضورؐ نے ان کی آمد کا ذکر دوسرے لوگوں سے بھی کیا اور دوسرے ساتھیوں کے مشورہ کے بعد ان کا حصہ بھی مال غنیمت میں مقرر کیا۔ خیبر سے مدینہ حضورؐ کے ساتھ ہی واپس ہوئے اور مستقل آپ کے جوار میں سکونت اختیار کرلی۔

روانگی کے وقت جو غلام ساتھ تھا وہ راستہ میں کہیں جُدا ہوگیا تھا مدینہ میں وہ بھی مل گیا جس کو انھوں نے اللہ کی راہ میں آزاد کردیا۔ ایمان و اسلام کی دولت سے مالامال ہونے کے بعد حضورؐ سے محبت کا یہ حال تھا کہ آپؐ کے نواسے حضرت حسینؓ جن کو حضورؐ نے گود میں کھلایا تھا ایک روز راستے میں مل گئے حضرت ابوہریرہ رضی بے اختیار ہوکر ان سے گزارش کی کہ ذرا وہ جگہ دکھلایئے جہاں

آپ کے جسم پر حضورؐ نے بوسہ دیا تھا انھوں نے اپنے شکم مبارک کو کھول دیا اور حضرت ابوہریرہؓ نے بار بار اس جگہ کا بوسہ دیا۔

عبادت کا یہ عالم تھا کہ نماز اشراق تک کی سخت پابندی کرتے تھے تسبیح و تہلیل میں تو ہر وقت ہی معروف رہتے اس غرض سے ایک تھیلی بنا رکھی تھی جس میں گٹھلیاں بھری رہتی تھیں ان پر وہ تسبیح پڑھتے رہتے تھے جب تھیلی خالی ہو جاتی تو لونڈی کو حکم دیتے وہ پھر سے بھر دیتی ۵۹ھ میں حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت کے زمانہ تک زندہ رہے اور اسی سنہ میں وفات پائی اس وقت ولید بن عتبہ مدینے کے گورنر تھے انھوں نے نماز جنازہ پڑھائی جنازہ میں حضرت ابو سعید خدریؓ، مروانؓ، عبداللہ بن نافع اور عبداللہ بن عمرؓ شریک تھے۔

جب حضرت امیر معاویہؓ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو ان کو بہت سخت صدمہ ہوا گورنر کو لکھا کر ان کے ورثہ کو تلاش کر کے ان کو دس ہزار درہم دیدو۔ ان کی تعریف میں لکھا کہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں رہنے کا کافی موقع ملا تھا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر اسی سال کی تھی اللہ ان پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے۔

ابوہریرہ کنیت

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضورؐ نے ان کو ابا ہرہ کہا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام لانے کے بعد بھی کچھ روز بکریاں اور اونٹ چرانے کے لئے لے جاتے رہے ساتھ میں ایک بلی کا بچہ ہوتا تھا جب جانور چرتے ہوتے تو وہ اس بچہ کے ساتھ کھیلا کرتے واپسی پر وہیں ایک درخت پر اس کو بٹھا دیتے ابوہریرہؓ کے معنی ہیں (بلی کا باپ) لیکن یہ لقب جوان کو حضورؐ نے اپنی زبان مبارک سے عطا کیا تھا لئے حد پسند کرتے تھے بلکہ بہت خوش ہوتے تھے۔ ان کا نسبی تعلق قبیلہ دوس سے تھا جو یمن کا ایک معزز قبیلہ تھا۔

ابوہریرہؓ اصحاب صفہ میں

اصحاب صفہ میں شمولیت صرف اس ارادہ سے کی تھی کہ زیادہ سے زیادہ وقت حضورؐ کی صحبت اور مجلس میں صرف کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ آپؐ کے ارشادات و احکامات سے مستفید ہوا جائے اور اس لئے بھی کہ حضورؐ کسی وقت بھی ان کی آنکھ سے اوجھل نہ ہوں اور جب کبھی ایسا واقعہ پیش آتا تو صحابہ کرامؓ کی پریشانی کا حال ناقابلِ بیان ہو جاتا جاں نثاروں کے دل دھڑکنے لگتے چنانچہ ایک دن حضورؐ صحابہ کرامؓ کے حلقہ میں رونق افروز تھے بیچ میں آپؐ کسی ضرورت سے گئے واپسی میں دیر ہوئی صحابہ کرامؓ گھبر لگئے کہ خدانخواستہ دشمنوں کی طرف سے کوئی گزند تو نہیں پہونچا حضرت ابوہریرہؓ اسی پریشانی کے عالم میں گھبرا کر آپ کی جستجو میں انصار کے ایک باغ کے پاس پہونچے دروازہ ڈھونڈا تو نہیں ملا دیوار میں پانی کی ایک نالی نظر آئی اس میں گھس کر آپؐ تک پہونچے صحابہ کرامؓ کی پریشانی کی داستان سنائی اور آپؐ کو ساتھ لے کر واپس ہوئے۔ یہ تھی صحابہؓ کی محبت کی ایک ادنیٰ مثال!

مدینہ آ کر چار سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہکر حدیث کا سماع کرتے رہے دوسرے صحابہ کرامؓ کی بہ نسبت حضرت ابوہریرہؓ حضورؐ کی خدمت میں ہر وقت موجود رہتے جس قدر فیض صحبت سے متمتع ہوتے اس قدر احادیث کا ذخیرہ ان کے پاس محفوظ ہوتا جاتا چنانچہ ان پر کثرتِ روایت کا الزام بھی لگایا گیا جس کا جواب انھوں نے یہ دیا "میرے بھائی مہاجرین تجارت میں اور میرے بھائی انصار کھیتی باڑی میں مصروف رہتے تھے لیکن میں مساکین صفہ کا ایک فرد تھا اس لئے ہر وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتا جب وہ لوگ غائب ہوتے تھے تو میں آپؐ کی خدمت میں رہتا تھا۔ اور جب یہ لوگ بھول جاتے تو میں یاد رکھتا اس کے علاوہ خود حضور اکرمؐ خاص طور سے ابوہریرہ پر شفقت فرماتے تھے۔ ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ "ایک بار میں نے حضورؐ سے درخواست کی کہ میں آپؐ کی حدیثوں کو بھول جاتا ہوں آپ نے فرمایا کہ اپنی چادر پھیلاؤ

میں نے پھیلا دی آپ نے دن بھر مجھ سے احادیث بیان کیں اس کے بعد آپؐ نے حکم دیا کہ اس چادر کو سمیٹ کر سینہ سے لگا لو میں نے لیا؟ کیا اس کے بعد جو کچھ بھی آپ نے مجھ سے بیان کیا میں کبھی نہیں بھولا۔

حضورؐ کی محبت میں بھوک پیاس کی بھی فکر نہیں رہتی تھی اور کئی کئی دن فقر و فاقہ کی حالت میں بسر ہوتے تھے لیکن اس فقر و فاقہ کے باوجود عالم یہ تھا کہ اگر کبھی سوال کا موقع آتا تو شرم و حیا علانیہ سوال کرنے سے روکتی بلکہ صرف حسنِ طلب سے کام لیتے۔ حالت یہ ہوتی تھی کہ بھوک کی وجہ سے زمین پر پیٹ کے بل پڑ رہتے یا پیٹ پر پتھر باندھ لیتے۔

ابوہریرہؓ کی والدہ کا اسلام

ان کی والدہ کافی عرصہ تک اسلام نہیں لائی تھیں وہ ان کو برابر اسلام کی دعوت دیتے رہتے تھے لیکن وہ انکار کر دیتیں اسی طرح ایک روز پھر انھوں نے اپنی والدہ کو اسلام کی دعوت دی اس دن وہ بہت خفا ہوئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نازیبا الفاظ کہے۔ جن کا ابوہریرہؓ کو سخت صدمہ ہوا روتے ہوئے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضورؐ میری والدہ کے لئے اسلام کی دعا کیجئے حضورؐ نے دعا فرمائی ابوہریرہؓ گھر واپس ہوئے تو دروازہ بند پایا اور اندر سے پانی گرنے کی آواز آئی۔ ان کی والدہ نے آہٹ پا کر ان کو باہر ہی روکا۔ کپڑے وغیرہ پہن کر ان کو اندر بلا لیا جب ابوہریرہؓ اندر پہنچے تو ان کی والدہ کلمہ تشہد پڑھ کر مسلمان ہو گئیں۔ حضرت ابوہریرہؓ خوشی کے مارے جھومتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے فرطِ مسرت سے آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے حضورؐ کو خوشخبری سنائی۔ پھر حضورؐ نے ان کے لئے یہ دعا کی کہ اے اللہ اپنے اس بندے کو اور اس کی والدہ کو مومن اور مومنہ کا محبوب بنا دے۔

اسلام لانے کے بعد والدہ کی اور زیادہ خدمت کرنے لگے ان کی حیات میں مسلسل چار سال تک حج جیسے اہم فریضہ کو ادا کرنے نہیں گئے ایک بار کئی روز سے فاقے سے تھے جب بھوک ناقابلِ برداشت ہو گئی تو بیتاب ہو کر گھر سے نکلے راہ میں کچھ صحابہ مل گئے وہ بھی بھوک سے پریشان ہو کر نکلے تھے سب مل کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے حاضری کا مقصد پوچھا عرض کیا یا رسول اللہ بھوک ہم سب کو اس وقت آپ کے پاس لائی ہے۔

آپؐ نے ایک طباق منگایا جس میں تھوڑی سی کھجوریں تھیں ہم میں سے ہر ایک کو دو دو عنایت فرمائیں اور فرمایا کہ آج کے لئے یہی دو کافی ہیں ان دو کھجوروں نے ایسا کام کیا کہ جو لوگ کئی روز کے بھوکے تھے آسودہ ہو گئے لیکن حضرت ابوہریرہؓ نے ان میں سے ایک کھجور اپنی والدہ کے لئے بچا کر رکھ لی حضورؐ نے یہ دیکھ کر پوچھا کہ تم نے ایک کھجور کیوں رکھ لی عرض کیا اپنی والدہ کے لئے آپ نے فرمایا کہ تم وہ کھا لو میں تمہاری والدہ کے لئے اور دیدوں گا آپؐ نے چلتے وقت مجھے دو کھجوریں اور عنایت فرمائیں

حضرت ابوہریرہؓ کچھ عرصہ مدینہ کے گورنر اور کچھ عرصہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں یمن کے گورنر رہے اس کے علاوہ اور بھی بہت سی ملکی خدمات انجام دیں حضرت عمرؓ نے ملک میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے محکمہ پولیس قائم کیا تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ کو بحرین کا صاحب الاحداث یعنی انسپکٹر جنرل بنایا ان کے سپرد یہ فرض بھی کیا گیا کہ وہاں کے امن و امان کے علاوہ احتساب کی خدمت بھی انجام دیں۔ مثلاً ناپ تول میں دوکاندار کمی نہ کریں حضرت ابوہریرہؓ بازاروں میں گھومتے پھرتے اور نگرانی کرتے شکایات کا معقول انتظام فرماتے۔ اس کے علاوہ فتاویٰ کے سلسلہ میں بھی ان سے مشورہ لیا جاتا وہ افتا کمیٹی کے ممتاز رکن بھی تھے

حفظ حدیث

حضرت ابوہریرہؓ کا شمار رواۃ حدیث کے طبقہ اول میں ہوتا ہے انھوں نے سب سے زیادہ حدیثیں روایت کیں جن کی مجموعی تعداد ۵۳۷۴ ہوتی ہے ان میں ہر قسم کی قولی اور فعلی احادیث شامل ہیں

دُنیا کو تعجب ہے کہ صحابہ کرامؓ نے احادیث کے ذخیرے کو اس صحت و جامعیت کے ساتھ کیوں کر محفوظ رکھا کہ رسول اللہؐ کی زبانِ مبارک کا ایک فقرہ بھی ہوا کے تموج میں جذب ہو کر فنا نہیں ہوا حضرت ابوہریرہ کا معمول تھا کہ رات کو تین حصوں میں بانٹتے ایک میں سوتے، دوسرے میں نماز پڑھتے اور تیسرے حصہ میں احادیث نبویؐ کو دہراتے اور یاد کرتے۔

اس کے علاوہ اس پروگرام کی پابندی کا اس سے زیادہ اور کیا اہتمام کیا جا سکتا کہ ساری رات کو تین حصوں میں اس طرح بانٹ لیا تھا کہ ان کی بیوی اور غلام بھی اس پروگرام میں ان کا ساتھ دیتے تھے تاکہ اگر اتفاق سے کسی کی آنکھ نہ کھلے تو دوسرا ان کو بیدار کر دے ایسے ہی لوگوں کی تعریف قرآن شریف نے کی ہے۔

کانوا قلیلاً مِّنَ اللَّیْلِ مَا یَھْجَعُوْنَ — یہ لوگ عبادت میں مصروف رہنے کے سبب رات کو بہت کم سوتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ کثیر الروایت ہونے کے باوجود حدیث بیان کرنے میں بڑے محتاط تھے، انھوں نے حدیث بیان کرنے میں اطاعتِ رسولؐ اور خشیتِ الٰہی کا حق ادا کیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کے زمانے میں تحریر تدوین حدیث صحابہ کرامؓ نے ان الفاظ کو محفوظ رکھنے کے لئے جو انھوں نے حضورؐ کی زبانِ مبارک سے سُنے تھے یا وہ اعمال جو اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے تحریری صورت میں محفوظ رکھنے کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں کی لیکن اس کے باوجود حضور اکرمؐ نے خود بعض لوگوں کو حدیثیں لکھنے کی اجازت دی تھی جیسا کہ خود ابوہریرہؓ کی روایات سے معلوم ہوتا ہے۔

ان ابن عمرؓ کان یکتب ولا اکتب استأذن رسول اللہ صلعم فی ذالک فاذن لہ۔ — یعنی عبداللہ بن عمرؓ احادیث لکھا کرتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا (بلکہ زبانی یاد رکھتا تھا) انھوں نے حضورؐ سے اس امر میں اجازت طلب کی تھی اور آپ نے ان کو اجازت دیدی تھی۔

حضرت ابوہریرہؓ احادیث نبویؐ کو زبانی یاد کرتے تھے لیکن عہدِ رسالت کے بعد انھوں نے بھی اپنی روایات لکھ رکھی تھیں چنانچہ فتح الباری میں حسن بن عمرو ابن اُمیہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ ان کو اپنے گھر لے گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے نوشتے دکھائے اور کہنے لگے دیکھو میرے پاس (سب کچھ) لکھا ہوا موجود ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہؓ نے بلکہ خود حضرت ابوہریرہؓ نے آخر میں احادیث نبویہ لکھ لی تھیں اس کے علاوہ جب قرآن مجید نازل ہو چکا اور اس بات کا خطرہ جاتا رہا کہ دونوں چیزیں خلط ملط ہو جائیں گی تو حضورؐ نے احادیث کو لکھنے کی اجازت دیدی تھی بلکہ کچھ عرصہ بعد اجازت عام کر دی کیونکہ حدیث نہ لکھنے کی ممانعت ابدی و دائمی نہ تھی بلکہ عارضی و وقتی تھی اس لئے کہ شروع میں قرآن شریف اور حدیث کے متن کے خلط ملط ہونے کا اندیشہ تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی واقفیت اور آگاہی کا نام اس زمانہ میں علم تھا اور یہی علم دینی و دنیوی عزت کا ذریعہ تھا اس لئے ہزاروں صحابہؓ نے جو کچھ دیکھا سُنا یاد رکھا اور آپ کے ارشاد کے مطابق بلّغوا عنّی۔ (ہم سے جو کچھ سُنو اور دیکھو اس کی اشاعت کرو) یا (فلیبلغ الشاھد الغائب) (جو مجھے دیکھ رہے ہیں اور مجھ سے سُن رہے ہیں وہ ان کو مطلع کر دیں جو اس سے محروم ہیں) وہ سب اپنی اپنی اولادوں، عزیزوں، دوستوں اور ملنے والوں کو سُناتے اور بتاتے چلے جاتے یہی ان کی زندگی کا کام اور یہی ان کے شب و روز کا علمی مشغلہ تھا اس لئے صحابہ کے فوراً بعد دوسری نوجوان پود ان معلومات کی حفاظت اور تدوین کے لئے کمر بستہ ہو گئی جن کو ان میں سے ایک ایک واقعہ لفظ بلفظ یاد کرنا پڑتا تھا اور دہرانا پڑتا تھا۔

حضور اکرمؐ نے جہاں اپنے اقوال و افعال کی اشاعت کی تاکید کردی تھی اس کی بھی تہدید کردی تھی کہ "جو کوئی میرے متعلق قصداً کوئی غلط یا جھوٹ بات منسوب کرے گا اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا"۔ اس اعلان کا یہ اثر تھا کہ بڑے بڑے صحابۂ کرامؓ روایت کرتے وقت تھر تھر کانپتے تھے ۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے ایک بار روایت کی اور آنحضرتؐ کی کوئی بات نقل کی تو چہرہ کا رنگ متغیر ہوگیا تھرّا گئے پھر کہنے لگے حضورؐ نے ایسا ہی فرمایا تھا یا اس کے قریب قریب فرمایا تھا۔

واقعات کو محفوظ رکھنے کے لئے عرب کی عام عادت حفظ روایت ہی تھی نہ کہ تحریر و کتابت ان کو اس میں نہایت درجہ کمال حاصل تھا خطبے اور قصائد سینوں میں محفوظ رکھتے اور اُن کو دُہراتے رہتے ۔ یہ قدرتی امر ہے کہ جس عضو و قوت کو کام میں لایا جائے گا اس میں ملکہ اور مہارت پیدا ہو جائے گی۔

پس اہلِ عرب کے حافظے ان میں عام طور پر تحریر کے رائج نہ ہونے اور تمدنی اسبابِ آسائش کے کم ہونے اور زیادہ تر قوت حافظہ کے کام لینے اور اس پر پورا پورا اعتماد کرنے کے سبب نہایت قوی تھے وہ کسی تحریر یا بیاض کے محتاج نہیں تھے جس طرح آج کل وفورِ علم و وسعت معلومات کا مدار کثرت مطالعہ پر ہے ان ایام میں قوت حافظہ کی جودت پر تھا۔

عربوں کا حافظہ نہایت قوی ہوتا تھا سینکڑوں ہزاروں شعر کے قصیدے زبانی یاد رکھتے تھے صحابۂ کرامؓ و تابعین نے قوتِ حفظ کو معراج کی کمال تک پہونچا دیا وہ ایک ایک قول اس طرح زبانی سُن کر یاد کرتے تھے جس طرح آجکل مسلمان قرآن مجید یاد کرتے ہیں ایک ایک محدث ہزاروں —— حدیثیں حفظ کرتا تھا گو بعد میں لوگ ان کو لکھ کر محفوظ کرنے لگے !

بعض مستشرقین اس بنا پر کہ روایات نبوی کی تحریر و تدوین کا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے نوّے برس بعد شروع ہوا احادیث کی صحت و وثوق میں شک پیدا کرنا چاہتے ہیں باوجودیکہ اسماء الرجال کی تحریر و تدوین کی صداقت کا اعتراف کرتے ہیں اور اس کو مسلمانوں کا عظیم تر علمی کارنامہ خیال کرتے ہیں ۔ اوپر کی تحریر سے یہ اندازہ کرلینا بہت آسان ہوگیا ہے کہ صحابہ کس طرح واقعات کو حفظ رکھتے تھے اُن کو یاد کرنے میں کتنی احتیاط برتتے تھے اور کس طرح آئندہ آنیوالی نسلوں کو وہ امانت سپرد کرتے تھے اگرچہ وہ تحریری صورت میں بعد میں آئیں تاہم ان کی صحت و وثوق میں کوئی کچھ شک و شبہ نہیں کرسکتا

احادیث کو تحریری شکل میں نہ لانے کی اصل وجہ یہ تھی کہ ابتدا میں حضورؐ نے قرآن کے علاوہ کسی اور چیز کو تحریر میں رکھنے کی ممانعت فرمادی تھی تاکہ عوام میں قرآن اور غیر قرآن کا باہمی التباس نہ ہوجائے لیکن جب قرآن مجید پوری طرح محفوظ ہوگیا تو آپؐ نے آخر میں صحابہ کو تحریر کی اجازت دیدی لیکن اس کے باوجود اکثر صحابہؓ احادیث کو سفینوں کی بجائے سینوں میں محفوظ رکھتے تھے ۔

واقعات بتاتے ہیں کہ احادیث کافی عرصہ پہلے تحریری شکل میں آچکی تھیں چنانچہ خلیفہ حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے ۱۰۱ھ میں وفات پائی وہ خود بھی بڑے عالم تھے اور مدینے کے امیر رہ چکے تھے جب خلیفہ ہوئے تو قاضی مدینہ ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم کو جو حدیث و خبر کے امام تھے حکم دیا کہ آنحضرتؐ کے سنن واقعات کی تحریروں کی تدوین کراؤ کیونکہ مجھے رفتہ رفتہ علم کے فقدان کا خوف ہو رہا ہے (تعلیقات بخاری و موطا)

ان کے علاوہ اور بھی ایسے واقعات ہیں جن سے آپ کے اقوال کا تحریری شکل میں آنے کا ثبوت ملتا ہے فتح مکہ کے موقع پر آپ نے ایک خطبہ دیا تھا صحیح بخاری میں ہے کہ ابو شاہ یمنی کی درخواست پر آپ نے یہ خطبہ لکھ کر ان کے حوالہ کرنے کو کہا سلاطین عالم کو جو خطوط روانہ فرمائے وہ بھی تحریری شکل میں تھے ۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضورؐ نے مدینہ سے واپس آنے کے کچھ مدت بعد مسلمانوں کی مردم شماری کرائی اور ان کے نام لکھوائے (باب الجہاد)

حضرت علیؓ کے پاس ایک صحیفہ تھا جو ان کی تلوار کی نیام میں رہتا تھا جس سے وہ وقتاً فوقتاً استفادہ کرتے رہتے لوگوں کی خواہش پر اس کو دکھایا بھی (بخاری) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا صحیفہ صادقہ ان کے پوتے عمرو بن شعیب کے پاس موجود تھا جب تحریریں اور یادداشتیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال درج تھے بیٹے کو باپ سے ملیں تو انہوں نے ان کو اور بھی حفاظت سے رکھا۔

حضرت انسؓ اور دوسرے صحابی ہیں جن سے بکثرت روایات موجود ہیں وہ خود اپنے بیٹوں کو کہا کرتے تھے کہ "میرے بچو علم کو تحریر کی قید و بند میں لاؤ" دارمی (۶۸)

حضرت زید بن ثابت کاتب وحی تھے ان کو بھی احادیث تحریر میں لانے سے انکار تھا مروان نے یہ تدبیر کی کہ ان کو سامنے بٹھایا اور پردہ کے پیچھے کاتب مقرر کر دیئے تاکہ جو وہ بولتے جائیں کاتب لکھتے جائیں، حضرت ابوہریرہؓ کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔

کیا یہ تمام واقعات اس بات کی شہادت کے لئے ناکافی ہیں کہ خود صحابہ کرامؓ نے اقوال و ارشادات رسول اپنے ہاتھوں سے جمع کئے جس کو پچھلوں کے لئے یادگار چھوڑا پچھلوں نے اپنی کتابوں میں ان کو لکھ لیا۔

لیکن بات یہیں نہیں ختم ہو جاتی ابھی تو تابعین کے واقعات باقی ہیں یہ بات بھی ظاہر ہے کہ تابعین نے صحابہ ہی کی زندگی میں ان کے تمام مرویات، واقعات و حالات کو ایک ایک سے پوچھ کر ایک ایک کے دروازہ پر جاکر بوڑھے جوان مرد عورت سب سے تحقیق کر کے ہمارے لئے علم و سعادت کا خزانہ فراہم کر دیا۔

محمد بن شہاب زہری، ہشام بن عروۃ، سعید بن جبیر وغیرہ سینکڑوں تابعین ہیں جنھوں نے دیوانہ وار ایک ایک گوشہ سے دانہ دانہ جمع کیا اور ہمارے سامنے اس کا خرمن لگا دیا۔

امام زہری جو ۵۰ھ میں پیدا ہوئے ان کے متعلق یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ مدینے کے ایک ایک انصاری کے گھر جاتے، راستوں کی صعوبتیں برداشت کرتے، جوان بوڑھا، مرد و عورت، جو مل جاتا، یہاں تک کہ پردہ نشین عورتیں ان سے بھی حضورؐ کے اقوال و حالات پوچھتے اور قلم بند کرتے۔

عام غلط فہمی کا ازالہ

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ احادیث کی تحریر و تدوین کا کام تابعین نے شروع کیا تابعین ان کو کہتے ہیں جنھوں نے صحابہ کو دیکھا ہو اور ان سے فیض پایا ہو صحابہ کا زمانہ تقریباً سو برس تک رہا تو گویا تابعین کا عہد سو برس بعد شروع ہوا اس طرح گویا تحریر و تدوین کے کام کا آغاز سو برس بعد ہوا، حالانکہ یہ خیال یا رائے غلط ہے۔ دراصل تابعین ان کو کہتے ہیں جنھوں نے آنحضرتؐ کی زیارت کا شرف حاصل نہیں کیا صحابہ کرامؓ کی زیارت کی اور ان سے مستفید ہوئے یا یہ کہ آنحضرتؐ کے زمانہ میں ہوں مگر زیارت کا موقع نہ ملا یا عہد نبوی کے آخر میں پیدا ہوئے اس لئے آپؐ کے دیدار سے مشرف نہ ہوئے اس طرح یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ تابعین کا عہد خود صحابہؓ کی زندگی ہی میں اور کم سے کم یہ کہ ۱۰۰ھ سے شروع ہو گیا اس لئے جو کام اس وقت شروع ہوا اس کو تابعین کا کام کہہ سکتے ہیں اور یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ تحریر و تدوین تدوین کا کام ۱۰۰ھ سے قبل یا اس کے فوراً بعد ہی شروع ہو گیا تھا حفظ حدیث کے سلسلہ میں تابعین نے جو کارنامہ انجام دیا ہے، اس پر سو برس کی مدت کا اطلاق کی ضرورت نہیں یہ کہنا کہ اخبار و سیر کی تدوین سو برس بعد شروع ہوئی صحیح نہیں بلکہ درحقیقت مسلمانوں میں اخبار و سیر کی ترتیب

(بقیہ مضمون ۳۵ پر)

سید عبدالرشید فاضل (ایم اے)

اقبال اور تصوف

"اقبال اور تصوف" کے عنوان سے متعدد کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں اور بیشمار مضامین بھی رسالوں اور اخباروں کی زینت بن چکے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ یہ بات انتہائی مسرت کا موجب ہے۔ مگر ان میں سے بعض مصنفین اور مضمون نگاروں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اقبال نے آخر میں تصوف کے متعلق اپنا نقطۂ نظر بدل دیا تھا۔ حتیٰ کہ وہ "وحدت الوجود" کے بھی قائل ہو گئے تھے۔ اور یہ لوگ اُن کے آخری زمانے کے کلام میں سے بعض ایسے اشعار بھی پیش کرتے ہیں جو ان کی رسائیِ فکر کے رُو سے "وحدت الوجود" کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یا اُنہی خیالات کے حامل ہیں جن کی اقبال مخالفت کرتے رہے ہیں۔ یہ بات چونکہ ہمارے نزدیک سراسر خلافِ واقعہ یا کم از کم ع فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست۔ کا مصداق ہے اس لئے جن لوگوں نے اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے اُن میں سے "مشتے از خروارے" کے طور پر بعض کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سب سے پہلے ہم عبدالغنی خاں صاحب نیازی کی کتاب "قرآنی تصوف اور اقبال" کے بارے میں اپنی گزارشات پیش کرتے ہیں نیازی صاحب فرماتے ہیں:-

> "خود علامہ اقبال نے جا بجا اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ وہ چند فروعی مسائل کے سوا باقی تمام اُمورِ دین میں اولیاء اللہ اور اکابر صوفیا کے مسلک کے پیرو ہیں۔ انھوں نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ ان کا "فلسفۂ خودی" اور "نظریۂ زمان و مکان" وغیرہ سب صوفیائے اسلام کے نظریات سے ماخوذ ہے۔"[1]

اوّل تو وہ فروعی مسائل کون سے ہیں نیازی صاحب نے یہ نہیں فرمایا پھر اقبال نے ان الفاظ میں کہیں اعتراف نہیں کیا ہے۔ ہاں ایک جگہ "اسرارِ خودی" کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ:-

> "میرا دعویٰ ہے کہ "اسرار" کا فلسفہ مسلمان صوفیہ اور حکماء کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے اور تو اور وقت کے متعلق برگساں کا عقیدہ بھی ہمارے صوفیوں کے لئے نئی چیز نہیں۔"

مگر واضح رہے کہ اسرار کا فلسفہ صوفیۂ اسلام کے نظریات سے ماخوذ ہے نہ کہ عجمی تصوف سے جو بدھ مت اور ویدانت وغیرہ کا معجونِ مرکب ہے۔

> "اقبال کو مخالفِ تصوف ثابت کرنے والوں کو اس بات پر نظر رکھنی چاہیئے کہ عارف رومیؒ کے عقائد وہی ہیں جو اکابر صوفیۂ قدیم کے تھے۔ پھر اقبال اپنے مرشدِ معنوی اور اُن کے اساتذۂ طریقت کے خلاف کوئی بات کس طرح کہہ سکتے تھے۔ سو اقبال خود فرماتے ہیں:
>
> تو بھی ہے اُسی قافلۂ شوق میں اقبال — جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومیؒ"[2] (نیازی صاحب)

[1] قرآنی تصوف اور اقبال [2] کتاب مذکور۔

اول تو یہ بات بالاطلاق صحیح نہیں ہے کہ "عارفِ رومی کے عقائد وہی ہیں جو دوسرے صوفیائے قدیم کے تھے"۔ رومی "جبر" کے قائل نہیں اور دوسرے صوفیا بالعموم جبر کے قائل ہیں۔ رومی اُس "فنا" کی شدت سے تردید کرتے ہیں جو قطرے کو دریا میں ملاتی ہے۔ وہ اُس فنا کے قائل ہیں جس کو انھوں نے لوہے اور آگ کی مثال سے واضح کیا ہے۔ رومی جذب و جہاد اور عمل کی تعلیم دیتے ہیں اور خودی کے انتہائی بلند مقام کے محرمِ راز ہیں۔ چنانچہ "منزلِ ما کبریاست" انہی کا قول ہے۔ پھر یہ کون کہتا ہے کہ اقبال نفسِ تصوف یا صوفیائے اسلام کے خلاف تھے۔ وہ تو اُس تصوف کے منکر ہیں جو عجمی تصورات کے زیر اثر ہے:۔

"افسوس ہے کہ لوگ بالعموم اقبال کو "مثیلِ رومی" اور "حامی تصوف" ثابت کرنے کی بجائے "ناسخِ رومی" اور "دشمنِ تصوف" ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور دنیا پر یہ واضح کرتے ہیں کہ اقبال نے رومی اور سنائی کے فقر و تصوف کو مسترد کرکے اس کی جگہ اپنے دماغ سے تراش کر کوئی نیا فقر و جدید تصوف ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اقبال حضراتِ جنیدؒ و بایزیدؒ کا نام لے کر ان کا فقر و تصوف ہمارے سامنے نہ پیش کرتے اور نہ حدیقۂ سنائیؒ کو ہمارے نظامِ تعلیم و تربیت میں خاص جگہ دینے کی سفارش کرتے نہ عارفِ رومیؒ کو اپنا مرشدِ معنوی قرار دیتے اور نہ ان کے عقائد و حکیمانہ نکتوں کو من و عن اپنے اشعار میں بیان کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکابرِ صوفیۂ وجودیہ نے جن حقائق کا انکشاف کیا ہے انہی حقائق کو علامہ اقبالؒ نے نئے آب و رنگ کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی نئے فقر و تصوف کے مبلغ ہیں"۔[1] (نیازی صاحب)

جن باتوں پر نیازی صاحب نے اظہارِ تاسف کیا ہے ہمارے خیال میں وہ کسی بھی معقول آدمی نے نہیں کہی ہیں۔ نہ کسی نے اقبال کو "ناسخِ رومی" اور "دشمنِ تصوف" کہا ہے نہ یہ کہ وہ کسی نئے فقر و تصوف کے مبلغ تھے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ وہ پیرِ رومی کی ہر بات کو مانتے تھے اسی طرح مخالفِ تصوف نہ ہونے سے یہ مراد نہیں ہو سکتی کہ وہ تصوف کے ساتھ ساتھ ویدانت اور بدھ مت کے تصورات کو بھی تسلیم کرتے تھے۔ اسی طرح کسی نے یہ بھی نہیں کہا کہ اقبال نے رومی و سنائی کے فقر و تصوف کو مسترد کرکے اس کی جگہ اپنے دماغ سے تراش کر کوئی نیا فقر اور جدید تصوف ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس سنجیدہ اور سمجھدار لوگ یہی کہتے رہے ہیں کہ اقبال ان حضرات کے از حد عقیدت مند تھے اسی وجہ سے ان کا نام بڑے ادب و احترام سے لیتے ہیں۔ مگر جیسا کہ تعلیماتِ اسلام کا اثر ہونا چاہیے تھا۔ وہ ان حضرات کی بعض باتوں سے اختلاف بھی کرتے تھے اور ایسا کرنے سے عقیدتمندی میں فرق نہیں آتا۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنے پیر حضرت نظام الدین اولیاؒ کے جہاں انتہا درجہ عقیدت مند تھے وہاں ان کے "سماع" سے متفق بھی نہیں تھے۔ بلکہ لوگوں کو اس میں شریک ہونے سے باز رکھنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ حضرت امیر خسروؒ آخر وقت تک شاہی دربار سے وابستہ رہے حالانکہ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے بادشاہوں کے دربار میں جانا درکنار کسی بادشاہ کا اپنے ہاں آنا بھی گوارا نہ کیا۔ تو کیا ایسا کرنے سے ان حضرات کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے پیر کے ساتھ عقیدت نہیں رکھتے تھے؟ اسلام نے چونکہ خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدِرَ کا حکم دیا ہے اس لئے یہ حضرات آزادی سے اس پر عمل کرتے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ العزیز نے بھی اپنے مرشد خواجہ باقی باللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے وحدت الوجود کے مسئلے میں اختلاف کرکے ان کے اس رجحان کو تبدیل کیا ہے۔

[1] قرآنی تصوف اور اقبال ص ۲۹

نیازی صاحب کا یہ کہنا بھی دُرست نہیں ہے کہ "حقیقت میں اکابر صوفیہ وجودیہ نے جن حقائق کا انکشاف کیا ہے انہی حقائق کو اقبالؒ نے نئے آب و رنگ کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کیا ہے" اس لئے کہ اقبالؒ نے مولانا رومؒ اور ابنِ عربی وغیرہم سے "وحدت الوجود" کے معاملے میں اختلاف کیا ہے۔ اسی طرح دوسرے اکابر صوفیہ کی بھی ہر بات آنکھ بند کر کے نہیں مانی ہے۔ محمود شبستریؒ کی "گلشن راز" میں سے (نو۹) سوالات کا انتخاب کر کے اُن کا جواب اُس سے بالکل مختلف دیا ہے جو محمود شبستری نے دیا تھا۔ حالانکہ محمود نے دوسرے تمام اکابر صوفیہ کی ترجمانی کی تھی۔ اسی طرح وہ "نئی منطق الطیر" بھی لکھنا چاہتے تھے جو یقیناً حضرت عطارؒ کی منطق الطیر سے مختلف ہوتی۔ فنا اور جبر کے مسائل میں بھی وجودی حضرات سے کُلیتہً اختلاف کیا ہے اور اس قسم کا اختلاف کوئی گناہ نہیں ہے خدا و رسولؐ کے علاوہ ایک مسلمان کسی بھی شخص کی بات سے معقول وجوہ کی بنا پر اختلاف کر سکتا ہے کہ اسلام نے اس بارے میں پوری آزادی دی ہے۔

نیازی صاحب نے خانقاہوں کی مُدافعت کے لئے بھی ایک باب قائم کیا ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبالؒ نفسِ خانقاہ کے خلاف ہیں کیا! وہ تو موجودہ زمانے کی خانقاہوں پر افسوس کرتے ہیں ؎

تھا جہاں مدرسۂ شیری و شاہنشاہی　　　آج اُن خانقہوں میں ہے فقط رُوباہی

یعنی جہاں کسی زمانے میں تزکیۂ نفس کے لئے شریعتِ اسلامیہ پر عمل کرنے کی تعلیم دی جاتی تھی اب وہاں غیر اسلامی باتیں ہو رہی ہیں۔ قرآن و سُنّت پر عمل ایک طرف قرآن و سُنّت کا احترام بھی نہیں رہا۔ مردوں اور عورتوں کا آزادانہ اختلاط، طوائفوں کے مُجرے، چادروں کے چڑھاوے اور اسی قسم کی بے شمار بدعات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ دیگیں لٹتی ہیں قوالی اور وہ بھی ہر قسم کے مزامیر کے آزادانہ استعمال کے ساتھ۔ خانقاہ والے نماز سے کوسوں دُور، معیشت و معاش کی فکروں سے آزاد، زمانے کے تقاضوں سے ناواقف، علم سے کورے۔ نہ محنت مزدوری نہ نوکری چاکری نہ ہُنر آموزی۔ سارا کاروبار عقیدتمندوں کی نذر و نیاز پر چل رہا ہے۔ کیا ایسی خانقاہوں میں شیروں کی بجائے روباہ نہ پیدا ہوں گے۔

> "صُوفیائے کرام کے عقیدے کے مطابق دینِ اللہ کے دو رُخ ہیں۔ ایک انسان کے ظاہری اعمال سے متعلق ہے جسے شریعت کہتے ہیں اور دوسرا انسان کے باطن اور اس کے باطنی اعمال سے متعلق ہے جو طریقت، معرفت اور حقیقت کا مجموعہ ہے۔ دینِ اللہ کی یہ شق شریعتِ ظاہری کا باطن ہے۔ اس کے خلاف نہیں (جیسا کہ بعض اوقات غلطی سے سمجھ لیا جاتا ہے) اور دونوں کا سرچشمہ قرآن و سُنّت اور علمائے حق کا اجماع ہے۔"[۱] (نیازی صاحب)

دینُ اللہ تو تمام و کمال شریعت ہی کا نام ہے اور شریعتِ اسلامیہ انسان کے ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح کرتی ہے۔ یہ کہنا شریعت کی توہین ہے کہ ظاہر کی اصلاح شریعت کے ذریعے ہوتی ہے اور باطن کی طریقت اور حقیقت وغیرہ کے ذریعے۔ اہلِ تصوف نے جو شریعت اور طریقت کی تقسیم نکالی ہے۔ یہ بڑی خطرناک ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ظاہری اعمال کا باطن پر کوئی اثر نہیں ہوتا یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ ایک شخص اپنی زندگی شریعت کے مطابق گذارے دوسرے الفاظ میں اتباعِ رسولؐ کو اپنا شعار بنا لے اور اس سے اس کے باطن کی اصلاح نہ ہو! اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ خواہ کوئی شخص قرآن و سُنّت کا جامہ ہی پہن لے مگر جب تک کسی خانوادۂ تصوف کے سجادہ نشین کے بتائے ہوئے سینہ بہ سینہ اسرار پر ایمان نہ لائے اور اُن کے مطابق اپنی زندگی کو سانچے میں نہ

[۱] کتاب مذکور صفحہ ۴۳

بنا لے تزکیہ نفس سے محروم رہے گا۔ حالانکہ تصوف کی ابتدا، اُس وقت ہوئی تھی جب لوگوں نے شریعت پر عمل کرنا چھوڑ دیا تھا اور دُنیا کی محبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ اور ایسے حالات کو دیکھ کر علماء حق نے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں لوگوں کی اصلاح کا کام شروع کیا، اُن کے دلوں سے دُنیا کی محبت نکال کر خدا کی محبت کو جاگزیں کیا اور قرآن و سُنّت پر عمل کرنے کی ہدایت کی۔ تاکہ اُن کے ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح ہو جائے۔ صحابۂ کرامؓ نے، جن کی زندگی ہمارے لئے ایک نمونہ ہے، ایسا ہی کیا تھا۔ اس لئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رسالت اور تزکیۂ نفس سے ایک ساتھ لوگوں کو مستفید فرمایا۔ قرآن کہتا ہے لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ لیکن آج وہی سلاسل جو کسی زمانے میں مذکورہ صدر فریضہ انجام دیتے تھے شریعت و طریقت کی تقسیم کی عجیب و غریب فلسفیانہ موشگافیوں میں پڑ گئے ہیں۔ اور ان فلسفیانہ موشگافیوں سے خدا رسی کی بجائے خدا سے دوری پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہ وحدت الوجود، فنا و بقا اور تنزلاتِ ستہ وغیرہ کی بحثیں، فلسفیانہ موشگافی نہیں تو اور کیا ہے؟

"آیاتِ قرآنی کے معنی ظاہری بھی ہیں، باطنی بھی۔ مثنوی میں تو ایک سے زیادہ بطن معنے کا ذکر ہے - - - - - - - - - - اولیاء کرام نے تمام ارکانِ اسلام کے باطنی معانی و نکات بیان کرنے کے سلسلے میں متعدد رسائل تحریر کئے ہیں" [1] (نیازی صاحب)

یہ بات بھی جیسی کہ بعض کم مایہ صوفیوں نے سمجھ لی ہے ویسی نہیں ہے۔ مولانا اصلاحی فرماتے ہیں کہ :-

"اس میں شبہ نہیں کہ قرآن ایک دریائے معانی ہے' قرآن کے عجائب کبھی ختم نہیں ہونگے، قرآن میں تمام علم اوّلین اور تمام علم آخرین ہے، قرآن کی تازگی پر کبھی باسی پن نہیں آئے گا، قرآن سے اہل علم کبھی آسودہ نہیں ہونگے۔ یہ ساری باتیں اپنی جگہ پر حقیقت ہیں۔ اور اُن لوگوں سے منقول ہیں جو قرآن کے راز داں رہے ہیں۔ لیکن اس مضمون کی احادیث آثار اور اس کے ہم معنی اقوال و اشارات سے یہ استدلال کرنا کہ قرآن نے ایک ایسا علمِ باطن دیا ہے جس کے حامل ہر دور میں صرف چند نفوسِ قدسیہ رہے ہیں اور اُنہی کے ذریعے سے یہ علم ہر دور کے مخصوص حاملین کو سینہ بہ سینہ منتقل ہوا ہے' ہمارے نزدیک بالکل غلط ہے اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کی ہر آیت کا ایک باطن بھی ہے لیکن اُس کا کوئی باطن نہیں ہے جس کی طرف رہنمائی خود اُس کا ظاہر نہ کرتا ہو، قرآن کے اندر اسرار و حکمت کا لاریب ایک خزانہ ہے لیکن اس خزانے کی کلید خود قرآن ہی کے الفاظ و اشارات ہیں، قرآن سے باہر اُن کی کلید نہیں ہے۔ قرآن کے علوم کا ایک حصّہ اُس کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے، ایک حصّہ اُس کے اشارات سے کھلتا ہے' ایک بہت بڑا حصّہ اُس کے سیاق و سباق سے بے نقاب ہوتا ہے۔ اور پھر سب سے بڑا خزانہ اس کے نظام کی معرفت سے سامنے آتا ہے۔ جو لوگ قرآن پر تدبر کرتے ہیں۔ وہ بقدرِ استعداد اس سے فیضیاب ہوتے ہیں اور وہ اپنی ہر بات پر قرآن ہی کے الفاظ و اشارات اور سیاق و سباق و نظام سے دلیل لاتے ہیں اس معاملے میں مجرد ذوق یا کشف یا مشاہدہ کو دلیل نہیں بناتے۔ ایک فقیہ جس طرح قرآن حکیم

سے ایک فقہی حکم مستنبط کرتا ہے اور اس پر قرآن کے الفاظ یا اشارات سے کوئی دلیل پیش کرتا ہے اور اگر وہ اس طرح کی دلیل پیش نہ کرے تو اس کی بات بالکل بے وزن ہو کر رہ جاتی ہے اسی طرح ایک صاحبِ اسرار کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہر سرّ پر جس کے متعلق اُس کا دعویٰ ہے کہ اس نے قرآن سے سمجھا ہے، قرآن سے دلیل لائے، اور اگر وہ قرآن سے دلیل نہ لا سکے تو اُس کے نکتے کی کوئی وقعت نہیں اگرچہ وہ دعویٰ کرے کہ اُس نے یہ نکتہ کعبہ کے اندر قرآن کی روحانیت کی طرف توجہ کے ذریعے حاصل کیا ہے"۔

"پس جہاں تک قرآن کے اندر اسرار و حکم کے موجود ہونے کا تعلق ہے اس سے کسی کو انکار کی مجال نہیں ہے۔ لیکن اسرار و حکم کے اس خزانے پر کسی خاص گروہ کا اجارہ نہیں ہے۔ اس خزانے میں سے بقدر صلاحیت و استعداد وہ لوگ حصہ پاتے ہیں جو کتابِ الٰہی پر تدبر کرتے ہیں۔ اور ان شرائط کے ماتحت تدبر کرتے ہیں جو قرآن پر تدبر کے لئے مقرر ہیں حضرات صوفیائے کرام نے جو اسرار و معارف دریافت کئے ہیں اُن کا وہ حصہ بے شک صحیح ہے جو اُنھوں نے قرآن کے تدبر کے ذریعے سے حاصل کیا ہے اور جس پر وہ قرآن سے کوئی دلیل رکھتے ہیں۔ مگر مجرد اس بنا پر کہ قرآن کی ہر آیت کا ایک باطن ہے، علمِ باطن کا ایک پورا نظام کھڑا کر دینا اور اس کی حمایت میں مذکورہ بالا حدیثوں سے دلیل لانا صریح زیادتی ہے۔

" باطن نماز کا بھی ہے، باطن روزہ کا بھی ہے، باطن حج کا بھی ہے، باطن زکوٰۃ کا بھی ہے اور قرآن نے صاف صاف اس بات کا اظہار بھی کیا ہے کہ ان میں سے ہر چیز کا ایک باطن ہے اور وہی باطن مقصود حقیقی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز ہرگز نہیں کہ کوئی شخص اُٹھ کر ان عبادات کی ساری صورت و ہیئت بالکل بدل ڈالے اور جب کوئی شخص اس پر اعتراض کرے تو یہ جواب دے کہ "یہ باتیں باطن سے تعلق رکھتی ہیں" ان کو اہل ظاہر کیا جانیں"۔ قرآن نے جہاں یہ بتایا ہے کہ ان میں سے ہر ظاہر کا ایک باطن ہے وہیں یہ بھی اشارہ کر دیا ہے کہ فلاں باطن کا ظاہر یہ ہے تاکہ کسی بے راہ روی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے"[1]

علامہ اقبالؒ "ایک خط میں، جو خواجہ حسن نظامی مرحوم کو ۹ جولائی ۱۹۱۶ء کو لکھا تھا، تحریر فرماتے ہیں:—

"کل میں ایک صوفی مفسر قرآن کی ایک کتاب دیکھ رہا تھا۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "ستۃ ایام" سے "تنزلاتِ ستہ" مراد ہیں۔ کم بخت کو یہ معلوم نہیں کہ عربی زبان میں یوم کا یہ مفہوم قطعاً نہیں۔ اور نہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ مفہوم ہی عربوں کی فطرت کے خلاف ہے۔ اسی طرح ان لوگوں نے نہایت بیدردی کے ساتھ قرآن اور اسلام میں ہندی اور یونانی تخیلات داخل کر دیئے ہیں"

[1] تزکیہ نفس صـ۳۲ و صـ۳۱

نیازی صاحب فرماتے ہیں :-

"صحابہ کرامؓ میں جو اسرارِ دین ایک کو تعلیم ہوتے وہ دوسرے کو نہیں ہوتے (کیونکہ اسرارِ دین حسبِ استعداد تعلیم کئے جاتے ہیں) حضرت علی کرم اللہ وجہ کو اسرارِ دین کی تعلیم کی بنا پر ہی سرکارِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے "بابِ علم" فرمایا اور اسرارِ دین کی بنا پر ہی حضرت حذیفہؓ کو "صاحبِ اسرارِ رسول اللہ" کہا جاتا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ کا قول ہے "قلوبُ الابرارِ قبورُ الاسرارِ" یعنی اولیاء اللہ کے قلوب اسرارِ الٰہی کی قبریں ہیں۔" [۱]

تاریخ و سیر اور احادیث سے یہ بات ثابت نہیں ہے کہ حضورؐ نے صحابہؓ میں سے ہر ایک کو الگ الگ اسرارِ دین کی تعلیم دی۔ اسرارِ دین تو سب کو اسی طرح بتاتے جاتے تھے جس طرح ایک استاد اپنے شاگردوں کو سبق پڑھاتا ہے۔ اب ان میں سے جو زیادہ ذہین ہوتا ہے وہ جلد سمجھ لیتا ہے اور جو کسی قدر کم ذہین ہوتا ہے وہ اسی قدر دیر سے سمجھتا ہے۔ اسی طرح جس کا حافظہ قوی ہوتا ہے وہ زیادہ یاد رکھتا ہے اور کمزور حافظے والا جلد بھول جاتا ہے۔ اسرارِ دین سکھانے کی صورت زبانی اور عملی دونوں طرح یکساں تھی۔ جو کچھ وحی کے ذریعے معلوم ہوتا تھا حضورؐ اس کو بیان بھی فرمادیا کرتے تھے اور اس پر عمل کرکے بھی دکھا دیتے تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اول ہر ایک کی فطرت اور مذاقِ طبیعت کا اندازہ کیا اور پھر اس کی طبیعت اور مزاج کے مطابق اس کو اسرارِ دین سکھائے اور وہ بھی دوسروں سے پوشیدہ رکھتے ہوتے۔ یا کسی خاص شخص کو اپنے عمل کا نمونہ دوسروں سے چھپا کر دکھایا گیا ہو۔ اور پھر اس کو یہ تاکید کردی ہو کہ کسی پر ظاہر نہ کرنا اور ایسا کیوں کرتے جب کہ یہ بات منشائے دین کے سراسر خلاف تھی۔ اسلام تو بغیر کسی استثناء کے سب کے لئے ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی فرماتے ہیں :-

"حضرت علیؓ کا اپنا دعویٰ یہ نہیں تھا کہ انہیں حضورؐ نے کوئی ایسا علم دیا تھا جو دوسروں کو نہ دیا ہو۔ بخاری، مسلم اور مسند احمد میں صحیح سندوں کے ساتھ یہ روایت آئی ہے کہ حضرت علیؓ نے بار بار برسرِ عام ان لوگوں کے خیال کی تردید فرمائی تھی جو ایسا سمجھتے تھے۔ آپ نے اپنی تلوار کے پرتلے سے ایک کاغذ کا پرزہ نکال کر لوگوں کو دکھا دیا تھا کہ اس کے سوا کوئی خاص چیز ایسی نہیں ہے جو میں نے حضورؐ سے سن کر ثبت کی ہو۔ اور اس پرچے میں صرف چار پانچ فقہی احکام تھے۔ مسندِ احمد میں ۱۳ مختلف سندوں سے حضرت علیؓ کا یہ ارشاد منقول ہوا ہے۔ ان سب روایتوں کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ ممدوح نے متعدد مواقع پر عوام کی اس غلط فہمی کو رفع فرمایا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے داماد کو راز میں دین کے کچھ ایسے اسرار تعلیم فرما گئے ہیں جو دوسروں کو آپ نے نہیں بتائے۔ بہت سے لوگوں نے آنجناب کی اپنی زبان سے اس باطل خیال کی تردید سُنی اور تردید اتنی مختلف سندوں سے محدثین کو پہونچی کہ اس کی صحت میں مشکل ہی سے شک کیا جا سکتا ہے" [۲]

"قرآن پاک میں ہے وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ = وہ تمہارے نفوس کا تزکیہ کرتا اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ صوفیہ کرام نے "کتاب" سے یہاں احکامِ شریعت اور حکمت سے علم قربِ الٰہی مراد لیا ہے۔ اس کی تائید دیگر آیاتِ قرآنی

[۱] قرآنی تصوف اور اقبال صفحہ ۲۲ [۲] ترجمان القرآن بابت ماہ اگست ۱۹۵۸ء۔

اور احادیث نبوی ؐ سے ہوتی ہے " صلہ (نیازی صاحب)

ہمارے خیال میں کتاب و حکمت کے یہ معنی جو نیازی صاحب نے لیتے ہیں تمام صوفیہ کے ہاں متفق علیہ نہیں ہیں۔ اور ہو بھی نہیں سکتے۔ کتاب سے قرآن اور حکمت سے مراد اس کتاب کی فہم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی جامع کتاب دی وہاں اس کتاب کی فہم بھی عطا فرمائی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ کتاب جس میں اصول و ضوابط کی تفصیلات نہیں ہیں بلکہ زیادہ تر اشارات سے کام لیا گیا ہے، انسانی زندگی کا ضابطہ کیونکر بن سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ سنت رسولؐ بھی ہمارے لئے ناگزیر ہے۔ "تزکیہ کا سرچشمہ اور اُس کا منبع و مصدر کتاب اللہ ہے، اسی کی تعلیم سے تزکیہ کا آغاز ہوتا ہے اور پھر اس کے اسرار و حقائق بلی جو نبیؐ کے ذریعے سے واضح ہوکر اس تزکیہ کی تکمیل کرتے ہیں۔" ؎

"صوفیائے کرام کے عقیدے کے بموجب "معرفت" یہ ہے کہ توحید وجودی سالک کا حال بن جائے اور وہ ہمہ اوست، ہمہ از وست، ہمہ در وست وغیرہ سب پر حاوی ہے بلکہ حقیقتؐ معرفت کی منزل میں "ہمہ" کا خیال ہی غلط ہے۔ اس منزل میں فقط "ہو" ہے۔ چنانچہ حضرت منصور حلاج کے بارے میں ایک شاعر کہتا ہے ؎

حضرت منصورؔ انا بھی کہہ رہے ہیں حق کے ساتھ ۔۔۔ دل تک تشریف لے آئیں اگر اتنا ہوش ہے

اور حضرت اقبال بھی اس کے قائل ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو ۔۔۔ پلا کے مجھ کو مئے لا الٰہ الا ہو

ایک جگہ یہ ارشاد ہوتا ہے ؎

جہانِ دل جہانِ رنگ و بو نیست ۔۔۔ درو پست و بلند و کاخ و کو نیست

زمین و آسمان و چار سو نیست ۔۔۔ دریں عالم بجز اللہ ہو نیست

واضح رہے کہ اس منزل میں "عبد" اللہ نہیں بن جاتا بلکہ عبد رہتا ہی نہیں۔ اللہ ہی اللہ رہ جاتا ہے۔ اس معنی میں کہ صفات عبد ہی صفات حق میں محو ہو جاتی ہیں" ؎ (نیازی صاحب)

عجمی و ویدانتی تصوف سے متاثر صوفیوں ہی کے اس قسم کے بے سر و پا خیالات کی تردید کی جاتی ہے جس پر وہ آتش زیر پا ہو جاتے ہیں یہ لوگ انسان کی ترقی اس میں سمجھتے ہیں کہ وہ سرے سے باقی ہی نہ رہے۔ خدا ہی خدا رہ جائے۔ حالانکہ ذرا سے تامل سے یہ بات بالکل باطل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اگر ترقی اسی میں ہوتی تو اُس کا پیدا ہونا اچھا ہوتا اور ظاہر ہے یہ بات غلط ہے۔ پھر صوفیہ کی معرفت کا جو بیان کیا ہے کہ "ان کے عقیدے کے بموجب معرفت یہ ہے کہ توحید وجودی سالک کا حال بن جائے، اور عبادت سے یہی مراد ہے"۔ تو فرمائیے کتنے ہیں جو اپنی تخلیق کے مقصد کو پورا کر رہے ہیں؟ لاکھوں میں سے ایک بھی مشکل سے نکلے گا اور جب اعداد و شمار کا یہ تناسب ہے تو تقریباً ساری نوع انسانی مقصدِ آفرینش کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے حیوانات کے زمرے میں داخل ہو جائے گی۔ اور اس کے برعکس وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ میں عبادت سے مراد اطاعت و بندگی لی جائے یعنی یہ کہ انسان کو خدا کے احکام کی بجا آوری میں کمال پیدا کرنا چاہیئے تو یہ کسی کے لئے بھی دشوار نہیں رہے۔ اس سے نظام عالم میں بھی ابتری پیدا نہ ہوگی اور "الدنیا مزرعة الآخرہ" کا مطلب بھی یہی ہے کہ جس کے اخلاق، معاملات اور جس کی عبادات ایسی ہوں

؎ کتاب مذکور صلہ ؎ تزکیہ نفس صنہ ؎ کتاب مذکور ص۵۳

جیسی خدا کو پسند ہیں تو وہ خدا کا محبوب بندہ ہے اور اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ خدا کو پہچانتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر ایک شخص کسی خانقاہ یا پہاڑ کے غار میں یا جنگل کی تنہائی میں بیٹھ کر مراقبہ کرتا ہے یا چلہ کشی میں مصروف رہتا ہے اور عبادات معاملات اور اخلاقیات کے شرعی نظام سے بالکل بے نیاز رہتا ہے یا ان کی طرف توجہ کرنے کا اس کو موقعہ ہی نہیں ملتا تو کیا ایسے شخص کی بابت بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے خدا کی معرفت کا مقام حاصل کر لیا ہے۔

پھر یہ کہنا کہ حقیقت و معرفت کی منزل میں "ہمہ" کا خیال ہی غلط ہے، اس منزل میں فقط "ہُو" ہے، خود اپنے مقرر کردہ معنیٔ عبادت کے خلاف ہے۔ کہ جب انسان کی تخلیق کا مقصد معرفتِ الٰہی ہے تو ایسی حالت میں اس کا اپنے آپ کو ختم کر دینا کیا منشائے الٰہی کے خلاف نہ ہوگا؟ کیونکہ معرفت کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے ایک دفعہ خواجہ حسن نظامؔ مرحوم کو ایک خط میں لکھا تھا کہ:—

"حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے مکتوب میں ایک جگہ یہ بحث کی ہے کہ "گسستن" اچھا ہے یا "پیوستن" یعنی فراق اچھا ہے یا وصال؟ میرے نزدیک "گسستن" عین اسلام ہے اور "پیوستن" رہبانیت یا ایرانی تصوف۔ اور میں اس غیر اسلامی تصوف کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوں۔ گزشتہ علمائے اسلام نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ اور اس بات کی تاریخی شہادت موجود ہے"۔

اقبالؔ کے مذکورہ صدر بیان کی روشنی میں نیازی صاحب کے پیش کردہ اشعار کو دیکھئے کیا ان سے وہ مطلب نکلتا ہے جو نیازؔ صاحب نے معرفت کی تعریف کے تحت میں لیا ہے۔ اقبالؔ تو پہلے شعر ؎

مٹا دیا مرے ساقی نے عالمِ من و تو — پلا کے مجھ کو مئے لا الٰہ الا ہو

میں یہ فرماتے ہیں کہ جب سے ساقی (سرکارِ دو عالم ؐ) نے لا الٰہ الا اللہ پڑھایا ہے وہ محبت اور اخوت پیدا ہو گئی ہے کہ ہمارا عالمِ من و تو ختم ہو گیا ہے چنانچہ اس وقت کو یاد کیجئے کہ جب حضور ؐ نے مدینہ منورہ میں پہونچنے کے بعد مہاجر و انصار میں اخوت قائم کی تھی جس کے نتیجے میں مہاجر و انصار نے محبت، ایثار اور یگانگت کا وہ مظاہرہ کیا تھا کہ تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اور جب تک یہ کلمہ نہ پڑھا تھا (حلقہ بگوشِ اسلام نہ ہوئے تھے) ایک دوسرے کا جانی دشمن تھا۔ اور معمولی معمولی باتوں پر جنگ و پیکار کا بازار گرم ہو جاتا تھا۔ شعر میں اسی اخوت کی طرف اشارہ کیا ہے اگر نیازی صاحب اس شعر کا سیاق و سباق بھی دیکھ لیتے تو اس کے وہ معنی نہ لیتے جو انھوں نے اوپر بیان کئے ہیں۔

دوسرے اشعار میں ؎

جہانِ دل جہانِ رنگ و بو نیست — درو پست و بلند و کاخ و کو نیست
زمین و آسمان و چار سو نیست — درین عالم بجز اللہ ہو نیست

شاعر جہانِ رنگ و بو پر جہانِ دل کو ترجیح دیتا ہے کہ "جہانِ رنگ و بو" میں تو پست و بلند اور کاخ و کو کے امتیازات موجود ہیں مگر "جہانِ دل" ان امتیازات سے پاک ہے۔ یہاں نہ کاخ و کو ہیں نہ زمین و آسمان اور نہ چار سو۔ بلکہ یہاں تو اللہ ہو کے سوا اور کچھ نہیں۔

عالمِ دل کا کس قدر حقیقی بیان ہے۔ کیا یہ شعر "وحدت الوجود" کی نفی نہیں کرتا؟ اس شعر سے تو صاف معلوم ہوتا ہے

کہ جہانِ رنگ و بو میں کاخ و کو، زمین و آسمان، پست و بلند اور چار سو سب ہی کچھ ہے جس کو صوفیہ دھوکا اور فریب کہتے ہیں غرضکہ اقبالؔ اس بات کے قائل نہ تھے کہ "عبد" باقی نہیں رہتا یا نہ رہنا چاہیئے۔ وہ تو مولانا رومؒ کے اس بیان سے اتفاق کرتے ہیں کہ جس طرح لوہا آگ میں تپ کر آگ کا رنگ اور آگ کے خواص اختیار کر لیتا ہے اسی طرح انسان کو خدا کی صفات اپنے اندر پیدا کرنی چاہئیں کہ تخلقوا باخلاق اللہ کا یہی مفہوم ہے اور اسی بات کو انھوں نے اس شعر میں ادا کیا ہے ؎

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے   یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ!

اور یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ جو صوفیہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ پر زور دیتے ہیں وہی "ہمہ" کو خیالِ غلط اور وہم و گمان سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

بحوالہ تعلیم غوثیہ صفحہ ۵۹ — فرماتے ہیں :-

"صوفیہ کرام نے توحید کی چار قسمیں بیان کی ہیں :-

(۱) — توحیدِ شریعت اور اس کی ضد شرکِ شریعت - جو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور افعال میں کسی کو شریک کرنا۔ جب قلب اس شرک سے خالی ہو جاتا ہے تو توحیدِ شرعی قائم ہو جاتی ہے۔ شرک کو اللہ نہیں بخشتا باقی جس گناہ کو چاہے گا بخش دے گا۔ عامۃ المسلمین کے لئے یہی توحید کفایت کرتی ہے"۔

(۲) — "شرکِ طریقت ہے - خدا اور رسولؐ، عبد و معبود، خالق و مخلوق کا ثابت کرنا (بلحاظِ وجودِ حقیقی) شرکِ جلی ہے اور اس کے برعکس توحیدِ طریقت ہے"۔

(۳) — شرکِ حقیقت ہے۔ یہ صفات کو غیر سمجھنا ہے۔ اس کے برعکس توحیدِ حقیقت ہے"۔

(۴) — شرکِ معرفت ہے۔ اسم و مسمیٰ میں تمیز کرنا۔ یہ شرکِ اخفیٰ ہے۔ اس کے برعکس توحیدِ معرفت ہے"۔

پس ان چاروں قسموں کے شرک کی باز پرس ان چار مراتب والوں سے ہوگی"۔ ^1 (نیازی صاحب)

نیازی صاحب نے اول تو یہ نہیں لکھا کہ تعلیم غوثیہ کا مصنف کون ہے۔ پھر اس کتاب کا حوالہ دیا مگر یہ نہیں فرمایا کہ یہ چار قسمیں قرآن و حدیث یا اقوالِ صحابہؓ سے بھی ثابت ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو ان کے نہ سمجھنے سے لوگ ماخوذ کیوں ہوں گے! پھر یہ کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ "عوام کے لئے توحیدِ شریعت ہی کفایت کرتی ہے" باقی توحیدیں اُونچے درجے کے لوگوں کے لئے ہیں۔ کیا اس بات سے شریعت کی توہین نہیں ہوتی؟ اسلام کے احکام تو سب کے لئے ہیں اور اسی لئے آسان اور سہل العمل ہیں۔ اور مذکورہ بالا تقسیم سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عوام کے لئے کچھ اور احکام ہیں اور خواص کے لئے کچھ اور۔ نیز احکام کا دُشوار ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ ایسے گورکھ دھندے اور پیچ در پیچ باتیں دوسرے مذاہب میں تو پائی جاتی ہیں مگر اسلام کا دامن اس قسم کے جھاڑ جھنکاڑ سے پاک ہے۔

"اقبالؔ کے آخری حصۂ عمر کے کلام و خیالات سے واضح ہوتا ہے کہ وہ بھی "توحیدِ وجودی" کے قائل ہو گئے تھے" چنانچہ پروفیسر سلیم چشتی ارمغانِ حجاز" کی شرح میں کہتے ہیں :-

^1 قرآنی تصوف اور اقبال صفحہ ۵۸

"سنہ ۱۹۳۰ء کا ذکر ہے ایک ملاقات کے دوران میں نے علامہ اقبال سے عرض کیا کہ مجھے مسئلہ وحدت الوجود سمجھا دیجئے۔ اس پر انھوں نے جواب دیا کہ دراصل یہ مسئلہ قال سے تعلق نہیں رکھتا جب تک تم پر یہ حالت طاری نہ ہو کہ اللہ کے سوا کسی کا وجود نہیں ہے۔ اس وقت تک تم اس مسئلے کو کما حقہ' نہیں سمجھ سکتے۔ علاوہ بریں اس کی تعبیر بذریعہ الفاظ بہت دشوار ہے بلکہ اس قدر نازک ہے کہ اگر بیان کرنے والے سے معمولی فروگذاشت بھی ہو جائے یا سننے والا غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے تو دونوں صورتوں میں کفر یا الحاد لازم آجاتا ہے۔ اس لئے بطور خود اس کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"جب میں نے حضرت حکیم مولانا برکات احمد ٹونکی کے "رسالہ وجود" کا مطالعہ کیا تو میں نے بھی یہی مسلک اختیار کر لیا کہ لاموجود الا اللہ اور مجھے خوشی ہے کہ آخر عمر میں حضرت اقبال بھی وجودی ہو گئے تھے" [1] (نیازی صاحب)

چشتی صاحب کی حضرت علامہ سے ملاقات' وحدت الوجود کے متعلق استفسار اور علامہ کے جواب کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی بجائے ہم خود چشتی صاحب کے ارشادات تصوف اور وحدت الوجود کے متعلق نقل کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ یہ ارشادات ان کی صرف ایک کتاب "شرح اسرار خودی" سے ماخوذ ہیں۔ اور اس کتاب میں سے بھی ہم نے نہایت اختصار کے ساتھ اقتباسات دیئے ہیں۔ ان ارشادات کو پڑھ کر ناظرین کو حیرت ہوگی کہ ایک ہی قلم ایک جگہ کیا لکھتا ہے اور دوسری جگہ کیا۔

چشتی صاحب کے ارشادات :-

(۱) "کافی غور و فکر کے بعد یہ حقیقت اقبال پر منکشف ہوئی کہ غیر اسلامی تصوف نے مسلمانوں کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔ غیر اسلامی تصوف سے میری مراد وحدت الوجود کی وہ تعبیر ہے جس کی رو سے خدا اور انسان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ ظاہر ہے جب کسی انسان کا خواہ وہ ہندو ہو خواہ مسلمان یہ عقیدہ ہو گا کہ :-

(الف) میں موجود نہیں بلکہ موہوم یا معدوم ہوں۔ یعنی میرا وجود دھوکا اور فریب نظر ہے تو وہ جد و جہد یا عملِ صالح کی طرف کیسے راغب ہو سکتا ہے !

(ب) کائنات میں جو کچھ نظر آتا ہے' یہ سب خدا ہے' یا بالفاظِ دیگر میں بھی خدا ہوں تو پھر میں خدا کی عبادت یا اطاعت کس طرح کر سکتا ہوں !

(ج) جب فرد کی ہستی باطل ہو گئی اور اس کے وجودِ ذاتی کی نفی ہو گئی تو اخلاقی ذمہ داری کا احساس کیسے پیدا ہو سکتا ہے ! اور جب اخلاقی ذمہ داری کا احساس مٹ جائے تو دین یا مذہب کیسے باقی رہ سکتا ہے [2]

(۲) جب علامہ پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی' کہ قوم کی بربادی کا سبب نفیِ خودی کا غیر اسلامی عقیدہ ہے تو انھوں نے دل و دماغ کی ساری قوتوں کو اثباتِ خودی کے اسلامی عقیدے کی اشاعت

ایضاً صد ۶۲ [1] شرح اسرار خودی صد ۲۵ [2] شرح اسرار خودی صد ۲۷

کے لئے وقف کردیا"

آگے چل کر فرماتے ہیں :۔

"جن لوگوں نے تاریخ عالم کا مطالعہ کیا ہے اُن سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) میں سب سے بڑا فتنہ جس سے ملت اسلامیہ دوچار ہوگئی تھی، یہ تھا کہ فرقہ باطنیہ کی دو صد سالہ مسلسل کوششوں کی بدولت مسلمانوں میں غیر اسلامی تصوف مقبول اور مرغوب ہوگیا تھا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا :۔

(۱) خدا اور انسان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ خدا، عینِ انسان ہے اور انسان، عینِ خدا ہے۔ بلکہ کائنات کا ہر ذرّہ خدا ہے۔

(۲) خدا، بعض برگزیدہ انسانوں میں حلول بھی کرجاتا ہے اس لئے ہم انہیں خدا سمجھ کر اپنا معبود بنا سکتے ہیں۔ مثلاً حضرت علیؓ میں خدا نے حلول فرمایا۔

(۳) اللہ، محمدؐ اور علیؓ تینوں ایک ہی حقیقت کی تین تعبیریں ہیں۔

(۴) خدا بعض اوقات مختلف لوگوں کے ذریعے سے ظاہر ہوتا ہے جسے "بروز" کہتے ہیں۔

(۵) خدا، کائنات سے جُدا کوئی مستقل ہستی نہیں رکھتا۔ یہ کائنات ہی خدا ہے۔ اور خدا کائنات ہی کا دوسرا نام ہے۔

اتحاد، عینیت، حلول، تجسّم اور بروز کے ان غیر اسلامی عقائد کا یہ نتیجہ نکلا کہ ملت اسلامیہ عمل سے نفور ہوگئی اور جہاد کا جذبہ بالکل ختم ہوگیا۔ اور ایسا ہونا بالکل قدرتی بات تھی اس لئے کہ اگر میں اور خدا دونوں ایک ہیں تو پھر جدوجہد کس لئے اور کس کے لئے؟ یعنی خدا سے بالاتر درجہ کونسا ہے جس کے حصول کے لئے کوشش کی جائے؟ علاوہ بریں جب (میں) موجود ہی نہیں تو کوشش کیسے کرسکتا ہوں۔

اس نفیِ خودی اور ترکِ عمل نے ایک زندہ قوم کو عمل اعتبار سے مُردہ بنا دیا اور فرقہ باطنیہ اسی مقصد کے لئے وجود میں آیا تھا کہ اسلام کو ایک عنصرِ فعّال یا اخلاقی وروحانی طاقت کی حیثیت سے ختم کردے"[1]

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ :۔

"سنہ ۱۹۰۸ء سے لے کر سنہ ۱۹۱۳ء تک انھوں نے اس مسئلے پر غور کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ عجمی تصوف یا وحدت الوجود کی غیر اسلامی تعبیر نے مسلمانوں میں رہبانیت کا رنگ پیدا کردیا جس کی وجہ سے اُن کی قوتِ عمل مُردہ ہوگئی۔ چنانچہ انھوں نے اسرار خودی میں اس غیر اسلامی تصوف کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے"[2]

پھر فرماتے ہیں کہ اگر وحدت الوجود کا مفہوم یہ قرار دیا جائے کہ :۔

[1] شرح اسرار خودی ص۱۸۱ [2] شرح مذکور ص۱۸۲

(۱) صرف اللہ موجود ہے اور انسان (خودی) موہوم یا معدوم یا فریبِ نظر ہے۔
(۲) انسان کا مقصودِ حیات یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی ہستی کو مٹا دے یعنی قطرہ دریا میں مل جائے۔
(۳) خدا اور انسان دونوں متحد الوجود ہیں یا عین یکدگر ہیں۔
تو اقبالؔ اس "وحدت الوجود" کے مخالف ہیں [۱]

نیازی صاحب فرماتے ہیں :۔

"تحقیق کی نظر سے یہ نکات بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتے کہ توحید وجودی کی بنیاد نفیٔ خودی کے بجائے استحکام خودی پر، فنا کی بجائے بقا پر، زوال کی بجائے 'لا نہایت عروج روحانی' پر اور اس جہان کو ہیچ یا معدوم سمجھنے کی بجائے اسے ہر طرح حق سمجھنے اور حق دیکھنے پر قائم ہے۔ دراصل مذکورہ نوعیت کے جتنے الزامات اس پر عائد کئے جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ غلطی سے دیگر اقوام کے غیر اسلامی فلسفوں اور نظریوں کو بعض مشترک اصطلاحات والفاظ کے استعمال کی بنا پر اسلامی توحید سمجھ لیا جاتا ہے" [۲]

تحقیق کی نظر تو اس نتیجے پر پہونچی ہے کہ "وحدت الوجود" کے غیر اسلامی نظریے سے یہ اور اس کے علاوہ اور بہت سی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں۔ چنانچہ اسی کتاب کے دیباچہ نگار صاحب فرماتے ہیں کہ :۔

"واضح رہے کہ علامہ اقبالؔ کی یہ تشخیص بالکل صحیح ہے کہ وحدت الوجود کی غلط غیر اسلامی یا عجمی تعبیر اور عامیانہ و شاعرانہ تفسیر نے مسلمانانِ عالم کی قوتِ عمل کو مفلوج کر دیا اور ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو مضمحل کر دیا اور یہ اضمحلال اس وقت بھی موجود ہے"

مولانا اسلم جے راجپوری لکھتے ہیں :۔

"تصوف کا "مسئلہ عینیت" افلاطون کے "مسئلہ اعیان" سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہے "ہمہ اوست" کے عقیدے نے ایک ایسی ہمہ گیر عینیت کی بنیاد ڈالی کہ ہر ذرہ عین آفتاب ہو گیا۔ اور خالق و مخلوق متحد ہو گئے۔ چند اقوال بطورِ مثال درج کرتا ہوں۔

(۱) سبحان الذی خلق الاشیاء وھو عینھا۔ پاک ہے وہ ذات جس نے کائنات کو پیدا کیا اور وہ اُس کا عین ہے۔ (اگر خدا عین کائنات ہے تو پھر خالق و مخلوق میں امتیاز کس طرح ثابت ہوگا؟ اور اگر امتیاز نہیں ہے تو مخلوق، عبادت کس طرح کر سکتی ہے؟)

(۲) خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ — خود بر سرِ آں کوزہ خریدار بر آمد
بشکست و رواں شد

ہر لحظہ بشکلِ دگر آں یار بر آمد — دل بُرد و نہاں شد
خود انا الحق نہ داز لبِ منصور — خود بر آمد ز شوق بر سرِ دار

[۱] شرح مذکور ص۱۸۸ [۲] قرآنی تصوف اور اقبال ص۱۴

گفت انا احمدؐ بلا میم		از دہانِ محمدؐ مختار

(۴) اے پسر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ		خود ز شرکِ خفی ست آئینہ دار
ہست شرکِ جلی رسولُ اللہ		خویشتن را ازیں دو شرک برآر

یعنی لا الٰہ الا اللہ شرکِ خفی ہے اور محمد رسولُ اللہؐ یہ شرکِ جلی ہے اور مسلمان کا فرض ہے کہ وہ شرک کی ان دونوں صورتوں سے کنارہ کش ہو جائے۔

(۵) چونکہ بے رنگی اسیرِ رنگ شد		موسیٰ با موسیٰ در جنگ شد

یعنی دراصل موسیٰ بھی خدا تھا اور فرعون بھی خدا تھا۔ لیکن جب ذات باری اسیرِ رنگ ہو گئی یا تعینات کے پردوں میں پنہاں ہو گئی تو موسیٰ فرعون کو نہ پہچان سکا۔ اور اُسے غیر سمجھ کر اُس سے لڑنے لگا۔ حالانکہ فرعون اور موسیٰ دونوں ایک ہی ہیں۔ وہ ایک خدا ہے تھے (معاذ اللہ)

"ان شطحیات کا ایک انبار ہے اور ان میں سے بہت سی ایسی ہیں جن کو نقل کرتے ہوئے مجھ ناآشنائے سرِ وحدت" کا قلم لرزتا ہے اور یہ اُن حضرات کے اقوال ہیں جن کا ایک ایک لفظ "عیارستانِ بازارِ صفا" میں جوہرِ بے بہا سمجھا جاتا ہے ایسی حالت میں اسلام کا عین تصوف اور تصوف کا عین اسلام ہونا کتنا حیرت انگیز ہو سکتا ہے[1]

مولانا عبدالماجد دریا بادی فرماتے ہیں کہ:-

حضرت شیخ جیلانیؒ بلکہ اُن کے مرید با اختصاص اور بانی سلسلہ سہروردیہ حضرت شیخ شہابُ الدین سہروردی تک کی تصانیف میں یہ اسلامی عنصر قائم اور یہی رنگ غالب ہے۔ اس زمانے کے بعد شیخ محی الدین ابنِ عربی کے اثر سے نظامِ تصوف میں فلسفیانہ عنصر کو غلبہ ہونے لگا۔ وحدتِ وجود وغیرہ کے مسائل پیدا ہونے لگے اور فارسی شاعری کے اثر سے ان تخیلات کو اور تقویت ہوئی گئی چنانچہ مُلّا جامیؒ کی لوائح ایک اچھی خاصی فلسفیانہ تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاہم نویں صدی کا یہ تصوف بھی، اگرچہ ابتدائی صدیوں کے تصوف سے بہت کچھ منحرف ہو چکا تھا، تاہم ان رسم پرستیوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا، جس پر آج اکثر خانقاہوں اور درگاہوں میں تصوف کا اطلاق ہوتا ہے۔ تصوف کی موجودہ مسخ شدہ شکل یونانی اوہام ایرانی تخیلات، ہندی مراسم اور دیگر غیر اسلامی عناصر کا ایک معجون مرکب ہے جس کے صرف بعض اجزا اسلامی کہے جا سکتے ہیں اور وہ بھی بڑی تلاش اور دیدہ ریزی کے بعد نظر آتے ہیں۔ حاشا ثم حاشا یہ اسلامی تصوف نہیں ---[2]"

غرضکہ یہ کہنا کہ "مذکورہ نوعیت کے جتنے الزامات اس نظریے (وحدت الوجود) پر عائد کئے جاتے ہیں ان کی وجہ یہ ہے کہ

[1] نوادرات ص ۸۷، ۸۸ [2] تصوفِ اسلام ص ۱۹ قرآنی تصوف اور اقبال ص ۶۶

غلطی سے دیگر اقوام کے غیر اسلامی فلسفوں اور نظریوں کو بعض مشترک اصطلاحات و الفاظ کے استعمال کی بنا پر اسلامی توحید سمجھ لیا جاتا ہے"۔ سراسر غلط اور جان بوجھ کر انجان بننے کی نمایاں مثال ہے۔

نیازی صاحب فرماتے ہیں :۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ۔ اَصْدَقُ کَلِمَۃٍ قَالَ الشَّاعِرُ قَوْلُ لَبِیْدٍ ۔ اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰہَ بَاطِلٌ ۔ سچا کلمہ جو شاعر لبید نے کہا ہے وہ لبید کا یہ قول ہے کہ "سن لو! جو شے ماسوی اللہ ہے وہ باطل ہے"۔

(۲) قرآن پاک میں ہے کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ ۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا تمام اشیاء فانی ہیں ۔ (فی الحال فانی ہیں نہ کہ مستقبل میں فانی ہونگی)

(۳) کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ ۔

(۴) الآن کما کان بھی اسی کی شان ہے ۔ وہ اب بھی ویسا ہی ہے جیسا پہلے تھا (یعنی اس کے ساتھ اب بھی کوئی شے موجود نہیں ہے)

(۵) کَانَ اللّٰہُ وَلَمْ یَکُنْ مَعَہٗ شَیْءٌ ۔ اللہ تھا اور اس کے ساتھ کوئی شے نہ تھی ۔

(۶) قرآن پاک میں ہے ۔ ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ

(۷) ایک جگہ ہے اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ (اے محمد ﷺ تو اور وہ سب میّت ہیں اور معدوم)

(یہاں بھی یہی سمجھا جائے گا کہ فی الحال میّت ہیں نہ کہ زمانہ آئندہ میں ۔ ظاہر ہے کہ اس آیت میں ہر شخص اور ہر شے کے تعین ظاہری کو باطل قرار دیا ہے نہ کہ اس کی حقیقت کو ورنہ کم از کم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو زندہ موجود اور مخاطب بھی تھے میّت نہ کہا جاتا)

نیازی صاحب ماسوی اللہ کو معدوم ثابت کرنے پر ایسے تلے ہوئے ہیں کہ معمولی سے سہارے پر بھی اپنے اہم دعوے کو ثابت کر دکھانا چاہتے ہیں حالانکہ مذکورہ صدر مثالوں میں سے ایک بھی ان کے دعوے کے لئے مفید نہیں ۔ ہم مختصراً ہر ایک کا جواب عرض کرتے ہیں ۔

(۱) ـــــ حضورؐ نے ماسوی اللہ کے باطل ہونے کی تائید فرمائی ہے ۔ اور یہ بالکل صحیح ہے ۔ کیونکہ جو چیز ایک حال پر قائم نہ رہے وہ باطل ہی ہوتی ہے ۔ قوسین میں باطل کو معدوم اور وہ بھی فی الحال معدوم لکھا ہے وہ قواعد اور لغت دونوں کے اعتبار سے غلط ہے ۔

(۲) ھَالِکٌ" کے معنی ہلاک ہونے والے کے ہیں اور ہلاک وہی ہوگا جو ہلاک ہونے سے پہلے موجود ہو ۔ ورنہ جو موجود نہ ہو اس پر ہلاکت کا اطلاق کیونکر ہو سکتا ہے ۔ قوسین میں جو لکھا ہے کہ فی الحال فانی ہیں نہ مستقبل میں فانی ہونگے، یہ غلط ہے ۔ فانی" اور "فان" کی بھی یہی حقیقت ہے ! "فان" کے معنی ہیں فنا ہونے والا اور فنا وہی ہوگا، جو اس وقت موجود ہے، معدوم پر "فان" کا اطلاق کون کر سکتا ہے ۔

(۴) مثال نمبر ۲ میں معدوم کا مفہوم نکلتا ہی نہیں۔ یہ بات تو ایک عامی سے عامی کی سمجھ میں بھی آجائے گی کہ وجودِ عالم سے پہلے خدا ہی خدا تھا۔ لیکن وجودِ عالم کے بعد خدا کے علاوہ اس کی مخلوق بھی ہے۔ الآن کما کان سے یہی بتر یاد کرانا مقصود ہے کہ اس کی ذات جیسی کی ویسی بحالہٖ قائم ہے۔ عالم کے وجود میں آجانے سے اُس میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ جیسا کہ بعض فرق ضالّہ کا کہنا ہے کہ

"حق تعالیٰ نے تجلّی فرمائی تو اُس کا وجودِ مستقل باقی نہ رہا۔ بلکہ ممکنات میں ساری ہو گیا یا ان میں مختفی ہو گیا وغیرہ"۔

قوسین میں جو لکھا ہے کہ اس کے ساتھ اب بھی کوئی شے نہیں تو معیت کا قائل ہی کون ہے؟

(۵) قرآن کی آیت ھو الاول و ھو الآخر ۔۔۔۔۔۔۔ الخ جو نقل کی ہے یہ بھی نیازی صاحب کے مفید مطلب نہیں اس لئے کہ یہ صحیح ہے کہ خدا ہی اوّل ہے، خدا ہی آخر ہے اور خدا ہی ظاہر و باطن ہے۔ مگر وہ کسی کا تو اوّل اور آخر اور ظاہر باطن ہے ورنہ چاروں صفات معنی کے اعتبار سے عجیب ہو کر رہ جائیں گی۔

(۶) آخری آیت انک میّتٌ وّانّھم میّتون کا یہ مطلب لینا کہ فی الحال میّت ہے عجیب غریب مطلب ہے۔ اس لئے کہ جو فی الحال میّت ہے اُسی سے خطاب بھی ہو رہا ہے۔ معدوم تو خطاب کے لائق ہی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ تو مخلوق کی حقیقت و ماہیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ تم اور تمہارے علاوہ سب جس طرح پہلے عدم میں تھے اب بھی عدم ہی کے لئے ہیں۔ اور ممکن کی تعریف بھی یہی ہے کہ وہ دو عدموں کے درمیان ہوتا ہے۔

اقبال نے "ساقی نامہ" میں زندگی اور خودی کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے:۔

اُتر کر جہانِ مکافات میں — رہی زندگی موت کی گھات میں
مذاقِ دوئی سے ہوئی زوج زوج — اُٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج
گل اِس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے — اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

×

خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے؟ بیداریٔ کائنات
خودی جلوہ بدمست، خلوت پسند — سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
کرن چاند میں ہے، شرر سنگ میں — یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

نیازی صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"بالِ جبریل" کے محولہ بالا اشعار میں وہی باتیں بطور اشارات مذکور ہیں جنہیں اکابرِ صوفیہ نے تنزلاتِ وجود کے پردے میں مرتبۂ احدیت (بے رنگی) سے مرتبۂ انسان تک بیان کیا ہے"۔ [۱]

[۱] ایضاً ص ۴۳ [۲] ایضاً

ہم اس بارے میں اس لیے کچھ عرض کرنا نہیں چاہتے کہ تنزلات کے متعلق خود علامہ اقبال کا بیان اس سے پہلے نقل کر چکے ہیں۔ اگر کوئی صاحب علامہ کے بیان سے ہٹ کر نیازی صاحب کی رائے کا وزن معلوم کرنا چاہیں تو کسی تصوف کی کتاب سے "تنزلات ستہ" کا مطالعہ کریں اور اقبال کے مذکورہ اشعار کو ان پر منطبق کرکے دیکھیں۔

نیازی صاحب نے ایک جگہ یہ عجیب و غریب بات بھی ارشاد فرمائی ہے کہ:۔

"حضور سرورِ کائنات کو جو سرکارِ دوجہاں کہتے ہیں وہ اقالیم نبوت و ولایت کے دو جہانوں کا سردار ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں۔" [1]

سرکارِ دوجہاں کے یہ معنی بھی جدت طرازی کی ایک مثال ہیں۔ اگر حضور کو سرکارِ دوجہاں اسی معنی کر کہتے ہیں تو یہ بات ہر نبی اور رسول پر صادق آسکتی ہے۔ اور جب یہ حقیقت ہے تو حضور کی کیا خصوصیت باقی رہ جاتی ہے حالانکہ حضور کو سرکارِ دوعالم، دنیا اور عقبیٰ کے دوعالموں کی نسبت سے کہتے ہیں کہ دنیا میں آپ کے ذریعے نوعِ انسانی کو ہدایت ملی اور عقبیٰ میں آپ ہی کی شفاعت سے نجات ملے گی ؎

اُسی نے نوعِ انساں کو نکالا کفر و عصیاں سے   اُسی کو ایک دن پھر کام کرنا ہے شفاعت کا

یا یہ کہ حضور ہی کے احکام پر عمل پیرا ہونے میں دنیا میں عزت اور خوشحالی ہے اور حضور ہی کے احکام پر عمل کرنے سے عقبیٰ کی نجات ہے۔

"نبی کی ولایت (حصولِ قرب یا عروج الی اللہ) وصالِ حق ہے اور احکامِ الٰہی کا مخلوق تک پہونچانا امرِ نبوت ہے۔ امرِ نبوت امرِ ولایت کے مقابلے میں ایک قسم کا نزول یا فراق ہے اسی لحاظ سے نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہوتی ہے۔" [2] (نیازی صاحب)

جن دماغوں نے دین کو شریعت و طریقت میں تقسیم کیا ہے۔ حالانکہ شریعت ظاہر و باطن دونوں پر حاوی اور دونوں کی اصلاح و ہدایت کا مکمل اور جامع نظام پیش کرتی ہے۔ انہیں دماغوں نے نبی کی جامع و مکمل حیثیت کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ نبوت و ولایت اور غضب یہ ہے کہ ولایت کو نبوت سے افضل قرار دیا ہے۔ اسی قسم کی اختراعات نے تصوف کو بدنام کیا ہے۔

"غرض یہ کہ انسان بلحاظ رُوح قدس حق اور بلحاظ جسم و صورت خلق ہے۔ اللہ تعالیٰ ملائکہ کو حکم دیتا ہے:۔ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ جب ٹھیک بنا چکوں اور پھونک دوں اس میں اپنی رُوح تو گر پڑو اس کے آگے سجدے میں۔" (نیازی صاحب)

اس سے پہلے نیازی صاحب شیخ اکبر کے فلسفے کے حوالے سے یہ ارشاد فرما چکے ہیں کہ کائنات نے وجود کی بو بھی نہیں سونگھی اور یہ کہ ظل اور اعتبار کے سوا کچھ نہیں وغیرہ اور یہاں اُسی کائنات کے ایک عنصرِ عظیم کو حق اور خلق بتلاتے ہیں اور اس کو آیت مذکورہ سے ثابت بھی کر رہے ہیں ؎   ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا!

"صوفیہ وجودیہ کے نزدیک یہ رُوح اور ذات، حقیقت واحدہ ہیں اور ملائکہ کا سجدہ حقیقت آدم یعنی رُوح اللہ یا ذات کو تھا۔ اسی لیے وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ آیا ہے۔" [3]

[1] ایضاً ص— [2] ایضاً ص ۸۳ [3] ایضاً ص ۱۳۲

اگر رُوح آدم اور خدا کی ذات کو حقیقتِ واحدہ کہنے سے شرک نہیں ہوتا تو وہ اور کون سے کلمات ہیں جن کے زبان سے ادا ہونے پر شرک ہو جاتا ہے؟ پھر یہ کہنا کہ یہ سجدہ آدم کو نہیں خدا ہی کو تھا کیا تفسیر بالرّائے نہیں ہے؟ حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو شیطان سجدہ کرنے سے انکار ہی کیوں کرتا اور اس کو یہ دلیل پیش کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی کہ انا خیرٌ منہ، خلقتنی من نارٍ وّخلقتہٗ من طین — میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے۔ پھر اگر نیازی صاحب ہی کی بات مان لی جائے تو آدم کی فضیلت کہاں باقی رہتی ہے؟ آدم کی فضیلت ثابت کرنے کے لئے ہی تو ملائکہ کو آدم کے آگے سربسجدہ ہونے کا حکم دیا گیا تھا تاکہ آدم کا خلیفۃ اللہ اور ساری موجودات کا اس کے لئے مسخر ہونا ثابت ہو جائے۔

> "قرآنِ پاک میں ہے:— وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ۔ ہم نے کہا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو۔ پس سجدہ کیا انھوں نے مگر ابلیس نے (نہ کیا) لہٰذا مردودِ بارگاہِ الٰہی ہوا"۔ اس کی ایک تعبیر یوں بھی کی جاتی ہے کہ جب امرِ ربّی یعنی رُوح مقدس تنِ خاکی میں پھونکی جاتی ہے تو عقل و فہم، ہوش و حواس اور اخلاقِ حسنہ وغیرہ مثل ملائکہ سر جُھکاتے اور خدمت میں لگ جاتے ہیں۔ لیکن جذباتِ شہوانی اور لذّاتِ نفسانی سرکشی و نافرمانی کرتے ہیں۔ یہی آدم کے شیطان ہیں۔ اور انہی کے باعث انسان سے (اعمالِ خبیثہ سرزد ہوتے ہیں)۔ بہرحال اس تعبیر سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ انسان کا اصل کارنامہ جذباتِ شہوانی کو رام کرکے انسانیت کے اعلیٰ مدارج کی جانب عُروج کرنا ہے۔ یہ اسلامی تصوف کا ایک مخصوص شعبہ ہے جسے تزکیۂ نفس کہتے ہیں"۔ (نیازی صاحب)

بلاشبہ انسان کا اصل کارنامہ تزکیۂ نفس کے ذریعے انسانیت کے اعلیٰ مدارج کی جانب رجوع کرنا ہے۔ (قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا) اور یہ اسلامی تصوف کا مخصوص شعبہ ہے۔ مگر عجمی تصوف اول تو نفسِ انسانی کی کوئی جُداگانہ حیثیت ہی تسلیم نہیں کرتا اور کرتا ہے تو اس کو فنا کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اور اس نفس کشی کو معراجِ انسانیت قرار دیتا ہے رہا قرآن کی مذکورہ آیت کے وہ معنی مُراد لینا جو نیازی صاحب نے صوفیہ کے حوالے سے درج کئے ہیں تو اول وہ ان تمام تفاسیر کے خلاف ہیں جو چودہ سو سال سے مُفسّرینِ کرام کرتے آئے ہیں۔ پھر اس تفسیر سے فضیلتِ آدم ہی کا نظریہ باطل نہیں ہوتا بلکہ آدم اور شیطان اور ملائکہ فرضی چیزیں قرار پاتی ہیں۔ لہٰذا قرآن میں جہاں آدم، ملائکہ اور شیطان کا ذکر آیا ہے اُس سے وہی قوتِ شہوانی، عقل و فہم اور اخلاقِ حسنہ وغیرہ مُراد لینے پڑیں گے۔ اور جب اس قسم کی تعبیر و تاویل کا دروازہ کُھل جائے گا تو جس کا جو جی چاہے گا قرآن کے مطالب گھڑے گا اور اس طرح قرآن ایک کھلونا بن کر رہ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ صُوفیہ کی اس قسم کی تعبیرات کو تسلیم کرنے میں ہمیشہ احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ ورنہ فرقہ باطنیہ نے کیا گناہ کیا ہے کہ ان کی تعبیرات ہی کو دیوار پر مار دیا جائے۔ مولانا محمد نذیر صاحب نقشبندیؒ، شارحِ مثنوی مولانا رُوم فرماتے ہیں:—

> "صُوفیائے کرام جب آیاتِ قرآنی سے اس قسم کے مفہومات بیان فرماتے ہیں تو بعض لوگ ان مفہوماتِ اعتباریہ کو معانیٔ قرآن اور آیات کی وجوہِ محتملہ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اور یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ اِنَّ لِلْقُرْاٰنِ ظَھْرًا وَّبَطْنًا۔ یعنی قرآن کے ایک ظاہری معنی ہیں اور ایک باطنی۔ ان اصحاب کی دانست میں مفسّرین کے بیان کردہ معانی ظہرِ قرآن ہیں اور

صوفیہ کے بیان کئے ہوئے اعتباری مفہومات "بطنِ قرآن" بلکہ بعض بیباک تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ قرآن کے معنی مفسرین نے سمجھے ہی نہیں۔ یہ صوفیائے کرام کا حصہ ہے۔
سو واضح رہے کہ یہ حدیث حق ہے اور قرآن مجید کا ظہر اور بطن ہونا بھی صحیح ہے۔ مگر یہ خیال بالکل غلط ہے کہ صوفیہ کے بیان کئے ہوئے معنی بطنِ قرآن ہیں۔ درحقیقت قرآن مجید کے معانی مقصود صرف وہی ہیں جو محدثین و فقہا کی تفسیروں میں لکھے ہیں۔ مگر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آیتِ قرآن کے اصلی معنی مقصود کے ساتھ ملتا جلتا کوئی اور مضمون ہوتا ہے جس کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ اس کو اگر تمثیلاً اصلی معنی کے مقابل رکھ کر وہی حکم اس کے لئے بھی ثابت کرنے لگیں تو کر سکتے ہیں۔ ایسے مضامین مفید، پُرحکمت اور عبرت بخش بھی ہوتے ہیں۔ مگر کیا اس قسم کا کوئی تشبیہی و تمثیلی مضمون قرآن کا معنی مقصود ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اور ایک قرآن کیا گلستان، بوستاں وغیرہ کسی کتاب کی حکایت و واقعات کو لے کر ان سے تمثیلی مفہوم بنائیں تو بنا سکتے ہیں مثلاً گلستان کی ایک تاریخی حکایت ہے "طائفہ دزدانِ عرب بر سرِ کوہے نشستہ بودو منفذِ کارواں بستہ۔ رعیتِ بلدان از مکائدِ ایشاں مرعوب ولشکرِ سلطان مغلوب الخ" مطلب ظاہر ہے اور الفاظ اپنی حقیقت پر محمول ہیں۔ مگر اس سے ہم یہ اعتباری مفہوم بھی نکال سکتے ہیں کہ کوہ سے مُراد قلبِ انسان ہے۔ طائفہ دزدانِ عرب سے اخلاقِ رذیلہ جو قلبِ انسانی پر مُسلّط ہو جاتے ہیں۔ کارواں سے وہ واردات و فیوضِ غیب مراد ہیں جن کا قلبِ انسانی پر گذر ممکن ہے مگر اب اخلاقِ رذیلہ نے ان کو قلب پر وارد ہونے سے بند کر رکھا ہے اور رعیت وہ اخلاقِ حسنہ ہیں جو مکانِ وجود میں جہاں تہاں دبے ہوئے پڑے ہیں اور اخلاقِ رذیلہ کے غلبے سے سر نہیں اُٹھا سکتے"۔ ہرچند کہ یہ تاویل دلچسپ بھی ہے اور مفید و نکتہ خیز بھی۔ مگر کیا گلستاں کی عبارت کا یہی ٹھیک مطلب ہو گا یا مطلب سعدی دیگر است!

باقی رہی یہ بات کہ قرآن مجید کا ظہر و بطن کیا ہے۔ سو واضح ہو کہ قرآن مجید نیز حدیث شریف، جو ماخذِ احکام ہیں ان سے احکام اخذ کرنے کا کام نازک تر، پُرخطر اور مزلق اقدام سمجھا گیا ہے۔ اس لئے یہ کام ان خاص اصُول موضوعہ کے تحت کیا جاتا ہے جو ائمہ مجتہدین نے قائم کئے ہیں۔ بعض آیات ایسی ہیں جو سرسری نظر میں ایک خاص مفہوم رکھتی ہیں ان کو ظہرِ قرآن کہتے ہیں۔ جب اس قسم کی آیت کو اصول کے تحت لا کر نظر کرتے ہیں تو اصلی مطلب کچھ اور نکل آتا ہے وہ بطنِ قرآن ہے۔ غرض قرآن و حدیث میں سے تمام احکامِ دین کا گرانبار ذخیرہ انہی اصول کے ذریعے ظہر القرآن و بطن القرآن میں تمیز کر کے تیار کیا گیا ہے"۔[1]

[1] مفتاح العلوم صفحہ ۱۹۹ دفتر ۲

اور سُنیئے نیازی صاحب فرماتے ہیں :—

"یہ حقیقت ہے کہ میری اپنی حقیقت ، ممکناتِ عالم اور وہ ذاتِ مطلقہ جو سب کی خالق ہے ۔ فی نفسہٖ ایک دوسرے سے الگ تین واحد (UNIT) نہیں ۔ (جن کا تصور کم از کم وجودیہ حقیقی کی حد تک) الگ الگ قائم کیا جا سکے ۔ یا جن کے عرفان کے دائرے ایک دوسرے سے قطعی الگ ہوں ۔ یہ سب ایک ہی حقیقت کی تفصیل اور ایک ہی شمع کی تجلیات ہیں ۔ ان سب کا خلاصہ انسان ہے اس لئے عرفائے کرام اور صوفیائے اسلام نے عرفانِ نفس پر ہی زیادہ زور دیا ہے کیونکہ اس میں سب کچھ ہے " [1] (نیازی صاحب)

کیا یہ بے سروپا باتیں تصوف کو بدنام کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں ۔ پھر الزام دیا جاتا ہے اُن لوگوں کو جو اس قسم کی لایعنی باتوں پر نکیر کرتے ہیں ۔ ایسی باتوں سے تو شریعت کا بطلان بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کفر و شرک ہوتا ہے ۔ انسان کائنات اور خدا تینوں کو ایک اور اس سے بھی بڑھ کر انسان کو سب کا خلاصہ کہنا کیا آدابِ شریعت کے خلاف بلکہ کھلا ہوا شرک نہیں ہے ؟ اور پھر ایسا فرماتے ہوئے نیازی صاحب کو اپنے دوسرے بیانات کا بھی خیال نہیں آیا کہ اس سے پہلے وہ انسان کو دوسری موجودات کے ساتھ وہم فکر اور اعتبار کا درجہ دے چکے ہیں اور یہاں اسی انسان کو سب کا خلاصہ قرار دے رہے ہیں سچ ہے جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے !

"اسلام نے ظاہر و باطن ، دونوں کی نوعیت جُدا جُدا قرار دی ہے ۔ دونوں کے لئے جُدا جُدا فرائض حقوق اور نصب العین مقرر کئے ہیں ۔ ظاہر کے لئے احکامِ شریعت اور باطن کے لئے احکامِ طریقت ہیں ۔ ظاہر کے لئے خلافت فی الارض اور باطن کے لئے رب کی ملاقات مقرر کی ہے ۔ ایک کا تعلق امرِ نبوت سے ہے اور دوسرے کا امرِ ولایت سے " [2]

یہ قول محض لغو ہے اور قرآنی تعلیم کے خلاف اور ہم اس خود ساختہ تقسیم کا جواب اس سے پہلے دے چکے ہیں ۔ علاوہ غیر ضروری ہے ۔

"اقبال نے بھی فلسفۂ حیات کو دو حصوں میں یعنی خودی اور قلندری کے تحت بیان کیا ہے اور اس کے تمام اہم خصائص اسلامی شریعت و طریقت ہی سے ماخوذ ہیں ۔ انداز بیان البتہ کہیں شاعرانہ اور کہیں فلسفیانہ ہے " [3] (نیازی صاحب)

یہ بالکل غلط اور بے بنیاد بات ہے ۔ اول تو اقبال نے اپنا فلسفہ بجائے خودی و قلندری کے خودی و بے خودی کے تحت بیان کیا ہے اور خودی کا تعلق فرد سے اور بے خودی کا تعلق جماعت سے ہے ۔ اور قلندری تو خودی ہی کی ایک حالت کا نام ہو سکتا ہے ۔ دوسرے اُنھوں نے شریعت کو کسی اور چیز کا محتاج نہیں قرار دیا ہے ، ان کے نزدیک شریعتِ اسلامیہ ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح و تزکیہ کے لئے کافی ہے ، اسی سے خلافت فی الارض حاصل ہوتی ہے اور اسی سے تقرب الی اللہ کی منزلیں طے ہوتی ہیں ۔ یہ طریقت ، حقیقت اور معرفت کے اضافے بعد کی چیزیں ہیں ۔ اور پھر ان کو وہ مقام دینا کہ جس سے شریعت کی تخفیف و تذلیل ہوتی ہو کھلی گمراہی اور نہایت درجہ کی خودسری و خود رائی ہے ۔

"علامہ اقبال پہلے " وحدت الوجود " کے خلاف تھے بالخصوص دیباچۂ اسرارِ خودی میں ۱۹۱۵ء اور پھر اس کے بعد ۱۹۱۸ء تک ان کی تحریرات اس نظریئے کے خلاف ملتی ہیں لیکن اس کے بعد ۱۹۲۲ء سے اس کی موافقت شروع ہو گئی ، جس کی مثالیں پیامِ مشرق ، زبورِ عجم ، خطبات ، جاوید نامہ ، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز سے پیش کی جا سکتی ہیں " [3]

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

[1] قرآنی تصوف اور اقبال صفحہ ۱۵۳ [2] ایضاً صفحہ ۱۶۶ [3] ایضاً صفحہ ۱۸۱

ماہر القادری

○

ہے دُھندلکا ہی دُھندلکا ابھی تا حدِ نظر — لے تباشیرِ سحر! اور بکھر اور بکھر

مجھ سے دیکھی نہ گئی جام کی یہ بے کیفی — گھول دی میں نے خود اپنے ہی تبسم کی شکر

شوخیٔ بادِ صبا سے یہ شکایت کیا کیا — ٹوٹتے دیکھے ہیں جس آنکھ نے شبنم کے گہر

میری دُنیا میں اندھیرا ابھی اُجالا ابھی ہے! — زلفِ مشکیں کی ہے شب عارضِ رنگیں ہے سحر

اللہ اللہ! یہ منظر چمن آرائی کا! — آتشِ گل کا ہے یہ رنگ دُھواں ہے نہ شرر

یہ غریبوں کے مصائب کا مداوا تو نہیں — کچھ فقیروں کو اگر کر بھی دیا شہر بدر!

مجھکو اس خاک سے کرنے ہیں ستارے پیدا — جستجو کا مری مرکز نہ عطارد نہ قمر!

حسن آغازِ محبت میں بہت سادہ تھا — اب چالاک ہے پُرکار ہے اور شعبدہ گر

راہ میں ایسے مسافر بھی نظر آئے ہیں — جسم آرام طلب دل میں نہیں ذوقِ سفر

سیم و زر، لعل و جواہر پہ نہیں میری نگاہ — میرا سرمایہ ہے بے تابیٔ دل سوزِ جگر

جام و مینا کی کھنک کتنی خوش آہنگ سہی

خودکشی پر مجھے اے دوست! تو مجبور نہ کر

مولانا سید احمد قادری

روح انتخاب

شراب کا قلیل و کثیر دونوں حرام ہے

ابوداؤد و ترمذی نے حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: —
مَا اَسْکَرَ کَثِیْرُہٗ فَقَلِیْلُہٗ حَرَامٌ۔ یعنی جس کا کثیر نشہ آور ہو اس کا قلیل بھی حرام ہے۔
ابوداؤد و نسائی میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس کا ایک فرق (فرق ایک بڑے برتن کا نام ہے) نشہ آور ہو، اس کا ایک چلو بھی حرام ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

چونکہ تھوڑی شراب کا استعمال کثرت سے نوشی کا سبب بن جاتا ہے اس لئے سیاست امت کے لئے واجب تھا کہ وہ مدار تحریم (حرام ہونے کی بنیاد) اس کے نشہ آور ہونے کو قرار دے نہ کہ فی الحال نشے کے وجود کو۔ یعنی شراب میں اگر نشہ پیدا کرنے کی صفت پیدا ہوگئی تو وہ حرام ہوگی عام ازیں کہ اس کی تھوڑی مقدار پینے والے میں نشہ پیدا کرے یا نہ کرے
اسی کتاب میں دوسرے مقام پر تحریر فرماتے ہیں: —
شریعتِ قویمۂ محمدیہ نے جو سیاست امت، سدِ ذرائع اور قطع احتمال تحریف میں منتہائے مقصود ہے یہ دیکھا کہ شراب کی تھوڑی مقدار، مقدار کثیر کی داعی بن جاتی ہے۔ اس لئے اس نے قلیل و کثیر دونوں کو حرام قرار دیا۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو امت کو ان مفاسد سے نہیں بچایا جاسکتا تھا جو شراب نوشی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کچھ شراب کے استعمال میں رخصت کا دروازہ کھول دیا جاتا تو سیاستِ امت کا انتظام کبھی درست نہ ہوتا۔ (ص ۲۷)

شراب کی تجارت بھی حرام ہے

تمام امت کا اس پر اجماع و اتفاق ہے کہ شراب کی بیع و فروخت اور اس کی قیمت و ثمن حرام ہے۔ یہ کوئی قیاسی مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ صحیح حدیثوں سے بہ نص صریح ثابت ہے۔
بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلے اور فرمایا حُرِّمَتِ التِّجَارَۃُ فِی الْخَمْرِ"۔ یعنی شراب کی تجارت حرام کر دی گئی۔
بخاری و مسلم میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے شراب کی خرید و فروخت اور اس سے انتفاع، نیز مردار، سور اور بتوں کی خرید و فروخت حرام کر دی

ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ نے شراب اور اس کے دام، مُردار اور اس کے دام، سُور اور اس کے دام کو حرام کر دیا۔"

ابوداؤد میں حضرت مغیرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (زجر و توبیخ کے لہجے میں) فرمایا جو شخص شراب بیچتا ہے اسے چاہیئے کہ سُور ٹکڑے ٹکڑے کر کے بیچے یعنی سُور کا گوشت اور شراب بیچنے میں کوئی فرق نہیں ہے کیوں کہ دونوں کی حرمت برابر ہے۔

ان حدیثوں نے جس شدت کے ساتھ شراب کی تجارت کو حرام قرار دیا ہے وہ ظاہر ہے لیکن حیرت ہے کہ جس شریعت نے سُور اور مُردار حتیٰ کہ بُت فروشی اور مے فروشی میں کوئی فرق نہیں کیا، آج اسی شریعت کو ماننے والوں کا ایک قبیلہ صرف شراب فروشی کی وجہ سے دوسرے قبیلوں سے ممتاز ہوتا ہے۔ ہمارے ان بھائیوں کو جو شراب فروشی کو پیشہ بنائے ہوئے ہیں، سوچنا چاہیئے کہ انھوں نے اپنے لئے کیسا بُرا ذریعہ معاش اور کیسی خبیث کمائی اختیار کی ہے۔ وہ شراب فروشی کر کے نہ صرف یہ کہ انسانی سوسائٹی کو تباہ کرنے میں مدد بہم پہنچا رہے ہیں بلکہ یہ کام ان کے دعویٰ ایمان و اسلام کے بھی منافی ہے وہ حقیقت میں چوروں کی، ڈاکوؤں کی، بدمعاشوں کی اور جرم پیشہ گروہوں کی مدد کر رہے ہیں اور بہت سے غریب کسانوں اور مزدوروں کی زندگیوں کی تباہی کا ذریعہ بن کر چند پیسوں کے لئے اور حصولِ دُنیا کے لئے اپنا دین تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ کاش ان کے دلوں میں جذبۂ ایمان جاگ اُٹھے اور وہ اس ملعون پیشے سے باز آئیں [1]

دس اشخاص پر اللہ و رسولؐ کی لعنت

ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب پر اور اس کے پینے والے پر، پلانے والے پر، بیچنے والے پر، خریدنے والے پر، کشید کرنے والے پر، کشید کرانے والے پر، بوجھ اٹھانے والے پر اور جہاں وہ پہنچائی جائے اس پر لعنت کی ہے۔

ترمذی میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب سے متعلق دس اشخاص پر لعنت کی ہے۔ کشید کرنے والے پر، کشید کرانے والے پر، پینے والے پر، پلانے والے پر، اس کا بوجھ اٹھانے والے پر، جس کے یہاں پہنچائی جائے اس پر، بیچنے والے پر، خریدنے والے پر، اس کا تحفہ دینے والے پر اور اس کے دام کھانے والے پر۔

جو مسلمان بھی شراب کے کسی کام میں لگا ہوا ہے اس کو ان حدیثوں پر غور کرنا چاہیئے۔ اس سے زیادہ بدنصیب کون ہوگا جس پر اللہ جو ماں باپ سے زیادہ مہربان ہے اور رسولؐ جو تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے۔ لعنت بھیجیں جو مسلمان بھی اس کاروبار میں لگا ہوا ہے وہ پیسوں اور روپیوں کے ساتھ ہر آن اللہ و رسولؐ کی لعنتیں بھی سمیٹ رہا ہے۔ مسلمان ملکوں کے سربراہوں اور حکمرانوں کو بھی ان حدیثوں سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔

شراب پینے والے کے متعلق وعیدیں

بخاری و مسلم میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے دنیا میں شراب پی اور پیتا رہا یہاں تک کہ

---

[1] اور یہ بات تو ایک مومنِ مخلص کے لئے انتہائی سوہانِ رُوح ہے کہ مسلمان حکومتیں اپنی مملکت میں شراب کی تجارت کے لئے پرمٹ اور لائسنس جاری کریں اور طرح طرح کے بہانے کر کے شراب کے کلی امتناع میں روڑے اٹکائیں۔

بے توبہ کے مرگیا وہ آخرت میں شراب طہور سے محروم رہے گا۔ مسلم میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یمنی کو جواب دیتے ہوئے فرمایا :۔ "جو مسکرات کا استعمال کرتا ہے اللہ اس کو آخرت میں دوزخیوں کے جہنم سے بہتے ہوئے پیپ اور خون پلائے گا۔" نسائی میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انھوں نے فرمایا "شراب سے بچو اس لئے کہ وہ خبائث (برائیاں) کی اصل ہے خدا کی قسم ایمان اور شراب نوشی پر اصرار دونوں جمع نہیں ہو سکتے یا تو ایمان شراب نوشی کو بند کر دے گا یا شراب، ایمان کو دل سے نکال دے گی۔"

حاصل کلام، شراب نوشی اور شراب فروشی انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو برباد کر دیتی ہے اس لئے عقل ونقل کا فیصلہ ہے کہ اسے قطعاً ترک کر دیا جائے۔ خصوصیت کے ساتھ مسلمان کے لئے جو اللہ ورسول پر ایمان کا دعویٰ کرتا ہے۔ شراب نوشی اور شراب کا کاروبار ایسا کام ہے جو اس کے ایمان واسلام کی جڑیں ہلا دیتا ہے۔ ایک شاعر واعظ کاشی نے یہ قطعہ کیا خوب لکھا ہے

ترا رحمان ہمی گوید کہ اے مومن مخور بادہ — ترا ترسا ہمی گوید کہ در صفرا مخور حلوا
ہمی مانی ز ناپاکی برائے گفتۂ رحمٰن — بمانی شہد و شکر را برائے گفتۂ ترسا

———x———

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۳ سے آگے)

تدوین کے تین دور ہیں اول یہ کہ ہر شخص نے اپنی معلومات کو یکجا کیا۔ دوسرا دور آیا تو ہر شہر کے معلومات یکجا کئے گئے تیسرا دور آیا تو تمام دنیائے اسلام کے معلومات اکٹھا کئے گئے اور ان کو موجودہ کتابوں کی صورت میں یکجا کر دیا گیا۔ پہلا دور غالباً سنہ ۱۰۰ھ تک قائم رہا دوسرا دور سنہ ۱۵۰ھ تک رہا اور تیسرا دور سنہ ۱۵۰ھ سے تیسری صدی کے کچھ دنوں بعد تک قائم رہا۔ پہلا دور صحابہ اور اکابر تابعین کا تھا دوسرا دور تبع تابعین کا تھا تیسرا دور امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، اور امام احمد بن حنبل وغیرہ کا تھا، پہلے دور کا تمام سرمایہ دوسرے دور کی کتابوں میں محفوظ اور دوسرے دور کی کتابوں کی حدیثیں تیسرے دور کی کتابوں میں یکجا کر دی گئیں۔ دوسرے اور تیسرے دور کی کتابوں کا سرمایہ آج ہزاروں اوراق میں ہمارے پاس موجود ہے جو دنیا کی علمی تاریخ کا سب سے معتبر، گراں بہا، مستند علمی ذخیرہ ہے جس سے زیادہ معتبر اور مستند دنیا کی تاریخ میں کوئی دوسرا ذخیرہ معلوم نہیں ہے۔

ہماری نظر میں

"نگار" پاکستان کا نیاز نمبر

مرتبہ :- فرمان فتحپوری - حصہ اول ضخامت ۲۱۴ صفحات قیمت :- چار روپے -
حصہ دوم ضخامت ۳۰۲ صفحات قیمت :- چار روپے (زرسالانہ دس روپے)
ملنے کا پتہ :- نگار پاکستان، ۳۲ گارڈن مارکیٹ، کراچی ۳

جناب نیاز فتحپوری اور رسالہ "نگار" کی شہرت اور نام اور کام لازم و ملزوم ہیں کہ جب ان میں سے ایک کا ذکر آتا ہے تو دوسرے کا تذکرہ چھیڑنا لازمی، ضروری بلکہ ناگزیر ہے، نگار کی شہرت اور مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ جناب نیاز کے پاکستان چلے آنے کے بعد ہندوستان میں رام پور سے "نگار" شائع ہو رہا ہے اور پاکستان کا "نگار" ہندوستان کے "نگار" سے زیادہ مقبول ہے !

شاعروں میں جناب جوش ملیح آبادی اور ادیبوں میں جناب نیاز فتحپوری دو ایسی شخصیتیں ہیں جن پر ہندوستان سے پاکستان چلے آنے کے بعد اخباروں اور رسالوں میں تنقیدی مضامین شائع ہوئے۔ خاص طور سے جوش صاحب کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا، ہمارے یہاں بھی اس سلسلہ میں ہندوستان سے مراسلے آئے مگر ہم نے شائع نہیں کئے، ان مضامین میں بعض لکھنے والوں نے ایسی نکتہ آفرینیاں اور غلط بیانیاں کی ہیں جن سے اصل حقیقت ملتبس ہو جاتی ہے، سیدھی سادی اور سچی بات یہ ہے کہ ان دونوں صاحبوں نے ہندوستان اس لئے نہیں چھوڑا کہ ان کو اور ان کی اولاد کو دین و ایمان کا کوئی خطرہ درپیش تھا، اس خطرے سے یہ حضرات کوئی سروکار نہیں رکھتے، انھوں نے ترکِ وطن اس لئے کیا ہے کہ پاکستان میں ان کو کسی خطرے اور اندیشے کے بغیر زیادہ خوشحال زندگی گزارنے کے مواقع حاصل تھے اور یہ مواقع ان کو یہاں پاکستان میں میسّر آئے ! جناب نیاز فتحپوری کی تو امید سے زیادہ پاکستان میں پذیرائی ہوئی اور ان کے ہمدردوں، بہی خواہوں اور مدّاحوں نے ان کے روزگار و معیشت کے وہ اسباب اور سامان پیدا کئے کہ نیاز صاحب کے بڑھاپے میں جوانی کی جھلک پیدا ہو گئی اور اب وہ یہاں ہر طرح سے مطمئن، خوش اور پُر امید ہیں ـــ اس کا نیاز نے اعتراف بھی کیا ہے، لکھتے ہیں :ـــ "میں احبابِ پاکستان کا شکر گزار ہوں جنھوں نے یہاں کی فضا کو ساز گار بنا کر میری اور نگار کی عمر چند سال اور بڑھا دی"۔

جناب نیاز فتحپوری کا قلم نصف صدی سے شعر و ادب کی جو خدمت انجام دے رہا ہے، اس کا ان کے دوستوں ہی نہیں مخالفوں کو بھی اعتراف ہے، اردو ادب کی تاریخ ان کے تذکرے سے خالی نہیں رہ سکتی "نگار" نے مسلسل چالیس سال تک شعر و ادب کی قابلِ قدر خدمت کی ہے اور نئی نسل کو متاثر کیا ہے، اردو تو نیاز فتحپوری کی اپنے گھر کی زبان ہے اس کے علاوہ فارسی، عربی، انگریزی اور ترکی بھی وہ جانتے ہیں اس لئے ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے اسی وسعتِ مطالعہ نے ان کے مضامین اور تحریروں میں بڑی جامعیت اور رنگا رنگی پیدا کر دی ہے ! شعر و ادب کی ہر صنف میں نیاز کے قلم نے گلکاریاں

ہیں اُن کا مطالعہ اس قدر ہمہ گیر اور وسیع الاطراف ہے کہ پامسٹری (فراست الید) تک پر انھوں نے معلومات آفریں مضامین لکھے ہیں۔
نگار کے "نیاز نمبر" میں پاکستان اور ہندوستان کی معروف و مستند ادبی شخصیتوں نے مضامین لکھ کر نیاز صاحب کو کھلے دل سے خراجِ عقیدت و منقبت پیش کیا ہے۔ اتنے اُونچے درجہ کے مدّاح اور قدر شناس ہر شاعر اور ادیب کو کہاں میسّر آتے ہیں! نیاز کی تنقید، افسانہ، مکتوب نگاری، مذہب، نفسیات، ناول نگاری، ناولٹ، شاعری اور شخصیت پر بلند پایہ ادیبوں نے بڑے جاندار مقالے لکھے ہیں! پروفیسر خان رشید خان نے بتایا ہے کہ اُردو ادب میں آزادیِ فکر کا رجحان نیاز فتحپوری نے پیدا کیا، بعض مشہور ناول نگاروں، نقادوں اور ادیبوں نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ نیاز کی تحریریں پڑھ کر اُن میں انشاپردازی کا سلیقہ اور ذوق پیدا ہوا ہے!

بعض مشہور شاعروں نے نیاز صاحب کی مدح میں اچھی نظمیں کہی ہیں، جناب فراق گورکھپوری کی نظم سب سے اچھی، دل کش اور اثر آفریں ہے، اُس کا آخری شعر ہے ؎

یہ میری نذرِ عقیدت سرِ قدوم[1] نیاز
صبا کے دوش پہ پہونچے بصورتِ اشعار

جناب فراقؔ گورکھپوری عظیم شاعر ہی نہیں، بلند پایہ نقاد بھی ہیں، نیاز صاحب کے لئے اُن کی نذرِ عقیدت اپنی جگہ بڑا وزن رکھتی ہے۔

جناب نیاز فتحپوری نے اپنے خاندان، والد اور اپنی تعلیم و تربیت، مذہبی رجحانات اور زندگی کے بارے میں جو مضمون لکھا ہے وہ خوب نہیں بہت خوب ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے مُبالغہ نہیں کیا، جو اُن پر گزرا ہے اور جن حالات سے وہ گزرے ہیں انہیں ہو بہو کاغذ پر منتقل کر دیا ہے! یہ بات ہم خاص طور پر اس لئے کہہ رہے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اپنے اور اپنے خاندان کے جو واقعات خود لکھے ہیں یا دوسروں سے لکھوائے ہیں، وہ بہت زیادہ قابلِ غور اور موضوعِ نزاع ہیں۔ نیاز صاحب کے خود نوشتہ سوانح میں یہ رنگ پیدا نہیں ہونے پایا۔

نیاز فتحپوری کی تحریروں کے بڑے اچھے اقتباسات اور نمونے مضمون نگاروں نے پیش کئے ہیں، مثلاً:-

——— "دُنیا میں کسی پر احسان کرنا اتنا دُشوار نہیں جتنا اعترافِ احسان"!

لیکن

صفحہ ۲۰ (حصہ دوم) میں نیاز صاحب کی تحریر کا ایسا اقتباس بھی نظر سے گزرا:-

[1] آغازِ شاعری میں مجھ سے بھی یہی غلطی ہوئی تھی کہ "قدوم" کو "قدم" کی جمع سمجھ کر نظم کیا تھا:-

مٹا رہے ہیں وہ نقشِ قدوم پھر پھر کر — سرِ نیاز کا ہے اُن کو مُدعا معلوم

مگر بعد میں پتہ چلا کہ قدم کی جمع "قدوم" نہیں "اقدام" ہے، "قدوم" تو "آنے" اور "تشریف لانے" کو کہتے ہیں "قدوم میمنت لزوم" کے معنی ہیں "ایسا آنا جو بابرکت ہو"! امداد علی بحر لکھنوی کا شعر ہے ؎

قدومِ یار سے روشن سیاہ خانہ ہوا — ہر ایک نقشِ کفِ پا چراغ خانہ ہوا

(یعنی آمدِ یار (یار کے آنے) سے سیاہ خانہ روشن ہوا)

حیرت ہے کہ فراق گورکھپوری کو شعر و سخن کی کم و بیش پچاس سالہ مشق اور علم و ادب کے وسیع مطالعہ کے بعد بھی "قدوم" کے صحیح معنی معلوم نہیں ہوئے۔

"کہا جاتا ہے کہ اصلاح کی بُنیاد انسان کے جہل سے شروع ہوتی ہے اور علم کی روشنی میں اُس کا اختتام ہوجاتا ہے، یہ بالکل صحیح ہے کیونکہ جو چیز جہل کو دُور کرنے کے لئے آئے گی اس کی ابتداء عہدِ تاریک سے ہوگی - - - -"

یہ خیال سراسر مادہ پرستانہ ہے، اور دین و دانش اس کی تردید کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ پہلے انسان (حضرت آدم) کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا تھا اور وہ ہدایت پر مبعوث ہوا تھا۔ انسانی زندگی کی ابتداء گمراہی سے نہیں ہدایت سے اور جہل کی تاریکی سے نہیں علم کی روشنی سے ہوئی ہے بالکل اسی طرح، جس طرح انسانی زندگی کا جسمانی طور پر آغاز بیماری سے نہیں صحت سے ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ پہلا انسان متشکک، گمراہ، منکر، ملحد اور ایمان سے ناآشنا نہیں تھا بلکہ مومن و مسلم اور خدا کا ماننے والا تھا۔

نیاز کے مکتوبات کی مضمون نگاروں نے تعریفیں بھی کی ہیں، مگر ان تعریفوں کے ہجوم میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی یہ بصیرت افروز تنقید بھی ملتی ہے :-

"نیاز فتحپوری کے یہ خطوط ماہ بہ ماہ رسالہ "نگار" لکھنؤ میں شائع ہوتے رہے، اس کے بعد کتابی صورت میں منظرِ عام پر آئے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لکھے ہی اس مقصد سے گئے ہیں کہ شائع کئے جائیں۔ اس لئے ان میں "نگاہے سرِ راہم گرفت" کا لطف نہیں ہے، ان خطوں میں اسلوب کا اچھوتا پن، بیان کی ندرت، تخیل کی بلندی، ظرافت کی بہار سب کچھ ہے، لیکن خلوص کی گرمی نہیں ہے، ان تینوں مجموعوں کو پڑھتے وقت وہ خوشی ہوتی ہے، جو چڑھتی ہوئی ہوا کو دیکھ کر لیکن ختم کرلینے کے بعد وہ کوفت بھی جو گرتی ہوئی ہوا کے نظارے سے ہوتی ہے ان مست ہواؤں اور گھنگھور گھٹاؤں میں ہمارا جام خالی ہی رہتا ہے، غالب کے خط پڑھ کر دوئی کا فرق مٹ جاتا ہے، ان کی بھرپور انسانیت اور ارضیت ہمیں غم گساری کے آداب سکھلاتی ہے لیکن نیاز کے ساتھ یہ ہمدردی پیدا نہیں ہوتی، ہم اُن کے ساتھ دُور تک نہیں جاسکتے، وہ خود نمائی اور خود پرستی کے درمیان جھولتے رہتے ہیں، ہم اگر چاہیں کہ اُن کی شخصیت کو دیکھ لیں، تو یہ ممکن نہیں ہے، وہ صرف انہی گوشوں کی نمائش روا رکھتے ہیں، جن کی نمائش وہ چاہتے ہیں کہ ہو، اُن کی شخصیت پر اس قدر دبیز اور تہ بہ تہ نقاب پڑے ہیں کہ محرومیاں سر پٹک پٹک کر رہ جاتی ہیں - - - - - - - انھوں نے اس مجموعے میں کوئی خط بھائی، بہن، بیوی ماں، باپ سلانعریا متوسل کو نہیں لکھا اس لئے ان خطوں سے نیاز کے متعلق کم اور ان کے مکتوب الیہم کے متعلق زیادہ معلومات حاصل ہوتی ہیں، بعض اوقات یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ مکتوب الیہ کی جنس کیا ہے؟ اور نیاز کے اس سے کس قسم کے اور کب سے مراسم ہیں - - - -"

بعض جگہ نیاز فتحپوری واقعہ کا انتخاب اور جزئیات کا بیان اس طرح کرتے ہیں کہ اس میں تکلف پیدا ہوجاتا ہے اور طنز کی شگفتگی کم اور زہرناکی بڑھ جاتی ہے۔" (نیاز نمبر حصہ اول صفحہ ۲۴۴-۲۴۶)

نیاز فتح پوری کے مکتوبات کوئی شک نہیں رومان سے لبریز ہیں، اُن میں زبان و بیان کا چٹخارہ بھی پایا جاتا ہے مگر اُن میں تکلف اور آورد بھی نمایاں ہے، اس لئے مکتوبات نیاز کو غالب، شبلی اور مہدی افادی کے خطوط کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

نیاز فتحپوری نے رسالہ نگار میں عروض پر بہت کچھ لکھا ہے، لیکن ان کی تحریروں کو پڑھ کر راقم الحروف کے وجدان کو یہ بات بار بار کھٹکی کہ نیاز صاحب فنِ عروض میں بس شُدبُد رکھتے ہیں، اور وہ عروض کی کتابیں سامنے رکھ کر عروض پر لکھ دیا کرتے ہیں، میری اس "کھٹک کی تائید رشید حسن خاں کے مضمون سے ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انھوں (نیاز صاحب) نے ایک ایسے صاحب کے مجموعہ رباعیات پر دیباچہ لکھا ہے، جنھوں نے رُباعی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل ہے، میری مُراد ڈاکٹر سلام سندیلوی سے ہے، اس دیباچے میں اُن کی اتنی تعریف کی جتنی وہ غریب خود نہیں کر سکتے تھے جب کہ اس مجموعے کی ۱۵۰ رُباعیوں میں کم از کم ۴۸ رُباعیاں ساقط الوزن ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" (نیاز نمبر حصہ اول صفحہ ۲۳۰)

جو شخص صحیح و موزوں اور بحر سے خارج اور ساقط الوزن رُباعیوں میں تمیز نہ کر سکے، وہ عروض داں ہو ہی نہیں سکتا۔

بعض مقامات پر لکھنے والوں نے نیاز صاحب کی مدح میں خاصہ مبالغہ کیا ہے، مثلاً:۔

"ان (نیاز صاحب) کی وُسعتِ نظر، عمق مطالعہ، بے عدیل محاکمہ، اعلیٰ جمالیاتی احساس اور گہرے سماجی شعور کا حریف کم از کم اس زمانے میں کوئی اور نہیں ہے"۔ (حصہ اول صفحہ ۱۲۹)

"اعلیٰ جمالیاتی احساس اور گہرے سماجی شعور" میں نیاز صاحب کا کوئی حریف ہے یا نہیں ان فنون (؟) میں ہم درک نہیں رکھتے، اس لئے ہم اس بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کرتے مگر وُسعتِ نظر، عمقِ مطالعہ اور محاکمہ میں درجنوں اہلِ قلم اور اربابِ فکر اسی زمانہ میں نیاز فتحپوری کے ہم پلہ ہیں بلکہ بعض ان سے منزلوں آگے ہیں۔

فاضل ناقد نے شبلی، حالی اور محمد حسین آزاد کے تنقیدی کارناموں پر تنقید کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے ——— "اس لئے یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اب تک اُردو ادب میں صرف ایک ہی نقاد پیدا ہوا ہے اور وہ نیاز صاحب ہیں۔" اس میں بیجا مُبالغہ پایا جاتا ہے جس کی تائید کوئی صاحبِ فکر اور اہلِ شعور نہیں کر سکتا! خاص طور سے شبلی نعمانی کو شعر کی جیسی پرکھ تھی اور انھوں نے شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر میں شاعری پر جو نقد و محاکمہ کیا ہے، ایسی شگفتہ نگاری، شاعرانہ بصیرت، ژرف نگاہی، باریک بینی اور نزاکت آفرینی نیاز فتحپوری کو کہاں نصیب ہے! ڈاکٹر عبد القیوم نے نیاز صاحب کے بارے میں جو یہ فرمایا ہے کہ ——— "غرض نیاز کو خواہ ہم بڑا نقاد نہ مانیں، لیکن اُن کو نظر انداز نہیں کر سکتے"۔ (نیاز نمبر حصہ اول صفحہ ۲۲۴) فنِ نقد و نظر میں نیاز کی یہی حیثیت ہے کہ بہ حیثیت نقاد اُن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا!

نیاز صاحب کے نام کے ساتھ بعض مضمون نگاروں نے "مولانا" اور "علامہ" بھی لکھا ہے، نیاز صاحب کو صرف عربی دانی کی وجہ سے مولانا نہیں کہا جا سکتا کہ مولانا کے لئے مذہب کی پابندی کے جو آداب، مظاہر اور رسوم ضروری اور لازمی ہیں اُن کو نیاز صاحب مدت ہوئی خیرباد کہہ چکے ہیں اور "علامہ" کا لقب و خطاب جس درجہ کی علمی قابلیت رکھنے والے اصحاب کو زیب دیتا ہے، اُس درجہ کی علمی قابلیت نیاز صاحب نہیں رکھتے ہرگز نہیں رکھتے اس لئے وہ "مولانا" ہیں اور نہ "علامہ" ہیں! اب رہیں لوگوں کی مبالغہ آمیزیاں اور خطاب نوازیاں تو راقم الحروف کو مضمون نگاری کے آغاز ہی کے زمانے سے لوگ "مولانا"

لکھ رہے ہیں اور " فاران " کی اشاعت کے بعد تو بعض خطوں میں خاکسار کو " علامہ " لکھا ہوا آتا ہے ' مگر لوگوں کی خطاب و نسبت کے معاملہ میں اس غلط بخشی نے مجھے اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں کیا کہ لوگوں کے لکھ دینے کے سبب میں " علامہ " بن گیا ! " علامہ " کا لقب تو شبلی نعمانی ، سید سلیمان ندوی ، شبیر احمد عثمانی اور اقبال جیسے بلند پایہ اہلِ علم کو زیب دیتا ہے اور نیاز فتحپوری اس صف کے آدمی ہرگز نہیں ہیں ۔

نیاز صاحب کوئی شک نہیں اچھے افسانہ نگار ہیں اور " رومان " کے تو وہ بادشاہ ہیں مگر ڈاکٹر محمد حسن نے نیاز کے افسانوں کے بارے میں یہ رائے بھی دی ہے : ۔

" جہاں تک نیاز کے افسانوں کے پلاٹ اور کردار نگاری کا تعلق ہے ، ان کو بھی معیاری نہیں کہا جا سکتا ، ایک نقاد نے مختصر اُردو افسانہ نگاری کا بانی پریم چند اور یلدرم اور اُس کے بعد نیاز کو بتایا ہے ، پریم چند کی روایت قیاس سے ہوتی ہوئی آگے بڑھی اُس نے جمالیات پر زور دیا اور زبان کی آراستگی بیان کی شعریت اور فلسفیانہ آہنگ کو اختیار کیا ، نیاز کے افسانوں اور مضامین کو جمالیاتی تجربوں کی حیثیت دینا چاہیئے ان میں نہ واقعہ پوری طرح مربوط اور مرتب ہوتا ہے ' نہ کردار جیتے جاگتے اور منفرد ہوتے ہیں نہ نقطۂ عروج کا واضح تصور ملتا ہے ' مگر اُن میں ایک مضطرب اور متجسس ذہن ضرور ملتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " (حصہ دوم ـــــ صفحہ ۳)

کوئی شک نہیں نیاز فتحپوری بلند پایہ انشا پرداز ہیں اُن کی تحریروں میں بڑی دل کشی ' روانی اور جامعیت ہوتی ہے مگر وہ " صاحبِ طرز " ادیب نہیں ہیں ' اپنی مضمون نگاری کے آغاز میں وہ مولانا ابوالکلام آزاد کی انشا پردازی سے متاثر ہوئے اور انھوں نے اپنی تحریروں میں عربی اور فارسی کی ادق اور بوجھل ترکیبیں استعمال کیں ۔ ۔ ۔ مثلاً استبعادِ حقیقی ، لاعبانہ انداز ، مستغرق کلفت ، پاسخ گذا ، انفکاکِ خصوصیت ، انجذابِ مضطر ، حوصلات ۔ ۔ ۔ ۔ !

محمد خورشید عاصم صاحب نے نیاز کے اسلوبِ نگارش کی تعریف کرتے ہوئے اس واقعیت کا بھی اظہار کیا ہے : ۔

" نیاز کی عبارت میں خامیاں بھی ہیں ' وہ بعض اوقات عربی فارسی کے موٹے موٹے الفاظ کا استعمال شروع کر دیتے ہیں ' جس سے ایک تو عبارت میں ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے ' دوسرے عبارت عوام کی سمجھ سے بالاتر ہو جاتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مثلاً : ۔

- ـــــ " دُنیائے شاعری مشکل سے ایسے ایجازِ سدید ' بیانِ جزیل اور عباراتِ بلیغ کی مثال پیش کر سکتی ہے " ۔
- ـــــ " میرے کوائف سے استبعادِ حقیقی ہے " ۔
- ـــــ " جسارتِ مستمرہ اور سلاستِ مقالی عود کر آئی " ۔

ہم نے ابھی ابھی اُوپر لکھا تھا کہ الہلال کے دورِ آغاز میں مولانا ابوالکلام آزاد جو عربی آمیز زبان لکھتے تھے اُس سے نیاز متاثر ہوئے اور ساتھ ہی سجاد حیدر یلدرم کے افسانوی طرزِ نگارش کا بھی اثر قبول کیا ، سجاد حیدر کے افسانوں میں " احساسات " اور " انجذابات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " جیسے الفاظ اور ترکیبیں ملتی ہیں ' پھر تدریجاً نیاز صاحب کا اسلوبِ نگارش سہل اور سلیس ہوتا

گیا، یہاں ایک بات کہنے کو جی چاہتا ہے ——— یہ کہ علامہ شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد اور نیاز فتحپوری دونوں سے بہت زیادہ عربی جانتے تھے مگر اُن کی تحریروں میں شروع ہی سے سادگی، سلاست اور بے تکلفی پائی جاتی ہے!

"نیاز نمبر" کے لکھنے والوں سے طوبے زبان کی غلطیاں بھی ہوتی ہیں مثلاً:-

"وہ پہلی شخصیتوں لے جن میں نیاز صاحب کی ہستی ممتاز ہے میرے ذوق میں آگ جلادی تھی"۔ (کوثر چاندپوری ص۱۱۳ حصہ اول)

یوں کہنا چاہیے تھا "میرے ذوق کو جلا بخش تھی" ——— "ذوق میں آگ جلا دینا" مضحکہ آمیز اندازِ بیان ہے!

"ان لوگوں کے اکتسابات کے زندہ عناصر آج کی نئی نسل کی رُوح میں کام کر رہے ہیں"۔ (ل، احمد ص۱۰۴ - حصہ اول)

اس عبارت میں کس درجہ تکلف اور آورد پائی جاتی ہے، پھر "رُوح میں کام کر رہے ہیں" یہ روزمرہ کے خلاف ہے! انہی ل، احمد صاحب کا ایک جملہ یہ بھی ہے ———

"موضوع کی خشکی یا تلخی کو اسلوبی کیفیتوں میں اس طرح لپیٹ لینا کہ محسوس نہ ہونے پائے"۔ (ص۱۰۴)

اس قسم کی عبارتوں کو پڑھ کر وجدان کس قدر وحشت محسوس کرتا ہے۔

"نیاز کے افسانوں کی ابتدائیں ہمیشہ بہت تصور زا ہوتی ہیں"۔ (وقار عظیم، ص۲۳۷ حصہ اول)

"ابتدا" کی جمع "ابتدائیں" ہی اول تو کھٹکتی پھر اُن کا "تصور زا" ہونا اس پر مستزاد! حیرت ہے کہ اس قدر معروف نقاد اور مشاق انشا پرداز بعض اوقات بات سلیقہ کے ساتھ نہیں کہتے۔

"نیاز کی تحریر کا ایک بڑا گر یہ ہے کہ وہ الفاظ کے صحیح استعمال پر قادر ہیں" (پروفیسر ارشد کاکوی ص۲۵۳ حصہ اول)

"گر" کا یہاں استعمال بہت کچھ محلِ غور ہے۔

"محشر عابدی نے نیاز صاحب کو عزیز ہوٹل میں جو وہاں کا ممتاز ترین ہوٹل تھا عصرانہ پر مدعو کیا"۔ (ارشد تھانوی، ص۵۱، حصہ دوم)

اُس زمانہ میں بلدہ حیدرآباد کا ممتاز ترین اور سب سے اُونچے درجہ کا ہوٹل "ویکاجی" تھا، عزیز کمپنی کی شہرت تو اُسکے خستہ بسکٹوں کے سبب تھی اور وہاں پانچ آنہ میں لبالب پلیٹ بھر کر آئسکریم ملتی تھی۔

نیاز نمبر کے دوسرے حصہ میں جناب نیاز پر فضا ابن فیضی کی ایک طویل نظم ہے جو تکلف و آورد اور لفظوں کے غلط استعمال کا بُرا نمونہ ہے! نظم کا آغاز یوں ہوتا ہے ———

تیرے نفس کی تازہ وشی نے چمن چمن — طبعِ گل و مذاقِ صبا کو بدل دیا
موزوں ہے تیرے قد پہ بہاروں کا پیرہن — جس موڑ پر رُکی تری چشمِ شگفتہ کار
فن کی حسین قدروں نے پایا نیا نکھار — تو نے غزل کدوں کی فضا کو بدل دیا

"نفس کی تازہ وشی" کیا ہوتی ہے، پھر "قمروش" اور "ماہ وش" تو صفت کے طور پر بولتے ہیں مگر "تازہ وش" یا "جدید وش" یا "نو وش" کوئی نہیں بولتا ——— "چشمِ شگفتہ کار" یہ کس قسم کی آنکھ ہے، پھر موڑ پر اُس کا رُکنا اور زیادہ مضحکہ خیز ہے! نیاز صاحب مدت ہوئی شاعری سے دست بردار ہو چکے انھوں نے "غزل کدوں" کی فضا کو کہاں اور کب بدل دیا!

پہلے کہاں تھا اتنا گل و لالہ کو شعور — اٹھلا رہا ہے انجمن سے تری فتنۂ بہار
اُف رے یہ فکر و فن کا مہکتا ہوا سرور — دامن ہی تیرے ہاتھ میں ابرِ بہار کا

گل والا کو آخر کس بات کا شعور نہ تھا ؟ پھر نیاز صاحب کی انجمن سے فتنۂ بہار کا اٹھنا اس سے زیادہ عجیب ہے ! "سرور" اور "مہکتا ہوا" یہ ترقی پسندوں کا کاواک انداز و اظہار ہے۔

لہجے میں تو نے جذب کیا ہے لبوں کا شہد — تو نے چھپا لیا ہے نظر میں بہار کو
تیرے قلم نے چوس لیا ہے لبوں کا شہد — تحریر کی یہ تازہ وشی یہ شگفتہ پن"

ایک ہی بند میں دو جگہ "لبوں کا شہد" آنا قبیح تکرار ہے، پھر نیاز صاحب کے قلم نے آخر کس کے لبوں کا شہد چوس لیا ہے، یہ کیا کرجوا لم غلم خیال ذہن میں آیا اُسے جھٹ سے نظم کر دیا! کسی شاعر اور ادیب کے قلم کے لئے یہ کہنا کہ اُس نے لبوں کا شہد چوس لیا ہے، یہ انداز بیان اور خیال دونوں غیر شاعرانہ ہیں !

لرزاں ہے شخصیت سے تری سرسے تا قدم — اک موج رنگ فلسفیانہ شعور کی

یہ شاعری نہیں شاعری کا منہ چڑانا اور زبان و ادب کی مٹی پلید کرنا ہے۔

یہ پیرتو بہار و فروغ مہ تمام — تیرے خم سحر سے ترادش ہے نور کی

"خم زلف" تو سُنا تھا، اس نظم کو پڑھ کر پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ "سحر" بھی "خم" رکھتی ہے !

پوری نظم کا یہی رنگ ہے، یہ نظم "نیاز نمبر" میں بار پانے کے قابل نہ تھی۔ اس قسم کی مدح سے خود ممدوح کی شخصیت پر حرف آتا ہے۔

نیاز صاحب کی تحریروں میں بھی بعض مقامات پر سہو و تسامح نظر آیا ———

"لیکن ان حضرات کی سرکہ پیشانی اس وقت بھی دور نہ ہوئی تھی" (ص۳۲ حصہ اول)

"سرکہ جبینی" لکھنا تھا ——— "یوسف کو تو عزیز مصر کا خزانہ حاصل کر کے اپنی پیغمبری کے کاروبار کو فروغ دینا تھا" (ص۹۹)

یہ گستاخانہ تلمیح ہے، اللہ کے رسول اور نبی نبوت و پیغمبری کا فریضہ کاروبار کی طرح انجام نہیں دیا کرتے اور وہ اپنے رب اور معبود کے سوا اور کسی سے اپنے کام کا اجر نہیں چاہتے۔

"شبستان ناز کے پُرلطف دقیقہ ہائے برق کسی آرمیدہ مژگاں کی آغوش میں تھک کر سو گئے ہیں" (ص۱۰ حصہ اول)

یہ "دقیقہ ہائے برق" کیا بات ہوئی، شاید اس سے برقِ نگاہ مراد ہو مگر یہ انداز بیان کس قدر ژولیدہ ہے ! پورا جملہ آورد اور تکلف کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

"وہ آنکھیں جن کی گہرائی میں سمندر کا عمق ڈوب سکتا ہے" (ص۱۴۹) ایک حسین رقاصہ کی آنکھوں کی یہ تعریف ہو رہی ہے کہ وہ اتنی گہری ہیں کہ ان میں سمندر ڈوب سکتا ہے ! آنکھوں کی اور یہ تعریف ! توبہ ! کیا ذوقِ لطیف اس کو گوارا کر سکتا ہے، آنکھوں کا سمندر سے زیادہ چوڑا اور گہرا ہونا، تعریف ہوئی یا ذم ! خان رشید صاحب نے نیاز صاحب کے بارے میں فرمایا ہے، جسے ہم اوپر نقل کر آئے ہیں کہ :-

"جمالیاتی احساس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ان کا کوئی حریف نہیں"۔

مگر نیاز صاحب کا یہ مشاہدہ جمالیاتی احساس اور اظہار و بیان تو ایک گاؤں والے کے اس خیال کی تصویر پیش کرتا ہے، جس نے محبوب کے زلف و رخ کو دیکھ کر کہا تھا ———

جُلیبو[1] اس کے چہرے پہ بل کھا رہی ہے — کھڑی نانند میں بھینس کھل کھا رہی ہے

[1] زلف

"وہ نصف سر پر تہ چھا آنچل رکھ کر ایک خاص انداز سے اپنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی کی
نوک ٹھوڑی پر رکھ کر کھڑا ہو جانا ، جو ساری دُنیا میں تیری حکومت کرا سکتا ہے (ص۱۹۹)

جملہ کے آخری لفظوں میں کتنی ناپختگی پائی جاتی ہے !

"رقیہ ایک دولت مند خاندان کی ناز پروردہ لڑکی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاعرانہ کیف کی بہوت وارفتگیوں سے مزہ لینے والی یُوں ہی اپنے مست و مخمور قدموں سے آمادہ ہلاکت تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" (ص۲۰۷) "شاعرانہ کیف کی بہوت وارفتگیاں" کس بلا کا نام ہے ؟ اگر "قدموں" کتابت کی غلطی نہیں ہے تو "مخمور آنکھوں" کی طرح قدموں کو "مخمور" کہنا زبان و ادب کی لطافت کو مجروح کرنا ہے ، "پھر اپنے ہی مخمور قدموں سے آمادہ ہلاکت تھی" یہ پورا جملہ مہمل ہے ۔

"میرے نزدیک جب جنسی نام ہے ایک فطری کہربائیت کا جو ایجابی و سلبی کیفیات کے
ساتھ مرد و عورت میں پیدا ہوتی ہے اور یہ فطری کہربائیت سیالات عصبیہ میں سے ایک
سیّال شے ہے ، مثل ہوا کے جو مرد یا عورت کی ہستی سے پیدا ہو کر مقابل کو متاثر کرتی
ہے ۔" (ص۲۸۰)

ہم نیاز صاحب کی تحریر کے اس اقتباس پر کسی تبصرے کے بغیر اُن کی عبارت میں ارتجالاً انہی کے رنگ میں اضافہ کرنے اور اُن کی لے میں لے ملانے کی جرأت کرتے ہیں : ۔

"اور یہ سیالات عصبیہ جب جامد ہو جاتے ہیں تو کائنات کی کہربائی اور مقناطیسی قوتیں
حرکت کرتے کرتے ٹھہر جاتی ہیں ، یہ جمود قبض ہے کائنات کا ! یہ قبض بسط سے اسی
وقت بدل سکتا ہے جب سیالات عصبیہ میں روانی پیدا ہو جائے ! عورت کہربا کا
ارتعاش اور مقناطیس کی کشش ہے ۔ اس ارتعاش میں انجذاب ہے مگر انقسام
نہیں ہے ، یہ ارتعاش تفصیل و تجزی کو قبول نہیں کرتا ، یہ وہ بے چینی ہے جو سکونِ
دوام کا حاصل اور نشاطِ غیر فانی کا وہ نچوڑ ہے کہ ساری دُنیا کے تاکستانوں کا افشردہ بھی
اس نچوڑ کا جواب پیش نہیں کر سکتا ۔۔۔۔۔" وقِس جرّاً !

جناب نیاز فتحپوری کی تحریر کا ایک اور اقتباس : ۔۔۔۔

"اپنی آنکھوں کی وہ شراب جو ابھی ابھی تیری لانبی سیاہ پلکوں کی آغوش میں سو رہی تھی
اور اب صبح کے وقت تیری بادہ خواروں آنکھوں کے چاروں طرف پھیلے ہوئے سرمہ کی
صورت میں چھلک پڑی ہے مجھے نہ پلا ، ہر چند میری رُوح تیری نگاہوں کے ہلکے
ہلکے جرعوں کے لئے تشنہ ہے مگر یہ تشنگی ہی رہے گی ، کیونکہ انہیں ہر شخص چکھ سکتا ہے
اور میں اس لذت کو صرف اپنے لئے مخصوص کرنا چاہتا ہوں ، اپنی جوانی کا جو وہ نشہ
تیرے بستر کی شکنوں پر ہر شخص کو میسّر آسکتا ہے مجھ پر نہ ڈال ۔ ۔ ۔ "

آنکھوں کی مستی کو شراب سے استعارہ کرنے کے بعد ضروری تھا کہ اس شراب کے صفات و لوازم بیان کئے جاتے ! لیکن نیاز صاحب نے شراب کو سیاہ پلکوں کی آغوش میں سُلا دیا خوب ! شراب سویا اور جاگا بھی کرتی ہے پھر اس شراب کو سُرمہ بنا کر

چھلکانا اس سے بھی عجیب ہے، آنکھوں کی مستی کو شراب کہا گیا ہے لیکن سرمہ کی صورت میں چھلکنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرمہ کو شراب سے استعارہ کیا گیا ہے ——— "نشہ کا ڈالنا" یہ کس دیس کی زبان ہے! نیاز فتحپوری کے پیش کئے ہوئے "ادبِ لطیف" کا اگر جائزہ لیا جائے تو اُن کی تحریروں میں الفاظ کے بے محل استعمال اور رذلیلی بیان کے بہت سے نمونے مل سکتے ہیں۔

نیاز آغازِ جوانی میں شاعری کرتے تھے اُن کی قومی نظمیں الہلال میں چھپتی تھیں شعر گوئی کی مشق کو جاری رکھتے تو اُن کا شمار اچھے شاعروں میں ہوتا مگر نہ جانے اُن پر کیا بپتا پڑی اور کیا حالات پیش آئے کہ اُردو شاعری چھوڑ کر فارسی میں شعر کہنے لگے اور پھر فارسی میں شعر کہنا بھی ترک کر دیا! برسوں کے بعد اس باسی کڑھی میں پھر اُبال آیا سنہ ۱۹۶۱ء میں انھوں نے چند غزلیں کہیں، جن کے یہ شعر کتنے دل کش اور لطف انگیز ہیں ———

صرف اک لرزش ہے نوکِ خار پر شبنم کی بوند　　　پھر بھی اس فرصت پہ اس کی مجھ کو رشک آجائے ہے

ہم سُنانے کو سُنا دیں داستانِ غم مگر　　　کس سے ان بھیگی ہوئی پلکوں کو دیکھا جائے ہے

خود زمانہ رُخ ہمارا دیکھتا ہے، ہم نہیں　　　جس طرف مڑتے ہیں ہم، دھارا بھی مڑتا جائے ہے

ہم کہاں ڈوبے تھے یہ کل پوچھے گا آج تو　　　کچھ تلاطم سا ابھی موجوں میں پایا جائے ہے

چشم تر ہے، اُس طرف اور اس طرف ابر بہار　　　دیکھنا ہے آج کس سے کتنا رویا جائے ہے

اب وہ کیا آئیں گے تم بھی آنکھ جھپکا لو نیاز
صبح کا تارہ بھی اب تو جھلملاتا جائے ہے

نیاز صاحب کی متعدد نظمیں اس خاص نمبر میں پیش کی گئی ہیں، ایک نظم ہے "شہر آشوب" جس کے دوسرے بند کا آخری شعر ہے ؎

رنگِ خوں آنکھ سے ٹپکا ذرا گہرا ہو کر　　　اشک دامن میں جو آئے تو کلیجہ ہو کر

نظم طباطبائی کی غزل کا خاصہ مشہور شعر ہمیں اس بیت کو پڑھ کر یاد آگیا۔

رنگِ خوں اشک میں گہرا نظر آتا ہے مجھے
آج دامن پہ کلیجا نظر آتا ہے مجھے

تیسرے بند کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :- ؎

آج عریاں ہے جو تھا سینۂ داغی مستور　　　یارب اس باغ کی نکہت سے جہاں ہو معمور

سینۂ داغدار کو "سینۂ داغی" کہنا انتخابِ الفاظ میں اچھے ذوق کی دلیل نہیں ہے! پھر "پنہاں" کی جگہ "مستور" بھی کھٹکتا ہے، جو قافیہ کی مجبوری کے سبب لایا گیا ہے! سینۂ داغدار کو باغ تو کہہ سکتے ہیں مگر اُس کی "نکہت" توبہ! داغوں اور زخموں کی "بو" سے دُنیا معمور ہو کر کتنی بدبودار بن جائے گی!

ہوئے برہان کے طالب درِ ایقاں بھُولے　　　شیوۂ زندگی بوذر و سلماں بھُولے　　　(ص ۱۴۲ حصہ دوم)

"درِ ایقاں" بھُولے یہ کیا ترکیب ہے!

وہ جلالت تھی، وہ ہیبت تھی شتربانوں کی　　　جھک گئیں گردنیں بغداد کے رہبانوں کی　　　(ص ۱۴۳)

"بغداد کے سلطانوں" کہنا تھا "بغداد کے رہبانوں" کی تلمیح سمجھ میں نہیں آئی! رہبانوں کی گردنوں کا جھک جانا کوئی قابلِ ذکر بات بھی نہیں ہے کہ بے چارے رہبانوں کے پاس طاقت اور اختیار نہیں ہوتا۔

کیوں بھلا بیٹھا تو دیرینہ نشیمن اپنا   ہم کو ویسا ہی سمجھ کشتۂ چتون اپنا (ص ۱۷۸)

"چتون" ہندی لفظ ہے، فارسی لفظ کے ساتھ اس کو اضافت نہیں دی جا سکتی۔

منظم "صدا بہ صحرا" کا ایک شعر ہے ؎

ہاں تجھے تڑپا رہی ہے ولولہ زائی مری   اضطرابِ دل ہے خوئے ناشکیبائی مری (ص ۱۸۰)

نوشقوں کا سا اندازِ بیان!

ملک کا ہر فرد وقفِ درسِ جست و خیز ہو   رہبرانِ قوم کا نوحہ بھی درد انگیز ہے (ص ۱۸۱)

"درسِ جست و خیز" کتنی نامانوس اور غریب ترکیب ہے!

دیکھ لیتا ہے مگر وہ کون کس کا اہل ہے   کوئی خوش ہو یا خفا اس کو تو کرنا عدل ہے (ص ۱۸۲)

"اہل" کا قافیہ اور "عدل" ——— یا للعجب!

سونے والو! اب خیالِ قربِ منزل چھوڑ دو   یا کرو اک عزمِ محکم خوابِ غافل چھوڑ دو (ص ۱۸۴)

"بچکانہ اندازِ بیان! مصرعہ ثانی میں "اک" نے شعر کی رہی سہی آبرو بھی خاک میں ملا دی!

کامرانی ہے رہینِ اضطرارِ سعی گرم   اضطرارِ سعیہائے گرم کی منزل ہے تو (نغم - ص ۱۸۵)

یہ شاعری نہیں "ماتری" ہے "اضطرارِ سعیہائے گرم" کو پڑھ کر وجدان نے شدید اذیت محسوس کی۔

"تاج محل" پر اک نظم کہی ہے، نیاز صاحب فرماتے ہیں:۔

پاؤں میں سیر سے تجھے دیکھا تو لغزش آ گئی   نیند سی آنے لگی مستی سی سر میں چھا گئی (ص ۱۸۷)

یہ بیجا مبالغہ ہے، تاج محل کو دیکھ کر اس قدر مستی کا طاری ہو جانا کہ پاؤں لڑکھڑانے لگیں خلافِ واقعہ ہے! "سی سر میں" صوتی تنافر پایا جاتا ہے!

دُور ہی سے ہو مرا شاہ شہاں مجرا قبول   ہو نیازِ خستہ کا یہ ہدیۂ رُسوا قبول

"ہدیۂ رُسوا" کیا ہوتا ہے، "مجرا" کے لئے کوئی قافیہ لانا تھا، رُسوا ذہن میں آیا اُسے نظم فرما دیا۔

یہ جھکی ہوئی نگہ ہے کہ مزارِ ناتوانی   یہ خموشیاں ہیں اس کی کہ زبانِ بے زبانی (ص ۱۹۲)

محبوب کی جھکی ہوئی نگاہ کو "مزارِ ناتوانی" کہنا فنِ تمثیل و استعارہ ہی کی نہیں، خودِ "حسن" کی بھی توہین ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ تو صرف ایک نزہت ہے رقیق   اک لطافت ہے بسیط اور اک لطف و رافت ہے رقیق (ص ۱۹۵)

"ساحلِ چمن پر ایک صبح" کا یہ ایک شعر ہے، جس کی ردیف "رقیق" ہی شاعر کے ذوق کی اعجوبگی کی دلیل ہے پھر صبح کو "نزہتِ رقیق" اور "لطف و رافتِ عمیق" کہنا اس پر مستزاد!

حسن سنجیدہ ہے اس کا یا سراپا دلربیت   چال ہے یا ہے خرام پیکرِ معصومیت (ص ۱۹۶)

اس "سراپا دلربیت" کا بھی بھلا کوئی جواب ہے!

یاں ہر ہر خلش جنوں کدۂ اضطرارِ دل   واں ہر نگہ کرشمۂ بے اختیارِ دوست (ص ۲۰۰)

"اضطرابِ دل کا جنوں کدہ" ـــــــ یہ کیا اندازِ بیان ہے! توبہ!

سید ابوالخیر کشفی "نیاز نمبر" حصہ دوم میں لکھتے ہیں :-

"سنہ ۱۹۳۲ء کا سالنامہ "شہوانیات" سے متعلق تھا، یہ سالنامہ تمام تر نیاز صاحب کا لکھا ہوا تھا، اس کو ترغیباتِ جنسی کہہ لیجئے، یہ بات افسوسناک ہے کہ نیاز نے ہیولاک ایلس کا کہیں ذکر نہیں کیا، جس کے یہاں سے انھوں نے پورا مواد حاصل کیا" (ص ۶۶)

اس کے بعد ماہنامہ "مہر نیمروز" کراچی (اکتوبر سنہ ۵۸ء) کا یہ اقتباس پڑھیئے :-

"انتقادیات نیاز حضرت نیاز فتحپوری کی بڑے معرکہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے' یہ کتاب دو حصوں میں ہے' انتقادیات کے دوسرے حصہ میں ایک مضمون ہے "ادبیات اور اصول نقد" (ص ۲۵۶ تا ۲۸۷)

"اس مضمون کے دو حصے ہیں "ادبیات" اور "اصولِ نقد" پہلا حصہ کل گیارہ صفحات پر محیط ہے۔ پہلا حصہ ہڈسن (HUDSON) کی مذکورہ بالا کتاب

AN INTRODUCTION TO THE STUDY OF LITERATURE

سے تمام تر اڑایا گیا ہے اور غریب مصنف کا نام صرف صفحہ ۲۶۷ پر ایک جگہ برسبیل تذکرہ آگیا ہے نیاز صاحب نے اُس کے ٹکڑے اِدھر اُدھر چسپاں کر کے اپنا کام چلایا ہے، دوسرے مغربی نقادوں کے جو حوالے نیاز صاحب نے دیئے ہیں وہ بھی ہڈسن کے یہاں سے لئے گئے ہیں اور براہِ راست مطالعہ کا نتیجہ نہیں' ان حوالوں کی ترتیب اور پیش کش سے بھانڈا پھوٹ جاتا ہے' "رئیس التحریر" کا سلیقہ بھی "ادبی چوری" کے چہرے پر نقاب نہ بن سکا ـــــــ مہر نیمروز کے اس دبلے پتلے نمبر میں اتنی گنجائش نہیں کہ زیادہ حوالے دیئے جا سکیں' بہر حال چند حوالے پیش کئے جاتے ہیں انہیں پھولوں سے "گلستاں" کا قیاس کیجئے :-

ایک قابلِ قدر کتاب براہِ راست زندگی سے پیدا ہوتی ہے تو ظاہر ہے کہ اُس کے مطالعہ سے زندگی کے ساتھ ہمارے تعلقات بھی بہت گہرے ہو جائیں گے (انتقادیات ص ۲۷)

A Great book grows directly out of life, in reading it we are in to .... close and fresh relation with life (Page 10)

چارلس لیمب نے ادبیات کو اس قدر محدود کر دیا ہے کہ اس میں ہیوم اور گبن کی تصانیف بھی داخل نہیں ہو سکتیں' برخلاف اس کے ہلم نے ادبیات میں قانون، مذہبیات، طب، سبھی شامل کر لیا ہے (انتقادیات ص ۲۲۶)

Shall we follow Charles Lamb, who narrowed the conception of literature to such an extent that he excluded the works of Hume, Gibbon together with Directors ... Shall we adopt the view of Hallam, who under the general head of literature comprised jurisprudence, Theology and medicine

"گیارہ صفحات میں علامہ نیاز فتحپوری نے "شوخیٔ قلم" کا جو مظاہرہ کیا ہے، اس کا
اندازہ مندرجہ بالا اقتباسات سے ہو سکتا ہے؟ آخر میں اقبال کے الفاظ میں ہم حضرت نیاز
سے صرف یہ کہیں گے۔

اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی ۔۔۔ کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

نیاز صاحب کی "اقتصادیات" کے ان اقتباسات کو "توارد" تو نہیں کہہ سکتے یہ ترجمہ ہے جسے حوالہ کے بغیر جان بوجھ کر گیا ہے تو "سرقہ" ہے اور اس معاملے میں نیاز صاحب خاصے "بہ کف چراغ دارد" واقع ہوئے ہیں۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ سے "سیر الصحابیات" شائع ہوئی، مولانا سعید انصاری مرحوم اس کے مولف تھے، اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد نیاز فتحپوری نے اپنی کتاب "صحابیات" میں اس کا چربہ اُتارا، علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے "سیر الانصار حصہ اول" (مولفہ جناب سعید انصاری مرحوم) کا جو دیباچہ لکھا، اس میں نیاز صاحب کی اس حرکت کی طرف لطیف اشارہ کیا، فرماتے ہیں۔

"اس سے پہلے سیر الصحابیات کی جو جلد شائع ہوئی تھی، ملک کے بعض مشہور اہل قلم نے
اس "لف و نشر مرتب" کو غیر مرتب کر کے اپنی طرف منسوب کر لیا ہے، اب اسی
سلسلہ کی ایک اور نئی جلد اُن کے سامنے پیش کی جاتی ہے
لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو"

سید صاحب مرحوم کی یہ عالی ظرفی ہے کہ اس دیباچہ میں قصداً اپنا نام نہیں لکھا! نیاز صاحب نے یقیناً اس دیباچہ کو پڑھا ہوگا مگر نیاز صاحب جیسے "علامہ قسم کے ادیبوں" کی پیشانی اس "پردہ کشائی" پر نمناک نہیں ہوا کرتی۔

اس کے ایک عرصہ بعد نیاز صاحب کی ایک اور کتاب "تاریخ الدولتین" چھپ کر منظر عام پر آئی تو علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے ایماء سے سید نجیب اشرف صاحب (مرتب و مقدمہ نگار رقعات عالمگیر) نے اس پر معارف (اگست سنہ ۱۹۲۴ء) میں نہایت تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا، اور ضمناً اس میں نیاز صاحب کی کتاب "صحابیات" کا بھی ذکر آ گیا کہ وہ دارالمصنفین کی "سیر الصحابیات" کا چربہ ہے، "تاریخ الدولتین" کے بارے میں سید نجیب اشرف صاحب نے لکھا کہ نیاز صاحب نے "تاریخ الدولتین" کو جو اپنی عظیم الشان علمی خدمت کے انداز میں اہل علم و تحقیق کے روبرو پیش کیا ہے وہ جرجی زیدان ایڈیٹر الہلال (مصر) کی عربی تاریخ "التمدن الاسلامی" کی چوتھی جلد کی تمام تر تلخیص ہے!

اس تبصرے کے جواب میں نیاز صاحب نے سید صاحب مرحوم کو ایک طویل خط بھیجا جسے سید صاحب نے اپنے فٹ نوٹ کے ساتھ معارف (مارچ سنہ ۱۹۲۵ء) میں شائع کیا، فٹ نوٹ میں سید صاحب نے لکھا ہے کہ ——

"صاحب نگار کے ایک دو مضمون میں تو سہو و غلطی کا امکان ہو سکتا ہے، اور ان کے لئے معذرت قبول کی جا سکتی ہے، مگر اُن کے نگارخانۂ خاص میں اس طرح کے معلوم نہیں کتنے مضامین ہیں، جو تمام تر دوسری کتابوں اور دوسروں کے مضامین اور خصوصاً انسائیکلو پیڈیا وغیرہ سے ماخوذ و منقول ہیں، اور جن کو نہایت دلیری و بے باکی کے ساتھ اپنا کہہ کر پیش کیا گیا ہے، بالکل یہی حال ان کی ان دونوں کتابوں صحابیات اور تاریخ الدولتین کا ہے کہ اول الذکر کا ایک ایک لفظ دارالمصنفین کی

سیر الصحابیات کی نقل ہے اور دوسری مصر کے مشہور عیسائی اہلِ قلم، ادیب اور صحافی جرجی زیدان کی عربی کتاب کی تلخیص یا ترجمہ ہے!

جنوری ۱۹۳۵ء میں ماہنامہ "نگار" کا خاص نمبر نکلا تھا، اس شمارۂ خاص میں ہندوستان کی مختلف مسلمان حکومتوں کی مفصل تاریخ بیان کی گئی تھی، اس نمبر کو پڑھ کر قاری کے ذہن پر یہی اثر مرتب ہوتا ہے کہ یہ تمام تر "صاحب نگار" ہی کی تحقیق و کاوش کا نتیجہ ہے مگر اس میں اصل ماخذ کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ نگار کا یہ شمارۂ خاص ہندوستان کی مشہور تاریخ الیٹ سے ماخوذ و منقول ہے۔

نیاز صاحب فتحپوری کی تمام تحریروں کا اگر دیدہ ریزی کے ساتھ جائزہ لیا جائے، تو اُن کی نہ جانے کتنی کتابیں اور مضامین ایسے نکلیں گے جو کسی دوسرے کی لکھی ہوئی کتاب کا یا تو چربہ ہوں گے، یا ترجمہ، یا پھر نقل و تلخیص ——— ان واقعات نے نیاز صاحب فتحپوری کی ادبی حیثیت کو خاصہ داغدار بنا دیا ہے، اس لئے تذکروں میں جہاں ان کی ادبی خدمات کا اعتراف ہوگا، وہاں اُن کی یہ حیثیت بھی ضرور بیان ہوگی اور ہونی چاہیئے! یہ ہے رئیس التحریر علامہ (؟) نیاز فتحپوری صاحب تصانیف کثیرہ کی ادبی زندگی کا ایک نمایاں مگر دھندلا رُخ!

بڑے سے بڑا عالم بھی اشیاء کے متعلقات اور چیزوں کی تاریخ وجود کے بارے میں بہت ہی کم بلکہ برائے نام علم رکھتا ہے، سب سے پہلے سوئی کس نے بنائی، دھاگا کب تیار ہوا؟ پاجامہ کا موجد کون تھا، قلم کس شخص کی ایجاد ہے؟ اسی طرح یہ کسے معلوم ہے اور پڑھا بھی ہو تو یاد کہاں رہتا ہے کہ سکندر اعظم کی ماں کا کیا نام تھا، اُس نے کس سنہ قبل مسیح میں ہندوستان پر حملہ کیا، شنتو مذہب کے کیا عقائد ہیں؟ تاج محل پر جو خطاطی کے اعلیٰ نمونے نظر آتے ہیں یہ کس خطاط کے موئے قلم کے بنائے ہوتے ہیں؟ اہرام مصر کتنے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں؟ بہائی مذہب کے بانی بہاء اللہ بہائی کی کتابوں کے کیا نام ہیں؟ ـ

جناب نیاز فتحپوری کے "نگار" میں جو بابُ المرسلات ہے، اُس میں مختلف علوم و فنون اور ایجادات پر سوالات اور اُن کے جوابات ملتے ہیں! بعض اہلِ علم کا شروع ہی سے یہ خیال رہا ہے کہ نیاز صاحب پہلے ایک کتاب پڑھتے ہیں اور پھر اس کتاب کے مواد و اطلاع سے متعلق ایک استفسار کسی فرضی نام سے نگار میں چھاپتے ہیں اور ساتھ ہی اُس کا جواب درج فرماتے ہیں! ان جوابات کو پڑھ کر لوگوں پر یہ اثر ہوتا ہے کہ نیاز صاحب علم و معلومات کا بحرِ بیکراں ہیں، شعر، ادب، تاریخ، فلسفہ، طب، سائنس، مذہب، معاشیات، سیاست غرض تمام علوم و فنون نیاز صاحب کو اس قدر مستحضر ہیں کہ ادھر استفسار آیا اور ادھر انھوں نے کھٹ سے معلومات آفریں جواب دے دیا۔ "نگار" کے "نیاز نمبر" (حصہ دوم) میں شاہد عشقی صاحب کا جو مضمون شائع ہوا ہے، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت سے اہلِ قلم اور لکھے پڑھے لوگ "بابُ المرسلات" کے بارے میں اسی تاثر اور مرعوبیت کا شکار ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ:-

> "بابُ الاستفسار میں موضوعِ بحث بننے والے موضوعات دُنیا کے تمام علوم و فنون کا احاطہ کئے ہوتے ہیں اور اتنے مختلف النوع علوم کا سرسری مطالعہ بھی ایک عمرِ خضر چاہتا ہے ـ ـ ـ ـ ـ بابُ الاستفسار ہمیشہ سے ایک عام قاری کے لئے انسائیکلوپیڈیا کا کام دیتا رہا ہے ـ ـ ـ"

بابُ المرسلات کے بارے میں جن اہلِ علم نے اپنے شبہ کا اظہار کیا ہے، وہ یہ نہیں کہتے کہ نگار میں کہیں باہر سے کوئی استفسار آیا ہی سرے سے نہیں آتا اور سب کے سب استفسارات دفترِ نگار ہی میں مرتب کئے جاتے ہیں، اُن کا کہنا یہ ہے کہ متعدد استفسارات سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ نگار نے خود مرتب فرمائے ہیں ـــــــ اس شبہ اور اندیشہ کو یہ ثبوت تقویت دیتا ہے کہ بابُ المرسلات میں "گھڑی سازی" کی تاریخ بھی ملتی ہے! کسی ادیب، شاعر اور افسانہ نگار سے کوئی شخص "گھڑی سازی" کے بارے میں سوال کر ہی نہیں سکتا، اور اگر کسی ادبی مجلہ کے ایڈیٹر، ادیب اور انشاپرداز کے پاس اس قسم کے استفسارات آنے لگیں کہ بتایا جائے کہ گھڑی کا موجد کون ہے؟ خوردبین کن اجزاء سے ترکیب پاتی ہے؟ ہوائی جہازوں کی زیادہ سے زیادہ رفتار پرواز کیا ہے؟ ہیرے کو کس دھات سے کاٹا جاتا ہے! ـــــــ تو ایسے استفسارات اس ادیب اور شاعر کو واپس کر دینے چاہئیں! بہرحال نرم سے نرم محتاط الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ "نگار" کے بابُ المرسلات کا معاملہ مُشتبہ ضرور ہے!

شعر فہمی کے معاملہ میں نیاز صاحب کے یہاں بڑی ژرف نگاہی اور بلندی کے ساتھ پستی بھی پائی جاتی ہے اور وہ بڑی اونچی بات بھی کہتے ہیں اور ساتھ ہی اس قسم کی تنقید بھی کر ڈالتے ہیں جو بالکل سطحی ہوتی ہے، اُن کی کتاب "مشکلاتِ غالب" پر ریویو "فاران" میں آچکا ہے اور نگار کے "جگر نمبر" میں نیاز صاحب نے جگر مراد آبادی کے شعروں پر جو اعتراضات وارد کئے ہیں، اُن کے جوابات بھی "فاران" کے علاوہ بعض دوسرے رسالوں میں چھپ چکے ہیں، جہاں تک شاعری پر تنقید کا تعلق ہے نیاز صاحب کی شعر فہمی پر پوری طرح اعتماد نہیں کیا جا سکتا!

نیاز صاحب نے بعض کتابوں کے ترجمے بھی کئے ہیں، وہ اچھے مترجم ہیں مگر ڈاکٹر سید علی بلگرامی، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، عنایت اللہ دہلوی اور ڈاکٹر عابد حسین وغیرہ صفِ اوّل کے مترجمین میں اُن کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔

"نیاز نمبر" کے سب سے زیادہ قابلِ اعتراض، لائقِ تردید اور پڑھنے والوں کے لئے گمراہ کن وہ مضامین اور نثر پارے ہیں، جن میں نیاز صاحب کی بے دینی اور الحاد کی تائید و توصیف کی گئی ہے، عشرت رحمانی صاحب لکھتے ہیں

> "جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ نیاز صاحب عقائد کے معاملہ میں نہایت پختہ، صاف باطن اور صاف گو ہیں، خواہ یہ تعلق خدا کا کیوں نہ ہو، اس کے ساتھ اُن کا کیش ترکِ رسوم ہے، اوہام کی بُت شکنی اُن کا شعار رہا، ہر باطل کے رد کے لئے وہ سدا اس شدت سے دلیر اور بیباک نظر آئے کہ کڑی سے کڑی نکتہ چینی اور بڑے سے بڑے خطروں کی کبھی پرواہ نہ کی، چنانچہ نگار کے استفسارات کے مباحث پڑھ کر بعض قارئین کو ان کے دینی عقائد سے اختلاف رہا، بعض نے انہیں ملحد اور منکر سمجھا، لیکن انھوں نے لوگوں کی غلط فہمی سے خائف ہو کر اپنی پختہ دینداری میں کبھی فرق نہیں آنے دیا، اور اس کٹر مردِ مومن نے بیجا نکتہ چینی سے ڈر کر کسی باطل کو حق کہنا گوارا نہ کیا" (صـ۲۸ ـــ حصہ اوّل)

اس غلط بینی، غلط اندیشی اور فکر و نظر کے افلاس کی کوئی حد و نہایت ہے کہ نیاز کے صریحی ملحدانہ خیالات کو "پختہ

دینداری" بتایا جارہا ہے اگر نیاز صاحب" مردِ مومن" ہیں تو پھر اس دُنیا میں آج تک کوئی ملحد اور بے دین پیدا ہی نہیں ہوا اور یورپ کے وہ سب مستشرقین مردِ مومن ہیں جنھوں نے دینِ اسلام کے بنیادی معتقدات اور دینی اقدار کا مذاق اُڑایا ہے! مضمون نگار کے بقول اگر نیاز صاحب کا باطل سے منہ موڑ کر حق پر جمے رہنا تو عشرت صاحب کے اس ممدوح بے خوف حق گو (؟) نے ایک زمانے میں "توبہ نامہ" لکھ کر چھپوایا تھا، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے' یہ توبہ نامہ نیاز صاحب کے تزلزل و تذبذب، بزدلی اور عہد شکنی کی جیتی جاگتی شہادت ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری کے مضمون کو پڑھ کر تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ وہ نیاز صاحب کے اس کھلے ہوئے ملحدانہ موقف تک کی تائید کرتے ہیں کہ قرآنِ کریم کے مطالب منزل من اللہ ہیں مگر الفاظ و کلمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے بیان کئے ہوئے ہیں! استغفر اللہ! اس عقیدہ اور تصوّر سے کروڑ بار اللہ کی پناہ! ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے مضمون میں قرآنِ کریم کی وہ چند آیات نقل کی ہیں' جن میں انفس و آفاق میں تعقل و تدبّر اور غور و فکر کرنے کی ہدایت کی گئی ہے' ان آیات کو پیش کر کے آخر ڈاکٹر صاحب کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ اور یہ آیتیں انھوں نے کس لئے درج کی ہیں؟ ایک شخص قرآن میں غور و تدبر کرنے کے بعد صوم و صلوٰۃ چھوڑ دیتا ہے' تو اُس کا یہ غور و تدبّر کیا تعریف کے قابل ہے؟ وہی شخص قرآن پڑھ کر قرآن کے پیش کئے ہوئے دوزخ و جنّت کا مذاق اڑاتا ہے یہ تعقل و فکر قابلِ ملامت اور لائق نفرت و بیزاری ہے یا مستحق مدح و ستائش ہے! قرآن میں غور و فکر کے بعد خود قرآن ہی کو جھٹلانا اور اس کا اعلان کرنا کہ قرآن الہامی نہیں ہے یہ فعل ضلالت و الحاد نہیں تو اور کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے انفس و آفاق اور قرآن میں غور و فکر کی جو ہدایت فرمائی ہے، اُس کی غرض یہ نہیں ہے کہ کوئی مفکر اور دانشور قرآنی افکار و عقائد ہی کی تردید کرنے لگے تو بعض حمقا اور سفہا اُس کی اس آزاد خیالی کو سراہیں کہ واہ! کیا نکتہ پیدا فرمایا ہے، کس جرأت کے ساتھ قدیم اوہام کی تردید کی ہے' کس قدر آزاد فکر اور کتنا دقیقہ رس مزاج پایا ہے؟

مسلمان علماء کے درمیان یہ مسئلہ کبھی مابہ النزاع نہیں رہا کہ قرآن کریم کے الفاظ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے ہیں اور مطلب و مفہوم الہامی ہے! بعض ملاحدہ نے البتہ یہ نکتہ آفرینی کی ہے! قرآنِ کریم کے معانی و الفاظ سبھی سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر القا، وحی اور نازل کئے گئے ہیں —— پوری اُمّتِ مسلمہ کا ہر دور میں یہ متفقہ عقیدہ رہا ہے!

جو کوئی قرآن کریم کے الفاظ کو "کلام رسول" کہتا ہے قطع نظر اس کے کہ یہ خیال ملحدانہ ہے وہ شخص عربی زبان و ادب کا بھی صحیح مذاق نہیں رکھتا! یہ صورت تو احادیث کی ہے کہ مفہوم الہامی ہے اور اُس الہامی مفہوم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لفظوں میں ادا فرمایا ہے' یہی سبب ہے کہ قرآنی آیات اور احادیثِ رسول میں زبان و ادب کے اسلوب کا بیّن فرق پایا جاتا ہے۔

قرآنِ کریم کا سیاق و سباق، زبان و ادب، اسلوب بیان، اندازِ خطاب، تبشیر و تنذیر کا طرز، سورتوں کی ترتیب، جملوں کی ساخت۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تمام خصوصیات اس کی دلیل ہیں کہ معانی، الفاظ، حروف اور حروف کا ایک ایک گوشہ الہامی ہے ؎ آرے! کلامِ حق بہ زبانِ محمدؐ است

جوانی میں نیاز صاحب کے چہرے پر ڈاڑھی تھی، وہ نماز بھی پابندی کے ساتھ پڑھتے تھے پھر اُن میں یہ تبدیلی

پیدا ہوئی کہ ڈاڑھی منڈا دی یہاں تک کہ صوم وصلوٰۃ سے بھی غافل ہو گئے! اور جب قلم ان کے ہاتھ میں آیا تو دین و شریعت کا مذاق اُڑانے لگے، یا بقول اُن کے مولویانہ عقائد کی تردید کرنے لگے، اُن کے عقائد میں سب سے پہلی تبدیلی جو رُونما ہوئی ہے اُس کا سبب نیاز صاحب نے یہ بتایا ہے کہ عربی مدارس میں اُن کو ایسی احادیث پڑھائی گئیں جن کو عقل دُرست و صحیح تسلیم نہیں کرتی تھی —— اور پھر: ——

"... مختصراً یوں سمجھئے کہ میرا تجربہ مولویوں کے باب میں تلخ سے تلخ تر ہوتا گیا اور میں نے سمجھ لیا کہ اس طبقہ کی طرف میں کبھی مائل نہیں ہو سکتا ... اس سلسلہ میں زیادہ تفصیل سے احتراز کرتا ہوں کیونکہ یہ بڑی طویل داستان ہے، مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، میں مولویوں کے بتائے ہوئے اسلام سے متنفر ہوتا گیا اور میرا یہ جذبہ نگارکے اجرا کے بعد اس حد تک شدید ہو گیا کہ آخر کار میں نے اس جماعت کے خلاف ایک محاذ قائم کر دیا، اور اُن کے عقائد اور اُن کے اخلاق پر نکتہ چینی شروع کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے مُلک کے مولوی میرے دُشمن ہو گئے"

اگر نیاز صاحب نے احادیث کے مشہور مجموعوں کو سبقاً سبقاً پڑھا ہے، تو وہ ایمانداری کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ کیا احادیث کی غالب تعداد عقلی اعتبار سے محلِ نزاع ہے! کیا بے شمار حدیثیں ایسی نہیں ہیں جو اخلاق، پاکیزگی، انسانی ہمدردی اور دینی اخوت کی تعلیم دیتی ہیں، کیا کتب احادیث کے اوراق پر حکمت و اخلاق کے بیش بہا موتی بکھرے ہوئے نہیں ہیں؟ اگر چند احادیث اُن کو عقل کے خلاف معلوم ہوتی تھیں اور اُن کی وہ کوئی توجیہ و تاویل نہ کر سکتے تھے تو اُن احادیث سے وہ صرفِ نظر فرما سکتے تھے، لعل وجواہر کے صندوقچے میں کچھ خزف ریزے بھی ملے ہوئے ہوں تو کیا کوئی عقلمند اور جوہر شناس اُن چند خزف ریزوں کی بنا پر تمام لعل وجواہر کو اُٹھا کر پھینک دے گا۔ کوئی صاحب عقل تو ایسی حماقت نہیں کر سکتا! اور نہ اُن چند خزف ریزوں کے سبب جوہریوں کے بارے میں یہ رائے قائم کی جائے گی کہ وہ سب کے سب ٹھیکرے اور کنکر پتھر ہی جمع کرتے رہے ہیں۔

ہم نے آج تک کسی نومسلم عیسائی، ہندو، یہودی اور زردشتی تک کے بارے میں یہ نہیں سنا کہ ایمان لانے کے بعد اُس نے احادیث کا مطالعہ کیا اور احادیث کو پڑھ کر وہ دین سے یا بقول نیاز مولوی کے بتائے ہوئے مذہب سے بیزار و متنفر ہو گیا، ہمارے سامنے زندہ مثال مشہور مغربی مصنف و عالم مسٹر محمد اسد لیو پولڈ کی ہے، اس خدا کے نیک بندے نے تو اسلام لانے کے بعد صحیح بخاری کا انگریزی میں ترجمہ کیا، اور احادیثِ نبوی ؐ کے مطالعہ نے اُس کے ایمان میں اور رسوخ و استحکام پیدا کر دیا۔

کسی شخص کے دل میں کجی ہو، اُس کی فطرت غیر صحیح ہو اور اُس کے دماغ میں بھس بھرا ہوا ہو تو قرآن کریم پڑھ کر بھی وہ دین سے بیزار ہو سکتا ہے کہ آدم کی تخلیق، شیطان، جن وملائکہ کا وجود، حضرت عیسیٰ مسیح کے معجزات، اصحاب کہف کا واقعہ، اصحاب فیل کا قصہ اور نبی کا یہ عمل کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور سے آنے کے بعد اپنے بھائی ہارون کی ڈاڑھی غضبناک ہو کر پکڑ لیتے ہیں، اور حضرت یوسف اپنے بھائی کو روکنے کی غرض سے اُن کے مال و اسباب کی خورجی میں پیالہ رکھوا دیتے ہیں ... اس قسم کے مقامات میں اُس شخص کو کمزوری اور عقل کے مخالف باتیں نظر آئیں، اور وہ قرآن کو پس پشت ڈال دے، تو کیا ایسے احمق و کودن اور

بدفطرت شخص کی مدح و ستائش کی جائے گی کہ کس قدر دانش وری اور تعقل و تدبر کا ثبوت دیا ہے اور کس حریتِ فکر سے کام لیا ہے ـــــــ نعوذ باللہ ! اور واقعہ یہ ہے کہ جن کے دلوں میں کجی ہو اور جو طلبِ حق نہ رکھتے ہوں، اُن کو قرآن کے مطالعہ سے بھی گمراہی میسر آتی ہے !

احادیثِ نبوی ؐ سے نیاز فتحپوری کو جو کد اور عداوت پیدا ہو گئی تھی، یہ لے یہاں تک بڑھی کہ صحابیٔ رسول ؐ تک کی دیانت و عزت کو اس شخص نے مجروح کر ڈالا، نیاز صاحب لکھتے ہیں :-

"ابوہریرہ ؓ کے اختراعات، ان کی تعداد اسرائیلیات سے کم نہیں بلکہ بے شمار ہے، اُن کا محبِ جاہ و دولت ہونا اور اسی نیت سے حدیث کا پیشہ اختیار کرنا، خلفاءِ وقت کا ہم پیالہ و ہم نوالہ اور نمکخوار ہونا، علم و دیانت و صداقت سے بے بہرہ ہونا ثابت و ظاہر ہے"
(نگار ماہ مارچ سنہ ۳۱ء)

اس کے بعد اس گستاخ اور دریدہ دہن نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی توہین کی :-

"حقیقتِ مسیح یہ ہے کہ شہر ناصرہ کے رہنے والے ایک شخص یوسف نجار کا بیٹا یسوع نامی بچپن ہی میں فرقہ ایسینی کے اندر داخل ہو گیا تھا، اُس فرقہ کے لوگوں سے یسوع نے ترکِ لذات، نفس کشی ـــــ سیکھا ـــــ چونکہ اُسے خود دولت سے نفرت تھی اس لئے وہ بعض اوقات دولت مندوں کے خلاف زہر بھی اُگلنے لگا تھا ـــــ ممکن ہے کہ اپنی نفس کشی اور زہد و تقویٰ کی بنا پر وہ خود کو خدا کا بیٹا بھی کہہ بیٹھا ہو ـــــ" (نگار مئی سنہ ۳۱ء)

کوئی مسلمان جس کے دل میں ایمان کی کوئی رمق بھی باقی رہ گئی ہو، کیا اللہ تعالیٰ کے نبی کا ذکر ان توہین آمیز رکیک الفاظ میں کر سکتا ہے، یہاں تک کہ پیغمبر معصوم سے شرک کو بھی منسوب کر دیا جاتے ـ

"توحید و رسالت" جو دین و ایمان اور اسلام کے ستون ہیں، اُن کے بارے میں نیاز صاحب کے خیالات یہ ہیں : ـــــ "ـــــ جس وقت تک مذہب کا مفہوم بجائے توحید و رسالت کے ـــــ

اخوتِ عامہ اور انسانیت پرستی نہیں ہو جاتا، نہ ہندوستان کبھی آزاد ہو سکتا ہے اور نہ حریت کی صحیح رُوح پیدا ہو سکتی ہے ـــــ وہ امن و سکون، جو آزادی کے بعد حاصل ہوتا ہے، اُس وقت تک میسر نہیں آسکتا، جب تک ہماری روحیں آزاد نہ ہوں ـــــ اور تفریقِ ملت امتیاز کفر و اسلام کا پردہ درمیان سے نہ ہٹ جائے اور یہ آسان نہیں جب تک مذہب مفقود نہ ہو جائے (نگار ـ مارچ سنہ ۲۹ء)

قرآنِ کریم میں جگہ جگہ کفر و اسلام کے امتیاز کو پیش کیا گیا ہے، کفر کی اور کافروں کی مذمت فرمائی گئی ہے اور اسلام و ایمان اور مُسلم و مومن کو سراہا گیا ہے، مگر نیاز صاحب مولوی کے مذہب سے بیزار ہو کر قرآنِ کریم میں فکر و تدبر کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ امتیاز کفر و اسلام امن و سکون کا دشمن اور آزادی کی راہ کا سنگِ گراں ہے !

اسلام ہی وہ دین ہے جس نے خدا کے رشتہ کو قومیت و وطنیت اور نسل و رنگ سے بالاتر سمجھا، اور اس پیغام کے اعلان فرمانے والے حضرت سیدنا محمد نبی الآخر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں مگر نیاز صاحب اسلام کے اس منشور پر اس طرح خطِ تنسیخ کھینچتے ہیں

"میرے نزدیک سب سے زیادہ مضرت رساں تحریک دُنیا میں وہ ہے جو قومیت و وطنیت کے رشتہ کو مذہب کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور بڑا ظالم تھا وہ جس نے اول اول اس بدعت کو رواج دیا۔"

یہ مولوی کے بتائے ہوئے مذہب کے خلاف اعلانِ جنگ ہے یا خدا اور رسول کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت اور دین کی بنیادی قدروں کا استخفاف ہے!

انبیاء کرام علیہم السلام کی شان میں گستاخی کا ایک اور نمونہ:۔

"بات یہ ہے کہ پیغمبر جتنے پیدا ہوئے سب مرد تھے، اسی لئے مرد کو حور و غلمان سب دیدیا، اگر کوئی عورت کبھی پیغمبر ہو جاتی تو آپ دیکھتے کہ عورتوں کے لئے جنت میں کیسے کیسے حسین و نوجوان مردوں کا انتظام ہوتا۔" (نگار، مئی سنہ ۳۱ء)

خدا کی بندگی کو نیاز صاحب "عذاب" سمجھتے ہیں، فرماتے ہیں:۔

"۔۔۔ سچ کہتے ہو (اے فرشتو!) واقعی تمہاری سخت توہین کی گئی کہ خاک کے پتلے کے سامنے جھکنے پر مجبور ہوگئے، اس لئے اگر تم لوگ مجھے مہلت دو تو میں خدا کی بندگی کے عذاب سے نجات دلانے کے لئے آمادہ ہوں، اور سچ پوچھو تو خدا تمہیں کو ہونا چاہیے تھا" (نگار، اکتوبر سنہ ۳۱ء)

اللہ تعالیٰ کی شان میں ایسی گستاخی بڑے سے بڑے ملحد نے بھی شاید ہی کی ہو!

دینی ارکان میں سب سے زیادہ ذکر قرآن پاک نے "الصلوٰۃ" (نماز) کا کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پانچ وقت کی فرض نمازوں کے علاوہ دوسرے اوقات میں بھی نماز پڑھتے تھے، قرآن پاک میں مسجد کی تعمیر کا ذکر ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی تھی اس دینی رکن کو نیاز فتحپوری "سب سے بڑا جنون" قرار دیتے ہیں، ماہ مئی سنہ ۳۱ء کے نگار میں وہ لکھتے ہیں:۔

"یوں تو جنون کی بہت سی قسمیں ہیں اور ہر جنون اپنی جگہ پر برا ہے، لیکن اللہ محفوظ رکھے اس جنون سے جو وہ اپنے متعلق نماز اور وظیفہ کی صورت میں انسان پر طاری کرے حقیقت یہ ہے کہ دُنیا میں سب سے بڑا عذاب انسان کے لئے یہ ہے کہ وہ ثواب آخرت کی امید میں اپنا سر کھپائے ۔۔۔۔"

اللہ تعالیٰ کے حضور کھلی ہوئی گستاخی انبیاء کرام اور صحابہ کی توہین، توحید و رسالت کا استخفاف، قرآن کریم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام بتانا، احادیث نبوی سے سخت قسم کی بیزاری اور نفرت، آخرت اور ثواب آخرت کا انکار، جنت و دوزخ کے وجود اور عقیدہ کی تضحیک، نماز کو "سب سے بڑا جنون" قرار دینا، ان عقائد و تصورات کے بعد کس فلسفہ، منطق، دلیل اور تاویل کی رُو سے کوئی شخص مسلمان رہ سکتا ہے، اس کھلے ہوئے کفر و الحاد کے ہوتے ہوئے جو کوئی نیاز فتحپوری کو پختہ "مرد مومن" کہتا ہے اور اس شخص کے کفریہ تصورات اور ملحدانہ عقائد کی تائید و تصویب کرتا ہے اس کا ٹھیک وہی موقف ہے جو نیاز کا ہے یہ کتنا بڑا ظلم اور کھلی ہوئی ناانصافی ہے کہ جو شخص دین کی بنیادی تعلیمات کا انکار کرے اور ان کا مذاق اُڑائے اُسے دین کا پختہ وفادار اور سچا ماننے والا کہا جائے، جو لوگ اسلام پر اعتقاد نہیں رکھتے انہیں کھل کر اپنے اس عقیدہ کا اعلان کر دینا چاہیے مگر یہ کتنی بڑی زیادتی اور کھلی ہوئی جہالت ہے کہ اسلام کی مخالفت ہی کو

"خدمتِ اسلام" اور "پختہ دین داری" کہا جا رہا ہے!

علمارکرام ان کفریات کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہ کرتے تو اور کیا کرتے۔ اس قسم کے ملحدانہ خیالات سے (جن کی کھلے بندوں اشاعت ہو رہی تھی) کیا صرفِ نظر کیا جا سکتا تھا اور گزر اور چشم پوشی اچھی چیز ہے مگر جب اسلام پر، خدا اور رسول پر، قرآن اور حدیث پر حملے ہو رہے ہوں اور نماز و آخرت کا مذاق اُڑایا جا رہا ہو، ایسے موقعہ پر چشم پوشی، درگزر اور سکوت کا موقف بزدلی، بے غیرتی اور ضلالت کا موقف ہے، علمار کرام نے نیاز فتحپوری کی ان خرافات اور کفریات پر احتجاج کر کے کسی زیادتی اور ناانصافی کا ارتکاب نہیں کیا، انھوں نے نیاز صاحب پر کوئی تہمت نہیں جوڑی، اُن کے خیالات کو توڑ مروڑ کر پیش نہیں کیا اور کوئی ایسی بات، تصور اور عقیدہ اُن سے منسوب نہیں کیا، جو نیاز صاحب کے سر منڈھ دیا گیا ہو! مسلمانوں کے اس ایجی ٹیشن کے بعد نیاز صاحب کی "جرأتِ حق گوئی" (؟) نے ہتھیار ڈال دیئے، انھوں نے اخبارات میں اپنا توبہ نامہ شائع کرایا، اس توبہ نامہ کا متن حسب ذیل ہے:-

"رسالہ نگار میں اس وقت تک اسلامی علوم و تعلیم شعائر مذہبی و اعمال اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ حضرات انبیاء کرام و اصحاب و اہل بیت رسالت دیگر بزرگان و ائمہ دین و علمار سلف کے متعلق جو مضامین میرے یا دیگر مقالہ نگاروں کی طرف سے شائع ہوتے ہیں، ان کو میں اپنے خیال میں اسلام کی خدمت سمجھتا تھا، لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرے یہ خیالات احترام اسلام و شریعت کے خلاف تھے، اس لیے میں اعلان کرتا ہوں کہ اب میں ان تمام امور سے باز آتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسے مقالات میری طرف سے کہیں شائع نہیں ہوں گے، جن سے اس قسم کی شکایت کا سبب پیدا ہوا، مجھے افسوس و ندامت ہے کہ ان مضامین سے مسلمانوں کو صدمہ پہونچا اور یہ یقین دلانے کے لئے کہ میں ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ سب کچھ لکھ رہا ہوں، اپنے معاصی سے جناب باری میں اظہار تبرا کرتا ہوں کہ

لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ ٥

مگر

نیاز صاحب اپنے اس عہد پر قائم نہ رہ سکے، اُنھوں نے دھڑلّے کے ساتھ توبہ شکنی کی اور اسلام کی مخالفت میں پہلے سے زیادہ شدید ہو گئے! اس شخص نے ماہ جون سنہ ۶۲ء کے نگار میں کھلم کھلا اپنے ارتداد کا اعلان کیا:-

"کلامِ مجید کو نہ میں کلامِ خدا سمجھتا ہوں نہ الہامِ ربّانی بلکہ ایک انسان کا کلام جانتا ہوں اور اس مسئلہ میں اس سے قبل کئی بار مفصل گفتگو کر چکا ہوں۔"

قرآن کریم کے بارے میں اس عقیدے کے اعلان کے بعد بھی کیا کوئی شخص مسلمان رہ سکتا ہے اس ترکش الحاد و ارتداد کے سب سے زیادہ زہریلے تیر یہ ہیں:-

"چونکہ میں رسول اللہ ؐ کو بڑے بلند اخلاق کا انسان سمجھتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ

> وہ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے تھے اس لئے قرآن میں واقعہ ابراہیم کا پایا جانا اس امر کی دلیل تو ضرور ہے کہ رسول اللہ نے جھوٹ نہیں بیان کیا، یعنی اپنی طرف سے گھڑ کے نہیں بیان کیا، لیکن اس کا اثر نفس واقعہ کی صحت یا عدم صحت پر بالکل نہیں پڑتا، کلام مجید میں اسرائیلیات کا حصہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا اور نہ اسے کلام مجید میں درج ہونے کی وجہ سے صحیح کہا جا سکتا ہے عہدِ نبوی میں اس قسم کی روایتیں توریت و انجیل کے حوالے سے لوگوں کو سمجھانے اور ڈرانے کے لئے یہود و نصاریٰ کی طرف سے عام طور پر بیان کی جاتی تھیں چونکہ توریت و انجیل کے الہامی ہونے کا غلط خیال پہلے ہی سے قائم تھا اس لئے رسول اللہ نے بھی ان کو محض اعتبار و بصیرت کے لئے بیان کر دیا اور اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ صحیح ہیں یا غلط" (نگار جون سنہ ۶۲ء)

ابوجہل بھی یہی کہتا تھا جو نیاز نے کہا ہے کہ اے محمدؐ! میں تم کو تو جھوٹا نہیں سمجھتا، مگر جو کچھ تم کہتے ہو (یعنی قرآن کی تلاوت کرتے اور اس کی تعلیم دیتے ہو) اسے صحیح نہیں سمجھتا! نیاز کے کہنے کے مطابق تو معاذ اللہ خاک بدہن گستاخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض ڈرانے اور دھمکانے کے لئے چند ایسے قصے بیان کر دیئے ہیں جو تاریخی طور پر کوئی اصلیت نہیں رکھتے یعنی قرآن کریم میں جو قصے بیان کئے گئے ہیں ان کا صحت و واقعیت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور توریت و انجیل کو جو الہامی کتابیں کہا جاتا ہے، یہ بھی غلط خیال ہے جسے لوگوں نے اپنی ناسمجھی کی وجہ سے قائم کر لیا ہے۔ (توبہ! نقلِ کفر کفر نہ باشد)

نیاز کے قلم نے اسلام کو جتنا نقصان پہونچایا ہے، اتنا نقصان بعض یہودی، عیسائی اور ہندو معاندین اسلام اہل قلم نے شاید مل کر بھی نہیں پہونچایا، مسلمانوں کے سینوں میں زخم ڈال دیتے ہیں اس دشمنِ خدا و رسول کے قلم نے! اس کے نشترِ خامہ کے پہونچائے ہوئے زخموں پر مسلمان فریاد کرتے ہیں تو نیاز اور اس کے مداحین چیخنے لگتے ہیں کہ ملا اور مولوی بلا وجہ کی ہنگامہ آرائی کر رہے ہیں اور اپنی ناسمجھی قدامت پرستی اور جہالت کے سبب ایک بہت بڑے مفکر اور مصلح کے خلاف فتنے اٹھا رہے ہیں!

اردو بولنے والے لکھے پڑھے تجدد مزاج طبقہ میں دین سے جو بیزاری، بے تعلقی، دوری، غفلت اور تشکیک کی کیفیت پائی جاتی ہے، اس میں نیاز فتحپوری کی ملحدانہ تحریروں کو بہت کچھ دخل ہے! خاص طور سے وہ ادیب اور شعراء جو نیاز سے متاثر ہیں وہ اسلام کے بارے میں بدگمان اور متشکک ہیں یا پھر مائل بہ الحاد ہیں، اور جو اسلامی عقائد رکھتے ہیں وہ صوم و صلوٰۃ اور دوسرے دینی ارکان سے غافل ہیں۔

ع جو صید کا عالم وہی صیاد کا عالم

اس خرابی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ نیاز فتحپوری کی ادبی تحریروں سے لوگ متاثر اور مرعوب ہوئے۔ پھر جب نیاز نے دین و مذہب کے خلاف زہر اگلنا شروع کیا تو انہوں نے اس زہر کو بھی آبِ زلال اور خوش ذائقہ شربت کی طرح مزے لے لیکر گھونٹ گھونٹ پینا شروع کیا، یہ لوگ اپنی نادانی اور خامیٔ فکر کے سبب یہ سمجھ بیٹھے کہ جس ادیب و افسانہ نگار کا موئے قلم رقاصہ کے رقص اور اس کے حسن و شباب کو کاغذ پر مصور کر سکتا ہے اور قلوپطرہ کی شبستانِ ناز کو کاغذی پیکر عطا کر سکتا ہے، اور جس کی تحریروں میں جوانی کی رعنائیاں اور دوشیزاؤں کی مست انگڑائیاں جیتا جاگتا قالب اختیار

کرسکتی ہیں، مذہب، اخلاق پر شہر جو کچھ لکھ رہا ہے، وہ قابلِ غور و فکر ہے بلکہ مستند ہے!

نیاز کی گزشتہ تحریریں اور کتابیں اس کی شاہد ہیں کہ نیاز صاحب کو مرزا غلام احمد کی ذات اور قادیانیت سے کوئی ربط اور لگاؤ نہیں رہا مگر پاکستان میں مستقل طور پر آنے سے پہلے وہ نہ جانے کس مقصد کے تحت قادیان جاتے ہیں اور وہاں سے واپس آکر رسالہ نگار میں مرزا غلام احمد قادیانی کی مدح سرائی کرتے ہیں اور نبوت کے اس جھوٹے دعویدار اور نبی آخر کے سریف کو عاشق رسول کے لقب سے یاد فرماتے ہیں۔ نیاز کے پاکستان آنے کے بعد دوسرے غلام احمد (پرویز صاحب طلوع اسلام) کے مسلک ضلالت کی نگار پاکستان میں تائید و توصیف کی جاتی ہے! قادیانیت، طلوع اسلام اور نگار کا یہ اتحاد ثلاثہ اور گٹھ جوڑ کون کہہ سکتا ہے کیا صورت اختیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسلام، ملت اور پاکستان کو اس قسم کے تمام فتنوں سے محفوظ رکھے

جناب فرمان فتحپوری (ایم اے) سے ہماری برسوں کی شناسائی ہے، ہمارا یہ خیال ہے اور خدا کرے یہ خیال واقعہ ہو کہ صاحب موصوف نیاز صاحب کے ملحدانہ عقائد سے کوئی سروکار نہیں رکھتے انھوں نے وطن دوستی کا حق نبایا ہے اور بڑی محنت و کاوش اور سلیقہ کے ساتھ نیاز نمبر کو مرتب کیا ہے!

روزگارِ فقیر

از:۔ جناب فقیر سید وحید الدین، طباعت فوٹو بلاک پر۔ قیمت:۔ سات روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ:۔ دفتر فقیر سپننگ ملز لمیٹڈ، کیمبل اسٹریٹ، بندر روڈ، کراچی

یہ کتاب (روزگارِ فقیر) اب سے چند سال پہلے شائع ہوئی تھی، اب دوبارہ اسے نظرِ ثانی اور اہم اضافوں کے ساتھ بڑی آب و تاب سے شائع کیا گیا ہے، روزگارِ فقیر میں علامہ اقبال کی زندگی کے بعض ایسے واقعات ملتے ہیں جو دوسری کتابوں میں نظر نہیں آتے، بعض سوانح نگاروں نے واقعات کی جو غلطیاں کی ہیں، اُن کی تصحیح بھی اس کتاب میں کردی گئی ہے انداز بیان سادہ دل نشین اور اثر انگیز ہے، صاحب موصوف نے علامہ اقبال کو بہت قریب سے دیکھا ہے، یہی مشاہدہ اور اقبال کے فیضِ صحبت کے تاثرات لفظ و بیان کے قالب میں ڈھل گئے ہیں!

کتاب کی جلد کتنی حسین، کتابت کس قدر دیدہ زیب اور فوٹو بلاک پر طباعت کس درجہ دل کش ہے، اس حسنِ اہتمام سے اُردو کی کتابیں شاذ و نادر ہی چھپتی ہیں، اور اس دریا دلی کے ساتھ کتاب کے GETUP پر اتنا روپیہ کون خرچ کرتا ہے!

جناب فقیر سید وحید الدین صاحب نے علامہ اقبال کی ذات سے اپنی عقیدت کو حسین و جمیل کتاب کی صورت میں منتقل کردیا ہے، ساڑھے سات روپیہ میں "روزگارِ فقیر" مفت برابر ہے، "اقبالیات" پر یہ کتاب (روزگارِ فقیر) خوشگوار اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے!

(بقیہ صفحہ ۲۳ سے آگے)

یہ بے سروپا بات چونکہ تسلیم چشتی صاحب نے اس کتاب کے دیباچے میں لکھی ہے اور اس کا جواب ہم تفصیل کے ساتھ دے چکے ہیں، اور جو اشعار انھوں نے پیش کئے تھے ان کی تشریح بھی کی جاچکی ہے۔ نیازی صاحب کتابوں کے نام ہی لکھ کر رہ گئے اگر ان کتابوں سے اس قسم کی مثالیں بھی نقل کرتے تو ہم ان کا بھی جواب عرض کر دیتے۔ لہٰذا اس بارے میں مزید کچھ لکھنا تحصیلِ حاصل کے سوا کچھ نہیں ہے
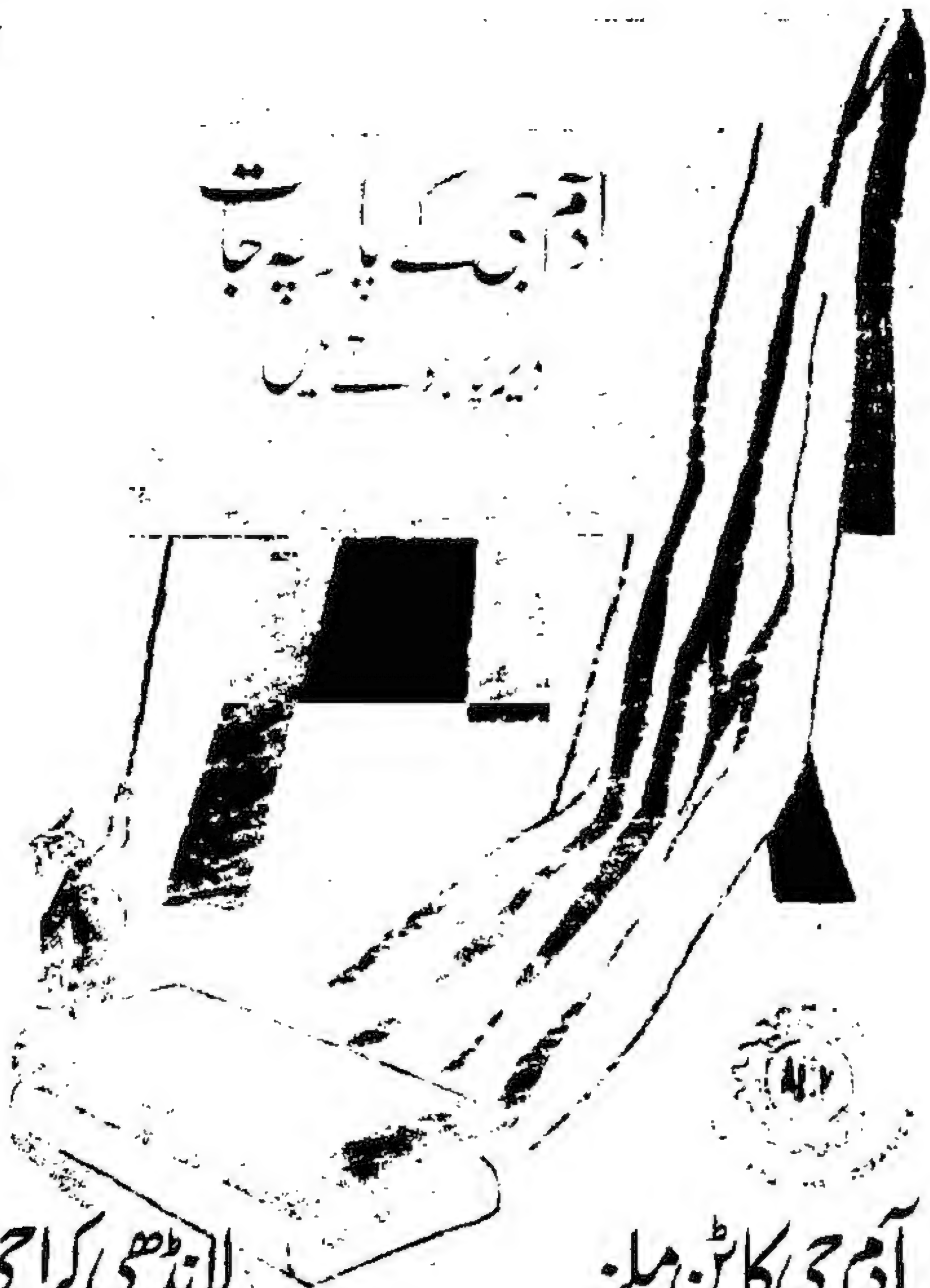
مشہور زمانہ

CAVANDER'S

کیونڈرز

میگنم سگریٹ

CAVANDER'S MEDIUM

NAVY CUT MAGNUM

بڑے اور

زیادہ اچھے

united

کارمینا

درد شکم، بدہضمی، بھوک کی کمی،
اپھارہ، قبض، قے، دست
ہضم کی خرابی ———

یہ اور معدہ اور جگر کے دوسرے امراض آج کل عام ہیں۔ اور ان شکایتوں کی وجہ سے نہ صرف صحتیں خراب رہتی ہیں بلکہ کاروبار اور زندگی کے دوسرے مشاغل پر بھی اثر پڑتا ہے۔ اچھا ہضم اور صحیح معدہ اچھی صحت کا ضامن ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ آپ وہی ہیں جو کچھ آپ کھاتے ہیں۔ لیکن جب آپ کا کھایا ہوا جسم کو نہ لگے، اور جزو بدن ہو کر خون نہ بن کر آپ کو طاقت نہ پہنچائے تو کھانا پینا ہی بے کار نہیں ہوتا بلکہ اٹھنا بیٹھنا، ذرا چلنا مشکل ہو جاتا ہے اور جینا دوبھر۔

ہمدرد کی لیبارٹریوں اور ہمدرد مطبوں میں چند جڑی بوٹیوں اور ان کے قدرتی مرکبات پر طویل تجربات اور سائنسی تحقیقات کے بعد ایک متوازن اور مفید دوا "کارمینا" تیار کی گئی ہے جو ہضم کی جملہ خرابیوں کو دور کرنے میں خصوصیت رکھتی ہے۔ "کارمینا" معدے پر نہایت خوشگوار اثر کرتی اور اس کے افعال کو درست کرتی ہے۔ ہضم کے فعل کے لیے جو رطوبتیں ضروری ہیں کارمینا ان کو مناسب مقدار میں پیدا کرتی ہے۔ جگر کی اصلاح کرتی اور جگر کی جملہ خرابیوں کو درست کرتی ہے۔

سینے کی جلن، تیزابیت، پیٹ کا بھاری پن، نفخ، بدہضمی، پیٹ کا درد، کھٹی ڈکاریں، درد شکم، متلی اور قے، بھوک کی کمی، قبض یا معدہ اور جگر کی دوسری بیماریوں میں کارمینا کا استعمال نہایت مفید ہوتا ہے۔

"کارمینا" نظام ہضم کو درست اور تقویت دینے کی یقینی دوا ہے۔ ہر موسم اور ہر آب و ہوا میں ہر مزاج کے لوگوں کے لیے فائدہ بخش اور مؤثر ہے۔ بلا خطر استعمال کی جا سکتی ہے۔

کارمینا ہر گھر کی ایک ضرورت ہے

کارمینا

ہمدرد

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی ڈھاکہ لاہور چاٹگام

فاران کراچی

جلد :- ۱۵
شمارہ :- ۹

ایڈیٹر :- ماہر القادری — ماہِ دسمبر ۱۹۶۳ء

ترتیب

چندہ سالانہ : سات رُوپے

قیمت فی پرچہ :- باسٹھ پیسے

مقامِ اشاعت
دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی

پرنٹر و پبلشر :- مسرور حسین

کتبہ ساجد
مطبوعہ مطبع سعیدی کراچی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نقشِ اوّل

دنیا کی لذتیں بہت زیادہ مستعجل اور گریز پا ہیں مگر "سیر و سفر" کی لذت دوسری لذتوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ دراز و طولانی ہے۔ مرزا غالب نے تجربہ و مشاہدہ کے بعد ہی اس حقیقت کا اظہار کیا ہے —

اگر بہ دل نہ خلد ہر چہ از نظر گزرد

زہے! روانیِ عمرے کہ در سفر گزرد

"سفر" بھی ایک ہی طرح کے نہیں ہوتے، کوئی سفر صرف "سیر و سیاحت" کے لئے ہوتا ہے تاریخی مقامات اور مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے! کسی سفر کی غرض و غایت بحالیِ صحت کی خاطر تبدیلیِ آب و ہوا ہوتی ہے، بعض سفر کسی علمی انکشاف و تحقیق کی غرض سے کئے جاتے ہیں! دوستوں اور عزیزوں سے ملاقات، بیمار پرسی، بیاہ شادی میں شرکت، تجارتی کاروبار کے لئے آنا جانا، غرض "سفر" کے بہت سے اسباب و مقاصد ہوتے ہیں، خیر و ثواب کے لئے بھی سفر ہوتا ہے اور معصیت کے لئے بھی —— پھر احوال و کیفیات کے اعتبار سے سفر صعوبتِ سقر بھی ثابت ہوتا ہے اور وسیلۃ الظفر بھی!

رات دن گردش میں ہیں ہفت آسماں

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اس لحاظ سے ساری کائنات رواں دواں اور گرمِ سفر ہے، یہ عالم کون و فساد اور جہانِ حرکت و اضطراب ہے، ٹھیراؤ ممکن ہی نہیں ہر آن چل چلاؤ، بھاگ دوڑ، قطعِ سفر اور رہ نوردی! سفر تو زمانہ اور وقت کی فطرت میں شامل ہے، ماضی، حال اور مستقبل یہ وقت و زمانہ کے سفر ہی کی منزلیں ہیں! یہاں تک کہ آدمی پلنگ پر سوتا ہوتا ہے مگر اس کی زندگی کا قافلہ بدستور چلتا رہتا ہے، طے منزل، قطعِ راہ اور سفر کے اعتبار سے ہر آدمی اپنی جگہ ابن بطوطہ اور مارکوپولو واقع ہوا ہے! مرنے کے بعد بھی سفر کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا، پھر اک دوسری منزل آتی ہے جس کے حالات اس منزلِ آب و گل سے مختلف ہوتے ہیں —

ہر آن نیا طور، نئی برقِ تجلی

اللہ کرے! مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اقبال کی یہ تمنا کس قدر معصوم اور پاکیزہ ہے! زندگی کا لطف ہی مسلسل حرکت و اضطراب میں ہے:—

اور

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے

اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

اگر زندگی میں کش مکش اور اضطراب نہ ہوتا، تو زندگی کتنی غیر دلچسپ اور بے لطف ہوتی!

مُسافر سفر میں ہے

یہ تمہید لاہور کے ایک سفر کی ہے ——— ہوا یہ کہ جماعتِ اسلامی (پاکستان) کے مرکزی سالانہ اجتماع کی خبریں کسی نہ کسی عنوان سے اخبارات میں چھپتی رہیں، کراچی شہر کی دیواروں پر اس اجتماع کے جاذبِ نگاہ پوسٹر بھی نظر آئے! خیال آیا، شوق پیدا ہوا، طبیعت نے اس سفر کے لئے اُبھارا، اور اس کے بعد نفس و ضمیر اور عقل و دل کے درمیان کش مکش اور بحث چھڑ گئی، نفس و عقل نے طرح طرح کے حیلے تراشے اور اندیشے پیدا کئے مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے قلب و ضمیر ہی کی جیت رہی!

گناہ و معصیت کی راہ ہو تو شیطان کیسی کیسی باریک چالوں اور پُرشوق بڑھاووں سے اس کے لئے طبیعت کو اُکساتا اور دل و دماغ کو تیار کرتا ہے، اس ظالم کو سب سے بڑی دُشمنی خیر و نیکی کے کاموں سے ہے! اس کے مقابلہ میں جہاں خیر و ثواب کی توقع ہوتی ہے اُس طرف سے روکنے کے لئے شیطان اندیشوں، خطروں اور طرح طرح کی بے کیفیوں کی دیواریں کھڑی کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فضل شامل ہو اور آدمی کے اندر جرأت اور عزیمت ہو تو پھر شیطان کی تمام چالیں اور تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں، جہاں غفلت اور پست ہمتی ہے وہاں شیطان کا غلبہ ہے، اور جس جگہ عالی ہمتی خدا خوفی اور بیداری پائی جاتی ہے اُس جگہ شیطان مغلوب ہے! ہر بُرائی شیطان کی جیت اور ہر نیکی شیطان کی شکست ہے، اور مردِ مومن کا تو مشن ہی یہ ہے کہ اس دُنیا میں شیطان کو ہر محاذ پر شکست دیتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی سرزمین نیکیوں سے بھر جاتے اور اُس کے نُور سے جگمگا اُٹھے۔

میں مشاعروں کے سلسلہ میں سالہا سال سے ریل کے اونچے درجوں اور ہوائی جہاز کے ذریعہ سفر کرتا رہا ہوں، مگر ۲۳ اکتوبر کو صبح کی ٹرین سے جماعتِ اسلامی کے قافلہ کے ساتھ تیسرے درجہ میں روانہ ہوا، یہ ڈبہ پہلے سے محفوظ کرالیا گیا ہے! اس میں جوان بھی ہیں ادھیڑ اور بوڑھے بھی ہیں مگر سب کے سب ایک ہی نشہ میں سرشار، ایک ہی مقصد کے شیدائی، ایک ہی شمع کے پروانے اور ایک ہی منزل کے مُسافر! لوگ وقت کاٹنے کے لئے ریلوں اور جہازوں میں تاش کھیلتے اور عشقیہ ناول پڑھتے ہیں، مُسافروں کی گفتگو کے موضوع بھی عام طور پر فلم، تفریح اور کھیل تماشوں سے متعلق رہتے ہیں مگر ریل کا یہ ڈبہ اس قسم کی تمام لغویتوں سے پاک ہے، راوحق کے ان مُسافروں کو سب سے زیادہ فکر اس کی پڑی ہوئی ہے کہ وضو ٹھکانے سے ہوسکے اور وقت پر نماز ادا ہو جائے، وہ پروگرام جدّ و جہد اور دوڑ دھوپ جس میں نماز شامل نہ ہو بے دینوں اور کافروں کو زیب دیتی ہے، نماز کے بغیر دین، قوم ملک اور معاشرے کی اصلاح و ترقی کی ہر جدّ و جہد نامبارک اور قابلِ ملامت و بیزاری ہے، راستے میں بڑے بڑے اسٹیشنوں پر جماعتِ اسلامی کے اس اجتماع میں شریک ہونے والوں کے قافلے ملے، لیکن ڈبے جو پہلے سے ریزرو کرلیے گئے تھے، اُنہیں محکمہ ریلوے نے وقت کے وقت منسوخ کر دیا، یہ بیچارے بڑی پریشانی میں ہیں کہ وقت پر لاہور کس طرح پہونچنا ہوگا! اس معاملے میں ہم بھی اُن کی کوئی مدد نہیں کرسکتے!

کراچی ایکسپریس فراٹے بھرتی ہوئی چلی جارہی ہے، یہ سندھ کا ریگستان ہے جس کے سینے میں مجاہدین کے نقوش قدم آج تک محفوظ ہیں، اللہ تعالیٰ کی اُن پر رحمتیں ہوں! ڈبے کی کھڑکیاں بند ہیں مگر گرد و غبار کے باریک ذرّے مہین درازوں سے طلوع کرتے ہوئے ڈبے میں چلے آرہے ہیں، لاہور کے سفر میں گرد سے مفر نہیں! انسان مٹی ہی سے بنایا گیا ہے اور مٹی ہی میں اُسے ایک دن ملنا ہے۔ پھر گرد و غبار سے یہ تکدّر اور سرکہ جبینی کیوں؟

سندھ کے بعد پنجاب کی وہ سرزمین آگئی جو دریاؤں، نہروں، باغوں اور کھیتوں کی سرزمین ہے جہاں صوفیائے کرام نے اپنے سوزِ دل سے ایمان و عرفان کے چراغ روشن کئے ہیں، رات کا وقت ہے ریل کے ڈبوں میں اُجالا ہے اور باہر اندھیرا ہے، ریل

باہر اُجالا ہوتا ہے اور اندر اندھیرا! ہم ریلوے گارڈ اور ڈرائیور کی نہیں اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں سفر کر رہے ہیں اُسی کے حکم سے برق و بُخار کی قوتیں کام کر رہی ہیں، اور ٹرین حادثوں سے محفوظ ہے ۔

روزنم تو بر فروزد شبم ما تو نُوردہ

ایں کار دستِ کار بہ مہر و آفتاب نیست

انسان اپنی حفاظت اور آرام و راحت کے جو مادّی اسباب فراہم کرتے ہیں یہ تمام اسباب اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت سے تو میسر آتے ہیں ——— یہاں تک کہ ۔

مری طلب بھی اُنہی کے کرم کا صدقہ ہے

قدم یہ اُٹھتے نہیں ہیں اُٹھائے جاتے ہیں!

اسی لئے تو اللہ تعالیٰ کے سچے آخری نبی ؐ (ہمارے جان و مال آپؐ پر قربان ہوں) نے فرمایا کہ جُوتے کے تسمے اور نمک کی کنکری کے لئے بھی اللہ تعالیٰ ہی سے دُعا کرنی چاہیئے ۔ مُشکل کُشا اور دستگیر، داتا اور غریب نواز اللہ تعالیٰ کے سوا اور ہے کون؟

اے پناہِ من و پناہِ ہمہ

ہمارے ڈبے کے ایک طرف تو جماعتِ اسلامی کے نام کا مخطوط لگا ہوا ہے، مگر ٹرین کہیں کہیں دوسری سا ... کے اسٹیشنوں پر بھی ٹھیر لیتی ہے، اس ضرورت کو محسوس کیا گیا تو پتہ چلا کہ اس قافلے میں خطّاط بھی موجود ہیں، انھوں نے کھریا سے مناسب عبارت جلی اور خوب صورت حرفوں میں لکھ دی! ایک معمّر شریکِ سفر جو بیساکھیوں کے سہارے ریل میں سوار ہوئے ہیں، اُن کی نبض ایک طبیب دیکھ رہے ہیں، اُن کے ہمراہ ضروری دوائیں بھی ہیں، بستروں اور ٹرنکوں پر سب سے پہلے اُن کے لئے کوئی بستر لگانا چاہے تو تسلی اور ترشے ہوتے پھلے کی چٹنیں اور بیلے بھی آسانی سے مل سکتے ہیں، وضو کے لئے لوٹے اور نماز کے لئے جا نمازیں بھی ساتھ ہیں، اس سفر میں ایک رفیق دوسرے رفیق کی خلوص و بے غرضی کے ساتھ مدد کرتا ہے، ہر شخص کو اپنے سے زیادہ دوسروں کے آرام و راحت کا خیال! کسی قسم کی تو تو میں میں آپا دھاپی، چھینا جھپٹی اور نفسا نفسی نہیں!

اُوپر کی نشست پر ایک نوجوان مغرب کی نماز پڑھ کر رات کے دس بجے تک سوتے، پھر اُن کے کہنے سے میں اُوپر چلا گیا اور فجر کی نماز تک پُورے آرام و اطمینان کے ساتھ سوتا رہا، ٹرین گھنٹہ سوا گھنٹہ لیٹ ہے، فجر کی نماز پڑھ کر رُفقاء اپنا سامان دُرست کر رہے ہیں منزلِ مقصود اب زیادہ دُور نہیں رہی، ریل کی کھڑکیوں سے سُورج کے طلوع ہونے کا منظر کتنا بھلا لگتا ہے، کہیں کہیں درختوں کے جھنڈوں پر دھواں سا رنگ کا دھندلکا سا دکھائی دے رہا ہے ——— اور

صبح کو طائرانِ خوش الحان پڑھتے ہیں کُلُّ من علیہا فَان

بیشک حیّ و قیوم اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اس کے سوا ہر شئے ہالکٌ فانی ہے ۔

لاہور کی آبادی شروع ہو چکی ہے، کوٹھیاں، بنگلے، کارخانے، غریبوں اور چھوٹے درجہ کے ملازموں کے مکان اور کوارٹر یہ سب بلندیاں اور پستیاں نگاہوں سے فلمی پردے کی طرح گزر رہی ہیں، دُور تک ریل کی پٹریاں جال کی طرح بچھی ہوئی ہیں، ریل کا انجن تھوڑے تھوڑے وقفہ سے سیٹی دے رہا ہے! یہ بانگِ رحیل نہیں بلکہ اس کا اعلان ہے کہ منزلِ مقصود آ چکی! ٹرین کی رفتار بتدریج دھیمی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ لاہور جنکشن کے پلیٹ فارم پر ٹرین رُک گئی!

چوبیس گھنٹہ کا سفر کس قدر شائستگی، تہذیب، تعاون و ہمدردی دینی اخوت اور اچھی رفاقت کے ٹھاٹھ سے ہوا، ذکر بدلے

نہ جانے کبھی تنہا میں اذان و تکبیر کی صدائیں بھی گونجیں، طرح طرح کے مناظر جو اللہ تعالیٰ کی آیات ہیں نگاہ سے گزرے، ریل کے اُن ڈبّے کو شاید برسوں کی مدت میں بھی اتنے بہت سے سجدے کا ہیکو میسّر آئے ہونگے !

لاہور جنکشن کے پلیٹ فارم پر استقبالیہ کے کارکن "جماعتِ اسلامی" کے بیج لگائے کھڑے ہیں، آنے والوں کو ہدایت دی گئی کہ ریلوے پُل کے قریب قلیوں کی مدد کے بغیر سب کا اسباب اکٹھا ہو جانا چاہیئے ! اب سب لوگ بستروں اور بٹوں کو سروں اور کندھوں پر رکھ کر لے جا رہے ہیں، کسی کی پیشانی پر بَل نہیں، ناگواری کا کوئی احساس نہیں ! میں نے بھی اسباب کے دو پھیرے کئے، قیامت میں ہر شخص اپنا بوجھ خود ہی اُٹھائے گا !

اسٹیشن سے باہر جماعتِ اسلامی کا کیمپ لگا ہوا ہے، باہر سے آنے والوں کی رہنمائی اور سہولت و آسانی کے لئے ! سب سے پہلے شاید ہمارا ہی قافلہ یہاں پہونچا ہے، اب ہمارا سامان اجتماع کے کارکنوں کی تحویل میں ہے جسے ٹرکوں کے ذریعہ اجتماع گاہ کو بھیجا جائے گا آنے والے اس کیمپ کے قریب میدان میں جمع ہو رہے ہیں، ٹرکوں کے آنے میں ابھی کچھ دیر ہے، اس لئے میں تین رفقا کے ساتھ ٹیکسی میں اجتماع گاہ پہونچا ۔

شہر کی دیواروں پر جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کے خلاف جا بجا پوسٹر لگے ہوئے ہیں، پاکستان کے عزت مآب وزیرِ داخلہ کا بیان بھی جماعتِ اسلامی کی مخالفت میں اخبارات میں آچکا ہے، یہ قریب قریب وہی الزامات ہیں جو برسوں سے دہرائے جا رہے ہیں اور جن کی کھلی ہوئی دلیلوں کے ساتھ اتنی بار تردید کی جا چکی ہے کہ اب ان الزامات میں کوئی ندرت اور جدت باقی نہیں ہے، پاکستان کے عوام جماعتِ اسلامی کے مزاج طریقِ کار اور مقصد کو بھی جانتے ہیں اور ان الزامات کی حقیقت بھی اُن پر کھل چکی ہے !

اجتماع گاہ کی چہل پہل ہر آن بڑھتی جا رہی ہے، ٹرینوں سے، بسوں اور ٹرکوں سے قافلے کے قافلے آتے چلے جا رہے ہیں، شعبہ استقبالیہ کے ارکان کی مصروفیت کی کوئی حد و انتہا نہیں، سب سے زیادہ ذمہ داری کا کام "بیجوں" کی صحیح تقسیم ہے، بیج کے بغیر کوئی شخص اجتماع گاہ میں داخل نہیں ہو سکتا، میں نے بھی اپنے کرتے پر جماعت کا بیج لگا لیا ہے، قانون و ضابطہ کی پابندی بہرحال ضروری ہے !

اجتماع گاہ کے صدر دروازے پر تماشائیوں کا میلہ سا لگا ہے، لوگ حیرت و مسرت کی نگاہوں سے ہر چیز کو دیکھ رہے ہیں، حیرت اس کی کہ انھوں نے کسی جلسہ، اجتماع اور کیمپ میں اتنی شائستگی، سلیقہ اور ڈسپلن نہیں دیکھا، اور مسرت اس بات پر کہ ملک میں کم سے کم ایک جماعت تو ایسی موجود ہے جو قانون و ضابطہ کی حدود میں رہ کر "اقامتِ دین" کے لئے جدّ و جہد کر رہی ہے، جس کے ارکان خدا ترس بھی ہیں اور فرض شناس بھی، اور اللہ تعالیٰ نے اُن کے اندر اخلاص و نیکوکاری بھی پیدا کر دی ہے، کسی نمود و نمائش کی خواہش کے بغیر ہر شخص اپنی ڈیوٹی کو پوری ذمہ داری اور تن دہی کے ساتھ انجام دے رہا ہے ۔

آج ۲۵ اکتوبر ہے، صبح طلوع ہوئی اور ایسا محسوس ہوا جیسے چشمِ آفتاب آج اس اجتماع کے نظارے میں محو ہے ——

لاؤڈ اسپیکر کی اجازت کے لئے جتنی قانونی، ضروری اور اُصولی کوششیں ممکن تھیں وہ سب کر کے دیکھ لی اور آزما لی گئیں مگر کہیں کوئی شنوائی نہیں ہوئی انصاف و قانون کے ہر دروازہ پر دستک دی مگر جواب میں "نہیں" سُننا پڑا، ایسے موقعوں پر جب کہ جان بوجھ کر کسی جائز شہری حق سے کسی فرد یا جماعت کو محروم کیا جا رہا ہو تو بعض لوگ "قانون شکنی" کی لائنوں پر بھی سوچنے لگتے ہیں، انگریز کے دورِ حکومت میں خلافت اور کانگریس کے انتہائی متحمل اور امن پسند رہنماؤں نے قانون شکنیاں کی ہیں، مگر جماعتِ اسلامی قانون و ضابطہ کے حدود کا احترام کرتی ہے، اُس نے فیصلہ کیا ہے کہ جلسہ ہوگا اور لاؤڈ اسپیکر کے بغیر ہوگا ۔

صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد ہی جلسہ گاہ میں لوگ جمع ہوتے جاتے ہیں، جلسہ شروع ہونے سے بہت پہلے پنڈال بھر چکا ہے۔ اور پنڈال شامیانوں کا ایک سلسلہ ہے جو بہت دور تک چلا گیا ہے۔ کئی ہزار آدمی تو جگہ نہ ملنے کے سبب پنڈال کے آس پاس کھڑے ہیں۔ ٹھیک وقت پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جلسہ گاہ میں داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کر لوگ کھڑے نہیں ہوئے کسی نے زندہ باد نعرہ نہیں لگایا، تعظیم وتکریم کا کوئی خاص اہتمام نہیں، اسٹیج پر پہونچ کر جب انھوں نے چھپی ہوئی افتتاحی تقریر پڑھنی شروع کی تو شاہراہِ عام کی جانب پنڈال کے ایک حصّے سے بیہودہ نعروں کا شور بلند ہوا، اور ساتھ ہی پستول کے تین فیروں کی آوازیں کئی غنڈے شور کرتے اور چلاتے کتابوں کی اسٹالوں پر پہونچے، وہاں ظالموں نے توڑ پھوڑ کی یہاں تک کہ قرآنِ کریم کی حرمت کا بھی پاس نہیں کیا، ان غنڈوں کو رات بھر شراب پلا کر جماعت اسلامی کے جلسہ گاہ میں فساد مچانے، اور جلسہ کو درہم برہم کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔

یہ خود آئے نہیں لائے گئے ہیں

ان کے پاس ریوالور ہیں، چاقو اور چھرے ہیں، یہ دکانوں کو لوٹ رہے ہیں، قناتیں کاٹ رہے ہیں، یہاں تک کہ عورتوں کی قیام گاہ پر بھی انھوں نے سوڈے کی بوتلیں پھینکنا شروع کردی ہیں مگر امن وقانون کی محافظ پولس بڑے اطمینان اور خاموشی کے ساتھ تماشا دیکھ رہی ہے، ایک طرف غنڈہ گردی اور لوٹ مار ہے اور دوسری طرف پستول کی گولی جماعت کے ایک متفق کے سینہ میں پیوست ہو کر اس بے گناہ کی جان لے چکی ہے۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

جماعت کے کارکن اللہ بخش شہید کو اٹھا کر اجتماع گاہ میں لے جا رہے ہیں، اس قدر خوفناک خونیں ہنگامہ، اتنی مسلّح غنڈہ گردی مگر جلسہ بدستور جاری ہے، کسی قسم کا انتشار اور خوف وہراس نہیں، جو جہاں بیٹھا تھا، وہیں بیٹھا ہے، مولانا مودودی اطمینان ووقار کے ساتھ اپنی تقریر پڑھ رہے ہیں، خلافت وکانگریس کے بعض اجتماعات کے بارے میں سننے میں آیا ہے کہ جلسہ گاہ میں مینڈک کو دیکھ کر انتشار پیدا ہو گیا، دو آدمی لڑنے لگے تو اس نزاع نے اجتماع میں افراتفری پیدا کردی، شامیانے کی چوب گر پڑی کچھ لوگ اٹھ کھڑے ہوتے اور جلسہ درہم برہم ہو گیا ———— مگر جماعتِ اسلامی کے اس عظیم اجتماع کو پستولوں کی خونریز فائرنگ اور مسلّح غنڈہ گردی بھی متاثر نہ کر سکی، اجتماعات اور جلسوں کی تاریخ میں ایک مثالی واقعہ بلکہ بے مثال یادگار!

جماعتِ اسلامی کے ضبط وتحمل نے دشمنوں اور بدخواہوں کی تمام منصوبے اور پوری اسکیم کو ناکام بنا دیا، ان کے سارے کئے کرائے پر پانی پھر گیا، انھوں نے یہ سوچ رکھا تھا کہ غنڈوں کی ہلڑبازی اور ان کے خون ریز اقدام پر جماعتِ اسلامی والے خاموش نہیں رہ سکتے، ان کو بھی غصہ آئے گا، طبیعتوں میں اشتعال پیدا ہوگا اور یہ اشتعال جوابی حملہ بن کر ایک بلوے کی صورت اختیار کرے گا پولس کی دخل اندازی اور قوت استعمال کرنے کا وہ وقت مناسب اور موزوں ہوگا مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے جماعتِ اسلامی کے ارکان اور متفقین اس جانکاہ چوٹ کو سہہ گئے، ان کی قوت برداشت غیر متوازن نہیں ہوئی، وہ نہ تو مشتعل ہوئے اور نہ بدحواس!

جلسہ ختم ہوا تو مولانا مودودی اپنی قیام گاہ میں آگئے، میں اس وقت ان کے پاس ہی تھا، اطلاع ملی غنڈوں نے کیمپ کے ایک حصے کو آگ لگادی، ٹھیک اسی وقت بھاٹی گیٹ کے دوسری طرف سے وہ پتھراؤ کر رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ میں نے اس عالم میں

مولانا موصوف پر گھبراہٹ اور خوف و پریشانی کا کوئی اثر نہیں دیکھا حالانکہ ان کی قیام گاہ سب سے زیادہ خطرے میں تھی، اور یہاں سے کچھ دور غنڈے پتھر پھینک رہے تھے اور اودھم مچا رہے تھے، مولانا کی گفتگو، چال ڈھال، اور طور طریق میں ذرا سا بھی فرق نہیں آیا، وہی حسبِ معمول سنجیدگی اور وقار و اطمینان! شاید اسی دن کے لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں قید خانے اور پھانسی گھر کی منزلوں سے گزارا تھا، اور اس زرِ خالص کو بار بار آزمائش و امتحان کی بھٹی میں تپایا گیا تھا۔

مولانا مودودی نے البتہ یہ کیا کہ شام سے پہلے پہلے خواتین کو اجتماع گاہ سے رخصت ہونے کی ہدایت کردی، جماعتِ اسلامی کے کیمپ کی سرزمین اب محفوظ نہیں رہی، نہ جانے کب کیا ہو جائے، غنڈے رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر بھی حملہ کر سکتے ہیں۔

مرحوم اللہ بخش کے بیوی بچے اجتماع گاہ میں موجود ہیں مگر خواتین کے کیمپ سے جزع فزع اور بین و بکا کی آواز نہیں سنی گئی، اسلام انسان کو نماز روزے ہی کے نہیں خوشی اور غم کے آداب بھی سکھاتا ہے، اللہ بخش کو ایک نہ ایک دن موت تو ضرور آتی، مگر ایسی قابلِ رشک موت! راہِ حق میں شہادت کا یہ شرف!!

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں

پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

راقم الحروف کے یہ تاثرات و جذبات نثر سے پہلے نظم کے قالب میں ڈھل چکے ہیں:—

حق سے جو وعدہ کیا تھا وہ وفا ہوتا رہا — گولیاں چلتی رہیں اور فرض ادا ہوتا رہا
اِس طرف اک شخص خاک و خون میں تڑپا کیا — کون قاتل ہے اُدھر یہ مشورہ ہوتا رہا
حشر کے دن خود گواہی دے گی چشمِ آفتاب — بے گناہوں پر جو ظلم ناروا ہوتا رہا
کچھ غریبوں کی دکانیں کیا ہوا لٹتی رہیں — اہلِ دولت کی سیاست کا بھلا ہوتا رہا
ہاتھ سے غنڈوں کے اور بے حرمتی قرآن کی — اے خدائے منتقم! فریاد! کیا ہوتا رہا
اُس طرف آتش زنی غارت گری ہوتی رہی — اِس طرف اعلانِ حق ذکرِ خدا ہوتا رہا
فرض ہے جن کا حفاظت امن اور قانون کی — اُن کے سائے میں یہ سب کچھ برملا ہوتا رہا
حق پرستوں کی نمازیں اور وہ مقتل کی رات — جذبِ دل، سوزِ جگر صرفِ دعا ہوتا رہا
شکر ہے ایثار و قربانی کی تپتی دھوپ میں — منزلِ مقصود کا طے فاصلہ ہوتا رہا

وقت آنے دو یہ پردہ خود بخود اٹھ جائے گا
کس کے ایما پر یہ ہنگامہ بپا ہوتا رہا

دوپہر کا وقت ہے اور مولانا مودودی اخباروں کے نمائندوں کے ہجوم میں بیٹھے ہیں، نمائندے صحافتی نقطۂ نگاہ سے سوالات دریافت کر رہے ہیں —— کیا آپ اس معاملہ میں احتجاج کریں گے؟ ایک نمائندے نے پوچھا —— اس پر مولانا موصوف نے دل گرفتہ انداز میں جواب دیا —— "میں احتجاج کس سے کروں" —— ایک ہی جملہ میں بہت کچھ بلکہ سب کچھ کہہ دیا، یہ چند الفاظ احتجاج بھی ہیں، مظلوم کی فریاد بھی ہیں اور اس خونیں ہنگامہ کے پس منظر کے ترجمان بھی!

(اِنَّمَآ اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ——)

شہر میں گشت کرنے کا جو پروگرام پہلے سے بن چکا تھا، اس ہنگامہ کے بعد بھی ملتوی نہیں ہُوا، علامہ اقبالؔ نے کتنی سچی بات کہی ہے ——

اگر خواہی حیات اندر خطر زی !

تین افراد کا ایک وفد، اسی طرح ایک ہزار وفود سارے شہر کے مختلف محلّوں، گلی کوچوں اور بازاروں میں گشت لگا رہے ہیں، اپنے ہاتھوں میں مولانا مودودی کی افتتاحی تقریر ہے، تاکہ "فلیبلغ الشاہد الغائب" کا فرض ادا ہو جائے، یہ وفود لوگوں سے مل کر جماعت اسلامی کے اغراض و مقاصد سمجھاتے ہیں !

آج کے خونیں ہنگامہ پر اخبارات نے ضمیمے شائع کئے ہیں، سارا شہر اس خبر سے گونج رہا ہے، ایک روزنامے نے لکھا ہے کہ جماعتِ اسلامی کے صبر و تحمل سے غنڈہ گردی بھی شکست کھا گئی، ہوٹلوں، سیرگاہوں، دکانوں، بسوں اور تانگوں میں ہر طرف یہی چرچے ہیں، اور عوام جو کچھ کہہ رہے ہیں کاش! اُن کے صحیح تاثرات اور واقعی جذبات خفیہ پولس نے اُوپر تک پہونچا دیئے ہوں!

اس شر سے اللہ تعالیٰ نے خیر کا پہلو نکالا ہے، جماعتِ اسلامی لاکھوں روپیہ بھی خرچ کرتی تو اُس کو اس انداز میں ہمہ گیر تعارف اور غیر معمولی پبلسٹی حاصل نہ ہوتی، جو لوگ جماعت کو نہ جانتے تھے، وہ بھی جان گئے! بعض تانگہ والوں نے جماعت کے کارکنوں سے کرایہ لینے سے انکار کر دیا کہ آپ لوگ اللہ کے دین کا کام کر رہے ہیں آپ سے بھلا ہم کرایہ لیں گے بادشاہو!"——

عوام خود اپنے شوق اور مرضی سے جماعت کے متفقین کے فارم بھر رہے ہیں! اس کثرت کے ساتھ دعوتِ واحد میں انفرادی ملاقات کا پہلا تجربہ اور کامیاب تجربہ! مسجدوں میں، بازاروں اور ہوٹلوں میں، دکانوں پر غرض ہر جگہ دینِ حق کے ان مبلغین اور خدمت گزاروں کی پذیرائی ہو رہی ہے۔

مقتل کی یہ رات ملال و اندوہ کے ساتھ ساتھ ایسا محسوس ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی بشارت لے کر آئی ہے رکوع و سجود اور قرأت و دعا میں کتنا سوز اور اخلاص پیدا ہو گیا ہے، اپنے معبود کے حضور دل تو سبھی کے رو رہے ہیں مگر بہت سی آنکھیں بھی اشکبار رہیں، دین کے خادموں کا اس کش مکش میں اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسا ہے اور اُسی کے کرم کے سہارے یہ مٹھی بھر نفوس حق کا پیغام لے کر میدانِ عمل میں لگے ہیں! ان کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اللہ کی زمین پر اللہ کا کلمہ غالب ہو کر رہے اسی جرم میں ان کو طرح طرح سے ستایا جا رہا ہے۔

بہ جرمِ عشقِ تو ام می کشند غوغائیست　　　　تو نیز بر سرِ بام آکہ خوش تماشائیست

اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لئے جدّ و جہد اور اُس کے کلمہ کو غالب کرنے کی کوشش اگر جرم ہے، تو اس جرم کی تو ان لوگوں کو عادت پڑ گئی ہے، یہ جرم تو اُن سے زندگی کے آخری سانس تک سرزد ہوتا رہے گا۔

رات کافی بھیگ چکی ہے، پولس کا اجتماع گاہ کے چاروں طرف پہرہ ہے مگر پولس کی حفاظت کا تجربہ آج صبح کو ہو چکا ہے، اس لئے جماعت کے کارکن اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر اپنی حفاظت کے لئے خود پہرہ دے رہے ہیں، میں مسجد سے عشاء کی نماز پڑھ کر نکلا تو چودھری غلام محمد صاحب کو دیکھا کہ اُن کے ہاتھ میں خاصی لمبی لاٹھی ہے اور پہرہ دینے کے لئے جا رہے ہیں، میں نے اُن سے کہا کہ بھائی! یہ کیا بات ہے کہ آپ لوگوں نے مجھے ناکارہ سمجھ رکھا ہے، کسی کام پر مجھے نہیں لگایا جاتا ——

چودھری صاحب اس پر مسکرانے لگے۔

اجتماع گاہ جماعت کا کیمپ کئی فرلانگ میں پھیلا ہوا ہے مگر پھر بھی یہ رقبہ تنگ اور ناکافی ثابت ہوتا ہے

صدر دروازہ سادہ اور پرکشش ہے، جس کے ایک طرف دکانیں اور دوسری جانب ہوٹل ہیں، یہاں ایک لمبے چوڑے تختہ پر خوشخط عبارت لکھی ہوئی ہے، جس کا عنوان ہے ـــــ

"کھنچنے نے کہا"

جناب نعیم صدیقی اس مخطوطہ کے مصنف ہیں، اس جگہ ہر وقت لوگوں کی بھیڑ نظر آتی ہے۔ لوگ بڑے غور سے اس عبارت کو پڑھتے ہیں اور بہت سے تو نقل کر کے لے جاتے ہیں، صدر دروازہ سے لیکر مختلف کیمپوں کے نمایاں مقامات تک کتبے لگے ہوئے ہیں جن میں اخلاق و حکمت کے جملے لکھے ہیں، کسی دوسری سیاسی پارٹی کا جلسہ ہوتا تو لیڈروں کی تصویریں یہاں آویزاں ہوتیں، جماعت اسلامی کے اجلاس میں ان خرافات کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

یہ بیت المال ہے، یہ شعبۂ نشر و اشاعت ہے، یہ استقبالیہ ہے، یہ شعبہ استفسار ہے، یہ ہسپتال ہے ـــ ہر شعبہ مہذب اور مرتب: جس کارکن سے جو کام متعلق کر دیا گیا ہے، وہ اسے خوش دلی کے ساتھ انجام دے رہا ہے۔ ایک ہی مشین کے کل پرزوں کی طرح سب لوگ کام کر رہے ہیں، ایک دوسرے کا صحیح دست و بازو، کسی کو کسی سے شکایت نہیں! سات ہزار آدمیوں کے قیام و طعام اور طہارت و وضو کا انتظام کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ مجھے سب سے زیادہ فکر اس کی تھی کہ نہ جانے کس قسم کے بیت الخلاء سے سابقہ پڑتا ہے۔ عرسوں، میلوں ٹھیلوں اور جلسوں میں غلاظت کے بڑے کریہہ مناظر کا تجربہ کر چکا ہوں مگر جماعت اسلامی کے کیمپ میں نماز و وضو کے انتظام کے بعد سب سے زیادہ اچھا انتظام اسی کا ہے۔

اجتماع گاہ کو بہت سے کیمپوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ کراچی سے جانے والوں کا کیمپ خاصہ بڑا ہے، چھ سو کے قریب افراد یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں، کوئٹہ، بلوچستان کے رفقاء بھی ہمارے ساتھ ہیں، لاؤڈ اسپیکر نہ ہونے کے سبب ضروری اعلانات نہیں ہو سکتے مگر کارکنوں کی مستعدی، فرض شناسی، پھرتی اور ہمت نے اس کمی کی بڑی حد تک تلافی کر دی ہے۔ ناشتہ اور کھانا وقت پر ملتا ہے، اتنی کم قیمت پر اوسط درجہ کا کھانا اور کہیں نہیں مل سکتا، سینکڑوں آدمی ایک دسترخوان پر مگر کسی قسم کا شور غوغا اور روٹی سالن لینے میں دست درازی نہیں۔ میں رہنے سہنے اور کھانے پینے کے معاملے میں خاصہ آرام طلب اور چٹخارہ کا عادی واقع ہوا ہوں، خدا جانتا ہے میں نے تین دن کے قیام میں کوئی ایسی دشواری محسوس نہیں کی جو طبیعت پر گراں ہو یا جسے "زحمت و مشقت" سے تعبیر کیا جائے، بڑے سے بڑے گراں قیمت اور پرتکلف سفر میں بھی گھر کی طرح آرام نہیں ملتا۔ دین کی راہ میں بھی جو کوئی ذرا سی بھی مشقت برداشت کرنے کی ہمت نہ رکھتا ہو، اس کی رفاقت اس راہ کے مسافروں کے لئے وبال ثابت ہوگی۔

مذہبی طبقہ کے بارے میں مغرب زدہ گروہ یہ تاثر رکھتا ہے کہ یہ لوگ بے سلیقہ اور بے ڈھنگے ہوتے ہیں۔ بس نمازیں پڑھنا اور تسبیحیں گھمانا جانتے ہیں۔ دنیا کے کاروبار کو سنبھالنا ان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ جماعت اسلامی نے اپنی خوش انتظامی سلیقہ اور تہذیب و شائستگی سے مغرب زدہ گروہ کی اس طنز کو باطل ٹھہرا دیا ـــ یہ وہ مردان حق آگاہ اور مومنان فراست دستگاہ ہیں جو دین و دنیا کے جامع ہیں۔ جس کام میں بھی پیسہ خرچ کیا ہے۔ انتہائی دیانت و کفایت کو ملحوظ رکھا ہے، جماعت کے یہ اجتماعات اس قابل ہیں کہ حکومت کے کارندے ان انتظامات کا مشاہدہ کریں اور اس تربیت و مشاہدہ سے پورا فائدہ اٹھائیں۔ کم خرچ اور بالا نشین کی ضرب المثل بچپن سے سنتے آئے ہیں، جماعت اسلامی کے اجتماع میں اسے آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سلیقہ، خوش انتظامی اور حسن اہتمام و انتظام کے ساتھ دینی شعور اور حق اللہ کے تقاضے

بھی اپنا کام کر رہے ہیں، بے دین سلیقہ اور خدا ناشناس خوش انتظامی سے کروڑ بار اللہ کی پناہ۔ جماعت کا ہر کارکن وقت پر نماز پڑھتا ہے اور آخرت کی جواب دہی کا احساس رکھتا ہے، سات ہزار کی اس بستی میں شاید ایک شخص بھی بے نمازی نہیں ہے اور جو اکا دکا آدمی نماز سے غافل ہوں گے وہ محکمہ "راز خفیہ" کے لوگ ہوں گے جو جماعت اسلامی کے بیج لگا کر ارکان و متفقین میں گھل مل گئے ہیں، مگر یہاں کوئی رازداری اور پُراسرار پروگرام ہی نہیں ہے، جس کے لئے یہ زحمت اٹھائی جا رہی ہے، جماعت کے مقاصد اس کا پروگرام اور کردار کھلی ہوئی کتاب کی طرح سب کے سامنے ہے، پاکستان اور خاص طور سے مشرقی پاکستان میں کمیونزم کی راہ میں جماعت اسلامی ہی سب سے بڑی روک بن کر شہادتِ حق کا فریضہ انجام دے رہی ہے جو لوگ جماعتِ اسلامی کے درپے آزار ہیں وہ اپنے اس عمل سے پاکستان میں کمیونزم کے لئے راہ ہموار کر رہے ہیں۔

اس اجتماع گاہ میں خدا کے ایسے نیک بندے بھی ہیں جو اشراق و تہجد کی نمازیں بھی ادا کرتے ہیں، تینوں دن اس منظر کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا کہ صبح کی نماز کے وقت ہمارے کیمپ کے کسی بستر پر کوئی آدمی سوتا ہوا نہیں دیکھا گیا، غالب اکثریت نے نماز جماعت کے ساتھ ادا کی! فجر کی نماز کے بعد درسِ قرآن ہوا ایک دن مشرقی پاکستان کے امیر جماعت مولانا عبدالرحیم صاحب نے شستہ اردو میں آیاتِ قرآنی کی تفسیر بیان کی، ان کے دست و بازو پروفیسر غلام اعظم کو دیکھ کر خدا جانتا ہے دل اقامتِ دین کے معاملہ میں بڑا حوصلہ مند ہو جاتا ہے، کس قدر ناسازگار فضا میں انھوں نے تحریکِ اسلامی کو استوار کیا ہے، اور اللہ کے راستے میں کیسی کیسی مصیبتیں اٹھائی ہیں۔

پاکستان کے کونے کونے سے وابستگانِ جماعت یہاں کھنچ کر آ گئے ہیں، سرحد کے بعض معمر اور سال خوردہ پٹھانوں کو دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے، یہ عمر ان کے آرام کرنے کی تھی، مگر دینی جذبہ انہیں کشاں کشاں یہاں لے آیا ہے، دودھ سے زیادہ سفید ڈاڑھیاں، چہروں پر بڑھاپے کی جھریاں لیکن آنکھوں میں جذبۂ اقامت دین کی بجلیاں چمکتی ہوئیں!

"فاران" کے ذریعہ مجھ ناصح بے عمل سے دین کی جو تھوڑی بہت خدمت بن آئی ہے اس کے سبب جس محبت و قدر شناسی کی نگاہ سے مجھے لوگ دیکھتے ہیں اور جس قدر تواضع سے پیش آتے ہیں، اسے دیکھ کر میں دل ہی دل میں کٹا جاتا ہوں، اس ندامت سے بار بار سابقہ پڑ رہا ہے، بعض وقت تو اہلِ محبت کا خاصہ جمگھٹا ہو جاتا ہے، انہیں بتاؤں تو شاید وہ اسے انکسارِ نفس پر محمول کریں گے کہ میرے ساتھ ابھی تک نفس کے کتنے چٹخارے لگے ہوئے ہیں، شعر کہہ کر اپنے ندامت زدہ ضمیر کو تھوڑی بہت تسکین دے لیتا ہوں ؎

ماہرؔ سے اجتناب نہ فرمائیں اہلِ دل
اچھوں کے ساتھ ایک گنہگار بھی سہی

اجتماع کی آخری رات میں تو ایک بجے تک مختلف کیمپوں میں اپنی نعتیں اور دینی نظمیں سناتا رہا، بعض لوگوں نے ٹیپ ریکارڈ لگا رکھے ہیں، اشتیاق کی کوئی حد و نہایت نہیں، ایسے مجمعوں کی داد و ستائش سامعین کا باوقار سکوت ہے۔

اختتامی تقریر اور الوداع

آج اکتوبر کی ۲۷ تاریخ ہے، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صبح نو بجے اختتامی تقریر فرمائیں گے، یہ تقریر مولانا موصوف نے راتوں رات لکھ کر چھپوا بھی لی ہے، پچیس تیس ہزار کے مجمع میں ایک شخص کی آواز چاہے کیسا ہی سکوت کیوں نہ ہو، پہونچ ہی نہیں سکتی! اس کے لئے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ پہلے سے منتظمین نے مجمع میں چند جملے تقریر کے انداز میں کہہ کر اس کا اندازہ لگایا ہے کہ ایک مقرر کی آواز کہاں تک آسانی کے ساتھ پہونچ سکتی ہے کہ دوسرے مقرر کی آواز سے ٹکرانے بھی نہ پائے اسٹیج کے بعد تھوڑی دور پر ایک نقیب کھڑا ہے، اس کے بعد دوسرا، اس طرح آٹھ نقیب میزوں پر کھڑے ہوئے ہیں، پنڈال حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہے، سب لوگ سراپا انتظار ہیں، مولانا مودودی ٹھیک وقت پر تشریف لائے، اسٹیج کے قریب

اخبارات کے نمائندوں کا ہجوم ہے، مولانا نے آتے ہی تقریر پڑھنا شروع کی اور ساتھ ہی نقیبوں کی آوازیں بھی بلند ہو گئیں، پورا مجمع تقریر سُن رہا ہے، جب تقریر کا یہ جملہ مولانا نے پڑھا اور نقیب نے دہرایا کہ ـــــــ "ہم نے اپنا مقدمہ (اللہ بخش شہید کے قتل کی طرف اشارہ تھا) کہیں اور ریکارڈ کرا دیا ہے" ـــــ تو بہت سی آنکھیں بے اختیار اشکبار ہو گئیں!

تقریر کا یہ منظر زندگی میں پہلی بار دیکھنے میں آیا، قدیم زمانے میں احادیث نبوی کے املاء کی قریب قریب یہی صورت ہوتی تھی، تاریخ نے آج اپنے کو دُہرا دیا! جماعت اسلامی کے جلسہ کی ناکامی کی خبریں سننے کی جو لوگ آس لگائے بیٹھے تھے اس عظیم الشان غیر متوقع کامیابی پر کیسے کیسے جھنجلائے ہوں گے اور عجب نہیں کہ "موتوا بغیظکم" کا مصداق بن گئے ہوں۔

اجتماع کی کارروائی ختم کر دی گئی، دوپہر کے کھانے کے بعد مہمانوں کے جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا، لوگ نیا ولولہ اور جوش لے کر اجتماع گاہ سے رخصت ہو رہے ہیں، ان کی عزیمت میں اور زیادہ قوت پیدا ہو گئی ہے!

راقم الحروف کا بارہا کا تجربہ ہے کہ جلسوں اور مشاعروں میں اسباب کی حفاظت کرنے کے باوجود چیزیں کھو جاتی ہیں مگر یہاں ہزاروں آدمیوں کے اجتماع میں سامان کھلا ہوا پڑا ہے لیکن کاغذ کا ایک پرزہ بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہوا، جو چیز جہاں رکھی تھی اُسے کسی نے چھوا تک نہیں، شام کے چار بجے کے قریب میں بھی اپنا سامان لے کر اجتماع گاہ سے باہر آ گیا، اسباب اُٹھانے کے لئے یہاں کوئی قلی نہیں ہے، ہر آدمی خود اپنے سامان کا قلی بنا ہوا ہے، دو رفیقوں کی عنایت نے مجھے اسباب اُٹھانے کی زحمت سے بچا لیا

اے بھاٹی گیٹ کے میدان خدا حافظ! یاد رکھنا تیری زمین کو حق پرستوں نے سجدوں سے معمور کیا ہے تیری فضا میں تکبیر و اذان کی صدائیں گونجی ہیں اور تیری آغوش میں ایک مردِ مومن خاک و خون میں تڑپا ہے ' دنیائے اسلام کے عظیم مفکر کی تقریروں نے تیرے ماحول میں سوز و گداز پیدا کیا ہے ' ہائے! وہ دعائے نیم شبی اور آہِ سحر گاہی' ایسا محسوس ہوتا تھا کہ خشیتِ الٰہی اور صدق و خلوص نے پوری فضا کو گھیرے میں لے رکھا ہے!

بھاٹی گیٹ کے اے پست و بلند میدان! تو نے شرافت و رذالت کے متضاد مناظر بھی دیکھ لئے اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور نیک نامی کسے میسر آئی اور ناکامی و بدنامی کسے نصیب ہوئی، آج تجھ میں قوتِ گویائی نہیں مگر قیامت کے دن تجھے بولنے کی طاقت دی جائے گی اور تیری گواہی پر اس مقدمہ کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی عدالت سے صادر ہو گا۔

ماہر القادری
۲۵ نومبر ۱۹۶۳ء

میکش اکبرآبادی

سماعِ حسن بصریؒ

(اس مضمون کا تعلق "موضوعاتِ کبیر" پر تبصرے سے ہے جو فاران ستمبر ۶۳ء میں شائع ہوا ہے)

.... ماہر القادری کے فاضلانہ تبصرے جو مختلف تصانیف پر فاران میں شائع ہوتے رہتے ہیں اپنی افادیت کی وجہ سے بہت اہم ہوتے ہیں ان تبصروں کی وجہ سے ہم لوگ بہت سی تصانیف اور ان کے خاص خاص مضامین سے مطلع ہوجاتے ہیں اور بعض نئی باتیں بھی معلوم ہوجاتی ہیں۔ البتہ یہ محسوس کرکے اکثر دکھ ہوتا ہے کہ اس وقت پاکستان میں مذہب کے متعلق عموماً جو تصانیف ہورہی ہیں وہ اس ذہنیت کے احیاء کا پتہ دیتی ہیں جس نے مسلمانوں کو فرقوں میں بانٹ دیا اور جس سے باہمی نفرت و افتراق کے علاوہ کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ پاکستان کے قیام کا اگر یہی مقصد تھا کہ محمود عباسی جیسے ادب ناشناس مورخوں اور پرویز جیسے فتنہ پردازوں کو کھلی چھوٹ مل جائے تو کیا عرض کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں اس پر بھی اعتراض نہیں ہے کہ فاران ایک خاص مسلک کا ترجمان ہے اور مخصوص طرزِ فکر کی نمائندگی کرتا ہے مگر اتنا ضرور عرض کیا جائے گا کہ اس طرح یک طرفہ فیصلے اور ایک ہی قسم کے دلائل و خیالات کی اشاعت ایک متلاشیِ حق اور محقق کی شان کے مطابق نہیں ہے۔

یہ چند جملے تلخ ضرور ہیں جن کے لئے میں معذرت خواہ ہوں مگر اس تلخی کو اکثر میں نے شدت سے محسوس کیا ہے اور اس وقت یہ گزارش کرنے کی جرأت اس لئے ہوئی کہ فاران میں موضوعاتِ کبیر کے ترجمے کی اشاعت اور اس پر تبصرہ میری نظر سے گزرا اور اس میں سماعِ حسن بصری کا انکار بہت قطعیت اور نمایاں طور سے ظاہر کیا گیا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اس قسم کی کتابوں کے اردو ترجمے کچھ مفید نہ ہوں گے بلکہ شاید کچھ مضر ہی ہوں۔ یہ کتابیں اُن اہلِ علم کے لئے ہیں جو فنِ حدیث سے شغف رکھتے ہیں اور اس قسم کی کتابوں کے ساتھ دوسری کتابیں بھی اُن کے مطالعہ میں رہتی ہیں اور اس طرح اُن کی رائے یک طرفہ نہیں ہوسکتی۔ ظاہر ہے کہ ان حضرات کے لئے اردو ترجمے کی ضرورت نہیں ہے۔ اردو داں حضرات کا علم اور مطالعہ محدود ہوتا ہے اُن کو اس قسم کی کتابیں دیکھنے سے یہ یقین بھی ہوسکتا ہے کہ حدیثیں موضوع بھی ہیں اور اس لئے ناقابلِ اعتبار ہیں۔ قابلِ اعتبار اور ناقابلِ اعتبار کا انتخاب کرنے کی یہ لوگ شاید کبھی ضرورت محسوس نہ کریں نہ اُن کے بس کی یہ بات ہے۔ اسی طرح اردو داں عوام کو صرف یہ معلوم ہوجائے گا کہ خواجہ حسن بصری نے حضرت علیؓ سے کوئی علم حاصل نہیں کیا اور اس طرح تصوف کے مخالفین کو اپنے نقطہ نظر کی تبلیغ کرنے میں اور صوفیوں پر طنز کرنے میں سہولت میسر آجائے گی مگر اس سے جو نقصان ہوگا اس کا اندازہ شاید ابھی لگایا نہیں گیا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ نقدِ حدیث کا فن اتنا سہل نہیں ہے جتنا بعض حضرات سمجھتے ہیں اس فن کے بارے میں یہ شعر کتنا بلیغ ہے ؎

ان کنت لا تعلم فذاک مصیبة وان کنت تعلم فالمصیبة اعظم

اس مشکل کو اگر محسوس کیا گیا ہوتا تو مترجم صاحب یہ کہنے کی جرأت نہ کرتے کہ ،۔

"میں نے اپنے والد مرحوم مفتی اشفاق الرحمٰن سے بارہا سنا ہے کہ ملا علی قاری اور جلال الدین سیوطی ضعف پرست ہیں"۔
کاش ہم لوگ معلوم کر سکتے مفتی اشفاق الرحمٰن صاحب کا مبلغ علم کیا تھا؟ انہیں یہ کہنے کا حق تھا کہ ملا علی قاری اور جلال الدین ضعف پرست ہیں؟ اگر فاضل مترجم اپنے پدر بزرگوار کو یہ حق دیتے ہیں تو پھر "آبرئے شیوۂ اہل نظر" کا خدا ہی حافظ ہے۔ حجاج ابن یوسف کی روایت معتبر اور سیوطی اور ملا علی قاری ضعف پرست پھر معلوم نہیں اس ضعف پرست عالم کی کتاب کا ترجمہ کیوں کیا گیا۔
اصل کتاب میرے سامنے نہیں ہے۔ میرا مبلغ علم صرف ماہر صاحب کے تبصرے تک ہے۔ اس میں اس ایک جملے "لبس الخرقة الصوفية وكون الحسن البصري لبسه من علي" کا ترجمہ کیا گیا ہے "صوفیہ کا خرقہ پہننا، اور حسن بصری نے اس خرقے کو حضرت علیؓ سے پہنا۔ یہ صحیح ترجمہ نہیں ہے۔ خدا کرے اور ترجمہ اس طرح کا نہ ہو۔ یہ جملہ معترضہ تھا۔ اصل بات عرض کرنا یہ ہے کہ اس عبارت کے بعد یہ عبارت نقل کی گئی ہے جو غالباً مترجم نے اصل سے ترجمہ کی ہے۔
"پھر حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ان تہمت لگانے والوں کے جھوٹ میں یہ بات بھی موجود ہے کہ حضرت علیؓ نے یہ خرقہ حضرت حسن بصریؒ کو پہنایا۔ حسن بصریؒ ائمہ حدیث شمار ہوتے ہیں لیکن تمام محدثین اس پر متفق ہیں کہ حسن بصری کو حضرت علیؓ سے سماع حاصل نہیں"
اس سلسلے میں سب سے پہلے تو یہ عرض کرنا ہے کہ ابن حجر عسقلانیؒ نے اپنے اس قول سے رجوع کیا ہے۔
قال الحافظ الذهبي في تذهيب التهذيب وقد قال فيه الحافظ ابن حجر في شرح نخبة الفكر هو من اهل الاستقراء التام في نقد الرجال في ترجمة الحسن روى عن عثمانؓ وعليؓ۔
قال الشيخ ضياء الدين ابو عبد الله محمد بن عبد الواحد المقدسي في المختارة فانه قال قال الحسن بن ابي الحسن البصري على ابن ابي طالب رضي الله عنه وقيل لم يسمع منه وتبعه على هذه العبارة الحافظ ابن حجر في اطراف المختارة ولكنه بعد رجح سماعه وصححه۔
حافظ ذہبی مشہور ناقد حدیث ہیں اور شیخ ضیاء الدین مقدسی کی کتاب المختارہ کے لئے شاہ ولی اللہ دہلوی کے شیخ حدیث کے شیخ "ابراہیم الکردی نے "امم" میں کہا ہے۔
"هي الاحاديث التي يصلح ان يحتج بها سوى ما في الصحيحين"۔
زرکشی نے تخریج احادیث الرافعی میں کہا ہے:۔
ان تصحيحه اعلى من تصحيح الحاكم وانه قريب من تصحيح الترمذي وابن حبان۔
اور اسی کی تائید کی ہے ابن حجر اور سخاوی اور سیوطی نے۔
شیخ ابراہیم الکردی نے رسالہ ابناء الابناء على تحقيق اعراب لا اله الا الله۔ میں حدیث بیان کی ہے اسکے راوی حسن بصریؒ عن علی ابن ابی طالب ہیں۔ آخر میں لکھتے ہیں:۔
هذا احد طرق شيخنا نفعنا الله به في الدارين واوردناه على الانفراد تبعا للحديث تبركا وهذه الحديث اخرجه الحافظ ابو الفتوح الطاؤسي بنحو ما في ريحان القلوب ثم الراجح ان الحسن البصري سمع من علي ابن طالب رضي الله عنه قال الحفاظ مختلفون في ذالك فانكره جماعة منهم واثبته جماعة منهم الامام احمد وابنه عبد الله واسحق بن راهويه والنسائي وابن جرير وابن المنذر والطحاوي والدارقطني والخطيب وابن عساكر ——— وعلي بن المديني بعدما كان منكرا ثم رجع عنه

عنہ وکذا خرج حدیثہ بہ احتج بہ الامام ابوحنیفۃ والامام محمد وسعید بن منصور وعبدالرزاق
ابن ابی شیبۃ ومسدد والدارمی وابوالقاسم ابن الجراح وابن مردویہ والدیلمی والدمیاطی وغیرھم
اس سلسلے میں اُن صوفیوں کے نام میں نے قصداً نہیں لکھے جو صوفی ہونے کے علاوہ محدث بھی ہیں کیونکہ ان سب کا سلسلۂ
ریقت حضرت علی کرم اللہ وجہ تک بہ واسطہ حسن بصری ؒ پہونچتا ہے اور یہی سب سے بڑا سبب انکار سماع کا ہے خصوصاً ابن
یمیہ اور ان کے مقلدین کے لئے۔ اسی طرح میں نے سیوطی کے حوالے دینے سے پرہیز کیا ہے کیونکہ مترجم صاحب کے والد بزرگوار نے
ن کو ضعف پرست قرار دیا ہے۔ بہرحال اس وقت میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس بحث کے تمام پہلوؤں کو سامنے لایا جائے
ابت کرنا صرف یہ تھا کہ یہ بات غلط ہے کہ تمام محدثین نے سماع حسن بصری کا انکار کیا ہے۔

عربی کی عبارتوں کا قصداً ترجمہ کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔ اس بحث پر ان تصانیف پر بھی نظر ڈالنی ضروری ہے جو اب سے
ہت پہلے شائع ہو چکی ہیں اہلِ علم کو اپنی رائے بہت احتیاط سے دینا چاہئیے اور دو ٹوک بات کہنے سے خصوصاً مختلف فیہ
سائل میں احتراز کرنا اولیٰ ہے۔ اس موضوع پر القول المستحسن فی فخر الحسن تالیف علامہ حسن الزماں محمد بن قاسم ترکمانی مطبوعہ
ردو اخبار دہلی سنہ ۱۸۵۱ء بہت جامع ہے اور مجھے اس سے بہت امداد ملی ہے اس میں وہ تمام حدیثیں بھی جرح و تعدیل کے ساتھ
قل کی ہیں جو حسن بصریؒ سے مروی ہیں اور لبس خرقہ کی بھی بحث پورے دلائل سے کی ہے۔

فاران: —— جناب میکش اکبرآبادی کے ہم شکر گزار ہیں کہ صاحب موصوف نے ایک علمی و تاریخی موضوع پر تبصرہ اور احتساب فرمایا۔ اس قسم کی تنقیدوں سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ بات کھل کر سامنے آتی
ہے اور مسئلہ کے چھپے ہوئے گوشے واضح ہو جاتے ہیں۔

"فاران" کسی خاص مسلک فرقہ اور گروہ کا ترجمان نہیں ہے ہمارے سامنے اللہ کا پورے کا پورا دین ہے اور اپنی فہم و استطاعت
کے مطابق ہر دینی مسئلہ پر اسی نقطۂ نگاہ سے غور و خوض اور اظہار رائے کرتے ہیں، مثلاً ہم نے "تقلیدِ جامد" پر بھی تنقید کی ہے
ور اُن حضرات کے مسلک کو بھی صحیح نہیں سمجھا، جو "تقلید" کی تردید میں اس انتہا تک پہونچ جاتے ہیں کہ "تقلید" سے "شرک"
نسوب کر دیتے ہیں!

ہم اللہ تعالیٰ کے دین کو شریعت، طریقت اور حقیقت کے خانوں میں نہیں بانٹتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
تاب و حکمت کی جو تعلیم دی ہے، وہ کتابوں میں موجود ہے اور وہی "سب کچھ" ہے! علم کلام ہو، علم تصوف ہو یا کوئی اور
دوسرا علم و فن، ہو وہ دین اور شریعت کا تابع ہے، دین و شریعت سے جہاں بھی تجاوز پایا جاتا ہے، وہیں فساد ظہور میں
آجاتا ہے۔

تصوف کی وہ تعلیم جو تزکیہ نفس کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے اور دین و شریعت کے مطابق ہے، اُس پر جو کوئی حرف گیری
کرتا ہے وہ جاہل اور بدباطن ہے! مگر "تصوف" میں جہاں غیر اسلامی تصورات و عقائد کی آمیزش نظر آتی ہے، اُس پر
حتساب کرنا غیرت ایمانی کی دلیل ہے!

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا سماع حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہ سے ثابت ہے یا نہیں، اس میں بے شک روایات
کا اختلاف ہے، امام بخاری، امام ابوداؤد، امام ترمذی وغیرہ (رحمہم اللہ تعالیٰ) بہت سے ائمہ حدیث کہتے ہیں کہ حضرت
حسن بصری نے حضرت علی کرم اللہ وجہ سے سرے سے کوئی حدیث سُنی ہی نہیں، ہاں! بعض محدثین اس کے قائل ہیں کہ حسن بصری نے

حضرت علیؓ سے کچھ سُنا ہے۔

اب رہی دوسری روایت کہ حضرت علیؓ نے جناب حسن بصری کو خرقہ پہنایا ــــــــ یہ روایت بالکل بے اصل ، غلط اور جھوٹ ہے۔ حافظ ابن حجر نے ضیاء مقدسی کی کتاب المختارہ کے اطراف کو جمع کیا ہے۔ وہاں ایک روایت کے باب میں انھوں نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ اُس خاص روایت کو حضرت حسن بصری نے حضرت علیؓ سے سُنا ہے مگر اس "روایتِ سماع" کا خرقہ والی روایت سے کوئی جوڑ نہیں ملتا۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب "قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین" ہے۔ اس کتاب کے آخر میں شاہ صاحب نے نصیر الدین طوسی کی کتاب "تجرید" کی اس بحث کا تفصیل کے ساتھ رد فرمایا ہے ، جس کا تعلق تفضیل علیؓ سے تھا۔ طوسی نے یہ بھی دعویٰ کیا تھا کہ تصوف کا سلسلہ حضرت علیؓ ہی سے چلتا ہے ، شاہ صاحب نے اس کے رد میں کہا کہ حضرت علیؓ سے تو حسن بصریؒ کا سماع بھی صحیح نہیں ہے ! مولانا فخر الدین دہلوی نے جو شاہ صاحب کے معاصر تھے اور صاحب سجادہ و تصوف تھے ' شاہ صاحب کی اس بات کو دُرست نہیں سمجھا ' اور اُن کے متعلقین و وابستگان میں سے مولانا حسن الزماں صاحب نے یہ کتاب "القول المستحسن فی فخر الحسن" لکھی جس سے فاضل مضمون نگار نے یہ عبارتیں نقل کی ہیں۔

بہرحال اس میں تو دو رائیں ہو سکتی ہیں کہ جناب حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہ سے کسی حدیث کو سُنا ہے یا نہیں ، لیکن اس باب میں محدثین ، مورخین اور ارباب نقد و نظر کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حسن بصریؒ کو حضرت علیؓ کے خرقہ پہنانے کی روایت بالکل باطل اور جھوٹ ہے !

———— x ————

سید عبدالحکیم (ایم۔ اے)

ستاروں کی دُنیا

ارباب فکر اور اہل نظر قرن ہا قرن سے عروس فطرت کے چہرے کا نقاب سرکانے میں لگے ہیں تاکہ ان پوشیدہ حقائق کو روشنی میں لا سکیں جو مظاہر کائنات کی بوقلمونیوں کے پس پردہ کارفرما ہیں، جستجو انہیں دریاؤں، پہاڑوں، ریگستانوں، جنگلوں، قطبین کی برفانی سرزمینوں اور فضا کی ناقابل تصور بلندیوں تک لے گئی۔ انسانی علوم کی تدریجی وُسعت کے ساتھ ساتھ انسان کا تصور زمان و مکاں بھی وسعت پذیر ہو گیا ہے۔ زندگی کا دور جب سے کرہ ارض پر شروع ہوا ہے اور جو بے اندازہ اور بے قیاس مخلوقات یہاں رہتی بستی چلی آ رہی ہیں ان کی معرفت نے انسان کی خود اپنی ذات کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں کو دُور کر دیا ہے وہ چار و ناچار اس حقیقت کو تسلیم کر چکا ہے کہ وہ جس کائنات میں زندگی گذار رہا ہے اس کا ہر حیثیت سے محتاج اور ضرورت مند ہے، ہوا، پانی روشنی اور دوسری بے شمار اشیاء اس کے لئے شرط زندگی ہیں

فلکیات جدید کے ارتقاء نے سائنس کے تمام دوسرے شعبوں سے بڑھ کر پوری قطعیت کے ساتھ یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ انسان کی حیثیت اس کائنات میں نہایت درجہ ہیچ میرز اور حقیر ہے، کرۂ ارض کا وہ اپنے کو حاکم اعلیٰ ہی کیوں نہ سمجھے مگر جب رات کے تاروں بھرے آسمان پر ایک نگاہ ڈالتا ہے اور فضا کی سیاہ اتھاہ پہنائیوں پر غور کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اس کا پناکرہ ایک ذرۂ خاک سے بھی زیادہ بے حقیقت ہے تو اس کی نگاہ میں اپنے اختیار و اقتدار کی خود اپنی بنائی ہوئی تصویر یکسر بے وقعت ہو کے رہ جاتی ہے۔ حقیقت حال کا یہ ادراک مغربی ارباب فکر کو خصوصیت کے ساتھ بہت آہستہ آہستہ ہو سکا ہے اور مشکلوں کے بعد قابل قبول ٹھیرا ہے انسان اپنے تو اس کائنات میں مرکزی حیثیت کا مالک سمجھتا چلا آ رہا تھا۔ کرۂ ارض پر کھڑا ہوا جو بظاہر ساکن اور غیر متحرک نظر آتا ہے وہ دیکھ رہا تھا کہ چاند سورج بڑی باقاعدگی سے مشرقی افق سے مغربی افق کی طرف گردش کر رہے ہیں اور روشن ستاروں سے مزین آسمان کا منڈپ دراصل کے گرد پھرتا ہوا نظر آ رہا تھا پس ایک بالکل فطری امر تھا کہ انسانی تاریخ کے اس نہایت مختصر دور میں لوگ زمین کو متحرک روشنیوں کی کائنات میں ایک بالکل ساکن اور غیر متحرک چیز سمجھ بیٹھیں۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ غلط تصورات کے باوجود قدیم ماہرین فلکیات نے اجرام فلکی کی گردش اور حرکات کے نہایت صحیح خاکے مرتب کر لئے جن سے بے حد مفید نتائج حاصل ہوئے سب سے پہلا فائدہ تو اوقات شماری کا ہوا اوقات کے جملہ پیمانے ہمیں آسمان کے مشاہدہ سے حاصل ہو سکے ہیں اور انہیں فضائی پیمائش کہنا زیادہ موزوں ہو گا مثال کے طور پر ہم جسے ایک گھنٹہ کہتے ہیں وہ درحقیقت آسمان میں پندرہ درجہ کا ایک قوس ہے سنہ ۳۰۰۰ قبل مسیح میں مصریوں نے کیلنڈر بنایا جس کی رُو سے سال کو بارہ مہینوں یا ۳۶۵ دنوں میں تقسیم کیا جھوں نے سنہ ۱۲۰۰ ق۔ م سے مناظر کسوف و خسوف کے اور ساتویں صدی قبل مسیح سے دُمدار ستاروں کے ریکارڈ رکھنے شروع کر دئیے تھے، فلاسفۂ یونان نے اقلیدس کی مدد سے بعض حیرت انگیز انکشافات کئے فیثا غورث اور اس کے پیروؤں نے دریافت کیا کہ زمین بظاہر چپٹی ہونے کے باوجود ایک کرہ ہے ارسٹارکس (ARISTAR CHUS) نے علمی طور پر ثابت کیا کہ زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہے وہ پہلا شخص تھا جو چاند اور سورج اور ستاروں کے فاصلے اور جسامت کے فرق کو صحت کے ساتھ سمجھ سکا لیکن یہ عرکس درجہ

افسوسناک ہے کہ فلکیاتِ قدیم کے یہ روشن تصورات بطلیموسی تعلیمات میں گم ہو کر رہ گئے (Claudius Ptolemy) بطلیموس کی مشہور زمانہ کتاب المجسطی پورے چودہ سو سال تک فلکیات کی اسٹینڈرڈ کتاب رہی ہے اس کتاب کی رُو سے زمین کائنات کا مرکز قرار پائی جس کے گرد سورج گردش کرتا تھا۔

۱۵۴۳ء میں پولینڈ کے مشہور ہیئت داں نکولس کوپرنیکس نے اپنا سی سالہ فلکی مطالعہ شروع کیا جس کے نتیجہ میں اسے معلوم ہوا کہ زمین بھی ایک سیارہ ہے جو دوسرے سیاروں کی طرح سورج کے گرد گردش کرتی ہے یہ وہ زمانہ تھا جب بطلیموسی نظام وقت کے مسلمات میں سے تھا، سترھویں صدی میں جان کپلر نے دریافت کیا کہ زمین اور سیارے سورج کے گرد بیضوی دائروں میں گردش کرتے ہیں پھر سر آئزک نیوٹن نے وہ اصول دریافت کئے جن سے سیاروں کی حرکات کی علمی توجیہ پوری وضاحت کے ساتھ ہوتی ہے دوربین کی ایجاد کے ساتھ ساتھ سنہ ۱۶۱۰ء میں گلیلیو نے نظامِ شمسی کے متعدد اہم حقائق دریافت کئے مثلاً چاند کے پہاڑ، زہرہ کی مختلف شکلیں، مشتری کے توابع اور سورج کے داغ۔ صدیوں کے بعد صدیاں گذرتی گئیں دوربین کی قوت میں اضافہ ہوتا گیا اور فلکیات کے علما فضا کی بلندیوں میں دُور سے دُور تر بڑھتے گئے اور آہستہ آہستہ ایک لاانتہا کائنات کا تصور بے حد و بے شمار ستاروں کے ساتھ روشن ہوتا گیا یہاں تک کہ کائنات کا تصور جو عام طور پر اس وقت ذہنوں میں موجود ہے وہ پچھلے تمام تصورات سے زیادہ واضح جامع اور مکمل ہے۔

آسمان گرد و غبار سے پاک ہو تو پانچ ہزار ستارے خالی آنکھوں سے دیکھے جا سکتے ہیں لیکن معمولی دُوربینوں کی مدد سے یہ تعداد لاکھوں سے زیادہ ہو جاتی ہے اور ماؤنٹ پیلومر کی عظیم الشان دوربین میں تو اربوں ستارے دیکھے جا سکتے ہیں۔ تعداد کی اس کثرت کے باوجود یہ حقیقت کس قدر حیرت انگیز ہے کہ ہر ستارہ بالکل یکہ و تنہا دوسرے ستاروں سے بے اندازہ فاصلے پر سرگرم سفر ہے۔ سورج کے بعد زمین سے قریب ترین ستارہ ۃ قنطورس ہے جس کا فاصلہ ۴.۳ سال نور ہے (ایک سال نور وہ فاصلہ ہے جو روشنی سال بھر کے وقفہ میں طے کرتی ہے جو تقریباً ۶ ٹریلین میل کے برابر ہوتا ہے، اس حساب سے سورج کا فاصلہ صرف ۸ منٹ کا ہے) برج جوزا کے مشہور ستارے ابط الجوزا کا فاصلہ ۳۰۰ سال نور ہے اسی طرح الرجل کی روشنی ۵۴۰ سال میں ہم تک پہنچتی ہے یہ ستارے پھر بھی ہمارے قریبی ہمسایوں کے مانند ہیں ان کے باہمی فاصلے کائنات کی وسعتوں میں چند انچوں سے زیادہ نہیں۔ اسی صدی کے پچھلے چند برسوں میں کائنات کی ہیبت انگیز وسعتیں اور ان کی بے پناہ پیچیدگیاں مجمل طور پر دریافت ہو سکی ہیں اور اب ہم اس حقیقت سے واقف ہو چکے ہیں کہ ہمارا نظامِ شمسی کہکشاں کے بیرونی حاشیے کا ایک نہایت ہی حقیر اور یکسر ناقابلِ لحاظ جزو ہے۔ پھر کہکشاں بھی جو ایک زمانے میں پوری کائنات سمجھی جاتی تھی کہکشاؤں کے ایک مقامی مجموعہ کا بھی ایک حصہ ہے جنہیں کششِ ثقل کا اصول باہم جوڑے ہوئے ہے اور ساتھ ساتھ فضا میں گردش کر رہی ہیں۔

موجودہ دُوربینوں سے مشاہدہ کرنے والوں کا منتہائے نظر ۲ بلین سال نور (۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۱۲ میل) تک وسیع ہو سکا ہے مگر مرئی کائنات کی یہ وسعت ہی مشاہدین کے لئے دہشت انگیز اور لرزہ براندام کر دینے والی نہیں ہے کیونکہ آگے ایسے مسائل آتے ہیں جہاں قیاس کے بھی پر جلتے ہیں آدمی سوچتا ہے کہ عام طبیعاتی قوانین جن کی کارفرمائی اس کرۂ زمین پر ہے فضا اور زمان و مکان کے عمق کی پیمائش میں بھی کام دیے جائیں گے لیکن ریاضیات کے جملہ نظامات مرئی کائنات کے خارجی حدود کے تعین میں بےکار ہو چکے ہیں یوں بھی اب شبہ کیا جانے لگا ہے کہ انسان نے اپنے محدود اور ناقص حسیات کی بنیاد پر اقلیدسی اشکال کے جو ڈھانچے بھی بنائے ہیں ایک ایسی کائنات کے سمجھنے اور سمجھانے میں کچھ بھی مفید ہو بھی سکتے ہیں جس کا سرے سے اور چھور ہی نہیں ملتا اور جو یکسر لاانتہا معلوم ہوتی ہے جہاں سائنس اور گمان دونوں لاعلمی کے تاریک کنارے پر پہنچ کر انگشت بدنداں ہو کر رہ جاتے ہیں جہاں مشہور فلاسفر شیلر کے الفاظ کی گونج کانوں میں آنے لگتی ہے کائنات اللہ رب العالمین کا ایک منصوبہ ہے (The universe is a thought of God)

فضا میں ہمارے قریبی ہمسائے

فرات اور نیل کے بسنے والوں میں سے جنھوں نے اول اول آسمان کا مشاہدہ کیا، دیکھا کہ پانچ روشن ستارے ہر رات تیزی سے آسمان میں اپنی اپنی جگہیں بدلتے رہتے ہیں وہ ایک برج سے دوسرے برج میں گذرتے ہوئے بظاہر من مانے راستوں پر مصروف سفر ہیں اسی لئے یونانیوں نے ان کا نام سیارہ رکھا آج ہم جانتے ہیں کہ فی الواقع وہ سیارے نہیں ہیں جو دور فضا میں روشن ہیں بلکہ زمین کی طرح وہ بھی سورج کے سرد ساتھیوں میں سے ہیں جو سورج کی روشنی سے روشن نظر آتے ہیں ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ان پانچ کے سوا تین اور بھی ہیں جو دوربینوں کی مدد سے دیکھے جاسکتے ہیں زمین سے ان کی مشابہت کی بنا پر ماہرین نے اکثر سوچا ہے کہ کیا ان میں کہیں زندگی یا زندگی کے وہ مظاہر پائے جاسکتے ہیں جن سے ہم واقف ہیں اس طرح کے سارے سوالات کا حل سائنس کے ایک بنیادی اصول پر منحصر ہے اور وہ ہے اصول فطرت کی یکسانی جس کا ماحصل یہ ہے کہ جو عناصر زمین پر ملتے ہیں وہی ساری کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں اس لئے سب کے سب ایک ہی طرح کے طبیعاتی اصولوں کے پابند ہیں اس نظریہ کے تحت پانچوں خارجی سیاروں پر زندگی کا سرے سے کوئی امکان نہیں اس لئے کہ سب کے سب بے حد سرد ہیں ان کی سطح کے درجات حرارت منفی - ۱۷ درجہ فارن ہائٹ سے لے کر منفی ۳۸۰ درجہ فارن ہائٹ تک ہے ـ (۱۷۰°F - مشتری کا اور ۳۸۰F - پلوٹو کا) پلوٹو کے علاوہ بھی زہریلی گیسوں کے گہرے بادلوں میں ملفوف ہیں دونوں داخلی سیارے بھی رہنے کے لئے کچھ بہتر مقام نہیں۔ عطارد جو ہوا سے یکسر محروم ہے ہمیشہ اپنا ایک ہی رُخ سورج کی طرف رکھتا ہے اس رُخ پر ٹمپریچر ۶۷۰° درجہ ہوتا ہے اور دوسری طرف منفی ۴۶۰° درجہ۔ زہرہ دبیز بادلوں میں ملفوف ہے جن میں کاربن ڈائی آکسائڈ کی کثرت ہے اس لئے سطح کا درجہ حرارت کم از کم ابلتے ہوئے پانی کا ہونا چاہئے تمام سیاروں میں مریخ پر زندگی کا امکان کسی درجہ میں پایا جاتا ہے اس کا انتہائی ٹمپریچر ۵۰° درجے سے زیادہ نہیں موسمی تغیرات اور نباتات پر ان کے اثرات زمین کی طرح وہاں بھی ملتے ہیں مگر مریخ کے بارے میں صرف اس قدر کہا جاسکتا ہے کہ ابتدائی قسم کے نباتات وہاں پائے جاسکتے ہیں حالات اس حد تک بے شک سازگار ہیں اگر زندگی کی نمود اپنی اعلیٰ اور ارفع صورت میں کرۂ زمین کے سوا کہیں اور بھی موجود ہے تو یقیناً وہ نظام شمسی سے دور کہکشاں میں یا اس سے بھی دور تر مقامات ہی میں تلاش کی جانی چاہیئے ـ

کہکشاں اور نظاماتِ کہکشاں

پاکیزہ اور لاانتہا روشنی کے ایک عظیم الشان حلقے کے مانند کہکشاں پورے آسمان کا احاطہ کئے ہوئے ہے ابتدا ہی سے اس کی موتی جیسی دودھیا روشنی اور بے انتہا دوری نے انسانی تخیل کو اکسایا ہے اور اس کے اندر خوف و عظمت کے جذبات پیدا کئے ہیں لیکن کہکشاں کے بارے میں صحیح علم موجودہ دور میں تھوڑے ہی دنوں پہلے ہوسکا ہے، کہکشاں کا وہ مرکزی حصہ جس میں ہمارا نظام شمسی واقع ہے، آفتابوں، ستاروں مجامع النجوم اور روشن بادلوں کا ایک عظیم الشان سمندر ہے، کہکشاں کا پورا مرقع بیک وقت ہماری نگاہوں کے سامنے یوں نہیں آتا کہ ہم بھی درحقیقت اس کے اندر شامل ہیں مگر ماہرین فلکیات کی کوششوں نے اس مشکل کا حل بھی دریافت کرلیا ہے ـ

زمین کہکشاں کے مرکز سے تیس ہزار سال نور کے فاصلے پر ہے اور کہکشاں کا قطر ایک لاکھ سال نور ہے اس لئے ہم اس کے اربوں ستاروں کا صرف ایک قلیل جزو ہی مشاہدہ کرسکتے ہیں کہکشاں اپنے محور پر گردش کرتی ہے اور ایک دور بیس کروڑ سال میں پورا ہوتا ہے، زمین اور سورج اس محور کے گرد چھ لاکھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گردش کرتے ہیں فضائی پرواز میں کہکشاں کے ساتھی کچھ کروی مجامع النجوم بھی ہے جن میں سے ہر ایک لاکھوں ستاروں پر مشتمل ہے کہکشاں اور یہ بے شمار مجامع النجوم مل کر گیلکسی یا کہکشاں بناتے ہیں کائنات کے عظیم الشان پس منظر میں، ہماری کہکشاں، کہکشاؤں کے ایک مقامی مجموعہ کا محض ایک جزو ہے اس مجموعہ میں سترہ یا زیادہ

کہکشاں ہیں اور پورے مجموعہ کا قطر بیس لاکھ سال نور ہے۔ کشش ثقل کا اصول یہاں بھی ان سب کو مربوط اور منظم رکھتا ہے اس مقامی مجموعہ کے ایک سرے پر ہماری کہکشاں کا روشن حلقہ ہے اور دوسرے پر مشہور ہیولائے مجعّد سلسلہ کی کہکشاں ہے۔

خارجی کہکشائیں دور بینیں جب مشہور و معروف مجامع النجوم، ہیولائے سحابی اور کہکشاں کے آگے نگاہ دوڑاتی ہیں تو بے شما غیر متشکل نورانی قطعات مکڑی کے جالوں کے مانند خلا میں معلق نظر آتے ہیں یہ خارجی کہکشائیں یا کائناتی جزائر ہیں اور ہر ایک اربوں ستاروں پر مشتمل ہیں مگر اتنے دور دراز فاصلے پر ہیں کہ ان کی روشنی کو اہل زمین تک پہنچنے میں لاکھوں سال کی مدت درکار ہوتی ہے (Big Dipper) دُبّ اکبر کے ذرا سے رقبے میں جو پورے آسمان کا دو ہزارواں حصہ ہے تین سو سے زیادہ کہکشاں موجود ہیں ہمارا مقامی مجموعہ کہکشاں نسبتاً نہایت مختصر ہے اس لئے کہ کہکشاؤں کے مجموعے عموماً پانچ سو کے ہوتے ہیں یعنی سینکڑوں کہکشاں مل کر ایک مجموعہ بناتی ہیں جنہیں وہی کشش کا ثقل کا اصول باہم جوڑے رکھتا ہے سب سے زیادہ ہوش رُبا امر یہ ہے کہ اکثر فضائی پرواز کے دوران میں دو کہکشاں ایک دوسرے میں داخل ہو کر پھر نکل جاتی ہیں ماہرین کا اندازہ ہے کہ تقریباً اڑبلین (۱۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰) کہکشاں ایسی ہیں جو ہماری بڑی دور بینوں کے حدود نظر کے تحت آجاتی ہیں ان کی تین قسمیں ہیں بیضوی کہکشاں جو دریافت شدہ تعداد کی سترہ فیصدی ہیں مجعّد کہکشاں جو اسّی فیصد ہی ہیں اور بقیہ تین فیصدی غیر متشکل ہیں چونکہ سب کی سب مختلف رفتار سے گردش کرتی ہیں اس لئے بیضوی کہکشاؤں میں ایسی بھی ہیں جو شکل میں مکمل کرہ ہیں اور ایسی بھی ہیں جو طشتری (Saucer) شکل کی ہیں اور چپٹی معلوم ہوتی ہو۔

نجوم و کواکب، سیارگان و ثوابت، حرکت و نور اور جذب و کشش کے اس حیرت انگیز نظام کو دیکھ کر عقل اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ یہ نظام آپ ہی آپ نہیں چل رہا ہے۔ اس کا کوئی ناظم، محرک اور سنبھالنے والا ہے۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین

ابو الحسن گنوری

حضرت مولانا احسن مارہروی کی اصلاحیں

اصلاح کے معنی دُرستی کے ہیں اصطلاح شعراء میں اصلاح ۔ معیوب و ناقص کلام کو بے عیب بنانے کا نام ہے اصلاحِ کلام کا سلسلہ صدیوں سے شعرائے اردو میں جاری ہے ۔

(۱) اصلاح کی ضرورت ۔

شاعری دو چیزوں سے مرکب ہوتی ہے خیال اور وہ زبان جس میں خیال کو ظاہر کیا جائے خیال عطیۂ قدرت ہے لیکن وہ زبان جو انسان نے بنائی ہے وہ بہرحال انسانوں ہی سے سیکھنی پڑے گی ۔ ظاہر ہے کہ کوئی زبان اور اس کے لوازم بغیر انسان سے سیکھے نہیں آسکتے اور شاعری میں اظہارِ خیال کا ذریعہ زبان ہی ہے

۲ ۔ اساتذہ نے شعر میں بہت سی باتوں کو حسن قرار دیا ہے اور بہت سی باتوں کو عیب ایک خالی الذہن آدمی ان پر وقوف حاصل نہیں کر سکتا جب تک وہ کسی باخبر شخص سے اس کو نہ سیکھے ۔ ۔ ۔ اس لئے کہ کسی عیب کو جب تک بتایا نہ جائے کہ یہ عیب ہے ناواقف آدمی ہمیشہ اس کا اعادہ کرتا رہے گا کیونکہ وہ اس عیب کو عیب ہی نہیں جانتا ۔

۳ ۔ ہر زبان میں وقت کے ساتھ ترک و قبول کا عمل جاری رہتا ہے بہت سی باتیں جو کل قابلِ استعمال تھیں آج کسی خرابی کے باعث قابلِ ترک قرار دی جاتی ہیں اور بہت سے نئے الفاظ نئے محاورے داخلِ زبان ہو جاتے ہیں جن سے مزاج دانِ زبان و سخن خبردار رہتے ہیں عام لوگوں کو کچھ پتا نہیں ہوتا وہ برابر متروکات کو استعمال کرتے رہتے ہیں اور اس سے ان کا کلام اہلِ نگاہ کی نظر میں بے وقار قرار دیا جاتا ہے ۔

۴ ۔ بالعموم مبتدیوں کا کلام بے ربط اور مہمل ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دماغ نے کوئی مضمون تخلیق کیا اور اس خیال کو شاعر نے الفاظ کا جامہ پہنا دیا لیکن مفہوم ظاہر کرنے کے لئے الفاظ ناکافی ہے شاعر کے دماغ میں چونکہ مضمون بسا ہوا ہے اس لئے کہ وہ خالق مضمون ہے اس نے سمجھ لیا کہ میرا مفہوم میرے شعر میں ظاہر ہو گیا مگر سامعین مضمون سے اس وقت آگاہ ہوں گے جب الفاظ شعر اتنے کافی ہوں کہ وہ مطلبِ شعر ظاہر کر دیں اور یہاں الفاظ ناکافی یا بے ترتیب ہیں اس لئے سامعین کے نزدیک وہ شعر مہمل یا مبہم ہی ہوگا ــــــ یہ تمام خرابیاں اصلاح کے ذریعہ ہی دُور ہو سکتی ہیں ۔

۴ ۔ صحت تغلیطِ الفاظ ۔ معائب، قوافی اور عروض کے بہت سے ایسے مرحلے شاعر کو پیش آتے ہیں جہاں وہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے اور ان سے واقفیت ایک ماہرِ فن مصلح ہی کرا سکتا ہے خود بخود یہ باتیں آ ہی نہیں سکتیں ۔

حضرت مولانا احسن مارہروی موصوف ایسے ہی اساتذہ میں تھے جو فنِ سخن کی ہر گھاٹی سے واقف تھے اور استاد میں جو اوصاف ہونے چاہئیں وہ اوصاف قدرت نے بڑی فیاضی سے انہیں مرحمت فرمائے تھے اور اس مقام پر وہ اس لئے پہنچے کہ انھوں نے محنت شاقہ سے مشقِ سخن اور فنِ سخن کو اپنایا جب وہ ما ۔ رہ میں بیٹھ کر حیدرآباد میں ساکن استاد (داغ) کی اصلاحوں سے سیر نہ ہوئے تو گھر سے

چھُپ کر حیدرآباد استاد کی خدمت میں جا پہنچے اور جی بھر کر اُستاد کی خدمت میں رہے صحبت اُستاد کے جو بے پناہ فائدے ہوتے ہیں ان سے بہرہ ور ہوئے مشق کی تکمیل کی اصلاح کرنا جو شعر کہنے سے ایک جُدا فن ہے وہ استاد کے پاس رہ کر سیکھا اور پھر پوری زندگی تحقیق اور تکمیلِ فن میں صرف کر دی۔

اس کو دنیا مانتی ہے کہ ہر لحاظ سے داغ سے زیادہ خوش نصیب شاعر نہیں گزرا منجملہ دولت شہرت اور عزت کے داغ کی ایک بڑی خوش نصیبی یہ بھی تھی کہ انھوں نے بکثرت اپنے ایسے تلامذہ چھوڑے جو آسمانِ شعر و ادب پر آفتاب بن کر جگمگائے اور اگر آج کوئی تحقیق کرے تو ہندو پاک میں جس قدر بھی شاعر ہیں ان میں ۹۰ فیصدی بلکہ اس سے بھی زیادہ داغ کے معنوی پوتے پڑپوتے ملیں گے۔

دیکھنا یہ ہے کہ خود اپنے استاد بھائیوں میں مولانا مرحوم کی کیا حیثیت تھی؟ جیسے کہ مثل مشہور ہے "دشمن مادر زاد برادری گویند"۔ یعنی ایک استاد کے جملہ شاگردوں میں جہاں انسیت ہوتی ہے وہاں سب میں احساس برتری بھی ہوتا ہے اور کوئی ان میں کمتر بھی ہو تو وہ احساس کمتری کے باعث خود کو برتر ثابت کرنے کی بسا اوقات نمائش کرتا رہتا ہے اور اس حصول سربلندی کے لئے اس سے بڑی بڑی سطحی قسم کی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں۔

اور اس راز کے انکشاف کے لئے ضرورت ایسے شخص کی ہے جو حضرت مولانا احسن کے قریب رہا ہو اس قربت کا شرف سب سے زیادہ تو موصوف کے منجھلے صاحبزادہ سید حافظ سعید احسن مارہروی کو حاصل ہے مگر اس گھرانے میں باپ بیٹوں کے درمیان ادب احترام اتنا شدید تھا کہ بیٹے باپ کے پاس بیٹھنے کی یا بات کرنے کی جرات ہی نہ کر سکتے تھے دوسرے صاحب حضرت احمق پھپھوندوی کا مرحوم جو مارہرہ میں مستقل رہ کر کسب فن مدتوں کرتے رہے۔ تیسرے صاحب مولوی غلام مصطفےٰ خاں صاحب پروفیسر سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ہیں جنھوں نے علی گڑھ دوران تعلیم میں مولانا کے قریب رہ کر بہت کچھ سیکھا اور بہت کچھ دیکھا چوتھا نمبر راقم الحروف کا ہے جو سال میں پندرہ دن جون کی تعطیل میں مولانا کے حکم کے تحت مارہرہ رہا کرتا تھا اور دوران سال میں بھی ان کی بے پناہ شفقت چار چھ دفعہ علی گڑھ اور دیگر مشاعروں میں قریب کھینچ لیتی تھی اس لئے بہت کچھ میرے علم میں ہے۔

مثلاً مولانا اپنے استاد بھائیوں سے بے پناہ محبت کرتے تھے حدیقۂ اُردو علی گڑھ کے سالانہ مشاعروں میں حضرات سیماب، نوح، دلیر، طپش، مبارک شاہجہانپوری وغیرہ بالعموم بلائے جاتے تھے اور ان حضرات کی خدمت کے لئے مجھے متعین کیا جاتا تھا۔ ایسے اکثر واقعات میرے سامنے ہیں کہ کسی علمی یا ادبی بحث ان استاد بھائیوں میں۔ چھڑی ہے اور جب کوئی فیصلہ نہ ہو سکا ہے تو حکم حضرت احسن کو بنایا گیا ہے اور ان کا فیصلہ سب نے تسلیم کیا ہے۔

ایک مرتبہ مجھے علی گڑھ بلایا میں حسب دستور پہنچا دو دن رہا میں مردانہ میں بیٹھا تھا مولانا اندر تھے دیوار میں تعمیر کردہ ایک ایسی الماری میں بھی کتابیں تھیں اوپر پردہ پڑا ہوا تھا میں نے شغل بے شغلی کے طور پر پردہ ہٹا کر سامنے رکھے ہوئے قلمی دو دیوان تھا میں نام نہ بتاؤں گا یہ موصوف کے دو نامور استاد بھائیوں کے تھے ان پر جگہ جگہ حاشیہ پر کچھ لکھا ہوا تھا شعروں پر نشان لگے ہوئے تھے کہیں کہیں شعر بنے ہوئے تھے میں دیکھ ہی رہا تھا کہ مولانا گھر سے آ گئے میرے ہاتھ میں کتابیں دیکھ کر بولے کیا ہے کیا ہے؟ تم نے یہ کیوں نکالے اور پھر بے حد خفا ہوئے یہ خفگی راز داری کی نشاندہی کرتی ہے جو ایک استاد کے فرائض میں داخل ہے۔

جناب اصغر گونڈوی مرحوم ایک خدا پرست صاحبدل مشاق کم سخن بزرگ شاعر تھے یہ ہر سال حدیقۂ اُردو علی گڑھ کے مشاعرہ میں شریک ہوتے تھے ان کی غزل جگر مرحوم پڑھتے تھے یہ عصر کے وقت حضرت احسن کے بنگلہ پر جایا کرتے تھے یہ پہنچا اور موصوف لنے تدبیر کے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں کو بعنوانِ لطیف اٹھانا شروع کر دیا اب مجھے کہاں اور کس بہانے سے بھیجیں سوچ سوچ فرماتے دیکھو

بالاخانے میں بیٹھے رہتا اور اگر کوئی آئے تو کوئی مناسب بات کہدیتا ہیں اس "مناسب بات" کے معنی جانتا تھا یہ کہ کبھی کمرہ میں چلے جاتے کمرہ بند ہو جاتا اور آدھ گھنٹے پون گھنٹے کبھی کبھی ایک گھنٹے میں دونوں برآمد ہوتے چہروں پر اطمینان ہوتا اس کے معنی میں تو جانتا ہوں آپ جان سکیں گے یا نہیں۔ یہ آپ جانیں۔

متعدد ایسے کاغذ دیکھے گئے ہیں کہ لوگوں نے حضرت داغ کے پاس برائے اصلاح کلام بھیجا اس پر اصلاحیں مولانا احسن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں اور دستخط استاد داغ کے ہیں یہ بات میرے اس دعوے کی دلیل ہے جو میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ حضرت احسن نے داغ کے پاس رہ کر اصلاح کرنا بھی سیکھا اور اس کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ مولانا کے ساتھ جو رویہ استاد داغ نے روا رکھا وہ مولانا نے میرے ساتھ بھی روا رکھا۔

ہوا یوں کہ میں ایک بار مارہرہ میں مقیم تھا مولانا کی ڈاک آئی پڑھتے رہے پھر ایک لفافہ مجھے دیا کہ جاؤ بالاخانہ پہ چلے جاؤ اس غزل کو دیکھ کر لے آؤ۔ اگرچہ میں اصلاح کا کام کئی برس سے کر رہا تھا جو مولانا کے علم میں بھی تھا مگر اس لفافہ کو ہاتھ میں لے کر مجھے پسینہ آگیا تعمیل حکم میں بالاخانہ پر تو چلا گیا مگر غزل کے مصرعے سمجھ میں نہ آتے تھے یعنی میں ہوش باختہ تھا جب چند منٹ یہ حالت رہی تو میں نے خود کو سنبھالا دل میں کہنے لگا احمق یہ کام روز کرتا ہے آج جب امتحان کا وقت آیا ہے تو اوسان گم ہوئے جاتے ہیں اور پھر میں نے اصلاح کرنی اور توجیہہ لکھنی شروع کر دی غزل کا وزن تھا۔ مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن ۔ اور شاعر کا تخلص تھا مفعول کے وزن پر جو اس بحر میں نہیں آسکتا مگر ایک خاص زحاف کی مدد سے آجاتا ہے بظاہر مصرع ناموزوں معلوم ہوتا ہے لیکن بروئے فن درست ہوتا ہے میں وہی زحاف استعمال کر کے غزل لے کر پہنچ گیا اس کام میں زیادہ سے زیادہ ۲۰ منٹ صرف ہوئے مجھے دیکھتے ہی فرمایا کیوں نہیں ہو سکی؟ میں نے کہا ہو گئی چونک کر بولے "ہو گئی؟" اور میں نے کاغذ بڑھا دیا پڑھتے رہے مسکراتے رہے ہوں ہوں کرتے رہے بولے یہ مقطع میں کیا کیا ہے؟ میں نے جو کیا تھا بتا دیا پھر اسے زحاف پہ جانچا اور غزل کے ایک گوشہ پر دستخط کئے "احسن مارہروی بقلم دیگر"۔

یہ تمام باتیں مجھے لکھنے کی یوں ضرورت پیش آئی کہ آپ مولانا احسن مرحوم کے مقام۔ مزاج۔ اور قابلیت وغیرہ سے متعارف ہو جائیں اب ان کی چند اصلاحیں ملاحظہ فرمالیجئے اصلاح میں مولانا کا وہی اصول تھا کہ وہ صرف غلطی دور کرتے تھے غلطی خواہ زبان کی ہو بیان کی ہو خیال کی ہو یا مسلمہ عیوب میں سے کسی کی ہو ان کا مقولہ تھا جیسا کلام ویسی اصلاح —— مجھے افسوس ہے کہنا پڑتا ہے کہ مولانا کی بکثرت اصلاحوں کا ذخیرہ جو خود میرے ہزیانات پر تھا ۴۷ء میں بدایوں میں غارت ہو گیا اب کچھ ادھر ادھر سے لے کر نمونہ پیش کر رہا ہوں۔

اصلاح بر کلام سید سعید احسن خلف الاوسط

سعید — مہرباں جب سے ہمارا ستم ایجاد نہیں — زندگی کا بھی مزا اے دل ناشاد نہیں
اصلاح احسن — " " " " " — مرنے جینے کا " " " "

توجیہ: —— مصرع ثانی میں "بھی" حشو قبیح (بھرتی) تھا۔ یہ کافی تھا کہ زندگی کا مزا نہیں۔ مگر اصلاح میں مرنے جینے کے ٹکڑے نے موت و حیات دونوں کو سمیٹ کر مضمون میں وسعت پیدا کر دی اور روانی بہت بڑھ گئی۔

سعید — قابل دید ہے یہ شان بھی ان کی سعید — میں تو ہوں یاد مگر بات مری یاد نہیں
اصلاح احسن — " " " شان تغافل بھی — " " " " " "

توجیہ:۔۔۔۔ مصرع میں اب حشو قبیح تھا۔ خالی شان بے محل تھا۔ شانِ تغافل نے دوسرے مصرع کے دعویٰ کی دلیل فراہم کر دی اور بلحاظ واقعیت شعر قرین قیاس ہو گیا۔

اصلاح بر کلام اظہر

اظہر — کہیں تھے پر کہیں بلبل کہیں نشیمن تھا — یہ انقلاب محبت کا اک فسانا تھا

اصلاح — کہیں تھے تنکے کہیں بال و پر تھے بلبل کے — اک آشیانۂ ویراں کا یہ فسانا تھا

توجیہ:۔ مولانا ایسے گنجلک اشعار کاٹ دیا کرتے تھے مگر یہ شعر اظہر صاحب کے ابتدائی زمانہ کے ہیں اور چونکہ ابتدائی زمانہ میں شعر ایسے ہی ہوتے ہیں اس لئے اہلِ نظر اساتذہ شاگردوں کے خیال کے جزو کو باقی رکھ کر اصلاح کرتے ہیں اگر ایسا نہ کریں تو شاگرد آگے چل ہی نہ سکے۔

سب سے پہلا عیب تو یہی تھا کہ دونوں مصرعے بے ربط ہیں اور دونوں کو ملا کر کوئی معنیٰ ہی پیدا نہیں ہوتے دوسرا عیب اجتماع ردیفین کا تھا۔ اصلاح نے شعر میں کچھ معنیٰ پیدا کئے یا نہیں۔ اسے ناظرین خود سمجھیں۔

اظہر — بلبل کی اب خبر لے کہدو یہ باغباں سے — کچھ برق کر رہی ہے جھک جھک کے آشیاں سے

اصلاح احسن — بے تاب بلبلوں نے پوچھا یہ باغباں سے — کیا " " " کر " "

توجیہ:۔ مصرع اولیٰ بچکانہ تھا اگر برق آشیاں سے جھک جھک کر کچھ کہہ رہی ہے تو باغباں بلبل کی کیا خبر لے سکتا ہے برق کا آشیاں سے جھک کر کچھ کہنا آشیاں جلانے کے لئے برق کی آمادگی کے معنی میں آتا ہے ایسی حالت میں جب باغباں خود بے بس ہو تو وہ بلبل کی کچھ مدد نہیں کر سکتا تھا ویسے بھی اگر بلبل و باغباں اپنے اصلی معنوں میں ہوں یعنی وطن اور اہل وطن مراد نہ ہوں تو باغباں کی یہ ڈیوٹی ہی نہیں کہ وہ بلبلوں کی رکھوالی کرے یا خبر لے اس لحاظ سے شعر محض الفاظ کا مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے اصلاح میں شعر کو بالکل نیچرل (قدرتی) بنا دیا گیا یعنی باغباں کو بلبلوں سے کوئی تعلق نہ ہی مگر بلبل کو باغباں سے ضرور واسطہ ہے اور برق و آشیاں کی یہ سرگوشی اُسے بیتاب کر رہی ہے اس لئے وہ خود باغباں سے پوچھ رہی ہے کہ یہ بجلیاں آشیاں سے کیا کر رہی ہیں؟ برق بیتاب ہوتی ہے اس رعایت سے بلبل کو بیتاب کہنا جہاں ایسی حالت میں امر فطری ہے وہاں برق کی رعایت سے لفظ بے تاب بھی خوب ہے مصرعہ ثانی میں کچھ کو کیا سے بدل کر شعر میں پر لگا دیئے ہیں کہ وہ اڑا جا رہا ہے اس لطف زباں کی داد ذوقِ سلیم کے سوا کون دے سکتا ہے۔

اختر بریلوی کی غزل پر اصلاح

اختر — ہو کائنات کے اختر کی صرف تم مالک — جو جاں بھی مانگو تو ممکن نہیں بہانہ کرے

اصلاح احسن — نہ دل، نہ مال، نہ اختر کو تم سے جان عزیز — کسی طلب پہ وہ ممکن نہیں " "

توجیہ:۔ شعر میں کئی عیب تھے شروع مصرع میں ہو۔ ہے۔ ہیں۔ ہوں۔ بروزن کا اور تھا۔ تھے۔ تھیں بروزن تھ: وہ۔۔۔ بروزن میم ناگوار سماعت ہے اس لئے قابلِ ترک ہے اگرچہ مولانا اس کے قطعی تارک نہ تھے تاہم تابمقدور گریز کرتے تھے مگر میں اب اس ترک کا قطعی پابند ہوں ۔۔۔ جو جاں ۔۔۔ معلوم ہوتا ہے یہ کسی منی جاں طوائف کی بہن کا نام ہے۔ جان جب بغیر ترکیب فارسی تنہا لکھا جاتے تو نون کا اعلان لازمی ہے یہاں نون غنہ تھا۔ اس کا اصول یہ ہے کہ وہ عربی الفاظ جن کا حرف آخر نون ہو اور نون سے پہلے الف ہو یا۔ واؤ ہو یا ی ہو جیسے جان ۔ خون ۔ چین تو جب یہ الفاظ تنہا بغیر

ترکیب اضافی یا توصیفی یا عطفی لکھے جائیں گے نون کا اعلان لازمی ہوگا البتہ مضاف الیہ معطوف علیہ وغیرہ کی حالت میں نون غنہ ہی رہے گا اس کے علاوہ شعر میں ہلکی سی تعقید بھی تھی اور مضمون بھی عامیانہ تھا اصلاح میں سب عیوب ختم ہو گئے۔

اختر　　یہ بات سچ ہے محبت میں ان کی جیت ہوئی　　مگر وہ یوں کہ جفا انہوں نے قبول ہار کے بیٹھے
اصلاح احسن　　〃 〃 〃 〃 〃 〃 وفا ہم 〃 〃 〃 〃

توجیہ :- محبوب کی جیت کا ذریعہ اختر صاحب نے اس کی جفا کو بنایا ہے حالانکہ اگر کمال وفا سے ظالم [illegible] برداشت نہ کرے تو وہ جفا کر ہی نہیں سکتا اور جیت ہو بھی نہیں سکتی پس اصلاح میں وہی اصل وجہ وفا کو ظاہر کر کے شعر مضبوط کر دیا۔

اختر　　ایسا گیا کہ لوٹ کے لی ہی نہیں خبر　　وہ دل کہ جس میں اپنے زمانے کا درد تھا
اصلاح احسن　　ایسا گیا کہ اس نے پلٹ کر خبر نہ لی　　〃 〃 〃 〃

توجیہ :- لوٹ واپس ہونے کے معنی میں اہل نظر متروک کر چکے ہیں "لی ہی نہیں" میں پہلوئے ذم تھا

اصلاح بر کلام صدیق مارہروی (وارد حال کراچی)

صدیق　　شب فرقت در و دیوار بھی آنکھیں دکھاتے ہیں　　مرے گھر میں بلائے آسماں معلوم ہوتی ہے
اصلاح احسن　　نہ ہٹتی ہے مرے سر سے نہ ٹلتی ہے مرے گھر سے　　شب فرقت 〃 〃 〃 〃

توجیہ :- در و دیوار کے آنکھیں دکھانے سے فرقت کا بلائے آسماں ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ مصرعوں کی بندش میں بے ربطی سی اور بے تعلقی سی تھی اب دعویٰ بھی ثابت ہو گیا بندش بھی چست ہو گئی اور شعر بھی ہموار ہو گیا۔

صدیق　　کبھی گور غریباں میں گزرتے ہیں تو کہتے ہیں　　شہید ناز کی تربت یہاں معلوم ہوتی ہے
اصلاح احسن　　وہاں جا کر بدل جاتا ہے انداز خرام ان کا　　〃 〃 یہاں 〃 〃

توجیہ :- بات بڑی سطحی کہی تھی صدیق صاحب نے "تربت یہاں معلوم ہوتی ہے" یہ ایسی بات تھی جو دندان جملہ در دہن منکر کے ذیل میں آ گئے۔ مولانا نے بڑی شان کا مصرع لگایا جس میں معنویت کی افراط ہے شعر کی سستی چستی سے بدل گئی ہے۔

اصلاح بر کلام کنور حاجی عبدالحمید خاں صاحب منظر مرحوم رئیس باغپت

منظر　　بیکسی کو دیکھ کر میری رکا دست ستم　　کچھ چلی کچھ رہ گئی شمشیر بھی تکبیر بھی
اصلاح احسن　　بیکسی پر میری ان کے دست و لب دونوں ہلے　　〃 〃 〃 〃

توجیہ :- منظر صاحب نے دوسرے مصرع میں شمشیر اور تکبیر دو چیزوں کا ذکر کیا مگر مصرع اولیٰ میں صرف ایک چیز دست ستم متعلق شمشیر کو لیا ہے۔ اصلاح میں شمشیر و تکبیر دونوں کو سمیٹ لیا ہے دست متعلق شمشیر ہے اور لب متعلق تکبیر ہے

منظر　　خواب میں پہلو میں تھے آنکھیں کھلیں تو کچھ نہ تھا　　خواب تو جو دیکھا تھا اس کی یہ ملی تعبیر بھی
اصلاح احسن　　〃 تھے ہم بغل 〃 〃 〃 〃

توجیہ :- پہلو سے ہم بغل بہتر ہے۔

اصلاح بر کلام صغیر احسنی جلال آبادی

صغیر　　ترتیب دے رہے ہیں وہ زلف سیاہ کو　　یا دیکھتا ہوں ابر کے دامن میں ماہ کو
اصلاح احسن　　کھولے ہے اس نے چہرہ پہ 〃 〃 〃 〃

توجیہ :- اول تو زلفوں کا ترتیب دینا بولا نہیں جاتا اور اگر زلفوں کو مرتب کر بھی لیا جائے تو جب تک زلفوں کو چہرہ پر نہ بکھیرا جائے چاند کا ابر کے دامن میں آنا ثابت نہیں ہوتا۔

صغیر ربابِ دل پہ ہیں مضرابِ غم کی کاوشیں پیہم رہے گا دیکھئے کب تک نظامِ جسم و جاں باقی

اصلاحِ احسن " " " ضربیں " " " یہ سازِ " " "

توجیہ :- مضراب کا کاوش سے کوئی تعلق نہیں جس کے معنی کھودنے کے ہیں مضراب سے ضرب لگائی جاتی ہے نظام کی جگہ ساز بنایا جو انتہائی برمحل لفظ ہے۔

اصلاح بر اشعار ابرا حسنی گنوری

ابرا حسنی مظلوم سہی رسم وفا توڑ نہ مجھ سے بیداد ہے بیداد کے قابل نہ سمجھنا

اصلاحِ احسن ایذا طلبی فطرتِ عاشق میں ہے داخل " " " "

توجیہ :- ترک بیداد کو میں نے بیداد سمجھا ہے اس کی موجودگی رسم وفا کو نہ توڑنے کی فرمائش بالکل متضادیات تھی اگر رسم جفا کہا جاتا تو بھی ٹھیک تھا۔ "مظلوم سہی" یہ ٹکڑا بھرتی کا تھا جو شعر میں کوئی جوڑ نہیں رکھتا۔ مولانا نے مصرع لگایا اس کی پختگی برجستگی اور یا دلیل ہونے میں کیا کلام کیا جا سکتا ہے۔

ابرا حسنی اجڑے ہوئے ارمانوں کے کچھ نقش ہیں باقی لوٹی ہوئی بستی ہے اسے دل نہ سمجھنا

اصلاحِ احسن لوٹے " " " " اجڑی " " " " "

توجیہ :- حق یہ ہے کہ ارمانوں کا اجڑنا بجا اس تھی ان کو لوٹا ہی جا سکتا ہے اور پھر بستی کا اُجڑنا مسلّمہ بول چال ہے ایسی اصلاحیں کرامت سمجھی جاتی ہیں صرف ادھر کے نقط کو اٹھا کر ادھر رکھ دیا ہے اور ایسی رد و بدل میں نہ صرف غلطیاں دور ہو گئیں بلکہ شعر شعر ہو گیا۔

اصلاح بر کلام راز احسنی سہسوانی

راز احسنی مقدر میں یہ کیا شے کارفرمائے جہاں رکھ دی دیا دل یا مرے سینہ میں اک برق تپاں رکھ دی

اصلاحِ احسن " " " " مرے سینہ میں دل رکھا ہے یا " "

توجیہ :- مصرع ثانی میں تعقید ہو گئی تھی "دینا" کا محل نہ تھا قدرت نے دل سینہ میں رکھا ہے۔ اک حشو تھا اب مصرع کتنا چست ہو گیا۔ یہ ملاحظہ فرما لیجئے رکھا اور رکھ دی کی تکرار نے جو لطف پیدا کیا وہ ظاہر ہے۔

راز احسنی - جہاں تک ہو سکے ارماں نہ آنے دے کوئی دل میں تمناؤں سے دل کا دور ہو جانا ہی جنت ہے

اصلاحِ احسن " " " " " " " پاک " "

توجیہ - بات وہ بھی غلط نہ تھی مگر دور کو پاک بنا کر شعر کو طہارت عطا کر دی اور جنت کی رعایت سے پاک کتنا ضروری لفظ تھا۔

یہ تھے مولانا احسن مارہروی اور یہ تھے ان کے شاعرانہ کمالات اور یہ ہے ان کا نمونۂ اصلاح خدا ان کی روح کو اعلیٰ مراتب مرحمت کرے یہ بات اور بتا دوں کہ وہ شعر کے سامنے ½ خالی صفحہ چھوڑا کرتے تھے اور ہر اصلاح کی توجیہ لکھتے تھے توجیہ کو یاد رکھنے کی سخت تاکید فرماتے تھے اسی سے ان کے تلامذہ بہت کچھ واقفیت کے حامل ہوئے اگر خالی اصلاح کر دی جائے اور وجہ اصلاح نہ بتائی جائے تو شاگرد کبھی اس اصلاح سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا ۲۵ برس اصلاح لینے کے بعد بھی کورا ہی رہے گا۔

سید عبدالرشید فاضل (ایم۔اے)

اقبالؒ اور تصوّف

(۲)

علامہ اقبالؒ اللہ تعالیٰ کے فضل سے صحیح الفکر عالم اور اسلام پسند مفکر تھے، اُن کے افکار کی اساس اسلامی اقدار پر تھی۔ اقبالؒ فرشتہ نہیں انسان تھے اور ہر انسان کے زبان و قلم سے بھول چوک بھی ہو جاتی ہے، جہاں سہو و نسیان کا امکان ہی نہ ہو ایسی تنزیہِ کامل تو اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے، علامہ اقبالؒ کے شاعرانہ افکار میں بہ تقاضائے بشریت، کہیں کہیں جھول آگیا ہے مگر مجموعی طور پر اُن کا کلام اسلامی افکار اور انسانی اقدار کا ترجمان ہے، اور اُن کی شاعری سچ مچ :-

جزو یست از پیغمبری

کی مصداق ہے!

افسوس اس کا ہے کہ کلامِ اقبالؒ کے بعض شارحین اپنے ذوق و استعداد کے مطابق اُن سے وہ تصورات و افکار منسوب کرتے ہیں، جن کی اقبالؒ نے کبھی تائید نہیں کی، نیازی صاحب، جن کے اقتباسات پر گزشتہ قسط میں تنقید آچکی ہے، وہ فرماتے ہیں :-

"اپنشدوں میں، ہمیں یہ اصول ملتا ہے کہ ہر لحظہ بدلنے والے عالم کے تحت ایک نہ بدلنے والی حقیقت بھی ہے۔ جس پر اس تغیر کا اثر نہیں ہوتا (اتفاق سے یہی خیال زمانے کے متعلق علامہ اقبالؒ نے بھی اپنے ایک خطبے میں ظاہر کیا ہے) ممکن ہے انہوں نے یہ خیال یا استعارہ یہیں سے لیا ہو" [۱]

نیازی صاحب نے خواہ مخواہ رعب جمانے کے لئے اپنشدوں کا ذکر تو کر دیا مگر اپنشدوں کی کسی عبارت کا حوالہ نقل نہیں کیا۔ تاہم عرض ہے کہ بلا شبہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں اس خیال کا اظہار کیا ہے بلکہ خطبات کے علاوہ اپنے منظومات میں بھی متعدد جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ اسرارِ خودی میں "الوقتُ سیفٌ" کے زیرِ عنوان فرماتے ہیں ؎

تا کجا در روز و شب باشی اسیر　　　رمزِ وقت از "لی مع اللہ" یادگیر

این و آں پیداست از رفتارِ وقت　　　زندگی سرّ است از اسرارِ وقت

اصلِ وقت از گردشِ خورشید نیست　　　وقت جاوید است خور جاوید نیست

وقت را مثلِ مکاں گسترده　　　امتیازِ دوش و فردا کرده

وقتِ ما کو اوّل و آخر ندید　　　از خیابانِ ضمیرِ ما دمید

[۱] قرآنی تصوف اور اقبالؒ ص۱۵۱

زندہ از عرفانِ اصلش زندہ تر   ہستی او از سحر تابندہ تر
زندگی از دہر و دہر از زندگی است
لاتسبوا الدھر فرمانِ نبی است

لیکن اوپنشدوں میں بدلنے والی اشیاء کا تذکرہ ہے اور نہ بدلنے والی حقیقت، ذاتِ باری کا ذکر ہے۔ ذکر وقت کا پھر اس کو بھی اسی وحدت الوجودی انداز میں بیان کیا گیا ہے جو شنکر یا ابن عربی کے لئے مخصوص ہے کہ حق کائنات کا عین ہے۔ اس کے برخلاف اقبال نے مادی اور حقیقی وقت کا فرق بتلایا ہے کہ یہ مادی وقت (جو ہم سے تعلق رکھتا ہے) جس کا معیار خورشید ہے تغیر پذیر اور فانی ہے۔ جو کوئی اس وقت میں گم ہو جائے گا، بقا سے محروم رہے گا۔ (۲) مادی وقت کے مقابلے میں حقیقی وقت ہے، وہ جس کا ذکر لی مع اللہ وقت میں ہوا ہے یا جو خلق السموات والارض فی ستۃ ایام سے ثابت ہوتا ہے یا حدیث لاتسبوا الدھر میں جس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ وقت ازلی و ابدی ہے۔ جو کوئی اس وقت کے دریا میں غوطہ زن ہوگا وہ حیاتِ جاوید سے ہم کنار ہوگا۔

نیازی صاحب نے اقبال پر اعتراض کا موقع نکالنے یا ان کو بھی ویدانتیوں میں شامل کرنے کی غرض سے ان کے خیال کو اپنشدوں سے ماخوذ قرار دیدیا۔ حالانکہ قرآنی آیات اور احادیثِ نبوی موجود ہیں جن کو اقبال کے نظریۂ وقت کا ماخذ قرار دیا جا سکتا تھا۔ علامہ ۱۹۳۲ء کا واقعہ ہے کہ اقبال جب برگساں سے ملے اور نظریۂ وقت کے بارے میں اس سے گفتگو کی تو دورانِ گفتگو میں لاتسبوا الدھر والی حدیث اس کو سنادی اس پر وہ اچھل پڑا اور حدیث کا مفہوم معلوم کرکے نہایت درجہ متاثر ہوا۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں:۔

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری   اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری   اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری
اک فقر ہے شبیری، اس فقر میں ہے میری   میراثِ مسلمانی سرمایۂ شبیری

ان اشعار کو نقل کرکے نیازی صاحب فرماتے ہیں:۔

"پہلے دو اشعار سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے فقر کی دو قسمیں ہیں۔ اور دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اسلام میں ایک ہی فقر ہے جس کے اوصاف صفحاتِ ماقبل میں مذکور ہوئے اور آئندہ صفحات میں بھی بیان ہوں گے ان اشعار میں علامہ نے اسلامی فقر کا مقابلہ عیسائیوں، ہندوؤں اور بدھ مت والوں کی رہبانیت سے کیا ہے۔ دوسرے شعر میں لفظ "قوموں" کا استعمال اس کا بیّن ثبوت ہے"[1]

کتنا بڑا مغالطہ ہوا ہے معترض کو جو فرماتے ہیں کہ اقبال نے جو کچھ کہا ہے عیسائیوں، ہندوؤں اور بدھ مت والوں کی رہبانیت کی طرف اشارہ کیا ہے حالانکہ اقبال نے نفسِ فقر کی تعریف کے ساتھ ساتھ اس کی بگڑی ہوئی حالت کو بیان کیا ہے اور یہ مقابلہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ ایک نماز وہ ہے کہ نمازی کو حضوریٔ قلب کی دولت نصیب ہوتی ہے اور وہ حدیث نبوی کے مطابق معراج کی سی لذت محسوس کرتا ہے اور ایک نماز وہ ہے کہ جس کی تعریف میں کہا گیا ہے

شب چو عقد نماز می بندم   چہ خورد بامداد فرزندم

یعنی نیت باندھتے ہی آدمی دنیا کے خیالات میں کھو جاتا ہے۔

[1] ایضاً ص ۱۰۱

اقبالؔ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کا فقر کسی زمانے میں ایسا تھا کہ اُس نے ان کو صیّاد بنا دیا تھا۔ اُن پر اسرار جہانگیری منکشف کردیئے تھے۔ ان کو خاک سے اُٹھا کر افلاک پر پہونچا دیا تھا اور اُن میں حسینؓ جیسے سرفروش مجاہد پیدا ہوتے تھے یا اب عجمی اور ہندی تصورات کے زیرِ اثر ان کا یہ حال ہو گیا ہے کہ وہ صیّاد سے نخچیر اور جہانگیر سے مسکین و دل گیر بن گئے۔ فرمائیے یہ بات کہاں تک دُرست ہے کہ اقبالؔ تو مسلمانو کی اصلاح کے لئے اُن کے بگاڑ کی نشاندہی کرتے ہیں اور معترض صاحب مسلمانوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ تم تو صراطِ مستقیم پر گامزن ہو۔ اقبالؔ جو کچھ فرماتے ہیں یہ عیسائیوں اور ہندوؤں کے فقر کی مذمت ہے۔ گویا اقبالؔ کو عیسائیوں اور ہندوؤں کی بے راہ روی کا غم کھائے جاتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ یہ قومیں کسی طرح اپنے قدیم فقر کو اختیار کرکے نخچیر سے پھر صیّاد ہوجائیں۔ اور موجودہ مسکینی و دلگیری سے نکل کر پھر وہی اگلی سی جہانگیری کا مقام حاصل کرلیں۔ سبحان اللہ کیا کہنے ہیں اس عقل و دانش کے!

نیازؔی صاحب فرماتے ہیں:۔

"تصوف میں تو ایک نبی کے منصبِ نبوت اور اُس کے منصبِ ولایت کے درمیان بھی فرق کیا جاتا ہے۔ اس میں امرِ ولایت عروج الی اللہ اور امرِ نبوت نزول الی الخلق ہے۔ امرِ ولایت قربِ وصالِ حق ہے اور نبوت فراق یا دوری ہے۔ کیونکہ امرِ نبوت احکامِ خداوندی کا مخلوق تک پہونچانا ہے۔ جس میں خلق کی طرف زیادہ توجہ رکھنا ہوتی ہے اور ولایت تمام امور سے بے نیاز ہو کر مشاہدۂ حق میں محو ہوجاتا ہے ؎

کہاں حضور کی لذّت کہاں حجابِ دلیل!

اس لئے کہا گیا ہے کہ نبی کی ولایت اس کی نبوت سے فضل ہوتی ہے۔ اور افرادِ اُمت کی ولایت فیضِ نبوت کے تحت ترقی پاتی ہے" [1] (نیازی صاحب)

یہی بات چونکہ نیازؔی صاحب اس سے پہلے بھی فرما چکے ہیں اور ہم اس کا جواب بھی عرض کرچکے ہیں مگر اس موقعے پر انھوں نے اقبالؔ کے مصرعے ؎ کہاں حضور کی لذت کہاں حجابِ دلیل! کو جس بیباکی سے استعمال کیا ہے اُس پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے۔ کہ حضورؐ کی لذت کو ولایت سے متعلق کیا ہے اور حجابِ دلیل کو نبوت سے۔ اور یہ خیال نہیں کیا کہ نبوت کے لئے حجابِ دلیل کا استعمال کس درجے کا سوءِ ادب بلکہ سوءِ ظن ہے۔

"جس طرح حیات پر خودی کا دعویٰ ؎ خودی کی زد میں ہے ساری خدائی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہو یا صوفیۂ کرام کا نعرۂ انا الحق یا سبحانی ما اعظم شانی۔ ۔ ۔ ۔ ہو۔

اُس سطحِ حیات پر عمل کی نوعیت وہ نہیں ہوسکتی جو غفلت عن اللہ مادہ پرستی، محکومیت مجبوریت اور جبر کی سطح پر ہوتی ہے" [2] (نیازی صاحب)

کیا اس قسم کی باتوں پر بھی یہ نہ سمجھا جائے کہ نیازؔی صاحب نے اقبال کو بالکل نہیں سمجھا۔ اقبالؔ کے مذکورہ اشعار اور صوفیا کا نعرۂ انا الحق وغیرہ ایک سطح کی چیزیں کہاں ہیں۔ اقبالؔ تو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں پہلے مصرعے میں یہ فرماتے ہیں کہ انسانی خودی اگر ترقی کرکے اپنے خاص مقام پر پہونچ جائے تو وہ ساری کائنات کو مسخر کرسکتی ہے کہ اس میں یہ صلاحیتیں ودیعت کردی گئی

[1] ایضاً صفحہ ۲۰　[2] ایضاً صفحہ ۲۲

ہیں، اور دوسرے مصرعے میں یہ فرماتے ہیں کہ تم صفاتِ ملکی ہی نہیں ہمت کرکے صفاتِ الٰہیہ بھی اپنے اندر جذب کر لینے کی کوشش کرو جس طرح لوہا آگ میں تپ کر آگ کے خواص اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے۔ اس کے برخلاف صوفیا کا نعرہ اگر محویت و سُکر کی حالت میں ہے تو یہ معنی ہے کہ سُکر کی حالت قابلِ اعتبار نہیں اور اگر ہوش میں ہے تو خلافِ شریعت ہونے کی وجہ سے شطحیات میں شمار ہوگا۔

"مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی"۔ اُس حالت کا بیان ہے کہ جب انسان مکمل طور پر اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دیتا ہے اور ایسی حالت میں اُس سے جو کام سرزد ہوتا ہے وہ: خدا کی مرضی اور خدا ہی کے ارادے کے تحت ہوتا ہے۔ جب ایک شخص آنکھوں سے وہی دیکھتا ہے جو خدا کو محبوب ہے اور کانوں سے وہی سنتا ہے جو خدا کو پسند ہے، ہاتھوں سے وہی چیزیں چھوتا ہے جن کا خدا نے حکم دیا ہے اور پیروں سے وہی راستہ چلتا ہے جو خدا نے بتایا ہے تو ایسے شخص کے فعل کو خدا ہی کا فعل کہا جائے گا۔ اور حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم تو سپردگی کے اُس مقام پر فائز تھے جہاں نہ کوئی پہنچا اور نہ پہنچ سکے گا۔ اور یہی عبدیت کی معراج ہے۔

> "گندی سیاست سے بچ کر اللہ کی یاد میں زندگی گذارنے کو "بے عملی" یا زندگی سے فرار نہیں کہہ سکتے۔ ورنہ اہلِ بیت اطہارؓ، آلِ رسولؐ اور دیگر علمائے اُمت پر جو معاویہؓ، یزید اور بعد کے دنیادار سلاطین سے اور ان کی سیاست سے بیزار ہوکر علیحدہ ہوگئے تھے۔ یہی الزام عائد ہوگا"۔ [1] (نیازی صاحب)

یہ بھی اقبال کے کلام کو نہ سمجھنے کی ایک مثال ہے۔ کیا بڑی شخصیتوں کا یہ فرض نہیں ہوتا کہ گندی سیاست کو پاک کرنے کی کوشش کریں؟ دوسرے ہر وقت اللہ کی یاد میں محو رہنا اور اس کے نتیجے میں کوئی انقلاب نہ لانا اُس یاد کی بے اثری کی نہیں تو عدمِ افادیت کا ثبوت ضرور ہے۔ تیسرے کسی شخص نے خاص حالات کے ماتحت یا رفعِ شر کی غرض سے ایسا کیا ہو تو اس کو عام نہیں کیا جا سکتا۔ چوتھے کیا اہلِ بیت میں سے حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ اور حضرت علیؓ کی پُرہنگامہ زندگی کو فرار سے تعبیر کر سکتے ہیں؟ اور کیا حضرت امام حسینؓ کا اسوۂ حسنہ ہم کو فرار کی تعلیم دیتا ہے؟ اگر دور کو جانے دیجئے کہ وہ قرنِ اول کا کارنامہ تھا حضرت امام مالک، امام احمد بن حنبل، امام اعظم اور اس سے بھی سیکڑوں سال بعد حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان کے بعد حضرت سید احمدؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے گندی سیاست سے بیزاری اختیار کرکے علیحدگی کی بجائے زبان و قلم ہی سے نہیں تلوار تک سے جہاد کرتے رہنا اپنا مشن نہ بنایا؟

نیازی صاحب نے یزید اور بعد کے دنیادار سلاطین و ملوک کے ساتھ ہی حضرت معاویہؓ کو شامل کرکے ان کا نام بھی اُسی انداز میں لیا ہے یہ بات دل کو کھٹکتی ہے۔ صحابیت کا مقام اتنا بلند ہے کہ ہم اُس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔

> "مکشوفات کے لفظ پر شاید "چار پائے بر و کتابے چند" کے مصداق ذی علم حضرات چونک اُٹھیں اور فرمانے لگیں کہ قرآن و سُنّت کے ہوتے ہوئے مکشوفات یا ملفوظات اولیا کے حوالوں کی کیا ضرورت ہے۔ گویا قرآن و سُنّت میں ان کے نزدیک "کشفِ صدر" اور "علمِ لدُنی" کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اگر ایسا ہو تو پھر اولیا اللہ کی رُوحانی قوت اور اُن کے مکشوفات و ملفوظات کو قرآن و سُنّت سے باہر کیوں سمجھا جائے"۔ [2] (نیازی صاحب)

مکشوفات و ملفوظات کے الفاظ سے تو ایسے ہی لوگ چونک پڑتے ہونگے جن کی تعریف نیازی صاحب نے کی ہے۔ ورنہ جو لوگ واقعی علم و بصیرت رکھتے ہیں وہ چونکنے کی بجائے اُن مکشوفات و ملفوظات کو قرآن و سُنّت کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھتے ہیں۔ اگر وہ اس کسوٹی

[1] ایضاً ص ۲۲۳ [2] ایضاً ص ۱۵۵

پر پورے اترتے ہیں تو اُن سے کوئی تعرض نہیں کرتے اور پورے نہیں اُترتے تو اُن کو بلا تامل رد وا سے مار دیتے ہیں۔ اس لئے کہ صوفیا ہوں یا علما کسی کا قول و فعل دین میں حجت نہیں ہے اور جب کہ احادیث تک کی تعدیل و تنقیح کی گئی اور روایت حدیث کے سلسلے میں صحابہ و تابعین تک کے حالات کی جانچ پڑتال کی گئی کہ حدیث کے نام سے دین میں کوئی غلط چیز داخل نہ ہو جائے تو صوفیا اور اُن کے مکشوفات کس شمار میں ہیں۔ ان مکشوفات و ملفوظات کو اس حیثیت سے بھی جانچا جائے گا کہ یہ حالت سکر کی باتیں تو نہیں ہیں۔ نیز یہ کہ الحاق تو نہیں ہیں۔

مکشوفات اور ملفوظات دو الگ الگ چیزیں ہیں مگر نیازی صاحب نے غالباً دونوں کو ایک ہی چیز سمجھ کر ایک ہی حکم میں داخل کر دیا ہے۔ ملفوظات کے راوی مستند ہوں تو وہ صحیح ہو سکتے ہیں بشرطیکہ کتاب اللہ و سنت کے خلاف نہوں۔ مگر مکشوفات میں تو ہمیشہ ظن و تخمین کا امکان ہوتا ہے۔

نیازی صاحب وسیلۂ شیخ کا عنوان قائم کر کے قرآن کی دو آیتوں سے اُس پر دلیل لائے ہیں، اول يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ اور دوسری أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ ۔ فرماتے ہیں:۔

"أَقْرَبُ إِلَى اللهِ باعتبارِ منزلت اول رسول ہے اس کے بعد امام جو اُس کا نائب ہے"

جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے علمائے حق نے ان آیتوں میں وسیلے کے لفظ سے پیروں کا وسیلہ مراد نہیں لیا ہے اور اگر مراد لیا ہے تب بھی عملِ صالح اور اتباعِ شریعت ہی کو وسیلہ قرار دیا ہے۔ کہ اگر کوئی چیز کام آنے والی ہے تو وہ عملِ صالح ہے لہٰذا عملِ صالح کو زادِ راہ اور وسیلۂ نجات بنانا چاہئے۔ اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ قرار دیا جائے تو اس کے معنی بھی حضورؐ کے اتباع ہی کے لئے جائیں گے کہ بغیر اتباع کے وسیلے کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ اور پیر و مرشد کی بیعت بھی اُسی وقت کام آئے گی جب اُس کے ذریعے پابندیٔ شریعت کی تربیت حاصل کی جائے گی۔ غرضکہ وسیلہ حضورؐ کی سُنت پر عمل پیرا ہونے کا نام ہے خواہ وہ براہِ راست حصولِ علم کے ذریعے ہو خواہ کسی پیرِ کامل کی بیعت کے ذریعے۔

نیازی صاحب نے ایک باب "بیعت و اطاعتِ پیر" کا بھی باندھا ہے اور اس کے تحت بہت سی ایسی باتیں لکھ دی ہیں کہ اگر ان کو دین کی اساس مان لیا جائے تو آج مسلمانوں کی اکثریت دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گی۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ ہر مسلمان کی گردن میں کسی شیخ طریقت کی بیعت کا قلادہ ہونا ضروری ہے اور جس کی گردن اس قلادے سے خالی ہو گی وہ دوزخ میں جائے گا اور اس کے بارے میں کچھ موضوع حدیثیں اور بعض لوگوں کے اقوال بھی نقل کئے ہیں یہاں تک کہ قرآن سے بھی استناد و استشہاد کر ڈالا ہے یعنی جن جن آیتوں میں لفظِ وسیلہ آیا ہے اس کو شیخ کا وسیلہ قرار دیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہر فن کو اُس کے اُستادِ کامل سے سیکھنا چاہئے۔ مگر جب یہ کہا جاتا ہے کہ تصوف قرآن کی رُو سے احسان اور اخلاص فی العمل کے سوا کچھ نہیں یا دوسرے الفاظ میں شریعت پر عمل پیرا ہونے کا نام تصوف ہے تو پھر یہ بات ایک خاص جماعت (صوفیوں) کے ساتھ ہی کیوں مخصوص ہے۔ صوفیوں کے ساتھ تو اُس وقت مخصوص ہو سکتی تھی کہ جب تصوف اسلام سے الگ کوئی چیز ہوتا اور اس کو کوئی مخصوص جماعت ہی سکھا پڑھا سکتی تھی۔ مگر جب اسلام کے مطابق اپنی زندگی کے ہر شعبے کو سنوارنے کا نام تصوف ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ لوگ اس کے اہل نہ سمجھے جائیں جو کتاب و سُنت کے عالم بھی ہوں اور اس کے مطابق جادۂ زندگی پر گامزن بھی۔ بلکہ اس کے لئے تو ایسے عالم اُن صوفیوں کے مقابلے میں جو جاہل بھی ہیں اور بے عمل بھی، کہیں زیادہ موزوں ہیں۔

پھر ایسے کامل صوفی اب ملتے کہاں ہیں جن کی صحبت میں رہ کر تزکیۂ نفس کی منزلیں طے کرلی جائیں۔ اور جب نہیں ملتے تو کیا ہر کس و ناکس پیر اور مصنوعی مرشدوں ہی کے ہاتھ میں ہاتھ دیدیا جائے اور وہ بھی بے قید مکمل اطاعت کے ساتھ؟ اور یہ جو فرمایا گیا ہے کہ بغیر پیر کی بیعت کے دوزخ سے بچنا ممکن نہیں تو کیا اس کے لئے نیازی صاحب کوئی مستند دلیل لاسکتے ہیں؟ اور پھر اس فتویٰ کا دین کی اشاعت پر اثر نہیں پڑے گا اور اشاعتِ دین تو ایک طرف موجودہ مسلمانوں میں سے بھی کتنے ہیں جو دوزخ سے بچ سکیں گے اور یہی نہیں بلکہ چودہ سو سال میں جتنے مسلمان قلادۂ بیعت کے بغیر دنیا سے چلے گئے اُن کا کیا حشر ہوگا؟ ایسی ہی بے سر و پا باتوں کی وجہ سے تصوف بدنام ہوا ہے اور جب اس قسم کی لایعنی باتوں پر اظہارِ افسوس کیا جاتا ہے تو یہ لوگ اس کو تصوف کے ساتھ دشمنی قرار دیتے ہیں حالانکہ مخلص لوگ دل سوزی کے ساتھ اسلام کو اس قسم کی رطب و یابس باتوں سے پاک رکھنا چاہتے ہیں۔ اور یہ جو اسلامی دورِ حکومت میں صوفیوں کی بجائے قضاۃ اور علما و فقہا اور حکمائے اسلام پیش پیش ہوتے تھے اور فتاویٰ نویسی اور فصلِ مقدمات کا تعلق انہی سے ہوتا تھا بلکہ دین کے جملہ اُمور انہی کے مشوروں اور ہدایات کے مطابق طے پاتے تھے تو کیا بے پیر ہونے کی وجہ سے وہ اور اُن کے ماننے والے اور اُن کے فتاویٰ و اقوال و اعمال سب خارج از اسلام سمجھے جائیں گے؟ غرضکہ اس باب میں نیازی صاحب نے ایسی عجیب و غریب باتیں تحریر فرمائی ہیں کہ اُن سب پر تبصرہ کرکے ہم اپنے مضمون کو غیر ضروری طوالت کے نذر نہیں کرنا نہیں چاہتے۔

نیازی صاحب فرماتے ہیں کہ خود علامہ اقبالؔ نے بھی یہی تعلیم دی ہے ؎

کیمیا پیدا کُن از مُشتِ گِلے　　بوسہ زن بر آستانِ کاملے

اندریں عالم نیرزی با خسے　　تا نیاویزی بدامانِ کسے

اقبالؔ نے کامل کی قید لگائی ہے اور کاملین کی صحبت سے استفادہ اور ان کے اقوال و کردار سے فیوض و برکات حاصل کرنا اور بات ہے اور کسی کو دنیا و آخرت میں وسیلہ بنانا دوسری بات ہے۔ جس کی لے یہاں تک بڑھی کہ اگر (۱) کوئی شخص کسی پیر کے ہاتھ پر بیعت نہ ہوگا تو سیدھا جہنم میں جائے گا۔ کافر کی موت مرے گا وغیرہ (۲) کامل سے کسی خانوادۂ تصوف کے سجادہ نشین سے مراد ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور شخص خواہ وہ کتنا ہی بڑا عالم اور سنّتِ نبوی کا متبع کیوں نہو، کامل کے حکم میں نہیں آسکتا۔ اور اگر کامل نہ ملے تب بھی کسی خانوادۂ تصوف کے باقیات میں سے ہی کسی کا دامن تھام لینا چاہیئے تاکہ نسبت حاصل ہو جائے کہ نسبت ہی سے بیڑا پار ہو جائے گا۔ بلکہ نیازی صاحب تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ:-

"مذکورہ بالا اُمور کے پیشِ نظر کسی مردِ کامل کی محض تلاش و جستجو میں عمرِ عزیز ضائع کرنے اور بالآخر جاہلیت کی موت مرجانے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ کسی مستند سلسلے میں داخل ہو کر کاملینِ سلسلہ سے نسبت پیدا کرلی جائے تاکہ آئندہ زندگی میں جو قدم اُٹھے وہ صحیح راہ پہ ہو اور عاقبت بھی بخیر ہو جائے۔"[1]

یعنی تلاش و جستجو بھی نہیں کرنی چاہیئے کہ مبادا اسی حالت میں موت آجائے اور جاہلیت کی موت مرجاؤ۔ حالانکہ اسلامی تعلیمات کے رُو سے "اِنَّمَا الاَعْمَالُ بِالنِّیَّات" والی حدیث کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے رُو سے تو اگر کسی کی بیعت کا قلادہ گردن میں ڈالنا شرعاً ضروری ہے تو تلاشِ کامل میں مرجانے کی صورت میں ثمرۂ نیت سے کیوں محروم رہے گا۔ اور پھر کاملینِ سلسلہ سے محض نسبت پیدا کرلینے سے آئندہ زندگی میں ہر قدم صحیح راہ پر کیونکر اُٹھے گا جب کہ جس کے ہاتھ میں ہاتھ دیا ہے وہ جاہل اور

بے عمل ہے۔ ع او خویشتن گم است کرا رہبری کند!

"اقبال کے نظریے میں تو خراج اور سرکاری محصول بھی صدقہ وخیرات ہی کے حکم میں آتا ہے۔ (خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے!) رعایا سے جو کچھ بالجبر لیا جائے وہ سوال یا گداگری ہے، جس سے خودی کمزور ہوتی ہے۔ کسی حکمراں کا اکرام وانعام اسکی خدائی کی زکوٰۃ ہے۔ ان اصولوں کے بموجب ملازمین سرکار کی تنخواہیں، جو محاصل سے ادا کی جاتی ہیں کیا وہ بھی خیرات وصدقات، سوال یا گداگری میں شمار ہونگی"[1] (نیازی صاحب)

اقبال کے کلام کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی؛ ایسے ہی لوگوں کو وہ بڑی دلسوزی سے فرماتے ہیں کہ ع مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا! جب کلام کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی تو اس کے سیاق وسباق کو دیکھنے کی کیوں فکر کرنے لگے تھے۔ بس ایک بات سامنے آئی اور بے سوچے سمجھے حوالۂ قلم کردی۔ اقبال نے کون سے انعام واکرام کو خدائی کی زکوٰۃ کہا ہے۔ اور کس موقعے پر کہا ہے کلامِ اقبال کا مطالعہ کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ مگر نیازی صاحب نے اعتراض کی خاطر اس مخصوص موقعے کی بات کو عمومیت کا درجہ دیدیا۔ اور کیوں صاحب! یہ ملازمین کی تنخواہیں جو ان کی محنت اور کارکردگی کا معاوضہ ہیں خیرات وصدقات یا سوال وگداگری کے حکم میں کیوں آنے لگی تھیں۔ اصل میں اپنی محنت اور گاڑھے پسینے سے روزی حاصل کرنے والا خدا کا محبوب ہوتا ہے اس لئے اقبال مذکورہ بالا بیان سے لوگوں کے دلوں میں محنت ومشقت سے روزی کمانے اور اکل حلال کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھنے کا شوق پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور یوں بھی دوسروں کا دست نگر ہونا یا دوسروں کی کمائی سے عیش کرنا مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہو سکتا۔

"صوفیہ کی عملی زندگی اور ان کا مشرب فرقہ پرستی کے خلاف زبردست محاذِ جنگ ہے۔ دنیا سے فرقہ پرستی کی لعنت اور اسی قسم کی دوسری تنگ نظریوں کے دور کرنے کا واحد علاج اسلامی تصوف اور فقرائے اسلام کی تقلید ہے۔"[2] (نیازی صاحب)

اس میں شک نہیں کہ فرقہ پرستی اور تنگ نظری ایک لعنت ہے اور تصوف اسلام (جس کی اوپر تعریف ہو چکی ہے) کے ذریعے اس کو آسانی سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ عیوب نفسانی تقاضوں سے پیدا ہوتے ہیں اور اسلامی تصوف نام ہے تزکیۂ نفس، اخلاص فی العمل اور اپنی زندگی کو شریعتِ اسلامی کے قالب میں ڈھال دینے کا۔ مگر آج جو کثرت سلاسلِ تصوف کی ہے اور پھر ان میں باہم سخت اختلافات بھی ہیں۔ تو کیا یہ فرقہ بندی اور تنگ نظری کی دلیل نہیں ہے۔ قادریوں اور چشتیوں، نظامیوں صابریوں نقشبندیوں اور اسی طرح دوسرے سلسلوں میں جو معرکے ہو چکے ہیں وہ کس کو معلوم نہیں۔

"تاریخ اسلام میں ملوکی سیاست کی لعنتوں کے جو نمونے ہم تیرہ سو سال سے دیکھ رہے ہیں ان سے اسلامی اخلاق و روحانیت کو محفوظ رکھنا ہی بہتر ہے۔ ورنہ آیتِ پاک وَلْتَكُنْ مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ط اور تم میں ایک جماعت ہونی چاہیے۔ جو خیر کی طرف بلائے اور ممنوعات سے روکے۔ کی تعمیل ہرگز نہ ہو سکے گی اور عمل میں خلوص وللّٰہیت کا ایسا معیاری جذبہ تا قیامت نہ پیدا ہو گا کہ کس کی زبان سے

مقصودِ من خستہ ز کونین توئی　　　از بہر تو میرم و ز بہر تو زیم

کہنے کے قابل ہو سکے"[3] (نیازی صاحب)

[1] ایضاً ص۲۳ [2] ایضاً ص ــ [3] ایضاً ص۲۸

کس قدر تضاد ہے اس بیان میں! ایک طرف یہ کہنا کہ "ملوکی سیاست کی لعنتوں کے جو نمونے ہم تیرہ سو سال سے دیکھ رہے ہیں اُن سے اسلامی اخلاق و رُوحانیت کو محفوظ رکھنا ہی بہتر ہے (یعنی حافظ شیرازیؒ کے اُس شعر پر عمل کیا جائے کہ ؎

رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند   گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

اور دُوسری طرف یہ فرمانا کہ وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ ۔۔۔۔۔ الخ کے رُو سے ایک ایسی جماعت ضرور ہونی چاہیئے جو خیر کی طرف بلائے اور ممنوعات سے روکے۔ حالانکہ قرآن کی مذکورہ آیت کے رُو سے مُبلغین اسلام کی ایک ایسی جماعت بہرحال ہونی چاہیئے جو لوگوں کو بُرائی سے روکے اور نیکی کی طرف بلائے اور اس دعوت الی الخیر میں اہلِ سیاست کو اپنے حال پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اہلِ سیاست کو جانے دیجیئے۔ تبلیغ کا یہ کام موجودہ زمانے کے صوفیوں نے ایک دن بھی انجام نہیں دیا۔ بلکہ اس کے برعکس ایسے نظریات کی تبلیغ کی جن سے فرار اور بے عملی کی ترغیب ہوتی ہے۔

"بہرحال یہ ثابت ہو گیا کہ اخلاقی و رُوحانی تربیت کسی سیاسی اقتدار کی محتاج نہیں ہے نہ سیاسی و معاشی نظاموں کی اُستواری صُوفیائے کرام کا کام ہے۔ ان کی جماعت درصل ایک قسم کے مدرسین و مصلحین کی جماعت ہے اور وہ اپنے مخصوص مشن کی حد تک ہر وقت اپنا فرض ادا کرتے رہتے ہیں"۔ [1] (نیازی صاحب)

اول تو اگر سیاسی اقتدار ایسے ملحدوں اور بے دینوں کے ہاتھ میں ہو جو معاشرے کو ایسا نہ رہنے دیں جس میں اخلاقی و رُوحانی تربیت کی جا سکے تو صوفیہ اپنے متعلقہ فرائض کس طرح انجام دے سکتے ہیں۔ دُوسرے ابھی ابھی نیازی صاحب یہ فرما چکے ہیں کہ قوم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض انجام دیتی رہے تو ایسی صورت میں سیاسی و معاشی نظاموں کے فساد کو دیکھتے رہنا اور ان کی دُرستی و اصلاح کی فکر نہ کرنا کیا مواخذے کا موجب نہ ہو گا؟ تیسرے جب یہ کہا جاتا ہے کہ تصوف عین اسلام ہے تو پھر یہ کہنا کہاں تک دُرست ہے کہ سیاسی و معاشی نظاموں کی اُستواری صُوفیائے کرام کا کام نہیں ہے۔ اور ان کی جماعت اپنے مخصوص مشن کی حد تک اپنا فرض ادا کرتی رہتی ہے۔ (اس سے زیادہ ان کا کوئی کام نہیں ہے)

"اس سے بھی یہی ثابت ہوا کہ علامہ اقبال کے نظریۂ خودی کے تیسرے مرحلے نیابتِ الٰہی کی بنیاد وصل الی اللہ (ولایت: ۔ یعنی وہ مقام جہاں انسانیت اور الٰہیت ایک ہو جاتی ہیں) پر قائم ہے اور وہ اُن لوگوں کو ہرگز نصیب نہیں ہو سکتا جو صوفیائے کرام کے نظریۂ ولایت اور توحیدِ حقیقت و معرفت کے قائل نہ ہوں۔ اور اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اس نظریے میں فراق کی گنجائش نہیں ہے۔ جب تک فراق رہے گا انسانیت اور الٰہیت نہ ایک ہوں گے نہ انسانِ ربانی وجود میں آسکے گا۔ [2] (نیازی صاحب)

پھر یہی کہنا پڑتا ہے کہ نیازی صاحب نے اقبال کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ورنہ ایسا ہرگز نہ فرماتے۔ علامہ اقبال نے انسانیت اور الٰہیت کے اتصال کو ایک جگہ نہیں اپنے کلام میں اور دوسری تصانیف میں بھی جا بجا بیان کیا ہے۔ لیکن اللہ اور انسان کے اُس وصل کی کہیں بھی تائید نہیں کی ہے جو صوفیہ کے واصل باللہ یا فنا فی اللہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ مولانا رُوم نے بھی "منزلِ ما کبریاست" فرمایا ہے اور اقبال مولانا کے تتبع میں "یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ!" کا نعرہ لگاتے ہیں۔ مگر ان دونوں حضرات کی مُراد اس سے

[1] ایضاً صـ ۲۹۳ [2] ایضاً صـ ۳۶۸

یہ ہے کہ انسان اپنے انتہائی عروج کی حالت میں اپنے آپ کو صفاتِ الٰہیہ کے رنگ میں رنگ لیتا ہے اور یہی وہ اتصال جس کو وہ الٰہیت اور انسانیت کا اتصال کہتے ہیں۔ اور اسی بات کو انھوں نے آگ اور لوہے کی مثال سے واضح کیا ہے۔ اس اتصال میں انسان خدا کی ذات میں فنا نہیں ہوجاتا بلکہ خدا کی صفات اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔ جس طرح لوہا آگ میں تپنے کے بعد آگ کی صفات اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے کہ تخلقوا باخلاق اللہ کا مفہوم یہی ہے۔ اس بات کے لئے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ انسان کو نظریۂ ولایت اور توحید حقیقت و معرفت کا حامل ہونا چاہیئے ورنہ یہ بات حاصل نہ ہوگی۔ غرضکہ انسانیت اور الٰہیت سے اتصال اور بات ہے اور انسان اور خدا کا وصل یا اتصال اور بات!

"جہاں تک قرآن کے اصطلاحی مفہوم کا تعلق ہے اُس کا نمونہ شیطان کا کردار ہے۔ شیطان نے آدم کے صرف ظاہر کو دیکھا اور اُس کی باطنی حقیقت و فضیلت کا منکر ہو گیا۔ اس لئے وہ مردود ہوا۔ شیطان کے اس مردود نظریئے کے خلاف علامہ اقبال بھی ہیں۔ ورنہ وہ شیطان کو "خواجۂ اہلِ فراق" نہ کہتے ؎

کم بگیزاں خواجۂ اہلِ فراق تشنہ کام وازازل خونیں ایاق

غرضکہ موجودات کی حقیقت سے متعلق غلط نظریئے کو اسلامی تصوف میں فراق کہا گیا ہے اور علامہ بھی اس کے حامی نہیں ہیں۔ وہ جس فراق کے حامی ہیں اُسے وصل الی اللہ کہنا چاہیئے چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں ؎

میانۂ من واو ربطِ دیدہ و نظر است کہ در نہایت دوری ہمیشہ با اویم" [1] (نیازی صاحب)

"شیطان" کو "خواجۂ اہلِ فراق" اس وجہ سے نہیں کہا گیا کہ جو نیازی صاحب نے بتلائی ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ وہ انسان میں وہ صفات پیدا کرتا رہتا ہے جو اس کو خدا سے دور رکھتی ہیں۔ اور اُن لوگوں کی سرپرستی کرتا ہے جو ایسی صفات کے حامل اور خدا دشمنی میں یکتا ہوتے ہیں۔

فراق کی جو تعریف نیازی صاحب نے کی ہے وہ ایسی عجیب و غریب ہے کہ پہلی بار ہمارے سامنے آئی ہے۔ حالانکہ فراق سے مراد ہے اپنے اندر خدائی صفات کی بجائے شیطانی صفات پیدا کرنا جس سے انسانیت الٰہیت سے دور ہوتی ہے قرآن نے بھی اُن لوگوں کو اولیاء اللہ کہا ہے جو اللہ پر ایمان لاکر عمل صالح کرتے ہیں اور اس کے برخلاف جو خدا کے منکر ہیں اور جن کے اعمال فسق و فجور اور فساد کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ان کو اولیاء الطاغوت کے نام سے یاد کیا ہے۔

یہ کہنا کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ علامہ اقبال جس فراق کے حامی ہیں اُسے وصل الی اللہ کہنا چاہیئے۔ کیا یہ کھلا ہوا تضاد نہیں ہے؟ اور جو مثال اس کے لئے دی ہے وہ بھی کس قدر بے محل ہے۔ مثال کا مفہوم تو اُسی اتصال کی تائید کر رہا ہے جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ یعنی جس طرح دیدہ اور نظر ایک دوسرے سے دور بھی ہیں اور متصل بھی اسی طرح ہم بھی خدا سے دور ہوتے ہوئے متصل بھی ہیں۔ دور اپنے تشخص ذاتی کے اعتبار سے اور قریب اس کی امانت کے حامل ہونے کی وجہ سے۔

"مذکورہ بالا حقائق سے یہ بات بھی ثابت ہوجاتی ہے کہ نٹشے کا مافوق البشر خیالی اور ظنی ہے لیکن ہمارا "انسان کامل" حقیقی ہے۔ جو اقوام وحی و رسالت پر ایمان نہیں رکھتیں اُنہیں انسان کامل کا

[1] ایضاً ص ۳۱۶

انتظار ہے اور وہ سمجھتی ہیں کہ دنیا میں ابھی تک ایسا انسان پیدا نہیں ہوا۔
لیکن ہم اُن کے سامنے جملہ انبیائے کرام بالخصوص سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور آپ کے بعد آپ کے صحیح جانشین اولیاء کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ذواتِ گرامی بطور اظہار فخر و افتخار پیش کرتے ہیں اور انہیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے لیکن ولایت کا دروازہ قیامت تک کھلا ہے گا اور صفاتِ النبیہ کی زندہ نشانیاں اولیاءِ کرام کی ذواتِ گرامی کی شکل میں دُنیا میں آتی رہیں گی۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں :۔

"اب صرف ایک سوال پر غور کرنا باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ اگر اقبال کو کسی مردِ کامل کا انتظار نہیں ہے تو وہ کیوں فرماتے ہیں ؎

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا — اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو — در سوادِ دیدہ ہا آباد شو
نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی — کاروانِ زندگی را منزلی
خیز و قانونِ اخوت ساز دہ — جامِ صہبائے محبت باز دہ

معلوم ہوا کہ علامہ اقبال کو ایک ایسے انسانِ کامل کا انتظار ہے جو قانونِ اخوت کو نافذ کر کے نہ صرف ملّتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی کر سکے بلکہ تمام عالمِ انسانیت کو رشتۂ محبت و اخوت میں منسلک کر کے دنیا میں امن قائم کر دے۔ ظاہر ہے کہ ایسا انسانِ کامل نبی یا ولی کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیکن اسلامی عقیدے کے بموجب حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی دوسرے نبی کے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ کوئی ولی کامل ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے ذہن میں یہ غیر معمولی شخصیت صرف ولی کامل کی نہ ہوگی بلکہ مزید اوصاف بھی رکھتی ہوگی۔ کیونکہ ملّتِ اسلامیہ کا شیرازہ منتشر ہونے کے بعد سے آج تک کسی ولی کامل سے بھی دُرست نہ ہو سکا۔ حالانکہ اس دوران میں ہزاروں کاملین گذر گئے۔ ان حالات میں اس عُقدے کا حل "عقیدۂ امامِ مہدی" میں نظر آتا ہے جن کے منتظر مسلمانوں کے متعدد فرقے ہیں"[1] (نیازی صاحب)

کسی نے سچ کہا ہے کہ ؎ خشتِ اول چوں نہد معمار کج ؛ تا ثریا می رود دیوار کج —— نیازی صاحب نے نہ اقبال کو سمجھنے کی کوشش کی نہ نیٹشے کو۔ اور کہنا شروع کر دیا ان دونوں کے نظریۂ انسانِ کامل پر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ لکھا وہ شروع سے آخر تک غلط اور بے معنی ہو کر رہ گیا۔ اول تو اقبال کے "انسانِ کامل" اور نیٹشے کے "فوق البشر" میں بڑا فرق ہے۔ مگر یہاں اس کے بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔ یہاں تو نیازی صاحب کی اس غلط فہمی کو دُور کرنے کے لیے کہ اقبال کو بھی کسی مردِ کامل کا انتظار ہے اور وہ امام مہدی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اتنا عرض کر دینا مناسب ہے کہ اقبال کسی ایک مردِ کامل کے منتظر نہیں۔ انفرادی طور پر ایسے کامل الانسان انبیاءِ کرام اور بالخصوص حضور خاتم النبیین کی ذاتِ گرامی میں ظہور کر چکے ہیں۔ اور حضور کے بعد حضور کے جانشین صحابہ

[1] ایضاً صـ ۳۲

تابعین اور تبع تابعین ہوتے رہے اور اس دور کے بعد صوفیائے کرام اور صلحاء و اتقیائے اُمت میں یہ عکس نظر آتا رہا ہے۔ بلکہ اقبال تو یہ چاہتے ہیں کہ کاش وہ زمانہ آئے کہ جب نوع انسانی کی کشت زار سے ایسے ہی انسان پیدا ہوں جن میں وہ صفات پائی جائیں جو کبھی کبھی کسی ایک آدھ کامل انسان میں مل جاتی ہیں کہ یہی نوع انسانی کی معراج ہوگی اور ایسی ہی صورت میں دنیا کا دکھ درد دُور ہوکر وہ زمانہ آئے گا جس کی تمنا اقبال نے اپنے محولہ بالا اشعار میں کی ہے۔ اور یہ بات ناقابلِ عمل یا محال نہیں ہے جب کہ خلافت راشدہ کے زمانے میں محدود حد تک ہی زمانے کی آنکھیں ایسا معاشرہ دیکھ چکی ہیں۔ رہا مہدی کے متعلق اقبال کا عقیدہ سو ذیل کی دو[۲] نظموں سے اچھی طرح واضح ہو سکتا ہے۔

(۱) مہدیٔ برحق۔

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس — خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیّار
پیرانِ کلیسا ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں — نے جدّتِ گفتار ہے نے جدّتِ کردار!
ہیں اہلِ سیاست کے وہی کہنہ خم و پیچ — شاعر اُسی افلاسِ تخیّل میں گرفتار
دُنیا کو ہے اُسی مہدیٔ برحق کی ضرورت — ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار (ضربِ کلیم)

ظاہر ہے اس نظم میں مہدیٔ برحق سے وہ مہدی مراد نہیں ہے جس کا بقول نیازی صاحب مسلمانوں کے متعدد فرقوں کو انتظار ہے بلکہ وہ ہر اُس شخص کو مہدیٔ برحق سمجھتے ہیں جس کی نگاہ سے عالمِ افکار میں زلزلہ آجائے، شیخانِ حرم میں جدّتِ گفتار اور جدّتِ کردار پیدا ہو جائے اہلِ سیاست اپنے سیاست کے کہنہ خم و پیچ سے نکل کر میدانِ سیاست میں نئے انداز سے تگ و تاز کرنا سیکھیں اور شاعر اپنے افلاسِ تخیل سے نکل کر خیالات کے تنوع اور افکار کی بوقلمونی سے مالا مال ہو جائے۔

(۲) مہدی۔

قوموں کی حیات اُن کے تخیّل پہ ہے موقوف — یہ ذوق سکھاتا ہے ادب مرغِ چمن کو
مجذوب فرنگی نے بہ اندازِ فرنگی — مہدی کے تخیّل سے کیا زندہ وطن کو
اے وہ کہ تو مہدی کے تخیّل سے ہے بیزار — نومید نہ کر آہوئے مشکیں سے ختن کو
ہو زندہ کفن پوش تو میت اُسے سمجھیں — یا چاک کریں مردکِ ناداں کے کفن کو (ضربِ کلیم)

اس نظم سے ثابت ہوتا ہے کہ اقبال مہدی کے خیال کو محض اس لئے اچھا سمجھتے ہیں کہ اس سے مُردہ قوم میں زندگی پیدا ہونے کی اُمید ہوتی ہے جس طرح نیٹشے نے اپنی قوم کو "فوق البشر" کا تصور دے کر موت کی گہری نیند سے جگا دیا تھا۔ بہت ممکن ہے اقبال بھی "مردِ کامل" کے تصور سے اپنی ملّتِ مُردہ کی رگوں میں خونِ زندگی دوڑانا چاہتے ہوں۔ غرضکہ یہ محض ایک تصور ہے قوم کو زندہ رکھنے کا یا نوع انسانی کو اُس مقام پر دیکھنا چاہتے ہیں جہاں کبھی کبھی ایک آدھ مردِ کامل پہونچ جاتا ہے۔ یعنی بعض افراد نے تو ہر زمانے میں انسانیت کا مقام بلند حاصل کیا ہے مگر ایسا زمانہ بھی تو آنا چاہیئے کہ جب نوع انسانی من حیث المجموع اُس مقامِ رفیع پر پہونچ جائے۔ اس لئے کہ جو اُخوت کا منظر اقبال دیکھنا چاہتے ہیں یہ تو اُسی وقت دیکھنے میں آسکتا ہے کہ جب نوع انسانی اُس مقام پر پہنچ جائے۔

سلسلۂ اقتباسات کافی طویل ہو گیا۔ بہرحال مضمون زیرِ بحث کے لئے جو خیال ذہن میں آیا تھا خلوصِ نیت کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کر دیا گیا یعنی یہ کہ عنوان مذکور پر دو قسم کے لوگوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ ایک نے مغربی فلاسفر کے نظریات کو سامنے رکھا ہے تو دوسرے صوفی عجمی تصورات کو۔ اول الذکر نے اقبال کا مقابلہ مغربی فلاسفر سے کر کے یہ سمجھ لیا کہ "اقبال اور تصوف" پر مضمون لکھنے کا حق ادا ہو گیا اور آخر الذ

نے اقبالؔ کو عجمی تصوف کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لئے اقبالؔ کی کتابوں سے اقتباسات لے کر ان کو اپنے طبع زاد معنی پہنا دیئے اور جہاں اپنے معنی پہنانے میں کامیاب ہو سکے وہاں اقبالؔ کو غلطی کا مرتکب قرار دیدیا ہے۔ ہم نے پہلی قسم کے لوگوں سے بحث نہیں کی ہے اور دوسری قسم کے لوگوں میں سے بھی صرف ایک صاحب کے خیالات بطور نمونے کے پیش کر کے ان خیالات کی حقیقت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

اس تمام بحث کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگوں نے جو اسلامی تصوف اور عجمی تصورات کو ایک سمجھ کر اقبالؔ کو تصوف کا مخالف یا حامی یا اس بارے میں متضاد خیالات کا حامل قرار دیا ہے وہ بالکل غلط بلکہ ایک قسم کا بہتان ہے۔ اسلامی تصوف تو نام ہے اس صفائے باطن اور تزکیۂ نفس کے حاصل کرنے کا جو کتابُ اللہ اور سُنّتِ رسول ؐ کے سانچے میں اپنی زندگی کو ڈھال دینے سے حاصل ہو۔ جس کو قرآن میں تزکیۂ نفس اور حدیث میں احسان کا نام دیا گیا ہے یا دوسرے الفاظ میں تصوف نام ہے خدا اور رسول ؐ کی سچی محبت بلکہ عشق کا۔" اور عشق کا تقاضا یہ ہے کہ خدا کے احکام اور اس کے رسول ؐ کی پیروی سے بال برابر انحراف نہ کیا جائے۔ اسلامی تصوف شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ شریعت کے احکام کو انتہائی خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ بجا لانے اور اطاعت میں خدا کی محبت اور اس کے خوف کی روح بھر دینے کا نام تصوف ہے..... اور اقبال اس تصوف کے مداح ہی نہیں بلکہ اپنے آپ کو اس سے وابستہ کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف عجمی تصوف، یعنی وہ نظریات جو بدھ مت اور ویدانت یا دوسرے راستوں سے مسلمانوں میں داخل ہو گئے ہیں، جن کی وجہ سے مسلمانوں کی قوتِ عمل مفلوج ہو کر رہ گئی ہے جیسا کہ مولانا مودودی فرماتے ہیں "افسوس ہے کہ بعد کے زمانوں میں علم اور اخلاق کے زوال سے جہاں اور بہت سی خرابیاں پیدا ہوئیں، تصوف کے پاک چشمے کو بھی گندلا کر دیا گیا۔ لوگوں نے طرح طرح کے غیر اسلامی فلسفے، گمراہ قوموں سے سیکھے اور ان کو تصوف کے نام سے اسلام میں داخل کر دیا عجیب عجیب قسم کے عقیدوں اور طریقوں پر تصوف کا نام چسپاں کیا جن کی کوئی اصل قرآن اور حدیث میں نہیں ہے۔ پھر اس قسم کے لوگوں نے رفتہ رفتہ اپنے آپ کو شریعت کی پابندی سے بھی آزاد کر لیا۔ وہ کہتے ہیں کہ تصوف کو شریعت سے کوئی واسطہ نہیں، یہ کوچہ ہی دوسرا ہے۔ صوفی کو قانون اور قاعدے کی پابندی سے کیا سروکار۔ اس قسم کی باتیں اکثر جاہل صوفیوں سے سننے میں آتی ہیں۔ مگر دراصل یہ بالکل غلط ہیں اسلام میں کسی ایسے تصوف کی گنجائش نہیں ہے جو شریعت کے احکام سے بے تعلق ہو۔ کسی صوفی کو یہ حق نہیں کہ وہ نماز، روزے اور حج اور زکوٰۃ کی پابندی سے آزاد ہو جائے۔ کوئی صوفی ان قوانین کے خلاف عمل کرنے کا حق نہیں رکھتا جو معاشرت اور معیشت اور اخلاق اور معاملات اور حقوق و فرائض اور حدودِ حلال و حرام کے متعلق خدا اور رسول ؐ نے بتائے ہیں۔ کوئی ایسا شخص جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح پیروی نہ کرتا ہو اور آپ کے مقرر کئے ہوئے طریقہ کا پابند نہ ہو مسلمان صوفی کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہے" [1] اقبال ایسے ہی تصوف اور اسی قسم کے جاہل صوفیوں کے خلاف ہیں اور ان غلط نظریات اور ایسے صوفیوں کی مذمت "اسرار خودی" کی تصنیف کے وقت سے لے کر وفات تک کرتے رہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اقبال تصوف اسلام کے خلاف یا عجمی تصوف کے حامی تھے یا تصوف کے بارے میں متضاد خیالات رکھتے تھے تو ایسے شخص کے بارے میں یہی کہا جائے گا کہ اس نے اقبال کو مطلق نہیں سمجھا۔

———— × ————

کچھ غمِ جاناں، کچھ غمِ دوراں

بابا ذہین شاہ تاجی

جراحتِ دل و زخمِ جگر کے ساتھ رہوں
نظر ملی ہے تو تیری نظر کے ساتھ رہوں
دل و نگاہ نہ جانے حبیب ہیں کہ رقیب
میں دل کے ساتھ رہوں یا نظر کے ساتھ رہوں
نظر کے حق میں غنیمت ہیں چند جلوے بھی
مجھے یہ دُھن ہے کہ میں جلوہ گر کے ساتھ رہوں
چمن میں آتشِ گل سے نہ جل سکے خس و خار
مجھے یہ حکم ہے برق و شرر کے ساتھ رہوں
نظر نواز مناظر نہ لُوٹ لیں سرِ راہ
بس آنکھ بند کیے راہبر کے ساتھ رہوں
خدا ہی خود ہمہ پرواز ہے ذہین مرا
میں جبرئیل ہوں جو بال و پر کے ساتھ رہوں

راشد اللہ خاں جوہر

نہ خوفِ شب ہے نہ تاریکیوں کا ماتم ہے
ہمارے سامنے اک صبحِ نو کا عالم ہے
نگاہِ شوق کی گستاخیاں بجا لیکن
جمالِ دوست بھی کیا فتنہ ساز کچھ کم ہے
یہ اپنے فکر و نظر کا فریب ہے جوہر
نہ زندگی ہے مسرت، نہ زندگی غم ہے
جب دل میں نہ ہوگی کوئی خلش تو لطف کا ساماں کیا ہوگا
تسکین کا پہلو تو ہی بتا پھر لے غمِ جاناں کیا ہوگا

ٹوٹا کہ اُٹھا فتنے لیکن اے گردشِ دوراں کیا ہوگا
ہے جس کی نظر میں نورِ سحر ظلمت سے ہراساں کیا ہوگا
اے بھولنے والے! یاد نہ آ پھر زخم ہرے ہو جائیں گے
کچھ اور خلش بڑھ جائے گی، تسکیں کا تو ساماں کیا ہوگا
معراجِ محبت ملتی ہے یہ نعمت لیکن عام نہیں
مل جائے جسے مل جائے، ہر اک خاکِ رہِ جاناں کیا ہوگا

نظر برنی

پامالیٔ اربابِ وفا دیکھ رہا ہوں
بدلی ہے زمانہ کی ہوا دیکھ رہا ہوں
غنچے نہیں کھلتے نہ کلی ہیں مائل بہ تبسم
یہ معجزۂ دستِ صبا دیکھ رہا ہوں
اندازِ کرم اُن کا نہیں تازہ شگوفہ
اک عمر سے یہ کرب و بلا دیکھ رہا ہوں

دور ہاشمی کان پوری

زندگی کو سمجھا ہے ہم نے تشنگی ساقی
آج کام آئی ہے تیری بے رُخی ساقی
مسکرا کے بھر دیے آج ساغرِ تہی ساقی
موج مے سے کیا ہوگا؟ موجِ زندگی ساقی
لُطف ہے نہ بے لطفی، حال ہے نہ بے حالی
زندگی بسر کرلی ہے جیسے خودکشی ساقی
رات کے اندھیرے ہیں کیوں سحر کا دھوکا ہے
تیرگی کو سمجھا ہے سب نے روشنی ساقی

تیز دل کی دھڑکن ہے ہر نفس میں خوشبو سی
میرے پاس بیٹھا تھا کون یہ ابھی ساقی

راہی بلند شہری

ساحل کی ہے نہ موجِ خراماں کی بات ہے
ہر لب پہ آج شورشِ طوفاں کی بات ہے
دُنیا کے حادثات زمانہ کا انقلاب
اُن کے لئے تو جنبشِ مژگاں کی بات ہے
میری نظر میں طوق و سلاسل کے پیچ و خم
تیری نظر میں گیسوئے پیچاں کی بات ہے
وہ دن گئے کہ جب غمِ جاناں کی بات تھی
ہر انجمن میں اب غمِ دوراں کی بات ہے
جور خزاں سے گل میں چمن میں ورق ورق
شاعر کے لب پہ جشنِ بہاراں کی بات ہے
تم کیا سمجھ سکو گے جوانانِ عصرِ نو
گزری ہوئی بہار گلستاں کی بات ہے
راہی زمانہ کچھ بھی کہے، چاہے کچھ بھی ہو
ہم تو وہی کہیں گے جو ایماں کی بات ہے
کبھی جو کھیلتے تھے روز و شب شمشیر و پیکاں سے
وہ دل بہلا رہے ہیں اب قدِ گیسوئے جاناں سے
نہ گھبراؤ خزاں والو! چمن کی چیرہ دستی سے
بہاریں ساتھ لاؤں گا اگر لوٹا بیاباں سے
چراغِ تربتِ اہلِ وفا روشن رہے پھر بھی
اگرچہ آندھیاں گزریں بہت گورِ غریباں سے

انوار ظہوری

تجربہ یہ ہو گیا جدائی میں
کوئی تم سا نہیں خدائی میں
تم سامنے رہو کہ ہو پوری مری غزل
کل رات سے پڑی ہے ادھوری مری غزل
وہ کشیدہ نظر آئے مری غزلیں سن کر
واقعی اُن کی طرف روئے سخن ہو جیسے
دُنیا کو چپ لگ جائے گی
سوچ رہا ہوں کیا منہ کھولوں
ان آنکھوں نے جو کچھ دیکھا
سچ سچ بولوں سچ سچ بولوں

حمید ناگپوری

بے وقت کا یہ زمزمۂ خواب اثر کیا
دل جس سے نہ بیدار ہوں وہ فکر و نظر کیا
اس زندہ حقیقت پہ نہیں تیری نظر کیا
جب موت یقینی ہے تو پھر موت کا ڈر کیا
ہاں! پوچھ کسی محرمِ اسرارِ خودی سے
تجھ کو نہیں معلوم نظر کیا ہے خبر کیا ہے
اس دورِ ترقی پہ تو نازاں ہے مگر دوست
انساں کی تباہی پہ نہیں تیری نظر کیا
دیکھا نہ حمید اس کو کسی حال میں راضی
کیا جانیئے انساں کا ہے مقصودِ نظر کیا

عابد نظامی

اتنی شدید تلخیٔ ایام ہو گی
میری حیات زہر بھرا جام ہو گئی
دولت عطا ہوئی جو غمِ روزگار کی
وہ بھی غمِ حبیب ترے نام ہو گئی
اے ہم صفیر! کوئی تو خوبی ضرور ہے
چرچے ہر اک چمن میں مرے آشیاں کے ہیں

روحِ انتخاب

دُعا کیا ہے؟

رسُولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبانِ مُبارک سے!

- حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، فرمایا رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، مسلمان آدمی کی دُعا اپنے مسلمان بھائی کے لیے اس کی عدم موجودگی میں قبول کی جاتی ہے، دُعا مانگنے والے کے سر کے قریب ایک فرشتہ مقرر کردیا جاتا ہے۔ اور جب وہ اپنے بھائی کی بھلائی کے لئے دُعا کرتا ہے، تو فرشتہ آمین کہتا ہے، یعنی خدا سے کہتا ہے، کہ اے اللہ! اس کی دُعا قبول فرما۔ اور پھر فرشتہ دُعا مانگنے والے سے کہتا ہے اور تجھ کو بھی اسی کی مانند (مسلم)
- حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، فرمایا رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا عبادت ہے اور پھر آپؐ نے یہ آیت پڑھی وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ (اور تمہارے پروردگار نے کہا ہے دُعا مانگو میں قبول کروں گا) (مسلم)
- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرمایا رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے نزدیک دُعا سے زیادہ کوئی چیز باعظمت نہیں ہے۔ (مسلم)
- حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، فرمایا رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں پھیرتی تقدیر کو مگر دُعا۔ اور نہیں زیادہ کرتی عمر کو مگر نیکی۔
- حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، فرمایا رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا نفع دیتی ہے اس چیز سے جو اُتری یعنی بلا اور مُصیبت وغیرہ اور اس چیز سے جو نہیں اُتری، پس اے خدا کے بندو! دُعا کو اپنے اوپر لازم جانو۔
- حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسُولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب کوئی شخص خدا سے دُعا مانگتا ہے یا تو خدا اس کے سوال اور خواہش کو پُورا کردیتا ہے یا دور کردیتا ہے اس سے بُرائی کو جو دُعا کے برابر ہو جب تک وہ کسی گناہ یا قرابت منقطع کرنے کی دُعا نہیں مانگتا۔
- حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، فرمایا رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگو اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ مانگنے کو بہت پسند کرتا ہے۔ اور بہترین عبادت انتظار کرنا ہے کشادگی کا۔
- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شخص خدا سے سوال نہیں کرتا، اللہ اس سے ناراض ہوجاتا ہے۔
- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، فرمایا رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس شخص کو یہ بات پسند ہو کہ سختیوں کے وقت اللہ تعالیٰ اس کی دُعا قبول فرمائے، اس کو چاہیئے کہ وہ فراخی اور خوش حالی کے وقت کثرت سے دُعا مانگے۔
- حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تم میں سے جس کے لئے کھولا گیا دروازہ دُعا کا کھولے گئے اس کے

لئے دروازے رحمت کے۔ اور اللہ تعالیٰ سے جو چیزیں مانگی جاتی ہیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بہتر یہ چیز عافیت ہے۔

- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ خدا سے دعا مانگو اس امر کا یقین کر کے کہ وہ ضرور قبول فرمائے گا اور اس بات کو جان لو کہ اللہ تعالیٰ غافل قلب رکھنے والے کی دعا قبول نہیں کرتا۔
- حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارا رب بہت حیادار ہے۔ بغیر مانگے دینے والا ہے۔ اور حیا کرتا ہے اپنے بندے سے کہ جب وہ ہاتھ اٹھائے طرف اس کے یہ کہ خالی پھیرے ان ہاتھوں کو۔
- حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بہت جلد قبول ہونے والی وہ دعا ہے جو غائب کے واسطے کرے۔ اس لئے کہ اس میں خلوص ہوتا ہے۔
- حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عمرہ کرنے کی اجازت طلب کی۔ آپ نے اجازت دے دی اور فرمایا میرے چھوٹے بھائی! اپنی دعاؤں میں مجھ کو شامل رکھنا، بھول نہ جانا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ایک ایسی بات فرمائی جو مجھ کو ساری دنیا کے مقابلے میں پسند ہے۔
- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین آدمیوں کی دعا رد نہیں ہوتی (یعنی ضرور قبول کی جاتی ہے) ایک تو روزہ دار کی دعا اس وقت جب کہ وہ روزہ افطار کرے۔ دوسرے عادل حاکم کی دعا۔ اور تیسرے مظلوم کی دعا کہ اس کی دعا کو اللہ تعالیٰ ابر کے اوپر بٹھاتا ہے۔ یعنی کہ وہ جلد خدا کے ہاں چلی جاتی ہے۔ اور کھولے جاتے ہیں مظلوم کی دعا کے لئے آسمان کے دروازے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قسم ہے اپنی عزت کی میں مدد کروں گا تیری اگرچہ کچھ دنوں کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔
- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تین دعائیں قبول کی جاتی ہیں اور ان کے قبول ہونے میں کوئی شک نہیں۔ (۱) ایک باپ کی دعا (۲) دوسرے مسافر کی (۳) تیسرے مظلوم کی دعا۔
- حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو چاہیئے کہ اپنی تمام حاجتیں خدا سے مانگو۔ یہاں تک کہ اپنی جوتی کا تسمہ بھی مانگو جب کہ وہ ٹوٹ جائے۔ اور ثابت بنانی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: - کہ نمک مانگے اور یہاں تک کہ جوتی کا تسمہ بھی مانگے جب کہ وہ ٹوٹ جائے۔
- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو مسلمان دعا مانگے اور اس میں کوئی ایسی دعا نہ ہو جس میں گناہ یا قرابت داری کے انقطاع کا ذکر ہو تو خدا تعالیٰ مانگنے والے کو ان تین چیزوں میں سے ایک چیز ضرور عطا فرماتا ہے (۱) یا تو اس کا مقصد جلد پورا کر دیتا ہے (۲) یا اس کی دعا کو آخرت کے لئے ذخیرہ بنا کر رکھتا ہے (۳) یا دعا مانگنے والے کی کوئی ایسی ہی یا اتنی ہی برائی دور کر دیتا ہے جتنی کہ دعا میں اس نے نفع کی خواہش کی تھی۔

ہماری نظر میں

حیات حضرت امام ابو حنیفہؒ

تالیف :- محمد ابوزہرہ (پروفیسر یونیورسٹی، مصر) ترجمہ :- غلام احمد حریری (ایم اے، پروفیسر اسلامیہ کالج لائل پور) ——— تنقیح، تحقیق، تعلیق از :- مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی ——— ضخامت ۸۰۷ صفحات (بڑا سائز، مجلد، رنگین سرورق) قیمت ۱۵ پندرہ روپلے

ملنے کا پتہ :- المکتبۃ السلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور ۲

علامہ محمد ابوزہرہ عالمِ اسلام کے مشہور صاحبِ مفکر عالم ہیں۔ صاحب موصوف نے متعدد ضخیم و بسیط بلند پایہ کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں سے بعض کے ترجمے اردو میں ہو چکے ہیں اور ان تراجم کے ذریعہ اردو دنیا علامہ ابوزہرہ سے اچھی طرح متعارف ہو چکی ہے یہ کتاب حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حالات، عصری پس منظر، عمیق اجتہادات اور عالمگیر تفقہ پر قابل قدر دینی اور علمی پیش کش ہے۔ ذیل کے عنوانات سے اس کتاب کی اہمیت، وافادیت اور علمی حیثیت کا ایک حد تک اندازہ ہو سکتا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کی داستانِ حیات ——— ذاتی اوصاف و کمالات ——— شیوخ و اساتذہ ——— خصوصی مطالعات و تجربات ——— امام ابو حنیفہ کا عہد ——— سنت نبویؐ اور رائے ——— اسلامی فرقے (شیعہ، خوارج مرجئہ اور معتزلہ) ——— معتزلہ کے مناظرے اور علم کلام ——— امام ابو حنیفہؒ کے سیاسی افکار ——— امام صاحب کے کلامی نظریات ——— ایمان کی حقیقت ——— مسئلہ خلق قرآن ——— امام ابو حنیفہ کی فقہ ——— فقہ حنفی کے ناقل تلامذہ امام ——— فقہ امام ابو حنیفہ کے اصول ——— دلائل فقہیہ امام ابو حنیفہ کی نظر میں (کتاب اللہ اور سنت نبویہؐ) ——— امام ابو حنیفہ اور حجیت حدیث مرسل ——— فتاویٰ صحابہؓ ——— اجماع ——— قیاس ——— استحسان ——— عرف عادات ——— تفکیر امام ابو حنیفہؒ کی دقیقہ سنجیاں ——— شرعی حیلے ——— حنفی مذہب اور اس کا نشوو ارتقاء ——— فقہ حنفی کے مجتہدین اور اہل تخریج ——— حنفی مذہب میں اقوال کی کثرت اور اس کے وجوہ و اسباب ——— تخریج و ترجیح ——— حنفی مذہب کا شیوع اور اشاعت عام

ان ابواب کے تحت سینکڑوں ذیلی عنوانات ہیں۔ فاضل مؤلف نے امام ابو حنیفہ کے سوانح زندگی کے علاوہ آپ کے علمی اور دینی افکار کو جس تحقیق و دیدہ ریزی کے ساتھ مدون فرمایا ہے اس پر علامہ موصوف علمی اور دینی دنیا کی طرف سے تبریک و تحسین کے مستحق ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مدح بھی کی گئی ہے اور قدح بھی ——— اس کے کیا اسباب ہیں؟ فاضل مؤلف اس کی نشاندہی کرتے ہیں :—

"فقہ اسلامی کی تاریخ کسی ایسے شخص سے آشنا نہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کی طرح جس کی مدح و قدح کرنے والے بڑی کثیر تعداد میں پائے جاتے ہوں، آپ کی تعریف کرنے والوں نے بڑی کثرت سے کتابیں لکھیں اور مذمت کرنے والوں نے بھی جرح و قدح کا کوئی تیر چلائے بغیر نہ چھوڑا، اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ

فکر و نظر میں ایک مستقل مسلک کے بانی اور موسس تھے، جس میں آپ نے بڑے غور و فکر سے کام لیا، لہٰذا کوئی وجہ نہ تھی کہ آپ کے ثنا خوانوں کے ساتھ ایک گروہ کثیر مخالفین کا نہ ہوتا، آپ کے مخالف زیادہ تر وہ لوگ تھے جو حریت فکر کے میدان میں آپ کا مقابلہ نہ کر سکے، یا امام کی فقاہت فہم و شعور سے بالا تھی، یا پھر ایسے لوگ تھے جو ہر اس طریقہ کو بدعت اور خلافِ حق قرار دیتے تھے، جس میں صرف اقوالِ سلف پر اکتفا نہ کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ آپ "رائے" سے زیادہ کام لیتے ہیں حالانکہ ایسے مواقع پر وہ توقف یا کم از کم "قیاس" سے کام لینے کے قائل تھے" (ص ۹۲)

اور

"۔ ۔ ۔ ۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ قیاس فقہی کے امام تھے، جو نصوص کے پوشیدہ گوشوں سے علل الاحکام کو ڈھونڈ نکالتے، پھر ان کے حکم میں عموم پیدا کرتے، علل اور نصوص معارضہ میں ایسی عادلانہ تطبیق دیتے کہ نہ نص سے دور ہٹتے اور نہ قیاس کو ہاتھ سے جانے دیتے، جب کسی موقعہ پر قیاس ناساز گار ہوتا تو اس مسئلہ میں استحسان کی طرف رجوع کرتے اور اس سے آگے نہ بڑھتے، وہ ایسے مقامات میں قباحتِ قیاس کو زائل کر دیتے جہاں وہ موزوں نہ ہوتا اس کے عموم کو باقی رکھتے اور اس کے تلازم کو زائل کر دیتے" (ص ۱۱۵)

حق یہ ہے کہ دینی مسائل میں امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا "قیاس" کتاب و سنت اور اجماع صحابہ کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا تھا آپ کی فقہی فکر کتاب و سنت کے مزاج سے ہم آہنگ تھی! فاضل مؤلف نے کتنی سچی بات کہی ہے :-

"حقیقت یہ ہے کہ عموم و علل احکام سے شدید وابستگی ہی امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں فقہائے عراق اور فقہائے حجاز کے درمیان فیصلہ کن فرق تھا، چونکہ امام ابوحنیفہؒ صحتِ قیاس کی صورت میں تعمیم علل کے بڑے حریص تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے حدیث کی بجائے قیاس و رائے میں زیادہ نام پایا اور اسی وجہ سے آپ کے قیاسات کی خبریں لوگوں میں عام طور پر پھیلنے لگیں ورنہ آپ کے نزدیک حدیث نبویؐ برابر قابلِ حجت تھی امام صاحب متبع سنت تھے اور ہرگز دین میں کوئی نئی بات اختراع کرنے والے نہ تھے" (ص ۵۲۹)

لائق و فاضل مولف نے "تقلید و اتباع" کے سلسلہ میں بڑی اچھی اور دل لگتی بات کہی ہے :-

"اتباع بہر حال ابتداع سے بہتر ہے" (ص ۱۷)

اس کتاب میں صریحی طور پر اس حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے کہ :-

"امام ابوحنیفہؒ کی رائے میں حضرت علیؓ نے جو لڑائیاں لڑیں ان سب میں حق و صواب حضرت علیؓ کی جانب تھا، حضرت علیؓ کے مخالفین کی کوئی تاویل ان کی نگاہ میں قابلِ تسلیم نہ تھی جیسے ان کو برا بھلا کہنے کے لئے کوئی وجہ جواز نہ تھی ــــــ آپ (امام ابوحنیفہؒ) کا قول تھا :-

"حضرت علیؓ جس کے خلاف بھی نبرد آزما ہوئے، ہمیشہ حق آپ کی جانب رہا" (ص ۲۶۷)

ناصبی مورخ محمود احمد عباسی کے موقف کی تائید کرنے والوں کو کاش ! امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ سچا قول قبولِ حق کے لئے آمادہ کر سکے

امام ابوحنیفہ اور امام مالک "استحسان" کے قائل اور عامل تھے مگر امام شافعی فرمایا کرتے تھے کہ "جس نے استحسان سے کام لیا اس نے خود دین گھڑ لیا" اور اس بارے میں حق "استحسان" کرنے والوں کے ساتھ ہے، بعض اوقات کسی مسئلہ میں ضرورت سے زیادہ احتیاط بالآخر "وہم" بن جاتی ہے۔

غلط کہتا ہے، جو بھی کہتا ہے کہ امام ابوحنیفہ قیاس کو نص پر مقدم کرتے ہیں، اس کتاب میں حضرت امام ابوحنیفہ کا یہ صریحی قول ملتا ہے! —

"جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہم قیاس کو نص پر مقدم کرتے ہیں، بخدا اس نے افترا پردازی سے کام لیا، کیا نص کے ہوتے ہوئے قیاس کی ضرورت بھی ہوتی ہے"

فاضل مؤلف نے اس سلسلہ میں اور زیادہ وضاحت کی ہے: —

"مذکورہ بالا قول میں آپ (ابوحنیفہؒ) نے قیاس کو وہی مرتبہ دیا ہے، جس کا وہ استحقاق رکھتا ہے، آپ فرماتے ہیں، قیاس کی طرف اسی صورت میں رُجوع کیا جا سکتا ہے جب نص کا کہیں پتہ نہ ہو، اگر نص موجود ہو تو قیاس کی کوئی حاجت نہیں، بلکہ ایک مرتبہ صراحۃً فرمایا۔

"ہم شدید ضرورت کے وقت قیاس کرتے ہیں، کیونکہ ہم مسئلہ کی دلیل کتاب و سُنّت اور فتاوئ صحابہ سے تلاش کرتے ہیں، دلیل کے فقدان کی صورت میں غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کرتے ہیں"۔ (ص ۲۲۷)

فقہ حنفی کا جب ذکر چھڑتا ہے تو "باب الحیل" کا نام طنز کے طور پر لیا جاتا ہے علامہ ابوزہرہ نے "شرعی حیلوں" پر بڑی تفصیل کے ساتھ گفتگو فرمائی ہے اور فقہ حنفی کی بڑے سلیقہ سے مدافعت اور وکالت کی ہے —— ایک مثال: —

"امام ابوحنیفہؒ سے ایک شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو اپنی بیوی سے کہے اگر مجھ سے خلع کا مطالبہ کرے اور میں خلع نہ کروں تو تجھے تین طلاق، اور عورت نے اس کے جواب میں کہہ دیا کہ اگر میں رات ہونے سے پہلے پہلے تجھ سے خلع کا مطالبہ نہ کروں تو میرے غلام آزاد ہوں اور میرا سب مال صدقہ کر دیا جائے ——

اب اس صورت میں ایک بات ضرور ہوگی یا تو طلاق بائن واقع ہوگی یا عورت کے غلام آزاد ہو جائیں گے اور سب مال صدقہ کر دیا جائے گا، حالانکہ یہ دونوں کام بڑے دشوار ہیں! لہٰذا امام ابوحنیفہ اس میں ایک حیلہ عمل میں لاتے ہیں تاکہ خاوند اور بیوی کی یہ لغزش گناہ کا ارتکاب کئے بغیر اور بجز کسی شرعی مقصد کی خلاف ورزی کے معاف کی جا سکے وہ اس صورت میں امام صاحبؒ نے یہ تجویز کی کہ عورت خلع کا مطالبہ کرے، چنانچہ عورت بولی —— "میں خلع کا مطالبہ کرتی ہوں" پھر امام ابوحنیفہؒ نے خاوند سے کہا کہ تم

عورت سے یوں کہو "ہزار درہم دے کر خلع کر لو" جب خاوند یہ الفاظ کہہ چکا تو انھوں نے
عورت سے کہا تم کہو "میں خلع قبول نہیں کرتی" اس کے بعد امام صاحبؒ نے عورت سے
مخاطب ہو کر کہا، اپنے خاوند کے ساتھ گھر جاؤ، تم دونوں کی قسم پوری ہو گئی، اور کوئی
بھی حانث نہیں ہوا"۔ (ص ۶۴۷)

مگر زکوٰۃ کے سلسلہ میں صفحہ ۶۵۰ پر جو "شرعی حیلہ" امام ابو یوسف سے منسوب کیا گیا ہے، اگر یہ نسبت صحیح ہے، تو یہ "شرعی حیلہ" دینی نقطۂ نگاہ سے کسی طرح درست نہیں اور اس بارے میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی رائے صائب ہے کہ وہ اس قسم کے شرعی حیلہ سے منع فرماتے تھے، خدا کرے حافظ ابن حجر کی یہ رائے واقعہ کے مطابق ہو کر امام ابو یوسفؒ نے اس (حیلۂ اسقاط زکوٰۃ کے فتویٰ) سے رجوع کر لیا تھا۔

"اجتہاد کے سلسلہ میں علامہ ابو زہرہ نے مشورہ دیا ہے اور صائب مشورہ دیا ہے کہ:—

"فقہ حنفی کے نشو و ارتقا کے لئے از بس ضروری ہے کہ تخریج کا دروازہ کھلا رکھا جائے مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہے اور فقہا نے (اجتہاد کا) دروازہ مسدود کر رکھا ہے، متاخرین صرف قدیم فقہاء کی ترجیحات کی پیروی کر سکتے ہیں مگر غیر منصوص مسائل میں انہیں اجتہاد کرنے کا حق حاصل نہیں اب مذہب مدون ہو چکا ہے کتابیں مرتب کی جا چکی ہیں، للذا ہر حنفی المذہب کا کام صرف اتنا رہ گیا ہے کہ اسی ڈگر پر بے سوچے سمجھے چلتا جائے، لیکن اس مذہب جلیل سے وفا شعاری و خلوص کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے پیرو متقدمین کے نقش قدم پر گامزن ہوں کیونکہ امتِ مسلمہ کے آخری دور کی اصلاح اسی انداز سے ہو سکتی ہے جیسے آغازِ اسلام میں اصلاح و فلاح کا بیڑا اٹھایا گیا، اور وہ یہ ہے کہ تخریج کا دروازہ بالکل کھول دیا جائے (اماموں سے) غیر منصوص مسائل میں اجتہاد کیا جائے اور منصوص مسائل کی تنقیح و تہذیب عمل میں لائی جائے (ص ۶۹۲)

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول اور مسلک ہے کہ ایمان میں کمی اور بیشی نہیں ہوتی! مگر فاضل مولف نے اپنے اس رجحان کا اظہار فرمایا ہے کہ "تصدیق" یکساں نہیں ہوتی بلکہ قوت کے اعتبار سے اس کے درجات مختلف ہوتے ہیں اور اس تفاوت کا مظہر اعمال ہیں"۔

"اہلِ عراق کے پاس صحیح احادیث کا ذخیرہ بہت کم تھا" (ص ۲۰۶)

فاضل مولف کے اس قول میں بڑا مبالغہ پایا جاتا ہے، کوفہ جو سینکڑوں صحابہ کا برسوں مسکن اور اقامت گاہ رہا ہو وہاں احادیث کا ذخیرہ "بہت کم" کیسے ہو سکتا ہے، فقہاءِ عراق فقیہ ہونے کے ساتھ ساتھ محدث بھی تھے! خاص طور سے امام ابو حنیفہؒ حدیث کے جانچنے اور پرکھنے کی خاص تمیز رکھتے تھے۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں فاضل مولف لکھتے ہیں:—

"آپ معاصی سے اجتناب اس لئے کرتے کہ وہ خلافِ مروت ہیں صرف اس لئے نہیں کہ وہ دین کے منافی ہیں" (ص ۳۰۵)

حالانکہ معاصی سے اجتناب اس لئے کرنا چاہئے کہ اللہ اور رسولؐ نے ان سے روکا ہے اور ان کی مذمت فرمائی ہے!

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک قول منسوب ہے کہ "اگر کوئی شخص نماز کے دوران قرآن عربی کے بجائے فارسی میں پڑھ لے تو درست ہے، شرعاً نماز ہی لئے قرات کا رکن کما حقہ ادا کردیا ـــــــ ! امام ابوحنیفہ کی یہ رائے درست نہیں تھی اسی لئے اس قیاس سے آپ بہت جلد نکل آئے اور اپنے قول سے رجوع فرمالیا ! فقہ حنفی کے اساطین اور امام اعظم کے قابل فخر شاگرد امام ابویوسف اور امام محمد کا یہ فتویٰ ہے کہ قرات صرف عربی زبان ہی میں ادا کی جاسکتی ہے اور دوسری کسی زبان میں مقبول نہیں !

حیرت ہے کہ علامہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ امام ابوحنیفہ کے پہلے قول (جس سے وہ رجوع کر چکے ہیں) کی تائید میں یہاں تک چلے گئے ہیں کہ ـــــــ "قرآن کا اعجاز معانی کے اعتبار سے ہے، الفاظ میں نہیں ہے۔" (معاذاللہ) حق بات یہ ہے کہ قرآن الفاظ و معانی کے مجموعہ کا نام ہے، اور معانی و الفاظ کے اعتبار سے قرآن اعجاز ہے جس کی مثال کوئی لا نہیں سکتا، قرآن اس بارے میں ساری دنیا کو چیلنج کرتا ہے ! پھر قرآن کریم صلوٰۃ (نماز) میں "ما تیسر من القرآن" پڑھنے کا حکم دیتا ہے اور "ترجمہ" قرآن نہیں ہے، اس لئے جو کوئی نماز میں "ترجمہ" پڑھتا ہے وہ "قرآن" کی قرات نہیں کرتا !

اسلام دنیا کے ہر گوشہ میں پھیلا مگر کسی ملک، قوم اور خطہ کے رہنے والوں کو اس کی شکایت نہیں ہوئی کہ وہ "قرآنِ کریم" کی قرات سے عاجز ہیں، اس لئے تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر بھی یہ بات بداہتہً غلط ہے کہ قرآنِ کریم کی قرات بعض لوگ کر ہی نہیں سکتے ـــــــ تقلیدِ ائمہ کی یہی وہ شدت، جمود اور جانب داری ہے جس کے سبب مسلکِ تقلید پر حرف آتا ہے !

جناب مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کتابوں پر تعلیقات و حواشی لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں، اس کتاب پر بھی انھوں نے بڑے قیمتی اور مفید، کارآمد حواشی تحریر فرمائے ہیں، اور اس کام کے لئے انھوں نے دو سو سے زائد کتابوں کو پڑھنے کی محنت شاقہ گوارا کی ہے ! مولانا موصوف نے جہاں ضرورت محسوس کی ہے مولف کتاب کی رائے سے اختلاف بھی کیا ہے، اور اس اختلاف کے لئے دلیلیں دی ہیں مولانا بھوجیانی اہلِ حدیث مسلک رکھتے ہیں، اس لئے کوئی بات اپنے اس مسلک سے ہٹی ہوئی پاتے ہیں تو اس کی ہاتھ کے ہاتھ تردید اور توجیہ فرما دیتے ہیں ! ان کے حواشی پڑھ کر ایک بات سامنے آئی ـــــــ یہ کہ احادیث کو جانچنے اور پرکھنے کے دو ذریعے ہیں، روایت اور درایت ! اہلِ حدیث حضرات "روایت" پر بہت زور دیتے ہیں مگر فقہا درایت اور روایت دونوں تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔

مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے تعلیقات و حواشی نے اس کتاب کو اور زیادہ مفید اور علمی بنا دیا ہے ـــــــ مثلاً اس بحث کے ذیل میں کہ امام ابوحنیفہ تابعی تھے یا تبع تابعی تھے، فاضل حاشیہ نگار نے علامہ انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول درج فرما کر اس بحث و نزاع کو کس قدر آسان بنا دیا ہے ـــــــ مولانا انور شاہ نے فرمایا ـــــــ انہ تابعی رویۃ و تبع التابعی روایۃ (یعنی امام ابوحنیفہ صحابہ کی رویت و لقا کے اعتبار سے تابعی اور روایت و سماع کے لحاظ سے تبع تابعی تھے)

فاضل مترجم نے ترجمہ میں بڑی محنت اور کاوش کی ہے، ترجمہ رواں اور عام فہم ہے کہیں کہیں کھٹک بھی پیدا ہوتی ـــــــ "تم نے روایت کم بیان کرنا ہوگا" (ص ۱۲۹) "تمہیں روایت کم بیان کرنی ہوگی"۔ لکھنا تھا اس جملہ میں ساری خرابی "نے" کے سبب پیدا ہوئی ہے ـــــــ "دونوں حریف ایک دوسرے کے طور طریقوں کا اثر قبول کر جاتے ہیں" (ص ۲۲۹) "اثر قبول کر لیتے ہیں" ترجمہ کرنا تھا ـــــــ "اور عقل کا خاصہ ہے اس میں اچھل کود ہوتی ہے" (ص ۲۲۹) "اور عقل کا خاصہ ہے کہ وہ طبع زنی اور شوخی کرتی ہے" زیادہ بامحاورہ ترجمہ ہے ! ترجمہ میں ایسے مواقع پر متن کے الفاظ کو اپنی زبان کے محاورہ اور روزمرہ میں منتقل کرنا چاہئیے۔

"۔۔۔ امام ابویوسف اور امام محمد تیس سال جیلے گئے" (ص ۲۵) "جیلے گئے" یہاں روزمرہ کے مطابق نہیں ہے ـــــــ "جب بیوی تو مشرف باسلام ہو جائے اور خاوند غیر مسلم رہے تو دونوں میں فرقت کا حکم صادر کر دیا جاتا" (ص ۵۱۳) "فرقت" شعر وافسا

کی زبان اور اصطلاح ہے' "جُدائی" یا "علیحدگی" لکھنا چاہیئے تھا ـــــــ بعض مقامات پر عربی کے الفاظ (مثلاً انقراض حصر، حجرۂ جُڑی) کے توں رکھ دیئے ہیں! حیرت ہے کہ صفحہ ۷۰ پر "غیظ و غضب" کا املا "غیض و غضب" نظر آیا، اس غلطی میں علماء تک مبتلا ہو جائیں ـ ـ ـ ـ ـ ـ تو ـ ـ ـ ـ !

کوئی شک نہیں اُردو جاننے والوں کے لئے یہ کتاب نعمت غیر مترقبہ ہے' عوام و خواص سبھی کے کام کی کتاب! اس میں بہت سے فقہی اور کلامی مسائل و مباحث اس قسم کے آگئے ہیں جن کی تفصیلات سے علماء کی معلومات میں اضافہ ہوگا، مکتبہ سلفیہ کے کارپرداز اور چلانے والے اہلِ حدیث ہیں' اس مکتبہ سے "حیاتِ امام ابوحنیفہ" کی اشاعت حق پسندی' بے تعصبی اور دینی اتحاد و اخوت کی دلیل ہے

عقد الجید

از :- حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی' ترجمہ :- مولانا ساجد الرحمٰن صدیقی کاندھلوی

ضخامت ۱۶۸ صفحات (مجلد، رنگین گردپوش) قیمت :- دو روپے پچیس پیسے،

ملنے کا پتہ :- ـــــ قرآن محل' مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی

"اجتہاد و تقلید" کے موضوع پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ کی یہ (عقد الجید) مشہور و مقبول کتاب ہے، اب سے ۷۵ برس پہلے اس کا ترجمہ اُردو میں حضرت مولانا محمد احسن نانوتوی نے کیا تھا، جو "سلک مروارید" کے تاریخی نام سے مطبع مجتبائی (دہلی) میں بار بار چھپا، اور اب اس کا جدید ترجمہ مولانا ساجد الرحمٰن کاندھلوی (مرحوم) نے کیا ہے' جسے قرآن محل نے شائع کیا ہے!

"عقد الجید" میں حضرت شاہ صاحب نے اجتہاد کی حقیقت، شرائط اور اقسام سے بحث فرمائی ہے اور مجتہد کے درجات اور اقسام بیان کئے ہیں! کتاب مختصر، مضامین بسیط و جامع "دریا بہ حباب اندر" کی کیفیت اس کتاب میں پائی جاتی ہے' شاہ صاحب نے مذاہب اربعہ کے اختیار کرنے کی تاکید کی ہے اور ان کے چھوڑنے کی ممانعت فرمائی ہے!

شاہ صاحب فرماتے ہیں :-

> "تقلید مجتہد کی دو اقسام ہیں۔ واجب اور حرام، تقلید واجب جو دلالۃً اتباعِ روایت حدیث سے متعلق ہو' تفصیل اس کی یہ ہے کہ کتاب و سُنّت سے جاہل از راہِ خود تتبع و استنباط نہیں کر سکتا اب اُس کا یہ فرض ہوگا کہ کسی فقیہ سے پوچھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ میں کیا حکم دیا ہے' جب بتائے تو اُس کی اتباع کرے' خواہ وہ صریح نص سے ماخوذ ہو یا اس سے مُستنبط، یا کسی نص پر قیاس ہو' ان میں ہر ایک اگرچہ دلالۃً ہی سہی آپؐ ہی کی روایت کی طرف راجع ہے۔
>
> تقلید حرام یہ ہے کہ کسی فقیہ کو یہ گمان کرلے کہ وہ نہایت بلندی پر پہونچ گیا، اُس سے غلطی ممکن نہیں، اب جب ایسی حدیث صحیح و صریح پہونچے، جو اُس قول کے مخالف بھی ہے، تو وہ اُس کے قول کو نہیں چھوڑتا، یا یہ گمان کرتا ہے کہ جب میں نے اس کی تقلید کرلی تو خدا نے مجھے اس کے اقوال کا مُکلّف بنا دیا ـ ـ ـ"

حضرت شاہ صاحب نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ مذاہب اربعہ میں ایسے متعصب مُقلّدین بھی پیدا ہوگئے جو اپنے ائمہ ہی کی تقلید کئے جاتے ہیں' اگرچہ اُن کا مذہب' دلائل سے دُور ہوتا ہے۔

"عقد الجید" اپنے موضوع پر کوئی شک نہیں بڑی مُفید کتاب ہے، قرآن محل نے اس کا ترجمہ شائع کرکے' دین کی خدمت انجام دی ہے۔

مصنفہ :۔ رائے بہادر پیارے لال آشوب دہلوی اور کپتان ڈبلیو جے ہالرائیڈ۔

رسومِ ہند

ترتیب :۔ کارکنان مجلس ترقی ادب لاہور ضخامت ۳۲۰ صفحات (ٹائپ پرسا) قیمت :۔ تین روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ :۔ مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور

مجلس ترقی ادب لاہور اردو کلاسیکی ادب کی کتابیں چھاپ کر اردو زبان و ادب کی قابلِ قدر خدمت انجام دے رہی ہے "رسوم ہند" اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہے' جس کا دیباچہ خلیل الرحمٰن داؤدی صاحب نے لکھا ہے' یہ کتاب سب سے پہلے سررشتہ تعلیم پنجاب نے ۱۸۶۶ء میں شائع کی تھی! فاضل دیباچہ نگار نے "رسوم ہند" کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے :۔

"رسوم ہند آج سے تقریباً سو سال پہلے تالیف کی گئی، لیکن مطالب کی صحت، حلاوت زبان اور سلاست بیان کے اعتبار سے گزشتہ سو سال میں کوئی کتاب اس پایہ کی منصۂ شہود پر نہیں آئی ہے' یہ کتاب آج مدارس کے طلبا کے لئے اتنی ہی مفید ہے، جتنی کہ آج سے سو سال قبل تھی، آج بھی کوئی دوسری کتاب اس کی جگہ لینے کے لئے موجود نہیں"۔

دیباچہ نگار کی اس رائے سے ہمیں حرف بہ حرف اتفاق ہے' زبان و روزمرہ کا کیا چٹخارہ ہے' کس قدر لطف بیان اور سادگی دیکھنے کا ہے کیا منظر نگاری ہے' مکالمے کس درجہ "کرداروں" سے ہم آہنگ اور نفسیاتی ہیں' دو نمونے :۔

● ——— "جس روز گونے کا مہورت نکلا، اس روز نمبردار نے گیان چند مشر کو بلوایا، اس نے آتے ہی چوک لیپوایا اور اس پر ایک طرف آٹے سے نو خانے بنا کر ان میں چاول رکھ دیئے، اور ایک مٹی کی ڈلی لے کر اس پر کلاوا لپیٹا، پھر دولھا دلہن کو دو پیڑھوں پر بٹھایا اور مٹی کی ڈلی کو گنیش اور نو خانوں کو نو گرہ قرار دے کر پوجا کرائی اور روپے، چاول، پھول، پان بتاشے اور پیسے ان پر چڑھائے پھر گیان چند نے لڑکے کے دوپٹے اور لڑکی کی اوڑھنی کا ایک سرا لے کر دونوں کو ملایا، اور اس میں چھالیہ کی ڈلی چاول اور ایک ٹکہ رکھ کر گرہ باندھ دی' اس کے بعد بیٹا پھیر کی رسم ہوئی اور پیڑھوں کو جن پر دولھا دلہن بیٹھے ہوئے تھے بدل دیا جس وقت نائی نے پیڑھوں کو بدلنے کے لئے اٹھایا تو پاربتی جو وہاں کھڑی ہوئی تھی، اس سے کہنے لگی ——— دیکھ رے! یہ پیڑھے آپس میں ٹکراویں نہیں' جو ایسا ہوا تو من سکھی اور جیجا میں سدا کھٹا پٹی رہے گی"۔

● ——— "سجان سنگھ سندر سنگھ کی طرف مخاطب ہو کر بولا "لے رے! تو بھاگ! کیوں جھک مارے ہے' میں نے تو تجھ کو اسی دن جان لیا تھا، جس دن تیرے تھا چھوری کے پھیرے ہوئے تھے پر کیا کروں کرموں کی ریکھا امٹ ہے' نہیں تو اور میرا گھر!"

منوجی کے دھرم شاستر کے حوالے سے لکھا ہے :۔

"انہیں یہ بھی حکم ہے کہ ناچنے، گانے، جوا کھیلنے اور ایسی ہی باتوں سے پرہیز کرنا چاہئے"

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ ناچنا گانا ہندو دھرم میں بھی معیوب ہے، بعد کے لوگوں نے ناچنے، گانے کو ہندو تمدن و تہذیب میں شامل کر کے اصل ہندو دھرم کی خلاف ورزی کی ہے۔

"دھرم شاستر میں لکھا ہے کہ وہ (یعنی شودر) اپنے سے اونچی ذات کے کسی آدمی کو گالی دے تو

اُس کی زبان چھیدنی چاہیئے" (ص۲۔)

یہ ہے عدمِ مساوات کا وہ ظلم جسے اسلام نے مٹایا ہے' یہاں تک کے :۔

ع ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز"

ہندوؤں کی شرک نوازی کا یہ عالم ہے کہ :۔

"بہتیرے ہندو بھوت پریت اور اسی قسم کی چیزوں کو دیوتا مان کر اُن کی پوجا کرتے ہیں' اکثر گاؤں والے ایک دو مردوں کو جو زندگی کی حالت میں اُن کے گاؤں میں زبردست تھے' اپنے گاؤں کا نگہبان جان کر پوجتے ہیں۔ اور بعض ہندو لوگ مسلمان پیروں اور شہیدوں کی قبروں کی پوجا کرتے ہیں - - - - - ہندوؤں میں دیوتاؤں کی نہایت ہی کثرت ہے، اُن کے نزدیک چھوٹے بڑے سب کے سب دیوتا ۳۳ کروڑ ہیں"۔ (ص۱۹ و ۲۰)

اس کتاب سے معلوم ہوا کہ ضلع مراد آباد کے قصبہ سنبھل کا پُرانوں میں ذکر آیا ہے کہ دسواں اوتار "نس کلنک" نامی اب ہونے والا ہے وہ سنبھل مراد آباد میں' وشن جس برہمن کے گھر میں ظاہر ہوگا! اس سے سنبھل کی قدامت کا پتا چلتا ہے' آلھا اودل میں بھی "سنبھل" کا نام آیا ہے۔

جانوروں کے چارے کو "نیار" نقیب کو "کوہل" عورتوں کو "بیٹر پاتی" نوشاہ (نیز) کو بنرا اس کتاب میں کہا گیا ہے' یو۔پی کے دیہات میں یہ الفاظ آج بھی اسی طرح بولے جاتے ہیں۔

صفحہ ۳۱۶ پر (غالباً) "محصَّب" کی بجائے "محتسب" چھپ گیا! صفحہ ۲۱۶ پر ملتزم کو ـــــ "ایک خاص جگہ کا نام" لکھا ہے' اس سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ یہ کوئی بستی یا پڑاؤ وغیرہ ہے' ملتزم میزابِ رحمت اور رکنِ یمانی کی طرح کعبۃ اللہ کا ایک مقام اور جزو ہے' جہاں لوگ کھڑے ہو کر اور ملتزم (دیوارِ کعبہ) سے چمٹ کر دعا مانگتے ہیں!

اس کتاب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ذاتوں اور رسوم کا مفصل بیان ہے' دلچسپ قصے، بعض پیغمبروں اور خلفاءِ راشدین کے مختصر حالات بھی اس کتاب کی زینت ہیں۔

کلکِ موج از:۔ عبد العزیز خالد، ضخامت ۲۶۴ صفحات (جلی ٹائپ' پائدار جلد' دبیز کاغذ) قیمت:۔ ساڑھے سات روپے' ملنے کا پتہ:۔ دو آبہ کوآپریٹو پبلشرز لمیٹڈ، ۹۳ نیو کلاتھ مارکیٹ' بندر روڈ، کراچی

جناب عبد العزیز خالد کے نام اور شاعری سے اُردو دُنیا خاصی متعارف ہو چکی ہے' جہاں تک "تلمیحات" کا تعلق ہے اس صنفِ خاص کے تو وہ بادشاہ ہیں' اُن کا مطالعہ غیر معمولی وسیع ہے' اور جو کچھ پڑھا ہے وہ مستحضر ہے، اُردو، فارسی، عربی، فرانسیسی، جرمنی، اطالوی اور سنسکرت وہندی کے جن شعراء سے انھوں نے استفادہ کیا ہے' اُن کے اشعار اور نظمیں بھی انھوں نے متن کے ساتھ کتاب میں نقل کر دی ہیں حافظ، نظیری، منوچہری، کعب بن زہیر، عنترہ بن شداد، بحتری، ابن الفارض، امرؤ القیس، ابن المعتز، ابن حسن التہامی، ابن خفاجہ ـــ بوصیری، کبیر، تلسی داس، ورجل، گوئٹے، لورکا (LORCA)

Rimbau —— Pascal —— Bandelaira —— Giovanni-Vellam Sphocles — Ariosta — Lucretius — Heinrich Heine —— Laforgue —— vigny

ان شاعروں میں بہت سوں کے نام تو اُردو داں ہی نہیں انگریزی جاننے والوں نے بھی نہ سُنے ہونگے!

اسی طرح عمارہ' مرج الفضہ، صیر غادیہ، برصیصا، مرغزیطہ، بورآکہ، ولادہ، الداخل، قبشتالا، ررزریق، ایشگوبی، ذنا تیر امباولی، رکمتی، دلیلہ، پائرا موس، نوشین، فریجہ، ساگان، سودآبہ، بیلشفر، وادیٔ اغمات، منولکا، چترکا، ملیکا، زلفا دعد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ وہ تلمیحات، کردار اور مقامات ہیں جن کو سُن کر اچھے اچھے لکھے پڑھے اپنی بے خبری کا اعتراف کریں گے!

عربی اور فارسی کے الفاظ اور ترکیبوں کا یہ رنگ ہے:۔

لولیانِ سیمیں ساق، کلاب عادیہ' اقحوان' عوار' صب مُتہالی، قیثارہ' ترتیل کثیب بدور، تدفلتے ہما مر ترنج جاتے شکرف، نوشخند صباح، بُت خلج ودیعا، غریم المنایا، حلیف الہموم ـــــ ان جھلکیوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عبدالعزیز خالد ایک خاص طرزِ شاعری کے موجد ہیں اور اُردو شاعری کو اپنا خاص آہنگ عطا کیا ہے۔

خالد کی شاعری میں "صنعتِ تلمیح" جگہ جگہ ملتی ہے' اُردو مصرعوں کے ساتھ انھوں نے "عربی مصرعے" بھی موزوں کئے ہیں مثلاً

لکھا ہے خونِ دل سے دلدار نے یہ نامہ　　جانی! رای فوادی من ہجرک القیامہ
میں نے کہا نشانی، سوز و گدازِ دل کی　　بولی:۔ ولوح عینی لم تکف بالعلامہ
صفوا الزمان وجمع القیان　　قربِ لغوانی دُنیا ہے جنت
المرءُ لایزال عدوٌّ لما جہل　　شکلیں اگرچہ ہیں عصبیت کی گوناگوں
انا اخدم البیض الکواعب کالدمیٰ　　دُنا نیر ھو امباولی ہو کہ رُکمتی

عبدالعزیز خالد کے عربی مصرعوں میں "عربیت" کی خاصی کمی محسوس ہوتی ہے، انھوں نے عربی الفاظ کو بس جوڑ دیا ہے۔ ایک شعر ہے:۔

بردالشرب، بُردالشباب　　چہرہ کتابی، قامت قیامت (ص۱۹)

پہلے مصرعہ کا ترجمہ یہ ہوا کہ ـــــ شراب کی ٹھنڈک، شباب کی چادر ہے! مگر یہ آخر بات کیا ہوئی۔

عبدالعزیز خالد پہلے اُردو شاعر ہیں، جنھوں نے عربی بحروں میں نظمیں کہی ہیں، یعنی اُن بحروں میں جو اُردو اور فارسی شاعری میں عام طور پر رائج نہیں ہیں، فرماتے ہیں:۔

ہے الماس کیا شکلِ منقیٰ زغال کی　　زردئ نسب پھر ہے یا قوتِ معدنی
مسدود ہیں اظہار کے وسیلے　　اک دل لگی ہے ذوقِ شعر خوانی
حائل مری گردن میں وہ مرمریں باہیں　　شراب لائے کچھ کچھ کے لبِ وسینہ ساغر کہ
کچھ گبر و مسلماں میں نہیں فرق ہیں　　جو مانے مقرب ہے جیسے چاہیں رتی

عربی کی ان مزاحف بحروں میں خالد کی شعر گوئی اس کی دلیل ہے کہ وہ عروض میں نہ صرف درک بلکہ تبحر، پوری قدرت اور مہارت تامہ رکھتے ہیں! مگر اُردو داں دُنیا ان بحور سے چونکہ قطعاً نا آشنا ہے اس لئے بہت سوں کو تو یہ اشعار "ناموزوں" محسوس ہونگے! اس قسم کے اشعار لوگوں کی زبانوں پر نہیں چڑھ سکتے' اور نہ حافظہ اُن کو یاد رکھ سکتا ہے اس لئے وہ تحریر و تقریر میں مثال کے طور پر شاید ہی پیش کئے جا سکیں' فارسی کے قریب قریب تمام شعراء عربی جانتے تھے، اور نظامی، سعدی، خسرو، خاقانی، اور جامی وغیرہ مشاہیر تو عربی زبان و ادب کے عالم تھے مگر انھوں نے عربی شاعری کی انھی بحروں کو فارسی میں

استعمال کیا جو فارسی زبان کے مزاج کے مناسب تھیں اُردو شاعروں نے بھی عربی کی بہت سی بحروں کو ترک کر کے صرف ان بحروں میں شاعری کی، جن کو اُردو زبان کا مزاج گوارا کر سکتا تھا۔ غالب نے اُردو کی مروّج بحروں سے ہٹ کر ایک غزل کہی ـــــ مگر وہ مقبول نہ ہو سکی اجناب عبدالعزیز خالد نامانوس بحروں میں نظمیں کہہ کر بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں، اُن کی خدمت میں ہماری مخلصانہ گزارش ہے کہ وہ عروض دانی کے مظاہرہ کی بجائے اپنی شاعرانہ قوتوں کو اُردو کی مانوس و مروج اور مقبول بحروں میں صرف کریں تو اُن کی شاعرانہ شخصیت اور اُردو زبان و ادب کو اس سے فائدہ پہونچے گا۔

دُوسری گزارش یہ ہے کہ شاعری میں تلمیحات ایک حد تک گوارا کی جا سکتی ہیں، تمام دُنیا کے ملکوں اور قوموں کے عاشقوں، معشوقوں، پانی کے چشموں، دریاؤں، وادیوں، شہروں اور کھنڈروں کے نام شعر میں نظم کر دینے اور مشاہیر شعراء کے خیالات کو ترجمہ کا جامہ پہنا دینے سے خود شاعر کی اپنی ذاتی شخصیت وہ نہیں رہتی جیسا اُسے ہونا چاہیئے! پھر اب تک جو "تلمیحات" وہ اپنی شاعری میں لائے ہیں اُن کی فرہنگ ہر کتاب میں ضرور رہنی چاہیئے، ورنہ عوام کیا خواص کے لئے بھی یہ "تلمیحات" "چیستاں" بنی رہیں گی!

قرصِ تریاق و ساغرِ سم ہے   زندگی ذوفنون و مبہم ہے (ص ۱۳)

زندگی زہر بھی ہے اور تریاق بھی ہے، تو اس سے "ذوفنونیت" اور "ابہام" نہیں "تضاد" کی نسبت موزوں تر ہے۔

فن کا شیطان ہے رقیبِ عتید   بے ضرر فن اصم و ابکم ہے

"رقیبِ عتید" اور "اصم و ابکم" نے شعر کو کتنا بوجھل بنا دیا۔

ظن معلول کا مشاہدہ نام   علم ناقص حجابِ اعظم ہے

شعر میں فلسفیانہ اصطلاحیں تو آ گئیں مگر "شعریت" کا دُور دُور پتا نہیں۔

عارضے کا علاج کر بالمثل   نیش کژدم ہی زخم و مرہم ہے

یہی حال اس شعر کا ہے!

ایلی ایلی! لما سبقتانی   وادیٔ شک میں ابنِ مریم ہے

حضرت عیسٰی ابنِ مریم علیہ السّلام کبھی "وادیٔ شک" میں نہیں رہے، نبی کا اللہ تعالیٰ پر یقین انتہائی پختہ اور محکم ہوتا ہے۔

ہوتی ہے پیدا اک حسِ سادس   کرتے رہو جو مشق و ریاضت (ص ۱۶)

"حسِ سادس" نے شعریت کو غارت کر دیا۔

دیپک سے کاجل ہوتا ہے پیدا   دیکھ کنول کی کیچڑ سے ملت

مصرعہ ثانی نفرت انگیز حد تک غیر شاعرانہ ہے ـــــ توبہ!

دیوارِ دل کو کرتا ہے بودا   غلیانِ عشق و طغیانِ شہرت

نری آورد ہی آورد!

بے امتحاں تو ہر شے ہے سونا   صورت نہیں ہے مرآتِ سیرت

ہر شے تو سونا دکھائی نہیں دیتی، کوئلہ کو ہیرا کون سمجھتا ہے، کانٹے پر کس نے پھول کا گمان کیا ہے، ضرب المثل یہ ہے کہ ہر چمکدار چیز سونا نہیں ہوتی ـــــ اس نظم کے یہ شعر کتنے اچھے ہیں:-

صورت نگارِ اسما و اشیاء   گلدستہ بندِ حرف و حکایت

مئے آگہ مری جان کو قرار نہیں ہے   بے طاقتِ بیدار و انتظار نہیں ہے

اے موج دریا بنے ہم کو بستر　　اے آگ بن جا گلزار رحمت

"وطنِ پاک" سے جس نظم میں خطاب ہے، اُس میں بڑی روانی، دل کشی اور جاذبیت پائی جاتی ہے، چند شعر:-

کاکل مشکینہ و چشم غزال　　کون کوئی ہے جو غزلخواں نہیں
چشمہ حیوان و جوئے زنجبیل　　خمر و لبن، نیشکر و انگبین
خمکدہ، جغجغ و نوشِ زلال　　روح فزا لذۃ للشاربین
چوکڑی کھیتوں میں بھریں ہرنیاں　　خیلِ گل و نسترن و یاسمیں

ایک دوسری نظم کے اچھے شعر:-

عود و عنبر کی منقلیں روشن　　نغمہ پیرا رباب و شہنائی
با ادب با ملاحظہ ہشیار　　دست بستہ کھڑے ہیں مجرائی
نخلبند حدیقۂ اسرار　　گلشنِ راز کے تماشائی!
کبھی ذرے کو آفتاب کہیں　　کبھی کہیں پہاڑ کو رائی!

ایک نظم کا شعر ہے:-

اے مقامر سنبھل کے چل چالیں　　بُری ہوتی ہے دیکھ دل کی شہ

مصرعہ اولیٰ بہت کمزور ہے! پھر شطرنج کھیلنے والے کو "قمارباز" نہیں کہا جاتا، شطرنج کی بازی بد کر شاذونادر ہی کھیلی جاتی ہے۔
چند منتخب اشعار:-

روشن ہے چراغِ طورِ سینا　　کر کسب تجلی و حرارت
ملتے ہیں مناقب و فضائل　　یا حسنِ خیال یا عمل سے
شاخِ چمن لہرا کے جس کی پیشوائی کو بڑھے
گلگشت کو نکلے تو جھک کے فرشِ پا ہو کہکشاں

فروغِ صبحِ صادق خالِ خد میں　　شبِ یلدا کی زُلفوں میں سیاہی
شاہدانِ خود نما راہوں میں نظارہ فروش　　جا بجا اٹھے نگہ، گزرا نہ جاتے سرسری
اُن کو زیبا ہے تبختر ان کو بجتا ہے غرور　　ان سے لعت و نشر کا فن سیکھتی ہے شاعری
مردان الوقت و خود بیں عورت آرائش پسند　　آدمی کے دیکھنے کی ہم کو حسرت ہی رہی
حصولِ آرزو شیریں ہے لیکن　　زوالِ سرخوشی مرگِ محبت
جو اپنے نفس پر قادر نہیں ہے　　وہ شہر پنے فصیل و لے امیر ہے
گلزار تو گھر ہے رنگ و بو کا　　ویرانے میں پھول بن کے مہکو
سورج سے نہ روشنی کی لو بھیک　　جگنو کی طرح چمن میں چمکو
سُنہرے جسم میں خوشبوئے ناقۂ اذفر　　خرامِ ناز سے پیدا رمِ غزالِ تتار
تو نورِ دیدۂ اربابِ ذوق ہے تجھ پر　　تماثیل کان بچھا دو، متاعِ بحر نثار

شکن شکن ہے حریری لباس شب خوابی — جھلک رہے ہیں سنہری ترنج دست افشار
گرتی ہے قطرہ قطرہ مے جامِ زندگی سے — تلچھٹ کو پھینکنا مت یہ بوندیاں گراں ہیں
اے ساقیِ صبوحی! جامِ مئے مغانہ — عمرت دراز بادا! ہم خادمِ مغاں ہیں
ہاتھ کھینچے نہیں نہیں کرکے — مسکرا مسکرا کے منع کیا
مت اسے زندہ کہو جس شخص کا — کوئی مستقبل نہ ہو، حاضر نہ ہو
لفظ و معنی کی دوئی معنی نہیں — کوئی جیب تک شاعرِ کامل نہ ہو

لالہ سوختہ دل ہے، سرو فارغ و آزاد
اپنی اپنی قسمت ہے اپنا اپنا جوہر ہے
خطبہ و خطابت کے دامِ مکر سے بچنا
بُت شکن جو بنتا ہے، بت پرست و بُت گر ہے

عالمِ شباب میں ہر خطا معاف ہے — حالتِ سرور میں پاؤں لڑکھڑائے گا
کبھی شبِ عمیق عشق میں تیر — کبھی پہنائے ہُو کا ہو طائر
عمر محدود، شوق لامحدود — کیا کریں زندگی میں کیا نہ کریں
نقاش کہاں ہے زرِ محلول تیرے پاس — قوسِ قزحِ خوں، شفق خاکِ شہیداں
پھوٹے شبِ دیجور کی دہلیز سے سویرا — ہونا ہے بہ موسم گل بادِ زمستاں
نہیں ہے وجہ قرار! السکوت کالاقرار — کچھ سے سوم بھلا جو ترت جواب تو دے
کبک کہسار و بلبلِ گلزار — تم سے سیکھے خرام و موسیقی

دوسرا رُخ:-

صناعی سے مفر نہیں ہے — بن ترشے نگوں کی کیا ہو قیمت (ص۴۲)

"مفر" کا استعمال اس شعر میں خاصہ محلِ نظر ہے۔

بنیادِ فراق و دیرانہ مصیبت — جرمانۂ عزیمت اے صاحبِ اغانی (ص۴۵)

غریب و نامانوس تراکیب جوڑ دی گئی ہیں!

ٹھوکر سے زخمی ہو مبادا وہ کلائی چاندسی — مہندی لگے ہاتھوں میں نازک کانچ کی ہیں چوڑیاں (ص۴۶)

چاند کو چہرے کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے "کلائی" کو "چاند" سی کہنا جدید تشبیہ ہے مگر عجیب!!

دیہیم ہفت اقلیم کو ٹھوکر سے ٹھکراتی چلے — ڈالے "پچھلتی" سی نظر جس پر بنے شاہ جہاں

"پچھلتی" شعر کی زبان نہیں ہے "اچٹتی" کہنا چاہیئے تھا ——— پھر یہ بیجا مبالغہ اور خلافِ واقعہ ہے کہ شاعر کی محبوبہ جو محل میں محوِ استراحت ہے جس پر بھی نگاہ ڈال دے وہ ہیچ مچ کا بادشاہ بن جائے!

وہ حسن بے پروا تو خود ہے ایک زندہ سلطنت — ہر رونگٹا اس جسم کیف انگیں کا گنجِ شائگاں

محبوب کے جسم کے رونگٹے کو "گنجِ شائگاں" کہنا کس قدر عجیب لگتا ہے۔

رعنائی و رزم و بزم سے انکا خمیر شاعری　　فرزانہ و دیوانہ دونوں قابل تحریر یہاں

مصرعہ اولیٰ کس قدر مبہم ہے۔

آرائشِ جمال میں تو محو ہے وہاں　　وہ روشنی کا ملک، دیارِ وصال ہے (ص۵۵)

مصرعہ ثانی بہت زیادہ گنجلک ہے! "دیارِ وصال" نے مفہوم میں اور زیادہ ابہام پیدا کر دیا۔

یادیں عزیز ہیں "مگر آرامِ جاں کہاں　　تیرے بغیر واقعی جینا محال ہے

"یادیں عزیز ہیں" اس ٹکڑے نے شعر کا مفہوم خبط کر دیا۔

دیکھی پرائی جورو تو لپلوٹ ہو گئے　　اس جدلیاتِ دل کا سمجھنا محال ہے

دوسرا مصرعہ شعر کے مرکزی تخیل سے ہم آہنگ نہیں ہے "جدلیاتِ دل" نے شعر میں اور زیادہ خرابی پیدا کر دی۔

جگر سوختہ دل باختہ، خائب و خاسر　　ریاکاری کے طرے پہ سرخاب کا پر ہے (ص۵۸)

اہمال ہی اہمال!

بارِ مینا سے ہاتھ میں لرزش　　کیف صہبا سے چال میں لغزش

جگر مرادآبادی کا فارسی سراپا بہت مشہور ہے اُس کا ایک شعر ہے:۔

از بارِ مینا لرزش بدستے　　وز کیفِ صہبا لغزش بہ گامے

دو شعر ہیں جن میں "مرموزِ نگاہ" اور "الحاح و لجاج" جیسی بوجھل فارسی ترکیبیں نظم کی ہیں۔

کیوں پسِ پردۂ مرموزِ نگاہ　　رنجِ نومیدی پنہانی ہو
خوئے عشاق ہے الحاح و لجاج　　حسن کیوں شاملِ نادانی ہو (ص۶۴ و ۶۵)

مفہوم کا لفظوں میں پوری طرح واضح نہ ہونا ——— یہ عیب "کلکِ موج" میں جگہ جگہ پایا جاتا ہے۔

جیسے بھونچال کے جھٹکوں سے سمندر کانپے　　شبِ اول یونہی اندامِ گلِ تر کانپا (ص۶۸)

محبوبہ کے بدنِ نازک کا کیف مستی سے اس طرح کانپنا، جس طرح بھونچال کے جھٹکوں سے سمندر کانپتا ہے وجدان اور ذوقِ صحیح کے لئے کس قدر تکلیف دہ مبالغہ آمیز تشبیہ ہے، میر انیس کہتے ہیں:۔

جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

یہ ہے لفظوں کے صحیح اور برمحل استعمال کا ایک نمونہ!

کام وہ ہے کہ جو بے بیمی و بے رشوت ہو　　چڑھتے سورج کی پرستش ہے چلن دنیا کا (ص۷۰)

"بے بیمی" کی ترکیب کس قدر نامانوس ہے جسے ذوق گوارا نہیں کر سکتا! اس کے علاوہ دونوں مصرعوں میں کوئی ربط نہیں۔

صبح و غزالانِ واسندہ مراول جن کا جہیز　　مرج القصر کرتی ہیں شکارِ دلہا

"شکارِ دلہا" کا بھلا کوئی جواب ہے!!؟

آذر و مانی کے بت خانے پریزادوں کے غول　　سانس لے زردشت کے آتشکدے کی روشنی (ص۷۲)

آذر و مانی مصور تھے بت تراش نہیں تھے، ان سے بت خانوں کی نسبت خلافِ واقعہ ہے، "زردشت کے آتشکدے کی روشنی کا سانس لینا" اس میں کتنا تکلف اور کس قدر آورد پائی جاتی ہے۔

عہد فکر و آگہی گہوارۂ پیغمبری — نیستی کا زاویہ کچھ مخول دائرہ وا

جہاں کہیں خالد کی شاعری کا یہ رنگ ہے، وہاں وجدان سخت اذیت اور گھٹن محسوس کرتا ہے۔

بردباری کا سبق لے سعدی و سقراط سے — کیسی بدخو بیویوں سے چھپ کے حکمت سیکھ لی

سپاٹ اور بے لطف شاعری!

میر میدانِ سخن پر بتۂ یکتاش بن! — ارتکازو کاملیت میں ہے باہم دوستی

آخر شاعر کیا کہنا چاہتا ہے؟ اور وہ شعر کہہ کر اس پر غور ہی نہیں کرتا کہ مفہوم ادا ہوا بھی یا نہیں!
"ارتکازو کاملیت" اور شعر میں ——— ! شعر کی لطافت و ناز کی فریاد کرتی ہے۔

مشعلِ دل روغنِ زیتون سے روشن کرو — کیوں ڈراتا ہے ہمیں دیوِ عبوسِ تیرگی

اس کا شعر بھی وہی رنگ ہے ——— "دیوِ عبوس تیرگی" جیسی ترکیبیں شاعری کے ساتھ دردناک مذاق ہیں۔

مبیج در سخت و شیرین در رسیدہ — دو لیمو بار دارد سرو نازت (ص۸۱)

یہ محبوب کی "پستانوں" کی تعریف ہے! مگر جو "پستان" ——— "رسیدہ" ہونگے، وہ سخت نہیں ہوسکتے۔

زنِ ماتن با لحاظ مراض — تمام آرام و رنج و ستم و راحت

اس قسم کے کلام موزوں پر "شاعری" کا سرے سے اطلاق ہی نہیں ہوتا ———

وہ تعمیرِ خوابِ خداوند خالق — وہ نقشِ ہیولائے ارض و سماء سے (ص۸۹)

اللہ تعالیٰ سے "خواب دیکھنے" کی نسبت ہی سخت قابلِ اعتراض ہے!

مجھے عشق ہے گرچہ طیب و نساء سے — مگر ٹھنڈک آنکھوں کی ذکرِ خدا ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوشبو اور عورت کو پسند فرماتے تھے، ان سے "عشق" نہ تھا، یہ مصرعہ اس طرح کا ہونا چاہیئے تھا۔

مجھے گرچہ طیب و نساء سے ہے رغبت

ملے مہر و منشور و فرمان و خلعت — یہ خالد ہے خاکِ قدم چاٹتا ہے

مصرعہ ثانی شاعر نے کہا بھی اور اُسے چھپوایا بھی ——— حیرت بالائے حیرت! توبہ!

سچ جھوٹ کی کسوٹی میں یکساں — ہر شے کو منافقانہ پرکھو (ص۹۹)

سچ اور جھوٹ کی پرکھ "منافق" بن کر کس طرح ہوسکتی ہے، ہاں! اپنے عیوب کو اگر کوئی "منافق" بن کر دیکھے تو اپنی بُرائیاں ظاہر ہوسکتی ہیں، فارسی شاعر نے بڑی نفسیاتی بات کہی ہے کہ اگر تو اپنے عیوب اور کمزوریوں کا پتہ معلوم کرنا چاہتا ہے ——— تو سے

روزے منافقانہ نشیں، در کمینِ خویش

اساطیر کو مت جان تو افسون و فسانہ — ہے ادراکِ حقیقت کی یہ اک رمزِ یگانہ (ص۱۰۱)

صرف لفظ جوڑ کر مصرعے کھڑے کر دیئے ہیں!

جو عقل کو ہدفِ تیرِ ترہات کرے — وہ راہِ عشق میں ثابت قدم نہ ہوز نہار (ص۱۰۳)

"ہدفِ تیرِ ترہات" نے شعر کا سارا لطف غارت کر دیا۔

میں ہو چکی ہوں تری اب جو چاہے کر مرے شاہ — نشاطِ وصل میں کس گلعذار کی ہے پکار آ!

مصرعہ ثانی میں "ذم" پایا جاتا ہے، دوسرا مصرعہ مہمل ہے۔

کریں امیر بعین جلیل و قدرِ شفیق — خدایگان تدلّل، نواہدِ ابکار

جس شعر کا مفہوم سمجھنے کے لئے صراح و قاموس کی ورق گردانی کرنی پڑے اُس کو کیا کہا جائے!

مردِ نبیدِ نسا و خادمِ خوباں — لیکن ہمیشہ سَنَ نویلی کے پیچھے (ص۱۱۱)

مصرعہ اُولیٰ کس قدر غیر شاعرانہ ہے

میں تو ہوں مشغول برگ راہ قیامت — مسئلے سود و زیاں کے پوچھ نہ مجھ سے (ص۱۱۲)

بہت سوچا مگر کچھ پلّے نہیں پڑا۔

صبح سویرے خدا کمک کرے اُس کی — نیم شب جو خلوصِ دل سے پکارے

اچھے خاصے موزوں لفظ "مدد" کو چھوڑ کر "کمک" لانے کی کیا ضرورت لاحق ہوئی!!

جس کو ہو ارمانِ مکرمات و معالی — عمر گرامی نہ این و آں میں گنوائے (ص۱۱۳)

"ارمانِ مکرمات و معالی"؟؟ —— توبہ! عبدالعزیز خالد کی عربی دانی نے اُن کی شاعری کو جتنا فائدہ پہنچایا ہے اُس سے زیادہ شعریت کو نقصان پہونچایا ہے!

برگِ خزاں پر کھدا ہے نقشِ بہاراں — پردۂ شب میں سحر کا نور چھپا ہے (ص۱۱۵)

پتّے پر کوئی نقش "کھد" نہیں سکتا، کھنچ سکتا ہے!

کاہن و مجنوں ہوں میں پیمبر و شاعر — شاعری آزار ہے جنوں ہے بلا ہے

وہی ابہام اور اہمال!

خاورِ حدیثِ شب کو کرتا ہے محو و منسی — ابرام و آہ و شکوہ انفاس کا زیاں ہیں

"محو و منسی" —— اُس کے بعد آہ و شکوہ کے ساتھ "ابرام" اُلجھن ہی اُلجھن! عربی شاعر نے کس سلیقے سے اس خیال کو ادا کیا ہے۔

کلام اللیل یمحوہ النہار

اُردو میں بھی ضرب المثل ہے —— کہ "رات گئی، بات گئی"

تن بر بستر ہے یہ گیسو ہے مستتر سراپا — کاکل جھٹک کے اُٹھی آنکھوں میں سوئیاں ہیں (ص۱۲۷)

اس قسم کے شعر کہنے سے تو یہ بہتر ہے کہ آدمی ڈنڑ پیلے اور مگدر ہلائے!

کرکے گٹر گٹر گوں سجوگ رس پلائیں — دل کی کسک بجھائیں کہنے کو کنواریاں ہیں

"کسک بجھانا" روزمرہ کے خلاف ہے، کسک دُور کی جاتی ہے اور پیاس بجھائی جاتی ہے۔

اقبالؔ و میر غالبؔ، عبدالعزیز خالدؔ — یہ شاعرانِ ذی شاں اُردو کے پشتیباں ہیں

"پشتیباں" اس شعر میں جس صوتی انداز میں نظم ہوا ہے، اُس نے نغمگی کو غارت کر دیا۔

ہم فقیر متاعِ استغنا — اے غنی! ہم ہیں سائلِ بوسہ (ص۱۳۱)

اے غنی! نہ جانے کس سے خطاب ہے —— "سائلِ بوسہ" اس شعر میں کس بُری طرح کھٹکتا ہے۔

ہر گھڑی بے کلی ہے غنچہ نمط — غم کو نظم و نسق سپرد ہوا

بے کلی اور ہر آن اضطراب غنچے کی صفت ہرگز ہرگز نہیں ہے، دوسرا مصرعہ مہمل ہے!

چلتے شعلوں پہ سوئیوں پہ چلوں　　　مجھ سے خود بھاگتا ہے سایہ مرا

شعر کا مفہوم کیا ہے! اس کا حال "بطن شاعر" ہی جان سکتا ہے۔

دل کو تلووں سے ملتی چلتی ہے　　　مرے بوسوں کے لب میں پوشیدہ

مصرعہ ثانی کا مفہوم وا ظہار دونوں کاواک!

ادٹ ہوا آنکھ کھوٹ دل میں پٹے　　　شاذ ہی کوئی باوفا دیکھا

اظہار مفہوم میں اس قدر عجز کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔

گیلے سوکھے جہاں چلیں دونوں　　　ایکساں نرخ اشک وگوہر کا

شعر اچھا ہے مگر "ایک ساں" کی جگہ "ایک سے" ہونا چاہیئے تھا۔

لیسے سے اٹھے نہ کوئی راحت　　　دے طعنہ وہ ٹھنڈے آدمی کا

کیا اس کا نام شاعری ہے؟؟

سیج پھولوں کی بدن کی رازدار　　　بوستاں ہو بوستاں بانی کرو (ص۱۳۷)

اس نظم میں حسینوں سے خطاب ہے ـــــــــ اول تو یہ بات ہی عجیب ہے کہ پھولوں کی سیج بدن کی رازدار ہوتی ہے، پھر حسینوں سے یہ کہنا کہ تم "بوستاں" ہو اس لئے "بوستاں بانی" کرو! "بوستاں بانی" سے نہ جانے باغبانی مراد ہے یا چمن بندی!

پھڑ پھڑا لو دو لباسِ پرنیاں　　　مثل طاؤں کے تمکیں سے چلو

"پھڑ پھڑانا" غیر جاندار کے لئے لانا درست نہیں! اس پورے شعر میں کیا رکھا ہے؟ بجز اس کے الفاظ جوڑ جاڑ کر بدسلیقگی کا اظہار کیا ہے۔

امتناع نفس سے تسخیر کر　　　جملہ موجودات و معدومات کو

ضبط نفس اور تسخیر کائنات کی دعوت کس غیر شاعرانہ انداز میں دی گئی ہے۔

ضیا بیز تھا ماہ مقنع درون چہ　　　سراپا عیاں رازِ نہاں در نہفتنی

یہ ملبوس عریانی وہ اندام مرمریں　　　شباب اور مینے کی گندھاوٹ تھی دیدنی

اس قسم کے مہمل، سپاٹ، بے مزہ اور کاواک شعر قریب قریب ہر صفحہ پر نظر آئے۔ ہم تنقید کو طول دیں تو یہ حکایت "بے لذت" ہونے کے باوجود دراز تر ہو جائے گی، عبدالعزیز خالد نے شاید اپنے اسی قسم کے شعروں کے بارے میں یہ کہا ہے ؎

یہ کیسے معانی ہیں کہ مستغنیٔ الفاظ

یہ کیسے مضامین ہیں کوئی نام نہ عنواں

ــــــــ × ــــــــ

محترمہ عصمت عارف علوی (ایم۔ اے۔ ایل ایل بی) نے علامہ اقبال کی بیس نظموں کو مصور (Illustrate) کیا ہے! پوری کتاب خوش نما بلاکوں پر چھپوائی گئی ہے، کتابت جلی اور دیدہ زیب ہے اور تصویریں رنگین ہیں!

اس مصوری کی صورت یہ ہے کہ ۔۔۔۔۔ مثلاً صـ ۲۹ پر اقبال کی نظم "ستارہ" کے آٹھ اشعار مرقوم ہیں، اس کے مقابل اس ایک شعر سے

چمکنے والے مسافر عجیب یہ بستی ہے   جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے

کو مصور کیا گیا ہے، اس شعر کا انگریزی ترجمہ بھی درج ہے :۔

O! Twinkling passer by! this is a
strange place where in the height
of one is the vileness of other.

بعض تصویریں خاصی جاذب نظر ہیں اور غور و فکر کے بعد اُن کے جوہر اُبھرتے ہیں اور بعض کا یہ رنگ ہے کہ سمجھو تو مشکل اور نہ سمجھو تو مشکل!

علامہ اقبال کے کلام کے خاص و عام بھی قدر دان ہیں، اس لئے توقع ہے کہ اس مرقع کو پسند کیا جائے گا!

۱۲ سالہ نمبر جامِ نو

نگران :۔ مظہر خیری، ضخامت ۲۰۴ صفحات (سرورق رنگین) قیمت :۔ چار روپے
سالانہ چندہ پانچ روپے، زرِ سالانہ مع بارہ سالہ نمبر :۔ سات روپے
ملنے کا پتہ :۔ منیجر جامِ نو جے/۶۷ بلاک نمبر ۲ پی، ای، سی ایچ سوسائٹی، کراچی نمبر ۲۹

اس خاص نمبر میں مضامین و مقالات اور افسانوں اور ڈراموں اور غزلوں اور نظموں کا انتخاب شائع کیا گیا ہے، اُ کے علاوہ نثر و نظم کی تازہ تخلیقات بھی شامل ہیں، مضامین دلچسپ اور رنگارنگ ہیں اور پڑھنے والوں کے ذوق کی پذیرائی اور نشاطِ طبع کے لئے ہر طرح کا سامان موجود ہے!

"جامِ نو" مقبول ماہنامہ ہے، اس "بارہ سالہ نمبر" کے بعد اس کی مقبولیت میں اور اضافہ ہو جائے گا، جناب مظہر خیری اور اُن کے رفقاء نے اس خاص نمبر کی ترتیب میں بڑی محنت کی ہے!

———×———

united

ماہنامہ **فاران** کراچی

جلد :- ۱۵ —— شمارہ :- ۱۰

ایڈیٹر :- ماہر القادری — ماہ جنوری سنہ ۱۹۶۴ء

ترتیب

چندہ سالانہ :- سات رُوپے — قیمت فی پرچہ ۱ باسٹھ پیسے

مقامِ اشاعت

دفتر ماہنامہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

کتبہ : ساجد

پرنٹر پبلشر :- سرور حسین — مطبوعہ مطبع سعیدی کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

نقشِ اوّل

جب کسی فرد، جماعت یا ادارے کو بدنام کیا جا رہا ہو اور اُس پر طرح طرح کے الزامات لگائے جا رہے ہوں، تو جو لوگ حقیقت حال سے باخبر ہیں، اُن پر واجب ہے کہ وہ شہادتِ حق کا فریضہ انجام دیں! کسی کو مالی اور جسمانی نقصان پہونچانا اور ناحق قتل کر ڈالنا ہی ظلم نہیں ہے، کسی شخص، جماعت یا ادارے سے غلط باتیں منسوب کرنا اور طرح طرح کے بے بنیاد الزامات لگانا، یہ بھی ظلم ہے اور مظلوم کی حمایت و مدافعت وہ جائز فعل ہے، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کی اُمید رکھنی چاہیئے۔ ہمارے پاس کوئی ایسی طاقت نہیں ہے کہ الزام تراشنے والوں کے زبان و قلم کو روک سکیں مگر یہ تو ہمارے بس میں ہے کہ جو کچھ ہمارے علم میں ہے، آخرت کی جوابدہی کے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اُسے کھُل کر ظاہر کر دیں، ایسا کرنے سے ایک طرف تو وہ لوگ، جو غلط قسم کے پروپیگنڈے کا شکار ہیں تاریکی میں نہیں رہتے اور اُن پر حق واضح ہو جاتا ہے، دُوسری طرف زیادتی کرنے والوں پر حُجّت تمام ہو جاتی ہے۔

جماعتِ اسلامی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی مخالفت کی عجیب و غریب آندھیوں اور طوفانوں سے سابقہ پڑ رہا ہے، ایک منظم مُہم ہے جو اُن کے خلاف چلائی جا رہی ہے، ہو لکے اس رُخ کو دیکھ کر ادارۂ طلوعِ اسلام اور قادیانی صحافت نگار خوشی کے مارے جامے سے باہر ہوئے جا رہے ہیں گویا اُن کے دل کی عین مُراد بر آئی، جماعت کی مخالفت میں بعض بیانات کو پڑھ کر ایسا محسوس ہو رہا ہے منکرینِ سُنّت کے آرگن طلوعِ اسلام اور قادیانیت کے ترجمان الفضل کی صدائے بازگشت سُنی جا رہی ہے ملک و ملت کی اس سے بڑی بدنصیبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کے خلاف قصر دانوان کی برہمی کو دیکھ کر سُنّت و نبوت کے دُشمن جشنِ مسرت منا رہے ہیں۔

سب سے زیادہ افسوس تو اُن لوگوں پر ہے جو اپنے ہی گھر کے روشن چراغ کو بُجھانے کے درپے ہیں اور اسلامی محاذ کے سب سے زیادہ طاقتور اور فعّال بازو کو کمزور کرنے ہی کو جنھوں نے اسلام کی خدمت سمجھ رکھی ہے! آہ! یہ شر پسند علمارِ دین (؟) جو دین و اخلاق پر کتابیں لکھنے کی بجائے جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کے خلاف جھُوٹ تصنیف کر رہے ہیں! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بُغض و عناد و کبر نے آخرت کی بازپُرس کے احساس سے انہیں یکسر غافل کر دیا ہے اور اُن کے زبان و قلم سے ایسی ایسی غلط و بیجا بلکہ بعض اوقات بازاری قسم کی باتیں نکل جاتی ہیں، جن کی توقع ایک جواری اور شرابی سے بھی نہیں ہو سکتی، علم و تقویٰ (؟) اور فسق و فجور کی جب ایک ہی سطح ہو جائے تو اس المیہ پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔

عناد و تعصب کی دوسری بات ہے اور جن کی آنکھوں پر یہ پٹی بندھی ہوتی ہے اُن آنکھوں کو کسی کے خوبی و ہنر کی بیاضِ صبح بھی شبِ تاریک نظر آتی ہے ــــــــــــ ورنہ سچی بات یہ ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے دین کی جو علمی خدمت انجام دی کہ وہ اس قدر شاندار اور عظیم الشّان ہے کہ اس دور میں اُس کی مثال مشکل ہی سے مل سکے گی، لادینیت اور مادہ پرستی کا کوئی ایسا محاذ اور مورچہ نہیں ہے، جہاں مودودی صاحب عقل و نقل کے دلائل سے مسلّح ہو کر حق کی حمایت میں سینہ سپر نظر نہ آتے ہوں، اُن کا

قلم کم و بیش چالیس سال سے اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت انجام دے رہا ہے اور اسی کے لئے وقف ہو کر رہ گیا ہے!

فتنۂ انکارِ سنّت ہو، قادیانیت ہو، تجدد اور مغرب زدگی یا کمیونزم اور اسی طرح کے دوسرے جاہلانہ "ازم" (ISM) ہوں، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ان تمام ملحدانہ معتقدات وجاہلانہ تصورات اور فتنوں کے خلاف اس شدت کے ساتھ قلمی جہاد کیا ہے کہ ان بُت کدوں کی فصیلوں میں رخنے ڈال دیئے ہیں، جو بات کہی ہے استدلال کی پوری قوت کے ساتھ کہی ہے، بے دینوں، تجدد زدوں اور اباحت و آزاد خیالی کے علمبرداروں کی وہ وہ دُکھتی رگیں پکڑی ہیں کہ یہ لوگ تلملا تلملا کر رہ گئے ہیں۔

مولانا مودودی غیر معمولی ذہین ہیں اور اس دور میں عام طور پر ذہین اہلِ قلم اور اربابِ فکر و علم "تجدد" کی طرف مائل نظر آتے ہیں، مصر کے بعض بلند پایہ علما کے نام اس سلسلہ میں پیش کئے جا سکتے ہیں مگر مولانا مودودی پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ ان کی ذہانت نے شریعت کے حدود میں رہ کر اپنے جوہر دکھلائے ہیں۔ غلامی، سُود، پردہ، ضبطِ ولادت، قتلِ مرتد، تصویر، بُت گری جہاد ـــــ اس قسم کے تمام مسائل میں مولانا مودودی نے دین و شریعت کے نقطۂ نگاہ کی ترجمانی کی ہے اور کسی مسئلہ میں بھی "معذرت" (APOLOGY) کا انداز اختیار نہیں کیا، ان مسائل کو انھوں نے اس قدر جرأت آمیز یقین کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس حقیقت کو دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ ان مباحث و مسائل میں دین و شریعت ہی کا نقطۂ نگاہ دُرست ہے، جو لوگ دین کی رُوح اور مزاج سے ناواقف ہونے کے ساتھ ساتھ مغربیت اور لادینیت سے مرعوب ہیں وہ یورپ کے ملحد مفکرین کے سامنے سپر انداختہ بلکہ سر بہ رکوع ہو جاتے ہیں! مولانا مودودی نے اس قسم کی مرعوب ذہنیتوں کو پوری طرح بے نقاب کر دیا ہے اور اُن کے فکر و نظر کی کمزوریوں کا آئینہ اُنہیں دکھا دیا ہے، مولانا مودودی کے قلم نے ہر محاذ پر مجاہد کی تلوار بن کر مدافعت ہی نہیں اقدام بھی کیا ہے! وہ اس زمانہ کے بہت بڑے فاتح دینی عالم اور کامیاب اسلامی مفکر ہیں۔

مولانا مودودی کی تنہا کتاب "پردہ" ہی اُن کی وسعتِ مطالعہ، علمی تبحر، دینی فکر، قوتِ استدلال، فراستِ ایمانی، ذہانت و بصیرت کا حسین و نمایاں تعارف اور ادب و انشاء کا شاہکار ہے! عربی میں اس کتاب کا ترجمہ ہو چکا ہے اور اس نے عرب دُنیا کے بڑے بڑے دانشوروں کو چونکا دیا ہے بلکہ بعض علمی حلقوں میں ہلچل پیدا کر دی ہے۔

مولانا مودودی قرآن کریم میں کتنی بصیرت رکھتے ہیں، اُس کو کوئی جاننا چاہے تو "تفہیم القرآن" کا ایک ایک صفحہ اس کی شہادت دے رہا ہے کہ ملّت کی خوش قسمتی ہے جو اس دورِ تشکیک و تجدد اور عہدِ آزاد خیالی میں اتنا صحیح الفکر مفسّرِ قرآن ہمارے درمیان پایا جاتا ہے۔ جن مقامات پر بعض خاصے مشہور و معروف مفسّرین نے ٹھوکریں کھائی ہیں اور تعبیر و توجیہ میں بڑے اختلافات اور جھمیلے پائے جاتے ہیں، وہاں سے مودودی کس متانت و سنجیدگی کے ساتھ گزر رہا ہے اور اس کے قلم نے کتنے نازک مباحث کو کس کمال و خوبی کے ساتھ عام فہم سُلجھے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے! مولانا مودودی جہاں یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس مقام پر تلاوت کرنے والے کے ذہن میں کھٹک پیدا ہو سکتی ہے یا جبر و قدر کی کسی انتہا کی طرف ذہن مائل ہو سکتا ہے ان مقامات کی وہ ضرور تشریح کرتے ہیں جسے پڑھ کر ذہن میں کوئی اُلجھن اور کھٹک باقی نہیں رہتی، اور قاری اللہ تعالیٰ کو قادر و قاہر اور جبّار سمجھنے کے باوجود اپنے اعمال کی ذمہ داری اور جوابدہی کا اپنے کو مکلّف تسلیم کرتا ہے۔

مولانا مودودی کے تفقہ فی الحدیث کا اندازہ لگانا ہے تو اُن کے دوسرے معرکہ آرا مضامین کے علاوہ مجلّہ "ترجمان القرآن" کا "منصبِ رسالت نمبر" پڑھیے جس میں اُنھوں نے سُنّتِ رسول کے دین میں حجّت ہونے پر ایسے قوی، دل نشین اور مسکت دلائل پیش کئے ہیں کہ منکرینِ سُنّت کا سارا "علم کلام" حرفِ غلط بن کر رہ گیا ہے۔

مولانا مودودی کی مشہور تصنیف سود ہے "حقوق الزوجین" ہے اور رسائل و مسائل ہیں۔ جو اُن کی فقہی بصیرت کی روشن شہادت ہیں، کتنے جدید مسائل ہیں جن کا حل مولانا موصوف نے دین و شریعت کے تقاضوں کے مطابق پیش کیا ہے اُن کے یہاں جدید مسائل کی تشکیل میں نہ تو تنگ نظری اور جمودِ تقلید پایا جاتا ہے اور نہ تجدد و آزاد خیالی!

جبر و قدر کا مسئلہ کس درجہ متنازعہ فیہ ہے اس مسئلہ میں متکلمین کے درمیان کس قدر نزاع و کش مکش برپا رہی ہے، مولانا مودودی نے اتنے نازک و باریک اور پیچیدہ مسئلہ کی جس شگفتہ انداز میں تشریح کی ہے اور اس پیچاک دراز و ژولیدہ کو جس طرح سلجھایا ہے اُس سے اُن کی متکلمانہ حیثیت بلکہ عظمت متعین ہو جاتی ہے۔

اسلامی تہذیب و سیاست، اسلامی معاشرہ، اسلامی قانون اور اسلامی سیاست پر جو مودودی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ اسلامی لٹریچر کا قابلِ قدر سرمایہ ہے۔

اور

اقامتِ دین اور حکومتِ الٰہیہ کے تو وہ اس دور میں سب سے بڑے داعی ہیں، یہ صدا آج جہاں سے بھی بلند ہو رہی ہے، وہ مولانا مودودی کے صریرِ خامہ کی صدائے بازگشت ہے! اس دور کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ذہن و فکر کو مولانا مودودی نے جس قدر متاثر کیا ہے اس میں کوئی دوسرا اُن کا حریف نہیں ہے!

مولانا مودودی کی کتابیں پڑھ کر ہزارہا مسلمانوں کی زندگیوں میں دینی اور اخلاقی انقلاب آیا ہے۔ کتنے اہلِ رفض و بدعت، کمیونسٹ، دہریئے، ملحد، متشکک اور متجدد ہیں جو یقین و تقویٰ، ایمان و اسلام اور اخلاق و پاکیزگی کی طرف لوٹ آئے ہیں، ہندوستان اور پاکستان کے قریب قریب تمام شہروں اور قصبوں تک میں اس کی زندہ مثالیں ملیں گی! اگر مولانا مودودی کسی سلسلۂ طریقت کے شیخ ہوتے تو اُن کی اس کامیاب دینی تبلیغ کو ان کے تصرفاتِ باطنی اور کرامات کا لقب دیا جاتا، مولانا مودودی کی کتابوں نے ذہن و فکر کے دینی و اخلاقی انقلاب کے ساتھ کردار سازی کا جو عظیم کارنامہ انجام دیا ہے اُس کو اگر "تجدید و اصلاح" کے نام سے یاد کیا جائے تو یہ کوئی مبالغہ کی بات نہ ہوگی۔

مولانا مودودی کی عالم گیر مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا یہ عالم ہے کہ اُن کی بعض کتابیں اور رسالے دُنیا کی متعدد و مختلف زبانوں (عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، ترکی، انڈونیشیائی، جاپانی، بنگالی، گجراتی، مرہٹی، تلگو، ہندی، پشتو، سندھی، کنڑی، ملیالم، تامل) میں ترجمہ ہو چکے ہیں، اس اعتبار سے اُن کی علمی شخصیت بلاشبہ بین الاقوامی ہے وہ دُنیا کے قریب قریب ہر علمی حلقہ میں متعارف ہیں، خاص طور سے عرب ممالک میں اُن کی شخصیت کا بہت زیادہ احترام کیا جاتا ہے اور ان ملکوں کے اربابِ فکر اور علماء کی اکثریت مولانا مودودی کی قدر شناس اور مدح خواں ہے۔

مولانا مودودی کے وسیع و عمیق مطالعہ نے اُن پر اس حقیقت کو اچھی طرح آشکارا کر دیا ہے کہ باطنی واردات اور متشابہات کے ذوق کی بدولت اسلامی ادب میں کتنی بڑی بڑی شخصیتوں کے زبان و قلم سے بعض ایسی باتیں نکل گئی ہیں جن سے توحیدِ خالص غبار آلود ہو جاتی ہے، اس لئے مولانا مودودی نے اخلاق اور تزکیۂ نفس پر جو کچھ لکھا ہے اُس میں وہ زبان ہی استعمال نہیں کی جس سے شبہات اور غلط فہمیاں پیدا ہوتے ہیں، اُن کا فطری ذوق حلاجی اور منصوری نہیں ہے وہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح "نص" پر "فص" کو ترجیح دیتے ہیں کہ اہلِ ایمان کو "فصوص" کا نہیں "نصوص" کا پابند بنایا گیا ہے، یہی سبب ہے کہ مودودی صاحب کی تحریروں میں "توحیدِ خالص" نمایاں طور پر نظر آتی ہے اُن کی تحریروں کی یہ خصوصیت ممتاز ترین خصوصیت ہے!

مولانا مودودی کی زندگی صرف علمی اور تحریری نہیں ہے، اُن کا عملاً اس کشمکش سے سابقہ پڑا ہے، جس کشمکش میں امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ، امام بن حنبلؒ، امام ابن تیمیہؒ اور دوسرے مجاہد علماء مبتلا رہ چکے ہیں، مودودی صاحب نے کئی سال قید و بند میں گزارے ہیں یہاں تک کہ وہ پھانسی گھر کی منزل سے بھی گزر چکے ہیں، حق گوئی کے جرم میں سزائے موت کا حکم سُن کر اُن کی پیشانی پر بل تک نہیں آیا، اس طرح انھوں نے قربانی اور سرفروشی کی تاریخ میں خلاء (GAP) باقی نہیں رہنے دیا، اس سلسلۃ الذہب کی کڑی سے کڑی انھوں نے ملادی ہے۔

ان تمام مناقب اوصاف کے بعد ہم مولانا مودودی کو معصوم و منزہ عن الخطا ہرگز نہیں سمجھتے، وہ بھی ہماری طرح ایک انسان ہیں اُن کے قلم سے بھی بھول چوک ہوئی ہے، وہ بیشک حق و صداقت کے داعی اور ترجمان و مبلغ ہیں مگر سراپا حق اور معیارِ صداقت نہیں ہیں۔

لیکن

امام ابوحنیفہ ہوں یا امام ابو یوسف، امام غزالی ہوں یا امام ابن تیمیہ، حضرت شاہ ولی اللہ ہوں یا حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی (رحمہم اللہ تعالیٰ) ان میں سے کون ایسا ہے جو معصوم ہے اور جس کے زبان و قلم سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی، ہم ان بندگوں کے بعض سہو و تسامحات کے باوجود اُن کا احترام کرتے ہیں اس لئے کہ اُن کے یہاں خیر و حقانیت اور اخلاص و صداقت کا غلبہ پایا جاتا ہے ——— عفو و درگزر کی یہ چھوٹ اور احترام قدرشناسی کا یہ الاؤنس مولانا مودودی کو بھی دینا ہوگا کہ اُن کی کتابیں بعض سہو و تسامحات کے باوجود دینی افکار، اسلامی اقدار اور حق و صداقت کی ترجمان ہیں! اُن کے زبان و قلم سے کوئی ایسی غلطی سرزد نہیں ہوئی جس سے ایمان و اسلام کو نقصان پہونچتا ہو اور کسی دینی قدر کی نفی ہوتی ہو، خدا، رسول، آخرت، ملائکہ، کتاب سُنت، عبادات و معاملات کے بنیادی عقائد کا جہاں تک تعلق ہے، اُنھوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جسے "ضلالت" کہا جاسکے یا جو اُمت کے مُسلّمہ عقائد سے مختلف ہو۔

کوئی چاہے تو شوق سے مولانا مودودی کی تحریر کی غلطیوں پر تنقید کرسکتا ہے مگر جو کوئی جرح و تنقید میں اس حد تک پہونچ جائے گا کہ اُن کی غلطیوں سے بے دینی، نیا اسلام اور ضلالت منسوب کرے گا، وہ ظلم کا مرتکب ہوگا، اس قسم کے ناقدین یا تو اسلام کا صحیح علم نہیں رکھتے یا وہ پھر مودودی صاحب سے ذاتی عداوت رکھتے ہیں اور یہ عداوت اخلاق و انصاف کی تمام حدوں کو پھلانگ چکی ہے، کیا کیا جائے یا دلِ ناخواستہ نام لینا ہی پڑتا ہے مولوی غلام غوث ہزاروی جیسے "مولوی" مودودی صاحب کو بدنام کرنے اور اُن پر جھوٹے الزامات لگانے کا فرض اسلام کی خدمت سمجھ کر انجام دیتے رہے ہیں، اس مزاج و ذہنیت کے "مولویوں" اور "مولاناؤں" نے ہر دور میں تخریب کا پارٹ ادا کیا ہے، اور دین کے مخلص خدمت گزاروں کی راہ میں کانٹے بچھائے ہیں!

وہ عظیم مفکر (مودودی) جس کے علم و فراست کی عرب و عجم میں دھوم ہے، عرب کے علماء جسے غزالیؒ اور ابن تیمیہؒ کی صف کا آدمی سمجھتے ہیں اُسے "ملعون مودودی" کہہ کر جو لوگ اپنے جذبۂ حسد و عداوت کو تسکین دینا چاہتے ہیں اُنہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ایسی اوچھی اور گھٹیا باتوں سے خود اُن کی اور دیندار طبقہ کی رُسوائی ہو رہی ہے اور نئی نسل "مولویوں" سے بیزار ہوتی جا رہی ہے کہ جو صاحبانِ جُبّہ و دستار اتنے بڑے دینی مفکر کی ذلت و رُسوائی کے درپے ہیں وہ خود اپنی ذات اور اخلاق و کردار سے کیا واقع ہوئے ہیں! ان حسد و تعصب کے مارے ہوئے "مولویوں" کی اس مہم کا اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نکل ہی نہیں سکتا کہ مولانا مودودی صاحب کی کتابیں پڑھ کر جو نوجوان دین سے قریب ہوئے ہیں وہ اپنی جگہ دین کے بارے میں مُذبذب ہو جائیں اور جو دین سے قریب آرہے ہیں یا آسکتے ہیں وہ

اپنے اپنے مقامات تشکیک و آزاد خیالی پر رُکے رہیں۔

سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے اگر کوئی مُفسد قرآن و احادیث تک کے چند جملے یا بعض الفاظ کاٹ چھانٹ کر، قرآن و حدیث کو (خاکم بدہن گستاخ) مطعون کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، مُنکرین سُنّت اس قسم کی گھٹیا حرکتیں کرتے ہی رہتے ہیں ———— مولانا مودودی کی تحریروں کے ساتھ بھی بلاشبہ یہی سُلوک کیا جا رہا ہے کہ اُن کے منشا اور مفہوم کے بالکل خلاف اِدھر اُدھر سے چند اَدھ کٹے جملے اور ادھورے اقتباسات کتربیونت کر کے پیش کئے جا رہے ہیں!

اور

پچھلے دو ڈھائی مہینہ سے تو یہ مُہم بہت زیادہ تیز اور منظم ہو گئی ہے، مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کے خلاف جہازی پوسٹر، پمفلٹ اور رسالے دھڑا دھڑ چھپ رہے ہیں، اگر ان مُہم سازوں کے "فتوحات" کے ذرائع کی چھان بین کی جائے تو پاکستان کی ایک ریاست کے خزانے کے علاوہ کچھ اور "ذریعوں" اور "واسطوں" کا بھی پتہ لگ سکتا ہے۔

بندگانِ شکم کی جبیں کے لئے
بارگاہیں بھی ہیں آستانے بھی ہیں

اس شر سے خیر کا پہلو بھی نکل رہا ہے ———— یہ کہ جو حضرات تحقیق کا جذبہ رکھتے ہیں وہ مولانا مودودی کی کتابوں کی طرف رجوع ہو رہے ہیں اور جو کوئی مودودی صاحب کی کتابیں پڑھ لیتا ہے اُس پر ان غلط اندیش "مودیوں" کا جھوٹ کھل جاتا ہے۔

مخالفت کی مُہم

حکومت کے وزراء کا بہت بڑا منصب اور اہم ذمہ داریاں ہیں اول تو انہیں سیاسی لیڈروں کی سطح پر آ کر بیان بازی کے چکر میں ہی نہیں پڑنا چاہئیے اور اگر کسی معروف شخصیت پر تنقید و احتساب کی ضرورت ناگزیر سمجھی جائے تو پھر انہیں زبان سے کوئی ایسی بات نہیں نکالنی چاہیئے جو پختہ اور مُحکم نہ ہو اور جس کے بارے میں وہ کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہ کر سکیں، حکومتوں کے وزراء اور ارباب حل و عقد کسی فرد یا جماعت کو عوام میں غیر مقبول بنانے اور رسوا کرنے کا پارٹ ادا نہیں کیا کرتے! یہ روش ان کے منصب کے شایانِ شان نہیں ہے

مولانا مودودی پر سب سے پہلے یہ الزام لگایا گیا کہ انھوں نے جہادِ کشمیر کے خلاف فتویٰ دیا تھا، اس پر مولانا مودودی نے چیلنج کیا کہ میں نے اس قسم کا کوئی فتویٰ نہیں دیا اگر کسی کے پاس ایسا کوئی فتویٰ موجود ہے تو اُسے پیش کیا جائے، مودودی صاحب کے اس چیلنج کو قبول نہیں کیا گیا، اُن کا بیان آج تک ناقابلِ تردید ہے! اُس زمانہ کے آزاد کشمیر کے صدر سردار محمد ابراہیم نے بیان دیا کہ میں نے اپنے عہدِ صدارت میں اس افواہ کی تحقیق کرائی تھی مگر مولانا مودودی پر اس قسم کا کوئی الزام ثابت نہیں ہوا ———— جب اس الزام کی کوئی بنیاد اور اصل نہ مل سکی تو اس کے بعد یہ فرمایا گیا کہ مودودی صاحب نے پاکستان کی مخالفت کی تھی حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے مولانا مودودی نے تو کانگریس کے متحدہ قومیت کے نظریہ کی اپنے زورِ قلم سے دھجیاں بکھیر کر رکھدی تھیں اور اُنھوں نے ہندوستان کے مُسلمانوں کے جداگانہ ملت ہونے پر ایسے مسکت دلائل پیش کئے تھے کہ کسی کانگریسی لیڈر اور مولوی سے ان دلیلوں کا جواب نہ بن پڑا، مولانا مودودی کی تحریریں تو پاکستان کی تاسیس و تشکیل میں کام آئی ہیں!

کسی فرد یا جماعت کا کسی غیر حکومت سے ساز باز کر کے خفیہ طور پر مالی امداد حاصل کرنا یا اُس کے ایما پر مُلک میں کوئی تحریک چلانا کتنا بڑا سنگین جرم ہے، اس جرم کی سنگینی کے اعتبار سے اس کے ثبوت کے لئے کس قدر قوی اور واضح شہادت کی ضرورت ہے، یہ بات کسی عام آدمی کو بھی کسی کے بارے میں اُس وقت تک مُنہ سے نہیں نکالنی چاہیئے جب تک اس کے لئے واقعی ثبوت موجود نہ ہو چہ جائیکہ کسی

حکومت کے ارباب کار اس الزام کا اعلان فرمائیں اور ملزم اس کے جواب میں اصرار کرے کہ اگر آپ کے پاس کوئی ثبوت موجود ہے تو عدالت میں مجھ پر باقاعدہ مقدمہ چلایا جائے! کسی فرد یا جماعت کو عوام میں بدنام و رسوا کرنے اور بے اعتبار ٹھہرانے کے لئے اس سے زیادہ سنگین اور شدید الزام اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا، مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پر یہ الزام لگایا گیا اور آج تک ذرہ برابر کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا ۔

اگر کسی جمہوری حکومت میں وزراء کسی دینی یا سیاسی رہنما اور جماعت پر اس قسم کے الزامات لگاتے اور ان کا کوئی ثبوت فراہم نہ کرسکتے تو وہ ازخود مستعفی ہوجاتے اور نہ ہوتے تو پریس اور پبلک کا احتجاج اور دباؤ انہیں اپنے عہدوں سے استعفا دینے پر مجبور کردیتا مگر پاکستان کی "بنیادی جمہوریت" نے حقیقی جمہوریت کی وسعتوں کو بہت کچھ تنگ کردیا ہے اور آئین پسند ضمیر کی بیداری کے لئے بہت ہی کم مواقع اور گنجائشیں رہنے دی ہیں ۔

مولانا مودودی کی ایک کتاب سے یہ نکتہ پیدا کیا گیا کہ وہ طاقت کے ذریعہ انقلاب لانا چاہتے ہیں، حالانکہ مولانا مودودی بار بار اس کا اعلان کرچکے ہیں کہ پاکستان جمہوری اور آئینی حدود کے ذریعہ وجود میں آیا ہے، یہاں آئین و جمہوریت ہی کے تقاضوں کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے اصلاح و انقلاب کی کوشش ہونی چاہیئے، جماعت اسلامی کا سولہ سالہ ماضی سب کے سامنے ہے اس نے کیسی کیسی ناخوشگواریوں اور زیادتیوں کو برداشت کیا ہے مگر آئینی حدود سے تجاوز نہیں کیا! اب رہا "طاقت" کا استعمال تو عزت مآب وزیر داخلہ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں کہ اسکندر مرزا کو "طاقت" کے ذریعہ ہٹایا گیا تھا یا آئین و جمہور کے تقاضے پورے کئے گئے تھے اور فوجی حکومت کیا جمہوری انتخاب اور عوام کی صوابدید کے ذریعہ ملک پر مسلط ہوئی تھی؟ پھر جس ملک میں آرڈی ننسوں کے ذریعہ حکومت ہوتی ہو اور دستور ساز اسمبلی تک کو بے دست و پا بنادیا گیا ہو وہاں آئین و جمہور کی راہوں کو بند دیکھ کر بعض غلط اندیش انتہا پسند "طاقت" کے بارے میں سوچنے لگیں تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوگی، اللہ تعالیٰ اس فتنہ اور ہنگامہ سے پاکستان کو محفوظ رکھے "طاقت" کے استعمال نے مصر، شام، ترکی اور عراق میں جو گل کھلائے ہیں، اس کے تصور سے امن و آشتی کے ماتھے پر پسینہ آجاتا ہے۔

مولانا مودودی پر ایک یہ الزام بھی لگایا گیا ہے کہ وہ جھوٹ بولنے کو ضروری سمجھتے ہیں! بلاشبہ یہ ایک ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی یوں کہے کہ قرآن میں خنزیر اور مردار کھانے کا حکم دیا گیا ہے! حالانکہ یہ کوئی اصول اور عام حکم نہیں ہے، بلکہ اجازت و رخصت ہے اور اس شخص کے لئے ہے جسے کھانے کو کوئی اور چیز نہ مل سکے اور وہ مضطر ہوجائے! مولانا مودودی جھوٹ بولنے کو گناہِ کبیرہ سمجھتے ہیں، اس لئے وہ کذب بیانی کی تلقین کرہی نہیں سکتے اور نہ انہوں نے ایسا کیا ہے ــــــ ان کی جس عبارت کا اقتباس پیش فرمایا گیا ہے اس کا پس منظر یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے بعض ارکان نے اب سے چند سال پہلے جماعت کے طریقِ کار کے بارے میں اختلاف کیا تھا، یہ ایک لمبی بحث ہے، اس سلسلہ میں مولانا موصوف نے لکھا تھا کہ بعض اوقات "جھوٹ" بھی بولنا پڑتا ہے، مثلاً مسلمانوں کی کافروں سے جنگ ہو تو کافروں کی صفوں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے "جھوٹی بات" بھی کہی جاسکتی ہے، اسی طرح میاں بیوی کے درمیان اختلاف ہوجائے تو میل ملاپ کے لئے کوئی شخص غیر واقعی بات اور کذب آمیز حیلہ بھی کام میں لائے کہ جس کے ذریعہ زوجین میں اتحاد ہوسکے، تو ایسا کرنے کی شریعت میں اجازت موجود ہے، بات کیا تھی اور اسے پیش کس طرح کیا گیا؟

مولانا مودودی سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ پاکستان سے اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کریں سفاکانہ قسم کا مذاق ہے یا ان پر یہ تہمت کہ وہ محبِ وطن نہیں ہیں ایک ایسا الزام ہے جس کی زد خود پاکستان پر آکر پڑتی ہے! دوسرے ملکوں کے اربابِ فکر اس قسم کے بیانات پڑھ کر پاکستان کے بارے میں کیا یہ رائے قائم کرنے میں حق بجانب نہیں ہوں گے کہ مودودی جیسا عظیم دینی مفکر، صاحب الرائے

عالمِ دین اور متین و سنجیدہ انسان جب پاکستان کا غیر وفادار ہے اور اُس کی وطن دوستی مشتبہ ہے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ پاکستان میں غالباً ایسے لوگوں کی اکثریت پائی جاتی ہے جو پاکستان کے وفادار نہیں ہیں! ہم اس بات کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتے خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر مولانا مودودی پاکستان کے وفادار نہیں ہیں اور اُن کی وطن دوستی مُشتبہ ہے تو پھر پاکستان میں کسی شخص کی وفاداری اور وطن دوستی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کافروں سے صُلح اور جنگ کی ہے، یہودیوں اور کفارِ قریش سے معاہدے کئے ہیں، یہ معاہدے دینی نہیں سیاسی تھے اس لئے اسلام کے نزدیک سیاست "شجرِ ممنوعہ" نہیں ہے، اسلام نزدیک "سیاست بے دین" ہے اور نہ "دین بے سیاست" ہے، مولانا مودودی سیاست کو دین سے جُدا نہیں سمجھتے اس لئے وہ بیک وقت دینی بھی ہیں اور سیاسی بھی ہیں اُنھوں نے "سیاست" اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم کرنے کے لئے اختیار کی ہے، سیاست تو راہبوں، جوگیوں، سنّاسیوں اور بھکشوؤں کے یہاں ناپسندیدہ عنصر اور قابلِ ترک شے ہے، اسلام کے حدودِ عمل میں "سیاست" بھی شامل ہے کہ اسلام دین و دُنیا کا جامع ہے۔

جو لوگ مولانا مودودی کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ مودودی صاحب بس دین و اخلاق تک اپنی کوششوں کو محدود رکھیں، سیاست میں دخل نہ دیں ——— ایسے لوگ دین کا صحیح علم ہی نہیں رکھتے، دین کے بارے میں اُن کا زاویہ نگاہ بہت زیادہ تنگ و محدود ہے، اسلام آفاق گیر مذہب اور ازلی و ابدی دین ہے، اس کے دائرہ عمل میں تجارت، سیاسیات، مالیات، معاشرت غرض زندگی کا ہر شعبہ شامل ہے، اقبالؔ نے ایک مصرعہ میں اس مفہوم کا ست نکال کر رکھ دیا ہے، فرماتے ہیں:—

؎ جُدا ہو دیں سے سیاست تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہ واقعہ ہے اور تجربات اس کے شاہد ہیں کہ دین و سیاست میں جب بھی جُدائی واقع ہوئی ہے تو پھر "چنگیزی" باقی رہ گئی ہے، مولانا مودودی یہی تو چاہتے ہیں کہ حکومت و سیاست کا کاروبار دین و شریعت اور اخلاق و تقویٰ کے ماتحت رہے! تاکہ علامہ اقبالؔ کے بقول "چنگیزیت" کو کھیل کھیلنے کا موقعہ نہ مل سکے! کوئی شک نہیں کہ غلط قسم کے سیاست بازوں نے "سیاست" کو بہت کچھ بدنام کر دیا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح بد دیانت تاجروں کے سبب تجارت بدنام ہے ——— مگر تجارت و سیاست تو حکومت اور معاشرے کے لازمی اجزاء اور ضروری عناصر ہیں، ان کو کس طرح چھوڑا جا سکتا ہے، ہاں! نیک لوگوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ تجارت و سیاست کو پاک و مُطہر بنائیں، اور ان کو اخلاقی حدود میں رہ کر استعمال کریں! کوئی شک نہیں کہ حکومت و سیاست کا کام بہت کچھ پیچیدہ اور پُر خطر ہے، اس میں قدم قدم پر سخت اخلاقی آزمائشیں ہیں مگر اُنہیں پیچیدگیوں، خطروں اور آزمائشوں میں گھر کر اللہ تعالیٰ کے دین کے تقاضوں کو پُورا کرنا اور "جام و سنداں باختن" کا ثبوت دینا ہے، خلافتِ راشدہ میں دین و سیاست اور حکومت و تقویٰ کا صحیح امتزاج پایا جاتا ہے اور اسی مقدس تاریخ کو پھر دُہرانا مقصود ہے۔

سوچیے!!

جماعتِ اسلامی کوئی ایسی جماعت نہیں ہے، جسے چند موقعہ پرستوں نے حالات کا رُخ دیکھ کر قائم کر دیا ہو یا جو کسی ہنگامی جذبہ یا وقتی جوش کے سبب وجود میں آگئی ہو، یہ جماعت پُورے غور و فکر کے بعد ان اربابِ فکر، اہلِ علم اور مخلص لوگوں نے قائم کی تھی جو دینی شعور کے ساتھ ساتھ اخلاقی اعتبار سے بھی اچھا کردار اور نیک زندگی رکھتے تھے، انگریز کے دور میں دس سال تک اس جماعت نے کام کیا! اُس وقت بھی جماعت کے دفاتر قائم تھے، مقامی جلسے اور سالانہ اجتماعات ہوتے تھے، کتابیں چھپتی تھیں اُس کے ہفتہ وار اور ماہوار رسالے بھی تھے ——— اس زمانے میں آخر جماعت کس غیر ملکی حکومت کے اشارے پر کام کر رہی تھی اور اُسے کہاں سے مالی امداد ملتی تھی، کیا رُوسی حکومت اُس کے اخراجات کی کفیل تھی،

امریکہ کی حمایت اسے حاصل تھی، یا جاپان اور جرمنی سے اس کا ساز باز تھا، یا کانگریس سے روپیہ ملتا تھا، یا مسلم لیگ اس کی پشت پناہی کرتی تھی؟ پاکستان بننے کے بعد بھی پاکستان کی جماعتِ اسلامی اپنے رفقاء اور ہمدردوں کے مالی تعاون کے ساتھ کام کر رہی ہے، اس کے دفاتر میں پائی پائی کا حساب موجود ہے۔ جماعتِ اسلامی سے جو ارکان وقتاً فوقتاً خارج اور مستعفی ہوتے رہے ہیں، جن میں سے بعض نے جماعت کے طریقِ کار پر سخت تنقید بھی کی ہے، مگر انھوں نے جماعت کے مالی معاملات کے بارے میں ایک حرف بھی نہیں کہا، روپیہ پیسہ اور حساب کتاب کے معاملے میں جماعت بڑی سختی کے ساتھ دیانت کے اصولوں کی پابند ہے ——— اور خدانخواستہ کسی دوسری حکومت کی شہ اور پشت پناہی یا مالی امداد کا جماعت کے معاملات میں ذرہ برابر بھی دخل ہوتا تو.......... جماعت سے نکلے ہوئے یہ ارکان جن میں سے بعض خاصے متشدد ناقدین بھی ہیں، اس راز کو ضرور فاش کر دیتے۔

پاکستان میں سیاسی پارٹیوں اور اُن کے بعض رہنماؤں کا جو رنگ رہا ہے وہ سب کو معلوم ہے، لوگوں نے کیسی کیسی سیاسی قلابازیاں کھائی ہیں، ایک ایک پارٹی کتنی کتنی پارٹیوں میں تقسیم ہوئی ہے اُن کی وفاداریوں کے محاذ تک بدلتے رہے ہیں مگر جماعت اسلامی شروع ہی سے جس اصول پر قائم ہے اُس سے بال برابر اِدھر سے اُدھر نہیں ہوئی، اگر یہ "مالِ بکاؤ" ہوتا تو کسی بیرونی حکومت سے ساز باز کا خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت تھی، خود پاکستان کی حکومتوں سے گٹھ جوڑ کر کے وہ ہر طرح کے فائدے حاصل کر سکتی تھی، جماعتِ اسلامی منافقت اور دورُخی سے کام لیتی اور پاکستان کی حکومتوں کی طرف جُھک جاتی تو یہاں وزارت امورِ مذہبی قائم کر کے اُس کو اپنے قبضہ میں لے لیتی اور اسلامی مشاورتی کونسل آج اُس کے ہاتھ میں ہوتی!

جماعتِ اسلامی کے بعض ناقدین شاید اپنے پر ارکانِ جماعت کا قیاس کرتے ہیں، جماعت کا ایک ایک رُکن جان دیدے گا مگر اپنے ضمیر کی سودے بازی نہیں کرے گا، یہ لوگ اپنی دُنیا بنانے کے لئے اپنی عاقبت خراب کر سکتے تو "اقامتِ دین" کی جدّ وجہد کے خطرے میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی، دُنیا میں بہت سی ایسی راہیں کھلی ہوئی ہیں، جہاں اخلاقی تقاضوں کو پسِ پشت ڈال کر بہت کچھ لذتیں اور منفعتیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

جس جماعت میں اتنے خدا ترس ارکان پائے جاتے ہوں، جنھوں نے اکلِ حلال کی خاطر بہت سے ناجائز ہی نہیں مشتبہ منافع تک کو چھوڑ دیا ہو، وہ کسی غیر حکومت کی مالی امداد لینے کا بھلا تصور بھی کر سکتے ہیں؟ ایسا کام کوئی پاگل اور حواس باختہ ہی کر سکتا ہے کہ ایک طرف گرد و غبار سے بھی اپنے دامن کو بچانے کی فکر رکھے اور دوسری طرف غلاظت اور نجاست کھانے سے بھی نہ چوکے۔

جماعتِ اسلامی کے ارکان جماعت کی مالی امداد میں کمالِ ایثار و قربانی کا ثبوت دیتے ہیں، ملک میں اس کے ہمدرد بھی موجود ہیں جو جماعت کی بڑی فراخدلی سے مالی اعانت کرتے ہیں، پھر جماعت کے کاموں میں ایک ایک پیسہ انتہائی دیانت اور کفایت شعاری کے ساتھ خرچ کیا جاتا ہے، حکومت کے کاروبار اور دوسری پارٹیوں کے کسی کام میں اگر ایک لاکھ روپیہ صرف ہوتا ہے، وہاں جماعت چند ہزار روپیہ میں اس کام کو اور زیادہ حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیتی ہے ——— ہم تو حکومت کی خدمت میں یہ گزارش کرتے ہیں اور مخلصانہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے ملازمین کا رندوں اور عمال کو جماعتِ اسلامی کے دفتروں میں تربیت کے لئے بھیجے، تاکہ یہ لوگ فرض شناسی، کفایت شعاری، دیانت اور نظم و ضبط وہاں جا کر سیکھیں!

جماعتِ اسلامی جس پیمانہ پر تبلیغِ دین اور اقامتِ دین کا کام کرنے کا منصوبہ رکھتی ہے، اُس کے لئے بہت بڑے سرمایہ کی ضرورت

ہے، سرمایہ کی قلت کے سبب وہ اپنا کوئی روزنامہ جاری نہیں کر سکی، روزنامہ تسنیم نکالا بھی تو اُس کو مسلسل خسارہ ہوتا رہا اس لئے وہ بند ہو گیا، مارشل لا کے نفاذ نے جماعتِ اسلامی کی تنظیم کو سب سے زیادہ متاثر کیا، خاص طور سے "خدمتِ خلق" کا شعبہ جماعت کے بحالی ہونے کے بعد ابھی تک نہیں سنبھل سکا۔

اس لئے

جماعتِ اسلامی پر یہ الزام کہ وہ کسی غیر ملکی طاقت کے اشارے پر کام کر رہی ہے اور اُسے کہیں باہر سے مالی امداد مل رہی ہے سو فیصدی جھوٹ، سرتاپا بہتان اور بے سروپا تہمت ہے!

جماعتِ اسلامی نے پاکستان میں اب تک جو جدوجہد کی ہے آئینی حدود میں رہ کر کی ہے! پاکستان میں برسوں سے طلباء کے ہنگامے ہو رہے ہیں یہاں تک کہ بعض مقامات پر خون خرابے کی نوبت پہونچ گئی ہے مگر جماعتِ اسلامی کے بارے میں کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ ان ہنگاموں سے اُس کا کوئی دُور کا تعلق بھی رہا ہے لیکن چند مہینہ سے جماعتِ اسلامی کو بدنام کرنے کی جو مہم جاری ہے، اس دوران میں پہلی بار جماعت پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ لاہور میں طلبا کا جو ہنگامہ ہوا تھا اُس میں جماعتِ اسلامی کا ہاتھ تھا یہ الزام جتنا سنگین ہے، اُتنا ہی بے اصل ہے، ہنگامہ آرائی جماعت کا مزاج ہی نہیں ہے!

پاکستان کے انتخابات میں جماعتِ اسلامی نے حصہ لیا ہے ان انتخابات کے لاکھوں دیکھنے والے موجود ہیں، جماعت نے کسی جگہ بھی ووٹ حاصل کرنے کے لئے کوئی غیر اخلاقی اور قانون و آئین کے منافی حرکت نہیں کی ہے۔ جماعت کی طرف سے انتخابی مہم میں کام کرنے والوں کو سختی کے ساتھ ہدایت کی گئی تھی کہ چاہے ووٹ ملے یا نہ ملے، جیت ہو یا ہار اخلاقی حدود کا پوری طرح لحاظ رکھنا ہے۔ جس جماعت نے الیکشن میں کسی ہنگامہ آرائی، بے آئینی اور غیر اخلاقی حرکت کو استعمال نہ کیا ہو، اُس سے اس بات کی اُمید نہیں کی جا سکتی کہ وہ طلباء کو ہنگامے کرنے کے لئے اُکسائے!

مسلم لیگ کی تاریخ ہمارے سامنے ہے کہ اس جماعت میں عہدے حاصل کرنے کے لئے کیسی کیسی کشمکش ہوتی تھی، جماعتِ اسلامی کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے، وہاں کوئی رُکن جماعت کا کوئی عہدہ اور منصب حاصل کرنے کے لئے نہ خود اُمیدوار بنتا ہے اور نہ اپنے لئے کنونیسنگ کر سکتا ہے، جس جماعت کا یہ کردار اور عقیدہ ہو، اُس کے بارے میں یہ رائے قائم کرنا کہ وہ اقتدار حاصل کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کر رہی ہے، ایک "توہم" سے زیادہ کوئی اور حیثیت اور حقیقت نہیں رکھتا۔

جماعتِ اسلامی اقتدار نہیں "اسلام" چاہتی ہے، اس کا ہر دور کے اربابِ اقتدار سے یہی مطالبہ رہا ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر اور اسلام کے لئے بنا ہے، اس لئے یہاں "اسلام" قائم ہونا چاہیئے! اس مطالبہ اور اس مطالبہ کے لئے جدوجہد کو جو کوئی "انتشار" سے تعبیر کرتا ہے وہ خود ضعفِ دماغ اور انتشارِ خیال میں مبتلا ہے۔

اگر حکومت کے کسی قانون، آئین، دستور، طرزِ حکومت اور طرزِ فکر میں خامیاں اور کوتاہیاں پائی جائیں، تو اُن خامیوں کی نشاندہی اور اُن کے دُور کرنے کا مطالبہ کرنا نہ تو فساد ہے اور نہ انتشار ہے، جو لوگ جمہوری حکومتوں کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہیں، اُن میں تنقید برداشت کرنے کا بھی تحمل ہونا چاہیئے، جمہوری ریاستوں میں شاہانہ نازک مزاجیوں سے اور زیادہ خرابیاں اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں! جماعتِ اسلامی کی کسی ایسی کوشش، احتجاج اور مطالبہ کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی جو غیر واجبی ہو جہاں کہیں جماعت کے کسی کارکن نے انتخابات میں کوئی قابلِ گرفت حرکت کی ہے، تو جماعت نے اس پر احتساب کیا ہے اور اُسے تنظیمی طور پر سزا دی ہے۔

ہو اور جس سے فساد و انتشار منسوب کیا جاسکے ——— مثلاً پاکستان میں "عائلی قوانین" جب منظرِ عام پر آئے تو جماعت نے دین و شریعت کی دلیلوں کے ساتھ بتایا کہ اس میں کتاب و سنّت کے نقطۂ نگاہ سے یہ یہ خرابیاں پائی جاتی ہیں، اور اس نے ان قوانین کی تنسیخ کا مطالبہ کیا! یہ مطالبہ اگر انتشار ہے تو پھر پاکستان کے تمام علماء اس جرم کے مجرم ہیں کہ ان سب نے "عائلی قوانین" کی تنسیخ و ترمیم کا مطالبہ کیا ہے، اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ علماء، عائلی قوانین کے واضعین سے زیادہ دین و شریعت کا علم رکھتے ہیں۔

اس زمانہ میں جب کہ رائے دہی کے لئے زیادہ سے زیادہ سہولتیں میسر آچکی ہیں جمہوری حکومتوں کا انتخاب بالغوں کی رائے دہی کی بنیاد پر ہونا چاہیئے، جماعت اسلامی کا یہ مطالبہ جمہوریت کی رُوح کی آواز ہے، رہا "بنیادی جمہوریت" کا نسخۂ کیمیا (؟) جسے پاکستان کے اربابِ اقتدار نے ایجاد کیا ہے، اُسے آزما کر دیکھا گیا تو خواص اور سرمایہ داروں کو تو اُس سے فائدہ پہونچا مگر عوام کے حق میں یہ مُضر ہی ثابت ہوا ——— ہمارے لائقِ احترام اربابِ حل وعقد کو آخر کس بات کا دھڑکا لگا ہوا ہے جو وہ "بالغ رائے دہی" کا سامنا کرتے ہوئے کتراتے ہیں۔

شرقِ اُردن بالشت بھر کی حکومت ہے وہاں بھی ریلیں چلتی ہیں، ہوائی جہاز اُڑتے ہیں، اور حکومت کے محکمے اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں، وہاں کا حکمراں دوسرے ملکوں میں جاتا ہے، تو اُس کا شاہانہ استقبال ہوتا ہے، اخبارات میں اُس کے دورے کی شاندار تصویریں چھپتی ہیں، دوسرے ملکوں کے اربابِ حل وعقد شاہ حسین کی فراست و ذہانت کی تعریفیں کرتے ہیں، مگر یہ تمام رسمی باتیں ہیں! اگر انگریزی حکومت کے انداز پر صرف ملک کا چلانا مقصود و مطلوب تھا، تو پھر لاکھوں مسلمانوں کی قربانی دینے کی کیا مار پڑی تھی، متحدہ ہندوستان میں یہ سب کچھ ہوتا بلکہ اس سے زیادہ بڑے پیمانے پر ہوتا ——— پاکستان تو ایک نظریاتی حکومت ہے، جو "اسلام" کے نام پر وجود میں آئی ہے، یہاں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ "اسلام" کے لئے کیا ہو رہا ہے؟

قرآنِ کریم دو ٹوک الفاظ میں کہتا ہے کہ جن اہلِ ایمان کو اللہ تعالیٰ زمین میں تمکّن عطا فرماتا ہے وہ صلوٰۃ و زکوٰۃ کا نظام قائم کرتے ہیں کیا پاکستان میں اس فریضہ کی طرف کوئی توجہ کی گئی یہاں "قومی ترانہ" چھڑتے ہی کھڑا نہ ہونا جرم ہے مگر اذان سُن کر نماز سے غفلت برتنے اور اقامتِ صلوٰۃ کے فریضہ کو دانستہ ترک کرنے پر کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوتی ——— سود، شراب خوری، زنا، قمار بازی، بُت گری جیسے فواحش و مُنکرات پر پاکستان میں کوئی روک ٹوک نہیں ہے، شراب کی درآمد میں سال کے سال اضافہ ہوتا جارہا ہے، یہاں تک کہ پاکستان کی بعض مسلمان عورتیں تک اس لعنت میں مبتلا ہیں، حکومت کی طرف سے رقص و سرود کی باقاعدہ سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی جاتی ہے ——— ان خرافات، لغویات اور فواحش و معاصی پر جماعتِ اسلامی احتجاج کرتی ہے تو کیا بُرا کرتی ہے، اس نہی عن المنکر پر "انتشار" کی پھبتی چُست کرنا ضمیر کی بے حسی کی دلیل ہے کہ توبہ و ندامت کی بجائے ان مُنکرات پر اُلٹا اصرار کیا جاتا ہے ——— اُن دینی امور کا نام لئے نام تو بتایا جائے جو حکومت نے سرانجام دیئے ہیں، اور جن پر وہ دیندار طبقہ سے مدح و ستائش کی توقع رکھتی ہے ——— اس نوبت پر کہا جاسکتا ہے کہ حکومت نے اسلامیات کی تحقیق کے لئے ایک ادارہ قائم کیا ہے، بیشک کیا ہے مگر اس ادارے کی جانب سے جن افکار و معتقدات کا اظہار ہورہا ہے انہیں پڑھ کر یہ اندیشہ واضح طور پر نظر آتا ہے کہ یہ ادارہ اسلامی تعلیمات کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دے گا۔

انگریز آمدنی کے ذرائع کے معاملات میں حلال و حرام کی تمیز نہیں کرتا تھا، سود ہو، سٹہ اور گھوڑ دوڑ کے جُوئے سے آمدنی ہو، شراب کے ٹیکس کی منفعت ہو، انگریزی دورِ حکومت میں آمدنی کی یہ تمام حرام و ناجائز مدیں جائز و گوارا بلکہ پسندیدہ تھیں، مگر پاکستان بننے کے بعد کسی دورِ حکومت میں بھی اس طرف دھیان ہی نہیں گیا کہ اسلام اکلِ حلال کو ضروری قرار دیتا ہے، اور جو

جسم حرام روزی سے پرورش پاتا ہے اُسے جہنم کا عذاب چکھنا پڑے گا! یہاں آج تک انگریزوں ہی کا نظام معیشت چل رہا ہے۔

پاکستان کو کسی کی تلوار نے فتح نہیں کیا، اور نہ یہ کسی کے ذریعہ حاصل کیا گیا ہے —— اور جمہوریت میں حکومتیں اَدلتی بدلتی رہتی رہیں جو کوئی یہاں تختِ حکومت پر تمکّن حاصل کرنے کے بعد اس فکر میں لگا ہے گا کہ اقتدار کی کرسی مل گئی ہے تو اب یہ ہاتھ سے جانے نہ پائے! اس طرح اقتدار کی مدت دراز کرنے کی یہ ہوس طرح طرح کی خرابیوں کو جنم دے گی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی الہامی بصیرت اور پیمبرانہ فراست نے انہی خرابیوں کو محسوس کرکے تو یہ فرمایا تھا کہ جو کوئی کسی عہدے اور منصب کو خود طلب کرے اُسے عہدہ نہ دیا جائے

جماعتِ اسلامی کے سالانہ اجلاس میں دن دھاڑے ایک بے گناہ قتل کردیا جاتا ہے اور منظم طور پر غنڈہ گردی ہوتی ہے مگر ہمارے سننے میں نہیں آیا کہ اس خونیں ہنگامہ کی تحقیقات کی گئی ہو دوسری طرف جماعت کے خلاف اخبارات میں آئے دن بیانات دینے کی باقاعدہ مہم جاری ہے اور — — — — — — — — — — — — اور بعض بیانات میں تو عوام کو اُکسایا گیا ہے کہ وہ خود جماعت اسلامی سے نمٹ لیں، جماعت کے کارکنوں کی گرفتاریاں ہوتی رہتی ہیں اور وہ بیچارے مقدموں میں کھنچے کھنچے پھرتے ہیں، فضا اس قسم کی پیدا کی جارہی ہے کہ عوام اور خاص طور سے سرکاری ملازمین کی ہمدردیوں سے جماعت محروم ہوجائے اور اس طرح وہ پاکستان میں "اچھوت" بن کر رہ جائے، اور یہ بھی ہماری خوش فہمی اور حسنِ ظن ہے کہ "جماعت اچھوت بن کر رہ جائے" —— رہ کیوں جائے، اقتدار خسروی کی یہ حریف جماعت زمین کے پردے پر باقی ہی کیوں رہے، اس کے شیرازہ ہی کو کیوں نہ بکھیر دیا جائے! اس حلقوم کو بیکار کردیا گیا، تو مطالبہ و احتجاج کی دردسری سے حکومت کو نجات مل جائے گی

طاقت سب کچھ کرسکتی ہے، انگریزی راج کا ہمیں تجربہ ہے کہ پولیس کا تھانیدار جب کسی کے درپے آزار ہوجاتا تھا تو اُس بیچارے کی زندگی تلخ ہوجاتی تھی، کتنے شریف آدمی اپنی عزت آبرو بچانے کے لئے اُس تھانہ کے حدودِ عمل (سے نکل کر دوسرے علاقہ) سے باہر چلے جاتے تھے، کتنے بے گناہوں کو تھانیدار صاحب کی خفگی اور برہمی نے جیل خانہ کا پانی پلاکر چھوڑا۔

ع فریاد از تطاول مشکیں کمندِ تو

جماعت اسلامی اور عوام سے

ان معروضات کے بعد ہمیں جماعتِ اسلامی کے ارکان سے یہ کہنا ہے کہ ان پر اس پندرہ سولہ سال کی مدت میں کئی بار آزمائشیں آچکی ہیں مگر جو حالات سامنے آرہے ہیں اُن کا رُخ بتاتا ہے کہ جماعت کو مستقبل میں بڑے ہی سخت و نازک مرحلوں سے غالباً گزرنا پڑے گا، نہیں کہا جاسکتا کہ کب کیا حالات پیش آجائیں! وہ جو فرمایا گیا ہے کہ جو کچھ ہونے والا (کائن) ہے اُسے لکھ کر (کاتب تقدیر کا) قلم خشک ہوگیا تو قسمت میں جو کچھ لکھ دیا گیا ہے وہ پورا ہوکر رہے گا، قضا و قدر سے کوئی لڑ نہیں سکتا، انسان کو ہاں کا البتہ اختیار دیا گیا ہے اور مکلّف بنایا گیا ہے کہ وہ ہدایت و ضلالت، تقویٰ اور فسق و فجور، بزدلی اور جرأت و مردانگی کی راہوں میں جس راہ کو چاہے اختیار کرے! دنیا کے عیش و آرام بہت عارضی ہیں، زندگی کی راتیں پھولوں کی سیج پر بھی گزرجاتی ہیں اور کانٹوں کے فرش پر بھی! اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے، اُسی زندگی کے لئے سب کچھ کرنا ہے، مردِ مومن کی ہر جدّ و جہد کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہونا چاہیئے!

امتحان و آزمائش کے جب موقعے آتے ہیں، تو آدمی کا خود اپنا نفس اور شیطان مل کر عجیب عجیب نکتے سُجھاتے ہیں اور طرح طرح کی رخصتوں اور حیلوں کے فریب دیتے ہیں! ایسے موقعوں پر شیطان اور نفس کے مکر و فریب سے اللہ تعالیٰ کی پناہ

طلب کرنی چاہیئے کہ اُسی کے کرم سے استقامت اور ثبات و عزیمت کی توفیق میسر آسکتی ہے! اسلامی تاریخ کی کتنی مقدس و نامور شخصیتوں کو جن کے احترام و عقیدت سے ہمارے قلب معمور ہیں' بادشاہوں کی تنک مزاجی اور خفگی و برہمی نے کیسی کیسی شدید مصیبتوں اور آفتوں میں مبتلا کیا ہے' مگر خدا کے ان نیک بندوں کے پائے استقامت میں جنبش تک نہیں آئی (رحمہم اللہ تعالیٰ)

اس عالم کون و فساد میں تو یہ ممکن ہے کہ کوئی کسی پر زیادتی کر کے اُس کی دُنیا بگاڑ سکتا ہے مگر آخرت میں کسی انسان کا بس نہیں چل سکتا وہاں ہر عمل کا پُورا بدلہ ملے گا، آخرت کی جواب دہی' اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اُس کے "مالک یوم الدین" ہونے پہ جتنا زیادہ یقین ہوگا، قدر قول و عمل میں اخلاص پیدا ہوگا، کسی کی ساری زندگی جیل خانے کی کال کوٹھری میں بیت لئے اور اُس پر دن رات سختیاں کی جائیں' تو یہ سالہا سال کی عقوبت اور عمر بھر کے شدائد و مصائب عذاب آخرت کے ایک لمحہ کے مقابلہ میں ہیچ ہیں' فکر اس کی کرنی چاہیئے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رضا، خوشنودی، مغفرت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت میسر آئے!

جماعتِ اسلامی بے سروسامانوں کی جماعت ہے' جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں ——— یہ کہہ کے چل پڑے کہ خدا کارساز ہے! جماعت کی اصل طاقت ایمان و یقین کی طاقت ہے، اور اُن کا سہارا صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا سہارا ہے' بس اسی تعلق (باللہ) کو مضبوط سے مضبوط تر کرنا ہے' اللہ تعالیٰ کے خوف و خشیت سے دل معمور رہے تو پھر دُنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی مرعوب نہیں کر سکتی ——— اخبارات کی تائید پر طبیعتوں کا اطمینان و مسرت محسوس کرنا اور مخالفت پر ملول ہونا، یہ ہے تو ایک طبعی تقاضا، مگر اس شغف سے دل کو زیادہ سے زیادہ بے تعلق رکھنے کی ضرورت ہے' نظر اس پر رہنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اخلاص و وفا کے تقاضے کہاں تک پُورے ہو رہے ہیں! شیطان جب دیکھتا ہے کہ حق کی راہ سے بھٹکانے کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں' تو وہ پھر نیکی و تقویٰ اور ایثار و قربانی پر نفس کے کبر و غرور کا شب خوں مارتا ہے' بڑے سے بڑے ایثار و قربانی کے بعد یہی سمجھتے رہنا چاہیئے کہ ہم سے غفلت اور کوتاہی ہو رہی ہے اور راہِ حق کی مسافرت کا ہم سے حق کہاں ادا ہو رہا ہے! اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ و ندامت، استغفار، خضوع و خشوع اور اپنے کو انتہائی ذلیل و حقیر پیش کرنے سے ایمان کو تقویت نصیب ہوتی ہے۔

جماعتِ اسلامی اقامتِ دین کی جس جدوجہد میں لگی ہوئی ہے، حسنِ اتفاق سے اس جدوجہد کو پاکستان کے عوام کی تائید بھی حاصل ہے' لیکن اگر خدانخواستہ ایسے حالات پیدا کر دیئے جائیں کہ یہ تائید جماعت کو حاصل نہ رہے اور عوام اُس کے مخالف ہو جائیں' پھر بھی جماعت کو کام تو یہی کرنا ہے اور اسی راستے کی سختیاں سہنی ہیں' انھوں نے عوام کی نہیں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے اس جدوجہد کا آغاز کیا تھا، اور یہ جدوجہد خواص و عوام کی رکاوٹوں اور مخالفتوں کے ہجوم میں جاری رہنی چاہیئے۔

آخر میں جماعتِ اسلامی کے وابستگان سے ایک بات اور کہنی ہے ——— یہ کہ جہاں تک اصلاح اخلاق کا تعلق ہے عوام جن میں یہ گنہگار بھی شامل ہے' خواص سے کم اصلاح کے محتاج نہیں ہیں' آخرت سے غفلت اور خدا سے بے خوفی کی دُھند قصر و ایوان سے لے کر جھونپڑیوں اور جھگیوں تک چھائی ہوئی ہے۔

عوام سے ہماری یہ التجا ہے کہ جماعتِ اسلامی کی مخالفت میں اخبارات کے بیانات' پوسٹر اور کتابچے پڑھ کر جماعت کے بارے میں وہ کوئی رائے قائم نہ کریں' اُن کو چاہیئے کہ سُنی سُنائی باتوں پر یقین کرنے کی بجائے جماعت کے لٹریچر کو خود پڑھیں اور تھا ہی جماعت کے کارکنوں کے حالات اور اُن کی زندگیوں کی ٹوہ لگائیں' اس کی تفتیش کریں کہ اُن لوگوں کی اخلاقی حالت کیسی ہے؟ اُنکی عبادات اور معاملات کی کیا کیفیت ہے؟ اس مطالعہ اور جائزہ کے بعد عوام کو جماعت کے بارے میں رائے قائم کرنے کا پُورا حق حاصل ہے!

اربابِ حکومت کی خدمت میں

آخر میں پوری دردمندی اور احترام کے ساتھ اربابِ حکومت کی خدمت میں ہماری یہ گزارش ہے' التجا ہے' معروضہ اور درخواست ہے کہ ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کے حق ہونے پر ہمارا ضمیر پوری طرح مطمئن ہے' ہم نے اپنی دانست میں کوئی غلط اور غیر واقعی بات نہیں کہی! اربابِ اقتدار کوئی غیر نہیں ہیں' وہ ہمارے ہی بھائی بند اور ہماری طرح ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں' اور اپنے بھائی بندوں پر تنقید کرنا کوئی خوشی کی بات نہیں ہے یہ فریضہ ناخوشگوار تو مجبوراً ادا کرنا پڑتا ہے۔

اربابِ حکومت کا منصب وعہدہ بلند سہی مگر وہ بھی ہماری طرح پاکستان کے باشندے ہیں' اور ایک شہری کی حیثیت سے جس طرح انہیں فرد وجماعت پر تنقید کا حق حاصل ہے' اسی طرح ہم بھی کسی فرد وجماعت کی مدافعت کا حق رکھتے ہیں اور ساتھ ہی تنقید کا بھی!

آرڈی ننسوں کی کیا نزاکتیں ہیں اور قانون ودستور کے کیا نکتے ہیں' یہ باتیں تو قانون داں ہی جانیں' ہم تو سیدھی سادی بات یہ عرض کرتے ہیں کہ جو گزارشیں ہم نے کی ہیں' ان میں سے کسی بات کی غلطی ہم پر واضح کر دی جائے' تو اسی رسالہ (فاران) میں اپنی غلطی کا ہم اعلان واعتراف کریں گے۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ "طلوعِ اسلام" اور "الفضل" ملّتِ اسلامیہ کے نہ ترجمان ہیں اور نہ ملّتِ اسلامیہ سے کوئی دینی واسطہ رکھتے ہیں' ان کے مشورے اور آراء کسی قدر وقیمت اور توجہ کے مستحق نہیں ہیں' جماعتِ اسلامی سے ان کی دشمنی اس حد تک پہونچی ہوئی ہے' جہاں اخلاق وانصاف کی ہر حد توڑ دی جاتی ہے!

حکومت اور اربابِ حکومت کا وقار ومنصب اور اس کے کچھ سنجیدہ اور بلند تقاضے ہوتے ہیں' اربابِ حکومت جس سطح پر آکر جماعتِ اسلامی پر اعتراض وتنقید کر رہے ہیں وہ ان کے بعض مشیروں کی تدبیر وفراست کا کوئی اچھا نمونہ نہیں ہے! ہم ابھی تک اربابِ اقتدار سے یہ حسنِ ظن رکھتے ہیں کہ جماعت کے بارے میں انہیں صحیح اطلاعات نہیں پہونچائی جا رہی ہیں!

ہمارے دوست اور شناسا جانتے ہیں کہ ہم نے سرکار دربار میں بار پانے کی کبھی کوشش نہیں کی' اور نہ حکومت سے کسی منفعت کی کوئی توقع رکھی مگر موجودہ صورتِ حال کی سنگینی اور اس کش مکش بحث ومناظرہ کو دیکھ کر ہم اپنی ناچیز خدمات پیش کرتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی کے بارے میں حکومت کو جو اعتراض اور غلط فہمی بھی ہو' اس کے متعلق وضاحت کے لئے ہماری خدمات حاضر ہیں! "ہماری حقیر خدمات" سے یہ لازمی اور ضروری نہیں ہے کہ راقم الحروف ہی "وضاحت وترجمانی" کے فریضہ کو انجام دے گا' ہم مرکزی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے بعض ارکان سے درخواست کر کے اس کے لئے انہیں آمادہ کر لیں گے کہ وہ جماعتِ اسلامی کے موقف کو پوری وضاحت سے پیش کریں' افہام وتفہیم اور حالات کا صحیح علم ہو جانے کے بعد تلخی اور برہمی کی فضا ہموار اور غلط فہمیوں کا غبار دور ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے اور اصلاحِ حال کی توفیق عطا فرمائے ——— آؤ ہم سب مل جل کر اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم کرنے اور اللہ کی سرزمین میں نیکی اور بھلائی پھیلانے کی کوشش کریں یہاں تک کہ اسی جدّ وجہد میں ہمیں موت آجائے (آمین)

ماہر القادری

۲۱ دسمبر ۱۹۶۳ء

مولوی محبوب الرحمٰن
(آزاد کشمیر)

قرآن اور مجرم

قرآن انسان کے لئے سراسر ہدایت کا پیغام ہے - خداوند تعالیٰ نے انسانوں پر احسان فرما کر آخرت کی نجات کے لئے ایک ضابطۂ حیات نازل فرمایا تاکہ لوگ اس کی روشنی میں زندگی گزاریں قرآن کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جب سے ہدایت ربانی کا آغاز ہوا۔ تمام بنی نوع انسان دو حصوں میں تقسیم ہو گئے - ایک فرقہ یا جماعت مسلمان ـــــ کہلائی اور دوسرا حصہ مجرمین جنھوں نے کفر کر کے مجرمانہ زندگی اور باغیانہ روش اختیار کر لی - اب آپ قرآن کی زبانی مجرمین کا حال معلوم کریں کہ یہ کون لوگ ہیں - ان کے دنیا میں کیا اعمال ہیں - اور آخرت میں ان کا انجام کیا ہوگا۔

قرآن مجرمین کا تذکرہ تفصیل سے کرتا ہے کہ سابقہ انبیاء کو بھی ان لوگوں سے واسطہ پڑا پیغمبر کی ہدایات کو جھٹلانا اور اُن کے بتائے ہوئے لائحہ عمل سے انحراف مجرمین کا شیوہ رہا گویا پیغمبر کے مشن کی مخالفت میں ہر دم ان کی کوشش صرف ہوتی رہی ہے اس اعتبار سے مجرمین کی تاریخ بہت پرانی ہے -

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ أَكٰبِرَ مُجْرِمِيهَا	اور اسی طرح ہم نے کئے ہیں ہر بستی میں گناہگاروں کے
لِيَمْكُرُوا فِيهَا وَمَا يَمْكُرُونَ إِلَّا بِأَنْفُسِهِمْ	سردار کہ حیلے کیا کریں وہاں اور جو حیلہ کرتے ہیں سو اپنی
وَمَا يَشْعُرُونَ　(الانعام)	ہی جان پر اور نہیں سوچتے -

سورۂ اعراف میں باری تعالیٰ نے چند پیغمبروں کا ذکر فرمایا ہے - اُن کی دعوت - لوگوں کی مخالفت اور پھر اُن مخالفین کا انجام بیان کیا گیا ہے - حضرت لوط علیہ السلام کے واقعہ میں بتایا گیا ہے : ـــ

ـــــ "اور بھیجا لوط کو جب کہا اس نے اپنی قوم کو کیا تم کرتے ہو ایسی بے حیائی کہ تم سے پہلے نہیں کیا اُس کو کسی نے جہان میں تم تو دوڑتے ہو مردوں پر شہوت کے مارے عورتوں کو چھوڑ کر بلکہ تم لوگ ہو حد سے گزرنے والے اور کچھ جواب نہ دیا اُس کی قوم نے مگر یہی کہا کہ نکالو ان کو اپنے شہر سے یہ لوگ بہت ہی پاک رہنا چاہتے ہیں - پھر بچا دیا ہم نے اس کو اور اُس کے گھر والوں کو مگر اُس کی عورت کہ رہ گئی وہاں کے رہنے والوں میں اور برسایا ہم نے اُن کے اوپر مینہ یعنی پتھروں کا پھر دیکھ کیا ہوا انجام مجرمین کا "۔

آیات قرآنی میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے نبی کی بات کتنی سچی، محکم اور وزنی ہوتی ہے، لیکن مجرموں اور غلط کاروں کی فطرت اتنی مسخ ہو جاتی ہے کہ وہ نبی کے پاس آنے تک کے لئے تیار نہیں ہوتے وہ اُن سے دُور دُور رہتے ہیں بلکہ چاہتے ہیں کہ ان مصلحین کو اپنی بستی سے باہر نکال دیں - یہی وجہ ہے کہ جب برائیوں میں پختگی پیدا ہو جاتی ہے تو عقل و خرد کی صلاحیت بے کار ہو جاتی ہے - مجرم جو سوچتا ہے اور وہی کام کرتا ہے جو اُس کے بگڑے ہوئے ذہن کے موافق ہو لیکن قرآن شہادت دیتا ہے کہ ایسے لوگوں کا انجام دردناک

یہ لوگ چند دن کی مجرمانہ زندگی گذار کر ہمیشہ کی دردناک موت مرجاتے ہیں۔ مجرمین خدا سے پھر اس قدر دُور ہو جاتے ہیں کہ اُن کی زندگی کی ساری دوڑ دھوپ خواہشاتِ نفس کی خاطر صرف ہوتی ہے۔ بات بات پر حیلوں سے کام لینا اور پیغمبروں سے جھگڑنا اور استہزا کرنا۔۔۔۔ ان لوگوں کا شیوہ رہا۔ قرآن بتاتا ہے کہ یہ لوگ خداوند تعالیٰ کے بے حد ناشکرے ہوتے ہیں اگر زندگی میں آسودگی نصیب ہو جاتے تو اسے اپنا حق سمجھتے ہیں گویا کہ یہ ان کی اپنی محنت اور کوشش کا ثمرہ اور نتیجہ ہے اور بُرائی کو نیک لوگوں کی نحوست قرار دیتے ہیں۔ سورۂ اعراف میں حضرت لوطؑ کے بعد ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا۔

"اور ہم نے پکڑ لیا فرعون والوں کو قحطوں میں اور میووں کے نقصان میں تاکہ وہ نصیحت مانیں۔
پھر جب پہنچی اُن کو بھلائی کہنے لگے یہ ہے ہمارے لائق اور اگر پہنچی بُرائی تو نحوست بتلاتے
موسیٰؑ کی اور اُس کے ساتھ والوں کی۔ سُن لو اُن کی شومی تو اللہ کے پاس ہے۔ پر اکثر لوگ
نہیں جانتے اور کہنے لگے جو کچھ تو لائے گا ہمارے پاس نشانی کہ ہم پر اُس کی وجہ سے جادو کرے
سو ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہ لائیں گے۔ پھر ہم نے بھیجا اُن پر طوفان اور ٹڈی اور چیچڑی اور
مینڈک اور خون اور بہت سی نشانیاں جدی جدی پھر بھی تکبر کرتے رہے اور تھے وہ لوگ
گنہگار۔"

باری تعالیٰ ایسے لوگوں کو زمین پر ہمیشہ کے لئے بسنے کا موقع نہیں دیتے۔ خدا کے مقابل پیغمبر کی ہر بات اور ہر کوشش کی مخالفت پر آمادہ ہونا بلکہ پیغمبر کے لائے ہوئے دین ہی کو ختم کرنے کی کوشش کرنا گویا خداوند تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینا ہے۔ بالآخر مجرمین اپنے کئے کی سزا ضرور پاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت نے فرعون کو اوّل ہی حیران کر دیا۔ فرعون کی قوم نے حضرت موسیٰؑ کو ہر قسم کے مصائب اور مشکلات کی دھمکیاں دینی شروع کر دیں۔ حضرت موسیٰؑ چاہتے تھے کہ اپنی قوم بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے آزاد کرائیں اور یہ کہ فرعون کو خدا کی مخالفت سے باز رکھیں۔

وَاِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ وَاِلَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ فَاعْتَزِلُوْنِ ۔ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ؛ (الدخان)

اور میں پناہ لے چکا ہوں اپنے رب اور تمہارے رب کی اس بات سے کہ تم مجھ کو سنگسار کرو اور اگر تم یقین نہیں کرتے مجھ پر تو مجھ سے پرے ہو جاؤ۔ پھر دُعا کی اپنے رب سے کہ یہ لوگ مجرم ہیں۔

مُصلح اور مجرم دونوں کی زندگی کی راہیں مختلف واقع ہوئی ہیں۔ پیغمبر اللہ تعالیٰ کی ہدایت میں اپنی اُمّت کے لئے ایک جُدا زندگی کی شاہراہ متعین کرتا ہے مجرم لوگ پیغمبر کا ساتھ چھوڑ کر اپنی خواہشات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ قرآن ایسے لوگوں کو ظالم کہتا ہے۔ ظلم کے معنی "وضع الشیٔ الیٰ غیر محلہ" کے ہیں۔ یعنی شے کو غیر مناسب جگہ دینا۔

فَلَوْلَا کَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِکُمْ اُولُوْا بَقِیَّةٍ یَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِی الْاَرْضِ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّنْ اَنْجَیْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِیْهِ وَکَانُوْا مُجْرِمِیْنَ ۔ وَمَا کَانَ رَبُّکَ لِیُهْلِکَ الْقُرٰی بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ (هود)

کیوں نہ ہوئے اُن جماعتوں میں جو تم سے پہلے تھیں ایسے لوگ جن میں اثر خیر رہا ہو کہ منع کرتے رہتے بگاڑ کرنے سے ملک میں مگر تھوڑے جن کو ہم نے بچا لیا اُن میں سے اور چلے وہ لوگ جو ظالم تھے۔ وہی راہ جس میں عیش سے رہے تھے اور تھے گنہگار اور تیرا رب ہرگز ایسا نہیں کہ ہلاک

کرے بستیوں کو زبردستی سے اور لوگ وہاں کے نیک ہوں ۔

باری تعالیٰ چاہتے ہیں کہ اصلاح کے لئے بندے اپنے درمیان کوششیں جاری رکھیں اور جب کسی بستی میں نیکی کی قدریں اور مصلحین ناپید ہو جائیں تو پھر عذاب خداوندی وہاں ضرور نازل ہوتا ہے ۔ گویا مجرمین کا وجود اس دنیا میں ناقابل برداشت ہے ۔

قرآن مومن کے مقابل مجرم کا لفظ استعمال کرتا ہے ۔ ہر دو الفاظ انسانوں کے دو گروہوں کی نشاندہی کرتے ہیں ۔ پہلا گروہ خداوند تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے خدا کے پیغمبروں کا اسوۂ اور اُن کی لائی ہوئی شریعت اُن کی زندگی کی شاہراہ ہے اور اس کے مقابل ایمان سے خالی مجرم لیا جو خدا و رسول پر ایمان نہیں رکھتے ۔ اُن کے ہاں اَنَا کا اپنا رب ہے ۔ وہی اُن کا حاکم ہے ۔ خداوند تعالیٰ لوگوں کے اس بنائے ہوئے رب کے مقابل حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو لاتے ہیں ۔ ارشاد باری ہے :۔

اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰی
اَنْ تَزَكّٰی وَ اَهْدِیَكَ اِلٰی رَبِّكَ فَتَخْشٰی
(النازعات)

جا فرعون کی طرف بے شک وہ سرکش ہو گیا ہے ۔ پھر کہہ
تیرا جی چاہتا ہے کہ تو سنور جائے اور راہ بتلاؤں تجھ کو
تیرے رب کی طرف پھر تجھ کو ڈر ہو ۔

فرعون اس برگزیدہ پیغمبر کے مقابل مخالفت میں ڈٹ جاتا ہے ۔ چنانچہ ہر قسم کی دھمکیوں کے باوجود پیغمبر کے عزم میں ذرہ برابر اضمحلال پیدا نہیں ہوتا ۔ فرعون نے ہر طرح کے حیلوں اور تدبیروں سے حضرت موسیٰؑ کو باز رکھنے کی کوشش کی ۔ مگر بے سود اس کی خود ساختہ ربوبیت کچھ کام نہ آسکی ۔ وہ حضرت موسیٰؑ کو جادوگر سمجھ کر اُن کے مقابل اپنے ملک کے جادوگر جمع کرتا ہے تاکہ وہ اپنے جادو کے اثر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نشانیوں کو بے کار کر دیں اور اس طرح حضرت موسیٰؑ کا مشن ناکام اور دیکھنے والوں کی نظروں میں بے وقعت ہو جائے ۔ خداوند تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا وہی جادوگر جو حضرت موسیٰؑ سے جادوگری کا مقابلہ کرنے کے لئے آئے تھے حقانیت کا نعرہ بلند کرتے ہیں ۔ حقائق جب ان کی آنکھوں کے سامنے منکشف ہو گئے ۔ تو انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی سچائی کو پہچان لیا اور اس کے بعد انھوں نے ایمان لانے میں ذرا سے بھی توقف اور تامل سے کام نہیں لیا ۔ فرعون کی سب کوششیں غارت ہو گئیں ۔ وہ انہیں طرح طرح کے عذاب کی دھمکیاں دیتا ہے ۔ لیکن اب ایمان دار جادوگر اُس کی ان دھمکیوں کی بالکل پروا نہیں کرتے ۔ انہیں یقین ہو گیا کہ مجرم کی زندگی جو پیغمبر کی مخالفت میں صرف کی جاتی ہے کچھ بار آور ثابت نہیں ہوتی ۔ ایسے لوگوں کے لئے خسران و عذاب یقینی ہے اور جو لوگ پیغمبر کے راستہ کو قبول کر کے ایمان حاصل کر لیں ان کے لئے بلند درجات کی بشارت موجود ہے ۔

فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ
الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ؕ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغْفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا
وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَیْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَاللّٰهُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی ۝
اِنَّهٗ مَنْ یَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ
لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی ۝ وَمَنْ یَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا
قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ
الْعُلٰی ۝ (طٰهٰ)

سو تو کر گزر جو تجھ کو کرنا ہے ۔ تو یہی کرے گا اس دُنیا کی زندگی
میں ہم یقین لائے ہیں اپنے رب پر تاکہ بخشے ہم کو ہمارے
گناہ اور جو زبردستی کرایا تو نے ہم سے یہ جادو اور اللہ بہتر
ہے اور سدا باقی رہنے والی بات یہی ہے کہ جو کوئی آیا اپنے
رب کے پاس گناہ لے کر سو اُس کے واسطے دوزخ ہے نہ
مرے اُس میں نہ جئے اور جو آیا اُس کے پاس نیکیاں کر کے
سو اُن لوگوں کے لئے ہیں بلند درجے ۔

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت مجرمین کسی خدائی ضابطہ کے پابند نہیں ہوتے ۔ اُن کا معبود تو اُن کی خواہشات اور اُن کی اغراض نفسانی ہوتی ہیں ۔ خداوند تعالیٰ اپنے پیغمبروں کے ذریعہ جو احکام اور قیود اُن پر عائد کرتے ہیں ۔ مجرمین ان کی تکذیب

ڈال دیتے ہیں ۔ قرآن اس مقام پر قوم یہود کا واقعہ بیان کرتا ہے کہ اُن پر چند قیود عائد کردی گئی تھیں اس لئے کہ اُن کی طبیعت شرارت پسند تھی انھوں نے اپنی خواہشات کے تحت چند اشیاء کو اپنے اُوپر حرام کر دیا تھا اور کچھ اشیاء حلال قرار دی تھیں ۔ باری تعالیٰ اُن کی اس مجرمانہ ذہنیت کا ذکر فرماتے ہیں ۔ کہ یہ اُس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ وہ اُنہیں ڈھیل دیئے جا رہا ہے ۔ ورنہ وہ ہلاک کر دیئے جاتے ۔ اور یقینی بات یہ ہے کہ مجرم ہمیشہ عذاب خداوندی سے ہمکنار ہوتے ہیں ۔

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ (الانعام)

پھر اگر تجھ کو جھٹلا دیں تو کہہ دے تیرے رب کی رحمت میں بڑی وسعت ہے اور نہیں ٹلے گا اُس کا عذاب گناہگار لوگوں سے ۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سرکش اقوام کو متواتر ڈھیل دیئے جانا کہ وہ عیش و تنعم میں مست ہو جائیں اس بات کی قطعاً دلیل نہیں کہ وہ خدا کے ہاں مقبول اور برگزیدہ ہیں ۔ بلکہ قانون امہال کے نتیجہ میں اُس کی حکمت کا تقاضہ ہے کہ اُنہیں ڈھیل دی جاتی ہے تاکہ غافل اقوام کو عذاب خداوندی اچانک آ کر دبوچ لے قرآن دراصل انسان کو غفلت سے نکال کر خداوند تعالیٰ کے تقرب کی طرف لے جاتا ہے ۔ جن لوگوں کے دلوں میں شرارت اور سرکشی پختہ ہو گئی ہو اُن کے دل اس ہدایت کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتے ۔ بات بات پر تمسخر ، استہزا اور سرکشی ظاہر ہوتی ہے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی ان لوگوں نے ایسا ہی معاملہ کیا ۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر ہم اس قرآن کو کسی عجمی زبان والے پر نازل کرتے پھر بھی ان لوگوں کے ایمان لانے کی اُمید نہ تھی ۔ انکار حقیقت ان لوگوں کا شیوہ بن گیا ہے ۔ چنانچہ قرآن ان کو مجرمین کا نام دیتا ہے ۔ اور ساتھ ہی ان لوگوں کے لئے عذاب کا ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے اُس وقت یہ ایمان لانے کی کوشش کریں گے مگر بے سُود ۔ ذرا بھی مہلت نہ ملے گی ۔

وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ۝ فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝ فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (الشعراء)

اور اگر اُتارتے ہم یہ کتاب کسی اوپری زبان والے پر اور وہ اس کو پڑھ کر سُناتا تو بھی اس پر یقین نہ لاتے اسی طرح گھسا دیا ہم نے اس انکار کو گنہ گاروں کے دل میں وہ نہ مانیں گے اس کو جب تک نہ دیکھ لیں گے عذاب دردناک پھر آئے اُن پر اچانک اور اُن کو خبر بھی نہ ہو ۔

یہ بات مسلّم ہے کہ اُخروی انعامات صرف مسلمین اور مومنین کے لئے مخصوص ہیں ۔ جنھوں نے اپنی زندگی خدا کی مرضی کے تحت صرف کی اس کے برخلاف مجرمین کا معاملہ بالکل جُداگانہ ہے ۔ آخرت میں ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا ۔ کفار کہ بھی یہی خیال کرتے تھے کہ اگر مومنین کو آخرت میں خدا کی عنایات و بخشش نصیب ہوگی تو وہ بھی بزعم خود اس سے بہتر آرام اور عیش و نشاط پر یقین رکھتے تھے ۔ خداوند تعالیٰ نے فرمایا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دُنیا میں جن کی زندگی مجرمانہ گزری ہو ۔ اُنہیں آخرت میں نیکو کاروں کے ساتھ شامل کر دیا جائے ۔ بادی النظر میں ہم یہاں مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک وفادار غلام جو ہر وقت اپنے مالک کی مرضی کو پُورا کرنے میں مصروف رہتا ہے ۔ ایک سرکش اور باغی غلام جیسا معاملہ اُس کے ساتھ نہیں کیا جاتا ۔ دونوں کا معاملہ بالکل جُداگانہ ہے ، بعینہٖ آخرت میں بھی دونوں کا معاملہ بھی بالکل جُداگانہ ہوگا ۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝ مَا لَكُمْ

البتہ ڈرنے والوں کو ان کے رب کے پاس باغ ہیں نعمت کے ۔ کیا ہم کر دیں گے حکم برداروں کو برابر گنہ گاروں کے

كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ (القلم) کیا ہوگیا تم کو کیسی ٹھہراتے ہو بات ۔

قرآن نے دو مقامات پر مجرمین کی زندگی کا خاکہ بھی کھینچا ہے ۔ ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ ان کے دنیا میں کیا اعمال تھے ۔ جن کی بدولت انہیں آخرت میں سزا ملے گی ۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۙ اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ۛ فِيْ جَنّٰتٍ ۛ يَتَسَآءَلُوْنَ ۙ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ۙ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ۔ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۙ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۙ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ۙ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۙ حَتّٰٓى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ۗ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ۗ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ۙ (المدثر)

ہر ایک جی اپنے کے کاموں میں پھنسا ہوا ہے ۔ مگر داہنے والے باغیچوں میں ہیں ۔ مل کر پوچھتے ہیں گنہ گاروں کا حال ! تم کاہے سے جا پڑے تھے دوزخ میں ۔ وہ بولے ہم نہ تھے نماز پڑھتے اور نہ تھے کھانا کھلاتے محتاج کو اور ہم تھے باتوں میں دھنستے دھنسنے والوں کے ساتھ اور ہم تھے جھٹلاتے انصاف کے دن کو ۔ یہاں تک کہ آپہنچی ہم پر وہ یقینی بات پھر کام نہ آئے گی اُن کے سفارش سفارش کرنے والوں کی ۔ پھر کیا ہوا اُن کو کہ نصیحت سے منہ موڑتے ہیں ۔

معلوم ہوا کہ قیامت کے دن گنہ گاروں یعنی مجرمین کو اپنے اعمال کا احساس ہو جائے گا ۔ آج یہ حالت ہے کہ اگر کسی کو نیک کام مثلاً نماز ۔ خیرات وغیرہ کی تلقین کی جاتی ہے اور فضول لغویات سے باز رکھا جائے تو مطلق توجہ نہیں دی جاتی ۔ بلکہ نیک کاموں کی قدر و اہمیت ہی کو فراموش کر دیا گیا ہے ۔ لیکن قیامت کے دن جب حقائق منکشف ہو جائیں گے انہیں اپنی کوتاہیوں کا احساس ہو جائے گا ۔ باری تعالیٰ مجرمین کا ذکر دوسرے مقام پر اس طرح فرماتے ہیں ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ۔ وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ۔ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ۙ (التطفیف)

یقیناً وہ لوگ جو گنہگار ہیں ۔ تھے ایمان والوں سے ہنسا کرتے اور جب ہو کر نکلتے اُن کے پاس کو تو آپس میں آنکھ مارتے اور جب پھر کر جاتے اپنے گھر پھر جاتے باتیں بناتے اور جب اُن کو دیکھتے کہتے بے شک یہ لوگ بہک رہے ہیں ۔

یہ ہیں مجرمین کے اعمال کہ دنیا میں اہل ایمان سے تمسخر و استہزا کیا کرتے تھے ۔ اندازہ لگائیے کہ مجرمین اپنے تئیں راہِ راست پر اور دوسروں کو گمراہ سمجھتے ہیں ۔ اس غلط اندیشی اور خود بینی کی بھی بھلا کوئی [illegible] ذرا سوچنے کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خداوند تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لئے کس قدر نشانیاں ظاہر فرمائیں [illegible] آفاق پر غور کرنے سے خالق کائنات کا پتہ چلتا ہے ۔ ساتھ ہی انسان کی ہدایت کے لئے اُس نے پیغمبروں کا سلسلہ شروع فرمایا ۔ بے شمار پیغمبر اس دنیا میں آئے ۔ خدا کی طرف انھوں نے دعوت دی ۔ لوگوں کو آخرت کے عذاب سے ڈرایا ۔ دنیا میں نیک اعمال کا ضابطہ مقرر فرمایا ۔ لیکن اس کے باوجود اگر کوئی شخص توجہ نہ دے ۔ بلکہ ان تمام شواہد سے منہ موڑ کر باغیانہ زندگی اختیار کر لے تو عقل کا تقاضہ بھی یہی ہے ۔ کہ قانون مکافات کے مطابق ایسے لوگوں کو بد اعمالیوں کے نتیجہ میں ضرور سزا ملنی چاہیئے ۔ قرآن اس موقع پر مجرمین کا انجام بھی بیان کرتا ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ بے شک جنھوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور ان کے

لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ۚ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ۝ (الاعراف)

مقابلہ میں تکبر کیا۔ نہ کھولے جائیں گے اُن کے لئے دروازے آسمان کے اور نہ داخل ہوں گے جنت میں یہاں تک کہ گھس جائے اونٹ سوئی کے ناکے میں اور ہم یوں بدلہ دیا کرتے ہیں گنہگاروں کو۔

یہاں مجرمین کی دو باتیں معلوم ہوئیں یہ کہ وہ دُنیا میں اوّل تو آیاتِ خداوندی کی تکذیب کرتے تھے اور ساتھ ہی اُن کے مقابل تکبر کرتے۔ اس کے نتیجہ میں خداوند تعالیٰ نے اُن کے لئے جہنم سے خلاصی ناممکن کر دی۔ کہ جس طرح سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گزرنا ناممکن ہے بالکل اسی طرح جہنم سے نکل کر مجرمین کا جنت کو جانا ناممکن ہوگا۔ معلوم ہوا کہ خداوند تعالیٰ کی آیات کی طرف توجہ نہ دینا اور ان سے انکار کا سلوک کرنا۔ ان کے مقابل غرور و تکبر سے کام لینا مجرمین کا طریقہ ہے۔ اور قرآن کی اصطلاح میں یہی لوگ مجرم ہیں۔

سورۂ ابراہیم کے آخری رکوع میں باری تعالیٰ نے ظالموں کا ذکر فرمایا۔ کہ ان لوگوں کا مکر قطعاً کوئی حیثیت نہیں رکھتا جبکہ باری تعالیٰ کی تدبیر خود اپنا کام کر رہی ہے۔ آگے پھر ارشاد ہوتا ہے۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ۝ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ۝ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (ابراہیم)

جس دن بدل جائے اس زمین سے اور زمین اور بدلے جائیں آسمان اور لوگ نکل کھڑے ہوں سامنے اللہ اکیلے زبردست کے سامنے اور دیکھے تو گنہگاروں کو اُس دن باہم جکڑے ہوئے زنجیروں میں۔ کرتے اُن کے ہیں گندھک کے اور ڈھانکے لیتی ہے اُن کے منہ کو آگ۔ تاکہ بدلہ دے اللہ ہر ایک جی کو اُس کی کمائی کا۔ بیشک اللہ جلد کرنے والا ہے حساب۔

بہت سے آدمیوں کو اس کا خیال نہیں آتا اور آتا بھی ہے تو غفلت میں بھلا دیا جاتا ہے کہ دن رات کے تمام اُمور خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے ریکارڈ کئے جا رہے ہیں اور یہ "ریکارڈ" یعنی اعمالنامے ایک دن ہر آدمی کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا (الکہف)

اور رکھا جائے گا حساب کا کاغذ پھر تو دیکھے گا گنہگاروں کو ڈرتے ہیں۔ اُس میں جو اُس میں لکھا ہے۔ اور کہتے ہیں ہائے خرابی کیسا ہے یہ کاغذ کوئی چھوٹی اور بڑی بات ایسی نہیں جو اس میں نہیں آگئی۔ اور پائیں گے جو کچھ کیا ہے سامنے اور تیرا رب ظلم نہ کرے گا کسی پر۔

دُنیا میں مجرمین نے اپنے چھوٹے بڑے کاموں کی بُرائی پر توجہ نہیں دی اور جو جی میں آیا کیے رہے۔ لیکن قیامت کو سب کچھ آنکھوں کے سامنے دیکھیں گے۔ اُس وقت کا افسوس کچھ کام نہ دے گا۔

سورہ شعراء کے پانچویں رکوع میں خداوند تعالیٰ نے بے راہوں کا ذکر فرمایا کہ ان لوگوں نے دُنیا میں خدا کے علاوہ معبود تجویز کر رکھے تھے۔ آج قیامت کے دن اُن کے معبود کچھ کام نہ آئیں گے شریک اور ابلیس کا سارا لشکر سب کو دوزخ میں اوندھے منہ گرایا جائے گا۔ وہاں

آپس میں پھر جھگڑیں گے۔ پھر غلطی کا اعتراف کریں گے کہ واقعی ہم نے ان اشیاء کو خدائے واحد کا شریک بنایا تھا۔ آج ہمیں اس مصیبت سے کوئی نجات دلانے والا نہیں۔ اُن کے الفاظ یہ ہونگے :۔

وَمَا أَضَلَّنَا إِلَّا الْمُجْرِمُونَ (الشعراء) اور ہم کو راہ سے بہکایا ان گنہ گاروں نے سارا قصور ایک دوسرے پر تھوپیں گے۔ دراصل یکجہتی یا یکجہتی باہمی کے اصول کے مطابق دنیا میں نیک لوگوں کی جماعت علیحدہ رہی اور گناہ گار اور کفار کا ٹولہ اپنی جگہ ایک دوسرے کے کاموں میں شریک اور معاون رہا۔ الْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ ۝ (الزخرف) اُس عالم میں کسی کی دوستی کچھ کام نہ دے گی سوائے متقیوں کے کہ دنیا میں یہ لوگ باہم الفت و محبت۔ ایثار، اخلاق و تواضع کے جذبات اپنے درمیان رکھتے تھے۔ اور اسی وجہ سے ان کا تعلق ایمانی قائم تھا۔ اسی واسطے آخرت میں بھی یہی تعلق قائم رہے گا۔

اس وقت تو خدا کا باغی جو دل میں آتا ہے کر گزرتا ہے۔ اخلاقی و قانونی حدود کی مطلق اُسے پروا تک نہیں ہوتی۔ دنیا میں فتنہ کے محرک یہی لوگ ہوتے ہیں اور اہلِ ایمان سے نفرت۔ دین سے بیزاری کا گویا عہد کئے ہوئے ہیں۔ لیکن قیامت میں ان کا کروفر اور ٹھاٹ باٹ سب ہوا ہو جائیں گے۔ اس دنیا میں بہت کچھ اُمیدیں لگائے بیٹھے تھے لیکن وہاں سب اُمیدیں خاک میں مل جائنگی

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ (الروم)　　اور جس دن برپا ہوگی قیامت آس توڑ کر رہ جائیں گے گنہ گار۔

آخرت میں (کفار) مجرمین کا گروہ بالکل اہلِ ایمان سے علیحدہ کیا جائے گا۔ یہ اس لئے کہ دنیا میں ان لوگوں نے صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر شیطان کی پیروی اختیار کر لی تھی قیامت کے دن ارشاد ہوگا۔

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ ۝ أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ۝ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ وَأَنِ اعْبُدُونِي ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۔

اور تم الگ ہو جاؤ آج اے گنہ گارو میں نے نہ کہہ رکھا تھا تم کو اے آدم کی اولاد کہ نہ پوجیو شیطان کو وہ کھلا دشمن ہے تمہارا اور یہ کہ پوجیو مجھ کو یہ راہ ہے سیدھی۔

مذکورہ آیات سے معلوم ہوا کہ باری تعالیٰ اُس دن اُن مجرمین سے کمال بے زاری کا اعلان فرمائیں گے۔ ان لوگوں نے دانستہ خدا کے راستہ کو چھوڑ کر شیطان کی راہ اختیار کی تھی جب آیاتِ الٰہی کی تلاوت کی جاتی تھی ان لوگوں نے ان کے مقابل غرور کیا تھا اور سُنی اَن سُنی کر دی۔ باری تعالیٰ نے نصیحت اور اتمامِ حجت کا کوئی دقیقہ بھی اُٹھا کر نہ رکھا تھا۔ اس پر بھی یہ لوگ ایمان کی طرف نہ جھکے اور بغاوت و سرکشی کی روش پر جمے رہے۔

وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا أَفَلَمْ تَكُنْ آيَاتِي تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُجْرِمِينَ ۝ (الجاثیہ)

اور جو منکر ہوئے کیا تم کو سُنائی نہ جاتی تھیں آیتیں میری پھر تم نے غرور کیا اور ہو گئے تم لوگ گنہ گار۔

دراصل انسان کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ اس کا ذہن جس طرف بھی جھک جائے۔ وہی خیالات اور تصورات اسے اُس ماحول کے مطابق بنا دیتے ہیں۔ مجرمین اپنی جگہ یہی خیال کرتے ہیں کہ اُن کا معاملہ بالکل درست ہے۔ اور وہ جو کچھ کر رہے ہیں۔ گویا کہ بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن باری تعالیٰ سے سچا اور کون ہو سکتا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ۝ يَوْمَ يُسْحَبُونَ　　بے شک جو لوگ مجرم ہیں۔ غلطی میں پڑے ہیں۔ اور

فِي النَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ ○ (القمر)

جنہیں دیکھو لیں جس دن گھسیٹے جائیں گے آگ میں اوندھے منہ چکھو مزا آگ کا۔

قرآن کا اول سے آخر تک مطالعہ کیجئے۔ یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خداوند تعالیٰ نے انسان کو صراطِ مستقیم کی دعوت دی ہے جن لوگوں نے پیغمبروں کے ذریعہ اس راستہ کو اختیار کیا اور خصوصاً خاتم المرسلین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہا ان کے لئے فلاح و نجات یقینی ہے اور یہی ایمان اور اسلام کی راہ ہے۔ ان ہی لوگوں کے لئے رحمتِ خداوندی کی بشارت ہے۔ باری تعالیٰ نے ہدایت کا راستہ کھول کر بیان کر دیا ہے تاکہ اہلِ ایمان اور مجرمین کے راستے میں امتیاز قائم ہو جائے۔

وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ وَكَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ وَلِتَسْتَبِينَ سَبِيلُ الْمُجْرِمِينَ ○ (الانعام)

اور جب آئیں تیرے پاس ہماری آیتوں کے ماننے والے تو کہہ دے تو سلام ہے تم پر لکھ دی ہے تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت کو کہ جو کوئی کرے تم میں سے برائی ناواقفیت سے پھر اس کے بعد توبہ کرے اور نیک ہو جائے تو بات یہ ہے کہ وہ ہے بخشنے والا مہربان اور اسی طرح ہم تفصیل سے بیان کرتے ہیں آیتوں کو اور تاکہ کھل جائے طریقہ گنہگاروں کا۔

آؤ! ہم سب اپنے اعمال و کردار کا جائزہ لیں کہ کس راہ پر چل رہے ہیں اور کون سی روش اختیار کر رکھی ہے، ہمارے اعمال صالحین کے جیسے اعمال ہیں، یا مجرمین کی بداعمالیوں کی نقل اور تقلید کر رہے ہیں!

عمر برف است و آفتاب تموز
اندکے ماند و خواجہ غرہ ہنوز

اس مغالطے میں نہ رہنا چاہیئے کہ ابھی بہت کچھ عمر پڑی ہے، آخری عمر میں توبہ کر لیں گے، کیا ساری دنیا کے لوگ بوڑھے ہو کر ہی مرتے ہیں، جوان اور ادھیڑ عمر کے لوگوں کو کیا ہم نے مرتے نہیں دیکھا، توبہ اور اصلاحِ حال کے لئے جلدی کرنی چاہیئے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اللہ اور رسول کے حکم کے مطابق نیک زندگی اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے، تاکہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت ہمیں میسر آسکے! رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط

محمد اقبال سہیل

مولانا مودودی اور عالمِ اسلام

اپنے حالیہ عالمِ اسلام کے سفر میں مختلف حلقوں میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے افکار اور لٹریچر کے جن اثرات کو میں نے دیکھا ہے ۔ اس مضمون میں انہی شاہدات کو اختصار کے ساتھ سمیٹا ہے ۔ وہاں کے احوال اور تفصیلات کے سلسلے میں اپنے تاثرات و مشاہدات کا سفرنامہ لکھنا ابھی مطلوب نہیں ۔ اخوان کے حلقوں کا تذکرہ بھی عمداً چھوڑ رہا ہوں ۔ اس سلسلے میں دوسرے حضرات بہت کچھ لکھ چکے ہیں ۔
اقبال

قاہرہ کے بین الاقوامی اسکول برائے عربی لسانیات میں جب مجھے داخلے کی اطلاع ملی ۔ تو میں نے سفر کی تیاریاں شروع کر دیں لیکن تعلیمی سیشن شروع ہونے میں ابھی چار ماہ باقی تھے ۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا ۔ کہ اس چار ماہ کے عرصہ میں عالمِ اسلام کا علمی سفر اختیار کر لوں ۔ اسلامی تحریکات سے زیادہ مجھے غیر اسلامی تحریکات اور مستغربین کے اسالیب کو بچشم خود دیکھنے اور براہِ راست مطالعہ و مشاہدہ کرنے کا بے حد اشتیاق تھا ۔ علی الخصوص ، مشرقِ وسطیٰ میں مختلف لادینی اور استعماری تحریکات کے فکری و علمی خطوط اور سیاسی و اجتماعی طریقوں کا مرتب مطالعہ و مشاہدہ کرنے ہی سے وہاں کے اضطرابات ، انتشار اور احوال و کوائف کا سُراغ مل سکتا تھا ۔ گو چار ماہ کا عرصہ اس طرح کے مطالعہ کے لئے ہرگز کافی نہیں ہوتا ہے ، لیکن قاہرہ اور بیروت میں ڈیڑھ سال کے قیام نے اس کمی کو کسی حد تک پورا کر دیا تھا ۔ علی کُلِّ حال ، تحقیق و مطالعہ کا یہی ذوق و شوق ، اپنی خستہ سامانی اور درماندہ روی کے باوجود ، کشاں کشاں اس سفر کی سنگلاخ اور کٹھن راہوں پر لے گیا ۔ ورنہ ایک شکستہ پا اور ناتواں جان کے پاس مالکِ حقیقی کے کرم کے سوا اور تھا بھی کیا !

اس سفر کے بعد مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ عالمِ اسلام میں اُٹھنے والی تجدید و احیاء کی اسلامی تحریکات سے لادینی اور استعماری حلقے فکر مند ہیں ، اور مسلمان عوام میں اسلامی تحریک کے احیاء کا جو شعور اور تڑپ پیدا ہو گئی ہے اُسے کچلنے کے لئے مختلف تدبیریں اختیار کر رہے ہیں ، اور اُن کی سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ عالمِ اسلام میں مستقل طور پر انتشار و اضطراب پیدا کر دیا جائے اور اس کے لئے انھوں نے بلادِ اسلامیہ میں فکری و ثقافتی ، تجدد و انحراف اور سیاسی و اجتماعی استغلال و سازش کی راہوں کو اپنایا ہے ، اسلامی تحریکات کے ضمن میں مشہور و معروف مستشرق ڈاکٹر نبیہہ امین فارس نے ایک ملاقات کے دوران یہ کہا کہ " ان تحریکات کو دیکھ کر پاگل خانوں کا تصور کرتا ہوں " اس سے اُن کے عصبی تشنج اور ذہنی گھٹن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ اور دیکھنے کی حالت اُس وقت ہوتی ہے جب ان حلقوں کے کسی جانے والے فرد سے مولانا مودودی کا ذکر کر دیا جائے اس ذکر سے وہ یکایک آتش زیر پا ہو جاتے ہیں ——— واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی کے تاریخ ساز لٹریچر کو مسلمانوں نے جس طرح عالمِ اسلام میں ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور جس سُرعت سے یہ لٹریچر متضاد و مخالف حلقوں میں پہونچا ہے ۔ اُس سے ایک طرف مسلمان عوام کی عظیم اکثریت میں احیاء و تجدید کے لئے حسرت و آرزو اور آتش رفتہ کا سُراغ ملتا ہے اور کھوئے ہوؤں کی جستجو نظر آتی ہے ۔ دوسری طرف مخالفِ اسلام حلقوں کی عیارانہ بیداری ، بدحواسی اور جھنجلاہٹ

عالم ہوتا ہے اور تیسری طرف مولانا مودودی کے فکری تسلسل، اندازِ تفہیم اور تحریکی بصیرت کی عظمت کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حسن البنا شہید علیہ الرحمۃ کے درد و اخلاص اور مولانا مودودی کے فکر و تفہیم سے آج کے دور میں جو عہد آفریں روشنی کا مینار تعمیر ہوا ہے، اس سے فکر و نظر کو روشنی ملتی ہے اور منزلِ مقصود کے نشان واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

دعوت اسلامی ایک خطے میں محصور نہیں ہو سکتی۔ اس کی آفاقی پکار چہار وانگ عالم میں گونجی ہے اور اس پر لبیک کہنے والے راوی و نیل و فرات سے بھی ابھرتے ہیں اور جیحوں دجلہ و درۂ خیبر سے بھی نمودار ہوتے ہیں۔ جن کی زمین بے حدود ہوتی ہے اور افق بے ثغور! اقبالؒ نے کہا تھا، کہ ؎

عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام!

تہران یونیورسٹی کے خوب صورت ہاسٹل "خیابان پہلوی" میں ایک انتہائی نیک اور مخلص انگریز نومسلم نوجوان عبدالحمید الگر سے ملاقات ہوئی، آپ تہران یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں اور ایرانی لسانیات میں تحقیق پیش نظر ہے۔ برطانیہ میں "یارک شائر" کے رہنے والے ہیں اور ایک نہایت شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس خاموش طبع اور سلیم الفطرت نوجوان سے جب ملاقات ہوئی۔ تو اس کا اندازہ نہ تھا۔ کہ وہ انگریزی کے علاوہ عربی، فارسی اور ترکی و اُردو پر بھی عبور رکھتے ہوں۔ ذاتی مطالعہ سے یہ مسلمان ہوئے۔ اور آکسفورڈ سے بی۔اے کرنے کے بعد یہ دمشق اور قاہرہ عرصہ تک رہے۔ اور وہاں اخوان کے حلقوں سے بہت متاثر ہوئے۔ پھر لیبیا چلے گئے اور وہاں سنوسی تحریک سے متاثر ہوئے اور مسلمان ہو گئے ——— اُردو انھوں نے لندن میں سیکھی۔ اُن کی انتہائی دلچسپ داستان سننے کے بعد دعوت اسلامی، موجودہ حالات اور استعمار کے طریقوں پر گفتگو رہی ——— بڑی دل گرفتگی کے ساتھ کہنے لگے کہ "ہمارے بھائی حالات کے علمی تجزیے اور عملی پہلوؤں پر نظر کئے بغیر کام شروع کر دیتے ہیں اور شیطنیت کی جن قوتوں سے مقابلہ ہے اُن کے بارے میں کوئی ٹھیک علم نہیں رکھتے ———" مزید یہ بات بڑے پتے کی کہی ——— کہ "سیاسی و معاشرتی پہلوؤں پر اسلامی تحریکات زیادہ وقت صرف کر رہی ہیں۔ درانحالیکہ جن قوتوں سے ہمارا تصادم ہے انھوں نے بہرحال علمی انکشاف اور تحقیق کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور اس کا توڑ کئے بغیر کوئی مستقل اور پائدار اجتماعی و سیاسی تبدیلی لانے کی سعی ایک ردِ عمل تو پیدا کر سکتی ہے لیکن کوئی تبدیلی یا انقلاب نہیں لا سکتی"۔

——— مولانا مودودی کا ذکر آیا تو وہ خوشی سے مسکرا اٹھے۔ کہنے لگے "عربی و انگریزی میں سب کتابیں دیکھ چکا ہوں اور اُردو میں تجدید و احیائے دین، تنقیحات، اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر اور مسئلہ جبر و قدر پڑھ چکا ہوں ——— باقی سب کتابیں بھی جلد پڑھ لینا چاہتا ہوں۔ اُن کے فکری اسلوب اور سلیقہ سے بے حد متاثر ہوں۔ مولانا مودودی جیسے صحیح الفکر مدبرین کی عالم اسلام کو ضرورت ہے۔ لیکن میری اطلاع یہ ہے کہ خود پاکستان کے لوگ اُن کی قدر کرنے میں بخل کرتے ہیں۔ اللہ مجھے اگر صحت و موقعہ عطا کرے تو میں پاکستانیوں کو وہاں آکر مولانا مودودی کی عظمت سے روشناس کراؤں ——— عبدالحمید الگر صاحب کے ساتھ مُلّا کاشانی کے ایک نوجوان عزیز کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا یہ صاحب بھی تہران یونیورسٹی میں سیاسیات کے طالب علم ہیں۔ عربی جانتے ہیں۔ مسلمان ذہن رکھتے ہیں اور شیعہ ہونے کے باوجود نہایت وسیع المشرب انسان نکلے۔ مخبرینؔ کی عزت و تکریم میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے اُن کی اس "وسیع المشربی" سے اُن کے اعزہ اور "مذہبی برادری" کے لوگ بہت ناراض ہیں ——— مولانا مودودی سے واقف ہی نہیں نکلے بلکہ مولانا کی دعوت اسلامی کے مشتاق بھی نظر آئے ——— مولانا کی کتاب "الاسلام والجاہلیۃ" سے بے حد متاثر تھے۔ اور بار بار اس کا ذکر کرتے تھے۔ میں نے انہیں مولانا مودودی اور عبدالحمید صدیقی صاحب کی دو کتابیں پیش کیں۔ بہت خوش ہوئے ———

کہنے لگے کیا آپ "الجماعۃ الاسلامیہ" کے رکن ہیں؟ ــــــ میں نے عرض کیا کہ اپنی کمزوریوں کی وجہ سے محروم ہوں ــــ کہنے لگے "ہم سب کمزور ہیں۔ لیکن کوشش کرتے رہنا چاہیئے۔ آپ اتنی عاجزی و انکساری نہ کیا کیجئے۔ خدا اعتمادی کے ساتھ خود اعتمادی بھی رکھیئے"۔ اس کے بعد یکایک سرگوشی کے انداز میں کہنے لگے "یونیورسٹی میں کسی پروفیسر سے ملاقات ہو تو مولانا کی کوئی کتاب نہ دیجئے گا یہاں کی مذہبی ادارت کی جانب سے ایک سرکلر جاری ہوا تھا۔ جس میں مولانا مودودی کے لٹریچر کی ممانعت کی گئی تھی"۔

میں سخت حیران ہوا کہ ایران کے تن آسان، تفریح دوست اور تخیل پسند لوگوں میں "مرد آزما" اور "مرد آفرین" لٹریچر سے گھبراہٹ کیوں ــــــ میں نے اُن سے کہا کہ مجھے اس معاملے میں کوئی ڈر اور کوئی جھجک نہیں ہے آپ اطمینان رکھئے"۔ ادھر کالعدم "تودہ پارٹی" کے ایک صاحب آقائے فتح علی سے ملاقات ہوئی۔ پاکستان کا ذکر آیا تو بہت خوش ہوئے۔ اسلام کی بات ہوئی تو بگڑ گئے کہنے لگے "پاکستانیوں کو اسلام کا خبط ہے" میں نے کہا کہ "جی ہاں آپ لوگوں کو فرج و شکم کا جنون ہے"۔ کہنے لگے "یہی تو زندگی ہے"۔ میں نے عرض کیا تو پھر یہاں تیل کی فراوانی ہے اور عیاشیوں کے سامان ہیں پھر آپ بغاوت اور مظاہرے کیوں کرتے ہیں ــــ اور اگر یہی زندگی ہے تو جانوروں نے کیا قصور کیا ہے انہیں بھی اس تہذیب میں شامل کر لیجئے"۔ بغداد پیکٹ کا ذکر کرتے ہوئے یکایک مولانا مودودی کا ذکر شروع کر دیا اور سخت گرم ہوتے رہے اور مولانا محترم کو "امریکہ کا ایجنٹ" بتلاتے رہے۔ مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ "آپ کو یہ اطلاعات کہاں سے ملی ہیں"؟ کہنے لگے کہ پاکستان کے "عوامی راہ نما" یہ کہتے ہیں۔ اور پھر ایک مشہور "سرخ شاعر" کا نام لے دیا (یہ صاحب آج کل لندن میں پاکستانی طلبہ میں خلافِ پاکستان فکری انتشار پھیلا رہے ہیں۔ اور ۲۵ ستمبر کے "نوائے وقت" میں جن کے بارے میں یہ خبر آئی تھی کہ الجزیرہ، قاہرہ اور بیروت کے افریشیائی سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔ ان ممالک میں جن مفاسد کے متلاشی عنصر سے ملنے جا رہے ہیں وہ سامنے کی بات ہے۔ لندن میں بیٹھ کر یہ صاحب اسلام اور پاکستان کے خلاف جو ریشہ دوانیاں کر رہے ہیں۔ پاکستان کی وزارت خارجہ کو نظریہ پاکستان کی حفاظت کی خاطر اس طرف توجہ کرنی چاہیئے) بعد میں اندازہ ہوا کہ کوئٹہ میں بعض "سرخ حضرات" ایران کی کمیونسٹ تنظیم سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں اور یہ لوگ اینٹی پاکستان حرکتیں کرنے سے باز نہیں آتے۔

ــــ ایک صاحب عباس مرندی سے ملاقات ہوئی۔ آپ امریکہ کے پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں۔ مشرقِ اوسط کے اجتماعی ارتقاء پر انھوں نے مقالہ لکھا تھا۔ بظاہر سلجھے ہوئے نظر آئے۔ لیکن جب گفتگو ہوئی۔ تو معلوم ہوا اسلام کو آثارِ قدیمہ سمجھتے ہیں ــ پھر یکایک کہنے لگے۔ کہ میں نے "MIDDLE EASTERN AFFAIRS" کے رسالے میں فری کے ایبٹ کا مولانا مودودی پر مضمون پڑھا تھا۔ اس کے بعد اسلامک سنٹر واشنگٹن میں "اسلامک لاء اینڈ کانسٹی ٹیوشن" ہاتھ لگی تو میں نے اسے پڑھ لیا مولانا نے اسلام اور اسلامی تاریخ کو "RATIONALIZE" کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ جدید نظریات کی برکت ہے۔ کہ لوگ اپنے فرسودہ مذہب کو جدید تکنیک پر منظم کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں"۔ میں نے اُن سے عرض کیا کہ یہ آپ کے اپنے نظریات و نتائج ہیں۔ یا آپکے پروفیسر کینٹول سمتھ (مشہور جدید مستشرق) کے نظریات کی اسمگلنگ کی ہے ــــــ یہ تو سب وہی باتیں ہیں جو انھوں نے اپنی کتاب "Islam in the modern History" میں لکھی ہیں ــــ وہ بہت حیران ہوئے۔ مجھ سے پوچھا کہ "اچھا آپنے وہ کتاب پڑھی ہے"؟ میں نے عرض کیا جی ہاں پڑھی ہے۔ کہنے لگے "بہترین کتاب ہے"۔ میں نے پوچھا عربی آتی ہے۔ جواب ملا۔ نہیں۔ پھر پوچھا اسلام کو اصل مآخذ یا مسلم زبانوں میں کتنے ہوتے ترجموں سے کتنا اور کب پڑھا۔ کہنے لگے "بس قرآن کو پہلے پہل انگریزی ترجمے سے کچھ دیکھا تھا"۔ میں نے عرض کیا تو پھر آپنے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے تھیسس میں مشرقِ وسطیٰ کے اجتماعی ارتقاء پر جو کچھ لکھا ہے اُس میں پارسیوں کا ذکر کیا ہوگا یا لبنان کے عیسائیوں کا ــــــ اور یا پھر ایرانی تیل

کمپنی کا" ـــــ بیچارے بوکھلا گئے ـــــ عبدالحمید الگر صاحب اُن کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے تھے۔ اور وہ آئیں بائیں شائیں کرتے رہے! مشہد میں ایک سکھ سے ملاقات ہوئی۔ تو "لاہور" کا حال پوچھنے لگے۔ مجھے چا پر دعوت دی لیکن میرے پاس وقت نہ تھا ـــــ کہنے لگے کہ میرے پاس مولانا مودودی کی کتاب "دینیات" ہے کیا آپ مجھے "خطبات" اور "بناؤ بگاڑ" بھجوا سکتے ہیں ـــــ میں اس اچانک سوال پر حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔ چنانچہ جب گفتگو ہوئی۔ تو معلوم ہوا کہ وہ مولانا کی کتاب "دینیات" سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ اور اسلام کے قریب آگئے ہیں۔ اس طرح کے سلیم الفطرت لوگ ہر دور میں ہر مقام پر پائے جاتے ہیں۔ اُن کے اشتیاق کو دیکھتے ہوئے میں نے اُن سے مولانا کی ساری کتابیں بھجوانے کا وعدہ کر لیا ـــــ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے ایران میں کسی نظام کا چلنا بہت دُشوار ہے۔ تن آسانی، منطقی موشگافیاں، ذہنی گریز اور قانونی الاؤنس ان کا مقصدِ زندگی بھی ہے اور قومی شعار بھی۔ یہاں جو بھی نظام آئے گا وہ ذہنی عیاشیوں کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ بیروت کو نہ صرف مشرقِ وسطیٰ میں ثقافتی، فکری، سیاسی اور تحریکات کے اعتبار سے عصبی مرکز (NERVE CENTRE) کی حیثیت حاصل ہے بلکہ گزشتہ ڈیڑھ دو صدیوں میں اسلام اور عربوں کے خلاف جو وسیع الاطراف سازشیں ہوئی ہیں اور استعمار نے جو ریشہ دوانیاں کی ہیں۔ اُن میں بیروت کو مرکزی مقام حاصل رہا ہے ـــــ قوم پرستی کی تحریک اور عرب قومیت کے فکری و ادبی "شانتی نکیتن" یہیں بنے۔ عیسائیوں کے مشنری اڈے اور خطرناک راہب خانے یہیں ہیں۔ برطانوی اور فرانسیسی استعمار کے لئے انتشار برپا کرنے کے لئے مختلف زبانوں کا خفیہ سکول یہیں موجود ہے۔

• ـــــ بعض مشہور مستشرق اور اہلِ قلم یہیں بیٹھ کر فکر و خیال میں انتشار پیدا کرنے کی جدّوجہد کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔ مولانا مودودی کے بارے میں یہ حلقے بہت کچھ جانتے ہیں۔ اور ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ یہاں ایک مشہور ادارہ ہے جس میں مختلف مکاتبِ فکر کے لوگ جمع ہیں۔ اور سب اسلام دشمن عناصر پر مشتمل ہیں۔ اس کا نام "ہیئۃ الدراساۃ الاجتماعیۃ والسیاسیۃ فی شرق الاوسط" ہے ـــــ اس ہیئت میں کٹر عیسائی بھی ہیں حزب البعث کے مارکسسٹ بھی ہیں۔ اور نیشنل سوشلسٹ بھی ـــــ خالص عرب قوم پرست بھی ہیں۔ اور تجدد و انحراف زدہ مسلمان بھی۔ اس کی تین چار نشستوں میں جانے کا موقعہ ملا اور ان اجتماعات میں جس علمی بددیانتی اور فکری فساد کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ اسلام اور عربوں کی اسلامی تاریخ کو جن تعبیرات اور جن خباثتوں سے یہ "ہیئۃ" نوازتی ہے ـــــ وہ بڑی دلخراش اور طویل داستان ہے ایک موقعہ پر ایک صاحب ڈاکٹر راحیل ا   سے ملاقات ہوئی۔ یہ صاحب اسی "ہیئۃ" سے متعلق ہیں اور "فرنچ یونیورسٹی" میں مشرقِ بعید کے پروفیسر ـــــ اسلامی تحریکات کے ضمن میں مولانا مودودی کا اُنھوں نے ذکر کیا تو اس طرح کہ :-

"MAUDOODI'S ATTEMPT IS THE STRONGEST TO DIG OUT ISLAM FROM IT'S HISTORICAL GRAVE."

میں نے اُن سے عرض کیا کہ اگر اسلام ایک "تاریخی قبر" ہے۔ تو آپ لوگوں نے بیروت میں یہ "ہیئۃ" کس لئے قائم کی ہے اور دن رات ان مستشرقین، قوم پرستوں اور سوشلسٹوں پر بوکھلاہٹ کیوں سوار ہے اور مشرقِ وسطیٰ کی اسلامی تحریکات سے اس قدر فکر مند اور ہراساں ہوتے کیوں ہیں" اس پر وہ بیچارے بغلیں جھانکنے لگے ـــــ اس "ہیئۃ" کی لائبریری میں مولانا مودودی کی سب کتابیں تھیں۔ جناب خورشید احمد صاحب اور پروفیسر عبدالحمید صدیقی صاحب کی بھی دو تین کتابیں نظر آئیں ـــــ وہیں "امریکن یونیورسٹی" کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی ـــــ مولانا مودودی کے تنقیدی مطالعہ کا ارادہ رکھتے ہیں اور پاکستان مولانا سے ملنے آنے کا خیال بھی ہے ـــــ "امریکن یونیورسٹی" میں مشہور کتاب فلسفۃ التشریع الاسلامی کے مصنف ڈاکٹر صبحی محمصانی

سے بھی ملاقات رہی۔ آپ لاء کالج میں پڑھاتے بھی رہیں اور لبنان میں "مستشار" بھی ہیں۔ مولانا سے واقف ہیں ـــــ تجدد پسندی کا خول اُن پر بھی چڑھا ہوا ہے، ہمارے ہاں کے "مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی کراچی" کا ذہن رکھتے ہیں۔ مطالعہ انھوں نے ضرور کیا ہے۔ لیکن بدہضمی کی شکایت میں مبتلا ہیں۔ یہاں کی مشہور فرنچ یونیورسٹی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ تو وہاں کے بعض سرکردہ اساتذہ سے اسلام پر گرما گرم بحث چھڑ گئی۔ اور ان میں سے بعض حسن البنا شہیدؒ، عبدالقادر عودہؒ، حسن الہضیبی اور استاذ سید قطب پر برستے رہے۔ یکایک ایک لڑکی "لیلیٰ جیران" نے مولانا مودودی کی کتاب "الحجاب" بحث کے لئے پیش کر دی یہ لڑکی وہاں معاشرتی علوم میں ایم اے کر رہی ہے۔ میں مولانا کی کتاب کو اس لڑکی کے ہاتھ میں دیکھ کر حیران رہ گیا ـــــ یہ لڑکی حزب البعث سے تعلق رکھتی ہے ـــــ اور مسلمان عورتوں کے ساتھ رابطہ کی سیکرٹری ہے ـــــ اُس نے کہا کہ "مولانا مودودی نے اپنی کتاب میں "روم" کے بارے میں جو معلومات دی ہیں۔ وہ غلط ہیں، اور جان بوجھ کر مغرب کے بارے میں جھوٹ پھیلائے ہیں ـــــ اور میں ثابت کر سکتی ہوں کہ روم میں عورتوں کی حالت بہت بہتر تھی ـــ وغیرہ"

• ـــــ میں نے اس سے کہا کہ مودودی صاحب آپ کے نام نہاد اہل علم کی طرح خانہ ساز باتیں لکھنے کے عادی نہیں ہیں۔ وہ جو بات لکھتے ہیں علمی تحقیق کی بنیاد پہ لکھتے ہیں۔ اب آیئے میں آپ کو ثابت کروں کہ اُن کی معلومات کس پایہ کی ہیں۔ اُس لڑکی اور ایک صاحب کو لے کر میں فرنچ یونیورسٹی کی لائبریری میں گیا اور وہاں سے لیکی کی مشہور "تاریخ اخلاق یورپ" نکال کر اُن کے سامنے پیش کر دی۔ ان دونوں نے اس کتاب کو نہیں پڑھا تھا۔ حالت "تک تک دیدم دم نہ کشیدم" ـــــ انھیں اُس میں سے بعض ابواب پڑھ کر سنائے، حیرت و ندامت کے مارے اُن کی کیفیت بس کچھ نہ پوچھیے۔ کیا ہو گئی تھی۔ بعد میں میں نے ان سب سے کہا کہ اسلام کا مطالعہ تو بعد میں کیجیے۔ پہلے آپ کے بڑوں نے جو دروغ و فریب کا حسین لبادہ اوڑھ رکھا ہے اُسے اُتار کر پڑھ لیجئے "ـــــ

اسی طرح "اللجنۃ الادبی العربی" نے عربی ادب اور "قوم پرستانہ ادب" کی نعرہ بازی کو اتنا عام کر دیا ہے کہ حواس تک معطل ہو کر رہ گئے ہیں۔ امریکن یونیورسٹی کے ایک صاحب ڈاکٹر میکملان کے ساتھ "حزب البعث" کے بانی و مؤسس استاذ میشل افلق سے دو بار ملنے کا اتفاق ہوا ـــــ ایک بار یونیورسٹی میں اور ایک بار گھر پر۔ اُن کی بہترین لائبریری کو بھی دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اور وہاں مولانا مودودی کی عربی و انگریزی کتابوں کا پورا سٹ دیکھا۔ سوشلزم پہ اُن سے گفتگو رہی صاحب فکر آدمی ہیں۔ لیکن اُن کی فکر اُصول علم و تحقیق سے ماوراء ہے۔ وہ ہر آن بدلتے ہوئے واقعات و حالات کی رو اور گرداب سے اپنے لئے فکر کا مواد تلاش کرتے ہیں اور خود کوئی محکم اُصول اور نظریہ نہیں رکھتے۔ اُن کی ذاتی زندگی بھی قلابازیوں کی داستان ہے ـ مجھے وہ ایک ہوشیار ذہین "کیریئرسٹ" نظر آئے ـــــ خود مرکزیت اور انا اُن کے فکر میں مرکزی نقطہ رکھتی ہے۔ وہ اب "اشتراکیۃ العربیۃ" کا نعرہ لگاتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے وہ صرف "الشیوعیۃ العربیۃ" کے علمبردار تھے۔ اب یوگوسلاوی برانڈ سے بھی متاثر ہیں اور لندن کے "FABIANS" سے بھی! امریکن یونیورسٹی میں بعض شخصیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کی تنظیم میں مختلف یورپی تنظیموں کے افراد بھیس بدل کر کام کر رہے ہیں اور خود قوم پرستوں کے ایک حلقے کو اُن کے بارے میں شک ہے۔ حزب البعث در اصل لبنان و حلب کے عیسائی راہبوں اور مفکرین کی قوم پرستانہ سعی کا نتیجہ تھے۔ جو بعد میں وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ دوسرے نظریات کو بھی اپناتی چلی گئی ـ

• ـــــ حزب البعث اور جمال ناصر کی مخالفت در اصل شخصیت و تنظیم کمانا کی مخالفت ہے۔ ورنہ در حقیقت نظریات اور خیالات کا

کوئی خاص فرق نہیں ہے ۔ میشل افلق صاحب بتاتے ہیں کہ انھوں نے مولانا کی بعض کتابوں کا مطالعہ کیا ہے ۔ رائے دینے سے انھوں نے گریز کیا ۔

● ــــ بیروت کے بعض یہودیوں سے بھی ملاقات رہی ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اسرائیل میں بن گوریان کی مخالف پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں اور بن گوریان کی قوم پرستانہ تحریک سے متاثر ہیں ۔ اسلامی تحریکات پر سخت برہم تھے ۔ ایک صاحب علامہ اقبالؒ کے بارے میں پوچھ رہے تھے ۔ پھر کہنے لگے کیا کوئی شخص مودودی نام کے پاکستان میں ہیں ؟ میں نے کہا فرمایئے کہنے لگے ان کی ایک کتاب ہمارے دفتر میں آئی ہے ۔ کتاب کا نام " البیانات " ہے ــــ میں نے مولانا کا تعارف کرانے کی بجائے یہ پوچھا کہ البیانات آپ کے ہاں کیوں آئی ہے ۔ اس کا مطلب کیا ہے ۔ وہ کچھ جواب نہ دے سکے ۔ بیروت میں مولانا کی کتاب " الحجاب " نے " جماعت عباد الرحمٰن " میں بھی خاصا تزلزل پیدا کیا ہے ۔ " عباد الرحمٰن " کے دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا ۔ تو اس تنظیم کے سربراہ استاذ عمر الداعوق المہندس وہاں موجود تھے ۔ ابھی تھوڑی ہی گفتگو جاری ہوئی تھی کہ ایک نوجوان خاتون نادرہ مختار صاحبہ تشریف لے آئیں ۔ ان کے ہاتھ میں مولانا کی کتاب " الحجاب " تھی ۔ اور انہیں پردے کے سلسلے میں سخت اُلجھن پیش آرہی تھی ۔ میں نے اپنی استطاعت اور محدود علم کے مطابق ان کی تشفی کی اور اللہ کا شکر ہے ۔ بات ان کی سمجھ میں آگئی ۔ لیکن کہنے لگیں ــــ " یہاں تو یہ پردہ قریب قریب ناممکن ہے میرے شوہر تو اسلام ہی کے سخت مخالف ہیں ۔ میں کیا کروں " ۔

بیروت استعمار کی فسطائیت خیز سازشوں کے لئے زیر زمین بندرگاہ ہے اور یہاں پر امریکہ برطانیہ ، فرانس اور یورپ کے دوسرے مستعمرین مختلف رنگوں میں کام کر رہے ہیں ۔ اسی طرح اشتراکی بلاک کے لوگ بھی بڑی ہوشیاری سے خول چڑھا کر کام کر رہے ہیں " فری مین " کی تحریک بھی یہاں فعال و بیدار ہے ' " فری پورٹ " رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ پورے مشرق وسطیٰ کی اقتصادی حالت دگرگوں کر دی جائے اور یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں کی کثرت کی وجہ یہ ہے کہ یہاں BRAIN WASHING کا کام سلیقہ سے سرانجام دیا جائے ــــ یہاں کے لوگ تجارتی ہیں اور وہ ہر چیز کی تجارت کرتے ہیں ۔ اس لئے اس ملک میں " لا دینی " کا نظام ہی چل سکتا ہے ــــ اسی لئے یہاں پر استعمار خیز تحریکات جلد پنپ جاتی ہیں ــــ

دمشق میں

دمشق کو شرق اوسط کا عروس البلاد کہئیے ــــ تہذیب ، شائستگی ، نفاست اور آرائش شہر کے کونے کونے سے نمایاں ہے ' اسلامی آداب کے مظاہر بھی جگہ جگہ نظر آئیں گے ۔ شام کے لوگ بہت ذہین و طباع ہیں ــــ بے حد تیز اور تعلیم یافتہ ہیں ۔ لیکن استقلال اور استمرار عنقا ہے ' شاید یہ ذہانت کا خاصہ ہے ــــ شام کی عجیب حیثیت ہے ۔ حسن و نفاست اور ذہانت و ذکاوت کے باوجود ۔ دُنیا بھر کے فتنے یہاں نمو پاتے ہیں ۔ حد یہ ہے انطاکیہ میں اب تک " فرقہ نصیریہ " کے بعض لوگ باقی ہیں ــــ " فری مین " کی یہود نواز تحریک نے یہاں بہت اثرات چھوڑے ہیں ' مشرق وسطیٰ میں سب سے زیادہ مضبوط کمیونسٹ شاخ شام ہی کی ہے ۔ پھر بھی شام میں دین کا بھی بہت چرچا ہے ۔ اخوان اپنے انداز سے کام کر رہے ہیں ۔

مولانا مودودی یہاں کے سب حلقوں میں بہت زیادہ معروف ہیں ۔ اور ان کا لٹریچر بے حد مقبول ہے ۔ یہاں کے مشہور اخوان کے رہنما اور خطیب الاستاذ عصام العطار اپنے لیکچروں میں اکثر علامہ اقبالؒ اور مولانا مودودی کا ذکر کرتے ہیں اور بڑی ہی عزت و محبت سے یہ ذکر ہوتا ہے ۔ بے شمار نوجوانوں میں مولانا مودودی کا لٹریچر پھیل چکا ہے ۔ اور یہ نوجوان

مولانا کے عصری انداز تفہیم اور فکری اسلوب سے بہت متاثر ہیں۔ معروف اسلامی ادیب استاذ علی الطنطاوی کے چھوٹے بھائی استاذ سعید الطنطاوی کا ایک معروف حلقہ ذکر و فکر ہے۔ جس میں نوجوانوں کی کثیر تعداد شرکت کرتی ہے۔ ان کے دروس میں اکثر مولانا مودودی کا لٹریچر پڑھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر امین المصری جو کسی زمانے میں لاہور رہے تھے اور پاکستان میں شام کی سفارت سے متعلق تھے ہر ہفتہ ٹیلیویژن پر درس قرآن و حدیث دیتے ہیں۔ ایک دفعہ انھوں نے درس میں مولانا کی کتاب "المصطلحات الاربعة فی القرآن" کا آدھا حصہ پڑھا اور دوسرے ہفتہ باقی حصہ پڑھا۔ اب میں دوسرے حلقوں کی طرف آتا ہوں۔ یہاں کے "حزب البعث" کے ڈاکٹر جمالی سے ملاقات رہی۔ ان کے ہاں مولانا کا پورا لٹریچر دیکھا۔ دمشق یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ڈاکٹر یوسف الاعش سے خاصی ملاقات رہی۔ وہ مولانا پر بہت برہم تھے۔ وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ مولانا ہمیں عہد عتیق میں لے جانا چاہتے ہیں۔ میں نے پوچھا کیسے؟ کہنے لگے کہ "الحجاب" لکھ کر مولانا مودودی نے وقت ضائع کیا ہے" میں نے کہا کہ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کوئی ٹھوس دلیل پیش کیجئے یہ صاحب فرانسیسی مستشرقین اور مصر کے بعض تجدد نواز ادیبوں سے بہت متاثر تھے — میں نے مزید عرض کیا کہ آیئے پردہ پر آزادانہ اور علمی و تحقیقی بحث کرلیں اور اگر آپ کسی اور کو بھی شامل کرنے کی تمنا رکھتے ہیں تو انہیں بھی بلا لیجئے۔ چنانچہ دمشق میں فرانسیسیوں کے قائم کردہ لڑکیوں کے اسکول کی پرنسپل اور "نادی حرية المرأة" کی ڈاکٹر آنسہ رومان بنت عادل اور ایک صاحب کو بھی انھوں نے بلا لیا — چنانچہ ہم نے ابتدائی گفتگو کرنے کے بعد یہ طے کیا کہ دوسرے روز مفصل گفتگو ہو جائے۔ دوسرے روز جب ہم مل بیٹھے تو ڈاکٹر مس رومان نے کہا کہ مولانا نے "الحجاب" میں اعداد و شمار غلط پیش کئے ہیں۔ میں چونکہ پوری تیاری کے ساتھ گیا تھا۔ فوراً سویڈن کی ایک رپورٹ پیش کی۔ جس میں جنسی اباحیت کے بارے میں ڈاکٹروں کے ایک بورڈ کی مفصل رپورٹ تھی۔ جب انھوں نے اسے پڑھنا شروع کیا۔ تو سب کے چہرے متغیر ہو گئے تھے — اور کوئی دو گھنٹے کی بحث کے بعد "الحجاب" کے مندرجات کے مضمرات اور معنی سمجھانے میں کامیاب ہو گیا — ڈاکٹر یوسف الاعش اور دوسرے پھر بھی مذبذب ہی رہے۔ لیکن مولانا مودودی کے اسلوب نے انہیں ذہنی دھماکوں سے دوچار کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی کتاب "الحجاب" نے شام کے دینی حلقوں پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ اور مخالف حلقے تنقیص و تکذیب کی مہم جاری کئے ہوئے ہیں "حزب الشیوعية السورية العظمیٰ" کے ایک صاحب سے دمشق کی قدیم لائبریری "مکتبة الظاہرية" میں ملاقات ہوئی — پاکستان کا ذکر آتے ہی مولانا مودودی کے بارے میں کہنے لگے — کہ "وہ ایک بطل جلیل ہیں لیکن وہ سراپے پیچھے ہیں۔ کاش وہ کمیونزم کو سمجھ سکتے" میں نے انہیں مولانا کی چار کتابیں پیش کیں اور کہا کہ مطالعہ کے بعد مجھ سے بات کیجئے گا۔ چند روز بعد میں دمشق کے ایک حسین مقام "عین الخضراء" سے واپس آرہا تھا۔ کہ راستے میں وہ مل گئے۔ میرے ساتھ کچھ اور حضرات بھی تھے۔ علیک سلیک کے بعد فوراً کہنے لگے۔ "سب کتابیں دیکھ لیں۔ اس سے پہلے بھی دو چار کتابیں دیکھ چکا تھا۔ مولانا نے دراصل مارکس کا انداز چرایا ہے اور ان کا یہ اسلوب درحقیقت مارکسی اسلوب ہے۔ جسے وہ کھوکھلے مذہب کی روح سے بھرنے کی کوشش کرتے ہیں" میں اُن کے اس معرکہ آرا تبصرہ سے بہت محظوظ ہوا۔ اور عرض کیا۔ مودودی نے جو بات پیش کی ہے۔ اس کا علمی جواب دیجئے۔ ہم کافی ہاؤس کی فقرہ بازی سے کام نہ چلے گا" میرا یہ کہنا تھا کہ وہ کمیونسٹ انداز کی جوشیلے نعرے بازی پر اتر آئے — اور ایک بات کا انکشاف کر گئے کہ "حزب الشیوعية" نے مودودی کے ذہنی فکر کا جائزہ لینے کے لئے چند کمیونسٹ اہل علم کا بورڈ بنایا ہے — تنہائی سنجیدہ اور پڑھے لکھے اشتراکی بھی جب گفتگو پر اتریں گے تو کافی ہاؤس کے پرشور انداز میں تاریخ کی متعصب آمیز تعبیر شروع کر دیں گے — مارکس کا یہ مزاج کسی نہ کسی طرح اُن کے معتقدین میں بھی در آیا ہے۔ لیکن شام میں حزب البعث اور کمیونسٹوں کے لئے

مولانا مودودی کا لٹریچر ایٹم بم ثابت ہوا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور حزب البعث کے گلابی اور رنگ دار نیشنل سوشلسٹ اور سرخ کمیونسٹوں نے جس انداز سے مولانا کے لٹریچر کو لیا ہے۔ اُس سے اُن کی بوکھلاہٹ کا پتہ چلتا ہے۔ "حزب الشعب الوطنی" کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی وہ دمشق کے جبل قاسیون پر مقیم ایک "ہر صوفی بزرگ سے بیعت ہیں۔ اور "سیاسیات" کو غیر دینی سمجھتے ہیں۔ اور مولانا مودودی کے سیاسی مقالوں پر معترض تھے۔ میں ان سے کیا عرض کرتا۔ خاموش رہا۔ جناب محی الدین ابن العربی کے مزار پر ہر جمعرات کو صوفیا کا حلقہ حلقۂ ذکر زور شور سے ہوتا ہے۔ ایک روز وہاں گیا تو دیکھا کہ "ہُوحق" کے نعرے لگ رہے ہیں۔ اور بدعات کے تقاضے پورے کئے جاتے ہیں بالکل سرحد کے اُس پار یہودی طاقتیں جنگی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ اور یہ حضرات بدعات کو اللہ کی خوشنودی سمجھ کر ان میں مبتلا ہیں۔ شدید افسوس ہوا۔ اتنے میں ایک تنومند اور خوش شکل نوجوان پر نظر پڑی۔ وہ بڑی جرأت سے حلقہ توڑ کر ایک پمفلٹ تقسیم کر رہے تھے۔ اس شامی نوجوان کی جرأت پر سخت حیرت ہوئی۔ جب وہ میرے قریب آئے۔ تو انھوں نے مجھے دیکھا اور پوچھا۔.......... "انت من الباکستان؟" میں نے "نعم" کہا ــــــ انھوں نے زور سے ہاتھ ملایا اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب "الجہاد فی سبیل اللہ" ہاتھ میں دے کر چلتے بنے ــــ اور میں مولانا کا نام پڑھ کر اس شامی نوجوان کی ہمت و جرأت پر مسرت کا اظہار کرتا ہوا واپس چلا آیا۔ اور اس کے لئے دل سے بہت دعائیں نکلتی رہیں۔

• ــــ حلب کے عیسائیوں نے بھی مولانا کے لٹریچر کا سنجیدگی سے نوٹس لیا ہے۔ اور اس ضمن میں اُن کا رابطہ لبنان کے عیسائیوں سے ہے حلب جاتے ہوئے ایک عیسائی ہم سفر استاذ اسحاق بھی تھے۔ اُن سے تعارف پر معلوم ہوا کہ وہ حلب کی "المعہد العربی للمسیحیین" میں استاذ ہیں اور دمشق میں کسی ذاتی کام سے آئے تھے ــــ باتوں باتوں میں اسلامی قانون کے نفاذ کا ذکر آیا۔ تو وہ بتانے لگے کہ انھوں نے مولانا مودودی کی "نحو الدستور الاسلامی" کا مطالعہ کیا ہے اور مزید بتایا کہ حلب کی Y. M. C. A کی لائبریری میں مولانا کی بہت سی کتب موجود ہیں ــــ اس کی تصدیق میں نے خود وہاں جا کر کی۔ حلب حسن کی سرزمین ہے۔ اور یہ حسن سیرت نہیں حسن صورت ہے اور اس حسن صورت میں ہوس و درندگی کے خوفناک سائے ناچتے نظر آتے ہیں ہوس زدہ حسن کی اس فراوانی کے سہارے استعماری و لادینی تحریکات نے اخلاقی زوال برپا کرنے کے لئے بہت کام لیا ہے۔

عمان بھی عجیب جگہ ہے۔ کرنل لارنس اور گلب پاشا جیسے جاسوس کے لئے مرکز کا کام دیتا رہا ہے۔ مسلمانوں میں بھی یہاں بہت سے غدار پیدا ہوئے۔ شاہ حسین کے دادا شریف حسین کی مثال سامنے کی بات ہے۔ انگریزی سامراج نے جس انداز اور جس شاطرانہ سیاست سے یہاں قدم جمایا ہے۔ ــــــــــــ اس کا علم کتابوں سے زیادہ مشاہدہ و ملاقات سے ہو سکتا ہے ــــ اخوان کے ایک ذہین اور بے حد تعلیم یافتہ نوجوان الاستاذ محمود عائد رشدان سے ملاقات رہی مولانا مودودی کی تمام کتابوں کا نہ صرف مطالعہ کر چکے تھے۔ بلکہ ارادہ ظاہر کر رہے تھے کہ فرانسیسی میں کچھ ترجمہ بھی کریں۔ بڑی اچھی فرانسیسی جانتے ہیں۔ ــــ مجھے اردن کی حزب التحریر کے کسی ذمہ دار فرد سے ملنے کا شوق تھا ــــ اور ان سے اُن کے طریقۂ کار پر گفتگو کرنا چاہتا تھا ــــ دو نوجوان الاستاذ ابراہیم کلیسری اور الاستاذ مروان قسابکی سے ملاقاتیں رہیں۔ اور معلومات کا ایک دفتر اُن سے حاصل ہوا۔ مولانا مودودی کے فکری و علمی " APPROACH " کے وہ لوگ بے حد مداح ہیں لیکن دستوری و قانونی راستوں کے وہ قائل نہیں ہیں ــــ وہ کہتے ہیں کہ مشرق وسطیٰ کے حالات مخصوص ہیں۔ اور یہاں جن قوتوں اور مخالفین سے واسطہ ہے ــــ اُن سے انقلابی و عسکری انداز سے بھی نمٹنے کی ضرورت ہے' دوران گفتگو میں اُنھوں نے ایک انکشاف کیا کہ "یروشلم اور تل ابیب میں ایک ایسا زیر زمین یہودی ادارہ ہے۔ جو انتہائی منظم طریقے سے مسلمانوں کے سربرآوردہ حضرات کو موت کے گھاٹ

اٹھانے کا کام کر رہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اردن کے ایک "الحسن" نامی گاؤں کے ایک صاحب عزیمت عالم دین کو قتل کر دیا ہے ــــــ اب جب کہ کہیں بھی کوئی اسلامی ریاست موجود نہیں ہے تو ہم کیا کریں اور کہاں جائیں ؟ ــ اور اصل صورت حال یہ ہے کہ یہ صرف یہودی ہی نہیں کرتے ہیں بلکہ کمیونسٹ اور نیشنل سوشلسٹ بھی مخصوص تکنیک کے ساتھ علماء اور مسلمانوں کے سرکردہ حضرات سے یہ سلوک کر رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ شرق اوسط میں اسلامی تحریکات بالکل دستوری اور آئینی بنیادوں پر اٹھی ہیں۔ اور عرصہ تک آئینی و اخلاقی خطوط پر کام کرتی رہی ہیں۔ لیکن جب حالات اور سازشوں نے مجبور کر دیا تو انہیں بھی تحفظ کے اقدامات کرنے پڑے ــــــ چاروں طرف دشمنوں اور مخالفِ اسلام یلغار سے وہاں کے مسلمانوں کا سنبھلے رہنا اور ان حالات میں بھی کچھ نہ کچھ دعوتِ اسلامی کا کام کرتے رہنا۔ شرق اوسط کے مسلمانوں کی عظمت اور بلند کرداری کی دلیل ہے۔

مصر اور اسلام قاہرہ کو افریقہ و ایشیا کا سنگم کہنا چاہیئے۔ مصر کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس عہد کی سب سے بڑی اور جہاں کشا اور عمل آفریں تحریک اخوان المسلمون وہیں سے اٹھی۔ مجھے پاک و ہند کے علماء سے یہ شکایت ہے۔ کہ وہ مصر میں صرف ناصر اور باب الجدید کے سامنے ریمسس ثانی کا بت دیکھتے ہیں۔ درانحالیکہ مصر نہ ناصر ہے اور نہ فرعون کا بت۔ یہاں موسیٰ و یوسف علیہما السلام بھی پیدا ہوئے حضرت ابراہیمؑ کی اہلیہ بھی۔ اور پھر تاریخ کے ہر دور میں کلیمؑ و خلیلؑ کی اذانیں پکاری جاتی رہی ہیں اور پھر اب، آج کے اس دور میں مصر کے سوا اور کسی بھی علم ملک کو نہ یہ شرف حاصل ہے اور نہ کسی کو اس قدر توفیق ہو سکی ہے کہ بیک وقت ایک طرف ایک عالم گیر تحریک اُبھری، دوسری طرف رجال کی ایک کھیپ تیار ہو گئی جس نے اسلام کی تاریخ ساز خدمت کی۔ اور تیسری طرف استعمار کی ولادینی اسالیب اور حلقوں کا پوری دردمندی اور اخلاص و صداقت کے ساتھ مقابلہ کیا گیا ــــــ مصر قاہرہ اور اسکندریہ کا نام نہیں ہے۔ وہاں ایسے بھی شہر اب تک باقی ہیں۔ جہاں دینی روایات اور بعض شعائر اسلامی پورے عالم اسلام سے زیادہ پائے جاتے ہیں ــــــ مصر کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت اسلام سے گہرا محبت اور عمیق تعلق رکھتی ہے ــــــ اور میری یہ رائے ہے کہ جمال ناصر کی کوششوں کے باوجود مصر کے عوام نہ سوشلزم قبول کریں گے اور نہ کمیونزم۔ صدیوں سے ازہر نے جو کام کیا ہے اسے ڈنڈے کے زور سے ختم نہیں کیا جا سکتا ــــــ آج بھی عوام کے سامنے ام کلثوم کو ایک طرف اور قاری شیخ مصطفیٰ اسماعیل کو دوسری طرف کھڑا کر دیجئے ــــــ تو لوگ قاری مصطفیٰ اسماعیل کی قرآن خوانی پر ٹوٹ پڑیں گے۔ مصری عوام کے ہاں شامیوں کی طرح نہ ذہانت ملے گی اور نہ نفاست۔ لیکن سادگی۔ وسیع القلبی اور سیدھا پن بے اندازہ ملے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ مصر کی جغرافیائی پوزیشن، وہاں کے اجتماعی حالات یہودیوں اور عیسائیوں کی ریشہ دوانیوں کو سمجھنے کی طرف کوئی مائل ہی نہیں ہے ــــــ اگر مصر نے ناصر پیدا کیا ہے تو حسن البنا بھی پیدا کیا ہے ــــــ اور آمریت کی جباریت کے باوجود آج بھی مصر میں دینی کام کسی نہ کسی طریقے سے ہو رہا ہے ــ میں جب بھی مصر کے علماء اور وہاں کے دینی حلقوں کا ذکر سنتا ہوں تو احترام سے سر جھکا لیتا ہوں اور انہیں آنسوؤں کا خراج تحسین پیش کرتا ہوں ــــــ مصر کے علمی، فکری، دینی اور اجتماعی احسانات عالم اسلام پر اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کا کوئی شمار ہی نہیں ہے ــــــ اسی طرح پاکستان کے جدید تعلیم یافتہ طبقے سے بھی مجھے شدید شکوہ ہے ــــــ یہ لوگ قاہرہ کے "بیلے ڈانس" اور "شبینہ کلبوں" کا ذکر کرتے ہیں مصر قاہرہ یا پورٹ سعید یا اسکندریہ تو صرف نہیں ہے۔ عجیب جہالت ہے کہ قاہرہ اور اسکندریہ کے بارے میں یہاں جدید تعلیم یافتہ سخت بے خبر ہے۔ اسکندریہ، منصورہ اور قاہرہ فرانسیسی استعمار کی چھاؤنیاں رہی ہیں۔ چھاؤنیوں کی حالت ہمیشہ دگرگوں رہتی ہے۔ سویز کی وجہ سے مصر کی پوزیشن اور بھی نازک ہو گئی۔ پھر مصر سے اسکندریہ میں یونانی اور اطالوی آباد ہیں اور بھی بہت سے غیر ملکیوں کا آنا جانا رہا ہے فرانسیسی استعمار جب یہاں آیا تو اپنے تہذیب و ثقافت کی خباثتوں کا تحفہ بھی لایا

آخر یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ ایک غیر ملکی استعمار ملک پر قبضہ کرے اور پھر یہاں شبینہ کلب نہ کھلیں۔ لیکن آفریں ہے مصری عوام پر کہ انھوں نے اس اخلاق کش تہذیب کے سیلاب کا مقابلہ پامردی سے کیا اور کر رہے ہیں۔ اسیوط، طنطا، اسماعیلیہ، الاقصر اور مصر کے دوسرے شہروں میں چلے جا ــــــ پاکستان سے بعض امور میں بہتر صورت ملے گی۔ قاہرہ اور اسکندریہ میں چند یوم رکنے سے کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے اور کیا کسی ملک اور قوم کو دیکھنے اور مطالعہ کرنے کا یہی طریقہ ہوتا ہے؟ ہمارے علمار مصر جاتے ہیں تو وہاں چند اونچے لوگوں کی حالتوں کو دیکھ کر سب کچھ فرض کر لیتے ہیں۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ جاتا ہے تو قاہرہ کے شارع فواد پر کسی لڑکی کی طرف اشارہ پانے سے تمام مصر کے بارے میں فتویٰ دے ڈالتا ہے۔ آخر یہ کیا آفت ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہاں تعلیم یافتہ طبقہ کی اکثریت اور اوپر کا طبقہ اسلامی اقدار سے مانوس نہیں ہے اور اس کا ذہن لادینی بنتا جا رہا ہے انھوں نے عرب قومیت کا بت تراش لیا ہے اور جمال ناصر نے اخوان کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس پر خون کے آنسو رونے کو جی چاہتا ہے، لیکن اس سے یہ کہاں لازم ہوا کہ جب بھی مصر کا ذکر کیا جائے تو صرف جناب ناصر کی مناسبت سے کیا جائے اور بس! مصر میں مولانا مودودی نہ صرف اخوان اور ازہر کے حلقوں میں متعارف ہیں۔ بلکہ اندرون دیہات تک میں مولانا کا لٹریچر پہنچ گیا ہے اور جس سرعت سے پہنچا ہے، وہ حیرت انگیز ہے۔

ازہر کے حلقوں میں مولانا نہ صرف اچھی طرح متعارف ہیں۔ بلکہ مقبول بھی ہیں۔ بعض اساتذہ اپنے (درس (لیکچرز) میں مولانا کے لٹریچر کا ذکر جرأت سے کر جاتے ہیں۔ ایک عالم دین لیکچر کی تیاری میں مولانا کی کسی نہ کسی کتاب سے ضرور استفادہ کرتے ہیں ــــ یہاں کے اکثر آزاد اور حق گو علمار مولانا مودودی کا کھل کر تذکرہ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ایک ممتاز عالم نے ایک "دینی حلقہ" میں مصر میں عریانی و بے پردگی کی روز افزوں ترقی کی طرف اشارہ کیا اور اس کے نتائج پر بحث کی۔ اس اجتماع کی صدارت حسین الشافعی اور کمال الدین حسین نائب صدر جمہوریہ مصر کر رہے تھے۔ انھوں نے بڑی بے باکی سے مولانا کی کتاب "الحجاب" سے حوالے دیئے۔

• ــــ قاہرہ میں "دائرۃ الابحاث الاسلامیۃ" کے بعض نوجوان ارکان سے ملاقات ہوئی۔ مولانا مودودی سے بے حد متاثر تھے ایک صاحب الاستاذ عز الدین یوسف علی مولانا کی تازہ ترین کتاب الأسس الاقتصاد بین الاسلام والنظم المعاصرۃ" پر تحقیقی کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور مولانا کے فکری خطوط پر آگے کام کرنا چاہتے ہیں ــــ "دائرۃ" کی لائبریری میں مولانا کی عربی و انگریزی کتابوں کے علاوہ بعض اردو کتب بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اور مزید یہ دیکھ کر میری حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ عالم اسلام کے مفکرین کا چارٹ دیوار پر چسپاں تھا اور مولانا کے تعارف کے ساتھ ان کی تصویر بھی ساتھ تھی۔ "دائرۃ" کے سب لوگ مولانا کا ذکر نہایت ادب و احترام سے کرتے تھے۔ مصر کے تحریکی حلقوں میں گرم جوشی اور اخوت کا جذبہ بڑھا گہرا ہے۔ پاکستان کے دینی بھائیوں کی سلامت و عافیت کا حال پوچھتے رہے۔ قاہرہ میں ایشیا کا سب سے بڑا ہاسٹل ہے۔ جس میں تیرہ ممالک کے کوئی چار ہزار طالب علم رہتے ہیں۔ اس ہوسٹل میں ہر رنگ اور ہر مکتب فکر کے طلبہ مقیم ہیں ــ مجھے بھی وہاں کچھ دیر رہنے کا اتفاق ہوا اور قریب قریب تمام ممالک کے طلبہ سے تفصیلی ملاقاتیں رہیں۔ یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ افریقی ممالک کے طلبہ میں مولانا مودودی کا لٹریچر سرعت سے پھیلا ہے۔ خصوصًا سوڈان، سومالیہ، ٹانگانیکا اور ماریشس کے طلبہ میں اس لٹریچر کا بہت چرچا ہے۔ سوڈان کے طلبہ تو اس لٹریچر کو خرید کر اپنے پاس حفاظت سے رکھتے ہیں ــــ مجھے ڈھائی سو سوڈانیوں کی ایک بلڈنگ میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا جس کے پاس مولانا مودودی کا پورا عربی لٹریچر نہ ہو ــــ اس عظیم "ہاسٹل" کا نام "مدینۃ البعوث الاسلامی" ہے۔ اور ازہر کے زیر اہتمام چل رہا ہے۔ اسی ہاسٹل میں لاطینی امریکہ اور جرمنی کے دو مسلم نوجوانوں سے ملاقات ہوئی ــــ جرمن نوجوان "ہمبرگ" کے رہنے والے ہیں ــــ وہ مولانا کی کتاب "نظریۃ الاسلام الخلقیۃ" کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ لیکن انھیں مزید کتابیں مل نہیں رہی تھیں۔ میں نے پتہ بتایا تو

فوراً گئے اور سب خرید لائے سُلجھے ہوئے ذہن اور وسیع معلومات کے نوجوان ہیں۔ ازہر میں محض دینی علوم کی تحصیل کے لئے آئے ہیں۔ ورنہ وہ ہائیڈل برگ یونیورسٹی سے فزکس کے ایم۔ اے ہیں۔ مولانا کے فکری تسلسل کا بار بار ذکر کرتے تھے۔

● ـــــ مصر کی وزارت اوقاف کے تحت ایک ادارہ "مجلس الشئون الاسلامی" کام کر رہا ہے۔ اس ادارہ کا کام غیر ملکی طلبہ کی امداد و راہنمائی اور اُن کے لئے لٹریچر شائع کرنا ہے۔ گو میرے مشاہدہ کے مطابق جمال ناصر کی یہ مطلق العنانی اس ادارہ سے غیر ملکی طلبہ پہ نگرانی اور جاسوسی کا کام بھی لیتی ہے ـــــ لیکن یہ بعض اوقات مسابقت میں کچھ اچھے کام بھی کر جاتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس سال کے لئے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مولانا مودودی کے "مسئلہ قادیانیہ" کو ایک لاکھ کی تعداد میں چھپوا کر افریقہ بھیجا جائے یہ بات مجلس کے سیکرٹری العام الاستاذ توفیق عویضہ نے بتائی۔ مصر، عالم اسلام میں واحد ملک ہے۔ جہاں "قادیانیوں" کا علمی اور عملی جواب دیا گیا ہے ـــــ افریقہ سے بھیس بدل کر آنے والے بعض قادیانی حضرات کو نہ صرف ملک سے نکال دیا گیا۔ بلکہ لٹریچر ضبط کر کے وہاں "قادیانیوں" کے مسئلہ پر ایک مجلس مذاکرہ بھی منعقد ہوئی اور کلیۃ الشریعۃ جامعۃ الازہر کے پرنسپل استاذ محمد المدنی نے ایک طویل تقریر کی اور مولانا مودودی، مولانا علی میاں اور ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی (پیرس) کے حوالے دیئے۔ یہ سب کچھ ازہر اور دوسرے علماء ہی کی سعی کا نتیجہ ہے۔ اس میں موجودہ حکومت کا کوئی کریڈٹ نہیں قاہرہ کے اہل علم مولانا مودودی کے فکری اسلوب اور منطقی ربط کے بہت قائل ہیں۔ لیکن بعض علماء تحقیقی مواد نہ دینے کے شاکی ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر علی عبدالواحد وافی کلیۃ الحقوق جامعہ ازہر، ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ عمید شعبہ فلسفہ جامعہ عین شمس، ڈاکٹر یحییٰ خشاب اور دوسرے ممتاز دینی ذہن کے اساتذہ مولانا کا سارا لٹریچر دیکھ چکے ہیں اور اُن کا ذکر بڑے ادب و احترام سے کرتے ہیں۔ شام کی طرح یہاں بھی مولانا کی کتاب "الحجاب" مختلف حلقوں کے لئے "ایٹم بم" ثابت ہوئی ہے ـــــ سوائے ایک آدھ حدیث کی سند پہ بات کرنے کے کسی سے کوئی جواب اصل مضمون کے سلسلے میں بن نہیں پڑتا ـــــ سب سے زیادہ لطف کی بات ہے کہ مولانا کی اس کتاب کو بالائے مصر میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے ـــــ وہاں پاکستان سے بھی زیادہ شدید پردہ ہے۔ تنہا اسیوط ہی میں صرف مولانا کی یہ کتاب ڈیڑھ سو کی تعداد میں بکی ہے ـــــ مجھے ایک دوست کے ذریعے یہ معلوم ہوا کہ وہاں قرآن کریم کے دروس میں اس کتاب کو پورے کا پورا پڑھا گیا ـــــ بعد میں جب اسیوط جانے کا اتفاق ہوا۔ تو اس کی نہ صرف تصدیق ہو گئی۔ بلکہ وہاں کے علماء اور عام دینی لوگ مولانا کی صحت، اُن کی عمر اور اُن کا پتہ معلوم کرتے رہے۔ "مجلۃ الازہر" کے سابق مدیر ڈاکٹر حسن الزیات ایک مرتبہ کہنے لگے ـــــ کہ "میں پردے کا قائل نہ تھا۔ مولانا کی کتاب نے ذہن کو صاف کر دیا"۔

● ـــــ معروف ادیبہ دکتورہ بنت الشاطی سے ایک محفل میں ملاقات ہوئی ـــــ کہنے لگی کہ "مولانا مودودی جیسے سخت علماء اگر پیدا ہو گئے تو ہم کوئی ترقی نہیں کر سکتے۔ اخوان کا آخر کیا حشر ہوا"۔ میں نے عرض کیا کہ ترقی کا تعلق سختی سے نہیں ہے۔ بلکہ ترقی نتیجہ ہوتا ہے محنت، دیانتداری، عزم اور ارادے کا ـــــ زندگی اگر کسی اُصول اور نظریئے پر گذارتا ہے تو دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ اس اُصول اور نظریئے کی ٹھیک ٹھیک تفہیم کے ساتھ ہم اس پر سختی سے کاربند ہوں۔ آخر اس پر آپ کو کیا اعتراض ہے۔ کیا آپ چاہتی ہیں کہ اسلام کے پیچھے چلنے کی بجائے اسلام کو اپنے پیچھے لے کر چلا جائے" جدید قوم پرست مصری ادیبوں کی بسیار نویسی بھی ہے اور بسیار کلامی بھی ـــــ بات بڑھنے لگی ـــــ تو انہی صاحبہ کے ساتھ ایک واقعہ ہو گیا تھا۔ میں نے اس کا ذکر صاف اُن سے کر دیا اور پھر پوچھا کہ کہیئے "حجاب" میں ہوتیں تو کیا ایسا ہوتا ـــــ محترمہ کے لئے ادھر اُدھر دیکھنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا ـــــ بعد میں معذرت کرنے لگیں ـــــ اور کہا کہ ہم اپنے مردوں کی قہاریت سے مجبور ہیں۔

میں نے اُن سے بالائے مصر کا ذکر کیا ——— تو وہ جھینپ گئیں۔ اسی طرح بنات النیل کی ایک ممتاز خاتون مادام بدری سے ملاقات ہوئی ——— مولانا کی کتاب "الحجاب" پر بہت برہم تھیں ——— اور کہہ رہی تھیں کہ "ہم ایک بورڈ قائم کریں گے جس میں "رجعت پسندانہ" اور دورِ غلامی کے افکار کا جائزہ لے کر عورت کی اصل حقیقت کو واضح کیا جائے گا"۔ میں نے اُن سے کہا کہ اس قدر تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ ازہر سے رجوع کر لیجئے۔ ازہر کا نام لیتے ہی اُن کا چہرہ متغیر سا ہو گیا ——— اور فوراً جواب ملا کہ "سب ازہر کے ممتاز علماء مودودی صاحب کی کتاب کے نفسِ مضمون پر نہ صرف اتفاق کرتے ہیں۔ بلکہ اصرار بھی کرتے ہیں اور پچھلے دنوں میں نے عورتوں کے کسی خاص مسئلے پر ازہر سے استفسار کیا تھا۔ تو جن صاحب نے جواب بھیجا اُنھوں نے استفسار کے جواب کے ساتھ اپنی طرف سے ہدیہ "الحجاب" بھی بھیج دی ——— یہ سخت غیر مہذب مذاق ہے" بنات النیل کے تھا!"

جمال ناصر کی "الاتحاد الاشتراکی العربی" اور نیم سرکاری ادارہ "الاتحاد القومی" کی لائبریریوں میں مولانا کی بعض کتابیں نظر پڑیں ——— علی الخصوص "نظریۃ الاسلام السیاسیۃ" "مسألۃ ملکیۃ الارض فی الاسلام" "الحجاب" اور "اسس الاقتصاد بین الاسلام والنظم المعاصرۃ" اچھے خاصے مقامات پر نظر آئیں ——— عجیب سی بات ہے ——— مولانا کے لٹریچر سے گریز کے باوجود اکثر کتابیں کہیں نہ کہیں مل جاتی ہیں ——— قاہرہ یونیورسٹی میں ایک ذہین ترین نوجوان عبدالکریم المبارک سے ملاقات ہوئی۔ پہلے کمیونسٹ تھے۔ لیکن مولانا مودودی کا لٹریچر پڑھنے کے بعد اسلام سے اب والہانہ تعلق رکھتے ہیں۔ مولانا مودودی کا سارا لٹریچر دیکھ چکے ہیں ——— لیکن پابندیوں کی وجہ سے نہ مولانا کو لکھ سکتے ہیں اور نہ شام وغیرہ سے مزید کتابیں منگوا سکتے ہیں۔ شدید حسرت و آرزو کا اظہار کر رہے تھے۔ چونکہ مولانا مودودی کے لٹریچر کی وجہ سے اُنھوں نے اسلامی ادب پڑھنا شروع کیا ہے۔ اس لئے مولانا کے نام سے گہرا جذباتی تعلق بھی رکھتے ہیں۔ کمیونزم کی اسالیب پر ایک تجزیاتی کتاب لکھ رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ مولانا کے نام معنون کروں گا ——— قاہرہ اب مشرقِ وسطیٰ میں سب سے زیادہ متحرک مقام ہے ——— استبداد کے باوجود اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں ——— جو نہ معلوم کن گوشوں سے ابھرتے ہیں اور صداقت آفریں لٹریچر ہی کے ذریعے دین کا کام کر رہے ہیں۔

بن غازی اور خرطوم

خرطوم سوڈان کا صدر مقام ہے۔ اور جدید تر بنتا چلا جا رہا ہے۔ یہاں کے دینی حلقوں میں مولانا مودودی کا لٹریچر نہ صرف یہ کہ سرعت سے پھیل چکا ہے۔ بلکہ نوجوانوں میں بے پناہ مقبول ہے۔ سوڈانیوں کے اخلاص و درد اور سادگی و محبت کا کوئی جواب نہیں ہے۔ بڑے ہی مخلص لوگ ہیں۔ دینی حمیت بہت رکھتے ہیں۔ مولانا مودودی کے لٹریچر سے واقعہ یہ ہے کہ پاکستان پورے عالمِ اسلام میں متعارف ہو چکا ہے۔ تعارف سے مراد "سفارتی و سرکاری تعارف" نہیں ہے ——— ان ممالک میں پاکستان کا تعارف، سفارت خانے والے "بھنگڑا ناچ" اور آثارِ قدیمہ کے پتھروں کو "تہذیب و ثقافت" کا نام دے کر کراتے ہیں۔ مولانا مودودی نے پاکستان کا تعارف نظریۂ پاکستان سے کرایا ہے۔ جو کہ اصل اساس ہے اس ریاست کے تخلیق کی! سوڈان کی "حزب التحریر الوطنی" کے ایک نوجوان کرام سلیم سعید سے ملاقات ہوئی فوراً پوچھا "ARE YOU THE MEMBER OF JAMAAT-E-ISLAMI PAKISTAN" میں نے "نہیں" کہا تو انہیں بے حد مایوسی ہوئی۔ تاہم میں نے مزید کہا کہ رکن تو نہیں ہوں البتہ جماعت اسلامی کے مقاصد سے پوری دلچسپی رکھتا ہوں ——— تو پھر سنبھل گئے اور کہنے لگے کہ "میں نے مولانا مودودی کا سارا لٹریچر پڑھا ہے اور انکے "MOST DYNAMIC THOUGHT" کو پڑھ کر ہمیشہ ہر پاکستانی کے سامنے احترام سے سر جھکا لیتا ہوں۔۔۔"

"لیکن مجھے اشتیاق درصل جماعتِ اسلامی کے ارکان سے ملنے کا ہے۔ اس فکر کا اثر اُن کے ہاں دیکھنا چاہتا ہوں"۔ —— مجھے اس گہری سوچ رکھنے والے نوجوان نے بہت متاثر کیا۔ اور چلتے ہوئے اُن سے کہا کہ "آپ پاکستان ضرور آئیں اور آنے سے پہلے مولانا مودودی کو ایک مفصل خط لکھ دیں"۔ انھوں نے گہرا سانس لیتے ہوئے زور سے "انشاءاللہ" کہا —— اخوان کے حلقے یہاں بھی ہیں اور مولانا کی مقبولیت کے بارے میں کچھ کہنے کی حاجت نہیں۔ خرطوم میں "لندن سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز" کے صدر شعبہ عربی ڈاکٹر داؤد سے یہاں اتفاقیہ ملاقات ہوگئی۔ قاہرہ سے آرہے تھے اور خرطوم میں رُک کر ادیس ابابا جانے کا پروگرام رکھتے تھے۔ یہ صاحب انگریز نومسلم ہیں۔ اور مشرقِ اوسط میں فکری و علمی فساد پھیلانے کے لئے برٹش کونسل کی طرف سے نام نہاد علمی دورہ کر رہے تھے —— پاکستان سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا —— کچھ دو چار اُردو کے الفاظ بھی دُہرائے —— لیکن نظریہ پاکستان اور اسلامی تحریکات پر اپنے آپ کو انگریزوں کی روایتی سرد مزاجی کی گرفت میں نہ رکھ سکے اور پھٹ پڑے۔ پاکستان کی تخلیق کو معاشی وجوہات اور ہندوؤں سے ضد کا نتیجہ بتلا رہے تھے —— میں نے اُن سے عرض کیا کہ قطع نظر اس بات کے کہ آپ کی یہ باتیں کتنی حقیقی تاریخی اور علمی وزن رکھتی ہیں —— یہی بات پاکستان اور دیگر ممالک کے اشتراکی بھی کہتے ہیں۔ پہلے اسے صاف کیجئے کہ آپ کے اور اُن کے نقطۂ نظر میں کیا فرق ہے۔ تب میں آپ کو آپ کے استعمار آمیز اسلوبِ فکر کی حقیقت سمجھا سکوں گا"۔

● —— اسلام کے ذکر سے مخالف اتنا نہیں گھبراتے جتنا متجدد و منحرف و گمراہ لوگ گھبراتے ہیں اور جب اُن سے خالص علمی اور شعوری انداز میں گفتگو کی جائے تو بوکھلاہٹ دوچند ہو جاتی ہے۔ میری اس بات کا جواب تو ڈاکٹر داؤد کو نہ بن پڑا۔ اور شام کو ملنے کا وعدہ کر کے چلے گئے —— جب ملاقات پھر ہوئی۔ تو پہلی بات کو نظر انداز کر کے پوچھنے لگے کہ "مولانا مودودی کے بارے میں مسلم لیگی حضرات کیا رائے رکھتے ہیں۔ میں نے اس شاطرانہ سوال کے جواب میں عرض کیا کہ "مسلم لیگی حضرات قائدِ اعظم کے فرمودات کی روشنی میں اسلام سے محبت رکھتے ہیں اور مسلم لیگی حضرات اور مولانا مودودی میں یہی مشترک احساس و شعور برطانوی سامراج کے اسالیب کو دو ڈھائی سو سال سے دیکھ کر اب ہوشیار ہو چکا ہے —— اور تفریق کی میکاولی سیاست سے خوب واقف ہے"۔ کہنے لگے۔ "YOU ARE TOO TERRIBLE TO TALK WITH." میں نے عرض کیا کہ برطانوی تعلیم کا اثر ہے —— بیچارے بوکھلا گئے تھے۔ ایک سوڈانی دوست اُن کے پیچھے پڑ گئے۔ جو سوڈان میں برطانیہ کی سیاہ کاریوں کی پول کھولنے لگے اور اس پر ڈاکٹر داؤد صاحب کو بھاگتے ہی میں خیریت نظر آئی۔ ورنہ ممکن تھا کہ سوڈانی دوست جمع ہو جاتے —— اور اُن کی مزاج پُرسی اچھی طرح ہو جاتی۔

● —— بن غازی خاصہ خوب صورت مقام ہے، لیبیا کے لوگ بے حد دین پسند، خاموش طبع، اور صلح کُن لوگ ہیں سنوسی تحریک کا دھیماپن اور آہستہ رو مزاج یہاں کے دینی حلقوں پر غالب ہے —— اطالوی استعمار کا کچھ زیادہ اثر ان لوگوں نے نہیں لیا۔ طرابلس و البیضاء کے شہروں میں عظیم مساجد اور ذکر و فکر کے حلقے قائم ہیں —— سنوسی تحریک کی خصوصیت اور مرکزی نقطہ عبادت اور ذکر و شغل پر زیادہ زور ہے لیبیا میں مولانا مودودی کا لٹریچر بہت مقبول ہے۔ علی الخصوص اخلاق و معاشرت کے موضوعات پر مولانا کی کتابیں بہت پھیلی ہیں۔ مولانا کی کتابوں کے پھیلانے والے ایک نوجوان الاستاذ البہلول احمد نشنوش سے ملاقات ہوئی۔ چھوٹے سے قد کے شائستہ لہجہ میں بولنے والے یہ صاحب مولانا کی کتابوں کے شیدائی ہیں۔

سابق وزیر اطلاعات لیبیا الشیخ عبداللہ بن السمری سے ملاقات ہوئی تو وہ غالی تصوف کے قائل اور حسن البنّاؒ اور مودودی کی دعوت و تحریک کے مخالف نکلے۔ بے حد نیک انسان ہیں۔ اور اُن کی نیکی اور رقّتِ قلبی، قنوطیت اور تنہا گزینی

کی طرف انہیں لئے جاتی ہے - دین کا یہ غیر متمدن تصور قوموں کو مرآزما اخلاق سے اس قدر تہی دامن کر دیتا ہے کہ بنیادی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کا ہی احساس نہیں رہتا - ایک نہایت ہی باشعور اور متحرک نوجوان "نبیل محمد غنیم طرابلسی" سے ملاقات رہی ـــــ مولانا مودودی کی تحریروں میں جذبہ و سوز کے کمی کی شکایت کرتے تھے - کہتے تھے کہ "انسانوں کی اکثریت سوچتی کم ہے اور محسوس زیادہ کرتی ہے - اس لئے قلب و احساس کو پہلے اپیل کرنا چاہیئے"۔

• ـــ الجزائر و مراکش اور ترکی و تونس میں بھی مولانا مودودی کا لٹریچر وسعت سے پھیلا ہے - یورپ کے علمی حلقوں میں مولانا مودودی کے فکر و دعوت کا سنجیدہ نوٹس لیا گیا ہے - یہ داستان لمبی ہے اسے کسی اور فرصت کے لئے اٹھا رکھئے ـــ البتہ تونس کا ایک واقعہ ہاتھوں ہاتھ سن لیجئے :-

• ـــ تونس کے صدر حبیب بورقیبہ جس اسلام دشمن اور آمریت پسند پالیسی پر گامزن ہیں - اس کا سبھی کو علم ہے - پچھلے دنوں نہ معلوم کیا سوجھی ان حضرت نے پردے کے خلاف ایک صدارتی آرڈیننس جاری کر دیا کہ "تونس کی ترقی پذیر ریاست کی خواتین ملک کے بہترین مفاد میں پردہ ترک کر دیں ـــ اور دفاتر و ادارات میں عورتیں بغیر پردہ کے کام کریں وغیرہ"۔

اس احمقانہ حکم پر پورا ملک ہمہ گیر مظاہرات و اضطرابات کا مرقع بن گیا - اور ایک خاتون ڈاکٹر فوزیہ الفاسی نے ایک بھرے ہوئے خواتین کے عظیم اجتماع میں شدید تنقید کی - اور کہا کہ تونس کی مسلمان خواتین ابھی حبیب بورقیبہ کی طرح بے غیرت نہیں ہوئی ہیں - اور پھر اس اجتماع میں مولانا مودودی کی کتاب "الحجاب" سے اقتباسات پڑھ کر سنائے گئے - اور کئی جگہوں پر اس کتاب کے دروس کے سلسلے جاری رہے۔

یہ واقعہ مجھے رباط میں ایک ممتاز صحافی دوست حسن وریاب المراکشی نے بتایا -

اصل صورت حال یہ ہے کہ عالم اسلام کے قصر نشین اور اوپر کے طبقے مغرب سے بہت زیادہ متاثر ہیں، ان کا ذہن "تجدد" سے بہت زیادہ مناسبت رکھتا ہے، مگر اس کے باوجود مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو آج بھی اسلام کی تاریخی وحدت کا شدید احساس رکھتی ہے اور تجدد و انحراف کا کوئی حربہ اس عظیم اسلامی وحدت کو ختم نہیں کر سکتا، قوموں پر انحلال و اضطراب کے دور بھی آتے ہیں لیکن مقصدی و نظریاتی رشتے اور قلبی و روحانی تعلقات زوال کو قبول نہیں کرتے ، اسلام دین کامل ہے جسے دنیا میں بہرحال باقی رہنا ہے اسلام سے جو لوگ گریز کی راہیں ڈھونڈتے ہیں اور اسلام کو اپنے خیالات کے قالب میں ڈھالنا چاہتے ہیں وہ دنیا میں باقی نہ رہیں گے مگر اسلام زندہ و سلامت رہے گا ـــــ مولانا مودودی کے پیش کئے ہوئے لٹریچر اور ان کی اسلامی فکر کی مقبولیت اسی حقیقت کی عکاس ہے ! کاش ! پاکستان کے مسلمان اپنی اس خداداد ریاست کو اسلامی اصولوں پر استوار کر لیں کہ پاکستان اسی مقدس مقصد کے لئے وجود میں آیا ہے !

فاران :- الجزائر کے مفتی اعظم محمد بشیر ابراہیمی ہوں، یا مصر کے علامہ ابوزہرہ ، شام کے سابق وزیر معارف احمد زرقا ہوں یا نجد کے بیباک و جری عالم محمد بن باز غرض عالم اسلام کے قریب قریب تمام ارباب فکر اور اہل علم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے نہ صرف یہ کہ واقف ہیں بلکہ ان سے متاثر ہیں اور مودودی صاحب کی دینی فکر کی اصابت کے معترف ہیں ! عرب ممالک کے علاوہ ترکی اور انڈونیشیا میں بھی مولانا مودودی کا لٹریچر پہونچ چکا ہے خاص طور سے ترکی کا دینی طبقہ مودودی صاحب سے متعارف ہے ! سنا ہے کہ جاپانی زبان میں بھی مولانا کی کسی کتاب کا ترجمہ ہو رہا ہے ـــ

ایک صاحب جو حکومت قطر (خلیج عرب) میں ملازم ہیں، اُن سے کراچی میں ملاقات ہوئی تو کہنے لگے اُس علاقے میں لوگ اس نسبت اور تعارف کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں ــــــ "اچھا! وہ پاکستان جہاں مولانا مودودی رہتے ہیں"۔

عربی زبان کے علاوہ مولانا مودودی کی کتابیں جس زبان میں بھی ترجمہ ہوئی ہیں، اُن کو پسند کیا گیا ہے اور خاص طور سے اہلِ علم نے اُن کا اثر قبول کیا ہے! کاش! پاکستان کے بڑے لوگ مولانا مودودی کی کتابوں کے مطالعہ کے لئے وقت نکالیں، انہیں اس کا احساس ہو کہ جس کو انھوں نے خزف ریزہ سمجھ رکھا تھا وہ گوہر شب چراغ نکلا اور اس فکر و مزاج کا آدمی پاکستان، ملّت اور اسلام کا بہی خواہ اور رفیق و دست و بازو ہونے کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

ہماری شاعری میں ایک نئی آواز

ڈاکٹر سید صفدر حسین کی نظموں کا مجموعہ "رقصِ طاؤس" نظم پابند اور نظم آزاد کے درمیان کا خلا پُر کرتا ہے۔ بیسویں صدی میں اردو شاعری نے ایک نیا رُخ بدلا اور ایک نئی چیز ظہور میں آئی جس کو "نظم" کہا گیا۔ حالی اُس کے موجد ٹھہرائے گئے اور اُس کو اپنے اپنے انداز پر جوش اور اقبال نے کمال تک پہونچایا۔ اس کے بعد "نئی شاعری" کی ایک تحریک چلی جس کا کارنامہ "آزاد نظم" تھا۔ یہ نظم اُردو کی روایات سے بالکل الگ یورپ کے جدید ترین شعرا علی الخصوص جنگِ عظیم کے بعد کے شاعروں نے جو تجربات کئے اُن کا تتبع تھی۔ یہ ہمارے مذاقِ شعر پر ایٹم بم کی طرح پھٹی۔ اس میں کلاسیکل روایات کے طرزِ فکر، اندازِ تخیل، اسلوبِ ادا اور سب سے زیادہ عروض سے شدید بغاوت کی گئی تھی۔ نیاز صاحب فتحپوری نے اسے شاعری کہنے سے انکار کیا اور "بگڑی ہوئی نثر" کہا۔ عرصہ تک مجھے اس نظم سے اس لئے دلچسپی رہی کہ مجھے جنگِ عظیم کے بعد کے انگریزی شاعروں نے بہت متاثر کیا تھا اور یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی تھی کہ ہمارے اُردو شاعر بھی حقیقتاً "جدید" ہو سکے ہیں کہلائے ہیں۔ مگر چند سال بعد ہی میں نے دیکھا کہ یہ "جدت" کلیتہً غائب ہو گئی اور شعرا پھر غزل کی طرف واپس جانے لگے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے اس پر یہ رائے دی کہ "یہ ایک وقتی اُبال تھا جو ختم ہو گیا"۔ جب میں نے اس امر پر غور کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ ہمارے شاعروں نے عجیب مضحک حرکت کی۔ حالی وغیرہ نے انگریزی شاعری کی تقلید کی تو خیر ایک حد تک گوارا ہو سکتی تھی لیکن آزاد نظم نگاری کی اُپج کو ذوقِ سلیم برداشت نہ کر سکے۔

اہم سوال اس صدی کے شاعروں کے سامنے یہ تھا کہ مربوط و مسلسل نظمیں لکھی جائیں۔ تسلسل کی ایک قسم تو وہ ہوتی جو حالی سے لے کر اس زمانہ کے نظم و شعرا تک کے کلام میں ملتی ہے یعنی ایک ہی موضوع پر الگ الگ خیالات الگ الگ بندوں میں رکھ دیئے جائیں یعنی موتی ایک دھاگے میں علیحدہ علیحدہ پرو دیئے جائیں۔ پھر آزاد نظم آگئی جس میں آزاد تسلسل (FREE ASSOCIATION) غیر مسلسل ہو گیا۔ ان دونوں کے درمیان ایک درجہ تسلسل کا وہ تھا جو انیسویں صدی کی انگریزی نظموں میں نظر آتا ہے اور جو آزاد تسلسل کا لازمی پیش خیمہ ہے۔ اگر ہمارے شعرا میں اس افسانوی، ڈرامائی، منطقی، اور بیانیہ تسلسل سے واقف ہو لیتے تو آزاد تسلسل سے شاید اتنا جلد نہ گھبرا اُٹھتے۔ غرض ہماری شاعری میں ایک درجہ وہ رہ گیا جس کو زندگی کا تسلسل (ORGANIC COHERENCE) کہتے ہیں۔ اور جس سے ہمارے شعرا کو اثر پذیر ہونے کا موقع نہ ملا۔ لیکن صفدر صاحب کی نظمیں اس کمی کو پورا کرنے والی ہیں۔

عروضی نقطۂ نظر سے بھی یہ نظمیں فنّی خلا کو پُر کرتی ہیں جس کا پُر ہونا شاعری کے ارتقا کے لئے ضروری تھا۔ ہماری زبان کثرت سے ہم قافیہ الفاظ رکھتی ہے اور یورپ کی جدید زبانوں میں ہم قافیہ الفاظ کی ایک حد تک کمی ہے۔ اس لئے یورپ کے ادب میں معرّا نظم کا وجود میں آجانا زیادہ قدرتی بات تھی۔ پھر بھی قافیہ کا التزام اُن کے ہاں عرصہ دراز تک ضروری سمجھا گیا۔ کلاسیکی ادب میں روم کے قومی شاعر ورجل کی طویل ایک نظم، معرّا اشعار میں ہے، مگر قرونِ وسطیٰ کی تمام شاعری قافیہ کو لازم قرار دیتی ہے۔ نشاۃ الثانیہ میں صرف طویل نظموں اور ڈراموں میں مقفیٰ اشعار کے ساتھ ساتھ معرّا اشعار بھی نظر آتے ہیں۔ مارلو (MARLOWE) پہلا ڈرامائی شاعر

ہے جس نے اپنے ڈراموں میں معرّا اشعار کو رواج دیا۔ مگر پھر بھی شیکسپیر کے ڈراموں میں اکثر مکالمے ابیات میں ہیں اور اُس کے آخری ڈراموں تک میں ابیات اور معرّا کا استعمال موقع موقع سے ہوا ہے۔ غیر ڈرامائی شاعری میں معرّا کا سب سے اہم کارنامہ —— ملٹن (MILTON) کی پیراڈائز لاسٹ (PARADISE LOST) ہے۔ اس میں قافیہ کے فقدان پر ملٹن نے ایک مقدمہ لکھا جس میں اس نے بتایا کہ قافیہ کی کمی کو اُس نے کس طرح پورا کیا ہے (گو اس کو ایک صدی تک تسلیم نہ کیا گیا) والٹیر (VOLTAIRE) نے کہا کہ ملٹن میں قافیہ بیانی کی صلاحیت نہ تھی اس لئے اس نے معرّا کا ڈھونگ رچایا۔ اٹھارھویں صدی کے خاتمہ پر ڈاکٹر جانسن (JOHNSON) نے کہا کہ نظم معرّا محض آنکھوں ہی کے لئے نظم ہوتی ہے کانوں کے لئے نہیں کیونکہ اگر اُسے سنا جائے تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کہاں مصرع ختم ہوا جب کہ قافیہ، مصرع کے اختتام کا پتہ سامع کو بھی دیتا ہے۔ مگر اُنیسویں صدی میں ابیات کو ترک کر دینے کا رواج شروع ہوا اور ملٹن کی "بلینک ورس" میں بڑی معرکہ آرا نظمیں لکھی گئیں۔ اس نظم معرّا میں مصرعے چھوٹے بڑے نہیں ہوتے اور بحر بھی یکساں رہتی ہے۔ قافیہ کی جگہ ملٹن نے ایک خاص بات رکھی تھی جس کو "سی زورا" (CAESURA) کہتے ہیں جو اُنیسویں صدی کی معرّا نظموں میں بھی ملتا ہے۔ بیسویں صدی میں معرّا نظم سے بھی بغاوت کی گئی اور "فری ورس" (FREE VERSE) وجود میں آئی جس میں بحروں اور مصرعوں کی لمبائی وغیرہ سے بھی آزادی برتی گئی اور عروض کی زنجیر کے سرگم اُتار پر چلایا گیا۔ میں نے "بلینک ورس" سے "آزاد نظم" تک کی داستانِ ارتقاء ذرا تفصیل سے بیان کر دی تاکہ معلوم ہو کہ ہماری شاعری میں شدید مقفیٰ نظموں سے ہٹ کر دفعۃً آزاد شاعری یا "فری ورس" تک جست لگانا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ انگلستان میں "بلینک ورس" تک پہونچنے میں دو صدیاں لگیں اور سو برس تک پوری طرح مقبول ہونے کے بعد وہ نظم آزاد کی طرف مڑی۔ چنانچہ صفدر صاحب اسی عمل کے علمبردار ہیں، اس لئے ان کی "بلینک ورس" کی نظموں کا مجموعہ ایک ایسی رہنمائی ہے جس سے ہماری موجودہ بھٹکی ہوئی شاعری راہِ راست پر آسکتی ہے۔

میں نے ان نظموں کی صرف دو نمایاں صفات کا ذکر کیا جو ہماری جدید شاعری میں اس کا صحیح مقام متعین کرتی ہیں۔ میں اردو ادب کو دو دوروں میں تقسیم کرتا ہوں۔ ایک دکنی سے لے کر داغ تک کا دور جو فارسی روایات کا دور ہے۔ دوسرا حالی سے لے کر عہدِ حاضر تک جسے نشاۃ الثانیہ کا دور بھی کہہ سکتے ہیں اور جو ابھی ختم نہیں ہوا۔ یورپ کے ادبی اثرات کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور اسکے زیرِ اثر ابھی بہت سے مراحل ہمیں طے کرنا ہیں۔ صفدر صاحب کی نظمیں انہیں منازل کی نشان دہی کرتی ہیں۔ یہ نظمیں اردو شاعری میں بالکل نیا تجربہ ہیں۔ ان میں وہ آہنگ ہے جو ایک مکمل تاثر (عالم، حالت، کردار، یا واقعہ کا) ہمارے سامنے لاتا ہے۔ کوئی نظم ایسی نہیں ہے — — — — جس کے ٹکڑے کئے جا سکیں۔ مثال کے طور پر پہلی ہی نظم "تجدیدِ محبت" کو لیجئے۔ پہلے اٹھارہ مصرعوں میں شاعر اپنے نفسیاتی عالم کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔ وہ بیگانۂ آلام ہے اور ایک خاص مقام پر ایک خاص فضا میں ایک خاص وقت بِتاتا ہے اور یہاں ایک واقعۂ عشق سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اس حادثے کے تاثرات کو وہ اپنے خاص انداز میں اس طرح ظاہر کرتا ہے:—

ایسے عالم میں کیا اُن کی نگاہوں نے سوال
میری سہمی ہوئی نظروں نے دیا اُس کا جواب
آنکھ نے کھائی قسم دل کی گواہی کے لئے
ہاتھ کے لمس نے بھی عہدِ وفا باندھ دیا

کوششِ قرب میں دھڑکنوں کی لپک تیز ہوئی
فاصلے گھٹ گئے، جھجکیں کی حدیں ٹوٹ گئیں

دو دلوں نے جو بتدریج کئے تھے اقدام
دو مذاقوں میں نمایاں ہوئی یک رنگیٔ شوق

دو جبیں نزدیک ہوئیں جذب ہوئیں محو ہوئیں
جذبے آپس میں بغل گیر و ہم آغوش ہوئے

ایک فردوسِ تخیل میں سمٹ آئی حیات
جس سے باہر کسی عشرت کا تصور ہی نہ تھا

ایک ہی دائرۂ حسن و لطافت میں محیط
گرمیٔ جذبۂ وارفتۂ محبت کی لپک

ان کی خواہش تھی کہ لمحات یہ جاوید بنیں
اسی مرکز پہ ٹھہر جائیں گریزاں مہ و سال

مجھ کو احساس نے زنجیرِ وفا پہنا دی
جل اٹھا دل میں محبت کے فرائض کا چراغ

دلوں میں ایک دم عشق کے جاگ اٹھنے کا مسلسل نفسیاتی نقشہ نہایت لطافت کے ساتھ ایک مخصوص رمزیہ انداز میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ کیفیت افسانوی اور ڈرامائی ہے اور اس کا لطف طولِ بیان میں ہے۔ شاعر اپنا ماجرا بیان کر رہا ہے مگر وہ خود الگ فرد نہیں ہے۔ وہ ایک عام نوجوان ہے جس کو اس دور کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے اور جس کے مزاج کی خارجیت (OBJECTIVITY) خاص طور پر نمایاں ہے۔ اس لئے ہم ان مصرعوں کو پڑھ کر محسوس کرتے ہیں کہ یہ پوری کیفیت ہمیں پر گذری ہے۔ شاعر اُن داخلی جذبات میں گم نہیں ہو گیا ہے جو پڑھنے والوں کے لئے مبہم ہوں۔ لگاہوں کا سوال، آنکھ کا قسم کھانا، ہاتھ کے لمس کا عہدِ وفا باندھنا، دو دلوں کا تدریجی قدم جذبوں کی ہم آغوشی، یہ سب ملاقات اور دوستی کی منزلیں ہیں۔ شاعر نے ان دلکش لمحوں کی بڑی دل کش تصویر پیش کی ہے۔ اس تصویر کی نوعیت کا اندازہ لگانے کے لئے اس کا مقابلہ جوش کی کسی نظم یا مدکس آزاد نظم سے کیجئے تو معلوم ہو گا کہ یہاں محض اجزاء کو جمع نہیں کر دیا گیا ہے اور نہ اجزاء سے کوئی معمہ بنا یا گیا ہے بلکہ واقعیت کے ساتھ عام منطقی تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے ذہنی اور جذباتی کیفیات کو دلچسپ طریقہ پر پیش کیا گیا ہے۔ "بلینک ورس" زیادہ تر طویل نظموں میں استعمال ہوتی ہے۔ قافیہ کے ہٹ جانے سے مصرعوں میں ایک خاص روانی آجاتی ہے جو خیالات کو آسانی سے لوا کر تی چلی جاتی ہے "بلینک ورس" کی یہ صفت اس ٹکڑے میں پوری طرح نمایاں ہے اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس کیفیت کا صحیح اور جامع اظہار شاید "بلینک ورس" ہی کے ذریعہ ممکن تھا۔

ان نظموں کی نوعیت کا پتہ تو ان کے چند اجزاء سے بھی چل سکتا ہے مگر نظم کا مکمل آہنگ، اس کے صوری و صوتی اثرات، اس کی تشکیل کا جمالی اور کُل کے جزئیات سے تعلق کو پوری نظم کے مطالعہ کے بعد ہی معلوم کر سکتے ہیں۔ مثلاً ایک نظم "گردش" ہی کو لیجئے کہ اس کے ایک ایک لفظ سے گردش کا صوری و ذہنی احساس تیز تر ہوتا جاتا ہے۔ نظم شروع کرتے ہی ایک بزمِ احباب کا نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے اس میں کسی شور و غل کے اوصاف گردش میں ہیں۔ ایک زبان سے دوسری زبان تک یہ وصف آ رہے ہیں اور بزم میں ان کی گردش شمع یا

پیالے کی گردش کی طرح جاری ہے۔ شاعر بھی دل چسپی سے سُن رہا ہے:۔

یعنی گلشن میں وہ نازل ہوئی تتلی کی طرح

تتلی سے تشبیہ گردش کا تاثر پیدا کرنے کے لئے نہایت موزوں تھی۔ تتلی کی آمد کے تصور سے سماں بدل جاتا ہے اور یک لخت ہمارا خیال اُس مجسّم اوصاف کی گردش اور گردش کی کیفیات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے:۔

کبھی ٹھٹکی کبھی ٹھہری کبھی رُک رُک کے بڑھی
کبھی آئی، کبھی پلٹی، کبھی بڑھ بڑھ کے رُکی

گہ پر کاہ پہ جھولی کبھی برگ گل پر
آنکھ جھپکا کے ہواؤں پہ کبھی تیر گئی

اِن سطور کے صوری اور صوتی اثرات گردش کے تاثر کو دلکش طریقہ پر گہرا کر لیتے ہیں۔ پہلے مصرع میں ٹھٹکی، ٹھہری، رُک رُک کے بڑھی کے الفاظ میں ہم تتلی کی حرکات کو کانوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ اور "کبھی" کی تکرار کے ساتھ جھٹکے جلے حرکات کا صوری اثر بڑھاتے ہیں۔ پھر تیسرے مصرع میں "پر کاہ پہ" اور "برگ گل پر" جھولنا تتلی کی بے فکری، شوخی اور معصوم اداؤں کو سامنے لاتا ہے۔ چوتھے مصرع میں "آنکھ جھپکا کے" کا ٹکڑا تتلی کے پروں کی حرکت اور اُس کی رفتار کی سُرعت کی بڑی مصورانہ ترجمانی کرتا ہے اور ہواؤں پر تیر جانے کا استعارہ پوری گردش کو تکمیل تک پہونچا دیتا ہے۔ یہ گردش اگرچہ تخئیلی ہے لیکن اس کے پس منظر میں ایک حقیقی محبوبہ موجود ہے جس کے وجود کو شاعرانہ نقاشی کے ذریعہ سے رفتہ رفتہ اُبھارا گیا ہے۔ اب گردش واقعاتی سطح پر آجاتی ہے اور عاشق اور محبوبہ کے درمیان خطوں کا چکر شروع ہو جاتا ہے۔

سلسلہ نامہ و پیغام کا بڑھتا ہی رہا

یہ خطوط نگاری بھی گردش ہی ہے کیونکہ خطوں کا رنگ بدلتا رہتا ہے:۔

ایک خط میں نظر آتی تھی مری سمت رواں
ایک مکتوب میں دے جاتی تھی حسرت کا نشاں

ایک نامے میں دھواں، ایک میں ننھی سی کرن
کسی مکتوب میں تلوار، کسی خط میں ہلال

کبھی چشمک، کبھی شوخی، کبھی ایک طنز خفی
کبھی جگنو، کبھی اخگر، کبھی آنسو کبھی آنچ

اس واقعاتی اور ڈرامائی عشق بازی کے چکر کا خاص موڑ اُس وقت آتا ہے جب:۔

میرے کردار کی خوبی میں دلائے گئے شک
میری سیرت پہ تراشے گئے بہتانِ عظیم

آخر نتیجہ دردناک ہوا اور اُس درد کو ایک پاکیزہ تشبیہ سے اس طرح ظاہر کیا گیا ہے:۔

بن رہا تھا کہ اُمیدوں کا محل بیٹھ گیا

اس مصرع کے صوتی اور معنوی اثرات اُس یاس انگیز عالم کو سامنے لاتے ہیں جو اس قسم کی جذباتی خط و کتابت کا لازمی نتیجہ ہے۔ مگر یہ

گردش ابھی ختم نہیں ہوتی۔ شاعر خود سرگرداں ہے مگر ہم وقت کا ذکر نہایت دلچسپ ہے۔ یہ گردش کو ختم کرنے ہی والا تھا کہ ایک نمائش کا سماں سامنے آ کر اس میں جان ڈال دیتا ہے۔ یہاں بجلی کی طرح گھومتی ہوئی محبوبہ پھر نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ مقام دونوں نگاہوں کو موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے اپنے مدِ مقابل کے خد و خال، قد و قامت، ہیئت اور شخصیت کی فضائے مجموعی کو بے محابا دیکھ لیں :۔

بے جھجک ایسے ہوا دونوں نگاہوں میں ملاپ
جیسے پردیس میں بچھڑے ہوئے دو دوست ملیں

یہاں گردش کا ڈرامائی ارتقا اپنی خاص منزل پر پہونچتا نظر آتا ہے۔ نظم کے منطقی ربط سے شاعر کی ذہنی اور تخیلی قوت کا احساس ہوتا ہے۔ اس عالم کی نفسیاتی تصویر اردو ادب میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ اور اس کو بڑے نازک کنایوں سے پیش کیا گیا ہے۔

رُو میں پیوست نگاہیں نہ جُدا ہوتی تھیں
آنکھیں بھر آئی تھیں جذبات گلے ملتے تھے

مصوّر کی نمائش میں ایک مجمع عام ہے مگر اس میں دو دل ایسے ہیں جو اس عالمِ خیال کو واقعی بنانے کے لئے عجیب پُر کیف گردش میں مبتلا ہیں۔ مگر یہ محض جذباتی تاثرات نہیں ہیں ان میں حقیقی نفسیات بھی شامل ہیں۔ محبوبہ کا انفرادی کردار جو اس مصرع سے نمایاں ہوتا ہے :۔

کھُل گیا حسن کے ناپختہ ارادوں کا بھرم

ظاہر کرتا ہے کہ یہ حسین لڑکی ابھی ذہنی توازن سے دور ہے۔ اس کا کردار گردش کا اشارہ ہے۔ اس کی محبت سے گردش کے سوا کچھ حاصل نہیں ہے۔ وہ بدلتی ہے اور عاشق کو قرب بھی نصیب ہوتا ہے :۔

کچھ دنوں دوش پہ لہرائی شمیم گیسو
کچھ دنوں بالش و بستر سے مہک بھی آئی

مگر گردش گردش ہے اور گردش ہی رہے گی۔ یہ وصل بھی گردش ہی کا ایک موڑ ہے۔ شاعر اپنے خاص تجربے کو آفاقی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے :۔

لیکن انجام ہر افسانۂ اُلفت کا ہے ایک
تاک میں فصلِ بہاراں کے خزاں رہتی ہے

گردش آخر کار اصول کائنات ہے جو جذبات، تخیلات اور تجربات تینوں سے واضح ہو جاتی ہے۔ اس طرح اس مجموعہ کی ہر نظم ایک ایسا مربوط فنی تجربہ ہے جس کی نظیر ہمیں اردو میں تو ملتی نہیں۔

صفدر صاحب نے اب تک اس انداز کی چودہ نظمیں کہی ہیں اور ہر نظم ایک اہم تجربہ ہے لیکن اس مختصر مضمون میں ہر نظم کا جائزہ لینا ضروری نہیں۔ تاہم تمام نظموں کو سامنے رکھ کر صفدر صاحب کی شاعرانہ قوتوں کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ تکنیکی لحاظ سے انھوں نے اہم قدم اٹھایا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ ان کی شاعرانہ انفرادیت بھی نمایاں ہے۔ ان کا فن کی طرف رجحان فطری ہے۔ ان کی تخلیقی قوت تنقیدی شعور کی بنیادوں پر مستحکم ہے۔ زندگی کے مواقع ان کی حساس طبیعت کو متاثر کرتے ہیں اور وہ خواب جذبات کی دنیا میں پہونچ جاتے ہیں۔ مگر وہ جذبات کی رو میں خالص رومانی مزاج والے لوگوں کی طرح بہہ نہیں جاتے خواب کی دنیا سے وہ حقیقت کی دنیا میں آ جاتے ہیں اور دونوں کے آہنگ سے فکر کی دنیا میں پہونچ جاتے ہیں۔ ان کے فن کی

خصوصیت صحت، نفاست اور توازن ہے۔ جو خاص خاص مصرعوں میں پورے عروج پر آجاتا ہے۔ "خوابِ گریزاں" میں اس کی مثالیں کثرت سے نظر آتی ہیں لیکن اور نظموں میں بھی ان کی کمی نہیں مثلاً "بنتِ عم" میں اس طرح کے مصرعے:۔

جب گریبانِ ہلالی سے دمکتا تھا وہ حسن
دفعۃً بعد کی زنجیر پگھل جاتی تھی!

چند مصرعے اسی رنگ و آہنگ کے اور ملاحظہ ہوں:۔

میرے احساس نے کھائے ہیں وہ توہین کے داغ (نظم "مسدود راہیں")
کتنے آنچل مری ترغیب کی خاطر لہرائے (〃 "الزام")
چوڑیاں کتنی بجیں، کھنکے ہیں کتنے پازیب (〃 〃)
دفعۃً ذہن میں روشن ہوئے فانوسِ خیال (〃 "مربوط فاصلے")
گوشے گوشے میں تمنا کے دیئے جل اُٹھے (〃 〃)
صرف تخیل میں جلتے رہے یادوں کے چراغ (〃)
جڑے ہوئے ہیں پرِ کاہ میں نگینۂ آب (〃 "شالامار")
قبولِ عکس سے گلرنگ حوض کا پانی (〃 〃)
اُٹھے بہار سرِ دوشِ لالہ زار لئے (〃 "یادِ یارِ مہرباں")

ان تمام نظموں میں قدرتی مناظر ہیں یا وارداتِ عشق اور ان دونوں کیفیات کے نظم کرنے میں بڑی خوب صورت و دلکش تعبیرات سے کام لیا گیا ہے۔

جدید سوسائٹی میں مرد اور عورت جس طرح آج کل مل رہے ہیں اور جس طرح ہمارے درمیان لگاؤ کی صورتیں بن بگڑ رہی ہیں اُن کی لطیف ترجمانی صفدر صاحب کا خاص حق ہے۔ اس ترجمانی میں ان کا ذہن خاص قسم کی گلکاری سے کام لیتا ہے۔ گویا اُن کی شاعری ایک صاف و شفاف دریا کا بہاؤ ہے جس میں زندگی کے تمام لطیف عکس نظر آتے ہیں اور جو لطفِ سخن کے ساتھ ساتھ دعوتِ فکر بھی دیتے ہیں۔

ان نظموں کی ایک اور خصوصیت نفسیات نگاری بھی ہے جو ہمیں اُردو شاعری میں بہت کم ملتی ہے۔ اصل میں نفسیاتی تحلیل کا میدان ڈراما اور ناول ہے داخلی اور غنائی شاعری نہیں۔ کیونکہ شاعری کی نوعیت ہی یہ ہے کہ اس کا موضوع تخیلی اور آفاقی ہو اس لئے فرد کی انفرادیت عام صفات میں گم ہو جاتی ہے۔ مگر شاعروں نے (جیسے انگریزی میں رابرٹ براؤننگ) یہ مسئلہ یوں حل کیا کہ انھوں نے کچھ ڈرامائی لمحوں (MOMENTS) کو نظم کا موضوع بنایا اور اس موقع پر ہر فرد کی جو انفرادی حالت نظر آئی اُس کی شاعرانہ تصویر کھینچ دی۔ اس طرح ہر نظم ایک منفرد کردار کا خاکہ بھی ہو گئی اور نظم بھی رہی۔ زیرِ نظر نظموں کا رنگ بھی یہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان میں مختلف افراد کی تصویر کشی نہیں کی گئی بلکہ ہر جگہ ایک ہی فرد جلوہ نما ہے اور اس کی نفسیاتی حالت جو مختلف مواقع کے لحاظ سے پیش کی گئی ہے مثلاً محبوبہ کے حضور میں خود اپنی اور اس کی ذہنی کشمکش کا نقشہ انھوں نے اس طرح پیش کیا ہے:۔

ذوقِ فطری نے دیا تھا اُسے لیکن یہ شعور
کہ وہ اس طرح سے اک ربط سنور کر سکتے

جس سے ہر عضوِ حسیں اور حسیں بن جائے
جس سے بے ساختگی ڈھال لے تلوار کا روپ

جس سے بے حس کے بھی ماتھے پہ پسینہ آجائے
جس سے منکر میں بھی پیدا ہو عقیدے کی چمک

اُس کی پہلی ہی جھلک پہ مرا ماتھا ٹھنکا
اور اس جرأتِ معصوم پہ حیرت سی ہوئی

آنچ اُدھر شعلۂ رخسار کی کچھ تیز ہوئی
اور اِدھر دل کی بجھی شمع میں پیدا ہوئی لَو

نگہِ ناز میں اِک خجلتِ اقرار اُدھر
اس طرف عقل میں اور عشق میں بحث و تکرار

آخر اس طرح دبے پاؤں سراپا اُس کا
دل کے تاریک نہاں خانوں میں آیا ناگاہ

دفعتاً ذہن میں روشن ہوئے فانوسِ خیال
گوشے گوشے میں تمنا کے دیئے جل اُٹھے

دو نگاہوں میں کچھ اس طرح ملاقات ہوئی
کھُل گئی جس سے کہ دونوں کے دلوں کی چوری

کچھ تخاطب کے طریقوں میں بھی فرق آنے لگا
کچھ تبسّم میں بھی پیدا ہوا عنوانِ پیام

اُس کے جذبات میں اس طرح سے پیدا تھا جھکاؤ
جس طرح شاخِ ثمردار ہو مائل بہ زمیں

میرا اقدام تھا خود حفظِ مراتب کے خلاف
مجھ پہ لازم تھا کہ میں ضبط کی حد سے نہ بڑھوں

میں نے اس طرح سے کی شوق کی اپنے تادیب
کہ مری چوٹ کا چہرے سے نہ ظاہر ہو اثر

آئینہ ٹوٹ کے اپنا ہی نہ غمّاز بنے
غم کی تفسیر نہ کر دے کہیں ماتھے کی شکن

دل میں طوفان ہو مگر آنکھ سے آنسو نہ بہے
ہو جگر خون مگر پھول تبسّم کے گریں

اس کشاکش میں جو دونوں نے گذارے اوقات
بے خودی کہنے لگی قصّۂ بے ربطیِ ہوش

ضبطِ غم کرکے کہیں میرا جو دل گھبرایا[1]
اُن کی پیشانیٔ نازک پہ پسینہ آیا

بے خیالی میں نگاہوں نے جو ٹھوکر کھائی
لبِ گلرنگ پہ بے ساختہ فریاد آئی

اس قسم کے رنگین لمحے اُن کی ہر نظم میں آتے ہیں اور ان کا نفسیاتی تجزیہ سُننے والے کو مسحور کر دیتا ہے۔ صفدر صاحب نے کئی مجموعوں میں میرے سامنے یہ نظمیں پڑھیں اور میں نے دیکھا کہ ہر مجمع جس میں زیادہ تر آج کل کے پڑھے لکھے لوگ موجود تھے محوِ حیرت ہو گیا۔ عموماً مجموعوں پر غزل یا پابند نظم کا اثر زیادہ ہوتا ہے اور معرّا یا آزاد نظم مجمع کے سر سے گذر جاتی ہے۔ اسی لئے میری یہ رائے ہو گئی تھی کہ آزاد نظم پڑھنے کی چیز ہے سُننے کی نہیں مگر صفدر صاحب کی نظموں نے مجمع کو اس طرح محو کیا کہ وہ ہر شعر پر داد بھی دیتا گیا اور نظم کے مخصوص جذباتی اثر سے بھی لطف اُٹھاتا رہا کیونکہ قافیہ کی پابندی نہ ہونے کے باوجود اُن کا ہر شعر اپنی جگہ اُسی طرح مکمل ہے جیسے غزل یا مثنوی کا شعر اور سُننے والا محسوس کرتا ہے کہ وہ زینہ بزینہ چڑھتا ہوا اُوپر جا رہا ہے اور نظم کے اختتام پر وہ آسودگیٔ ذوق کا بڑا لطیف احساس لے کر محفل سے رُخصت ہوتا ہے۔

فاران:- بے سروپا شاعری جس کے مصرعوں میں ہر اعتبار سے عجیب شتر گربگی پائی جاتی ہے' اُس کے مقابلہ میں معرّا یا آزاد نظم بہرحال پھر غنیمت ہے کہ اس میں قافیہ کی بس پابندی نہیں ہے' ورنہ پابند نظم کی جو دُوسری خصوصیات ہیں وہ اس میں ملتی ہیں۔

ڈاکٹر سید صفدر حسین صاحب نے کوئی شک نہیں بڑے معرکے کی آزاد نظمیں کہی ہیں' جن میں جدّت کے ساتھ روانی اور نغمگی بھی پائی جاتی ہے' مگر ہم اُن کی خدمت میں یہ گزارش کریں گے کہ وہ اُردو زبان کے مزاج کی مناسبت کا لحاظ رکھتے ہوئے آئندہ پابند نظموں (بہ قید قافیہ) میں اپنی قوت صرف کریں! انیسؔ اور اقبالؔ کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں' انھوں نے پابند شاعری کی حدود میں رہ کر زبان و ادب کو بڑی ثروت، تازگی اور فکر و بیان کی جدّت عطا کی ہے' قافیہ سے شاعری میں جان اور نغمگی پیدا ہوتی ہے!

فردوسیؔ' نظامیؔ، سعدیؔ اور دوسرے مشاہیر ایرانی شعراء نے پابند شاعری ہی کو اپنے فن کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اور اُن کا کلام صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ہمارے اس زمانہ کی آواز معلوم ہوتا ہے۔

ہر زبان کا ایک خاص مزاج ہے' اُردو اور فارسی شاعری کا مزاج شاعری میں قافیہ اور ردیف سے بڑی مناسبت رکھتا ہے' ہر شاعر اپنی زبان کا مزاج شناس ہونا چاہیئے!

مذہب میں' شعر و ادب میں اور اخلاق و معاشرے میں جائز پابندیوں سے گریز کی راہیں تلاش نہیں کرنی چاہئیں' ان پابندیوں سے ہی سیرت و کردار' اور دل و دماغ جلا پاتے ہیں اور فن کے جوہر کُھلتے ہیں۔ (م - ق)

---

[1] یہ مصرعہ کمزور ہے (م - ق)

دو آتشہ

بادۂ کہنہ و نو

شفقت کاظمی:۔

شکوہ تو کوئی تیرے جہاں سے نہ تھا مجھے — یہ اور بات ہے کہ نہ راس آسکا مجھے
منزل پہ آگیا ہوں مگر یہ نہ پوچھئے — کن سخت مرحلوں سے گزرنا پڑا مجھے
قسمت سے وہ نگاہ بھی تیور بدل گئی — لے دے کے جس نگاہ کا تھا آسرا مجھے

راہی بلند شہری:

محبت میں کسی پہلو سکونِ دل نہیں ملتا — بہ آسانی تو کیا ملتا، بہ صد مشکل نہیں ملتا
ہمارے پاس مانا کچھ نہیں، ہم دل تو رکھتے ہیں — سبھی کچھ ہے تری محفل میں لیکن دل نہیں ملتا
جو طوفانوں کے طالب ہوں وہ ساحل پر پہنچتے ہیں — جنہیں ساحل کی حسرت ہو انہیں ساحل نہیں ملتا

حافظ سہارن پوری:۔

ہماری زندگی میں آج وہ مشکل مقام آیا — جہاں سے لوٹ کر ہر ایک بے نیلِ مرام آیا
مرے ساقی! بتا کیا ہے یہ تیرا نظمِ میخانہ — کوئی سیراب آیا، اور کوئی تشنہ کام آیا
ہماری راہ میں کانٹے بکھیرنے والو! — تمہاری راہ میں آنکھیں بچھاتے ہیں ہم

نظر برنی:۔

کیا ہوا لب اگر نہیں ہلتے — آنکھ خود اک زبان ہوتی ہے

مظہر جلیل شوق:۔

ہم تو آباد فضاؤں کے تمنائی ہیں — اس خرابہ کا بھی ہوگا کوئی آخر معمار
سب کی نظریں ہیں یہاں ایک اشارہ کی طرف — کوئی مجبور ہے اے دوست! نہ کوئی مختار

ہے اگر عشق تو افسردہ دلی کیا معنی!
پھر اسی جذبۂ بےتاب کو اے شوق ابھار

صدیق قریشی:۔

کسی کے درد کا درماں نہ ہو تو زندگی کیا ہے — جو اپنی ذات تک محدود ہو وہ آدمی کیا ہے
ومن یرجوا لقاء ربہ پہ غور کر نادان! — لقائے رب سے بڑھ کر اور معراجِ خودی کیا ہے

اُستاد نظام رامپوری:۔

تم سے کچھ کہنے کو تھا بھول گیا — ہائے! کیا بات تھی کیا بھول گیا
حالِ دل سن کر نہ دینا اس ستم گر کا جواب — اک خموشی ہو گئی دفتر کے دفتر کا جواب
یوں غیر ستائیں مجھے اور کچھ نہ کہوں میں — منہ مجھ کو تمہارا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
آج کہتے ہو مدعا کہیے — اس تغافل کو کیجیے، کیا کہیے

نعتِ رسولؐ

عروج زیدی

مثال بے مثالی تھا جو فطرت کے خزینے میں
وُہی دُرِّ یتیم بحرِ رحمت ہے مدینے میں

یہاں کچھ لطف مرنے میں نہ کوئی کیف جینے میں
حیات و موت کو آواز دی جائے مدینے میں

مرے پہلو میں دل ہے اور دل میں عشق احمدؐ ہے
انہیں کے نام کے سکّے ہیں گویا اس دفینے میں

مجھے اپنے خدا کی ناخدائی پر بھروسہ ہے
مری کشتی سما سکتی نہیں طوفاں کے سینے میں

یہاں کی خاک پر خود عظمت مستقدیس نازاں ہیں
فرشتے بھی ادب کے ساتھ آتے ہیں مدینے میں

خدا کا عشق بھی ہے اور عشقِ شاہِ والا بھی
مئے دو آتشہ ہے میرے دل کے آبگینے میں

چلا ہوں پڑھ کے بِسمِ اللّٰہِ مَجرٖیھَا وَ مُرسٰیھَا
تلاطم کو بھی رکھ سکتا ہوں میں اپنے سفینے میں

عروج! اس درِ ن کو میں حاصلِ کونین کہتا ہوں
شہِ بطحاؐ کی اُلفت دل میں ہو قرآں سینے میں

دوستو!

زکی کاکانی

جب فائدہ اسی میں سراسر ہے دوستو
چڑھ جائیں دار پر بھی تو کیا ڈر ہے دوستو

ہر سمت ایک شورِ تقاضا ہے دم بدم
دورِ حیات گردشِ ساغر ہے دوستو

دیتا ہوں میں کسی کے کرم کو ستم کا نام
مجھ سے بڑا بھی کوئی ستم گر ہے دوستو

ٹوٹا مری نظر سے زمان و مکاں کا کفر
اب ساری کائنات مرا گھر ہے دوستو

ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتا یہ شرف
جو راہبر ہے بس وُہی رہبر ہے دوستو

فرشِ زمیں پہ اس طرح پھیلی ہے چاندنی
جیسے یہ کچھ فقیر کا بستر ہے دوستو

نوائے سروش

ماہر القادری

یارانِ ہوس وقت کے دھارے پہ رواں ہیں
اے حسن! ترے عاشقِ جاں باز کہاں ہیں

گونجے گا کسی روز یہاں نعرۂ تکبیر ——
یہ قصر یہ ایوان جو محرومِ اذاں ہیں

مظلوم نہ دیں عدل و مروت کی دُہائی
شاہوں کی طبیعت پہ یہ الفاظ گراں ہیں

اے صاحبِ سجادۂ و تسبیح ادھر دیکھ
ہم بھی تو نظر کردۂ صاحب نظراں ہیں

ہو روس کی تہذیب کہ یورپ کا تمدن
یہ کچھ بھی نہیں کارگہِ شیشہ گراں ہیں

روحِ انتخاب

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ بحیثیت ایک اخلاقی نصب العین اور نظامِ سیاست اسلام ہی وہ سب سے بڑا جزوِ ترکیبی تھا جس سے مسلمانانِ ہند کی تاریخِ حیات متاثر ہوئی اسلام ہی کی بدولت مسلمانوں کے سینے ان جذبات و عواطف سے معمور ہوئے جن پر جماعتوں کی زندگی کا دار و مدار ہے اور جن سے متفرق اور منتشر افراد بتدریج متحد ہو کر ایک متمیز و معین قوم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں بلکہ ان کے اندر ایک مخصوص اخلاقی شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ دنیا بھر میں شاید ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہوا ہے۔ دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی اسلامی جماعت کی ترکیب صرف اسلام ہی کی رہینِ منت ہے کیونکہ اسلامی تمدن کے اندر ایک مخصوص اخلاقی رُوح کارفرما ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندرونی اتحاد اور اُن کی نمایاں یکسانیت ان قوانین و ادارات کی شرمندۂ احسان ہے جو تہذیبِ اسلامی سے وابستہ ہیں

کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ ہے اور آپ یہی چاہتے ہیں کہ ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں لیکن اس کے نظامِ سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا؟ یہ دعویٰ کہ مذہبی واردات محض انفرادی اور ذاتی واردات ہیں اہلِ مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور ہی یہی تھا کہ وہ ایک مشربِ رہبانیت ہے جس نے دُنیائے مادیات سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالمِ رُوحانیت پر جمالی ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وارداتِ مذہب کی حیثیت، جیسا کہ قرآن پاک میں اُن کا اظہار ہوا ہے۔ اس سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہیں جن کا تعلق صرف صاحبِ واردات کے اندرونِ ذات ہو اور اس کے باہر اس کے گرد و پیش کی معاشرت پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جس کے اولین نتیجے سے ایک ایسے نظامِ سیاست کی تاسیس ہوتی ہے جس کے اندر قانونی تصورات مضمر تھے اور جن کی اہمیت کو محض اس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنیاد وحی و الہام پر ہے — لہٰذا اسلام کا مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے جو خود اس کا پیدا کرتا ہے، الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کو ترک کرنا بھی لازم آئے گا میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحہ کے لئے بھی کسی ایسے نظامِ سیاست پر غور کرنے کے لئے آمادہ ہو گا جو کسی ایسے وطنی یا قومی اُصول پر مبنی ہو جو اسلام کے اصولِ اتحاد کے منافی ہو۔

سیاست کی جڑ انسان کی رُوحانی زندگی میں ہوتی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اسلام ذاتی رائے کا معاملہ نہیں بلکہ وہ ایک سوسائٹی ہے، یا پھر سوک چرچ۔ سیاست میں میری دلچسپی بھی دراصل اسی وجہ سے ہے۔ آج کل ہندوستان کے اندر سیاسی تصورات جو شکل اختیار کر رہے ہیں وہ آگے چل کر اسلام کی ابتدائی ساخت اور نوعیت پر غالباً اثر انداز ہوں گے، میں یورپ کی وطن پرستی کا مخالف ہوں اس لئے نہیں کہ اگر اسے ہندوستان میں نشو و نما پانے کا موقع ملے تو مسلمانوں کو مادی فوائد کم حاصل ہوں گے۔ میری مخالفت تو اس

بنا پر ہے کہ میں اس ملک کے اندر ملحدانہ مادیت پرستی کے بیج دیکھتا ہوں جو میرے نزدیک انسانیت کے لئے ایک عظیم ترین خطرہ ہے۔ حب الوطنی بالکل طبعی صفت ہے اور انسان کی اخلاقی زندگی میں اس کے لئے پوری جگہ ہے۔ لیکن اصل اہمیت اس کے ایمان، اس کی تہذیب اور اس کی روایات کو حاصل ہے، اور میری نظر میں یہی اقدار اس قابل ہیں کہ انسان انکے لئے زندہ رہے اور انہی کے لئے مرے، نہ زمین کے اس ٹکڑے کے لئے جس سے اس کی روح کو کچھ عارضی ربط پیدا ہو گیا ہے۔

(علامہ اقبال ــــ خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم لیگ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء وآل انڈیا مسلم کانفرنس ۱۹۳۲ء

ہماری نظر میں

مخدوم جہانیاں جہاں گشت رح

از:- محمد ایوب قادری (ایم۔اے) ضخامت ۳۰۴ صفحات، قیمت مجلد سات روپے غیر مجلد ساڑھے چھ روپیہ، ملنے کا پتہ:- ادارۂ تحقیق و تصنیف ۱۴/۱ وحید آباد کراچی ۱۸

حضرت جلال الدین مخدوم جہان جہانیاں گشت بخاری رحمۃ اللہ علیہ آٹھویں صدی ہجری کے مشہور صوفی بزرگ گزرے ہیں جن کی تبلیغ و تربیت سے اُچ کے نواح میں اور سندھ و گجرات کے علاقہ میں اسلام پھیلا ہے اور مغربی پنجاب کے متعدد غیر مسلم قبیلوں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے۔ جناب محمد ایوب قادری (ایم۔اے) نے انہی مخدوم صاحب کے سوانح حالات بڑی تحقیق و تدقیق کے ساتھ پیش کئے ہیں۔

یہ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں بر صغیر پاکستان میں اسلام کے داخلہ سے لے کر تغلق خاندان تک کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے اور صوفیائے کرام کی تبلیغی مساعی کا تذکرہ ہے۔ دوسرے باب میں سہروردی سلسلہ کے حالات درج ہیں، تیسرے باب میں مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی پیدائش، تعلیم و تربیت، اور بیعت و خلافت وغیرہ کا حال ہے، باب چہارم میں آپ کے سفر ـــــ مکہ، مدینہ، یمن، عدن، دمشق و لبنان، مدائن، شوکارہ، بصرہ و کوفہ، شیراز، تبریز، خراسان و بلخ، سمرقند، گازرون، لہسہ، بحرین و قطیف لحد، غزنین وغیرہ ـــــ کی تفصیل ہے، باب پنجم میں بتایا گیا ہے کہ حضرت مخدوم کے کن بادشاہوں سے تعلقات رہے اور سلطان محمد تغلق کے عہد میں آپ کا تقرر شیخ الاسلام کے منصب گرامی پر ہوا ـــــ باب ششم میں آپ کے رشد و ہدایت کا، باب ہفتم میں درس و تدریس کا اور باب ہشتم میں آپ کی تصانیف و ملفوظات اور علمی آثار کا ذکر ہے۔ شہرہ آفاق سیاح ابن بطوطہ بھی حضرت مخدوم کی خدمت میں حاضر ہوا ہے، اس کا حال بھی اس کتاب میں ملتا ہے۔

مشائخ و صوفیا کے تذکروں میں عام طور پر تصرفات اور کرامات کا ذکر ہوتا ہے اور اس باب میں بڑے مبالغے کئے جاتے ہیں محمد ایوب قادری نے اس روشِ عام سے ہٹ کر یہ کتاب لکھی ہے اور خوارقِ عادات کی بجائے صاحبِ تذکرہ کے نیک عادات اور بشری سیرت کو پیش کیا ہے!

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت قدس سرہٗ کے نام سے ایک سفرنامہ منسوب ہے، تذکرہ نگار نے بتایا ہے کہ یہ سفرنامہ قطعاً وضعی اور جعلی ہے اور حضرت مخدوم کی ذات سے اس کی نسبت بالکل غلط ہے ـــــ یہ جو آنولہ، دیوبند، رام پور، یوپی، دہلی اور دوسرے مقامات پر "قدم شریف" ملتے ہیں، ان کے بارے میں بھی فاضل مورخ نے لکھا ہے کہ ان "قدم شریفوں" کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔

"مخدوم سے دریافت کیا کہ حدیث ـــــ من لیس لہ شیخ فشیخہ الشیطان
اس کے بارے میں حضرت کی کیا رائے ہے، حضرت مخدوم نے فرمایا کہ یہ حدیث صحاح کی ہے۔" (ص ۱۵۱)

حیرت ہے کہ کسی کا یہ قول "حدیث" کے نام سے صوفیا میں مقبول و مشہور ہو گیا ــ یہ قول درایت و روایت کے اعتبار سے بھی حدیث نہیں ہو سکتا ہے جناب محمد ایوب قادری نے ’دو سو‘ کتابیں اس ایک کتاب کے لئے مطالعہ کی ہیں اور اس طرح خوشہ خوشہ کر کے یہ خرمن جمع ہوا۔

نقوشِ زنداں

از:- مولانا محمد علی صدیقی، ضخامت ۳۰۴ صفحات (مجلد، رنگین گرد پوش) قیمت پانچ روپے پچاس پیسے
ملنے کا پتہ:- مکتبہ قاسمیہ رنگپورہ روڈ، سیالکوٹ

حضرت مولانا محمد علی صدیقی کو تحریکِ ختمِ نبوت کے سلسلہ میں قید و بند کی سعادت حاصل ہوئی، اس زمانہ میں انھوں نے مختلف احباب کے نام جو خطوط لکھے تھے، "نقوشِ زنداں" انہی کا مجموعہ ہے، مولانا موصوف کے یہ خطوط بڑے اثر انگیز ہیں اسلام کے بنیادی مسائل، ختمِ نبوت، مسئلہ ارتداد، توحید و رسالت، مقامِ نبوت اور احسان و استحسان پر دل نشین تبصرہ ہے اور مختلف آیاتِ قرآنی اور ارشاداتِ نبوی کی تشریح کی گئی ہے! فراستِ مومن، اخلاص اور دینی بصیرت ایک ایک سطر سے نمایاں ہے۔

"دراصل گھبرا لینے کی چیز مصائب نہیں معاصی ہیں" (ص۸) تنہا یہ ایک جملہ اپنی جگہ علم اخلاق کی کتاب ہے! ایک اور نمونہ:۔

"بہا بانی تو سب ہوتے ہیں مگر ہر آہوئے صحرائی کا خون مشک اذفر نہیں ہوتا، اگلی وفاداگی
پر ہزار فرزانگیاں قربان، جنھوں نے اسلام کو دنیا میں پیش کیا اور اس کی خاطر جانوں اور
مالوں کی بازی لگادی، کیسے عواقب سے بے خبر تھے اور کیسے نتائج سے بے پروا"

دوچار جگہ کھٹک بھی پیدا ہوئی مثلاً:۔

"مولانا قاسم العلوم نے تحذیر الناس میں دعویٰ کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ
گرامی وصفِ نبوت کی موصوف بالذات ہے اور دوسرے انبیاء موصوف بالعرض ہیں،
سب کی نبوت آپ کا فیض ہے، اور آپ کی نبوت کسی کا فیض نہیں ہے"۔ (ص۳۷)

صاحبِ مکتوبات کو مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی تائید نہیں کرنی چاہیئے تھی! سچی بات یہ ہے کہ ہر نبی مستقل بالذات نبی تھا اور اسے اللہ تعالیٰ نے کسی دوسرے نبی کے فیض اور واسطہ کے بغیر نبی بنایا تھا، اسی قسم کی مبالغہ آمیز مدح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا ہے!

"ایک جانب نماز پڑھنے کے لئے جانماز بچھا ہوا ہے" (ص۲۲۵) "جانماز" بالاتفاق مونث ہے ——————

"نقوشِ زنداں" کوئی شک نہیں ایمان افروز مکتوبات کا گلدستہ ہے، جس کے مطالعہ سے اللہ اور رسولؐ اور دین و شریعت سے تعلق مضبوط ہوتا ہے۔

انشاءِ ماجد حصہ اوّل

از:۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی، ضخامت ۳۰۴ صفحات (مجلد رنگین گرد و پوش) قیمت:۔ پانچ روپے
ملنے کا پتہ:۔ نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ۔

مولانا عبدالماجد دریاآبادی صاحبِ طرز ادیب ہیں، اُن کی تحریروں میں زبان کا چٹخارہ اور ادبی جاذبیت ہوتی ہے، خاص طور سے طنز نگاری کے تو وہ بادشاہ ہیں، مغربی زندگی پر بھرپور طنز کرنے میں موصوف اکبر الٰہ آبادی کے وارث و جانشین اور ترجمان و ہم نوا ہیں! مولانا موصوف کے مضامین چند سال قبل "مقالاتِ ماجد" کے نام سے شائع ہوئے تھے، اب وہ نظرِ ثانی اور ترمیم و اضافہ کے بعد "انشاءِ ماجد" کے نام سے منظرِ عام پر آئے ہیں!

"انشاءِ ماجد" میں مقالے ہیں، کتابوں کے مقدمے اور تبصرے ہیں! ہر مضمون دلچسپ ہے اور اس قابل ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے! مولانا دریاآبادی نے سچ مچ نثر میں شاعری کی ہے! اخلاق و نیکی کے غلبہ کا یہ عالم ہے کہ مثنوی "زہرِ عشق" پر مقدمہ لکھا اور "سوادِ ہوس" سے شرم و حیا اور اخلاق و شرافت کے نکتے پیدا کئے!

"انشاءِ ماجد" کے چند اقتباسات:۔

• ——— ہم نے اپنوں کو چھوڑ کر بیگانوں کی تقلید و نقالی شروع کی، بیگانوں نے دیکھتے دیکھتے ہم کو زیر

کر دیا، مجھاڑ جب تک بند ھی ہوئی ہے، تیز سے تیز آندھی میں بھی محفوظ ہے؛ ادھر اس کا مُنھ کھلا، ادھر اس کی ایک ایک سینک ہوا کے ہر جھونکے کے رحم و کرم پہ رہ گئی۔

• ——— ہمیں سابقہ جس علم سے اس دور میں پڑا ہے وہی تو امراض کا مورث ہے، مفاسد کی اصل اور بدبختیوں کا منبع جسے شربت کا نام دیا گیا، وہی جام زہر نکلا جسے رہبر پکارا گیا، وہی راہزن ثابت ہوا۔ جس نظام کو ہم نے نام "علم و تعلیم" کا دے رکھا ہے، وہی تو عین جہل ہے، یہ تو عین وہی علم ہے جس کا مقصود دلوں میں حُبِّ دُنیا کو پختہ و راسخ کرنا ہے، خیالِ عقبیٰ و آخرت کے لئے اس تعلیم کے نصاب میں کوئی جگہ نہیں، نصابِ تعلیم کا فلسفہ خدا اور رسولؐ کے اعتقاد سے نا آشنا!"

• ——— "اکبر کے کلام سے بھی اور اکبر کی ذات سے بھی خوش نصیب تھا کہ اتنی مدت تک موقع استفادہ کا ملا، بدنصیب تھا میں کہ موقع سے پورا فائدہ نہ اٹھایا"۔

• ——— "سنہ ۱۲ اور سنہ ۲۱ میں عارف رومی کی مشہور و معروف مثنوی کی دُھن میرے اُوپر سوار تھی، اکبرؔ کی خدمت میں اس کا تذکرہ کیا، ایک بار کیا، دوبار کیا جب تیسری بار کیا تڑ سے بول اٹھے کہ اچھا یہ تو فرمایئے اللہ میاں بڑے ہیں یا مولانا روم! میں نے کھسیانے ہو کر کہا "اللہ میاں"۔ بولے میں تو آپ کی گفتگو سے یہی سمجھا تھا کہ شاید مولوی رومؒ بڑے ہیں، جب سے آپ آئے ہیں انہیں کا ذکر کر رہے ہیں، اللہ میاں کا نام میں نے ایک بار بھی نہیں سُنا۔ میں تو سوچ میں پڑ گیا تھا کہ اللہ میاں نے آپ کی رہنمائی مثنوی تک کی یا مولوی رُومؒ آپ کو اللہ تک لے آئے! ——— انتہا یہ ہے کہ ایک بار جب ذکر رسولؐ شروع ہوا تو اسے بھی دو ہی چار منٹ بعد حضرت اکبرؔ نے اپنے اس فقرے پر ختم کر دیا ——— جی ہاں! ہمارے اللہ کی قدرت کا کیا کہنا، کیسے بے نظیر اور بے مثال انسان پیدا کر دیا" ——— یہ حد تھی غلبۂ توحید کی"۔

• ——— بعض ان مشاہیر میں اتنے مشہور کہ ان کا تعارف بھی اُن کی توہین! بعض ایسے گمنام کہ اتنی تعریف و تعارف کے بعد بھی مجہول کے مجہول!

بعض مقامات کھٹکے بھی!

"سب سے گہرا دام لفظ "ترقی" میں ہے (صفحہ ۱۱۳)" "چال" کے ساتھ تو "گہری" بولتے ہیں مگر "دام" کے ساتھ عام طور پہ "گہرا" یا "اُتھلا" نہیں بولتے! پھر "ترقی میں ہے" یہ بھی محلِ غور ہے، "فلاں بات میں گہرا دام ہے" اس طرح کون بولتا اور لکھتا ہے ——— "اودھ کی سرزمین پر بہار کی محبت و عظمت کا تخم پڑا" (صفحہ ۱۸۳) "پڑا" اور اس کے ساتھ "تخم پڑا" کھٹکتے ہیں! ——— "اور دفترِ ہمدرد کا مرکز میں سب کہیں کے مسلمان اکٹھے ہوتے رہتے تھے" (صفحہ ۱۸۶) "سب کہیں کے" فصیح نہیں ہے ——— "مُصنف صاحب کو "معلم" کے کن مظالم سے پالا ہوا تھا" (صفحہ ۲۲۱) یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے کہ "پالا پڑا تھا" کی جگہ "پالا ہوا تھا" چھپ گیا۔

"انشاء ماجد" بلند پایہ ادبی کتاب ہے، نئے لکھنے والے کو خاص طور سے اس کتاب کو پڑھنا چاہیئے بلکہ اسے دلیلِ راہ بنانا چاہیئے کہ بات یوں کہی جاتی ہے، مفہوم اس انداز سے ادا کیا جاتا ہے اور الفاظ اس سلیقہ کے ساتھ برتے جاتے ہیں۔

دلیلِ عزا

از :۔ علامہ الحاج مرزا احمد علی امرتسری، ضخامت ۲۸۴ صفحات۔ قیمت :۔ چھ آنہ (خرچ ڈاک علیحدہ)

ملنے کا پتہ :۔ ادارۂ معارفِ اسلام (رجسٹرڈ) ڈبی بازار لاہور

اس کتاب میں گریہ و بکا، جزع و فزع، نوحہ، بین، تعزیہ، ذوالجناح، سیاہ لباس، رونے پیٹنے، گریبان پھاڑنے وغیرہ مراسم و مظاہرِ عزا کے جواز پر دلیلیں لائی گئی ہیں، اور اپنے خیال میں فاضل مصنف نے اس طرح شہدائے کربلا کی محبت کا ثبوت دیا ہے، اور دین کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے!

جن مراسمِ عزا کی اس کتاب میں تائید و حمایت کی گئی ہے ان میں واضح طور پر دینی قباحت پائی جاتی ہے اور کتاب و سنت اور خود اہلِ بیت کرام کے اُسوہ سے اُن کی تائید نہیں ہوتی، اب رہی کتاب و حدیث سے نکتہ آفرینی تو جو لوگ "سماع و موسیقی" کے قائل ہیں، وہ یہ تک کہہ دیتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کا جو ذکر آیا ہے، تو اُس کے چپوؤں سے جو آواز نکلتی تھی اُس سے "موسیقی و غنا" کی اباحت بلکہ استحباب ثابت ہوتا ہے ——

ع ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے!

اس کتاب کا بھی یہی رنگ ہے۔

کسی غم پر آنسوؤں کا نکل آنا یا بلیساختہ آہ و فریاد کا سرزد ہو جانا اس سے کون بدبخت روکتا ہے، ایسا ہونا تو فطرت کے مطابق ہے!

سرایئے کہ رخشد بہ ویرانہ خوش تر
زچشمے کہ پیرایۂ نم نہ دارد!

کسی حادثۂ غم پر بے اختیاری کے عالم میں کوئی شخص اپنا گریبان چاک کر دے یا سر و سینہ پر اُس کے ہاتھوں کی ضرب پڑ جائے، تو یہ ایک اضطراری کیفیت ہے جو کوئی قانون اور دستور نہیں بن سکتی!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں کتنے صحابہ شہید ہوئے تھے، ان کی شہادت کو نہ تو "یومِ غم" قرار دیا گیا کہ سال بہ سال اُس کی برسی منائی جائے، نہ اُن کی قبروں کی شبیہیں بنائی گئیں اور نہ اُن کے لئے گلی کوچوں میں ماتم کیا گیا، کربلا کے خونیں حادثہ کے بعد خود اہلِ بیت کرام نے اس قسم کے ماتم و غم کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا! یہ تمام باتیں بعد کے لوگوں کی نکالی ہوئی ہیں، ان کو "محبتِ اہلِ بیت" اور "شہدائے کربلا کے غم" سے منسوب کرنا، غلط قسم کی نسبت ہے! اب رہا کوئی اضطراری واقعہ تو اسے قانون، دستور اور مستقل شعائر کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔

مشرکانہ رسوم اور بدعات پر نکیر کا تعلق فرقہ واریت سے نہیں ہے جس سے شیعیت اور سُنیت کو منسوب کیا جائے، جو چیز شرک اور بدعت ہے، وہ کسی ایک بھی مسلمان فرقہ کے نزدیک مباح اور مستحب نہیں ہو سکتی اور نہ ہونی چاہیئے، عُرس و فاتحہ اور میلاد و قیام کے نام پر بعض سُنی مسلمان جو کچھ کرتے ہیں، اُس پر بھی اہلِ حق کی جانب سے کھل کر نکیر کی جاتی ہے، اور عزا کے نام سے جو رسمیں جاری ہو گئی ہیں اُن پر بھی ٹوکا جاتا ہے! اگر غلط رسوم و مظاہر کو کچھ لوگ یا کوئی گروہ اپنا مسلک و شعار بنالے، تو اُن کے ایسا کر لینے سے وہ غلط رسم دینی شعار تو نہیں بن جاتی، ناحق بات پر نکیر و احتساب کے دل شکنی اور افتراق نہیں

کہا جا سکتا!

جو جماعتیں اپنے کو اہل سنت والجماعت سے منسوب کرتی ہیں ان میں خوش قسمتی سے ایسے حق پسند گروہ پائے جاتے ہیں جو شرک و بدعات پر نکیر کرتے ہیں مگر شیعہ حضرات میں کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جو غلط قسم کے رسوم و مظاہر پر احتساب و نکیر کا فرض انجام دے، اس لئے ان کے یہاں بدعات و محدثات کے انبار لگتے چلے گئے ہیں، اور اصلاح کی طرف ذہن و فکر مائل ہی نہیں ہوتے غلو بدعت کی حد ہو گئی کہ حضرت قاسم کی "مہندی" تک کو جو خالص ہندوستانی ایجاد ہے، اس کتاب میں سند جواز عطا کی گئی ہے! جب دینی مسائل میں فکر و نظر کی کمی کا یہ عالم ہو جائے، تو کوئی کہے بھی تو کیا کہے!

"إِنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ" اور "يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِن مَّحَارِيبَ وَتَمَاثِيلَ" سے تعزیہ، شبیہ اور ذوالجناح کے جواز پر دلیل لانا کس قدر اَنمل بے جوڑ بات ہے! قبروں، روضوں اور ضریحوں کی شبیہیں بنا کر انہیں راستوں میں گشت کرانا، انہیں چومنا، سلام کرنا، مرادیں مانگنا اور ان پر چڑھاوے چڑھانا، اس کے لئے آخر کوئی دلیل، کوئی حجت، کوئی مثال؟ پھر ان غلط قسم کے مظاہر کے نہ صرف درست بلکہ باعث ثواب ہونے پر کس قدر اصرار اور شدت ہے، یہاں تک کہ اس کی دعوت دی جاتی ہے کہ تمام مسلمان ان بدعات میں شریک ہو کر "اتحاد بین المسلمین" کا ثبوت دیں! واہ!

؎ خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

اور دیکھئے

"حضورؐ نے امام حسنؓ کو کندھے پر اٹھایا، کسی نے کہا صاحبزادے کیسی اچھی سواری پر تو سوار ہو، حضورؐ نے فرمایا سوار بھی تو اچھا ہے ——— (مشکوٰۃ) اس طرح کا ایک واقعہ امام حسینؓ سے بھی ہوا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ حضور امام حسینؓ کی سواری کی شبیہ بنے، اس لئے فعلِ رسولؐ ثابت ہوا۔" (ص ۳۸)

اس حدیث سے تو یہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ سے غایت درجہ کی محبت رکھتے تھے اور ہمیں بھی حضرات حسنینؓ سے محبت رکھنی چاہیئے، دوسری بات اس حدیث سے یہ ظاہر ہوتی ہے کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے اور دنیا کے جائز علائق و روابط سے بے تعلقی نہیں پائی جاتی، ہر شخص کو اپنی آل اولاد اور متعلقین سے لگاؤ اور محبت ہونی چاہیئے! ——— اس واقعہ سے یہ آخر کس طرح ثابت ہو گیا کہ ایک گھوڑے کو حضرت حسینؓ کا مرکب فرض کر کے، اس پر خون چھڑکیں، تیر چھیدیں اور اس کا جلوس نکالیں محبت اس قسم کی باتوں کو گوارا کس طرح کر سکتی ہے!

اس عجیب و غریب علم کلام (؟) کا ایک اور نمونہ:—

"ہوا چلی تو پردے کی ایک جانب کھلی حضورؐ نے کہا یہ کیا ہے بی بی صاحبہ نے فرمایا میری گڑیاں ہیں، فرمایا یہ پردار گھوڑا ان کے درمیان کیا ہے؟ بی بی صاحبہ نے کہا سلیمان علیہ السلام کے گھوڑے پردار تھے" (ترجمہ بحوالہ مشکوٰۃ) ——— پس جب ذوالجناح سلیمان علیہ السلام کی شبیہ نبی کے گھر میں حضرت ام المومنین کے ہاتھ سے ہے تو دلدل حسینؓ کی شبیہ کے جواز میں کیا کلام ہے" (ص ۳۹)

اسے کہتے ہیں "قیاس مع الفارق"! اس حدیث شریف سے تو کمسنی میں گڑیاں بنا کر ان سے کھیلنے کی اجازت اور رخصت نکلتی ہے!

اس واقعہ کے اتباع میں کیا صحابۂ کرام اور اہلِ بیت نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ناقہ یا گھوڑے کی کوئی شبیہ بنائی اور اُس کا جلوس نکالا!

"دلیلِ عوام" میں بعض ایسی کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں جو درایت و روایت کے اعتبار سے بہت کمزور ہیں اور کتاب و حدیث سے جو کچھ استنباط فرمایا گیا اور نکتے پیدا کئے گئے ہیں وہ علم و دانش کے ساتھ ایک طرح کا مذاق ہے۔

بُوئے گل از :- کوثر نیازی ضخامت ۱۶۰ صفحات (مجلد رنگین سرورق) قیمت :- ساڑھے تین روپلے
ملنے کا پتہ :- اسلامک پبلیکیشنز شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

مولانا کوثر نیازی ادیب ہیں، صحافی ہیں، مقرر اور شاعر ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں شعر و ادب اور علم و اخلاق کی بڑی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں! صاحب موصوف کا پہلا مجموعۂ کلام "زرِ گل" مقبول ہو چکا ہے، اب اُن کا دوسرا مجموعہ منظرِ عام پر آیا ہے!

جناب کوثر نیازی اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود، شعر ہی نہیں غزلیں کہتے ہیں، اُن کی دینی زندگی اور غزل گوئی کے درمیان کشمکش بھی پائی جاتی ہے۔

؎ کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

مگر انھوں نے "جام و سنداں باختن" کے مقولہ کو سچ کر دکھایا ہے، غزلیں کہی ہیں اور متغزلانہ انداز میں کہی ہیں، جن میں محبت کی گرمی اور جذبات کا سوز ملتا ہے! "بُوئے گل" میں کئی نظمیں بھی شامل ہیں ——— چند منتخب اشعار :-

دھندلا نہ جائے جلوۂ محبوب دیکھنا
اے چشمِ اشکبار ادب کا مقام ہے

خدا بھی مل نہ سکے گا انہیں جو وہ نہ ملے
خدا کا نام بھی لیتے ہیں اُن کے نام کے ساتھ

نازاں ہے جس پہ حُسن وہ حُسنِ رسولؐ ہے
یہ کہکشاں تو آپ کے قدموں کی دُھول ہے

زاہد! خیالِ پیرویٔ مصطفیٰؐ رہے
پھر اس کے بعد تیری عبادت قبول ہے

کچھ نہیں معلوم کیا ہے قصۂ ذات و صفات
تجھ پہ ہم ایمان لائے اے خدائے مصطفیٰؐ!

فطرت کا وہ پیمانِ وفا یاد نہیں ہے
فریاد کہ دُنیا کو خدا یاد نہیں ہے

صیاد! نہ کر نغمہ سرائی کے تقاضے
اب مجھ کو گلستاں کی فضا یاد نہیں ہے

ہم نے دیکھا ہے جہاں میں اک نیا انقلاب
دن نکلنے بھی نہ پایا، شام ہو کر رہ گئی

چند لمحوں کا نہیں ہے عمر بھر کا کام ہے
ہر قدم پر راہِ اُلفت میں عزیمت چاہیے

ہمیشہ سطحِ دریا ایک حالت پر نہیں رہتی
سفینہ تند موجوں سے کبھی ٹکرا بھی جاتا ہے

اے مبتلائے عشرتِ امروز ہوشیار
ہے کھیل دھوپ چھاؤں کا دنیا کہیں جسے

بہ قیدِ نفس کی طاعت جسے گوارا ہو
وہ قدر دانِ شہیدِ فرات کیا ہوگا

نہ آج بازوئے حیدرؓ نہ غیرتِ فاروقؓ
قدم قدم پہ ہیں لات و منات کیا ہوگا

دوستی گر تمہارے بس میں نہ تھی
دُشمنی کا تو حق ادا کرتے

بے آسرا ہیں لوگ سہاروں کے باوجود
تاریکیاں ہیں چاند ستاروں کے باوجود

کتنے اُلجھ گئے ہیں مسائل حیات کے
جب سے تمہارے کاکل پیچاں میں خم نہیں

عشق کا فرض کچھ اس طرح ادا ہوتا ہے
ہر نفس معرکۂ کرب و بلا ہوتا ہے

اپنی رسموں پہ نہ کر شرحِ محبت کا قیاس
دوستی کے لئے دستور جُدا ہوتا ہے

پھولوں کی طلب اور غم دامنِ صد چاک
دُنیا تو کبھی گلشنِ بے خار نہ ہوگی

پھر تیرے نقشِ پا کی طالب ہے
زندگی کی اُداس راہگذر

اب تو اے ظالم زمانے رحم کر
اُن کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے

شغل مے بیہکا نہ موسم رہا
جام کھنکائے تو یادِ دل چھلک گئے

یاد آئیں گی ہماری باتیں
جب کبھی آپ کو فرصت ہوگی

میں قید میں ہوں مگر تخیل پہ کون پہرے بٹھا سکے گا
اُڑا کے لے جائے گی جہاں میں ہوا مرے فکر و فن کی خوشبو

اور کچھ بھی ہو جائے آپ کے فقیروں سے
دوستی کے پردے میں دُشمنی نہیں ہوگی

یہ دردکہ ہے تیری محبت سے عبارت
مرجائیں گے اس درد کا درماں نہ کریں گے

ہر ایک شاخ پہ زاغ و زغن کا قبضہ ہے
نوائے قمری و صوتِ ہزار لے کے آ

دھواں دھواں سی فضا ہے بجھا بجھا ماحول
نئی حیات کے روشن شرار لے کے آ

ہے قہقہوں کے تعاقب میں آنسوؤں کا جلوس
میں جانتا ہوں زمانے کی عشرتوں کا مآل

شبِ سیاہ سے اہلِ سفر نہ گھبرائیں
شبِ سیاہ کی آغوش میں سویرا ہے

گو ترے پیار سے کہ زمانہ بخیل ہے
پھر بھی جو غم ملے وہ توقع سے کم نہ تھے

دُوسرا رُخ :-

دل آپ کا ہے اس کی تقسیم کریں گے
جو بات بھی فرمائیں گے تسلیم کریں گے (ص ۱۹)

شاعر شاید یہ کہنا چاہتا ہے کہ آپ کے سوا دل کے معاملات میں کسی اور کو ہم شریک نہ ہونے دیں گے' دل صرف آپ ہی کا بنا رہے گا ______ مگر مصرعہ اُولیٰ سے یہ مفہوم ٹھیک طرح کہاں ادا ہوا۔

شاید در احمدؐ سے اُڑا لائی ہو صبا سے
چہرے پہ اسی سوچ میں مٹی بھی ملی ہے (ص ۲۲)

کس نے مٹی ملی ہے ؟ شاعر نے یا صبا نے ؟ "سوچ" اس مصرعہ میں محلِ غور ہے !

گردن نہ جھکی آپ کی مخلوق کے آگے
اللہ رے کیا شان حسین ابن علی ہے

"مخلوق" کی جگہ کوئی اور لفظ بادشاہ' حاکم یا بیداد و جفا یا جبر و ملوکیت وغیرہ لانا چاہیئے تھا ______ "مخلوق کے سامنے گردن نہ جھکانا" یہ کوئی خاص تعریف کی بات نہیں ہے۔

وہ آستاں نہیں تو جبیں کس لئے جھکے
وہ در نہیں نصیب تو سجدہ فضول ہے (ص ۳۰)

جبین و سجدہ اور عبادت کی نسبت غیر اللہ سے نہیں ہونی چاہیئے ! اور یہ غزل نعتِ رسولؐ میں ہے۔

ہر رہزن مشتاق جنہیں راہنما ہے　　ان قافلے والوں سے مری راہ جدا ہے

مصرعہ اولیٰ مصرعہ ثانی کے مقابلہ میں خاصہ کمزور ہے۔

مریض معاصی سنبھل جائے شاید　　ندامت کے آنے لگے ہیں پسینے　(صـ۵۵)

"مریض معاصی" نے شعریت کو غارت کر دیا۔

شرافت اس طرح ہو بے سہارا ہو نہیں سکتا　　ہمیں تو ہیں انساں ہو گوارا ہو نہیں سکتا　(صـ۶۵)

مصرعہ ثانی میں کس قدر ناگوار تعقید پائی جاتی ہے۔

جو ہمت ہے تو آ ؤ موجۂ طوفاں سے ٹکرائیں　　کہ ہم سے اور ساحل سے نظارا ہو نہیں سکتا

اس خیال کو دل نشین انداز میں ادا کرنا تھا، مصرعہ ثانی خاص طور سے بے لطف ہے۔

اے عشق اب پناہ ملے گی کہاں تجھے　　وہ یہ بھی کہہ رہے ہیں "محبت کو کم کریں" (صـ۶۸)

اس شعر میں کتنی ناپختگی پائی جاتی ہے۔

اے شیخ! دل صاف یونہی تو نہیں ملتا　　ہم نے اثر رہنے دل آرام لیا ہے　(صـ۷۴)

اس قسم کے شعر انتخاب میں چھانٹ دینے چاہیئے تھے۔

اب میں ہوں اور شکوۂ آلام روزگار　　تیری فضائیں کوچۂ جاناں یہ غم نہ تھے　(صـ۱۰۴)

شعر میں کوئی خاص لطف نہیں!

افلاک سے روتا ہے کوئی اہل زمین پر　　فطرت کا اشارہ ہے یہ برسات نہیں ہے　(صـ۸۶)

بس واجبی سا شعر ہے! مفہوم اور زیادہ وضاحت چاہتا ہے!

اب تیری جفا باعث آزار نہ ہوگی　　ہم سے یہ خطا اے نگہ یار نہ ہوگی　(صفحہ ۸۹)

ایسے شعر نومشقی کے زمانے میں کہے جاتے ہیں۔

حسن ہی حسن نزاکت ہی نزاکت کو ثر　　بت کافر سے مجھے یاد خدا آتی ہے

"نزاکت" آخر کس کی صفت ہے، یاد کی، خدا کی یا محبوب کی ——! دوسرے مصرعہ میں "سے" کا استعمال درست نہیں ہے "آتی" ہے کے ساتھ "سے" یوں بولا جاتا ہے۔

بت کافر سے مجھے بوئے وفا یاد آتی ہے

بت کافر کو دیکھ کر خدا کی یاد آتی ہے، کہا جاتا تو ایک بات تھی۔

باغباں کے طور یہ سمجھا گئے　　فصل گل میں پھول کیوں مرجھا گئے

غزل کا مطلع اور اس قدر سپاٹ!

آپ کی یاد عناں گیر نہ ہو جائے کہیں　　غم منزل مری تقدیر نہ ہو جائے کہیں

مفہوم واضح نہیں ہوا، مبہم رہا۔

سوچتا ہوں کہ ترے اہل جنوں کی فریاد　　شدت گریہ نہ زنجیر نہ ہو جائے کہیں

ایسا ابہام جو اہمال کی حدوں کو چھو رہا ہے۔

"بوئے گل" کی آخری نظم "قیدی" ہے، جس میں بڑا تاثر اور خلوص پایا جاتا ہے ——— چند اشعار:-

رات تاریک ہے فضا چپ چاپ — ہر طرف ایک ہول طاری ہے
جیل کے مختصر احاطے میں — آبشار سکوت جاری ہے
لگ چکے ہیں بڑے بڑے تالے — سامنے آہنی سلاخوں میں
ایسے میں ایک غم کے مارے کو — اپنے بچوں کی یاد آتی ہے
بیتے ایام کے جھروکے سے — اس کی بیوی اسے بلاتی ہے
اُڑ گئی نیند کھو گیا آرام — میرے غم کا ہی تو قیاس کرو
تم کو اپنا نہیں خیال اگر — میرے جذبات ہی کا پاس کرو
ایک آقا کی بندگی چھوڑوں — مان لوں سینکڑوں خداؤں کو
باصد لئے ضمیر پر ترجیح دوں — حسن کی دل رُبا اداؤں کو

اللہ تعالیٰ کے کرم سے جیت شاعر کے ضمیر ہی کی رہی اور وہ اس ابتلاء میں کامیاب رہا۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

جماعتِ اسلامی پر الزامات کا جائزہ

مرتبہ:- محمد یعقوب طاہر، ضخامت ۴۰ صفحات، قیمت فی سینکڑہ ۱۵ روپے ۵۰ پیسے فی پمفلٹ:- ۲۵ پیسے، ملنے کا پتہ:- ادارہ ادب اسلامی سیٹلائٹ ٹاؤن، سرگودھا۔

تحریکِ پاکستان کی مخالفت ——— قائد اعظم کی وفات اور سقوط حیدرآباد پر خاموشی ——— مذہب کا لبادہ اوڑھ کر سیاست بازی ——— پاکستان اور جماعتِ اسلامی کی وفاداری۔ جہادِ کشمیر کی مخالفت ——— خارجہ پالیسی کیسی اور کیوں؟ ——— طاقت سے حصولِ اقتدار کا الزام

یہ اُن الزامات کا خلاصہ ہے جو جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی پر لگائے گئے ہیں، اس کتابچے میں جماعتِ اسلامی کے لٹریچر سے اقتباسات پیش کر کے ان الزامات کو بالکل بے بنیاد اور غلط ثابت کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں جماعت کی دعوت اور طریقِ کار کی مختصر مگر دل نشین و جامع شرح و تفصیل ہے "مخالفت کے مقابلے جماعت کے ہمدردوں اور خیر خواہوں کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے" اس کے بارے میں امیر جماعتِ اسلامی کی یہ نصیحت و تلقین اس کتابچہ کا تتمہ ہے۔ کہ:-

"سخت سے سخت بے ہودہ مخالفت کے جواب میں بھی آپ حدود اللہ سے کبھی تجاوز نہ کریں، ہر لفظ جو آپ کی زبان یا قلم سے نکلے اس پر خوب سوچ لیں کہ وہ خلافِ حق تو نہیں ہے، اور آپ اس کا حساب خدا کے ہاں دے سکیں گے؟ آپ کے مخالفین خدا سے ڈریں چاہے نہ ڈریں، آپ کو تو بہر حال اُس سے ڈرتے رہنا چاہیے۔"

یہ کتابچہ بر وقت آیا ہے، جماعت کے ہمدردوں کو چاہیے کہ اسے ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ملک کے طول و عرض میں پھیلا کر دعوت حق و صداقت اور اتمام حجت کا حق ادا کر دیں۔

فاران کراچی

جلد: ۱۵
شمارہ ۱۱

ایڈیٹر: ماہر القادری
ماہ فروری سنہ ۱۹۶۴ء

ترتیب

چندہ سالانہ
ساتھ روپے

قیمت فی پرچہ
باسٹھ پیسے

مقام اشاعت: دفتر ماہنامہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی نمبر ۱

پرنٹر و پبلشر: مسرور حسین
مطبوعہ: مطبع سعیدی کراچی

Aasim Saeed -64

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقش اوّل

امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ، مجدد الف ثانیؒ رحمہم اللہ تعالیٰ، سے معاذ اللہ کوئی اخلاقی جرم سرزد نہیں ہوا تھا یہ بزرگ دین و اخلاق کے مبلغ و ترجمان تھے، حکومتوں کو ان کی غلط روش پر ٹوکتے تھے، اور ناروا باتوں میں حکمرانوں کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتے تھے حق گوئی اور حق شناسی کے اس جرم میں خدا کے ان نیک بندوں کو عتاب شاہانہ کی بدولت طرح طرح کی مصیبتیں جھیلنی پڑیں، فرد ہو یا جماعت جو کوئی ان نفوس قدسیہ کی روش پر چلے گا اس کے ساتھ یہی سلوک کیا جائے گا، حق گوئی اور سچائی کی راہ کو جو کوئی پُرخطر سمجھتا ہے اُسے چاہیئے کہ وہ کوئی دوسری راہ اور کاروبار اختیار کرے، اس راہ میں تو قدم قدم پر جراحتوں سے سابقہ پڑتا ہے، تاریخ کسی ایک فرد کی بھی نشان دہی نہیں کر سکتی جس نے اصلاح و انقلاب کے لئے آواز حق بلند کی ہو، اور دنیا نے اسے معاف کر دیا ہو، حق و صداقت اور ایثار و قربانی لازم و ملزوم ہیں۔

شرط عشق است کہ تا ایں نہ شود آں نہ شود

امتحان و آزمائش میں پڑنے اور مصیبت و غم اٹھانے کی تمنا ہرگز نہیں کرنی چاہیے، لیکن یہ بلا سر پر آن پڑے تو یہی زحمت اللہ تعالیٰ کی رحمت بن سکتی ہے اور وہ اس طرح کہ زحمتوں، مشکلوں، مصیبتوں اور خطروں میں "تعلق مع اللہ" مضبوط تر ہوتا ہے، ہر آن خدا سے لو لگی ہوتی ہے، آخرت کی بازپرس کا احساس جاگ اٹھتا ہے بلکہ تیز تر ہو جاتا ہے، اس عنوان سے تزکیۂ نفس کا موقع میسر آتا ہے اور آزمائش کی آگ میں تپ کر جو سونا ہے وہ کندن بن جاتا ہے، اور جو مس خام ہے اس میں زر خالص کے خواص پیدا ہو جاتے ہیں۔

وہ جس کا امتحاں لیں، اور جو ہو کامیاب اس میں
ہمارا آپ کا جینا نہیں، جینا اسی کا ہے

امتحان وآزمائش کی یہ بات ہم نہیں کر رہے ہیں، اور یہ نکتہ ہم نے اپنے ذہن سے نہیں تراشا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ

کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ (بس) اتنا کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ "ہم ایمان لائے" اور وہ آزمائے نہیں جائیں گے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی شرح وتفسیر میں فرماتے ہیں:-

"یعنی زبان سے ایمان کا دعویٰ کرنا کچھ سہل نہیں جو دعویٰ کرے امتحان وابتلا کے لئے تیار ہو جائے یہی کسوٹی ہے جس پر کھوٹا کھرا کسا جاتا ہے، حدیث میں ہے کہ سب سے سخت امتحان انبیا کا ہے اس کے بعد صالحین کا، پھر درجہ بدرجہ ان لوگوں کا جو ان کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں۔ نیز امتحان آدمی کا اپنی حیثیت کے موافق ہوتا ہے جس قدر کوئی شخص دین میں مضبوط ہوگا، اسی قدر امتحان میں سختی کی جائے گی!

رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم نے آیت قرآنی اور ارشاد ربانی کے اس مفہوم کو شاعرانہ زبان میں اس طرح ادا کیا ہے:-

طغرائے امتیاز ہے خود ابتلائے دوست

اس کے بڑے نصیب جسے آزمائے دوست

اور "دوست" اپنے چاہنے والوں کو آزماتا ضرور ہے، دنیائے مجاز ہو یا عالم حقیقت ارباب محبت کسی نہ کسی عنوان سے آزمائے جاتے ہیں، ایثار و قربانی کوچۂ محبت کی رسم نہیں بلکہ نہ بدلنے والی سنت ہے اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے اور اس کی راہ میں مصیبتیں اٹھانے والے دنیا والوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ لوگوں کی ان کے بارے میں کیا رائے ہے؟ ان کے کام کو کون سراہتا ہے اور کون نہیں سراہتا، وہ تو اپنا اجر اپنے رب کے سوا اور کسی سے نہیں چاہتے۔ ظاہر ہے کہ راہ حق کی جراحتوں اور قربانیوں کا اجر اللہ تعالیٰ کے سوا اور کون دے سکتا ہے

حق کی دعوت کسی ماحول، وقت اور مقام کی پابند نہیں ہے، دنیا کے جس پردے پر بھی آدمی پایا جاتا ہے دعوتِ حق کا فریضہ انجام دیا جائیگا حضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانے میں قیدیوں کو دعوت دی اور انھیں تلقین فرمائی۔

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝

اے قید خانے کے رفیقو! کئی معبود جدا جدا بہتر ہیں، یا اللہ اکیلا زبردست!

کوئی مانے یا نہ مانے، حالات کیسے ہی ناساز گار اور وقت وماحول کتنا ہی مخالف کیوں نہ ہو تبلیغ حق ہوتی رہنی چاہیئے حق کی پہلی کامیابی اس کا پہنچا دینا (تبلیغ) ہے

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب بادشاہِ وقت (فرعون) کو دعوتِ حق دی تھی، تو ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ یہ اس کے پردے میں دراصل اقتدار پر قبضہ جمانا چاہتے ہیں (قالوا اِنْ ھٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ یُرِیْدٰنِ اَنْ یُّخْرِجٰکُمْ مِّنْ اَرْضِکُمْ بِسِحْرِھِمَا)! اور اقتدار اسے برداشت ہی نہیں کرسکتا کہ کوئی اس کی طرف نگاہ غلط انداز سے بھی دیکھنے کی جرأت کرے! اصلاح وانقلاب کی ہر جد وجہد میں اقتدار کو خطرہ نظر آتا ہے کہ اس کی زد مجھ پر پڑ رہی ہے اور اقتدار چھیننے کی ہوس نے دراصل حق کی دعوت وپیغام کا روپ دھار لیا ہے۔

داعیانِ حق اپنا دل چیر کر تو کسی کو دکھا نہیں سکتے کہ یہ دیکھو اس میں اخلاص وبے غرضی کے سوا اپنی ذات کی منفعت کی کوئی رمق بھی پائی جاتی ہے؟ یہ آئینہ کس قدر مجلّا اور مصفا ہے، اس پر دنیا کے لالچ اور حرص کا کہیں گرد وغبار بھی دکھائی دیتا ہے؟ اپنے پرند سر دل تا قیاس

نہ کرو، یہ دنیا ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہے جو ذاتی منفعت اور شخصی فائدے سے بلند ہو کر حق کی سربلندی کے لئے کام کرتے ہیں۔

کاش !

اللہ اور رسول نے جن باتوں کو گناہ اور حرام قرار دیا ہے، ان پر احتساب ہی کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ عین محاذ جنگ پر کوئی سپاہی شراب پیتا ہوگا تو اس کے ہاتھ سے جام شراب چھیننے کی کوشش کی جائے گی اور اسے بتایا جائے گا کہ مرد مجاہد کا یہ مشرب اور کردار نہیں ہوتا اور ایسی باتیں اُسے زیب نہیں دیتیں

تاریخ میں ایسے فرمانرواؤں کا وجود بھی ملتا ہے جنہوں نے نصیحت و احتساب کرنے والوں کی پند و نصیحت کا اثر قبول کیا ہے اور ان کے ٹوکنے پر بجائے خفگی کی بجائے ندامت محسوس کی ہے، برائی پر احساس ندامت بہت بڑی نعمت ہے، اسی نقطہ سے اصلاح حال کا آغاز ہوتا ہے اور آدمی کے اندر اخلاقی تبدیلی کے امکانات ہر وقت باقی رہتے ہیں مگر جو کوئی اپنے گناہوں اور بداعمالیوں پر اصرار کرتا اور اس کے جواز کے لئے دلیلیں لاتا ہے، اس کا ضمیر مردہ اور بے حس ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اسے اپنی اصلاح کا دھیان ہی نہیں آتا! یہی وہ قلب غافل ہے جس سے پناہ مانگنی چاہیئے۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے ہارون الرشید کو بڑا سخت خط لکھا تھا اور اس کو شدید لہجہ میں زجر و توبیخ کی تھی ہارون الرشید اس خط کو رات کی تنہائی میں پڑھ کر رویا کرتا تھا حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ نے اصلاح و احتساب کا جو فرض انجام دیا تھا شہنشاہ جہانگیر نے بالآخر اُسے مان لیا۔ اسی پاکستان میں حضرت مخدوم جہانیاںؒ مشہور صوفی بزرگ گذرے ہیں، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ سلطان فیروز شاہ پر ان کی صحبت اور تلقین و احتساب کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے نہ صرف یہ کہ خود اپنی ذات سے شریعت کی پابندی کی بلکہ اپنے حدود حکومت میں غیر مشروع افعال کا انسداد کیا، مثلاً قمار بازی بند کرا دی، عورتوں کو قبروں پر جانے سے روک دیا۔ سونے اور چاندی کے برتنوں کے استعمال اور ان پر تصویریں بنانے پر پابندی لگا دی یہاں تک کہ خراج کی آراضی اور معدنیات وغیرہ پر شریعت کے نصاب کے مطابق حصے مقرر کر دیئے۔

کاش! مسلمان ملکوں کے حکمراں کم سے کم سلطان فیروز شاہ ہی بن سکیں اور نیکی و اخلاق کی دعوت دینے والوں اور منکرات پر نکیر و احتساب کرنے والوں کو حریف سمجھنے کی بجائے اپنا دردمند اور خیر خواہ سمجھیں!

ماہر القادری

۱۷ ر رمضان المبارک سنہ ۸۳ھ جمعہ - ۳۱ ر جنوری سنہ ۶۴ء

مولانا ضیاء احمد بدایونی
(ایم اے)

عقیدہ توحید و رسالت

کلام اقبال کی روشنی میں

اس دور الحاد و فتن میں جب کہ برابر اسلامی عقائد اور دین کی ابدی اقدار پر ہر طرف سے ہر طرح کے اعتراضات ہو رہے ہیں۔

از طرفے رخنہ بر دیں می کنند   وز دگر اطراف کمیں می کنند

ہمارے بعض نامور اہل قلم مثلاً مولانا مودودی اور علامہ اقبال نے (کثر اللہ امثالہم) جس قوت سے اسلام کی حمایت کی ہے اس تصور سے ہمارے قلوب جذبات عقیدت سے لبریز ہو جاتے ہیں۔ اس زمانے میں نہ صرف غیر مسلم، بلکہ بعض نام کے مسلمان جس طرح مذہب حق کے منہ آتے اور اس کا استہزاء و استخفاف کرتے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ان معترضین کے یہاں فکر و سنجیدگی کم ہے اور مکابرہ و عناد یا کسی نہ کسی "ازم" کی اندھی تقلید زیادہ۔ ان کی ہفوات سے اسلامی فضا کا مکدر اور مسموم ہونا مسلّم اور علمائے دین پر ان امور کا تدارک لازم۔ لیکن حال میں ہند و پاک کے متعدد تعلیم یافتہ نوجوانوں سے تبادل خیالات کر کے اس امر سے مسرت ہوئی کہ وہ ان بیہودہ اور رکیک اعتراضات کو چنداں وقعت نہیں دیتے۔ اس خصوص میں علامہ اقبال کی تصانیف نے ہمارے منور الفکر نوجوانوں کے دماغوں پر جو صحت بخش اور بصیرت افروز اثر چھوڑا ہے اس سے انکار ممکن نہیں آج کی صحبت میں اسی پر مختصراً اظہار خیال مقصود ہے۔

اقبال پر اردو اور انگریزی (نیز فارسی و عربی) میں لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اور ان کی فکر کے تمام گوشوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ راقم الحروف کے علم میں اس وقت تک علامہ کے سوانح و تعلیمات پر اردو میں (۱۸۴) اور انگریزی میں (۴۲) کتابیں شائع ہو چکی ہیں (یہ تعداد جامع ہرگز نہیں ہے) ان حالات میں یہ توقع کرنا شاید درست نہ ہو کہ اس مضمون میں کوئی نئی بات پیش کی جائے گی۔ سر دست صرف دو امر تحریر ہذا کے محرک ہوئے۔ ایک اپنے مکرم جناب ماہر القادری کی فرمائش کی تعمیل۔ دوسرے دل کے اس جذبۂ شوق کی تکمیل جس کی ترجمانی شاعر نے اس طرح کی ہے ؎

أَعِدْ ذِكْرَ نُعْمَانٍ لَنَا إِنَّ ذِكْرَهُ   هُوَ الْمِسْكُ مَا كَرَّرْتَهُ يَتَضَوَّعُ

(نعمان کا ذکر ہم سے بار بار کرو کیونکہ اس کا ذکر مشک کی طرح ہے جتنی اس کی تکرار کرو گے اتنی ہی خوشبو اور پھیلے گی)

سب جانتے ہیں کہ اقبال کے فلسفے اور شاعری کا محور خودی ہے۔ ان کے تمام مباحث اور تعلیمات کی منتہا یہی مسئلہ ہے خودی کیا ہے۔ اقبال کے نزدیک خودی، انا یا ایگو، ہر شے کی باطنی حقیقت یا جوہر کا نام ہے جو غیر مرئی، ناقابل تقسیم، زمان و مکان کی قیود سے ماوراء اور بے مثل ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہے خودی ہی کا مظہر ہے۔

پیکر ہستی ز آثار خودی ست   ہر چہ می بینی ز اسرار خودی ست

خودی ہر وقت فعال اور متحرک۔ عمل اور ظہور کے لئے آمادہ رہتی ہے۔ کائنات کے تغیرات و تحولات سب کے سب خودی کی ہی فطرت کا مظاہرہ ہیں۔ حیات کا قوی اور موثر ہونا خودی کی قوت پر موقوف ہے۔ ظاہر ہے کہ کبوتر ضعیف و عاجز، اور شاہین قوی و تجاوز کار (AGRESSIVE) ہے۔ جس سے ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ اول الذکر کی خودی ضعیف اور آخر الذکر کی خودی قوی

ہے۔ نہ صرف جاندار ۔ بلکہ بے جان اشیا میں بھی یہی کلیہ کارفرما ہے ۔ مادّے کی قوت مقاومت (Resistance) کون نہیں جانتا ۔ یہ دراصل اس کے اندر خودی کے موجود ہونے کا ثبوت ہے ۔ مادّی اشیا میں بھی ہمیں اختلاج مدارج نظر آتا ہے ۔ مثال کے طور پر کوئلے اور ہیرے کو لیجئے کوئلہ معمولی ضرب سے ٹوٹ جاتا ہے ۔ اس کے برخلاف ہیرا سخت سے سخت چوٹ برداشت کر لیتا ہے ۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک کا باطنی جوہر کمزور اور دوسرے کا مضبوط ہے ۔ یہی جوہر خودی ہے جس کو ہم اس کے مظاہر سے پہچانتے ہیں ۔

انسانی دنیا پر نظر ڈالئے تو خودی کا وجود اور بھی بدیہی اور آشکار معلوم ہوتا ہے ۔ ہر فرد بشر کو براہ راست اپنی خودی کا تیقن ہوتا ہے جو ہر ایک تشکک و وہم سے بالاتر ہے ۔ انسان یوں جس چیز پر چاہے شک کرنے لگے ۔ مگر اپنی ہستی پر شک نہیں کر سکتا ۔ فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ (۱۵۹۶۔ ۱۶۵۰) نے سچ کہا تھا Cogito, ergo sum (میں سوچتا ہوں ۔ اس لئے میرا وجود یقینی ہے) اگر کوئی متشکک کائنات کی ہر چیز پر شک کرے تو اُس سے دریافت کیا جائے گا کہ تمہارا یہ عقیدہ یا مقولہ مشکوک ہے یا نہیں ۔ ظاہر ہے کہ دونوں صورتوں میں اس کو اپنے وہم سے دست بردار ہونا پڑے گا لیکن یہ واضح ہے کہ خودی کا ادعا استدلالی نہیں ۔ بلکہ وجدانی ہے ۔ اقبال خود فرماتے ہیں ؎

اک دانش نورانی اک دانش برہانی
ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

عقل گو آستاں سے دُور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

یہ صحیح ہے کہ خدا نے جو چیز بھی پیدا کی ہے وہ حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ، پھر عقل جو اس کا ایک بیش بہا عطیہ ہے ہرگز بیکار نہیں ہو سکتی ۔ اقبال تسلیم کرتے ہیں کہ عقل زندگی میں ہماری مددگار و مُعین ہے ۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ زیادہ دور تک ہماری رہنمائی نہیں کرتی ۔ زندگی میں ایسے حقائق بھی ہیں جن کا علم ہمیں عقل کی بجائے براہ راست اپنے وجدان سے حاصل ہوتا ہے ۔ اور خودی انہیں حقائق میں سے ایک ہے ۔ جیسا کہ عرض کیا گیا خودی ماورائے عقل ، غیر محدود ۔ اپنے امکانات میں بے نہایت اور عالم محسوسات سے بالاتر ہے ۔ وہ عالم مادی سے ایک ارفع و اعلیٰ عالم سے علاقہ رکھتی ہے ۔ یہ ضرور ہے کہ عالم مادی سے بھی اس کو تعلق ہے ۔ مگر محض اس لئے کہ اُس پر غالب آ کر اپنے لئے نئے نئے امکانات تلاش کرے اور ترقی کا جو قدم اُٹھائے اس میں اپنی ہستی کا اثبات (assertion) پائے ۔ اسی کش مکش اور مقاومت پر غالب آنے میں خودی کی قوت ، اس کی واقعیت اور اس کی انفرادیت مضمر ہے ۔ اسی کو خودی کی غایت سمجھنا چاہیئے ۔

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خودی کی ترقی کی سمت اور اس کے حصول کا طریقہ کیا ہے ۔ اقبال بتاتے ہیں یہ سمت راہ من مانی یا اتفاقی نہیں ہے ۔ اس کی صرف ایک ہی تدبیر ہے کہ محدود خودی (انائے صغیر) زیادہ سے زیادہ لامحدود خودی (انائے کبیر) کا تقرب حاصل کر لے ۔ یہی وصف ہے جس کو حدیث میں تخلقوا باخلاق اللہ (اپنے اندر اللہ کے اخلاق کی جھلک پیدا کرو) سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ بالآخر بندے کو اپنے مولیٰ سے ایک لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے ۔ یہ لگاؤ اقبال کی زبان میں عشق ہے ۔ اور یہی انسان کی بے نہایت ترقی کا ضامن ہے ۔

عشق کی تعبیر شعرا نے اپنے طور پر کی ہے ۔ اطبا نے اپنے اور صوفیہ نے اپنے طور پر ۔ اقبال کے نزدیک عشق تزکیۂ نفس کا ذریعہ بھی ہے اور نتیجہ بھی ۔ انھوں نے عشق کی بے پناہ طاقت اور اس کے لاانتہا امکانات پر بہت کچھ لکھا ہے ۔ اور شاید خودی کے بعد یہی ان کا محبوب موضوع رہا ہے ۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

نقطۂ نورے کہ نام او خودی ست
زیر خاک ما شرار زندگی ست

از محبت می شود پاینده تر
زنده تر سوزنده تر تابنده تر

از محبت اشتعال جوہرش
ارتقائے ممکنات مضمرش

؎ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ ۔

فطرت او آتش اندوزد ز عشق　　عالم افروزی بیاموزد ز عشق
عشق را از تیغ و خنجر باک نیست　　اصل عشق از آب و باد و خاک نیست
در جہاں ہم صلح و ہم پیکار عشق　　آب حیواں تیغ جوہر دار عشق
عشق دم جبرئیل، عشق دل مصطفیٰ　　عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک　　عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہ حرم، عشق امیر جنود　　عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کی مضراب سے نغمۂ تار حیات　　عشق سے نور حیات عشق سے نار حیات

یوں سمجھئے کہ عشق دراصل (Assimilation of every thing noble) کا دوسرا نام ہے۔ یعنی ہر وہ چیز جو اعلیٰ و اشرف ہو اس کو اپنانا۔ عشق کی اس تعبیر کے پیش نظر اقبال پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ جو لوگ ایسے عشق کو عقل کا دشمن اور جذباتیت کا مترادف قرار دیتے ہیں وہ یا تو حقیقت دیکھنے سے محروم ہیں یا قصداً دیکھنا نہیں چاہتے۔ اب ظاہر ہے کہ سب سے اشرف و اعلیٰ باری تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس لئے ہمارے عشق (قرآنی الفاظ میں حُبّ[1]) کا اصل مرکز وہی ہونا چاہیئے۔ اور چونکہ رسول[2] کی ذات، باری تعالیٰ کا مظہر اتم اور اخلاق الٰہی کا کامل ترین نمونہ ہے اور آپ کی محبت محبت[3] الٰہی کی فرع ہے۔ اس لئے اقبال نے آپ کی محبوبیت کو جزو ایمان بنایا۔ فرماتے ہیں

عاشقی آموز و محبوبے طلب　　چشم نوحؑ قلب ایوبؑ طلب
ہست معشوقے نہاں اندر دلت　　چشم اگر داری بیا بنمایمت
عاشقان او ز خوباں خوب تر　　خوشتر و زیبا تر و محبوب تر

اب تک پردے میں گفتگو تھی۔ آگے صاف صاف کہتے ہیں۔

در دل مسلم مقام مصطفیٰؐ ست　　آبروئے ما ز نام مصطفیٰؐ است
طور موجے از غبار خانہ اش　　کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش

ظاہر ہے کہ محبت اتباع کے بغیر، اور اتباع محبت کے بغیر ناقص ہے۔

کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق　　ہست ہم تقلید از اسمائے عشق
کامل بسطام در تقلید فرد　　اجتناب از خوردن خربوزہ کرد

کہا جاتا ہے کہ شیخ بایزید بسطامی نے عمر بھر خربوزہ نہیں کھایا کیونکہ ان کو اس امر کی تحقیق نہ تھی کہ رسول مقبولؐ نے یہ پھل کس طرح کھایا تھا۔ نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت، بلکہ ان خاصان حق کی محبت کو بھی وہ تقاضائے ایمان قرار دیتے ہیں جن کی زندگیاں حضورؐ کی مقدس زندگانی کا نمونہ رہی ہیں۔ اس خصوص میں ان کی نگاہ انتخاب جناب علی مرتضیٰؓ پر پڑتی ہے۔

مسلمِ[4] اول شہ مرداں علیؓ　　عشق را سرمایۂ ایماں علیؓ

[1] وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ خدا کی محبت میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔

[2] چوں خدا اندر نیاید در عیاں ۔ نائب حق اند ایں پیغمبراں (رومی)

[3] چونکہ ہر ایسی محبت و اطاعت خدا کی محبت و اطاعت کی فرع ہے۔ اس لئے "دُوئی" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

[4] حضرت علیؓ کی منقبت میں دوسری جگہ کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں ؎ آں باب مدینۂ محبت ۔ آں نوح سفینۂ محبت
آں ماحی نقش باطل من ۔ آں فاتح خیبر دل من

از ولائے دودمانش زندہ ام / در جہان مثل گہر تابندہ ام
زمزم ار جوشد ز خاک من از وست / مے اگر ریزد ز تاک من از وست
خاکم و از مہر او آئینہ ام / می توان دیدن نوا در سینہ ام
از رخ او فال پیغمبرؐ گرفت / ملت حق از شکوہش فر گرفت
قوت دین مبیں فرمودہ اش / کائنات آئیں پذیر از دودہ اش

علامہ نے عشق کو اس قدر جو اہمیت دی ہے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عشق کے دو پہلو ہیں۔ پہلا محبوب و مطلوب سے وابستگی، دوسرا اس کے ما سوا ہر ایک سے بے تعلقی۔ سچ پوچھئے تو توحید کا عقیدہ انہیں دو بنیادوں پر قائم ہے۔

پہلی بنیاد کی حیثیت ایجابی ہے اور دوسری کی سلبی۔ یہ دونوں حیثیتیں کلمۂ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کے اندر بہ اکمل وجوہ موجود ہیں۔ لا الٰہ کہہ کر ہم تمام معبودان باطل سے بیزاری اور بے تعلقی کا اعلان کرتے اور ہر ما سوا سے اپنا رشتہ توڑ لیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم ہر باطل اقتدار، باطل عقیدہ اور باطل ادارہ کو چیلنج دیتے ہیں۔ یہ کلمہ طیبہ کا سلبی پہلو ہوا۔ اس کو اقبال اکثر فقر سے تعبیر کرتے ہیں۔ دوسرا نام اسی دین کا ہے فقر غیور۔

لیکن فطرت انسانی اس منزل پر قناعت نہیں کر سکتی۔ وہ سلبی نصب العین کی بجائے، ایک ایجابی نصب العین کی طالب ہوتی ہے۔ وہ ایک ایسا معیار چاہتی ہے جس تک پہونچنے کے لئے خودی جد و جہد کرے اور جس کی اطاعت سے زندگی کو سکون اور ہم آہنگی نصیب ہو۔ یہ سکون اور ہم آہنگی الا اللہ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہم ایک ہستی کی جانب رجوع کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جو رحمٰن و رحیم بھی ہے اور قادر و عادل بھی اس کی محبت اور اسی کا ذکر ہمارے اطمینان قلب کا سرمایہ اور اسی کی طاعت و اطاعت ہماری تعمیر حیات کی ضامن ہے۔ یہ کلمۂ طیبہ کا ایجابی پہلو ہے۔ اسی حقیقت کو اقبال نے اس طرح واشگاف طور پر پیش کیا ہے ؎

در مقام لا نیاساید حیات / سوئے الا می خرامد کائنات

اوپر عرض کیا گیا تھا کہ خودیٔ صغیر کی معراج یہ ہے کہ اس کو خودیٔ کبیر کے حضور میں تقرب حاصل ہو جائے۔ یہ معراج صرف لا الٰہ الا اللہ (عقیدۂ توحید) کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے۔ عقل انسانی مدتوں بھٹکتی اور دربدر ماری ماری پھرتی رہی، تب کہیں توحید کی صراط مستقیم ملی۔

در جہان کیف و کم گردید عقل / پے بہ منزل برد از توحید عقل
ورنہ ایں بیچارہ را منزل کجاست / کشتیٔ ادراک را ساحل کجاست
اہل حق را رمز توحید از بر است / در اٰتی الرحمٰن عبداً مضمر است

للّٰہ درّہٗ حیث قال

خودی کا سرّ نہاں لا الٰہ الا اللہ / خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الا اللہ
خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری / نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ
یہ عہد اپنے براہیم کی تلاش میں ہے / صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں / مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ

یہ عقیدہ ہمارے اشرف المخلوق ہونے کا امتحان۔ ہمارے مجد و شرف کا ضامن۔ جد و جہد اور عمل کا وسیلہ اور مساوات انسانی کے حصول کا ذریعہ ہے۔ تمام انبیائے کرامؑ اور سید الانبیا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کی علت غائی یہی ہے۔ یہاں پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے سلبی نصب العین کی مثال زمانۂ قدیم میں برہمنیت اور زمانہ حال میں کمیونزم ہے۔

سعی و عمل کے لئے دستور العمل کہاں سے حاصل ہوا۔ بہ الفاظ دیگر ہم حق تعالیٰ کی مرضی کیونکر معلوم کریں۔ کیا عقل اس باب میں ہماری رہنمائی کر سکتی ہے؟ نہیں۔ کیونکہ یہ مقام اُس کی رسائی سے ماورا ہے، عقل اس کی نسبت نفیاً یا اثباتاً نہ کوئی دعویٰ کرتی ہے نہ کر سکتی ہے، لامحالہ ہمیں اس مقصد کی خاطر وحی الٰہی کی روشنی میں چلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور انبیائے کرام علیہم السلام کی رہنمائی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

حق تعالیٰ پیکر ما آفرید | وز رسالت در تن ما جاں دمید
حرف بے صوت اندریں عالم بُدیم | از رسالت مصرع موزوں شدیم
از رسالت در جہاں تکوین ما | از رسالت دین ما آئین ما

بے شک لا الٰہ الا اللہ ایک حقیقت کبریٰ اور ایک عقیدۂ ثابتہ ہے۔ مگر ہم پر یہ حقیقت محمد رسول اللہ (ارواحنا فداہ) کی بدولت کھلی اس لئے آپ کی ہدایت و رسالت کا اعتراف نہ کرنا کفران نعمت بلکہ کفر صریح ہے۔ ایک جگہ اقبال نے نہایت نکتہ سنجی کے ساتھ اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا ہے کہ خدا نے افراد کو پیدا کیا اور انبیا نے اقوام کو۔

از رسالت ہم نوا گشتیم ما | ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما

رسول کی یہ تمام حیثیتیں مسلم۔ مگر بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ رسول ہادی، پیامبر اور امت کی شیرازہ بندی کرنے والے بے شک ہیں مگر اس کے ساتھ آپ کی ذات اقدس تمام عالم کے لئے اُسوۂ حسنہ بھی ہے، ہر قول، فعل یا تقریر جو رسول سے ثابت ہو وحی کی طرح واجب الاتباع ہے۔

علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست | اصل سنت جز محبت ہیچ نیست
فرد را شرع است مرقات یقیں | پختہ تر از وے مقامات یقیں
ملت از آئین حق گیرد نظام | از نظام محکمے خیزد دوام
قدرت اندر علم او پیدا ستے | ہم عصا و ہم ید بیضا ستے
با تو گویم سر اسلام است شرع | شرع آغاز است و انجام است شرع

حق یہ ہے کہ توحید رسالت کے بغیر اور رسالت توحید کے بغیر ناتمام ہے۔ اسلام ایک شجرہ طیبہ ہے جس کی جڑ توحید اور تنہ رسالت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ درخت کا وجود بیک وقت جڑ اور تنے کا محتاج ہے۔

مُلّا واحدی

جب اتحاد نہیں رہا تھا

اور

جب اتحاد ہو گیا

اورنگ زیب کا زمانہ ہندوستانی مسلمانوں کے انتہائی اقبال اور مسلمان سلطنت کے لیے کمال کا زمانہ تھا جس کی سرحد زوال سے مل جاتی ہے
ںگ زیب عالمگیر کے جانشین اورنگ زیب عالمگیر نہیں ہوتے۔ اکبر اعظم، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب نے سلطنت کی بنیادیں بڑی مضبوط
ی تھیں لیکن جانشینوں کی عیش پرستی اور نفسانیت نے بنیادوں کو ہلا ڈالا۔ جیسا راجہ ویسی پرجا، پرجا میں بھی عیش پرستی اور نفسانیت پھیل
۔ کمزور کا ساتھی کوئی نہیں ہوتا، مسلمان گورنروں نے مرکز سے رشتہ توڑ لیا۔ سب الگ الگ ڈفلی لے بیٹھے اور اپنا اپنا راگ گانے لگے۔
مسلمان امرا کو بادشاہ سے باغی دیکھا تو ہندو امرا نے بھی آنکھیں بدل لیں، اور انگریز، فرانسیسی اور پرتگیزی جو ہندوستان میں تجارت
نے آئے تھے، انہوں نے اس افراتفری سے فائدہ اٹھانے کی ٹھانی۔ نفسانی سیاست انسان کے اندر گدھ کی خصلت پیدا کر دیتی ہے
وں کی طرح ایک طرف سکھ اور ہندو مرہٹے اور فرنگی عیسائی مغل حکومت کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ دوسری طرف مسلمان نظام الملک اور شجاع الدولہ
و حکومت کی نیم مردہ لاش کا تیاپانچہ کر رہے تھے۔ حافظ رحمت خاں، نواب نجیب الدولہ، نواب احمد خاں بنگش اور نواب دوندے خاں کسی کو مرکز
ہمدردی نہیں رہی تھی، اور نہ مرکز پر قبضہ جمانے کی کسی میں طاقت تھی۔ مرکزی حکومت کا برا حال تھا۔ مسلمانوں کی نااتفاقی اور عدم یکجہتی نے ہندوؤں
ز حوصلے بڑھا دیئے تھے اور ہندو مسلمانوں کے عنادنے فرنگی تاجروں میں یہ خیال اور جذبہ ابھار دیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں سے
ی کرانی چاہیئے۔

جو زمانہ اس وقت پیش نظر ہے، اس زمانے میں مرہٹوں کا پیشوا بالاجی تھا۔ مسلمان صوبے مسلمان مرکز سے بھی کٹ گئے تھے اور آپس میں
، دوسرے کی بھی کاٹ کرتے تھے۔ علی ہذا ہندو ریاستیں اور فوجی طاقت والے بھی کچھ متحد نہیں تھے۔ وہ بھی ایک دوسرے کے دشمن تھے
، بالاجی پہان سب کا اثر تھا۔ مسلمان ریاستیں کہیں شیعیت، کا شکار تھیں کہیں سنیت، کا، اور افغان اس فکر میں تھے کہ مغل جلدی سے دم
ہ اور افغان پھر اقتدار پائیں۔ ہندو اس اعتبار سے مسلمانوں کی نسبت عقلمند تھے لیکن بالآخر مسلمانوں نے حالات کا احساس کیا۔ ادھر
ؤں نے بالاجی کا سہارا پکڑا، ادھر مسلمان متحد ہو گئے اور انھوں نے افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ ابدالی کی مدد کرنے اور احمد شاہ ابدالی
مدد لینے کا فیصلہ کر لیا اور بچاؤ کے لئے تیار ہو گئے۔ پانی پت کے میدان میں ایک جنگ لڑی گئی جس میں مسلمان جیتے اور ہندو ہارے، مگر نتیجتاً انگریزوں
مت کھل گئی۔ بہرحال مسلمانوں نے اتحاد کیا تو اللہ نے بھی ان کی سرپرستی فرمائی۔ مسلمان منتشر رہتے ہیں تو اللہ ان سے روٹھ جاتا ہے اور مسلمان
ہو جاتے ہیں تو ہمیشہ سرپرستی فرماتا ہے۔ بڑی معرکے کی جنگ لڑی گئی۔

احمد شاہ ابدالی کا بیٹا تیمور شاہ پنجاب کے بعض حصوں کا حاکم تھا۔ بالاجی نے سوچا کہ اسے پنجاب سے نکالے بغیر ہمارا منصوبہ پورا نہیں ہوگا
چہ بالاجی کا حقیقی بھائی راگھوناتھ کثیر فوج کے ساتھ پنجاب پہنچ گیا۔ پروگرام یہ تھا کہ پنجاب پر قبضہ کر کے افغانستان کو بھی تسخیر کیا جائے۔ تیمور شاہ نے

احمد شاہ ابدالی کے پاس خبر بھیجی۔ احمد شاہ ابدالی فوراً چل پڑا، اور رگھوناتھ احمد شاہ ابدالی کا نام سن کر واپس پونا بھاگ گیا۔ پونا میں کانفرنس ہوئی اور طے پایا کہ رگھوناتھ کی بجائے بالاجی کا چچا زاد بھائی بھاؤ تین لاکھ فوج اور بالاجی کے بیٹے بسواس راؤ کو لے جائے۔ پہلے دلی کی مغل حکومت کا گلا گھونٹے اور بسواس راؤ کو بادشاہ بنائے اور پھر احمد شاہ ابدالی کو دریائے اٹک کے کنارے روکے اور اُسے مغلوب کرے اور کابل قندھار اور غزنی چھینے۔ ادھر دوسری فوج ہندوستان میں مسلمان ریاستوں کو موت کے گھاٹ اتارے گی، اور سکھوں کا خاتمہ کرے گی۔ سکھ راج کا خواب دیکھنے والوں سے بھی ہمیں خطرہ ہے۔ انھیں بھی مٹانا ضروری ہے۔ بھاؤ جوش میں بھر گیا، اور بولا میں غزنی میں بت شکن محمود غزنوی کی قبر کھدواؤں گا، اس کے دانت تڑواؤں گا، اس کی لاش جلواؤں گا اور ثابت کر دوں گا کہ ہندو بے غیرت اور کمینے نہیں ہیں۔ بالاجی نے کہا نہیں، ایسا نہ کرنا۔ افغانستان میں ایسی حکومت کی جائے جیسی اکبر اعظم والے راجہ مان سنگھ نے کی تھی۔ افغانی اب تک مان سنگھ کے مداح ہیں۔ خیر تم روانہ ہو۔ میں خود تمہارے پیچھے پیچھے آتا ہوں۔

الغرض سواروں اور پیدلوں اور توپخانوں کا موجیں مارتا دریا پونا سے چلا اور اس لشکری سیلاب نے ہر نسل اور ہر ذات کے ہندوؤں میں تندی رونما کر دی۔ مردہ انسانوں کے دانت توڑنے کا شوق بھاؤ جی کو بے حد تھا، چنانچہ بیانہ میں، جہاں سورج مل جاٹ کی حکومت تھی، بھاؤ نے بیانہ کے نامور امیروں، حکمرانوں کی قبریں کھدوائیں اور لاشیں نکال کر دانت تڑوائے۔ وہیں خبر لگی کہ احمد شاہ ابدالی ہندوستان میں داخل ہو چکا ہے اور ہندوستان کی تمام افواج [illegible] اور نواب نجیب الدولہ کو اور خفیہ خط نواب شجاع الدولہ کو دیے گئے ہیں۔ ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں بھی جوش ہے مقابلہ سخت ہوگا۔ سورج مل جاٹ نے کہا، جتنا جوش مسلمانوں میں ہے اتنا ہندوؤں میں نہیں ہے۔ مسلمان سمجھ رہے ہیں کہ ہمارے بچاؤ کی آخری کوشش ہے۔

بہرحال مرہٹوں نے ہمت نہ ہاری اور دلی کے قریب پہنچنے تک مرہٹہ فوج زلزلہ بنی رہی

محمد شاہ رنگیلے کا بیٹا احمد شاہ نام کا بادشاہ تھا۔ اس کے دو مسلمان امیر متھرا جاکر ہندوؤں سے مغل شہنشاہی کے خلاف سازشی عہدنامہ کر آئے تھے۔ بھاؤ لال نے قلعے کے چاروں جانب مورچے باندھے اور قلعے پر گولہ باری شروع کی۔ احمد شاہ ابدالی نے مغل بادشاہ احمد شاہ کو لکھا کہ آپ بھاؤ سے صلح کر لیجیے اور قلعہ اُس کے حوالے کر دیجیے۔ تاکہ بھاؤ دلی سے جلدی آگے بڑھے۔ ہم کھلے میدان میں اُس کے مقابلے کو تیار ہیں۔ دلی مقابلے کے لائق جگہ نہیں ہے

دلی اور دلی کے قلعے پر قبضہ ہوگیا تو مرہٹہ سرداروں نے بھاؤ کو یاد دلایا کہ بسواس راؤ کو تخت نشین کرنا ہے مگر بھاؤ کے دل میں کھوٹ تھی اس نے ٹالنے کی غرض سے کہا جب تک ہم احمد شاہ ابدالی اور نجیب الدولہ وغیرہ افغانوں کا قصہ نہ چکا دیں تب تک ہمیں ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہیے جس سے بعد میں شرمندگی ہو۔ فی الحال لال قلعے کے دیوان خاص کی چھت کا سونا اتار لینا کافی ہے اس سونے سے سات لاکھ روپے کی اشرفیاں بالاجی پیشوا کے نام کی ڈھالی گئیں اور پورے ہندوستان میں پھیلائی گئیں۔ اس کارروائی نے سرداروں کو مطمئن کر دیا۔

یہ مضمون میں عماد السعادت، مصنفہ سید علی نقوی کی مدد سے لکھ رہا ہوں، جو ایک سو ساٹھ سال قبل، ۱۲۲۳ ہجری کی کتاب ہے اس کا اردو ترجمہ خواجہ حسن نظامی صاحب نے ۱۹۴۵ عیسوی میں شائع فرمایا تھا۔ سید علی نقوی کا بیان ہے کہ بھاؤ کے ساتھ ایک لاکھ سوار اور دو لاکھ پیدل تھے اور توپ خانہ بھی زبردست تھا۔ احمد شاہ ابدالی اور اس کے ہندوستانی رفیقوں کے پاس کل چھیاسٹھ ہزار فوج تھی یعنی ایک اور پانچ کا مقابلہ تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے اُدھر جمنا پار کی، ادھر بھاؤ کا لشکر یلغار کرتا آ گیا، اور آتے ہی اس نے جے جے بھوانی کے نعرے لگا کر مسلمانوں پر ہلہ بول دیا۔

مسلمانوں نے کچھ فوج سامنے رکھی اور کچھ فوج کو ترتیب سے تقسیم کیا، اور دستہ دستہ کر کے بڑھایا۔ سو سو مسلمان تکبیر کہتے آگے آتے

سو قدم کے فاصلے پر یہ دستے کھڑے تھے اور تکبیروں کی آواز سے میدان گونج رہا تھا۔ مرہٹوں کو اندازہ نہ ہو سکا کہ مسلمان کتنے ہیں۔ وہ سمجھے کہ مسلمانوں کی تعداد بے حساب ہے۔ بھاؤ اور وسواس راؤ اور ملہار راؤ ہلکر اور ناجی گائیکواڑ اور جھنکوجی سندھیا سب کے سب اپنے اپنے خبر رسانوں کو ڈانٹ رہے تھے کہ تم خبر لائے تھے کہ مسلمان تھوڑے ہیں۔ لاکھوں مسلمان کہاں سے آگئے۔

سب سرداروں نے بھاؤ کو مشورہ دیا کہ دو کوس پیچھے ہٹ کر صف بندی کیجئے، تاکہ مسلمان بکھر جائیں۔ پھر ہم ایک دم حملہ کر کے ان کے پیدل قراولوں کو چن چن کر مار ڈالیں گے۔ بھاؤ نے مشورہ منظور کر لیا اور حکم دے دیا کہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹا جائے اور مسلمانوں کو آگے بڑھنے کا موقع دیا جائے۔ احمد ابدالی نے اس جنگی چال کا احساس کر لیا۔ اس نے فوج سے کہا کہ سوار پیدلوں اور قراولوں سے اب دور نہ رہیں، فوراً آملیں۔ دو کوس پیچھے ہٹنے کے بعد مرہٹہ سرداروں نے دیکھا کہ پوزیشن بدلی نہیں، پوزیشن وہی ہے۔ مرہٹے رک گئے۔ اور چونکہ شام ہو گئی تھی دونوں فوجوں نے لڑائی بند کر دی۔

دوسرے دن مرہٹوں نے پھر سوچا کہ ہماری فوج زیادہ ہے۔ اسے لڑنے کے واسطے وسیع میدان کی ضرورت ہے، لہٰذا دو کوس اور پیچھے ہٹنا چاہیئے۔ احمد شاہ ابدالی نے دوسرے دن بھی سواروں کو قراولوں کے قریب کر دیا۔ تیسرے اور چوتھے دن بھی یہی عمل رہا۔ مرہٹے دو دو کوس پیچھے ہٹتے اور مسلمان دو دو کوس آگے بڑھتے۔ پانچویں دن تین لاکھ مرہٹے پانی پت کے میدان میں تھے لیکن چھیاسٹھ ہزار مسلمانوں نے یلغار کر کے میدان پر قبضہ کر لیا اور مرہٹوں کو اور چار کوس پرے جا کر چھاؤنی چھانی پڑی۔

احمد شاہ ابدالی نے پھرتی سے اپنی فوج کے گرد بیس گز چوڑی اور ہاتھی ڈباؤ گہری خندق کھدوائی تاکہ مرہٹے شبخون نہ مار سکیں۔ اس خندق کے کھودنے میں احمد شاہ ابدالی اور تمام مسلمان سردار شریک تھے۔ احمد شاہ ابدالی تکبیریں کہہ رہا تھا اور درود پڑھ رہا تھا اور فوج کو بتاتا جاتا تھا کہ آج ہم اپنے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تقلید کر رہے ہیں، جنھوں نے دس گنے دشمنوں سے بچاؤ کے لئے خندق کھدوائی تھی اور خندق کھودنے میں خود شریک رہے تھے۔ مرہٹوں نے بھی اپنا بچاؤ خندق ہی سے کیا۔ دونوں خندقوں کے درمیان چار کوس کا فاصلہ تھا ایک طرف سے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوتی تھیں دوسری طرف سے ہر ہر مہادیو کی آوازیں اٹھتی تھیں۔ دن بھر لڑائی رہتی تھی، رات کو بند کر دی جاتی تھی۔

بھاؤ نے ایک اور داؤں کھیلا۔ اپنے معتبر سردار گوبند پنڈت کے ساتھ دس ہزار سوار کئے اور کہا کہ جمنا اور گنگا کے درمیان جتنے شہر قصبے اور گاؤں مسلمانوں کو رسد دے رہے ہیں، انھیں اتنا لوٹو کہ وہاں کے لوگ بھی سبق حاصل کر لیں اور ابدالی کی فوج کھانے پینے کو ترس جائے۔ احمد شاہ ابدالی نے سردار عطائی خاں کو حکم دیا کہ تم دو ہزار سوار لے جاؤ اور گوبند پنڈت کا سر کاٹ لاؤ۔ گوبند پنڈت کو سان گمان بھی نہ تھا کہ مسلمان یوں ناگہاں پہنچ جائیں گے۔ اُس کے سواروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ جس پر وہ قابو نہ پا سکا اور بالآخر آپ بھی بھاگ پڑا عطائی خاں کی مٹھی بھر فوج نے بھاگتوں کو خوب قتل کیا اور گوبند پنڈت کا سر نہایت آسانی سے ہاتھ آگیا اور رسد کی دقت جاتی رہی۔ ادھر بھاؤ نے دو ہزار سوار دلی بھیج رکھے تھے کہ وہاں سے خورجیوں میں بھر بھر کر اشرفیاں آئیں۔ سوار خورجیوں میں اشرفیاں بھرے لوٹ رہے تھے کہ راستہ بھول گئے اور وہاں جا نکلے جہاں احمد شاہ ابدالی کی فوج تھی۔ احمد شاہ ابدالی کی فوج نے ان دو ہزار مرہٹوں کا صفایا کر دیا اور زر کثیر ہاتھ بھی ہو گئے۔ اس واقعے نے مرہٹوں کے حواس کھو دئے اور حوصلے پست کر دئے، نیز زر کثیر چھن جانے سے انھیں رسد کی خریداری میں دشواریاں ہونے لگیں۔

احمد شاہ ابدالی روزانہ تہجد کے وقت جاگ جاتا تھا اور نماز فجر تک تلاوت کلام مجید کرتا تھا۔ نماز فجر پڑھ کر لشکر میں گشت لگاتا تھا ایک ایک مورچہ دیکھتا تھا۔ ہر سردار کی فوج کا جائزہ لیتا تھا۔ خندق کے چاروں جانب چکر کاٹتا تھا۔ اور پھر گھوڑا دوڑاتا مرہٹوں کی فوج کے

نزدیک سے گزرتا تھا تاکہ مرہٹوں پر اس کی جرأت کا اثر ہو اور وہ مرہٹوں کی فوج کے حال سے بھی واقف رہے محض جاسوسوں کی اطلاعات پر بھروسہ نہ کرے دن کے بارہ بجے تک پچاس کوس کا دورہ کر لیتا تھا۔ اس سے مسلمان فوج میں روز نئی زندگی آجاتی تھی۔ ایک دن بادشاہ سے الگ وزیر اعظم اشرف الوزراء نے دورہ کیا، مگر ان کے اقبال میں اور احمد شاہ ابدالی کے اقبال میں فرق تھا۔ اشرف الوزراء مرہٹوں کے نرغے میں پھنس گئے اور انہیں نرغے سے باہر لانے کے لئے کمک بھیجنی پڑی

گوبند پنڈت کو قتل کرا کے احمد شاہ ابدالی نے مزید ایسے انتظامات کئے کہ اسے تو رسد پہنچتی رہے اور مرہٹوں کو نہ پہنچے۔ مرہٹے دلی والا خزانہ لٹ جانے اور رسد نہ پہنچنے سے بہت پریشان اور سراسیمہ تھے۔ رسد جمنا اور گنگا کے درمیانی علاقوں سے آیا کرتی تھی۔ بھاؤ نے بیس ہزار سپاہی اسی کام کے لئے متعین کئے کہ رسد ملنے کے مقامات پر جائیں اور رسد لائیں۔ انہیں رات کے اندھیرے میں رخصت کیا گیا تاکہ مسلمانوں کو علم نہ ہو۔ آدھی رات کو راستے میں ڈھاک کے درختوں کا گنجان جنگل آیا۔ انہوں نے سمجھا کہ اب ہم بالکل محفوظ ہیں، یہاں کچھ دیر آرام کر لیں۔ ان کو معلوم نہیں تھا کہ احمد شاہ ابدالی نے انتظام کر رکھا ہے جس کی وجہ سے مرہٹوں تک رسد نہیں پہنچنے پاتی۔ احمد شاہ ابدالی کا سردار شاہ پسند خاں پانچ ہزار سپاہی لئے جمنا اور گنگا کے درمیان پھرتا رہتا تھا۔ وہ رات اتفاق سے اسی گنجان جنگل میں پھیرا لگانے کی تھی ڈھاک کے جنگل میں شکار بکثرت ہوتا ہے۔ شاہ پسند خاں جانوروں کا شکار کرنے آیا تھا، مرہٹوں کا شکار بھی کر گیا۔ مرہٹے بے سدھ سو رہے تھے مسلمانوں نے تکبیر کے نعروں سے انھیں بیدار کیا اور فوراً دبوچ لیا۔ آفتاب طلوع ہوا تو بیس ہزار مرہٹوں میں سے ایک بھی باقی نہ تھا اور پانچ مسلمانوں میں سے دو چار ہی مرے تھے۔ شاہ پسند خاں نے احمد شاہ ابدالی کو سانڈنی سوار کے ذریعہ اپنی کامیابی کی اطلاع دی اور احمد شاہ ابدالی کے آتے آتے بیس ہزار سروں کا مینار کھڑا کر دیا۔

بھاؤ نے مرہٹہ سرداروں سے کہا صلح کے سوا چارہ نہیں ہے۔ سورج مل بھی رسد بھیجنی بھول گیا۔ راجپوتانہ کے راجہ تماشائیوں کی طرح خاموش بیٹھے ہیں۔ خیر اور راجپوت تو بے حس ہیں، لیکن اس اودے پور کے رانا کو کیا ہوا۔ اس نے تو مغلوں سے رشتے نہیں جوڑے تھے۔ ملہار راؤ ہلکر بولا۔ گھبرائیے مت۔ سپاہی ان امتحانوں سے گزرا ہی کرتے ہیں۔ آپ نے سورج مل سے بے رخی برتی تھی اور راجپوتوں اور سکھوں کے ساتھ کونسا عمدہ سلوک ہوا ہے جو راجپوت اور سکھ آپ کی لڑائی کو ہندو قوم کی لڑائی تصور کرتے۔ سکھوں کو رگھوناتھ راؤ نے لوٹا تک ہے۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں ان سب کے سامنے جا کر عاجزی کروں اور انہیں مناؤں۔ احمد شاہ ابدالی سے صلح کرنے کی نسبت ان سب کے دب جانا بہتر ہے۔ میں سورج مل کے پاس جاتا ہوں۔ سورج مل نہ مانا تو آپ کی بات نہیں جائے گی میری بات جائے گی، اور مان گیا تو پھر نہ رسد کی کمی رہے گی اور نہ روپے کی۔ بھاؤ نے جواب دیا۔ میں سورج مل کے آگے ہرگز ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا سورج مل کو بوڑھے اور تجربہ کار ہونے کا گھمنڈ ہے۔ مجھے بچہ اور احمق کہتا ہے۔ ذرا اس لڑائی سے فارغ ہو جاؤں، سورج مل کا مزاج ٹھیک کر دوں گا۔ اور بھرت پور کو ایسا مٹا دوں گا کہ لوگ پہچان نہ سکیں گے کہ بھرت پور کہاں تھا۔

بھاؤ نے شجاع الدولہ سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ اس کو اپنی پگڑی بھیجی اور کہلوایا کہ تم میرے بھائی ہو، احمد شاہ سے باعزت صلح کرا دو۔ نواب شجاع الدولہ نے اپنی دستار بھاؤ کو بھیج دی اور اطمینان دلایا کہ میں صلح کی کوشش کروں گا۔

شجاع الدولہ کی تحریک صلح پر احمد شاہ ابدالی نے کہا۔ مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے میں تم لوگوں کی مدد کرنے آیا ہوں، تم صلح چاہتے ہو تو بسم اللہ کرو۔ حافظ رحمت خاں اور نواب دوندے خاں اور نواب احمد خاں بنگش بھی صلح پر آمادہ تھے، مگر نواب نجیب الدولہ نے اختلاف کیا اور کہا کہ جناب آپ کے واپس جاتے ہی مرہٹے تازہ دم فوجیں لا کر ہمیں بھون ڈالیں گے میں اسلام کے اس حکم سے واقف ہوں کہ دشمن جھک جائے تو اکڑو اور اینٹھو نہیں، صلح کر لو لیکن اسلام نے آنکھیں بند کر کے صلح کرنے کا حکم نہیں دیا ہے۔ ہماری حالت ہندوستان میں ابتر ہو گئی ہے اور مرہٹوں

نے جتنا نعرہ پکڑا ہے اُسے ملحوظ رکھنے کو اسلام نے منع نہیں کیا اُسے سوچ لیجئے اور غور کر لیجئے کہ صلح آپ کے افغانستان جانے کے بعد کیا رنگ رنگ لائے گی۔

ابھی احمد شاہ ابدالی نے ہاں یا نا نہیں کی تھی اور شجاع الدولہ کی مساعی جاری تھیں کہ بالک رام، ایک نوعمر لڑکا، بھاؤ کا پاندان جس کے سپرد تھا، راستے کے اندھیرے میں بھاؤ کے ہاتھ کا نوشتہ خط شجاع الدولہ کے نام لایا کہ صلح جلدی کراؤ۔ لیکن ادھر شجاع الدولہ نے خط پڑھتے ہی احمد شاہ ابدالی کے جانے کی تیاری کی، اُدھر بھاؤ نے تمام مرہٹہ سرداروں کو حکم دیا کہ آج پچھلی رات کو مسلمانوں پر دھاوا بولا جائے گا احمد شاہ ابدالی کے ہاں جانے سے قبل ہی شجاع الدولہ کا خبر رساں خبر لے آیا کہ بھاؤ کی فوجیں چل پڑی ہیں۔ اب شجاع الدولہ صلح کرانے کی بجائے یہ خبر سنانے احمد شاہ ابدالی کے ہاں پہنچے۔ احمد شاہ ابدالی کو خبر سنائی اور کہا بھاؤ نے مجھے اور آپ کو غافل کرنا چاہتا تھا۔ صلح کا پیغام فریب تھا جس پھرتی سے مسلمانوں نے خندق کھودی تھی، اسی پھرتی سے وہ مرہٹوں کے مقابلے کو موجود تھے مصنف عماد السعادت کا بیان ہے کہ جب شجاع الدولہ احمد شاہ ابدالی کو مرہٹوں کے حملے کی خبر سنانے گئے ہیں تو میں شجاع الدولہ کے ہمراہ تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے کہا، واقعی بھاؤ نے دھوکا دینا چاہا تھا۔ مگر آج وہ دیکھ لیگا کہ مسلمانوں کو دھوکا دینا آسان نہیں ہے۔ اچھا اللہ حافظ ...... آپ بھی اپنے لشکر میں جائیے۔

مصنف عماد السعادت لکھتے ہیں: ابھی نواب شجاع الدولہ وہیں کھڑے تھے اور اپنے خیمے میں نہیں گئے اور خیال کر رہے تھے کہ احمد شاہ ابدالی کیا کہہ گیا۔ سب مجھے تو اس کے مغلوب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ دشمن سر پر پہنچ چکا ہے اور مسلمان آدھے جاگے ہیں، آدھے سوتے ہیں۔ ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ دیکھا کہ ہر مسلمان سوار گھوڑے پر ہے اور ہر پیدل صف میں ایستادہ ہے۔ نواب شجاع الدولہ نے اپنے خیمے کا راستہ لیا اور مجھ سے فرمایا میں جب حملے کی اطلاع دینے چلا تھا تو میرے دل میں یہ خیال کہ بھاؤ نے مجھے دھوکا ہی نہیں میرا منہ بھی کالا کرایا۔ تاریخ میں لکھا جائے گا کہ شجاع الدولہ نے مرہٹوں کی خاطر مسلمانوں کو غافل رکھا اور مسلمانوں کو نیست و نابود کرا دیا۔ مگر اب میری رائے ہے کہ مسلمان ضرور کامیاب ہوں گے۔ میرا ارادہ لڑنے کا نہیں تھا لیکن بھاؤ کی دھوکہ بازی نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ احمد شاہ ابدالی کا ساتھ دوں۔ چنانچہ ساتھ دیا۔ مگر بھاؤ کی فوج کے دستے شجاع الدولہ کی فوج سے کتراتے تھے۔ شاید بھاؤ کا حکم ہوگا کہ شجاع الدولہ کو نہ چھیڑنا اور پورا زور نجیب الدولہ کا مورچہ توڑنے پر لگا دینا۔ بھاؤ کی فوج نجیب الدولہ کی فوج سے دیوانہ وار لڑ رہی تھی اور مرہٹے غالب تھے اور مسلمان مغلوب یکایک احمد شاہ ابدالی میدان میں خود آ گیا اور اس کے آتے ہی رنگ بدل گیا۔ مسلمان غالب ہونے لگے اور مرہٹے بھاگنے لگے اور مسلمانوں کے بھاگے ہوئے سپاہی پلٹ آئے اور اتنا گھمسان کا رن پڑا کہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

غل مچا کر بسواس راؤ اور بھاؤ مارے گئے۔ مسلمانوں نے بآواز بلند کہا، اللہ اکبر، اللہ بڑا ہے۔ اللہ کا ارادہ سب پر غالب ہے مرہٹوں میں بھگدڑ پڑ گئی۔ احمد شاہ ابدالی نے حکم دیا کہ دشمن کے سپاہی زندہ نہ جانے پائیں۔ ایک ایک کو ذبح کر دو۔ دوسرے دن چالیس چالیس کوس تک مرہٹوں کی لاشیں نظر آتی تھیں۔ تین لاکھ میں سے گنتی کے مرہٹے اور ان کے سردار جان بچا سکے۔

جنگ ختم ہوئی اور جنگ کی داستان بھی ختم ہوئی۔ میں نے اس داستان کا عنوان قائم کیا ہے "جب اتحاد نہیں رہا تھا، اور جب اتحاد ہو گیا" مجھ پر اس ساری داستان کا یہی اثر ہے کہ تم الجھا اُلجھا حکام کا عیش و عشرت میں پڑ کر کمزور ہو جانا ہے اور نگ زیب کی اولاد عیش و عشرت میں نہ پڑتی تو کمزور نہ ہوتی اور کمزور نہ ہوتی تو ایسے مسلمان گورنر بغاوت اور افتراق و انتشار برپا نہ کرتے۔ مسلمان گورنروں ہی نے جب منہ موڑ لیا تو غیر مسلموں کا منہ موڑنا قدرتی اور لازمی امر ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی دوران میں چند روزہ اتحاد کرا کر اتحاد کا تماشہ ایک مرتبہ دکھا دیا۔ مسلمانوں کو ایسا بے نفس مددگار دلوا دیا کہ وہ جنگ جیت کر ملک مغل بادشاہ ہی کے حوالے کر گیا۔ خود واپس افغانستان چلا گیا۔ اتحاد ہندوؤں کے ہاں بھی ہوا، مگر مسلمانوں جیسا اتحاد نہیں ہوا اور انہیں احمد شاہ ابدالی کی قسم کا بے نفس لیڈر نہیں ملا۔ اس لئے بھاؤ ہارا اور احمد شاہ ابدالی

جیسا یہ جنگ درحقیقت احمد شاہ ابدالی اور بھاؤ کی جنگ تھی بلکہ احمد شاہ ابدالی کی خداشناسی اور بھاؤ کی خدا ناشناسی کا مقابلہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے احمد شاہ ابدالی کی سرپرستی فرمائی، ورنہ مسلمانان ہند سرپرستی کے قابل نہیں تھے ۔ اتحاد کا تماشہ دکھا کر انھیں دوبارہ کمزور مغل بادشاہ اور ایک دوسرے کی کاٹ کرنے والے مسلمان امرا کے سپرد کر دیا گیا۔ ہندوؤں کو مسلمانوں کے عدم اتحاد سے فائدہ نہیں پہنچا کیونکہ وہ مسلمانوں سے زیادہ غیر متحد تھے۔ اتحاد اللہ کی نعمت ہے، اور اللہ اپنی ہر نعمت اسے عنایت فرماتا ہے جس میں اس کے لینے اور سنبھالنے کی اہلیت پاتا ہے۔

مسلمانوں میں اتحاد نہیں تھا اور ہندوؤں میں بھی اتحاد نہیں تھا اور مسلمانوں اور ہندوؤں میں بھی کھینچا تانی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دور دیس کے انگریز ڈیڑھ سو برس مسلمانوں اور ہندوؤں پر حکومت کر گئے نہ تو کو، نہ مو کو، لے چولھے میں جھونکو۔ عدم اتحاد نے دونوں قوموں کو انگریزوں کا غلام بنا دیا، اور انگریزیت ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے چمٹ کر رہ گئی۔

لڑائیوں جھگڑوں کے تذکرے سے مجھے دلچسپی نہیں ہے، میرا یہ مضمون اور سبجکٹ نہیں ہے۔ لیکن چونکہ اتحاد کی طرف توجہ دلانی تھی، تائید کے لئے پانی پت کی آخری جنگ کی مثال پیش کر دی ہے۔ مسلمانوں پر تو متحد رہنا مذہبا فرض ہو اللہ نے مسلمانوں کی سرپرستی کی شرط یہ بتائی ہے کہ مسلمان متحد ہوں، تب میں ان کی سرپرستی کروں گا اور میرا دل چاہتا ہے کہ صرف مسلمان ہی آپس میں متحد نہ ہوں، تمام انسان ایک دوسرے کو آدم کی اولاد سمجھنے لگیں اور ایک دوسرے سے بھائیوں کی طرح محبت کریں، اور لڑیں جھگڑیں نہیں۔ لیکن مسلمان اللہ کی نہیں سنتے تو غیر مسلم میری کیا سنیں گے۔ تاہم جو عرض کرنا تھا وہ عرض کر دیا۔ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغ

مولانا حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی

سماعِ حسنؒ

فاران ماہ ستمبر ۶۳ء میں مدیر رسالہ نے موضوعات اور اس کے ترجمے پر تبصرہ شائع کیا تھا جس میں مدیر نے مختلف مقامات کی عبارات نقل فرمائی تھیں جن میں خرقہ کی حدیث بھی تھی حسن اتفاق سے مدیر نے صرف ترجمے پر اکتفا کیا اور عربی متن نقل نہیں فرمایا۔ نیز مدیر موصوف نے ایک تنقیدی عبارت دوسرے مقام کی نقل فرمائی تھی جو اس روایت موضوع کے تحت کی گئی تھی

ان ولد الزنا لا یدخل الجنۃ ولد الحرام جنت میں داخل نہ ہوگا۔

لیکن بعض حضرات کو یہ مغالطہ لاحق ہوا کہ ہر دو عبارتیں ایک ہی مقام سے متعلق ہیں

پھر حدیث خرقہ کے تحت ملا علی قاری نے حافظ ابن حجر کا سماع حسنؒ کے بارے میں نقل فرمایا جس سے یہ اشتباہ پیدا ہوا کہ اس روایت کا بطلان حسن بصری کے حضرت علی سے سماع نہ ہونے پر موقوف ہے اور جناب میکش اکبرآبادی نے سماع حسن بصری کے ثبوت میں ایک مقالہ قلمبند فرمایا جو فاران ماہ دسمبر سنہ ۶۳ء میں شائع ہوا۔ لیکن چونکہ اس میں موصوف کو مختلف اشتباہات پیدا ہو گئے تھے۔ اس لئے یہ چند سطور تحریر کر رہا ہوں

ملا علی قاری مرحوم کی عبارت حسب ذیل ہے:۔

حدیث لبس الخرقۃ وکون الحسن البصری لبسها من علی قال ابن دحیۃ وابن الصلاح انہ باطل وکذا قال العسقلانی انہ لیس فی شیئ من طرقها ما یثبت ولم یرد فی خبر صحیح ولا حسن ولا ضعیف ان النبی علیہ السلام البس الخرقۃ علی الصورۃ المتعارفۃ بین الصوفیۃ لاحد من الصحابۃ ولا امر احدا من اصحابہ بفعل ذالک وکل ما یروی من ذالک صریحا فباطل قال ثم ان من الکذب المفتری قول من قال ان علیا البس الخرقۃ الحسن البصری فان ائمۃ الحدیث لم یثبتوا للحسن من علی سماعا فضلا من ان یلبسہ الخرقۃ

خرقہ پہنانے کی حدیث اور یہ مروی ہونا کہ حسن نے حضرت علی کو اسے پہنایا ہے ابن دحیہ اور ابن الصلاح اس کے بارے میں فرماتے ہیں یہ باطل ہے۔ اسی طرح حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ اس کی سندات میں سے کوئی سند ایسی نہیں جو ثابت ہو اور نہ یہ کسی خبر صحیح میں مروی ہے۔ نہ حسن میں اور نہ ضعیف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ میں سے کسی کو صوفیاء کے متعارف طریقے پر خرقہ پہنایا ہو اور نہ کسی صحابی کو اس کے کرنے کا حکم دیا ہے اور جو کچھ اس بارے میں روایت کیا جاتا ہے سب باطل ہے اور حافظ صاحب فرماتے ہیں پھر اس مفتری کا ایک کذب یہ بھی ہے کہ وہ کہتا ہے کہ حضرت علیؓ نے یہ خرقہ حسن رح کو پہنایا۔ حالانکہ ائمہ حدیث نے حسن کے لئے علی سے سماع ثابت نہیں کیا۔ کجا کہ انہیں خرقہ پہنانے۔

ملا علی قاری کا مقصود روایت خرقہ پر بحث ہے جسے تمام محدثین نے باطل قرار دیا ہے نہ کہ عدم سماع حسن۔ اور حافظ ابن حجر نے جو عدم سماع حسن کو دلیل میں پیش کیا ہے تو ان کا مقصد یہ ہے کہ اگر اس روایت کے رواۃ بھی معتبر ہوتے تب بھی یہ روایت سماع حسن کے عدم ثبوت کی بنا پر مستند نہ ہوتی۔ کیونکہ اگر سماع و عدم سماع میں بقول میکش صاحب اختلاف بھی ہو تو یہ شے مشکوک اور محتمل نہ ہوگی نہ کہ قطعی۔ اور مشکوک شے پر کسی شے کی بنیاد قائم کرنا کیونکر جائز ہوگا۔۔

ثانیاً چونکہ یہ شئے ایسی ہے کہ اس کے بہت سے معتبر روات ہونے چاہیئے تھے اس لئے کہ یہ واقعہ عمومیت سے تعلق رکھتا ہے اور جب ثقہ روات اسے روایت نہیں کرتے بلکہ صرف ایک غیر معتبر راوی اسے روایت کرتا ہے تو ایسی روایت کے قابل قبول ہونے کا تو احتمال بھی پیدا نہیں ہوتا حالانکہ عمومی واقعے میں ثقہ راوی کی روایت بھی معتبر نہیں ہوتی۔ تاوقتیکہ اسے روایت کرنے والے متعدد ثقہ روات نہوں۔ اور اس اکیلے ثقہ راوی کی روایت کو ایسی صورت میں منکر کہا جائیگا تو کیا وجہ ہے کہ سوائے حضرت علیؓ اور حسن بصری کے اسے کوئی اور صحابی اور تابعی روایت نہیں کرتا۔

ثالثاً عقیدے کی بنیاد قرآن مجید اور خبر متواتر پر قائم ہوتی ہے نہ کہ خبر واحد پر اور وہ خبر بھی ضعیف ہو موضوع ہو تو اس سے تو استحباب بھی ثابت نہیں ہوتا

لیکن اس روایت کا انکار اس بنا پر نہیں کیا جارہا ہے کہ حسن کو حضرت علیؓ سے سماع حاصل ہے یا نہیں۔ کیونکہ اگر اس پر روایت کی صحت کا دارومدار ہوتا تو محدثین حدیث کو باطل اور مفتری کا کذب قرار نہ دیتے بلکہ یہ فرماتے

هذا الیس بمتصل لان الحسن لم یسمع من علی یہ متصل نہیں۔ کیونکہ حسنؒ نے علیؓ سے نہیں سنا

اس صورت میں یہ روایت منقطع ہوتی اور چونکہ جناب حسن تمام ائمہ کے نزدیک ثقہ ہیں تو انہیں کوئی بھی محدث مفتری اور ان کی روایت کو کذب قرار نہیں دے سکتا۔ کجا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ۔

رہا حافظ ابن حجر کا یہ فرمان :-

فان ائمۃ الحدیث لم یثبتوا للحسن من علی سماعا کیونکہ ائمہ حدیث نے حسن کے لئے حضرت علی سے سماع ثابت نہیں کیا۔

یہ دو معنی کو محتمل ہے۔ ایک تو انکار سماع کو جیسا کہ امام بخاری، ترمذی، ابوداؤد، طحاوی وغیرہ نے اس کا انکار کیا ہے۔ اور دوسرا مقصود یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ کا حضرت علی کرم اللہ وجہ سے حدیث کی سماعت کا قطعی ثبوت موجود نہیں جو حضرات سماع حسن کے قائل ہیں وہ زیادہ تر اس احتمال کی بنا پر قائل ہیں کہ امام حسن بصری سنہ ۲۱ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۳۵ھ تک مدینہ میں مقیم رہے تو یہ ممکن نہیں کہ انھوں نے حضرت سے ملاقات نہ کی ہو اور کچھ روایات نہ سنی ہوں۔

عقلی طور پر تو یہ احتمال بظاہر بہت قوی معلوم ہوتا ہے لیکن روایات احتمالات سے ثابت نہیں ہوتیں اس کے لئے ثبوت کی ضرورت ہے اور صرف دو صورتوں میں ممکن ہے :

اولاً حسن خود یہ دعویٰ کرتے :-

سمعت علیاً میں نے علیؓ سے سنا

یا دوسرا ثقہ راوی حسنؒ کا سماع بیان کرتا اور وہ خود حسنؒ کے ساتھ اس سماع میں شریک ہوتا۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے

نیز حسنؒ جس زمانے میں مدینہ میں مقیم تھے وہاں اور دیگر صحابہ بھی موجود تھے۔ مثلاً ابوہریرہؓ، جابرؓ بن عبداللہ، ابن عمرؓ اور ابن عباس وغیرہ۔

لیکن امام حاکم اپنی معرفۃ الحدیث میں فرماتے ہیں :-

ان الحسن لم یسمع من ابی هریرۃ ولا من جابر ولا من ابن عمر ولا من ابن عباس ص۱۱۱ حسنؒ نے ابوہریرہؓ، جابرؓ، ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ سے کوئی روایت نہیں سنی

اور یہ چاروں صحابہ حضرت علیؓ کے بعد ایک عرصہ دراز تک حیات رہے تو ان سے سماع بہ نسبت حضرت علیؓ کے زیادہ ممکن تھا لیکن

جب ان حضرات سے حسنؒ کو سماع حاصل نہیں۔ حالانکہ ان سے سماع کا احتمال زیادہ قوی ہے تو ایک احتمال ضعیف کی بنا پر سماع کی بنیاد قائم کرنا صحیح نہیں۔ اور محدثین کا جو اختلاف ہے وہ رویت و ملاقات میں ہے نہ کہ سماع و عدم سماع میں۔

شیخ ولی الدین ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ الخطیب مصنف مشکوٰۃ اپنی اکمال فی اسماء الرجال میں فرماتے ہیں :-

وقدم البصرة بعد قتل عثمان ورأى عثمان وقيل انه لقي عليا بالمدينة واما بالبصرة فان رؤيته اياه لم تصح لانه كان في وادي القرى متوجها نحو البصرة حين قدم علي بن ابي طالب البصرة

حسن بصرہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد آئے اور حضرت عثمانؓ کو دیکھا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مدینہ میں حضرت علیؓ سے بھی ملاقات کی لیکن بصرہ میں حسن کا علیؓ کو دیکھنا صحیح نہیں۔ کیوں کہ جب حضرت علیؓ بصرہ تشریف لائے تو حسن وادی القریٰ میں تھے اور بصرہ کی جانب کوچ کرنے والے تھے۔

یعنی ثبوت سماع تو کجا صرف ایک قول مدینے میں ملاقات کے بارے میں ضرور ہے لیکن وہ بھی ضعیف ہے اسی لئے اسے قیل سے تعبیر کیا گیا ہے اور مطلق ملاقات و رویت سے سماع ثابت نہیں ہوتا۔

رہا آنجناب کا یہ فرمان کہ حافظ ابن حجر نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا تھا تو یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ حافظ ابن حجر نے اطراف مختارہ میں ایک خاص حدیث کے لئے حضرت حسن کے سماع کا دعویٰ کیا ہے نہ کہ عام سماع کا اور ایک روایت کے سماع سے تمام روایتوں کا سماع ثابت نہیں ہوتا۔

اور جناب کا یہ فرمانا کہ سماع حسن کا انکار ابن تیمیہ اور ان کے حامیوں نے صرف اس لئے کیا ہے تاکہ یہ تصوف کا سلسلہ ختم ہو جائے تو اس سلسلے میں گذارش یہ ہے کہ ان کا انکار کرنے والے بخاری، ترمذی، ابوداؤد، طحاوی، یحییٰ بن معین اور یحییٰ بن سعید القطان وغیرہ ہیں اور یہ حضرات ابن تیمیہ سے بہت پہلے گذرے ہیں۔ اور بعد کے حضرات میں ابن دحیہ، عراقی، ابن الصلاح، حافظ سخاوی، اور حافظ ابن حجر وغیرہ ہیں جو شافعی المسلک ہیں اور ابن تیمیہ حنبلی تھے اور متاخرین میں ملا علی قاری اور شاہ ولی اللہ بھی اس کے منکر ہیں اور یہ دونوں حنفی ہیں۔

اور نہ سماع کا انکار اس بنا پر کیا گیا۔ کہ سلسلہ تصوف کا لعدم ہو جائے بلکہ بہت سے محدثین کرام سلسلہ تصوف سے متعلق تھے۔ مثلاً حافظ سخاوی، حافظ دمیاطی، ابن ملقن، امام نووی اور بعد کے حضرات میں شاہ عبدالحق اور شاہ ولی اللہ دہلوی وغیرہ اور اکثر حضرات دیوبند سلسلہ تصوف سے متعلق ہیں۔ اور یہ ناچیز بھی چاروں سلسلوں میں بیعت ہے

میکش صاحب غالباً یہ تصور فرماتے ہیں کہ تصوف کی اصل حقیقت خرقہ پوشی، جبہ و قبہ اور مجاورت پر موقوف ہے اور علم باطن علم شریعت سے کوئی جداگانہ شے ہے تو اگر تصوف کا مقصود یہ ہے اور خدا کرے جناب کا مطمح نظر یہ نہ ہو تو ایسے تصوف کے ہم منکر ہی نہیں بلکہ دشمن ہیں جس کی مختلف وجوہات ہیں۔

(۱) اس قسم کے تصوف کے جو قائل ہیں ان کے نزدیک علم باطن حسنؒ نے حضرت علیؓ سے حاصل کیا، اور حضرت علیؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اور یہ علم حضورؐ نے سوائے حضرت علیؓ کے کسی کو نہیں بتایا جو سینہ بسینہ چلا آرہا ہے۔ اور یہ صراحتاً باطل ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ

... جو کھلے دلائل اور ہدایت کی باتوں کو جو ہم نے نازل کی ہیں چھپاتے ہیں باوجودیکہ ہم اسے لوگوں کے لئے کتاب میں بیان کر چکے ہیں تو ان پر اللہ لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں

اللہ تعالیٰ کتمان ہدایت کرنے والے پر خود بھی لعنت فرماتے ہیں اور دیگر لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ جس فعل پر اللہ کی لعنت ہو اسے معاذ اللہ نبی کس طرح انجام دے سکتا ہے۔

(۲) حضور کو حکم ہے۔

یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ

اے رسول آپ پر آپ کے پروردگار کی جانب سے جو کچھ نازل کیا گیا ہے اسے دوسروں تک پہنچا دیجئے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو اپنی رسالت کی تکمیل نہیں کی۔

تو حضور کو حکم دیا جا رہا ہے کہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اور اگر اس میں آپ نے کوئی کمی کی تو آپ نے اپنے اپنے فریضۂ رسالت کو انجام نہیں دیا اسی لئے حضور اکرم نے حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا تھا۔

ھل بلغت — کیا میں نے پہنچا دیا

صحابہ نے جواب دیا جی ہاں۔ آپ نے صحابہ سے مخاطب ہو کر فرمایا

اشھدوا — تم گواہ ہو جاؤ۔

اور پھر آسمان کی جانب ہاتھ اٹھا کر فرمایا

اللھم اشھد — اے اللہ تو بھی گواہ ہو جا۔

تو کیا یہ ممکن ہے کہ نبی نے تمام صحابہ سے ایک علم کا اخفا کیا ہو اور وہ صرف حضرت علی کو بتایا گیا ہو۔ اسی لئے حضرت عائشہ رضؓ نے مسروق سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا۔

من حدثک ان محمد اقد کتم شیئا ما انزل اللہ فقد افتری علی اللہ الکذب

جو شخص تجھ سے یہ بیان کرے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے نازل کردہ احکام میں سے کوئی شے چھپائی ہے اس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹی تہمت لگائی۔

(۳) تمام اہل سنت والجماعت کے نزدیک حضور اکرمؐ کے بعد سب سے افضل حضرت ابوبکرؓ، پھر حضرت عمرؓ، پھر حضرت عثمانؓ ہیں۔ اور ان حضرات کی جانب کوئی اس علم کو منسوب نہیں کرتا حالانکہ اس کے وہ حضرت علیؓ سے اول حق دار ہیں۔

در اصل یہ عقیدہ سبائی جماعت کا پھیلایا ہوا ہے جس کا مقصود حضرت علی پر ان اصحاب ثلثہ کی فضیلت ثابت کرنی ہے اور یہ خیال حضرت علی کی حیات میں عام ہو چکا تھا حتیٰ کہ حضرت علیؓ نے اس کی خود تردید فرمائی۔ سنن نسائی، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور دیگر کتب حدیث میں مختلف روات سے مروی ہے۔

سالنا علیا فقال ھل عندکم شیٔ سوی القرآن فقال لا والذی فلق الحبۃ وبرآ النسمۃ الا ان یعطی اللہ عزوجل عبدا فھما فی کتابہ او ما فی ھذہ الصحیفۃ قلت (ای) ابو جحیفۃ وما فی الصحیفۃ قال فیھا العقل وفکاک الاسیر وان لا یقتل مسلم بکافر

ہم نے حضرت علیؓ سے دریافت کیا۔ کیا آپ کے پاس قرآن کے علاوہ بھی کوئی شے ہے۔ انھوں نے فرمایا اس ذات کی قسم جس نے دانے کو پھاڑا اور مخلوق کو پیدا کیا کوئی شے نہیں مگر اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو اپنی کتاب کا فہم عطا فرما دے یا جو اس صحیفے میں ہے۔ ابو جحیفہ کہتے ہیں میں نے عرض کیا اس صحیفے میں کیا ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا اس صحیفے میں دیت اور قیدی کی رہائی کے احکام ہیں۔ اور اس میں یہ بھی تحریر ہے کہ مسلم کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے۔

(۴) لفظ تصوف تیسری صدی کی ایجاد ہے۔ اس سے پہلے عربی میں اس لفظ کا وجود نہ تھا۔ گویا کہ صحابہ تابعین اور تبع تابعین کے دور میں جو خیر القرون ہیں یہ لفظ تک وجود میں نہ آیا تھا۔ اور کہا یہ جاتا ہے کہ لفظ صوفی صفہ کی جانب منسوب ہے تو اس سے صوفی نہیں بنتا۔ بلکہ اسے صاحب صفہ کہا جاتا ہے۔ اور اگر ہم کچھ دیر کے لیے تسلیم بھی کرلیں تو یہ سلسلہ حضرت علیؓ کے بجائے ابوہریرہؓ اور ابو موسیٰؓ اشعری سے منسوب ہونا چاہیئے تھا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ تو جو شے خیر القرون میں نہ پائی جاتی ہو وہ دین میں کیسے داخل تصور کی جاسکتی ہے۔

(۵) حضور کا ارشاد ہے:۔

بلغوا عنی ولو آیۃ — مجھ سے پہنچا دو چاہے ایک آیت ہو

تو جس تبلیغ کا لوگوں کو حکم دیا جارہا ہے تو خود حضورؐ نے اس سے کیسے گریز کیا۔ اور حضرت علی کو اس کے لئے کیوں مخصوص کیا

(۶) حدیث میں ارشاد ہے

من کتم علما فقد الجمہ اللہ یوم القیمۃ من النار — جس نے علم کو چھپایا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کے منہ میں آگ کی لگام ڈالے گا۔

اور اگر تصوف کا مقصود زہد و تقویٰ، تزکیہ قلب اور روح کی صفائی ہے تو وہ سماع حسنؒ پر موقوف نہیں اور اس پر ہمارا ایمان ہے۔ یہ سطور اس لئے تحریر کی گئی ہیں کہ بیکش صاحب کو یہ اشتباہ واقع ہوا تھا کہ سماع حسن کے انکار کا مقصد سلسلۂ تصوف کو ختم کرنا ہے۔ ورنہ اصل مسئلہ حدیث خرقہ کا تھا اور اس کے تحت سماع حسنؒ اور عدم سماع حسنؒ کی بحث کو چھیڑ دیا گیا تھا۔ حالانکہ حدیث خرقہ سماع حسن پر موقوف نہ تھی۔

اور ثبوت سماع کے لئے دلیل میں ایسی روایات پیش کرنا جو عن حسن عن علی کے ذریعے مروی ہیں بے سود ہیں۔ کیونکہ محدثین کا اتفاق ہے کہ "عن" سے سماع ثابت نہیں ہوتا۔ امام بخاری رحمہ اللہ حدیث معنعن کے بارے میں فرماتے ہیں

لا تقوم الحجۃ بہا ولا یحمل علی الاتصال حتی یثبت انہما التقیا فی عمرہما مرۃ فاکثر ولا یکفی امکان تلاقیہما
فتح الملہم ص ۳۹

حدیث معنعن کے ساتھ حجت قائم نہیں ہوسکتی اور نہ اسے اس وقت تک متصل قرار دیا جاسکتا ہے جب تک راوی اور مروی عنہ کی عمر میں ایک بار یا اس سے زیادہ ملاقات ثابت نہ ہو۔ صرف امکان ملاقات کافی نہ ہوگا (یہ حکم اس وقت ہے جبکہ راوی مدلس نہ ہو۔)

اور ائمہ حدیث کا حدیث حسن کو حجت سمجھنا وہ سماع و عدم سماع پر مبنی نہیں بلکہ ضابط و عادل ہونے پر مبنی ہے اور حضرت حسنؒ تمام محدثین کے نزدیک ثقہ ہیں۔

اور چونکہ روایت عن میں احتمال ہے کہ راوی نے یہ روایت مروی عنہ سے سنی ہے یا درمیان سے راوی حذف ہوا ہے۔ اس لئے اس پر سماع کی بنیاد قائم نہیں کی جاسکتی۔

اور علی الخصوص حسنؒ کی حدیث معنعن پر خاص طور پر بحث ہے اس لئے کہ تمام محدثین کے نزدیک حسنؒ سے یہ تدلیس منسوب کی جاتی ہے یعنی اکثر اپنے مروی عنہ کا نام حذف کرجاتے ہیں .... اور بسا اوقات وہ مروی عنہ مجہول اور ضعیف ہوتا ہے امام حاکم اپنی معرفۃ علوم الحدیث میں فرماتے ہیں:۔

فاشتبہ علینا تدلیس الحسن بن ابی الحسن و ابراھیم النخعی لان الحسن کثیرا ما کان یدخل بینہ و بین الصحابۃ اقواما مجہولین وربما دلس عن مثل

ہم پر حسن بن ابی الحسن اور ابراہیم نخعی کی تدلیس بہت مشتبہ ہے کیونکہ حسن اپنے اور صحابہ کے درمیان بہت سے مجہول لوگوں کو داخل کردیتے ہیں۔ اور کبھی عُنی بن ضمرۃ، حنیف بن المنتجب و غفل بن

عنی بن ضمامۃ وحنیف بن المنتجب وحفل بن حنظلۃ وامثالہم معرفۃ علوم الحدیث ص۱۰۹

حنظلہ اور ان جیسے رواۃ سے تدلیس کرتے ہیں (اور یہ رواۃ مجہول اور ضعیف ہیں)

امام یحییٰ بن سعید القطان جو امام ابوحنیفہ کے شاگرد اور فن جرح وتعدیل کے امام ہیں حدیث معنعن کے بارے میں فرماتے ہیں :-

لعلہ تجوز فی صیغۃ الجمع وارادھم دخولہ کقول الحسن خطبنا ابن عباس وخطبنا عقبۃ بن غزوان واراد اھل البصرۃ بلدہ فان لم یکن بہا حین خطبتہما ونحوہ فی قولہ حدثنا ابوھریرۃ فتح الملہم

شاید راوی اختصار کے طور پر جمع کا صیغہ لائے ہیں جس سے اس کے سماع میں داخل ہونے کا احتمال پیدا ہو۔ مثلاً حسن کا یہ قول کہ ہمیں ابن عباس نے خطبہ دیا یا ہمیں عقبہ بن غزوان نے خطبہ دیا۔ یہاں اہل بصرہ سے شہر والے مراد ہیں۔ ورنہ ان حضرات نے جب خطبہ دیا تھا تو حسن بصرہ میں موجود نہ تھے۔ اسی طرح حسنؒ کا یہ قول ہے کہ ہم سے ابوہریرہ نے حدیث بیان کی (حالانکہ انہوں نے ابوہریرہ سے کوئی روایت نہیں سنی)

مرسلات حسنؒ کے بارے میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا فرمان ہے۔

ولیس فی المرسلات اضعف من مرسلات الحسن وعطاء بن ابی رباح فانہما کانا یاخذان عن کل احد

(مرسلات میں حسن اور عطاء بن ابی رباح کی مرسلات سے زیادہ کوئی ضعیف مرسل نہیں۔ کیونکہ یہ دونوں حضرات ہر ایک راوی کی روایات سے لیتے ہیں۔ چاہے وہ ثقہ ہو یا غیر ثقہ)

حافظ عراقی کا قول ہے

مراسیل الحسن عندھم شبہ الریح

حسن کی مرسلات محدثین کے نزدیک باد کے مشابہ ہیں (یعنی ان کی کوئی قدر نہیں)

اور اس سلسلے میں سب سے بہتر رائے محمد بن سعید کی رائے ہے

کل ما اسند من حدیثہ اوروی عن سمع منہ فھو حسن حجۃ وما ارسل من حدیث فلیس بحجۃ

جب حسن کوئی مسند روایت بیان کریں یا اس شخص سے روایت کریں جس سے انہیں سماع حاصل ہو تو وہ حجت ہے اور جب جب حدیث مرسل روایت کریں تو حجت نہیں

روایت مدلس کے بارے میں محدثین وفقہا کی آرا مختلف ہیں لیکن صحیح قول یہ ہے :-

ان ما رواہ المدلس بلفظ محتمل لم یبین فیہ السماع والاتصال فحکمہ حکم المرسل وانواعہ

جس روایت کو مدلس نے محتمل لفظ سے روایت کیا ہو اور سماع واتصال کو صراحتاً بیان نہ کیا ہو تو اس روایت کا وہی حکم ہوگا جو مرسل اور اس کی اقسام کا ہے

اگرچہ بعض محدثین مدلس کی روایت قطعاً قبول نہیں کرتے

حاصل کلام یہ کہ سماع کے منکر بخاری اور دیگر اکثر محدثین کرام ہیں۔ اب اگر مفتی صاحب رحیم یا کسی اور کو ملا علی قاری پر تنقید کا حق حاصل نہیں تو جناب کو بخاری وغیرہ کے قول کو رد کرنے کا حق حاصل نہیں۔ اور جس دلیل سے جناب نے اس حق کو اپنے لئے جائز قرار دیا ہے اس دلیل سے میں ملا علی قاری پر تنقید کو جائز سمجھتا ہوں۔ اور میں نے صرف تنقید کی اور آں جناب نے ملا علی قاری کے قول کو رد کر دیا وہ بھی بلا دلیل۔

موجودہ دور میں ایسی علمی کتابوں کی اشاعت انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ عوام میں دین کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو چکی
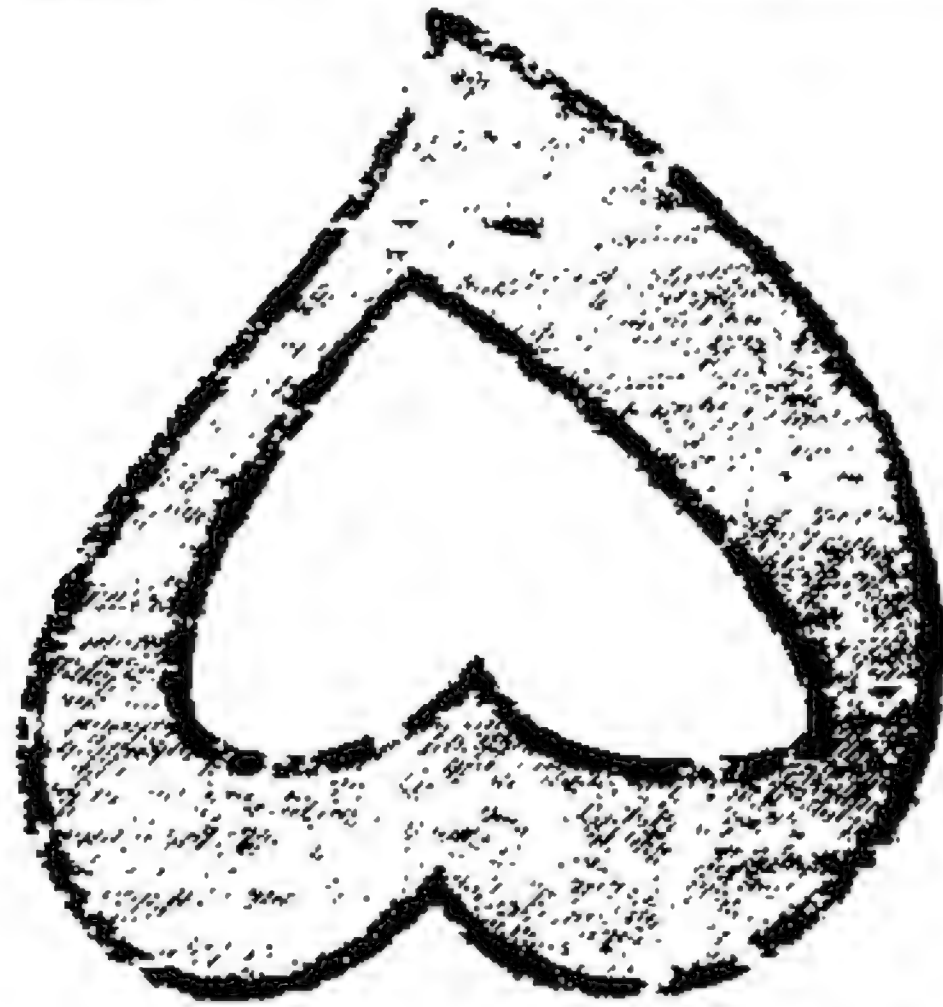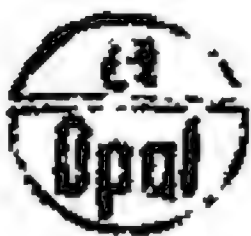
ابو علی (اعظم گڑھ)

خلاصۂ حیاتِ شبلی کا ایک تاثر

دار المصنفین اعظم گڑھ کے سلسلۂ تصنیفات و تالیفات کی مشہور و معرکۃ الآراء اور مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کی آخری تصنیف حیاتِ شبلی کا جو فہرست مضامین، فہرست رجال، حواشی اور ضمیموں وغیرہ کو ملا کر تقریباً ۹ سو صفحات پر مشتمل ہے، خلاصہ ہے، جس کو شبلی ہی کے وطن بندول کے ایک لائق اور ہونہار مصنف جناب عبد الرزاق صاحب قریشی نے کیا ہے، اس وقت انجمن اسلام بمبئی کے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے متعلق ہیں، اور جن کی ایک کتاب مرزا مظہر جانجاناں پر تمام ملک نے ان کو خراج تحسین پیش کیا ہے، ابھی حال میں ان کی ایک کتاب اردو کے ایک گمنام شاعر عزلت پر شائع ہوئی ہے، اس میں بھی انھوں نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے، شروع میں عزلت کے حالات اور ان کے کلام پر تبصرہ ہے، اور آخر میں اس کا دیوان ہے، جس کو انھوں نے باقاعدہ از سر نو ایڈٹ کیا ہے، ان کی یہ کتاب بھی دیکھنے کے قابل ہے، جو انجمن ہی کے ذاتی ٹائپ پریس میں نہایت دیدہ زیب خط نسخ میں چھپی ہے، یقیناً حیاتِ شبلی بہت ضخیم تھی، اس لئے اس کی افادیت کا دائرہ بہت محدود ہو کر رہ گیا تھا، جناب عبد الرزاق صاحب قریشی نے اچھا کیا، کہ عام شائقین اور طلبہ کے لئے اس کا مناسب خلاصہ کر کے، اس کا فائدہ عام کر دیا، واقعی اس کی سخت ضرورت تھی، یہ اتنا مفید کام انجام پایا ہے، کہ لائق و فاضل خلاصہ نگار کو جتنی داد دی جائے کم ہے، لیکن انھوں نے یہ خلاصہ جیسا کہ اس کے دیباچہ میں بھی لکھا ہے مصنف کی عبارت ہی میں کیا ہے، کہیں اپنا کوئی حرف نہیں لکھا ہے، تقریباً ایک ہزار صفحوں میں پھیلے ہوئے تمام مباحث کو مصنف ہی کے لفظ و عبارت میں اس خوبی کے ساتھ سمیٹ لینا، کہ کسی بحث میں تشنگی باقی نہ رہے، بجائے خود بڑے سلیقہ، ہنرمندی اور کمال کی بات، جو مشکل ہی سے کسی سے بن آسکتی ہے، لیکن اگر وہ بجائے مصنف کے لفظ و عبارت میں خلاصہ کرنے کے اپنے خاص لفظ و عبارت میں اس کا خلاصہ لکھتے، اور گنتی کے چند صفحوں میں اس کے تمام اہم مباحث کو سمیٹ لیتے تو ان کے قلم کی ایک اور شگفتہ تحریر جس پر بحمد اللہ ان کو اب بڑی قدرت ہو گئی ہے، شائقین کے ہاتھوں تک پہنچ جاتی، بہر حال جس صورت میں بھی یہ کام ہو گیا ہے، وہ قابل قدر ہے اور فاضل مولف حیاتِ شبلی جیسی اونچے درجہ کی کتاب کی تسہیل و تلخیص کے لئے تمام وابستگان دامن شبلی کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ اب اسکولوں، کالجوں، اور تمام عربی مدارس کے طلبہ و اساتذہ کے لئے حیاتِ شبلی کا مطالعہ آسان ہو گیا ہے، وہ اس کو ذوق و شوق سے خریدیں گے، اور شبلی کی زندگی سے متعلق جن کو وقت کے بہت بڑے مصنف ادیب، نقاد و مورخ و متکلم اور اردو و فارسی کے باکمال شاعر ہونے کے ساتھ ایک بہت بڑے معلم، داعی مجدد اور مفکر کی حیثیت بھی حاصل تھی، اس چھوٹی سی کتاب میں تمام معلومات انکو حاصل ہو جائیں گی

جناب شبلی کی تالیف میں، تین آدمیوں کا ہاتھ شامل تھا، ایک مولانا عبد السلام ندوی کا، جنھوں نے اپنے ذاتی ذخائر اور مولانا شبلی کے خطوط سے مولانا شبلی کی ابتدائی زندگی کے حالات بہم پہنچائے اور بہت سے کاغذات اور مسودات کی تلاش میں مولف کو مدد دی، پھر اس میں کچھ خاندانی اور ابتدائی حالات اور علی گڑھ کے زمانۂ قیام کے متعدد واقعات مولانا اقبال سہیل نے اضافہ کئے، یہ پورا مسودہ اربابِ نظر کی نگاہ سے گذرا تو ان کو بہت بے جان نظر آیا، تو سید صاحب نے اپنے استاد کی اس وصیت کے مطابق کہ "افکار حاکم صاحب میری

الفت کیا لکھیں گے کبھی تم دنیا کے کاموں سے فارغ ہوتا تو تم ہی لکھنا" اس کو اپنے ہاتھوں میں لیا، اور اس کو اپنے حسنِ ترتیب اور
اضافے سے وقت کی ایک اہم تالیف بنا دیا، بلکہ اردو کے سوانحی ادب میں یہ کتاب حیات جاوید کے مقابل بھی جانے لگی، حیات ج
تو بد قسمتی سے میں نے پڑھی نہیں، کہ وہ مولانا شبلی کے قول کے مطابق مدلل مداحی ہے۔ یا کتاب المناقب، مگر جب وہ شائع ہوئی تھی
بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی گئی تھی اور اب بھی اردو کے سوانح ادب میں اس کا ایک مرتبہ ہے' اور اس میں دخل غالباً صاحب سوانح
غیر معمولی شخصیت سے زیادہ مولانا حالی کے خلوص اور شرافت قلم کو بھی ہے' انھوں نے بڑی عقیدت اور محبت سے اپنے ہیرو کے سوانح حیا
اور اس کی زندگی کے تمام کارنامے ایک ایک کرکے لکھے ہیں' حیاتِ شبلی میں حیاتِ جاوید پر تو کم لیکن سرسید پر زیادہ دے دے کی گئی؛
سرسید بہت سے کام محض مصالح کے تحت کرتے تھے، کوئی کام خواہ کتنا ہی مفید اور ضروری ہوتا، جب تک اس میں کالج کی کوئی مصلحت
نظر نہ آتی اس کو کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوتے' الفاروق جب مولانا شبلی نے لکھنا چاہی تو سب سے زیادہ رکاوٹ سرسید ہی نے پیدا کی' اس کا
سبب خدانخواستہ یہ نہیں تھا، کہ حضرت عمر فاروقؓ سے ان کو عقیدت نہیں تھی' یا ان کو صدیق اکبرؓ کے بعد خلیفہ دوم نہیں سمجھتے تھے،
حدیثوں میں ان کے جو فضائل و مناقب درج ہیں' ان سے ان کو انکار تھا، پھر وہ عقیدہ و مسلک کے اعتبار سے شیعوں سے کوسوں دور
دلی کے خانوادۂ ولی اللٰہی سے ان کو ارادت تھی، اور اس خانوادۂ رشد و ہدایت کا جو مسلک تھا، وہی ان کا بھی تھا، لیکن پھر بھی وہ کالج
مصلحت کے خیال سے الفاروق کی تالیف کے سخت مخالف تھے کہ کالج اس فرقہ کی ہمدردی سے محروم ہو جائے گا، جو اس وقت یو۔پی میں
ہر اعتبار سے بڑی حیثیت کے مالک تھے اور ان کی بڑی بڑی تعلقہ داریاں اور ریاستیں تھیں اور ان سے کالج کو بڑی مدد ملتی تھی۔ سرسید
کسی قیمت پر ان کو ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے اس لئے مخالفت کا کوئی دقیقہ انھوں نے اٹھا نہیں رکھا یہاں تک کہ وقت کے بہت ب
شیعہ عالم اور مصنف نواب عماد الملک حیدرآباد سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا، سرسید نے سمجھا تھا کہ یہ تیر کبھی خطا نہیں کر سکتا
لیکن انھوں نے لکھا، کہ پوری تاریخ اسلام میں ایک ہی فاروق تو گزرا ہے، اس کی سوانح نہیں لکھی جائے گی، تو پھر کس کی لکھی جائے
اس سے بڑھ کر مصنف کی حوصلہ افزائی اور کیا ہو سکتی تھی' مولانا شروانی کی روایت ہے کہ یہ واقعہ خود سرسید احمد خان نے ان سے بیان
کیا تھا، اور نواب عماد الملک نے ان کو جو جواب لکھا تھا، وہ انھوں نے مولانا شبلی کے سپرد کر دیا، ابھی مولانا شبلی الفاروق لکھ ہی رہے تھے
جس کے غلغلے سے سارا ہندوستان گونج رہا تھا، کہ سرسید ہی کے حلقہ کے ایک صاحب نے سیرۃ الفاروق نام سے ایک کتاب لکھ کر
شائع کر دی' مگر ظاہر ہے کہ کسی اعتبار سے بھی مولانا شبلی کی زیر تصنیف الفاروق سے اس کا کیا مقابلہ تھا، یہ حضرت بے حد مطعون ہوئے
بلکہ خود سرسید نے ان کی اس حرکت کو سخت ناپسند کیا، اور اپنی اس ناپسندیدگی کا اظہار انھوں نے اپنے اس یادگار مضمون میں بھی کر دیا،
انھوں نے نفس الفاروق کی تجویز کی مخالفت میں ۱۰ مارچ سنہ ۱۸۹۳ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں لکھا تھا، یہ پورا مضمون مو
سید سلیمان ندوی نے حیاتِ شبلی میں نقل کر دیا ہے' جس کو پڑھ کر کالج کے لئے سرسید کی مصلحت بینی پر حیرت طاری ہو جاتی ہے، اگر
خدانخواستہ یہ مصلحت کام کر جاتی، تو یقیناً دنیا، اس عظیم الشان تصنیف سے محروم رہ جاتی، علامہ شبلی نعمانی کو داد دیجئے، کہ ان حوصلہ شکن
موانع اور رکاوٹوں کے باوجود وہ اپنے عزم سے باز نہیں آتے' اسی زمانے میں اپنے ایک عزیز کو علی گڑھ سے لکھتے ہیں کہ "الفاروق انشا
تعالیٰ لکھوں گا" اور انھوں نے لکھا اور سوانح نگاری کا حق ادا کر دیا اپنی تصنیفات میں سب سے زیادہ ناز ان کو اپنی اس کتاب پر تھا
اور بجا ناز تھا اس کے جواب میں المرتضیٰ وغیرہ بھی لکھی گئیں' لیکن الفاروق کے مقابلہ میں کسی کتاب کو بھی فروغ نہ ہو سکا۔

شبلی کی تاریخ زندگی کے یہ واقعات اگر ضبط تحریر میں نہ آتے، تو کتنی کمی رہ جاتی، سرسید کے نورتن میں ایک سے ایک بڑھ کر صاحب
کمال اور غیر معمولی شخصیت اور عظمت کے مالک تھے' اور وہ سب کے سب ملک و قوم کے لئے سرمایۂ افتخار تھے، لیکن ان میں سب سے زیا

جاندار اور قد آور شخصیت مولانا شبلی کی تھی، اور اس کی حیات شبلی میں عکاسی کی گئی ہے جس میں مولانا شبلی اپنے تمام معاصرین سے ممتاز اور منفرد نظر آتے ہیں، اور ان کے اتنے عظیم کارنامے ہیں، جن کو زمانہ کبھی مٹا نہیں سکتا۔

مجھے فخر حاصل ہے کہ سید صاحب کے حکم سے میں اس کتاب کی ایک معمولی بلکہ ناقابل ذکر خدمت میں بھی انجام دی ہے، یعنی اس کتاب کی مفصل فہرست مضامین میں نے ہی بنائی تھی، سید صاحب قبلہ کتابوں کی تصحیح، اصل سے ان کا مقابلہ، مضامین کی فہرست اور انڈکس وغیرہ بنانے میں مجھ پر بڑا اعتماد کرتے تھے، اور میں یہ تمام کام ان کی محنت و شفقت کے سایہ میں بڑے ذوق شوق سے انجام دیتا تھا۔ مجھے ان سے شرف تلمذ بھی حاصل ہے، میں نے دیوان حماسہ کے کچھ ابواب انہی سے پڑھے ہیں جس میں میرے شریک درس مولانا سید نجیب اشرف صاحب ندوی مرتب رقعات عالمگیر تھے، سید صاحب میں یہ بڑی خوبی تھی، کہ اپنے حلقہ بگوشوں میں جو جس صلاحیت کا ہوتا تھا، اور اس سے اسی کے مطابق کام لیتے تھے۔ اس کتاب کی تصحیح تو مجھ سے متعلق تھی لیکن اس کے مسودہ کو بر وقت صاف کرنے کے لئے عارضی طور پر ایک مستقل خوشنویس انھوں نے رکھ لیا تھا، سید صاحب ہر روز جتنا کچھ لکھتے تھے، وہ چمکدار سیاہ گاڑھی روشنائی سے نہایت خوشخط لکھ دیا کرتا تھا، اور روزانہ کا یہی مبیضہ سید صاحب کی مزید نظر ثانی، اصلاح و ترمیم، اور مکرر اضافہ کے بعد پریس کے حوالہ کر دیا جاتا تھا، اس کتاب کی تالیف کے زمانہ میں سید صاحب پر بڑا کیف طاری تھا، اور ان کا دل سرور و انبساط سے لبریز تھا، کہ دنیا کے سارے کاموں سے فارغ ہو جانے کے بعد استاد نے جس کام کے لئے وصیت کی تھی، حسن اتفاق سے دنیا کے تمام مکروہات سے فارغ ہو جانے کے بعد ہی وہ حسن و خوبی سے انجام پا رہا ہے، اس کام میں ان کے پورے دو سال صرف ہوئے، اس درمیان میں انھوں نے سوائے معارف کے ایڈٹ کرنے اور اس کے لئے شذرات لکھنے کے، اور کوئی دنیا کا کام نہیں کیا، اور نہ کوئی لمبا سفر کیا، جو ان کے لئے لازمۂ زندگی تھا، جب تک یہ کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ گیا، وہ اپنے زاویۂ علم و فن سے باہر نہیں نکلے، یہ تھا اس کتاب کی تالیف کے ساتھ ان کا شغف اور انہماک، اور یہ واقعہ ہے کہ جس محنت، یکسوئی اور انہماک سے انھوں نے اپنی شاندار علمی و تصنیفی زندگی کے اس عظیم الشان کارنامہ کو انجام دیا، قدرت نے ان کو اس کا صلہ بھی دیا، یوں تو وہ جو کتاب بھی لکھتے تھے، اس کے شائع ہونے سے پہلے ہی تمام ہندوستان میں اس کی شہرت ہو جاتی تھی، اور ہر صاحب ذوق اس کا طلب گار ہو جاتا تھا، اس کتاب کے لکھنے کا ارادہ کیا تو اس کے غلغلہ سے سارا ہندوستان گونج گیا، اور ہر شخص اس کے خریدنے اور پڑھنے کا شائق ہو گیا، جونہی وہ کتاب پریس سے نکل کر بازار میں آئی اس کی دھوم مچ گئی۔

میں نے اوپر اپنی جس ادنیٰ خدمت کا ذکر کیا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے،

ابواب اور بکثرت ذیلی سرخیاں تو سید صاحب نے کتاب لکھتے وقت ہی قائم کر دی تھیں، اور جب سید صاحب نے حسب معمول مجھے فہرست مضامین بنانے کا حکم دیا، تو انہی کو نقل کر کے ایک سادہ سی فہرست بنا کر میں نے پیش کر دی، سید صاحب نے فرمایا، یہ تو بہت مختصر ہے، تو پھر میں نے اپنے ذوق سے نئے نئے عنوانات اور بکثرت ذیلی سرخیاں بڑھا کر، دوسری فہرست پیش کی، تو سید صاحب نے اسے بہت پسند فرمایا، اور وہی حیات شبلی کے تعارف کے لئے، معارف میں بھی شائع ہوئی، جب کتاب شائع ہوئی، تو پرستاران سر سید نفس فہرست مضامین ہی کو دیکھ کر چراغ پا ہو گئے کہ فہرست میں جب اتنا کچھ ہے، تو اصل کتاب کے اندر کیا ہوگا، شبلی کے بعض ایسے مخلصین کو بھی جو سر سید سے بھی اندر اندر اخلاص رکھتے تھے، اور کتاب میں اتنی تفصیل کے ساتھ سر سید و شبلی کے باہمی اختلافات کا آنا بہت زیادہ پسند نہیں کرتے تھے، یہ بات بہت کھلی، انھوں نے قلم سے تو نہیں، لیکن زبان سے اس کا متعدد موقعوں پر اظہار کیا، ایک عربی کے فاضل نے بھی کتاب کی اتنی مفصل فہرست کو جس میں قریب قریب کتاب کا پورا خلاصہ آگیا ہے، پسند نہیں کیا،

مگر یہ تو کتاب کا عیب نہیں ہنر ہے، کہ محض فہرست پر ایک نظر ڈالتے ہی پہلے کتاب کے مباحث پر پوری اطلاع ہو جاتی ہے۔ سابق مہتمم تاریخ بھوپال جناب امین زبیری کو تو اتنا دکھ ہوا کہ حیات شبلی کے رد میں ذکر شبلی کے نام سے انھوں نے پوری کتاب ہی لکھ ڈالی، جس میں انھوں نے خوب خوب شبلی کے مقابلہ میں سرسید کی حمایت کی، اور مصنف کو مطعون کیا، حالانکہ وہ مولانا شبلی کے بڑے معتقد دوست قدردان، ان کی بہت سی علمی و تعلیمی اسکیموں میں شریک اور خود حیات شبلی کی تالیف میں سید صاحب کے معاون تھے، اور انہی نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ وغیرہ کے پرانے فائلوں سے بہت سی مفید تحریریں اور مولانا شبلی کے زمانۂ قیام علی گڑھ کی متعدد نظمیں اور بہت سے واقعات نقل کرکے فراہم کئے تھے، جن کا حیات شبلی کے دیباچہ میں سید صاحب نے نہایت اخلاص کے ساتھ شکریہ بھی ادا کیا ہے، سید صاحب نے ان کی اس خلاف توقع مخالفت کا کوئی نوٹس نہیں لیا، لیکن امین زبیری صاحب کے اس مخالفانہ بلکہ معاندانہ تبصرہ کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ رفتہ رفتہ ان دونوں بزرگوں کے تعلقات ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے، ایک عرصہ کے بعد ایک صاحب نے زبیری صاحب کے تبصرہ کا جواب لکھنا چاہا، اور سید صاحب سے اس کے متعلق استصواب رائے کیا، تو سید صاحب نے ان کو لکھا کہ:۔

> "آپ کا عنایت نامہ ملا، زبیری صاحب نے حضرت مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کے اخلاق کا آئینہ ہے، میں نے ان کی کتابیں نہ پوری پڑھیں، اور نہ ان کے جواب دینے کا کبھی ارادہ کیا، آپ اگر جواب لکھنا چاہتے ہیں، تو میں آپ کو روکتا نہیں، تاہم میں اپنی طبیعت کی بنا پر زبیری صاحب کو اپنی موت آپ مرجانا پسند کرتا ہوں، تاہم اگر آپ اس سلسلہ میں مجھ سے ملنا چاہیں، تو شام کو غریب خانہ پر مل سکتے ہیں۔"
>
> (نقوش مکاتیب نمبر ص ۷۱۵)

اس خط کا ایک ایک لفظ سید صاحب کی قلبی اذیت اور انتہائی رنج وغم کا مظہر ہے، وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ امین زبیری صاحب جو مولانا شبلی اور خود ان سے اس درجہ اخلاص رکھتے تھے، اور جنھوں نے کتاب کے لئے از خود بہت سا قیمتی مواد بہم پہنچایا تھا ایسا رویہ اختیار کریں گے،

منشی امین زبیری کے اس تبصرہ سے اس کا بھی اندازہ ہوا کہ سرسید مرحوم کی حد تک وہ مولانا شبلی کے بہت زیادہ مخلص نہیں تھے اور اس چور کو انھوں نے اپنے دل میں چھپائے رکھا۔ تا آنکہ جب کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی، اور ان کی نظر سے گذری تو مدت کا یہ چور یکایک ظاہر ہو گیا، ان کو حیات شبلی سے اتنی کد ہو گئی، کہ پہلے تو کتابی صورت میں اس پر مخالفانہ تبصرہ لکھا، اس سے تسکین نہیں ہوئی تو اس موضوع پر ذکر شبلی کے نام سے پوری ایک کتاب لکھ ڈالی۔ لیکن آج حیات شبلی کی غیر معمولی شہرت اور مقبولیت کے آگے اس کے تمام مخالفانہ تبصروں کتابچوں اور رسالوں کو کون جانتا ہے، وہ اردو کے سوانحی ادب کا بہت بیش قیمت اور گرانقدر سرمایہ ہے، جس پر اردو زبان کو ہمیشہ فخر رہے گا، اس کو حیاتِ جاوید پر ترجیح دینا بہت بڑی جسارت ہے، لیکن جہاں تک فن سوانح نگاری کا تعلق ہے اس سے کسی طرح کم بھی نہیں ہے، حیدرآباد دکن کے ایک پروفیسر نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے، کہ سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی لکھ کر حالی سے وہ تاج فضیلت چھین لیا جو حیات جاوید کی بدولت ان کے سر پر تھا۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے "حیاتِ جاوید" کو تقدم کا شرف حاصل ہے اور وہ اس وقت لکھی گئی جبکہ اردو میں اس عہد کے کسی مشہور بزرگ کی جدید طرز پر کوئی سوانح عمری موجود نہیں تھی، الفضل للمتقدم! جناب عبد الرزاق صاحب قریشی نے طلبہ کی سہولت کے لئے اس عظیم و جلیل کتاب کا بھی خلاصہ کر دیا ہے، جس کے لئے وہ نہ صرف حلقہ حالی کے ارباب فکر ونظر کے بلکہ تمام اردو دنیا کے شکریہ کے مستحق ہیں۔[1]

---

[1] یہ دونوں کتابیں اور انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی تمام مطبوعات اس پتہ سے مل سکتی ہیں:۔ ۹۲۔ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی

پروفیسر رشید حسن خاں

ثقافتِ پاکستان

شیخ محمد اکرم صاحب کی مرتب کی ہوئی ایک کتاب "ثقافتِ پاکستان" ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان (کراچی) نے شائع کی ہے۔ اس کتاب پر سنِ اشاعت درج نہیں، جب کہ دیگر تفصیلات موجود ہیں۔ آخر میں اشاریہ بھی نہیں ہے۔ اس زمانے میں کسی ایسی قابلِ ذکر کتاب کا سنِ اشاعت اور اشاریے سے محروم ہونا تعجب خیز ہے۔ مرتب کی صراحت کے مطابق یہ کتاب حکومتِ پاکستان کے شعبۂ نشر و اشاعت کی فرمائش پر مرتب کی گئی ہے، اس سے اس کی اہمیت ظاہر ہے ــــ کتاب میں مختلف عنوانات کے مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ ان کے مندرجات کا اندازہ درج ذیل فہرستِ مضامین سے کیا جا سکتا ہے (مقدمۂ مرتب اور اعترافِ تشکر کے علاوہ)

(۱) ثقافتی ورثے کی نوعیت (۲) آثارِ قدیمہ (۳) فنِ تعمیر (۴) موسیقی (۵) مصوری (۶) خطاطی (۷) دیگر فنون (۸) فارسی کا ادبی ورثہ (۹) اردو ادب (۱۰) علاقائی ادبیات (۱۱) روحانی فیضان (۱۲) جدید ذہنی رجحانات۔

پاکستانی ثقافت کی تشکیل میں جو عناصر کار فرما رہے ہیں، ان کی نشان دہی، اور اس ثقافت کی ایک واضح تصویر پیش کرنا، مؤلف کا اصل مقصد ہے۔ لیکن اثباتِ مدعا کے لئے جو مواد ادھر اُدھر سے جمع کیا گیا ہے اور اس سے جو نتائج نکالے گئے ہیں، وہ بڑی حد تک بحث طلب ہیں ــــ کتاب کے مختلف مضامین پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والوں کے ذہن میں نفسِ ثقافت اور پاکستانی ثقافت کا واضح تصور نہیں ہے ــــ کہیں کہیں یہ بات کھٹکتی ہے کہ مختلف عناصر کو محض اس لئے یک جا کر دیا گیا ہے کہ ان سے حسبِ مدعا استدلال کیا جائے۔ اس سلسلے میں متعلق و غیر متعلق اور صحیح و غلط کا فرق بھی مٹ گیا ہے ــ اگر یہ طے کر لیا جائے کہ ایک دعوے کو بہر طور ثابت کرنا ہے، تو پھر کوئی مشکل باقی نہیں رہتی۔ اس کی متعدد مثالیں اس کتاب میں موجود ہیں۔ دو مثالوں سے اس کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے:-

> "اردو کی ابتدا کہیں بھی ہوئی ہو، اس کی اٹھان ابتدا برِ صغیر کے مسلمانوں کے دل میں ہوئی جس میں یہ خواہش پنہاں تھی کہ وہ ایک ایسی زبان ایجاد کریں جو مقامی بول چال میں ان کی مشترک ایرانی ثقافت اور عربی ورثے کی ترجمانی کر سکے"۔ (ص ۲۱۴)

اردو کے آغاز کے متعلق یہ مفروضہ پیش کرنا کہ یہ دراصل مسلمانوں کی اس خواہش کے نتیجے میں عدم سے وجود میں آئی کہ ایرانی عربی ثقافتی ورثے کی ترجمانی کا ذریعہ ہاتھ آ جائے، یہ طے کر لینا ہے کہ علمائے لسانیات نے آج تک جو کچھ لکھا ہے، وہ سب بے معنی ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ زبانیں کسی طے شدہ پروگرام کے تحت بنا کرتی ہیں۔ اور لوگ باقاعدہ "زبان ایجاد" کیا کرتے ہیں ــ یہ قول عزیز احمد صاحب کا ہے، جن کی روشن خیالی ایک زمانے میں زبان زدِ عام تھی۔ یہ انقلابات ہیں زمانے کے!!

اس سے بھی زیادہ دلچسپ مثال یہ ہے:-

> "کوئی پنجابی مسلمان کسی بنگالی مسلمان کے گھر میں داخل ہوتے ہی یوں محسوس کرتا ہے گویا وہ اپنے ہی گھر میں ہے۔ مشترک طرزِ زندگی اور مشترک فکر و نظر کا جادو، ہندوستانی علاقے کی ایک ہزار

میل کی مسافت کو کالعدم کر دیتا ہے" (ص ۵۵)

دونوں علاقوں کی معاشرت میں اس قدر نمایاں فرق ہے کہ "مشترک طرز زندگی کے سانچے میں اُس کو ڈھالنا" بس فرض کرنے کی حد تک ٹھیک ہے۔ ہاں اگر طرز زندگی، صرف مذہب و متعلقات مذہب کا نام ہو اور جغرافیائی اثرات، رسم و رواج، علاقائی روایات، اور نسلی خصوصیات کا معاشرت سے کوئی تعلق نہ مانا جائے، تو دوسری بات ہے (اسلامی عقیدے کی وحدت فکر ایک جداگانہ مسئلہ ہے۔ ایڈیٹر)

مقالہ نگاروں نے مفروضات کو اس قدر وُسعت دی ہے کہ جس چیز کو چاہا ہے "اسلامی" بنا دیا ہے۔ خواہ وہ فنِ تعمیر ہو، خواہ مصوری ہو، اور خواہ بادشاہت ہو ــــــ مسجد قوۃ الاسلام (دہلی) کا ذکر کرتے ہوئے، ایک مقالہ نگار نے لکھا ہے۔

"ان توسیعات میں آرائش کا انداز کچھ اور ہو گیا۔ وضع خالصۃً اسلامی اور اقلیدسی بن گئی ہے۔" (ص ۸۳)

ایک دوسرے مقالہ نگار نے لکھا ہے :-

"چنانچہ برصغیر پاک و ہند میں اسلامی فتوحات کے بعد سے قرآن مجید اور عربی کتابیں زیادہ تر خطِ نسخ میں لکھی جاتی رہیں۔" (ص ۱۵۰)

ہندوستان میں مختلف خاندان کے بادشاہوں نے حکومت کی ہے۔ اُن کی حکومت کو اسلامی حکومت کہنا، کسی طرح صحیح نہیں۔ مسلم حکومت اور اسلامی حکومت میں بہت فرق ہے۔ ورنہ سلاطین جس قدر غیر معقول حرکات کیا کرتے تھے (خلفائے بغداد سے لے کر شاہان ایران و ہند تک) وہ سب اسلام کے احکام کا ایک جُز بن کر رہ جائیں گی۔ یہی حال فنِ تعمیر وغیرہ کا ہے۔ مختلف ادوار میں فنون کی ترقی، اُن ادوار کے حالات و محرکات کے زیرِ سایہ ہوئی۔ اُن میں بہت سے اثرات کارفرما رہتے تھے۔ علاقائی اثرات، ملکی اثرات، حکومتی اثرات، مذہبی اثرات، اور روایتی اثرات۔ فنون کو اسلامی و غیر اسلامی کے خانوں میں بانٹنا، غلطِ محض ہے۔

اسلام نے تصویر کشی کی ممانعت کی ہے اور موسیقی کو ناجائز بتایا ہے۔ مختلف ممالک کے مسلمان حکمرانوں کے دور میں، خصوصاً ہندوستان کے مسلم فرمانرواؤں کے عہد میں، ان فنون نے بہت ترقی کی ؛ تو کیا مصوری و موسیقی کو بھی اسلامی مصوری اور اسلامی موسیقی کہا جا سکتا ہے ؟ زبان، لباس، تعمیر اور دیگر فنون پر مذہب کا لیبل چسپاں کرنا، اس کا اعلان کرنا ہے کہ ان سب کے متعلق احادیث و قرآن اور کتبِ فقہ و تفسیر میں ساری تفصیلات مرقوم ہیں ــــــ نیز مسلمان بادشاہوں کی حکومت کو "اسلامی حکومت" کہنا اور ان کے معرکوں کو "اسلامی فتوحات" سے تعبیر کرنا ؛ اس کو مان لینا ہے کہ بادشاہت، اسلامی آئینِ حکمرانی کے عین مطابق ہے اور جس قدر جنگیں ان بادشاہوں نے کی ہیں، وہ سب جہاد کا حکم رکھتی ہیں۔ اس سلسلے میں اس حد تک غلو سے کام لیا گیا ہے کہ تضادِ بیان کی بھی پروا نہیں کی گئی ہے۔ ایک مقالہ نگار نے سلطان علاؤالدین خلجی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

"سلطان علاؤالدین نے اسلامی سلطنت کو انتہائی وُسعت بخشی" (ص ۱۸)

لیکن خود مرتبِ کتاب نے "اسلامی سلطنت کو ایسی وسعت بخشنے والے بادشاہ کے متعلق لکھا ہے۔

"ایک اور قدیم اور اہم بادشاہ علاؤالدین خلجی کا کہنا تھا کہ "سلطنت کے ضوابط و احکام کا تعلق سلاطین کی صوابدید سے ہوتا ہے۔ اور وہ قوانینِ شرعی کے دائرۂ عمل میں شامل نہیں ہوتے اس کے نزدیک عوام کا فیصلہ اور قانونی معاملات کا تصفیہ یا نماز ادا کرنے کے طریقوں کا تعین علما اور قضاۃ کا کام ہے"۔ چنانچہ وہ جس بات کو سلطنت کے لئے مفید سمجھتا تھا، اس کے حق میں احکام صادر کر دیتا۔ اور اس امر کو ملحوظ نہ رکھتا کہ یہ مذہباً جائز ہے یا ناجائز" (ص ۵۰)

اس قدر واضح بیان کے بعد علاؤ الدین کی حکومت کو "اسلامی سلطنت" کہنا، مضحکہ خیز بات ہے ۔۔۔ کتاب میں ایسے مفروضات کی کمی نہیں ہے ؛ جن کے فیض سے کتاب کی اہمیت اور افادیت پر بُرا اثر پڑا ہے ۔

شہرت سے غلط فائدہ اُٹھانا ؛ آج کل شیوہ عام بن گیا ہے ۔ بہت سے متعارف اہلِ قلم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ اُن کا نام ہی صحت مضمون کی ضمانت ہے ۔ نہ محنت کی ضرورت ہے نہ پابندیِ آدابِ تحقیق کی ۔ جو کچھ قلم سے نکل جائے ؛ مستند ہے ۔۔۔ ایسی تحریروں کو پڑھ کر، کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُردو میں ابھی ابتدائی آدابِ تحقیق کا بھی رواج نہیں ہوا ہے ۔ یہ صورتِ حال پریشان کن ہے ۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ اس طرح آسان پسندی کی ایک روایت قائم ہوتی جا رہی ہے ۔۔۔ لوگ، مُرتّب یا مقالہ نگاروں کے نام دیکھ کر، اس اعتماد کے ساتھ کتاب خریدتے ہیں، کہ اُن کی معلومات میں اضافہ ہوگا ۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ ہمیشہ کے لئے غلط معلومات حاصل کرنے کا ایک وسیلہ ہاتھ آجاتا ہے ۔

چوں کہ یہ کتاب حکومتِ پاکستان کے ایما پر مُرتّب کی گئی ہے اور اس کے مُرتّب ایک نامور صاحبِ قلم ہیں ؛ اس لئے خیال تھا کہ یہ اُن غلطیوں سے ضرور پاک ہوگی، جو آج کل عام طور سے ایسی کتابوں میں نظر آتی ہیں ۔۔۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کتاب میں ایسی مثالوں کی بھی کمی نہیں ۔ کسی دوسرے ملک کا کوئی پڑھا لکھا شخص یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ کتاب، جس کا مرتب ملک کا معروف ترین صاحبِ قلم ہو اور وہ حکومت کی فرمائش پر مرتب کی گئی ہو ؛ اُس میں ہر قسم کی غلطیاں موجود ہونگی ۔ ذیل میں اسی قسم کی چند غلطیوں کی نشان دہی کی جاتی ہے ۔۔۔ یہ صراحت ضروری ہے کہ یہ جائزہ صرف چند ابواب تک محدود ہے ۔ دوسرے ابواب، مثلاً فنِ تعمیر، موسیقی، مصوری، علاقائی زبانوں کا ادب، میرے تبصرے کے دائرے سے خارج ہیں ۔ جو لوگ ان زبانوں سے یا ان فنون سے واقفیت رکھتے ہوں، یہ اُن کا کام ہے ۔ اگر زیرِ تبصرہ چند ابواب کو معیار قرار دیا جائے، تو باقی ابواب کے متعلق بھی کوئی اچھی رائے قائم کرنا مشکل ہے ۔

(۱) "خطِ نستعلیق بہت خوب صورت اور رواں تھا، لیکن اُس کے لکھنے میں کاتبوں کو زیادہ محنت کرنی پڑتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس لئے خطِ نستعلیق کو تیزی سے لکھنے کی ایک نئی طرز ایجاد ہوئی جس کو خطِ شکستہ کہتے ہیں ۔ اس طرز کا موجد مرزا شفیعا نامی خوشنویس تھا ۔ اس لئے اُس کے نام سے منسوب ہو کر یہ خطِ شفیعا کہلایا ۔" (ص ۱۵۰)

اس عبارت سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں (الف) خطِ شکستہ اور خطِ شفیعہ ایک ہی خط کے دو نام ہیں (ب) خطِ شکستہ کا موجد مرزا شفیعا تھا ۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں ۔

خطِ شکستہ اور خطِ شفیعہ، دو الگ الگ خط ہیں ۔ دونوں نستعلیق کی رواں دواں شکلیں ہیں ۔ ان میں سے رواں شکل شفیعہ ہے اور دواں شکستہ ۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ نستعلیق کو تیزی سے لکھا جائے تو وہ شفیعہ ہے اور بے حد تیزی سے لکھا جائے ۔ تو شکستہ ہے ۔ بہ الفاظِ دیگر، نستعلیق میں پیچ و خم کم ہوں تو شفیعہ ہے اور زیادہ ہوں، تو شکستہ ۔

خطِ شکستہ کا موجد "مرزا شفیعا" نہیں تھا ۔ ہاں خطِ شفیعہ، مرزا شفیع سے منسوب ہے ۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اسی کتاب میں ایک صفحے پر "مسلم خطاطی کے نمونے" بھی پیش کئے گئے ہیں ۔ ان میں خطِ شکستہ اور خطِ شفیعہ دونوں کے نمونے موجود ہیں اور یہ نمونے ہی اُن کے قول کو غلط ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں ۔

(۲) "منشی سرب سنگھ دیوانہ" (ص ۱۵۶)

صحیح : رائے سرب سنگھ دیوانہ ۔ سفینۂ ہندی میں (مولفہ بھگوان داس ہندی شائع کردہ ادارۂ تحقیقاتِ عربی و فارسی پٹنہ) ان کا قطعۂ تاریخ وفات موجود ہے، جس میں پورا نام آگیا ہے ۔

بچار شنبہ ماہ صیام نوزدہم ـــــ برفت رائے سرپ سنگھ سوئے بہشت برین
چو بود او بفن شعر و شاعری ہشیار شدش تخلص دیوانہ اختیار ازین
بہشت یافتہ ـ تاریخ رحلتش باشد دلیل مغفرت او ہمیں بود بہ یقین!
۱۲۰۳ھ

(۳) "مغلوں نے اپنے دو صد سالہ دورِ حکومت میں یعنی اکبر کی تخت نشینی سے لے کر محمد شاہ کی موت تک (۱۵۵۶ء تا ۱۷۴۹ء) سارے شمالی ہندوستان ہی کو نہیں ـ ـ ـ ـ ـ" (ص ۳۷)

اس عبارت کے سلسلے میں مجھے تین باتیں عرض کرنا ہیں ـ ایک تو یہ کہ عبارت کے جزو اول "مغلوں نے اپنے دو صد سالہ دورِ حکومت میں" سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ مضمون نگار کی رائے میں مغلوں نے صرف دو سو سال حکومت کی ہے ـ نیز اس عبارت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انکی حکومت کا زمانہ عہد اکبر سے عہد محمد شاہ تک تھا ـ حالانکہ مضمون نگار کا یہ منشا نہیں ہے ـ غیر مناسب اندازِ بیان نے یہ صورت پیدا کی ہے ـ

دوسری بات یہ، کہ مضمون نگار نے محمد شاہ کا سالِ وفات ۱۷۴۹ء لکھا ہے ـ یہ غلط ہے ـ محمد شاہ کا انتقال ۱۶ اپریل ۱۷۴۸ء کو ہوا تھا (ملاحظہ ہو بیل کی اورینٹیل بایو گریفیکل ڈکشنری)

تیسری یہ کہ، مضمون نگار نے ۱۵۵۶ء سے ۱۷۴۹ء تک کے عہد کو "دو صد سالہ دور" کہا ہے ـ تقاضائے احتیاط یہ تھا کہ یہاں لفظ تقریباً یا اس کا مرادف استعمال کیا جاتا ـ کیونکہ یہ عرصہ دو سو سال سے کم ہے ـ

(۴) "۱۸۰۱ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں نستعلیق اور نسخ کا مطبع قائم ہو گیا" (ص ۱۵۶)

اگر اس سے مراد وہ پریس ہے، جس کو گلکرسٹ نے قائم کیا تھا، تو سنہ غلط ہے؛ کیونکہ یہ مطبع ۱۸۰۲ء میں قائم ہوا تھا (ملاحظہ ہو محمد عتیق صدیقی کی کتاب ـ گلکرسٹ اور اس کا عہد) اور اگر کوئی اور پریس مراد ہے، تو مضمون نگار صاحب براہِ کرم یہ بتائیں کہ وہ کونسا پریس تھا؟

(۵) "ڈاکٹر وحید مرزا نے خسرو کے متعلق انگریزی زبان میں ایک عالمانہ کتاب لکھی ہے"

یہاں یہ لکھنا بھی ضروری تھا کہ اس کتاب کا ترجمہ اُردو میں ہو چکا ہے ـ رہی اس کی عالمانہ حیثیت؛ یہ سراسر محلِ نظر ہے ـ معمولی کتاب ہے ـ آج کل کے معیارِ تحقیق کے لحاظ سے، تو وہ قابلِ ذکر بھی نہیں ـ

(۶) "شاعری کی مقبول طرز وہ تھی جس کو ایران کے نو وارد شعرا نے رائج کیا ـ ان شعرا کی فہرست میں عرفی، نظیری اور ظہوری جیسے مشہور نام ہیں ـ عرفی کی شہرت قصیدہ نگار کی حیثیت سے ہوئی، گو وہ غزلیں بھی خوب کہتا ہے ـ باقی شعرا نے زیادہ تر غزلیں ہی کہی ہیں" (ص ۱۹۰)

مضمون نگار کی تحریر سے صراحت کے ساتھ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ عرفی، نظیری اور ظہوری کو "ایک طرز" کا شاعر مانتے ہیں ـ اور اس کی غیر صحیح ہونا عیاں ہے ـ ظہوری کی شاعری، ان دونوں کی شاعری سے مختلف ہے ـ خصوصاً نظیری کا طرز تو اُس سے قطعاً مختلف ہے اس بات کو بھی نظر انداز کر دیا گیا کہ ظہوری کی شہرت، درحقیقت اُس کی معروف کتاب سہ نثر کے سبب سے ہے، یا اُس کے ساقی نامہ کے سبب سے ـ بحیثیتِ غزل گو وہ نہ مشہور ہوا، نہ اُس کا نام غزل گوئی میں نظیری کے ساتھ لیا گیا، اور نہ لیا جا سکتا ہے ـ

مضمون نگار نے اسی ذیل میں، آگے چل کر لکھا ہے: ـــ عرفی، نظیری اور ظہوری کی شاعری بہت بلند قسم کی ہے" یہ بڑا مبالغہ ہے ـ اگر ظہوری کی شاعری کو "بہت بلند قسم کی" کہا جا سکتا ہے؛ تو پھر سعدی و حافظ اور فردوسی و نظامی کی شاعری کو کس قسم کی مانی جائے گی؟ ـــ تعریفی الفاظ کے صرف میں، بے احتیاطی شیوۂ عام بن گئی ہے؛ مضمون نگار بھی اُسی کا شکار ہیں ـ

(۷) "معاصر الامرا اور معاصر رحیمی، امرا کے یادگار تذکرے ہیں" (ص ۱۹۶)

یہ بالکل نئی کتابیں معلوم ہوتی ہیں۔ کم از کم میری نظر سے نہیں گزریں۔ البتہ، مآثر الامرا اور مآثر رحیمی سے ضرور واقف ہوں۔

(۸) "خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (۱۳۲۱ ــــ ۱۴۲۲ء) نے اردو نثر کی سب سے پہلی تصنیف لکھی" (ص ۲۱۹)

مقالہ نگار نے اس تصنیف کا نام نہیں لکھا۔ لیکن بہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی مراد معروف کتاب معراج العاشقین سے ہے؛ جس کو خواجہ صاحب کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ لیکن یہ انتساب ہنوز محتاج ثبوت ہے۔ اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ یہ کتاب انہیں کی ہے ــــ "تصنیف لکھی" کی بلاغت سے یہاں قطع نظر کی جاتی ہے۔

(۹) ص ۲۱۷ پر میر تقی میر کا سنہ ولادت و وفات بالترتیب ۱۷۲۲ء اور ۱۸۰۸ء لکھا ہوا ہے ــــ میر کے سال وفات میں تو کوئی اختلاف ہی نہیں۔ ان کا انتقال ماہ شعبان ۱۲۲۵ھ میں ہوا تھا؛ جو برابر ہے ۱۸۱۰ء کے۔

(تفصیلات کے لئے دیکھئے حاشیہ دستور الفصاحت ذکر میر۔ رسالہ معیار (پٹنہ) بابت مئی ۱۹۳۶ء)

سنہ ولادت میں ضرور معمولی سا اختلاف ہے۔ لیکن مرجح قول یہ ہے کہ ان کی ولادت اواخر ۱۱۳۵ھ میں ہوئی؛ جو مطابق ہے ۱۷۲۳ء کے۔

(ملاحظہ ہو مجلہ معاصر شمارہ ۱۳ ص ۱۰۲)

(۱۰) سودا کا سال وفات ۱۷۸۰ء لکھا گیا ہے (ص ۲۱۷) یہ بھی صحیح نہیں۔ سودا کی وفات ۴ رجب ۱۱۹۵ھ کو ہوئی تھی۔ (سودا ــ مؤلفہ شیخ چاند۔ حاشیہ دستور الفصاحت ذکر سودا ــ تاریخ لطیف قلمی کتاب خانہ رام پور) یہ ۲۶ جون ۱۷۸۱ء کے مطابق ہے۔

(حسب تقویم شائع کردہ انجمن ترقی اردو کراچی)

(۱۱) خواجہ میر درد کا سال ولادت ۱۷۲۰ء اور سال وفات ۱۷۸۴ء لکھا ہے (ص ۲۱۸) دونوں سنہ غلط ہیں۔ سنہ وفات غلط تر ہے۔ خواجہ صاحب کا سنہ ولادت ۱۱۳۱ھ ہے (میخانہ درد) یہ مطابق ہے ۱۷۱۹ء کے۔
خواجہ صاحب کی وفات ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ کو ہوئی تھی۔ (میخانہ درد۔ حاشیہ دستور الفصاحت ذکر درد۔ تاریخ لطیف) یہ ۶ جنوری ۱۷۸۵ء کے مطابق ہے۔

(۱۲) خواجہ میر درد کا ذکر کرتے ہوئے مقالہ نگار نے لکھا ہے ــــ "اپنے عہد و ماحول کے انتشار کی تاب نہ لاکر، باطن کی پاکیزگی اور روحانی مسرت کے سرچشمہ یعنی تصوف کی طرف متوجہ ہوئے"۔ (ص ۲۱۸)

مقالہ نگار کے انداز نگارش سے صراحت کے ساتھ یہ معلوم ہوتا ہے کہ درد اپنے ماحول کے انتشار کی تاب نہ لاکر تصوف کی طرف متوجہ ہوئے۔ گویا وہ ایک زمانے میں تصوف کی طرف متوجہ نہیں تھے!! مقالہ نگار کو معلوم ہونا چاہیئے کہ تصوف درد کو ورثے میں ملا تھا۔ ان کے والد خواجہ ناصر عندلیب اپنے زمانے کے معروف صوفی تھے۔ درد کی نشو و نما اسی ماحول میں ہوئی۔ وہ آغاز ہی سے بادۂ تصوف سے سرشار تھے۔ اس میں زمانے کے انتشار کو مطلق دخل نہیں تھا۔ مقالہ نگار اگر درد کی تصانیف کو ایک بار پڑھ لیتے، تو ان کو یہ غلط فہمی نہیں ہو سکتی تھی۔ میر درد کی معروف تصنیف علم الکتاب میں ساری تفصیلات موجود ہیں۔

(۱۳) مومن کا سنہ ولادت ۱۷۹۹ء اور سنہ وفات ۱۸۵۱ء لکھا گیا ہے (ص ۲۲۰) دونوں سنہ غلط ہیں۔ مومن کا سنہ ولادت ۱۲۱۵ھ ہے (آبحیات) یہ ۱۸۰۱ ــ ۱۸۰۰ء کے مطابق ہے۔ مومن کا انتقال ۱۲ مئی ۱۸۵۲ء کو ہوا تھا۔ (نادرات غالب۔ مکتوب ۱۹)

(۱۴) ص ۲۲۲ پر "ڈاکٹر گلکرائسٹ" لکھا ہوا ہے۔ صحیح املا "گلکرسٹ" ہے۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے محمد عتیق صدیقی کی کتاب۔ گلکرسٹ اور اس کا عہد)

(۱۵) "نفحات الانس میں جامی حضرت بایزید سے روایت کرتے ہیں" (ص ۲۹۷)

کتاب کا صحیح نام نفحات الانس ہے۔

(۱۶) "ڈاکٹر عبدالحق اپنی کتاب (اُردو میں صُوفیائے کرام کا حصہ) میں کہتے ہیں"۔ (ص ۳۰۶)

کتاب کا صحیح نام ہے۔ "اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام"۔

(۱۷) ایک زمانے میں' غالب کی ترقی پسندی کے ثبوت میں' اُن کا غزل سے غیر مطمئن ہونا بھی بیان کیا جاتا تھا۔ صاف صاف کہا جاتا تھا کہ غالب کو غزل کی تنگ داماںی کا شدید احساس تھا اور اِس مفروضے کی بنیاد، غالب کے اِس معروف شعر پہ رکھی جاتی تھی :-

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل کچھ اور چاہیئے وُسعت مرے بیاں کے لئے

یہ شعر درحقیقت اُس قطعے کا جزو ہے جو اس غزل کے آخر میں ہے اور جس میں شاعر نے ظرفِ تنگنائے غزل کی شکایت محض اس لئے کی ہے کہ اِس میں تجمل حسین خاں کی مدح وثنا کا مکمل بیان نہیں سما سکتا۔ یاروں نے اس شعر کو ما قبل ومابعد سے الگ کر کے' خیال آرائی کا ہدف بنا لیا۔ بہرحال اب بیشتر حضرات اِس مفروضے کا غلطِ محض ہونا تسلیم کر چکے ہیں؛ لیکن فاضل مقالہ نگار ہنوز اُسی خیالِ غیر واقعی کے اسیر معلوم ہوتے ہیں۔ ص ۲۲۱ پر' اِسی شعر کو بنیاد بنا کر' اُسی نوع کی باتیں لکھی گئی ہیں۔

(۱۸) ص ۳۲۷، ۳۲۸ پر مولانا شبلی کا تذکرہ موجود ہے۔ اِس سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ اِس تذکرے کو ثقافتِ پاکستان سے کوئی تعلق بھی ہے؛ مقالہ نگار نے کئی باتیں ایسی لکھی ہیں، جن کو کسی طرح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ تعجب ہوتا ہے کہ دو صفحے کا مختصر سا بیان بھی فاش غلطیوں سے گراں بار ہے۔

(الف) "سولہ سال تک اپنے علی گڑھ کے دورانِ قیام میں مولانا شبلی سید احمد خاں کے صرف مدّاح ہی نہیں رہے، بلکہ اُن کی تحریک سے کامل اتفاق کرتے رہے"۔

یہ بالکل صحیح نہیں ہے کہ مولانا شبلی سر سید احمد خاں سے مکمل اتفاق کرتے رہے۔ مقالہ نگار اگر حیاتِ شبلی کے صفحات ۱۶۰، ۲۳۲، اور ص ۲۸۱ سے ص ۲۹۸ تک کا حصہ سرسری طور پر بھی پڑھ لیں' تو اُن کو اپنے اِس قول کی خامی معلوم ہو جائے گی۔ میں یہاں صرف مولانا شبلی کے ایک خط کا اقتباس نقل کرنا کافی سمجھتا ہوں، جس کو حیاتِ شبلی میں بھی نقل کیا گیا ہے۔

"رائے میں ہمیشہ آزاد رہا۔ سر سید کے ساتھ سولہ برس رہا۔ لیکن پولٹیکل مسائل میں ہمیشہ اُن سے
مخالف رہا اور کانگریس کو پسند کرتا رہا، اور سر سید سے بارہا بحثیں رہیں"۔ (حیاتِ شبلی ص ۲۹۷)

(ب) "اُنھوں نے مسٹر آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھی' جس کے ذریعے اُن کو مغربی خیالات سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملا"۔

یہ دعویٰ کہ مولانا شبلی نے اتنی فرانسیسی سیکھ لی تھی کہ اُس کے ذریعے سے وہ مغربی خیالات سے واقفیت حاصل کر سکتے تھے، محتاجِ ثبوت ہے۔ مولانا کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی نے حیاتِ شبلی میں' لکھا ہے کہ "علامہ شبلی نے پروفیسر آرنلڈ سے کسی قدر فرنچ بھی سیکھی تھی" (ص ۱۴۰)۔ اب اِس "کسی قدر" کو جس قدر جی چاہے' وُسعت دے لیجئے۔ خود مولانا شبلی کی کسی تحریر سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اُنھوں نے فرنچ کے واسطے سے مغربی خیالات سے واقفیت حاصل کی۔ ہاں یہ البتہ معلوم ہوتا ہے کہ جب ان کو مغربی خیالات سے واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی' تو وہ کسی شخص سے انگریزی کی کتاب پڑھوا کر اخذِ مطلب کرتے تھے۔ پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیاتِ فارسی جب چھپ کر آئی، تو انھوں نے اس کو اسی طرح پڑھوا کر سنا تھا۔ اس کی صراحت کئی جگہ موجود ہے۔

(ج) "سید احمد خاں کی تحریک سے اور مسٹر آرنلڈ کی رہنمائی میں وہ اُردو کے شاہکار تیار کرنے لگے"۔

یہ عبارت غیر محتاط اندازِ نگارش کا اچھا نمونہ ہے۔ آرنلڈ کی رہنمائی کا ادعا، اور یہ ادعا کہ شبلی کے شاہکار' سر سید کی تحریک کا نتیجہ تھے؛ دونوں دعوے

کسی قید یا صراحت کے بغیر قابلِ قبول نہیں۔ شبلی کا ایک شاہکار الفاروق بھی ہے اور یہ سب کو معلوم ہے کہ سر سید اس تصنیف کے حق میں نہیں تھے، تحریک در کنار۔ شبلی کا آرنلڈ سے فیضیاب ہونا یا متاثر ہونا برحق؛ لیکن ان دونوں کا مطلب "رہنمائی" سے مختلف ہے۔

(د) غیر محتاط اندازِ بیان کا ایک اس سے بھی زیادہ عجیب نمونہ موجود ہے۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے۔ " فارسی نظم پر اُن کی یادگار تصانیف شعر العجم اور موازنۂ انیس و دبیر اپنے بلند پایہ تنقیدی معیار اور ادبی خصوصیات کے لئے ہمیشہ پسند کی جائیں گی۔"

مقالہ نگار کا یقیناً یہ مقصد نہیں ہوگا، لیکن غیر مناسب طرزِ ادا کے سبب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شعر العجم اور موازنہ دونوں فارسی نظم پر اُن کی یادگار تصانیف (ص) "ان کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں یعنی سیرت النبی، الفاروق اور المامون بھی اسی قدر اہم ہیں"۔ کیا سیرۃ النعمان سوانح عمری کے ذیل میں نہیں آتی ہے؟

(۱۹) " ترکی کے فارسی ادب کی تاریخ میں ایک ایسا دور بھی رہ چکا ہے، جب وہاں ادبِ فارسی کے ہندوستانی مسلک "سبق ہندی" کا اثر غالب تھا۔" (ص ۲۵)

سبق ہندی، سبکِ ہندی، کی مسخ شدہ صورت ہے۔ مقالہ نگار نے حسبِ معمول حوالہ نہیں دیا ہے۔ اس سے بجا طور پر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ مقالہ نگار ترکی زبان و ادب کے بھی ماہر ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے۔ تو وہ یہ بتائیں کہ کوئی شخص اُن کی اس تحریر کو کیوں صحیح مانے گا؟ ——
مقالہ نگار یا تو صراحت کے ساتھ یہ بتاتے کہ یہ ان کے ذاتی مطالعے کا نتیجہ ہے۔ یا اُس ماخذ کا حوالہ دیتے، جہاں سے یہ قول لیا گیا ہے۔ پڑھنے والے ماخذ کے مستند یا غیر مستند ہونے کے لحاظ سے کوئی فیصلہ کر سکتے۔

(۲۰) ص ۲۰۸ پر حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کا نام "شاہ چراغ دہلوی" لکھا ہوا ہے۔ مقالہ نگار کے علاوہ شاید ہی کسی نے "شاہ چراغ" لکھا ہو۔

(۲۱) " فارسی نے بنگالی کو نئی اصنافِ سخن عطا کیں مثلاً غزل" (ص ۲۰۹)

دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ فارسی نے بنگالی کو نئی اصنافِ سخن عطا کیں، لیکن ذکر صرف ایک صنفِ سخن "غزل" کا کیا گیا ہے۔

(۲۲) ص ۲۱۵ پر امیر خسرو کے متعلق لکھا ہے۔ " اور جنھوں نے فارسی کے علاوہ اُردو شاعری میں بھی تجربے کئے تھے"۔

اس سلسلے میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں (الف) امیر خسرو سے جس کلام کو منسوب کیا جاتا ہے، اُس میں سے بیشتر کا انتساب محتاجِ ثبوت ہے۔ جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ یہ کلام خسرو ہی کا ہے، اُس وقت تک اُس کلام کی بنیاد پر کوئی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اور ایسا کوئی ثبوت ابھی تک پیش نہیں کیا جا سکا ہے۔

(ب) خسرو کے زمانے میں "اُردو شاعری" وجود میں نہیں آئی تھی۔ وہ زمانہ اُن زبانوں کا ہے، جن سے اُردو کی ترتیب عناصر کی ابتدا ہوئی۔ مقالہ نگار نے ص ۲۱۶ پر ولی کو "دکنی اُردو کا سب سے بڑا شاعر" لکھا ہے۔ ولی کو تو از راہِ احتیاط "دکنی اُردو" کا شاعر کہا جائے، اور امیر خسرو کو جو ولی سے کئی سو برس پہلے گزرے ہیں، "اُردو شاعری" میں تجربہ کرنے والا بتایا جائے، اس کو بوالعجبی کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔

(۲۳) ص ۲۱۸ پر مصحفی کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے "غزل کی اصلاح کی"۔ مقالہ نگار نے اس اصلاح کی تفصیل پیش نہیں کی، ورنہ معلوم ہوتا کہ اس سے اُن کی مراد کیا ہے۔ بہر حال یہ قول کہ مصحفی نے غزل کی اصلاح کی؛ محتاجِ ثبوت ہے۔ آج تک مصحفی پر "یہ الزام" کسی نے نہیں لگایا ہے۔

(۲۴) انشا کے متعلق لکھا ہے۔ " اُن سے اور مصحفی سے، جو طبعاً سنجیدہ تھے؛ بذلہ سنجی اور مزاح کے میدان میں بعض بڑے دلچسپ معرکے ہوئے"۔ انشا و مصحفی کے معرکوں کا حال کتابوں میں درج ہے۔ اُن کو پڑھنے کے بعد شاید ہی کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت کر سکے کہ یہ معرکے "بذلہ سنجی و مزاح کے میدان" میں لڑے گئے تھے۔ "مصحفی و مصحفن" والے سوانگ اور اُس معرکے سے متعلق ہجویات کو پڑھ کر، اُن معرکوں کو اُس وقت

بذلہ سنجی اور مزاح نہیں کہا جا سکتا، جب تک بذلہ و مزاح کے معنی نہ بدل دیئے جائیں۔ ان معرکوں میں پھکڑپن اپنی حد کو پہنچ گیا تھا۔

(۲۵) "حالی کی نثر پر ایک اور صاحب کمال کا بھی اثر پایا جاتا ہے جو سر سید کے حلقۂ اثر سے باہر تھے۔ یہ بزرگ مولانا محمد حسین آزاد۔۔۔ تھے" (ص ۲۲۳)

حالی و آزاد کے اسالیب نگارش مختلف بلکہ متضاد ہیں۔ ایک سادہ نگاری کا دوسرا مرصع نگاری کا استاد تھا۔ حالی کی زبان، تنقید کی زبان ہے، آزاد کی زبان انشاپردازی کی جان ہے۔ ان میں سے کوئی بھی دوسرے سے کسی حد تک بھی متاثر نہیں تھا۔ یہ مصیبت تو اسی زمانے کے بعض ناقدین کی لائی ہوئی ہے کہ انھوں نے تنقید کی زبان کو انشائیے کی زبان بنا دیا ہے۔ حالی کا دامن اس گناہ کے داغ سے پاک تھا۔ یہ کہنا کہ حالی کی تحریر میں آزاد کے انداز نگارش کے عناصر پائے جاتے ہیں؛ حالی پر بہتان لگانا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی کتاب مطالعۂ حالی میں یادگار غالب اور آبحیات کی کچھ عبارتوں کو پیش کیا ہے۔ جن میں نفس مفہوم اور کہیں جگہ الفاظ بھی مشترک ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ تو نکل سکتا ہے کہ حالی نے یادگار غالب میں آبحیات کی کچھ عبارتوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ قطعاً نہیں نکل سکتا کہ حالی کی نثر پر آزاد کے اسلوب کا اثر پڑا۔ یہ دونوں مختلف باتیں ہیں۔

(۲۶) "آخر زمانے میں اردو شاعری کی سرپرستی تنزل پذیر مغل دربار نے کی، مگر اردو نظم و نثر کے تمام جید اساتذہ چاہے وہ دکنی طرز کے لکھنے والے ہوں یا گجراتی طرز کے یا ریختہ کے، صوفی بزرگ تھے" (ص ۲۰۵)

منقولہ بالا عبارت میں دو باتیں کہی گئی ہیں (الف) آخر زمانے میں اردو شاعری کی سرپرستی مغل دربار نے کی (ب) اردو نظم و نثر کے تمام جید اساتذہ صوفی بزرگ تھے۔ دونوں محل نظر ہیں۔

غالباً یہ مغل دربار کی سرپرستی ہی کا اثر ہوگا کہ میر، سودا، سوز، انشا، مصحفی، قائم، میر حسن وغیرہ دہلی کو چھوڑ کر چلے گئے! بالکل آخری زمانے میں مغل دربار (اگر اس کو صحیح معنی میں دربار کہا جا سکتا ہے) ذوق کی سرپرستی کا ضرور گناہ گار رہے لیکن یہ سرپرستی بھی ترقی کی آخری منزل میں اس ماہانہ شرح تنخواہ سے آگے نہ بڑھ سکی، جس تنخواہ پر اسی زمانے کی ایک معمولی سی ریاست میں ایک موسیقار بھی ملازم تھا۔ اگر کسی ایک فرد کے استاد شاہ ہونے کا مطلب، پوری شاعری کی سرپرستی ہو سکتا ہے، تو اور بات ہے ـــــ مغل دربار تو اس زمانے میں شاہزادوں کی بھی سرپرستی کرنے کے قابل نہیں رہا تھا ـــــ اس کے ماسوا مقالہ نگار سے یہ بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ میں شاعری و نثر کو جو ترقی نصیب ہوئی؛ کیا وہ بھی مغل دربار کی سرپرستی کا اثر تھا؟

مقالہ نگار کا یہ قول بھی غلط ہے کہ اردو نظم و نثر کے تمام جید اساتذہ صوفی بزرگ تھے۔ معلوم نہیں مقالہ نگار کی اس اطلاع کا ماخذ کیا ہے۔ عام تاریخی و تحقیقی ماخذ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو نظم و نثر کے اکثر و بیشتر جید اساتذہ "صوفی نہیں تھے۔ مقالہ نگار اگر یہ بتائیں کہ فورٹ ولیم کالج کے اردو مصنفین میں سے کون شخص "صوفی بزرگ" تھا۔ ان کے علاوہ شاہ حاتم، فغاں، مضمون، ناجی، میر، سودا، قائم، میر حسن، مصحفی، جرأت، انشا، ناسخ، آتش، انیس، دبیر، رجب علی بیگ سرور، غالب، ذوق، مومن، شاہ نصیر، میں سے کون کون "صوفی بزرگ" تھا۔ تو یقیناً ہم سب کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ مفروضات پر پوری عمارت تعمیر کر لینا، شیوۂ عام بن گیا ہے۔

اس کتاب میں غیر مناسب انداز بیان نے غلط فہمی کے لئے بہت گنجائش پیدا کر دی ہے۔ تعجب اس پر نہیں ہے کہ مقالہ نگاروں نے اس کو کیسے روا رکھا، یہ تو آج کل رسم عام ہے۔ تعجب اس پر ہے کہ فاضل مرتب نے اپنی ذمے داری کو گلدستۂ طاق نسیاں بنانا کیوں پسند کیا؟ چند مثالوں سے اس کا کچھ اندازہ ہوگا:۔

(۱) "اکبر کی اتا ماہم انگہ نے دہلی میں ایک کالج قائم کیا تھا۔" (ص ۴۱)

اکبر کے زمانے میں مدرسے ہوتے تھے ۔ لفظ کالج آجکل مخصوص نوعیت کی درس گاہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ۔ کسی قدیم یا جدید مدرسے کو، خواہ کتنا ہی بڑا ہو، کسی صراحت کے بغیر کالج کہنا؛ غلط فہمی پیدا کرنے کا اسقاط ہے ۔ اس کے لئے دارالعلوم قسم کے کئی لفظ موجود ہیں ۔

(۲) اکبر کی بیوی سلیمہ سلطانہ، شاہ جہاں کی بیوی ممتاز محل، اورنگ زیب کی بہن جہاں آرا بیگم، اور زیب النسا کو "بلند پایہ شاعر خواتین" لکھا گیا ہے۔ (ص ۳۲) جب کہ ان میں سے کسی کے دوچار سے زیادہ شعر دستیاب نہیں ہوتے ہیں۔ ان خواتین کا شاعر ہونا مسلم؛ لیکن "بلند پایہ شاعر" ہونا محض شاعرانہ اندازِ بیان ہے، جس کو کسی غیر شاعرانہ یا سنجیدہ تحریر سے کوئی علاقہ نہیں ۔ ہاں اگر مقالہ نگار گمانِ عام کے تحت، دیوانِ مخفی کو زیب النسا کا دیوان مانتے ہوں؛ تو اور بات ہے ۔ (جس کا غلط ہونا ثابت ہو چکا ہے)

(۳) فیروز شاہ بہت بڑا معمار تھا؛ جس نے کئی شہروں کی بنیاد ڈالی"۔ (ص ۸۵)

معلوم ہوتا ہے کسی معروف معمار (راج) کا ذکر کیا جا رہا ہے ۔ حالانکہ مقالہ نگار کی مراد ہے سلطان فیروز شاہ تغلق سے !!

(۴) شاہ جہاں کے ذوقِ تعمیرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ـــــ "آگرہ میں اُس نے کئی محل اور دالان تعمیر کیئے"۔ (ص ۹۰)

غالباً مقالہ نگار اور مُرتب، دونوں کی رائے میں، تعمیر کرنے اور تعمیر کرانے میں، کوئی فرق نہیں ہے !

(۵) مشہور شاعر مسعود سعد سلمان کے متعلق لکھا ہے۔" قید ہی میں اُس نے اپنی وہ مشہور نظمیں لکھیں، جن کو حبسیات کہا جاتا ہے" (ص) مسعود سعد نے نظمیں نہیں، قصائد کہے ہیں۔ "نظمیں" ایک جدید اصطلاح ہے ۔ اس کو قصائد یا دیگر اصنافِ سخن کے لئے استعمال کرنا غلط فہمی کا سبب بن سکتا ہے ۔ مقالہ نگار نے یہ خلطِ مبحث کئی مقامات پر کیا ہے ۔ مثلاً ص ۸۷ پر ایک رُباعی نقل کی ہے، اور اس کو بھی "نظموں" میں محسوب کیا ہے ۔ اس کے بعد ہی ایک قصیدے کے تین شعر نقل کرنے سے پہلے لکھا ہے "ایک اور نظم میں کہتا ہے"۔ ص ۸۸ پر ایک لغت شرف نامہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ۔" اس میں خود مولف کی بہت سی نظمیں ہیں"۔

(۶) "۵۸-۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ نے اس جنگ کی قیادت کی، جو بیرونی اقتدار سے آزادی حاصل کرنے کے لئے کی گئی تھی" (ص ۳۱۸)

بہادر شاہ ظفر جیسے معذور و مجبور کے لئے یہ لکھنا کہ انھوں نے "قیادت کی" غلط بیانی ہے ۔ لفظ قیادت کا مفہوم، مجبوری کی سرپرستی سے مختلف ہے ۔

(۷) وہ علیا حضرت ملکہ برطانیہ کی پریوی کونسل کے رُکن مقرر ہوتے"۔ (ص ۳۲۴)

مقالہ نگار نے جس وفادارانہ تعظیم و تکریم کے ساتھ، ملکۂ وکٹوریہ کا ذکر کیا ہے: وہ یقیناً وفاداری بشرطِ استواری کا مظہر ہے ۔ لیکن اُن کے اس اندازِ بیان سے بظاہر یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ یہ کتاب ۱۹۴۷ء سے پہلے مُرتب کی گئی تھی ۔

(۸) "نذیر احمد نے اُردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے ۔ اُن کے افسانوں نے، جو مغربی طرز پر لکھے گئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔" (ص ۳۱)

مولوی نذیر احمد صاحب نے "افسانے" نہیں، ناول لکھے ہیں ۔ احتیاط کیجئے تو اُن کو قصّے کہہ لیجئے ۔ لیکن افسانہ کہنا، کسی طرح مناسب نہیں۔ اِسی کتاب میں ص ۲۲۳ پر ایک مقالہ نگار نے ان کو قصّے ہی لکھا ہے ـــــ "ایک اور رفیق کار مولانا نذیر احمد تھے، جنھوں نے اصلاحی قصّے تصنیف کرکے، اُردو میں ناول نویسی کی بنیاد رکھی"۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ یہ افسانے "مغربی طرز پر لکھے گئے تھے ۔

کتاب میں اشعار زیادہ نہیں ہیں، لیکن جو ہیں، اُن میں سے متعدد تصحیح طلب ہیں ۔ مثلاً:

دل پر خوں کی اک گلابی سے ۔۔۔ عمر بھر ہم رہے شرابی سے

جی ڈھہا جائے ہے سحر سے آج ۔۔۔ رات گذرے گی کس خرابی سے (ص ۲۱۷)

پہلا شعر مشہور اسی طرح ہے، لیکن ہے دراصل یوں: ؎ عمر بھر ہم رہے شرابی سے ۔ دل پر خوں کی اک گلابی سے ۔ (کلیات میر مرتبہ آسی)

دوسرے شعر کے مصرعے اول کے آخر میں "آج" کے بجائے "آہ" ہونا چاہیے :۔ ع جی ڈہا جاتے ہے سحر سے آہ (کلیات مرتبہ آسی)

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے خود مختاری کی — چاہیں ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
یاں کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے تو اتنا ہے — رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا
میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھتے ہو تم اُن نے تو — قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

پہلے شعر کا مصرعۂ اولیٰ، جس بری طرح ساقط الوزن ہوا ہے' وہ قابلِ توجہ ہے۔ ان اشعار کی صحیح صورت یہ ہے :۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی — چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں' ہم کو عبث بدنام کیا
یاں کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے — رات کو رو رو صبح کیا، یا دن کو جوں توں شام کیا
میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو — قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا (کلیات میر مرتبہ آسی)

اسی صفحے پر خواجہ میر درد کا ایک مصرع اس طرح لکھا ہوا ہے ع درد کے ملنے سے اے یار برا کیوں مانے۔ "مانے" کے بجائے "مانا" ہونا چاہیے۔ (دیوان درد مرتبہ نواب صدر یار جنگ)

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں (ص ۲۲۱)

دوسرا مصرع صحیح اس طرح ہے ع مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں (دیوان غالب مرتبہ مولانا عرشی نیز مرتبہ مالک رام)

ایک اور افسوسناک بات یہ ہے کہ اس کتاب میں غلط جملوں کی بہتات ہے۔ یہ غلطیاں ایسی ہیں کہ ان کو کسی مشاق انشا پرداز سے منسوب کرنا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ واقعات و حقائق کی صحت کے ساتھ ساتھ، مناسب انداز بیان اور صحیح بلکہ فصیح زبان بھی ایک اچھی کتاب کے لازمی اجزا ہیں۔ بطور مثال ایسے کچھ جملے درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) "اورنگ زیب نے فارسی ملک الشعرا کا عہدہ منسوخ کر دیا"۔ (ص ۲۷)

عہدے کو منسوخ ہونے، یا منسوخ کرنے سے کیا علاقہ! عہدہ، حکم نہیں ہوتا کہ اس کو منسوخ کیا جائے۔

(۲) اس مختصر جائزے میں بھی قلعۂ لاہور کے شیش محل کا ذکر حذف کرنا ممکن نہیں"۔ (ص ۶۷)

منسوخ کی طرح لفظ حذف بھی یہاں بے محل صرف ہوا ہے۔

(۳) مسعود کے کلام میں متروک الفاظ اور محاورے اور اس زمانے کی عروضی خاصیتیں پائی جاتی ہیں"۔ (ص ۱۷۷)

عروضی خاصیتوں سے کیا مراد ہے، اس کو مقالہ نگار ہی بتا سکتے ہیں' عروض کی اور خاصیتیں —— خوب !؟

(۴) "حال ہی میں اس کا ضخیم کلام ایران میں شائع ہوا ہے"۔ (ص ۱۷۸)

لفظ ضخیم مجموعۂ کلام کی صفت ہو سکتا ہے' نہ کہ کلام کی۔

(۵) "اردو نثر کی سب سے پہلی تصنیف لکھی" (ص ۲۱۶)

"تصنیف[1] لکھنا" کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

(۶) "ان کے ہم عصر سودا ...... نے اپنے عہد و رجال پر طنزیہ شاعری کی"۔ (ص ۲۱۷)

عہد و رجال پر شاعری کرنا، صحتِ زبان و بیان کا خون کرنا ہے۔

(۷) جو کبھی کبھی اس اسکول کی رکیک اور پست سطح سے بلند ہو کر"۔ (ص ۲۱۹)

[1] تالیف اور تصنیف کے ساتھ "لکھنا" روزمرہ کے خلاف ہے (م ۔ ق)

رکیک کو پست کی طرح ، سطح کی صفت نہیں قرار دیا جا سکتا ۔ یہ دوسرے الفاظ کے ساتھ آتا ہے ۔

(۸) "اس کے بعد لکھنؤ کے نسبتاً نو شعرا میں ایک مذہبی تحریک شروع ہوئی " (ص ۲۲۰)

"نسبتاً نو شعرا" سے کیا مراد ہے ، میں نہیں سمجھ سکا ۔ یہ لکھنا بیکار ہے کہ اس کا صحیح املا نسبتاً ہے ۔ کیونکہ اس کتاب میں صحتِ املا کا حال سب سے زیادہ برا ہے ۔

(۹) "بابا فرید نے باقاعدہ طور سے شاگردوں کو تربیت دینے کر " (ص ۳۰۰)

"طور سے" حشو ہے ۔

(۱۰) اصل ماخذات سے استفادہ کیا ہے " (ص ۳۲۴)

یہ جمع الجمع غیر ضروری بھی ہے اور غیر فصیح بھی ۔

(۱۱) اسلامی ثقافت و تمدن کے سارے دور کے سب سے بڑے شاعر " (ص ۲۲۴)

" سارے دور کے " بے حد غیر مانوس ہے ۔

(۱۲) " کاتبوں نے اس پر سے ایک آسان اور ہموار خط ایجاد کیا " (ص ۱۴۹)

یہاں "پر" غلط ہے ۔ " اس سے " کافی ہے ۔

(۱۳) یہ خط دسویں صدی عیسوی اور اس کے سو سال بعد مکمل ہو چکا تھا " (ص ۱۴۹)

دسویں صدی کے سو سال بعد ، عجیب انداز نگارش ہے ۔ " گیارھویں صدی " لکھا جا سکتا تھا ۔

(۱۴) خطاطوں کی ایک کثیر تعداد تھی ، جنھوں نے اس فن میں اپنا اہم حصہ پیش کیا ہے " (ص ۱۵۴)

" حصہ پیش کیا " اس جملے میں بے جوڑ ہے ۔

(۱۵) " ان کے ایجاد کردہ بعض طرز خطوں کے نام یہ ہیں " (ص ۱۵۵)

" طرز خطوں " بے معنی مرکب ہے ۔

کتاب میں ایک بڑی کمی یہ محسوس ہوتی ہے کہ بیشتر واقعات ، حوالے کی نشان دہی کے بغیر درج کیے گئے ہیں ۔ اور سنین تو تقریباً سبھی یوں ہی لکھے گئے ہیں ۔ اس سے کئی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ۔

(الف) کسی واقعے کا ماخذ معلوم نہ ہو ، اس صورت میں پڑھنے والا اندازہ نہیں کر سکتا کہ جو کچھ لکھا گیا ہے ، وہ قابلِ اعتبار بھی ہے یا نہیں ۔ یہ بڑی خامی ہے ، جس سے سارے مندرجات کی افادیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے ۔ خصوصاً اس صورت میں کہ بعض مندرجات کا غلط ہونا عیاں ہو ۔

(ب) ماخذ کا حوالہ دینے سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ لکھنے والا مجبور ہو کر ، مستند ماخذ کی طرف رجوع کرتا ہے ۔ اور ثانوی ماخذ سے دامن بچاتا ہے ۔ اس طرح محنت تو کرنا پڑتی ہے ، لیکن صحیح بات ضرور معلوم ہوتی ہے ۔ اس کتاب میں سنین کی جو غلطیاں ہیں ، وہ اسی کا نتیجہ ہیں کہ مقالہ نگاروں نے ، مستند ماخذ کی طرف رجوع کرنے کا التزام نہیں کیا ؛ جہاں جو ملا ، اسے نوٹ کر لیا ۔ چونکہ حوالہ دینا نہیں تھا ۔ اس لئے بظاہر کسی مشکل کا بھی احساس نہیں ہوا ۔

(ج) ایسی کتابوں سے آسان پسندی کی روایت قائم ہو جاتی ہے ، جو نئے لکھنے والوں کے لئے دامِ فریب بن جاتی ہے ۔ مستند ماخذ کی جستجو کی بجائے ، وہ محض نقلِ قول پر اکتفا کر لیتے ہیں اور اس کو صحیح سمجھتے ہیں ، کیونکہ اس کا " مستند نمونہ " موجود ہوتا ہے ۔ جب کوئی شخص اس غلطی کی

پر متنبہ کرتا ہے، تو ان حضرات کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بھی کوئی قابلِ اعتراض بات ہو سکتی ہے۔

یہ شروع میں ہی لکھا جا چکا ہے کہ کتاب اشاریے سے محروم ہے۔ یہ بڑی کمی ہے۔ آج کل قابلِ ذکر کتابوں میں، آخر کتاب میں ایسے مآخذ کی مکمل فہرست درج کر دی جاتی ہے، جس سے اس کتاب کی تیاری میں کام لیا جاتا ہے۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اُس موضوع سے متعلق بہت سے قابلِ ذکر مآخذ، کام کرنے والوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ یہ کتاب اِس سے بھی معرا ہے۔ چونکہ یہ کتاب مختلف فنون اور زبانوں کے ادب کی کچھ تفصیلات پر مشتمل ہے؛ اگر ہر مقالہ نگار فہرست مآخذ اور اُس کے متعلقات کو درج کر دیتا، تو اس سے بہت سے نئے کام کرنے والوں کو مدد ملتی کہ ایک ہی کتاب میں مختلف فنون سے متعلق مآخذ کی قابلِ ذکر فہرست مل جاتی۔

صحتِ املا کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اچھے مواد اور صحیح زبان کے ساتھ ساتھ، صحیح املا بھی، ایک اچھی کتاب کے ضروری اجزا میں شامل ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب نہایت درجہ قابلِ اعتراض ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مُرتّب صاحب کے نزدیک، املا کا کوئی معیار نہیں، اصل معیار کاتب صاحب کا ہے۔ وہ جہاں جس طرح چاہیں لکھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک ہی لفظ، ایک جگہ ایک طرح لکھا ہوا ہے، دوسری جگہ دوسری طرح۔ املا کی غلطیاں اِس قدر ہیں کہ اُن کی فہرست تیار کرنا مشکل ہے۔ بہ طورِ نمونہ، محض ایک غلطی کی نشان دہی کرتا ہوں:-

اُردو املا کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ وہ الفاظ، جن کے آخر میں ہ ہے جیسے بندہ، بتکدہ، زمانہ، محرّف "ہ" کرنے سے لکھے جائیں گے۔ جیسے بندے سے، کعبے کو، بتکدے گئے ـــــ اس کتاب میں چند مقامات پر ان الفاظ کا املا قاعدے کے مطابق ہے، لیکن اکثر و بیشتر مقامات پر غلط ہے۔ مثلاً پیشہ پر (۱۵۶) زمانہ میں (۱۵۶) دانہ پر (۱۵۶) کوفہ سے (۱۳۹) کتب خانہ میں (۱۵۲) عجائب خانہ میں (۱۵۲) زمانہ میں بھی (۱۵۲) اس میں کوئی شک نہیں کہ کاتب صاحبان عموماً اپنے ہی املا کو ترجیح دیتے ہیں، جس کے نمونے برابر رسالوں اور اخباروں میں دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس طرف کوئی توجہ نہیں کرتا، کبھی یہ خیال بھی ذہن میں نہیں آتا کہ صحتِ املا بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ایک ایسی اہم کتاب میں ان سب امور کو بہ آسانی ملحوظ رکھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ مرتب یا نگراں کو براہِ راست نگرانی کے مواقع میسّر ہوتے ہیں، جو رسائل کے مضمون نگاروں کو حاصل نہیں ہوتے۔ اس لئے ایسی کتابوں میں یہ صورت نہایت درجہ قابلِ اعتراض ہے۔

اس کتاب میں، مرتب کے علاوہ متعدد حضرات کے مضامین شامل ہیں۔ جن میں اکثر مضامین کا ترجمہ کسی دوسری زبان سے اُردو میں کیا گیا ہے۔ مقدمے میں کہیں اس کی صراحت نہیں ملتی کہ صورتِ حال کیا ہے۔ بظاہر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اصل کتاب پہلے انگریزی میں مرتب کی گئی ہوگی، پھر اس کا اردو ترجمہ کیا گیا ہوگا۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ یہ ترجمہ صرف اُردو میں ہوا ہے یا اور علاقائی زبانوں میں بھی۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ کسی کتاب کے مقدمے سے اس قدر ضروری بات بھی نہ معلوم ہو۔

———×———

مرکب کو بست کی طرح سطح کی صفت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ دوسرے الفاظ کے ساتھ آتا ہے۔

(۸) "اس کے بعد لکھنؤ کے نسبتاً نوشعرا میں ایک مذہبی تحریک شروع ہوئی"۔ (ص ۲۲۰)

"نسبتاً نوشعرا" سے کیا مراد ہے، میں نہیں سمجھ سکا۔ یہ لکھنا بے کار ہے کہ اس کا صحیح املا نسبتاً ہے۔ کیونکہ اس کتاب میں صحت املا کا حال سب سے زیادہ بُرا ہے۔

(۹) "بابا فرید تو باقاعدہ طور سے شاگردوں کو تعلیم دیتے تھے"۔ (ص ۳۰۰)

"طور سے" حشو ہے۔

(۱۰) "اصل ماخذات سے استفادہ کیا ہے"۔ (ص ۳۲۳)

یہ جمع الجمع غیر ضروری بھی ہے اور غیر فصیح بھی۔

(۱۱) "اسلامی ثقافت و تمدن کے سارے دور کے سب سے بڑے شاعر"۔ (ص ۲۲۴)

"سارے دور کے" بے حد غیر مانوس ہے۔

(۱۲) "کاتبوں نے اس پر سے ایک آسان اور ہموار خط ایجاد کیا"۔ (ص ۱۴۹)

یہاں "پر" غلط ہے۔ "اس سے" کافی ہے۔

(۱۳) "یہ خط دسویں صدی عیسوی اور اس کے سو سال بعد مکمل ہو چکا تھا"۔ (ص ۱۴۹)

دسویں صدی کے سو سال بعد، عجیب اندازِ نگارش ہے۔ "گیارھویں صدی" لکھا جا سکتا تھا۔

(۱۴) "خطاطوں کی ایک کثیر تعداد تھی، جنھوں نے اس فن میں اپنا اہم حصہ پیش کیا ہے"۔ (ص ۱۵۴)

"حصہ پیش کیا" اس جملے میں بے جوڑ ہے۔

(۱۵) "ان کے ایجاد کردہ بعض طرز خطوں کے نام یہ ہیں"۔ (ص ۱۵۵)

"طرز خطوں" بے معنی مرکب ہے۔

کتاب میں ایک بڑی کمی یہ محسوس ہوتی ہے کہ بیشتر واقعات، حوالے کی نشان دہی کے بغیر درج کیے گئے ہیں۔ اور سنین تو تقریباً سبھی یوں ہی لکھے گئے ہیں۔ اس سے کئی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

(الف) کسی واقعے کا ماخذ معلوم نہ ہو، اس صورت میں پڑھنے والا اندازہ نہیں کر سکتا کہ جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ قابلِ اعتبار بھی ہے یا نہیں۔ یہ بڑی خامی ہے، جس سے سارے مندرجات کی افادیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ بعض مندرجات کا غلط ہونا عیاں ہو۔

(ب) ماخذ کا حوالہ دینے سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ لکھنے والا مجبور ہو کر، مستند ماخذ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور ثانوی ماخذ سے دامن بچاتا ہے۔ اس طرح محنت تو کرنا پڑتی ہے، لیکن صحیح بات ضرور معلوم ہوتی ہے۔ اس کتاب میں سنین کی جو غلطیاں ہیں، وہ اسی کا نتیجہ ہیں کہ مقالہ نگاروں نے، مستند ماخذ کی طرف رجوع کرنے کا التزام نہیں کیا؛ جہاں جو ملا، اُسے نوٹ کر لیا۔ چونکہ حوالہ دینا نہیں تھا۔ اس لئے بظاہر کسی مشکل کا بھی احساس نہیں ہوا۔

(ج) ایسی کتابوں سے آسان پسندی کی روایت قائم ہو جاتی ہے، جو نئے لکھنے والوں کے لئے دامِ فریب بن جاتی ہے۔ مستند ماخذ کی جستجو کی بجائے، وہ محض نقلِ قول پر اکتفا کر لیتے ہیں اور اس کو صحیح سمجھتے ہیں، کیونکہ اس کا "مستند نمونہ" موجود ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص اس طرح کی

پر متنبہ کرتا ہے، تو ان حضرات کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بھی کوئی قابلِ اعتراض بات ہو سکتی ہے۔

یہ شروع میں ہی لکھا جا چکا ہے کہ کتاب اشاریے سے محروم ہے۔ یہ بڑی کمی ہے۔ آج کل قابلِ ذکر کتابوں میں، آخر کتاب میں ایسے مآخذ کی مکمل فہرست درج کر دی جاتی ہے، جس سے اس کتاب کی تیاری میں کام لیا جاتا ہے۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اُس موضوع سے متعلق بہت سے قابلِ ذکر مآخذ، کام کرنے والوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ یہ کتاب اس سے بھی معرا ہے۔ چونکہ یہ کتاب مختلف فنون اور زبانوں کے ادب کی کچھ تفصیلات پر مشتمل ہے؛ اگر ہر مقالہ نگار فہرست مآخذ اور اُس کے متعلقات کو درج کر دیتا، تو اس سے بہت سے نئے کام کرنے والوں کو مدد ملتی کہ ایک ہی کتاب میں مختلف فنون سے متعلق مآخذ کی قابلِ ذکر فہرست مل جاتی۔

صحتِ املا کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اچھے مواد اور صحیح زبان کے ساتھ ساتھ، صحیح املا بھی، ایک اچھی کتاب کے ضروری اجزا میں شامل ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب نہایت درجہ قابلِ اعتراض ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرتب صاحب کے نزدیک، املا کا کوئی معیار نہیں، اصل معیار کاتب صاحب کا ہے۔ وہ جہاں جس طرح چاہیں لکھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک ہی لفظ، ایک جگہ ایک طرح لکھا ہوا ہے، دوسری جگہ دوسری طرح۔ املا کی غلطیاں اس قدر ہیں کہ اُن کی فہرست تیار کرنا مشکل ہے۔ بہ طورِ نمونہ، محض ایک غلطی کی نشان دہی کرتا ہوں:-

اُردو املا کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ وہ الفاظ، جن کے آخر میں "ہ" ہے جیسے بندہ، بتکدہ، زمانہ، محرّف ہو کر "ے" سے لکھے جائیں گے۔ جیسے بندے سے، کعبے کو، بتکدے گئے ——— اس کتاب میں چند مقامات پر ان الفاظ کا املا قاعدے کے مطابق ہے، لیکن اکثر و بیشتر مقامات پر غلط ہے۔ مثلاً پیشہ پر (۱۵۶) زمانہ میں (۱۵۶) دانہ پر (۱۵۶) کوفہ سے (۱۴۹) کتب خانہ میں (۱۵۲) عجائب خانہ میں (۱۵۲) زمانہ میں بھی (۱۵۳) اس میں کوئی شک نہیں کہ کاتب صاحبان عموماً اپنے ہی املا کو ترجیح دیتے ہیں، جس کے نمونے برابر رسالوں اور اخباروں میں دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ کبھی یہ خیال بھی ذہن میں نہیں آتا کہ صحتِ املا بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ایک ایسی اہم کتاب میں ان سب امور کو بہ آسانی ملحوظ رکھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ مرتب یا نگراں کو براہِ راست نگرانی کے مواقع میسر ہوتے ہیں، جو رسائل کے معمولی کارکنوں کو حاصل نہیں ہوتے۔ اس لئے ایسی کتابوں میں یہ صورت نہایت درجہ قابلِ اعتراض ہے۔

اس کتاب میں، مرتب کے علاوہ متعدد حضرات کے مضامین شامل ہیں۔ جن میں اکثر مضامین کا ترجمہ کسی دوسری زبان سے اُردو میں کیا گیا ہے۔ مقدمے میں کہیں اس کی صراحت نہیں ملتی کہ صورتِ حال کیا ہے۔ بظاہر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اصل کتاب پہلے انگریزی میں مرتب کی گئی ہوگی، پھر اس کا اردو ترجمہ کیا گیا ہوگا۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ یہ ترجمہ صرف اُردو میں ہوا ہے یا اور علاقائی زبانوں میں بھی۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ کسی کتاب کے مقدمے سے اس قدر ضروری بات بھی نہ معلوم ہو۔

—x—

مُدیر "فاران" کے نام ایک دردمند خاتون کا خط

بجناب ایڈیٹر صاحب ماہنامہ فاران ——— السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معاف کیجیے بلا کسی تعارف کے مخاطب کرنے کی جسارت کر رہی ہوں، صرف اس امید پر کہ اس کا جواب عام اسلامی تہذیب کے لئے مفید ثابت ہوگا ورنہ تو کوئی حقیقت نہیں۔ وجہ تحریر یہ ہے کہ کل ایک پرائمری اسکول کے جلسہ میں لڑکیوں کا ایک ڈانس دیکھا، یہ انھوں نے کسی فلم سے لیا ہے جس میں لڑکیاں ناچتی گاتی شوخیاں اور چہلیں کرتی مٹی کی گھڑیاں لے کر دریا پر پانی بھرنے جاتی ہیں۔ گیت ہے ۔

چلو نیر بھرن کو چلیں سکھی یہاں تک کہ

پنگھٹ پہ کرشن ملیں سجنی ——— اور پھر کرشن پر فریفتگی کا ایکشن سے اظہار ہے۔

گو یہ سین طربیہ تھا مگر دل کی عجیب حالت تھی ایسا معلوم ہوا کہ رو پڑوں گی۔ الٰہی ہم اپنی تہذیب کو خود ہی کس بُری طرح اُلٹی چھری سے ذبح کر رہے ہیں یا اسلامی سخت گیر مولانا اور سفید ریش واعظ صاحب سے گھبرا کر۔ آخر بنسری والے کرشن کی پناہ کیوں ڈھونڈ رہی ہیں۔ (سب لڑکیوں کے درمیان ایک لڑکا بنسری، کرشن بنایا گیا ہے) مہربانی سے غور فرمائیں۔ اس کا ردِ عمل کیا ہوگا؟ آرٹ جو نامعلوم طریقہ پر اپنا مستقل اثر چھوڑتا ہے اُنکے ساتھ کیا کرے گا۔ ان نوخیز طلباء کی ذہنیتیں کیا اپنی عمر کے ساتھ ان ہی احساسات و جذبات کو جوان نہ کریں گی؟ اور بھی بہت سی قسم کے غیر اسلامی کردار ادا ہوتے رہتے ہیں اور پسند کئے جاتے ہیں۔ طلبا انعام حاصل کرتے ہیں۔ مجھے ان طلباء یا ٹیچرس سے کوئی شکایت نہیں۔ بلکہ ان کی بہی خیر خواہ ہوں۔ لیکن شکایت ہے تو اسلام سے۔ اسلام جو زندگی کا دوسرا نام ہے۔ اسلام جو دین فطرت ہونے کا دعویدار ہے۔ اسلام جس نے انسان کو ایک ہی نہیں دو دو جہانوں کی بادشاہی بخشی۔ جس نے انسان کو صحیح انسانی آزادی کے مفہوم سے روشناس کیا۔ پھر اسلام میں زندگی کا طربیہ پہلو بالکل مفقود کیوں نظر آتا ہے؟

باوجود اس خشکی کے اس کی زمین بالکل بنجر بھی نہیں ہے جس زمانہ میں اس کا ورود ہوا اس وقت بھی دنیا کے اکثر حصے عیش و عشرت میں غرق تھے۔ آخر کس چیز نے انہیں عشرت سے عسرت کی طرف راغب کردیا؟ آخر کیوں اکثریت نے اس خشک صحرا کی صدائے درد پر لبیک کہا۔ بہتے دریا، رقص و سُرود کے متوالے کرشن، رنگین رُومانی سبزہ زاروں سے منھ موڑ کر ایک صراط مستقیم کے ساماں، برگزیدہ نبی کی مشفقانہ آواز پر سب کچھ چھوڑ کر دوڑ پڑے...... ! آج..... ؟..... ؟ اب آپ تاویل فرمائیں، یا اسلام وہ نہیں، یا انسان وہ نہیں؟ اسلام عالمگیر ہے۔ اسلام قائم و دائم ہے۔ اور زمانہ..... ؟ فلم، موٹر، عشرت خانے ہوٹل، تمام فضا باد سموم کی طرح غبار سے اٹی ہوئی ہے اور اب یہ آیات الٰہی کا نگہبان کدھر جاتے؟ ہمیں اسلام سے دلی لگاؤ ہے اور جب اس کو کوئی صدمہ پہنچتا ہے تو دل پر ضرب آتی ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی فضا میں اسے کس تہ خانے میں چھپا کر رکھا جائے۔ کوئی حل نظر ہی نہیں آتا۔ انسان آخر انسان ہی ہے۔ کب تک طربیہ پہلو سے بالکل دامن بچاتے ہوئے ساری زندگی محرومی میں گزار سکتے ہیں۔ جب کہ دنیا کی بساط انکے سامنے کھلی ہوئی ہے۔ آخر خدائے تعالیٰ کو کچھ اپنے بندوں کی فطرت کا خیال ہونا چاہئیے۔ دوسرے مذاہب نے اپنے پیروؤں کو سال میں چند یا کم از کم ایک دن ایسا عطا کیا ہے جس میں وہ پاسبان عقل سے چھٹکارا حاصل کرکے بالکل اپنی بہیمانہ اور وحشیانہ فطرت میں آزاد چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ لیکن اسلام ہمیں ایک لمحے کے لئے بھی شرف بنی آدم سے محروم نہیں کرتا، زندگی کے کسی بھی لمحہ میں ہمیں لباس التقویٰ سے باہر آنے کی اجازت دیتا ہے۔

اب بتلائیے ہم شکر کریں یا شکوہ ——— بہر حال ہمیں اس وقت صرف اس بات کا حل درکار ہے کہ ہمارے طلباء کو ان مذکورہ مکروہات سے نجات

والدین کے لئے اسلام کے پاس کیا نعم البدل ہے۔ یا کم از کم کوئی ایسی صورت جو اس کا ردعمل ہی کر دے۔ ساتھ ہی تعلیم حاصل کرنا فرض ہے، عملی زندگی ذمہ ہے اور تفریح کا ہونا کیا اہم ترین مسئلہ ہے۔ بظاہر تو اسلام میں تفریح کی کوئی گنجائش ہی نظر نہیں آتی۔ مگر یہ امید بھی نہیں کی جا سکتی کہ ایک نباض فطرت کسی حقیقت سے چشم پوشی کر جائے گا یہاں اساتذہ کی پوزیشن بھی کتنی غیر محفوظ ہے۔ ہزارہا انسانوں کے افعال و کردار کی ذمہ داری، غلط روی و خام کاری کی جواب دہی خدا کے سامنے انہیں کرنی ہے۔ جن کا خدا رسول کے بعد دن میں پانچ مرتبہ نام لیا جاتا اور مغفرت مانگی جاتی ہے۔ اب یہ بیچارے چلیں تو کس راہ پر چلیں۔ دین کے تقاضے کچھ اور ہیں دنیا کے اور وقت کے تقاضے کچھ اور ہی ہیں۔ اسلامی جماعت والے بھی زندگی کو اسلام سے قریب تر لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن ہم کسی مولوی صاحب سے ایسے بے باک سوالات کی جرأت نہیں کر سکتے خدا کا شکر ہے کہ جناب پیدائشی مولوی نہیں ہیں۔ بات یہ ہے کہ میں نے تقریباً بچپن سے جناب کی نگارشات کا کافی مطالعہ کیا ہے۔ پھر پاکستان میں یکایک کرشن لیلا سے ایک دم مصلے پر پایا انتہائی حیرت اور خوشی کے ساتھ خدا کا شکر بجا لائی اور ہمیشہ دعائیں کرتی رہتی ہوں کہ خداوند کریم یہ انقلاب مبارک کرے۔ اور اوروں کو بھی تقلید کی توفیق بخشے اور ہم گمرہوں کو بھی آپ کے ذریعہ سے ہدایت نصیب کرے۔ کیونکہ آپ نے زندگی کے دونوں رخ دیکھے ہیں۔ جس سے افکار میں پختگی اور صداقت آجاتی ہے اب آپ گناہگاروں اور غلط کاروں کی ہدایت و اصلاح بخوبی کر سکتے ہیں۔ اور دوسرے علماء صرف نیکوں کی ہدایت کے لئے ہیں۔ مدت سے آپ کی سیرت النبی "دُرِّ یتیم" دیکھنے کی تمنا ہے۔ براہ کرم ایک کتاب "دُرِّ یتیم" مجھے وی پی روانہ کر دیں۔ مشکور ہونگی۔ اس کے علاوہ جس رسالہ فاران میں میرے اس عریضہ کا جواب شائع ہو وہ بھی مجھے بذریعہ وی پی روانہ کر دیا جائے۔ بدقسمتی سے میں فاران کی مستقل خریدار نہیں ہوں لیکن جب میسر ہو جائے تو پڑھتی ضرور ہوں۔ اگر جواب براہ راست دینا چاہیں تو جوابی لفافہ حاضر خدمت ہے۔ میرا پتہ یہ ہے:-

مسز حمید۔ معرفت عبدالوحید فیکٹری کوارٹر ۲۹/۱۴ جی　پی۔ او۔ ایف۔　واہ کینٹ۔

میں ایک جاہل طبقہ کی گمنام اور معمر عورت ہوں اور امید کرتی ہوں کہ آپ مجھے جواب سے محروم نہ رکھیں گے۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ نئے آنے والے اسلامیوں کے لئے نئی راہیں بنانے کے بجائے ان ہی پہلی راہوں کو گوارا تر بنا دیا جائے۔ علمائے دین ہمیشہ شاہراہ اسلام کو آثار قدیمہ کی طرح کھود کھود کر عوام کے سامنے لاتے رہتے ہیں جو کہ اختلاف نظریاتی اور حوادثات کی ریت کے نیچے دب کر بالکل معدوم ہو گئی ہے اور جس پر کبھی انہیں یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ ؎ رہ گیا کہاں یہاں کا اور جا کیا یہ رہے ہیں۔ لیکن اس خشک صحرائی، صراط مستقیم کو خوشگوار اور آسودگی بخش بنانے کا خیال شاید ابھی ان کے دل میں نہیں گزرا۔ کیا اس شاہراہ کے کناروں پر کوئی سرسبزی و شادابی نہیں پیدا کی جا سکتی۔ کیا اس کے کنارے بھی آرام دہ سرائیں اور مسافر خانے تعمیر نہیں ہو سکتے۔ کیا اسلامی سعی و ہم ہیں "رفتم گفتار با گشتم" کی بھی اجازت نہیں دیتی ظاہر ہے کہ ہم کھٹک جائیں گے (پھر تفریح کا سوال) اسلام کوئی نظریاتی و روایاتی مذہب نہیں، یہ تو ایک تجرباتی حقیقت ہے۔

؎ نخل اسلام نمونہ ہے برو مندی کا　　　پھل ہے یہ سینکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا

پھر بھی اسلام تمنا کرتا ہے ؎

؎ عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے　　　شکوہ ترکمانی ذہن ہندی نطق اعرابی

کیا اسلام کے حقیقت پرست سرپرست ظواہر پسند ذہن ہندی کی نئی ہیئت ترتیب ہو گی۔ اگر میری سمجھ غلطی نہیں کر رہی۔ تو کیا یہ واپس لوٹ جانے کے مصداق نہ ہو گا اس ہوائی سروس کے دور میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ صراط مستقیم پر بھی ہادی راہ یا میر کارواں سے اجازت لے کر کچھ آسائشیں بہم پہنچائی جائیں۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ یہ بالکل ہی متروک اور معدوم نہ ہو جائے حالانکہ بار بار کھود کر نکالنا تو پڑتا ہے اور پڑے گا۔ لیکن شاید پھر وہ پہلی استقامت باقی نہ رہے　نعوذ باللہ

جواب

یہ خط درحقیقت اس دور کے ہزاروں لاکھوں ذہنوں کا ترجمان ہے، ماحول اور فضا کو دیکھ کر لوا ٹریٹ متاثر ہو کر بعض ذہنوں میں اس قسم کے سوالات کھٹکتے اور پیدا ہوتے ہیں! یہ خط کوئی شک نہیں اخلاص اور دردمندی سے لبریز ہے، خاتون مضمون نگار اخلاق و تفریح کی کشمکش میں مبتلا ہیں، وہ یہ چاہتی ہیں کہ وہ

پرستانہ تفریحات اور [illegible] لنے کے غیر اخلاقی اسباب و مظاہر کا بدل اسلام میں مل جائے۔

آج دُنیا جس [illegible] زر رہی ہے وہ خدا ناشناسی، آخرت فراموشی اور اخلاق فریبی سے گریز، عبادت کا دور ہے، تمدن و تہذیب کی چمک نے اچھے خاصے پہلے آدم کی نگاہوں کو بھی خیرہ کر [illegible] ہے، ہر شخص دُنیا کمانے اور دنیا کی لذتوں اور عشرتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی دُھن میں لگا ہوا ہے، حرام و حلال کے تقاضے نگاہوں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔

کس واسطے ہم آئے ہیں دُنیا میں شیفتہ
اس کا جو دیکھئے تو بہت کم خیال ہے

مذہبیت کے باغیوں کی [illegible] سے شکایت کیجئے، دیندار طبقہ تک میں آخرت کا عقیدہ کمزور پڑتا جا رہا ہے، آخرت پر یقین رکھنے کے باوجود "آخرت" کے بارے میں بہت کم سوچا جاتا ہے [illegible] دماغ پر دُنیا اور اس کی لذتیں چھائی ہوئی ہیں، خود راقم الحروف جب اپنے حالات کا جائزہ لیتا ہے تو شدید ندامت محسوس کرتا ہے کہ آخرت کے مقابلہ میں دُنیا اور [illegible] زیادہ دلچسپی ہے، نفس کے کتنے جھنجھٹ ہیں جو ابھی تک میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں! اس اعتراف کے بعد اللہ تعالیٰ کا فضل حال شاملِ حال ہے کہ میں نے اپنی کسی [illegible] کے جواز کے لئے کوئی عذر نہیں تراشا اور اپنی کسی غلطی، کمزوری اور بے اعتدالی کا ذمہ دار "اسلام" کو نہیں ٹھیرایا، اور نہ ذہن میں یہ اندیشہ آیا [illegible] تفریح و زینت کے معاملہ میں اسلام نے جو تنگی پیدا کر دی ہے اس میں کشادگی و وسعت پیدا ہونی چاہیے (معاذ اللہ)

اسلام کا ضابطۂ اخلاق اپنی جگہ ہر اعتبار سے مکمل ہے، جو چیزیں حرام ہیں وہ ہمیشہ کے لئے حرام ہیں اور جو حلال ہیں وہ بھی ابدالآباد تک کے لئے حلال ہیں اسلام دنیا میں اس لئے آیا ہے کہ دُنیا اس کے پیچھے چلے، اس لئے نہیں کہ اسلام دنیا کے تقاضوں کی اقتدا کرے، اور دنیا میں آئے دن جو انقلابات آتے رہتے ہیں اسلام اُن انقلابات سے اپنے کو ہم آہنگ کرنے کے لئے اپنے اندر تبدیلیاں پیدا کرتا چلا جائے! اسلام دنیا کا امام و قائد ہے مقتدی اور بار بردار نہیں ہے۔

اسلام آفاق گیر دین ہے، اس لئے وہ دُنیا کی ترقیوں کا مخالف نہیں ہو سکتا، تمدن و تہذیب اور سائنس کی ہر ایسی ترقی کا جو اسلام کے ضابطۂ اخلاق سے نہیں ٹکراتی، اسلام خیر مقدم کرتا ہے، تسخیر کائنات کی ہر مہم اور کوشش کا اسلام رفیق اور ساتھی ہے۔

تمدن و تہذیب اور سائنس کی ترقیوں میں اس قدر منہمک ہو جانا کہ آخرت سے یکسر غفلت پیدا ہو جائے یہی وہ فساد ہے جس نے انسانی معاشرے کو خراب کر رکھا ہے اور سارا ماحول مسموم ہو گیا ہے، سائنس کی ایجادیں اور تمدن و تہذیب کی ترقیوں کے جلو میں فسق و فجور بھی قدم سے قدم ملا کر چل رہے ہیں آج کا سائنس داں شراب پی کر اور ایک نامحرم عورت کے ساتھ رات گزار کر زمانہ وقت، روشنی کی رفتار، زمین کی کشش اور ستاروں کے مدار پر غور و خوض کرتا ہے، اسی لئے سائنس کی نت نئی ایجادات اور دُنیا کی گوناگوں ترقیوں کے باوجود معلوم دنیا کے گوشہ گوشہ میں اضطراب اور انتشار پایا جاتا ہے، زندگی کے ہر شعبہ سے خیر و برکت اُڑ سی گئی ہے اور سارا عالم لذت و عیش کی "جوع البقر" میں مبتلا ہے، آج کے زمانہ میں انسانی آبادی کو چٹخاروں کا استسقا ہو گیا ہے، ضبطِ نفس، شرافتِ نفس اور عزتِ نفس کا جیسا قحط اس دور میں پایا جاتا ہے "تاریخ" کا شاید ہی کوئی دور ان حالات سے دوچار ہوا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جب بعثت ہوئی ہے تو عرب لہو و لعب، اور عیش و تفریح کے کس قدر خوگر تھے، اسلام قبول کرتے ہی اُن کے فکر و نظر کے زاویے اور سُود و زیاں کی قدریں ہی سرے سے بدل گئیں انھوں نے اس بات کا مطالبہ نہیں کیا اور نہ اس طرف اُن کا خیال گیا کہ شراب خوری، قمار بازی اور ناچ رنگ کا ..... اسلامی معاشرے میں اُنھیں بدل ملنا چاہیئے۔

صحابہ کرام کی زندگیاں نہ تو سنیاسیوں اور راہبوں کی طرح خشک اور بے مزہ تھیں اور نہ "لذتیت" کی مانند رنگین اور لذتوں میں ڈوبی ہوئی تھیں یہ نفوسِ قدسیہ اپنے بیوی بچوں اور گھریلو زندگی سے شغف رکھتے تھے اور یہی اُن کے دل بہلانے کے جائز حدود تھے! اُن کے یہاں تفریح اور شہسواری کی مشق کے لئے گھوڑ دوڑ بھی ہوتی تھی، تیر و کمان سے بھی کھیلتے تھے اور شعر و سخن سے بھی دلچسپی رکھتے تھے مگر انہیں سب سے زیادہ دلچسپی نیکی اور بھلائی سے تھی! "تعلق باللہ" وہ نور تھا، جن کے اردگرد اُن کی زندگیاں حرکت کرتی تھیں۔

آج دنیا جس راہ پر جارہی ہے وہ فسق و فجور اور گناہ آلود لذتوں کی راہ ہے! پورے ماحول پر :-

؎ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

کی ذہنیت چھائی ہوئی ہے۔ اس گناہ پروردہ ماحول نے جن تفریحات کو جنم دیا ہے، اُن کے "بدل" کی اسلام میں تلاش' خود اس کی دلیل ہے کہ اس قسم کا مطالبہ کرنے والا ذہن ماحول سے متاثر ہے!

انگریز کے دورِ حکومت کا ہمیں تجربہ ہے کہ کالجوں اور اسکولوں میں ناچ گانے کا رواج نہیں تھا، نہ لڑکیاں ڈرامے کھیلتی تھیں، اُس دور میں اس کا مطالبہ نہیں کیا گیا کہ کالجوں اور اسکولوں کا ماحول خشک، بے مزہ اور متقشفانہ ہے، نوجوانوں کی تفریح و دلچسپی کے لئے کچھ سامان چاہئیں! پاکستان کے تعلیمی اداروں میں تفریح کا دلچسپی اور آرٹ کے نام پر جو لغویتیں ہو رہی ہیں وہ اس قابل نہیں ہیں کہ اُن کا "بدل" تلاش کیا جائے! مرض کو صحت سے بدلا جاسکتا ہے۔ مرض کا بدل کسی دوسرے مرض ہی میں تلاش کرنا' بہت بڑی نادانی کی بات ہے۔

سالانہ امتحان کا زمانہ جب قریب آتا ہے تو تعلیمی اداروں میں کھیل اور تفریح کے پروگرام ملتوی کردیئے جاتے ہیں۔ اس وقت طالب علموں اور اساتذہ کے ذہن و فکر پر "امتحان" چھایا رہتا ہے۔ ہر کسی کو امتحان میں کامیاب ہونے کیلئے محنت کرنے کی فکر لگی ہوئی! ان دنوں ذہن و فکر تفریحات کا سرے سے مطالبہ ہی نہیں کرتے! امتحان کی کامیابی کے بعد جو منافع حاصل ہونے والے ہیں، اُن پر کھیل کود اور دوسری تفریحات کو بے دریغ قربان کر دیا جاتا ہے!

کالجوں اور اسکولوں کے امتحانات کی طرح اگر دل و دماغ پر آخرت کا عقیدہ' تصور اور یقین غالب ہو جائے۔ تو پھر ذہن و فکر تفریح' لہو و لعب اور کھیل کود کی جانب متوجہ نہیں ہو سکتا' اور ہو گا بھی تو اس کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جائے گی! تفریحات اخلاق کی جائز حدود سے آگے نہ بڑھنے پائیں گی۔

ہم مسلمانوں کی جن میں راقم الحروف بھی شامل ہے۔ اصل کمزوری خدا سے بے خوفی اور آخرت سے غفلت ہے؛ اسی غفلت کے سبب طرح طرح کے غیر ضروری مطالبے اور داعیے ہمارے اندر اُبھرتے ہیں اور جو لوگ اسلام کے اخلاقی حدود کا پاس و لحاظ کرتے ہیں' وہ بھی اس کمزوری میں کسی نہ کسی حد تک مبتلا ہیں! ایک دق کا مریض اصل مرض کا علاج چھوڑ کر اگر زبان کے بگڑے ہوئے ذائقہ کو درست کرنے پر توجہ صرف کرے اور ایک عورت جس کا جسم زخمی ہو وہ اپنے زخموں کی مرہم پٹی کی بجائے ناخنوں پر سُرخی اور مہندی لگانے کا اہتمام کرنے لگے! تو یہ کتنی بڑی نادانی اور کس قدر خطرناک غلطی اور غفلت ہوگی۔

ہمارے معاشرے میں بُرائیاں اس وجہ سے نہیں پھیل رہی ہیں کہ ناچ رنگ اور اس قسم کی دوسری ناجائز تفریحات کا اسلامی بدل پیش نہیں کیا گیا اس کا اصل سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خوف دلوں سے رخصت ہو گیا ہے اور آخرت پر یقین و ایمان رکھنے کے باوجود، آخرت کی جوابدہی کا احساس ضعیف و مضمحل ہو گیا ہے اصل چیز جس پر توجہ دینی ہے اور جو کام کرنے کا ہے وہ یہ ہے کہ تحریر و تقریر اور وعظ و تذکیر کے ذریعہ تعلق باللہ کو مضبوط سے مضبوط تر کیا جائے۔ آخرت کی جوابدہی کے احساس کو اُبھارا جائے اور جو حضرات امر کے داعی ہوں وہ خود علم و اخلاق کا نمونہ بن کر لوگوں کے سامنے آئیں۔ جن کو دیکھ کر اور جن کی محفلوں میں جاکر خدا یاد آئے اور جن سے مل کر لوگ اپنے اندر دین کا سوز اور گرمی محسوس کریں۔

قوسِ قزح

(وسیم ہاشمی کانپوری)

جو تیرے غم کی میسر ہمیں خوشی نہ رہے
تو زندگی میں کوئی لطف واقعی نہ رہے
مزاجِ غم سے جو محروم ہو دلِ شاعر
ادب ادب نہ رہے شعر و شاعری نہ رہے
ہوائے دامنِ جاناں نہ ہو نصیب اُسے
وہ اشک جس میں محبت کی دلکشی نہ رہے
جو ہوں نہ اُس لبِ لعلیں سے نسبتیں لے دور
نوائے شعر میں روحِ شگفتگی نہ رہے

(راشد اللہ خاں جوہر)

پھر خلش دل میں اُٹھی پھر ہے تقاضائے غزل
آنکھ خوں رو دیگی پھر آج برایمائے غزل
اُس کی آنکھوں سے چھلکتی ہے جو صہبائے غزل
کاش آجائے وہ کھنچ کر سرِ مینائے غزل
خود ہی احوالِ دلِ زار سُنا میں کیا ہم
لطف تو جب ہے کریں خود وہ تقاضائے غزل
اُن پہ کیفیت ترنم کا اثر کیا کہیے
اور بڑھ جاتا ہے کچھ نشۂ صہبائے غزل
آگئے کھنچ کے وہ خود آج سرِ بزمِ سخن
اللہ اللہ مرا جذبِ تمنائے غزل
حُسنِ رنگیں کی بہاریں مرے اشعار میں ہیں
وہ سراپا ہیں غزل، حُسن تقاضائے غزل
جس قدر ہوگی بلند اور مری فکر و نظر
اور نکھرے گا جمالِ رُخِ زیبائے غزل
مہکی مہکی ہے مری بزمِ خیال اے جوہر
آج وہ شوخ ہے پھر انجمن آرائے غزل

(راہی جعفر شہری)

[illegible] لب پہ ہے نالہ جیسے
آہ بھرتی ہمیں آتی [illegible]
چھپ کے دل میں ترے ساحل پہ تری [illegible]
ہر تمنا کو ملا دیں [illegible]
کبھی سر جائے تو ہم جیتے ہیں [illegible]
[illegible]
ہم ہیں کہ تیرا جائے ہے آنکھیں کھولیں
شمع بجھتے بجھتے جیسی ہو
اشک ٹوٹے کے منہ سے ہم پہ چلے آئے ہیں
ٹوٹ کر آج بکھر جائے گی
چھٹ گئے ہی اس انداز سے دل بھر آیا
ٹھیس لگتے ہی چھلک جاتے ہیں پیالہ
چند مجبور دلوں پہ ڈھا کر وہ ستم جو خاک میں
کر دیا سارا زمانہ تہ و بالا
یوں جوانانِ چمن سہمے سہمے بیٹھے ہیں
نہ پڑا ہو کبھی صیاد سے پالا
بجھ گئے تو ہوئی شمعوں کو بجھا کر شاید
وہ یہ سمجھے کبھی ہوگا نہ اُجالا

(قوی فاطمی)

پریشاں آج کل ہر آدمی ہے
جسے دیکھو اُسے اپنی پڑی ہے
زمانے نے ہزاروں رنگ بدلے
مرے دل کا مگر عالم وہی ہے
کنارے پر جو موجیں آرہی تھیں
انہی موجوں میں کشتی بہ گئی ہے

ماہر القادری

جب کھلیں آنکھیں تو دیکھا وہ سرِ بالیں نہ تھے
ہوش آنا تھا کہ پھر بیمار غافل ہو گیا
قافلہ مہر و وفا کا یہ کہاں آ پہونچا
زندگی راہ میں خود سنگِ گراں ہو بیٹھے
بہت سے دہر میں قاتل ادا ہیں
تمہیں سے تو کیوں زمانہ بدگماں ہے
زاغ و کرگس پر کوئی بندش نہیں
اور شاہیں ہیں کہ زیرِ دام ہیں

خط و کتابت کرتے وقت اپنا مکمل پتہ اور خریداری نمبر ضرور تحریر کیجیے (ادارہ)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

روحِ انتخاب

سب سے بڑا فریب

لیکن سب سے زیادہ شدید اور قبیح فریب جو اس سلسلہ میں دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن اور حدیث سے استدلال کرکے اس تحریک کو اسلام کے موافق ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالانکہ اسلام اور مغربی تہذیب کے مقاصد اور تنظیم معاشرت کے اصولوں میں زمین و آسمان کا بعد ہے۔ اسلام کا مقصد جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے۔ انسان کی شہوانی قوت (Sex-energy) کو اخلاقی ڈسپلن میں لاکر اس طرح منضبط کرنا ہے کہ وہ آوارگی عمل اور ہیجانِ جذبات میں ضائع ہونے کے بجائے ایک پاکیزہ اور صالح تمدن کی تعمیر میں صرف ہو۔ برعکس اس کے مغربی تمدن کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے معاملات اور روزمرہ کے مشاغل میں عورت اور مرد کو یکساں شریک کرکے مادی ترقی کی رفتار تیز کردی جائے اور اس کے ساتھ شہوانی جذبات کو ایسے فنون اور مشاغل میں استعمال کیا جائے جو کشمکش حیات کی تلخیوں کو لطف اور لذت میں تبدیل کردیں۔ مقاصد کے اس اختلاف کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تنظیم معاشرت کے طریقوں میں بھی اسلام اور مغربی تمدن کے درمیان اصولی اختلاف ہو۔ اسلام اپنے مقصد کے لحاظ سے معاشرت کا ایسا نظام وضع کرتا ہے جس میں عورت اور مرد کے دوائرِ عمل بڑی حد تک الگ کردیئے گئے ہیں، دونوں صنفوں کے آزادانہ اختلاط کو روکا گیا ہے اور ان تمام اسباب کا قلع قمع کیا گیا ہے جو اس نظم و ضبط میں برہمی پیدا کرتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مغربی تمدن کے پیش نظر جو مقصد ہے اس کا طبعی اقتضا یہ ہے کہ دونوں صنفوں کو زندگی کے ایک ہی میدان میں کھینچ لایا جائے۔ اور ان کے درمیان سے وہ تمام حجابات اٹھادیئے جائیں جو ان کے آزادانہ اختلاط اور معاملات میں مانع ہوں، اور ان کو ایک دوسرے کے حسن اور صنفی کمالات سے لطف اندوز ہونے کے غیر محدود مواقع بہم پہنچائے جائیں۔

لہٰذا ہر صاحب عقل انسان اندازہ کرسکتا ہے کہ جو لوگ ایک طرف مغربی تمدن کی پیروی کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف اسلامی نظم معاشرت کے قوانین کو اپنے لئے حجت بناتے ہیں، وہ کس قدر سخت فریب میں خود مبتلا ہیں یا دوسروں کو مبتلا کررہے ہیں۔ اسلامی نظم معاشرت میں تو خود عورت کے لئے آزادی کی آخری حد یہ ہے کہ حسب ضرورت ہاتھ اور منہ کھول سکے اور اپنی حاجات کے لئے گھر سے باہر نکل سکے۔ مگر یہ لوگ اس آخری حد کو اپنے سفر کا نقطۂ آغاز سمجھتے ہیں۔ جہاں پہنچ کر اسلام رک جاتا ہے وہاں سے یہ چلنا شروع کرتے ہیں اور یہاں تک بڑھ جاتے ہیں کہ حیا اور شرم بالائے طاق رکھدی جاتی ہے۔ ہاتھ اور منہ ہی نہیں بلکہ خوب صورت مانگ نکلے ہوئے سر اور شانوں تک کھلی ہوئی بانہیں اور نیم عریاں سینے بھی نگاہوں کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ اور جسم کے باقی ماندہ محاسن کو بھی ایسے باریک کپڑوں میں ملفوف کیا جاتا ہے کہ ہر وہ چیز اُن سے نظر آسکے جو مردوں کی شہوانی پیاس کو تسکین دے سکتی ہو۔ پھر ان لباسوں اور آرائشوں کے ساتھ محرموں کے سامنے نہیں بلکہ دوستوں کی محفلوں میں بیویوں، بہنوں اور بیٹیوں کو لایا جاتا ہے اور ان کو غیروں کے ساتھ ہنسنے بولنے اور کھیلنے میں وہ آزادی بخشی جاتی ہے جو مسلمان عورت اپنے سگے بھائی کے ساتھ بھی نہیں برت سکتی۔ گھر سے نکلنے کی جو اجازت محض ضرورت کی قید اور کامل ستر پوشی و حیاداری کی شرط کے ساتھ دی گئی تھی، اُس کو جاذب نظر ساڑھیوں اور نیم عریاں بلاؤزوں اور بے باک نگاہوں کے ساتھ سڑکوں پر پھرنے، پارکوں میں ٹہلنے، ہوٹلوں کے چکر لگانے اور سینماؤں کی سیر کرنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ عورتوں کو خانہ داری کے ماسوا زندگی کے دوسرے امور میں حصہ لینے کی جو مقید اور مشروط آزادی اسلام میں دی گئی تھی اس کو حجت بنایا جاتا ہے۔ اس غرض کے لئے کہ مسلمان عورتیں بھی فرنگی عورتوں کی طرح گھر کی زندگی اور اس کی ذمہ داریوں کو طلاق دے کر سیاسی و معاشی اور عمرانی سرگرمیوں میں ماری ماری پھریں اور کلبوں کے ہر میدان میں مردوں کے ساتھ دوڑ دھوپ شروع کردیں۔

پاکستان اور ہندوستان میں تو معاملہ یہیں تک ہے۔ مصر اور ترکی اور ایران میں سیاسی آزادی رکھنے والے ذہنی غلام اس سے بھی دس قدم آگے نکل گئے ہیں۔ وہاں مسلمان عورتیں ٹھیک ویسی ہی لباس پہننے لگی ہیں جو یورپ کی عورت پہنتی ہے تاکہ اصل اور نقل میں کوئی فرق ہی نہ رہے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر کمال یہ ہے کہ ترکی خواتین کے فوٹو بارہا اس

ہیئت میں دیکھے گئے ہیں کہ غسل کا لباس پہنے ساحل سمندر پہ نہا رہی ہیں ——— وہی لباس جس میں تین چوتھائی جسم برہنہ رہتا ہے اور ایک چوتھائی حصہ اس طرح پوشیدہ ہوتا ہے کہ جسم کے سارے نشیب و فراز سطح لباس پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔

کیا کسی قرآن اور کسی حدیث سے اس شرمناک طرز زندگی کے لئے بھی کوئی جواز کا پہلو نکالا جا سکتا ہے؟ جب تم کو اس راہ پر جانا ہے تو صاف اعلان کیجئے کہ ہم اسلام سے اور اس کے قانون سے بغاوت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کیسی ذلیل منافقت اور بد دیانتی ہے کہ جس نظام معاشرت اور طرز زندگی کے اصول، مقاصد اور عملی اجزاء میں سے ایک ایک چیز کو قرآن حرام کہتا ہے اسے علی الاعلان اختیار کرنے ہو، مگر اس راستہ پر پہلا قدم قرآن ہی کا نام لے کر رکھتے ہو تاکہ دنیا اس فریب میں مبتلا رہے کہ باقی قدم بھی قرآن ہی کے مطابق ہونگے۔

ہمارا پیشِ نظر کام

یہ دورِ جدید کے "مسلمان" کا حال ہے۔ اب ہمارے سامنے بحث کے دو پہلو ہیں اور اس کتاب میں انہی دونوں پہلوؤں کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

اولاً ہم کو تمام انسانوں کے سامنے، خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، اسلام کے نظامِ معاشرت کی تشریح کرنی ہے اور یہ بتانا ہے کہ اس نظام میں پردے کے احکام کس لئے گئے ہیں۔

ثانیاً ہمیں ان دورِ جدید کے "مسلمانوں" کے سامنے قرآن و حدیث کے احکام اور مغربی تمدن و معاشرت کے نظریات و نتائج دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ دینا ہے تاکہ یہ منافقانہ روش جو انہوں نے اختیار کر رکھی ہے، ختم ہو اور یہ شریف انسانوں کی طرح دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کر لیں۔ یا تو اسلام کے احکام کی پیروی اختیار کریں اگر مسلمان رہنا چاہتے ہیں، یا اسلام سے قطع تعلق کر لیں اگر ان شرمناک نتائج کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں جن کی طرف مغربی نظامِ معاشرت لامحالہ ان کو لے جانے والا ہے۔

ہماری نظر میں

پیغمبر انسانیت ؐ

از :- مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی، ضخامت ۶۳۰ صفحات (مجلد گرد پوش کے ساتھ)
ملنے کا پتہ :- ادارۂ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ، لاہور

جناب مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی کا نام علمی اور دینی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے، تقسیم ہند سے قبل بھی اُن کے علمی و اخلاقی مضامین رسالوں اور اخباروں میں آتے رہے ہیں، مگر جب سے مولانا موصوف ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے رکن بنے ہیں، تالیف و تصنیف کا کام اُن کا مشغلۂ حیات بن کے رہ گیا ہے، اُن کی متعدد کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں اور وہ کسی نہ کسی دینی، اخلاقی اور سیاسی و معاشرتی موضوع پر کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے ہیں۔

مولانا شاہ محمد جعفر صاحب کوئی شک نہیں ایک مفکر عالم ہیں، اُن کا مطالعہ بھی خاصہ وسیع ہے، موصوف ایک علمی صاحب سجادہ درویش خانوادے کے چشم و چراغ ہیں اور علم و اخلاق کے ماحول میں پرورش پائی ہے مگر جب سے ادارۂ ثقافت اسلامیہ سے ملازمت کا تعلق ہوا ہے، اُن کے افکار میں "تجدد" کا رنگ آگیا ہے، اس کتاب (پیغمبر انسانیت ؐ) میں بھی جابجا یہ رنگ جھلکتا ہے!

سیرت پر اُردو زبان میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں علامہ شبلی نعمانی (اور مولانا سید سلیمان ندوی) کی "سیرت النبی" اور قاضی سلیمان منصور پوری کی "رحمۃ للعالمین" بہت زیادہ مشہور اور مقبول ہیں، مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی نے ان کتابوں سے کسی نہ کسی حد تک استفادہ تو کیا ہے مگر ان کی خوشہ چینی نہیں کی، انھوں نے عربی کی کتابوں کا براہ راست خود مطالعہ کیا ہے اور اپنی تحقیق و مطالعہ کو بڑے دل نشین انداز میں پیش فرمایا ہے! کوئی شک نہیں مولانا پھلواروی کی یہ کتاب انداز فکر اور اسلوب تحریر کے اعتبار سے اپنی جگہ ایک منفرد کتاب ہے، تاریخ و سیر کے بعض ایسے واقعات جن کے پڑھنے سے ذہن میں کھٹک پیدا ہوتی ہے ان کو مولانا موصوف نے دور کیا ہے اور ان الجھنوں کو سلجھایا ہے۔

کتاب کا آغاز فاضل مصنف کے برادر زادے جناب حسن مثنیٰ ندوی کے مقالے "پاکستان و ہندوستان کے خادمانِ سیرت" سے ہوتا ہے، اس مقالے میں اُردو زبان کی اُن تصانیف و تالیفات کا جائزہ لیا گیا ہے جو سیرت سے متعلق ہیں۔

بعثت نبوی ؐ سے قبل عربوں کے کیا خصائص و حالات تھے، اس کا کس دیدہ ریزی کے ساتھ لائق سیرت نگار نے تجزیہ کیا ہے۔

"... عربوں میں صرف عیوب ہی نہ تھے، بہت سے ہُنر بھی تھے، لیکن محلِ استعمال کی غلطی نے ان کے ہُنر کو بھی عیب بنا دیا تھا، عرب بے غیرت بھی تھے اور غیرت مند بھی، زن و مرد طوافِ کعبہ کے وقت عریاں ہو جانے کو عبادت سمجھتے تھے، ظاہر ہے کہ اسے بے غیرتی ہی میں شمار کیا جا سکتا ہے، لیکن ان کی غیرت مندی کا انداز یہ تھا کہ اپنی نو مولود دختر کو زندہ در گور کر دینا تقاضائے غیرت تصور کرتے تھے ------- وہ مہمان نواز بھی تھے اور مہمان کُش بھی، جب کسی کو اپنی زبان سے پناہ دیتے تو اُن کے لئے مہمان نواز تھے لیکن جب زائرین حرم کو لوٹنا ہوتا تو انہیں مہمان نہیں سمجھتے تھے"

"وہ بڑے فصیح و بلیغ تھے لیکن اسی وقت جب اپنی خودستائی یا دوسروں کی ہجو کرنی ہو یا اپنے معاشقے کی عریاں داستان بیان کرنی ہوتی لیکن　　　　عصبیت مسئلہ　سر تو اظہار حق میں وہ گونگے بن جاتے تھے"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو کفار قریش نے ظلم و ستم اور طنز و دشنام کا نشانہ بنایا تھا۔ اُس کا اظہار کتنے انگیز نفسیاتی و واقعاتی انداز میں کیا ہے

"نیز اس حقیقت سے کون ظالم بے خبر تھا کہ اس نئے دین کی ساری بنیاد حضور ہی کی ذاتِ گرامی ہے ! یہ کیسے ممکن تھا کہ معاندین و منکرین فروع ہی کی طرف اپنی ساری توجہ مبذول کر دیں اور اصل سے صرفِ نظر کر ڈالیں ! انہیں یہ پورا علم تھا کہ ان "نو مسلموں" کا قبلۂ توجہ اور سب کا مرکزی نقطہ نگاہ ذاتِ محمدی ہے اس لئے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ اپنے ظلم و ستم کا نشانہ صرف پروانوں کو بنائیں اور شمع کو گل کرنے کی فکر نہ کریں۔"

حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا مشہور واقعہ ہے کہ حالتِ اضطرار میں اُن کی زبان سے کلمۂ کفر نکل گیا تھا۔ وہ روتے ہوئے حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اس پر حضور نے فرمایا ——— "کہ جب وہ ایسا کریں تو تم اسی طرح کہہ کر اپنی جان بچا لو" اس پر یہ آیت نازل ہوئی ———

من کفر بعد ایمانہ ... ... ولہم عذاب الیم (۱۶:۱۴)

اس واقعہ اور اس آیت سے "تقیہ" کا جواز ثابت ہوتا ہے مگر اس "تقیہ" کے کیا حدود ہیں، اس پر مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی کا نقد و احتساب کتنا حقیقت افروز ہے

"آیت سے صاف واضح ہے کہ اگر بربنائے ایمان مسلسل جانچ ہو رہی ہو اور اُسے برداشت بھی کیا جا رہا ہو تو زندگی میں بعض مرحلے ایسے بھی آتے ہیں کہ جہاں جان پر بن آتی ہے اور زندگی کو مستقبل کے اعلیٰ مقاصد کے لئے محفوظ رکھنا ہی اعلیٰ قدر ہوتی ہے، ایسے مواقع پر تقیہ جائز ہے۔

لیکن

اگر زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں اسے عام (Generalise) کر دیا جائے اور وہ بھی کسی آزمائش میں پڑے بغیر محض معمولی خطرے کی بنا پر، تو منافقت اور ایمانی پختگی میں کوئی فرق نہ رہے گا اور استقامت کی تمام قدریں ختم ہو جائیں گی۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شفیق چچا جناب ابوطالب نے حضور کی حمایت کی تھی، اس حمایت کی کیا نوعیت تھی، فاضل سیرت نگار نے اس کا تجزیہ کیا ہے

"ابوطالب کی حمایت کی نوعیت وہی ہے جو تمام عربوں میں ہوتی ہے، جسے قبیلوی عصبیت کہتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صحیح و غلط یا حق و باطل سے کوئی بحث نہیں ہوتی، بس یہ جذبہ ہوتا ہے کہ یہ آدمی ہمارے قبیلے کا ہے للہذا اس کی حمایت ضرور کرنی ہے ! قرآنی اصطلاح میں اسے "حمیۃ الجاہلیہ" کہتے ہیں، حضور کی اور دوسرے مسلمانوں کی ایسی حمایت اور بھی بہتیرے اشخاص نے کی ہے، جس کا ذکر آگے آئے گا۔ اس نوعیت کی کوئی حمایت اگر کوئی شخص کسے خواہ وہ قبیلوی برادری کے اندر ہو یا اُس سے باہر، تو یہ ایک انسانی شرافت کہی جائے گی، اور اس کے احسان کا بدلہ زیادہ بہتر احسان سے دیا جائے گا۔ اس دنیا میں اس کو قدر دانی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا، بہت سی دنیوی رعایتیں دی جائیں گی، یہ سب کچھ ہوگا، لیکن اس کا شمار نہ تو "حزب اللہ" میں ہوگا نہ جماعت مومنین میں، للہذا آخرت میں اس کی کوئی قیمت یا وزن نہ ہوگا (فلا نقیم لہم یوم القیامۃ وزنا)

"ابوطالب عرب کے اس قبیلوی جذبہ و ذہنیت سے اچھی طرح واقف تھے، للہذا ہاشمی وقار کو قائم رکھنے کے لئے تمام ابنائے ہاشم کو محمد بن عبداللہ (نہ کہ محمد رسول اللہ) کی حمایت کے لئے ایک مرکز پر جمع کر لیا، صرف ابولہب الگ رہا، باقی سارے کافر و مسلم ہاشمیوں کو سمیٹ لیا ——— بہرحال ابوطالب کی حمایت ایمان و عمل اور نجات کی کسوٹی پر پوری اترنے والی نہیں ہے، لیکن اس دنیا میں مستحق تشکر و امتنان ضرور ہے۔"

حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کی اہمیت کو کتنے اثر انگیز انداز میں ظاہر کیا ہے ۔

"اس وقت انتالیس (۳۳ مرد، ۶ عورتیں) نفوس قدسیہ ایمان لاچکے تھے ۔ جن میں ابوبکرؓ جیسے باثروت زیرک حمزہؓ جیسے شجاع و باہمت اور علیؓ جیسے نڈر شیر بھی تھے ، لیکن ابھی تک نبوت کی شان جمال مظہر شان جلال کی تلاش میں تھی ۔ جناب عمرؓ کی واحد ذات نے اسلام لاکر تصویر[1] نبوت کا یہ دوسرا رُخ بھی بے نقاب کر دیا "

" ووجدک ضالاً فھدیٰ " کی تفسیر و تشریح :-

" . . . ایک نبی کی بھی تقریباً یہی صورت ہوتی ہے کہ وہ بغیر وحی کے بھی ٹھیک راہ پر چلتا ہے ، خواہ نبوت سے پہلے ہو یا بعد از نبوت ، کسی معاملے میں حکم خداوندی نازل ہونے سے پہلے ہو ، لیکن یہ رہنمائی صرف عقل و بصیرت اور فطری اقتاد مزاج کی ہوتی ہے اس میں امکانِ خطا کا ایک پہلو بھی موجود ہوتا ہے مگر اس کے بعد جب وحی اس کی تصدیق کر دیتی ہے ، تو اس توثیق (CONFIRMATION) کے بعد ایک ایسا شعوری یقین پیدا ہو جاتا ہے ، جس میں خطا کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا ۔ جہاں تک ہم نے غور کیا ہے وہ یہ ہے کہ " ووجدک ضالاً فھدیٰ " میں جس " ضلال " کا ذکر ہے وہ یہی عبوری راہروی ہے جو توثیق وحی سے پہلے ہوتی ہے یہ روی گمراہی (بھٹک جانا) نہیں ہوتی ، وحی صرف اس کی توثیق و تصدیق کر کے اسے امکان غلط روی کے شائبوں سے پاک کر دیتی ہے اور حقیقت کو آئینے کی طرح واضح شعور کے سامنے لے آتی ہے " ۔

اذان مسلمانوں کا ایک " کلمہ جامعہ " ہے ، مگر ایک فرقہ نے اس وحدت کو بھی صحیح سالم نہیں رہنے دیا ، مولانا پھلواروی نے اس سلسلہ میں کتنی سچی باتیں کہی ہیں ، فرماتے ہیں ـــــــ

"اہل اسلام ہی کے لئے نہیں بلکہ سارے عالم کے لئے یہی (اذان) کلمہ جامعہ ہے ، دنیا کے لئے اس کے سوا اور کوئی نقطہ وحدت انسانی ممکن نہیں اور مسلمان مختلف ٹکڑیوں میں اس وقت منقسم ہو کر فرقہ بندی کا شکار ہوا جب اس نے اذان میں نیا اضافہ کر لیا ، اذان وہی صحیح ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بلالؓ اور دوسرے موذن دیتے رہے اور امت میں تفریق اس وقت شروع ہوئی ، جب اس میں نیا اضافہ کیا گیا ، جو اضافہ حضرت ابوبکرؓ سے لے کر حضرت علیؓ کی خلافت راشدہ میں نہ کیا گیا بلکہ عرصہ دراز تک کسی نے اس کی جرات نہ کی وہ معلوم نہیں کب اور کیوں گوارا کیا گیا "

" استخارہ کرنا کوئی شک نہیں مسنون ہے مگر بات بات پر استخارہ آدمی کو وہمی بنا دیتا ہے " مولانا پھلواروی نے چند لفظوں میں بہت بڑی حقیقت بیان کر دی :-

" اتباع سنت میں مقدار کے صحیح توازن و تناسب کو برقرار رکھنا بھی ضروری ہے ۔ کھانا سنت ہے لیکن مسلسل کھاتے چلے جانا کوئی سنت نہیں ، یہی حال قرعہ اندازی اور استخارہ کا ہے بقدر مناسب ہی یہ روا ہے اور ہر قدم پر اس کا استعمال انسان کو وہمی بنا سکتا ہے " ۔

فتح مکہ کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے بیعت لیتے تھے ، تو دوسری ضروری باتوں کے علاوہ اُن سے یہ بھی اقرار لیا جاتا تھا ۔

"کسی کے سوگ میں قبر پر نہ بیٹھنا ، سیاہ کپڑے نہ پہننا ، گریبان چاک نہ کرنا ، سر کے بال نہ نوچنا ، چہرہ اور سینہ نہ پیٹنا ۔

[1] " تصویر " کی بجائے " مرقع " ہوتا تو عبارت پاکیزہ تر اور فصیح تر ہو جاتی ، اور بے نقاب کی جگہ " نمایاں " کا محل تھا (م ۔ ق)

مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی نے اپنی اس کتاب میں بعض مشہور روایتوں کو صحیح تسلیم نہیں کیا۔ مثلاً کعب بن اشرف کے قتل کی روایت! وہ یہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کافر اور معاند اسلام کو دھوکے سے قتل کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتے ——— رخصتی کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر نو سال بتائی جاتی ہے مگر مولانا پھلواروی فرماتے ہیں —

"یہ تمام دلائل یہ ثابت کرنے کو بالکل کافی ہیں کہ بوقت رخصتی حضرت عائشہ کی عمر یا تو ۱۲ سال کی تھی یا ۱۸ سال کی تھی یا ۱۹ سال کی، لیکن ۹ سال کی ہرگز نہ تھی۔"

یہ بات کتنی مشہور ہے کہ صحابہ کرام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ فاقہ کی حالت میں بعض اوقات پیٹ سے پتھر باندھ لیتے تھے ——— مگر مولانا پھلواروی غالباً پہلے سیرت نگار ہیں جنھوں نے یہ "نکات" غور و فکر کے لئے پیش کئے ہیں۔

(۱) کیا فاقوں میں پیٹ پر پتھر باندھنے کا رواج پہلے بھی تھا؟ یا بعد میں رہا؟ یا اب کہیں ہے؟

(۲) کیا فاقہ چہرے سے، آواز سے، یا دھنسا ہوا پیٹ دکھانے سے، یا محض زبانی کہہ دینے سے ظاہر نہیں ہو سکتا؟ جو کپڑا اٹھا کر شکم پر بندھا ہوا پتھر دکھانے کی ضرورت پڑے؟

(۳) کیا اس عمل سے فاقوں میں فی الواقع کوئی تسکین ہوتی ہے، اور کیا روزوں میں بھی ایسا کیا جاتا رہا ہے؟

(۴) پیٹ پر پتھر باندھنا کوئی محاورہ تو نہیں؟

تمام مسلمان اپنی بیٹیوں، بہنوں وغیرہ کی شادی میں اس عقیدے کے ساتھ جہیز دیتے ہیں کہ یہ "سنت نبوی" ہے، مگر مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی پہلے عالم، اہل قلم اور سیرت نگار ہیں جنھوں نے اس پر احتساب کیا ہے، فرماتے ہیں: ———

"———۔ جہیز کوئی اسلامی چیز نہیں، نہ قرآن میں اس کا کوئی ذکر ہے، نہ حدیث میں اسے ضروری قرار دیا گیا اور نہ کسی فقہ میں اسے جزو شادی بتایا گیا ہے۔ جہیز صرف ہندوؤں کی رسم ہے اور وہ بھی اس لئے کہ وہاں بیٹی کے ترکے میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ ایک ہی بار بہت کچھ جہیز کے نام سے دے کر گویا حقِ میراث بھی ادا کر دیتے ہیں۔ یہاں کے مسلمانوں نے ان سے یہ رسم لے لی، اور اس کا نام جہیز رکھ دیا، یہاں تک تو خیر کوئی مضائقہ نہ تھا، لیکن غضب یہ ہے کہ اسے سنت رسول بھی قرار دے دیا، اور ثبوت میں وہ چیزیں پیش کر دیتے ہیں، جو حضور نے حضرت فاطمہؓ کو دی تھیں۔ ———"

"ذرا سوچئے اگر جہیز کوئی سنت ہوتا، تو یہ سنت محض حضرت فاطمہ ہی کے ساتھ ادا کی جاتی! کیا حضورؐ کی اور صاحبزادیاں نہ تھیں، لیکن آپ نے کہیں سنا کہ رقیہؓ، ام کلثومؓ اور زینبؓ کو بھی کوئی جہیز دیا! کسی جگہ آپ نے یہ بھی دیکھا کہ فلاں ام المومنین جب رخصت ہو کر حضورؐ کے پاس آئیں تو اپنے ساتھ فلاں فلاں چیزیں جہیز میں لائیں؟ دوسرے بے شمار صحابہ کی اور خود سیدنا علی کی شادیاں ہوئیں کہیں آپ نے یہ پڑھا ہے کہ وہ اپنے ساتھ جہیز لائی تھیں۔

جناب فاطمہؓ کا قصہ یہ ہے کہ حضرت فاطمہ اور حضرت علیؓ دونوں کے سرپرست حضورؐ ہی تھے، اور دونوں کی مناکحت کا اہتمام حضورؐ ہی کو کرنا تھا۔ اس وقت حضرت علیؓ کے پاس کوئی الگ مکان نہ تھا، چونکہ یہاں ایک نیا گھر بسانا اور بنانا تھا، اس لئے حضورؐ نے اتنا کچھ بھی کیا، اگر حضرت علیؓ کے پاس کوئی الگ گھر ہوتا، تو جس طرح اپنی دوسری بیٹیوں کے لئے حضورؐ نے الگ گھر بنانے کا کوئی اہتمام نہ فرمایا، اسی طرح حضرت فاطمہؓ کے لئے بھی کوئی اہتمام نہ فرماتے!

حضرت علی کے پاس کوئی گھر نہ تھا، حضرت حارثہ بن نعمان انصاری نے اپنا گھر خالی کر کے اس نئے پاکیزہ

جوڑے کے لئے پیش کردیا۔ اسی نئے گھر کے لئے حضورؐ کو گھرداری کے کچھ سامان مہیا کرنے پڑے۔ لوگوں نے خدا جانے کیوں اسے "جہیز" فرض کرلیا اور اپنے اوپر ایک مصیبت مول لے لی کہ محض جہیز کے تصور سے بیٹی جیسی نعمت کو ایک وبال سمجھنے لگے"۔

بہت عرصہ ہوا کہ ایک بار ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ایک بڑے وسیع النظر استاذ مولانا شاہ حلیم عطا سلونی سے جہیز پر گفتگو ہوئی، تو انھوں نے فرمایا کہ بیہقی وغیرہ کی روایت ہے۔

"جھز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاطمہ فی خمیل۔۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے "جہیز دیا اور یہی "جہیز" کا لفظ دوسری روایتوں میں چاندی کے ہار کے متعلق بھی ہے، اس لئے جہیز کے وجود سے انکار کیسے ممکن ہے؟ میں نے عرض کیا کہ "سورہ یوسف میں ہے۔

فلما جھزھم بجھازھم ــــــ

تو کیا آپ اس کا ترجمہ یوں کریں گے کہ "جب یوسف نے اپنے بھائیوں کو جہیز دیا"۔ تجہیز کے معنی ہیں سامان مہیا کرنا، نہ کہ جہیز دینا۔ روایت میں جو "جھز [1]" کا لفظ آیا ہے اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ حضورؐ نے فاطمہ کو یہ یہ سامان دیئے، نہ کہ جہیز میں دیئے۔

ماکان لنبی ان یکون لہ اسریٰ حتی یثخن فی الارض۔۔۔۔۔۔"

اس آیت کی شرح میں مفسرین اور اہل سیر نے جو باتیں لکھی ہیں، مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی اُن کو صرف یہ کہ درست نہیں سمجھتے بلکہ اُن کو "فاش غلطیاں" بتاتے ہیں! وہ کہتے ہیں کہ "اثخان" کے معنی نہ لڑنے کے ہیں، نہ قتل کرنے کے۔ اس کے معنی ہیں کسی کو کمزور کر دینا اور اس پر غالب آجانا! اور یہ آیت قیدیان بدر سے نہیں بلکہ ابوسفیان کے قافلہ تجارت سے متعلق ہے!

"اگر آج آپ جاگیردارانہ یا سرمایہ دارانہ نظام کی اصلاح کے لئے، کوئی ایسی تجویز پیش کریں، جس میں اللہ کے عام بندوں کا فائدہ ہو تو فوراً "اسلام خطرے میں آگیا" کا الارم بجادیا جائے گا اور غیر عادلانہ نظام کی حمایت میں علمائے کرام اور مفتیان عظام کے فتوے اور کتابچے پیش کردیئے جائیں گے۔۔ (ص ۱۰۳)

اگر کسی "مستبد" کو اللہ کے بندوں کا فائدہ "کمیونزم" میں نظر آئے، تو علمائے کرام کو کیا اس غلط اندیشی اور فساد و خرابی پر خاموش بیٹھے رہنا چاہیئے! اللہ کے بندوں کا فائدہ اللہ اور رسول ہی کے نظام معیشت کے تحت ہونا چاہیئے! اگر کسی کا فرانہ نظام میں اللہ کے بندوں کا فائدہ نظر آئے، دینی نقطہ نگاہ سے وہ انسانیت کا فائدہ نہیں نقصان ہے۔

"موسیقیت صرف عوالم ہی میں نہیں، حسن صوت سے دل چسپی انسانی فطرت میں داخل ہے اور وحشی قوموں تک میں یہ ذوق پایا جاتا ہے۔ ایسی فطری چیز کو اسلام جیسا دین فطرت کبھی ممنوع قرار نہیں دے سکتا"۔ (ص ۲۴۳)

خوش آوازی اور حسن صوت پر اسلام نے کوئی پابندی نہیں لگائی۔ بعض صحابہ جو قرآن کریم کی تلاوت خوش آوازی کے ساتھ کرتے تھے، اُن کی قرات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پسند فرماتے تھے! بادشاہوں اور امیروں نے جس موسیقی وغنا کو رواج دیا ہے، جو ان دنوں سوسائٹی پر چھائے ہوئے ہیں اور جو دل بہلانے کے علاوہ جذبات شہوت کو حرکت میں لاتے ہیں، ان کو دین فطرت بے شک ممنوع قرار دیتا ہے، اور اسلام کا مکروہات کے بارے میں یہ رویہ اس کے حق اور دین فطرت ہونے کی روشن ہونے دلیل ہے!

[1] حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا لقب "مجھز جیش العسرہ" ہے کہ آپ نے اسلامی فوج کو "سامان" فراہم کیا تھا (م ق)

"ہم دیکھتے ہیں کہ سنہ ہجری ہی سے اس معاشرتی نظام میں سیاسی انداز پیدا ہو گیا۔ جس میں آگے چل کر نظام حکومت کا رنگ بھی مجبوراً آگیا اگرچہ حکومت مقصود نہ تھی" (ص ۲۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس دینی ریاست کے امیر (H E A D) تھے وہ کوئی مجبوری اور سر آن پڑنے کی بات نہ تھی بلکہ حضور نے بہ رضا و رغبت دین کے تقاضوں کو اس طرح پورا فرمایا تھا جیسے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل تھی" اس کے بعد "خلافت راشدہ کا دور بھی" مجبورانہ حکومت" یا پائے باندھنے کی ذمہ داری کا دور نہ تھا۔ کسی خلیفہ نے یہ نہیں کہا کہ ہم ریاست وحکومت کے شکنجے میں حالات سے مجبور ہو کر پھنس گئے ہیں! اور معاشرتی نظام قائم کر کے یہ ریاست وحکومت کا رنگ جو پیدا ہو گیا ہے اسے ہم بادل ناخواستہ گوارا کر رہے ہیں ـــــــ افسوس ہے کہ مولانا پھلواری صاحب حکومت اور کے بارے میں کارل مارکسی ذہن رکھتے ہیں۔

"حضور کی رائے سے اختلاف کرنا کوئی معصیت نہیں بلکہ حضور کو بحکم خداوندی تھا کہ" شاورھم فی الامر" اور ظاہر ہے کہ مشورے میں حضور کی رائے سے اتفاق واختلاف دونوں ہو سکتے ہیں" (ص ۲۲۵)

مولانا موصوف نے یہ بات کہہ کر منکرین سنت کی صف میں اپنے کو کھڑا کر دیا ہے! افسوس!! جس مشورت کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس کا تعلق دینی احکام سے نہیں بلکہ تدبیری امور سے تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کا نصاب اور شرح مقرر کرنے میں کسی صحابی سے مشورہ نہیں لیا تھا، اور نہ نماز رکعات کا تعین مسلمانوں کی باہمی مشورت سے ہوا۔ دینی احکام میں حضور کے حکم سے عمداً اختلاف نہ صرف یہ کہ معصیت بلکہ کفر ہے! حلال و حرام میں حضور نے کبھی مشورہ نہیں لیا! لہٰذا کتاب وسنت میں جو احکام ملتے ہیں ان سے اختلاف کرنا (معاذ اللہ) اپنے دین وایمان کو تباہ کرنا ہے! دین نام ہی اطاعت کا

"۔۔۔۔ لیکن اب جو ذخیرہ روایات ہمارے سامنے موجود ہے اس میں بجز حضور کی بعض پیش گوئیوں یا احادیث قدسیہ وغیرہ کے (وہ بھی اگر معیار صحت پر پوری اتریں) اور کسی حدیث کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ حضور کی غیر قرآنی وحی ہے چہ جائیکہ اسے متلو مع قرار دیا جائے (صفحہ ۳۲۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کتاب وسنت اور تزکیہ نفس کی جو تعلیم دی ہے وہ احادیث کی کتابوں میں محفوظ ہے جس کے لئے علماء "وحی غیر متلو" کی اصطلاح بولتے ہیں، ایک مسلمان کو قرآنی وحی کے ساتھ اس "وحی" (غیر متلو) کو بھی دین میں حجت سمجھنا چاہیئے۔ جو کوئی حضور کی سنت مطہرہ کو دین میں حجت نہیں سمجھتا، وہ منصب رسالت کا منکر ہے، ہم منکرین رسالت سے اپنی برأت و بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔

"پہلا سندیس" (صفحہ ۵۹) یہ ذیلی عنوان ہے، اس سے پہلے کا عنوان ہے "رد بلائے صلوٰۃ" اس کے بعد "پہلا سندیس" کس قدر بے جوڑ لگتا ہے "پیغام" کی جگہ "پہلا سندیس" لکھنے کی آخر کون ضرورت لاحق ہوئی؟

لائق مصنف نے وارننگ، ایتھر اور پینک (Panic) جیسے انگریزی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں ـــــــ صفحہ ۱۳۱ پر "مکہ کو مکے میں ایمان والوں کے ساتھ کیا گیا) اور "حبشہ" کو "حبشے" (صفحہ ۱۲۰) (حضور کبھی حبشے تشریف نہیں لے گئے) لکھا ہے! "مدینہ" کو بعض لوگ "مدینے" لکھتے ورنہ عام طور پر اسم معرفہ (Proper Nouns) میں "ہ" "یے" سے نہیں بدلی جاتی۔ مثلاً یوں کون لکھتا ہے ـــــــ قرطبے کی سیر کر کے آیا ہے، اور حجاز سے دالبندہ پر اس کی ہمیانی کھوگئی تھی اور وہ اب شبیلے کو دیکھنے کے لئے اسپین جائیگا!"

مس خام کو جس نے کندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا (ص ۹۶)

یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے کہ "جس نے" کی جگہ "جس کے" چھپ گیا ـــــــ "آپ دیکھیں گے کہ جور وظلم کے جو پہاڑ آزادوں کے سر پر توڑے گئے اس سے زیادہ ہی ان غلاموں کے ساتھ کیا گیا (ص ۷۹) حیرت ہے کہ اس قدر مشاق اہل قلم اور ادیب انوشتوں کا سا انداز تحریر ـــــــ "اب باقاعدہ ایک منظم جھ

ستم ایجاد یوں کے لئے بنایا (صفحہ ۱۰۱) "ستم ایجادیوں" پہلی بار نظر سے گزرا اور وجدان نے اجنبیت محسوس کی — "وہاں اطمینان سے رہ کر اتنا پھر اسلامی احکام کی پابندیوں کے ساتھ زندگی گزارنے لگے (صفحہ ۱۱۹) "اتنا پھر" کی جگہ کسی طرح استعمال کیا ہے' یہ اہل بہار کی زبان ہے!

"مجمع اس انوکھے مقدمے کی کارروائیاں دیکھنے سننے کا مشتاق ہے" (صفحہ ۱۳۲) "کارروائی" کی جمع یہاں بلا ضرورت اور بے محل لائی گئی ہے —

"نصرد لرحق کو ہمیشہ پہلے جبر و اکراہ سے، ڈراووں اور دھمکیوں بھرے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے" (صفحہ ۱۳۲) "نصرد لرحق" یہ حق کی آخر کونسی قسم ہے؟

"خطاب کا یہ آتش اندر فرد ند بولا" (صفحہ ۱۴۷) غضبناک' مشتعل یا بھرے ہوئے کی بجائے "آتش اندر فعل" میں کس قدر تکلف پایا جاتا ہے۔

"محمدی جنون عشق الہٰی نے، انہیں بھی جنون عشق کا سرشار بنا لیا تھا" (صفحہ ۱۸۱) اس جملہ میں کس قدر کچا پن پایا جاتا ہے خاص طور سے "محمدی جنون عشق الہٰی" قابل غور ہے! اس کے کسی لفظ میں توازن کا لگاؤ ہے" (صفحہ ۱۹۰) آخر لائق مصنف کہنا کیا چاہتے ہیں' یہ "توازن کا لگاؤ" کیا ہوتا ہے؟

"جناب ابو بکر نے . . . . . اپنے صاحبزادے عبداللہ بن ابی بکر . . ." (صفحہ ۲۲۲) "اپنے صاحبزادے" لکھنے کے بعد "بن ابی بکر" لکھنے کی ضرورت نہ تھی

"حتیٰ کہ رجز الاپنے میں بھی ——" (صفحہ ۲۹۵) "رجز" کے ساتھ الاپنا صوتی طور پر کتنا ناگوار لگتا ہے، پھر "رجز الاپنا" روزمرہ کے بھی خلاف ہے'

"غرض انھوں نے جس عبداللہ بن سلام کی ایک منٹ پہلے مدحیاں کر رہے تھے، اسی کو ملامیاں کرنا نے لگے (صفحہ ۲۹۹) "انھوں نے" کی جگہ "وہ" لکھنا چاہیئے تھا یا پھر "مداحیاں کی تھیں" لکھتے! —— "لیکن اس صدمے کو حضور صلعم نے کوئی ذاتی صدمے سے متجاوز نہ ہونے دیا" (صفحہ ۲۵۲) پورا جملہ ہی کا واک اللہ غلط ہے اور ترجمہ سا لگتا ہے! "اس موقعے پر سب سے بڑے جگرے کا ثبوت عائشہ کے پدر بزرگوار نے دیا" (صفحہ ۲۲۷) "جگرے" کا اس طرح استعمال مقامی محاورہ معلوم ہوتا ہے۔ لائق مصنف جس مفہوم کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے "ظرف و تحمل" جیسے الفاظ موزوں تھے۔

"اس کا افسر الکل ابو سفیان تھے" (صفحہ ۳۳۹) "افسر" فارسی لفظ ہے' جو تاج اور صاحب تاج کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ سودا کا شعر ہے ؎

کون دنیا میں آج ہے تجھ سا ۔۔۔ مالک تخت و صاحب افسر

اردو میں اس لفظ کو عہدیدار ( ) کے معنی میں بولتے ہیں' فارسی یا اردو لفظ کے ساتھ عربی لفظ "کل" کی اضافت قطعاً غلط ہے — "افسر الکل" کی ترکیب نامانوس و عجیب بھی ہے!

اس کتاب میں "قدر" اور "اقرار" کا استعمال اس کثرت سے ہوا ہے کہ بعض اوقات اس لفظ کی تکرار وجدان کو کھٹکنے لگتی ہے ——

صفحہ ۳۰۴ پر ایک ذیلی سرخی ہے "اقرار معاہدہ کی عجیب حفاظت" اول تو "اقرار معاہدہ" ہی عجیب سا لگتا ہے' "عجیب حفاظت" اس پر مستزاد!

زبان و بیان اور فکر و عقیدہ کی غلطیوں کے باوجود "پیغمبر انسانیت" اونچے درجہ کی کتاب ہے، انداز تحریر دل نشین اور اثر انگیز ہے' زبان سادہ اور عام فہم ہے سیرت نگار صرف واقعات کے ناقل نہیں ہیں' بلکہ انھوں نے جگہ جگہ تفکر و تعمق کا ثبوت دیا ہے' اور پڑھنے والوں کو سوچنے اور غور کرنے کی دعوت دی ہے ساتھ ہی سیرت کے واقعات سے فکر انگیز نتائج اخذ کئے ہیں' سب سے بڑی بات یہ ہے کہ عشق رسول کی چنگاریاں کتاب کے صفحات پر جگہ جگہ فروزاں نظر آتی ہیں

گلدستہ قرآن و حدیث

از:- ڈاکٹر قاری کلیم اللہ حسنی، ضخامت ۹۸ صفحات، ہدیہ ایک روپیہ۔
ملنے کا پتہ:- مکتبہ کلیمیہ بازار نور الامراء حیدرآباد دکن ۲۴

اس گلدستہ کے مرتب نے "پیش لفظ" میں لکھا ہے:-

"خاکسار نے اس کی ضرورت محسوس کی کہ دار القرآت میں ابتدائی دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے روزانہ صبح میں کمسن بچیاں اور بچے جمع ہوتے ہیں' ان کے لئے قرآن مجید اور حدیث شریف کی ایسی مختصر اور ضروری آیتیں اور حدیثیں جمع کی جائیں' جو ان کی نفسیات' ماحول اور موجودہ ضروریات کے مطابق ہوں، اگر ایسی مفید چیزیں بچپن ہی سے انہیں یاد کرا دی جائیں تو ان کی آئندہ زندگی کے لئے مشعل راہ بن سکیں گی"

کوئی شک نہیں یہ گلدستہ اس ضرورت کو پورا کرتا ہے اور مسلمان بچوں کی ذہنی تربیت کے لئے یہ بہت مفید اور مبارک کوشش ہے۔ آیات واحادیث کا ترجمہ سہل اور عام فہم ہے۔ اللہ تعالیٰ مرتب کو اس نیک کام پر دارین میں اجر عطا فرمائے گا۔

عصمتِ رسولؐ مولفہ :۔ سید حشمت حسین جعفری، ایڈووکیٹ، ضخامت ۲۲۲ صفحات، قیمت تین روپے،
ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ افکار اسلامی، گاڑی کھاتہ، حیدر آباد

اس کتاب میں عقلی و نقلی دلائل سے اس نظریہ کی پرزور تردید کی گئی ہے کہ پیغمبر اسلام سے بشری حیثیت میں اجتہادی غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں۔ شک نہیں کہ فاضل مصنف نے اس کتاب کی تیاری میں بڑی کاوش و تحقیق کو صرف کیا ہے۔ وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ :۔

"انبیائے کرام علیہم السلام ہر قسم کے گناہ سے کبیرہ ہو یا صغیرہ اور ہر قسم کی خطا اور لغزش سے عمداً ہو یا سہواً مثل ملائکۃ اللہ محفوظ اور معصوم ہیں"۔

قرآن کریم کی آیت ——— "ووجدک ضالاً فہدیٰ" میں جو "ضال" آیا ہے، اس کی تفسیر میں لائق مصنف لکھتے ہیں ۔

"ضال" بہ معنی "محب" اکثر مقام پر استعمال ہوا ہے "ضال" ایسے شخص کو کہتے ہیں، جو کسی چیز کی محبت میں محو اور از خود رفتہ ہو گیا ہو۔ جیسا کہ آیہ انک لفی ضلالک القدیم میں ضلال کے معنی انتہائے محبت کے ہیں، اور یہ معنی عطاء ابن رباح تابعی سے منقول ہیں (مدارج النبوۃ جلد ۱ ص ۱۰۸)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس قول :۔

"رب انی ظلمت نفسی فاغفرلی"

کی شرح حضرت امام رضا رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے یہ کی گئی ہے ———

"میں نے اس شہر میں داخل ہو کر اپنے کو ایسے مقام پر رکھا، جو اس کی جگہ نہ تھی (کہ وہ دشمنوں کا شہر تھا) بس تو مجھ کو دشمنوں سے پوشیدہ رکھ تاکہ وہ مجھ پر قابو نہ پائیں"۔

اس شرح و تفسیر سے انھوں نے یہ بات ثابت کی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوئی خطا سرزد نہیں ہوئی، جس کی معافی کے لئے انھوں نے اللہ تعالیٰ سے (فاغفرلی)..... درخواست کی!

حضرت زید رضی اللہ عنہ نے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کو جو طلاق دی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کیا تھا، اس میں قرآن میں جو آیت آئی ہے ——— کہ

واذ تقول للذی انعم اللہ علیہ - - - - - - مفعولا

جناب جعفری صاحب اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"کامل غور و خوض کے بعد عاجز اس آیت کے متعلق اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اس میں جس قدر شکوک اور اوہام پیدا ہوتے ہیں وہ اس وقت کہ "تخفی" اور "تخشی" کو "تقول" پر معطوف سمجھ کر ان سب کا فاعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر "امسک علیک زوجک" سے لے کر "ان تخشاہ" تک مسلسل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے آزاد کردہ غلام کو نصیحت سمجھا جائے، تو نام کو بھی کوئی اعتراض یا وہم و شک پیدا نہیں ہوتا"۔

صفحہ ۵۸ پر "چیلنج" نظر آیا، یہ دکنی انداز تحریر ہے کہ فیکٹری کو فیاکٹری اور ہیٹ کو ہیاٹ بولتے اور لکھتے ہیں۔

اس کے بعد آیت قرآنی کی ترجمانی یوں کی ہے :-

"اے پیغمبر! اس وقت کو یاد کرو (جب تم اس شخص (زید) سے جس پر اللہ نے بھی احسان کیا تھا اور تم نے بھی احسان کیا تھا یہ کہہ رہے تھے کہ زید! دیکھو حتی الوسع اپنی بیوی سے نباہ کرنے کی کوشش کرو۔ اور خدا سے ڈرو اور یوں تو اظہار باسبار شکایت کرنے سے ظاہر ہے کہ تم اس چیز (ارادۂ طلاق زینب) کو اپنے دل میں پوشیدہ کئے ہوئے تھے وہی جس کو ظہور میں لانا اللہ کے ہاتھ میں ہے اور تم (اس بارے میں) لوگوں سے ڈرتے ہو (کہ کہیں گے ایک آزاد کردہ غلام نے اتنے بڑے گھرانے کی لڑکی کو طلاق دے دی) حالانکہ اُمور شرعیہ میں اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ غرض جب (باوجود اس نصیحت کے) زید نے اپنی زوجہ کے بارے میں اپنی خواہش کو پورا کیا (اس کو طلاق دیدی) تو ہم نے زینب کو تم سے بیاہ دیا۔ اور اس نکاح سے غرض یہ تھی کہ مومنین کو اپنے لے پالک لڑکوں کی مطلقہ بیویوں سے نکاح کرنے میں آئندہ کوئی قباحت باقی نہ رہے (اور جاہلیت کے زمانے کی رسم کا خاتمہ ہو جائے) اور اللہ کی بات تو ہو کر رہتی ہے۔"

ایلاء کے سلسلہ میں جو روایتیں آئی ہیں، اس کے بارے میں فاضل مصنف لکھتے ہیں :-

"ایلاء کے سلسلہ میں تین ہی واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ جن میں سے ماریہ اور شہد والا واقعہ دونوں ساقط الاعتبار قرار پاتے ہیں۔ اس لئے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حضورؐ کا ازواج سے اعتزال، نزول آیہ تحریم وتخییر سب واقعات ازواج مطہرات کے مطالبہ توسیع نفقہ و کسوت کے سلسلہ میں رونما ہوئے۔"

یعنی

یہ جو قرآن کریم میں آیا ہے ـــــــ یا ایھا النبی لما تحرم ما احل لک ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ تو حضورؐ نے کوئی حلال شے اپنے اوپر حرام نہیں فرمائی تھی، جس پر اللہ تعالیٰ نے احتساب کیا ـ ـ ـ بلکہ ـ

"اے نبی! تم نے (اپنے نظریہ حیات پر) اپنی بیویوں کے قناعت کرنے کی خواہش میں ہر آرام اور خوشگوار طعام سے جو اللہ نے (دیگر مسلمانوں کی طرح) تمہارے لئے بھی جائز قرار دیا ہے، بہرہ اندوز ہونا کیوں ترک کر رکھا ہے، خاص کر ایسی حالت میں کہ جب اللہ نے قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے۔"

"عبس وتولیٰ" کے ترجمہ میں سید حشمت علی جعفری صاحب نے اس کا فاعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی بجائے کفار قریش کے اس سردار کو قرار دیا ہے، جن سے حضورؐ دین کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ حضرت عبداللہ ابن مکتوم نابینا صحابی کو دیکھ کر اس کفار قریش کے سردار نے تیوری چڑھائی۔ صاحب موصوف نے اپنی کتاب میں یہ ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ کسی قسم کی کوئی بھول چوک ہوئی اور نہ حضورؐ کے کسی فعل پر عتاب نازل ہوا

وَاِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ

اور اگر شیطان کی طرف سے تمہاری (امت کے) دل میں کوئی وسوسہ پیدا ہو تو اللہ سے پناہ مانگو کیونکہ اس میں شک نہیں کہ وہ بڑا سننے والا اور واقف کار ہے۔

پر شیعہ عالم مولانا فرمان علی صاحب کی حمائل کا ترجمہ ہے :

دین و دنیا کا کوئی مسئلہ ہو اس میں افراط و تفریط مناسب نہیں، نری تاویل، تو یہ بات کی کسی نہ کسی عنوان سے تاویل کی جا سکتی ہے، صحیح بات یہ ہے کہ تنزیہ کامل جہاں سہو و نسیان اور کسی قسم کی کمزوری کا شائبہ امکان تک نہ ہو یہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، انبیاء کرام بے شک معصوم ہیں۔

ہوائے نفس کے تحت ان سے کسی قسم کی خطا کا صدور نہیں ہوا۔ مگر دین کی خیرخواہی میں کبھی کبھار "ترک اولیٰ" ہوگیا ہے یا یوں سمجھئے کہ اندازے کی بھول چوک ہوگئی جس پر وہ جمے نہیں رہے، اللہ تعالیٰ نے فوراً اس پر متنبہ فرمادیا لیکن شک نہیں کہ انبیاء کرام اخلاق کے اعتبار سے "معصوم" ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی خاک پا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

حضرت آدم علیہ السلام سے تقرب الٰہی کے جذبے کے تحت جو بھول چوک ہوئی تھی قرآن کریم میں اسے "عصیٰ" اور "فازلہما" کہا گیا ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام پر بھی کسی کوتاہی کی بنا پر عتاب نازل ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور سے واپس ہوئے ہیں تو دینی غیرت کے سبب وہ اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام پر سخت خفا ہوئے، یہاں تک ان کے بال پکڑ کر کھینچے۔ حالانکہ حضرت ہارون علیہ السلام سے گوسالہ پرستی کی تردید و مذمت میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہوئی تھی۔ مگر حضرت موسیٰ کا یہی خیال تھا جس پر انہیں بعد میں تنبیہ ہوا کہ ان کا اندازہ واقعہ کے مطابق نہ تھا۔

صحیح احادیث میں ملتا ہے کہ کبھی کبھار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھانے میں رکعتیں کم یا زیادہ کردیں، اور معلوم ہوجانے پر سجدۂ سہو کیا! اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت اور ہدایت کا انبیاء کرام نے اپنے کو ہر وقت محتاج سمجھا، ان کے مقدس قلوب اللہ تعالیٰ کی محبت اور ساتھ ہی خشیت سے معمور رہتے تھے۔

"علامہ ابن الحدید معتزلی نے شرح نہج البلاغہ میں لکھا ہے کہ "ائمہ ضلالت" اور "دعاۃ الی النار" سے معاویہ و عمرو عاص اور دوسرے دوسرے لوگ مراد ہیں   علامہ علی نقی صاحب طرابلی شیعی مجتہد نے بھی اپنی شرح نہج البلاغہ میں "ائمہ ضلالت" کی یہی تصریح کی ہے۔

کوئی شک نہیں کہ امیر معاویہ اور عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہما) سے حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے معاملہ میں غلطی ہوئی۔ اور حق حضرت علی مرتضیٰ کے ساتھ تھا! مگر ان بزرگوں کا شرف صحابیت اپنی جگہ مسلم اور ثابت ہے" ان کو "دعاۃ الی النار" کہنا سخت گستاخی اور بدتوفیقی ہے جو عام طور پر اہل رفض کا مسلک ہے۔

سوانح حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ضخامت ۳۲۴ صفحات مجلد رنگین گردپوش، قیمت پانچ روپے، ——— ملنے کا پتہ :- مکتبہ اسلام، ۳۷ گوئن روڈ لکھنؤ ———

حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ صاحب ذکر و شغل بزرگ تھے جن کی صحبت و تربیت سے بہت سے لوگوں کو فائدہ پہنچا ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی حضرت موصوف کے تربیت یافتہ اور منجملہ نظر کردہ صاحب نظر ہیں۔

اس کتاب پر مولانا محمد منظور نعمانی نے دلنشین انداز میں سیر حاصل مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔ اس میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ میرے دل میں تصوف کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہوگئے تھے۔ حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری نے تصوف کے مقصد اور مشاغل و وسائل اذکار و اشغال وغیرہ کا تجزیہ فرماکر ایسی محققانہ تقریر فرمائی جس سے اپنے اشکالات و سوالات کی غلطی کی بنیاد خود مجھ پر منکشف ہوگئی اور معلوم ہوا کہ سارے اشکالات اپنی نافہمی اور کم عقلی سے پیدا ہورہے تھے، بہرحال وہی دن میری زندگی کے موڑ کا دن تھا۔

جزاک اللہ چشمم باز کردی

مولانا علی میاں مدظلہ نے حضرت مولانا رائے پوری قدس سرہ کے سوانح حالات بڑی عقیدت و محبت کے ساتھ مرتب کئے ہیں۔ اور ایک ایک جزئیہ کو خاصی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، بہت سے واقعات، دوسروں کی روایات و مشاہدات پر مشتمل ہیں۔ فاضل سوانح نگار نے اس کی پوری کوشش کی ہے کہ عقیدت میں غلو کا رنگ پیدا نہ ہونے پائے

حضرت مولانا رائے پوریؒ اپنی نوجوانی کے زمانے میں "قادنیت" سے متاثر ہوگئے تھے اس تفصیل کو پڑھ کر سخت وحشت ہوئی اور اس میں

بار بار یہ بات کھٹکی کہ اگر ایسا ہوا بھی تھا تو اس کے ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی، مگر بعد کے صفحات میں یہ پڑھ کر طبیعت کو مسرت ہوئی اور بے انقباض دور ہوا کہ حضرت رائے پوری قادیانیت کو اسلام کی بیخ کنی اور تخریب کا ذریعہ سمجھتے تھے، اور آپ نبوت کے ہر مدعی کو نبوت محمدیؐ کا رقیب و حریف سمجھتے تھے (صفحہ ۲۶۸) کاش مولانا عبدالماجد دریا بادی کے دل میں یہ حقیقت کسی طرح اتر جائے۔

"رائے پور کا دور بڑے مجاہدے اور جفاکشی کا تھا، یہ سب ان لوگوں کی تکمیل حال کے لئے تھا جن کی ترقی و پختگی اللہ تعالیٰ کو منظور تھی، لنگر کی روٹی اتنی موٹی اور کچی ہوتی تھی کہ بغیر پانی یا چھاچھ کے حلق سے نیچے نہیں اترتی تھی، اخیر زمانے میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ یہ ریاح کا مرض اور ضعف معدہ اسی وقت سے ہے۔" (صفحہ ۵۱)

تکمیل حال کے لئے دانستہ اور عمداً کچی روٹیاں کھانا اور کھلانا یہاں تک کہ کھانے والوں کی صحت خراب ہو جائے اور "تکمیل حال" کے بعد وہ اپنے امراض کی شکایت کریں کوئی تعریف کی بات نہیں ہے۔ صاف پانی میسر ہو تو اسے گدلا کر کے ہرگز نہیں پینا چاہیئے، اور آٹا اور اس کے پکانے کی سہولتیں اللہ تعالیٰ کے فضل سے مہیا ہوں تو روٹیوں کو جان کر کچی پکانا کوئی نیکی کا کام نہیں ہے۔

"حضرت رائے پوری کو اخبارات کا انتظار رہتا اور پابندی سے وہ پڑھتے۔ جانے بعض زمانے میں یہ سلسلہ عصر کے بعد رہتا۔" (صفحہ ۹۸)

اگر کسی دوسرے حلقہ اور جماعت میں دین کی خاطر اخبارات نکالے جائیں، پوسٹر شائع ہوں، سالانہ اجتماعات منعقد کئے جائیں، پریس کانفرنسیں ہوں تو اس پر دنیاداری کا دھوکا ہوتا ہے اور "تعلق مع اللہ" میں ڈھیل اور سستی دکھائی دیتی ہے۔

"اسی کا نام قرآن مجید کی اصطلاح میں استدراج بھی ہے" (صفحہ ۴۹)

ارہاص، استدراج، معجزہ اور کرامت ..... یہ سب اصطلاحیں اپنی جگہ درست ہیں مگر اس عبارت سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں لفظ "استدراج" آیا ہے۔

کوئی شک نہیں اس کتاب کے پڑھنے سے تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کا ذوق پیدا ہوتا ہے، خدا رسول اور آخرت کی یاد آتی ہے، اپنی غفلت اور کوتاہیوں پر ندامت ہوتی ہے اور یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ نیک لوگوں اور اللہ والوں کی صحبت سے بڑا فائدہ پہونچتا ہے اور ان کی تلقین و تربیت سے دینی کردار بنتے ہیں۔ اللھم کثر امثالھم

تذکرہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت

از سخاوت مرزا۔ ضخامت ۳۰۰ صفحات (مجلد) قیمت چھ روپے ۵۰ نئے پیسے

ملنے کا پتہ: انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز حیدرآباد دکن

جناب سخاوت مرزا بی، اے، ایل، ایل، بی (عثمانیہ) متعدد کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔ یہ کتاب جو حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حالات پر مشتمل ہے، بڑی کاوش و محنت سے مرتب کی گئی ہے حضرت مخدوم کے علاوہ آپ کی اولاد و رفقا اور یاران ہم مشرب کے حالات بھی اس کتاب کی زینت ہیں! اس تذکرے کے آخری ڈیڑھ سو صفحات میں حضرت مخدوم کے خانوادوں اور وابستگان کے جو حالات درج ہیں، وہ صفحات "ناموں" کا جنگل نظر آتے ہیں!

"ایک روز شیخ نصیرالدین چراغ دہلی قدس سرہٗ آپ سے بغل گیر ہوئے تو جس قدر نعمت آپ نے سینکڑوں شیوخ سے حاصل کی تھی وہ سب شیخ مذکور نے سلب کر لی ...... پھر چراغ دہلیؒ نے آپ کے سینہ سے اپنا سینہ مس کیا تو تمام نعمتیں اور فیوض اس سے بھی بہت زائد حاصل ہو گئے" (صفحہ ۱۲)

صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے دور میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ فلاں صحابی نے فلاں تابعی کو سینہ سے لگایا تو اس بچارے کے سامنے کمالات سلب کر لئے ...... آخر یہ کیا واردات اور کیفیات ہیں اور ان کا ماخذ کیا ہے؟

"شیخ رکن الدین ابو الفتح کا انتقال ہو گیا میں نے تجہیز و تکفین میں شرکت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام بھی شریک تھے" (صفحہ ۴۸)

کیا رسول اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام "وفات" پانے کے بعد جسمانی طور پر دنیا میں آکر لوگوں کے جنازوں میں شریک ہوا کرتے ہیں ــــ یہ کیا مشاہدات ہیں؟ اگر حضور اس طرح جنازوں میں شریک ہوا کرتے تو حضرت حسن اور حضرت حسین کے جنازے اس کے سب سے زیادہ مستحق تھے

"یعنی دوسرے الفاظ میں "لاموجود الا اللہ" توحید حقیقی ہے" (صفحہ ۶۵)

کلمہ توحید "لاموجود الا اللہ" نہیں "لا الہ الا اللہ" ہے۔ اس کلمہ سے غیر اللہ کے موجود ہونے کی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ماسوا کسی کے "الٰہ" ہونے کی نفی کی گئی ہے!

"صوفیائے کرام کے یہاں ایمان کے معنی دیدار کے ہیں" (صفحہ ۶۷)

صوفیا کو کیا حق ہے کہ وہ "ایمان" کی ایسی تعریف کریں جس کی اصل کتاب و سنت اور آثار صحابہ میں نہ ملتی ہو۔ اول تو یہ مسئلہ ہی سخت متنازعہ فیہ ہے کہ دنیا میں دیدار الٰہی ہو بھی سکتا ہے؟ پھر اس دنیا میں کتنے مسلمان ایسے ہیں جن کو دیدار الٰہی کا شرف حاصل ہے۔ اور جب ایمان دیدار الٰہی کا نام ہے تو اس خود ساختہ نظریہ کی بنا پر مسلمانوں کی غالب اکثریت دیدار الٰہی نہ ہونے کے سبب "بے ایمان" قرار پاتی ہے (معاذ اللہ)

"حضرت مخدوم جہانیاں قدس سرہ کا قول ہے کہ منصور حلاج نے انا الحق سکر کی حالت میں نہیں کہا تھا بلکہ وہ حال کے مالک تھے" (صفحہ ۶۹)

منصور حلاج کا نعرہ ہر اعتبار سے لغو اور قابل مذمت ہے اور تصوف کے دامن پر سب سے زیادہ بدنما داغ ہے۔ غیرت توحید اس نعرے کو کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی۔

"اس لئے اولیاء اللہ مرتے نہیں ہیں بقول علیہ السلام ان اللہ لا یموتون ولکن ینقلون من دار الی دار۔"

"علیہ السلام" سے اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی مراد ہے، تو یہ قول حضور پر تہمت ہے، یہ قول رسول ہو ہی نہیں سکتا جبکہ خود حضور پر طبعی موت واقع ہوئی تھی! اولیاء اللہ بیمار ہوتے ہیں مرتے ہیں، اور ان کے بے جان جسموں کو قبروں میں دفن کر دیا جاتا ہے ــــ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر شے ہالک و فانی ہے۔

تصوف کے یہ نکتے، رموز اور باریکیاں سخت الجھن میں ڈالنے والی ہیں یہ جہاں بھی ہیں ان کو وہیں دفن رہنے دینا چاہیئے جو لوگ ان گڑے ہوئے مردوں کو اکھاڑ کر انہیں کتابوں کے شوکیسوں میں سجاتے ہیں وہ سخت غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں۔

مضامین سلیم (جلد سوم)

از مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی ـ مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ ضخامت ۲۰۸ صفحات (مجلد) قیمت چار روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ کل پاکستان انجمن ترقی اردو، اردو روڈ، کراچی

مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی مرحوم کے مضامین کی یہ تیسری جلد انجمن ترقی اردو (پاکستان) نے شائع کی ہے، ان میں سے بعض مضامین آج سے ساٹھ سال پہلے کے لکھے ہوئے ہیں، ہر مضمون کوئی نہ کوئی افادی پہلو رکھتا ہے۔ زبان شستہ اور اسلوب تحریر دلنشین ہے۔

"اگر تم اپنا خرچ آمدنی سے کم رکھ سکتے ہو تو سمجھ لو کہ پارس کا پتھر تم نے حاصل کر لیا" (صفحہ ۱۷)

روزمرہ " پارس پتھر" ہے ـــــــــــ صفحہ ۱ کے حاشیہ میں ان مضامین کے فاضل مرتب نے "ڈالر" کو قریباً ڈھائی روپیہ کا بتایا ہے
ہوں نے غالباً پچھلی ڈکشنریوں کو دیکھ کر یہ قیمت لکھی ہے مگر آج کل ڈالر کی قیمت چار روپے سے کچھ زائد ہی ہے :

مولوی وحید الدین سلیم نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں مشورہ دیا ہے :-

(۱) مسلمان بچوں کی تعلیم ایسے معلموں کے ہاتھوں میں دی جائے جن کا چال چلن خراب نہ ہو۔

(۲) مسلمان بچوں کی مذہبی تربیت پر ایسے عالم مقرر کئے جائیں جو دل سے مذہب کو مانتے ہوں۔
اور جو مذہبی زندگی کا نمونہ ہوں۔

(۳) مسلمان بچوں کی مذہبی اور اخلاقی درستی اور اس کی ترقی پر انعام مقرر کئے جائیں۔

ش! پاکستان کے ارباب حل و عقد کی نگاہ سے بھی یہ تحریریں گزرتی رہیں کہ یہاں "رقص و سرود" کے ذریعہ نئی نسل کے اخلاق کو خراب کیا جا رہا ہے۔
"مخلوط تعلیم" کی وبا عام ہوتی جا رہی ہے اور اُس کے نقصانات سامنے آ رہے ہیں

"تم کہ جو اس کائنات میں زندگی بسر کر رہے ہو خدا کی عظمت اور اس کا جلال ہر طرف سے احاطہ کئے ہوئے
ہے مگر نہ تم آنکھوں سے اس کو دیکھ سکتے ہو نہ اس کی ہستی کو عقل سے پا سکتے ہو، ایمان کی وہ مقدس
اور مذہبی روشنی جو تمہارے دل کی گہرائی میں مخفی ہے اور جس کو خدا ہی نے اپنی رحمت سے تمہارے دل میں
ودیعت کیا ہے، البتہ اس کو پا سکتی ہے اور اس کی عظمت و جلال کا سراغ لگا سکتی ہے۔ اگر یہ روشنی
تمہارے مجادلوں اور مکابروں کی ہوا سے گل ہو جائے تو پھر اس زندگی کی تاریکی میں کسی اور روشنی
سے ہدایت نہیں پا سکتے۔"

کس قدر ایمان افروز و یقین آفرین ہے یہ عبارت!

اس مجموعہ میں تاریخ، سائنس، الہیات، تجارت اور سیاست غرض مختلف موضوعات پر مضامین ہیں، انجمن ترقی اردو نے اس کتاب کو چھاپ کر
علم و اخلاق اور زبان و ادب کی قابل ذکر خدمت انجام دی ہے۔

سید شوکت حسین زیدی (ایک یادگار)

مرتبہ۔ سید محمد حسین رضوی ضخامت ۱۹۰ صفحات مجلد
ملنے کا پتہ: سید محمد حسین رضوی، بنگلہ نمبر ۲۲۴، کورنگی کریک، کراچی

سید شوکت حسین زیدی مرحوم ضلع گوڑگاؤں کے ایک گاؤں ترکیا واس میں پیدا ہوئے اور اپنی محنت اور کوشش سے تعلیم کو انتہا تک پہنچا
دیا، اُنہوں نے آگرہ یونیورسٹی سے تاریخ میں، علی گڑھ یونیورسٹی سے معاشیات میں اور دہلی یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔ اے۔ کیا، اس کے بعد
ہائی اسکول کی صدر مدرسی سے ترقی کر کے عربک کالج دہلی کے پرنسپل ہو گئے! مرحوم میں کام کرنے اور آگے بڑھنے کا بے پناہ جذبہ تھا جس کام کو ہاتھ
لگایا، اُسے سلیقہ کے ساتھ پورا کر کے دم لیا۔ وہ ایک اچھے کھلاڑی (man sportsman) اور چابکدست فوٹوگرافر بھی تھے!

سید شوکت حسین زیدی مرحوم کی خانگی زندگی انتہائی خوش گوار تھی، وہ طالب علموں کے حق میں شفیق و غمخوار معلم اور دوستوں کے دوست تھے
پاکستان میں آج کتنے ذی وجاہت عہدیدار ہیں جن کو مرحوم کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ مرحوم میں دوسری خوبیوں کے علاوہ سب سے بڑی خوبی دینداری
تھی۔ عبادت کا یہ ذوق و شغف کہ پوری پوری راتیں سجدے میں گزار دیں۔ افسوس ہے ان کی عمر نے زیادہ وفا نہیں کی۔ زندگی کی چالیس بہاریں بھی
پوری طرح نہ دیکھنے پائے تھے کہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔
مرحوم کے لائق داماد سید محمد حسین صاحب رضوی نے ان کے حالات کو مرتب کیا ہے جن کا خلاصہ اور لب لباب ہم نے اوپر کی سطروں میں پیش

یا ہے مضمون نگاروں[1] میں سید شوکت حسین زیدی کے دوست، شاگرد، بیٹے اور بیٹیاں شامل ہیں، ان مضامین میں درد و غم اور عقیدت و محبت کا
راج پایا جاتا ہے !

لہ "اس زمانے میں زیدی صاحب مرحوم کالج کے وائس پرنسپل ہوا کرتے تھے" (صفحہ ۱۵۱) زبان اور روزمرہ کی یہ غلطی عام ہوتی جا رہی ہے ! ایسے موقعوں پر
رف "تھے" بولتے ہیں۔ "ہوا کرتے" زائد ہے "ہوا کرتے تھے" کا محل استعمال یوں ہوتا ہے ——— ہماری جوانی کے زمانہ میں بہت بارش
ا کرتی تھی ——— وہ زمانہ لد گیا جب اس دنیا میں نیک اور بے غرض انسان پیدا ہوا کرتے تھے ——— مسلم یونیورسٹی میں بڑے پیمانے
پر کرکٹ میچ ہوتے تھے یا ہوا کرتے تھے ——— جب میں صبح چہل قدمی کے لئے جاتا تھا۔ تو میرے چند دوست بھی میرے ساتھ ہوا کرتے تھے۔

✕

ایک زمانہ کے جانے پہچانے

CAVANDER'S

کیونڈرز

میگنم سگریٹ

اب پھر دستیاب ہیں

پاکستان کے خوش ذوق سگریٹ نوش عرصے سے ایک چیز کی کمی محسوس کر رہے تھے۔ یعنی وہ لطف اور ذائقہ جو کیونڈرز سگریٹ ہی سے مخصوص ہے۔ یہ عمدہ اور فرحت انگیز سگریٹ آپ ہی اپنی مثال ہیں۔ کیونڈرز میگنم کے بیشمار شائقین کو خوشی ہوگی کہ یہ ذائقہ دار سگریٹ اب پھر دستیاب ہیں۔

CAVANDER'S
NAVY CUT

CAVANDER'S
MEDIUM
NAVY CUT
MAGNUM

بڑے اور زیادہ اچھے

۳۵
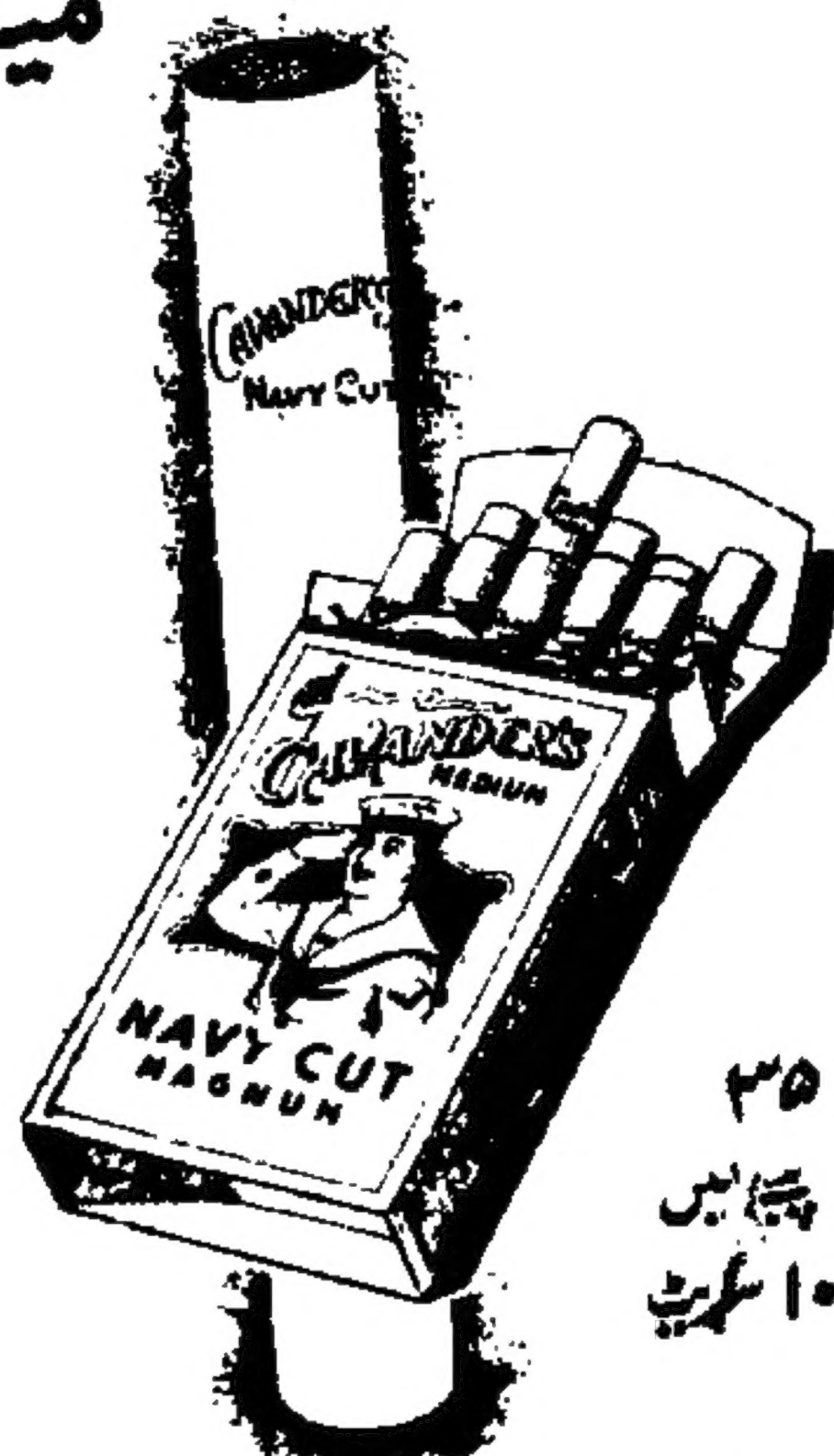
پیسے میں

۱۰ سگریٹ

تیارکردہ: پریسٹیئر ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ

باشتراک: گوڈفرے فلپس لمیٹڈ۔ لندن

کراچی

فاران

ماہنامہ

جلد ۱۵ — شمارہ ۱۲

ایڈیٹر:- ماہر القادری — ماہ مارچ سنہ ۱۹۶۲ء

ترتیب

چندہ سالانہ — سات روپے

قیمت فی پرچہ — باسٹھ پیسے

مقام اشاعت:- دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی نمبر ۱

پرنٹر پبلشر:- مسرور حسین

مطبوعہ مطبع سعیدی کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

حالات کتنے ہی ناسازگار اور فضا کیسی ہی ناموافق کیوں نہ ہو مسلمان کسی عالم میں بھی مایوس نہیں ہوتا، یاس و نا امیدی اہلِ کفر کو زیب دیتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ کے حی و قیوم ہونے کا یقین ہو وہ مایوس کیوں ہونے لگا؟ ــ

ترا چہ باک خدائے کہ داشتی داری

ــــــــ مگر ــــــــ

حالات کی ناخوشگواری سے متاثر ہونا یہ انسان کی فطرت ہے، زخم لگتے ہیں اور چوٹیں پڑتی ہیں تو تکلیف و اذیت ہوتی ہے اور اس عالم میں ضبط کے باوجود آہ نکل ہی جاتی ہے!

ان دنوں طبیعت سخت قسم کی گھٹن محسوس کر رہی ہے دل و دماغ شدید کشمکش میں مبتلا ہیں، ذہن و فکر سخت کرب و اذیت سے دوچار ہیں عقل احتیاط پسند نے اندیشوں اور خطروں کے پہاڑ زبان و قلم کی راہ میں کھڑے کر دیئے ہیں دوسری طرف دل کی ہر خلش الفاظ بن جانے کے لئے بے تاب ہے اور جگر کی ہر چوٹ آواز میں ڈھل جانا چاہتی ہے۔ ضمیر و عقل کی کشمکش اور یقین و ایمان کی اس آزمائش کا عالم نہ پوچھیے، جب کسی کے ایک طرف آتشِ نمرود بھڑک رہی ہو اور دوسری جانب جنتِ شداد لہلہا رہی ہو!

کتنے کاغذ لکھ لکھ کر چاک کر چکا ہوں، کاغذ پر لکیریں سی بناتا ہوں اور کاٹ دیتا ہوں کیا لکھوں کیا نہ لکھوں! اور لکھوں تو اسلوب کیا ہو! پیرایہ بیان کیا اختیار کیا جائے!؟ آہ! یہ الجھنیں یہ نزاکتیں یہ سوچ بچار! جیسے قلم جذبات کے شکنجے میں کس کر رہ گیا ہے۔

اس دنیا میں سدا یہی ہوتا رہا ہے کہ نفس کے تقاضوں اور ہوسناک چٹخاروں کا ساتھ دیجیے تو مزے ہی مزے ہیں اور سچی بات کہیئے اعلانِ حق کیجیے تو انتشار پسندی اور وطن دشمنی کی تہمتوں سے لے کر قید و بند اور دار و رسن کے مرحلوں تک گزرنے کے لئے تیار رہیے۔

ایک دو زخم اور دو چار داغ ہوں تو ان پر صبر کیا جا سکتا ہے۔ مگر جب یہ کیفیت ہو ـــــــــــ

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

تو کس زخم کو چھپایئے اور کس داغ کو نمایاں کیجئے!

بنگال میں مسلمانوں کو جس منظم سازش کے تحت ہلاک و تباہ کیا گیا ہے اس پر پیچ خون کے آنسو رونے کے بعد بھی یہ غم تازہ ہے

نہیں ہو سکتا۔ خدا کی قسم ہم بے غیرت اور بے حمیت ہو گئے ہیں ورنہ یہ قیامت خیز سانحہ ایسا تھا کہ ہماری نیندیں حرام ہو جاتیں اور کھانے پینے میں کوئی لذت باقی نہ رہتی۔ فرض کر لیجئے پاکستان کے اخبارات نے اس المیے کے رنگ میں زیادہ تیزی پیدا کر دی ہے، مگر ہندوستان کے اخبارات میں اس قتل و غارت گری کی جو تفصیلات آئی ہیں وہ اپنی جگہ قیامت کا منظر پیش کرتی ہیں ——— ایسی قیامت جس کے تصور سے انسانیت پناہ مانگتی ہے۔ آگ اور لہو کی اس مہیب فضا میں کوئی شک نہیں بعض شریف سکھوں اور ہندوؤں نے اپنی جانوں پر کھیل کر مسلمانوں کو بچایا بھی ہے مگر عام فضا پر درندگی چھائی ہوئی تھی! افسوس کہ جن کے دھرم میں جیو ہتیا بڑا پاپ ہے۔ انسانوں کے لہو سے ہولی کھیل رہے تھے۔

انگریز کے دور میں جب ہم محکوم تھے تو ہماری قومی غیرت، دینی اخوت اور جرأت ایمانی کا یہ عالم تھا کہ ترکی اور عرب ممالک میں کسی مسلمان کے تلوے میں کانٹا بھی چبھا ہے تو اس کی کسک ہمارے دل و جگر نے محسوس کی ہے۔ اپنے دینی بھائیوں کی ہمدردی میں ہم نے کس طوفانی جوش کے ساتھ احتجاج کئے ہیں۔ ان کی امداد کے لئے فنڈ کھولے ہیں۔ اُن ملکوں میں طبی وفد بھیجے ہیں مگر پاکستان بننے کے بعد جب کہ آٹھ کروڑ انسانوں کی آبادی سے ہمارا ملک معمور ہے۔ ہمارے پاس ہر طرح کی طاقت بھی ہے اور ہم ایک عظیم الشان آزاد سلطنت کے مالک ہیں اپنے مظلوم ہمسایہ دینی بھائیوں کے لئے ہم کچھ نہیں کر سکتے! اچھی آزادی اور حکومت ملی کہ ہم دورِ غلامی سے زیادہ بے بس اور مجبور ہو کر رہ گئے!

انگریز جب ہندوستان چھوڑ کر جا رہا تھا اُس وقت اس بات پر غور کرنے کا موقع بھی تھا اور اُس کا کوئی مفید نتیجہ بھی نکل سکتا تھا۔ کہ متحدہ ہندوستان میں دو قوموں کی ملی جلی فوج اور پولیس کیساتھ مسلمانوں کا کیا موقف رہے گا؟ اور مسلم لیگ جس کی رکنیت کے لئے اسلام کے سب سے بڑے اور لازمی رکن "نماز" تک کی پابندی بھی ضروری نہیں ہے، کیا وہ پاکستان میں اسلامی نظام کو قائم کر سکے گی؟

——— مگر ———

اب جب کہ ملک تقسیم ہو چکا ہے پاکستان وجود میں آ چکا ہے، متحدہ ہندوستان کا تصور کرنا بھی اسلام اور پاکستان کیساتھ غداری کرنا ہے، جو ہونا تھا وہ ہو چکا اب تو ہمیں اپنے خونِ جگر سے اس مقدس خطہ کی آبیاری کرنی ہے اور اس کے تحفظ کیلئے اپنی جانوں کی بازی لگانی دینی ہے اس الم انگیز موقف پر صبر ہی کرنا پڑے گا کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم نہیں ہوا اور ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمان پاکستان بنوانے کے جرم میں تباہ و برباد کئے جا رہے ہیں اور اُن کی جان و ایمان کو ہر گھڑی طرح طرح کے خطرے لاحق ہیں! جب کبھی قلم پوری طرح آزاد ہوں گے تو اُس وقت لکھنے والے پوری جرأت و آزادی کے ساتھ لکھیں گے کہ جب پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا اس میں کاٹ چھانٹ کس لئے گوارا کی گئی ——— کیا وہ وقت قربانی دینے کے لئے موزوں نہیں تھا؟ پھر ہندوستان کے مسلمانوں کے تحفظ کے لئے ہمارے قابلِ احترام لیڈروں نے کیا تدابیر اختیار کیں؟ پاکستان بننے کے بعد یہاں جمہوریت اور اسلام کے تقاضوں کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا؟ مستقبل کا مورخ جب دیانتداری کیساتھ ان حقائق کا تجزیہ کرے گا اُس وقت عظیم شخصیتوں کے تمام رُخ اور پہلو سامنے آئیں گے اور تاریخ کے یہی اوراق عبرت و بصیرت کے اوراق ہوں گے۔

آہ! یہ کشمکش!! ہم آج کے عالم اسلام پر نظر ڈالتے ہیں تو واضح طور پر یہ حقائق سامنے آتے ہیں کہ مسلمانوں کے بیشتر ممالک میں اختیار و اقتدار کی زمام ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جن کی تربیت مغربی ماحول میں ہوئی ہے، جو اپنی معاشرت رہن سہن اور ذہنی قطع میں مغربیت سے بہت قریب رہے ہیں اس لئے اُن کے خوب و ناخوب کا معیار اور ان کے فکر و نظر کے زاویئے مغربیت سے متاثر ہو گئے ہیں! یہ حضرات اسلام اور ملت کے بدخواہ نہیں ہیں مگر اس کو کیا کیجئے کہ مغرب کی عینک سے دینی اور قومی مسائل پر وہ غور و خوض فرماتے ہیں اور اس غور و فکر کے بعد وہ جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں اُس کو اسلام اور ملک و ملت کے حق میں مفید سمجھتے ہیں ——— مثلاً لیبیا میں مرد

اور مرد و زن کے بیباکانہ اختلاط میں کوئی عیب محسوس نہیں کرتا بلکہ اسے تہذیب و ترقی اور تمدن و ثقافت کا مظہر سمجھتا ہے۔ یہ حضرات بھی ناچ گانے اور نامحرم مرد و زن کے اختلاط کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، یورپ نے دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کو خطرہ سمجھ کر اس کا واحد علاج "ضبط ولادت" تجویز کیا۔ ان حضرات نے بھی یورپ کی لے میں لے ملا دی کہ بے شک "ضبط ولادت" ہی کے ذریعہ نسانی آبادی کو خانہ کشی سے بچایا جا سکتا ہے، یورپ میں زنا پر کوئی قدغن نہیں مگر "تعدد ازدواج" پر وہ پابندی لگاتا ہے۔ اسی طرح نکاح و طلاق کے مسائل میں یورپ مرد و زن کی غیر فطری مساوات کا قائل ہے۔ یہ نیرنگ بھی مسلمانوں کے عائلی مسائل کا حل مغربی انداز پر چاہتے ہیں۔ گھوڑدوڑ و کلب گھروں کی قمار بازی جیسا کھلا ہوا گناہ بھی مغرب زدہ مسلمانوں کی نگاہ میں گناہ نہیں ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ یورپ نے اسے سند جواز عطا کر دی ہے، یہی حال سود کا بت گری کا اور دوسرے فواحش کا ہے اس سلسلہ کو یوں ہی دراز کرتے چلے جائیے۔

دوسری طرف وہ حضرات ہیں جن کی زندگیاں دینی اور علمی ماحول میں گزری ہیں۔ جو نماز روزے اور دوسرے احکام کے بھی پابند ہیں جنہوں نے برسوں کتاب و سنت کا مطالعہ اور اس میں غور و فکر کیا ہے، اُن کی نگاہ میں یہ تمام باتیں غیر اسلامی اور دینی نقطۂ نگاہ سے سخت ناپسندیدہ ہیں بلکہ بعض پر تو فحش و منکر کا اطلاق ہوتا ہے۔

سائنس کے مسائل درپیش ہوں تو ان مسائل میں سائنس دانوں کی رائے وقعت رکھتی ہے اور ماننے کے قابل ہے۔ یا اُن حضرات کی بات مانی جائے گی جنہوں نے سائنس پر ایک کتاب بھی نہ پڑھی ہو، جو سائنس کے آلات کے نام بھی ٹھیک طرح نہ جانتے ہوں اور سائنس کے بارے میں جن کی علومات بالکل خام اور ناقص ہوں اسی پر دینی مسائل کا قیاس کر لیجئے کہ دین و اخلاق اور اسلامی معاشرت کے مسائل میں اہل علم کی رائے کو وقعت دی جائے گی!

مسلمانوں کی اکثریت ابھی تک علماء دین پر اعتماد رکھتی ہے اس کا سب سے نمایاں ثبوت یہ ہے کہ دینی مسائل میں فتویٰ حکومت کے کسی وزیر، سکریٹری اور ڈائرکٹر سے کوئی نہیں پوچھتا، عوام ان معاملات میں علماء کرام ہی سے رجوع کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ دینی مسائل میں عوام علماء کی رائے، مشورت اور اجتہاد پر اعتماد کرتے ہیں بس اسی نقطہ سے کشمکش کا آغاز ہو جاتا ہے کہ مسلم ممالک کے ارباب اقتدار دین و اخلاق کے مسائل کو اپنے انداز پر سوچتے ہیں اور جو کچھ سوچتے ہیں اُس کی صحت پر اصرار کرتے ہیں اس کے برخلاف کتاب و سنت کا علم رکھنے والے علماء اور ان پر اعتماد کرنے والے عوام ان مسائل میں ان بڑے لوگوں سے مختلف زاویہ نگاہ رکھتے ہیں۔

ایک وہ مسلمان جسے اپنا ایمان اور اسلام عزیز ہے۔ جو کتاب و سنت کا بھی علم رکھتا ہے جس کے اندر آخرت کی بازپرس کا احساس بھی بیدار ہے وہ اس کو کس طرح گوارا کر سکتا ہے کہ شریعت کے خلاف قانون سازی ہو رہی ہو اور قیام معروف کی جگہ قیام منکر کا دور دورہ ہو مثلاً قیام صلوٰۃ کیلئے تو کوئی اہتمام نہ ہو مگر رقص و سرود کی کھلے خزانے حوصلہ افزائی اور سرپرستی کی جا رہی ہو ان حالات کو دیکھ کر کوئی دیندار چاہے وہ فرد ہو یا جماعت یا ادارہ ہو احتجاج کرنے اور کلمۂ حق کہنے سے باز نہیں رہ سکتا۔

اس کشمکش سے بچنے کی ایک تو وہ اندوہناک صورت ہے جو مصر میں اخوان المسلمین کیساتھ روا رکھی گئی ہے کہ دنیائے عرب کی سب سے زیادہ منظم، حق پسند، سرفروش اور مخلص دینی جماعت کو کچل دیا گیا، طاقت سب کچھ کر سکتی ہے مگر اخوان کی بربادی سے عرب دنیا کو جو دینی، اخلاقی اور روحانی نقصان پہونچا ہے اُس کی تلافی کے لئے ساری دنیا کے پٹرول کمپنیاں بھی مصر کے قبضہ میں آ جائیں تو بھی اس عظیم نقصان کی تلافی نہیں ہو سکتی، یہ اخوان ہی کا اثر تھا کہ مصر کے آزاد خیال اور متجدد نے وہ مشہور ادیب ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنے ملحدانہ افکار اور اسلوب نگارش کو چھوڑ کر دینی موضوعات پر بڑے معرکہ کے مضامین اور کتابیں لکھیں اور اخوان کے تباہ و برباد اور کمزور و بے اثر ہو جانے کے بعد ہی انشا پردازانہ حسن زبان کو یہ کفر بکنے کی جرأت ہوتی ہے کہ "اصرانم" "محمد انم" سے زیادہ طاقت ور ہے (معاذ اللہ، نقل کفر کفر نباشد: خاک بدہن گستاخ)

"اخوان" کے میدانِ عمل میں نہ ہونے سے جامعۃ الازہر کی ہزار سالہ تقدیس تجدد و مغرب زدگی کے ہاتھوں غبار آلود ہو گئی۔" اخوان نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو بے مثال قربانیاں دی ہیں اس کا اجر آخرت میں ان شاء اللہ العزیز انہیں ملے گا، اس اعتبار سے وہ گھاٹے میں نہیں رہے کہ ان کی تباہی و بربادی آخرت میں اُن کے فوز و فلاح اور نجات و مغفرت کا سبب بن جائے گی! دنیا کی آسودگی، کامیابی، خوشحالی، شان و شوکت اور طمطراق سے ہزار بار اللہ کی پناہ جو عقبیٰ میں رسوائی کا سبب ٹھہرے اور دنیا کے اُس دُکھ درد، پریشانی، بدحالی، بدحالی اور ذلت و تباہی اور بربادی پر دنیا جہان کی تمام شادمانیاں اور کامرانیاں قربان، جن کا اجر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و رضا کی صورت میں میسر آئے!

کسی محلہ، قریہ اور بستی میں صرف ایک نیک اور دیندار شخص کے ہونے سے لوگوں میں خدا ترسی اور نیکی و پاکبازی کا احساس کسی نہ کسی صورت میں باقی ضرور رہتا ہے مرنے نہیں پاتا، اُس مردِ صالح کے تقویٰ کے فیض و تربیت سے، وعظ و تلقین سے اور دینی جدوجہد سے محلہ کی فضا خوشگوار اثر قبول کرتی ہے، جب ایک فرد ماحول کو اس قدر متاثر کر سکتا ہے تو ایک دین پسند تنظیم اور اخلاق دوست ادارہ اپنے گرد و پیش پر کتنے اچھے اور بہت گہرے اثرات ڈال سکتا ہے۔ اور اس کا میدانِ عمل سے ہٹ جانا، اخلاقی اور دینی لحاظ سے معاشرے کا کتنا بڑا نقصان ہے۔

سامنے کی مثال پاکستان میں اسلامی جمعیۃ طلبہ کا وجود ہے، جس اسکول، کالج اور تربیت گاہ میں بھی طلبا کی اس دینی و اخلاقی تنظیم کے ارکان پائے جاتے ہیں، وہاں کے ماحول سے تقدیس و نیکی کی خوشبو آتی ہے جہاں جہاں مخلوط تعلیم ہے وہاں کی لڑکیاں اسلامی جمعیۃ طلبہ کے ان نوجوانوں کی پاکیزگیٔ اخلاق کی گواہی دیں گی، ان کی نماز، روزے، اخلاق و سنجیدگی اور ساتھ ہی تعلیمی صلاحیت اور علمی ذہانت کو دیکھ کر دوسرے طلباء اچھا اثر قبول کرتے ہیں جس درسگاہ میں بھی کمیونسٹ طلباء پائے جاتے ہیں ان کے مقابلہ میں اسلامی جمعیۃ طلباء سے وابستگی اور تعلق رکھنے والے مورچہ سنبھالے ہوئے ہیں ان میں سے کتنے ایسے سعید نوجوان بھی ہیں جو رمضان میں شب بیداری اور اعتکاف کی سعادت حاصل کرتے ہیں، رقص و سرود کے بیہودہ اور غیر اخلاقی ہنگاموں میں ان کی پرچھائیں بھی دکھائی نہ دے گی۔ یہ نیک نوجوان تعلیم گاہوں میں "ورائٹی شو" کی بجائے قرآن و حدیث کے درس، سیرت النبی کے جلسوں اور قرأتِ قرآن کریم کے مقابلوں کا اہتمام کرتے ہیں، ان کی پیشانیاں سجدوں کی جلوہ گاہ اور ان کے دل اللہ تعالیٰ کے خوف و محبت کے نشیمن ہیں۔ ان اسلام پسند نوجوانوں کو اگر میدان سے ہٹا دیا جائے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کو اخلاق و نیکی کی تخم ریزی سے محروم کر دیا گیا۔

ہاں! تو بات یہاں سے چلی تھی کہ احتجاج و اختلاف کی کشمکش کو کس تدبیر سے روکا جا سکتا ہے ایک تدبیر کا ہم ذکر کر چکے ہیں - دوسری تدبیر یہ ہے کہ ملک کے دانشور اور عوام ارباب اقتدار کے ہم خیال بن جائیں، تیسری تدبیر یہ ہے کہ حکمران طبقہ عوام کے افکار و مطالبات سے ہم آہنگ ہو جائے ان دونوں تدبیروں میں دوسری تدبیر آسان اور قابلِ عمل ہے۔ اور وہ اس لئے کہ لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کے ذہن و فکر کی تبدیلی کے مقابلے میں، گنتی کے چند افراد کے زاویہ فکر و نظر کا بدل جانا آسان اور سہل ہے۔

ملک میں کشمکش کس طرح پیدا ہوتی ہے اس کا سلسلہ کہاں سے چلتا ہے اور اس کے داعیات و محرکات کیا ہیں اسے سمجھنے کے لئے پاکستان کی تازہ ترین کشمکش پر غور کیجیے جو براہِ راست اور بالواسطہ انتخاب کے نام پر جاری ہے! ساری دنیا جانتی ہے کہ تقسیم ہند سے قبل ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء کے انتخابات حقِ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہِ راست ہوئے تھے۔ یہ فیصلہ کن انتخابات تھے جن میں مسلم لیگ کو عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی اور جس کے سبب پاکستان کا مطالبہ ایک مسلّمہ حقیقت بن گیا ——— جس طرزِ انتخاب نے پاکستان کے مطالبہ کو مکمل کیا: اس طرزِ انتخاب کو ترک کر کے ایک نئے قسم کے بالواسطہ اور محدود انتخاب کا شگوفہ کس نے چھوڑا ہے؟ نہ عوام جو اب سے اٹھارہ سال پہلے قومی اسمبلیوں کے براہِ راست انتخابات میں حصہ لینے کی اہلیت اور صلاحیت رکھتے تھے کیا پاکستان بننے کے بعد اس اہلیت و صلاحیت کو

ضائع کر چکے ہیں! اس زمانے میں جب کہ نقل و حمل اور مواصلات کی سہولتیں میسر ہیں، حقِ بالغ رائے دہی کو خارج کر کے جمہوریت کا نام لینا جمہوریت کیسا تمسخر نہیں تو اور کیا ہے۔ عوامی ذمہ داریوں کو جب سنبھالا ہے تو پوری وسعت ظرف اور فراخ حوصلگی کے ساتھ عوام اور جمہوریت کے مطالبوں کو بھی پورا کرنا چاہیئے؛ جمہوری حکومتوں میں اقتدار و اختیار کی کرسیاں گھومتی پھرتی اور ادلتی بدلتی رہتی ہیں۔ جو کوئی اپنی کرسی کو زینِ سفر کرانے کی کوشش کریگا بس وہیں سے خرابی شروع ہو جائے گی۔

آہ! یہ انتظار!

اس بارے میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں کہ جماعتِ اسلامی پاکستان کی سب سے زیادہ منظم بلکہ واحد منظم اور اصول پسند جماعت تھی، پاکستان کی مرکزی حکومت نے جس پر پابندی لگا کر "کالعدم" قرار دیا اور دنیائے اسلام کے قابل فخر مفکر اور دینی عالم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے علاوہ جماعت کے متعدد رہنما گرفتار کر لیے گئے، حکومت کے اس اقدام کو بعض لوگوں اور اخبارات نے سراہا بھی ہے مگر اخبارات میں جو خبریں آتی رہتی ہیں اُن کی غالب تعداد میں احتجاج و ہمدردی کا رنگ پایا جاتا ہے یہ احتجاج پاکستان تک ہی محدود نہیں رہا۔ عراق اور لندن میں بھی اس کی صدائے بازگشت سنائی دی ہے۔

حکومتِ پاکستان کے بعض اکابر اور ارباب حل و عقد نے فرمایا ہے کہ جماعت کے رہنماؤں کے خلاف عدالت میں باقاعدہ مقدمہ چلانے کیلئے وقت کا انتظار ہے! جس طرح قدرت کاریوں اور پھلوں کی فصلیں، برسات کی رُت اور بہار و خزاں کے موسم آتے ہیں، کیا لوگوں پر مقدمہ چلانے کا بھی کوئی خاص وقت اور موسم آیا کرتا ہے جس کا انتظار کیا جا رہا ہے، جماعت کے رہنماؤں پر عدالت میں مقدمہ دائر کرنے کے لئے اگر خاطر خواہ ثبوت فراہم نہیں ہوا تھا اور تفتیش و تحقیق مکمل نہیں ہوئی تھی تو انہیں گرفتار کر کے جیل خانوں میں محبوس کرنے کی ایسی کیا جلدی پڑ گئی تھی۔ آخر یہ کس قماش کا اندازِ حکمرانی ہے!

دعوتِ غور و فکر

آج کی جمہوری دنیا میں عوام کو اظہارِ رائے کے حق سے کلیۃً محروم کر دینے کی مثال روس کے علاوہ اور کسی ملک اور سلطنت میں نہیں ملتی، وہاں بدترین قسم کی آمریت مسلط ہے جہاں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ عوام کی رائے زنی سے ملک میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ روس میں ارباب اقتدار جو چاہیں کر گزریں، عوام اُن کے کسی فعل پر لب کشائی نہیں کر سکتے روس میں عوام کا کوئی اخبار نہیں، کوئی قومی انجمن اور سیاسی جماعت نہیں، "شہری آزادی سلب کر دی گئی ہے پورا ملک قید خانہ بنا ہوا ہے۔

عوام کو بھیڑ بکریوں کی طرح بے بس اور مجبور و غلام بنا دینا یہ اشتراکی حکمت عملی و ٹیکنک رہی ہے، اس کے مقابلہ میں اسلام عوام کو آزادیٔ رائے کا اتنا حق دیتا ہے کہ ایک بڑھیا امیر المومنین کا گریبان تھام کر ٹوک سکتی ہے اور ایک بدوی خلیفہ کے کرتہ کے عرض و طول پر احتساب کر سکتا ہے۔ اس احتساب پر امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ ذرہ برابر خفگی اور برہمی کا اظہار نہیں فرماتے اور نہ اپنے ناقد، معترض، اور محتسب و نکتہ چیں پر عوام میں انتشار پھیلانے کی تہمت دھرتے ہیں بلکہ دلیل کے ذریعہ اُسے مطمئن کیا جاتا ہے۔

جہاں تک پاکستان کی سالمیت اور تحفظ کا تعلق ہے پاکستان کے عوام و خواص رعایا اور ارباب حکومت کے درمیان ذرہ برابر اختلاف نہیں ہے، پاکستان کی ایک ایک انچ زمین کی اسی طرح حفاظت کی جائے گی جس طرح ہم اپنے جسموں اور جانوں کی حفاظت کرتے ہیں! اختلاف و کشمکش کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ پاکستان کو کن اصولوں پر چلایا جائے! پاکستان کے عوام کا مطالبہ یہ ہے کہ پاکستان اسلام کے لئے اور اسلام کے نام پر بنا ہے اس لئے پاکستان کی حکومت، سیاست اور معاشرت کا نظام خالص اسلامی اصولوں اور دینی قدروں پر قائم و استوار ہونا چاہیئے، جب بھی اور جہاں بھی اسلامی اصولوں سے انحراف پایا جائے گا پاکستان کے عوام اور ان کے نمائندے تنقید و احتساب اور مطالبہ و احتجاج کے تمام جائز ذرائع استعمال کریں گے، اس حق کو کوئی طاقت اُن سے چھین نہیں سکتی۔ وقتی طور پر ایمان و اسلام کے تقاضوں کو دبا بھی دیا جائے گا تو یہ تقاضے کسی نہ کسی دن ضرور اُبھریں گے!

خدا کی اور اس کے فرشتوں کی اُس شخص پر لعنت ہو جو "پاکستان میں اسلام" کا نعرہ اس لئے بلند کرتا ہے کہ ملک میں انتشار پیدا ہو اور اس

انتشار کے ذریعہ زمام اقتدار اُن کے ہاتھوں میں آ جاتی۔ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی خدا کا خوف ہو گا وہ تو اس طرح کا ایمان سوز کھیل ہرگز نہیں کھیل سکتا !

جو لوگ ذاتی اغراض کی خاطر بڑے لوگوں کی ہوا خواہی کا دم بھرتے ہیں ان کی عقیدتوں اور نیازمندیوں کے مرکز بھی بدلتے رہتے ہیں اس ذہنیت کے لوگوں نے ہر دور میں چڑھتے ہوئے سورج کی پوجا کی ہے۔ ان لوگوں کے پیش نظر کوئی بلند مقصد نہیں ہوتا اور نہ یہ کسی نظریہ کے علمبردار ہوتے ہیں تو غرض کے بندے ہیں جہاں غرض پوری ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے وہیں ان کی پیشانی جھک جاتی ہے ! اس قسم کے جی حضوریوں کی نیازمندی اور ہوا خواہی بڑے آدمیوں کو اپنے نفس پر احتساب کرنے اور اپنے اعمال کا جائزہ لینے کی طرف مائل ہی نہیں ہونے دیتی —— دوسری طرف وہ افراد ہیں جنہوں نے ذاتی غرض کیلئے نہ کسی کی مخالفت کی اور نہ کسی کی ہاں میں ہاں ملائی ان کے سامنے بلند مقصد اور متعین منزل ہے اور اُسی منزل کی طرف ہمیشہ رواں رہے ہیں۔ عالم خیال میں بھی اور عالم واقعہ میں بھی ! کوئی خوف اور دھمکی ان کو مرعوب اور کوئی لالچ ان کو رام نہیں کر سکتا۔ یہی وہ مردان کار ہیں جن کی رفاقت اور اخلاص پر اعتماد کیا جا سکتا ہے ! زندگی کے جس شعبے میں بھی لوگوں نے ان کا تجربہ کیا ہے، ان کو سچا اور کھرا پایا ہے !

آخر میں ہمیں یہ عرض کرنا ہے انگریز سے ہمارا سب سے بڑا اختلاف کفر اور اسلام کا اختلاف تھا وہ مذہب، وطن اور تمدن و تہذیب غرض ہر اعتبار سے غیر اور اجنبی تھے۔ انگریز کو ہم ہر قیمت پر اقتدار و اختیار اور حکومت سے بے دخل کر دینا چاہتے تھے۔ کسی اصلاح و انقلاب کی ہم ان سے متوقع نہ تھے۔ پاکستان کے ارباب اقتدار سے ہمارا دینی رشتہ ہے، یہ ہمارے بھائی بند اور ہماری ملت کے ممتاز افراد ہیں۔ ہم ان حضرات سے اصلاح و انقلاب کی توقع رکھ سکتے ہیں۔ ان کے نظریوں سے ہمارا اختلاف اور ان کے اعمال پر تنقید و احتساب خیر خواہانہ ہو گا۔ کیونکہ اس دنیا میں ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی سب سے بڑی بھلائی اور خیر خواہی کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اُسے خیر و صلاح اور نیکی و تقویٰ کی دعوت دے !

ہم اُن سے عرض کریں گے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے موقعہ دیا ہے اور اختیار بخشا ہے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر اپنے اختیارات کو نیکیاں قائم کرنے اور برائیاں مٹانے میں صرف کرو۔ یہاں تک کہ اللہ کا دین غالب ہو جائے، مغرب جس راستے پر جا رہا ہے وہ بدی اور گمراہی کا راستہ ہے جو آدمی کو جہنم کی طرف لے جاتا ہے اور ایک مسلمان جو دن میں کم سے کم پانچ وقت "جہنم کے عذاب سے پناہ مانگتا ہے۔" اس دوزخی راستے کو کیسے قبول کر سکتا ہے۔ مسلمانوں کا معاشرہ اخلاق و غیرت اور پاکیزگی و نیکی کی اساس پر استوار ہونا چاہیئے۔ یہ مخلوط تعلیم، یہ مرد و زن کا بے باکانہ اختلاط، یہ رقص و سرود کے ہنگامے، شراب نوشی اور قمار بازی اور اسی قسم کے دوسرے فواحش نے مغرب کو سچ مچ کا قحبہ خانہ بنا دیا ہے وہاں کی خانگی زندگی بالکل بے کیف، قطعاً بے لطف اور غیر متوازن ہو کر رہ گئی ہے، ہمیں پاکستان میں مغربی تہذیب و تمدن کے مقابلے میں اُس تہذیب کو فروغ دینا ہے جس میں مسلمان عورتوں کو حجاب کا اور مردوں کو غض بصر کا حکم دیا گیا ہے۔

ربا" اس قدر خوفناک جرم اور شدید ترین گناہ ہے جس کے لئے قرآن کریم میں اللہ اور رسول سے جنگ کرنے کی دھمکی آئی ہے۔ جو کوئی جدید اقتصادیات کے حیلوں سے جائز ثابت کرنا چاہتا ہے وہ شدید ضلالت میں مبتلا ہے اسی طرح زنا کو جو کوئی قابل نامرجوم سمجھتا ہے وہ مسلمانوں کے معاشرے میں "ویلیوشیت" داخل کرنے کا گناہ اپنے سر لیتا ہے۔

پاکستان کے ارباب اقتدار اگر یہاں اسلام کو قائم کر دیں تو اُن کے اقتدار کی عمر بھی دراز ہو جائے گی، عوام و خواص کی اس کشمکش کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ دنیا میں بھی انہیں نیک نامی ملے گی اور غرض کے بندے اور زمانہ ساز بھاٹ اور ڈوم نہیں بلند پایہ انصاف پسند مورخ اُن کے مناقب میں کتابیں لکھیں گے اور سب سے بڑا اجر تو عاقبت کا اجر ہے کہ جس کو زوال نہیں ! یہ اگر ہمارے ارباب اقتدار نے انجام دے دیا تو اُن کے مادحین، معترضین اور نکتہ چین اُن کی رکابیں تھام کر چلیں گے۔ اہل سیاسی اور دینی جماعتوں کی بجائے اُنہی کی طرف رجوع کریں گے اور اُنہی کی ذات ملت کی امیدوں اور عقیدتوں کا واحد

ہوگی!

اگر ارباب اقتدار اس اصلاح و انقلاب کیلئے اپنے کو تیار نہیں کر سکتے اور اس باب میں وہ معذور ہیں تو پھر عوام کو اس کا پورا حق حاصل ہے کہ آئینی حدود میں رہ کر جب از جمہوری ذریعوں سے ایسے افراد کو برسر اقتدار لانے کی جدوجہد کریں جو اقامتِ دین کا داعیہ اپنے اندر رکھتے ہوں اور جن کی ذات سے اس کی توقع ہو کہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد یہ حضرات کتاب و سنت کے مطابق پاکستان کے نظام کو چلائیں گے! اس طرح کی کوشش، اس قسم کا داعیہ، عزم اور جذبہ نہ تو قانونی لحاظ سے کوئی جرم ہے اور نہ دین و اخلاق کا کوئی گناہ ہے۔ اس آئینی جدوجہد کی راہ میں رعب داب، قید و بند اور آرڈی ننسوں کے پہاڑ کھڑے کرنا ایک مستقل اضطراب اور کشمکش کو دعوت دینا ہے ——— جبر و اکراہ سے وقتی طور پر زبانیں خاموش تو ہو سکتی ہیں مگر دلوں کی بے چینی میں اضافہ ہو جاتا ہے گا، کوشش اس کی کرنی چاہیے کہ ملک میں رضا و رغبت، خوش دلی اور اطمینان و اعتماد کی فضا پیدا ہو!

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اصلاحِ حال کی توفیق عطا فرمائے اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہمارا مقصودِ حیات بن جائے۔

ماہر القادری

۲۳ فروری ۶۲ء

اسلامی مُعاشرت

(زیر ترتیب تصنیف کے چند اوراق)

پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ

نواب صولت علی خاں (رام پوری)

زندگی اور نظام زندگی

تصور زندگی موجودات عالم میں سے انسان جب کسی چیز یا کسی شخص کو دیکھتا ہے تو پہلے اس کی نسبت کوئی تصور قائم کرتا ہے پھر اسی تصور کے مطابق اس چیز یا اس شخص سے برتاؤ کرتا ہے کیونکہ کسی چیز کے متعلق یہ جانے بغیر کہ وہ مفید ہے یا مضر اور کسی شخص کے متعلق یہ جانے بغیر کہ وہ دوست ہے یا دشمن، عالم ہے یا جاہل اور حاکم ہے یا محکوم جو برتاؤ بھی کیا جائے گا وہ یقیناً غلط ہوگا۔ اب اگر انسان اپنی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کو حل کرنا چاہے تو سب سے پہلے اس کو خود زندگی کا کوئی تصور قائم کرنا ہوگا۔

کوائف زندگی ایک طرف زندگی کی کیفیتیں ہیں کہ زندگی کس طرح پیدا ہوئی یکایک یا بتدریج، کب پیدا ہوئی تیس کروڑ سال پہلے یا کچھ کم و بیش اور کہاں پیدا ہوئی صحرائے گوبی میں یا جزیرے کے تہ آب بر اعظم لیموریا میں۔ بلاشبہ ان کوائف زندگی کو جاننا نہ جاننے سے بہتر ہے مگر ان کو جاننا اور نہ جاننا زندگی کے مسائل پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ ان کوائف کو جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں ہر شعبہ زندگی میں یکساں طرز زندگی اختیار کر سکتے ہیں۔

حقائق زندگی دوسری طرف زندگی کی یہ حقیقتیں ہیں کہ کوئی خالق زندگی ہے یا نہیں، کوئی مقصد زندگی ہے یا نہیں، کوئی نتیجہ زندگی ہے یا نہیں اور انسان زندگی بسر کرنے میں مختار ہے یا بے اختیار وغیرہ۔ ان حقائق زندگی کو جاننا اور نہ جاننا مختلف طریقے سے مسائل زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ان حقائق کو ماننے اور نہ ماننے والے دونوں کسی شعبہ زندگی میں بھی یکساں طرز زندگی اختیار نہیں کر سکتے لامحالہ ماننے والوں کا طرز زندگی نہ ماننے والوں کے طرز زندگی سے مختلف ہوتا ہے۔

دنیا میں حقائق زندگی کے صرف چار مختلف تصورات پائے جاتے ہیں۔ راہبانہ تصور زندگی، مشرکانہ تصور زندگی، ملحدانہ تصور زندگی اور اسلامی تصور زندگی۔ ان چاروں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

راہبانہ تصور زندگی رہبانیت میں زندگی کا تصور یہ ہے کہ عالم ایک فریب تخیل، مایا کا جال، فریب کا پھندا اور دھوکہ کی ٹٹی ہے جس میں دنیا انسان کے لئے ایک قید خانہ ہے اور جہاں انسان ایک فریب خوردہ قیدی ہے۔ اس قید خانہ کے طوق و سلاسل جسم اور جسمانی تعلقات ہیں اور ان تعلقات کی محبت کو دل سے نکال دینا اور ریاضتوں اور مشقتوں سے جسم کو قیام روح کے ناقابل بنا کر قید حیات اور فریب زندگی سے رہائی پانا انسانی زندگی کی کامیابی یا نجات ہے۔ رہبانیت میں انسان کی پوزیشن انسانی شرافت کا کوئی تصور پیدا نہیں کرتی۔

مشرکانہ تصور زندگی شرک میں زندگی کا تصور یہ ہے کہ عالم ایک متنازع الملکیت چڑیا خانہ ہے جس میں دنیا ایک قفس ہے اور جہاں انسان ایک پابند قفس ہستی ہے۔ جمادات، نباتات اور حیوانات میں سے کوئی انسان کا خالق اور کوئی رازق ہے مگر یہ سب انسان کی حاکمیت اور مالکیت کے مدعی اور اس کے لئے باہم برسر پیکار ہیں۔ انسان تمام جمادات، نباتات اور حیوانات کا خادم ہے اور کسی کا بھی مخدوم نہیں ہے گویا انسان کو اپنے قفس کی ان تیلیوں کے برابر بھی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ شرک بھی انسانی شرافت کے تصور سے خالی ہے۔ ہر ملک اور ہر قوم کی مشرکانہ خرافات دیومالائی تھالوجیا میں دیوتاؤں کی مختلف حیثیات، ان کی باہمی آویزش اور انسان کی پستی کا تصور موجود ہے۔

ملحدانہ تصور زندگی الحاد میں زندگی کا تصور یہ ہے کہ عالم ایک اتفاقی ہنگامہ وجود و ظہور ہے جس میں دنیا ایک لاوارث صید گاہ ہے اور جہاں ہر آن جہد للبقاء بشکل تنازع للبقاء نہ کہ بصورت تعاون للبقاء جاری ہے۔ اس جہد حیات میں انسان کی حیثیت بھی از حیوانات کی سی ہے یہاں ہر کمزور انسان فطرتاً صید ہے اور زور آور انسان فطرتاً صیاد ہے کیونکہ وہ بغیر کسی مقصد کے پیدا ہو گیا ہے، بغیر کسی ذمہ داری کے زندگی

بسر کرتا ہے، بغیر کسی رہنمائی کے ارتقاء کرتا ہے اور بغیر کسی نتیجہ کے سلسلہ ارتقاء کو چھوڑ کر فنا ہو جائے گا۔ الحاد میں بھی انسان کی پستی کا تصور موجود اور انسان کی شرافت کا تصور مفقود ہے۔

یہ ملحوظ رہے کہ الحاد مغربی ممالک میں ہی پیدا ہوا وہیں پروان چڑھا اور وہیں سے دنیا میں درآمد کیا گیا۔ ملحدانہ نظام زندگی بھی مغرب ہی کی ایجاد ہے۔ اسلامی ممالک میں الحاد کے جو جراثیم پائے جاتے ہیں وہ بھی مغربی یونیورسٹیوں ہی کے پیدا کردہ ہیں اس لئے مغربی ممالک روس سے کم ملحد نہیں ہیں مگر روس اور مغربی الحاد میں فرق یہ ہے کہ روس اپنے آپ کو ملحد کہتا ہے اور مذہب کو جلد از جلد مٹانے کیلئے جبر و تعلیم کے تمام ممکن ذرائع استعمال کرتا ہے برخلاف اس کے مغربی ممالک سیاسی مصلحت کی بنا پر اپنے آپ کو پیرو مذہب بھی کہتے ہیں اور تبلیغ مذہب بھی کرتے ہیں مگر ساتھ ہی مذہب کو تعلیمی اور ثقافتی ذرائع سے مٹانے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔

اسلامی تصور زندگی

اسلام میں زندگی کا تصور یہ ہے کہ :-

(۱) عالم ایک غیر متنازع الملکیت مملکت (اسٹیٹ) ہے خالق عالم یا خالق زندگی اس کا تنہا احکم الحاکمین (Sovereign) ہے۔ اور عالم کی ہر چیز بشمول انسان اس کی محکوم ہے۔ اس نے جس طرح سالمات (ایٹمس) سے لے کر اجرام اور اجسام تک جمادات سے لیکر نباتات اور حیوانات تک اپنے تمام محکوموں کے لئے نظام زندگی بنایا ہے اسی طرح انسان کے لئے بھی بنایا ہے۔

(۲) دنیا کی ہر چیز کے برخلاف انسان ذی عقل اور ذی اختیار پیدا کیا گیا ہے اس لئے دنیا کی ہر چیز الٰہی نظام زندگی کو اختیار کرنے پر مجبور ہے مگر انسان مجبور نہیں وہ مختار ہے کہ چاہے اختیار کرے چاہے نہ کرے اگر اختیار کریگا تو فائدہ نہ اختیار کریگا تو نقصان اٹھائے گا۔ انسان صرف مختار ہی نہیں ہے بلکہ مجبور اختیار ہے ناممکن ہے کہ اس کے سامنے کوئی معاملہ آئے اور وہ اس میں اپنا اختیار استعمال نہ کرے۔ یہی اختیار انسانی شرافت کی بنیاد ہے، اسی اختیار کی وجہ سے دنیا انسان کیلئے دار العمل اور دار الامتحان ہے اور اسی اختیار کی بنا پر انسان کیلئے دار الجزاء کی ضرورت ہے۔

(۳) انسان اپنی شرافت کی بنا پر دنیا میں احکم الحاکمین کا نائب یا خلیفہ ہے۔ وہ اسی حیثیت میں تمام مخلوق کا مخدوم ہے اور اسی حیثیت میں زیر امتحان ہے۔ اسلام میں انسانی خلافت کا نظریہ انسانی شرافت کا اتنا اعلیٰ تصور پیدا کرتا ہے جو اسلام سے باہر کہیں پایا نہیں جاتا اور جس تصور زندگی میں انسانی شرافت کا تصور شامل نہ ہو وہ تصور زندگی بہرحال غیر انسانی ہے۔

فلسفہ اور تہذیب

زندگی کے مذکورہ بالا تصورات جب موروثی اثرات یا عقلی استدلال سے پیدا ہوں اور ان کی گرفت صرف دماغ تک محدود ہو تو وہ ایک بیجان تخیل سے زیادہ قدر و قیمت نہیں رکھتے انسان ان کو مانتا بھی ہے اور ان کے خلاف عمل بھی کرتا ہے اس صورت میں وہ زندگی کا فلسفہ کہلاتے ہیں مگر یہ تصورات جب انسان کے دماغ سے گذر کر دل پر قبضہ کر لیتے ہیں تو ان میں جان پڑ جاتی ہے اب انسان ان کو مانتا بھی ہے اور ان پر عمل بھی کرتا ہے اس صورت میں وہ زندگی کے فلسفہ کے بجائے زندگی کی تہذیب (کلچر)[1] کہلاتے ہیں پس فلسفہ تصورات زندگی کے متعلق دماغی فیصلہ کا نام ہے اور تہذیب اس فیصلہ کی دلنشینی اور عمل انگیزی کو کہتے ہیں۔ اسلامی تصورات سے اسلامی تہذیب اور غیر اسلامی تصورات سے غیر اسلامی تہذیب پیدا ہوتی ہے۔

تہذیب اور تمدن

تہذیب خواہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی وہ جب انسان کے دل پر قبضہ کر لیتی ہے تو انسان کے تمام افعال اس کے زیر اثر آجاتے ہیں کیونکہ ہر تہذیب تقاضہ کرتی ہے کہ انسان کا سوچنا سمجھنا، اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، کھیلنا کودنا، ہنسنا رونا، کھانا پینا اور پہننا اوڑھنا سب کچھ اس کے مطابق ہو۔ ہر تہذیب ایک سانچہ ہوتی ہے جس میں انسان کا پورا تمدن (سولائزیشن)[1] مع اپنے شعبہ جات معاشرت، معیشت

---

[1] انسانوں میں دو طرح کے طرز زندگی پائے جاتے ہیں ایک دیہی دوسرا شہری۔ دیہی طرز زندگی بے رنگ و بے تکلف اور شہری طرز زندگی رنگا رنگ اور پر تکلف ہوتا ہے عربی میں شہر کو مدینہ اور شہری طرز زندگی کو مدنیت یا تمدن کہتے ہیں۔ تمدن کے لئے سولائزیشن کا لفظ جو سٹی سے مشتق ہے کوئی اور انگریزی لفظ موزوں نہیں ہے اور تمدن کے لئے سولائزیشن کو مخصوص رکھنے کے بعد تہذیب کیلئے کلچر کے سوا کوئی اور انگریزی لفظ مجھے نہیں ملا ہے تہذیب اور تمدن کے الفاظ جن معنی میں استعمال کئے ہیں ان کی صراحت متن میں کر دی ہے۔

اور جینا مرنا سب کچھ اس کے مطابق ہو۔ ہر تہذیب ایک سانچہ ہوتی ہے جس میں سے انسان کا پورا تمدن ڈھل کر نکلتا ہے۔

معیارِ تہذیب آدمی کے مہذب ہونے کا ادنیٰ معیار یہ ہے کہ وہ کسی ایک صحیح یا غلط تہذیب کو مان کر اس کے مطابق تمدن اختیار کرے۔ ایک تہذیب کو ماننا اور دوسری تہذیب کا تمدن اختیار کرنا انتہائی بدتہذیبی ہے جس میں اکثر مدعیان تہذیب مبتلا نظر آتے ہیں خواہ وہ اسلامی تہذیب کے مدعی ہوں یا غیر اسلامی تہذیب کے۔ تہذیب کی فطرت اور تہذیب و تمدن کے باہمی تعلق کے پیش نظر:

(۱) چار دوں تہذیبوں کو بیک وقت ترک کر دینا یا بیک وقت اختیار کر لینا ناممکن ہے۔

(۲) اسلامی تہذیب میں کسی غیر اسلامی تہذیب کا جوڑ ملانا بھی ناممکن ہے۔

(۳) اسلامی تہذیب اور غیر اسلامی تمدن یا غیر اسلامی تہذیب اور اسلامی تمدن کا اختلاط بھی ناممکن ہے ایسا اختلاط کبھی بھی دیرپا نہیں ہو سکتا اس مخلوط میں جو عنصر بھی غالب ہوگا وہ بہت جلد مغلوب عنصر کو مخلوط سے خارج کر دیگا۔

بہرحال اسلامی تہذیب و تمدن سے جو اسلامی نظامِ زندگی پیدا ہوتا ہے اس کے تین شعبہ جات یعنی اسلامی نظامِ معاشرت، اسلامی نظامِ معیشت اور اسلامی نظامِ سیاست کو علی الترتیب تفصیلی شکل میں آئندہ صفحات میں پیش کیا جاتا ہے۔

اسلامی نظامِ معاشرت

معاشرت کے معنی انسانوں کے باہمی تعلقات کو معاشرت، انسانوں کے کمانے اور خرچ کرنے کے معاملات کو معیشت اور معاشرت و معیشت کو باہمی تصادم سے بچا کر ان میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے طریقوں کو سیاست کہتے ہیں۔

معاشرت میں صنفی تعلق کی اہمیت معاشرت جن گوناگوں انسانی تعلقات کا نام ہے وہ اگرچہ انسان کی ولادت سے وفات تک زندگی کے بیشمار پہلوؤں پر حاوی ہیں ان تعلقات میں سب سے مقدم صنفی تعلق ہے اسلئے کہ وہ شخصی اور نوعی زندگی کی بقاء کا واحد ذریعہ ہے لیکن اگر صنفی تعلق میں لذت نہ ہوتی تو انسان تو ایک طرف حیوان بھی اس کی طرف راغب نہ ہوتا اس لئے اس پر حیوان اور انسان کو راغب کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے صنفی تعلق میں لذت پیدا کر دی ہے لذت اندوزی اس کا مقصد نہیں ہے ذریعہ حصول مقصد ہے اور اس کے دو مقاصد حسب ذیل ہیں:۔

صنفی تعلق کا ایک مقصد اجرائے نسل ہے جو حیوان اور انسان میں مشترک ہے اور جس کیلئے صنفی کشش کی زیادہ ضرورت نہیں اس لئے بعض حیوانات سال میں صرف ایک مرتبہ اور بعض صرف مخصوص موسم میں صنفی کشش قبول کرتے ہیں اور یہ اجرائے نسل کیلئے کافی ہوتی ہے۔

صنفی تعلق کا دوسرا مقصد تعمیر تمدن ہے جس سے حیوان کو کوئی سروکار نہیں ہے یہ انسانی خصوصیت ہے کیونکہ مرد کو عورت کی اور عورت کو مرد کی ضرورت صرف اجرائے نسل ہی کیلئے نہیں ہے بلکہ دائمی رفاقت (کمپینین شپ) کیلئے بھی ہے جو تعمیر تمدن کی بنیاد ہے اسی بنیاد پر خانگی زندگی کا گرانقدر قلعہ قائم ہوتا ہے اور اس قلعہ پر اجتماعی زندگی کی منزلیں اٹھتی چلی جاتی ہیں۔ چونکہ حیوان کے صنفی تعلق میں تعمیر تمدن کا مقصد مضمر نہیں ہے اس لئے حیوانات میں خانگی اور اجتماعی زندگی مفقود ہے۔ اور چونکہ صنفی کشش کی تعمیر تمدن کیلئے بہت زیادہ ضرورت ہے اسلئے بر خلاف حیوان کے انسان ہر وقت صنفی کشش قبول کر سکتا ہے۔ اگر انسان میں صنفی کشش دوامی اور ہمہ وقتی نہ ہوتی تو مرد اور عورت کی باہمی وابستگی بھی دوامی نہ ہوتی اور خانگی، اجتماعی اور تمدنی زندگی کی بنیاد ہی کھوکھلی رہتی۔

اسلامی آدابِ معاشرت مگر بمقابلہ حیوان کے انسان میں صنفی کشش کی زیادتی سے فطرت کا یہ منشا نہیں ہے کہ انسان کا صنفی عمل بھی حیوان سے زیادہ ہو یا حیوان کی طرح بے قید ہو اس لئے فطرت انسان کو صنفی عمل کی کثرت پر فساد صحت کی سزا اور صنفی عمل کی بے قیدی پر فساد تمدن کی سزا ضرور دیتی ہے۔ اسلام انسان کو ان سزاؤں سے بچانے کیلئے انسانی زندگی پر کچھ قیود عائد کرتا ہے جن کو آداب زندگی (رولز آف لائف) کہتے ہیں، آداب زندگی کا ایک شعبہ آداب معاشرت ہیں۔ اسلامی آداب معاشرت حسب ذیل ہیں:۔

(۱) صنفی عمل کے وقت منکوحہ والدین کو بچہ پیدا کرنے کا ارمان اور غیر منکوحہ والدین کو بچہ پیدا نہ کرنے کی فکر ہوگی عام مشاہدہ ہے کہ ایسے والدین نطفہ کے استقرار کو روکنے کیلئے اور استقرار کے بعد اسقاط کیلئے ہر ممکن طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

(۲) منکوحہ اور غیر منکوحہ والدین کے یہ خیالات، ان کے دیگر خیالات سے کہیں زیادہ، ان کے بچوں کی سیرت پر اثر انداز ہونگے۔ جو بچہ بڑا ہو کر یہ محسوس کرسکے کہ اسکے والدین کے صنفی تعلق کا مقصد نسل تمدن پر مبنی تھا اس کے دل میں والدین کیلئے احترام بھی ہوگا اور محبت بھی لیکن جو بچہ بڑا ہو کر یہ محسوس کرے کہ اس کے والدین کے صنفی تعلقات صرف لذت طلبی پر مبنی تھے اس کے دل میں والدین کیلئے نہ احترام ہوگا نہ محبت عام مشاہدہ ہے کہ ایسے والدین کے بچے ان حالات میں بھی اثر قبول کرتے ہیں۔

(۳) اسی لئے اسلام میں حکم ہے "والدین ہر کام کی طرح صنفی عمل سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ لیا کریں"۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنے سے نفسیات کے مطابق نکاح کو خدمت نسل و تمدن قرار دینے والے (یعنی اللہ تعالیٰ) کا تصور نطفہ قائم ہونے کے وقت والدین کے ذہن میں حاضر ہو جائے گا اور پیدائش کے بعد بچہ کی سیرت پر اثر انداز ہونے لگے گا۔

چھٹا ادب۔ اذان ولادت

مغربی ماہرین نفسیات یہ بھی کہتے ہیں کہ "ماحول اور ابتدائی تربیت کے اثرات بھی مسلم ہیں بعض صورتوں میں ان کے اثرات ان موالید اور اخلاط کے اثرات سے ہم آہنگ ہوتے ہیں جن سے بچہ تشکیل پاتا ہے لیکن بعض اوقات ماحول اور تربیت کے اثرات موالید اور اخلاط کے اثرات کو بھی بدل دیتے ہیں اسی لئے آدمی ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرلیتا ہے"۔ اس لئے اسلام میں حکم ہے کہ "بچہ کی پیدائش کے فوراً بعد اسلامی تصور زندگی کا مفصل فارمولا (یعنی اذان) بچہ کے کان تک پہونچایا جاتے"۔ تاکہ ماحول کی جو پہلی چیز بچہ کے نفس نیم شعوری۔ (سب کانشس سلف) پر اثر انداز ہو وہ زندگی کا اسلامی تصور ہو۔

ساتواں ادب۔ کلمہ صبح گاہی

نفس کے ابتدائی اثرات بغیر تکرار کے نہ قائم رہ سکتے ہیں نہ نشوونما پاسکتے ہیں کیونکہ نفسیاتی اصول ہے کہ "جو بات جتنی مرتبہ جتنے طریقوں اور جتنی آواز سے کان میں پڑتی ہے اتنی ہی زیادہ نفس پر اثر انداز ہوتی ہے"۔ اسلئے اسلام میں حکم ہے کہ "بچہ کے ماحول کے تمام افراد ہر صبح کو بیداری کے بعد قابل سماعت آواز میں اسلامی تصور زندگی کا مختصر فارمولا یعنی (لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ) پڑھا کریں۔ تاکہ بچہ اور اس کے اہل ماحول کے دلوں پر اپنی اپنی اذان ولادت کے ابتدائی اثرات روز بروز گہرے ہوتے چلے جائیں۔

گھر کے تمام افراد کے تصور زندگی میں یکسانیت پیدا کرنے کیلئے اذان ولادت اور کلمہ صبح گاہی بہترین ذریعے ہیں اور بغیر اس یکسانیت کے زندگی کے کسی شعبہ میں بھی گھر والے متحدہ جدوجہد نہیں کرسکتے۔ جس گھر میں شوہر اور زوجہ، باپ اور بیٹا، ماں اور بیٹی کا تصور زندگی مختلف ہو اس گھر کی زندگی جس معاشرت کے نمونہ کا کام ہوگی

مندرجہ بالا آداب بے مقصد رسوم نہیں ہیں ان کا مشترک مقصد انسان کو صنفی عمل کی بے قیدی اور کثرت سے باز رکھ کر اس کی صحت کو برقرار رکھنا اور اس کو تمدنی ترقی کے لئے استعمال کرنا ہے۔

راہبانہ نقطۂ نظر

صنفی کشش اور اس کے استعمال کے سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر سے واقف ہونیکے بعد یہ مناسب ہوگا اگر ایک نظر دوسرے نقطۂ ہائے نظر پر بھی ڈالی جائے۔

رہبانیت میں اخلاقی بلندی کا سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ خواہش صنفی کو بالکل ہی مٹا دیا جائے اس سے کم درجہ یہ ہے کہ باوجود صنفی خواہش کے نکاح نہ کیا جائے اس سے بھی کم درجہ یہ ہے کہ نکاح کرکے بیوی سے صنفی تعلق نہ رکھا جائے اور سب سے پست درجہ یہ ہے کہ نکاح کرکے بیوی سے صنفی تعلق بھی رکھا جائے۔

عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جب اسلام نے مسیحیت کی اور مسیحیت نے رہبانیت کی شکل اختیار کی تو مسیحی معاشرہ میں بھی تجرد کو اخلاقی بلندی اور نکاح کو اخلاقی پستی کا معیار سمجھا جانے لگا اور متقیانہ مسیحی زندگی بسر کرنے کیلئے ضروری ہوگیا کہ چرچ کے عہدیدار یا تو نکاح کیا ہی نہ کریں اگر کریں تو زن و شوہر ایک دوسرے سے صنفی تعلق نہ رکھیں چنانچہ مسیحی رہبانیت کے عہد عروج میں یہ قانون تھا کہ چرچ کے عہدہ دار تخلیہ میں اپنی بیویوں سے نہ ملیں ان کی ملاقات ہمیشہ کھلی جگہ میں ہو اور ملاقات کے وقت کم از کم دو غیر آدمی موجود ہوں۔

مشرکانہ نقطۂ نظر شرک میں ایک طرف تو صنفی تعلق نکاح کے بعد بھی غیر مقدس سمجھا جاتا ہے چنانچہ بھارت کے گاندھی جی نے آخری عمر میں اپنی بیوی کیساتھ صنفی تعلق کو ختم کر دیا تھا اور دوسری طرف صنفی تعلق نکاح کے بغیر بھی پیدا کیا جا سکتا ہے مثلاً اگر بچے شوہر سے اولاد نہ ہوتی ہو تو وہ کسی اور سے استقرار حمل میں مدد لے سکتی ہے اسی کا نام نیوگ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس خیال انسانی معاشرت کو اصولاً یہ صحیح مان کر اس کی عملی مخالف ورزی سے جو جس پر فطرت مجبور کر دیتی ہے جو خاندان وجود میں آئیگا اس کے ارکان (یعنی زن و شوہر اور اولاد) میں باہمی یگانگی اور خوش اطوار مفقود ہو گی کیونکہ جو لوگ اپنی پیدائش کے طریقہ کو مذموم سمجھتے ہوں ان میں حسن معاشرت کا پایا جانا ناممکن ہے۔

ملحدانہ نقطۂ نظر چونکہ الحاد میں انسان کا تصور سراسر حیوانی ہے اس لئے ملحدانہ معاشرت میں حیوانی زندگی کے قوانین کو انسانی زندگی کے قوانین کا ماخذ بنانے کیلئے ڈاکٹر ٹوینیڈل لکھتا ہے کہ:

"آزاد صنفی تعلق (یعنی زنا) بہتر اخلاق کا مظہر ہے اس لئے کہ وہ قوانین فطرت سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔"

جرمن ہوشن ڈیموکریٹک پارٹی کا لیڈر بیبل لکھتا ہے کہ:

"مرد اور عورت آخر حیوان ہی تو ہیں، کیا حیوانات کے سلسلہ میں نکاح کا کوئی سوال پیدا ہو سکتا ہے۔"

ان بیانات میں نکاح کی تردید اور زنا کی تائید میں جو استدلال پیش کیا گیا ہے اس کو صحیح مان کر ہر مفید چیز کی تردید اور ہر مضر چیز کی تائید میں استعمال کیا جا سکتا ہے مثلاً کہہ سکتے ہیں کہ:

"مرد اور عورت آخر حیوان ہی تو ہیں کیا حیوانات میں اشیاء خوردنی کو لوٹنے کاٹنے پیسنے پکانے اور ان میں رنگا رنگی پیدا کرنے کا کوئی سوال پیدا ہو سکتا ہے۔"

اگر یہ دلیل غذا کے سلسلہ میں قابل قبول نہیں ہے تو نکاح و زنا کے سلسلہ میں بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی مگر چونکہ ملحدین نے اپنی حیوانی شہوت کے محض خواہشات کی بناء پر حیوانی معاشرت کو انسانی معاشرت کیلئے نمونہ قرار دیدیا ہے اس لئے ناواقف لوگ زنا کو صنفی تعلق کا حکیمانہ طریقہ سمجھنے لگے ہیں۔

مغربی تصور زندگی نے انسانی زندگی میں شہوانیت کو جس حد تک وسعت دی ہے اس کے زیر اثر جرمن ڈاکٹر مانگنوس ہرشفیلڈ نے دنیا کی کانگریس برائے جنسی اصلاح کے صدر کی حیثیت سے جنگ عظیم سے قبل لواطت کی موافقت میں اتنا زبردست پروپیگنڈا کیا کہ جرمن پارلیمنٹ نے لواطت کو اس شرط قانونی جواز دیدیا کہ "اگر فریقین راضی ہوں یا مفعول کا ولی اجازت دیدے تو لواطت جائز ہے۔" اس کے یہ معنی ہیں کہ مغرب میں ایسے والدین بھی موجود ہیں جو اپنے نابالغ بچوں سے اس طرح فائدہ اٹھانے پر تیار ہیں کہ یہ اولیہ دادا، باپ، چچا اور بھائی بھی ہو سکتے ہیں۔ (معاذ اللہ)

ملحدانہ نقطۂ نظر کے نتائج جب معاشرت میں نکاح اخلاقی پستی کا اور زنا اخلاقی بلندی کا معیار قرار پائے تو معاشرہ میں نکاح کیلئے دشواریاں اور زنا کیلئے آسانیاں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں اور شہوانیت گھر ہی سے شروع ہو جاتی ہے چنانچہ فرانسیسی مفکر موسیو لیپ ہیوڈ اپنی "تو مدر ڈمس مالسل ہینگر لیسی" میں لکھتا ہے کہ "فرانس کے اضلاع اور بڑے شہروں کی آبادی میں قریبی رشتہ داروں حتیٰ کہ باپ بیٹی اور بھائی بہن میں بھی صنفی تعلقات کا پایا جانا اب کوئی شاذ و نادر واقعہ نہیں رہا ہے۔"

ڈاکٹر ایڈنسہو کر لکھتا ہے کہ "ایک شریف خاندان کی لڑکی اپنے بڑے بھائی اور اس کے چند دوستوں کے ذریعے لوٹ ہوئی۔"

گھر کے بعد شہوانیت کی دوسری پناہ گاہیں اسکول ہیں اس سلسلہ میں ڈنور (امریکہ) کی عدالت اطفال کا جج بن لنڈسے اپنی "ریوالٹ آف ماڈرن یوتھ" میں اپنی تحقیقات کے نتائج پیش کرتا ہے کہ "ہائی اسکول کی ۴۹۵ لڑکیوں نے خود مجھ سے اقرار کیا کہ ان کو لڑکوں سے صنفی تعلقات کا تجربہ ہو چکا ہے۔ ان میں سے ۲۵ کو حمل ٹھہر گیا تھا بعض اتفاق سے بچ گئی تھیں لیکن اکثر کو مانع حمل تدابیر کا علم تھا۔"

مغربی معاشرہ پر شہوانیت کے طوفانی اثرات کو جارج رائلی اسکاٹ (اپنی "ہسٹری آف پراسٹی ٹیوشن" میں) اس طرح بیان کرتا ہے کہ "جن عورتوں کو لبرل اوقات کا ماحصل یہ ہی ہے کہ اپنے جسم کو کلیۃ یا جزواً کرایہ پر دیتی ہیں ان کے علاوہ ایک بہت بڑی تعداد ان عورتوں کی بھی ہے جو اپنی ضروریات زندگی کیلئے دوسرے ذرائع رکھتی ہیں اور

جنسی طور پر اس کے ساتھ فحاشی بھی کرتی ہیں تاکہ آمدنی میں کچھ اضافہ ہو جائے یہ پیشہ ور فاحشات سے کچھ بھی مختلف نہیں ہیں مگر ان کا نام کا ان پر اطلاق نہیں ہو سکتا ان کو شوقین فاحشات یا ایسے ہی پرائیویٹ بیشن کہہ سکتے ہیں۔ ان کی کثرت جتنی آج ہے اتنی کبھی نہیں تھی معاشرہ کے نیچے سے اوپر تک ہر طبقہ میں یہ پائی جاتی ہیں اگر ان کو اشارتاً بھی فاحشہ کہہ دیا جائے تو یہ برافروختہ ہو جائیں گی مگر ان کی ناراضگی سے حقیقت نہیں بدل سکتی ...... اب جوان لڑکیوں کے ذہن میں زنا یا عصمت فروشی کا خیال آتا ہی نہیں...... دوشیزگی اور بکارت کو دقیانوسی چیز سمجھا جاتا ہے اور دوشیزگی لڑکی اس کو ایک مصیبت خیال کرتی ہے۔"

مغربی ممالک میں فحاشی نے منضبط نظام کی صورت اختیار کر لی ہے فرانسیسی مصنف کارکن فرڈیننڈ دریو لکھتا ہے کہ فحاشی کا پیشہ اب کوئی انفرادی کام نہیں رہا ہے بلکہ ایک منضبط کاروبار اور ایک منظم حرفت (آرگنائزڈ انڈسٹری) بن گیا ہے اس کے خام پیدا وار مہیا کرنے والے ایجنٹ الگ ہیں سفری ایجنٹ الگ ہیں اور اس کی باقاعدہ منڈیاں موجود ہیں۔ جوان اور کم سن لڑکیاں وہ تجارتی مال ہیں جس کی درآمد اور برآمد ہوتی ہے۔"

پول بیورو لکھتا ہے کہ "فحاشی ایک زبردست نظام ہے جو پورے منظم طریقہ سے تنخواہ دار عہدہ داروں کے ساتھ چل رہا ہے۔ ناشر اور اہل قلم، خطیب اور مقررین، اطباء اور دایاں اور تجارتی سیاح اس میں باقاعدہ ملازم ہیں اور اشتہار و مظاہرہ کے جدید ترین طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔"

اسی پول بیورو کا بیان ہے کہ جنگ عظیم سے پیشتر فرانس میں ایک ایجنسی اس اصول پر قائم کی گئی تھی کہ ہر عورت خواہ وہ اپنے حالات، ماحول، مالی حیثیت، عادی اخلاقی چال چلن کے لحاظ سے کیسی ہی ہو ایک نئے تجربہ کیلئے آمادہ کی جا سکتی ہے لیس جو صاحب کسی خاتون سے تعلق پیدا کرنا چاہیں وہ اس کا صرف پتہ بتا دیں اور پچیس فرانک بطور ابتدائی فیس کے داخل کر دیں اس کے بعد خاتون موصوفہ کو معاملہ پر راضی کر لینا ایجنسی کا کام ہے۔ اس ایجنسی کے رجسٹروں سے ثابت ہوا کہ معاشرہ کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس کے کثیر التعداد افراد نے ایجنسی سے [illegible] رجوع کیا ہو۔"

چونکہ مغرب میں زنا کو بد اخلاقی کے بجائے اخلاق کا معیار بنا لیا گیا ہے اس لئے اب اس پر عمل کی یہ صورت نہیں ہے کہ معاشرہ میں کچھ لوگ غلطی سے یا خواہش سے مجبور ہو کر اس کے مرتکب ہو جاتے ہیں بلکہ اب زنا ایک نصب العین ہے جس کی اشاعت پوری سرگرمی سے کی جاتی ہے۔ پول بیورو لکھتا ہے کہ "پچھلے پچیس سال میں اتنی کامیابی تو ہو چکی ہے کہ حرامی بچہ کو حلالی بچہ کا تقریباً ہم مرتبہ بنا دیا گیا ہے اب صرف اتنی کسر باقی ہے کہ فقط حرامی بچے ہی پیدا ہوا کریں تاکہ تقابل کا سوال ہی باقی نہ رہے۔"

موانع حمل

مغربی معاشرہ میں نکاح کر کے گھر بسانا اور اولاد پیدا کرنا فریضہ زندگی کے بجائے ابتدا استغنا زندگی اور بالآخر وبال زندگی سمجھا جاتا ہے۔ میکفیڈنٹ (ڈاکٹر) "مین اینڈ میرج" میں لکھتا ہے کہ "موانع حمل کو کنوار یاں اس لئے استعمال کرتی ہیں کہ بچہ کی پیدائش کے بعد نکاح نہ کرنا پڑے بیاہیاں اس لئے استعمال کرتی ہیں کہ بچہ کی پیدائش طلاق لینے اور دینے میں مانع نہ ہو اور دونوں اس لئے استعمال کرتی ہیں کہ بچہ کی پیدائش سے حسن میں فرق نہ آئے، لطف زندگی کرکرا نہ ہو اور مصارف کا بار نہ بڑھ جائے۔"

اسقاط حمل

اسقاط حمل بھی مغربی معاشرت کی خصوصیت ہے چنانچہ جج بن لنڈسے کے بقول امریکہ میں کم از کم پندرہ لاکھ حمل سالانہ ساقط کئے جاتے ہیں۔ فرانس میں تین اسقاط میں سے بمشکل ایک کے چالان کی نوبت آتی ہے اور عدالتی مقدمات میں سے پچھتر فیصدی عدالت سے چھوٹ جاتے ہیں باوجود فرانس میں اسقاط کی تعداد کم از کم چھ لاکھ سالانہ ہے۔

قتل اولاد

مغربی ممالک میں جو اولاد موانع حمل کے استعمال اور اسقاط کی کوشش کے باوجود پیدا ہو جاتی ہے اس میں سے معقول تعداد کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ بن لنڈسے لکھتا ہے کہ امریکہ میں ہر سال ہزاروں بچے قتل کر دیئے جاتے ہیں صنفی تعلقات میں سے پچاس فیصدی کو موانع حمل کے ذریعہ بے ثمر بنایا جاتا ہے باقی پانچ فیصدی میں اسقاط حمل اور قتل اولاد سے کام لیا جاتا ہے۔"

پول بیورو نے فرانس میں اولاد کشی کی عبرت انگیز مثالیں بیان کی ہیں۔ ایک عورت کا چھ ماہ کا بچہ مر گیا تو وہ بہت خوش ہوئی اور کہنے لگی کہ "اب ہم دوسرا نہ ہونے دیں گے مجھ کو اور میرے شوہر کو اس کی موت سے بڑا اطمینان ہوا ہے۔" فروری ۱۹۱۸ء میں لوار کی عدالت میں دو لڑکیاں پیش ہوئیں ایک نے اپنے بچہ کو ڈبو کر

کیا تھا اور دوسری نے اپنے بچہ کو گلا گھونٹ کر مارا تھا۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں سویڈن کی عدالت میں ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں ماں نے اپنے بچہ کی زبان کھینچ کر مارا تھا۔ ان تینوں کا عدالت سے بری ہو جانا اس کا ثبوت ہے کہ تمدن مغرب میں اولاد کشی کو عدالت کی چشم پوشی اور حکومت کی سرپرستی حاصل ہو چکی ہے۔ اور اس معاملہ میں بیسویں صدی کے مغرب کی اخلاقی سطح ساتویں صدی کے عرب جاہلیت کی اخلاقی سطح سے مختلف نہیں ہے۔

ضبطِ ولادت

ملحدانہ معاشرت نے جس طرح تمدن کے خلاف زنا کے جرم کو اخلاقی رنگ دیا تھا اسی طرح تمدن کے خلاف قتل اولاد کے جرم کو بھی اخلاقی رنگ دیا ہے جس کے مغالطہ انگیز دلائل حسب ذیل ہیں:۔

(۱) کہا جاتا ہے کہ "بچوں کی تعداد کا والدین کی حد استطاعت کے مطابق ہونا خود بچوں کیلئے بہتر ہے"۔ مگر اس وقت تک کے تجربہ کے مطابق مغرب کی ہر متمدن قوم میں ضبط ولادت پر نیم تعلیم یافتہ اور غیر مستطیع طبقات کے بجائے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مستطیع طبقات نے عمل کیا ہے جس سے تعداد اطفال اور حد استطاعت میں مطابقت کا مقصد تو پورا نہ ہوا البتہ ضابطہ اقوام کا وجود خطرہ میں پڑ گیا اس لئے یعنی امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی اور روس وغیرہ میں ضبط ولادت کے خلاف تحریکات شروع ہو گئی ہیں ہر جگہ بہ لحاظ قانون منضبط ہو۔ مصنوعی طریقوں کو روکا اور افزائش نسل کی تدابیر کرنا شروع کیا جا رہا ہے۔ غیر شادی شدوں اور بے اولاد پر بھاری ٹیکس لگایا جاتا ہے۔ شادی کی ترغیب کیلئے مالی امداد دے کر شادی کیا جاتا ہے۔ شادی شدہ اور با اولاد لوگوں کو تحفوں کے علاوہ تنخواہیں پنشنیں اور مزدوریاں زیادہ ملتی ہیں اور ان سے ریل کا کرایہ اور انکم ٹیکس کم لیا جاتا ہے۔ جرمنی میں سنہ ۱۹۳۲ء میں چھ لاکھ افراد کو ایک کروڑ پونڈ قرضہ شادی دیا گیا اور سنہ ۱۹۳۹ء کے قانون کی رو سے انکم ٹیکس میں ایک بچہ پر ۱۵ فیصدی کم، دو بچوں پر ۳۵ فیصدی کم، تین پر ۵۵ فیصدی کم، چار پر ۷۰ فیصدی کم، پانچ پر ۹۰ فیصدی کم لیا گیا اور چھ بچوں پر انکم ٹیکس معاف کر دیا گیا۔

(۲) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "بچوں کی کثرت ان کی جسمانی اور دماغی کمزوری کا باعث ہوتی ہے"۔ مگر یہ کوئی دلیل نہیں ہے محض دعویٰ ہے جس کے برخلاف تجربہ یہ ہے کہ جن جن لوگوں نے بڑے بڑے کام کئے ہیں ان میں سے اکثر اپنے بڑے بھائیوں سے زیادہ تندرست یا زیادہ ذہین تھے۔ قارئین اگر غور کریں گے تو اس کی بہت سی مثالیں اپنے گردوپیش پائیں گے۔ چند نمایاں مثالیں حسب ذیل ہیں۔ جن کی ذہنی صلاحیتوں کا ان کے بڑے بھائیوں سے فائق ہونا مسلم ہے:۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ مولانا محمد علی جوہر۔ مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ

(۳) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "زمین میں قابل سکونت جگہ اور وسائل معاش محدود ہیں اور افزائش نسل غیر محدود ہے اگر وہ فطری طریقہ سے جاری رہے تو نوع انسانی پر زمین تنگ اور وسائل معاش تنگ تر ہو جائیں گے"۔ مگر تعجب ہے کہ ایسا کہنے والوں کو صلاحیت ارتقاء کا فطری انتخاب تو نظر آیا لیکن صلاحیت تولید کا فطری انضباط نظر نہیں آیا حالانکہ فطری انتخاب سے فطری انضباط کے شواہد کچھ کم نہیں ہیں۔ مثلاً تحقیق جدید کے مطابق "نباتات کی صرف ایک نوع سسمبرم سوفیا کے ہر پودے میں ساڑھے سات لاکھ بیج ہوتے ہیں"۔ "اور حیوانات کی صرف ایک نوع اسٹار فش کی ہر فرد بیس کروڑ انڈے دیتی ہے"۔ "اور ایک مرد کے جسم سے ایک وقت میں جتنا مادہ منویہ خارج ہوتا ہے اس سے تمام دنیا کی عورتیں حاملہ ہو سکتی ہیں"۔ اب اگر سسمبرم سوفیا، اسٹار فش اور انسانوں میں سے ہر نوع کے صرف ایک فرد کی پوری صلاحیت تولید بروئے کار آ جاتی اور ہر نسل میں بڑھنے کا موقع ملتا تو چند ہی نسلوں میں زمین پر پہلی نوع سے اتنی پٹ جاتی کہ اس میں ہر دوسری نوع کے لئے نہ تو گنجائش نکل سکتی اور نہ غذا میسر آ سکتی۔ اس صورت حال سے ثابت ہوتا ہے کہ نباتات اور انسان کی صلاحیت تولید پر فطری انضباط کا تسلط رہا ہے جس نے ہر ایک نوع کے افراد کی تعداد کو اتنا بڑھنے نہ دیا کہ دوسری نوع کی پیدائش کیلئے مصنوعی انضباط [illegible]۔

(۴) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "فطری انضباط تولید بذرائع مرگ سے (یعنی وباؤں، سیلابوں، طوفانوں، زلزلوں اور جنگوں سے) ضبط ولادت کرنا جو انسان کے لئے باعث مصیبت ہے اس لئے مصنوعی انضباط تولید کے ذریعہ سے (یعنی منع حمل و اسقاط حمل و قتل اولاد سے) ضبط ولادت کرنا انسان کیلئے باعث راحت ہے"۔ مگر مصنوعی انضباط اس وقت باعث راحت ہو سکتا ہے جب ذرائع مرگ کے بجائے استعمال کیا جائے ذرائع مرگ کیساتھ ساتھ مصنوعی انضباط کا استعمال انسان کے لئے دوہری مصیبت ہے۔ پس ذرائع مرگ کو اگر روکا جا سکتا ہو تو ضرور روکا جائے اور اگر نہ روکا جا سکتا ہو تو مصنوعی انضباط

ضروریات کو پیدا کر دیتا ہے۔ جو لوگ مادہ کی وحشی قوتوں کو بے لگام چھوڑ دیتے ہیں وہ خود ہی ان قوتوں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتے ہیں۔ دور حاضر میں مادی قوتوں کو بے لگام چھوڑ دیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مادہ اس انسان کو برباد کر دے گا جو خود مادہ سے بلند ہوئے بغیر مادہ کی تسخیر چاہتا ہے۔" (ری کری ایشن آف دی ماڈرن ورلڈ)

میسن نے لکھا ہے کہ "ہم نے اپنے دور کی ابتدا طبیعیات کی کارگری سے کی اس توقع کے ساتھ کہ مادی کامرانیاں زندگی کے عقدوں کو حل کریں گی لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم غلطی پر تھے زندگی کے مسائل ایسے سہل نہیں ہیں۔ بڑھتی ہوئی مادی خواہشات کی تسکین کے لئے کشمکش زندگی نے یہ حقیقت نگاہوں سے اوجھل کر دی کہ انسانی زندگی کا سرچشمہ ماورا مادیت ہے۔ چونکہ طبیعیات نے مادی کامیابی عطا کر دی اس لئے ہم طبیعیات کی اسی طرح پرستش کرنے لگے جس طرح ہمارے بزرگ جادو کی پرستش کیا کرتے تھے۔ ہمارے دور میں خوشحالی اتنی فراواں ہے کہ بایں ہمہ شاید عیش و عشرت کے سامان ہر مقام پر موجود ہیں، مادی کامیابی کے حاصل ہونے سے نچلے درجہ کے انسانوں کے پیٹ بھلے ہی بھر گئے ہوں بایں ہمہ انسان بے چین غیر مطمئن، مضطرب اور بے قرار ہے، تخلیق کی قوت محرکہ ایسے نظریہ کو کبھی سینہ سے لگائے نہیں رکھ سکتی جو انسان کو محض مادہ کی نمود قرار دے۔ ایسے نظریہ کے ساتھ افراد اور اقوام تباہ ہو کر خاک میں مل جاتی ہیں۔" (کریئیٹو فریڈم)

ڈبلیو۔ برنا نے لکھا ہے کہ "قدیم اقتدار اور عقائد ختم ہو چکے ہیں اور اس خلا کو کسی اور چیز نے پُر نہیں کیا ہے، دنیا کے بڑے حصہ پر تعمیری کے بجائے تخریبی قوتیں چھا چکی ہیں اور انسان نے جو کچھ صدیوں میں حاصل کیا تھا وہ سب ختم ہو رہا ہے۔ مختلف انداز کی حکومتیں اور معاشرتی ادارے اس بات میں ناکام ہو چکے ہیں کہ انسانوں کو انسانوں کے ہاتھوں سے محفوظ رکھا جائے۔" (فاؤنڈیشن آف ہیومن کنفلکٹس)

برٹرنڈ رسل نے لکھا کہ "مجموعی طور پر ہمارا حال یہ ہے کہ ہم دو چیزوں کے درمیان معلق ہیں۔ ایک وسائل و ذرائع پر انسانی قدرت اور دوسری مقاصد حیات میں غلط کاری اور جب مقاصد کے سلسلہ میں روش غلط ہو تو قوت اور قدرت میں ہر اضافہ بگاڑ میں اضافہ کا مترادف ہوتا ہے۔ آج تک نسل انسانی اس لئے بچی رہی ہے کہ وہ جہالت اور عدم مہارت میں مبتلا تھی...... لیکن جب غلط کاری کے ساتھ علم اور مہارت بھی موجود ہوں تو پھر انسانیت کی بقا ہی معرض خطر میں ہے علم ایک قوت ہے لیکن یہ قوت برائی کے لئے بھی اتنی بڑی ہے جتنی بھلائی کے لئے...... اس امر کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جب تک علم کے فراغ کے ساتھ ساتھ حکمت اور مقاصد حیات کا حقیقی شعور بھی نہ بڑھے علم کا ہر اضافہ رنج والم اور مصائب ہی کے اضافہ کا ہم معنی ہوگا۔"

آٹھواں ادب۔ ازدواجی ذمہ داریاں

صنفی قوت کی کثرت استعمال سے انسانی صحت کو اور بے قید استعمال سے انسانی تمدن کو محفوظ رکھنے کیلئے اسلامی معاشرت نکاح کے بعد ہی شوہر اور زوجہ پر حسب ذیل ذمہ داریاں عائد کرتی ہے:-

شوہر کی ازدواجی ذمہ داریاں دو ہیں (۱) خطرہ کے وقت اپنی جان پر کھیل کر زوجہ اور اس کے بچوں کی حفاظت کرنا (۲) زوجہ کو وضع حمل تک زوجہ کی اور وضع حمل کے بعد زوجہ اور اس کے بچوں کی ضروریات زندگی کی بہم رسانی سے بے فکر کر دینا۔

زوجہ کی ازدواجی ذمہ داریاں پانچ ہیں (۱) ایام حمل اور (۲) وضع حمل کے شدائد برداشت کرنا (۳) اپنی صحت اور جان کو خطرہ میں ڈال کر اپنے جسم کے تمام اجزاء اور قوام کو جنین کی پرورش میں صرف کرنا (۴) وضع حمل کے بعد اپنے خون سے بچوں کیلئے غذا مہیا کرنا (۵) شوہر اور بچوں کی راحت رسانی میں دن کا چین اور رات کا آرام قربان کرنا۔

یہ ذمہ داریاں کسی اور کی عائد کردہ نہیں ہیں مرد اور عورت کی فطری ساخت کا نتیجہ ہیں اس لئے خود بھی فطری ہیں ان کو مردوں کی حماقتوں یا عورتوں کی ہوس پر خواہش اقتدار کا نتیجہ قرار دینا مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کے خلاف اور دونوں کو فطرت کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کرنا ہے جس سے خانگی اور اجتماعی زندگی کا برہم ہو جانا یقینی ہے۔

یہ ذمہ داریاں خود بخود زندگی کا مرکز دلچسپی اور دائرہ عمل مرد کے لئے بیرون خانہ اور عورت کے لئے اندرون خانہ قرار دیتی ہیں اس لئے فطری، عقلی اور اسلامی نقطہ نظر سے ضروری ہے کہ مرد اور عورت اپنے اپنے دائرہ عمل میں رہ کر اپنی اپنی ذمہ داریاں ادا کریں اور ایک دوسرے کے دائرہ عمل میں جا کر ان کی ذمہ داریوں میں مداخلت نہ کریں مردوں کا جتنا وقت گھر میں گذرے وہ اندرونی ذمہ داریوں کے بجائے بیرونی ذمہ داریوں کی فکر میں گذرے اور عورتیں جب گھر سے باہر جائیں تو

وہ بیرونی ذمہ داریوں کے بجائے اندرونی ذمہ داریوں کی فکر میں جائیں۔

یہ ذمہ داریاں اتنی اہم، اتنی وسیع اور اتنی گراں بار ہیں کہ اس وقت تک ادا ہو نہیں سکتیں جب تک مرد اور عورت اپنے دائرۂ عمل میں رہ کر اپنی پوری اہلیت اور وقت ان پر صرف نہ کریں اور نوع انسانی کا طویل تجربہ یہ ہے کہ جو مرد زنانہ ذمہ داریوں، زنانہ وضع اور زنانہ لباس میں دلچسپی لیتے ہیں وہ مردانہ ذمہ داریاں ادا کرنے کی صلاحیت کھو دیتے ہیں اور جو عورتیں مردانہ ذمہ داریوں، مردانہ وضع اور مردانہ لباس میں دلچسپی لیتی ہیں وہ زنانہ ذمہ داریاں ادا کرنے کی صلاحیت کھو دیتی ہیں۔

یہ ذمہ داریاں اگر مردوں اور عورتوں کی جانب سے ٹھیک ٹھیک ادا کی جائیں تو ہر پہلی نسل سے ہر دوسری نسل زیادہ ترقی یافتہ ہو کر رہے، والدین کے ایثار کے نمونہ سے بچوں میں بھی دوسروں کے لئے بلامزد کام کرنے کا جذبہ پرورش پائے گا جو تمدنی ترقی کی پہلی شرط ہے کیونکہ دنیا میں گھر کے سوا کوئی تعلیم گاہ اور والدین کے سوا کوئی معلمین ایسے نہیں مل سکتے جو بچوں کو خدمت دیگراں اور خدمت بلامزد کا عملی سبق دے سکیں، دوسری تمام تعلیم اور تمام صرف خدمت خود اور خدمت بالمزد کا سبق دیتے ہیں جو تمدنی ترقی کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے پس نکاح نہ کرنے یا صرف لذت طلبی کیلئے نکاح کرنے کے یہ معنی ہیں کہ تمدن کے ارتقاء کے لئے کارکنوں کو اس طرح پیدا اور پرورش کرنے سے ہم انکار کر دیں جس طرح ہم خود پیدا اور پرورش کئے گئے تھے اور بلوغ کے بعد نکاح میں تاخیر کرنے کے یہ معنی ہیں کہ کارکنان تمدن کی اس تعلیم کو ہم ناقص چھوڑ جائیں جو ان کو ہمارے سوا کوئی اور نہیں دے سکتا۔

مردوں اور عورتوں کی یہ ذمہ داریاں ایک دوسرے سے مختلف اور جداگانہ نوعیت کی ہیں اس لئے دونوں کو ان کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے قابل بنانے کیلئے جداگانہ نصاب، جداگانہ طرز تعلیم اور جداگانہ تعلیم گاہوں کی ضرورت ہے جن کے بغیر عورتوں کی تعلیم کو ہم جو کچھ چاہیں کہہ لیں تعلیم نہیں کہہ سکتے عورتوں کے لئے مشترک نصاب، مشترک طرز تعلیم، مشترک تعلیم گاہیں، مشترک مصروفیتیں اور مشترک دلچسپیاں ان ذمہ داریوں کے احساس کو مردہ کر کے نظام خاندانی اور اجتماعی زندگی کی بنیادوں کو جڑ سے اکھیڑ دیتی ہیں۔

مغربی معاشرہ زبان سے تو ماؤں کی تربیت اور تعلیم کو بچوں کے لئے ضروری قرار دیتا ہے مگر وہ عملاً ماؤں کو مردانہ ذمہ داریوں میں مصروف کر کے انہیں بچوں کی تربیت اور تعلیم کا موقع نہیں دیتا۔ پس معاشرہ میں عورتوں کا ایک طبقہ تو نکاح کرنا ہی پسند نہیں کرتا، دوسرا طبقہ نکاح کرنے کے بعد بچے جننا پسند نہیں کرتا اور تیسرا طبقہ جننے کے بعد بچوں کی خود پرورش کرنا پسند نہیں کرتا، کچھ بچے پرورش گاہوں میں پل کر نامی بنتے ہیں اور کچھ بچے نرسوں کی گود میں پل کر والدین سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔

نواں ادب سلام صبح گاہی

ہر مذہب، ہر تمدن اور ہر معاشرت نے ضروری قرار دیا ہے کہ صبح کو بیدار ہونے کے بعد انسان کی روزانہ زندگی کی ابتدا دوسرے انسانوں کیلئے ایک خیر سگالی سے ہونا چاہیئے (اس قاعدہ کے مطابق آج کل اقوام اور مملکتیں ایک دوسرے سے تعلقات کی ابتدا خیر سگالی کے پیغاموں اور ملاقاتوں سے کرتی ہیں اور بہتر تعلقات قائم ہونے کے بعد معاشرتی، معاشی اور سیاسی معاہدات کرتی ہیں) مگر اس صبح گاہی پیغام خیر سگالی کے لئے موزوں الفاظ، مناسب اشکال اور شائستہ آداب اسلام کے سوا کسی مذہب، کسی تمدن اور کسی معاشرت نے مقرر نہیں کئے ہیں چنانچہ:۔

(۱) خیر سگالی کے غیر اسلامی الفاظ گڈ مارننگ، ست سری اکال، نمستے، رام رام اور پالاگن وغیرہ کے بجائے اسلام نے خیر سگالی کے لئے السلام علیکم اور جواب خیر سگالی کے لئے وعلیکم السلام کے الفاظ اختیار کئے ہیں۔ سلام کے معنی امن و سلامتی کے ہیں اس لئے ہر معقول آدمی تسلیم کرے گا کہ خیر سگالی کے غیر اسلامی الفاظ کے مقابلہ میں اسلامی الفاظ قابل ترجیح ہیں۔

(۲) تمام غیر اسلامی معاشرتوں میں عمر، رشتہ اور مرتبہ کے لحاظ سے سلام کی ابتدا یکطرفہ ہے اولاد والدین کو، شاگرد استاد کو، ملازم آقا کو، سپاہی افسر کو، محکوم حاکم کو اور بادشاہ رعایا کو یعنی ہر چھوٹا ہر بڑے کو سلام کرتا ہے کوئی بڑا کسی چھوٹے کو سلام نہیں کرتا مگر اسلام میں حکم ہے کہ ہر شخص بلا لحاظ عمر، رشتہ

مرتبہ کے اپنے سے پہلے بیدار ہونے والوں کے لئے سلام میں ابتدا کیا کرے۔ اور سلام کے وقت سر نہ جھکائے" کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر سلام بھیجتا ہے۔ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہر بڑے اور چھوٹے کو حتیٰ کہ اپنی بیٹی کو بھی سلام کیا کرتے تھے پس یکطرفہ غیر اسلامی طریقہ سلام بڑوں میں جذبہ خود پسندی کو اور دو طرفہ اسلامی طریقہ سلام چھوٹوں میں جذبہ خودداری پیدا کرتا ہے۔ جس طرح کلمہ صبح گاہی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور حاکمیت کو نفس انسانی میں پیوست کرتا ہے اسی طرح سلام صبح گاہی انسانی مساوات کو نفس انسانی میں نشو ونما دیتا ہے اس سے زیادہ انسانی مساوات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

دسواں ادب۔ سلام ملاقات

اب تک جتنے آداب بیان ہوئے ہیں وہ خانگی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں گھر سے باہر نکل کر مختلف مواقع پر کسی سے ملاقات ہو تو۔

(۱) حکم ہے کہ "اگر دو آدمی بغیر سابقہ تعارف کے کہیں ملیں تب بھی باہم سلام علیک ضرور کریں" کیونکہ اگر تمام مسلمانوں کو ایک معاشرتی رشتہ میں منسلک ہونا ہے تو ان کا ایک دوسرے سے ملنے کے بعد بعض ذریعہ تعارف نہ ہونے کی وجہ سے بے تعلق رہنا کوئی معنی نہیں رکھتا برخلاف اس کے مغربی معاشرت میں دو آدمی برسوں دیوار بیچ رہنے کے باوجود ایک دوسرے کے نام تک سے واقف نہیں ہوتے اور ہزاروں میل ساتھ ساتھ سفر کرنے کے باوجود اس وقت تک ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے جب تک کوئی تیسرا تعارف نہ کرائے یہ طرز عمل سراسر ان سوشل بلکہ اینٹی سوشل ہے۔

(۴) حکم ہے کہ "اگر ایک سوار اور ایک پیدل سر راہ ملیں تو سوار سلام میں سبقت کرے خواہ وہ عمر، رشتہ اور مرتبہ میں بڑا ہو یا چھوٹا اور مجلس یا جلسہ میں سے صرف ایک شخص جواب دے" کیونکہ سب کا جواب دینا باعث ہنگامہ اور وجہ بدنظمی ہوگا جو اسلام میں ناپسندیدہ ہے۔

(۵) حکم ہے "اگر دو جماعتیں کسی مجلس خاص یا جلسہ عام میں یا سر راہ ملیں تو چھوٹی جماعت میں سے ایک شخص سلام کرے اور بڑی جماعت میں سے ایک شخص جواب دے"

—— اس سے ثابت ہے کہ مواقع اجتماع میں شور و غل تو ایک طرف اسلامی نقطۂ نظر سے اتنی آواز بھی ناپسندیدہ ہے جو اجتماعی سلام سے پیدا ہو سکتی ہے۔ کاش مسلمان اپنے اجتماعات کو پرسکون اور باوقار بنانے پر متوجہ ہوں۔

(۶) حکم ہے کہ "اگر کوئی کسی کا مہمان ہو تو مہمان کو میزبان کے لئے سلام میں سبقت کرنا لازم ہے" آج کے حالات میں اس سنت نبوی پر عمل درآمد کی صورت یہ ہے کہ اگر آج کوئی مملکت اسلامی دستور پر مبنی ہو (مثلاً ترکی یا مصر یا سعودی عرب یا پاکستان یا انڈونیشیا) اور اس کا سربراہ کسی دوسری مملکت میں (مثلاً امریکہ یا روس میں) مدعو کیا جائے تو سنت نبوی کے مطابق مہمان مسلم سربراہ کو میزبان سربراہ اور میزبان دستہ فوج کے کمانڈر دونوں کے لئے یکساں سلام میں سبقت کرنا ہوگا۔ کیونکہ میزبان فوج کا اپنے ملک کے دفاع کی ذمہ داری قبول کرنا کوئی جرم نہیں ہے جس کی سزا میں میزبان فوجیوں کو اس مساویانہ معاشرتی درجہ سے محروم کر دیا جائے جو اسلام نے ہر میزبان کو عطا کیا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے میزبان دستہ فوج کا صحیح نام دستہ استقبالیہ (گارڈ آف ریسپشن) ہوگا اس کو مغربی اصطلاح میں دستہ اعزازی (گارڈ آف آنر) کہنا قرون مظلمہ (ڈارک ایجز) کی یادگار ہے جب بادشاہوں کے اعزازی جلوسوں میں مسند جھولوں سے آراستہ ہاتھی، گھوڑوں اور کتوں کو اور مسلح بہ قہ فوجوں کو ایک ہی حیثیت اور ایک ہی مقصد سے شامل کیا جاتا تھا حکمرانوں کے اعزاز کے اس جاہلانہ نظریہ کو اور فوجوں کی بے قدری کے اس جاہلانہ تخیل کو اسلامی اصولوں پر تربیت یافتہ فوج تو کسی طرح برداشت کر ہی نہیں سکتی لیکن اگر اسلامی اصولوں کو مغرب میں مناسب طریقہ سے پیش کیا جائے تو ان کے مقابلہ میں جاہلانہ اصولوں کو گوارا کرنا امریکہ و یورپ اور روس کی فوجوں کے لئے بھی مشکل ہو جائے گا کیونکہ انسان جہاں بھی ہو بہرحال انسان ہے وہ انسانی آداب سے ہمیشہ دست بردار نہیں رہ سکتا۔

گیارہواں ادب۔ تکریم باہمی

سلام علیک کے وقت دو ملنے والوں کا ایک دوسرے کی باہمی تکریم و توقیر کرنا حسن معاشرت کے لحاظ سے ضروری ہے مگر تمام غیر اسلامی معاشرتوں میں تکریم و توقیر کے لئے ہر چھوٹے کا ہر بڑے کی ایسی تعظیم کرنا فرض ہے جس سے بڑے کی تعظیم کے ساتھ چھوٹے کی تذلیل بھی لازم آئے چنانچہ دنیا میں قدیم زمانہ سے آج تک رعایا کا بادشاہ کو، محکوم کا حاکم کو اور خادم کا مخدوم کو سلام

کرتے وقت سر زمین پر رکھنا (سجدہ) یا کمر تک سر جھکانا (رکوع) یا مخصوص طور پر کھڑا ہونا (قیام) یا مخصوص طور پر بیٹھنا (قاعدہ) مزدکی مذاہب کے آثار قدیمہ میں بادشاہوں، حاکموں اور دیوتاؤں کے سامنے گھٹنے ٹیکنا اور نیل ننگ (Kneeling) کی صورت میں اور ہندو معاشرت میں ڈنڈوت اور پالاگن صورت میں آج تک موجود ہیں مگر اسلام نے ان چاروں افعال تعظیم کے سلسلہ میں بھی دنیا کی خاص رہنمائی کی ہے اول تو ان چاروں افعال کو نماز کا جزو بنا جس سے یہ افعال انسان کی طرف سے انسان کیلئے حرام ہوگئے کیونکہ اللہ ہی کیلئے جس طرح پوری نماز حرام ہے اسی طرح نماز کا ایک جزو یعنی ایک رکعت بھی ہے اور اسی طرح ایک رکعت کا جزو (یعنی سجدہ، رکوع، قیام اور قاعدہ) بھی حرام ہے۔ دوسرے ان چاروں افعال کو نماز کے باہر بھی ممنوع قرار دیدیا چنانچہ

(۱) معاذؓ نے شام سے واپس آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا آپ نے فرمایا معاذ یہ کیا، انہوں نے عرض کیا میں نے شامیوں کو دیکھا ہے کہ وہ اسقفوں کو سجدہ کرتے ہیں اور اس کو اپنے انبیاء سے منسوب کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا وہ انبیاء پر جھوٹ بولتے ہیں اے معاذ سجدہ غیر اللہ کیلئے زیبا نہیں ہے ثابت ہوا کہ انسان کا انسان کو سجدہ کرنا سابقہ شریعتوں میں بھی حرام تھا اس کی حرمت شریعت محمدی سے مخصوص نہیں ہے۔

(۲) انسؓ کہتے ہیں کہ "ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے کوئی اپنے بھائی یا دوست سے ملے تو کیا جھکے اس کیلئے۔ فرمایا نہیں۔ پھر گلے لگائے اس کو اور چومے اس کو۔ فرمایا نہیں۔ پھر پوچھا کیا پکڑے ایک ہاتھ اس کا اور مصافحہ کرے۔ فرمایا ہاں"۔ ایک طرف تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کے وقت جھکنے کی یہ ممانعت ہے اور دوسری طرف موجودہ مسلمانوں کی اپنے بچوں کو یہ ہدایت ہے کہ "بیٹا جب کسی بڑے سے ملو تو خوب جھک کر سلام کیا کرو"

(۳) ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ "قیام کیا ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے تو آپ نے فرمایا کہ تمہارا قیام عجمیوں کے قیام کی شکل ہے کہ ان کے بعض ان کے بعض کی کرتے ہیں" (ابوداؤد) عجمیوں کا تعظیمی قیام یہ تھا اور آج بھی یہی ہے کہ ان میں کچھ لوگ تعظیم کرنے کے لئے اور کچھ لوگ تعظیم کئے جانے کیلئے تھے۔ ان کے چھوٹے ان کے بڑوں کی تعظیم کیلئے ہر صورت قیام کرتے تھے اور ایسی کوئی صورت نہیں تھی کہ بڑے بھی چھوٹوں کے لئے قیام کرتے۔ اس یکطرفہ قیام میں تعظیم ہی تعظیم تھی کوئی یا اخلاقی مقصد نہیں تھا ایسے ہی قیام کی نسبت امیر معاویہؓ سے مروی ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کو یہ پسند ہو کہ لوگ اس کیلئے قیام کریں وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے" (ترمذی و ابوداؤد) اس ارشاد کے بعد صحابہ کا طرز عمل انسؓ یہ بتاتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی شخص صحابہ کو محبوب نہ تھا مگر وہ آپ کو دیکھ کر قیام نہیں کرتے تھے کیونکہ جانتے تھے آپ اس کو ناپسند کرتے ہیں" (شمائل ترمذی)

مگر یکطرفہ تعظیمی قیام کے خلاف قیام کی ایک قسم دوطرفہ معاشرتی قیام ہے جو حسن معاشرت کی جان اور شائستگی کی روح ہے وہ غیر اللہ کے لئے نہ صرف جائز بلکہ سنت نبوی ہے اس قیام کی چار صورتیں حسب ذیل ہیں۔

ایک صورت قیام استقبال ہے عائشہؓ سے مروی ہے کہ "جب فاطمہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتی تھیں تو آپ فاطمہ کیلئے قیام کرتے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیتے اور جب آپ فاطمہ کے پاس جاتے تو فاطمہؓ آپ کے لئے قیام کرتیں، دست مبارک کو بوسہ دیتیں اور آپ کو اپنی جگہ بٹھاتیں" اس حدیث سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ زید بکر سے ملنے آئے تو بکر نہ صرف کھڑا ہو بلکہ بڑھ کر زید کو لے اور لا کر مناسب جگہ پر بٹھائے اور جب بکر زید سے ملنے آئے تو زید بھی ایسا ہی کرے۔ یہ ثابت نہیں کہ کسی کے نہ آنے ہوئے کو آیا ہوا فرض کر کے اس کے لئے قیام کیا جائے۔ واضح رہے کہ فاطمہؓ کی دست بوسی والدین اور بزرگان خاندان کی دست بوسی کے لئے تو دلیل ہو مگر کم عمر اور ہم عمر رشتہ داروں اور دوستوں کی باہمی دست بوسی اور دست بازی کے لئے نہیں ہو سکتی۔

دوسری صورت قیام خیر باد ہے جس کو قیام استقبال پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔

تیسری صورت قیام برخاست مجلس ہے ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ بیٹھے ہوتے پھر جب آپ اٹھتے تو ہم لوگ بھی کھڑے ہو جاتے اور آپ کو دیکھتے رہتے تھے یہاں تک کہ آپ اپنی بیویوں کے گھروں میں داخل ہو جاتے۔

چوتھی صورت قیام امداد ہے چنانچہ سعدؓ بن معاذ جب بحالت بیماری مسجد نبوی میں آئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے فرمایا کہ "اٹھو اپنے سردار اس حدیث کی رو سے جب کوئی معذور بیمار یا کمزور یا بوڑھا آئے تو حاضرین میں سے حسب ضرورت بعض لوگ نہ صرف کھڑے ہوں بلکہ اس کو سہارا دیکر مناسب جگہ پر بٹھا

اس تفصیل سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے یا کسی دوسرے کے لئے یکطرفہ تعظیمی قیام کی نہ صرف مخالفت کی ہے بلکہ ایسے قیام پر جہنم کی وعید بھی فرمائی ہے، یہ وعید تو اس حالت میں ہے جب کسی زندہ کی موجودگی میں اس کے لئے قیام کیا جائے مگر کسی وفات یافتہ کو زندہ اور ہر مقام قیام میں حاضر و ناظر مان کر قیام کرنا تو شرک جلی ہے اللہ تعالیٰ ایسے عقیدہ اور عمل سے مسلمانوں کو محفوظ رکھے۔

بارہواں ادب طرزِ نشست

تمام غیر اسلامی معاشرتوں میں مجلسِ خاص اور جلسۂ عام میں ہر بڑے اور ہر رشتہ اور ہر مرتبہ کے بڑوں کے لئے طرزِ نشست بھی مخصوص اور یکطرفہ رہا ہے مگر اسلام نے اس معاملہ میں بھی دو طرفہ طریقے تعلیم کئے ہیں حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست و برخاست سوائے ذکر کے نہیں ہوتی تھی جب آپ کسی قوم کی مجلس میں جاتے تو جہاں جگہ ملتی وہیں بیٹھ جاتے اور دوسروں کو بھی اسی کا حکم دیتے تھے اور اپنے گرد و پیش، بیٹھنے والوں کا حق ادا کرتے تھے" (شمائل ترمذی صفحہ ۱۸)

اس روایت میں ذکر سے مراد ذکر الٰہی ہے جس کے معنی صرف زبان سے اللہ اللہ کہنا نہیں ہے بلکہ احکام الٰہی پر خود عمل کرنا اور دوسروں سے عمل کرانا بھی ذکرِ الٰہی ہے چنانچہ اس روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر الٰہی کی جو تین صورتیں بیان کی گئی ہیں وہ تینوں مجالس میں نشست کے طریقے ہیں۔

(۱) یہ کہ "جو لوگ کسی مجلس یا جلسہ میں آئیں وہ بیٹھ ضرور جائیں کھڑے نہ رہیں" کیونکہ مجلس اور جلسہ کے معنی محض میٹنگ کے نہیں ہیں بلکہ ایسے اجتماع کے ہیں جہاں بیٹھا جائے ظاہر ہے کہ جلسہ میں شریک ہونا اور نہ بیٹھنا مقصدِ جلسہ سے ہمدردی نہ رکھنا، شرکاءِ جلسہ پر برتری جتانے اور جلسہ کو پراگندہ کرنے کے ہم معنی ہے البتہ شرکت مقصدی جلسوں کے لئے زیبا نہیں ہے صرف تفریحی جلسوں کیلئے مناسب ہے (بعض جلسوں میں فرش کے انتظام سے حاضرین بڑھ جاتے ان میں کھڑا رہنا نامناسب نہیں ہے)

(۲) یہ کہ "جو لوگ کسی مجلس یا جلسہ میں پہلے آئیں وہ آگے اور بعد میں آئیں وہ پیچھے جہاں جگہ پائیں بیٹھ جائیں خواہ وہ عمر، رشتہ اور مرتبہ میں بڑے ہوں یا چھوٹے" یعنی بعد میں آنے والے آگے بیٹھنے کی کوشش نہ کریں تاکہ مجلس یا جلسہ میں ابتری اور بدمزگی نہ پیدا ہو۔

(۳) ہر شریک مجلس دیگر شرکاءِ مجلس کا حق ادا کرے۔ یہ حق ادا کرنے کی صورت یہ ہے کہ کوئی شریک مجلس مجلس یا جلسہ کے کسی منظر کو دیکھنے یا کسی بات کو سننے کے لئے ایسی صورت اختیار نہ کرے جو دوسروں کے دیکھنے یا سننے میں مانع ہو جو لوگ جلسوں میں کھڑے ہو ہو کر یا اچک اچک کر دیکھتے ہیں۔ وہ دوسروں کی حق تلفی کرتے ہیں۔

تیرہواں ادب طرزِ تخاطب

مجالس نبوی میں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں سے خطاب کرتے تھے اسی طرح دوسرے آپ سے خطاب کرتے تھے اسی لئے روایات میں آتا ہے کہ "نووارد بغیر بتائے نہیں جان سکتا تھا کہ مجلس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون سے ہیں" اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست کے لئے بلند مقام یا کوئی تعظیمی طریقہ مخصوص ہوتا اور صحابہ آپ کی آمد پر کھڑے ہو جایا کرتے یا دست بستہ خطاب کیا کرتے یا دست بوسی کیا کرتے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ نووارد بغیر بتائے نہ جان سکتا کہ آپ کون سے ہیں اور کہاں ہیں۔

چودہواں ادب۔ الفاظِ تخاطب

دنیا قدیم و جدید کے ہر مذہب، ہر تمدن اور معاشرت میں بڑوں سے خطاب کیلئے تقدس مآب (ہز ہولی نس) فضیلت مآب (ریورنڈ) جلالت مآب (ہز مجسٹی) عزت مآب (ہز آنر یا آنریبل) وغیرہ الفاظ کا استعمال ضروری تھا اور آج بھی ضروری ہے، مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم دس لاکھ مربع میل مملکت کے سربراہ تھے جس میں موجودہ سعودی عرب، شرق اردن، یمن، حضرموت، مسقط، عمان، الحساء، بحرین شامل تھے، خطاب کیلئے رسول اللہ اور نبی اللہ کے سوا اور آپ کے خلفاء راشدین سے (جو ترکستان سے شمالی افریقہ تک دور اعظمی مملکت کے سربراہ تھے) خطاب کے لئے خلیفہ اور امیر المومنین کے سوا کوئی اور لفظ استعمال نہیں کیا جاتا تھا اور یہ الفاظ عہدہ کے نام تھے، اعزازی القاب و خطابات نہیں تھے اسی لئے کتب حدیث میں صحابہ اور تابعین اور ائمہ حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ان سادہ اور بے تکلف الفاظ میں کریں کہ "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" "رسول اللہ صلی اللہ (علیہ وسلم) نے فرمایا" اور "عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" "رسول اللہ سے مروی ہے" برخلاف اس کے شمائل ترمذی کے اردو ترجمہ میں "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کا ترجمہ "حضور اقدس نے فرمایا" اور "عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کا ترجمہ

" حضور اقدس سے مروی ہے کیا گیا ہے۔ ان تراجم میں تصرفات ہوئے ہیں ایک " رسول اللہ " کی تخفیف حد تک " حضور اقدس " کا اضافہ ان تصرفات غیر شعوری طور پر الفاظ تخاطب میں بالکل عباری شان پیدا ہوگئی ہے جس کے بعد رفتہ رفتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تمام شاہانہ القاب جو دیئے گئے مثلاً سلطان مدینہ، شاہ عرب، شہنشاہ کونین اور شاہانہ لوازم مثلاً دربار رسالت، کاشانہ نبوت، تخت و تاج نبوت جن سے اہل بیت، صحابہ، تابعین اور ائمہ و فقہ کی زبان اور کان قطعاً نا آشنا تھے، غرض اسلامی معاشرت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے شاہانہ القاب اوصاف کے لوازم کا استعمال جن کو قرون اولیٰ میں نہیں کیا گیا مسلم معاشرت نے ان کو ادب قرار دیا ہے جس سے آداب رسالت آداب شاہی کی سطح تک آ گئے ہیں۔

پندرہواں ادب۔ طرز کلام

حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام تم لوگوں کی طرح لگاتار اور بے امتیاز نہیں تھا بلکہ ہر مضمون سے ممتاز ہوتا تھا کہ اہل مجلس یاد کر سکیں " (شمائل ترمذی صفحہ) یعنی مجمع زیادہ ہوتا تو سننا کیلئے اور مضمون مشکل ہوتا تو سمجھانے کیلئے تینوں جانب متوجہ ہو کر کلام کو تین مرتبہ دوہرا لیتے تھے۔

ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بوجہ حیا کے کسی کے چہرہ پہ نگاہ نہیں جماتے تھے یعنی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ دیکھتے تھے (فائدہ مترجم شمائل صفحہ ۱۹۳) حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اشارہ کرتے تو پورے ہاتھ سے اشارہ کرتے تھے " (شمائل ترمذی) یعنی آپ ایک انگلی سے اشارہ نہیں کرتے تھے یہ دونوں وہی چیزیں ہیں جن کو اہل مغرب " گیزنگ " اور " پوائنٹنگ " کہتے ہیں اور معیوب سمجھتے ہیں۔ عجیب کا مقام ہے کہ معاشرت کے یہ دونوں پہلو آج غیر مسلم معاشرت میں موجود اور تمام نہاد مسلم معاشرت میں مفقود ہیں۔

سولہواں ادب۔ مجلس نبوی

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس علم و حیا اور صبر و امانت کی مجلس تھی اس مجلس میں نہ شور ہوتا تھا، نہ کوئی بے حرمت کیا جاتا تھا نہ کسی کی لغزش کو شہرت دی جاتی تھی، اس مجلس میں سب برابر تھے، ایک کو دوسرے پر تقویٰ سے فضیلت دی جاتی تھی، ہر شخص دوسروں سے بہ تواضع پیش آتا تھا، بڑوں کی توقیر اور چھوٹوں پر رحمت کی جاتی تھی (شمائل ترمذی)

تو سے سولہ تک آٹھوں آداب اگرچہ معاشرتی مساوات سے متعلق ہیں مگر ان میں جمہوریت کیلئے سیاسی مساوات بھی موجود ہے جس کی اہمیت کو اگر نظر انداز کر جاتے تو صحیح اور صالح جمہوریت پیدا نہیں ہو سکتی اس سے ظاہر ہے کہ اسلام نے مساوات کے ذریعہ سے معاشرت ہی میں جمہوریت کی تخم ریزی کر دی ہے تاکہ یہ تک پہنچتے پہنچتے جمہوریت اچھی طرح برگ و بار لے آتے۔

سترہواں ادب۔ احترام خلوت

اب تک جتنے آداب بیان کئے گئے ہیں وہ انسان کے اپنے گھر کے اندر کی زندگی یا گھر سے باہر معاشرے کے اندر کی زندگی سے متعلق ہیں۔ اب وہ آداب بیان کئے جاتے ہیں جو مہذب اور شائستہ انسانوں کو ایک دوسرے کے گھر آنے جانے میں ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

انسان خواہ کتنا ہی جلوت پسند ہو مگر وہ اپنی زندگی کو پرسکون بنانے کے لئے اپنے وقت کا کچھ حصہ خلوت میں بسر کرنا پسند کرتا ہے اور اس کے لئے ایسی جگہ ضرورت مند ہے جہاں دوسروں کی مداخلت سے محفوظ ہے اس لئے تمام غیر اسلامی معاشروں سے زیادہ اسلامی معاشرت میں انسانی خلوت کا احترام کیا گیا ہے

تفسیر الباری، اردو ترجمہ صحیح البخاری کتاب الدیات (پارہ ۲۸ صفحہ) میں تین روایتیں ہیں جن کا مشترک مفہوم یہ ہے کہ حکم بن ابی العاص (دادا مروان) نے " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ کے روزن سے آپ کے گھر میں جھانکا۔ اس وقت آپ کے ہاتھ میں ایک لوہے کی کنگھی تھی جس سے سر کھجا کرتے تھے۔ جب آپ نے جھانکنے والے کو دیکھا تو فرمایا کہ اگر میں جانتا کہ تو مجھے جھانک رہا ہے تو میں یہ کنگھی تیری آنکھ میں مار دیتا۔ اجازت لینے کا حکم اسی لئے ہے کہ نظر نہ پڑے۔ اگر کوئی شخص تیری اجازت کے بغیر تیرے گھر میں جھانکے پھر تو ایک کنکری پھینک کر اس پر مارے جس سے اس کی آنکھ پھوٹ جائے تو تجھ پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔ " (یعنی نہ قصاص لازم نہ آئیگا نہ دیت۔ یہ صراحت صحیح نسائی میں ہے)

اٹھارہواں ادب۔ پردہ افگنی

۔ اسلامی معاشرہ میں خلوت کے احترام کو عملی شکل دینے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خلوت گاہوں کے دروازوں پر

ہمیشہ پردہ لٹکایا جاتا تھا۔ ان حضرت کا ہوں کو قرآن میں بیوت النبی اور حدیث میں حجرات نبوی کہا گیا ہے ۔ یہ بیوت مجموعی طور پر بیوت النبی اور انفرادی طور پر کبھی بیت عائشہ اور بیت حفصہ اور کبھی حجرہ عائشہ اور حجرہ حفصہ کہلاتے تھے۔ ان بیوت میں بسنے والے ایک دوسرے کے اہلبیت تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلبیت ازواج مطہرات تھیں اور ازواج کے اہلبیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اس کو اردو میں یوں کہیں گے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ازواج کے گھر والے تھے اور ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گھر والیاں تھیں۔

دس لاکھ مربع میل مملکت کے سربراہ کے یہ بیوت قلعہ یا محل نہیں تھے بلکہ وہ بن گھڑے پتھروں اور گارے سے بنائے گئے تھے اور کھجور کے تنوں، شاخوں اور پتوں سے پاٹے گئے تھے ان کو بیوت کے بجائے جھونپڑیاں اور جھگیاں کہنا زیادہ صحیح ہے۔ بیشتر انصار اور تمام تر مہاجرین کے بیوت بھی ایسے ہی تھے یعنی حکمران کے گھر محکوموں کی اکثریت کے گھروں سے مختلف نہیں تھے۔ یہ اسلامی معاشرت کے ساتھ اسلامی معیشت میں بھی جمہوریت کا آغاز تھا اور ظاہر ہے کہ جب تک معاشرت اور معیشت جمہوری کا نہ ہو سیاست جمہوری نہیں ہو سکتی۔

اسلامی معاشرت کے چودہ سو سالہ اثرات کی بدولت آج کل دنیا میں اور خاص کر مغرب میں گھر کے دروازوں پر پردہ لٹکانے کا عام رواج ہے مگر اسلامی اور مغربی پردہ لٹکانے اپنے مقصد اور اپنے نتیجہ کے اعتبار سے دو مختلف چیزیں ہیں۔ اسلام میں پردہ لٹکانے کا مقصد ستر اور عورت کی حفاظت ہے اور مغرب میں پردہ لٹکانے ایک بے مقصد رسم اور فیشن ہے اس لئے کہ مغرب میں وہ لوگ دروازوں پر پردے ڈالتے ہیں جو ستر کھول کر بازاروں میں پھرتے ہیں۔ اہل مغرب اور مسلمانوں میں پردہ کے استعمال کی صورتیں بھی مختلف ہیں اہل مغرب کی آمدورفت میں پردہ اپنی جگہ سے اٹھایا نہیں جاتا ہٹایا جاتا ہے بلکہ اچھال دیا جاتا ہے اس لئے پردہ کے اندر کا منظر باہر والوں پر ظاہر ہو جاتا ہے برخلاف اس کے مسلمانوں کی آمدورفت میں پردہ اپنی جگہ سے ہٹایا نہیں جاتا ہے اس لئے پردہ کے اندر کا منظر باہر والوں پر ظاہر نہیں ہوتا اس کی مثال چودہ سو سال میں ایک فی لاکھ بھی نہیں ملتی۔

انیسواں ادب۔ اجازت طلبی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب نبوی کے بیوت میں خوابگاہیں، طعام گاہیں اور نشست گاہیں علیحدہ علیحدہ نہیں تھیں اس خلا کو چند شائستہ آداب معاشرت سے پُر کیا گیا تھا اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ اسلام میں تمدن کی برتری کا معیار مکانوں کی شان و شوکت اور سامانوں کی خوشنمائی و بیش قیمتی کے بجائے مکینوں کے آداب معاشرت کی شائستگی تھی یعنی ساری معاشرت جمہوری بنیاد دی گئی تھی۔ اس سلسلہ میں اجازت طلبی کے آداب کو سمجھنے کے لئے اسلامی معاشرت میں خانہ اور خاندان یا گھر اور گھرانہ کے فرق کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ اسلام کا خانگی نظام مشترک خاندانی نظام (جوائنٹ فیملی سسٹم) نہیں ہے بلکہ یک خانگی نظام (سنگل فیملی سسٹم) ہے اس نظام میں نکاح کے بعد آدمی کا خانہ اس کے باپ، ماں، بھائی بھاوج، چچا چچی، پھوپھا پھوپھی، ماموں ممانی، خالو خالہ کے خانوں سے علیحدہ اور مستقل ہوتا ہے اور ایسے خانوں کے مجموعہ کو خاندان کہتے ہیں۔ ہر خانہ سے تعلق رکھنے والوں کو ممبران خانہ اور ہر خاندان سے تعلق رکھنے والوں کو ممبران خاندان کہتے ہیں مثلاً:-

(۱) زید کے ممبران خانہ میں اصلاً خود زید اور اس کی بیوی اور ساتھ ہی میاں بیوی کی نابالغ غیر منکوحہ اولاد اور ایسے خادم داخل ہیں جو کم عمری یا طویل العمری کی وجہ سے صنفی کشش نہ رکھتے ہوں۔

(۲) زید کے ممبران خاندان میں اس کے اور اس کی بیوی کے ماں باپ، منکوحہ اولاد، منکوحہ بھائی بہن اور دوسرے مذکورہ بالا رشتہ دار داخل ہیں یہ زید کے ممبران خانہ نہیں ہیں۔

ان مبادیات کو سمجھ لینے کے بعد اسلامی معاشرہ کے افراد ایک دوسرے کے مسکونہ اور غیر مسکونہ گھروں میں باجازت اور بلا اجازت داخل ہونے کے لئے اسلامی آداب معاشرت کا مطالعہ فرمائیے ارشاد ہے کہ:-

یا ایہا الذین آمنوا لا تدخلوا بیوتاً غیر بیوتکم حتی تستانسوا وتسلموا علی اہلہا ذلکم خیر لکم لعلکم تذکرون ۵

اے ایمان والو اپنے گھروں کے سوا غیر گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک گھر والوں کی رضامندی لے لو اور ان پہ سلام نہ بھیج لو یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اسے

فان لم تجدوا فیہا احداً فلا تدخلوھا حتی یؤذن لکم ۚ وان قیل لکم ارجعوا فارجعوا ھو ازکیٰ لکم ۚ واللہ بما تعملون علیم ○ (۲۴ - ۲۸)

یاد رکھو پھر اگر گھر میں کسی کو نہ پاؤ تو داخل نہ ہو جب تک تم کو اجازت نہ ملے اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس جاؤ تو واپس چلے جاؤ یہ تمہارے لئے پاکیزہ تر ہے اور اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔

ان آیات میں حسب ذیل امور قابل لحاظ ہیں :۔

(۱) حکم ہے کہ اہل ایمان اپنے گھروں کے سوا غیر گھروں میں (یعنی ممبران خاندان کے گھروں میں) بغیر اجازت کے داخل نہ ہوا کریں۔ اس حکم کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ممبران خاندان کے گھروں میں اور آپ کے ممبران خاندان آپ کے گھروں میں بغیر اجازت کے داخل نہ ہوتے تھے یہاں تک کہ آپ کے چچا (عباسؓ) اور آپ کے چچا زاد بھائی اور داماد (علیؓ) تک آپ کے مرض وفات جیسے جذباتی مواقع پر بھی جب آپ کی عیادت کو جاتے تو اجازت لے کر داخل ہوتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے پوچھا "کیا میں اپنی ماں کے پاس جانے کے لئے بھی اجازت لوں" فرمایا "کیا تو پسند کرتا ہے کہ اپنی ماں کو برہنہ دیکھے" (اگر کسی گھر میں آگ لگ جائے یا چور گھس آئے تو ایسی صورتیں اجازت سے مستثنیٰ ہیں)

(۲) حکم ہے کہ اہل ایمان سلام کے ذریعہ سے داخلہ کی اجازت لیا کریں۔ اس حکم کے اتباع میں حضرت عمرؓ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں جاتے تو کہا کرتے "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم السلام علیکم کیا عمرؓ داخل ہو سکتا ہے" یہ اجازت لینے کا جمہوری طریقہ ہے اس لئے کہ معاشرہ کے نیچے سے اوپر تک ہر گھر میں قابل عمل ہے اگرچہ خادم کے ذریعہ سے اجازت لینا بھی جائز ہے مگر یہ اجازت لینے کا غیر جمہوری طریقہ ہے اس لئے کہ ہر گھر میں قابل عمل نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اس کا حکم نہیں دیا گیا حدیث میں اجازت دی گئی ہے۔

(۳) حکم ہے کہ اجازت مانگنے پر اگر کوئی جواب نہ ملے تو صاحب خانہ کی عدم موجودگی میں گھر میں داخل نہ ہو (لیکن اگر صاحب خانہ نے اجازت دے رکھی ہو کہ اگر میں موجود نہ ہوں تو آپ میرے کمرہ میں بیٹھ جایئے گا یا وہ کسی دوسری جگہ ہو اور آپ کی اطلاع ملنے پر کہلا بھیجے کہ آپ تشریف رکھیئے میں ابھی آتا ہوں تو ایسی صورتیں اجازت سے مستثنیٰ ہیں۔

(۴) حکم ہے کہ اجازت مانگنے پر اگر یہ جواب ملے کہ واپس جاؤ تو واپس ہو جایا کرو۔ اس حکم کے اتباع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سعد بن عبادہ کے ہاں گئے اور السلام علیکم کہہ کر اجازت طلب کی جب تیسری مرتبہ بھی جواب نہ ملا تو آپ واپس ہو گئے۔

غرض احترام خلوت، دروازوں پر دو انگلی اور گھروں میں داخلہ کے لئے اجازت طلبی کے آداب سے اندازہ ہوتا ہے کہ عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ میں اسلامی معاشرہ شائستگی کے کس بلند درجہ پر پہنچا ہوا تھا مگر آج مسلمان آداب کو بھول چکے ہیں اور اہل مغرب کے طریقہ پر عامل ہیں اگرچہ ان کا عمل دینی بے مقصدی اور لاشعوری ہی ہی اور مسلم مقلدین مغرب کا یہ حال ہے کہ وہ دفاتر اور دوسرے سرکاری مواقع پر تو ضرور اجازت لیتے ہیں کہ اگر نہ لیں تو نکال دیئے جائیں لیکن غیر سرکاری اور خصوصاً خانگی مواقع پر اجازت لینے کی کوئی پابندی نہیں کرتے اور اگر کوئی دوسرا پابندی کرانا چاہے تو خفا ناراض ہوتے ہیں کہ بسا اوقات تعلقات تک خراب ہو جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا احکام مسکونہ مکانات سے متعلق تھے غیر مسکونہ مکانات یعنی دوکانوں، گوداموں، کارخانوں، مسافر خانوں، مہمان خانوں اور ہوٹلوں وغیرہ کے متعلق حکم ہے کہ :۔

لیس علیکم جناح ان تدخلوا بیوتاً غیر مسکونۃ فیہا متاع لکم ۚ واللہ یعلم ما تبدون وما تکتمون ○ (۲۴ - ۲۹)

تم پر کوئی گناہ نہیں ہے (بلا اجازت) داخل ہونے میں ان غیر مسکونہ مکانوں میں جہاں تمہارے اموال ہوں۔ اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے اور چھپاتے ہو

بیسواں ادب ۔ حیاداری

جب ممبران خاندان اجازت لے کر گھر میں داخل ہوں تو ان کو اور گھر کی عورتوں کو حکم ہے کہ :۔

قل للمومنین یغضوا من ابصارھم

ایمان والوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نظریں بچائے رہیں اور اپنی شرمگاہوں

ابصارھم ویحفظوا فروجھم ط ذلک ازکیٰ لھم ط
ان اللہ خبیر بما یصنعون o وقل للمؤمنٰت یغضضن من
ابصارھن ویحفظن فروجھن ولا یبدین زینتھن الا
ما ظھر منھا ولیضربن بخمرھن علیٰ جیوبھن ولا یبدین
زینتھن الا لبعولتھن او اٰبائھن او اٰباء بعولتھن او ابناء
ھن او ابناء بعولتھن او اخوانھن او بنی اخوانھن او بنی اخوا
تھن او نسائھن او ما ملکت ایمانھن او التابعین غیر اولی
الاربة من الرجال او الطفل الذین لم یظھروا علیٰ
عورٰت النسآء ولا یضربن بارجلھن لیعلم ما یخفین من
زینتھن ط وتوبوا الی اللہ جمیعاً ایہ المؤمنون لعلکم
تفلحون o (سورۂ نور ۲۴ - ۳۰ و ۳۱)

کی حفاظت کریں یہ ان کے لئے پاکیزہ تر ہے جو وہ کرتے ہیں اللہ اس سے
باخبر ہے ۔ اور ایمان والیوں سے کہہ دو کہ وہ بھی اپنی نظریں بچائے رہیں
اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت ظاہر ہونے کے سوا کچھ ظاہر
نہ کریں اور اپنی اوڑھنیوں کے دوپٹے اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں اور
اپنی زینت (ظاہرہ) کسی پر ظاہر نہ کریں سوائے اپنے شوہروں کے بیٹوں
کے یا اپنے بھائیوں کے یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں کے یا اپنی بہنوں کے بیٹوں
کے یا اپنے میل جول کی عورتوں کے یا اپنے مملوکوں کے یا ایسے خادموں
کے جو عورتوں کی ضرورت نہ رکھتے ہوں یا ایسے ان بچوں کے جو عورتوں کے
رازوں سے ناآشنا ہوں اور اے ایمان والیاں! اس طرح نہ چلیں کہ ان کی
مخفی زینت (یعنی چال کی لچک اور اٹھلاہٹ) ظاہر ہو جائے اور ایمان والو
تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو تو توقع ہے کہ تم فلاح پا جاؤ گے ۔

یعنی خانہ کے مرد اور عورتیں ایک جگہ جمع ہوں تو دونوں ایک دوسرے سے "نظریں بچائیں" (یعنی ایک دوسرے کو گھور گھور کر نگاہیں لڑا کر اور آنکھوں
میں آنکھیں ڈال کر نہ دیکھیں کیونکہ اس طرح مرد کا عورت کو اور عورت کا مرد کو دیکھنا ہی نہیں بلکہ مرد کا مرد کو اور عورت کا عورت کو دیکھنا بھی ...
ناشائستگی کی علامت ہے) اور اپنی "شرمگاہوں کی حفاظت کریں" (یعنی حدود ستر کی نگہداشت کریں اور کوئی ایسی بات یا ایسی حرکت نہ کریں جو شہوات
کی محرک ہو) اور چونکہ ایسے تمام حالات میں پیش نظری، پیش دستی اور پیش قدمی ہمیشہ مرد کی جانب سے ہوتی ہے اگر عورت بے جا رسی جواب دیتی ہے وہ
بھی اس وقت جب اس کی اصل فطرت کو مردوں نے غلط نظروں، مخلوط معاشرت اور مشترک تعلیم سے مسخ کر دیا ہو اس لئے مردوں کی ناشائستگی سے بچنے
کے لئے عورتوں کو مزید یہ ہدایت بھی دی گئی ہے کہ "وہ اپنی زینت ظاہرہ (یعنی چہرہ اور کلائی تک ہاتھ اور چہرہ کا غازہ اور ہاتھوں کی مہندی اور چہرہ
اور ہاتھ کے زیورات) کے سوا کوئی مخفی زینت یعنی آرائش کی علامت، نظر کی لگاوٹ، سینہ کا ابھار، کمر کی لچک اور چال کی اٹھلاہٹ ظاہر نہ کریں
اور اپنی اوڑھنیوں کے دوپٹے اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں اور اپنی زینت (ظاہرہ) کسی پر ظاہر نہ کریں سوائے ان لوگوں کے جو آیت میں مذکور ہیں" اس تفصیل
کے بعد شبہ باقی نہیں رہتا کہ چہرہ اور کلائی کو آیۂ بالا میں مذکور مردوں کے سوا دوسروں پر بھی ظاہر کیا جا سکتا ہے ۔

آیت ۲۷ کے اس حکم سے کہ - لا تدخلوا بیوتاً غیر بیوتکم - "اپنے گھروں کے سوا غیر گھروں میں داخل نہ ہوا کرو" زوجین مستثنیٰ ہیں اس لئے کہ وہ اصلاً
ممبران خانہ اور ایک دوسرے کے اہلبیت ہیں ان کا گھر ایک دوسرے کے لئے غیر گھر نہیں ہے پس ان کو بھی گھر میں یا خوابگاہ میں آنے کیلئے ایک دوسرے
سے اجازت لینا ضروری نہیں ہے ۔ زوجین کے غلاموں اور نابالغ بچوں کو بھی جو گھر میں رہتے ہیں خوابگاہوں میں آنے کیلئے ہر وقت اجازت لینا
ضروری نہیں ہے بجز ان تین اوقات کے ۔

یا ایھا الذین اٰمنوا لیستاذنکم الذین ملکت ایمانکم
والذین لم یبلغوا الحلم منکم ثلث مرّٰت ط من قبل صلوٰة
الفجر وحین تضعون ثیابکم من الظھیرة ومن بعد صلوٰة
العشاء ط ثلث عورٰت لکم ط لیس علیکم ولا علیھم جناح
بعدھن ط طوّافون علیکم بعضکم علیٰ بعض ط کذٰلک یبین اللہ

اے ایمان والو تمہارے غلام اور تمہارے نابالغ بچے تین اوقات میں اجازت
مانگا کریں نماز فجر سے قبل اور ظہر کو جب تم کپڑے اتار ڈالتے ہو اور نماز
عشاء کے بعد - یہ تین اوقات تمہاری خلوت کے ہیں ان اوقات کے بعد بلا
اجازت آئیں تو نہ تم پر کوئی گناہ ہے اور نہ ان پر تمہیں ایک دوسرے کے
پاس بار بار آنا ہی پڑتا ہے ۔ اس طرح اللہ تمہارے لئے اپنی آیات کی وضاحت

لکم الاٰیات ط واللّٰہ علیم حکیم ۝ واذا بلغ الاطفال منکم الحلم فلیستاذنوا کما استاذن الذین من قبلھم ط کذالک یبین اللّٰہ لکم اٰیتہ ط واللّٰہ علیم حکیم ۝ (سورۃ ۲۴ - ۵۸ و ۵۹)

کرتا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے۔ اور جب تمہارے بچے بالغ ہو جائیں تو اسی طرح اجازت لیا کریں جس طرح ان کے بالغ ان سے پہلے لیتے تھے اس لئے اللہ اپنی آیات تمہارے لئے کھولتا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے۔

ان آیات کے بین السطور میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ زوجین کی خواب گاہ کے علاوہ گھر میں کوئی ایسی جگہ بھی ہونا چاہیئے جہاں زوجین کے علاوہ دوسرے لوگ اوقات سہ گانہ خلوت بسر کر سکیں۔ یہ جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حجروں میں وہ پردہ بنا کرتی تھی جس کا ذکر سورۃ ۳۳ - ۵۳ میں آگے۔ یہ پردہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حجروں کے وسط میں تھا اور حسب ضرورت تان لیا جاتا تھا۔ یہ پردہ اوقات سہ گانہ خلوت میں حجروں کو دو حصوں میں تقسیم حصہ کو زوجین کے لئے خواب گاہ اور بیرونی حصہ کو گھر کے دوسرے لوگوں کے لئے خواب گاہ اور مہمانوں کے لئے طعام گاہ بنا تا تھا۔

آیات کے اس مفہوم کا تقاضہ پورا کرنے کے لئے ہر اسلامی مملکت اپنے ہر شہری کو مکان کے لئے اتنی زمین الاٹ کرنے کی ذمہ دار ہے جس میں ہر کم سے کم معیار معیشت کے مطابق زوجین اور گھر کے دوسرے لوگوں کیلئے جدا جدا دو خوابگاہیں بن سکیں۔ اس لئے کسی غیر مستطیع کو اور اس سے کسی مستطیع کو مکان کے لئے زمین الاٹ کرنا غیر اسلامی ہے مستطیع لوگ اگر کشادہ مکانات بنانا چاہیں تو اپنے لئے زمین خرید سکتے ہیں مگر ان کے حصہ زیادہ سرکاری زمین ان کو باقیمت بھی اس وقت مل سکے گی جب غیر مستطیع لوگوں کی ضرورت پوری ہو چکی ہو۔

خاندانی مردوں اور عورتوں کی یکجائی کی صورت میں جو عورتیں اپنی اوڑھنیاں اتار سکتی ہیں اور جس شرط پر اتار سکتی ہیں اس کی تصریح فرمائی گئی ہے کہ :-

والقواعد من النساء التی لا یرجون نکاحاً فلیس علیھن جناح ان یضعن ثیابھن غیر متبرجٰت بزینۃ ط وان یستعففن خیر لھن ط واللّٰہ سمیع علیم ۝ (سورۃ ۲۴ - ۶۰)

اور بوڑھیاں جو نکاح کی امیدوار نہ ہوں اگر اپنی اوڑھنیاں اتار دیں کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں اور وہ بھی نہ تو ان کے لئے بہتر ہے اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

یعنی خاندانی مردوں اور عورتوں کی یکجائی کی صورت میں بڑی بوڑھیوں کی حد تک اوڑھنیاں اتار دینے اور گریبان کھول دینے سے کوئی معا پیدا نہیں ہوتی مگر بوڑھیوں کے گریبان کھولنے کے بعد جوان عورتوں اور لڑکیوں کا گریبان ڈھانکنا ناممکن ہے اس لئے پہلے خاندان اور پھر معاشر کے لئے بہتر یہی ہے کہ بوڑھیاں بھی خاندانی مردوں کے سامنے اوڑھنیاں نہ اتارا کریں۔

اس عنوان کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے گھر کے کام کاج کے لئے جوان مردوں کے بجائے نابالغ بچوں اور فارغ البلوغ بوڑھو خادم کے رکھنا بہتر سمجھا گیا ہے اور تجزیہ ذیل سے ثابت ہوگا کہ بوڑھوں اور بچوں کو بطور خادم کے رکھنا قومی معاشرت کی حفاظت اور پاکیزگی کے سا قومی معیشت کی استواری کے لئے بھی ضروری ہے :-

(۱) گھروں میں واقع ہونے والی چوریوں، ڈکیتیوں اور وارداتِ قتل میں سے تمام تر اور گھر لٹنا اور اغوا کے واقعات میں سے بیشتر جوان مرد کے ہاتھوں سے یا ان کی امداد سے یا ان کی مخبر رسانی سے واقع ہوتے ہیں اس لئے گھریلو کاموں کے لئے جوان مردوں کو ملازم رکھنے والے خود اپنی جان پر ظلم کرتے ہیں۔

(۲) جوان مردوں کو گھریلو سروس دا سلف، روٹی ہنڈیا اور بچے کھلانے کیلئے رکھنے والے :-

(الف) ایک طرف قومی دفاع اور قومی حرفت کے تمام محنت طلب کاموں کو نقصان پہنچا کر قوم پر ظلم کرتے ہیں کیونکہ لاکھوں قومی کام کرنے والے گھ میں لگ جاتے ہیں۔

(ب) دوسری طرف لاکھوں بوڑھوں اور بچوں کو محنت طلب کام کرنے پر مجبور کر کے ان پر ظلم کرتے ہیں کیونکہ جب جوانوں سے ہلکا کام لیا جانے لگتا ہے

اور بچے مجامع کی کام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اکیسواں ادب۔ پردہ داری

مندرجہ بالا احکام ممبران خاندان کے خاندانی گھروں میں داخلہ سے متعلق ہیں غیر ممبران خاندان کے غیر خاندانی گھروں میں داخلے کے لئے حسب ذیل احکام ہیں جو معاشرہ کے ہر طبقہ کے مکانات میں قابل عمل ہیں:۔

یا ایھا الذین اٰمنوا لا تدخلوا بیوت النبی الا ان یؤذن لکم الیٰ طعام غیر نٰظرین انٰہ ولٰکن اذا دعیتم فادخلوا فاذا طعمتم فانتشروا ولا مستانسین لحدیث ط ان ذٰلکم کان یؤذی النبی فیستحی منکم واللہ لا یستحی من الحق واذا سالتموھن متاعاً فسئلوھن من ورآء حجاب ط ذٰلکم اطھر لقلوبکم وقلوبھن ط (سورۃ ۳۳ - ۵۳)

اے ایمان والو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں کے اندر تم داخل نہ ہوا کرو مگر جب اجازت دی جائے تمہیں کھانا کھانے کے لئے نہ کہ کھانا کی تیاری کے انتظار کے لئے۔ بلایا جائے تو جاؤ اور کھا چکو تو باہر نکل آؤ باتوں میں مشغول نہ ہو جاؤ اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہوتی ہے مگر وہ تم سے شرماتے ہیں اور اللہ نہیں شرماتا ٹھیک بات بتانے سے اور جب عورتوں سے کچھ مانگنا ہو تو پردہ کی اوٹ سے مانگا کرو یہ طریقہ زیادہ پاکیزہ ہے مردوں اور عورتوں کی قلبی طہارت کیلئے۔

اس آیۃ کے احکام یہ ہیں:۔

(۱) غیر ممبران خاندان اگر کھانے پر بلائے جائیں تو وہ اگر گھر کے مردانہ حصہ میں بیٹھیں وہ نہ ہو تو گھر کے سقف صحن زنانہ میں اور وہ بھی نہ ہو تو پیش دروازہ بیٹھیں اور جب کھانا بالکل تیار ہو جائے اور وہ کھانے کیلئے بلائے جائیں تو اندر داخل ہوں اور کھا کر پھر باہر آ جائیں اندر بیٹھ کر کھانا کی تیاری کا انتظار کریں اور کھانے کے بعد عمومی گفتگو نہ کرتے رہیں یہ صورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور آپ کی طرح ہر مختصر مکانات والے کے لئے باعث تکلیف ہے۔

(۲) غیر خاندانی عورتوں سے غیر خاندانی مرد جو کچھ مانگیں پردہ کی اوٹ سے مانگیں یہ حکم اس حالت کا ہے جب گھر کی عورتیں گھر میں ہوں اور غیر خاندانی مرد گھر میں آئیں لیکن اگر گھر کی عورتیں گھر سے باہر جائیں جہاں غیر خاندانی مرد موجود ہوں تو حکم ہے کہ:۔

یا ایھا النبی قل لازواجک وبنٰتک ونسآء المؤمنین یدنین علیھن من جلابیبھن ط

اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہدو کہ وہ (گھر سے باہر) اپنی چادروں کا ایک حصہ اوپر لٹکا لیا کریں۔

اب سوال یہ ہے کہ صنفی قوت کے بے قید استعمال سے انسانی تمدن کو اور کثرت استعمال سے انسانی صحت کو محفوظ رکھنے کے لئے غیر خاندانی مردوں اور عورتوں کے درمیان مذکورہ بالا قرآنی پردہ ضروری ہے یا نہیں اس پر تقریری اور تحریری مباحث کا وہ وقت تھا جب دنیا میں بے پردگی عام نہیں ہوئی تھی اور اس کے نتائج مستقبل کے پردہ میں پوشیدہ تھے مگر اب جبکہ بے پردگی دنیا میں ہوا اور پانی کی طرح عام ہو چکی ہے اور خود بے پردگی کے مغربی موجدوں نے اس کے خطرناک نتائج کے اعداد و شمار دنیا کے سامنے پیش کر دئے ہیں اس وقت بے پردگی کی حمایت میں مشرقی مقلدوں کی تقریریں اور تحریریں منطقی مغالطوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ بے پردگی کے عام رواج سے پہلے نکاح سے گریزاں اور آزاد صنفی تعلق کے لوازم دنیا کے کسی باپردہ معاشرہ میں ایک فی لاکھ بھی نہیں تھے اور آج دنیا کے بے پردہ معاشرہ میں بہ کثرت موجود ہیں۔ بے پردگی کے عام رواج سے پہلے عریانی، فحاشی، صحبت بین المحرمات، منع حمل، اسقاط حمل اور قتل اولاد کو دنیا کے ہر با پردہ معاشرہ میں نفرت انگیز سمجھا جاتا تھا اور آج دنیا کے ہر بے پردہ معاشرہ میں یہ افعال قبیحہ کا بھی کوئی محرک ہونا چاہیئے اگر ان کا محرک بے پردگی کے سوا کچھ اور ہو سکتا ہو تو بتایا جائے ورنہ پردہ کی اخلاقی اور تمدنی ضرورت کو تسلیم کیا جائے۔ بے پردگی کے حامی عموماً کہا کرتے ہیں کہ عریانی اور فحاشی کو تو وہ خود بھی برا سمجھتے ہیں اگر یہ محض سخن سازی نہیں ہے تو بتایا جائے کہ دنیا میں وہ کونسا ایسا بے پردہ معاشرہ ہے جہاں عریانی اور فحاشی عام نہیں ہے اور جس کی تقلید میں وہ بے پردگی اختیار کر لینے کے بعد عریانی اور فحاشی سے بچے رہنے کی توقع کر سکتے ہیں

بہر حال پردہ کے قرآنی حکم کی تعمیل عہد رسالت اور دور خلافت راشدہ میں چادروں کے گھونگھٹ سے کی جاتی تھی اس کے بعد مسلمان اس حکم کی تعمیل برقع اور نقاب سے کرنے لگے جس سے بمقابلہ چادر اور گھونگھٹ کے باہر دیکھنے میں چلنے میں اور ہاتھ سے ضروری اشیاء کے اٹھانے میں نسبتاً سہولت پیدا ہو

گئی اب اگر مزید سہولت مطلوب ہو تو وہ برقع اور نقاب میں مزید ترمیم سے ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے کے لئے:۔

(۱) برقع کے بجائے شلوار یا غرارہ کے اوپر ایسا کوٹ پہننا چاہیئے جو سینہ کے ابھار کو چھپائے اور جس کی نیچائی گھٹنے تک ہو۔

(۲) نقاب کے بجائے چھجہ دار ٹوپی پہننا چاہیئے جس کے داہنے بائیں اور پیچھے تین طرف بیز کپڑے کی جھالر اور آنکھ کی طرف جالی دار یا شفاف کپڑے کی جھالر ہونا چاہیئے اس سے قرآن کے منشا کے مطابق نظریں نیچی رہیں گی، نگاہیں نہ لڑیں گی، خدوخال بھی نمایاں نہ ہوں گے اور چیزوں کو دیکھنے، اٹھانے اور چلنے میں بھی سہولت پیدا ہو جائے گی۔

مولانا گوہر رحمان

طاغوت کیا ہے

تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا خلاصہ یہی رہا ہے کہ خدا کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے اجتناب کرو۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ۔ ہم نے ہر قوم میں رسول یہ پیغام دیکر بھیجا ہے کہ اللہ کی بندگی اور پرستش کرو اور طاغوت (غیر اللہ) کی بندگی اور پرستش سے اجتناب کرو۔

میں اپنے اس مختصر سے مضمون میں "طاغوت" کی حقیقت واضح کرتا ہوں اس لئے کہ میں نے خود کئی دفعہ بعض حضرات سے سنا ہے کہ طاغوت سے مراد اصنام ہیں اور عبادۃ سے مراد صرف پوجا ہے اور وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ کا مطلب صرف یہ ہے کہ "بتوں کی پوجا نہ کرو"

لفظ "طاغوت" طغی یطغی سے مصدر کا صیغہ ہے۔ اس باب سے طُغیان ۔ طغیان اور طغی وغیرہ مصادر بھی آتے ہیں ۔ اور طغیان کا مفہوم ہے حد سے بڑھ جانا ۔ مثلاً کہا جاتا ہے طغی الماء پانی حد سے بڑھ گیا طغی البحر سمندر میں طغیانی آگئی طغی الکافر کافر نے اپنی سرکشی کی حد کر دی۔ اسی معنی میں ناقص واوی سے طُغوان ۔ طغوان اور طغو بھی آتا ہے ۔ مثلاً طغا جاوز القدر والحد فلاں شخص حد سے آگے بڑھ گیا ۔ طغا البحر سمندر میں طغیانی آگئی ۔ طغا السیل اتی بماء کثیر سیلاب کا پانی حد سے بڑھ گیا ۔ اس معنے مصدری کے لحاظ سے طاغوت کے معنی سرکشی اور حد سے بڑھنا ہیں اور سرکشی کرنیوالی چیز یا سرکشی کا سبب بننے والی چیز پر اس لفظ کا اطلاق مبالغۃً ہوگا یعنی وہ چیز جو مجسمہ طغیان ہو۔ لیکن قاضی بیضاویؒ نے اپنی تفسیر میں اس لفظ کو "صفت مشبّہ" کا صیغہ بھی کہا ہے تو اس لحاظ سے مذکورہ چیز پر اس کا اطلاق حقیقتاً ہوگا اور مبالغہ "حمل المصدر علی الذات" کی بنا پر نہ ہوگا بلکہ اس لفظ کی حیثیت صیغہ کی بنا پر ہے اس لئے کہ "فعلوت" کا وزن صیغتی خود مبالغہ اور شدت کے معنے پر دلالت کرتا ہے۔

اس اصلی اور لغوی مفہوم کے اعتبار سے طاغوت ہر وہ چیز ہے جو کسی نظام اور کسی بات سے بغاوت اور سرکشی کرے یا اس بغاوت کا سبب ہو۔ اور وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ کا اصل اور جامع مفہوم یہ ہے کہ ہر اس چیز کی بندگی اور پرستش سے اجتناب کرو جو خدا کے "شرعی نظام" کا باغی ہو یا بغاوت کا سبب۔ اس طاغوت کا اصلی مصداق تو شیطان ہے اس لئے کہ اس کا تو کام ہی خدا کی عبادت سے سرکشی کرنا اور اس سرکشی میں باقی لوگوں کو بھی اپنا ہمنوا بنانا اور اس مہم کو سر کرنے لئے نئی نئی پالیسیاں وضع کرنا اور نئے نئے دام پھیلانا ہے ۔ حافظ ابن کثیر المتوفی ۷۷۴ھ نے حضرت حسانؓ ابن قائد العبسی سے باسناد نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے۔ قال عمرؓ الطاغوت الشیطان[1] طاغوت سے مراد شیطان ہے ۔ لیکن یہ قاعدہ ہے کہ قرآن کریم کا لفظ اپنے اصل کے اعتبار سے جس وسیع اور عام معنی کا حامل ہو اس سے وہی معنے عام مراد لیا جائیگا اور بغیر کسی قطعی اور یقینی دلیل کے اس کے عموم کو زائل نہیں کیا جائیگا اور سلفؒ سے اس کی تفسیر میں جو مختلف چیز بیان کی گئی ہوں انہیں صرف مثال بیان کرنے پر محمول کیا جائیگا نہ کہ حصر پر ۔ اس قاعدہ کے اعتبار سے حضرت عمرؓ کا مطلب شیطان کو بطور مثال کے پیش کرنا ہے اگر واقعی ان کی مراد شیطان سے صرف جنی شیطان ہو ۔ ورنہ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو شیطانی کام کرے یا اس کا سبب بنے ۔ خواہ پتھر وغیرہ کے بت ہوں، یہودی صفت مولوی اور لیڈر ہوں جنھوں نے ایسا رویہ اختیار کر رکھا ہو جس کی بنا پر عوام انہیں کے قانون اور احکام کو حلال و حرام کی کسوٹی اور حق و باطل کا معیار قرار دیتے ہوں یا وہ خود سر بادشاہ اور حکمران ہوں جو اپنا نظام حکمرانی صرف اپنی عقل و فہم یا چند انسانوں کی عقل و فہم کی بنا پر چلاتے ہوں اور الٰہی حدود و ضوابط سے اپنے آپ کو اور اپنے ملکی نظام کو پابند نہ سمجھتے ہوں یا سمجھتے تو ہوں لیکن عملاً اس کی پابندی نہ کرتے ہوں ۔ امام مالک المتوفی ۱۷۹ھ نے طاغوت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے یہی مفہوم بیان کیا ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۳۱۱ ج ۱

(۱) هُوَ كُلُّ مَا يُعْبَدُ مِنْ دُونِ اللهِ [۱] طاغوت ہر وہ چیز ہے جس کی اللہ کے علاوہ عبادت کی جائے ۔

قاضی بیضاویؒ المتوفی ۶۸۵ھ فرماتے ہیں ۔

(۲) (فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ) بالشيطان ۔ جو لوگ انکار کریں طاغوت سے یعنی شیطان سے ۔

او الاصنام او كل ما عُبِدَ من دون الله او صدّ عن عبادة الله [۲] یا بتوں سے یا ہر اُس چیز سے جس کی عبادت کی گئی ہو سوائے اللہ کے یا وہ چیز روکتی ہو اللہ کی عبادت سے ۔

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں ۔

وَقِيلَ الْكَهَنَةُ وَكُلُّ من اطاعوه في معصية الله [۳] بعض علما کہتے ہیں کہ طاغوت سے مراد کاہن (جوگی) اور ہر وہ شخص ہے جس کی لوگ خدا کی نافرمانی میں پیروی کرتے ہوں ۔

"مَا يُعْبَدُ مِنْ دُونِ اللهِ" ۔ "ما عُبِدَ من دون الله" ۔ "مَا صَدَّ عَنْ عِبَادَةِ اللهِ" ۔ اور "كُلُّ مَنْ اطاعوه في معصية الله" ۔ کا مصداق وہ تمام چیزیں ۔ اشخاص اور ادارے ہیں جن کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے ۔

(۳) حضرت جابرؓ ابن عبد اللہؓ سے کسی نے پوچھا کہ "طَوَاغِيت" سے مراد کون لوگ ہیں تو انھوں نے فرمایا :۔

هُمْ كُهَّانٌ تنزل عليهم الشياطين [۴] یہ وہ کاہن (جوگی) ہیں جن کے پاس شریر جن آتے ہیں ۔

(۴) حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں ۔

الطاغوت الشيطان في صورة ۔ طاغوت وہ شیطان ہے جو انسان کی صورت میں ہے ۔

إنسان يتحاكمون اليه وهو صاحب أمرهم [۵] جن کے پاس یہ لوگ فیصلے کے لئے اپنے مقدمات لے جاتے ہیں اور وہ ان کا صاحب امر یعنی حاکم اور جج ہوتا ہے ۔

(۵) امام فخر الدین رازیؒ المتوفی ۶۰۶ھ ۔ سورۂ نساء کی "يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ" والی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں ۔

قال اهل اللغة كل معبود دون الله فهو جبت و طاغوت ۔ ۔ ۔ قال الكلبيؒ الجبت في هذه الآية حي ابن اخطب والطاغوت كعب ابن اشرف وكانت اليهود يرجعون اليهما فسميا بهذين الاسمين لسعيهما في اغواء الناس واضلالهم [۶]

اہل لغت نے کہا ہے کہ جس کی بھی اللہ کے علاوہ عبادت کی جائے وہ جبت اور طاغوت ہے ۔ ۔ ۔ کلبی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جبت سے مراد "حی ابن اخطب" ۔ اور طاغوت سے مراد "کعب ابن اشرف" ہے ۔ یہود انکے پاس مقدمات کے فیصلوں کے لئے آیا کرتے تھے اس لئے انہیں یہ نام دیئے گئے اس وجہ سے کہ یہ لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے ۔

(۶) حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں ۔

والطاغوت كل ما تجاوز به العبد حده من معبود او مطاع او متبوع ۔ فطاغوت كل قوم من يتحاكمون اليه غير الله ورسوله ويعبدونه من دون الله او يتبعونه

طاغوت ہر وہ چیز ہے جس کی وجہ سے بندہ حد سے تجاوز کرے خواہ معبود ہو یا متبوع اور مُطاع ۔ ہر قوم کا طاغوت وہ شخص ہے جس کے پاس یہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ کو چھوڑ کر فیصلہ کے لئے مقدمات لے جاتے ہوں ۔ اور

---

[۱] ابن کثیر ج ۱ ص ۵۱۳ ۔ اعلام الموقعین ج ۱ ص ۵۰ ہندی نسخہ ۔ روح المعانی ج ۳ ص ۱۳

[۲] بیضاوی ہندی نسخہ ج ۱ ص ۱۳۳ ۔ [۳] بیضاوی مصری ج ۱ ص ۱۹۹ ۔ [۴] ابن کثیر ج ۱ ص ۵۱۱ ۔ [۵] ابن کثیر ج ۱ ص ۵۱۲

[۶] تفسیر کبیر ج ۲ ص ۲۲۸

على غير بصيرة من الله او يطيعونه فيما لا يعلمون انه طاعة لله فهذه طواغيت العالم اذا تأملتها وتأملت احوال الناس معها رأيت اكثرهم اعرضوا من عبادة الله الى عبادة الطاغوت وعن التحاكم الى الله والى رسوله الى التحاكم الى الطاغوت ؎

اس کی عبادت کرتے ہوں یا خدا کی جانب سے نازل کردہ دلیل و بصیرت کے بغیر اس کی تابعداری کرتے ہوں۔ یا اس بات میں ان کی اطاعت کرتے ہوں جسکے منجانب اللہ ہونے کا ان کو علم نہ ہو یہ ہیں عالم کے طواغیت جب تو ان میں اور انکے ساتھ لوگوں کے معاملات میں غور کریگا تو اکثر دیکھے گا کہ انھوں نے خدا کی بندگی سے روگردانی کرکے ان کی بندگی شروع کر رکھی ہے اور اللہ و رسول کے پاس مقدمات لے جانے کی بجائے انکے پاس لیجانا شروع کر رکھا ہے۔

(۷) علامہ سید محمود آلوسیؒ المتوفی ۱۲۷۰ھ طاغوت کے مفہوم کے متعلق مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

والاولى ان يقال لعمومه سائر ما يطغى ويجعل الاقتصار على بعض تلك الاقوال من باب التمثيل وهو بناء مبالغة كالجبروت والملكوت ؎

بہتر قول یہ ہے کہ لفظ کے عام ہونے کی وجہ سے ان تمام چیزوں کو طاغوت کہا جائے جو سرکشی کرتی ہوں اور مذکورہ اقوال میں جن چیزوں کو خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے انہیں مثال بیان کرنے پر محمول کیا جائے۔ اور یہ "جبروت و ملکوت" کی طرح مبالغے کا صیغہ ہے۔

ان تمام اقوال کا مطلب ایک ہے اور وہ یہ کہ ہر وہ چیز۔ شخص یا ادارہ جو خدائی قانون و شریعت سے بغاوت و سرکشی کرتا ہو (ذہناً و عملاً یا صرف عملاً) یا جو بغاوت کا سبب ہو تو وہ طاغوت ہے اور ائمہ سلف کا اس لفظ کی تشریح میں مختلف چیزوں کا ذکر کرنا بطور مثال ہے نہ کہ بطور حصر۔

قرآن کریم میں طاغوت سے اجتناب کا حکم اور اس کی مذمت مذکورہ آیت کے علاوہ میری تحقیق کے مطابق چھ اور مقامات پر بھی کی گئی ہے اور وہ مقامات یہ ہیں:—

(۱) فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ (البقرہ ع ۲۲ پ ۳)

جو شخص طاغوت (غیر اللہ) کی بندگی سے انکار کرے اور خدا پر ایمان لے آئے اس نے مضبوط حلقہ تھام لیا جسے کسی طرح بھی شکست نہیں ہے۔

(۲) وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُمْ مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ (ایضاً)

جنہوں نے کفر اختیار کر لیا ہو انکے ساتھی طاغوت (انسی یا جنی شیطان) ہیں جو انہیں روشنی سے نکال کر تاریکی میں لے آتے ہیں۔

(۳) أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ (النساء ع ۸ پ ۵)

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ ملا ہے وہ جبت اور طاغوت یعنی غیر اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔

(۴) أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ (النساء ع ۹ پ ۵)

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ وہ آپؐ نازل شدہ کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور آپ سے پہلے نازل شدہ کتابوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں لیکن باوجود اس کے اپنے فیصلے طاغوت (غیر اللہ) کے پاس لے جانا چاہتے ہیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ اس سے انکار کریں۔

(۵) وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ (النساء ع ۱۰ پ ۵)

اور جن لوگوں نے حق سے انکار کر لیا ہے وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں تو تم شیطان کے ساتھیوں سے جہاد کرو۔

(۶) قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِنْ ذَلِكَ مَثُوبَةً عِنْدَ

کہدیجیے! کیا میں تمہیں ایسا طریقہ بتلاؤں جو اس سے بھی خدا کے ہاں برا

؎ اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۸۱ مصری نسخہ۔ ؎ روح المعانی ج ۳ ص ۱۳

اللہ ومن لعنہ اللہ وغضب علیہ وجعل منہم القردۃ ... وعبد الطاغوت — (المائدہ ع۹ پ۶)

ملنے میں زیادہ برا ہے؟ وہ ان لوگوں کا طریقہ ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہو۔ اور ان پر خدا کا غضب ہوا اور ان میں سے بعضوں کو بندر اور سور بنا دیا ہو اور انھوں نے "طاغوت" (غیر اللہ) کی عبادت کی ہو۔ اھ

آیت ۶۰ میں لفظ "طاغوت" سے اشارہ ہے کعب ابن اشرف کی طرف جو یہود مدینہ کا عالم اور لیڈر تھا جس کا پس منظر یہ ہے کہ "بشیر" نامی ایک منافق اور ایک یہودی کے درمیان کسی معاملہ میں جھگڑا پیدا ہو گیا تھا۔ یہودی نے کہا "بینی و بینک محمد صلعم" چلو ہمارا فیصلہ محمدؐ کریں گے لیکن منافق نے کہا "بینی و بینک کعب ابن الاشرف" نہیں ہمارا فیصلہ کعب ابن اشرف کرے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس مقدمہ میں یہودی حق بجانب تھا اس لئے اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں مقدمہ لے جانے کا مطالبہ کیا کہ یہاں پر کسی کی طرفداری نہیں ہوتی تھی اور کعب ابن اشرف کے ہاں تو ہر قسم کا حربہ استعمال ہو سکتا تھا اس لئے منافق نے اسے ترجیح دی۔ اسی معاملے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی کہ ایک طرف تو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اور دوسری طرف نزاعی معاملے کے فیصلے کے لئے غیر شرعی عدالت کا انتخاب کرتے ہیں — ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

بعض علماء کا قول ہے کہ یہ آیت منافقین کی ایک پوری جماعت کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ جو باوجود دعوائے ایمان اور اظہار اسلام کے جاہلیت کی عدالتوں یعنی غیر شرعی عدالتوں میں مقدمات لے جانا چاہتے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ ف ۷۷۴ھ مذکورہ دونوں روایتوں کے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

والآیۃ اعم من ذالک کلہ فانہا ذامۃ لمن عدل عن الکتاب والسنۃ وتحاکموا الی ما سواہما من الباطل وہو المراد بالطاغوت ہنا

آیت ان تمام واقعات سے عام ہے اس لئے کہ یہ اصولی طور پر ہر اس شخص کی مذمت کر رہی ہے جو کتاب و سنت سے اعراض کرے اور کتاب و سنت کی عدالت کے سوا کسی اور کی عدالت میں اپنے مقدمات داخل کرے اور یہی یہاں "طاغوت" سے مراد ہے۔

میری غزل پر

جناب شوکت علی خاں شوکت ایم اے (ٹونک راجستھان) نے میری غزل کے بعض اشعار
پر اعتراضات کئے ہیں۔ اُن کو براہ راست جواب دینے کے مقابلہ میں "فاران" میں اپنی معروضات پیش
کرنا میں نے زیادہ مناسب خیال کیا، کہ شہرت و صفائی، جرح و تعدیل اور اعتراض و جواب دوسرے
اہلِ ذوق کی نگاہ سے بھی گزر جائیں۔ (ماہر القادری)

وہ طرح طرح کی شوخی، وہ نئی نئی ادائیں
انہیں یاد کیا نہیں ہے، انہیں یاد کیا دلائیں

اعتراض ـــــ جس طرح پہلے مصرعہ میں نئی نئی ادائیں کہا گیا ہے، اسی طرح بجائے شوخی کے شوخیاں ہونا چاہیئے۔ ایک ہی مصرعہ میں پہلے ٹکڑے واحد اور دوسرے ٹکڑے جمع، عجز بیان ہے اسی طرح دوسرے مصرعہ میں "انہیں" تکرار فصاحت کے خلاف ہے اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا

ع وہ نئے نئے کرشمے وہ نئی نئی ادائیں

جواب ـــــ ایک ہی مصرعہ یا جملہ میں واحد اور جمع کا اس طرح لانا روزمرہ اور عام بول چال ہے۔ مثلاً ـــــ

"اُس کے یہاں دعوت میں طرح طرح کی مٹھائی اور قسم قسم کے حلوے تھے"

یہ مصرعہ ع وہ نئے نئے کرشمے وہ نئی نئی ادائیں ـــــ اس میں "نئے اور نئی" کی تکرار کھٹکتی ہے اس کے مقابلہ میں تو یہ مصرعہ بہتر ہے ـــــ

وہ طرح طرح کے جلوے / غمزے وہ نئی نئی ادائیں

مصرعہ ثانی میں "انہیں" خلافِ فصاحت کیوں ہے؟ میرے خیال میں "انہیں" کی اس تکرار کو شعر سے خارج کر دیا جائے تو شعر کا "FORCE" کم ہو جائے گا۔

مرے شوق کی صداقت، مری بے غرض وفائیں
یہ طلسم عاشقی ہے، وہ فریب میں نہ آئیں

اعتراض ـــــ مفہوم کچھ سمجھ میں نہیں آیا، اگر اپنی فریب کاری سے محبوب کو متنبہ کرنا مقصود ہے تو اس فریب کی زحمت کیوں اٹھائی گئی اور اگر یہ لطیف طنز کہا جاتا ہے (جیسے کوئی کسی سے کہے کہ آپ تو بڑے پارسا ہیں، تو اس کے جواب میں سامنے والے سے کہا جائے، بیشک میری پارسائی، محض فریب ہے ملمع ہے۔ کہیں آپ بھی میری پارسائی کے فریب میں نہ آ جانا) تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چونکہ روئے سخن محبوب کی جانب ہے کیا محبوب پر یہ طنز مناسب ہے اور اگر کہئے کہ مناسب ہے تو پھر اسی طنز کی ہمزیست کیا ہے جبکہ شوق صادق اور وفائیں بے غرض ہیں تو یہ اپنا اثر خود ہی مرتب کر لیں گی، آپ کو طنز و طعن کی کیا احتیاج ہے، محبوب آپ کو چاہے کچھ کہے آپ کو تو راضی برضا رہنا چاہیئے، وقت خود ثابت کر دے گا کہ صورتِ حال کیا ہے۔

جواب ـــــ شعر کا مفہوم نہ ابھی اُلجھا ہوا نہیں ہے! شعر و ادب میں ابہام اور اُلجھاؤ سے مجھے سخت نفرت ہے! اس شعر میں محبوب پر طنز بھی نہیں ہے! کسی دوسرے شاعر کا یہ شعر ہوتا تو میں کھل کر اس کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتا! مختصراً عرض ہے کہ محبت میں ایسے مقامات بھی آتے ہیں، جہاں شاعر

(محب) محبوب سے اس طرح کی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے ——

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی (مومن)

مومن نے اپنے شعر میں اسی قسم کی لطیف ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ یہ کہ اگرچہ میری وفا میں بے غرض اور میرا عشق صادق ہے لیکن پھر بھی عاشقی ایک طرح کا طلسم ہے۔ محبوب کو چاہیے کہ وہ اس فریب سے بچا رہے!

اس قسم کے جذبات اور واردات عاشقانہ لوازم ہیں۔ مثلاً اس طرح کہا بھی جاتا ہے —— کہ بھئی! دنیا نے اتنے فریب دیے ہیں کہ مجھے خود اپنی ذات پر بھی اعتماد نہیں رہا۔ میں نے اپنی ایک نظم میں محبوب سے خطاب کر کے کہا ہے ——

مت کسی پر کبھی بھروسا کر میری باتوں پہ بھی نہ جا اے دوست

مرے عرضِ غم پہ اُن کو ابھی سوچنا پڑے گا
یہ معاملہ ہے دل کا وہ سمجھ کے مسکرائیں

اعتراض —— حیرت ہے کہ ماہر صاحب نے "عرض" کو مذکر لکھا ہے دوسرے پہلے مصرعہ کا یہ ٹکڑا "ابھی سوچنا پڑے گا" اور دوسرے مصرعہ کا ٹکڑا "وہ سمجھ کے مسکرائیں" جبریہ احکام کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو یقیناً غزل کے مزاج کے منافی ہیں، دوسرے مصرعہ کا مفہوم سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کے مرادف ہے، گویا حکم دے کر محبوب کو مرعوب کیا جا رہا ہے اگر وہ ہنسے تو سوچ سمجھ کر ہنسے ورنہ بصورت دیگر اس کا نتیجہ ٹھیک نہیں ہوگا حالانکہ پہلے مصرعہ میں "عرضِ غم" کا ٹکڑا افتادگی اور عجزِ عاشق کا آئینہ دار ہے جو مقتضائے عشق ہے اس کے بعد شعر کے باقی حصے کا مفہوم بالکل متضاد ہے جو شایانِ حسن ہے نہ درخورِ عشق! کاش! شعر یوں ہوتا ——

مری عرضِ غم پہ آخر وہ خموش ہو گئے کیوں
مری آرزو ہو پوری وہ ذرا جو مسکرائیں

جواب —— پہلے "عرض" کے بارے میں عرض کرتا ہوں کہ اردو کے مشہور لغت "نور اللغات" میں "عرض" کو پیش کرنے اور کسی چیز کو کسی شخص پر ظاہر کرنے کے معنی میں "مذکر" لکھا ہے (صفحہ ۹۹۹ جلد سوم مطبوعہ جنرل پبلشنگ ہاؤس کراچی) اردو میں اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ جس میں محبوب کو "کرنا چاہیے" اور "کرنا پڑے گا" کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے اس میں "حکم" دینے کا قرینہ ہرگز نہیں پایا جاتا۔ یہی حال میرے اس شعر کا ہے! حیدرآباد دکن کے ایک شاعر کا کتنا اچھا شعر ہے ——

بہت ناتواں ہے صدا سازِ دل کی انہیں اور نزدیک آنا پڑے گا

پھر اس قسم کے اندازِ گفتگو، طرزِ تخاطب اور معاملت میں یہ نکتہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ نازِ حسن کی طرح "نازِ عاشقی" بھی ایک چیز ہے!
میرے شعر کے مقابلے میں فاضل معترض نے جو شعر کہا ہے، اس میں شعریت کا دور دور پتا نہیں! خاص طور سے مصرعہ ثانی بہت کمزور ہے۔

تری خامشی کو سمجھا تو چٹک گئے شگوفے ترے گیسوؤں کو دیکھا تو ٹھٹک گئیں گھٹائیں

اعتراض —— جس طرح پہلے مصرعہ میں خاموشی کے ساتھ شگوفوں کی چٹک کا ذکر کیا گیا ہے دوسرے مصرعہ میں محبوب کی گفتگو کا ذکر کرنا چاہیے تھا خاموشی کے ذکر کے ساتھ گیسوؤں کا بیان مناسب نہیں اس لئے کافی بُعد واقع ہو جاتا ہے، شعر یوں ہوتا ——

ترے عارضوں کو دیکھا تو دمک اٹھے ستارے ترے گیسوؤں کو دیکھا تو ٹھٹک گئیں گھٹائیں

جواب —— میرے شعر میں کوئی عیب نہیں ہے، دونوں مصرعوں میں جدا جدا کیفیت بیان کی گئی ہے! شاعر یہ کہہ رہا ہے کہ گیسو جو ماتھے پر ہیں، اُن کے دیکھنے کا گھٹاؤں پر یہ اثر ہوا کہ وہ ٹھٹک کر رہ گئیں اور خاموشی جو غیر ارادی ہے اُس کا مفہوم سمجھ کر کلیاں چٹک گئیں —— تو محبوب

کی ہر شے اور ہر صفت چاہے وہ مادّی ہو یا غیر مادّی، وہ عرض ہو یا جوہر اپنی جگہ بڑی دلکش حسین اور افزا انگیز ہے۔

مجھے دل کی دھڑکنوں کا نہیں اعتبار ماہر
کبھی ہو گئی ہیں شکوے، کبھی بن گئی ہیں دعائیں

اعتراض —— دل کی دھڑکن یوں تو ہمیشہ جاری ہی رہتی ہے۔ لیکن اس کی حرکت میں غیر معمولی شدت اسی وقت پیدا ہوتی ہے کہ یا تو انسان کسی غیر معمولی خطرے میں مبتلا ہو یا امید و بیم کی امتزاجی کیفیت اس پر طاری ہو۔ ان دو حالتوں کے علاوہ کسی تیسری حالت سے دل کی دھڑکن کو کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے نہ دعا کے وقت دل دھڑکنے کا کوئی محل ہے نہ شکوے کے وقت۔ شکوہ انسان ہمیشہ اس وقت کرتا ہے جب تکلیف یا صدمے میں مبتلا ہو۔ لیکن صدمے کے عالم میں انسان کا دل دھڑکنے کی بجائے ڈوبنے لگتا ہے۔ اور دعا اظہار تشکر کا محل ہے اس عالم میں دل نہیں دھڑکتا۔

جواب —— بیشک دل تو ہر انسان کا ہر وقت دھڑکتا ہی رہتا ہے، مگر شعر و محبت کی زبان میں "دل کی دھڑکن" سے حسن و عشق سے بہت سے لوازم اور معاملات وابستہ ہیں۔ وہ کبھی محبوب کا پیام ہوتی ہے کبھی شاعر کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دل کی دھڑکن سے محبوب کی آواز آ رہی ہے۔ دل کی دھڑکن کبھی نغمہ ہوتی ہے اور کبھی فریاد و فغاں ——

—— اور ——

دھڑکنا دل کا کہتا ہے وہ گزرے ہیں ادھر ہو کر (جگر مراد آبادی)

میں نے اپنے اس شعر میں اس مفہوم کو بیان کیا ہے کہ انسان پر مختلف عالم گزرتے رہتے ہیں کبھی وہ سراپا شکوہ و فریاد ہوتا ہے اور کبھی مجسم سپاس و دعا! "دل کی دھڑکن" کی رمزیت و ایمائیت کے پردے میں نیاز مند نے یہی بات کہی ہے کہ مجھے خود اپنے دل کے واردات کا اعتبار نہیں ہے۔ ایک سی حالت نہیں رہتی۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اندر اندر شکوہ سنجی کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے اور کبھی سپاس التجا کا عالم ہوتا ہے ——

اپنے اشعار کی شرح و تفصیل میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ بھی جتنا کہا ہے ڈرتے ڈرتے کہا ہے کہ یہ شرح "خود ستائی" کی حدود کو کہیں نہ چھو لے! (م-ق)

حقیقت و مجاز

عزیز الرزاق صدیقی۔

پڑتی ہے کس پہ دیکھئے اہلِ چمن کی آہ — گلشن میں آرزوئے بہاراں بھی ہے گناہ
اے چشمِ انتظار! غمِ گلستاں پہ رو — اے دل! خزاں کا دَور ہے اک بادِ پُر کراہ
کیا بات فردِ جرمِ محبت کی دوستو — ہر لفظ شکوہ سنج ہے ہر حرف دادخواہ
دردِ ازل سے اہلِ وفا کا نصیب ہے — قیدِ قفس کا موڑ، یہ دار و رسن کی راہ

شفقت کاظمی۔

مرے خلوص نے آخر اثر دکھایا ہے — کہ میرا ذکر کسی انجمن میں آیا ہے
خیالِ دوریٔ منزل ابھی سے آیا ہے — کسی کی راہ میں پہلا قدم اٹھایا ہے
ہزار بار مقدر نے بے وفائی کی — ہزار بار مقدر کو آزمایا ہے

عروج زیدی۔

دہر میں رہنا سکھایا انقلابِ دہر نے — اب ہر اک سانچے میں آسانی سے ڈھل جاتا ہوں میں
وہ اگر ترکِ ستم کر دیں تو کیا ہرج ہے — انگلیاں اٹھتی ہیں آن پر اور شرماتا ہوں میں
خود غرض احباب کو کہتا ہوں اربابِ خلوص — اور اپنی اس غلط کاری پہ اتراتا ہوں میں

ماہر القادری۔

اب تبسم کا ہے یہ رنگ دھواں ہو جیسے — آج نغمہ کا یہ عالم ہے فغاں ہو جیسے
قافلہ مہر و وفا کا یہ کہاں آپہونچا — زندگی راہ میں خود سنگِ گراں ہو جیسے
کچھ نہ کہتے پہ بھی سب کچھ ہے نگاہوں پہ عیاں — خامشی حسن و محبت کی زباں ہو جیسے
آپ بیتی کو بھی اس طرح بیاں کرتا ہوں — میرا افسانہ حدیثِ دگراں ہو جیسے
دردِ دل سخت ہے جانکاہ مگر کیا کیجے — زندگانی کی بہی روحِ رواں ہو جیسے
واعظِ شہر کی باتوں پہ ہنسی آتی ہے — یہ بھی من جملۂ صاحب نظراں ہو جیسے
آدمی موت کے دھارے پہ جب آجاتا ہے — بلبلہ ٹوٹ کے بے نام و نشاں ہو جیسے

دلِ غم ہجر سے مانوس ہے اتنا ماہرؔ
خواہشِ وصل محبت کا زیاں ہو جیسے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

روحِ انتخاب

س:- آپ کی نگاہ میں پاکستان کے بقا اور استحکام کے لئے اسلامی نظریہ کی ضرورت اور اہمیت کیا ہے؟

جواب:- پاکستان کے بقاء و استحکام کے لئے اسلامی نظریہ کی اوّلین ضرورت و اہمیت یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں اگر ایک مسلمان قوم کا نظریہ اسلامی نہ ہو تو اور کیا ہو سکتا ہے۔ مسلمان ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہمارے خیالات اسلامی ہوں۔ ہمارے سوچنے کا انداز اسلامی ہو معاملات پر ہم اسلامی نقطۂ نظر ہی سے نگاہ ڈالیں اور اپنی تہذیب، تمدن، سیاست، معاشیات اور فی الجملہ اپنے پورے نظام زندگی کو اسلام کے طریقے پر چلائیں اگر ہم ایسا نہ کریں تو آخر کس بنا پر ہم اپنے آپ کو مسلمان کہنے کے حقدار ہو سکتے ہیں مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرنا اور پھر اپنی زندگی کے مختلف گوشوں میں کسی غیر اسلامی نظریہ پر کام بھی کرنا لا محالہ یہ معنی رکھتا ہے کہ یا تو ہم منافق ہیں اور دل سے مسلمان نہیں ہیں یا پھر ہم جاہل ہیں اور اتنا شعور بھی نہیں رکھتے کہ مسلمان ہونے کے کم سے کم منطقی تقاضے کیا ہیں!

دوسری چیز اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ہم نے متحدہ ہندوستان میں سے پاکستان کے نام کا ایک الگ خطۂ زمین کاٹ کر حاصل کرنے کے لئے جو لڑائی لڑی تھی وہ تمام دنیا کے سامنے ڈنکے کی چوٹ یہ کہہ کر لڑی تھی کہ ہم ایک جداگانہ تہذیب و تمدن رکھنے والی قوم ہیں۔ متحدہ ہندوستان میں غیر مسلم اکثریت کے ساتھ ایک مشترک نظام زندگی ہم نہیں بنا سکتے ہمیں اپنے نظام زندگی کے مطابق کام کرنے کے لئے الگ ایک علاقہ چاہیئے جہاں ہم اپنی تہذیب اور اپنے تمدن اور اپنے قوانینِ حیات کے مطابق کام کر سکیں۔ اب ایک سخت لڑائی لڑنے کے بعد جب وہ پاکستان ہمیں حاصل ہو گیا جس کے لئے ہم نے یہ سارے پاپڑ بیلے تھے تو یہ ایک بالکل عجیب حرکت ہو گی کہ ہم یہاں اسی تہذیب و تمدن اور نظام زندگی سے منہ موڑ لیں جس کا ہم نے نام لیا تھا اور وہی سب کچھ کرنا شروع کر دیں جو متحدہ ہندوستان میں بھی بآسانی کیا جا سکتا تھا۔ اس کے لئے یہی کہ ہم تمام دنیا کے سامنے اپنے آپ کو ایک جھوٹی اور مکار یا احمق اور بوالفضول قسم کی قوم کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ آخر یہ دنیا رہے تو کیا سوچے کہ یہ عجیب قوم ہے کہ جس مقصد کا نام لے کر یہ لڑائی لڑی تھی، لڑائی میں کامیاب ہو کر اسی مقصد کو فراموش کر بیٹھی اور جو کام یہ لڑے بغیر کر سکتی تھی وہی اس نے جان و مال اور آبرو کے بے شمار نقصانات اٹھانے کے بعد کرنا شروع کر دیا ہماری سوسائٹی میں جن باتوں پر بیچارے سکھوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے ہماری یہ حرکت ان سے بدرجہا زیادہ بڑھی ہوئی ہو گی وہ دنیا کے سامنے ہم اپنے آپ کو مہا سکھ کی حیثیت سے پیش کریں گے۔

تیسری چیز اس سلسلہ میں یہ ہے کہ پاکستان مختلف عناصر سے مرکب ہے اور جن عناصر سے یہ مرکب ہے اُن کے درمیان آج تک اپنی جداگانہ خصوصیات نمایاں طور پر موجود ہیں۔ ان کے اندر حقیقت میں کوئی امتزاج ایسا نہیں ہو سکا ہے جو ان عناصر کو بالکل یک جان اور یک رنگ کر چکا ہو۔ ان کی زبانیں مختلف ہیں۔ لباس، عادات، طرزِ معاشرت مختلف ہے۔ نسلیں مختلف ہیں۔ ایک بڑی حد تک اُن کے مفاد بھی نہ صرف مختلف بلکہ متضاد ہیں۔ ان کے اندر جدا جدا ہونے کا احساس نہ صرف موجود ہے بلکہ زندہ اور متحرک ہے اور ایک ذرا سے اشارے پر بآسانی ابھر آتا ہے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ پاکستان جغرافیائی حیثیت سے ایک وطن بھی نہیں ہے۔ اس کے دو بڑے ٹکڑے، جن میں اس کی آبادی تقریباً نصف نصف بٹی ہوئی ہے ایک دوسرے سے ہزاروں میل کے فاصلے پر ہیں اور بیچ میں ایک ایسی طاقت حائل ہے جس کے ساتھ ہمارے کچھ بہت اچھے تعلقات بھی نہیں ہیں۔ کسی وقت بھی ان تعلقات کی خرابی کی وجہ سے ان دونوں ٹکڑوں میں مواصلات کے سارے رشتے کٹ سکتے ہیں۔ اس حالت میں پاکستان کو ایک وحدت بنا کر رکھنے والی قوت سوائے اسلام کے

کوئی نہیں ہے۔ محض سیاسی نظام کی وحدت کوئی چیز نہیں۔ کیا اسی طرح کی وحدت آسٹریا اور ہنگری میں نہ تھی؟ کیا اسی طرح کی وحدت عثمانی سلطنت میں نہ تھی؟ کیا اسی طرح کی وحدت برٹش ایمپائر میں نہ تھی؟ اس وحدت کے بل پر مختلف الجنس عناصر کو ایک "بنیان مرصوص" نہیں بنایا جاسکتا۔ اس کے لئے زبان کی وحدت مددگار ہو سکتی ہے مگر اس کا یہاں دور دور کوئی امکان نہیں۔ اس کے لئے معاشی مفاد کی وحدت بھی مددگار ہو سکتی ہے لیکن ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان یہ موجود نہیں ہے۔ اب سوائے ایک عقیدے اور دین کی وحدت اور اصول اخلاق و تہذیب کی وحدت کے اور کیا ایسی چیز ہے جو پاکستان کے مختلف عناصر کو جوڑ کر رکھ سکتی ہو۔

چوتھی اور آخری چیز یہ ہے کہ ملک کی عظیم مسلم اکثریت، جو دراصل پاکستان کی بانی اور پشت پناہ ہے سچے دل سے یہ ایمان رکھتی ہے کہ اس کی زندگی کے مسائل کا حل فی الواقع اسلامی نظام ہی میں ہے اور اس نظام سے بہتر دوسرا نظام نہیں ہے۔ جن لوگوں کا اصلی عقیدہ یہ نہیں ہے جو محض مسلمان گھرانوں میں پیدا ہو جانے کی وجہ سے مسلمان بنے ہوتے ہیں مگر اپنے عقائد اور خیالات اور نظریات کے اعتبار سے غیر مسلم ہو چکے ہیں ان کا معاملہ تو دوسرا ہے وہ تو بلاشبہ یہی چاہیں گے کہ اپنے ساتھ بس مسلمان کا نام لگائے رکھیں مگر کام کسی غیر اسلامی نظریہ پر کریں۔ لیکن ایسے لوگ آخر ہماری آبادی میں ہیں کتنے؟ بمشکل ان کا تناسب ایک دو یا زیادہ پانچ فی لاکھ ہوگا۔ آخر عقل و منطق، یا انصاف یا جمہوریت کے کس قاعدے سے اس چھوٹی سی اقلیت کو حق پہونچتا ہے کہ یہاں کوئی نظام زندگی اس کے نظریات کے مطابق اختیار کیا جائے؟ اس میں شک نہیں ہے کہ اس وقت یہی چھوٹی سی اقلیت ہمارے ہاں بڑے بڑے مناصب پر مسلط رہی ہے لیکن یہ حالت خواہ کتنی ہی پریشان کن ہو۔ بہر حال اسے کوئی حقیقی اہمیت حاصل نہیں ہے اھ

ہماری نظر میں

تاریخ القرآن

از:- عبدالصمد صارم الازہری، ضخامت ۴۸۴ صفحات (۲۰×۳۰ سائز، خوشنما جلد، مہری ڈائی) قیمت چھ روپے

ملنے کا پتہ:- ادارہ علمیہ ۵۳ دھنی رام روڈ، نئی انارکلی، لاہور

جناب مولانا عبدالصمد صارم، دس بیس نہیں سینکڑوں کتابوں کے مصنف، مؤلف اور مترجم ہیں، صاحب موصوف دارالعلوم دیوبند کے فاضل، پنجاب یونیورسٹی کے مولوی فاضل اور جامعہ الازہر مصر کے تعلیم یافتہ ہیں، جہاں انہوں نے شہرۂ آفاق مفسر قرآن علامہ طنطاوی جوہری سے دو سال تک استفادہ کیا ہے۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے قرآن کریم کی مفصل مربوط تاریخ بیان کی ہے۔ ان چند عنوانات سے کتاب کی جامعیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

قرآن عہد رسالت میں ——— نزول قرآن ——— پہلی وحی ——— آخری وحی ——— کتابت قرآن ——— کاتبین وحی ——— رسم خط قرآن ——— قرآن عہد خلافت راشدہ میں ——— جمع قرآن ——— تہذیب قرآن ——— ترتیب سور ——— اختلاف مصاحف ——— مصاحف قرآن ——— اعراب و نقاط ——— رموز اوقاف ——— قرأت و تجوید ——— تفاسیر و تراجم قرآن ——— قرآن اور الفاظ دخیلہ ——— حروف مقطعات ——— نسخ ——— رجال قرن اول، ثانی و سوم ۔۔۔۔۔۔

"انزال و تنزیل" میں کیا فرق ہے! اس کتاب میں اس فرق کو واضح کیا گیا ہے ——— یہ کہ "انزال" ایک دم اتارنے کو کہتے ہیں اور "تنزیل" بتدریج اتارنے کو ——— قرآن کریم میں جو معجزانہ بلاغت و فصاحت پائی جاتی ہے عربی کی کسی دوسری کتاب میں نظیر نہیں مل سکتی، اس خصوص میں فاضل مصنف نے تنظیر، مقدآتت، استطراد اور حسن التخلص کی تعریف بیان کی ہے۔ اور اس تشریح سے اُن کا مقصد یہ ہے کہ جب تک معانی و بیان اور فصاحت و بلاغت کے اصول و فروع پیش خاطر خواہ عبور نہ ہوگا، قرآن کریم کے اسلوب کی خوبیوں کا سمجھنا مشکل ہے۔

قرآن کریم کے آداب و مسائل کا ایک مستقل باب ہے۔ اس کے تحت لکھا ہے ——— "قبروں کے سرہانے قرآن پڑھنا مکروہ ہے۔"

اور

"چند اشخاص کا ایک جگہ بلند آواز سے قرآن پڑھنا، جس طرح آجکل فاتحہ وغیرہ میں دستور ہے مکروہ ہے۔"

صحابہ کرام میں قرآن کریم کے سب سے زیادہ جاننے والے کون تھے اور تفسیر، ترجمہ اور قرأت و تجوید کے فن میں جو شخصیتیں مشہور ہیں، اُن کی زندگیوں کے مختصر حالات بھی اس کتاب میں ملتے ہیں۔ لائق مصنف نے یہ بھی بتایا ہے کہ قرآن کریم میں انتہائی ربط پایا جاتا ہے، اُس کی آیات سچے موتیوں کی لڑی کی طرح مربوط و منظم ہیں۔ قرآن کریم کے تراجم کن زبانوں میں ہوئے اُس کی تفصیل بھی مترجمین کے ناموں کے ساتھ "تاریخ القرآن" میں ملتی ہے۔

"تاریخ القرآن" کوئی شک نہیں بڑی محنت و کاوش کے ساتھ مرتب کی گئی ہے جس کے مطالعہ سے قرآن کریم کے بارے میں معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، اس کتاب کے علاوہ مولانا عبدالصمد صارم کی دوسری کتابوں کے پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ موصوف کا مطالعہ خاصہ وسیع ہے مگر اُن کی علمی حیثیت ایک ناقل راوی اور جامع و مؤلف کی ہے، مفکر و محقق کی نہیں ہے۔ اُن کی تحریر میں ادبیت کی کمی محسوس ہوتی ہے۔!

صفحہ ۴۰۹ پر انہوں نے ریاست ٹونک کے فرمانروا نواب سعادت علی خاں مرحوم کو عالم و فاضل لکھا ہے یہ مبالغہ نہیں بلکہ خلاف واقعہ ہے ———

قرآن کریم کا موضوع "ہدایت" ہے۔ یہ اخلاق و ہدایت کی کتاب ہے مگر مولانا صارم نے بعض قرآنی آیات سے علم الحساب، علم بدیع، علم قیافہ، جغرافیہ و ہئیت یہاں تک کہ علم و عروض تک کو منسوب کر دیا ہے اور قرآن کی دو آیتوں کی تقطیع کی ہے کہ یہ مصرعے ہیں اور بحر رمل۔ و متقارب میں ہیں! قرآن کریم کے بارے میں سوچنے کا یہ انداز درست نہیں ہے! اور قرآن سے علم عروض اور شعر و شاعری کو منسوب کرنا تو خود قرآن کے دعوے کے خلاف دلیل لانا ہے۔ (معاذ اللہ)

پاکستان اور ہندوستان میں علوم قرآن کی جو خدمت انجام دی گئی ہے، اس کی تفصیل "تاریخ القرآن" میں ملتی ہے۔ حیرت ہے کہ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ جیسے بلند پایہ مفسر قرآن کا ذکر کیسے چھوٹ گیا، مدراس کے سیٹھ محمد یعقوب مرحوم کی کشاف الہدیٰ کا بھی نام آنا ضروری تھا۔ لکھنؤ میں حضرت مولانا عین القضاۃ رحمۃ اللہ علیہ کا مدرسہ جو تجوید و قرأت میں خاص شہرت رکھتا تھا اُس کا ذکر بھی ضرور آنا چاہیے تھا۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب "ارض القرآن" بھی قابل ذکر تھی۔

قرآن کریم کے اردو منظوم ترجموں میں صرف آغا شاعر قزلباش دہلوی کا نام آیا ہے۔ جناب سیماب اکبرآبادی اور اثر زبیری صاحب کے منظوم ترجموں کا ذکر آنے سے رہ گیا ——— مولانا عبد الرشید نعمانی کی "لغات القرآن" کا تذکرہ بھی ضروری تھا۔

"تاریخ القرآن" میں لکھا ہے "کتابتِ قرآن کی اجرت لینا مکروہ ہے" (صفحہ ۶۹) اس زمانے میں جب کہ بعض لوگوں کی روزی کتابت سے وابستہ ہے۔ وہ اگر "کتابتِ قرآن" کا معاوضہ لیتے ہیں تو اس میں شرعی طور پر کوئی قباحت نہیں ہے۔

"اعمال قرآنی" ایک مستقل باب ہے جس میں تفصیل کیساتھ بتایا گیا ہے کہ فلاں سورت کے پڑھنے سے فاقہ سے محفوظ رہے گا اور فلاں سورت کی تلاوت سے "منافع ظاہری و باطنی" حاصل ہوں گے ..... لیکن اس کے ساتھ ایک باب "عمل قرآن" کا بھی ہونا چاہیے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب محض تلاوت و تبرک اور تعظیم و تقبیل کے لئے نہیں بھیجی بلکہ اصل مقصد اس پر عمل کرنا ہے۔

اعتقادِ صحیح

بجواب

ذیل رکعات تراویح

از :- آزاد رحمانی ایڈیٹر "الہدیٰ" (دربھنگہ) ضخامت ۸۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔

ملنے کا پتہ :- مولوی حکیم عبد الباقی صاحب جمال پورہ، مئوناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ (یو۔ پی۔ انڈیا)

مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی کتاب "انوار مصابیح" پر "فاران" میں تبصرہ ہو چکا ہے۔ احناف جو تراویح میں بیس رکعتیں پڑھتے ہیں اُسی مسلک کی تائید اس کتاب میں دلائل کیساتھ کی گئی تھی، اب اُس کے جواب میں مولانا آزاد رحمانی صاحب نے یہ کتاب لکھی ہے۔ اہل حدیث اور احناف کے درمیان اس قسم کے فروعی مسائل میں یہ معرکہ آرائی کوئی قابل تعریف کام نہیں۔

جناب آزاد رحمانی نے مصنفِ "انوار مصابیح" اور دوسرے حنفی اہل قلم کی شکایت کی ہے کہ وہ اہل حدیث پر نقد و احتساب میں تلخ و نامناسب لہجہ اختیار کرتے ہیں مگر خود آزاد صاحب کی اس کتاب کا یہ رنگ ہے، لکھتے ہیں ———

"اس کے بعد بھلا "علامہ کبیر" دوبارہ میدان میں آنے کی کیا ہمت کرتے، بچارے شرافت کے ساتھ مقابلہ سے ہٹ گئے۔ مگر اُن کے بعض خوش مریدوں کو، جو اُن کے ماتحت ہیں اور مدرسہ مفتاح العلوم میں اُن کی زیر سرپرستی کام کر رہے ہیں اپنے آقا اور ولی نعمت کی یہ ذلت و خجالت گوارا نہ ہوئی، سوچا کہ عوام بالخصوص بمبئی کے سیٹھوں کو (جن کے دست کرم کا مفتاح العلوم محتاج ہے) مغالطہ میں رکھنے کے لئے، جواب نہ سہی جواب کے نام سے کچھ تو شائع کر دینا چاہیے تھا۔ چنانچہ مولانا عبد الباری صاحب قاسمی مدرس مدرسہ مفتاح العلوم قربانی کا بکرا بن کر سامنے آئے ———"

کیا اہل حدیث حضرات کے مدرسوں کو صاحب ثروت سیٹھ اعیان امداد نہیں دیتے، اگر دیتے ہیں تو مفتاح العلوم پر بمبئی کے سیٹھ صاحبان کی امداد و اعانت

کی طرز تحقیق بے اصل اور خلاف واقعہ ہے اور یہ بات تو سو فیصدی غلط ہے کہ مفتاح العلوم کے علماء نے تراویح کی بیس رکعتوں کی تائید بعض صاحبان کو مغالطے میں رکھنے کیلئے کی ہے ——— اہل علم کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اتنی نیچی سطح پر آ کر بحث و مناظرہ کا آغاز کریں۔

مولانا حسین احمد مدنی مرحوم و مغفور کی کتاب "شہاب ثاقب" کا اقتباس پیش کیا گیا ہے ———

"صاحبو! محمد بن عبدالوہاب نجدی ابتداء تیرھویں صدی میں نجد عرب سے ظاہر ہوا، خیالات باطلہ عقائد فاسدہ رکھتا تھا۔ . . . . . . الحاصل وہ ایک ظالم و باغی اور خونخوار فاسق شخص تھا۔"

ہم نے ایک مضمون میں پڑھا ہے کہ مولانا مدنی نے اس کتاب سے رجوع فرما لیا تھا۔ خدا کرے انہوں نے ایسا کر لیا ہو، حیرت ہے کہ اُن کے قلم سے ایسی بے تحقیق اور غلط باتیں نکل گئیں!

احناف کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ احادیث میں جہاں جہاں "قیام لیل" آیا ہے اُس سے مراد "تہجد کی نماز" ہے مگر اس کتاب میں شیخ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب سے ایک اقتباس نقل کیا گیا ہے جس میں "قیام" سے مراد تراویح ہے (ومن قام شہر رمضان فخفیہ قیاماً والمراد بالقیام التراویح)

اس قسم کے فروعی مسائل میں جہاں ایک سے زیادہ قول اور عمل ملتا ہے، ہر قول و عمل کے اتباع سے شریعت کا منشاء پورا ہو جاتا ہے، تراویح کی تعداد میں اختلاف پایا جاتا ہے جس کسی کو جس روایت اور قول و عمل پر اطمینان ہو، وہ اس پر عمل کرے اور دوسرے قول و فعل پر عمل کرنے کو خاطی اور غلط کار نہ کہا جائے کہ معاملہ راجح و مرجوح کا ہے۔ ہدایت و ضلالت اور غلط و صحیح کا نہیں ہے۔ آٹھ اور بیس رکعت تراویح کے دونوں گروہوں کو ثواب ملے گا، اور اس اختلاف پر اُن سے باز پرس نہ ہوگی (ان شاء اللہ العزیز)

اس کتاب کا ایک "تکلیف دہ اقتباس" ———

"حقیقت یہ ہے کہ شیخ دہلوی کا یہ بیان مؤلف صاحب کے گلے میں اس طرح پھنس گیا ہے کہ بیچارے کو اچھو ہو گیا ہے، نیچے کا سانس نیچے اور اوپر کا سانس اوپر اٹک کر رہ گیا ہے اور یہ "تنکا" ان معاندین سنت کی آنکھوں میں اس طرح گڑ گیا ہے کہ ہزار کوشش کے باوجود کسی طرح نکلتا ہی نہیں ہے۔" (صفحہ ۲۶)

سنت نبوی سے عناد تو کفر ہے ——— آنا رحمانی صاحب نے مئو کے علماء احناف پر کتنا سخت الزام لگایا ہے ———

جو اہل حدیث احناف کو سنت نبوی کا مخالف اور تارک سمجھتے ہیں اُن کو اپنی اس تہمت طرازی اور الزام تراشی کا اللہ تعالیٰ کے یہاں جواب دینا ہوگا اور حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت و محبت بھی اُن کی مدافعت نہ کر سکے گی!

احناف کا مسلک کتاب و سنت ہی کی اتباع و تقلید ہے۔ اُن کے عمل کی بنیاد حدیث رسول ہی ہوتی ہے وہ کسی حدیث کو اس لئے نہیں چھوڑتے ہیں کہ اپنے علم و تحقیق کی حد تک انہیں کوئی دوسری زیادہ قوی و معتبر حدیث یا آخری عمل مل جاتا ہے اہل حدیث کی طرح سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احناف کے نزدیک بھی دین میں حجت ہے!

اہل حدیث ظاہری نصوص کو دیکھتے ہیں اور اہل فقہ خاص طور سے احناف نصوص میں "تفقہ" سے کام لیتے ہیں، اُن میں گمراہ کوئی نہیں یہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے طلبگار ہیں، افسوس ہے کہ بحث و مناظرہ کی بدولت احناف اور اہل حدیث خواہ مخواہ ایک دوسرے کے حریف بن گئے ہیں، سچی بات یہ ہے کہ مذاہب اربعہ اور مسلک اہل حدیث ان سب میں حق دائر و سائر ہے!

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ کفر و ایمان اور اسلام و مسلمان کی تعریف کیا ہے؟ کفر کے کتنے اقسام ہیں؟ اسلم و مومن میں کیا فرق ہے؟ کفر مستلزم .... کیسے کہتے ہیں؟ تاویل اور تعریف میں فرق کس طرح واقع ہوتا ہے؟ تکفیر اہل قبلہ کے مسئلہ کی اصل نوعیت کیا ہے؟ کسی مدعی اسلام کی تکفیر میں انتہائی احتیاط کی کیا حدود ہیں؟

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ نے اپنے استاذ حضرت العلامہ مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ایک عربی رسالہ کے مضامین کو اس کتاب میں عام فہم انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ مباحث و افکار قرآن و حدیث اور اقوال ائمہ کی روشنی میں واضح کئے گئے ہیں —— ایک اقتباس ——

"ایمان و اسلام کی مسافت تو ایک ہے۔ فرق مبداء اور منتہی میں ہے —— شروع ہوتا ہے اور ظاہر پر منتہی ہوتا ہے اور اسلام ظاہر سے شروع ہو کر قلب پر منتہی ہوتا ہے اگر قلبی تصدیق ظاہری اقرار وغیرہ تک نہ پہنچے تو وہ تصدیق ایمان معتبر نہیں۔ اسی طرح ظاہری اقرار و اطاعت اگر تصدیق قلبی تک نہ پہنچے وہ اسلام معتبر نہیں۔"

کتاب کا اختتام ان کلمات حکمت پر ہوتا ہے ——

"حدیث میں جو اہل قبلہ کی تکفیر کو منع کیا گیا ہے۔ اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ جو قبلہ کی طرف منہ کرلے وہ مسلمان ہے بلکہ یہ شرع اسلام کا ایک اصطلاحی لفظ ہے جو صرف ان لوگوں کے لئے بولا جاتا ہے جو اسلام کے عام شعائر نماز وغیرہ مسلمانوں کی طرح ادا کرتے ہوں اور ان سے کوئی قول و فعل ایسا سرزد نہ ہو جس سے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تکذیب ہوتی ہو"

مولانا مودودی ایک تعارف

از:- نعیم صدیقی، ضخامت ۲۰۰ صفحات (سرورق حسین و رنگین) قیمت قسم اعلیٰ (سفید کاغذ) تین روپے قسم ادنیٰ (نیوز پرنٹ) دو روپے پچاس پیسے۔
ملنے کا پتہ:- مکتبہ ستارہ اچھرہ - لاہور

کتاب کا انتساب ——

اس قوم کے نام
جس نے بارہا کانٹوں کو سر آنکھوں پر رکھا
اور
پھولوں کو پامال کیا

ترتیب:- الف نام آرزو ست —— ایک انسان —— ایک انقلابی مفکر —— بلاکش مادی شوق
اور
ایک تعارف:- اس دلچسپ تاریخی شخصیت کا جو درحقیقت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔
وہ کہ
جس کے حصے میں سب سے زیادہ گالیاں بھی ہیں اور سب سے زیادہ احترام بھی،

ان چند جملوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب کتنی دلچسپ اور دلکش ہے اور مصنف نے کیا انداز بیان میں کس قدر ادبیت اور لطف

بیان پایا جاتا ہے ۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شخصیت پر یہ کتاب ہر حیثیت سے خوب نہیں خوب تر ہے ، مولانا موصوف کی جامع و ہمہ گیر شخصیت ، مسلک اور ان کے افکار کا خلاصہ اور جوہر [illegible] جناب ایم صدیقی نے کس سلیقہ کے ساتھ واقعات کا تجزیہ کیا ہے اور مولانا مودودی نے مخالفین و معاندین کے ہاتھوں میں آئینہ دے دیا ہے کہ وہ اس میں اپنے چہرے کے خدوخال کو دیکھ لیں !

یہ کتاب کردار نگاری کے اعتبار سے بھی بلند مقام دیئے جانے کی مستحق ہے ۔ کسقدر نفسیاتی انداز میں مودودی صاحب کے مزاج و فکر اور عادات و مشاغل کی تصویر کشی کی ہے ! افسوس ہے کہ دنیائے اسلام کا یہ قابل فخر مفکر ان دنوں لاتعداد کے جیل خانے میں محبوس ہے !

زاغ و کرگس پر کوئی بندش نہیں اور شاہین ہیں کہ زیر دام ہیں

تاریخ تصوف قبل از اسلام

از : بشیر احمد ڈار ، ضخامت ۲۲۲ صفحات ، مجلد رنگین گرد پوش ، قیمت چار روپے پچاس پیسے ۔

ملنے کا پتہ :- ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ ، لاہور

جناب بشیر احمد ڈار متعدد کتابوں کے مصنف ہیں ۔ ان کا مطالعہ خاصہ وسیع ہے ۔ فلسفیانہ فکر کے ساتھ اہل تحقیق کا مزاج رکھتے ہیں اور عالمانہ انداز میں مسائل کا تجزیہ کرتے ہیں ۔ اس کتاب میں انہوں نے یونانی ، یہودی ، عیسائی اور چینی تصوف کا تنقیدی اور تاریخی جائزہ لیا ہے ۔ اس کتاب کا ایک ایک ورق معلومات سے لبریز ہے جس کے پڑھنے سے علماء اور خواص تک کو فائدہ ہوگا ۔

حاصل مطالعہ ——— " یونانی تاریخ میں آرفیس نے سب سے پہلے خانقاہیں قائم کیں ، تصوف میں شروع سے دو اجزاء شامل رہے ہیں اور یہی دونوں اجزاء آرفیئی مسلک میں پائے جاتے ہیں (۱) انسان اور خدا کے درمیان تعلق کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ اور (۲) انسانی روح اور خدا کے مابین اتحاد کے متعلق مختلف فکری توجیہات ——— آرفیس نے " ینتھوسیا " کا لفظ استعمال کیا ، ینتھوسیا سے مراد انسان کی وہ نفسیاتی حالت ہے جب وہ جذبات کی انتہائی شدت کے زیر اثر اپنی انفرادی ہستی کو بھول کر اپنے آپ کو خدائے مطلق کا محض پرتو یا سایہ سمجھتا ہے اور جس وقت اتصال الٰہی کا انکشاف اس پر ہوتا ہے ۔"

" مسلمانوں نے جب فلاسفۂ یونان کی مختلف کتابوں کے تراجم کئے تو اس کتاب (الانتہا) کے کچھ حصوں کو عربی میں منتقل کیا گیا ، لیکن غلطی سے مترجم نے اس کو فلاطینوس کی بجائے ارسطو کی کتاب سمجھا اور اس بنا پر اسلامی دنیا میں " دینیات ارسطو " کے نام سے رائج ہوئی ۔"

" جدید مغربی فلسفہ میں جو ہمیں فلسفی کانٹ کے ہاں جو عالم ظاہر اور عالم حقیقت کی تقسیم ملتی ہے وہ فلاطینوس کے اسی تصور کی صدائے بازگشت ہے "

" . . . . . . اس کے بعد فلاطینوس یہ سوال کرتا ہے کہ اگر واحد مطلق کی یہ کیفیت ہے تو پھر ہم اس کے متعلق کس طرح گفتگو کریں ؟ اس کا جواب وہ دیتا ہے کہ اگرچہ وہ ہمارے علم سے ماوراء ہے تاہم وہ ہم سے مکمل طور پر ماوراء بھی نہیں ہے ہم اسے نہ جانتے ہوئے بھی ایک حیثیت سے سمجھتے ہیں اور نہ کہہ سکنے کے باوجود بھی اس کے متعلق کچھ کہہ پاتے ہیں ، اگر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا ہے ؟ تو کم از کم اتنا تو جانتے ہیں کہ وہ کیا نہیں ہے ، ہماری حالت اس شخص کی سی ہے جو روحانی فیضان کے زیر اثر ہو جو اس حقیقت کو تو محسوس کرتا ہے کہ اس وقت اس کے قلب پر ترین قسم کی ہستی مسلط ہے جو اسے حرکت دے رہی ہے اور جس کے متعلق وہ مکمل طور پر نہ جانتے ہوئے بھی گفتگو کرنے سے باز نہیں رہ سکتا ۔"

یہ جو صوفیاء کے یہاں " سیر الی اللہ " اور " سیر فی اللہ " کی اصطلاحات ملتی ہیں ، ان کا وجود فلاطینوس کے یہاں صدیوں پہلے ملتا ہے ———

" جب انسان اس منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے تو دوئی فنا ہو جاتی ہے ۔ خارجی دنیا اور باطنی قلب آفاق اور انفس دونوں اس کے لئے اتنے متحد ہو جاتے ہیں کہ ہر قسم کی تمیز غائب ہو جاتی ہے " سیر الی اللہ " فلاطینوس کے مشہور الفاظ میں ایک تنہا (انسان) کی تنہا (ذات مطلق) کی طرف ہجرت ہے "

فلاطینوس کے یہاں انسان کا خدا کی ذات سے اتحاد و تشابہ کا تصور ملتا ہے اور وہ انسان اور خدا کو ہم مرکز دائروں کی طرح سمجھتا ہے کہ جب

وہ دونوں منطبق ہو جائیں تو ایک ہو جاتے ہیں اور جب علیحدہ ہوں تو دو ——— وہ مشاہدہ سے پیشہود و شاہد دونوں کے ایک ہونے کا قائل ہوا"

"یونانی تاریخ میں ہرکلیٹس کا مقام منفرد ہے۔ اس نے سقراط اور افلاطون سے پہلے صوفیانہ اور مذہبی رجحانات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی"

"رواقیوں کے نزدیک الفاظ اور تصورات ایک ہی حقیقت کے دو پہلو تھے اس لئے لوگوس یا کلمہ جب تک قلب یا ذہن میں ہے تصور ہے۔ لیکن جب وہ زبان سے ادا ہوتا ہے تو وہی لفظ بن جاتا ہے"

افلاطون کو "فلسفہ عینیت" کا موجد سمجھا جاتا ہے مگر اس کتاب سے معلوم ہوا کہ اعیان کے معروضی وجود کا نظریہ اسرائیل کی دینی روایات کا جزو ہے!

"مرکبہ صرنیوں کا گروہ خالص تجسیم کا قائل تھا جس کو عام یہودیوں نے بالکل پسند نہ کیا، چنانچہ اُن کی سخت مخالفت کی گئی، اس کتاب میں خدا کے جسم کے مختلف اعضاء کی پیمائشیں دی گئی ہیں مثلاً خالق کا قد ۲۳۶۰۰۰ فرسنگ ہے ———" (استغفر اللہ)

چین کے مشہور صوفی لاؤزی کی تعلیم یہ تھی ——— "علم کو ترک کر دو اور حکمت کو جلاوطن کر دو تاؤ تک پہونچنے کے لئے عقل و حکمت کی بجائے جہالت اور عقل سے دست برداری ضروری ہے ——— اخلاقیات میں لاؤزی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان کو ہر قسم کے عمل سے پرہیز کرنا چاہیئے اس کے لئے چینی زبان کی اصطلاح "وو وائی (.......)" ہے، جس کا مفہوم ہے "لاعملی"۔ یعنی جتنا کوئی شخص عمل سے رکا رہیگا اتنا ہی زیادہ اپنے اور دوسروں کے لئے فائدہ مند ثابت ہوگا"

لاؤزی "بے عملی" کی تعلیم میں اس حد تک پہونچ جاتا ہے ——— "جب حکومت کاہل اور بے کار ہو تو لوگ خراب نہیں ہوتے، جب حکومت چست اور چوبند ہو تو لوگ بدحال اور پریشان ہوتے ہیں"

اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یونانی، یہودی، عیسائی اور چینی تصوف سے مسلمان صوفیا کسی نہ کسی حد تک متاثر ہوئے ہیں۔ چینی تصوف کے امام لاؤزی نے "ترک دنیا اور بے عملی" کی جو تعلیم دی ہے اُس کی جھلک ہمارے صوفیا کے یہاں "ترک ترک" کی اصطلاح میں دکھائی دیتی ہے!

جناب بشیر احمد ڈار نے کھل کر لکھا ہے ———

"حکیم فیلو نے جب یہودیت کو یونانی فلسفہ کے رنگ میں پیش کرنا چاہا تو یہ تمام مواد اُس کے سامنے موجود تھا اس نے تمام تصورات و خیالات کو یکجا پیش کیا اور مذہب، فلسفہ اور عقل و نقل میں تطبیق کی یہ پہلی کوشش تھی جس نے بعد میں عیسائی اور مسلمان صوفیا اور حکما کو متاثر کیا، مسلمان صوفی مفکرین حلاج، ابن عربی، رومی اور عبدالکریم الجیلی وغیرہ سب نے اس سے استفادہ کیا"

مسلمان صوفیاء کے یہاں "حقیقت محمدیہ" کی جو اصطلاح اور نظریہ ملتا ہے، یہ فیلو اور یوحنا کے لوگوس کی جھلک ہے: اس قسم کے نظریوں اور اصطلاحوں نے بڑی پیچیدگیاں پیدا کی ہیں۔

یہ کتاب[1] (تاریخ تصوف قبل از اسلام) اونچے درجہ کی کتاب ہے اردو ادب کی ثروت میں اس کتاب نے اضافہ کیا ہے جس کا فاضل مصنف (بشیر احمد ڈار)

---

[1] وہ چار بگھر زبان کی کوتک پیدا ہوئی ——— "سبب حکومت چست اور چوبند ہو" (صفحہ ۱۹۰) درمندرد "چاق چوبند" ہے "موسیقی کی پانچ سریں کانوں کو بہرہ کر دیتی ہیں" (صفحہ ۲۰)

"شعر بالا تغاوت مذکر ہے، میر تقی کا شعر ہے ———

جلتا و بیت سب بھا ہیں یاں اپنی نظر سرد میں
بڑا برسات میں ہوتا ہے جولی شعر تریہ ابر ہم کا

دوسری غلطی اس جملہ میں یہ ہے کہ "بڑا" کا املا "بہو" کیا گیا ہے ——— "پونجی و سرمایہ" (صفحہ ۲۰۱) فارسی و عربی اور اردو لفظوں کے درمیان اضافت جائز ہے اور نہ عطف!

اقبال کا نظریہ اخلاق

از ڈاکٹر سعید احمد رفیق (ایم اے) ضخامت ۱۹۴ صفحات (مجلد) قیمت
ملنے کا پتہ: ادارۂ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ، لاہور

اس کتاب میں علامہ اقبال کے نظریہ اخلاق کو علمی انداز میں پیش کیا گیا ہے اور اس موضوع پر غالباً یہ پہلی تصنیف ہے جو منظر عام پر آئی ہے۔ مصنف نے یورپ کے مشاہیر اہل فلسفہ اور اقبال کے افکار کے مابین خوبصورتی کے ساتھ مقابلہ اور موازنہ کیا ہے۔ ایک اقتباس ——

"نطشے صرف جلالی خصوصیات کا مداح ہے۔ مثلاً قوت، شجاعت، بہادری، کوشش، ہمت اور
اور جمالی خصوصیات مثلاً ہمدردی، اخوت، مساوات، رحم کا زبردست مخالف ہے۔ اقبال تکمیل
نفس کے لئے ہر دو قسم کی خصوصیات کو لازمی اور ضروری سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نطشے کے فوق الانسان
میں صرف "شیر" کی خصوصیات پائی جا سکتی ہیں۔ نطشے کی نیک خواہشات کے باوجود وہ کبھی "بچہ"
نہیں بن سکتا اور اقبال کا انسان کامل، مرد مومن مرد حُر ہے جو اپنے میں ہر دو قسم کی قدریں کو
سموئے ہوئے ہے۔"

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

پوری کتاب کا یہی رنگ ہے، ہر صفحہ پر اخلاق و حکمت کے لعل و گہر غلطاں اور تاباں نظر آتے ہیں۔
اس کتاب میں علامہ اقبال کے کلام کے علاوہ اُن کے خطبات اور مضامین کے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں، جن سے اقبال کا نظریہ اخلاق واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ عجمی تصوف کے بارے میں اقبال کی یہ رائے ہے ——

"...... تصوف سے اگر اخلاص فی العمل مُراد ہے اور یہی مفہوم قرون اولیٰ میں اس کا لیا
جاتا تھا تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ہاں! جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا
ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظام عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں
کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔"

کتنی سچی بات کہی ہے اقبال نے! تصوف کا یہی پہلو سب سے کمزور ہے! اُس کی ان فلسفیانہ موشگافیوں نے سخت اُلجھنیں پیدا کر دی ہیں!
فارسی کا مشہور شعر ہے ——

بر کفے جامِ شریعت بر کفے سندانِ عشق　　ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن

اس خیال کو اقبال نے کس قدر دلکش انداز میں ادا کیا ہے ——

باچنیں زور جنوں پاس گریباں داشتم　　در جنوں از خود نہ رفتن کار ہر دیوانہ نیست

"متاع" بالاتفاق "مؤنث" ہے مگر اقبال نے اس مصرعہ میں ——

؎ وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا

"متاع" کو مذکر باندھا ہے اور لفظوں کے دروبست کے اعتبار سے یہاں اُن کا یہ تصرف ناگوار محسوس نہیں ہوتا مگر اس شعر میں ——

نہ فقر کے لئے موزوں نہ سلطنت کے لئے　　وہ قوم جس نے گنوایا متاعِ ہمہ دتی　　(صفحہ ۷۰)

"متاع" کی تذکیر وجدان پر گراں گذرتی ہے! اقبال کا ایک مصرعہ ہے ——

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی

اس میں اقبال نے "متاع" کو مونث نظم کیا ہے اور یہی درست ہے۔

"اقبال فکر و عمل کے جن جن شعبوں پر اثر انداز ہوتے ہیں ان سب کا احاطہ ایک کتاب میں سعیٔ لاحاصل ہے"۔ (یہاں لفظ ——— از مصنف)

"سعیٔ لاحاصل" کی جگہ "ناممکن" یا "بہت دشوار" لکھنا تھا۔

"ختم نبوت . . . . کے معنی بالکل سلیس ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جنہوں نے اپنے پیروؤں کو ایسا قانون عطا کر کے جو ضمیر انسان کی گہرائیوں سے ظہور پذیر ہوتا ہے آزادی کا راستہ دکھا دیا ہے کسی اور انسانی ہستی کے آگے روحانی حیثیت سے سرِ نیاز خم نہ کیا جائے۔ دینیاتی نقطۂ نظر سے اس نظریہ کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ وہ اجتماعی اور سیاسی تنظیم جسے اسلام کہتے ہیں مکمل اور ابدی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں ہے۔ جس کا انکار کفر کو مستلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرتا ہے وہ اسلام سے غداری کرتا ہے" (حرفِ اقبال ص ۱۴۹-۱۵۰)

علامہ اقبال نے "ختم نبوت" کی جو تشریح کی ہے۔ اس کی روشنی میں مرزا غلام احمد قادیانی کا کیا موقف قرار پاتا ہے؟ افسوس کہ پاکستان بننے کے بعد اسلام سے غداری کا یہ مرکز قادیان سے ربوہ میں منتقل ہو گیا ہے!

"رسول کریم کو صرف نبی ماننا کافی نہیں اصل چیز تو رسول اکرم کی ختم رسالت پر ایمان ہے"

(حرفِ اقبال - ص ۱۶۵)

ان اقتباسات نے اس بلند پایہ کتاب کو مقدس بھی بنا دیا ہے اللہ تعالیٰ مصنف کو دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے گا! (ز آمین)

خیالاتِ محمد عزیز مرزا

مرتبہ:- آنجہانی منشی دیا نرائن نگم (ایڈیٹر زمانہ) دیباچہ:- نواب وقار الملک مرحوم ضخامت، ۳۴۰ صفحات (مجلد)

ملنے کا پتہ:- کل پاکستان انجمن ترقی اردو - اردو روڈ، کراچی

مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۷۵ء میں جب سر سید احمد خاں نے علی گڑھ کالج قائم کیا تو عزیز مرزا دس سال کی عمر میں طلباء کے سب سے پہلے گروہ کے ساتھ اس کالج میں داخل ہوئے انہوں نے بی اے کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ گریجویٹ ہونے کے بعد وہ دکن چلے گئے اور وہاں اپنی ذہانت اور قابلیت کی بدولت مختلف معزز عہدوں پر فائز رہے۔ جب وہ حیدرآباد کی ہائی کورٹ کے جج بنے تو صیغۂ عدالت میں بہت سی اصلاحیں کیں اور جب ہوم سکریٹری ہوئے تو محکمہ تعلیمات کو ترقی دی۔ حیدرآباد دکن میں مرحوم مختلف علمی انجمنوں کے صدر اور سرپرست تھے ۱۹۰۹ء میں ریاست کی داخلی سازشوں کی بدولت انہیں اپنے عہدے سے ناگہانی طور پر سبکدوش ہونا پڑا، بلکہ حیدرآباد چھوڑ دینا پڑا اور وہ علی گڑھ میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئے!

علی گڑھ میں رہ کر عزیز مرزا مرحوم نے قومی کاموں میں حصہ لیا۔ خاص طور پر علی گڑھ کالج کے معاملات سے اُن کو بہت زیادہ شغف رہا ۱۹۱۰ء میں برما میں ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں علی گڑھ سنڈیکیٹ کے ایک رکن تعلیمات کی حیثیت سے شرکت کی اور اسی سال آل انڈیا اردو کانفرنس کے پہلے اجلاس منعقدہ بدایوں کی صدارت فرمائی۔ مسلم لیگ کے سکریٹری کا عہدہ بھی اُن کو تفویض ہوا جس کے فرائض انہوں نے بڑی محنت اور خلوص کے ساتھ انجام دیئے۔ ۱۹۱۲ء میں وہ اللہ کو پیارے ہو گئے!

مولوی عزیز مرزا مرحوم کو طالب علمی کے زمانے سے ہی شعر و ادب سے دلچسپی تھی۔ انہوں نے نواب فتح نواز جنگ مولوی مہدی حسن کے انگریزی سفر کا اُردو میں سلیس ترجمہ کیا جو "گل گشتِ فرنگ" کے نام سے شائع ہوا اور دکن کے مشہور وزیر محمود کا داں کی سوانح عمری قلمبند کی جو اُس دور میں بہت پسند کیا گیا۔

اس کتاب میں مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم کے مضامین کو یکجا کیا گیا ہے۔ یہ مضامین مختلف موضوعات پر ہیں زبان سادہ و سلیس اور اسلوب دلچسپ ہے۔ چند مضامین کے عنوانات :-

اکبر اعظم ——— دربار بغداد کی ایک جھلک ——— سکہ کی ابتدا اسلام میں ——— دنیاوی ترقی کے واسطے پابندیٔ مذہب لازمی ہے ——— ہندوستان اور مسٹر چیمبرلین ——— گرمی کا سماں ——— دیسی مصنوعات کی حفاظت .... !

مولوی عزیز مرزا مرحوم کے خیالات مذہبی ہیں اور اُن کی تحریریں مشرقی شرافت کی آئینہ دار ہیں لیکن کہیں کہیں یہ رنگ بھی آگیا کہ مغلیہ خاندان کے بعض غلط جاہل بادشاہ جلال الدین اکبر نے جو ڈاڑھی منڈوانے کا حکم دیا تھا اور گائے کے گوشت اور لہسن پیاز کے استعمال پر بندش یا پابندی عائد کی تھی اُس کو وہ سراہتے ہیں !

مولوی عزیز مرزا کا یہ جملہ "ضرب المثل" بننے کے قابل ہے ——— اصلی حاکم تلوار نہیں بلکہ ہنر مند ہاتھ ہے ——— بھاکری کالیداس کے ڈرامہ کا ترجمہ انہوں نے کس حسن و خوبی کیساتھ کیا ہے :———

"اُس کی شریلی آواز جس سے امرت ٹپکتا تھا، کچھ ایسی دلکش تھی کہ اُس کے مقابلے میں خوش گلو کوئل کے نغمے بھی دلخراش اور کسی سانک بے سری گت معلوم ہوتے تھے۔
متلون نظر جو بے قراری میں اُس نیلے کنول سے جو تیز ہواؤں کے تھپیڑے کھا رہا ہو کم نہ تھی یا تو اس کو بڑی آنکھوں والوں کو ہرنی سے ملی تھی یا خود ہرنی نے اُس سے اُڑائی تھی"

اردو شاعری میں جو "واسوخت" کی صنف ملتی ہے اُس پر وہ کتنی سچی تنقید کرتے ہیں ———

"واسوختوں کی بھی یہی کیفیت ہے کہ ضمیریں تو ہما بہ تذکیری آ رہی ہیں مگر سراپا دیکھو تو عورت کا"

مغلیہ بادشاہ جلال الدین اکبر کی وفات پر جو مضمون ہے اُس کا عنوان :———

"فوتِ اکبر شہ"

ہے ! اس دور میں یہ عنوان کتنا عجیب لگتا ہے۔

حیدرآباد دکن کا ایک تعلقہ (ضلع ـ ڈسٹرکٹ) بیڑ (بروزن چیڑ BEED) ہے مگر اُس کو کاتب نے جگہ جگہ "بشیر" لکھا ہے !

انجمن ترقی اُردو پاکستان نے "خیالاتِ عزیز" کو شائع کرکے علم و ادب کی خدمت انجام دی ہے۔

پھول

مرتبہ :- غلام عباس، ضخامت ۲۸۰ صفحات (رانگ ود اسائز ـ مجلد) قیمت چھ روپے

ملنے کا پتہ :- سجاد کامران ۶ ـ ایچ (بلاک ۶) پی ای سی ایچ سوسائٹی، کراچی ۲۹

بچوں کا مشہور و مقبول اخبار "پھول" ۱۹۰۹ء میں لاہور سے جاری ہوا تھا، شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی مرحوم اس کے سرپرست اور نگران تھے، ۱۹۳۵ء میں اُن کے مرنے کے بعد مولوی صاحب مرحوم کے قابل فخر فرزند سید امتیاز علی تاج کو یہ فرض انجام دینا پڑا، اُردو زبان کے متعدد مشہور ادیبوں اور شاعروں کا "پھول" سے ادارت کا تعلق اور وابستگی رہی ہے یہ جریدہ اڑتالیس سال تک ہر ہفتہ باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتا رہا یہاں تک کہ ۱۹۵۷ء میں بند ہو گیا، کاش یہ "پھول" کھلتا ہی رہتا مگر قدرت کے قانون "کھلنے کو ہر پھول کی قسمت میں بکھر جانا لکھا ہوا ہے"۔

اُردو کے مشہور و مقبول افسانہ نگار جناب غلام عباس بھی "پھول" کے ایڈیٹر رہے ہیں، انہوں نے "پھول" کے مضامین نظم و نثر کا انتخاب کیا ہے جسے ترقی اردو بورڈ کے تعاون سے سجاد کامران صاحب نے شائع فرمایا ہے۔

"پھول" کے مضامین کا یہ انتخاب بچوں کے لئے سدا بہار گلدستہ ہے، سادہ اور دلچسپ نثر پارے اور ہلکی پھلکی نظمیں! یقین ہے کہ یہ انتخاب پسند کیا جائے گا۔

"مگر کمال یہ کہ سادگی کے باوجود اُن کی تحریر کا عالمانہ وقار اور ٹھوس پن قائم رہتا" (صفحہ ۱۴)

یہ اس "انتخاب" کے دیباچہ کا ایک جملہ ہے: "تحریر کا ٹھوس پن" کیا ہوتا ہے! مفہوم تو سمجھ میں آگیا مگر یہ اندازِ بیان ..... ؟!

"سپاہی کو ولایت کے لوگ لاڈ سے "ٹومی" کہتے ہیں" (سید احمد شاہ بخاری پطرس، صفحہ ۲۰) "لاڈ" کی جگہ محبت اور پیار لکھتے تو تحریر میں زیادہ حُسن پیدا ہو جاتا اس کے علاوہ "لاڈ" عام طور پر قرابت اور رشتہ داری کی اصطلاح ہے، مثلاً :—

"فیضی کی ماں اُسے لاڈ سے "فجو" کہتی تھی"

اگر کوئی یوں بولے :—

"ملک کے عوام فلاں شخص کو لاڈ سے "بابا" کہتے ہیں"

تو اس جملہ میں "لاڈ" کھٹکتا ہے۔

"راجہ بکرماجیت کی کوشش سے دربار کے امیروں اور وزیروں اور پڑھے لکھے ودوانوں کی زبان تو پھر سنسکرت ہوگئی۔ لیکن عام لوگوں کا کچھ علاج نہ ہو سکا وہ برابر پراکرت ہی بولتے رہے۔"

(عبدالمجید سالک، صفحہ ۱۳)

اس عبارت میں ایک تو ——— "عام لوگوں کا کچھ علاج نہ ہو سکا" ——— کھٹکتا ہے، دوسرے "ودوانوں" کو "پڑھے لکھے" کہا گیا ہے یہ حشو و زائد ہے "ودوان" عالم کو کہتے ہیں اور ودوان لکھے پڑھے ہی ہوا کرتے ہیں!

"بیوی نے رات ہی رات میں جو کچھ جُڑا اُس کا ناشتہ کیا" (صفحہ ۱۶۹)

"جُڑا" اس جملہ میں کتنا بے جوڑ لگتا ہے اس ایک لفظ سے پوری عبارت ہی کا ناک اوبکیب ہو گئی۔

کتاب خاصے اہتمام سے چھاپی گئی ہے، کتابت جلی اور نمایاں ہے خاص طور سے جلد دیدہ زیب اور خوشنما ہے۔

دیدۂ بیدار

از:- قابل اجمیری، ضخامت ۱۹۲ صفحات، (مجلد سرورق دیدہ زیب) قیمت تین روپے

ملنے کا پتہ:- مجلس یادگار قابل، جامعہ مسجد میر آباد۔ حیدر آباد۔

علامہ اقبال کا یہ مصرعہ ———

؎ غربت میں آکے چمکا گم نام تھا وطن میں

قابل اجمیری پر صادق آتا ہے، وہ ہندوستان میں گمنام تھے، اور پاکستان میں آکر چمکے اور خوب چمکے ——— مگر آہ!

؎ خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود
(دولت کے نیچے: شعلہ)

اب وقت آیا تھا کہ وہ اپنی شہرت کی بہار دیکھتے اتنے میں پیک اجل نے آن کی زندگی کی بساط ہی لپیٹ دی، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

جناب قابل اجمیری نے کوئی شک نہیں تغزل میں اپنا منفرد آہنگ پیدا کیا آن کی غزلوں کا لہجہ کتنا نرم رسانک اور شیریں ہے آن کے کتنے ہی اشعار ایسے ہیں جن میں انہوں نے روشِ عام سے ہٹ کر اپنے محسوسات اور واردات کی ترجمانی کی ہے۔ قابل کی غزلوں میں زبان و بیان کا بڑا نکھار پایا جاتا ہے، یہ شعر کا کیا

ذکر ہے شہنشاہِ تغزل حضرت جگر مرادآبادی مرحوم نے قابل کا کلام سن کر کہا ــــــــــ

"اُن کے کلام سے ان کی انفرادیت نمایاں ہے"

"دیدۂ بیدار" کا مقدمہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا ہے جس کا رنگ یہ ہے ــــــــ

"وہ زندگی کو بسر کرنے اور برتنے کے قائل معلوم ہوتے ہیں" (صفحہ ۷)

عجیب مضحکہ خیز بات کہی ہے دنیا میں کون ایسا شخص ہے جو زندگی کو بسر کرنے اور برتنے کا قائل نہیں ہے ـــــ "لیکن اُن کی شاعری میں ہنگامہ پسندی نہیں ہے برخلاف اس کے خاص مہذب اور ستھری فضا کا احساس ہوتا ہے" ـــــ اس جملہ میں "برخلاف" کس بری طرح استعمال کیا گیا ہے! اور بات کیا ہوئی کہ فلاں شخص کی شاعری میں ستھری فضا کا احساس ہوتا ہے!

"ان میں تو عشق کرنے والے کی اہمیت کا احساس چھپایا ہوا ہے" (صفحہ ۱۱) پورا جملہ زبان و بیان کے ساتھ ایک طرح کا مذاق ہے ـــــ "لیکن اگر عشق متوازی انداز سے کھیلتا ہو تو پھر انتظار کے لمحے بھی حسین ہو جاتے ہیں" (صفحہ ۱۱) عشق کا متوازی انداز کیا ہوتا ہے؟ یہ کیا کہ جو لفظ اور جملہ ذہن میں آیا اُسے لکھا ـــــ "اُن کے ہاتھوں ہیجان انگیزی کا وجود نہیں ہوتا" (صفحہ ۱۲) سالہا سال کی مشق کے بعد تحریر میں اس قدر کچا پن پایا جاتا ہے۔

"قابل صاحب کے عشقیہ اشعار میں خاصہ تنوع پایا جاتا ہے، لیکن اس تنوع کے باوجود اُن کی انفرادیت کو ٹھیس نہیں لگتی" (صفحہ ۱۲) یہ عجیب بات ہے کہ جس کسی شاعر کے کلام میں تنوع پایا جاتا ہے اُس کی "انفرادیت" کو ٹھیس لگنے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔

"اُن کے اشعار کا موضوع صرف گردشِ دوراں اور غمِ روزگار ہی نہیں ہے بلکہ اس موضوع کا سہارا لے کر ان میں زندگی کی بعض اہم حقیقتوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے، غمِ جاناں کو سینے سے لگا لینے کے بعد گردشِ دوراں کو امان بخشنے کا خیال، عشق کے مارے ہوئے بے کسوں کی بزم میں گردشِ دوراں کے آ بیٹھنے کسی بات پر سمجھانے سے اُکتا آنے، لذتِ گردشِ ایام کو صحیح طور پر محسوس کرنے اور جنون کو حجرہ دلدار رکھتے ہوئے بھی کسی کی آنکھ کے نم نظر آنے کا خیال اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ قابل صاحب زندگی اور اس کے حالات کا گہرا شعور رکھتے ہیں ـــــ" (صفحہ ۱۴)

ڈاکٹر عبادت بریلوی کا نقد و ادب میں جو بلند مقام ہے، اس کے لحاظ سے ان کی یہ عبارت فروتر ہے۔ ـــــ "قابل صاحب کی غزلوں کے موضوع محدود نہیں ہیں" (صفحہ ۱۳) کیا نظم کی طرح غزل کا بھی مخصوص و متعین "موضوع" ہوتا ہے ـــــ "اس لئے وہ غزل کے حدود سے باہر نہیں نکلتے اور اس کی بندشوں کو توڑتے نہیں اُس کے اقتضایات کا خون نہیں کرتے" (صفحہ ۱۵)

"اقتضایات کا خون نہیں کرتے" یہ اظہارِ بیان کس قدر عجیب ہے! ـــــــ "انہیں غزل کو غزل بنانے کا گُر خوب آتا ہے" (صفحہ ۱۶) "گُر" یہاں جس طرح استعمال ہوا ہے اُس میں "ہجو ملیح" کا رنگ جھلکتا ہے۔

"دیدۂ بیدار" کے منتخب اشعار "قارئین" "نگاران" کی آسودگی ذوق اور نشاطِ وجدان کے لئے پیش کئے جاتے ہیں ـــــــ

زہر بھی ہم نے پی کے دیکھ لیا ‌‌ ‌ عشق میں تشنگی ہی رہتی ہے
تیرے مستوں کی زندگی اے دوست ‌ ‌ اک سرورِ خوشِ اعتبار کا ہے
اُس کے حسنِ ستم کا کیا کہنا ‌ ‌ لوگ سمجھے خطا ہماری ہے
دل کی دھڑکن کا اعتبار نہیں ‌ ‌ ورنہ آواز تو تمہاری ہے
ہمارے نقشِ قدم سے چمک اٹھے شاید ‌ ‌ فضائے منزلِ جاناں دھواں دھواں ہے ابھی

سرکشی جاتی ہے آنکھیں ڈوبتے جاتے ہیں دل
تیری محفل میں بدل جاتا ہے طوفانوں کا رخ

کیا ہوا ہم کو اگر دو چار موجیں چھو گئیں
ہم نے بدلا ہے نہ جانے کتنے طوفانوں کا رخ

رہبر جو ہمیں ٹھوکریں کھانے نہیں دیتا
ڈرتا ہے کہیں راستہ ہموار نہ ہو جائے

اس کی محفل میں بیٹھ کر دیکھو
زندگی کتنی خوب صورت ہے

مقاماتِ فکر و نظر کون سمجھے
یہاں لوگ نقشِ قدم دیکھتے ہیں

دلِ دیوانہ عرضِ حال پہ مائل تو کیا ہوگا
مگر وہ پوچھ بیٹھے خود ہی حالِ دل تو کیا ہوگا

ہمیں ڈر کیا ہمیں تو ڈوبنا ہے ڈوب جائیں گے
مگر طوفان جا پہنچا لبِ ساحل تو کیا ہوگا

شرابِ ناب ہی سے ہوش آ جاتے ہیں انساں کے
ترا کیفِ نظر بھی ہو گیا شامل تو کیا ہوگا

محبت کو ہے عمرِ خضر بھی کم
محبت منزلِ یک گام بھی ہے

لطف لیتا ہے مگر شکوہ سرا ہوتا ہے
شوقِ احسان فراموشِ جفا ہوتا ہے

ایک دل تابِ تجلی کو ترستی ہے نظر
صبح ہوتی ہے مگر صبح سے کیا ہوتا ہے

بات بھی تشنہ رہی الفاظ بھی مبہم سے ہے
عہدِ پیمانِ نظر لیکن بڑے محکم سے ہے

جلوہ گاہِ یار سے بھی تشنہ کام آئے ہیں لوگ
جانے امیدیں زیادہ تھیں کہ جلوے کم سے ہے

مجھ سے ہمدردی تو ہے لیکن کہیں ایسا نہ ہو
میری آنکھیں سوکھ جائیں ترا دامن نم سے ہے

قابل اپنا دردِ محرومی سمجھ سکتا ہے کون
عمر بھر طوفاں سے کھیلے تشنۂ شبنم رہے

شاید پھر اس قدر بھی تعلق نہیں رہے
کچھ لوگ ڈھونڈتے ہیں ترا سنگِ در ابھی

صرف عذرِ گناہ ہو نہ سکا
ورنہ سارے گناہ کر بیٹھے

ابھی مشکل سے سمجھے گا زمانہ
نیا نغمہ نئی آواز ہوں میں

پھر کوئی کم بخت کشتی نذرِ طوفاں ہو گئی
ورنہ ساحل پر اداسی اس قدر ہوتی نہیں

ہائے اس عالم میں چھوڑا ہے تمہارے غم نے ساتھ
جب قضا بھی زندگی کی چارہ گر ہوتی نہیں

رنگِ محفل چاہتا ہے اک مکمل انقلاب
چند شمعوں کے بھڑکنے سے سحر ہوتی نہیں

آسودگیٔ ذوقِ طلب کا سوال ہے
فیضانِ دوست عام سہی بیکراں سہی

ہمیں بھی دیکھ لو آثارِ منزل دیکھنے والے
کبھی ہم نے بھی دیکھا تھا غبارِ کارواں اپنا

کوئی وعدہ نہیں امید نہیں
پھر مجھے انتظار سا کیوں ہے

ڈھونڈنے پر کہاں ملیں گے ہم
راہرو ہیں سفر میں رہتے ہیں

لاکھ ہم خانماں خراب سہی
حادثوں کی نظر میں رہتے ہیں

ایک دن پوچھتی پھرے گی حیات
اہلِ دل کس نگر میں رہتے ہیں

دن نکلتا ہے کس تمنا میں
رات کس آسرے پہ آتی ہے

مجھ کو تلقینِ صبر فرما کر — کیوں تری آنکھ بھیگ جاتی ہے
نامرادی نے کر دیا خود دار — اب سرِ شوق خم نہیں ہوتا
وقت کرتا ہے پرورش برسوں — حادثہ ایک دم نہیں ہوتا
نشانِ پا بھی پہنچا تو دیا کرتے ہیں منزل تک — مگر فیضانِ میرِ کارواں کچھ اور ہوتا ہے
تم نے پیمانِ محبت توڑ کیا تھا لیکن — اب تمہیں یاد نہیں تو مجھے شکوا بھی نہیں
کس کڑے وقت میں بدلی ہیں نگاہیں تم نے — جب مجھے حوصلۂ ترکِ تمنا بھی نہیں
مجھی پہ اتنی توجہ مجھی سے اتنا گریز — مرے سلام سے پہلے مرے سلام کے بعد
حرم والو! انہیں سجدوں کا کیونکر ہوش رہتا ہے — درِ جاناں پہ ہم تو سر جھکانا بھول جاتے ہیں
صبر لوگوں کے سلسلے سوزِ نہاں تک آ گئے — ہم نظر تک چاہتے تھے تم تو جاں تک آ گئے
زلف میں خوشبو نہ تھی یا رنگ عارض میں نہ تھا — آپ کس کی آرزو میں گلستاں تک آ گئے
بہار آئے نہ آئے کلی کھلے نہ کھلے — نسیمِ صبح چمن کا طواف کر آئی
یوں دھڑکنے لگا ہے دل جیسے — پہلی بار آ رہی ہے تیری یاد
زندگی کتنی تیز رو ہے مگر — ساتھ ساتھ آ رہی ہے تیری یاد
راستوں سے گریز تم سے فرار — بعض لمحے عجیب ہوتے ہیں
تم جنہیں عمر بھر نہیں ملتے — وہ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں
مرے غم پہ آنسو بہاؤ گے تم بھی — تو اس آگ کو پھر ہوا کون دے گا
زمانہ محبت کا مارا ہوا ہے — تجھے زندگی کی دعا کون دے گا
اے آفتابِ صبحِ بہاراں سلام کر — دیوانے آ رہے ہیں شبِ غم گزار کے

وہی اضطرابِ فراق ہے وہی اشتیاقِ وصال ہے
تری جستجو میں جو حال تھا تجھے پا کے بھی وہی حال ہے
نہیں کوئی راہ نما تو کیا ہے خلاف ساری فضا تو کیا
مجھے فکرِ سود و زیاں ہو کیوں تری یاد شاملِ حال ہے

جانا بھی اگر ہم نے تری بزم سے اٹھنا — محسوس ہوا پاؤں میں زنجیر پڑی ہے
دل رسم و رہِ شوق سے مانوس تو ہو لے — تکمیلِ تمنا کے لئے عمر پڑی ہے
کچھ دیر کسی زلف کے سائے میں ٹھہر جائیں — قابل غمِ دوراں کی ابھی دھوپ کڑی ہے
اس حسنِ اتفاق کی تصویر کھینچ لو — ہوتے ہیں ایک ساحل و طوفاں کبھی کبھی
ہم بیکسوں کی بزم میں آئے گا اور کون — آ بیٹھتی ہے گردشِ دوراں کبھی کبھی
کچھ سہہ غمِ جاناں، غمِ دوراں تو نہ ہوگا — ہو جائے گا رسوا مگر انساں تو نہ ہوگا
گھر پھونک کے خوش ہوں کہ مرا ذوقِ تماشا — شرمندۂ احسانِ بہاراں تو نہ ہوگا

ترکِ مے تو بہت آسان ہے لیکن واعظ — تیری تقریر بڑی توبہ شکن ہوتی ہے

آ ہی جائے گی اسیرانِ قفس تک اک دن — نکہتِ گل کہیں پابندِ چمن ہوتی ہے

تضادِ جذبات میں یہ نازک مقام آیا تو کیا کرو گے

میں رو رہا ہوں تو تم نہس رہے ہو میں مسکرایا تو کیا کرو گے

مجھے تو اس درجہ وقتِ رخصت سکوں کی تلقین کر رہے ہو

مگر کچھ اپنے لئے بھی سوچا میں یاد آیا تو کیا کرو گے

کوئی جواب ہے اس طرزِ دلربائی کا — سکوں بھی لوٹ لیا بیقرار بھی نہ کیا

خیالِ خاطرِ احباب اور کیا کرتے — جگر پہ زخم بھی کھاتے شمار بھی نہ کیا

زمانہ دوست ہے کس کس کو یاد رکھو گے — خدا کرے کہ تمہیں مجھ سے دشمنی ہو جائے

قفس ہے دام ہے بجلی کی ہوئی ہے آتشِ گل بھی — اسی ماحول میں اندازۂ پرواز ہوتا ہے

زمانہ کھیل رہا ہے تمہاری زلفوں سے — ہمارے حالِ پریشاں کی بات کون کرے

کسی کو رنگ سے مطلب کسی کو خوشبو سے — گلوں کے چاک گریباں کی بات کون کرے

ہو کے رہ جاتا ہے اپنی ہی اداؤں میں اسیر — حسنِ شائستۂ اربابِ نظر ہونے تک

ظلمت دلوں میں تفرقِ ابھی مشکل ہے — رات سونگ بدلتی ہے سحر ہونے تک

ہم نے اُس کے لب و رخسار کو چھو کر دیکھا — حوصلے آگ کو گلزار بنا دیتے ہیں

یہی وہ ساحلِ مقصود ہے کہ جس کیلئے — نہ جانے کتنے سفینے ڈبو کے آتے ہیں

قطعہ :- جو کسی موج کا شکار نہ ہو — وہ کنارہ تلاش کرتا ہوں

اک سہارے کا زخم ہے دل میں — اک سہارا تلاش کرتا ہوں

دوسرا رُخ

جھوٹے وعدے کی لذتیں مت پوچھ — آنکھ در سے لگی ہی رہتی ہے (صفحہ ۱۸)

"سے" کی جگہ "پہ" لانا تھا ـ آنکھ در پہ لگی ہی رہتی ہے

دن پریشان ہے رات بھاری ہے — زندگی ہے کہ پھر بھی پیاری ہے (صفحہ ۲۰)

"پریشان" دن کی صفت نہیں ہے، دشوار یا سخت . . . . جیسے الفاظ کا محل تھا۔

اپنے لب ہی نہیں سیئے ہم نے — آپ کی زلف بھی سنواری ہے

زلف سنوارنے اور لب سینے میں نہ کوئی مناسبت ہے اور نہ لطیف تضاد ہے ۔

جبینِ وقت کو ہم نے بھی نور بخشا ہے — سلیقۂ نگہِ یار ہم بھی رکھتے ہیں (صفحہ ۲۳)

"سلیقۂ نگہِ یار" نامانوس ترکیب ہے ۔

ذرا نگاہِ تغافل شعار اُٹھنے دو — اک آرزوئے فسوں کار ہم بھی رکھتے ہیں

"آرزوئے فسوں کار" آرزو کی کون سی قسم ہے ؟ اور نگاہِ تغافل شعار کے اٹھنے کے بعد آرزوئے فسوں کار آخر کیا فرض انجام دے گی ؟

مٹا جاتا ہے دل راہِ طلب میں — تمنا بیکراں ہو جائے گی کیا (صفحہ ۲۷)

شعر کا مفہوم واضح نہیں ہوا۔

جنونِ عشق نے پہونچا دیا کہاں مجھ کو　　نگاہِ دوست بھی اکثر تھکی تھکی آئی　　(صفحہ ۲۸)

بلا شاعر کا مفہوم یہ ہے کہ میں جنونِ عشق میں اتنی دور چلا گیا ہوں کہ نگاہِ دوست وہاں میری تلاش میں اکثر تھکی تھکی پہونچی ہے ـــــ اس خیال میں
بل تو بڑا تکلف پایا جاتا ہے۔ پھر دوسرا مصرعہ کمزور ہے! اس کا بھی کوئی ثبوت اور قرینہ نہیں ہے کہ نگاہِ دوست جنونِ عشق کا نظارہ کرنے کی اتنی زحمت
رکس لئے برداشت کرتی ہے۔

مرے خلوص کا عالم نہ پوچھئے قابل　　شکستِ جام سے آوازِ زندگی آئی

ست جام سے آخر کیا مراد ہے! جب کہ شعر میں مے، مینا و کا کوئی ذکر اور اشارہ ہی سرے سے نہیں ہے ـــــ پھر شکستِ جام سے زندگی کی آواز کا
اپنی جگہ خود قابلِ غور ہے نیز شکستِ جام سے آوازِ زندگی کے آنے سے شاعر کے خلوص کا کیا تعلق ہے!

مریض کا بھرم نہ کھلتا نہ میری تشنگی ہوتی　　ذرا تم نے نگاہِ ناز کو تکلیف دی ہوتی　　(صفحہ ۳۰)

"نہ میری تشنگی ہوتی" یہ ٹکڑا کمزور ہے، پھر "نگاہِ ناز" کا نہیں یہاں "نگاہِ مست" کا محل تھا ـــــ

مری وحشت کا اندازہ تو ہو جاتا زمانے کو　　جبینِ زندگی پر اک شکن ہی آگئی ہوتی

بینِ زندگی" سے شاید "جبینِ کائنات" مراد ہے، بہرحال جبینِ زندگی ہو یا پیشانی کائنات اس پر اک ذرا سی شکن آجانے سے زمانے کو وحشت کا اندازہ
طرح ہو سکتا ہے؟ کیسی بے مایہ وحشت ہے جس کا اندازہ جبیں کی صرف ایک شکن سے کیا جا سکتا ہے۔

زمانے کی شکایت کیا زمانہ کس کی سنتا ہے　　مگر تم نے تو آوازِ جنوں پہچان لی ہوتی

شعر اچھا خاصہ تھا بشرطیکہ "جنوں" کی جگہ کوئی مناسب لفظ ہوتا!

جانے کس عالم میں آئیں آنے والے قافلے　　سایۂ دیوارِ جاناں چاروں طرف جاوداں کر جا　　(صفحہ ۳۳)

دوسرا مصرعہ اندازِ بیان کے اعتبار سے سست اور کمزور ہے! پھر ایسا کرنا کس طرح ممکن ہے کہ دیوارِ جاناں کے تلے دھوپ آتے سدا سایہ ہی سایہ ہے
شاعری میں محالات کو ممکن بنانے کی بھی مثالیں ملتی ہیں مگر اصل چیز بات کہنے کا سلیقہ اور اسلوب ہے۔

تم نہ مانو مگر حقیقت ہے　　عشق انسان کی ضرورت ہے　　(صفحہ ۳۹)

مطلع میں کوئی شک نہیں بڑی بے ساختگی پائی جاتی ہے مگر مصرعہ ثانی میں "ذم" کی جو جھلک ہے اس کو کیا کیجئے!

ہمارا شعورِ محبت تو دیکھو　　تمہیں بھی محبت سے کم دیکھتے ہیں　　(صفحہ ۴۱)

بات کھلی نہیں کہ شاعر آخر کیا کہنا چاہتا ہے!

تڑپ اٹھتی ہے ان کی اک اک تجلی　　کچھ اس بے نیازی سے ہم دیکھتے ہیں

مصرعہ ثانی کس قیامت کا ہے، افسوس ہے کہ مصرعہ اولیٰ اسی نسبت سے کمزور ہے!

لی تو رو رہے انگڑائی دل وجد میں آیا ہے　　اکثر تری نظروں نے وہ گیت سنایا ہے　　(صفحہ ۵۱)

نظروں کا گیت سنانا ـــــ خیال و بیان کے اعتبار سے کمزور ہے ـــــ

ازل سے مائلِ پرواز ہوں میں　　تری انگڑائیوں کا راز ہوں میں　　(صفحہ ۵۹)

عزیز لکھنوی کے اس مشہور شعر ـــــ

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

سے استفادہ کیا تھا تو اس مفہوم کو اور ترقی دے کر بیان کرنا تھا، کہ مفہوم و معنی میں ابہام پیدا ہو گیا

غمِ خودِ آگہی میں کھو گیا ہوں — تماشے لگ گئے نازِ شبوں میں (صفحہ ۶۰)

ایسے کمزور شعر انتخاب میں چھانٹ دینے چاہیے تھے —

میری طرح ہوتی تو ہیں تنہائیاں عزیز — اپنی ہی شوخیوں سے کوئی سرگراں بھی (صفحہ ۶۸)

وہی "ابہام" کا عیب !

ہمیشہ شمع بھڑکے گی سدا پیمانہ چھلکے گا — تری محفل میں چھوڑ آئے ہیں جوشِ بیاں اپنا

"جوشِ بیاں" کا محبوب کی محفل میں چھوڑ آنا ایک عجیب خیال ہے !! "سوزِ نہاں" کہتے تو شاید دونوں مصرعوں میں ربط پیدا ہو جاتا !

آج دل بے قرار سا کیوں ہے — تیرا غم ہے تو بار سا کیوں ہے (صفحہ ۷۱)

غزل کا مطلع جاندار ہونا چاہیے تھا جب کہ اس غزل میں دو تین شعر بہت ہی اچھے ہیں۔

کتنے شعلے سکونِ جاں بن کر — نرگس بے خبر میں رہتے ہیں (صفحہ ۷۶)

نرگس ——— شاعر کے "رومان" کی تلمیح ہے مگر "نرگس بے خبر میں رہتے ہیں" یہ اندازِ بیان وجدان و ذوق کو کھٹکتا ہے۔

عشق کا احساسِ تنہائی نہ پوچھ — دل بھی تیرا راز داں ہے آج کل (صفحہ ۸۰)

محبوب کا راز داں "دل" ہی تو ہوتا ہے پھر "بھی" لانے کی کیا ضرورت تھی ! جہاں تک مفہوم کا تعلق ہے شعر میں ابہام کے سوا اور کیا دھرا

کر رہا ہوں میں جہادِ زندگی — وقت میری داستاں ہے آج کل

اس پہیلی کو آخر کون بوجھے گا ؟

راہ پُرخار ہے اور رات اندھیری تابش — دور تک کوئی چراغِ رخِ زیبا بھی نہیں (صفحہ ۸۷)

"بھی" نے "رخِ زیبا" کی اہمیت، محبوبیت، ضرورت اور نایابی کو کس قدر گھٹا دیا — اس شعر سے تو یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اندھیرے میں روشنی تو کچھ اور ہی طرح درکار تھی، رونا تو اس کا ہے کہ "چراغِ رخِ زیبا" ممکن نہیں ہے، یعنی یہ بات بھی تنزل کی گئی ہے۔

مرے گناہِ نظر سے پہلے چمن چمن میری آبرو تھی

مجھے شعورِ جمال آیا تو گلعذاروں نے ساتھ چھوڑا (صفحہ ۹۸)

حیرت ہے کہ اتنا اچھا شاعر ایسے مبہم شعر کہہ کر یہ نہیں سوچتا کہ مفہوم لفظوں سے ادا ہوا یا نہیں۔

مری بندگی کا صلہ کون دے گا — ترے در پہ مجھ کو صدا کون دے گا (صفحہ ۱۰۳)

سجدہ کرنے والے کی بندگی کا یہی صلہ ہے کہ در محبوب پر کوئی اس کا نام لے کر اسے پکار دے ؟ یہ آخر کیا خیال ہے ؟ یہ کیسی تمنا ہے ؟

دردِ دیار کو تسکیں کا عنواں ہم بھی کر لیتے — محبت دردِ سر ہوتی تو درماں ہم بھی کر لیتے (صفحہ ۱۰۹)

تخیل کے اعتبار سے شعر بہت اچھا ہے مگر پہلے مصرع میں بڑا تکلف پایا جاتا ہے !

جلا رکھی تھی ہم نے مشعلِ جاں دشتِ غربت میں — وگرنہ احترامِ شامِ ہجراں ہم بھی کر لیتے

شعر کا مفہوم بطنِ شاعر میں گھٹ کر رہ گیا۔

آنا اب تری بزم کے جینے نہیں دیتے — دیوانوں کو جینے کی تمنا تو رہی ہے (صفحہ ۱۱۴)

ایسے شعر اور اس طرح کی غزلیں تو مشق کے زمانے میں کہی جاتی ہیں اور چاک کر دی جاتی ہیں۔

تابش مری نگاہ کے پیچھے ہیں دور دور — آتا ہے بتکدے میں مسلماں کبھی کبھی (صفحہ ۱۱۸)

"نگاہ" کے جوچ پچ کیوں ہیں ! اس ایک لفظ نے سارے شعر کا مفہوم خبط کردیا۔

ساقی سے بگڑ جائے کہ میخانہ اُجڑ جائے
اب جوشِ جنوں صرفِ گریباں تو نہ ہوگا (صفحہ ۱۲۱)

جوشِ جنوں اگر گریباں کو پرزے پرزے کرنے سے رُکا رہے گا۔ تو ایسا ہونے سے آخر میخانہ کیوں اُجڑ جائے گا۔ اور ساقی کس لئے بگڑ جائے گا !

تیز جب صبحِ بہاراں کی لگن ہوتی ہے
ہر نفس میں تری خوشبوئے دہن ہوتی ہے (صفحہ ۱۲۵)

اور اگر صبحِ بہاراں کی لگن تیز نہ ہو تو کیا محبوب کی خوشبوئے دہن ہر نفس میں محسوس نہیں ہوسکتی ! اس کے علاوہ "لگن" اور "خوشبوئے دہن" دونوں لفظ اس شعر میں کھٹکتے ہیں۔

ہم نے دنیا کو دردِ بخشش دیا
تم ستاروں میں مسکراتے رہے (صفحہ ۱۳۰)

شاعر نے بس الفاظ جوڑ دئے ہیں اور کلام موزوں ہوگیا ہے۔

تمہیں جو میرے غمِ دل سے آگہی ہو جائے
جگر میں پھول کھلیں آنکھ شبنمی ہو جائے (صفحہ ۱۴۳)

"جگر میں پھول کھلنے" سے شعر کا مفہوم غالباً یہ ہے کہ جگر میں زخم پیدا ہو جائیں مگر اس انداز پر عاشق محبوب کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا۔

قافلے منزلِ مقصود تک آ پہونچے ہیں
اہتمامِ رسن و دار پہ کیا گزری ہے (صفحہ ۱۴۹)

مصرعہ ثانی خاصہ مبہم ہے !

سینے میں ہے توہینِ طلب کا غمِ جاں سوز
سو داغ نظر آتے ہیں دامانِ سحر پہ (صفحہ ۱۶۹)

"توہینِ طلب" کا "غمِ جاں سوز" کس بلا کا نام ہے !

چاند تاروں کیساتھ رقص کروں
ایک لبریز جام بن جاؤں
اپنی محفل میں گر بلائیں آپ
زندگی کا خرام بن جاؤں (صفحہ ۱۷۹)

نام نہاد "ترقی پسند شاعری" کی وبائے عام قابل جیسے سنجیدہ شاعر کو بھی ذرا دیر کے لئے چھو گئی !

تیری آفاقیت نگاہ میں ہے
عالمِ ہستی دلپسند سمجھتے ہیں
ہم بلانوش زہرِ ہستی کو
تیرے ہونٹوں کا رس سمجھتے ہیں (صفحہ ۱۸۵)

دوسرے شعر کو قطعہ بنانے کے لئے پہلا شعر جوڑا گیا ہے !

کھیل سکتے ہیں زلفِ پیچاں سے
شامِ غم پر عبور رکھتے ہیں
تم نگاہیں ملا نہیں سکتے
ہم محبت کا نور رکھتے ہیں

قطعہ کیا ہے چیستاں ہے !!

کوچہ رنگ دلبر میں موجِ نسیم
فرطِ مستی سے جھوم جاتی ہے
ڈالیوں کا طواف کرتے ہوئے
عارضِ گل بھی چوم جاتی ہے (صفحہ ۱۸۷)

کوئی شک نہیں اس قطعہ کا خیال دلکش و لطف انگیز ہے مگر چوتھے مصرعہ میں "کو" کی کمی بری طرح محسوس ہو رہی ہے اور اس کے بغیر مصرعہ کھڑا کھڑا لگتا ہے
زبان و بیان اور مفہوم و خیال کی ان کمزوریوں کے باوجود "دیدۂ بیدار" تغزل کا حسین و جمیل گلدستہ ہے۔ قابل کا تنہا ایک شعر (مقطع) ہی جانے
کتنی غزلوں پر بھاری ہے ——

ہوس کے دور میں قابل سے عظمتِ فن ہے
غزل سرا بھی رہا ذکرِ یار بھی نہ کیا